کراچی

اپریل ۱۹۶۶ء

جلد:- ۱۸

شمارہ:- ۱

ماہرالقادری

ترتیب

	ماہرالقادری	۳
ورحزب اختلاف	محمد نواز (ایم۔اے)	۱۰
وی	عبیداللہ قدسی	۲۶
حیثیت	جلال الدین قریشی — وارث سرہندی	۳۴
فاخرانہ نظر	محمد زکریا مائل	۴۸
کائنات	حافظ لدھیانوی — جاوید احسن	۵۰
	مسٹر اے کے بروہی ایڈوکیٹ	۵۱
بی	....	۵۲

پبلشر:- مسرور حسین

مقام اشاعت

قیمت فی پرچہ ۶۲ پیسے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

متحدہ ہندوستان میں جب انگریزوں کی غلامی ہم پر مسلّط تھی، اُس دورِ جبر و استبداد میں ہم نے برطانوی پالیسی اور انگریزی زائمہ کے علی الرغم ترکوں کی عملاً حمایت و معاونت کی ہے، مولانا محمد علی جوہر کا شہرۂ آفاق انگریزی هفتنامہ "کامریڈ" مولانا ابوالکلام آزاد کا انقلاب آفریں جریدہ "الہلال" اور ان کے بعد مولانا ظفر علی خاں کا ہنگامہ آرا اخبار "زمیندار" ترکوں کی حمایت کے لئے وقف تھے۔ اس قسم کی نظمیں :-

بلقان چلو، بلقان چلو

اور

کہ رہا ہے اب شمشیر زار انگورہ چلو

بہت مقبول تھیں، اور ہندوستانی مسلمان اپنے ترک بھائیوں کی حمایت میں جوش سے لبریز تھے، ہر طرف اسلامی اخوت کی بجلی رو رواں دواں! ایثار و اخوت کا یہ عالم کہ ہندوستانی مسلمانوں کو اپنی آزادی سے زیادہ ترکوں کی آزادی عزیز تھی، اور وہ اس دینی جذبہ کے تحت کہ صدیوں تک آلِ عثمان کی تلواروں نے اسلام اور ملّت کی حفاظت کی تھی اور ہر محاذ پر معاندین اسلام کو نیچا دکھایا تھا۔

رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر ترکی خلافت کی خاطر وفد لے کر انگلستان تشریف لے گئے، برطانوی شہنشاہیت کے عروج و شباب کا یہ وہ زمانہ تھا کہ بڑی بڑی حکومتیں برطانیہ کے چشم و ابرو کے اشاروں پر چلتی تھیں، مگر ہندوستانی مسلمانوں کے اس وفد نے ترکی کی حمایت میں انگلستان جاکر اُن خیالات کا اظہار کیا، جن کی براہِ راست زد برطانیہ کی پالیسی پر پڑتی تھی، دینی اخوت نے عواقب سے بے پروا ہو کر اس ایمانی جرأت کا مظاہرہ کیا! ترکی کو ہندوستان کے مسلمانوں نے طبی وفود بھیجے "سمرنا فنڈ" اس جوش و خروش کے ساتھ قائم ہوا کہ ہندوستان کے طول و عرض میں ایک ہل چل پیدا ہو گئی! فلسطین کا مسئلہ سامنے آیا تو سید امین الحسینی مفتی اعظم فلسطین ہندوستان تشریف لائے اور یہاں کے مسلمانوں نے اُن کی بڑی پذیرائی کی! — شریف حسین اور سلطان ابن سعود کے درمیان آویزش ہوئی، تو حجازِ مقدس کے عقدہ کو سلجھانے کے لئے متحدہ ہندوستان کے مسلمانوں نے امکانی جدوجہد کی! غلامی کے زمانے میں ہمارا یہ عالم تھا کہ دنیا کے کسی گوشہ میں بھی کسی مسلمان کے پاؤں میں

کانٹا چبھتا تھا تو اس کی خلش ہم محسوس کرتے تھے ! اور ہر مسلمان ملک کا مسئلہ گویا ہمارا مسئلہ ہوتا تھا۔

وہ انگریز کی غلامی کا دور تھا، پاکستان بننے کے بعد ہم اللہ تعالیٰ کے فضل سے آزاد ہو گئے، تدبیر و تقدیر اور تعمیر و ترقی کی زمام ہمارے اپنے ہاتھوں میں آگئی، دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت کے مالک و مختار! حکومتوں سے جنگ و صلح کے تمام اختیارات ہمیں مل گئے! اور وہ تلوار بھی ہمارے قبضہ میں آگئی، کہ جب قرطاس و قلم بیکار ہو جاتے ہیں تو لوگ شمشیر سے سیاسی عقدے وا ہوتے ہیں!

حقائق

اس تمہید کے بعد ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں نزاع و تصادم اور حرب و ضرب کے مقابلہ میں "امن" بہر حال اچھی چیز ہے! ہر انسان کو طبعاً امن پسند اور صلح دوست ہونا چاہئے! پاکستان اور ہندوستان ہمسایہ ملک۔ اور ہمسایہ ..... ملکتیں ہیں، یہاں کے رہنے والے صدیوں ایک وطن کے باشندے ہونے کی حیثیت سے ساتھ ساتھ رہے ہیں، اس لئے دونوں ملکوں کی اسی میں بھلائی ہے کہ ان کے تعلقات خوش گوار ہوں۔ اور دونوں ملک ایک دوسرے کے حق ہمسائیگی کا پاس و لحاظ کریں، پڑوسیوں میں کبھی کبھار جھگڑا بھی ہو جاتا ہے اور پھر صلح و صفائی ہو کر تلخیاں دور بھی ہو جاتی ہیں!

اس حقیقت کا ہم کھلے دل سے اعتراف کرتے ہیں کہ ہندوستان میں سبھی لوگ جن سنگھی اور مہا سبھائی نہیں ہیں۔ وہاں جے پرکاش نرائن، راج گوپال اچاریہ اور ونوبھاوے جیسے دھرماتما نیتا بھی پائے جاتے ہیں جو انسانی بھائی چارے کے بہت بڑے حامی اور مبلغ ہیں اور ہندوستان کے مسلمانوں کو سکھی دیکھنا چاہتے ہیں، مہاتما گاندھی کی اس قربانی کو نہیں بھلایا جا سکتا کہ بھارت کے پریشان حال مسلمانوں کی حمایت ہی کے جرم میں انہیں گولی کا نشانہ بننا پڑا، ہندوستان میں اس ذہنیت کے ہندو بھی پائے جاتے ہیں جو اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے تمدن و تہذیب نے بھارت کو نکھار اور سنوار دیا ہے، ہزاروں لاکھوں ہندو اور سکھ اہلِ قلم اور ارباب ذوق اردو زبان کے دل و جان سے شیدائی ہیں! ہمیں ذاتی طور پر اس کا تجربہ ہے کہ مدراس اور بمبئی میں دنیا کا مرحلہ بڑی آسانی سے طے ہو گیا، اور ہمارا مسلمان اور پاکستانی ہونا اس راہ میں رکاوٹ نہیں بنا، عوامی اور جمہوری حکومت کی یہ کرامت ہے کہ بھارت میں مسلمانوں کے اخبار وہاں کی حکومت پر بڑی آزادی اور جرأت کے ساتھ تنقید کرتے ہیں! فریضۂ حج کی ادائیگی کیلئے جتنی سہولتیں ہندوستانی مسلمانوں کو حاصل ہیں، اتنی سہولتیں پاکستان میں میسر نہیں ہیں!

مگر

اس تصویر کا دوسرا رخ یہ بھی ہے کہ تقسیم ہند کے بعد بھارت کے معاشرے اور حکومت پر مہا سبھائی اور جن سنگھی ذہنیت مسلط ہوتی اور چھاتی چلی گئی، ایسا محسوس ہونے لگا کہ ہزاروں تو نچلے اور لاکھوں سادہ گر جواب تک چھپے بیٹھے تھے، ایکا ایکی منظرِ عام پر آگئے ہیں، سردار پٹیل آنجہانی کے اثر و اقتدار نے اس مسلم دشمن ذہنیت کو پوری طرح غذا پہونچائی یہاں تک کہ راجندر پرشاد جیسے کانگریسی نیتا بھی مسلم اقلیت کے معاملے میں بے پروا بن گئے، پنڈت جواہر لال نہرو کو جن سنگھی مزاج اور مہا سبھائی ذہنیت سے کوئی مناسبت اور دلچسپی نہ تھی، ان کی مجبوری کا یہ عالم تھا کہ اردو زبان کے وہ انتہائی مداح اور ہمدرد و خیر خواہ ہوتے ہوئے بھی عملاً وہ اس کے لئے کچھ نہ کر سکے۔

یہ واقعہ ہے کہ بھارت میں مسلمانوں پر معیشت و روزگار کی راہیں جان کر تنگ کی گئی ہیں، خاص طور سے سرکاری محکموں میں ان کی تعداد تناسب آبادی کے لحاظ سے تیزی کے ساتھ گھٹتی چلی جا رہی ہے ــــ حکومت اور سنٹرل کے صوبہ سے اردو زبان کو صرف اس لئے دیس نکالا دیا گیا ہے کہ یہ مسلمانوں کی زبان ہے! تعلیمات کے نصاب میں اس قسم کے افکار و خیالات کو سمویا گیا ہے۔ جن سے اسلام اور سلطنتِ اسلامیہ کے بارے میں نفرت و حقارت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں، اسلامی روایات و معتقدات کو بگاڑ کر پیش کیا گیا ہے۔

ان کتابوں کو پڑھ کر ہندوستانی مسلمانوں کی نئی پود اپنے مذہب کے بارے میں بدگمان ہو جائے گی اور کہیں کہیں اس "ذہنی شدھی" کے آثار نمایاں بھی ہونے لگے ہیں!

تقسیم ہند کے بعد سے اب تک ہندوستان کے طول و عرض میں مسلمانوں کو قتل و غارت گری بے آبروئی، عصمت دری اور خون اور آنسوؤں کے جن دردناک سانحوں سے گزرنا پڑا ہے، اُن کا کوئی شمار و حساب نہیں، مسلمانوں کو کاٹنے، تباہ و برباد کرنے اور انہیں خوف زدہ، بزدل اور کم ہمت بنانے کے لئے سوچی سمجھی اسکیم کے تحت کام ہوتا ہے اور ہر سال کہیں نہ کہیں جبل پور، رانچی، علی گڑھ، سنبھل، مرادآباد، بڑودہ، روڑکیلا اور جمشید پور کا کوئی نہ کوئی مقتل مسلمانوں کے لئے تیار ہو جاتا ہے! پولیس جو عوام کے جان و مال اور عزت و آبرو کی محافظ ہے - وہ قاتلوں اور لٹیروں کی ہر طرح سے پشت پناہی کرتی ہے اور عدالتیں جن سے انصاف کی توقع کی جاتی ہے وہاں ان قاتلوں، ظالموں اور غارت گروں کو عام طور پر بری کر دیا جاتا ہے۔

ہر مہذب حکومت میں ایک "شہری" کی شخصیت بڑی اہمیت رکھتی ہے، مگر یہ ظلم ہندوستان ہی میں دیکھنے میں آیا کہ لاکھوں مسلمانوں کو زبردستی پاکستان کی سرحد میں دھکیل دیا گیا اس ظلم و شرارت کا مقصد یہ کہ ایک طرف ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد میں کمی واقع ہو جائے، دوسری طرف پاکستان کی معاشیات کو لاکھوں آدمیوں کا بار اُٹھانا پڑے! یہ صورتِ حال بین الاقوامی قانون کی کھلی ہوئی خلاف ورزی ہے! مگر وہ جو پرانی کہاوت ہے کہ زبردست مارے اور رونے نہ دے ——— یہی صورت اس قسم کے ظالمانہ سانحوں میں پیش آرہی ہے!

رواداری اور امن و دوستی کے نام پر ان زخموں سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا، اور جو کوئی رواداری کی اس انتہا تک پہونچا ہوا ہے! اُس کے اندر دینی غیرت باقی نہیں رہی، صلح و صفائی اور امن و دوستی کے اعلان اور معاہدوں کو عملاً کامیابی اُسی وقت میسر آ سکتی ہے جب کہ طرفین کی جانب سے میلان اور جھکاؤ نظر آئے، تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجا کرتی! اعلانِ تاشقند کے بعد ہی ہندوستان میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں کھلے خزانے ڈنکے کی چوٹ اس کا اعلان کیا گیا ہے کہ ہندوستان کی تقسیم تو عارضی تھی، اسے ہمیشہ کے لئے خوش دلی کے ساتھ قبول نہیں کیا گیا، پاک و ہند کی تقسیم کی اس لکیر کو مٹ جانا چاہئے پاکستان اور ہندوستان کے ایک ہو جانے ہی سے ایشیا میں امن قائم ہو سکے گا! اس کے بعد راشٹریہ سیوک سنگھ نے اس خطرناک فتنہ کی طرح ڈالی ہے کہ —

"جب تک مسلمان عورتوں کو پردے سے باہر نہیں لایا جائے گا، مسلمان مرد، مہذب عورتوں کے لئے خطرہ بنے رہیں گے" (ہفت روزہ لکھنؤ)

کیا یہ دوستی کی باتیں ہیں! صلح و امن چاہنے والے کیا ایسے فتنے کھڑے کیا کرتے ہیں؟ ——— ہم اوپر تفصیل سے بتا چکے ہیں کہ انگریز کی غلامی کے دور میں ہم نے دوسرے ملکوں کے مسلمانوں کی مظلومیت اور پریشان حالی پر احتجاج اور اُن کی ہر امکانی مدد کی ہے ——— دُنیا کی سب سے بڑی آزاد مسلم حکومت کے مالک و مختار ہوتے ہوئے ہم ایسے بے دست و پا ہو گئے ہیں کہ اس ظلم و ستم کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے! کیا قیامت کے دن ہم سے اس غفلت کی باز پُرس نہ ہو گی! کیا اُس دن روس، امریکہ، برطانیہ اور بھارت "اعلانِ تاشقند" کے نام پر ہماری وکالت کر سکیں گے۔

پاکستان اور ہندوستان کی حالیہ جنگ کی تفصیل اور اُس کے محرکات، دواعیات اور عواقب کے ذکر سے ہم بہ قصد؟ گریز کرتے ہیں، اس سلسلہ میں صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ اس جنگ کا اصل محرک "مسئلہ کشمیر" تھا! ہندوستان اور سکیورٹی کونسل نے کشمیر میں "استصوابِ رائے عامہ" کے اصول اور شرط کو مان لیا ہے، اس لئے ہندوستان جس شرط کو تسلیم کر چکا ہے اُس کا ایفاء

کہنا چاہئے !

وعدہ کرتے ہو مگر وعدہ وفا ہوتا نہیں
میری قسمت تم سے اپنا بھی کہا ہوتا نہیں

اعلانِ تاشقند میں مسئلہ کشمیر کے تصفیہ کی نہ کوئی ضمانت دی گئی ہے اور "ضمانت" کیسی، ایک حرف بھی اس بارے میں نہیں کہا گیا، پھر فریق ثانی یعنی ہندوستان اس کا بار بار اعلان کر چکا ہے، کہ کشمیر بھارت کا اٹوٹ انگ ہے، اس مسئلہ پر ہم بات چیت کرنے کے لئے ہی سرے سے تیار نہیں ہیں، اس صورت میں جو مسئلہ بنائے نزاع تھا، وہ بدستور اسی طرح موجود ہے۔ اس کے تصفیہ کے لئے راہ اسی وقت ہموار ہو سکتی تھی کہ جنگ بندی اور فوجوں کی واپسی مشروط ہوتی !

ہندوستان کے اربابِ اقتدار کھلے بندوں اعلان کر رہے ہیں کہ اعلان تاشقند سے مسئلہ کشمیر کا کوئی واسطہ ہی نہیں ہے — اور پاکستان کے ارباب کا سکی خوش فہمی کا یہ عالم ہے کہ وہ اس اعلان سے تصفیہ کشمیر کی توقع رکھتے ہیں ! یہ سیاسی تاریخ کا ایک اعجوبہ ! جب فریق ثانی مسئلہ کشمیر کی ذراسی ذمہ داری بھی اپنے سر لینے کے لئے تیار نہیں ہے، یہاں تک کہ اس مسئلہ پر گفتگو تک کرنا بھی چاہتا تو پھر اس "خوش فہمی" کو آخر کیا نام دیا جائے ! یہ صورتِ حال کس قدر اضطراب انگیز اور تکلیف دہ ہے ! کسی ملک کی سیاست کو ایسے عجیب و غریب مرحلے سے شاید ہی سابقہ پڑا ہو !

مصر اور اخوان

جمال ناصر اور اخوان المسلمون کے حالات کے تمام رخ منظرِ عام پر آچکے ہیں، جن اہل قلم پر اس مسئلہ میں ذہول طاری ہو گیا تھا، جس کے سبب اُن کے قلم نے جمال ناصر کی مدح اور اخوان پر طنز و تعریض کی، اُن کو اپنے اس ذہول و لغزش کی اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرنی چاہئے ! عرب دنیا کی اتنی منظم دینی تحریک کو جس ظلم و ستم کے ساتھ تباہ و برباد کیا گیا ہے، وہ دین و اخلاق بلکہ انسانیت کی درد انگیز ٹریجڈی ہے اخوان کی تباہی کا، خونیں ڈرامہ مصر میں کھیلا جا رہا ہے اور اُن پر مختلف قسم کے الزامات لگا کر جیل خانہ سے لے کر پھانسی کے تختہ تک ہر عقوبت اور مصیبت میں وہ مبتلا کئے جا رہے ہیں۔

اتحادِ امت کے لئے اسلامی اخوت کے نام پر جو تحریک حجاز مقدس سے اٹھی ہے وہ بھی جمال عبدالناصر کو پسند نہیں ہے۔ انہوں نے فرمایا ہے :—

".. یہ عرب ملکوں میں ترقی پسند تحریکوں کے خلاف سامراجیوں کی ایک اور سازش ہے اور اسلامی معاہدہ کا یہ تصور نیا نہیں ہے، ہم پہلے ہی ایسی سازشیں دیکھ چکے ہیں"

اسلامی اخوت اور ملت اسلامیہ کے اتحاد کے بارے میں یہودی بھی اسی قسم کے جذبات رکھتے ہیں، اور اُن پر بھی یہ تحریک گراں اور شاق گزرتی ہے !

نائیجیریا میں احمد بن بیلو کی شہادت عالم اسلام کا ناقابل تلافی نقصان ہے، یہ شخص اپنی جامعیت، اسلامی فکر و جوش اور دینی غیرت میں ایک امت کی برابر تھا۔ مگر برطانیہ اور اسرائیل کی طرح متحدہ عرب جمہوریہ بھی ان سے ناخوش تھی، مولانا عبدالمنعم سرخس ندوی اپنے مکتوب میں لکھتے ہیں :—

".. الحاج احمد، نائیجیریا ہی نہیں بلکہ پورے افریقی براعظم میں اسلام کے مبلغ تھے، ۹ فٹ

کا بلند قامت چوڑا چکلا سینہ رکھنے والا مردِ مومن تنہا یہود ویلی کے سیلاب کے سامنے ایک بند کا کام کر رہا تھا، ان سے انگریز ناراض تھے، کہ یہ اسلام کا داعی اور اسلامی تمدن کے مبلغ ہیں، یہود اس لئے خفا تھے، کہ اسرائیلی نفوذ کو اپنے ملک میں بڑھنے نہیں دے رہے تھے، عبدالناصر کے ہنوا اس لئے جلتے تھے کہ یہ کھلم کھلا اسلامی اتحاد کے داعی تھے "

اور سنئے

"جکارتہ متحدہ عرب ۲ جمعرات۔ کل یہاں الزمبل کے عظیم مندروں کی تعمیر شروع ہوئی، مصر کے وزیر نے صدر ناصر کی طرف سے دو پتھر مندر کی بنیاد میں رکھے، ان دو چٹانوں پر مصر کے چار قدیم دیوتاؤں کی مورتیاں بنی ہوئی تھیں، ان دونوں مورتیوں کے نیچے وزیر یاسین نے دو نسخے قرآن کے رکھے اور دو نسخے مصر کے قومی دستور کے ......"

مورتیوں اور بتوں کے نیچے قرآن کریم کے نسخے .... !

؎ آسماں راحق بود گر خوں بیارد بر زمیں

خدا کی قسم ہم بے حس اور بے غیرت ہوگئے ہیں، ورنہ تنہا یہی روح فرسا خبر انگاروں پر لٹا دینے کے لئے کافی ہے!!

مصر میں حکومت کی طاقت کے زور سے جمال ناصر صاحب کے مناقب کی شہنائیاں بج رہی ہیں، اخبارات انھیں "مصر کا نجات دہندہ" کے لقب سے یاد کرتے ہیں، ریڈیو انہی کی قصیدہ خوانی کرتا ہے، ملک کی آزادی سمٹ سمٹا کر ایک شخص کی مٹھی میں آگئی ہے، اور ستم یہ ہے کہ اس آمریت کو جمہوریت کا نام دے دیا گیا ہے! آہ! آج مصر میں آزادی کتنی کمیاب اور اسلام کس قدر مظلوم ہے۔

مُفکرِ اعظم

صدقِ جدید لکھنؤ میں مولانا حبیب ریحان ندوی بھوپالی کا ایک مکتوب شائع ہوا ہے، جس کے آغاز میں صاحب موصوف نے لکھا ہے کہ مصر میں حفظِ قرآن پر ہزار ہا پونڈ صرف کئے جاتے ہیں اور مصر کے سب سے عظیم قاری شیخ مصطفیٰ اسمٰعیل کو حکومت مصر نے تمغہ دے کر فن تجوید و قرأت کی حوصلہ افزائی کی ہے ـــــ اس تفصیل کے بعد وہ لکھتے ہیں :ـــــ

"... ہم لوگ عید کے دن فضیلۃ الشیخ عبدالحمید الدبیانی شیخ الجامعہ (چانسلر) الاسلامیہ کو عید کی مبارک باد دینے گئے، چند رسمی جملوں کے بعد شیخ نے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی خیریت پوچھی میں نے کہا مجھے پتہ نہیں ان شاء اللہ ٹھیک ہی ہوں گے، وہ تو پاکستان میں رہتے ہیں، کہنے لگے وہ تو در اصل ہندوستانی ہی ہیں، یہ تقسیم تو بعد کو ہوئی ہے اور اسلامی رشتہ سب سے قوی ہے، الغرض ہم لوگ ۴۵ منٹ بیٹھے، جس میں سے ۳۰ منٹ تک مولانا کی تفکیر ان کی تالیفات اور نقطۂ نظر کی تعریف کرتے رہے، کہنے لگے، **ان سے بڑا مفکرِ اسلامی دنیا میں کوئی دوسرا نہیں، دین و دنیا کا جو جامع تصور انہوں نے پیش کیا ہے، وہ کتاب و سنت کے عین مطابق ہے!**

نیز کمیونزم، کیپٹل ازم اور دوسرے اقتصادی نظاموں کے مقابلے میں انہوں نے اسلامی نظامِ اقتصاد کی شرحیں کی ہیں اور وہ قانونِ اسلامی کے محققین کے لئے عالمِ عربی و اسلامی میں مشعلِ راہ کا درجہ رکھتی ہیں۔

ان کی تازہ کتاب "حرکتہ تحدید النسل" برتھ کنٹرول کی تعریف کرتے ہے" "پردہ" اور "سود" کی بھی تعریف کی، کہنے لگے مودودی صاحب کی فکر میں منطقی تسلسل ہے اور پڑھنے والے کو وہ ایک طرف قائل بناتے ہیں اور دوسری طرف اپنی شخصیت کا گرویدہ بھی! میں نے مودودی صاحب کو دیکھا نہیں ہے، میری سب سے بڑی تمنا ہے کہ ان (مولانا مودودی) کو ایک نظر دیکھ لوں۔ اسلامی یونیورسٹی دو دفعہ اُن کو دعوت نامہ ارسال کر چکی ہے کہ وہ لیبیا کی زیارت کریں، لیکن کبھی وہ معروف ہوتے ہیں اور کبھی جیل میں، اس سال بھی دعوت نامہ ارسال کیا ہے۔

- مولانا ئے محترم! شیخ کے ان جملوں سے اس قدر خوشی ہوئی کہ میں بتا نہیں سکتا، یہ تو مجھے پہلے سے جب سے مصر اور عالم عربی میں آیا ہوں، یعنی سات سال سے معلوم ہے کہ مولانا مودودی کی شخصیت دنیائے اسلام میں سرزمین عجم کی سب سے مشہور شخصیت ہے، مولانا کی پچاس (۵۰) اُردو کتابوں کا عربی میں ترجمہ ہو چکا ہے، مصر کی وزارت اوقاف نے ان کی ایک کتاب ایک لاکھ کی تعداد میں چھاپی تھی۔ پچھلے سال سعودی عرب میں ان کی بعض تقریریں اور لبنان سے بعض پمفلٹ ہزاروں کی تعداد میں چھپے تھے، لیبیا کا ہر پڑھا لکھا آدمی مولانا کا عاشق ہے اور ان کی ۵۰ کتابوں کا سیٹ اپنے پاس رکھتا ہے، جس دن مولانا پاکستان میں گرفتار ہوئے تھے تو لیبیا کے ریڈیو اور اخبارات نے حکومت پر سخت تنقیدیں کی تھیں بعض طلبار نے غم کے اثر سے دو دن تک گویا خاموش اسٹرائک کی تھی نیز شام، فلسطین، اردن، سوڈان ہر جگہ مولانا مودودی سب سے عظیم اسلامی کاتب کی حیثیت سے مشہور ہیں ——— لیکن میں نہیں سمجھتا تھا کہ شیخ الجامعہ جیسے عظیم عالم کی بھی یہ رائے ہوگی، حالانکہ اس سے قبل شیخ الازہر شلتوت مرحوم کے نطق مبارک سے بھی تقریباً اسی کے مثل یہ جملے سن چکا تھا ——— بہرحال مجھے انتہائی خوشی ہوئی اور میں نے خدائے پاک کے دربار میں سجدۂ شکر ادا کیا کہ اس نے مودودی صاحب کی شہرت کے ذریعہ پردیس میں ہم لوگوں کی عزت بھی رکھی۔

اس واقعہ کے نقل کرنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ مودودی صاحب کے افکار سے بھی میں مکمل طور پر متفق ہوں یا یہ کہ مودودی صاحب معصوم عن الخطا ہیں، لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ سرزمین ہند کو اس کا دس فیصدی بھی علم نہیں کہ پورے عالم اسلامی میں ایران سے لے کر

مراکش تک اور ترکی سے لے کر سوڈان تک مولانا کا کیا مقام ہے !

اور ہندوستانی و پاکستانی صحافت کو بھی میرا مشورہ ہے' جس کا کام - مولانا" کی تعبیری غلطیاں پیش کرنا ہے کہ وہ کسی تعمیری کام میں اپنا وقت صرف کرے، اسلام اس کا نام نہیں کہ دوسرے کی غلطیاں نکالی جائیں بلکہ دنیا کے سامنے مرض کی تشخیص کیجئے اور علاج پیش کیجئے، کیونکہ مودودی صاحب نے جو مرض تشخیص اور جو علاج پیش کیا ہے، ہندو پاک کے چند علماء کو چھوڑ کر پورے عالم اسلامی نے اس مرض کو مہلک جانا ہے اور اس علاج کو صحیح مانا ہے "

ان بزرگوں کو کیا کہئے جو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تنقیص و تذلیل بلکہ تجہیل و تحقیر کے درپے ہیں اور مولانا موصوف کو "مفتی" لرا اپنے دل کی بھڑاس نکالتے ہیں - اور مطمئن ہو جاتے ہیں کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں دنیا بھی اُسے صحیح تسلیم کر رہی ہے، حالانکہ ایسی اوچھی باتوں سے یہ حضرات خود اپنے وقار کو گرا رہے ہیں -

پاک و ہند کی جنگ کے دوران ایک صاحب نے حکومت کو مشورہ دیا تھا کہ مولانا مودودی کو عرب ممالک میں بھیجنے کی غلطی نہ کی جائے عرب ممالک میں اُن کا اثر یوں ہی سا ہے -- اس مکتوب کو پڑھ کر ان صاحب کا ضمیر کاش ! ندامت محسوس کر سکے -

" فاران " میں مولانا مودودی کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے، اس تعلق خاطر اور اعتراف کا سبب صرف " دینی خیر خواہی " ہے ! اس دور میں اللہ تعالیٰ کے دین کی مدافعت کے لئے مولانا مودودی نے ہر محاذ پر سرفروشانہ جنگ کی ہے، اُن کا قلم ۳۰ سال سے دین کی خدمت کے لئے وقف ہے، اللہ تعالیٰ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لئے انہوں نے قید و بند کی صعوبتیں بھی اٹھائی ہیں، یہاں تک کہ پھانسی کی کال کوٹھری بھی ان کی استقامت میں لچک پیدا نہیں کر سکی ! ہم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ عرب کے صفِ اول کے مشاہیر علماء اور ارباب فکر مولانا مودودی کے بارے میں وہی جذبات اور خیالات رکھتے ہیں جو ہمارے دل و دماغ میں موجزن ہیں، یہ توارد نہیں بلکہ "حسنِ توارد" ہے، اللہ تعالیٰ مودودی صاحب اور دین کے تمام مخلص خدمت گزاروں کو خدمتِ دین کی زیادہ سے زیادہ توفیق عطا فرمائے اور ساتھ ہی معاندین کے شر سے محفوظ رکھے - ثم آمین ؟

ماہر القادری
١٥ مارچ ١٩٦٦ء

محمد نواز (ایم۔ اے)

اسلامی جمہوریت اور حزبِ اختلاف

پاکستان کے نظریاتی استحکام کا انحصار دو باتوں پر ہے :

● پہلی یہ کہ قرآن و سنت کو منبع ہدایت اور اولین ماخذِ قانون تسلیم کیا جائے اور ملک کے دستور میں حاکمیت اور مطلق قرآن و سنت ہی کو حاصل ہو اور

● دوسری یہ کہ ملک میں حکومت کا ڈھانچہ جمہوریت ہی کی بنیاد پر استوار کیا جائے۔ جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے وہ پاکستان میں اب طے شدہ ہے۔ اسے ۵۶ء کے دستور میں بھی تسلیم کیا گیا تھا۔ اور مارشل لاء کے بعد جو دستور نافذ کیا گیا ہے اس میں بھی یہ بات نمایاں طور پر شامل ہے اس بات میں اب کسی قسم کے اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہ ایک طے شدہ بات ہے' اس کے خلاف کوئی شخص کچھ کہنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ صرف اسی ایک بات نے ہمارے ملک کو دارالاسلام کا درجہ دے کر اسے مسجد کی طرح محترم اور مقدس بنا دیا ہے، اس ملک کی ادنٰی سے ادنٰی خدمت سے لے کر اعلیٰ سے اعلیٰ منصب تک کے سارے کام عبادت کی تعریف میں آتے ہیں ——— لہٰذا اس طے شدہ بات کے سلسلے میں مزید گفتگو کرنا تحصیل حاصل ہے!

رہی دوسری بات یعنی ملک کے حکومتی ڈھانچہ کو جمہوریت کے مسلّمہ اور متفق علیہ اصولوں پر استوار کرنا ——— اس سلسلے میں بعض حضرات کے ذہنوں میں خلفشار سا پایا جاتا ہے۔ بالخصوص ہمارے ہاں کے بعض مذہبی لوگ اس مسئلہ میں حد درجہ الجھے ہوئے ہیں۔ یہ نہایت ہی درد انگیز صورت حال ہے کہ جس طبقہ کو سب سے زیادہ آگے بڑھ کر جمہوریت کے فروغ اور اس کی بحالی کے سلسلے میں کوشش کرنی چاہیے تھی وہی دین ہی کے نام پر اس کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرنے کا فریضہ سرانجام دے رہا ہے۔ حالانکہ جمہوریت اسلام سے مختلف چیز ہرگز نہیں بلکہ اسلام کے اجتماعی نظام کا ایک لازمی وصف ہے، کیا کوئی یہ کہنے کی جسارت کرسکتا ہے کہ آزادی، مساوات اور اخوت اسلام کے لازمی اوصاف نہیں ہیں اور کیا کسی کے پاس اس بات کی دلیل ہے کہ حریت فکر اور آزادئ اجتماع اسلام کی تعلیمات سے متصادم ہیں یا اسلام قانون اور عدلیہ کی برتری کے مخالف ہے اور کیا ان کے بنیادی اور اسلامی حقوق کی بحالی کا مطالبہ غیر اسلامی ہے۔

اگر یہ ساری باتیں اسلامی ہیں اور اسلام ہی کے لازمی اوصاف ہیں تو پھر اس جمہوریت کو جو ان ساری باتوں کا جامع عنوان ہے آخر کیونکر غیر اسلامی قرار دیا جا سکتا ہے: کیا خلافتِ راشدہ کا نظام جمہوری نہیں تھا۔ کیا خلیفہ مسلمان رائے عامہ کا نمائندہ نہیں ہوا کرتا تھا، کیا اکابر صحابہ کے معاملات باہمی مشورے سے طے نہیں ہوا کرتے تھے اور کیا خلیفۃ المسلمین اپنی شوریٰ کے مشورے کا پابند نہیں ہوا کرتا تھا اور کیا خلافتِ راشدہ کے نظام میں قانون اور عدلیہ کو برتری حاصل نہیں تھی۔ اگر خلافتِ راشدہ کے نظام میں جمہوریت کی یہ ساری خصوصیات شامل ہیں تو پھر جمہوریت کو خلافتِ راشدہ کا مظہر اور پرتو کیوں نہیں سمجھا جاتا ؟

اتنی واضح اور صاف بات کے باوجود یہ بزرگانِ دین کبھی کہتے ہیں کہ جمہوریت کے ساتھ "اسلامی" کے لفظ کا اضافہ کرنا ایسے
ہے جیسے کمیونزم کے ساتھ "اسلامی" کا لفظ استعمال کیا جائے ــــــ کبھی ارشاد ہوتا ہے کہ اسلام میں حزب اختلاف کا سرے سے
ئی تصور ہی نہیں کبھی فرمایا جاتا ہے کہ ساری امت ایک جسدِ واحد ہے، اس لئے اس کے اندر تجدید واحیائے دین کے نام پر کوئی منظم
عت بنانا تفرقہ پیدا کرنے کے مترادف ہے اور کبھی دورِ حاضر کی جمہوریتوں کے آمرانہ ایڈیشنوں پر واہ واہ اور سبحان اللہ کے
ڈونگرے برسائے جاتے ہیں۔

خدا معلوم یہ ساری باتیں علم و مطالعہ کی کمی کی بنا پر کہی جا رہی ہیں یا کچھ مخصوص محرکات کی بنا پر، وجہ خواہ کچھ بھی ہو، لیکن یہ
طلنطنے سے کہی جاتی ہیں کہ اوسط درجے کا پڑھا لکھا آدمی بھی حیران ہو کر دریافت کرتا ہے کہ آخر ہمارے ان بزرگانِ دین کو کیا
یا ہے؟ جمہوریت کی یہ مخالفت آخر کیوں کی جا رہی ہے۔ کیا واقعۃً غیر جمہوری نظام حکومت ملک و ملت کے لئے آبِ رحمت ہے!
جمہوریت کی راہ روکنے سے دین کو سربلندی اور سرفرازی نصیب ہوگی اور کیا اس سے آخرت میں بھی درجات بلند ہوں گے!

پھر بدقسمتی سے ان مخالفین میں وہ حضرات بھی ہیں جو جماعت اسلامی سے الگ ہوئے ہیں اور جماعت سے الگ ہونے کی بعض
سری وجوہ میں سے ایک اہم اور بنیادی وجہ یہ بھی بتائی گئی تھی کہ جماعت کے "جبری" نظام میں مولانا مودودی کی حیثیت ایک آمر کی ہے۔

ان میں سے بعض حضرات جماعتِ اسلامی اور مولانا مودودی کی مخالفت میں اس حد تک پہونچ گئے ہیں جہاں مخالفت برائے
لفت ہوتی ہے، جیسے کوئی کسی کے درپے آزار ہو جائے! حیرت ہے کہ پندرہ سولہ سال ایک تحریک سے وابستہ رہنے، ایک مقصد اور طریق
کو اپنانے اور اس پر قائم رہنے اور اس کی صداقت کا خدا اور خلقِ خدا کے سامنے حلف اٹھانے کے بعد وہ جماعت سے الگ
ئے اور اس شان اور ادعا کے ساتھ علیحدہ ہوئے کہ جماعت کا مقصد بھی غلط، جماعت کا طریق کار بھی غلط، یہاں تک کہ خود جماعت
ا بھی غلط! جو لوگ برسوں کی رفاقت کے بعد بھی حق کو نہ پہچان سکے، اور سالہا سال زعمِ خویش میں غلط طریق کار کی
ایت کرتے رہے! ان کے بارے میں یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اپنے نئے موقف پر نہ جانے کب تک جمے رہتے ہیں اور
اسے چھوڑ بیٹھتے ہیں! انکے عمل کے اس تلون کا اگر کسی کو مشاہدہ کرنا ہو تو ان بزرگوں میں سے صرف کسی ایک بزرگ کی تحریروں
مطالعہ کرکے دیکھ لیجئے، ان میں نمایاں تضادات ملیں گے، کہیں اقامتِ دین کو ایک اہم فریضہ قرار دیا جا رہا ہے اور
ہیں اسے "خبط" سے تعبیر کیا گیا ہے، کبھی ارشاد ہوتا ہے کہ جماعتی زندگی واجب ہے اور کبھی فتویٰ صادر ہوتا ہے کہ جماعت
ری امت میں فتنہ کے مترادف ہے، کبھی شورائیت کے نقیب اور داعی کی حیثیت اختیار کر لی جاتی ہے تو کبھی جمہوریت کی مخالفت
ہ آمریت کے جواز میں سارا زورِ قلم صرف کر دیا جاتا ہے۔

ان میں سے بعض ہوشیار حضرات براہ راست نصب العین پر حملہ کرنے کے بجائے ان ذرائع اور وسائل کی مخالفت
وع کر دیتے ہیں جو جماعت نے اپنے نصب العین تک پہونچنے کے لئے اختیار کر رکھے ہیں، انہی ذرائع میں سے ایک ذریعہ "انتخابات" کا
۔ اور آج کل کے حالات میں دوسرا ذریعہ جمہوریت کی کامل اور مکمل بحالی کا ہے۔ حالانکہ مقصد جتنا اہم ہوتا ہے اس کے حصول کے
ائع بھی اتنے ہی اہم ہوتے ہیں۔ نماز کا ادا کرنا اگر مقصد ہے تو وضو کرنا، جگہ کا پاک رکھنا، بدن اور کپڑوں کا پاک ہونا، یہ سارے ذرائع
ماز کی تکمیل کا سبب اور ذریعہ بنتے ہیں انتہائی ضروری ہیں۔ پیاس بجھانا اگر مقصد ہے تو اس کے لئے "پانی" کی تلاش اور جستجو کرنا بھی
ض ہے کیونکہ اس کے بغیر پیاس بجھانے کا مقصد پورا ہی نہیں ہو سکتا۔ اگر ملک کا دفاع مقصد ہے اور جہاد یا قتال بھی فرض ہے،
س کے لئے ضروری وسائل اکٹھے کرنا، جنگی ساز و سامان جمع کرنا، تباہ کن ہتھیاروں کا مہیا کرنا بھی تو اتنا ہی فرض ہے اگر آپ یہ

سمجھتے ہیں کہ ملک کی اجتماعی زندگی پر خدا کا دین غالب اور حکمران ہو، اور یہ مقصد ملک وملت کے دنیاوی مفاد کے نقطۂ نگاہ سے بھی اور خود اپنی آخرت کی کامیابی کے خیال سے بھی ـــــ آپ کے نزدیک کسی درجہ کی بھی اہمیت کا حامل ہے تو اس مقصد کے حصول کا واحد ذریعہ جمہوریت کی کامل اور مکمل بحالی ہے اگر جمہوریت بحال نہیں ہوتی تو غلبۂ دین کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ اپنی قدرتِ کاملہ سے کوئی معجزہ صادر فرما دے تو بات دوسری ہے ورنہ جہاں تک تاریخی تجربات اور انسانی سوجھ کا تعلق ہے ان کا فیصلہ یہی ہے کہ جمہوریت کی کامل اور مکمل بحالی ہی وہ لازمی اور ضروری ذریعہ ہے جس کی مدد سے خدا کا دین اس ملک میں حکمران بن سکتا ہے، جو شخص جمہوریت کی راہ میں حائل ہوتا ہے وہ خواہ علم وتقویٰ کے کتنے ہی اونچے بُرج پر کیوں نہ بیٹھا ہو وہ دراصل خدا کے دین ہی کے غلبہ کی راہ کا سنگِ گراں ہے۔

سردست اس بحث کو جانے دیجئے کہ جمہوریت کا پارلیمانی نظام ہمارا مفید مطلب ہے یا اس کا صدارتی نظام۔ اس بحث کو اس سے زیادہ کوئی اہمیت حاصل نہیں کہ ایک شخص لاہور جانے کے لئے یہ فیصلہ کرے کہ کراچی سے لاہور جانے والی گاڑیوں میں کس گاڑی میں سفر کرنا چاہئے، پسنجر ٹرین سے جو لاہور تاخیر سے پہونچتی ہے یا خیبر میل اور تیز گام کے ذریعے جو لاہور جلد پہونچاتی ہیں۔ اس میں اختلاف رائے ... ممکن ہے ـــــ لیکن اس بات میں ہرگز اختلاف رائے نہیں ہونا چاہئے کہ سرے سے لاہور جانے والی گاڑی ہی پر سفر نہ کیا جائے بلکہ گھر بیٹھ کر، آنکھیں بند کرکے صرف "لاہور، لاہور" کی تسبیحیں گھماتے رہیں اور یہ توقع رکھیں کہ کہیں سے کوئی غیبی ہاتھ نمودار ہو کر معجزانہ طور پر پہونچا دے گا۔

جمہوریت!! جماعت اسلامی کے نزدیک "جمہوریت" کی بحالی ہی وہ گاڑی ہے جسے ذریعہ بنا کر اسلامی نظام کے غلبہ کی منزل مقصود تک پہونچا جا سکتا ہے۔ پارلیمانی نظام اس منزل تک پہونچنے کے لئے ایک تیز رفتار ذریعہ ہے اور جمہوریت کا صدارتی نظام بھی منزل تک پہونچانے کا ایک صحیح ذریعہ ہے بشرطیکہ جمہوریت ہی کا صدارتی نظام ہو اور یہ بقول علامہ اقبال "آمریت کا دیو استبداد، جمہوری قبا میں" پائے کوب" نہ ہو۔

جس جمہوریت کی بحالی کے مطالبہ کی تائید کی سعادت جماعت اسلامی کو حاصل ہے، اس کا سیدھا سادھا مفہوم امیر جماعت کے الفاظ میں حسب ذیل ہے:۔

> " ملک کسی خاص شخص یا طبقہ اور گروہ کا نہیں بلکہ ان تمام لوگوں کا ہے جو اس میں رہتے ہیں، لہٰذا اس کا انتظام ان سب کی یا کم از کم ان کی اکثریت کی مرضی کے مطابق چلنا چاہئے اور اس کو اصولاً یہ حق، اور عملاً یہ موقع حاصل ہونا چاہئے کہ اپنے حکمران اپنی آزاد مرضی سے چنیں اور اپنی آزاد مرضی ہی سے ان کو تبدیل کر سکیں۔ اس تصور کو عملی جامہ پہنانے کی بہت سی شکلیں دنیا میں اختیار کی گئی ہیں اور بہت سی نئی شکلیں بھی ہو سکتی ہیں، بحث اس کی خاص شکل میں نہیں بلکہ اس امر میں ہے کہ جو شکل بھی یہاں اختیار کی جاتی ہے، اس میں جمہوریت کی یہ حقیقت فی الواقع موجود ہوتی ہے یا نہیں اگر یہاں کوئی ایسا نظام قائم کر دیا جائے جس میں باشندگان ملک کی نہیں بلکہ کسی خاص طبقے کی مرضی کو غلبہ حاصل ہو تو خواہ اس پر کتنے جلی حروف میں "جمہوریت" کا سرعنوان لکھ دیا جائے اس پر عام لوگوں کو مطمئن ہونا اور مطمئن رہنا بہرحال ممکن نہیں اور نہ یہ ممکن ہے کہ اسے کامیابی کے ساتھ چلانے کے لئے سب یا اکثر بندوں کا دلی تعاون حاصل ہو سکے۔ ایسے نظام سے

اگر دلچسپی ہو سکتی ہے تو اس طبقہ کو ہو سکتی ہے جس کی مرضی اس میں غالب ہو اور ایک محدود طبقے کی دلچسپی صرف یہ کہ کسی ملک کی فلاح و بہبود کی ضامن نہیں ہو سکتی بلکہ اس کی عین فطرت میں یہ چیز شامل ہے کہ وہ رفتہ رفتہ عام لوگوں کی دلچسپی کی ضد ہوتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ یہ تضاد ایک کشمکش میں تبدیل ہو کر رہتا ہے اس نقصان دہ صورت حال میں مبتلا ہونے سے ملک کو بچانا ضروری ہے اور اس کی صورت صرف یہ ہے کہ تمام وہ لوگ جو ملک کے آئندہ نظام کی تشکیل پر اثر انداز ہو سکتے ہیں پہلے جمہوریت کے اصول کو صدق دل سے قبول کر لیں اور پھر نیک نیتی کے ساتھ ایسا نظام بنائیں جس میں یہ اصول ٹھیک ٹھیک کارفرما ہو" (ترجمان القرآن - اشارات اگست ۵۵ء)

اس کی مزید تشریح ان الفاظ میں کی گئی ہے :-

"جمہوریت کے متعلق میں بارہا اپنی تحریروں اور تقریروں میں یہ بات اچھی طرح واضح کر چکا ہوں کہ اسلام میں جمہوریت کا جوہر موجود ہے مگر جمہوریت کے اسلامی تصور اور جمہوریت کے مغربی تصورات میں بڑا فرق ہے - اسلام عوام کی لامحدود حاکمیت کا قائل نہیں ہے، بلکہ خدا کی حاکمیت کے تحت عمومی خلافت کا قائل ہے - اس عمومی خلافت کے اختیارات چونکہ کسی شخص یا خاندان یا گروہ میں مرکوز نہیں ہوتے بلکہ بہ حیثیت مجموعی پوری ملت کو حاصل ہوتے ہیں اور وہی اس کا مجاز ہے کہ جس کو چاہے ان اختیارات کے استعمال کے لئے منتخب کرے - اس لئے شخصی اور گروہی حکومت سے ممتاز کرنے کے لئے اسلام کے طرز حکومت کو جمہوری حکومت کہا جا سکتا ہے یہی اسلام کا مخصوص تصور جمہوریت ہے - یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ دنیا بھر میں جمہوریت کا ایک ہی معروف اور متفق علیہ تصور رائج ہے - مغرب میں بھی جمہوریت کے مختلف تصورات ہیں - مثلاً سرمایہ دارانہ جمہوریت، اشتراکی جمہوریت وغیرہ موجود ہیں - ان کے بالمقابل اسلام کے طرز حکومت کو اسلامی جمہوریت کا نام دیا جا سکتا ہے اسی اسلامی جمہوریت کو میں نے تھیوڈیماکریسی کے نام سے تعبیر کیا ہے اس اصطلاح سے بھی مراد جمہوریت ہی کی قسم ہے، جو اسلامی اصولوں پر مبنی ہے" (ترجمان القرآن فروری ۵۶ء ص ۲۶ تا ۲۷)

اسلامی جمہوریت کے اس تصور کی مزید وضاحت اپریل ۶۴ء کے "ترجمان" میں ان الفاظ کے ساتھ کی گئی ہے :-

"جب یہ حقیقت مسلم ہے کہ اسلام کا نظام بادشاہت، آمریت، یا محدود مذہبی طبقے کے تسلط کا متحمل نہیں ہے بلکہ وہ اصول شورائیت پر کام کرتا ہے یعنی اصحاب امر کے انتخاب، تفویض فرائض اور تصفیہ امور میں مسلم سوسائٹی کو باہمی مشورے پر انحصار کرنا چاہئے اور نصوص کی تعبیر اور اجتہاد رائے میں اسلام کے مفاد کے ساتھ عامۃ المسلمین کے مفاد و مصالح کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی نظام کے ان خواص کو موجودہ دور کی زبان اور ذہنی فضا کے لحاظ سے کس طرح بیان کیا جائے - ایک شکل نئی اصطلاح وضع کرنے کی ہو سکتی ہے مگر یہ اس صورت میں درست ہوتی جب کہ نئی اصطلاح پہلے سے وضع ہو کر دنیا میں خصوصاً پاکستان میں اپنے مفہوم خاص کے ساتھ جانی جا چکی ہوتی - ایسا نہیں ہوا - پھر دوسری شکل یہ رہ جاتی ہے کہ مروجہ الفاظ کو فرق کی احتیاط

کے ساتھ استعمال کیا جائے اور یہی دوسری شکل پاکستان میں اختیار کی گئی ہے "جمہوریہ اسلامیہ" کے الفاظ جمہوریت کو دو اقسام میں بانٹ دیتے ہیں ـــــ ایک اسلامی دوسرے غیر اسلامی ـــــ اور پھر یہ الفاظ پاکستان کے لئے جمہوریت کی اس خالص شکل کو پیش کرتے ہیں جو اسلامی ہے"

(ترجمان القرآن اپریل ۱۹۵۰ء ص ۵۸)

اسلامی جمہوریت کی نمایاں خصوصیات حسب ذیل ہیں :ـــ

- اقتدار اعلیٰ اور حاکمیت مطلق اللہ تعالیٰ کا حق ہے اور مسلمان جمہور اللہ تعالیٰ ہی کی مرضی کو نافذ کرنے کے پابند ہیں نصرکا بنیادی اصول حکم اللہ علی الناس بالناس بالحق ہے۔
- ریاست کے تینوں شعبے ـــــ انتظامیہ، عدلیہ، مقننہ ـ ـــــ ـــــ کا دائرہ اختیار واضح طور پر الگ ہونا۔
- شہری آزادیوں اور بنیادی حقوق کی ضمانت اور عدلیہ کا ان کے تحفظ پر قادر ہونا۔
- انتخابات کی آزادی اور اس کی حفاظت کے لئے ایسی قانونی اور انتظامی تدابیر جن سے یہ اطمینان ہو سکے کہ انتخابات نتائج فی الحقیقت رائے عام کے مطابق نکل سکیں گے۔
- قانون کی حکمرانی یعنی یہ امر کہ راعی اور رعایا کے لئے ایک ہی قانون ہو اور سب اس کے پابند ہوں اور عدالتوں کو یہ ہو کہ یہ سب پر بے لاگ طریقے سے وہ اس کو نافذ کر سکیں۔
- ملازمین حکومت کا خواہ وہ سول سروس سے تعلق رکھتے ہوں یا فوج سے سیاست میں دخیل نہ ہونا اور اس ہیئت ہ کی اطاعت قبول کرنا جسے باشندوں کی اکثریت آئینی طریقے پر ملک کا اقتدار سونپ دے۔

یہ سارے اصول ایک جمہوری نظام کے ایسے لوازم ہیں کہ اگر ان میں سے کسی ایک کو بھی ساقط کر دیا جائے یا ساقط نہ بھی ں ہی کر دیا جائے تو جمہوریت بے معنی ہو جاتی ہے اور پھر وہی خرابیاں ظاہر ہو کر رہتی ہیں جو کسی نہ کسی نوع کی بے نقاب یا نقاب پوش یت سے رونما ہوا کرتی ہیں۔ (ترجمان القرآن اگست ۱۹۵۵ء صـ۶)

جمہوریت کا یہی وہ تصور ہے جس کے فروغ اور جس کی بحالی کے لئے کوششیں کی جا رہی ہیں۔ فرمائیے اس تصور میں کونسا پہلو ہے ین اسلام شریعت کے نقطۂ نگاہ سے ناقابل قبول ہے۔

جو بزرگان دین فرماتے ہیں کہ جمہوریت کے اس تصور کو "اسلامی" نہیں کہا جاسکتا اگر ان کی اس بات کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر یہ تسلیم ے گا کہ ریاست پاکستان کا نام "اسلامی جمہوریہ پاکستان" ـ ـ ـــــ بھی غلط ہے۔ آخر وہ کیا وجہ تھی کہ ہمارے ملک کے علماء کے ایک قابل احترام گروہ نے جمہوریہ پاکستان کے ساتھ "اسلامی" کے لفظ کا اضافہ کیا تھا۔

اس کے علاوہ اعتراض کرنے والے حضرات میں سے اکثر جمہوریت کی مختلف اصطلاحات اور ان کے استعمال کے باہمی فرق سے بھی خبر ہیں۔ اس بات کو مولانا مودودی نے ان الفاظ میں واضح فرمایا ہے :ـــ

"واضح رہے کہ اصل نام انگریزی میں "اسلامک ری پبلک آف پاکستان" تجویز کیا گیا۔ ری پبلک کا لفظ جمہوریت کے مقابلہ میں مختلف مفہوم رکھتا ہے۔ جمہوریت کا اطلاق وہاں ہوسکتا ہے جہاں لازماً حاکمیت کا سرچشمہ عوام ہوں اور مجرد عوام کی مرضی اور ان کی خواہشات نظام زندگی کی تشکیل کریں لیکن ری پبلک کے مفہوم کا دائرہ وسیع ہے اس کا اطلاق ایسی ریاست اور ایسے معاشرہ پر بھی ہوسکتا ہے

جس کی بنیاد خدا کی حاکمیت کے تصور پر ہو اور عوام بطور خود صاحب حاکیت نہ ہوں نہ ان کی مرضی اور ان کی خواہشات آخری فیصلہ کن طاقت ہوں۔ لیکن ری پبلک میں اتنی بات ضرور ہوتی ہے، عوام کی رائے اور عوام کے مفاد کو نظام حکومت کے کام کرنے میں دخل حاصل ہوتا ہے ـــــــ چنانچہ یہ لفظ روس اور چین کی ریاستوں کے لئے بھی اختیار کیا گیا ہے۔ (سوشلسٹ سویٹ ری پبلک آف رشیا۔ چائنا) گویا نظام زندگی کی اصولی نوعیت سوشلسٹ کے لفظ میں بیان کی گئی ہے اور اس کے طریق عمل کو لفظ ری پبلک سے واضح کیا گیا ہے۔ اسی طرح یہاں نظام زندگی کی اصولی نوعیت "اسلامک" سے بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی "عوامیت" کے پہلو کو نمایاں کرنے کے لئے لفظ "ری پبلک" اختیار کیا گیا ہے"۔

(ترجمان القرآن اپریل ۶۵ء صفحہ ۵۹)

جو حضرات اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ "اسلامی جمہوریت" کی اصطلاح کا استعمال بالکل ایسا ہے جیسے "اسلامی کمیونزم" کی اصطلاح انہیں اس مسئلہ پر ایک دوسرے زاویہ سے نگاہ ڈال کر سوچنا چاہئے کہ :-

یہ بات متفق علیہ ہے کہ بنکنگ کا موجودہ نظام غیر اسلامی ہے اس کا سارا دارو مدار سود پر ہے لیکن اگر فرض کیجئے کسی وقت اس میں سود کو ختم کر دیا جائے اور اس کے سارے نظام کو مضاربت کے اصول پر منضبط کیا جائے تو کیا پھر بھی بنک کے اس نظام کو "اسلامی" کہنا غلط ہوگا۔ اسی طرح بیمہ کی موجودہ شکل میں جوا اور سود شامل ہے اس لئے اس کے پورے سسٹم کو غیر اسلامی قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن فرض کیجئے اس نظام میں سے بھی قمار اور سود کو ختم کر دیا جاتا ہے اور اسے اسلام ہی کے بتائے ہوئے "معاشرتی تحفظ" یا "کفالت عامہ" کے اصولوں پر استوار کیا جاتا ہے تو کیا اس اصلاح و ترمیم کے بعد بھی اسے غیر اسلامی بیمہ قرار دیں گے اور اگر کوئی شخص ایسے بنک کو "اسلامی بنک" اور ایسے بیمہ کو "اسلامی بیمہ" کہے تو آپ اسے یہ کہہ کر رد کر دیں گے کہ اسلامی بنک اور اسلامی بیمہ کی اصطلاحیں ایسی ہیں جیسے "اسلامی چکلہ" یا "اسلامی شراب خانہ"۔ غور فرمائیے "اسلامی بنک" کی اصطلاح کے ساتھ "اسلامی چکلہ" کی اصطلاح کو کیا نسبت ہے۔ اسی طرح اسلامی جمہوریت کی اصطلاح کا اسلامی کمیونزم" کی اصطلاح کے ساتھ آخر کیا جوڑ ہے۔

جمہوریت کی وہ بے شمار اقسام جو دنیا میں مختلف زمانوں میں رائج رہی ہیں یا آج کل رائج ہیں ان کی خرابی کے بنیادی اسباب صرف تین ہی ہیں۔ پاکستان میں جس جمہوریت کی بحالی کا مطالبہ کیا جاتا ہے وہ ان تینوں اسباب سے پاک ہے، تینوں اسباب کے دور ہو جانے کی وجہ سے جمہوریت کا "مغربی" تصور بھی مسلمان بن جاتا ہے اور وہ اسباب مولانا مودودی کے الفاظ میں یہ ہیں :-

"اول یہ کہ جمہور کو مختار مطلق (SOVEREIGN) فرض کر لیا گیا ہے اور اس بنا پر جمہوریت کو مطلق العنان بنانے کی کوشش کی گئی ہے حالانکہ جب بجائے خود انسان کائنات میں مختار مطلق نہیں ہے تو انسانوں پر مشتمل کوئی جمہور کیسے حاکمیت کا اہل ہو سکتا ہے۔ اسی بنا پر مطلق العنان جمہوریت قائم کرنے کی کوشش آخر کار جس چیز پر ختم ہوتی رہی ہے وہ جمہور پر چند آدمیوں کی عملی حاکمیت ہے اسلام پہلے ہی قدم پر اس کا صحیح علاج کر دیتا ہے وہ جمہوریت کو ایک ایسے بنیادی قانون کا پابند بناتا ہے جو کائنات کے اصل حاکم (SOVEREIGN) نے مقرر کیا ہے اس قانون کی پابندی جمہور اور اس کے سربراہ کار دونوں کو لازماً کرنی پڑتی ہے اور اس بنا پر وہ مطلق العنانی سرے سے پیدا ہی نہیں

ہونے پاتی جو بالآخر جمہوریت کی ناکامی کا سبب بنتی ہے۔

دوم یہ کہ کوئی جمہوریت اس وقت تک نہیں چل سکتی جب تک عوام میں اس کا بوجھ سہارنے کے لائق شعور اور مناسب اخلاق نہ ہوں۔ اسلام اسی لئے عام مسلمانوں کو فرداً فرداً تعلیم اور تربیت پر زور دیتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک ایک فرد مسلمان میں ایمان اور احساس ذمہ داری اور اسلام کے بنیادی احکام اور ان کی پابندی کا ارادہ پیدا ہو۔ یہ چیز جتنی کم ہوگی جمہوریت کی کامیابی کے امکانات کم ہوں گے اور جتنی زیادہ ہوگی امکانات اتنے ہی زیادہ ہوں گے۔

سوم یہ کہ جمہوریت کے کامیابی کے ساتھ چلنے کا انحصار ایک بیدار اور مضبوط رائے عام پر ہے اور اس طرح کی رائے عام اسی وقت تک پیدا ہوتی ہے جب معاشرہ اچھے افراد پر مشتمل ہو، ان افراد کو صالح بنیادوں پر ایک اجتماعی نظام میں منسلک کیا گیا ہو اور اس اجتماعی نظام میں اتنی طاقت موجود ہو کہ برائی اور برے نہ پھل پھول سکیں اور نیکی اور نیک لوگ ہی اس میں ابھر سکیں اسلام نے اس کے لئے بھی ہم کو تمام ضروری ہدایات دے دی ہیں۔

اگر مندرجہ بالا تینوں اسباب فراہم ہو جائیں تو جمہوریت پر عمل درآمد کی مشینری خواہ کسی طرح کی بنائی جائے وہ کامیابی کے ساتھ چل سکتی ہے اور اس مشینری میں کسی جگہ کوئی قباحت محسوس ہو تو اس کی اصلاح کر کے بہتر مشینری بھی بنائی جا سکتی ہے اس کے بعد اصلاح اور ارتقاء کے لئے صرف اتنی بات کافی ہے کہ جمہوریت کو تجربے کا موقع ملے تجربات سے بتدریج ایک ناقص مشینری بہتر اور کامل تر بنتی چلی جائے۔ (ترجمان القرآن جون ۱۹۶۳ء)

یہ ہے جمہوریت کا وہ تصور جس کی بحالی کے لئے ہمارے ملک میں کوششیں کی جا رہی ہیں اور جس کی تائید کا شرف جماعت اسلامی کو بھی حاصل ہے لیکن بعض بزرگان دین اس تصور کو نہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور نہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ جمہوریت کی کوئی قسم "اسلامی" بھی ہو سکتی ہے۔ وہ جمہوریت کے لفظ کے ساتھ "مغربی" کا اپنی طرف سے اضافہ کر کے جماعت اسلامی پر بے تحاشا تبرا کر دیتے ہیں اور لوگوں کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی جاتی ہے کہ جماعت اسلامی گمراہ ہو گئی ہے اور اقامت دین کا نصب العین چھوڑ کر "مغربی" جمہوریت کی داعی اور علمبردار بن کر رہ گئی ہے۔

یہ حضرات جمہوریت کاملہ کی بحالی پر مختلف انداز میں جو اعتراضات وارد کرتے ہیں ان میں سے ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ اسلام میں حزب اختلاف یا حزب احتساب کا کوئی تصور ہی نہیں نہ معلوم ان کے اس نظریہ کا اصل مدعا کیا ہے آیا وہ کسی جمہوری حکومت میں حزب اختلاف کے وجود کو فی الواقع ناجائز سمجھتے ہیں یا اس کی آڑ میں وہ جماعت اسلامی کی دینی حیثیت کو مجروح کرنا چاہتے ہیں کون نہیں جانتا کہ پاکستان میں جماعت اسلامی ہی وہ واحد منظم جماعت ہے جس کے دم قدم سے ملک کی حزب اختلاف کچھ نہ کچھ متحرک ہے۔ یہ مقدس ہستیاں غالباً یہ چاہتی ہیں کہ اپنے علم و تقویٰ کے زور پر حزب اختلاف ہی کے وجود کو غیر اسلامی قرار دے دیا جائے اگر حزب اختلاف کو بلکہ منعقد خلاف اسلام ثابت کر دیا گیا تو جماعت اسلامی کا موقف پھر بآسانی غیر دینی اور خالصتاً سیاسی ثابت کیا جا سکتا ہے۔

قطع نظر اس بات کے کہ اسلام میں حزب اختلاف کا کوئی تصور ہے یا نہیں پہلے اس بات پر غور کر لیا جائے کہ ان علمائے دین اور حاملین شرع متین کی اس بات کو اگر تسلیم کر لیا جائے تو اس کے نتیجے میں اور کون کون سی باتیں لازماً تسلیم کرنی پڑیں گی

حزب اختلاف

● اگر آپ مطلق یہ بات تسلیم کرلیں کہ اسلام کے اندر حزب اختلاف کی اجازت نہیں تو آپ کو یہ بھی...... لازماً تسلیم کرنی پڑے گی کہ نظام خواہ کسی بھی نوعیت کا ہو — غلط ہو یا صحیح — اس سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا۔ غلط نظام کی اصلاح اور اس کے بدلنے کی کوششیں بھی نہیں کی جا سکتیں اور نظام خواہ جبر کا ہو یا استبداد کا اس کے خلاف اجتماعی طور پر آئینی حدود کے اندر رہتے ہوئے صدائے احتجاج بلند کرنا بھی غیر اسلامی فعل ہوگا۔ گویا یہ تصور آپ کو بھکشوؤں اور سادھوؤں کی زندگی بسر کرنے کی تلقین کرتا ہے اور ایک مخصوص اور مختصر مذہبی دائرے کو چھوڑ کر زندگی کے اجتماعی دائرے سے قطعی لاتعلق رہنے کی ترغیب دیتا ہے۔

● اگر آپ یہ بات تسلیم کرلیں کہ حزب اختلاف کا وجود غیر اسلامی ہے تو دوسری بات آپ کو یہ بھی لازماً تسلیم کرنی پڑے گی کہ حکومت کرنے کا حق صرف اور صرف ایک پارٹی، ایک خاندان، یا ایک فرد کو ہے۔ جو اتفاق سے ایک دفعہ کسی نہ کسی طرح اقتدار پر قابض ہوگیا اسے اطمینان سے حکومت کرنے کا لامحدود خدائی حق مل گیا وہ خود خدا بن بیٹھے تو روکنے کا حق کسی کو نہیں، وہ اگر "دین الٰہی" تصنیف کرکے نافذ کرے تو کسی حزب اختلاف کو اس کی راہ میں حائل نہیں ہونا چاہیے وہ آل اولاد پر جبر اور استبداد سے حکومت کرے تو اسے کوئی چیک نہیں کرسکتا، کیونکہ جب حزب اختلاف کا وجود غیر اسلامی ٹھیرا تو اب اسے راہ راست پر لانے، اس کی غلطیوں کا احتساب کرنے اور اگر وہ درست نہ ہو تو آئینی ذرائع سے انتقال اقتدار کے لئے اب کوئی دوسری منظم طاقت تو ملک کے اندر موجود نہیں اگر کوئی طاقت تھی تو اسے ہمارے بزرگان دین نے غیر اسلامی قرار دے دیا ہے۔ ان بزرگان دین کے اس خودساختہ "علم کلام" کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام میں جمہوریت کے علاوہ آمریت، اشتراکیت اور فسطائیت جیسی حکومتوں کو تو جواز کا درجہ حاصل ہو سکتا ہے لیکن جمہوریت کے لئے اسلام کے دروازے بند ہیں کیونکہ ہمارے بعض علماء نے حزب اختلاف کے وجود کو حرام قرار دے دیا ہے۔ حزب اختلاف اگر نہیں ہوگی تو جمہوریت کیا خاک پروان چڑھے گی ——!

● اگر آپ یہ بات تسلیم کرلیں کہ حزب اختلاف کا تصور غیر دینی ہے تو اس کے نتیجے میں آپ کو تیسری بات یہ بھی تسلیم کرنی پڑے گی کہ تاریخ اسلامی میں شاہان بنو امیہ اور بنو عباس سے اسلاف میں سے جن جن بزرگوں نے اختلاف کیا، فرداً فرداً یا اجتماعی طور پر اصلاح اور انقلاب حکومت کی جس جس نوعیت کی بھی جو کوششیں کیں وہ سب غلط تھیں کیونکہ دور حاضر کے ان فقہاء کا فتویٰ ہے کہ اسلام میں حزب اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں۔ ان بزرگان دین کی وہ ساری قربانیاں اور وہ سارے کارنامے جو آج کے تاریک دور کی گھٹا ٹوپ ظلمتوں میں روشنی کے ایک مینار کی حیثیت رکھتے ہیں وہ سب کی سب بے حیثیت ہو کر رہ جائیں گے۔ اسلام کی تاریخ دعوت و عزیمت سے ہم بے تعلق ہو کر رہ جائیں گے اور ہمارے لئے قابل تقلید نمونے یزید، حجاج بن یوسف اور ابن زیاد یا ان کے خوشامدی اور حاشیہ بردار علماء ہی بن کر رہ جائیں گے۔

● اگر آپ یہ بات تسلیم کرلیں کہ حزب اختلاف کا وجود اسلام کے منافی ہے اور یہ تینوں باتیں بھی جو دینی سیاست کے اس نئے فلسفے کا لازمی نتیجہ ہیں آپ تسلیم کرلیں تو ان کے ساتھ ساتھ آپ یہ چوتھی بات بھی لازماً ماننے پر مجبور ہوں گے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا جو ادارہ دین نے قائم کیا ہے اس کا قائم رہنے اور اسے برقرار رکھنے کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف حالات میں جو مختلف نقشہ ہائے کار متعین کرکے دیے ہیں ان پر عمل کرنا بھی ناممکن ہو جائے گا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بگڑے ہوئے نظام کو درست کرنے کے لئے ہاتھ، زبان اور دل کی طاقتوں کو استعمال کرنے کی جو ہدایت فرمائی وہ اس جدید فلسفہ کی رو سے منسوخ العمل سمجھنی پڑے گی۔

یہ ہیں وہ لازمی نتائج جو ہر اس شخص کو لازماً ماننے پڑیں گے جو ہمارے کرم فرماؤں کے اس خودساختہ نظریہ پر ایمان لائے گا ان کے

ساتھ ساتھ ایک عملی نتیجہ یہ بھی برآمد ہوگا کہ تجدید و احیائے دین کی ان ساری مساعی پر پانی پھر جائے گا جو پچھلے چند برسوں سے اس ملک میں سرانجام دی جا رہی ہیں اور آئندہ کے لئے اصلاح اور انقلاب کی جو کوششیں کی جا رہی ہیں وہ بھی ختم ہو جائیں گی کیونکہ حزب اختلاف کے تصور کو جو شخص خلاف اسلام قرار دیتا ہے وہ جمہوریت کے وجود کی نفی کرتا ہے اور جو جمہوریت کے وجود کا مخالف ہے وہ خواہ زبان سے اس کا اظہار کرے یا نہ کرے خواہ اس کی یہ نیت ہو یا نہ ہو، بالارادہ یا بلاارادہ ـــــ وہ اسلامی نظام کے قیام اور اس کے غلبہ سے اس ملک کو اور ملک کے باشندوں کو محروم کرنا چاہتا ہے۔

اب ذرا اس سوال کا جائزہ بھی لے لیا جائے کہ آیا اسلام میں حزب اختلاف کا کوئی تصور ہے بھی یا نہیں اور اگر ہے تو مختلف حالات میں اس پر عمل کرنے کے لئے شریعت نے کیا رہنمائی دی ہے۔

اس موضوع پر حضرت سید اسماعیل شاہ شہید رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "منصب امامت" اور محترم مولانا احسن اصلاحی نے "اسلامی ریاست میں شہریت کے حقوق و فرائض ـ و اطاعت کی شرائط و حدود" ـــ میں اظہار خیال فرمایا ہے۔ ہم ان دونوں بزرگوں کے نقطہ نظر کو مناسب تلخیص کے ساتھ ذیل میں بیان کرتے ہیں۔ جو حضرات اس مسئلہ سے دلچسپی رکھتے ہیں انہیں ہم مشورہ دیں گے اور وہ مندرجہ بالا کتب کا خود بھی مطالعہ کر لیں:۔

مسلمانوں کے چودہ سو سالہ دور حیات پر حکومتوں کی جتنی اقسام مسلط رہی ہیں، ان میں سے سب سے پہلی، سب سے زیادہ بابرکت اور سب سے زیادہ قابل اطاعت حکومت خلافت راشدہ کی حکومت تھی۔ کیا خلافت راشدہ میں، جس کی اطاعت بدل و جان کرنی چاہئے، حزب اختلاف کا وجود تھا اور اگر تھا تو خلفاء راشدین نے اس حزب اختلاف کو کس حد تک گوارا کیا اور اس کے لئے کیا حدود عمل مقرر کیں۔ اس کا جواب مولانا امین احسن اصلاحی نے بالوضاحت دیا ہے ان کی ایک تحریر کے مندرجہ ذیل اقتباسات ملاحظہ فرمائیں:۔

" اسلامی حکومت ان اختلافات کو بھی ایک وسیع حد تک انگیز کرتی ہے جو سیاسی نقطہ نظر کے اختلافات، یا دلیل کی غلطی اور فلسفیانہ طرز فکر سے پیدا ہوا کرتے ہیں۔ خلافت راشدہ کے دور میں ان تمام سیاسی اختلافات کو گوارا کیا گیا جو ظلم و تشدد اور بدامنی پیدا کرنے کی کوششوں (VOILENCE) سے پاک تھے .... سیاسی رواداری کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ خلافت راشدہ کا آغاز ہی انصار و مہاجرین کی دو بڑی پارٹیوں کے امتزاج و ترکیب سے ہوتا ہے۔ انصار کا یہ مطالبہ تھا کہ خلافت کا منصب باری باری انصار و مہاجرین دونوں میں منتقل ہوتا رہے ایک مرتبہ ایک مہاجر خلیفہ ہو دوسری مرتبہ ایک انصاری ــــ مہاجرین نے انصار کے اس مطالبہ سے اختلاف کیا جس سے شدید قسم کی نزاع اٹھ کھڑی ہونے کا اندیشہ پیدا ہو گیا۔ لیکن انصار اور مہاجرین کے بڑے لیڈروں کی دور اندیشی نے بالآخر معاملے کو سلجھا لیا۔ اور حضرت ابوبکر کے ہاتھ پر بیعت ہو گئی صرف خزرج کے لیڈر سعد بن عبادہ حضرت ابوبکر کی بیعت پر راضی نہیں ہوئے اور ان پر قبائلی عصبیت کا ایسا شدید دورہ پڑا کہ انہوں نے حضرت ابوبکر کے پورے زمانہ خلافت میں نہ تو ان کے ہاتھ پر بیعت کی اور نہ ان کی وفات کے بعد حضرت عمر کے ہاتھ پر بیعت کی بلکہ کھلم کھلا پورے نظم اطاعت سے بالکل الگ رہے۔"

" اسلامی قانون کی رو سے سعد بن عبادہ کا یہ طرز عمل جاہلیت کا طرز عمل تھا اور اسلام کے خلاف

سخت کارروائی کی جاسکتی تھی۔ لیکن سیاسی رواداری کا یہ کمال دیکھئے کہ وہ پورے ٹھنڈے کے ساتھ اپنی ضد پراڑے رہ جاتے ہیں اور کوئی معمولی سے معمولی سزا بھی ان کو نہیں دی جاتی "۔

"انصار اور مہاجرین کی ان دو بڑی پارٹیوں کے علاوہ خود مہاجرین کے اندر بھی تین نمایاں پارٹیاں موجود تھیں۔ بنو امیہ کی پارٹی عثمان غنی کی قیادت میں، بنو زہرہ کی پارٹی سعد اور عبدالرحمٰن بن عوف کی سرکردگی میں، بنو ہاشم کی پارٹی حضرت علی اور عباس بن عبدالمطلب کی رہنمائی میں ــــ اور ان میں سے بعض کا اختلاف حکومت کے ساتھ کھلا تھا۔ لیکن حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر کی حکومت نے انتہائی رواداری کے ساتھ اس اختلاف کو انگیز کیا۔ یہاں تک کہ حضرت علی نے حضرت ابوبکر صدیق کے ہاتھ پر کئی مہینے تک بیعت نہیں کی لیکن حضرت ابوبکر صدیق نے ان کے خلاف کوئی کارروائی محض اس وجہ سے نہیں کی کہ ان کو علی مرتضیٰ جیسے ذمہ دار لیڈر سے بدگمانی نہیں ہوسکتی تھی کہ وہ اس اختلاف رائے کو کسی فتنہ کا ذریعہ بنائیں گے "۔

"حضرت عثمان نے اپنے مخالفین اور نکتہ چینوں کو جس حد تک انگیز کیا اس کی تفصیل بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہر شخص کو علم ہے انہوں نے نہایت مظلومیت کے ساتھ قتل ہو جانا گوارا کیا لیکن اپنے مخالفین کو قوت کے زور سے دبانا گوارا نہیں کیا حالانکہ وہ اگر چاہتے تو یہ کرسکتے تھے اور یہ کرنے کا ان کو پورا حق بھی حاصل تھا" (اسلامی ریاست میں شہریت کے حقوق و فرائض ص ۳۵)

حضرت علیؓ نے حضرت عثمان رضہ کی پالیسیوں اور ان کے بعض اقدامات سے بشدت اختلاف کیا۔ بالآخر وہ خلیفہ سوم کی خدمت میں پہنچے اور ان کے سامنے اپنے اور دوسرے لوگوں کے احساسات رکھے اور اس موقعہ پر ان دونوں جلیل القدر صحابہ کے درمیان جو گفتگو ہوئی اس سے بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ خلیفہ راشد کی پالیسیوں سے اختلاف بھی کیا جاسکتا ہے اور ان کی اصلاح کی کوششیں بھی کی جاسکتی ہیں۔

ایک بار لوگوں نے جمع ہوکر حضرت علی ابن ابی طالب کے سر یہ ذمہ داری ڈالی کہ وہ حضرت عثمان کے پاس جاکر ان سے گفتگو کریں آپ ان کے پاس گئے اور فرمایا :ــــ

"میرے پیچھے عوام ہیں جنہوں نے مجھ سے آپ کی بابت گفتگو کی ہے مگر خدا کی قسم میں کوئی ایسی بات نہیں جانتا جس سے آپ ناواقف ہوں، نہ آپ کو کوئی ایسی بات سمجھا سکتا ہوں جس پر خود آپ کی نظر نہ ہو جو کچھ ہم جانتے ہیں اسے آپ بھی جانتے ہیں کسی بات تک ہماری رسائی آپ سے پہلے نہیں ہوئی کہ ہم آپ کو اس سے آگاہ کرسکیں نہ کوئی بات ایسی ہے جس سے صرف ہم ہی واقف ہوں اور آپ تک پہونچائیں۔ . . . . . . لہٰذا اپنے نفس کے معاملے میں اللہ سے ڈریئے کیونکہ آپ کو نہ اندھیرے سے روشنی کی طرف لانے کی ضرورت ہے نہ ناواقفیت سے علم کی طرف صحیح راہ بالکل واضح اور کھلی ہوئی ہے۔ دین کے نشانات اب بھی قائم ہیں۔ عثمان! جان لو کہ اللہ کے نزدیک سب سے افضل بندہ وہ امام عادل ہے جس کو خود بھی ہدایت پر چلنا نصیب ہوا اور اس نے دوسروں کو بھی ہدایت کی راہ دکھلائی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

حضرت عثمان نے جواب دیا :ــ

۔ خدا کی قسم میں خوب جانتا تھا کہ لوگ یہی کچھ کہیں گے جو تم نے کہا ہے سنو! خدا کی قسم اگر میری جگہ تم ہوتے تو نہ میں تم پر سخت گیری کرتا نہ عیب نکالتا نہ (بعض طعن بننے کے لئے) تم اکیلا چھوڑ دیتا۔ میں یہ اعتراض لے کر نہ کھڑا ہوتا کہ تم نے صلہ رحمی کیوں کی ہے کسی حاجت مند کی حاجت روائی کیوں کی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور کیوں ایسے لوگوں کو ولایت کا منصب دیا جس قسم کے لوگوں کو عمر بھی یہ منصب دیا کرتے تھے۔ علی! میں تمہیں خدا کی قسم دلا کر پوچھتا ہوں کیا تم نہیں جانتے کہ مغیرہ بن شعبہ اس منصب پر فائز تھے"

حضرت علی نے جواب دیا "ہاں" (خوب جانتا ہوں)

عثمان: جانتے ہو نا کہ اسے عمر نے والی بنایا تھا۔

علی: ہاں

عثمان: پھر اگر میں نے رشتہ داری اور قرابت کی وجہ سے ابن عامر کو والی بنایا تو تم اس پر مجھے کیوں ملامت کرتے ہو؟"

علی: میں آپ کو بتاتا ہوں کہ حقیقت حال کیا ہے۔ عمر جس کو والی بناتے تھے ان کا جوتا ان کے سر پر ہوتا تھا۔ اس کے خلاف ایک حرف بھی ان تک پہونچتا تو اسے فوراً حاضر ہونے کا حکم دیتے اور پھر معاملے کو آخری حد تک پہنچا کر دم لیتے۔ یہی چیز ہے جو آپ نہیں کرتے۔ آپ خود کمزور پڑ گئے ہیں اور اپنے رشتہ داروں کے ساتھ نرمی برتنے لگے۔"

عثمان: "اور تمہارے قرابت داروں کے ساتھ بھی تو"

علی: "بلاشبہ ان کا مجھ سے قریبی رشتہ ہے لیکن دوسرے ان سے افضل ہیں"

عثمان: "تم جانتے ہو کہ عمر نے اپنی خلافت کے پورے عرصہ معاویہ کو والی بنائے رکھا پھر میں نے بھی انہیں والی برقرار رکھا۔"

علی: "میں آپ سے خدا کی قسم دلا کر پوچھتا ہوں آپ جانتے ہیں نا کہ معاویہ عمر سے اس سے زیادہ ڈرتے تھے جتنا عمر کا غلام یرفا ان سے ڈرتا تھا"

عثمان: "ہاں"

علی: اب صورت حال یہ ہے کہ معاویہ آپ سے رائے لئے بغیر فیصلے کرتے رہتے ہیں اور آپ کو خبر بھی نہیں ہوتی وہ لوگوں سے یہ کہتے پھرتے ہیں کہ یہ عثمان کا حکم ہے یہ بات آپ تک پہونچتی ہے مگر آپ معاویہ کی تردید نہیں کرتے۔" (اسلام کا نظام عدل مصنفہ سید قطب (ترجمہ) صفحہ ۳۵)

اس مکالمے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے ________________ کہ حضرت علی رض نے خلیفہ راشد کی بعض باتوں سے کس طرح اختلاف کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بعض اقدامات اور پالیسیاں تبدیل کرنے پر آمادہ کر لیا تھا مگر شورش برپا کرنے والوں نے انہیں اس کا موقع نہ دیا۔

خلافت راشدہ سے عام مسلمانوں کو اختلاف کا حق حاصل تھا چنانچہ خلیفہ اول نے منصب خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالتے

ہی سب سے پہلے جس بات کا اعلان کیا وہ یہ تھی :۔

"اگر میں اپنے فرائض خوش اسلوبی سے انجام دوں تو میری مدد کرنا اور کج روی اختیار کروں تو مجھے سیدھا کر دینا"

(اسلام کا نظام عدل ص ۳۳۹)

ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے خلیفہ کی حیثیت میں لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا :۔

"اگر میرے اندر کوئی کجی دیکھو تو سیدھا کر دینا"

عامۃ المسلمین میں سے ایک فرد اٹھ کر فاروق اعظم کو ان الفاظ میں جواب دیتا ہے۔

"اگر ہم نے تیرے اندر کوئی کجی دیکھی تو اپنی تلوار کی دھار سے تجھے سیدھا کر دیں گے"

حضرت عمرؓ نے اس پر صرف اتنا فرمایا :" اللہ کا شکر ہے جس نے عمر کی رعایا میں ایسے افراد بھی پیدا کئے جو اسے اپنی تلوار کی دھار سے سیدھا کر سکتے ہیں"

(اسلام کا نظام عدل ص ۳۱۱)

یہ نقد و احتساب کرنے والوں کی گویا حوصلہ افزائی تھی۔

حضرت علیؓ کے زمانہ میں خوارج کے فتنہ نے سر اٹھایا یہ لوگ نہ صرف حضرت علی، حضرت معاویہ، حضرت ابو موسیٰ اشعری اور عمرو بن العاص کو دائرہ اسلام سے خارج کر کے انہیں واجب القتل سمجھتے تھے بلکہ ان کے نزدیک خلافت کا پورا نظام سراسر کفر و معصیت تھا اور وہ اپنے نقطہ نظر کے لحاظ سے خارج ٹھیک ٹھیک نراج (ANARCHISM) کے علمبردار تھے ان کے سیاسی اور مذہبی عقیدے کے باوجود حضرت علیؓ نے ان کو پیغام بھیجا کہ تم کو آزادی حاصل ہے جہاں چاہو رہو البتہ ہمارے اور تمہارے درمیان یہ قرارداد ہے کہ ناجائز کسی کا خون نہیں بہاؤ گے بدامنی نہیں پیدا کرو گے اور کسی پر ظلم نہیں ڈھاؤ گے اگر ان باتوں میں سے کوئی بات تم سے سرزد ہوئی تو میں تمہارے خلاف جنگ کا حکم دے دوں گا۔ (مولانا امین احسن اصلاحی حوالہ بالا)

ان اقتباسات سے ذیل کی باتیں واضح طور پر نمایاں ہوتی ہیں :۔

- خلافت راشدہ سے جس کی اطاعت بطیب خاطر ہونی چاہیئے، بھی اختلاف کیا جا سکتا ہے چنانچہ خلافت راشدہ کے دور میں صرف افراد ہی نہیں بلکہ حکومت سے اختلافات رکھنے والے گروہ بھی موجود تھے، حکومت سے اختلاف کرنے والوں میں صرف معمولی درجہ کے انسان ہی نہیں تھے بلکہ حضرت سعد بن عبادہ، اور حضرت ابوذر غفاری جیسی جلیل القدر ہستیاں بھی تھیں۔
- اسلامی حکومت نہ صرف تعمیری اختلاف کو گوارا کرتی ہے بلکہ اس کی حوصلہ افزائی بھی کرتی ہے اور دنیا کی حکومتوں کے برخلاف اسلامی حکومت ایسے افراد اور گروہوں کے خلاف کسی قسم کی کارروائی نہیں کرتی جن کے نظریات حکومت سے متصادم ہوتے ہوں۔ ایسے لوگوں کو اسلامی حکومت اس وقت تک گوارا کرتی ہے جب تک کہ وہ کھلا آمادہ فساد نہ ہوں جیسا کہ حضرت علیؓ کے طرز عمل سے واضح ہے جو انہوں نے خوارج کے ساتھ روا رکھا۔

خلافت راشدہ کے نظام کے درہم برہم ہو جانے کے بعد امت مسلمہ ملوکیت کی گرفت میں آ گئی۔ چودہ سو سال کے طویل دور کے دوران امت نے ملوکیت اور اس کی مختلف اقسام کے تحت زندگی بسر کی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ملوکیت کی مختلف اقسام کے تحت ان سے اطاعت کا معاملہ کس طرح استوار کیا جائے۔ کیا اس نظام میں بھی رعایا کو اختلاف اور احتساب کا حق ہے یا نہیں اگر ہے تو وہ اس حق کو کس طرح استعمال کرے؟ اس کا جواب سید اسماعیل شاہ شہید رحمۃ اللہ علیہ نے تفصیل کے ساتھ تحریر فرمایا ہے اس کی مختصر

تفصیل مولانا امین احسن اصلاحی کے حوالے سے نقل کی جاتی ہے :-

حکومتیں حضرت اسماعیل شاہ شہید رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ایک اسلامی حکومت کے طریق نبوت وسنت سے انحراف کے درجے ہو سکتے ہیں جنہیں سید موصوف نے حکومت عادلہ، حکومت ضالہ، اور حکومت کفریہ کے عنوانات کے تحت تقسیم کیا ہے :-

"حکومت عادلہ کی شکل یہ ہے کہ حکومت کا آئین اور نظام تو اسلامی ہو یعنی عدالت وقضاء کے معاملات کتاب وسنت کے اصولوں پر انجام پا رہے ہوں حدود تعزیرات اسلامی ہوں، لین دین اور معاملات میں اسلامی قوانین کا نفاذ ہو، تہذیب ومعاشرت میں غالب رنگ اسلام کا ہو . . . لیکن امیر اور اس کے دوسرے عمال اور کارکنوں میں وہ دیانتداری اور تقویٰ نہ ہو جو رسول اللہ کی خلافت کے شایان شان ہے۔ اس کمی کی وجہ سے وہ بہت سی باتیں بھی کر گذرتے ہیں جن پر اگرچہ صریح خلاف شریعت ہونے کا حکم نہ لگایا جا سکتا ہو لیکن اپنی روح کے اعتبار سے وہ شریعت اسلامی سے بے جوڑ ہوں۔ زندگی کے مختلف گوشوں میں اسراف اور نمائش کی بیماری نمایاں ہو جاتے اور فرض میں سہل انگاری پیدا ہو جاتے۔ رفتار اور گفتار میں غرور اور تمکنت جھلکنے لگ جائے"

ایسی حکومت کے سلسلے میں مولانا امین احسن کی رائے یہ ہے کہ :-

ایسی حکومت کی "اطاعت کے لئے دل کا اخلاص بھی ضروری نہیں بلکہ ان کی اطاعت کے خلاف . . . . . دل کے اندر کراہت کا موجود ہونا عین تقاضائے ایمان ہوگا اور ہر صاحب ایمان کا یہ دینی فرض ہوگا کہ ان کی خلاف شریعت باتوں کے خلاف ان کو تنہائی میں بھی نصیحت کرے اور پبلک میں بھی ان پر کھلی تنقید کرکے رائے عامہ کو دباؤ کے ذریعہ سے ان کی اصلاح کی کوشش کرے ——— لیکن ان کی محض ان حرکات کی بنا پر نہ علم بغاوت بلند کیا جائے گا اور نہ ان کی اطاعت سے انحراف کیا جائے گا بلکہ ان کی ان باتوں کے باوجود ان کی اطاعت کی جاتی رہے گی"

(اسلامی ریاست۔ اطاعت کی شرائط وحدود ص۱۸۱)

حکومت کی دوسری قسم ضالہ یا فاسقہ ہے جس کی تشریح مولانا امین احسن اصلاحی کے الفاظ میں حسب ذیل ہے :-

"نظام فی الجملہ اور فی الاصل تو بظاہر اسلام ہی پر قائم ہو اور اس سے متعلق بیشتر کام بھی اسلام ہی کے اظہار و اعلان اور نام سے کئے جا رہے ہوں لیکن غیر الٰہی قوانین اور غیر اسلامی طریقے بھی نظام کے بقا اور حکومت کے قیام اور استحکام کے لئے ضروری خیال کئے جاتے ہوں، ہر حرکت و عمل کا مقصد تو اسلام کی سربلندی ہی ظاہر کیا جاتا ہو لیکن فی الواقع پیش نظر کلمہ حق کی رفعت اور خدا کی رضا نہ ہو بلکہ زیادہ تر اپنے ذاتی یا قومی حوصلوں کی تکمیل ہو، تہذیب ومعاشرت کے سلسلے میں نام تو سارا اسلام کا آتا ہو لیکن عملاً ہر گوشہ میں جاہلی تہذیبوں کی نقالی کی جا رہی ہو، زبانوں سے تعریف وتوصیف تو بیشتر انہی اخلاقی اقدار کی ہو رہی ہو جو اسلام میں پسندیدہ اور قابل احترام خیال کئے جاتے ہیں لیکن عملاً پیروی اور حوصلہ افزائی ان اقدار کی ہو رہی ہو

جن کو وقت کی جاہلیت پیش کر رہی ہو ...."

حکومت کی تیسری قسم مولانا اسمٰعیل شہید رحمتہ اللہ علیہ نے بیان فرمائی ہے وہ "سلطنتِ کفر" ہے۔ اس کی (اجمالی) تشریح اُن کے اپنے الفاظ میں یہ ہے:-

"واضح رہے کہ "سلطنتِ کفر" سے یہاں اصل کفار کی حکومت مراد نہیں ہے، بلکہ ایسی لوگوں کی حکومت مراد ہے جو اپنے آپ کو مسلمانوں کے زمرے میں شمار بھی کریں اور پھر کھلے کھلے موجباتِ کفر کو عمل میں بھی لاتے اور ایسے لوگوں سے شریعت کے احکام کے بارے میں اتنی مخالفت اور دشمنی ظاہر ہو کہ ان پر کفر و ارتداد کا حکم ثابت ہو جاتے ۔۔۔ پس جب اس طرح کے لوگ حکومت کے منصب پر اور جہاں اور تختِ شاہی پر قابض ہو جاتے ہیں تو آئینِ سلطانی کو جو بظاہر کے لحاظ سے سلطنت کی رونق کا موجب ہوتا ہے، عقل و حکمت کے تقاضوں کے مطابق یقین کرتے ہیں اور اس کے مقابلے میں خدا کی شریعت کو جو اُن کی نگاہ میں بالکل بے فائدہ ہوتی ہے احمقانہ رسوم کا درجہ دیتے ہیں ....."

اس کی واضح مثال مصطفےٰ کمال پاشا کے دورِ حکومت میں ملتی ہے!

اس گزارش کا مقصد یہ ہے حاکم وقت کی اطاعت "معروف" میں ہے "معصیت" میں نہیں ہے اور جب بھی "معصیت" کے خلاف احتجاج کیا جائے گا۔ "اختلاف" کی شکل پیدا ہو جائے گی، مغربی حکومتوں کا البتہ یہ مزاج ہے کہ "حزبِ اختلاف" حکومت کی ہر پالیسی سے اختلاف کرتی ہے اُس کے وجود کا سب سے بڑا مقصد حکومت سے اختلاف و نزاع ہوتا ہے مگر مسلمانوں کی حکومت میں "حزبِ اختلاف" حکومت کی صرف ان باتوں سے اختلاف کرتی ہے، جو شریعت اور مفادِ عامہ کے منافی ہوتے ہیں حکومت کے اچھے اور مفید کاموں سے اُسے اختلاف نہیں اتحاد کرنا چاہیے۔ بہرحال اسلامی حکومت میں نقد و احتساب اور اختلاف کرنے والوں کا پایا جانا کوئی ایسی چیز نہیں ہے، جسے غیر اسلامی اصول اور مغرب کی تقلید سمجھا جائے۔

واقعی شک نہیں "اقامتِ دین" کے لئے جمہوری نظام کی فضا ہی موجودہ دور میں سازگار ثابت ہو سکتی ہے! لہذا اس نظام کی بحالی کے لئے آئینی کوشش کرنا، کوئی ایسی غلط بات نہیں ہے جس پر "مغربیت" کی طنز کرکے جمہوری آزادی کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کی جائیں اور مطلق العنان اقتدار کو سندِ جواز دی جاتے! جمہوری آزادی کی بحالی کے لئے بالغ رائے دہی کے ذریعہ انتخاب بھی کوئی غیر اسلامی بات نہیں ہے! کسی جماعت یا فرد کی مخالفت میں اس قسم کے شوشے چھوڑنا اور لوگوں کے دلوں میں وسوسے پیدا کرنا ان لوگوں کو کم از کم زیب نہیں دیتا جو اسلام کی نمائندگی کا دعویٰ کرتے ہیں۔

فاران ۔۔۔ یہ ایک طویل مضمون ہے جو پاک و ہند کی نبرد آزمائی سے کچھ پہلے سے آیا ہوا رکھا ہے اس کو اب ملخص کرکے پیش کیا جا رہا ہے اس تلخیص کے لئے فاضل مقالہ نگار سے ہم معذرت خواہ ہیں کہ ان کا کم از کم ایک تہائی مضمون اس قطع و برید کی نذر ہو گیا۔
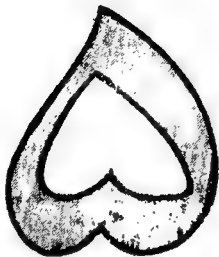
(م۔ ق)

۵
آزمودہ دواؤں کا مرکب
انالجین
سر درد۔ کمر کا درد۔ دانت کا درد
ایام۔ انفلوئنزا اور ہر قسم کے دوسرے درد کے لئے
یقینی زود اثر اور بے ضرر علاج ہے
Opal

عبید اللہ قدسی

ہماری قومی شاعری

قومی کا مفہوم اردو میں ایک عرصہ تک زیر بحث رہا ہے چونکہ قوم سے عام طور پر یورپ کی قومی تحریکوں کی طرف ذہن جاتا ہے اور مختلف ازم اس سے یک وقت سامنے آجاتے ہیں۔ دورِ حاضر کے پرودہ ذہن نیشن اور نیشنلزم کی طرف متوجہ ہوتے ہیں چنانچہ اسی قسم کی قومیت اور ایسی ہی قوم کا تصور درمیانی زمانہ میں ہمارے انکار کا محور بھی رہ چکا ہے سرسید نے اس قومی تصور کو پیش کیا اور بعد کے لیڈروں نے اس میں تنگ فکر دائرے قومیت کے اس مجرد تصور اور جامد تصور سے مسلمانوں کو نکالنے کے لئے اقبال نے ملت کا لفظ استعمال کیا اور ملی ترانہ لکھ کر مسلمانوں کی قومی تحریک میں آفاقی توانائی پیدا کر دی۔

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

اس ترانہ نے اردو شاعری میں قومیت اور وطنیت کے بتوں کو پاش پاش کر دیا اور ملت کا تصور پوری اسلامی تحریک اور تاریخ کے ساتھ اردو شاعری میں وارد ہو گیا۔

کانگریس کی پوری سیاست ملت کے تصور کی دشمن ہو گئی ادیبوں کو طرح طرح سے اس تصور سے ہٹانے کی کوشش کی گئی اخبارات نے وطن پرستی اور قومیت پر مقالے لکھے اور آخر یہ بحث پورے شباب پر اس وقت پہونچی جب اقبال نے اپنا یہ قطعہ لکھا۔

سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن است چہ بے خبر ز مقام محمد عربیست

اس قطعہ نے اس بحث کا دو ٹوک فیصلہ کر دیا اور مسلمانوں میں ملت کے تصور نے قومیت کے تصور کو تقویت پہونچائی رہ گئی ترقی پسندوں کی تحریک ترقی پسند ادیبوں کی تحریک حقیقت میں کمیونسٹ تحریک تھی کمیونزم اپنی محدود آفاقیت کے باوجود بہر کیف آفاقیت کا حامل ہے اس طرح اس تحریک نے انسانیت کے نام پر بلوتاریت کا پرچار کیا اور اس تبلیغ انسانیت میں چونکہ وہ وطن اور قومیت کے بتوں کا آدرش نہیں دیتے تھے یہی چیز بالواسطہ ہمارے لئے مفید ثابت ہوئی۔

قومیت کے اس تصور سے مسلمانوں کو اس قدر بعد ہو گیا کہ عرب نیشنلزم کو کسی طرح بھی گوارا کرنے کے لئے تیار نہیں ہوئے چنانچہ بعض عرب ادیب پاکستان کے اس ردعمل سے متاثر بھی ہوئے اور اکثر ادیب اس تحریک کو آگے بڑھا رہے ہیں؛ حقیقت تو یہ ہے کہ کوئی مسلمان خواہ وہ اپنے اسلامی تصورات اور اس کی آفاقیت سے کتنا ہی بے بہرہ ہو اور اس پر یورپ کی تحریکوں اور وہاں کی سیاست کا رنگ کتنا بھی غالب آگیا ہو جہاں اس میں تھوڑا سا بھی پیدا ہوئی وہ کسی طرح بھی یورپ کے نیشنلزم کو گوارا نہیں کر سکتا بلکہ اس کے گھٹیا اور پست ہونے کی وجہ سے اس سے نفرت کرنے لگتا ہے انسان کی بلند خیالی، آفاقیت اور انسانیت کے سامنے نیشنلزم کا چراغ نہیں جل سکتا

اور جب وہ اس کی عملی صورت دیکھتا ہے تو لرز جاتا ہے۔ انسانی روح اس کے تعصب اور تنگی میں گھٹنے لگتی ہے اور انسان آزادی کے لئے بے چین ہو جاتا ہے۔

قومیت کا یہ تصور جس کا پرستار یورپ ہے آج کی پیداوار نہیں ہے بلکہ انسان کے عروج و زوال کی داستان اس تصور سے وابستہ ہے دنیا میں دو ہی قسم کے رہنما پیدا ہوتے ہیں۔ جنہوں نے انسانوں کی ترقی کے لئے کوشش کی، ایک تو وہ جنہوں نے ملک اور قوم کی خاطر ایثار کئے اور اس کی فتح و کامرانی کے لئے خون بہاتے اس میں آپ دنیا کے جلیل القدر بادشاہوں اور حریص جابر ظالم قوموں کو شمار کر سکتے ہیں جن کی تنگ نظری اور تعصب اور خود پرستی نے انسانیت کی تاریخ میں خونی داستانیں چھوڑی ہیں ان میں آپ یونان و روما کی جنگ سے لے کر سکندر کی لشکر کشی تک اور چنگیز و ہلاکو خاں کی لڑائیوں سے لے کر نپولین کی لڑائیوں تک کو شمار کر سکتے ہیں اور بیسویں صدی میں تو تمام ہی لڑائیاں اسی قسم کی لڑی گئی ہیں، جن میں آفاقیت اور انسانیت کو کچل گیا ہے نظریات سے کوئی بحث نہیں تھی بلکہ یہ لڑائیاں ملک گیری وطن پرستی اور حرص و طمع کی بنیاد پر لڑی گئیں، ان لڑائیوں کے فاتح بھی اپنے ظلم و جبر اور ملک گیری کی ہوس میں ملوث ہو کر اسی قدر بدنام ہوتے جس قدر جنگ کی ابتدا کرنے والے بدنام ہوئے ہیں اور یہ سلسلہ آج بھی دنیا میں جاری ہے۔

شاعری میں چنگیز و ہلاکو کے بھی قصیدے لکھے گئے ہیں اور آج بھی عام شاعر ہٹلر سے لے کر گویا، کانگو اور بیت نام کے ہر کو قسم کے لوگوں کی تعریف میں نظمیں لکھ چکے ہیں۔ دوسرے وہ رہنما ہیں جن میں اوتار، فلسفی اور پیغمبروں کے گروہ کو شمار کیا جا سکتا ہے جنہوں نے انسانیت کا درس دیا، آفاقیت کی تعلیم دی اور عام ترقی کی شاہراہ تعمیر کی، اس میں شک نہیں کہ ان فلسفی بنیادوں میں بھی یہ تصور شروع شروع میں صاف نہیں تھا یا یہ کہیے کہ جب اس تصور نے عملی لباس پہنا اور اس کی تفسیریں اور تعبیریں پیش کی گئیں، شریعت یا قوانین کی شکل اس تصور نے اختیار کی تو بہت محدود ہو گیا، لیکن عملی قوانین، شرائع اور فلسفیوں کی جوج ... کے مدارج طے کرتا ہوا یہ تصور آخر آفاقیت کی اور انسانی ترقی کی وہ شاہراہ تعمیر کرنے میں کامیاب ہو گیا، جس میں انسانی ترقی کی رکاوٹوں کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے یہ تصور تمام انسانوں کے لئے ایک خاندان اور کنبہ سے بیان نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کے لئے "ایک جسم نامی" کا فقرہ استعمال ہوتا ہے۔

اردو شاعری میں دنیا کے اس ترقی یافتہ تخیل کو کس حد تک اپنایا ہے اور تعصب قومیت، وطنیت اور ہوس کے اس جذبہ کو کس حد تک ابھارا گیا ہے جس میں آفاقیت فنا ہو جاتی ہے اور اس ترقی یافتہ ایک جسم نامی کا تخیل ختم ہو جاتا ہے، اس کا اندازہ موجودہ دور کی شاعری کے تجزیہ سے ہو سکتا ہے۔

جنگ پر قومی نظمیں سب سے پہلے سن ۱۹۴۲ء میں لکھی گئیں۔ جب کمیونسٹوں نے انگریزوں سے ساز باز کر لیا اور وہ فرنٹ میں داخل ہو گئے تو ترقی پسند شاعروں نے محدود آفاقیت کے تصور کو قبول کر لینے کی وجہ سے انسانیت کی حمایت اور ظلم و جبر کے خلاف منظم آواز بلند کی، اور ان کی منظومات اور ترانے اردو میں مقبول بھی ہوتے لیکن ان ترانوں میں ایک بھی ایسا دلپذیر اور اثر انگیز نہیں تھا جو قبول عام حاصل کر کے بقائے دوام اختیار کر جاتا اور زبان زد عام و خاص ہو جاتا غالباً اس کی وجہ یہی تھی کہ جس جذبے نے ترانے لکھوائے وہ شاعروں کا عقیدہ نہیں تھا اور بقول الحسن شاعری نام ہے عقیدہ کا لہذا یہ ترانے اوپرے دل سے لکھے گئے اور بعض پیسوں کی خاطر لکھے گئے اس لئے بڑے تیکھے نوکیلے اور نشتر تو بن گئے لیکن دل کے پاسنہ ہو سکے۔ انہوں نے تصویر کا ایک رخ پیش کیا، جنگ کی ہولناکی اور تباہی دکھائی، ظلم و قہر کی تصویر کھینچی، اور انسانیت کی مٹتی ہوئی لکیروں کو ابھارا لیکن ان کے پاس کوئی ایسا عالمگیر ولولہ انگیز جنون پرور پیغام نہیں تھا جو دلوں کو گرمادیتا، روحوں کو تڑپا دیتا اور انگریزوں کی موافقت میں اکساتا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ جب ۱۹۴۷ء میں تقسیم کے وقت کشت و خون ہوا ہندوستان میں بربریت اور بہیمیت کا دور ہوا وطن و قومیت کے نام

بستیاں اور قصبے اجاڑ دیئے گئے تو یہ ترقی پسند دو قوموں میں توازن پیدا کرنے میں مشغول ہو گئے، انصاف کی ترازو لے کر بھائیوں دونوں میں نصف نصف بانٹنے بیٹھ گئے ان کی تقسیم عمل نے نہیں پھر کسی ایسے شاہکار کی تخلیق سے باز رکھا جو امرت جوت بن جاتا اور جس کو پڑھ کر سنگدل موم ہو جاتا کافر کافر ہی رہے، اور مسلمان مسلمان، کوئی بھی نظم ایسی نہیں ہوئی جو کافر کو مسلمان کر دیتی یا مسلمان کو مومن بنا دیتی۔

غیر ترقی پسند شعراء میں دو ایک شاعر ایسے ضرور ہوئے جو اپنا رنگ بھول گئے اور ان کی حیرانی نے دنیا کو دلگیر کر دیا جس طرح سعدی نے کہا تھا۔

چناں قحط سالے شد اندر دمشق　　　که یاراں فراموش کردند عشق

جگر مراد آبادی نے اس پر برجستہ کہا تھا،

شاعر نہیں ہے جو بھی غزل خواں ہے آجکل

اب آپ ہندوستان پاکستان کی سترہ روزہ جنگ پر نظمیں اور ترانے اٹھا کر دیکھئے اور انہیں اس نظر سے پرکھیئے کہ اس میں وہ قوم و ملت کے تصور اور آفاقی تخیل سے کس حد تک معمور ہیں۔

موجودہ قومی ترانوں اور نظموں میں کچھ تو ایسے شاہکار ہیں جن میں پاکستان کی تعمیر کا تصور جھلک رہا ہے جن میں وہی ولولہ، وہ جذبہ ہے جو انسانیت کی تعمیر میں کام آتا ہے جن میں نہ سر پر غرور ہے نہ جبر و قہر کی ترغیب ہے نہ لعن و طعن اور حقارت کو بڑھایا گیا ہے بلکہ انسانیت کی سربلندی، اسلامی جذبۂ تعمیر اور توحید یا جسم نامی کی تعریف کی گئی ہے، اس قسم کی نظموں میں آپ رئیس امروہی، صوفی تبسم اور محشر بدایونی کے مقبول ترانوں کو شمار کر سکتے ہیں۔ دوسرے وہ ترانے ہیں جن میں جوش بھی ہے اور شاعری کی ٹکنک بھی استعمال کی گئی ہے، خیالات کا تسلسل بھی ہے اور مضمون آفرینی بھی، لیکن نہ تو ان ترانوں اور نظموں کو قبولیت حاصل ہوئی نہ کبھی ان کا وجود باقی رہے گا۔ ان ترانوں میں بھی جوانوں، جیالوں کو صف بہ صف اور قدم بقدم آگے بڑھنے کی ترغیب دی گئی ہے ان میں وطن کے گن گائے گئے ہیں، میدانوں، پہاڑوں، کھیتوں، سبزہ زاروں اور مرغزاروں کی تعریف کی گئی ہے اور وطن کے محافظ اور نگہبان کے قصیدے لکھے گئے ہیں، لیکن ان تمام اوصاف کے باوجود یہ ترانے اور نظمیں بھرتی کی ہیں اور پختہ کاروں کی لکھی ہوئی ہونے کے باوجود نگوڑوں کی فہرست میں درج ہیں۔ اس لئے کہ یہ جاندار نہیں ہیں، ان میں عقیدے کی گرمی نہیں ہے ان میں وہ روح نہیں ہے جو زندۂ جاوید بنا دیتی ہے بلکہ اس روح کا شائبہ تک نہیں ہے اس لئے کہ ان میں وہی سب کچھ لکھا گیا ہے جو ایک لیمپ کا محب وطن اپنے وطن کے لئے دوسروں کے دفاتر میں لکھ سکتا ہے ان ترانوں اور نظموں میں پاکستان کے عقیدے اور تصور کی روح کار فرما نہیں ہے یہ عام اور سطحی خیال تک محدود ہیں جو بے سوچے تگ بندی کے طور پر ہر مضمون نگار کے ذہن میں آجاتا ہے ان میں کوئی ایسی فکر انگیز جادو نگاری نہیں ہے جس کی ندرت سے ذہن انسانی ترقی اور انبساط محسوس کرے، فتح اور کامرانی سے انبساط اور کشادہ دلی حاصل ہوتی ہے اور جو نظم ہمارے تخیل پر قبضہ کر کے اس میں یقین اور اعتماد پیدا کر دے کہ فتح و کامرانی کی سی لذت اور انبساط میں حاصل ہو وہی کامیاب نظم ہے اس لئے کہ اس میں جسم نامی کا شعور کار فرما ہے یا یوں کہئے کہ جسم نامی میں وہ سرایت کر رہی ہے۔

جنگ کے دوران ایک ادیب کو میں نے عرب کی قدیم شاعری کا کچھ حصہ ترجمہ کرتے ہوئے دیکھا معلوم نہیں انہوں نے اسے ریڈیو پر نظم میں استعمال کیا یا نثر میں، بہرحال یہ کوشش بھی مور سلیمان سے کم نہیں تھی جس نے حضرت سلیمان کے لشکر کی دعوت کے لئے ٹڈی کی ایک ٹانگ پیش کی تھی۔

فیض صاحب اگر قومی شاعری کی طرف توجہ کرتے تو کچھ اچھا کلام ہو جاتا لیکن ان کے ساتھ مشکل یہ ہے کہ ان کی شاعری کا مزاج ان کے عقیدے سے ہم آہنگ نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ اس جنگ پر فیض صاحب کچھ نہ لکھ سکے، ان کا عقیدہ، فلسفہ سخت کوشی، کوہکنی اور مزدکیت کا متقاضی ہے اور ان کی شاعری کا مزاج، نرم رو، گنگا جمنا اور رومانی تخیل کا طلب گار ہے ان دونوں کے امتزاج سے کبھی مزاج برہم ہو جاتا ہے اور کبھی تضاد پیدا ہو کر ابہام بن جاتا ہے۔ وہ اپنا عقیدہ چھوڑتے نہیں اور ان کی شاعری اپنا مزاج چھوڑتی ہے۔

فاران : کوئی شک نہیں اسلام غیر محدود آفاقیت کا حامل ہے مگر وہ جائز اور فطری حدود میں وطن اور قومیت کے ذکر اور ربط و تعلق پر قدغن نہیں لگاتا، وطن سے لگاؤ اور محبت پرستش کی حد تک پہونچ جائے تو یہ بت توڑ دینے کے قابل ہے! ایسے تنگ دعوت وطنیت کی طرف نہیں اسلام کی طرف دینی چاہیئے۔

پاکستان میں بہت سی رزمیہ نظمیں ایسی بھی کہی گئی ہیں جن میں اسلام اور توحید کے ساتھ خطۂ پاکستان کے وفا شعار بھی عوام کو ابھارا گیا ہے! اس ملک کے سبزہ زاروں، کھیتوں اور دشت و جبل کی تعریفیں بھی کی گئی ہیں —— تو یہ تلمیحات اس رنگ سے ایسے نہیں ہیں کہ ایک مسلمان کے دل میں کھٹک پیدا کریں۔

جہاں تک "شہرت" کا تعلق ہے ہزاروں اور لاکھوں ادیب اور شاعر مشہور نہیں ہوا کرتے، شہرت چند ہی کے حصے میں آتی ہے، مثلاً دنیا کی ہر زبان میں شہرت و مقبولیت کے اعتبار سے صفِ اول کے چھ سات شاعر ہوتے ہیں اس کے بعد صفِ دوم کے بیندرہ بیس شاعر، پھر صفِ سوم کے اس تعداد سے زیادہ شاعر! باقی شعراء کے نام بس تذکروں میں آکر رہ جاتے ہیں، شہرت ان کو میسر نہیں آتی! ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض اچھے شعراء کو خاطر خواہ شہرت نصیب نہیں ہوتی، مثلاً لسان العصر اکبر الٰہ آبادی کے استاد وحید الٰہ آبادی کو وہ شہرت کہاں ملی ہے جس کے وہ مستحق تھے، اُن کا یہ شعر۔

> پڑے ہیں صورتِ نقشِ قدم نہ چھیڑ ہمیں
> ہم اب خاک میں مل جائیں گے اٹھانے سے

سینکڑوں غزلوں پر بھاری ہے۔

اسی طرح ہزاروں اور لاکھوں کتابوں میں چند کتابیں ہی شہرت پاتی ہیں، شہرت اور کثرت دو مختلف چیزیں ہیں "شہرت" کا تعلق محدود تعداد اور "شواذ" سے ہے! غزلیں اور نظمیں بھی چند ہی مشہور ہوا کرتی ہیں! شہرت میں مقدر کو بھی دخل ہے، "کوہ نور ہیرا" ساری دنیا میں مشہور ہے مگر کون کہہ سکتا ہے کہ اس ہیرے سے زیادہ بڑے اور قیمتی ہیرے خاک کی تہوں میں پوشیدہ نہیں ہیں! شعر و ادب ہی پر منحصر نہیں ہے مصور ہوں، موسیقار ہوں، کھلاڑی اور پہلوان ہوں، شہرت چند ہی کو میسر آتی ہے —— پھر ساری شہرت کسی ایک شخص کا حصہ اور حق ہو کر نہیں رہ جاتی کہ جس شاعر کی غزلیں اور نظمیں مقبول ہوں، اُسی کے رزمیہ نغمے بھی شہرت پائیں، اللہ تعالیٰ کی دین اور تقسیم ہے کسی کو کچھ دیا اور کسی کو کچھ ملا!

غزلوں، نظموں، نغموں اور گیتوں کی شہرت اور مقبولیت کا سبب ان چیزوں کی معنویت کے علاوہ اس پر بھی ہے کہ جس کو بھی منظر عام پر آنے کا موقع مل جائے اُسے شہرت حاصل ہو جاتی ہے جسے نہیں ملتا وہ مشہور نہیں ہوتی چاہے وہ غیر مشہور غزل اور نظم اُس مشہور غزل اور نظم سے بہتر ہی کیوں نہ ہو۔

پاکستان میں جو رزمیہ نغمے مشہور ہوئے ہیں وہ شاعرانہ نقطۂ نگاہ سے قابلِ تعریف ہیں مگر ان کی شہرت کا اصل سبب یہ ہے کہ موسیقار نے اُن کی دلکش "دھنیں" بنا دیں اور وہ "دھنیں" ریڈیو سے نشر ہوئیں، بس پھر وہ نغمے چل پڑے اگر بعض دوسرے شاعروں کی رزمیہ

نظموں کو بھی یہ موقعہ مل جاتا تو اُن کی نظمیں بھی مشہور ہو جاتیں! بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ فنکاروں، موسیقاروں اور شعبہ نشر و اشاعت سے ذاتی تعلقات کے سبب بھی "نغموں" کو شہرت کے مواقع اور مواقع میسر آجاتے ہیں!

جہادِ پاکستان نے کوئی شک نہیں ہمارے شعراء کے جذبات و محسوسات میں ہل چل پیدا کر دی، جس کے سبب سینکڑوں نظمیں منظرِ عام پر آگئیں ان میں انتخاب کیا جائے تو خاصی اچھی اور جاندار نظموں کا ایک حسین مجموعہ مرتب ہو سکتا ہے مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ مشہور نغمے ہوں یا کم مشہور نظمیں، ان میں سے کوئی نظم بھی علامہ اقبال کی اس نظم کے مقابلہ میں پیش نہیں کی جا سکتی جس کا تنہا یہ شعر سینکڑوں نظموں سے زیادہ گراں قدر ہے۔

جھلکتی ہے تری اُمت کی آبرو اس میں

طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

فاضل مضمون نگار نے فیض صاحب کا بھی ذکر چھیڑا ہے، اس سلسلہ میں عرض ہے کہ فیض صاحب عقیدہ کے اعتبار سے خالص اشتراکی ہیں اسی سبب انہیں "لینن پرائز" دیا گیا تاکہ ایشیا اور خاص طور سے پاکستان میں اُن کی شہرت مسلّم ہو جائے اور اُن کی شہرت اور شخصیت کے سہارے "اشتراکیت" کو پاکستان میں برگ و بار میسر آئیں! ورنہ انہوں نے دنیا میں "امن" قائم کرنے کا آخر کون سا کارنامہ انجام دیا ہے!

پاکستان اور ہندوستان کی جنگ میں روس کی تائید ہندوستان کو حاصل تھی، اس لئے فیض صاحب روس کی پالیسی سے ہٹ کر پاکستان کی جنگی پالیسی کی تائید اور حوصلہ افزائی میں ایک شعر بھی نہ کہہ سکے!

غزلوں، نظموں، گیتوں اور نغموں کی شہرت و مقبولیت کا جب ذکر چل پڑا ہے تو اس سلسلہ میں ہم اپنی یادداشت اور مشاہدہ و تجربہ کے کچھ نقش ثبت قرطاس کرنا چاہتے ہیں، اس موضوع پر اب تک شاید کسی نے نہیں لکھا!

شہرت و قبولیت کے سلسلہ میں سب سے پہلے ہم دو کتابوں کا ذکر کرتے ہیں، یہ دو کتابیں (۱) بہشتی زیور اور (۲) میلاد اکبر ہیں۔

بہشتی زیور تقریباً ۵۶ سال قبل (اور میلاد اکبر غالباً اس کے دس سال بعد لکھا گیا) حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کا بہشتی زیور کوئی شک نہیں اپنے موضوع پر بے مثال کتاب ہے، یہ کتاب اس مدت میں کیا عجب ہے کہ پچاس لاکھ سے بھی زیادہ چھپ چکی ہو! "بہشتی زیور" کی ہمیشہ مانگ رہتی ہے اور ہر سال نہ جانے کتنے ایڈیشن چھپ جاتے ہیں یہ کتاب اسی شہرت اور مقبولیت کی مستحق تھی!

دوسری طرف منشی محمد اکبر میرٹھی کا "میلاد" ہے یہ کتاب بھی لاکھوں کی تعداد میں چھپ چکی ہے اور ہمیشہ چھپتی رہتی ہے! "میلاد اکبر" نثر و نظم پر مشتمل ہے اس میں جو روایات ہیں وہ ضعیف و موضوع ہیں، نثر بہت ہی معمولی درجہ کی ہے یہی حال نظموں کا ہے، اُن میں کوئی ندرت و دلکشی نہیں۔ ہاں! "معراج کی رات" کوئی شک نہیں بڑی اچھی نظم ہے مگر اُس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ نظم جناب بیان یزدانی میرٹھی کی کہی ہوئی ہے یا اُس میں اُن کی اصلاح و تصرف اور نظر ثانی کا بہت کچھ دخل ہے!

منشی محمد اکبر وارثی میرٹھی میلاد خواں تھے اور اپنے خوش الحان شاگردوں کی ٹولی کے ساتھ میلاد پڑھا کرتے تھے، یو۔ پی میں آج سے پچاس پچپن سال قبل ان سے زیادہ مقبول اور مشہور کوئی میلاد خواں نہ تھا۔ جگہ جگہ شادیوں، عرس اور میلاد کی محفلوں میں ان کو بلوایا جاتا! یہ چیز اُن کے "میلاد" کی مقبولیت کا باعث ٹھیری! اور عوام مسلمان جو میلاد و قیام سے عقیدت و شغف رکھتے ہیں اور کم استعداد ہیں اُن میں "میلاد اکبر" بے حد مقبول ہوا یہ جو پھیری میں کتابیں بیچنے والے جنگنامہ علی، قصہ دائی حلیمہ، نقش سلیمانی اور قصہ عورت ڈلہ جیسی کتابیں بیچ کر روزی پیدا کرتے ہیں اُن کی گٹھریوں اور بقچوں میں "میلاد اکبر" ضرور ملے گا۔

آج کل شعر و ادب کی شہرت کے لئے اخبار اور رسالے ہیں، فلم اور ریڈیو ہے، مگر جب یہ چیزیں نہ تھیں اور اخبارات و رسائل کی تعداد بہت ہی محدود تھی، اُس وقت طوائفوں اور قوالوں کے ذریعہ غزلوں کی شہرت ہوتی تھی! مثلاً یہ غزل جو نواب امداد امام اثر سے منسوب ہے:۔

آنکھ والا ترے جوبن کا تماشا دیکھے
دیدۂ کور کو کیا آئے نظر کیا دیکھے

اب سے ساٹھ سال پہلے گانے والوں کے ذریعہ مشہور ہوئی!

مرزا داغ دہلوی کے علاوہ آغا شاعر دہلوی اور مضطر خیرآبادی کی غزلیں نصف صدی قبل محفلوں میں گائی جاتی تھیں پھر نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل کی یہ غزل:۔

دیکھا جو حُسنِ یار طبیعت مچل گئی
آنکھوں کا تھا قصور چھری دل پہ چل گئی

طوائفوں کو ورد زبان اور تماش بینوں کی حرز جان تھی۔ پچاس سال قبل جو غزلیں بہت زیادہ مشہور تھیں اُن میں چند یہ تھیں

مجھے مسیح کے احسان سے بچا لینا تمہیں نے درد دیا ہے تمہیں دوا دینا
یہی دن ہیں دعا لے لو کسی کے قلب مضطر سے
جوانی آ نہیں سکتی مری جاں پھر نئے سر سے

~ چھا رہی کالی گھٹا جیرا مورا لہرائے ہے
~ یہ بت پتھر کے ہیں ترشے ہوئے فولاد کے ٹکڑے
~ میں مریضِ عشق ہوں میری دوا پردے میں ہے

اس زمانے میں گراموفون رواج پا چکے تھے، اللہ آبادکی جانکی بائی، کلکتہ کے پیارے صاحب اور نگینہ کے قوال محمد حسین کے بھرے ہوئے ریکارڈوں کی بہت شہرت تھی، یہ صرف دُھن اور گانے والے کا کمال تھا کہ۔

~ میں تو پانی میں کی مینڈکی

جیسے گیت کو محمد حسین نگینہ والے کے گانے کے سبب شہرت میسر آئی!

گراموفون کے ریکارڈوں کے علاوہ اُس زمانے میں جو مشہور تھیٹر کمپنیاں تھیں مثلاً نیو الفریڈ، حبیب کمپنی وغیرہ اُن میں جو گیت گائے جاتے تھے وہ بہت جلد مشہور ہو کر سارے ملک میں پھیل جاتے، مثلاً ان دو گیتوں کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی:۔

(۱) چھوٹی بڑی سوئیاں رے! جالی کا مورا کاڑھنا
(۲) اب کے بالم پھر پہنا دے آسمانی چوڑیاں

یہ وہ گھٹیا چیزیں ہیں جو صرف "دُھن" کے سبب مقبول اور مشہور ہوئی ہیں۔

یہی وہ زمانہ ہے جب خلافت اور کانگریس کی تحریکیں زوروں پر تھیں اس دور میں یہ نظم جو مرزا طاہر مرادآبادی کی کہی ہوئی ہے بے حد مشہور و مقبول ہوئی۔

بولیں اماں محمد علی کی
جان بیٹا خلافت پہ دیدو

اس کے بعد :— کہہ رہے ہیں کراچی کے قیدی
ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو

اور

؎ گاندھی چھٹے سے لندن اڑائے دیں گے

یہ نظمیں معمولی اور سیدھی سادی ہیں مگر ایک تو ماحول اور فضا کی سازگاری میسر آتی، پھران کی " دھنیں " کسی نے خوب نکالیں، یہی حال اس نظم کا تھا :—

؎ تیغ سے اور نہ خنجر سے لیں گے
کام اللہ اکبر سے لیں گے

کاکوری ڈکیتی کیس میں جن لوگوں کو پھانسی دی گئی ان میں لاہری پرشاد بسمل خاص مشہور شخصیت تھی اُن کی یہ غزل بہت مشہور ہوئی :—

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے   دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے
وقت آنے دیں دکھا دیں گے تجھے اے آسماں   ہم ابھی سے کیا بتائیں کیا ہمارے دل میں ہے

اور یہ غزل نہ جانے کس شاعر کی ہے اُن دنوں بہت زیادہ گائی جاتی تھی۔

جانے کیا ساقی کی نظروں نے اشارا کر دیا   مندرسعر آج ہم نے زہد و تقویٰ کر دیا

لطف بدایونی کو کون جانتا ہے ان کی شہرت بدایوں اور نواح بدایوں سے آگے نہ بڑھ سکی مگر ان کی یہ غزل بدایوں کے مشہور قوال نتھا نے پیران کلیرشریف کے عرس میں جو گائی ہے تو بس چل نکلی اور خوب مشہور ہوئی۔

تو وہ ہے خوبی ہے اے جلوۂ جانانہ
ہر گل ہے ترا بلبل ہر شمع ہے پروانہ

۱۹۳۲ء کے لگ بھگ، فانی بدایونی کی اس غزل —

؎ آل سوز غم ہائے نہانی دیکھتے جاؤ

نے بڑی شہرت پائی! جگر مرادآبادی کی ایک دو نہیں بہت سی غزلیں مشہور اور مقبول ہوئیں! اسی زمانے (۱۹۲۳ء - ۱۹۲۴ء) میں منددجہ ذیل نعتیہ نظم کی شہرت کی کوئی حد و نہایت نہیں رہی۔

میرے مولا بلا لو مدینے مجھے
غم ہجر آدے گا نہ جینے مجھے

اُنہی دنوں ایک صاحب نے مجھ سے بیان کیا کہ میں نے دہلی میں ایک انگریز لڑکے کو " میرے مولا بلا لو مدینے مجھے " گاتے ہوئے سنا، وہ " مدینے " کا تلفظ " ڈینے " کرتا تھا۔

اب سے تقریباً تیس سال پہلے اختری بائی فیض آبادی نے بہزاد لکھنوی کی یہ غزل —

دیوانہ بنانا ہے تو دیوانہ بنا دے

گائی، اور اس غزل نے شہرت کی تمام حدوں کو توڑ دیا۔ فلم "زینت" میں مخشب جارچوی کی قوالی ،۔

آہیں نہ بھریں، شکوے نہ کیے کچھ بھی نہ زباں سے کام لیا

کی غیر معمولی شہرت نے مخشب کے مستقبل کو کس قدر شاندار بنا دیا، کہ راوی چین ہی چین اور چاندی ہی چاندی لکھتا ہے۔

اس تفصیل سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ جو چیز مشہور ہوتی ہے وہ لازمی طور پر گھٹیا اور کمتر حیثیت کی ہوتی ہے: نظیر اکبرآبادی کا "بنجارہ نامہ" ——

سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

گانے والوں کی گلوکاری کے سبب نہیں بلکہ اپنی شاعرانہ قوت کے سبب مشہور ہوا اسی طرح حالی پانی پتی کے مسدس اور اقبال کے شکوہ کی مقبولیت اور شہرت کسی موسیقار کے فن کی رہینِ منت نہیں ہے! غالب اور اقبال یہ تو اس درجہ کے شاعر ہیں کہ خود ان کے کلام کی بہ دولت موسیقاروں اور فن کاروں کے کمالِ فن کو چار چاند لگتے ہیں!

—— لیکن ——

یہ بھی واقعہ ہے، "دھن" "طرز" "گلوکاری" اور "موسیقی" کے سبب بہت سی معمولی اور پست چیزیں بہت زیادہ مشہور ہو جاتی ہیں!

جناب عبیداللہ قدسی کے مضمون نے اس طرف ذہن کو منتقل کر دیا، ورنہ اس موضوع پر لکھنے کا کبھی خیال ہی نہیں آیا، یہ ایک سرسری جائزہ ہے اگر کوئی دوسرے صاحب اس پر "تحقیق" کر کے کچھ لکھیں تو یہ موضوع ہے بڑا دلچسپ!

شہرت کا ذکر نکلا تو خواجہ عزیز الحسن مجذوب مرحوم کی غزل کا یہ مطلع یاد آ گیا ——

قدر مجذوب کی خاصانِ خدا سے پوچھو
شہرتِ عام تو اک طرح کی رسوائی ہے

تحریر: جلال الدین ٹونکی
ترتیب و تہذیب: سعادت سرہندی

قربانی کی شرعی حیثیت

پاکستان میں ایک مدت سے تجدد پسند حضرات ایک ہمہ گیر مہم چلا رہے ہیں، جس کا مقصد شعائر اسلامیہ میں رخنہ اندازی اور متفقہ مسائل کے متعلق عوام میں شکوک و بدگمانی پیدا کرنے کے سوا اور کچھ نہیں۔

گزشتہ چند سالوں سے قربانی کے خلاف جو ہنگامہ کھڑا کیا گیا ہے وہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

اگرچہ بظاہر یہ تحریک ایک نئی معلوم ہوتی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کی جڑیں بڑی پرانی ہیں۔ اگر اس سلسلہ کو مربوط کیا جاتا تو اس کی کڑیاں فرقہ معتزلہ کے عقائد سے جا ملیں گی۔ معتزلہ کی اس روش کا سبب یونانی فلسفہ سے مرعوبیت تھی اور موجودہ دور میں اس کی وجہ مغربی تہذیب کی ظاہری چمک دمک اور نام نہاد عقلیت پسندی کی گمراہانہ تقلید اور احساس کمتری ہے۔

سواد اعظم پاکستان و ہند میں اس تحریک کو فروغ گزشتہ چالیس سال میں ہوا۔ قریباً نصف صدی پہلے نیاز فتح پوری نے اسی قسم کے مسائل پر جمہور علماء سے اختلاف ہی نہیں کیا بلکہ قلمی جدال شروع کیا اور پر جوش مخالفت میں نماز روزہ اور دوسرے شعائر اسلامی کو بیکار رسمیں بتاتے ہوئے مجموعہ احادیث کو مزخرفات کا طومار قرار دیا تھا۔ نیاز فتح پوری کے اس معاندانہ رویہ کی وجہ جہاں ان کا فلسفہ سے اشتغال تھا وہاں ایک نفسیاتی سبب بعض تنگ نظر و سخت گیر اساتذہ مدارس دینیہ کا تشدد بھی تھا جس کی وجہ سے موصوف کو طبقہ علماء سے اتنی شدید نفرت ہو گئی کہ وہ کھرے اور کھوٹے میں امتیاز کرنے کی قوت سے بھی محروم ہو گئے اور انہوں نے علماء کی سرگرمیوں کی مخالفت پر کمر باندھ لی۔ چنانچہ شعائر اسلامی کی مخالفت کر کے انہوں نے اپنے سخت گیر اساتذہ سے انتقام لینے کی کوشش کی۔ موصوف نے اپنے حالات زندگی مطبوعہ آپ بیتی نمبر رسالہ "نقوش" لاہور میں اسے خود بھی تسلیم کیا ہے ان کا یہ ردعمل ہم سب کے لئے عبرتناک ہے۔

بہرحال نیاز صاحب کی اس تحریک و مخالفت کا مقصد ہی ہر بات میں علماء کی مخالفت ہے۔ علاوہ بریں امتداد زمانہ اور تقاضۂ عمر نے بھی ان کے اس جوش کو بڑی حد تک ٹھنڈا کر دیا۔ اگرچہ اب بھی نیاز صاحب کے خیالات میں کوئی نمایاں تغیر نہیں ہوا لیکن اب ان کی مخالفت میں وہ جوش اور شدت بھی باقی نہیں۔

اس کے بعد اسلم جیراجپوری صاحب نے اس تان کو اونچا کیا، لیکن اس سے بھی لوگ زیادہ متاثر نہ ہوئے، کیونکہ لوگ ایک ہی قسم کے دلائل کو بار بار سن کر اکتا چکے تھے۔

پاکستان بنا تو غلام احمد پرویز نے پھر اس تحریک کی بنیادیں استوار کرنے کی کوشش کی اور منظم طور پر اس تحریک کو چلایا۔ موصوف نے

جملہ احادیث نبوی کو دفتر بے معنی قرار دیا اور تمام مسائل کو بلا استمداد احادیث قرآن حکیم سے مستخرج و مستنبط کرنے پر زور دیا۔

یہ اگرچہ درست ہے کہ قرآن مجید ایک مکمل اور جامع و مانع دستور العمل ہے۔ لیکن مہبط وحی حضور اکرم (فداہ روحی) کے اقوال و افعال کی روشنی میں ہی ہم قرآن حکیم کو کما حقہ سمجھ سکتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو قرآن عزیز اور دیگر کتب و صحف مقدسہ بلا واسطہ پیغمبر نازل کر دیئے جاتے تاکہ لوگ خود ہی تمام احکام کو سمجھ کر ان پر عمل پیرا ہو جاتے۔ لیکن ایسا ممکن نہ تھا کیونکہ اگر احکام خداوندی بلا واسطہ پیغمبر نازل ہوتے تو ہر شخص اپنی مرضی کے مطابق مطلب اخذ کرتا اور ہر شخص کی رائے ایک دوسرے سے مختلف ہوتی اور اس طرح ایک امت در خلفشار پیدا ہو جاتا، جو مقصد ہدایت کے منافی ہوتا۔ چنانچہ تمام کتب و صحف مقدسہ کو انبیاء و مرسلین علیہم السلام پر نازل کیا گیا تاکہ یہ نفوس قدسیہ جو براہ راست تلامیذ الرحمٰن تھے، اپنے اقوال و افعال سے کلام خداوندی کے صحیح مفہوم و مقصد سے مخلوق مکلف کو آشنا کر کے ہدایت و صلاح کے مقصد کو صحیح معنوں میں پورا کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی صحیفہ یا کتاب بلا واسطہ پیغمبر نازل نہیں ہوئی۔

چنانچہ دستور خداوندی کے مطابق خدائے ذوالجلال کا آخری اور مکمل دستور العمل یعنی قرآن مجید بھی بالواسطہ نازل ہوا بلکہ اس کی ابلاغ اور تعلیم کے لئے حضور اکرم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو منتخب کیا گیا اور حضور کے کردار کو اسوہ حسنہ قرار دے کر آپ کی اطاعت کو لازمی اور دین کا جزو لاینفک قرار دیا گیا۔ اس مختصر سی بحث سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اسوۂ رسولؐ سے اعراض کر کے کوئی شخص قرآن حکیم کے صحیح مطالب سے آشنا نہیں ہو سکتا۔ اور بلا سمجھے بوجھے عمل کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ظاہر ہے کہ رسول آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و اعمال سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے ہمیں لا محالہ احادیث نبوی اور فقہائے امت کی تشریحات کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ چونکہ اکابر امت اس حقیقت سے پوری طرح باخبر تھے اس لئے انہوں نے صحیح احادیث اور استنباط احکام میں بڑی جگر کاوی کی۔ احادیث کی صحت کو جانچنے کے لئے اس قدر حزم و احتیاط سے کام لیا کہ اس سے زیادہ بشری امکان میں نہیں۔ چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لئے وہ خاص قاعدے وضع کئے گئے جو اصول روایت اور اصول درایت کے نام سے معروف ہیں۔

اصول روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ :-

۱۔ کوئی روایت تاریخ مشہور کے خلاف نہ ہو۔
۲۔ " " وقت حال کے قرینہ کے خلاف نہ ہو۔
۳۔ " " اقتضائے عقل و شرع کے خلاف نہ ہو۔
۴۔ " " رسول اللہ کے اخلاق حسنہ کے منافی نہ ہو۔
۵۔ " " قرآن کریم سے متصادم نہ ہو۔

اصول روایت کو انتہائی بلند معیار تک پہونچانے کے لئے ایک الگ اور مستقل فن ایجاد کیا گیا جو اصطلاح میں فن جرح و تعدیل اور عرف عام میں فن رجال کے نام سے مشہور ہے۔ فن رجال فن انساب ہی سے متضمن ہے۔ جس کے تحت تمام راویان حدیث کے حالات و کوائف بڑی تحقیق و تدقیق کے ساتھ جمع کئے گئے اور اس ضمن میں کسی رو رعایت سے کام نہیں لیا گیا۔ چنانچہ روایت کے لحاظ سے احادیث کی متعدد اقسام قرار دی گئیں۔ جن کی مجمل تشریح درج ذیل ہے۔

۱۔ صحیح :- وہ حدیث جس کے راویوں کا پورا سلسلہ نہایت معتبر ہو اور حدیث میں کوئی بات عقائد مروجہ کے خلاف نہ ہو۔
۲۔ حسن :- وہ حدیث جس کے سلسلہ رواۃ میں کوئی راوی کم درجہ کا ہو یا اسناد نامکمل ہوں۔

۳۔ ضعیف :- وہ حدیث جس کا راوی مشتبہ ہو اور روایت میں کوئی بات مشتبہ ہو۔
۴۔ مدرج :- وہ حدیث جس کے راوی الفاظ رسولؐ کی بجائے کہیں کہیں اپنے الفاظ بھی استعمال کئے ہوں۔
۵۔ متروک :- وہ حدیث جس کا ایک ہی راوی ہو اور اس کی روایت ضعیف سمجھی جاتی ہو۔
۶۔ مسند :- وہ حدیث جس کی روایت کا سلسلہ نہایت معتبر ہو اور غیر منقطع ہو اور کسی صحابی تک پہونچے۔
۷۔ مسلسل الحلف :- وہ حدیث جس کی ہر راوی نے قسم کھا کر اور ہاتھ پر ہاتھ مار کر روایت کی ہو۔
۸۔ عالی :- وہ حدیث جس کی اسناد مکمل اور مختصر ہوں یعنی پہلے اور آخری راوی کے درمیان بہت کم فاصلہ ہو۔
۹۔ متصل :- وہ حدیث جس کے راویوں کا سلسلہ غیر منقطع ہو۔
۱۰۔ منقطع :- وہ حدیث جس کے راویوں کا سلسلہ درمیان میں ٹوٹ جائے یعنی تابعین کے طبقہ کا کوئی راوی نہ ہو۔
۱۱۔ موضوع :- وہ حدیث جو روایت اور مفہوم کے لحاظ سے غلط قرار دی جا چکی ہو۔
۱۲۔ مرسل :- وہ حدیث جس کا راوی کوئی تابعی ہو لیکن یہ معلوم نہ ہو کہ اس نے کس صحابی سے روایت کی ہے۔
۱۳۔ معنعن :- وہ حدیث جس کی اسناد صرف سماعی ہوں اور عن فلاں وعن فلاں سے روایت کی گئی ہو۔
۱۴۔ مبہم :- وہ حدیث جس کا کوئی راوی غیر متعین ہو۔
۱۵۔ متواتر :- وہ حدیث جس کو علیحدہ علیحدہ بہت سے لوگوں نے بیان کیا ہو اور وہ سب معتبر و ثقہ ہوں۔
۱۶۔ مشہور :- وہ حدیث جس کو کم از کم تین معتبر طبقوں کے راویوں نے بیان کیا ہو۔
۱۷۔ عزیز :- وہ حدیث جس کو علیحدہ علیحدہ راویوں نے بیان کیا ہو۔
۱۸۔ احاد :- وہ حدیث جس کو ایک ہی راوی نے بیان کیا ہو۔
۱۹۔ غریب مطلق :- وہ حدیث جس کو صرف ایک تابعی نے بیان کیا ہو۔
۲۰۔ مرفوع :- وہ حدیث جس میں صحابہ کے اقوال و افعال کے ساتھ رسولؐ اللہ کا ذکر بھی ہو۔
۲۱۔ موقوف :- وہ حدیث جس میں صرف صحابہ کے اقوال و افعال کا ذکر ہو۔
۲۲۔ مقطوع :- وہ حدیث جس میں صرف تابعین کے اقوال و افعال کا ذکر ہو۔

منکرین حدیث کا احادیث پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ ان میں ہر طرح کا رطب و یابس بھرا پڑا ہے اس لئے ممکن نہیں کہ ان میں سے کسی کو صحیح یا غلط قرار دیا جائے یہ درست ہے کہ بعض مطلب اللیل قسم کے حضرات نے بلا تحقیق احادیث کا ایک انبار لگا دیا اور بعض دنی الطبع لوگوں نے وضع احادیث کا کاروبار شروع کر دیا لیکن آخر اصول روایت و درایت کس مرض کا علاج ہیں۔ اگر روایت احادیث یہ کوتاہیاں سرزد نہ ہوئی ہوتیں تو ان خاص دو معیاروں کو وضع کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی یہ معیار اسی لئے تو وضع ہوئے کہ کھرے اور کھوٹے کو الگ کیا جا سکے۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ احادیث کے صحیح ترین کہلانے والے مجموعوں مثلاً صحاح ستہ اور ان میں سے بھی بالخصوص صحیحین تک موضوع اور ضعیف روایات موجود ہیں، جو ان تمام مجموعوں کو ساقط الاعتبار بنا دیتی ہیں۔
یہ اعتراض اگرچہ بادی النظر میں معقول معلوم ہوتا ہے، لیکن غور کیا جائے تو یہ بھی محض اعتراض برائے اعتراض ہی کے سلسلہ میں ہے کیونکہ صحاح ستہ اور بالخصوص صحیحین میں موضوع اور ضعیف روایات کے شمول سے ان کی اہمیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ ہر حدیث

ساتھ اس کی اسناد بھی بیان کر دی گئی ہیں۔ جس سے ہر حدیث کی نوعیت واضح ہو جاتی ہے پھر اصول روایت کی کسوٹی ہمارے پاس موجود ہے۔

تیسرا اعتراض یہ ہے کہ جب جامعین احادیث کے پیش نظر یہ تمام اصول تھے تو انہوں نے اپنے احادیث کے مجموعوں میں کمتر درجہ کی احادیث کیوں شامل کیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ہر قسم کی احادیث کو قلمبند کر دینے سے ان کا یہ مقصد تھا کہ آئندہ وضع حدیث کا کاروبار بند ہو جائے چنانچہ وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب رہے اور اس کے بعد وضع حدیث کا سلسلہ منقطع ہو گیا کیونکہ سب کو معلوم ہو چکا تھا کہ ہر قسم کی احادیث مختلف مجموعوں میں شامل ہو چکی ہیں۔ چنانچہ اس کے بعد کوئی حدیث گھڑی نہیں گئی اور اس کے علاوہ اسی طرح ہر قسم کی روایات کے نمونے ہمارے سامنے آ گئے۔ ایسی صورت میں تمام احادیث کو مجموعہ مزخرفات قرار دینا سخت علمی بددیانتی ہے اور حدیث کی صحت سے انکار کرنا عقل سے زیادہ نہیں۔ کیونکہ کھرا اور کھوٹا الگ ہو چکا ہے اور جہاں شبہ ہو جانچنے کا معیار ہمارے پاس موجود رہے۔

اب یہ حضرات چونکہ احادیث سے تو تعلق ختم کر بیٹھے ہیں۔ اس لئے مسائل کے استنباط و استخراج کا اس کے سوا ان کے پاس کوئی ذریعہ نہیں کہ قرآن حکیم سے مسائل مستخرج کرنے کے لئے اپنی عقل و فہم پر انحصار کریں یہ بھی ظاہر ہے کہ ہر شخص کی فہم و فکر اور فراست و ذہانت یکساں نہیں ہوتیں۔ اس لئے تفسیر بالرائے ایک طرح کا کھلواڑ بن کر رہ گئی ہے اور ہر شخص اپنے ڈھائی چاول الگ پکا رہے ہیں معروف ہے جس کا نتیجہ انتشار و خلفشار کے سوا کچھ نہیں۔ حالانکہ اسی انتشار و افتراق سے محفوظ رکھنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کی تبلیغ کے لئے انبیاء و مرسلین علیہم السلام کو مبعوث فرمایا تھا اور ان کے کردار کو مثال و نمونہ قرار دے کر اس کی تقلید کو دین کا جزو اول قرار دیا گیا۔ چنانچہ قرآن حکیم کو شارع اسلام حضور اکرمؐ سے الگ کر دینے کے بعد قرآن کا کوئی مقصد ہی باقی نہیں رہتا۔

ابھی میں پرویز صاحب کا ذکر کر رہا تھا کہ انہوں نے تفسیر بالرائے کی مہم کو منظم طور پر چلایا، شروع شروع میں تو ان کی اس تحریک میں بڑی کشش محسوس ہوتی رہی کیوں جاتے خود میں بھی اس سے کسی حد تک متاثر ہوا اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ کل جدید لذیذ اور دوسری وجہ یہ کہ انہوں نے اس وقت تک کھل کر حدیث کا انکار نہیں کیا تھا۔ جب بعض علماء نے موصوف کے ان خیالات کو ہدف تنقید بنایا تو میں نے ضروری خیال کیا کہ اس باب میں پرویز صاحب کی رائے بھی معلوم کی جائے چنانچہ میں نے ایک خط لکھ کر ان سے دریافت کیا کہ آیا وہ واقعی منکر حدیث ہیں؟ یا ان کی مخالفت ہمارے مخالفت ہو رہی ہے اس کا جواب مجھے یہ ملا کہ پرویز صاحب صرف موضوع روایات کے خلاف ہیں اور اپنی احادیث سے انکار کرتے ہیں جو معارض قرآن ہوں یا جن سے شارع اسلام کی ذات پر طعن ہوتی ہو اس جواب سے میں مطمئن ہو گیا اور میں نے علماء کے احتجاج کو ان کی تنگ نظری پر محمول کر کے نظر انداز کر دیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ علماء کہلانے والوں میں سے اکثر حضرات باہم دست و گریبان رہتے ہیں۔ لیکن بعد میں پرویز صاحب اور زیادہ کھل کھیلے اور رسالت کا مفہوم ایسا قرار دیا جس سے رسول کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کو جو مقبولیت حاصل ہوئی تھی وہ بڑی حد تک ختم ہو گئی اور مجھے بھی ان کے متعلق اپنی رائے تبدیل کرنی پڑی۔ ان کے ساتھ اب صرف وہی لوگ رہ گئے ہیں جو دین کو اپنی مرضی کے تابع اور بازیچہ اطفال سمجھتے ہیں، پرویز صاحب کی اس تحریک کے ابتدائی دور میں ڈاکٹر غلام جیلانی برق نے بھی دو قرآن اور دو اسلام لکھ کر ان کی ہمنوائی کی۔ لیکن بعد میں وہ سنبھل گئے اور اس موضوع پر پھر خامہ فرسائی نہیں کی۔ بلکہ میرے ایک عریضہ کے جواب میں موصوف نے جو کچھ لکھا اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے اس مسلک سے رجوع کر لیا ہے۔

ان حالات کے پیشِ نظر تجدد پسند حضرات نے یہ سوچا کہ اس وقت تک اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ جب تک احادیث کا سہارا نہ لیں۔ چنانچہ احادیث کا سہارا لے کر افتراق و نفاق کی ایک اور مہم چلائی گئی اور عامۃ المسلمین کو متفق علیہ شعائرِ اسلامی سے برگشتہ کرنے کی کوشش کی گئی اس سلسلہ کی ایک کڑی۔ وہ مہم ہے جو قربانی کے خلاف شروع کی گئی۔ چنانچہ چند سال قبل بادشاہی مسجد لاہور کے خطیب غلام مرشد صاحب نے عید الاضحیٰ کی قربانی کے بدلے نقد رقم صدقہ دے دینے کے جواز کا فتویٰ صادر کردیا عوام اور علماء کے شدید احتجاج پر غلام مرشد صاحب کو تو اپنے فتویٰ کی تکرار اور اعادہ کی جرأت نہ ہوئی لیکن اس گروہ کے بعض دوسرے سرخیلوں نے قلمی طور پر اس مہم کو جاری رکھا۔ جن میں رحمت اللہ طارق پیش پیش ہیں۔ اس وقت زیر بحث رحمت اللہ طارق کا ایک مضمون ہے۔ جو "قربانی کی شرعی حیثیت" کے عنوان سے مئی ۶۳ء کے ماہنامہ "نصرت" لاہور میں شائع ہوا تھا

اس مضمون کے جواب کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ مضمون نگار نے قربانی کے خلاف مہم میں احادیث نبوی۔ آثارِ صحابہ، اور اجماعِ امت سے بھی استمداد کی ہے۔ ایسی صورت میں عام ذہن کا اس سے متاثر ہونا لازمی بات ہے اور کچھ لوگ وجوب قربانی کے باب میں شک و شبہ میں مصروف ہوگئے ہیں۔ اپنے اس مضمون میں طارق صاحب نے زیادہ تر مندرجہ ذیل امور پر زور دیا ہے۔

۱۔ قربانی واجب نہیں۔ اس کے وجوب کے قائل صرف امام ابوحنیفہؒ ہیں۔ جب کہ دوسرے امام تنہا وجوب کے قائل نہیں۔
۲۔ قربانی شارعِ اسلامؑ کا ذاتی فعل ہے جس پر عمل کرنے کی امت پابند نہیں۔
۳۔ اگر قربانی سنت ہے تو بھی مستحبات کے درجہ کی سنت ہے جس کے ترک یا اختیار میں ہر شخص آزاد ہے۔
۴۔ صحابہ بالاجماع اس کے ترک کے مؤید تھے۔
۵۔ صحابہ قربانی کے بدلے کے بھی قائل تھے۔
۶۔ سورہ کوثر سے قربانی کا استدلال بہت بعد یعنی آخریں صدی ہجری کی بات ہے اس سے پہلے کسی سلف نے سورۂ کوثر سے قربانی کا استنباط نہیں کیا علاوہ ازیں استدلال فاسد بھی ہے کیونکہ فقہاء و محدثین کے نزدیک مشترک المعانی الفاظ سے کسی خاص معنی کا تعین قرآن حکیم پر بہتان ہے اور نحر لفظِ نحر مشترک المعانی ہے۔

اگرچہ بعض علماء نے اس کے خلاف روزنامہ "آتشاں" اور رسائل و جرائد میں مضامین بھی لکھے۔ لیکن ان مضامین کی حیثیت مجموعی تھی اس لئے ان میں اس مضمون میں پیش کردہ دلائل کا پوری طرح احاطہ نہیں ہوسکا اور عام ذہن میں جو کھٹک پیدا ہوگئی تھی وہ پوری طرح دور نہ ہوسکی۔ جب سے میں نے طارق صاحب کا مضمون دیکھا تھا اسی وقت سے اس کا جواب لکھنے کا ارادہ کرلیا تھا۔ لیکن بوجوہ یہ ارادہ پایۂ تکمیل تک نہ پہونچ سکا اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ میں ایک ایسے دور افتادہ مقام پر مقیم ہوں جہاں کوئی اچھا کتب خانہ نہیں۔ اور نہ کوئی ایسا عالم ہی موجود ہے جس سے مدد لی جاسکے اور مجھ میں اتنی استطاعت نہیں کہ میں اپنا ذاتی کتب خانہ قائم کرسکوں۔ جو میری تمام ضروریات کو مستحضر ہو۔ ظاہر ہے کہ موصوف نے اپنے مضمون میں جن کتابوں سے حوالے پیش کئے ہیں، جب تک ان کا مطالعہ کرکے اصل و نقل کا مقابلہ نہ کرلیا جائے مضمون کا جواب لکھنا ممکن نہ تھا۔ اس کے علاوہ میری معاشی الجھنیں مجھے اتنی مہلت ہی کہاں دیتی ہیں کہ دل جمعی کے ساتھ اس قسم کے علمی کاموں میں مشغول ہوسکوں۔ چنانچہ میں نے اپنے ایک کرم فرما جناب جلال دین صاحب مقیم ٹونک راجستھان بھارت سے اس سلسلہ میں امداد چاہی۔ موصوف نے ازراہِ مہربانی ناسازیٔ طبع کے باوجود بڑی کاوش اور محنت سے جوابی مضمون لکھ کر مجھے بھیج دیا اور اس میں ترمیم و تنقیح کا مکمل اختیار بھی مجھے تفویض کردیا۔ اسی اختیار سے کام لیتے ہوئے میں نے اصل مضمون کی ترتیب جہاں مناسب خیال کیا بدل دی۔ اور کہیں کہیں حذف و اضافہ سے بھی کام لیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ طارق صاحب کے مضمون سے قربانی کے متعلق جو شبہات پیدا ہوسکتے ہیں یہ مضمون ان کا ازالہ کردے گا اور یہ بھی واضح ہوجائے گا کہ موصوف نے غلط حوالو

اور غلط تعبیرات سے کام لے کر بات کو کہاں سے کہاں تک پہونچا دیا ہے ۔

اب ذیل میں مضمون پر تفصیلی نظر ڈالی جاتی ہے ۔ تاکہ مضمون نگار کے دلائل کا جائزہ لے کر صحیح نتائج تک پہونچا جاسکے ۔

(وارث سرہندی)

طارق صاحب نے مضمون کی تمہید میں پیروانِ دین کو دو گروہوں میں تقسیم کیا ہے ایک وہ جو پوری طرح اپنی زندگی کو دین کے تابع کر لیتے ہیں ۔ دوسرے وہ جو کسی عقیدے کو تسلیم تو کر لیتے ہیں لیکن عملاً اس کی تائید نہیں کرتے ۔ چنانچہ وہ اس گروہ کے متعلق رقم طراز ہیں ۔

" اس دوسرے گروہ کی نفسیات عجیب و غریب ہوتی ہیں ۔ ایک طرف تو ان کی دینی وفاداری عقیدے کے ساتھ ہو لیتی ہے لیکن دوسری طرف اُن کی خواہش ، ارادے اور سوچ کی تہذیب عقیدے کے مطابق نہیں ہوتی ۔ اس لئے عقیدہ اور ذاتی خواہش برسرِ پیکار رہتے رہتے ہیں ۔ چنانچہ یہاں انسان مفاہمت کی کوئی صورت تلاش کر لیتا ہے ۔ یعنی عقیدہ بھی برقرار ہے اور ذاتی خواہش کی تکمیل کا کوئی جواز بھی نکل آئے چنانچہ پہلا گروہ اس لئے کہ زیادہ سے زیادہ عقیدت کی حقیقت کو اپنی زندگی میں راسخ کر سکے ۔ اور دوسرا گروہ اس لئے کہ وہ اپنے اعمال کا کوئی جواز پیدا کر سکے ۔ مختلف اوقات میں عقائد کے ماخذوں کی طرف رجوع کرتے ہیں مثلاً مسلمانوں کا ایک بہت بڑا گروہ کثرت اس قسم کا سوال کرتا دکھائی دیتا ہے کہ فلاں مسئلہ کی شرعی حیثیت کیا ہے ۔"

" یہاں ایک نکتے کی بات ملحوظ رہے کہ جس طرح ہر چیز کا ایک خارجی پیکر اور باطنی مفہوم ہوتا ہے اسی طرح ادیان کا بھی ایک خارجی لباس اور ایک روح معنوی ہوتی ہے ۔ خارجی لباس معتقدات اور رسومات ہیں اور روح معنوی وہ حقیقت ہے جس کو اپنی ذات میں رچا لینا ہی ادیان کا اصل مطالبہ ہوتا ہے ۔ ہوتا یہ ہے کہ مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ خارجی لباس تو رہ جاتا ہے لیکن روح معنوی پردہ بیز ہیں ۔ چڑھ جاتی ہیں اور تب لوگ اس طرح سوال کرتے دکھائی دیتے ہیں کہ فلاں مسئلہ کی شرعی حیثیت کیا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم روح اسلام یا حقیقتِ اسلام سے آشنائی پیدا کر لیں اور اپنی سوچ اور اپنے ارادے کو اس حقیقت کے تابع کر لیں تو ایسے سوالات کا جواب خود ہمیں اپنی ذات ہی سے مل جایا کرے ۔ ایک مسلمان کا کسی مسئلے کے بارے میں یہ پوچھنا کہ اسلام اس بارے میں کیا کہتا ہے اجتماعِ ضدین معلوم ہوتا ہے ۔ اسلام کوئی دیومالائی افسانوی اور اساطیری مذہب نہیں اور نہ ہی یہ چند عقائد کا مجموعہ ہے یہ تو ایک طرزِ احساس ، طریقِ فکر اور اندازِ زیست ہے ، اور مسلمان وہی ہو سکتا ہے جو اس طرزِ احساس ، طریقِ فکر اور اندازِ زیست کا حامل ہو اور جب ہم یہ کہتے ہیں کہ کوئی انسان کسی مخصوص اندازِ زیست کا حامل ہے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ مسائلِ حیات کو ایک زاویۂ نظر سے دیکھنے اور مخصوص طریق کار کے ساتھ ان مسائل کو حل کرنے کا عادی ہے ۔ اگر مسلمان اسلام کو ایک طرزِ احساس ، ایک طریقِ فکر اور ایک اندازِ زیست کے طور پر اپنا سکتے تو اسلامی کتب خانوں میں فتاویٰ کے مجموعوں کی اتنی زیادہ تعداد نہ ہوتی اور نہ مسلمانوں کو یہ سوال تنگ کرتا کہ اسلام اس بارے میں کیا کہتا ہے اسلامی فکر کی تاریخ میں بہت سے مسائل کی شرعی حیثیت متعین کرنے کا مسئلہ مسلسل اٹھتا رہا ہے اور اپنے اپنے دور میں اسلام کے مزاج شناسوں نے ، اپنے مسائل حل کرنے کی مساعی کی ۔ لیکن ان مساعی کا انجام یہ نکلا کہ اسلام کے ماخذِ اول یعنی قرآن اور حیاتِ رسولؐ نظروں سے اوجھل ہونے لگے اور مسائل کے استنباط میں قرآن اور قولِ رسولؐ سے زیادہ اکابرِ امت کے اقوال کو اہمیت دی جانے لگی ۔ چنانچہ قرآن ، قولِ رسولؐ اور اقوالِ اکابر کی اہمیت میں حفظِ مراتب قائم نہ رہ سکا ۔ اسی طرح سے قولِ رسولؐ کی ہدایت اور منشا کا تجزیہ کرنے کی کوشش بھی مفقود ہو گئی ۔"

اس تمہید کی روشنی میں دیکھا جائے تو کیا مضمون نگار کا رشتۂ فکر اس دوسرے گروہ سے وابستہ نظر نہیں آتا ۔ جو عقیدہ اور عمل کے تضاد کا شکار ہونے کے باعث ذاتی خواہشوں کی تکمیل کے نئے جواز کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے کیا ایسا نہیں ہے کہ صاحب

مضمون اپنی ذاتی خواہش کی اتباع میں اپنے عملی تضاد کا جواز تلاش کرنے کے لئے لایعنی تاویلات کا سہارا لے کر قربانی کو ختم کرنے کے درپے ہیں۔ کیونکہ جو لوگ اپنی تمام تر خواہشات کو دینی تقاضوں کے سامنے ختم کر دیتے ہیں وہ قربانی اور انفاق مال کے معاملہ میں گریز و فرار کی راہیں تلاش نہیں کیا کرتے ہیں۔ ایسا (؟) لوگ کرتے ہیں۔ جو دین کی آڑ میں ذاتی خواہشات کی تکمیل کے بہانے تلاش کرتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ مضمون نگار کی یہ کوشش اسی دوسرے گروہ کی طرز فکر سے وابستہ ہے۔

آگے چل کر موصوف کا دین کے خارجی اور داخلی پہلو کی نشاندہی کرتے ہوئے معتقدات اور رسوم کو ایک سمجھنا ہی غلط ہے اور پھر معتقدات کا تعلق دین کے خارجی پہلو سے قائم کرنا ایک بوالعجبی سے کم نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عقائد روح ہیں اور اعمال و رسوم کی حیثیت خارجی لباس کی سی ہوتی ہے۔ کیونکہ عقائد کا تعلق قلب و دماغ سے ہوتا ہے اور افعال کا اعضاء و جوارح سے جس طرح جسم روح کا مظہر ہوتا ہے اسی طرح اعمال عقائد کے مظہر ہوتے ہیں۔

اس سے بھی عجب تر بات جو مضمون نگار نے بیان کی ہے وہ یہ ہے کہ مسلمان کے لئے کسی مسئلہ کی شرعی حیثیت دریافت کرنا اسلام سے وفاد ہوتا ہے حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے یہ سوال کہ فلاں معاملہ کی شرعی حیثیت کیا ہے صرف اسی شخص کو بے چین کرتا ہے جس نے اسلام کو ایک طرز احساس، طریق فکر اور انداز زیست کی حیثیت سے اپنا لیا ہو۔ جس شخص کے رگ و پے میں اسلام سرایت کر گیا ہو۔ اسی کو یہ فکر دامن گیر ہو گی کہ ہر معاملہ میں شرعی حکم معلوم کرے تاکہ اس کا کوئی قدم شرعی احکام کے خلاف نہ اٹھ جائے اس کے برخلاف جس شخص کا تعلق اسلام سے برائے نام ہو گا۔ اس کو ہر معاملہ میں شرعی حکم معلوم کرنے سے کوئی دلچسپی نہ ہو گی۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر مسلمان نہیں تو کیا کوئی کافر یہ معلوم کرتا پھرے گا کہ فلاں معاملہ میں اسلام کا کیا حکم ہے اگر موصوف کا منشا یہ ہے کہ جو شخص اسلام کو طرز فکر طریق احساس اور انداز زیست کی حیثیت سے اپنا لیتا ہے اس پر بغیر کسب اکتساب کے ہر مسئلہ کا شرعی پہلو خود بخود منکشف ہو جاتا ہے۔ تو ایسی صورت میں سوائے رسول اکرم کے کوئی شخص بھی امت محمدیہ میں مسلم کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ احکام شرعی کے منکشف و ملہم ہونے کا سلسلہ اُسی ذات بابرکات پر ختم ہو چکا ہے۔ صحابہ کرام بھی حضور سے اسلامی مسائل کی شرعی حیثیت دریافت کیا کرتے تھے، کیا وہ بھی روح اسلام سے ناآشنا تھے، اگر نہیں تو ایسے اسلام پسند افراد کو جو مسائل کی شرعی حیثیت معلوم کرنے کے خواہاں ہوں۔ روح اسلام سے ناآشنا قرار دینا دین کے ساتھ بھونڈا مذاق اور نیاز مندی نہیں تو اور کیا ہے۔ یہ کہنا حقیقت کو مسخ کرنا ہے کہ فتاویٰ کے انبار نے اسلام کے اصل خدوخال کو نظروں سے اوجھل کر دیا ہے عوام ہوں یا خواص کوئی بھی کسی امام مجتہد کی تقلید اس خیال سے نہیں کرتا کہ وہ امام کو رسول اکرم پر ترجیح دیتا ہے بلکہ یہ سمجھ کر تقلید و اتباع کرتا ہے کہ اس امام نے قرآن اور ایمائے رسول کو سامنے رکھ کر مسائل کا استنباط کیا ہے۔ اکابر امت، اکابر اسی لئے ہیں کہ انہوں نے ایمائے رسول کو معلوم کرنے کی بیش از بیش سعی کی۔ اور اپنی طرف سے اس مقصد کے حصول میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور پھر رسول اکرم سے جو جتنا زیادہ قرب زمانی و روحانی رکھتا ہے وہ اتنا ہی زیادہ ایمائے رسول کو سمجھ سکتا ہے۔ اسی لئے اکابر امت کی آراء پر اعتماد کیا جاتا ہے اور ایسا ہی ہونا چاہیئے۔

فتاویٰ کا انبار شریعت اسلامی کے لئے شرم کی بات نہیں بلکہ فخر کی بات ہے کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ صلحائے امت نے ایمائے رسولؐ کو معلوم کرنے کی سعی بلیغ کی اور دقیقہ رسی سے کام لیا ہے اس ضمن میں جہاں کہیں اختلاف آراء پیدا ہو گیا ہے تو وہ بھی نیک نیتی پر مبنی ہے اور اس کی اساس بھی قرآن اور ایمائے رسول ہی ہے۔ ایسی صورت میں فتاویٰ کے انبار کو ہدف مطاعن بنانا انتہا درجہ کی ناشکر گذاری ہے۔

یہ درست ہے کہ بعض احکام ایسے بھی ہیں جن میں شارع اور امت کے بقیہ افراد کے درمیان کچھ فرق ہے لیکن اس فرق کو معلوم

کہنا ہر کس و ناکس کا کام نہیں ۔ اس فرق کو اللہ اور رسول کے بعد وہی نفوس قدسیہ واضح کر سکتے ہیں جو اسلام کے مزاج شناس اور علوم اسلامی کے بحرِ زخار کے شناور ہیں اس تمہید کے بعد اب آیئے نفسِ مضمون کی طرف مضمون کے آغاز میں طارق صاحب نے ابن رشد کی کتاب "بدایت المجتہد" کے حوالہ سے یہ عبارت درج کی ہے ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد جب صیغۂ امر سے ہو تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک وجوب پر دلالت کرے گا ۔ لیکن علما امت کا کہنا ہے کہ اوامرِ نبوی فرداً فرداً ہوں خواہ بالجملہ ان سے سنت محسنہ کا استنباط ہو سکتا ہے ، وجوب وغیرہ کا نہیں ۔

اس کے بعد دوسری وضاحت اس طرح ہے کہ

قربانی کے بارے میں وارد احادیث کا مفہوم متعین کرنے میں فقہاء کا اختلاف ہی دراصل اس کی شرعی حیثیت متعین کرنے میں تضاد اور اختلاف کا موجب بنا ۔"

بدایت المجتہد کی کتاب ۔۔۔۔۔ کا باب اول اس وقت سامنے ہے مگر کہیں بھی ایسی عبارت نظر نہیں آئی جس کا یہ ترجمہ یا مفہوم ہو سکے ۔ ابن رشد تو خود کتاب کے خطبہ میں فرما رہے ہیں ۔

" والاوامر ان فہم منہ الجزم وتعلق العقاب تبد کہ سمی واجباً ان فہم منہ الثواب علی الفعل والا نتفاء العقاب مع الترک سمی ندباً ۔"

اس سے ظاہر ہے کہ علامہ ابن رشد کی یہ رائے نہیں کہ اس سے صرف سنت کا استنباط ہی ہو سکتا ہے ۔ ابن رشد کی طرف من گھڑت عبارت کو منسوب کرنا اور پھر موصوف کی رائے کے خلاف اوامر کے معنی بیان کر کے اس کا ذمہ دار انہیں ٹھہرانا حد درجہ کی جسارت ہے ۔ امام ابوحنیفہ سے عناد و تعصب کی بنا پر ایسی عبارت گھڑی جا رہی ہے ۔ جس سے یہ سمجھا جائے کہ ابن رشد ایک طرف امام اعظم کو رکھتے ہیں اور دوسری طرف علماء امت کو یا امام ابوحنیفہ کا شمار علماء امت میں ہوتا ہی نہیں ۔

اس کے ساتھ ہی ابن رشد کی اس عبارت " وعلی حدیث بلال وفی الغرض الذی یحتج بہ فیہ فالاحتجاج بہ ضعیف " کا ترجمہ یہ کیا " جو حدیث بھی مقصدِ اصلی (وجوب قربانی) کی طرف واضح مفہوم لیکر رہنمائی کرنے سے قاصر ہے ، اسے (وجوب کی) دلیل بنانا ضعیف (اور کمزور اسلوب) ہے "

قوسین میں وجوب قربانی اور وجوب کے الفاظ لکھ کر طارق صاحب نے مغالطہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے ۔ تاکہ یہ ظاہر ہو سکے کہ ابن رشد وجوب قربانی کے مویدین سے مخاطب ہیں ۔ اور کمزوری استدلال کا الزام ان پر عائد کرتے ہیں اگر قوسین میں وجوب قربانی اور وجوب کی جگہ عدم وجوب قربانی اور عدم وجوب کے الفاظ رکھ دئے جائیں تو کیا اس سے یہ بھی تو کیا جا سکتا ہے کہ علامہ کا روئے سخن منکرین وجوب کی طرف ہے آخر طارق صاحب کے پاس اس کا کیا قرینہ ہے ، حالانکہ علامہ موصوف نے ایک عام قاعدہ بیان کیا ہے اور وجوب یا عدم وجوب کے متعلق اپنا کوئی فیصلہ نہیں دیا بلکہ دونوں طرف کے دلائل بیان کر دئے ہیں ایسی صورت میں ان کو منکرین وجوب کا حامی قرار دیکر سند بنانا علمی و تحقیقی دیانت کے منافی ہے مضمون نگار نے المحلی کے حوالے سے یہ روایت بیان کی ہے ۔

" عن ابی سریحۃ بن اسید الغفاری قال لقد رایت ابابکر وعمر وما یضحیان کراہیۃ ان یقتدی بہما " یعنی حضرت حذیفہ فرماتے تھے کہ میرا پیارا نا کا مشاہدہ ہے (اور میں نے ہر بار اس کو نوٹ کیا ہے) کہ ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما اس خیال سے قربانی کرنا مکروہ جانتے تھے کہ لوگ ان کی اقتداء کر کے ضروری سمجھ کر قربانی کے عادی نہ بن جائیں ۔"

یہ روایت کئی طریقوں سے مروی ہے اور اس پر ضعیف ہونے کا الزام بھی ہے تاہم اگر صحیح بھی ہو جیسا کہ صاحب ہدایہ نے تحریر کیا ہے ۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیخین حالت اعسار (تنگی) میں قربانی نہیں فرماتے تھے۔ تاکہ لوگ یہ نہ سمجھنے لگیں کہ معسرین پر بھی قربانی واجب ہے۔ ورنہ سوچنے کی بات ہے کہ اس زمانہ میں جس میں وہ قربانی نہیں کرتے تھے۔ اگر ذی استطاعت ہوتے تو یہ کس طرح ممکن تھا کہ قربانی کو چھوڑ دیتے کیونکہ قربانی کی فضیلت تو ابن حزم تک کو تسلیم کیا ہے بلکہ خود مضمون نگار نے بھی اس کے وجوب سے انکار کرتے ہوئے اس کی سنت ہونے کا اقرار کیا ہے اگر شیخین رضی اللہ عنہما قربانی نہیں فرماتے تھے تو ایسا ان کے ذی استطاعت نہ ہونے کی وجہ سے تھا اور معسر پر قربانی واجب ہونے کا کوئی بھی قائل نہیں ہے۔ اس کے بعد مضمون نگار نے المحلیٰ سے حضرت ابو مسعود عقبیٰ بن عمر البدری کا یہ قول مع ترجمہ درج کیا ہے۔

"لقد هممت عن ادع الاضحية واني لمن ايسركم مخافة عن يحسب الناس انها حتما واجب" یعنی باوجود مسلمانوں کی بہت اور تیسیر کے خیال سے قربانی ترک کر دینے کا ارادہ تک کر چکا ہوں کیونکہ یہ اندیشہ ہے کہ یہ لوگ اسے فرض (حتمی) اور واجب سمجھ لیں گے۔"

حالانکہ اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ باوجودیکہ کہ تم میں سے موسر ترہوں مگر اس اندیشہ سے کہ لوگ قربانی کو واجب سمجھنے لگیں۔ میں نے اس کے چھوڑ دینے کا ارادہ کر لیا ہے۔

اس اثر سے کسی طرح بھی عدم وجوب ثابت نہیں ہوتا۔ کیونکہ موسر تر ہونے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اتنے موسر تھے کہ ان پر قربانی واجب ہوتی اور غیر موسر پر وجوب کا کوئی بھی قائل نہیں۔ دوسرے ایسا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ انہوں نے واقعی قربانی ترک کر دی نیز اس اثر کے آخری ٹکڑے ...... فاقہ ...... الخ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ لوگ معسر ہونے کے باوجود قربانی کرنے کے خواہشمند ہوں گے۔

اس کے بعد مضمون نگار نے المحلیٰ ابن رشد اور ابن حزم کے حوالے سے حضرت بلالؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے دو اثر نقل کئے ہیں۔ جو یہ ہیں:-

۱- ماكنت ابالي لو ضحيت بديك ولان اخذ ثمن الاضحية فاتصدق به على مسكين مقتر فهو احب الي من ان اضحي۔

۲- اشتريها لحماً ومن لعيك فقل هذه اضحية ابن عباس۔

حضرت بلالؓ کی مرغ کی قربانی اور حضرت عبداللہ بن عباس کی دو درہم کے گوشت کی قربانی سے یہ کب ثابت ہوتا ہے کہ وہ اس وقت موسر بھی تھے۔ اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ حالت اعسار میں ہونے کے باوجود عید قربان پر قربانی کا ..... شوق پورا کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ بطور صدقہ خرچ کر دینا ضروری سمجھتے تھے۔

"من رأى هلال ذى الحجة فاراد ان يضحى فلا ياخذن من شعره ولا من اظفاره حتى يضحى"

اس حدیث سے فقہا نے استدلال کیا ہے کہ چونکہ شرائط قربانی واجب ہیں اس لئے قربانی بھی واجب ہے۔

طارق صاحب کا جواب یہ ہے کہ چونکہ قربانی ہر مسلم کے ارادہ سے وابستہ ہے اس لئے یہ واجب یا فرض نہیں ہو سکتی۔ شرائط کی پابندی اس طرح ہے جس طرح نفل نماز کے لئے بھی جملہ ارکان نماز کی پابندی ضروری ہے۔

یہ درست ہے کہ محض شرائط کی پابندی کے باعث کسی عمل کی فرضیت یا وجوب پر استدلال نہیں کیا جا سکتا لیکن اس حدیث سے عدم وجوب بھی تو ثابت نہیں ہوتا اور نہ حدیث میں قربانی کو لوگوں کی مرضی پر منحصر کیا گیا ہے اس حدیث میں "ارادہ" کے لفظ سے یہ کسی طرح ثابت نہیں ہوتا کہ یہ واجب نہیں بلکہ لوگوں کی مرضی پر منحصر ہے واجب اور فرض عبادات کے لئے بھی پہلے ارادہ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ یہ کسی عبادت کی فرضیت یا وجوب کا نقیض نہیں۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ قربانی ہر شخص پر بلا لحاظ عسر و یسر واجب نہیں جس طرح نماز فرض ہے بلکہ موسر پر واجب ہے اور معسر اس کا مکلف نہیں۔ اس لئے اس حدیث میں "ارادہ" کے لفظ سے اس کے عدم وجوب پر استدلال نہیں کیا جا سکتا

اس حدیث "من وجد سعۃ فلم یضح فلا یقربن مصلانا"

پر طارق صاحب کو یہ اعتراض ہے کہ اس کا راوی عبداللہ بن عیاش بن عباس "نہایت درجہ مجروح اور ناقابل اعتبار ہے" حالانکہ معترض کے پیر و مرشد ابن حزم نے ان کو "لیس معروفا بالثقۃ" لکھا ہے اور ابن حجر نے "تقریب التہذیب" میں "صدوق یغلط" کہا ہے اس نرم جرح کے مقابلہ میں طارق صاحب کی یہ سخت جرح کوئی وقعت نہیں رکھتی۔

اس کے بعد طارق صاحب نے یہ حدیث "کتب علی النحر ولم یکتب علیکم" پیش کر کے اس پر تنقید کی ہے کہ اس کی اسناد میں جعفر الجعفی کذاب ہے بلکہ اعلیٰ درجہ کا کذاب ہے معلوم نہیں معترض کو یہ حدیث پیش کرنے اور اس پر جرح و تنقید کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی کیونکہ یہ حدیث عدم وجوب قربانی کے ثبوت میں پیش کی جاتی ہے۔ ہمیں خود تسلیم ہے کہ یہ حدیث کمزور ہے لہٰذا اس سے عدم وجوب کا استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ اگر یہ حدیث قائلین وجوب کی طرف سے پیش کی جاتی تو اس پر طارق صاحب کی تنقید کا کوئی مقصد ہو سکتا تھا۔ موجودہ صورت میں بصورت موجودہ ان کا اعتراض نہ صرف فضول ہے بلکہ اس سے معترض موصوف کے مسلک پر بھی زد پڑتی ہے۔

آخر میں معترض نے سورۂ کوثر کی آیت "فصل لربک وانحر" سے استدلال وجوب قربانی پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا ہے:-

"فقہاء کا آخری سہارا سورۂ کوثر میں ـــــ "فصل لربک وانحر" کا فقرہ ہے۔ لیکن محدثین کہتے ہیں کہ کوئی لفظ جب مشترک المعانی اور متعدد مفاہیم کا متحمل ہو تو اس سے کسی خاص مفہوم کا تعین کرنا قرآن پر بہتان ہے۔ چنانچہ کسی ایک صحابی سے بھی نحر کے معنی قربانی منقول نہیں ہوئے۔ سب سے پہلے مجاہد متوفی ۱۰۴ھ اور اسماعیل بن ابی خالد متوفی ۱۴۶ھ نے یہ شوشہ چھوڑا اور اس طرح قربانی کا ثبوت قرآن سے پیش کیا جانے لگا۔ اعاذنا اللہ من شرور انفسنا"

لفظ "نحر" قربانی کرنے اور دیگر معانی میں مشترک ہے اور صاحب مضمون کا کہنا ہے کہ جب کوئی لفظ مشترک المعانی ہو اور متعدد مفاہیم کا متحمل ہو تو اس سے کسی خاص مفہوم کا تعین کرنا قرآن پر بہتان ہے۔

یہ خیال سراسر غلط ہے۔ قرآن میں صرف یہی ایک مشترک المعانی لفظ استعمال نہیں ہوا، بلکہ متعدد ایسے لفظ موجود ہیں۔ مثلاً لفظ "قروء" کے معنی طہر اور حیض دونوں کے ہیں یہ لفظ نہ صرف مشترک المعانی بلکہ متضاد المعانی ہے۔ امام ابوحنیفہ نے اس سے حیض مراد لیا ہے اور امام شافعی نے طہر۔ اگر لفظ مشترک سے کوئی مخصوص معنی مراد لینا قرآن پر بہتان ہے تو پھر کلام اللہ میں جتنے الفاظ اس قبیل سے ہیں ان سے کوئی حکم مستخرج نہیں ہو سکتا۔

واقعہ یہ ہے کہ حنفی اصول فقہ کی رو سے لفظ مشترک کے کسی متعین معنی کے اعتقاد کا تعلق ہے اس میں توقف کرنا اولیٰ ہے۔ لیکن جہاں تک عمل کا تعلق ہے ادلہ و امارات پر غور کرنے کے بعد جو پہلو واضح نظر آئے گا اس پر عمل کیا جاتا ہے[1]۔ اس لئے "والنحر" سے "اور قربانی کیجئے" کے معنی مراد لے کر نہ تو احناف نے قرآن پر بہتان باندھا ہے اور نہ اپنے اصول کے خلاف کوئی کام کیا ہے۔ جب خبر احاد یا قیاس یا سیاق و سباق وغیرہ سے مشترک کے ایک معنی متعین کر لئے جائیں تو پھر وہ مشترک نہیں رہتا بلکہ ماؤل ہو جاتا ہے اور اس پر عمل واجب ہوتا ہے، گو غلطی کا احتمال باقی رہتا ہے[2]۔

اگر "نحر" کے معنی آیت مذکورہ میں قربانی کی بجائے نماز میں سینہ پر ہاتھ باندھنا یا دعا میں سینہ تک ہاتھ اٹھانا لئے جائیں تو کیا طارق صاحب اس کو قرآن پر بہتان سے تعبیر کریں گے۔ کیا "قروء" سے امام ابوحنیفہ نے حیض اور امام شافعی نے طہر مراد لے کر قرآن پر بہتان باندھا ہے؟ یہ ادعا بھی عجیب و غریب ہے کہ مجاہد متوفی ۱۰۴ھ اور اسماعیل بن ابی خالد متوفی ۱۴۶ھ نے پہلی مرتبہ سورۂ کوثر میں "نحر" کے

---

[1] نور الانوار: مبحث المشترک [2] مبحث المؤول

معنی قربانی بیان کئے ہیں۔

مجاہد اور اسماعیل بن ابی خالد کے نام کے ایک سے زیادہ راوی گزرے ہیں۔ اگر مضمون نگار ان کا پتہ بتا دیتے تو معلوم کیا جا سکتا کہ کس نے کس موقع پر کیا کہا۔ بہرحال خود "محلی" ابن حزم میں (جس سے مضمون نگار نے اکثر استناد کیا ہے) یہ عبارت درج ہے:۔

" وذکروا قول اللہ تعالیٰ فصل لربک وانحر قالوا: ھو الاضحیۃ "[1]

ابن حزم کی وفات ۴۵۶ھ میں ہوئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پانچویں صدی کے اوائل میں یہ تفسیر موجود تھی۔ پھر یہ کہنا کہ ساتویں یا آٹھویں صدی میں یہ شوشہ چھوڑا گیا کہاں تک درست ہے؟ نیز محمد جریر طبری نے عکرمہ، حسن، انس بن مالک، عطا، مجاہد اور سعید بن جبیر وغیرہم سے اپنی تفسیر سورہ کوثر میں جو روایات درج کی ہیں، ان میں "نحر" سے قربانی ہی مراد لی گئی ہے۔

ابن جریر کی وفات ۳۱۰ھ یا ۳۱۱ھ میں ہوئی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تیسری صدی میں یہ تفسیر عام تھی۔ "انوار التنزیل" تفسیر قاضی بیضاوی متوفی ۶۸۵ھ میں بھی یہی تفسیر موجود ہے، امام فخر الدین رازی متوفی ۶۰۶ھ اپنی تفسیر کبیر میں اس آیت سے متعلق فرماتے ہیں:۔ " وھو قول عامۃ المفسرین ان المراد ھو نحر البدن " اور پھر آگے اس تفسیر کی ترجیح کے وجوہ بیان کئے ہیں۔

شیخ الاسلام ابو العباس ابن تیمیہ متوفی ۷۲۸ھ نے ایک مستقل رسالہ سورہ کوثر کی تفسیر میں لکھا تھا، جس کا اردو ترجمہ عبدالرزاق ملیح آبادی نے کیا، جو الہلال بک ایجنسی، شیرانوالہ دروازہ، لاہور سے ۱۳۴۴ھ میں شائع ہوا۔ اس میں بھی شیخ موصوف نے "نحر" کے معنی قربانی ہی لئے ہیں۔

غالباً یہ مجاہد اور اسماعیل، دونوں وہی حضرات ہیں جن کا ذکر ابن حزم نے صفحہ ۳۵۷ پر کیا ہے اور لکھا ہے:۔ " وما نعلمہ احد قبلہم قال انہا الاضاحی " اگر ایسا ہے تو ظاہر ہے کہ یہ لوگ کم از کم تیسری یا چوتھی صدی ہجری کے ہوں گے کیونکہ ابن حزم کی وفات ہی ۴۵۶ھ میں ہوئی تھی۔ اس زمانہ میں مجاہد بن جبر مخزومی، مجاہد بن موسیٰ خوارزمی ختلی اور مجاہد بن وردان مدنی گزرے ہیں ان میں سے ایک کو امام ابن حجر عسقلانی نے "تقریب التہذیب" میں ثقہ و امام تفسیر، دوسرے کو ثقہ اور تیسرے کو صدوق کہا ہے ان میں سے پہلے مجاہد سے جمیع اصحاب سنن نے اور بقیہ دونوں سے شیخین کے علاوہ بقیہ نے روایت کی ہے۔ اسماعیل بن ابی خالد کے نام کے بھی ایک سے زیادہ راوی اس زمانہ میں گزرے ہیں۔ ان میں سے ایک احمسی اور دوسرے فدکی ہیں۔ پہلے کو ابن حجر نے "تقریب التہذیب" میں ثقہ، اور دوسرے کو صدوق لکھا ہے۔ ان لوگوں کے متعلق یہ کہنا کہ انہوں نے "نحر" کے معنی قربانی بتا کر شوشہ چھوڑا ہے، کچھ کم زیادتی اور بہتان نہیں۔

دیگر مصادر سے قطع نظر یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ سورہ کوثر میں "وانحر" سے مراد قربانی ہے یا نہیں؟

اوپر بتایا جا چکا ہے کہ ابن جریر نے مختلف تابعین اور تبع تابعین سے روایت کی ہے کہ "نحر" سے مراد قربانی ہے ابن تیمیہ اور بیضاوی اور نیز حاشیہ بیضاوی میں شیخ زادہ نے بھی یہی تفسیر کی ہے۔ تفسیر "جلالین" میں بھی "والنحر" کے آگے "نسکک" لکھا ہے۔ امام رازی نے جو خود شافعی المسلک ہیں اس تفسیر کی ترجیح بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔ " اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں صلوٰۃ کے ساتھ زکوٰۃ کا حکم فرماتا ہے اس لئے یہاں "نحر" سے قربانی ہی مراد لینی چاہئے۔ دوسرے یہ کہ اگر "نحر" سے سینہ پر ہاتھ رکھنا وغیرہ

---

[1] صفحہ ۳۵۷ جز ۷ المحلی منیریہ مصر ۱۳۴۹ھ

مراد لئے جائیں تو یہ اقوال تو خود آداب صلوٰۃ میں شامل ہیں اس لئے بعد کا عطف کل پر صحیح نہیں ہوگا کیونکہ صلوٰۃ کلی ہے اور نحر ان معانی میں اس کا جزو ہوا۔ تیسرے یہ کہ "نحر" اپنے دوسرے معانی کی نسبت "نحر البدن" کے معنی میں زیادہ مشہور ہے۔ اس لئے سورۂ کوثر میں یہی معنی مراد لئے جانے مناسب ہیں۔

ابن مردویہ نے سعید بن جبیر سے روایت کی ہے کہ یہ آیت یوم حدیبیہ میں نازل ہوئی چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز ادا کی اور اونٹوں کی قربانی کی۔ ابن ابی حاتم نے مجاہد، عکرمہ اور عطا سے روایت کی ہے کہ اس آیت میں قربانی ہی مراد ہے۔ ابن منذر نے ابن جریج سے، ابن جریر نے قتادہ سے اور ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیر سے ایسی ہی روایات بیان کی ہیں۔ یہ تفصیلات سیوطی کی "درمنثور" میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

اگرچہ ابن حزم اس آیت کی یہ تفسیر نہیں کرتے، لیکن حق محض "المحلی" تک ہی محدود و منحصر نہیں۔

کلام اللہ کے بعد اب اگر احادیث متعلقہ کا جائزہ بھی لے لیا جائے تو مناسب ہوگا۔

صحیحین میں حضرت جندب بن سفیان البجلی سے روایت ہے: "انه صلی مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوم اضحی قال فانصرف فاذا هو باللحم وذبائح الاضحی فعرفها رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انها قد ذبحت قبل ان یصلی فقال من کان ذبح قبل ان یصلی فلیذبح مکانها اخری ومن لم یکن ذبح حتی صلینا فلیذبح"

ایک دوسری روایت صحیحین میں حضرت انس سے ہے کہ: "قال قال النبی صلعم یوم النحر من کان ذبح قبل الصلوٰۃ فلیعد"

موطا امام مالک میں عباد بن تمیم سے روایت ہے: "ان عویمر بن اشقر ذبح ضحیۃ قبل ان یغدو یوم الاضحی وانه ذکر لرسول اللہ صلعم فامرہ ان یعود"

نسائی میں بھی حضرت جندب بن سفیان سے جو روایت ہے وہ صحیحین کے مطابق ہے۔

مندرجہ بالا احادیث سے دو امور واضح ہیں:

۱۔ جس نے قبل صلوٰۃ قربانی کی، اس پر اعادہ قربانی ضروری ہے۔

۲۔ بعد از صلوٰۃ ہر شخص پر قربانی واجب ہے۔

چونکہ دونوں جگہ امر کے صیغے مستعمل ہیں اس لئے تاوقتیکہ اس کے خلاف کوئی قرینہ نہ پایا جائے ان صیغوں سے وجوب ہی مراد لیا جائے گا۔

امام ابن حزم نے "المحلی" میں یہ تو تسلیم کیا ہے کہ جس شخص نے قبل از صلوٰۃ قربانی کر لی ہو اس پر اعادہ واجب ہے، مگر اس کی وجہ یہ نہیں بتائی کہ نفس قربانی واجب ہے بلکہ یہ کہا ہے کہ یہ اعادہ اسی طرح ہے جس طرح نفل روزہ کو شروع کرنے کے بعد فاسد کر دینے سے یا نفلی حج کو فاسد کر دینے سے قضا واجب ہوتی ہے ـــــ لیکن ظاہر ہے کہ مثال صورت حال کے مطابق نہیں کیونکہ نفل نماز ہو یا روزہ و حج، ان کی قضا اس لئے واجب ہوتی ہے کہ یہ عبادتیں اپنے تمام شرائط کے ساتھ جن میں وقت بھی شامل ہے، شروع کی گئی تھیں اور کل ... ارکان کی تکمیل سے پہلے فاسد کر دی گئی تھیں۔ مگر قربانی تو اپنے وقت سے پہلے شروع کی گئی اور وقت سے پہلے ختم کر دی گئی اور کوئی رکن فاسد نہیں کیا گیا۔ اس لئے اس پر ان مذکورہ عبادات کی مثال کیونکر صادق آسکتی ہے اگر کوئی شخص رات ہی

کو سنہ و شروع کر کے رات ہی کو ختم کر دے یا ربیع الاخری کے مہینے میں شروع کر کے ختم کر دے تو کیا اس پر قضا لازم ہوگی اس کے علاوہ نفلی قربانی کے لئے وقت کی بھی کوئی قید نہیں۔ ایسی صورت میں قبل از نماز ہونے والی قربانی کے اعادہ کا حکم یہ ظاہر کرتا ہے کہ عید قربان کی قربانی واجب ہے چونکہ قربانی فی نفسہ واجب ہے اور اپنے وقت پر ادا نہیں کی گئی۔ اس لئے اس کے اعادہ کا حکم صادر فرمایا۔

حدیث کے دوسرے ٹکڑے :۔ "من لم یکن ذبح حتی صلینا فلیذبح" سے جب ابن حزم کو کوئی مفر نہ ملا تو اس میں صیغہ امر کے وجوب پر دال ہونے سے انکار کر دیا چنانچہ کہتے ہیں کہ یہ امر ندب (استحباب) کے لئے ہے۔ اس کی دلیل یہ دی ہے کہ اگر کوئی شخص بعد نماز اونٹ کا نحر کر دے تو اس پر اجماع ہے کہ اب اس کو کسی ذبح کی ضرورت نہ ہوگی۔ گویا امام موصوف اس موقع پر بھی "ذبح" کو اس کے لغوی معنی "گلو بریدن" تک ہی محدود رکھتے ہیں اور سینہ شگافتن "تک نہیں بڑھاتے۔ حالانکہ "فلیذبح" سے منشاء مبارک یہی تھا کہ قربانی کی جائے۔ "صراح" میں ذبح کے معنی قربانی بھی دئے گئے ہیں۔ چونکہ اس حدیث کے موقع پر بکری ذبح کرنے کا ذکر تھا۔ اس لئے آپ نے موقع کی مناسبت کے لحاظ سے یہ لفظ استعمال فرمایا۔ خود "المحلی" میں یہ روایت ہے :۔ "من طریق وکیع انا الربیع عن الحسن ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امر بالاضحی" اس سے بھی وجوب قربانی ثابت ہے۔ ابن حزم نے اس حدیث پر صرف ارسال کا اعتراض کیا ہے۔ لیکن ارسال اگر قرون ثلاثہ کے حضرات سے ہو تو ہمارے نزدیک بالاتفاق مقبول ہوگا۔ اگر ان قرون کے بعد کے اصحاب کا ارسال ہو تو وہ کرخی کے نزدیک تو مقبول ہے، مگر ابن ابان کے نزدیک نہیں[1]

اسی طرح صاحب محلی نے مجاہد، مکحول اور شعبی کے متعلق لکھا ہے کہ وہ حاجی اور مسافر کے سوا کسی کو ترک قربانی کی، اجازت نہیں دیتے تھے، چنانچہ اس سے بھی وجوب ہی ثابت ہوتا ہے۔ حاصل کلام یہ کہ سرسری طور پر احادیث مذکورہ سے بلاشبہ وجوب قربانی ثابت ہوتا ہے۔

آخر میں نامناسب نہ ہوگا اگر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی تفسیر "تفہیم القرآن" سے ایک اقتباس پیش کر دیا جائے۔

مولانا مودودی سورہ الحج کی آیت :۔ "لن ینال اللہ لحومها ولا دماؤها ولکن یناله التقوی منکم ۔ کذالک سخرها لکم لتکبروا اللہ علی ما هداکم"

کی تفسیر میں رقمطراز ہیں[2]: "یعنی اس کی بڑائی اور برتری مانو اور عمل سے اس کا اعلان و اظہار کرو۔ یہ حکم قربانی کی غرض اور علت کی طرف اشارہ ہے۔ قربانی صرف اسی لئے واجب نہیں کی گئی کہ یہ تسخیر حیوانات پر اللہ کا شکریہ ہے، بلکہ اس لئے بھی واجب کی گئی ہے کہ جس کے یہ جانور ہیں اور جس نے انہیں ہمارے لئے مسخر کیا ہے، اس کے حقوق مالکانہ کا ہم دل سے بھی اور عملاً بھی اعتراف کریں۔ تاکہ ہمیں کبھی یہ بھول لاحق نہ ہو جائے کہ یہ سب کچھ ہمارا اپنا مال ہے اسی مضمون کو وہ فقرہ ادا کرتا ہے جو قربانی کے وقت کہا جاتا ہے کہ "اللهم منك ولك" "خدایا تیرا ہی مال ہے اور تیرے لئے حاضر ہے۔

اس مقام پر یہ جان لینا چاہیے کہ اس پیراگراف میں قربانی کا جو حکم دیا گیا ہے۔ وہ صرف حاجیوں کے لئے ہی نہیں۔ اور صرف مکے میں حج ہی کے موقعہ پر ادا کرنے کے لئے نہیں ہے بلکہ تمام ذی استطاعت مسلمانوں کے لئے عام ہے تاکہ وہ تسخیر حیوانات کی نعمت پر شکریہ اور تکبیر کا فرض بھی ادا کریں اور ساتھ ہی ساتھ اپنے مقامات پر حاجیوں کے شریک حال بھی ہو جائیں۔ حج کی سعادت میسر نہ آئی نہ سہی، کم از کم حج کے دنوں میں ساری دنیا کے مسلمان وہ کام تو کر رہے ہوں۔ جو حاجی جا کر بیت اللہ میں کریں۔ اس مضمون کی تصریح

---

[1] نور الانوار، مبحث اقسام السنۃ [2] تفہیم القرآن حصہ سوم فٹ نوٹ ۷۵ء صفحہ ۲۲۹-۲۳۰

متعدد صحیح احادیث میں وارد ہوتی ہے اور بکثرت معتبر روایات سے بھی ثابت ہوا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود مدینہ طیبہ کے پورے زمانہ قیام میں ہر سال بقرعید کے موقعہ پر قربانی کرتے رہے اور مسلمانوں میں آپ ہی کی سنت سے یہ طریقہ جاری ہوا۔ مسند احمد اور ابن ماجہ میں ابوہریرہؓ کی روایت ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :-

من وجد سعة فلم یضح فلا یقرب مصلانا - | جو شخص استطاعت رکھتا ہو اور پھر قربانی نہ کرے وہ ہماری عیدگاہ کے قریب نہ آئے۔

اس روایت کے تمام راوی ثقہ ہیں۔ محدثین میں صرف اس امر پر اختلاف ہے کہ یہ مرفوع روایات ہے یا موقوف۔ ترمذی میں ابن عمرؓ کی روایت ہے :-

اقام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالمدینۃ عشر سنین یضحی ! | نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں دس سال رہے اور ہر سال قربانی کرتے رہے۔

بخاری میں حضرت انس سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بقرعید کے روز فرمایا :-

من کان ذبح قبل الصلٰوۃ فلیعد و من ذبح بعد الصلٰوۃ فقد تم نسکہ و اصاب سنۃ المسلمین۔ | جس نے عید کی نماز سے پہلے ذبح کر لیا، سے دوبارہ قربانی کرنی چاہئے اور جس نے نماز کے بعد قربانی کی اس کی قربانی پوری ہو گئی اس نے مسلمانوں کا طریقہ پا لیا۔

اور یہ معلوم ہے کہ یوم النحر کو مکہ میں کوئی نماز ایسی نہیں ہوتی جس سے پہلے قربانی کی سنت مسلمین کے خلاف ہو۔ اور یہ اگر ...... مطابق لہذا لا محالہ یہ ارشاد مدینہ میں ہی ہوا نہ کہ حج کے موقعہ پر مکہ میں۔

مسلم میں جابر بن عبداللہ کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں بقرعید کی نماز پڑھائی اور بعض لوگوں نے یہ سمجھ کر کہ آپ قربانی کر چکے ہیں، اپنی اپنی قربانیاں کر لیں اس پر آپ نے حکم دیا کہ مجھ سے پہلے جن لوگوں نے قربانی کر لی ہے وہ پھر اعادہ کریں؛

پس یہ بات شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ بقرعید کے روز جو قربانی عام مسلمان دنیا بھر میں کرتے ہیں یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جاری کی ہوئی سنت ہے البتہ اگر اختلاف ہے تو اس امر میں کہ آیا یہ واجب ہے یا صرف سنت۔ ابراہیم نخعی، امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام محمد اور ایک روایت کے مطابق امام ابو یوسف بھی اس کو واجب جانتے ہیں اگرامام شافعی اور امام احمد بن حنبل کے نزدیک یہ صرف سنت مسلمین ہے اور سفیان ثوری بھی اس بات کے قائل ہیں کہ اگر کوئی نہ کرے تو مضائقہ نہیں۔ تاہم علماء امت میں سے کوئی بھی اس بات کا قائل نہیں اگر تمام مسلمان متفق ہو کر اسے چھوڑ دیں تب بھی کوئی مضائقہ نہیں یہ نئی اپج صرف ہمارے زمانہ کے بعض لوگوں کو سوجھی ہے جن کے لئے ان کا نفس ہی قرآن بھی ہے اور سنت بھی"

اگر مضمون نگار نیک نیتی کے ساتھ حق کے جویا ہیں تو ان واضح اور روشن دلائل سے ان کا اطمینان ہو جانا چاہئے لیکن اگر محض اعتراض برائے اعتراض اور تضلیل عامۃ المسلمین ہے تو الگ بات ہے تاہم اس مضمون سے قارئین کو اتنا تو ضرور معلوم ہو گیا کہ طارق صاحب نے غلط حوالوں اور غلط تعبیرات سے کام لے کر اصل مفہوم کو کتنا توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے اور یہی اس مضمون کا مقصد اولیٰ ہے۔

محمد زکریا مائل

اندلس پر ایک طائرانہ نظر

یادش بخیر جب کبھی اسلامی اندلس کی یاد آجاتی ہے تو بے اختیار دل تڑپنے لگتا ہے اور کسی شاعر کا یہ مصرعہ زبان پر جاری ہو جاتا ہے ؎

ہمارا بھی رہا ہے اس چمن میں آشیاں برسوں

یقین نہیں ایک لمحے کے لئے سناٹا سا آجاتا ہے دنیا کے انقلابات، اس کی بے ثباتی اور عروج و زوال کے مناظر چشم تصور کے آگے فلموں کی طرح گردش کرنے لگتے ہیں اور بے ساختہ رونے کو جی چاہتا ہے۔ آخر مرزا یگانہ چنگیزی کا یہ شعر حافظے میں ابھر کر فی الجملہ تسلی کا سامان مہیا کرتا ہے۔

؎ یکساں کبھی کسی کی نہ گزری زمانے میں
یادش بخیر بیٹھے تھے کل آشیانے میں

یوں تو اس آشیانے کو اجڑے ہوئے صدیاں گزر گئیں مگر بعض وقت بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے سچ مچ کل ہی یہ سانحہ دنیائے اسلام پر گزرا ہے۔ خیر اب کم از کم اتنا تو ہونا ہی چاہئے کہ کبھی کبھی اس قصہ پارینہ کو یاد کرکے داغہائے سینہ کو تازہ رکھنے کی کوشش کی جاتی رہے۔ چنانچہ یہ مختصر مضمون اسی قسم کی ایک کوشش ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلامی اندلس پر عربی زبان میں اس کثرت سے کتابیں لکھی جا چکی ہیں کہ ان کا احصا کوئی آسان کام نہیں۔ اگر ان کتابوں کا تعارف ہی لکھنے کی کوشش کی جائے۔ تو ایک اچھی خاصی ضخیم کتاب تیار ہو جائے گی اس کے بعد متعدد یورپی زبانوں میں "اندلسیات" کے موضوع پر بہت کثرت سے کتابیں لکھی گئیں مثلاً جرمنی، فرانسیسی، انگریزی اور طلوی زبانوں کے ادبی خزانے ان علمی و تاریخی جواہرات سے مالامال ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان "گنج ہائے گرانمایہ" تک رسائی ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ اس لئے انہیں چھوڑ کر اگر صرف اردو زبان میں اندلس سے متعلق کثیر المقدار تراجم اور تالیفات کے مطالعے پر اکتفا کیا جائے تو اس کے لئے بھی خاصا وقت درکار ہوگا۔ مجبوراً ان کی شرح و تفصیل سے بھی صرف نظر کرتا ہوں اور سر دست ایک جدید ترین عربی ماخذ "الموسوعۃ الذہبیہ" کو سامنے رکھ کر ایک مضمون قارئین کے لئے پیش کر رہا ہوں۔ اس سلسلے میں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ خدا کو جب کوئی کام بنانا منظور ہوتا ہے تو بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

اکثر و بیشتر غیر مسلم حضرات شعوری یا غیر شعوری طور پر اسلام کی کوئی نہ کوئی اہم خدمت انجام دیتے نظر آتے ہیں۔ الموسوعۃ الذہبیہ (گولڈن انسائیکلو پیڈیا) امریکہ کے علمی اداروں کے زیر اہتمام بارہ حصوں میں عربی زبان میں مرتب ہوئی ہے۔ اس مجموعہ کے لئے جس فراخ دلی سے بہترین طباعت اور جلد بندی وغیرہ کا قابل رشک انتظام کیا گیا ہے اس کی بے ساختہ داد دینا پڑتی ہے۔ اب یہ کہنا اور باقی ہے کہ اس مجموعہ میں اندلس پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ "اندلسیات" کے موضوع پر دریا میں سے ایک قطرہ کا مصداق ہے یقیناً اندلس پر اس سے کہیں زیادہ تفصیل اور بے تعصبی کے ساتھ لکھا جا سکتا تھا تاہم امریکی اعانت کے زیر سرپرستی اپنی علمی خدمت کا سرانجام پانا بھی دلی شکرگزاری کا مستحق ہے۔ من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ۔ اب آئندہ سطور میں محولہ بالا مضمون ملاحظہ ہو۔

کوئی بارہ سو برس پہلے کا واقعہ ہے جب اسلامی فتوحات کا دائرہ مشرق اور مغرب میں وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا تھا اس زمانے میں مسلمانوں نے بہت بڑی قوت پیدا کر لی تھی۔ بحر متوسط کی مشرقی جانب میں اور اعظم افریقہ کے شمال میں جو آبادی واقع تھیں ان پر عربوں کا قبضہ و تسلط قائم تھا یہاں تک کہ وہ جبل الطارق (جبرالٹر) کو عبور کر کے اسپانیا (اسپین) میں داخل ہوئے اور قوطیوں (قوم گاتھ) کی مغربی حکومت کو شکست دے کر اپنی حکومت قائم کی پھر جبال البرانس میں جا پہنچے اور ان کی نظر میں ان پہاڑوں کے اس پار کے علاقوں پر پڑیں تو ان کی افواج نے فرانس پر تاخت کی جو اس زمانے میں بلاد غال (گال کنٹری) کے نام سے مشہور تھا۔ لیکن ان اطراف میں اسلامی فتوحات کا سیل بے پناہ شہر تورز تک پہنچ کر ٹھہر گیا۔ اس لئے کہ بلاد غال کے وزیر خارجہ شارل مارتل (چارلس مارٹل) نے اس مقام پر اسلامی افواج کو آگے بڑھنے سے روک دیا تھا۔

اندلس کے عرب اندلس کے اصلی باشندوں اور عرب فاتحین کا ایک ملا جلا مرکب تھے۔ اسپین پر عربوں کی حکومت آٹھ سو برس قائم رہی جو عدل و انصاف میں بہت ممتاز تھی۔ اس دوران میں انہوں نے اس ملک کی ترقی اور رفاہ و بہبود میں نمایاں حصہ لیا اور اسلامی شائستگی کو بڑی کامیابی سے منتقل کیا۔ یہ کوئی ایسی حیرت کی بات نہیں ہے اس لئے کہ عرب اس زمانے میں ریاضیات، فلکیات، نحو اور ادب میں استاد تھے۔ انہوں نے یونانی زبان کے ورثے کو عربی زبان میں منتقل کر کے اس کی خاطر خواہ حفاظت کی تھی۔ عربوں نے عربی زبان کے بہت الفاظ یورپی زبان میں داخل کئے، مثلاً الجبرا، کیمیا، الکحل (الکوحل) قطن (کاٹن) قہوہ (کوکو، شراب دار چینیا)

اسی طرح انہوں نے مشرق کی بہت سی مصنوعات یورپ میں منتقل کیں جن میں کاغذ غالباً سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے اسپین کے جہاز اپنے تجارتی سامان افریقہ اور ایشیا میں بھی پہنچاتے رہتے تھے۔

عربوں نے اسپین میں بہت سے شہروں کی بنیاد رکھی جن میں قرطبہ سب سے زیادہ قابل ذکر ہے وہ اس زمانے کے عظیم ترین شہروں میں شمار ہوتا تھا۔ اس شہر میں تین ہزار مسجدیں، تین سو عوامی حمام، یونیورسٹی اور بہت سے خوبصورت محل تھے، اس شہر میں ایک ہزار سے زیادہ نورباف تھے جو خوش نما عربی فرش فروش اور پردے وغیرہ بنا کرتے تھے۔

غرناطہ بھی عظیم الشان عربی شہروں میں سے تھا جس میں اندلس کی مشہور ترین عمارت قصر الحمرا واقع تھی۔

جب پہلی مسلمانوں پر زوال آیا تو ان کے آخری قلعے غرناطہ ہی کے ختم ہونے پر ۱۴۹۲ء میں ان کی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا یہ سانحہ کولمبس کے اس سفر سے پہلے کا ہے جس میں اس نے پہلی مرتبہ امریکہ کو دریافت کیا تھا۔

(الموسوعۃ الذہبیہ، ڈی گولی ان سیکلو پیڈیا)

حافظ لدھیانوی

بہ حضور سرورِ کائنات

ذروں کو کیا ہمسرِ خورشید جہاں تاب
ہر سنگِ سریزہ کو کیا گوہرِ نایاب
چمکے ہیں ترے نور سے کیا کیا خس و خاشاک
اے صاحبِ لولاک

ہے نقشِ کفِ پا ترا تاروں کی جبیں پر
احسان ترے نور کا ہے ماہِ مبیں پر
تابندہ ترے قدموں سے ہے عرصۂ افلاک
اے صاحبِ لولاک

ہے فخر تجھے فقر پہ اے شاہِ دو عالمؐ
اے ختمِ رسل، ہادیٔ دیں، خلقِ مجسم
سرمہ ہے مری آنکھ کا پاؤں کی تری خاک
اے صاحبِ لولاک

تو رحمتِ عالم ہے، دو عالم کا ابیا ہے
تو صاحبِ معراج ہے محبوبِ خدا ہے
کیا سمجھے گا رتبہ ترا، انسان کا ادراک
اے صاحبِ لولاک

جاوید احسن :-

کس کے پرتو سے مہ و مہر ہیں جلوہ افشاں
کس کے صدقے میں ستاروں نے ضیا پائی ہے
اک تری ذات زمانے میں ہے "کن" کا مقصود
اک ترے نور سے یہ انجمن آرائی ہے
بشریت کی حقیقت شبِ معراج کھلی
سایہ تک ساتھ نہیں کیا تری یکتائی ہے

ماہر القادری :-

کیا مدینہ سے بھی پیغام کوئی لائی ہے
یا نسیمِ سحری یوں ہی چلی آئی ہے

مسٹر اے۔ کے بروہی ایڈوکیٹ

رُوحِ انتخاب

میری گزارش یہ ہے کہ ہمارے تعلیم گاہوں میں "اسلامیات" کا موضوع اسلام کا کلی نصب العین ہونا چاہئے۔ کارِ حق کی تلاش جہادِ اکبر ہے۔ ایک ہی دفعہ جان دے دینا آسان ہے۔ لیکن جاہلیت کے خلاف مسلسل جنگ کرنا اور چھوٹے موٹے قیصروں کے علی الرغم کلمۂ حق کا اعلان کرنا میرے نزدیک یہ حبِ الٰہی کا ایک برتر اور بلند تر مظہر ہے۔

اسلامیات کے بارے میں مزید ایک غلط فہمی یہ ہے کہ اسے بعض اوقات محض تفاسیرِ قرآن، انتخابِ حدیث اور قدیم کتب فقہ کے مطالعے تک محدود کر لیا جاتا ہے یہ بھی صحیح اسلامی نقطۂ نظر نہیں ہے۔ طبیعات، علم کیمیا، علم الحیات، ریاضی، فلکیات، زراعت، طب، قانون اور تاریخ وغیرہ کا مطالعہ بھی اگر اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر کیا جائے کہ فردی زندگی پاکیزہ ہو اور پوری انسانیت کے لئے ذریعہ اتحاد و استناط ثابت ہو تو یہ مطالعہ بھی اسلامیات ہی کا ایک حصہ ہے۔

اسلامی طرزِ حیات میں دین و دنیا کے مابین کوئی منافات و امتیاز نہیں ہے۔ اسلام میں "قیصر کا حصہ قیصر کو ادا کرنے" کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہاں قیصر کا کچھ سرے سے ہے ہی نہیں، سب کچھ اللہ کا ہے، اسلام قیصریت کا مخالف ہے، کیونکہ قیصر اس راہ میں کانٹا ہے جس پر چل کر انسان اپنے خدا تک پہونچتا ہے۔ ہر شکل میں برائی کا مقابلہ جہاد ہے نوعِ انسانی کے شہداء کی تاریخ درحقیقت شر کے خلاف جہاد کی تدریج ہے۔ جان دینے والوں نے اپنی جانیں اسی لئے دی ہیں کہ سبیل اللہ کے موانع دور ہوں اور اللہ کے بندے صراطِ مستقیم پر گامزن ہو کر اپنی منزلِ مقصود تک رسائی حاصل کریں۔ قیصر شاہراہ عام پر ایک سنگِ گراں ہے۔ زیادہ سے زیادہ وہ ایک جاروب کش کی خدمت انجام دے سکتا ہے لیکن اگر وہ خدا کے قانون کے بجائے اپنا قانون چلائے اور اس طرح خدائی قانون کے خلاف جنگ کرے تو خدائی قانون کے مطابق امر کا رستے سے ہٹایا جانا مقدر ہو چکا ہے۔ تمام قیاصرہ صفحۂ تاریخ پر حرفِ غلط کی حیثیت رکھتے ہیں اور کسی نوحہ خوان اور گریہ کن کے بغیر ان کا مٹ جانا یقینی ہے۔ اسلام اپنے نظام میں قیصر کو تسلیم نہیں کرتا کیونکہ حاکمیت اور بادشاہی اللہ کے لئے ہے و للہ ما فی السموات و ما فی الارض زمین و آسمان میں جو کچھ ہے اللہ کی ملکیت ہے تمام طاقت و اقتدار اسی کے لئے ہے اس لئے کوئی اس کا شریک و سہیم نہیں ہے۔

اس لئے اسلام کے طالب علم کو شعبہ ہائے حیات میں دینی و غیر دینی کی تفریق کا مہلک نظریہ تسلیم نہیں کرنا چاہئے پوری زندگی ایک وحدت ہے اور مشیت الٰہی سے وجود میں آتی ہے اس میں ناپاک اجزاء کا کوئی دخل نہیں ایک مسلم اسکالر کو محبت اور گرمجوشی کے ساتھ اپنے اسلامی نصب العین سے ہمکنار ہونا چاہئے اور اللہ الحق کی عبادت و عبودیت کے جذبے میں سرشار ہو کر تحصیل علم کا کام کرنا چاہئے۔

اس طریقے سے نہ صرف اس کی انفرادی تکمیل ہوگی بلکہ وہ پوری انسانیت کو ان بے راہ رویوں سے بچائے گا جو خدا کے حقوق اور قیصر کے حقوق کی مصنوعی تفریق کا نتیجہ ہیں۔

وقت کی پکار یہی ہے حالات کا تقاضا یہی ہے خوش بخت اور خوش نصیب ہیں وہ مردانِ کار جو اس پکار کو سنیں اور اپنی پیہم جدوجہد کے ذریعے اس اعلیٰ و ارفع نصب العین کو حاصل کریں جس کے لئے انسانیت آغازِ تخلیق سے اب تک لڑتی چلی آرہی ہے۔

ہماری نظر میں

انہاءُ السکن الیٰ من یطالع اعلاء السنن

از :- مولانا ظفر احمد عثمانی تھانوی، ضخامت ۱۴۴ صفحات (بڑا سائز دیدہ زیب ٹائپ)، قیمت چھ روپے، (علاوہ محصول ڈاک)
ملنے کا پتہ :- دارالعلوم اسلامیہ، ٹنڈوالہ یار (مغربی پاکستان)

جناب مولانا ظفر احمد عثمانی تھانوی نے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ کے ایما سے بلکہ ان کی زیر ہدایت و نگرانی "اعلاء السنن" کی متعدد جلدیں مرتب فرمائی تھیں، جن میں پوری شرح و بسط اور عقلی و نقلی دلائل کے ساتھ یہ ثابت کیا گیا ہے کہ فقہ حنفی کا کوئی مسئلہ کتاب و سنت کا مخالف نہیں ہے! یہ کتاب (انہاء السکن) جس پر تبصرہ کیا جا رہا ہے۔ اسی معرکۃ آلارا تالیف (اعلاء السنن) کا مقدمہ ہے، اس پر حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے (جمادی الآخر ۱۳۴۶ھ میں) جو کلمات تحسین فرمائے ہیں، اُن سے اس مقدمہ کا آغاز ہوتا ہے اس کے بعد زاہدالکوثری رحمۃ اللہ علیہ کی تقریظ ہے۔

اس کتاب کے شروع میں احادیث نبوی کے اقسام سے مفصل بحث کی گئی ہے۔ یہ کہ متواتر کیا ہے، مشہور دعزیز کسے کہتے ہیں، ارسال و تدلیس سے کیا مراد ہے، رفع، وقف، وصل اور قطع کا حدیث کی حجیت میں کیا مقام ہے؟ احناف مرسل حدیث کو کیوں حجت سمجھتے ہیں، اس کو ثابت کرنے کے لئے "مراسیل" پر بڑی تفصیل کے ساتھ سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے، جرح کیا ہے! تعدیل کی کیا تعریف ہے؟ "منکر حدیث منکر" کہ کر متقدمین اور متاخرین کیا مراد لیتے ہیں! "انہ لیس بشیٍٔ" کی اصطلاح کے کیا معنی ہیں؛ غرض احادیث کے تمام گوشوں اور پہلوؤں پر جس عالمانہ اور مبصرانہ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے اُس نے اس کتاب کو فن حدیث کے موضوع پر انتہائی مفید کارآمد اور معلومات آفریں بنا دیا ہے۔ اس کتاب میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ حدیث صحیح کا انحصار صرف بخاری اور مسلم پر نہیں ہے، بعض دوسرے مجموعوں میں بھی احادیث صحیحہ ملتی ہیں۔

احناف سے بعض علماء نے "ارجاء" کو منسوب کیا ہے، اس بے بنیاد الزام کی پرزور تردید کی گئی ہے کہ مذہب حنفیہ کی کتابیں، مذہب مرجئہ کو باطل قرار دیتی ہیں، ——— تو جس چیز کو حنفی مذہب نے باطل ٹھیرایا ہے، وہ الزام اُس پر کیسے عائد ہو سکتا ہے۔

مشاہیر علماء اور ائمہ دین نے حضرت ابوحنیفہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں جو خراج تحسین و عقیدت پیش کیا ہے، اُس کے مستند حوالے اس کتاب میں ملتے ہیں، یہ واقعہ ہے کہ صحابۂ کرام کے بعد کسی اور شخصیت کی اتنی تحسین و تکریم نہیں کی گئی جس نے

امام اعظم سے تعصب روا رکھا، اُس نے اپنی دیانت اور باطنی کیفیت کا کوئی اچھا ثبوت نہیں دیا، باب مناقب میں یہ بھی ثابت کیا گیا ہے کہ امام اعظم بلاشبہ تابعی ہیں! اور یہ بھی کہ آپ فن حدیث کے بہت بڑے ناقد اور صاحب جرح و تعدیل ہیں۔

"تتمہ فی مسائل شتیٰ" جس باب کا عنوان ہے، وہ بہت اہم ہے اس میں ناقدین حدیث کے اقوال پیش کرکے فاضل مصنف نے "قلت" کہہ کر جو گفتگو کی ہے، وہ دلیل ہے اُن کی شدت بینی ناقدانہ فراست اور عالمانہ بصیرت کی کہیں کہیں اُن کی "تعدیل" "جرح" کے مقابلے میں زیادہ وزنی نظر نہیں آتی۔

کتاب کے آخر میں علامہ ظفر احمد عثمانی نے کتابوں اور مشاہیر علماء کے ناموں کی تشریح کی ہے۔ مثلاً جب وہ "قال الحافظ" کہتے ہیں تو اُس سے اُن کی مراد ابن حجر عسقلانی ہوتی ہے ———— "قال المحقق" فی الفتح" کے یہ معنی ہیں کہ شیخ ابن ہمامؒ "فتح القدیر" میں یوں فرماتے ہیں ———— "بالدر" سے "الدر المختار" "بالبحر" سے ابن نجیمؒ کی "بحر الرائق" اور "بالکنز" سے فقہ کی کتاب "کنز الدقائق" نہیں بلکہ علامہ سیوطیؒ کی "کنز العمال" مراد ہے ......!

حضرت مصنف مدظلہ کا یہ مقدمہ ہر اعتبار سے گراں قدر اور بلند پایہ ہے اُردو میں اس کا ترجمہ ضرور ہونا چاہئے!

قرآنی و نبوی دعائیں

مرتبہ:- مولانا خان محمد ربانی، ضخامت ۹۶ صفحات (سرورق دیدہ زیب) قیمت ۵۰ پیسے
ملنے کا پتہ:- فرینڈز پبلیکیشنز گلی بہاراں والی، ملتان۔

اس کتابچہ میں عربی متن اور اُردو ترجمہ کے ساتھ قرآنی اور نبوی دعائیں جمع کی گئی ہیں! دعا چاہے قبول ہو یا نہ ہو اُس سے تعلق مع اللہ پیدا ہوتا ہے۔ یہی اُس کا سب سے بڑا فائدہ ہے!

صفحہ ۵، پر "دعائے آوۃ لعنتک" کا ترجمہ "اور تیرے ناگہانی عذاب" سے کیا گیا ہے، یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے کہ "عذابک" کی جگہ "نعمتک" چھپ گیا۔ اسی طرح صفحہ ۸، پر "ان امنت لدلیفا" کی بجائے "ان امنت لدلیفا" پڑھنا پڑا ———— (یعنی غ جگہ ف)

بس مجموعہ میں سفر کرتے وقت کی دعا آنے سے رہ گئی اور یہ مشہور دعا "انت السلام و منک السلام ... تبارکت یا ذوالجلال والاکرام" بھی نظر نہیں آتی، جو ہر نماز کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معمول میں شامل رہی ہے۔

مولانا خان محمد ربانی نے ان دعاؤں کو جمع کرکے اپنے لئے زاد آخرت اور عام مسلمانوں کے لئے خیر و برکت کا اہتمام کیا ہے۔

اشرف الجواب

از:- مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ، ضخامت ۔ ۔ صفحات،
ملنے کا پتہ:- کتب خانہ انوار الاسلام، کاغذی بازار، کراچی

"احکام شریعت کی علتیں دریافت کرنا، اس بات کا ثبوت ہے، کہ قلب میں عظمت حق نہیں" ———— "تعلیقاً اس ملتے کی کہ تمام رموز قرآن شریف میں ہیں" ———— اس قسم کے سوالات کے جوابات جو حکمت و دانش سے لبریز ہیں اور حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات کا خاصہ ہیں، اس کتاب میں مدون کئے گئے ہیں، جن کے مطالعہ سے بہت سے شکوک کا ازالہ ہوتا ہے، اور دینی بصیرت پیدا ہوتی ہے۔

نکات سیاسی

از:- نسرین وحید خاں (ایم۔اے) ضخامت ۲۸۴ صفحات (مجلد، رنگین گرد پوش) قیمت چھ روپے
ملنے کا پتہ:- سرسید بک کمپنی، آرام باغ بازار، بندر روڈ، کراچی

یہ کتاب بی۔اے اور بی۔اے آنرز کے طلباء کے لئے لکھی گئی ہے اور اپنے موضوع پر بڑے کام کی کتاب ہے، طلباء کو اس سے فائدہ

اُٹھانا ہی چاہتے۔ مگر اچھے خاصے تعلیم یافتہ حضرات کی معلومات میں اس کے مطالعہ سے اضافہ ہوگا!

- افلاطون کہتا ہے کہ تصور حقیقت ہے اور اس دنیا کی ہر شے اُس حقیقت کا عکس ہے، جس کا تصور ہمارے ذہن اور دماغ میں موجود ہے، لہذا تصور کے ذریعہ ہم حقیقت تک پہونچ سکتے ہیں۔

یہ ہے "فلسفۂ تصوریت"! افلاطون کے افکار سیاسی کا خلاصہ پیش کرنے کے بعد اُن پر تنقید بھی کی گئی ہے ——— ... افلاطون حقوق کو بالکل فراموش کر دیتا ہے اور فرائض پر زور دیتا ہے ——— اور ——— افلاطون کا اشتراکی نظام انسانی فطرت کے بالکل برعکس ہے وہ انفرادیت کو بالکل کچل دیتا ہے اور ریاست کے مفاد کو بہت افضل قرار دیتا ہے .... افلاطون کا اشتراکی نظام قابل قبول نہیں۔

- ارسطو کے نظریہ کا.. سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ اس کی حکومتوں کا اطلاق موجودہ زمانے میں نہیں ہوتا ——— ارسطو ریاست کی ایک بڑی تعداد کو نہ صرف حقوق شہریت سے محروم کرتا ہے بلکہ ان کو قانون سازی کے لئے بھی نا اہل قرار دیتا ہے اور ایک محدود طبقہ کو شہریت اور قانون سازی کے حقوق سونپتا ہے لہذا سیاسی مفکرین نے ارسطو کے نظریہ شہریت کو بہت تنگ اور محدود قرار دیا ہے۔

میکاولی نے سیاست کو اخلاق و مذہب سے علیحدہ قرار دے کر سیاست اور اخلاق میں دوری پیدا کر دی ——— ہابس کے یہاں معاہدہ دو پارٹیوں کے درمیان نہیں، بلکہ یکطرفہ ہے ——— ہابس انسانی فطرت کے اچھے پہلوؤں پر روشنی نہیں ڈالتا، وہ انسان کو وحشی، خود غرض اور حریص تصور کرتا ہے، لیکن یہ بھول جاتا ہے کہ ان برائیوں کے علاوہ انسان میں ہمدردی اور محبت کا جذبہ بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔

لاک کہتا ہے ——— "عوام اپنے تمام سیاسی اختیارات بطور امانت بادشاہ کو سپرد کر کے سونے کے لئے چلے جاتے ہیں، لیکن جانے سے قبل وہ بادشاہ سے کہتے ہیں کہ اگر اس نے امانت میں خیانت کی، تو وہ اپنی نیند سے بیدار ہو جائیں گے اور اپنی بغاوت کا حق استعمال کر کے اُس کے خلاف بغاوت کر دیں گے" ——— لاک جمہوریت کو بہت زیادہ پسند کرتا ہے، جس میں اختیارات عوام کے منتخب شدہ نمائندوں کے ہاتھوں میں ہوتے ہیں وہ بادشاہت کو بالکل مسترد نہیں کرتا۔

اپنی تصنیف "روح قوانین" میں مونٹیسکو نے تفریق اختیارات کے نظریہ کو ان لفظوں میں بیان کیا ہے۔

"اگر مقننہ اور انتظامیہ کے اختیارات ایک ہی شخص یا اشخاص کی ایک جماعت کو دئے جائیں، تو وہ جماعت ہر دباؤ کے خوف سے آزاد ہو کر ظالمانہ قوانین بنائے گی، اور ان کو ظالمانہ طریقہ سے نافذ کرے گی........"

- مونٹیسکو کے نظریہ کا اثر نہ صرف فرانس پر ہوا بلکہ انگلستان میں مونٹیسکو کے نظریہ کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا، امریکنوں نے تو مونٹیسکو کے نظریہ کو اس قدر اپنایا کہ امریکی دستور کی بنیاد ہی اس کے نظریہ تفریق اختیارات پر رکھی گئی ہے۔

- مونٹیسکو کا خیال ہے کہ اس ریاست میں آزادی کا تصور ہی پیدا نہیں ہو سکتا جس میں ایک شخص یا اشخاص کی ایک جماعت قانون سے بالاتر ہو۔

- روسو کے نظریہ ارادۂ عامہ (GENERAL WILL) پر سخت تنقید کی گئی ہے، سیاسی مفکرین کا خیال ہے کہ روسو کا نظریۂ ارادۂ عامہ نامکمل اور غیر واضح ہے: عملی طور پر اس کے نظریہ کا اطلاق ہونا مشکل نظر آتا ہے، وہ ارادۂ عامہ اور ارادۂ کلی میں فرق کو واضح طور پر ظاہر

نہیں کرتا ...."

"بنیتھم ضمیر اور روحانی خوشی پر یقین نہیں رکھتا ــــــ سیاسی مفکرین کا خیال ہے کہ بنیتھم کا نظریہ افراد کے اخلاق کو پست کرکے اُن کو خود غرض بناتا ہے۔"

"عین اس وقت جب کہ افادیت پسندی اپنے عروج پر تھی، اُس وقت ملک میں ایک نئے نظریہ نے جنم لیا، جس کو عینیت پسندی یا تصوریت پسندی کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے، افادیت اور عینیت میں بہت بڑا فرق نظر آتا ہے افادیت کا تعلق افراد کی مسرتوں سے تھا جب کہ عینیت کا تعلق افراد کی اخلاقی برتری سے تھا۔"

کارل مارکس کے بارے میں فاضل مصنف نے کیا خوب بات کہی ہے :-

"ایک ایسے شخص کے سیاسی فلسفہ پر بحث کرنا بہت ہی مشکل کام ہے، جس کو سینکڑوں لوگ دیوتا کی حیثیت سے پوجتے ہوں، تو سینکڑوں اس کو شیطان سمجھتے ہوں۔"

مارکس کی "قدرِ زائد" کیا ہے؟ خود مارکس کی زبان سے سنئے :-

"ــــ سرمایہ دار مفلس مزدور کی محنت کی قوت کو خریدتا ہے اور مشین اور خام مواد پر جو اُس کی ملکیت ہوتی ہے، استعمال کرتا ہے، اور نتیجہ کے طور پر ایسی شے پیدا کرتا ہے جو قدرِ مبادلہ کی مالک ہوتی ہے وہ شے ایک ایسی قیمت پر فروخت کی جاسکتی ہے، جو مزدور کی اُجرت اور کارخانے پر صرف ہوجانے والی رقم کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہے، لہٰذا وہ فرق جو مشینی پیداوار کے قدرِ مبادلہ اور اُس اُجرت میں جو مزدور کو اُس کی محنت کے لئے دی جاتی ہے قدرِ زائد کہتے ہیں۔"

"سیاسی مفکرین کہتے ہیں کہ مارکس سرمایہ داروں کو ختم کرکے سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد ڈالتا ہے لہٰذا اشتراکی ریاست ایک ایسی سرمایہ دارانہ ریاست ہوگی جس میں سرمایہ دار نہ ہوں گے۔"

"مارکس نے اپنی تمام تر توجہ سرمایہ دارانہ نظام کو ختم کرنے کے لئے مرکوز کردیں، اُس نے اپنے مقصد کو کامیاب بنانے کے لئے جائز و ناجائز کی تمیز کو بالکل ختم کردیا۔"

کتاب کی زبان اور اندازِ بیان بھی خوب ہے، کہیں کہیں کھٹک محسوس ہوتی ہے۔

"کیونکہ صرف انصاف ہی کے ذریعہ افلاطون ہر شخص کو تنزلی سے بچا سکتا تھا" (صفحہ ۳۹)

"تنزلی" دفتری زبان کی اصطلاح ہے، کئی مقامات پر یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

"ان احساسات کو کوئی بھی تول نہیں سکتا اور نہ ہی ان کو قانونی تشکیل دی جاسکتی ہے" (صفحہ ۴۴) افسوس ہے "نہ ہی" کا استعمال بہت عام ہوچلا ہے، مگر ہم اس بد مذاقی کے خلاف ہمیشہ احتجاج کرتے رہیں گے۔ "اور جاں وجود بند ہوتے ہیں" (صفحہ ۱۸۶) "جا بجا چیند برتے ور لکھتے ہیں" حرفِ عطف (واؤ) کے بغیر : ـــــ "ایک مالدار خوب صورت لڑکی جینی کی تعریفوں میں بہت سی نظمیں لکھیں (ص ۲۰۴)" - "تعریف" کی جمع لانے کی آخر کیا ضرورت تھی! (صفحہ ۲۰۳) پر کاتب صاحب کی نوازش نے "فصوص الحکم" کو "خصوص الحکم" بنا دیا (ف کی بجائے خ) ـــــ اس کتاب میں قدیم یونانی سیاسی فلسفیوں سے لے کر ہیرالڈ، جے لاسکی تک اور مسلم سیاسی مفکرین میں ماوردی، ابن عربی،

بن خلدون اور اقبال کے سیاسی افکار پیش کئے گئے ہیں۔ خود فاضل مصنفہ سلجھی ہوئی فکر رکھتی ہیں اور وسیع مطالعہ بھی! اس نے کتاب کو ہر اعتبار سے گراں قدر اور بلند پایہ بنا دیا ہے!

گردِ راہ

از:- ضیا فتح آبادی، ضخامت ۱۴۸ صفحات، سرورق رنگین و دیدہ زیب، قیمت تین روپے، ۵۰ نئے پیسے۔

ملنے کا پتہ:- مکتبہ جامعہ ملیہ نئی دہلی۔

جناب ضیا فتح آبادی، حضرت سیماب اکبرآبادی کے ارشد تلامذہ میں شمار کئے جاتے ہیں، اُن کا کلام برسوں سے بلند پایہ رسالوں میں شائع ہو رہا ہے، ادبی حلقوں میں وہ بہت دنوں سے متعارف ہیں، اُردو زبان و ادب کے شیدائی ہیں، شاعری میں اپنا خاص رنگ رکھتے ہیں، جس میں شوخی کم مگر وقار و سنجیدگی کی فراوانی ہے!

ضیاء صاحب نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے، یہ دلیل ہے اُن کی قدرتِ سخن ... کی! "گردِ راہ" کے منتخب اشعار۔

(رباعی)

ظلمت کے بغیر نور پائے گا کہاں
خوابوں کے حسین قلعے بنائے گا کہاں
دھرتی کی کشش سے بچ نکلنے والے
جذبِ اُلفت سے بچ کے جائے گا کہاں

نظم "چور بازار" کا پہلا بند:-

ہر اُجالے کے پسِ پردہ اندھیرا ہے یہاں		شام جیسے ہو سیہ پوش سویرا ہے یہاں
ہر خطرناک درندے کا بسیرا ہے یہاں		ہر دُکاں دار حقیقت میں لٹیرا ہے یہاں

مگر

اس بند کی ٹیپ کے مصرعے ان چار مصرعوں کے جوڑ کے نہیں ہیں۔

آگ دوزخ کی دہکتی ہے بھڑکتی ہے مدام
مدحِ انساں کی رذالت سے بھڑکتی ہے مدام

"روح کا بھڑکنا" ایسے موقعوں پر نہیں بولا جاتا، اس کا محلِ استعمال اور ہے،

چلی دُنیا میں رسمِ سجدہ ریزی		کچھ اُن کے دَر سے، کچھ میری جبیں سے
اُجالوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر پکارو		اندھیروں میں بیٹھنے سے کیا فائدہ ہے
ہوش ہوتا ہے نہ کچھ اپنی خبر ہوتی ہے		ہائے! کیا چیز محبت کی نظر ہوتی ہے
کہہ دیا اُن سے جو نہ کہنا تھا		اور کہنا جو تھا وہ کہہ نہ سکے
باہیں جیسے گُل کی شاخیں		آنکھیں جیسے مد کے پیالے
(پھول کی شاخیں کہنا تھا)
مجھے دھوکا دیا میری نظر نے		کروں تجھ سے شکایت کیا گلا کیا
بہار تمہید ہے خزاں کی، بہار لے کر میں کیا کروں گا
قرار تو نام موت کا ہے قرار لے کر میں کیا کروں گا

تمہارے وعدے، تمہارے پیماں، تمہارے قول و قرار لیکن
یہ دو دلوں کا ہے نقد سودا اُدھار لے کر میں کیا کروں گا

دوسرا رخ :—

آوازِ جنوں فتنۂ فریاد سہی
اخلاص و وفا کی داد بیداد سہی
رکھتا ہوں نگاہ اپنے مستقبل پر
ماضی مرے امروز کی بنیاد سہی

اس رباعی کے آخری دونوں مصرعے خوب ہیں، مگر شروع کے مصرعے مبہم ہیں، "آوازِ جنوں" سے کیا مراد ہے! "فتنۂ فریاد" کیا ہوتا ہے اخلاص و وفا کی داد، بیداد کیوں ؟؟

پشتِ عفریتِ شب پر میں کوڑے برسانے آیا ہوں
نورانی صبح کے جلووں کو پیغام سنانے آیا ہوں (ص ۴۴)

"صبح کا تارا" اس نظم کا عنوان ہے! شب کے عفریت کی پیٹھ پر صبح کے تارے کا کوڑے برسانا — کس قدر بناوٹی خیال ہے اس میں کتنا تکلف پایا جاتا ہے .... اور تکلف بھی بے لطف !

عجب دائرہ ہے محبت کی دنیا   چلے تھے جہاں سے وہیں آ گئے ہم

شعر میں کوئی نقص نہیں — مگر نیاز رودولوی کا یہ شعر بے ساختہ یاد آگیا، کس قیامت کا شعر ہے ! —

تڑپتے تڑپتے سکوں پا گئے ہیں   جہاں سے چلے تھے وہیں آ گئے ہیں

ضیا صاحب کی غزل کا مطلع ہے —

سہانا سازِ زمانہ چاہتا ہوں   جنوں کے گیت گانا چاہتا ہوں

اس قسم کے اشعار انتخاب میں چھانٹ دینے چاہیے تھے ۔

مرے جذبات میں جو بہہ نہ سکے   اُن سے وہ دل کا حال کہہ نہ سکے (ص ۱۲۸)

یعنی ! ؟ !

ضیا فتح آبادی کی طبیعت کو "نظم" سے زیادہ مناسبت معلوم ہوتی ہے، مختلف موضوعات پر اُن کی نظمیں اس مجموعے میں شریک ہیں، نعتِ رسول کے یہ شعر کتنے ایمان افروز ہیں :—

پردے ابھی آنکھوں پہ جہالت کے پڑے ہیں   پائے کوئی کیسے درِ فیضانِ محمد
لکھی گئی دنیا میں ضیا ؔ ذوقِ یقیں سے
انسان کی تاریخ بہ عنوانِ محمد

گل و سنگ

از :- خضر برنی، ضخامت ۱۷۶ صفحات مجلد، رنگین گرد پوش، قیمت دو روپے پچاس پیسے
ملنے کا پتہ :- سنگم کتاب گھر، آنند پربت ، دہلی ۔

جناب خضر برنی پرانے صحافی اور کہنہ مشق شاعر ہیں، اُن کی زندگی انہی وادیوں کی سیر و سیاحت میں گذری ہے ! زبان صاف و

شستہ اور بیان میں تغزل کا چٹخارہ ملتا ہے ــــــ منتخب اشعار :ـــ

اک نمونہ ہے جہنم کا جہاں آیا ہے　　　آدمی چھوڑ کے جنت کو کہاں آیا ہے

پھر بھی رواں دواں ہے بہ فضلِ خدا ہنوز　　　ٹکرائی زندگی میں ہزاروں سے زندگی

اور کرتے بھی تو کیا ، ہاتھ گنہگاری کے سوا　　　یاد کرکے اپنی بربادی کا عالم رو دیے

غیروں پہ التفات و کرم ہم سے اجتناب　　　کس کو ہے کتنا پیار ، ذرا دل ٹٹول لیے

سہارا ناخدا کا اور ساحل کی تمنا کیا　　　کرو کشتی کو خود ہی نذر طوفاں دیکھتے کیا ہو

کچھ گردشیں الجھ گئیں لیل و نہار میں　　　ورنہ خزاں میں کیا نہیں ، جو ہے بہار میں

کم ظرف بہکتے ہیں تھوڑی سی جو مل جائے　　　میکش وہی میکش ہے پی کر جو نہیں جائے

جب سے تجھے دیکھا ہے دنیا کو نہیں دیکھا　　　جب سے تجھے پایا ہے دنیا سے ہوں بیگانہ

راز داری کے سبب ضبط کئے جاتے ہیں　　　تلخ ہے جام مگر پھر بھی پئے جاتے ہیں

دوسرا رخ :ـــ

اغیار کا کچھ ذکر نہیں پیار کی باتیں　　　آتی ہیں مرے لب پہ فقط یار کی باتیں　　　(ص ۲۱)

یار کی باتیں ــــ کیا پیار کی باتیں نہیں ہوتیں ؟

اپنے بیگانے ہوتے برقِ نظر کے سامنے　　　دل میں بھڑکی آگ آن کی چشم تر کے سامنے　　　(ص ۲۵)

مفہوم بطنِ شاعری میں گھٹ کر رہ گیا۔

وہاں سے باز ہوتی ہیں خدا والوں کی تقدیریں　　　جہاں گم ہو کے رہ جاتی ہے سب تدبیر انساں کی　　　(ص ۲۶)

تقدیروں کا باز ہونا ــــ کیا بات ہوئی ؟

پھر آج رقص میں آئے ہوئے ہیں دیوانے　　　فضائے عالم امکاں لگی ہے تھرانے　　　(ص ۲۹)

" وجد میں آئے ہوئے ہیں " کہنا تھا ، " وہ رقص آ گیا یا آیا ہوا ہے " یہ زبان اور روزمرہ نہیں ہے ! پھر یہ مبالغہ ہی ہے کہ دیوانوں کو رقص میں دیکھ کر عالم امکاں کی فضا تھرانے لگی۔

آپ روحِ عشق ہیں ناصح کو بکنے دیجئے　　　ایسے دیوانے کو خاطر میں نہیں لاتا ہوں میں　　　(ص ۴۵)

محبوب کو " روحِ عشق " کہہ کر مخاطب کرنا ، کچھ عجیب سا لگتا ہے ! اس ترکیب سے شعر میں کیا لفظی اور معنوی فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

مے خانے میں ساقی کا فیضان ہوا جاری　　　مے خوار وہاں بڑھ آئے اک اذن کہ جام آیا　　　(ص ۵۲)

" مے خواروں " کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے " مے خوار " لکھنا چاہیے تھا ! " اک اذن کہ جام آیا " اس ٹکڑے نے شعر کا لطف غارت کر دیا۔

نظامِ عالم کو کیا ہوا ہے کہ میری ہستی جواں نہیں ہے
مگر کسی کا کرم ہے شامل جو مجھ پہ طاری خزاں نہیں ہے　　　(ص ۸۶)

مصرعہ اولیٰ خاصہ مبہم ہے۔

کوئی ہے جفا کا عادی کوئی شانِ غم بڑھائے　　　کوئی مستقل ستائے کوئی پھر فریب کھائے　　　(ص ۱۰۲)

خضر برنی جیسے کہنہ مشق شاعر کے مجموعۂ کلام میں ایسے اشعار باعث حیرت ہے۔

رقیب کو نہ کبھی مورد عتاب کریں — وہ مجھ کو درد محبت سے کامیاب کریں (ص ۱۱۱)

اس مطلع کا بھی وہی رنگ ہے۔ ایسے اشعار نو مشقی کے زمانے میں کہے جاتے ہیں۔

معکوس نظرتی کی یہ سب ساز باز ہے — محو نیاز میں ہوں، تو وہ بے نیاز ہے (ص ۲۰)

معکوس نظرتی نے شعر کا ستیاناس کر دیا۔

حسن ہی کامیاب ہونا تھا — عشق آخر خراب ہونا تھا (ص ۱۰۲)

شاعر کے فن کا بڑا تعارف ہے، یہ مطلع!

کیا جادو کیا ہے کسی نے — اشک غم پڑ گئے آج پینے (ص ۱۲۳)

اس میں جادو کی آخر کیا بات ہے؟ اشک غم پینا، تو محبت کا معمول ہے!

محبت میں جنونِ شوق اب شامل نہ ہو جائے
ہمارا دعویٰ صدق و صفا باطل نہ ہو جائے (ص ۱۴۰)

"جنونِ شوق" میں ہوا و ہوس کب پائی جاتی ہے، جس کے شامل ہو جانے سے "صدق و صفا" کا دعویٰ ہی سرے سے باطل ہو جائیگا۔

جو نظر نظر میں سما گئی، اسی اک نظر کی تلاش ہے
مرا کھو گیا ہے دل و جگر مجھے دنیا بھر کی تلاش ہے (ص ۱۴۲)

دل تو کھویا جاتا ہے مگر خضر برنی صاحب کا، "جگر بھی دل کے ساتھ کھو گیا! عجیب بات ہے،" "دنیا بھر" پڑھتے ہوئے زبان کتنی اذیت محسوس کرتی ہے!

میری غریب زندگی کس کے سہارے جائے گی — سجدے تو پی کے سو رہے میکدۂ مجاز میں (ص ۱۴۷)

ابہام نہیں اہمال! پھر مصرعہ اولیٰ میں زبان کی خامی وجدان کو کس قدر کھٹکتی ہے!

کتاب خاصے اہتمام سے ترتیب دی گئی ہے، جگہ جگہ تصویریں اور قلمی خاکے ہیں! جو شاعر کی رنگین مزاجی کی دلیل ہیں، حالانکہ خود شاعر کی تصویر "مولویانہ" ہے! کتاب کا نام اُس کے مضامین کا صحیح ترجمان ہے کہ اس میں پھول کی نرمی کے ساتھ سنگ و خشت کی سختی بھی ہے، مگر وجدان شاعری میں نرمی و رعنائی کو ڈھونڈتا ہے اور —

موجِ خرام یار بھی کیا گل کتر گئی
یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا، اور نہ کوئی بندہ نواز

جیسی شاعری سے محظوظ ہوتا ہے۔

GULSHAN-I RAZ-I-JADID AND BANDAGI NAMAH

از:— علامہ اقبال، انگریزی ترجمہ:— بشیر احمد ڈار
صفحات ۔ صفحات، قیمت تین روپے،
ملنے کا پتہ:— انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک کلچر، کلب روڈ، لاہور

جناب بشیر احمد ڈار علمی حلقوں میں باوقار شہرت رکھتے ہیں، وہ عالم ہیں، فلسفی ہیں اور بلند پایہ انشاء پرداز ہیں، خاص طور سے "اقبالیات" پر صاحب موصوف " AUTHORITY " سمجھے جاتے ہیں، یہ کتاب جو ہمارے سامنے ہے علامہ اقبال کی دو نظموں ـــــ گلشن راز جدید اور بندگی نامہ ـــــ کا انگریزی ترجمہ ہے، ترجمہ خاصہ سلیس اور رواں ہے اس سے زیادہ کار آمد اور مفید تشریحی حواشی ہیں، جن میں علامہ اقبال کے مفہوم، فلسفہ اور تعلیمات کی عالمانہ انداز میں شرح کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ محمود شبستری اور علامہ اقبال کے تصورات اور افکار کہاں کہاں مختلف ہیں! محمود شبستری کا فلسفہ "فنا" اور "گم ہو جانے" کا فلسفہ ہے، اقبال "فنا" اور "گمشدگی" کی نفی کر کے بندہ کی "خودی" کو اتنا بلند کر دینا چاہتے ہیں کہ

ع خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

"فنا میں انفعالیت اور جمود پایا جاتا ہے اور "خودی" میں فعالیت اور حرکت ہے، پھر جس طرح قطرہ سمندر میں مل کر گم ہو جاتا ہے، اس طرح بندہ کا خدا کی ذات میں گم ہو جانا، یہ تصور غیر اسلامی ہے!

فاضل مترجم اور شارح نے اس کتاب کو اپنے استاد پروفیسر حافظ محمود خاں شیرانی کے نام معنون کر کے اپنی سعادت مندی کا ثبوت دیا ہے!

PARALLELISM IN ENGLISH URDU POETS از :- ایس اے مہدی، ضخامت ۹۰ صفحات دیدہ زیب خوشنما ٹائپ، پائیدار جلد، ملنے کا پتہ :- پوسٹ بکس ۵۱۲۶ ممباسہ (کینیا)

اس کتاب پر لارڈ ہیڈ لے آف گلینڈیل (سابق گورنر کینیا ایسٹ افریقہ) نے مختصر سا پیش لفظ، مسٹر سی، سائکس ٹامپسن (سابق ڈپٹی ڈائرکٹر تعلیمات کینیا) نے "تعارف" مسٹر گی سی ایچ رانو ـ مستقل سکریٹری وزارت محنت نیروبی) نے "دیباچہ" مسٹر ایس جیسٹر (علاقائی افسر تعلیمات ممباسہ) نے "دعائیں" اور جناب سید احتشام حسین نے پیش لفظ لکھا ہے اور ان تمام ممتاز و متعدد اشخاص نے فاضل مؤلف کی کاوش و محنت اور ذوق شعری کی تحسین کی ہے، جناب مہدی صاحب نے اپنی کتاب پر جو مقدمہ لکھا ہے وہ ادب و انشاء کا اچھا نمونہ اور ان کے علم و فضل کا آئینہ دار ہے۔

جناب ایس اے مہدی نے انگریزی اور اردو شعراء کے مختلف موضوعات پر وہ اشعار جمع کئے ہیں جن میں مضمون و خیال کی یکسانی پائی جاتی ہے، دو تین نمونے :-

There's not a bonie flower, that springs
By fountain, shaw or green
There's not a bonie bird that sings
But minds me o' my Jean
Robert Burns

I see her in the dewy flower
I see her sweet & fair
I hear her in the tuneful bird
I hear her charm the air
Robert Burns

گلشن میں صبا کو جستجو تیری ہے — بلبل کی زباں پہ گفتگو تیری ہے — انیس
ہر رنگ میں جلوہ ہے تری قدرت کا — جس پھول کو سونگھتا ہوں بو تیری ہے — 〃
اشارہ ہے یہی بادِ صبا کا — چمن اک رنگ ہے اُس کی ادا کا — اکبر
نسیم صبح گاہی وجد میں ہے — عجب مطلب ہے بلبل کی صدا کا — 〃
گل آتے ہیں ہستی میں عدم سے ہمہ تن گوش — بلبل کا یہ نالہ نہیں افسانہ ہے اُس کا — آتش

انگریزی شاعر کہتا ہے :—

I wander in the ways of men
Alike unknowing & unknown.

اکبر الہ آبادی نے اس خیال کو ان لفظوں میں ادا کیا ہے —

نہ تعلق ہے کسی سے نہ شناسائی ہے — انجمن میں ہوں مگر عالمِ تنہائی ہے

Misery is but the shadow of happiness. Happiness is but the cloak of misery. LAO TSZE

درد کے شعر میں اس مفہوم کا حسین فارمولا دیکھیے ہے :—

شادی کی اور غم کی ہے دنیا میں ایک شکل — گل کو شگفتہ دل کہو تم یا شکستہ دل

درد نے "شگفتہ دل" اور "شکستہ دل" کہہ کر مثال اور ثبوت سے شعر کو کس قدر وزنی اور اثر انگیز بنا دیا۔

What in fact is the world? A glass which shines, which a breath has made, and which a breath can destroy.
Gilles de Caux.

میر تقی میر فرماتے ہیں :—

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام — آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

اس کتاب میں میر کا ایک شعر نگاہ سے گذرا —

ساقی قدحے کہ ذوقِ گل ہے — مطرب غزلے کہ فصلِ گل ہے

اس شعر میں میر کے عام رنگ سے ہٹ کر کس قدر "فارسیت" بلکہ "ایرانیت" پائی جاتی ہے۔

صفحہ ۱۶۱ پر جوش ملیح آبادی کا ایک شعر درج ہے —

آپ سے ہم سے رنج ہی کیا ہے — مسکرا دیجیے صفائی ہے

کاش! فاضل مولف کو محمد الدین طپش بدایونی تلمیذِ امیر مینائی کا یہ شعر یاد ہوتا —

میری اُن کی کوئی لڑائی ہے　　اب چلا جاؤں اب صفائی ہے

عربی میں "مضطر" مجبور کو کہتے ہیں، مگر اُردو میں مضطرب اور بے قرار کے معنی میں بھی بولا جاتا ہے، یہ اُردو شاعروں کا تصرف ہے، سراج الدین ظفر تک نے اسی معنی میں یہ لفظ (مضطر) منظوم کیا ہے، فرماتے ہیں ــــ

آیا نہیں ہے وہ جو صنم جاڑے ز سے　　مضطر ہے دل خدا کی قسم جاڑے ز سے　　(صفحہ ۱۰)

جناب مہدی صاحب کو میر انیس کے کلام سے بہت زیادہ شغف اور محبت ہے، کتاب کا آغاز میر کے شعر کے بعد انیس کے شعر سے کیا ہے اور انیس کا شعر ہی خاتمۃ الکتاب ہے! اسی عقیدت و شغف کی رو میں غالب کے اس مشہور شعر ــــ

ہاں یہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا　　کہ میرے نطق نے بوسے مری زبان کے لئے

کو وہ انیس سے منسوب کر گئے ہیں (صفحہ ۸۹)

صفحہ ۲۰۳ پر "شعاعیں" کا املا "شعائیں" دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی! خدا کرے یہ ٹائپ جوڑنے والے (کمپوزیٹر) کی غلطی ہو۔

بدگمانی، بے اعتباری اور طرح طرح کے وہم و خیال کا آنا، محبت کی فطرت ہے، اس موضوع پر مولانا الطاف حسین حالی کا یہ شعر :-

یارب اس اختلاط کا انجام ہو بخیر　　تھا اُس کو ہم سے ربط مگر اس قدر کہاں

جو درج کیا گیا ہے اُس کا "بدگمانی" سے برائے نام بلکہ دراصل "زوالِ نعمت" سے تعلق ہے! یہ ایک نفسیاتی نکتہ ہے کہ جب آدمی کو توقع کے خلاف کامیابی اور مسرت و شادمانی کے اسباب اور آثار نظر آتے ہیں تو اُس کے دل میں کھٹک، وہم اور دھڑکا پیدا ہوتا ہے کہ کہیں اُس کا انجام "زوالِ نعمت" نہ ہو!

اس کتاب میں بعض غیر معروف اور گمنام شعراء ــــ درخشاں، بانسا، مشتاق، ناز ــــ کے اشعار بھی نظر آئے! ناسخ دو ہیں ایک "عظیم آبادی" اور دوسرے "دہلوی" اس کی صراحت ضروری تھی۔

اُردو ادب میں یہ پہلی کتاب ہے، جس میں اُردو اور انگریزی شعراء کے اشعار اس اہتمام و انتخاب کے ساتھ یکجا کئے گئے ہیں! یہ دلیل ہے فاضل مؤلف کی دیدہ ریزی اور وسعتِ مطالعہ کی کہ وہ انگریزی اور اُردو شعر و ادب میں اس قدر بصیرت رکھتے ہیں! جناب ایس اے مہدی اس انتخاب پر تبریک و تحسین کے مستحق ہیں!

کارمینا

دردِ شکم، بدہضمی، بھوک کی کمی،
اپھارہ، قبض، قے، دست
ہضم کی خرابی ——

یہ اور معدہ اور جگر کے دوسرے امراض آج کل عام ہیں۔ اور ان شکایتوں کی وجہ سے نہ صرف صحتیں خراب رہتی ہیں بلکہ کاروبار اور زندگی کے دوسرے مشاغل پر بھی اثر پڑتا ہے۔ اچھا ہاضمہ اور صحیح معدہ اچھی صحت کا ضامن ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ آپ وہی ہیں جو کچھ آپ کھاتے ہیں۔ لیکن جب آپ کا کھایا ہوا جسم کو نہ لگے، اور جزوِ بدن ہو کر خون بن کر آپ کو طاقت نہ پہنچائے تو کھانا پینا ہی بیکار نہیں ہوتا بلکہ اٹھنا بیٹھنا، سونا جاگنا مشکل ہو جاتا ہے اور جینا دوبھر۔

ہمدرد کی لیباریٹریوں اور ہمدرد مطبوں میں جیسے جڑی بوٹیوں اور ان کے قدرتی مرکبات پر طویل تجربات اور سائنسی تحقیقات کے بعد ایک متوازن اور مفید دوا "کارمینا" تیار کی گئی ہے جو ہضم کی جملہ خرابیوں کو دور کرنے میں خصوصیت رکھتی ہے۔ کارمینا معدے پر نہایت خوشگوار اثر کرتی اور اس کے افعال کو درست کرتی ہے۔ ہضم کے عمل کے لیے جو رطوبتیں ضروری ہیں کارمینا ان کو مناسب مقدار میں پیدا کرتی ہے، جگر کی اصلاح کرتی اور جگر کی جملہ خرابیوں کو درست کرتی ہے۔

سینے کی جلن، تیزابیت، پیٹ کا بھاری پن، نفخ، بدہضمی، پیٹ کا درد، کھٹی ڈکاریں، دردِ شکم، متلی اور قے، بھوک کی کمی، قبض یا معدہ اور جگر کی دوسری بیماریوں میں کارمینا کا استعمال نہایت مفید ہوتا ہے۔

"کارمینا" نظامِ ہضم کو درست اور قدرتی کرنے کی یقینی دوا ہے۔ ہر موسم اور ہر آب و ہوا میں ہر مزاج کے لوگوں کے لیے فائدہ بخش اور مؤثر ہے۔ بلا خطر استعمال کی جا سکتی ہے۔

کارمینا ہر گھر کی ایک ضرورت ہے

ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان
کراچی ڈھاکہ لاہور چاٹگام

ماہنامہ

فاران

کراچی

مئی ۱۹۶۶ء

جلد :- ۱۸

شمارہ :- ۲

ایڈیٹر ← ماہر القادری

ترتیب

نقش اول	ماہر القادری	۳
محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم	مولانا محبوب الرحمٰن	۸
آداب مراسلہ نگاری	اسرار احمد سہاروی (ایم۔ اے)	۱۳
ابن ابی الربیع	پروفیسر وحید اللہ نظمی (ایم۔ اے)	۲۵
اقبال کا فارسی کلام	محمد خاں (جھنگ صدر)	۴۴
اسلامی حکومت میں مالیات کا شعبہ	مولانا محمد حسام اللہ شریفی	۵۱
سفینۂ غزل	مختلف شعراء	۵۷
روح انتخاب	مولوی ضیاء الدین اصلاحی	۵۹
ہماری نظر میں	. . . .	۶۱

مسرور حسین پبلشر نے انٹرنیشنل پریس کراچی میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ "فاران" کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

پاکستان اسلام کے نام پر اور اسلام کے لئے بنا ہے، مگر افسوس ہے کہ اس ملک کا جو مقصدِ وجود اور غایت تخلیق ہے اُس سے یہاں شروع ہی سے غفلت برتی جاتی رہی ہے۔ یہاں کی معاشرت، سیاست، طریق تعلیم و تربیت اور قانون و دستور ان میں کسی شعبہ کو بھی "خالص اسلامی" بننے کی سعادت حاصل نہیں ہو سکی! اس امید و انتظار میں کتنے دین پسندوں کے بال سپید ہو گئے کہ اس خطہ میں کمیت و کیفیت کے اعتبار سے چھوٹے پیمانہ پر ہی سہی، خلافتِ راشدہ کی ایک صبح تو نمودار ہو سکتی۔

حسن اتفاق سے پاک و ہند کی جنگ کے زمانہ میں پاکستان کے معاشرے میں دینی جھلک اور اخلاقی رنگ پیدا ہو گیا، خشیت الٰہی اور محاسبۂ آخرت نے فکر و خیال اور قول و عمل کو پاکیزگی عطا کی، ریڈیو کی نشرگاہ سے لے کر عوام کی محفلوں تک "لا الٰہ الا اللہ" کی صدائیں گونجنے لگیں، بڑے بڑے عادی مجرم اور پیشہ ور بدمعاش برائیوں سے رُک گئے، جیسے جرائم کی چلتی ہوئی گاڑی میں کسی نے ایکا ایکی بریک لگا دیا، پولیس کے رجسٹروں میں آئے دن جو "وارداتیں" درج ہوتی رہتی ہیں ان میں حیرت انگیز حد تک کمی واقع ہو گئی! جو عورتیں تبرج جاہلیت اور تاک جھانک کی عادی ہیں اُن کو کلام پاک کی تلاوت کرتے اور نوافل پڑھتے دیکھا گیا، ہر طرف اللہ، رسول کے تذکرے، دین اور نیکی کی باتیں، جوشِ جہاد نے دلوں سے موت کا ڈر نکال دیا تھا! ادھر مسلمانوں کی سوسائٹی میں دینی تبدیلی کے آثار نمایاں ہوتے اور اُدھر اللہ تعالیٰ کی نصرت نازل ہوئی، دنیا نے اس حقیقت کا اس بیسویں صدی میں بھی مشاہدہ کر لیا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے چھوٹی جماعتیں بڑے گروہوں پر غالب آ جاتی ہیں اور جنگ کے میدانوں میں ملائکہ کے ذریعہ مجاہدین کی مدد کی جاتی ہے سچ تو یہ ہے کہ اس جہاد نے مسلمانوں کی گزشتہ تاریخ کی تصدیق کر دی! چھمب، سیالکوٹ، لاہور اور چونڈہ کے محاذ سے لے کر بدنہ کے میدان تک اہل ایمان کی شجاعت، سرفروشی اور استقامت کا یہ سلسلۃ الذہب اُستوار ہو گیا۔ کیسے کیسے دہریے اور خدا کے منکر تھے جو مجاہدوں اور غازیوں پر نصرت الٰہی کا نزول دیکھ کر بے ساختہ "اللہ" کا نام پکار اٹھے! اکبر الٰہ آبادی نے اس نفسیاتی کیفیت کو جو حقیقت میں فطرت کی پکار ہے، شاعرانہ زبان میں یوں بیان کیا ہے۔

ہر مضطرب کو اُس کی طرف التفات ہے
آخر خدا کے نام میں کوئی تو بات ہے

دینی طبقہ نے معاشرے میں دین و اخلاق اور رجوع الی اللہ کا یہ رنگ دیکھ کر دلی مسرت کا اظہار اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا، اور پاکستان کے ارباب بست و کشاد کو بار بار اس طرف متوجہ کیا کہ حکومت اپنے تمام ذرائع کام میں لائے، کہ جنگ کے بعد امن کی حالت میں بھی معاشرے کی یہ اخلاقی سطح برقرار اور قائم رہ سکتی ہے! اس فضا کو باقی رہنا چاہئے، بلکہ اس کو بلند سے بلند تر کرنے کی ضرورت ہے

منکر

اعلانِ صلح کے بعد اخلاق نیکی اور خدا خوفی کا یہ چڑھتا ہوا پارہ رفتہ رفتہ گرنے لگا۔ اخبارات میں پھر اُنہی جرائم اور وارداتوں کی خبریں آنے لگیں، جو جنگ کے زمانے میں رُک گئی تھیں ـــــ جگہ جگہ ذمہ دار شخصیتوں کے تعاون یا ایما سے "کلچرل شوز" کے نام پر رقص و سرود کی وہ محفلیں جمنے لگیں، جن پر قرآنی اصطلاح میں "فحش و منکر" کا اطلاق ہوتا ہے! اور جن کے ناجائز ہونے میں دو رائیں ہو ہی نہیں سکتیں!
اس پر دلیری کا یہ عالم کہ اخبارات میں کھلے خزانے بڑے فخر و مباہات کے ساتھ اس معصیت آلود مناظر کی تصویریں چھپ رہی ہیں ـــــ یہ عورتوں کی قوالی ہے، وہ لڑکیوں کا ناچ ہے، اور یہ مسلمان کنواریوں کی اداکاری کا منظر ہے! شمشیر و سناں کے چند روزہ دور کے بعد "طاؤس و رباب" کا پھر وہی اخلاق سوز تماشا، بلکہ پہلے سے زیادہ زور شور کے ساتھ اور اس انداز اور تنظیم کے ساتھ جیسے زمانۂ جہاد کی دینی فضا کو رنگ دیکر، ہوا و ہوس اور فحش و منکر کے قالب میں ڈھال دینا ہے! نصرتِ الٰہی اور انجام خداوندی پر شکر بھیجنے کی بجائے اس کا اُلٹا جلد اور ڈنکے کی چوٹ "کفران"!

ع ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے!

جو کوئی ان حیا سوز حرکتوں کا صوفیا کرام کے "سماع" سے جوڑ ملانا چاہتا ہے، وہ نہ "سماع" کی حقیقت سے واقف ہے اور نہ صوفیہ کے مزاج اور کردار کو پہچانتا ہے۔ صوفیا کرام کی اکثریت، مزامیر اور آلاتِ سرود و دف کی مخالف رہی ہے، چاہے اُس کے بجانے والے صرف مرد ہی کیوں نہ ہوں، رہی عورتوں کی گلوکاری، رقص و سرود اور ایکٹنگ اور وہ بھی مردوں کو خوش کرنے اور لبھانے کے لئے، تو یہ ہر صوفی کے نزدیک قطعاً ناجائز اور حرام ہے۔
بھارت، یورپ، امریکہ اور روس وغیرہ ممالک میں بے شک اس معصیت اور منکر کو "آرٹ" سمجھا جاتا ہے، مگر اسلام ایسے "آرٹ" پر جو کھلی ہوئی بے حیائی ہے، لعنت بھیجتا ہے! ان بے حیائی کی باتوں اور اخلاق سوز حرکتوں نے دنیا کی جو حالت کر رکھی ہے اس کا اندازہ کرنے کے لئے امریکہ کے معاشرے کا سرسری جائزہ لیجئے ـــــ کہ وہاں۔

ہر پانچ منٹ میں	ایک ڈکیتی ہوتی ہے۔
ہر ۳ منٹ پر	ایک شدید خونیں حملہ ہوتا ہے۔
ہر منٹ پر	ایک موٹر کی چوری ہوتی ہے۔

ـــــ اور ـــــ

ہر ۲۸ سکنڈ پر	ایک نقب زنی کی واردات ہوتی ہے۔

اس کے نتیجہ میں امریکہ کے سرکاری خزانے کو جو مالی نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے، وہ اربوں ڈالر تک پہونچتا ہے۔
عرب میں شرک و بت پرستی کے ساتھ جو برائیاں پائی جاتی تھیں اُن میں عورتوں کا رقص و سرود، تبرج اور عریانی بھی شامل تھی جس نے پورے معاشرے کو سرتاپا معصیت و گناہ بنا رکھا تھا، اسلام نے اس ایک ایک برائی کو مٹایا، اور وہ عورت جو برہنہ اور نیم برہنہ ہو کر ناچتی گاتی اور ساقی گری کرتی تھی، اُس کے سینہ و سر اور چہرے کو جلباب و خمار عطا کئے اور اس قسم کی چال ڈھال اور پہناوے پر پابندی لگا دی جس سے عورت کی "زینت" ظاہر ہوتی ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو عورت خوشبو لگا کر گھر سے باہر نکلتی ہے وہ "زانیہ" ہے!
دورِ نبوت اور عہدِ خلافت میں ایسی اخلاق سوز حرکتوں کا ارتکاب ہوتا تو اُن پر شرعی حد لگائی جاتی اور اس مزاج، ذہنیت اور

فی کو کسی قسم کا کوئی مقامِ عزت نہ دیا جاتا، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اکرام و عزت کا معیار صرف "تقویٰ" ہے۔

صنفِ نازک کو اسلام کے اس احسان کو ماننا چاہئے کہ اسلام نے اُسے قعرِ ذلت سے نکال کر، عزت کے تخت پر بٹھا دیا اور عفت و عصمت کا لباسِ فاخرہ اور مقدس خلعت اُسے عطا فرما دیا۔

آج کا معاشرہ جاہلیت اولیٰ کی طرح عورت کی عزت و ناموس کا دشمن ہے مگر عورت کی نادانی اور بے خبری کا یہ حال ہے کہ اپنی ذلت کو یہ سمجھ رہی ہے کہ اس طرح اُس کی قدر افزائی ہو رہی ہے، غالباً وہ اس حقیقت سے ناواقف ہے کہ دنیا کا کوئی اعزاز، داد و تحسین اور دولت و عزت عورت کی عصمت و عفت کی قیمت نہیں ہو سکتی!

نامحرم مرد و زن کو جہاں بھی قرب و اختلاط کے مواقع میسر آئیں گے وہاں اَدبدا کر بُرائیاں پیدا ہوں گی۔ پاکستان اسی پاکیزہ تصور اور مقدس نظریہ کی بنیاد پر وجود میں آیا تھا کہ اس خطہ میں ہم اہلِ ایمان یورپ، امریکہ، روس اور بھارت کے معاشرے، سوسائٹی اور سماج کی نقالی نہیں کریں گے، بلکہ ان تہذیبوں اور سوسائٹیوں کے علی الرغم اُس معاشرے کو فروغ دیں گے، جس کا دار و مدار اسلامی اخلاق پر ہوگا! مگر پاکستان میں ان توقعات کا کس بے دردی کے ساتھ خون ہو رہا ہے، مخلوط تعلیم سے لے کر سینماؤں، فیشن زدہ ہوٹلوں اور کلب گھروں تک، وہ فتنہ بہ ایں پیمانہ چڑھ رہا ہے جس کو قرآن کریم میں "تبرج جاہلیت" کہا گیا ہے۔ مغربی ملکوں کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ اسی "تبرج جاہلیت" کے ہاتھوں وہاں کا معاشرہ بداخلاقی اور معصیت و بے شرمی کے اُس پاتال تک پہنچ گیا ہے، جہاں "گناہ" کو آرٹ سمجھ کر فخر کیا جاتا ہے، اور مزاج و طبیعت میں "کلبیت و خنزیریت" کی خو بُو رَسا جاتی ہے۔

مشرقی ممالک بھی رفتہ رفتہ مغربی رنگ میں رنگتے چلے جا رہے ہیں، زندگی کے ہر شعبہ میں اس معصیت پسند تمدن و تہذیب کی نقالی کی پوری پوری کوشش! اب سے ۳۰-۳۵ سال پہلے متحدہ ہندوستان میں ڈوم، ڈھاڑیوں، کنجکروں، سازندوں، طوائفوں، بھانڈوں، نٹوں، مغنیوں اور ناچنے گانے والی عورتوں کو معاشرے میں کوئی عزت کا مقام حاصل نہیں تھا، بیاہ شادی اور دوسری تقریبوں میں اس گروہ کے عورت و مرد شریفوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا نہیں کھا سکتے تھے۔

مگر

آج ان کے لئے "آرٹسٹ" اور "فن کار" کے معزز القاب تراشے گئے ہیں، ان کو حکومتوں کی جانب سے خطابات اور یونیورسٹیوں کی طرف سے اعزازی ڈگریاں دی جاتی ہیں!

؎ پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے

معازف و ملاہی اور رقص و غنا اور اداکاری کو جس معاشرے میں برابر کی سطح دی جائے، اُس معاشرے کی ذلت اور پستی کی بھلا کوئی حد ہے!

دعوتِ غور و فکر

ہاں! تو ہم پاکستان کے معاشرے کا ذکر کر رہے تھے ——— جس طرح "اسلام" اپنے مزاج و فکر کے اعتبار سے دنیا کے تمام مذاہب سے جداگانہ اور منفرد حیثیت رکھتا ہے اور ملت اسلامیہ کے مزاج و ہیئت کی ترکیب بھی تمام قوموں سے ممتاز ہے، اسی طرح "پاکستان" کو بھی اسلامی مزاج و فکر کی اسی انفرادیت کا مظہر ہونا چاہئے تھا! غیر ملکوں میں ہمارے "سفارت خانوں" کو دیکھ کر دنیا اُن سے سبق اور روشنی حاصل کرتی کہ یہ تو "خیر و نیکی" کے تبلیغی ادارے ہیں! ہمارے سرکاری تقریبات میں باہر کے آئے ہوئے مہمانوں کو دین و اخلاق کی پاکیزگی نظر آتی اور پاکستان کے معاشرے کو دیکھ کر وہ نمایاں طور پر محسوس کرتے کہ یہاں تو ہر طرف اسلام کی دی ہوئی بھلائیاں جلوہ گر ہیں! غیر ملکی سیاح ہمارے کلب گھروں اور ہوٹلوں میں شراب اور رقص و قمار کی بجائے پاکیزگی و تقویٰ کے مناظر کا مشاہدہ کرتے تو وہ خود بھی متاثر ہوتے اور اپنے ملکوں میں واپس جا کر ہم سے

معاشرے کی اچھائی کے قصیدہ خواں اور مداح بن جاتے! پاکستان کے ہوائی جہازوں میں "خاتون میزبانوں" (AIR HOSTESS) کی جگہ مردوں کو میزبانی کے فرائض انجام دیتے ہوئے دیکھ کر غیر ملکی مسافر یہ اثر قبول کرتے کہ پاکستان کا معاشرہ مرد و زن کے اختلاط میں اسلامی حدود کی پابندی کرتا ہے اور یہاں کا ہر محکمہ، ہر شعبہ اور ہر ادارہ اسلام کے دئے ہوئے ضابطہ اخلاق کا سختی سے پابند ہے، یہاں دوسرے ملکوں کے تمدن و تہذیب کی نقالی نہیں کی جاتی یہاں فسکر و نظر گروی نہیں ہونے پاتے! پاکستان کے بارے میں دوسروں کے کاش ایسے تصورات ہوتے اور ہونے چاہئیے تھے، اس صورت میں ساری دنیا اخلاق و نیکی کی روشنی پاکستان سے حاصل کرتی، دنیا میں ہمارے پاکیزہ معاشرے کی مثالیں دی جاتیں، جہاں تک اخلاق و انسانیت کا تعلق ہے، دنیا کی زمام قیادت ہم پاکستانی مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہوتی اور پاکستان دنیا کے نقشہ پر مینارہ نور بن کر اُبھرا ہوتا۔

مگر

افسوس ہے کہ پاکستان کے کسی شعبہ حیات میں بھی اسلام غالب قوت نہ بن سکا، یہاں کے معاشرے میں کوئی ایسا امتیاز نظر نہیں آتا جسے دیکھ کر دوسرے لوگ اپنے یہاں کی سوسائٹی اور پاکستان کے معاشرے میں نمایاں طور پر فرق محسوس کریں، یورپ جس راہ پر جا رہا ہے اُنہی خطوط پر پاکستان کو بھی لے جایا جا رہا ہے، عوام کی تسلی کے لئے "اسلام" کا نام بار بار لیا جاتا ہے مگر اسلام کو عملاً نافذ نہیں ہونے دیا جاتا! اس غم کو کن لفظوں میں بیان کیجیے کہ جو خطہ اسلام کے نام پر بنا ہے وہاں اسلام کس قدر "اجنبی" نظر آتا ہے! پاکستان کے بڑے آدمیوں کو سب سے زیادہ اس کی فکر ہے کہ یہاں کی آبادی میں اضافہ کیوں ہو رہا ہے؟ اس کے کم کرنے اور گھٹانے کی تدبیریں کی جا رہی ہیں، حالانکہ فکر اس کی ہونی چاہیے تھی کہ پاکستان کے معاشرے کو اسلامی اخلاق کے قالب میں ڈھالا جائے! — "اقامت صلوٰۃ" اور ایتائے زکوٰۃ کے فریضہ کو نظر انداز کر کے "ضبط ولادت" پر روپیہ اور وقت کا خرچ، دینی نقطہ نگاہ سے کس قدر قابل غور بلکہ مستحق نقد و نظر ہے۔ عیش و تفریح کا کروڑوں روپیہ کا سامان پاکستان میں درآمد کیا جاتا ہے جس کے لئے پاکستان کو زرمبادلہ دینا پڑتا ہے اس پر کوئی احتساب، قدغن اور روک ٹوک نہیں۔ زرمبادلہ کی ساری کفایت شعاری اور احتیاط فریضہ حج کے معاملے میں کی جاتی ہے! انگریز کے دور میں حاجیوں کی تعداد پر کوئی پابندی نہ تھی، بھارت کے موجودہ ہندو راج تک میں وہاں کے مسلمانوں کو فریضہ حج کے سلسلہ میں بڑی سہولتیں اور آسانیاں میسر ہیں — مگر پاکستان میں زائرین حج کی تعداد کا کوٹا کم ہوتا چلا جا رہا ہے اور امسال حاجیوں کی تعداد پر جو قدغن لگائی گئی ہے اُس سے دین پسند طبقہ کو بڑا دکھ ہوا ہے۔

جیسے روح فرسا مظاہرے انجمنوں میں جس گرم جوشی کے ساتھ منظم طور پر مختلف شہروں میں "ورائٹی شو" منعقد ہوتے ہیں، اس کی مثال پاکستان کی پوری اٹھارہ سالہ تاریخ میں مجموعی طور پر بھی نہیں ملتی، یہ رنگا رنگ پروگرام جن میں پاکستانی طلبہ اور طالبات حصہ لے رہی ہیں — نوجوانوں کی سیرت و کردار میں جس قدر بھی اخلاقی بگاڑ پیدا کر دیں کم ہے، جو لڑکی غیر مردوں کو خوش کرنے اور اُن سے داد و ستائش حاصل کرنے کے لئے اسٹیج پر آ کر گاتی ناچتی اور رقص کرتی ہے، اس کھلے ہوئے فحش و بے حیائی کے سبب اُس کا کردار داغدار تو ہو چکا، اب وہ اس کے بعد برائی کی جس پست سطح تک بھی پہونچ جائے، اس کا دار و مدار ماحول اور مواقع پر ہے۔ گو نوا لہ کی نگاہ میں یہ حرکت "آرٹ" ہے مگر اسلام کی نگاہ میں "گناہ" ہے اور ایسا گناہ ہے جس کے بارے میں دو رائیں ہو ہی نہیں سکتیں۔

باہر سے آنے والے معزز مہمانوں کے خیر مقدم میں مسلمان خواتین کے "تبرج جاہلیہ" کا مظاہرہ، کہیں طائفوں کا ناچ، کسی مقام پر گرلز گائیڈز کی پریڈ ...... یہ تمام باتیں اللہ اور رسولؐ کے نزدیک انتہائی ناپسندیدہ ہیں! آخر یہ کیا ہو رہا ہے! اور کیوں ہو رہا ہے؟ کیا اس طرح معاشرے کو با اخلاق بنا کر دین پسند طبقہ کو کمزور اور بے اثر کرنا مقصود

ہے! جہاد فی اللہ تعالیٰ کی رحمت اور نصرت کے نزول کے بجائے اُس کے غضب کو دعوت دینے کے یہ محرکات و اسباب اور مظاہر کس قدر افسوسناک ہیں! ملک و ملت کے حق میں اس کے نتائج کتنے سنگین ثابت ہوں گے!

انسان فرشتہ نہیں ہے اُس سے غلطیاں بھی سرزد ہوتی رہتی ہیں، سب سے پہلے راقم الحروف اپنی اخلاقی کمزوریوں کا اعتراف کرتا ہے، "پاکی داماں" کا ہمیں بھی دعویٰ نہیں ہے، ہم بھی اصلاح و انقلاب کے محتاج ہیں ـــــ مگر "فحش و منکر" کا ایک پروگرام کے تحت مظاہرہ اور اس کا مسلسل اعادہ! اُسے عوام میں مقبول بنانے کی سعی و تدبیر...... !! یہ ہے وہ ٹریجڈی جس سے پاکستان دوچار ہے، یہ وہ ماحول ہے، جس میں رہ کر خدا کا خوف دل سے نکل جاتا ہے، گناہوں سے توبہ کرنے اور پشیمان ہونے کا خیال تک نہیں آتا! رفتہ رفتہ آخرت پر ایمان باقی نہیں رہتا!

حالات جب یہ ہوں تو کس کا سانحہ ارتحال کی تعزیتیں کریں، کس کی دانش و تدبر کو سراہیں، کس کے حضور سپاسنامے پیش کریں، کس کی شان میں قصیدے پڑھیں ـــــ مگر پھر کیا کریں؟ کیا مایوس ہو کر خاموش بیٹھے رہیں، حالات کے آگے سپر انداختہ ہو جائیں.... نہیں یہ نہیں ہو سکتا، مردِ مومن کے عزم و فراست کی یہ توہین ہے، ہمارا اولین فرض ہے کہ حالات کو بدلنے کے لئے مسلسل جدوجہد کرتے رہیں جہاں برائی دکھائی دے اس کو مٹانے کی کوشش کریں، زبان سے برا کہیں، کم از کم دل میں برا سمجھیں اگرچہ ایمان کا یہ آخری درجہ ہے! قیامت کے دن ہم سے یہ سوال نہیں کیا جائے گا کہ تم نے ماحول کو بدل کیوں نہیں دیا، باز پرس اس کی ہوگی کہ تم نے بُرے ماحول کو بدلنے کے لئے کیا کیا؟ آخرت میں سرخروئی اسی کو میسر آئے گی، جس نے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لئے تبلیغ خیر اور تغییرِ منکر کی جدوجہد کی ہوگی، آؤ! ہم اس جدوجہد میں شریک ہو کر اللہ تعالیٰ کی رضا کے طلب گار بن جائیں۔

ماہر القادری

۱۲/ اپریل ۶۶ء

ترجمہ :- مولانا محبوب الرحمٰن
خطیب جامع سلطانی (مظفر آباد، آزاد کشمیر)

(حال ہی میں ایک مضمون "النزاع حول اسم النبی صلی اللہ علیہ وسلم" کے عنوان سے ماہنامہ البعث الاسلامی بابت ماہ مارچ ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا ہے۔ مستشرقین نے جو اعتراض اسم "محمد" پر کئے ہیں۔ اُن کی تردید ڈاکٹر عبدالمعید نے اپنے انگریزی پرچہ ISLAMIC CULTURE - ثقافت اسلامیہ - بابت اکتوبر ۱۹۶۵ء میں کی ہے۔ اب اُن اعتراضات و جوابات کو استاذ سید احتشام احمد ندوی مدرس لغت عربی جامعہ دنکیشور نے ایک مضمون کی شکل میں شائع کیا ہے۔ مضمون اس لحاظ سے بڑا اہم ہے کہ آپ معلوم کریں گے کہ ہم مسلمانوں کے آخری پیغمبر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم گرامی پر مستشرقین نے کس قسم کے اعتراض کئے ہیں اور مسکت دلائل سے ان اعتراضات کی تردید ہماری جانب سے کس خوبی سے ہوئی ہے۔ میں نے اسی خیال کے پیش نظر اس عربی مضمون کا اردو ترجمہ کر دیا ہے۔

عربی عنوان کا اگر اردو ترجمہ کریں تو ذرا لمبا ہو جاتا ہے جو طبیعت کو کھٹکتا ہے۔ چونکہ مستشرقین کی جانب سے اسم محمد پر اعتراض ہوا ہے اور ہمارے نزدیک آپ کا حقیقی نام بھی یہی ہے۔ اس لئے اس اسم کو میں نے عنوان مضمون قرار دیا ہے۔)

مستشرقین ہمیشہ سے اسلام اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراضات کرتے آتے ہیں۔ ان کا منتہائے مقصد یہ ہے کہ اسلام کو ناقابل یقین قرار دیں۔ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلامی شریعت کے بارے میں لوگوں کو شک میں ڈال دیں۔ انتہائی افسوس کی بات یہ ہے کہ اکثر معترضین اسلام پر ایسے اعتراض کرتے ہیں۔ جن کی اصل قطعاً نہیں ہوتی۔

انتہائی تعجب کی بات یہ ہے کہ یورپ کے لوگ جو علم، دلیل، تحقیق، تاریخ کی چھان بین اور واقعات میں، ہی صحیح رائے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ کس طرح وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کے متعلق ایسی خرافات اپنی کتابوں میں بھر دیتے ہیں۔ اس طریق سے ان کی اسلام دشمنی ظاہر ہو جاتی ہے کیونکہ مستشرقین کا خیال یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نام محمد کبھی نہیں رہا اور آپ کا یہ نام اسلام کے بعد رکھا گیا اور آپ کا حقیقی نام ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا۔

ڈاکٹر عبدالمعید خاں نے اپنے پرچے ثقافت اسلامیہ - ISLAMIC CULTURE - میں مستشرقین کے اس باطل نظریہ کا معقول دلائل سے تعاقب کیا ہے۔ پھر ساتھ ہی ڈاکٹر موصوف نے نہایت واضح اور روشن دلائل سے ثابت کیا ہے کہ "محمد" آپ کا پیدائشی نام ہے

جس کی حقیقت تک مستشرقین کی رسائی نہیں ہو سکی مستشرق ہرش فلڈ۔ HIRCH FELD ۔ نے دیوان حسان بن ثابتؓ کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ اس شاعر نے اسم محمد اسلامی پیغمبر کے لئے استعمال کیا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ محمدؐ آپ کا نام نہیں تھا۔ بلکہ اسلام کی جانب سے آپ کو یہ لقب دیا گیا تھا۔ جو پیغمبرؐ کی وفات سے دو سال قبل تھا (معاذ اللہ) حقیقت یہ ہے آپ کے دو لقب محمدؐ اور محمودؐ ملے تھے۔ آپ نے آخری لقب کو اختیار کر لیا اور پہلے کو ترک کر دیا۔

ایسی ہی رائے پروفیسر ہٹی۔ HITTI ۔ نے اپنی کتاب تاریخ عرب۔ HISTORY OF THE ARABS میں اختیار کی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے قبیلہ میں سن ۵۷۱ء یا اس کے قریب پیدا ہوئے۔ آپ کی ماں نے جو نام رکھا وہ ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا اُس کا اندازہ ہے کہ آپ کا نام ہمیشہ غیر معروف رہا۔

سخت افسوس کی بات یہ ہے کہ مستشرقین بلاشبہ خود بھی نام نہیں جانتے جو آپ کی ماں نے آپ کا رکھا اس لئے ان لوگوں نے یہ نظریہ اپنی جانب سے گھڑ لیا ہے اور دلیل کے طور پر یہ کہتے ہیں کہ اسم "محمدؐ" قرآن کی مکی سورتوں میں نہیں آیا اور ، حسان بن ثابتؓ کے قصیدہ میں یہ اسم استعمال ہوا ہے یہ دیوان گویا ان کی نظر میں پایۂ ثقاہت کو پہنچا ہوا ہے۔

یہ مستشرقین ان احادیث اور واقعات کی طرف توجہ نہیں کرتے جو ہجرت سے پہلے دور کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔ ان واقعات پر غور کئے بغیر ہی انہوں نے یہ اندازہ کر لیا کہ حضورؐ کا نام مبارک "محمدؐ" اسلام سے پہلے اور بعد بھی نہیں تھا البتہ وفات سے دو سال قبل دینی لقب کے طور پر آپ کے لئے یہ لفظ استعمال ہونے لگا۔

لیکن ڈاکٹر عبدالحمید نے اس غلط نظریہ کا بڑی اچھی طرح تجزیہ کر کے بڑے معقول دلائل سے اس کی تردید کی ہے، اور اس بحث کی دلائل قاطعہ سے تائید کی ہے۔ جن سے پوری طرح یہ بات ثابت کی ہے کہ پیغمبر اسلام کا ذاتی نام محمدؐ اور احمدؐ کے سوا کوئی اور نہ تھا ڈاکٹر صاحب کا بیان ہے کہ اسم محمدؐ سورہ آل عمران ، احزاب ، فتح اور محمد میں آیا ہے۔ اور یہ سورتیں مدنی ہیں بجز فتح و محمد کے جن کے نزول سے متعلق مفسرین نے اختلاف کیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ دونوں سورتیں مکہ میں نازل ہوئیں۔ اس بارے میں تو کسی کو بھی شک نہیں کہ یہ سورتیں صلح حدیبیہ کے موقع پر سن چھ ہجری میں مکہ اور مدینہ کے درمیان نازل ہوئیں۔ اس موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ الفاظ لکھوانا چاہے تھے،

"یہ وہ عہد ہے جسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تسلیم فرما لیا ہے"۔ سہیل نے کہا اگر ہمیں یقین ہوتا ہے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں، ہم آپ کو بیت اللہ کی طرف جانے سے نہ روکتے۔ اس کے بجائے آپ محمدؐ بن عبداللہ لکھیے۔ مستشرقین نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کے متعلق جو غلط نظریہ قائم کیا ہے۔ اُس کی تردید میں یہ چیز قطعی حجت کی حیثیت رکھتی ہے۔

سہیل نے کلمہ رسول پر ... اعتراض کیا اگر اسی طرح محمد بھی دین کا لقب ہوتا تو سہیل اس پر بھی اعتراض کرتا اور بجز جو نام حضورؐ کا بچپن سے مشہور تھا اُس نام کے لئے اصرار کرتا۔ اس بات سے کامل طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ اہل عرب آپ کے نام محمدؐ کے سوا اور

IN OR ABOUT A.D. 571 A CHILD WAS BORN TO THE QURAYSH AT MAKKAH AND WAS GIVEN BY HIS MOTHER A NAME WHICH MAY REMAIN FOR EVER UNCERTAIN.

(CHAPTER VIII - PAGE — 111)

نام نہیں جانتے تھے۔ اسی لئے تو انہوں نے اس نام کو صلح حدیبیہ کے موقع پر قبول کر لیا تھا۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ وہ کلمہ طیبہ جس سے ایک انسان اسلام میں داخل ہو جاتا ہے وہ کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے اور یہ ارکان خمسہ میں سے پہلا رکن ہے۔ اس کلمہ کا ذکر سورہ ابراہیم میں شجرہ طیبہ کی تشبیہ سے کیا گیا ہے اس پر سب مفسرین نے اتفاق کیا ہے کہ شجرہ طیبہ سے مراد یہی کلمہ طیبہ ہے جس کے اقرار سے ایک کافر مسلمان ہو جاتا ہے اسی طرح یہ کلمہ ایک مکی سورت صافات میں "انہم اذا قیل لہم لا الٰہ الا اللہ یستکبرون" بھی آیا ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں نبی علیہ السلام کے اس ارشاد کو بیان کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا۔

" امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لا الٰہ الا اللہ "

بلاشک ان دونوں سے مراد کلمہ کا پہلا جزو ہے اور دوسرا جزو سورہ ابراہیم میں آیا ہے۔ جس سے یہ کلمہ پورا ہو جاتا ہے اس سے پوری طرح یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ "محمد" دینی لقب نہ تھا۔ بلکہ مکہ میں اسلام کی ابتدا سے ہی موجود تھا اور پھر ہمیشہ رہا۔

ایک اور روشن دلیل یہ ہے کہ مسلمان کلمہ شہادت کو اپنی پانچ نمازوں میں دہراتے ہیں۔ یہ آفتاب کی طرح روشن دلیل ہے کہ نئے اسم کے لئے ضروری ہے کہ وہ تھوڑی مدت میں عوام میں مشہور ہو جائے اگر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کی وفات سے دو برس پہلے ہی دینی لقب دیا گیا ہوتا تو یہ حقیقی نام کس طرح جلد کا مشہور ہو جاتا اس میں کچھ خدشہ تھا کہ قوم فوراً ہی اسے بھلا بھی دیتی اگر معاملہ ایسا ہی ہوتا تو آپ کا اسم حقیقی قصائد، محاضرات، قصص اور کتب مغازی میں بیان ہوتا۔ یہ حقیقت بھی دیکھئے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اذان کا حکم ہجرت کے پہلے سال دیا اس میں حضور کا یہی نام استعمال ہوا۔

مستشرق ہرش فیلڈ HIRSCH FELD نے کیا عجیب فیصلہ کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات سے دو سال قبل یہ لقب اختیار کیا تھا۔ اس نے اپنے دعویٰ کے ثبوت میں حسان بن ثابت کا یہ شعر پیش کیا ہے

وشق لہ من اسمہ لیجلہ فذو العرش محمود وھذا محمد

ترجمہ: اللہ نے حضور کی عظمت ظاہر فرمانے کے لئے اپنے نام سے حضور کا نام مشتق فرمایا۔ پس وہ صاحب عرش محمود ہے اور آپ محمد ہیں۔

ڈاکٹر عبدالمعید خان نے مستشرق کے خیال کی تردید کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس کی رائے میں حسان بن ثابت غزوۂ بدر کے بعد اسلام میں داخل ہوئے اُن کی رائے یہ بھی ہے کہ حسان بن ثابتؓ نے اس قصیدہ کے ایک شعر میں " ایاک نستعین وایاک نعبد " بولا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ مصرعہ سورہ فاتحہ سے لیا گیا ہے اور سورہ فاتحہ مدینہ میں نازل ہوئی۔ حسانؓ کا کہنا ہے کہ یہ قصیدہ ہجرت اور فتح مکہ ۸ ہجری کے درمیانی عرصہ سے تعلق رکھتا ہے۔

اس موقعہ پر سورہ فاتحہ کے مقام نزول کے بارے میں مفسرین نے اختلاف کیا ہے۔ بعض کی رائے ہے کہ مکہ میں نازل ہوئی اور بعض کی رائے ہے کہ مدینہ میں نازل ہوئی۔ لیکن مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی تفسیر میں واضح دلائل سے ثابت کیا ہے کہ یہ سورہ مکہ میں نازل ہوئی۔ کیونکہ اس سورہ کا ایک نام " مثانی " ہے اور ایک موقع پر ارشاد ربانی ہے۔ " ولقد اتینٰک سبعاً من المثانی والقرآن العظیم " اور یہ آیت بلا اختلاف مکہ میں نازل ہوئی ہے۔

حسان بن ثابتؓ مدینہ کے قبیلہ نجار میں سے تھے اور یہ قبیلہ بنو خزرج کا ایک شاخ ہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ پہونچے تو اُس وقت حسان بن ثابتؓ کی عمر ساٹھ برس کی تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باون سال کے تھے۔ ان دونوں کی عمر کے درمیان آٹھ سال کا فرق تھا۔ اس صورت میں ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ اُس وقت حسان بن ثابت تجربہ کار، دانا اور معروف شاعر تھے لوگوں میں اُن کی بڑی عزت اور تکریم پائی جاتی تھی جیسا کہ بیعت عقبہ اور بیعت رضوان مدینہ میں لوگوں کے درمیان مشہور تھی۔ نبو نجار

انصار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے تھے۔ سب اہل مدینہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد مدینہ کے منتظر تھے۔ ان تمام وجوہ کی بنا پر یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ حسانؓ ان انصار میں سے تھے جو سب سے پہلے اسلام لائے اور انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کی مدد کی۔ درحقیقت وہ غزوۂ بدر سے پہلے اسلام لائے تھے، جیسا کہ ان قصائد اور اشعار سے معلوم ہوتا ہے جو انہوں نے غزوۂ بدر سے پہلے کہے۔ ایک قصیدہ میں جس کا مطلع ہے "واللہ ربی لا نفارق ماجداً" مجھے اپنے رب کی قسم ہے کہ اس بزرگ و برتر سے کبھی علیحدہ نہیں ہونگا۔ اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ یہ اشعار اس وقت کہے گئے تھے جبکہ قریش نے انصار مدینہ کو دھمکایا تھا کہ وہ اسلام اور نبی علیہ السلام کی مدد سے باز رہیں۔

اس طرح حسانؓ نے ایک شعر میں ابوجہل پر طعن کیا ہے جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ابوجہل اس وقت زندہ تھا کیونکہ ان کی عادت ہے کہ کسی کے مرنے کے بعد اس پر طعن نہیں کرتا اور ابوجہل غزوۂ بدر کے موقع پر قتل ہوا ان تمام دلائل سے ثابت ہوتا ہے کہ حسانؓ نے ابوجہل کی زندگی میں اس کی موت سے قبل یہ شعر کہا تھا۔

لعن الرحمٰن جمعاً یقودهم — دعی بنی شجع لحرب محمد

ترجمہ:- خدائے رحمن نے محمدؐ سے لڑنے والے اس گروہ پر لعنت کی ہے۔ جس کی رہنمائی بنی شجع کا ایک شخص کرتا ہے۔ حسان بن ثابتؓ کے بہت سے اشعار سے ہم معلوم کرتے ہیں کہ غزوۂ بدر (۲ ہجری)، غزوۂ احد (۳ ہجری) غزوۂ خندق (۵ ہجری) میں کہے گئے ہیں۔ ان کے بارے میں کسی کو بھی شک نہیں ہو سکتا۔ غزوۂ بدر کے موقع پر ان کا شعر ہے ؎

امام محمد قد آزروه — علی الاعداء فی لفح الحروب

واقر عین محمد واصحابه — واذل کل مکذب مرتاب

ترجمہ: محمدؐ ایک قائد ہیں۔ جن کی اعانت کے مردوں نے دشمنانِ حق کے مقابلہ میں جنگ بھڑکانے میں کی ہے۔

اللہ پاک نے محمدؐ اور ان کے ساتھیوں کی آنکھوں کو ٹھنڈا کیا۔ اور ہر شک کرنے والے مکذب کو ذلیل و خوار کیا۔ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم "محمدؐ" صاف طور پر لایا گیا ہے۔ اسی طرح اعشیٰ قیس مخضرمی نے ایک قصیدہ رسول اللہ صلعم کی تعریف میں اپنے اسلام لانے کے ابتدائی دور میں کہا تھا جس میں وہ کہتا ہے:

فآلیت لا ارثی لها من کلالة — ولا من حفی حتی تلاقی محمدا

متی ما تناخی عند باب ابن هاشم — تراحی وتلقی من فواضله ندی

اجدک لم تسمع وصاة محمد — نبی الاله حین اوصی واشهدا

ان اشعار میں اس نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نامی "محمدؐ" کا ذکر کیا ہے اس موقع پر ابوسفیان نے اسے مدینہ جانے سے منع کر دیا تھا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا مکہ ہی میں نام "محمدؐ" معروف تھا اور آپ کی شہرت اسی نام سے عرب میں پھیل گئی تھی۔ اعشیٰ نے یہ قصیدہ صلح حدیبیہ کے زمانے میں کہا تھا۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنی وفات سے پانچ سال قبل بھی اسم "محمدؐ" کے نام سے مشہور تھے۔

اسی طرح ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ابو احمد بن جحش نے ایک شعر میں مکہ میں اسلام کی مشکلات کا ذکر کیا ہے۔ جس میں سریہ نخلہ کا ذکر ہے جو ساتویں ہجری میں واقع ہوا۔ اس میں وہ کہتا ہے ؎

صدودکم عما یقول محمد — وکفی به والله راء وشاهد

ترجمہ- محمدؐ جو کچھ فرماتے ہیں۔ تم لوگوں کو اس سے روکتے ہو اور اس سے انکار کرتے ہو اور اللہ تعالیٰ یہ سب کچھ دیکھتا ہے اور گواہ ہے یہ ایک

بڑی گواہی ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم "محمد" مکہ کے لوگوں میں ہجرت کے تین سال قبل مشہور تھا۔ ابوعزہ عزہ بدر میں کفار کی جانب سے شریک ہوا تھا۔ یہ شہور شاعر اور منافق تھا اس نے نبی علیہ السلام سے معافی مانگی اور آپ نے درگذر فرمایا۔ آپ نے اس سے فرمایا کہ میں سمجھ اس بات پر چھوڑتا ہوں کہ تو آئندہ دشمنان اسلام سے تعاون نہیں کرے گا ابوعزہ نے ایسا ہی وعدہ کیا اور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا جس میں وہ کہتا ہے ؎

الا ابلغا عنی النبی محمداً　　بانک حق والملیک حمید
وانت امرؤ تدعوا الی الرشد والتقیٰ　　علیک من اللہ الکریم شہید
ولکن اذا ذکرت بدراً واھلھا　　تاوب ما بی حسرۃ و تعود

ترجمہ۔ اے لوگو میرا پیام محمد کو پہنچا دو کہ آپ بلاشک حق پر ہیں اور جو لائق حمد فرمانروا ہے۔ آپ ایسی شخصیت ہیں جو رشد وہدایت کی طرف بلاتی ہے۔ آپ اللہ رب العزت پر گواہ ہیں۔

لیکن ایک بات ہے کہ جب مجھے بدر اور اہل بدر یاد آتے ہیں تو حسرت وندامت کا ہجوم ٹوٹ پڑتا ہے ۔ یہ مکی منافق شاعر نبی علیہ السلام کا نام "محمد" ہجرت میں بولتا ہے۔ کیونکہ وہ اس کے سوا اور کوئی دوسرا نام آپ کا نہیں جانتا۔ یہاں شاعر کے کلام میں ایک اور نکتہ کی طرف بھی اشارہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا نام "محمد" اپنے نام "حمید" سے نکالا ہے اور یہ اشعار حسان بن ثابت سے سات سال قبل کہے گئے ہیں اس موقع پر مستشرق کی اس بات پر کہ حسان بن ثابت نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ لقب دیا تھا۔ عقل حیران رہ جاتی ہے کہ جو نام لوگوں کے یہاں غیر معروف سا ہو، اس کی تشریح وتوضیح ایسے نام سے کی جاتی ہے جو معروف ہو۔

عباس بن مرداس نے اس انداز پر اس طرح کہا ہے۔

؎ حتی اذا قال الرسول محمد　　ابن سلیم قد وفیتم فارفعوا

—— الف ——

حضرت حسان بن ثابت نے کہا ؎

نصرنا وآوینا النبی محمداً　　علی انف راض من معد وراغم

ترجمہ۔ ہم نے جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کی اور انہیں پناہ دی۔ راضی، معدا اور راغم کی ناراضی کے باوجود!

چونکہ لفظ نبی اس موقع پر شہید نہ تھا۔ اس لئے شاعر نے معروف نام "محمد" کے ذکر سے توضیح کر دی۔

یہ گوناگوں تاریخی دلائل ہیں۔ جن سے مکمل کر یہ ثابت ہو جاتا ہے۔ کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا نام "محمد" ابتدا ہی سے رکھا گیا تھا۔ اس واضح معاملہ میں کسی قسم کے شک کی گنجائش نہیں۔ اگر مستشرقین پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کوئی دوسرا نام جانتے ہیں۔ تو انہیں چاہئے کہ دلائل کے ہمراہ پیش کریں تاکہ سچ، جھوٹ اور حق وباطل کے درمیان تمیز ہو سکے۔

(صفحہ ۴۹ کا بقیہ)

پس طریقت چیست اے والا صفات　　شرع را دیدن بہ اعماق حیات

اقبالؒ دین فہمی میں چالاک وچست فکر کے مالک تھے مگر میدان عمل میں کچھ کمزور تھے اس کا اعتراف خود انہوں نے بھی کیا ہے اور کردار عمل کے لئے بار بار دعا مانگی ہے۔ مثنوی "پس چہ باید کرد" میں فرماتے ہیں ؎

فکر من در فہم دین چالاک وچست　　تخم کردارے ز خاک من نرست
تیشہ ام را تیز تر گرداں کہ من　　محنتے دارم فزوں از کوہکن
مومنم از خویشتن کافر نیم　　بر فسانم زن کہ بد گوہر نیم

اسرار احمد بہادری (ایم۔اے)

آدابِ مراسلہ نگاری

انسان متمدن ہونے سے پہلے بھی مدنی الطبع تھا وہ اپنی فطرت کے اس تقاضے سے اور مجبور ہوتا ہے کہ اگر ماں باپ اس کی مسلسل کئی سال تک دیکھ بھال اور پرورش نہ کریں تو وہ زندہ ہی نہیں رہ سکتا۔ اسی وجہ سے ابتدائے آفرینش سے انسان کو خانگی زندگی بسر کرنی پڑی ہے دوسرے جانداروں کی یہ کیفیت نہیں ہے ان کے بچے پیدا ہوتے ہی خود کفیل ہو جاتے ہیں یا بہت تھوڑے عرصے میں اپنی حفاظت کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے اکثر جانوروں کو گروہ اور قبیلہ بنا کر زندگی گزارنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی اس کے علاوہ انسانی زندگی کی اہمیت بھی خالقِ کائنات کے نزدیک کچھ زیادہ معلوم ہوتی ہے اس لئے اس کی زندگی کی حفاظت اور بقائے نسل کی ضمانت دوسرے جانوروں کی نسبت زیادہ کی گئی ہے۔ جان کی حفاظت کے لئے اس کو سب سے بڑی طاقت وہ جوہرِ عقل عطا کی گئی ہے جو دوسرے جانوروں کو نہیں ملی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی زندگی کی بقا قدرت کو بہت عزیز ہے۔

قیاس کیا جاتا ہے کہ ابتدائے آفرینش میں انسان ایک دوسرے کو اشاروں سے مخاطب کرتا ہوگا۔ پھر کچھ بے ہنگم قسم کی آوازوں کو کام میں لایا گیا ہوگا اور آوازیں اشارے مل کر کام کرنے ہوں گے۔ غصہ۔ محبت۔ نفرت وغیرہ کے جذبات کو آواز کے اتار چڑھاؤ اور اشاروں کی سختی نرمی سے ظاہر کیا گیا ہوگا۔ لیکن جیسے جیسے انسانی تہذیب و تمدن کا نشوونما ہوا اس کی زندگی میں پیچیدگی پیدا ہوتی رہی اس کی ضرورت میں اضافہ ہوا۔ دور دور بستیاں آباد ہوئیں جہاں کو اشارے اور آوازیں ابلاغ کے لئے کافی نہیں ہو سکتے تھے، چنانچہ ضرورت نے انسان کو ایک نئی ترکیب سجھائی اور اس نے تصاویر بنا کر اپنے پیغام عزیزوں اور دوستوں کے پاس بھیجنا شروع کئے، اشاروں اور آوازوں کو انسان نے ایک قباحت یہ بھی محسوس کی ہوگی کہ ہر بات ایسی نہیں ہوتی کہ اس کو سوائے مخاطب اصلی کے کوئی دوسرا سمجھے لیکن اشاروں اور آوازوں کو ذریعہ پیغام رسانی بنانے سے رازداری ممکن نہ تھی اس وجہ سے تصاویر کا فن ایجاد ہوا۔ تصاویر نے ایک طویل مدت گزرنے کے بعد حروفِ تہجی کی صورت اختیار کر لی اور آہستہ آہستہ تحریر کا ایک مستقل فن ایجاد ہوا۔

مندرجہ بالا گزارشوں سے ایک بات یہ ذہن میں آئی ہے کہ خطوط نویسی کا ایک بڑا مقصد رازداری بھی تھا۔ انسان اپنی بعض باتوں کو صیغۂ راز میں رکھنا چاہتا ہے اور برملا کوئی بات اگر نہیں کر سکتا تو تحریر کے ذریعے سے اپنے پیغام کو اپنے مخاطب تک بڑی آسانی اور حفاظت سے پہنچا سکتا ہے۔ یہ رازداری کا داعیہ ہی دراصل خطوط نویسی کی جان ہے، خط در اصل وہی ہے جس میں ایسی باتیں بیان کر دی گئی ہوں جو دوسروں کے لئے نہ ہوں بلکہ صرف مخاطب کے لئے ہی مخصوص ہوں بلکہ ان کو دوسروں کی نگاہوں سے محفوظ رکھنا ہی مقصود ہو اسی لئے مشرقی آدابِ خطوط کی رازداری کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور جہاں مشرقی گھرانوں میں دوسرے اخلاقی سبق دئے جاتے ہیں۔ وہاں ایک سبق یہ بھی ہوتا ہے کہ دوسروں کے خطوط بغیر اجازت کے پڑھنا منع ہے۔ چنانچہ اسلامی آدابِ معاشرت میں کسی کی بات کو چھپ کر سننا یا کسی کے راز کو فاش کرنا انتہائی قبیح فعل گردانا گیا ہے۔ لیکن آج کل کی معاشرت کے آداب میں ان اخلاقی اور اسلامی قدروں کو تسلیم نہیں

یا جاہلانہ اور آہستہ آہستہ لوگ ان قدروں کو نظر انداز کرتے جا رہے ہیں اصحاب کا خیال ہے کہ انسان کا اپنا کچھ نہیں اس کا ہر فعل خام کا مال ہے اور عوام کو حق حاصل ہے کہ اس کا کوئی راز راز نہ رہنے دیں اور اس کے ہر راز کو طشت از بام کریں۔ جہاں آج کل قدروں میں جسمانی عریانی پسند کی جاتی ہے وہاں انسان کو ننگا کر دینا بھی ایک مستحسن فعل شمار کیا جاتا ہے۔ بہرحال پسند نا پسند کے معیار بدلتے رہتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمیں عقل سلیم عطا فرمائی ہے تو ہمیں چاہئے کہ ہم یہ سوچتے رہیں کہ کون سے معیار ہماری زندگی کے لئے مفید ہیں اور کون سے معیار مضر ہیں محض دل کی خواہش اور نفس کے حکم کے پابند ہو کر نہ رہ جائیں۔ میں یہاں اضافیت سے انکار نہیں چاہتا لیکن اضافیت کو تسلیم کرتے ہوئے بھی آخر اچھائی اور برائی کے پیمانے مقرر کرنے پڑتے ہیں۔ اضافیت کے معنی نراج اور اخلاقی انارکی کے نہیں ہیں۔ قانون اور اس کی پابندی تہذیب و تمدن کی علامت ہے، نراج اور انارکی وحشت کی۔ ہمیں خیر و شر کے پیمانے مقرر کرتے وقت اور کچھ نہیں تو کم از کم افادیت کا ہی خیال رکھنا چاہئے۔ یعنی جو چیز مجموعی حیثیت سے انسانی زندگی کو بلندی، خوشی اور سکون عطا کرنے والی ہو اس کو اپنا لیا جائے اور جو چیز انسان کو پستی، ذلت اور انتشار کی طرف لے جائے اس کو ترک کر دیا جائے۔ میرے خیال سے عریانی خواہ کسی قسم کی ہو، ذہنی یا جسمانی انسانی شرف کو مٹانے والی، اس کو ذلیل کرنے والی اور اس کی زندگی میں انتشار پھیلانے والی چیز ہے۔ انسان نے لاکھوں سال کی زندگی میں تجربات حاصل کر کے یہی نتیجہ نکالا ہے کہ عریانی بری اور نقصان دہ چیز ہے اور یہ انسان کو جانوروں کی سطح پر لے آتی ہے۔ یہ انسان اور حیوان میں امتیاز پیدا کرنے والی ہے۔ راز داری اور پردہ پوشی انسانی تمدن کی پیداوار ہے۔ اگر ہم خالص افادیت کی نظر سے اس مسئلے پر غور کریں تو یہ بات آسانی سے ہماری سمجھ میں آ جاتی ہے کہ عریانی میں بہت سی قباحتیں ہیں۔ جسمانی عریانی میں انسان کو بری سختیاں جھیلنی پڑتی ہیں۔ شرم و حیا کا تصور ختم ہو جاتا ہے۔ اخلاقی اور جنسی انتشار پھیل جاتا ہے، لڑائی فساد اور قتل و غارت کا ہونا یقینی ہے۔ مذاق سلیم پر بھی عریانی گراں گزرتی ہے اگر یہ کہیں کہ انسان ہر چیز کا عادی ہو جاتا ہے تو کیا یہ اچھی بات ہے کہ انسان اپنے آپ کو ایسی چیزوں کا عادی بنائے جو ظاہری طور پر اس کو بالکل حیوان بنا دیں۔ لباس انسان کی حفاظت ہی نہیں کرتا بلکہ اس کی زینت کا باعث بھی ہے۔ اس کے بہت سے عیوب کی بھی پردہ پوشی کرتا ہے۔ ننگے آدمی کا ہر عیب نگاہوں کے سامنے ہوتا ہے اور ہمیں زندگی میں خوبصورتی کے اظہار اور پردہ پوشی کی اس لئے ضرورت ہے کہ ہم زندگی کو بے عیب اور خوب صورت ہی دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ نقائص اور عیوب سے فطری طور پر ہمیں کوفت اور کراہت محسوس ہوتی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہر چیز ہمارے سامنے ایک اچھے معیار اور حسن صورت اور حسن سیرت کا پیکر بن کر آئے تاکہ ہم اس کو نمونہ اور معیار سمجھ کر اس کی پیروی کریں اپنے ذوق جمال کی تسکین کریں اور اگر ہو سکے تو اس معیار کو آگے بڑھانے کی کوشش کریں۔ اگر ایک انسان جسمانی طور پر بدہیئت، بدصورت اور مکروہ ہے لیکن وہ ہمارے سامنے آنا چاہتا ہے تو اس کو حق ہونا چاہئے کہ وہ ایسا کرے اس میں ہمارا بھی فائدہ ہے اس کا بھی۔ اپنے اس ادعا کے ساتھ وہ ایک "مہذب" اور خوب صورت اور خوش مزاج انسان کی سی حرکتیں کرے گا۔ اس میں خود اعتمادی پیدا ہوگی اور نفسیاتی طور پر اس کی زندگی پر بھی خوش گوار اثر پڑے گا اور دوسروں کی زندگی پر بھی ــــــ

مندرجہ بالا تمام باتوں کا اطلاق ذہنی عریانی پر بھی ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے ذہن کی چند واردات کو پس پردہ رکھنا چاہتا ہے۔ خصوصاً وہ واردات جو تہذیبی اور اخلاقی اصول میں قابل اعتراض سمجھے جاتے ہیں تو ہمیں اس کا یہ حق چھین نہیں لینا چاہئے خصوصاً جب کہ وہ ہمارے درمیان نہ ہو اور اپنے اوپر لگائے ہوئے الزاموں کی تردید ہی نہ کر سکتا ہو یا ان کی تفسیر اس طرح نہ کر سکتا ہو جو اس کو لگائے ہوئے الزاموں سے تبرا کر سکے۔ مرنے کے بعد کسی کے ذاتی خطوط اگر کوئی خصوصاً جن کو وہ زندگی میں شائع کرنا

پسند کرتا ہو بڑا ظلم ہے۔

ہیں ہر شخص کے ان خیالات کو عوام کے سامنے لانے کا انسان کی بازپرس کرنے کا حق ہونا چاہئے۔ جو قوت سے فعل میں منتقل ہو کر کسی طرح ہمارے سے معاشرتی طرز پر اثر انداز ہو رہے ہوں۔ یہی دنیا میں ہر جگہ قانون نافذ ہے جو خیال عمل میں ظاہر نہ ہو اس پر کہیں دارو گیر نہیں ہوتی۔ برے خیال کا پیدا ہونا ہر شخص کے ذہن میں ممکن ہے۔ لیکن اچھے لوگ اس کو دبا دیتے ہیں اور نشو و نما کی اجازت نہیں دیتے۔ ان کے لبوں میں اتنی ہی بات ہے اور اسی سے نیکی و بدی کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ بھی انہیں خیالات اور خواہشات پر دار و گیر کرتا ہے جو قوت سے فعل میں آ جائیں اور معاشرے میں خرابی کا باعث بنیں۔ خطوط کا بھی معاملہ بڑی حد تک خیالات کا ہے۔ ان کی مضرت بہت محدود ہے۔ بشرطیکہ ہم اس کے تعفن کو خود تمام دنیا میں پھیلانے کی کوشش نہ کریں۔ تعجب ہے کہ ہم کسی کے خطوط پر معترض ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس نے یہ غیر اخلاقی بات لکھی لیکن محض اس کو بدنام کرنے کے شوق میں اس محدود برائی کو غیر محدود ہم خود بنا ڈالتے ہیں گویا پھر پہچانتے ہیں اور ہاتھی نکل جاتے ہیں۔ یہاں مثال کے طور پر میں مولانا شبلی کے خطوط کا ذکر کروں گا جن کے ساتھ یہ انتہائی ظلم کیا گیا ہے کہ اس وقت جبکہ وہ اس دنیا میں نہیں اور اپنی صفائی نہیں کر سکتے اور نہیں بتا سکتے کہ انہوں نے کیا بات کس خیال سے کہی کیونکہ ایک ہی بات مختلف خیال کے تحت کہی جا سکتی ہے، ہم نے ان کے بعض وہ خطوط شائع کر دئے جن کو شاید اپنی زندگی میں شائع کرنا پسند کرتے چند سکے یا سستی شہرت حاصل کرنے کے لئے یا اپنی شخصیت کی کوئی کمی پوری کرنے کے لئے یا احساس کمتری کو دور کرنے کیلئے ہم نے مرحوم کے ناموس پر حملہ کرنا گوارا کر لیا۔ آخر ہم اپنے جسم کے بعض حصوں کو دوسروں کی نظر کے سامنے نہیں لاتے تو ذہن کے بعض گوشوں کو چھپانے سے ہمیں کیوں محروم کر دیا جائے۔ بلاشبہ اگر ہماری راز داری کسی بڑے فتنہ کا باعث ہو رہی ہے تو مفاد عامہ کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو برملا ظاہر کیا جائے۔ لیکن شبلی کے چند خطوط کسی بڑے معاشرتی یا اخلاقی فتنہ کا سبب نہیں بن رہے تھے اگر وہ اخلاقی فتنہ بن سکتے تھے تو اپنی اشاعت کی وجہ سے ہی بن سکتے تھے۔ تو جو کام شبلی نے نہیں کیا وہ ہم نے کر ڈالا۔ پہلے وہ خطوط ایک ذات تک محدود تھے اب ہم نے ان کو عالم گیر بنا دیا۔ دانائی اور تدبر کا یہ کارنامہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ یقیناً ان کے خطوط شائع کئے جاتے لیکن وہ چند خطوط جو اخلاقی طور پر قابل اعتراض ہو سکتے ہیں ان کو شبلی کا ناموس سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا تو کوئی بہت بڑا خسارہ قوم کے حصے میں نہ آ جاتا یا کوئی بہت بڑا ادبی ضیاع نہ ہو جاتا۔ شبلی کے تقدس کو مجروح کر کے ہم نے کوئی کارنامہ سر انجام نہیں دیا یقیناً ایک مقدس شبلی ایک عاشق مزاج شبلی سے قوم کے لئے کہیں زیادہ مفید ہو سکتا ہے۔ خواہ انہوں نے تقدس کا لبادہ ہی اوڑھ لیا تھا لیکن ہمیں ان کے لبادے کو تار تار کر دینے کا حق نہیں تھا جب کہ انہوں نے اپنی ساری زندگی تقدس کے رنگ میں ہی گزارنے کی کوشش کی تھی اور جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ ہم پر ان کی تقدس کی زندگی ہی نظر انداز ہو رہی تھی ان کی پس پردہ رندی یا عاشق مزاجی قوم پر کسی قسم کا اثر نہیں ڈال رہی تھی اس لئے ہمیں ان کی اس دو رنگی کی شکایت کرنے کا بھی کوئی حق نہیں تھا۔ اب ایک ادبی نکتہ رہ جاتا ہے کہ ہم بغیر ان کے خطوط کے شبلی کے کلام کو صحیح طریقے سے نہیں سمجھ سکتے تھے، یہ خیال بھی ایک وہم اور غلط فہمی سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ کیونکہ کسی کے کلام کو سمجھنے کے لئے اور اس سے استفادہ کرنے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ لازمی طور پر یہ بھی معلوم کر لیں کہ اس نے الفاظ کے کیا معنی لئے ہیں یا کسی خاص جذبے کے تحت کوئی شعر موزوں کیا ہے۔ بلکہ عموماً ہم ان الفاظ سے جو معنی متبادر ہوتے ہوں اخذ کر لیتے ہیں۔ چنانچہ اگر کسی شعر سے بہت سے معنی پیدا ہوں تو ہم اس کو پہلو دار شعر کہتے ہیں اور ہر معنی سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور کسی معنی کو یہ کہہ کر رد نہیں کر دیتے کہ شاعر کا ان الفاظ سے یہ مطلب نہیں تھا۔ چنانچہ غالب کا کلام اس سلسلے میں اپنی خاص شہرت رکھتا ہے اور کوئی شخص اس بات کے پیچھے نہیں پڑتا کہ غالب کا اس شعر سے کیا مطلب تھا اور کس جذبے کے تحت یہ شعر کہا گیا بلکہ جتنے مطالب بھی ایک شعر سے

نکلتے ہوں ان سے لطف اٹھایا جاتا ہے خواہ وہ معانی غالب کے کبھی وہم و گمان میں بھی نہ آئے ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ شاعر کا خاص جذبہ یا خاص مطلب ایک ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی صرف اتنی اہمیت ہے کہ اگر معلوم ہو جائے تو یہ متعین ہو جاتا ہے کہ شاعر اپنے شعر کو خود کس طرح سمجھتا تھا اس بات کی اتنی اہمیت نہیں ہونی چاہئے کہ شاعر کی آبرو کو خاک میں ملا دیا جائے اور اس کی زندگی بھر کی کمائی غارت کر دی جائے۔ ہر چیز کی ایک حد ہونی چاہئے۔ بلاشبہ ہمیں اس کی کوشش کرنی چاہئے کہ ہم یہ کھوج لگائیں کہ شاعر خود ایک شعر کہتے وقت کس جذبے سے کس قدر متاثر تھا۔ لیکن جس طرح ہم اپنے جسم کے کچھ حصوں کو پردے میں رکھتے ہیں اور کسی کے سامنے ان کو کھولنا پسند نہیں کرتے اور یہ ہمارا تہذیبی حق تسلیم کیا جاتا ہے اسی طرح ذہن کے بعض گوشوں کے متعلق بھی یہ حق تسلیم کیا جانا چاہئے کہ اگر ہم ان کو دوسروں کی نگاہوں سے محفوظ رکھنا چاہیں تو ان کو محفوظ ہی رہنے دیا جائے خصوصاً ان لوگوں کے بارے میں جو ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے ہیں اور اپنا دفاع خود نہیں کر سکتے۔ چنانچہ اگر شبلی کے خطوط عطیہ بیگم کے نام اس قدر حاشیہ آرائی کے ساتھ شائع نہ کئے جاتے بلکہ ان کے شائع ہونے کے بعد اس قدر حاشیہ آرائی نہ کی جاتی کہ ان کی باقاعدہ "سیاحات معاشقہ" تصنیف کر دی گئی تو ان کے اشعار خصوصاً فارسی غزلیات کے سمجھنے یا ان سے لطف اندوز ہونے میں کسی قسم کی کمی واقع نہ ہوتی۔ الفاظ اور ان کے معنی موجود تھے۔ ان کی تاثیر میں بھی کوئی کمی واقع نہ ہوتی۔ وہ اشعار بہر حال رنگین، جذبات آفریں اور پُر تاثیر ہی کہے جاتے اور ہر شخص اپنے ظرف اور حوصلے کے مطابق ان کو معنی پہنا دیتا۔

مراسلہ نگاری کی ٹیکنیک میں دوسری اہم چیز سادگی اظہار ہے۔ بعض لوگوں نے صحیح طریقے سے اس امر کا دعویٰ کیا ہے کہ طرز ادا کی سادگی کا تعلق تہذیب کے ارتقاء سے بھی ہے۔ صرف خطوط کی عبارت میں ہی نہیں بلکہ دوسرے مطالب کے اظہار میں بھی تہذیب و تمدن کے ارتقاء کے ساتھ سادگی کا پیدا ہو جانا عام ہے۔ اگر ہم دنیا کی مختلف زبانوں کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو ہمیں یہ بات آسانی سے معلوم ہو جائے گی کہ ہر زبان کے ادب میں شروع میں اس قدر سادگی نہیں ہوتی جس قدر کہ تہذیب و تمدن کی ترقی کے بعد پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ہر ادیب کا بھی شروع میں یہی طریقہ ہوتا ہے کہ بڑے بڑے اور نامانوس قسم کے الفاظ استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ کچھ تو زبان پر قدرت نہ ہونے کی وجہ سے اور کچھ احساس کمتری کا شکار ہونے کی وجہ سے لیکن جب زبان پر پوری قدرت حاصل ہو جاتی ہے اور خود اعتمادی پیدا ہو جاتی ہے تو سادگی اظہار کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کو بھی نہایت سادہ الفاظ اور سلیس عبارت میں ادا کرتا چلا جاتا ہے۔ خطوط میں خصوصاً سادگی ادا کی اس لئے بھی ضرورت پڑتی ہے کہ لکھنے والا ایک بے تکلف فضا میں ایک دوست یا عزیز کو مخاطب کرتا ہے وہ بے تکلفی کا ماحول قدرتی طور پر اس بات کا متقاضی ہوتا ہے کہ وہ اظہار مطلب بھی بے تکلفانہ ہو۔ عالمانہ اظہار ایسی فضا کے لئے سازگار نہیں ہو سکتا۔ پھر خط کا ہر مخاطب تعلیم یافتہ اور نکتہ رس شخص نہیں ہو سکتا۔ ہر درجہ اور ہر قابلیت کے شخص کو خط لکھنے پڑتے ہیں اس لئے عام طور پر رواج یہی ہو جاتا ہے کہ اظہار میں سادگی پیدا کی جائے اور یوں بھی سادگی دل پر زیادہ اثر انداز ہوتی ہے اور خطوط میں دو دلوں میں براہ راست بلا کسی حجاب کے گفتگو ہوتی ہے اسی وجہ سے اثر انگیز بھی خطوط نویسی کا ایک اہم اور فطری جز تصور کی جاتی ہے۔ وہ خط خط نہیں جو حسب دلخواہ مخاطب کے دل پر اثر پیدا نہ کر سکے۔ یہ ظاہر بات ہے کہ ہم یہاں جن خطوط کا ذکر کر رہے ہیں۔ وہ عام کاروباری خطوط نہیں ہیں جن میں کسی قسم کے جذبات کے اظہار کا شائبہ بھی نہیں ہوتا۔ یہاں ہماری مراد انہیں خطوط سے جن میں کسی نہ کسی قسم کے جذبات کا اظہار کیا گیا ہو۔ خواہ وہ کاروباری خطوط ہی کیوں نہ ہوں۔ ہر قسم کا خط اگر اس میں کسی جذبے کے اظہار کا موقع آ گیا ہے تو ایسا خط ادب پاروں میں شمار ہو سکتا ہے۔ اس قسم کے خطوط ادب میں اپنی مستقل جگہ محفوظ کر لیتے ہیں اور اگر کسی خط میں کسی جذبے کی کارفرمائی نہیں اور نہ طرز ادا میں کوئی دلکشی پیدا ہو سکی ہے تو ہم اس خط کو ادبی خطوط میں شمار نہیں کریں گے۔ خواہ وہ کتنے ہی بڑے آدمی کے خطوط کیوں نہ ہوں ان کی افادیت تاریخ یا کاروبار کے لحاظ سے بہت کچھ ہو سکتی ہے

لیکن ادب میں ان کو کوئی مقام حاصل نہیں ہو سکتا۔ ایک ادبی خط لکھنے کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ کاتب ایک ادبی شخصیت ہی ہو ایک عام آدمی کا خط جذبات کی فراوانی۔ اظہار کی سادگی اور بے تکلفی کی وجہ سے ادبی خطوط میں شمار ہو سکتا ہے اور ایک ادیب کا روکھا اور کاروباری خط ادب کے دائرے سے خارج ہو سکتا ہے۔ ویسے عموماً ہوتا یہی ہے کہ عام آدمیوں کے بہترین خطوط بھی ضائع جاتے ہیں اور خواص کے بیکار خطوط بھی بڑی احتیاط اور طمطراق سے شائع کر دئے جاتے ہیں صرف خواص کی نسبت سے ان کے خطوط میں خصوصیت پیدا ہو جاتی ہے اور اب تو "خط" ہمارے ادب کی ایک مستقل صنف ہو گئی ہے، بلکہ بہت سے ناول اور افسانے بھی خط کی شکل میں لکھے اور شائع کئے گئے ہیں اور اپنی جگہ بڑے کامیاب ہیں اس لئے یہ بحث چھیڑنا فضول ہے کہ خط کو ادب میں شمار کیا جا سکتا ہے یا نہیں جیسا کہ بعض لوگ اکثر کیا کرتے ہیں۔ مندرجہ بالا شرائط کے ساتھ خط ہمارے ادب کی ایک اعلیٰ صنف ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ہمارے اردو خط نویسوں کے سامنے فارسی خطوط کے نمونے تھے۔ فارسی خطوط کی عبارت عام طور پر مسجع اور مقفیٰ ہوتی تھی طرز انتہائی پر تکلف۔ طویل القاب و آداب سے گرانبار ہوتے تھے، چنانچہ اکثر لوگوں نے اس سلسلے میں فارسی کا تتبع کیا۔ لیکن فارسی خطوط بھی جہاں ابوالفضل اور فیضی کے خطوط عالمانہ شان و شوکت کا نمونہ طرز اظہار اور مبالغہ آمیز عبارت کے لئے بدنام ہیں وہاں عالمگیر اورنگ زیب اور حضرت شیخ احمد سرہندی یعنی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کے خطوط سادگی اور بے تکلفی کی طرف جھکا کرتے ہیں۔ شاید اردو کے پہلے سادہ نویس مرزا غالب پر یہاں مذکورہ حضرات کی طرز نگارش کا اثر پڑا ہو گا۔ خصوصاً حضرت مجدد اپنے خطوط میں بڑی سادگی کا اظہار فرماتے ہیں۔ اکثر القاب و آداب بھی نہایت مختصر اور سادہ استعمال کئے ہیں۔ جس طرح غالب نے اپنے اردو خطوط میں اہتمام کیا ہے اسی طرح مجدد صاحب بھی اکثر القاب میں وہ ایک لفظ ہی لکھ کر براہ راست اصل مطلب پر آ جاتے ہیں اور بڑی سادہ اور دلنشین عبارت میں اپنا مطلب ادا کرتے چلے جاتے ہیں اور خط کی خوبی یہی قرار پاتی ہے کہ اس پر کسی قسم کے تکلفات کی گراں باری نہ ہو بلکہ خط لکھنے والا اپنی خوبیاں اور برائیاں بھی بلا تکلف بیان کر دے اس کے ذہن کے کسی گوشے میں بھی یہ خیال نہ ہو کہ اس کا راز فاش ہو جائے گا۔ اسی وجہ سے لوگ عموماً اپنے خطوط میں اپنی ہر قسم کی خواہشات اور آرزوؤں کا بھی اظہار کر جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ خطوط میں بے تکلفی اور سادگی کا ایک سبب یہ بھی ہوتا ہے کہ خط پہلے سے تیار ہو کر نہیں لکھے جاتے نہ ان کا پہلے کوئی مسودہ تیار کیا جاتا ہے نہ ان کی اصلاح کی جاتی ہے بلکہ ہر شخص خط کو قلم برداشتہ ہی لکھتا ہے۔ اسی وجہ سے کسی شخص کی سوانح حیات لکھنے کے معاملے میں خطوط کو معتبر ترین ذریعہ تسلیم کیا گیا ہے۔ کیونکہ خط کے ذریعے سے ہی آپ کے دل کے تاریک ترین اور دلکش ترین گوشوں میں جھانک کر دیکھ سکتے ہیں اور اس کی مجموعی شخصیت کا صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں۔ خطوط اس وجہ سے بھی اپنے زمانے کی تاریخی دستاویز ثابت ہو سکتے ہیں کہ ...... ان میں اہم قسم کے تاریخی واقعات کی طرف اہم اشارات مل جاتے ہیں۔ خصوصاً خط لکھنے والا اور خط کا مخاطب اگر تاریخی لحاظ سے اہم شخصیت کے مالک ہوں اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خط کو دانستہ طور پر ایک تاریخی دستاویز بنایا جاتا ہے بلکہ قدرتی طور پر اس قسم کے تاریخی اشارات خود بخود ان میں آ جاتے ہیں جن سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے اگر دانستہ اور شعوری طور پر ان میں تاریخی واقعات کو لکھا جاتا تو وہ تاریخ ہو گی خطوط نہیں ہوں گے۔ تاریخ کے علاوہ کسی علمی موضوع کا شعوری طور پر ان خطوط میں شامل کر دینا بھی انہیں مراسلت کے درجے سے گرا دیتا ہے اور وہ ایک علمی مقالے کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں چنانچہ اسی وجہ سے مولانا آزاد کے غبار خاطر والے خطوط کو بعض لوگ خطوط کا درجہ دینے کے لئے تیار نہیں ہیں کیونکہ ان میں بہت گراں بار اور تند قسم کے مباحث کو شعوری طور پر چھیڑا گیا ہے اور اکثر یہ احساس ہوتا ہے کہ باوجود مولانا اور اجمل خاں صاحب کے دوستی کے مولانا کو یہ احساس ضرور تھا کہ ان کے یہ خطوط

کسی روز ضرور شائع کئے جائیں گے اس کے علاوہ جا بجا تکلف اور آمد بھی پائی جاتی ہے اسی ذیل میں مہدی افادی کے کچھ خطوط غالب کے بعض مکاتیب اور نیاز فتحپوری کے بہت سے خطوط آجاتے ہیں۔ البتہ شبلی نعمانی اور مولوی عبدالحق کے خطوط اس عیب سے بری معلوم ہوتے ہیں۔

جلیل قدوائی "مکتوبِ عبدالحق" کے مقدمے میں اس بارے میں لکھتے ہیں "غالب کو اردو خطوط نویسی خصوصاً "مراسلہ کو مکالمہ" بنا دینے والی خطوط نویسی کا باوا آدم سمجھا جاتا ہے جس پر اس فن کا کمال ختم بھی ہوگیا مگر اہل نظر اس امر سے انکار بھی نہیں کرسکتے کہ ان کے بعض خطوط کی برجستگی میں بھی اہتمام اور آورد کا دخل پایا جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ غالب نے خطوط نویسی کو ایک فن کی حیثیت سے اختیار کیا تھا وہ اپنے احباب کو خاص اہتمام سے خط لکھتے تھے اور اپنی نئی طرز کی ان سے داد بھی طلب کرتے تھے، انہیں خط لکھتے وقت اس بات کا احساس رہتا تھا کہ وہ شائع کئے جائیں گے بلکہ انہوں نے خود احباب سے کہ ان کو جمع کیا تھا۔ ممکن ہے ان پر نظر ثانی بھی کی ہو اور بعد کے خطوط نویسوں مثلاً ابوالکلام آزاد اور نیاز فتحپوری کے ہاں تو اس کی توقع ہی فضول ہے اس لئے کہ یہ دونوں بزرگ اہتمام اور آورد کے امام ہیں (نیاز نسبتاً زیادہ) ان کے خطوط نہ مراسلے نہ مکالمے۔ جن حضرت کے نام خطوط ہیں وہ یا تو معدوم ہیں (نیاز کے یہاں) یا مشکوک۔ خطوط کیا ہیں مختلف موضوعات پر مستقل مقالات یا تصانیف ہیں جو شاید اپنے مخاطب کو مرعوب کرنے کے لئے لکھے گئے ہیں"

جلیل قدوائی صاحب کا تبصرہ بڑی حد تک صحیح معلوم ہوتا ہے، غالب کے خطوط اردو نثر میں اور تاریخ خطوط نویسی میں اولیت کا درجہ رکھتے ہیں۔ سادگی، بے تکلفی ان کا جوہر ہے لیکن یہ دعویٰ کرنا مشکل ہے کہ انہیں اس بات کا احساس نہیں تھا کہ ان کے خطوط شائع کئے جائیں گے لیکن اس سے ان کی فنکاری کی عظمت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی، یہ حقیقت ہے کہ ان کا ایجاد کردہ طرز انہیں پر ختم بھی ہوگیا اور آج تک کوئی ان کا تتبع بھی صحیح طریقے سے نہیں کرسکا۔ کسی نے یہ صحیح کہا ہے کہ طرز تحریر ہر شخص کی اپنی مخصوص شخصیت کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے غالب کی شخصیت پہلودار تھی۔ اس لئے غالب اپنے طرز کو اپنے ساتھ ہی لے گئے۔ ان کی ظرافت، ان کی دلسوزی، خلوص، شاعرانہ عظمت، تفکر، طبیعت کی موزونی، دوستانہ طبیعت، سارے جہاں کا درد جگر میں سمیٹ لینے کی عادت، زبان پر قدرت، پھر زبان دانی کے معاملے میں زبردست ریاض، یہ تمام باتیں کسی ایک شخص میں بیک وقت جمع ہو جانا محال سا ہوگیا ہے جس طرح شاعری میں غالب تمام شعراء پر چھا گئے ہیں۔ اسی طرح خطوط نویسی میں بھی آج تک کوئی ان کا مدمقابل پیدا نہیں ہوسکا۔ بقول سید عبداللہ کے "غالب نے اپنی ہمہ گیر شخصیت کا اثر جڑ پکڑ ڈالا۔ اردو میں خط لکھ کر ہمیں نثر کا ایک ایسا نمونہ دیا جو اب تک مفقود ہے۔ نثر میں غالب کا سرمایہ وہ خطوط ہیں جو انہوں نے اپنے دوستوں کو لکھے اور یہ مرزا کے قلم کا اعجاز ہے کہ اس قلیل سرمائے کے باوجود وہ اردو ادب میں ایک ایسا مقام حاصل کرگئے جو کسی دوسرے انشا کو نہیں مل سکتا"

دراصل مرزا کے خطوط میں زندگی کا ایک خاص نقطۂ نظر ہے جو ان کی عبارت اور خیالات میں جان ڈال دیتا ہے۔ مرزا زندگی سے لمبا لمبا فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ انہوں نے زندگی کے بہت سے رنگ دیکھے تھے لیکن ان کی بلا آشام طبیعت ان کو چند جرعے ہی سمجھتی رہی وہ سیر نہیں ہوسکے اور تشنگی کا احساس ہی ان کی زندگی اور زندہ دلی کا سبب بن گیا۔ ان کا مشہور شعر دراصل ان کے دل کی بات کی ترجمانی کرتا ہے ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

وہ ایک سچے سپاہی اور سپاہی زادے کی طرح زندگی کی مشکلات کا مقابلہ بھی کرتے رہے اور بقدرِ ہمت و طاقت اس کا رس بھی نچوڑتے

رہے انسان کی کوشش یہی رہی کہ ایک ایک قطرہ نچوڑ لیا جاتی حتیٰ کہ صدیقہ جام بھی ۔ بقول ان کے ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے ع رہنے دو ابھی ساغر و مینا میرے آگے

مرزا کی اس بے پناہ حوصلہ مندی اور زندگی کی چاہت نے انہیں یہ ہمت عطا کی کہ انہوں نے چوٹوں کو صرف برداشت ہی نہیں کیا بلکہ ان پر مسکرانا بھی سیکھ لیا ۔ اسی قوت برداشت کی بنا پر وہ اپنے اوپر بھی ہنستے رہے ۔ اپنے اوپر ہنسنے کے لئے مصائب کے ہجوم میں مسکرانے کے لئے بڑا حوصلہ چاہئے اور یہ حوصلہ مرزا کو حاصل تھا ۔ ع

زمانہ سخت کم آزار ہے بجان اسد
اگرچہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں

ایسے حوصلہ مند آدمی کی تحریر میں زندگی ، شگفتگی اور بے تکلفی نہ ہوگی تو پھر کس کی تحریر میں ہوگی ۔

غالب ایک رئیس زادے تھے ، ان کی خاندانی زندگی کی روایت محفل آرائی تھی ۔ اس زمانے کے رؤسا خلوت میں انجمن آرائی کو ریاست کا لازمہ قرار دیتے تھے ، اور کوشش اس بات کی ہوتی تھی کہ محل کے اندر ہی تمام قسم کی دلچسپیاں مہیا ہو جائیں ۔ ہر قسم کے آدمی کی صحبت وہیں میسر آ جاتے اور اس کا بڑا اہتمام کیا جاتا تھا اور لوگوں کی قدردانی پر دولت پانی کی طرح بہائی جاتی تھی ۔ غالب بھی زندگی بھر محفل آرائی کی کوشش کرتے رہے لیکن اپنے معیار اور پسند کے مطابق انجمن آرائی نہ کر سکے اس جذبے کی ناآسودگی بھی انہیں زندگی بھر ستاتی رہی شروع میں کسی نہ کسی طرح اس کا اہتمام کیا اور دوستوں کے سہارے کچھ انجمن آرائی کا لطف اٹھایا اور ہر قسم کی صحبت میں بیٹھے رہے لیکن بڑھاپے میں یہ چیز میسر نہ رہی ۔ کچھ مفلسی کی وجہ سے اور کچھ کمزوری کی وجہ سے تو ذہنی مجلس آرائی پر اکتفا کرنا پڑا اور فرمایا ع

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال — ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

صرف محشر خیال ہونے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کی جدت پسند اور رنگین طبیعت نے محفل آرائی کے لئے ایک دوسری راہ بھی نکال لی اور وہ راہ مراسلہ نگاری کی راہ ہے ۔ آپ ہر خط میں محفل آرائی کا رنگ دیکھیں گے ۔ قہقہے ، ہنسی ، چہلیں ، ہنسنا ، گنگنانا ، اشارے کنائے ، صلح جنگ ، پھبتی ، محبت اور دلسوزی کا اظہار ، دوستانہ وضعداریوں کا اظہار ، تواضع انکسار ، غرضیکہ ہر چیز جس کا ظہور دوستوں اور آشناؤں کی محفل میں ہو سکتا ہے وہ غالب کے خطوط میں موجود ہے ۔

خطوط کے معاملے میں غالب کی ایک بڑی خدمت یہ بھی شمار کی جاتی ہے کہ انہوں نے طویل قسم کے القاب و آداب کو ختم کر دیا وہ نہایت بے تکلفی سے خط کو شروع کر دیتے ہیں ۔ ورنہ ان سے پہلے کئی کئی سطروں میں صرف القاب چلا کرتے تھے ، پھر کہیں جا کر اصل مدعا شروع ہوتا تھا ۔ وہ بھی تشبیہ ، استعارہ ، رعایت لفظی ، بے جا تکلف اور مبالغہ میں ۔ مرزا نے ان تمام تکلفات کو بیک جنبش قلم ختم کر دیا وہ صرف "پیر و مرشد" "بندہ نواز" میرے پیارے میر مہدی وغیرہ کے القاب سے خط کو شروع کر کے براہ راست اظہار مدعا پر آ جاتے ہیں

ایک اور بڑی اہم چیز جو مرزا کے خطوط میں نظر آتی ہے وہ یہ کہ وہ ہمیشہ مخاطب کی عمر ، اس کی نفسیات اور پسند و ناپسند کا خیال رکھتے ہیں ۔ وہ انتہائی کوشش کرتے ہیں کہ اپنے مخاطب کو کسی نہ کسی طرح خوش کریں ۔ خود خواہ غم کے دریا میں ڈوبے ہوئے ہوں لیکن کوشش یہی ہوگی کہ اپنی پریشانی کا اثر مخاطب پر نہ پڑے چنانچہ اگر یہ مجبوری اظہار غم کرنا بھی پڑ جائے تو ہزار جتن کرتے ہیں کہ مخاطب پہ اس کا کم سے کم اثر پڑے ۔ غم کی داستان کے ساتھ کوئی چٹکلہ کوئی لطیفہ شروع کر دیتے ہیں ۔ خود اپنے اوپر ہنسنے لگتے ہیں ۔ اپنا مذاق اڑانا شروع کر دیتے ہیں تاکہ غم کا بوجھ کم ہو جائے یہ دلسوزی کہاں پائی جاتی ہے ۔ حقیقتاً نہیں تو انتہائی کم یاب ضرور ہے بچوں سے بچوں کی طرح ، جوانوں سے جوانوں کی طرح اور بڈھوں سے بڈھوں کی طرح باتیں کرتے ہیں اور یہ باتیں واقعی باتیں ہی ہوتی ہیں ۔ حالانکہ مرزا نے

ہیں یہ اصول تسلیم کیا گیا ہے کہ تحریر کی زبان اور ہوتی ہے اور آپس میں گفتگو کی زبان اور۔ لیکن واقعی غالب نے مراسلے کو مکالمہ بنا کر دکھا دیا۔ تحریر میں گھریلو بات چیت کا لطف پیدا کر دیا ایک اور بڑی پر لطف اور اہم چیز جس میں مرزا منفرد ہیں وہ ان کی خطوط میں مکالمہ نویسی ہے۔ نہ ان سے پہلے نہ بعد میں کسی نے خطوط میں مکالمے لکھے۔ یہ مکالمے انتہائی بے ساختہ اور دلچسپ ہیں — ظرافت کی چاشنی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ غالب کا وہ خط جو انہوں نے میر مہدی کو ایک مکالمے کی صورت میں لکھا ہے بہت مشہور ہے۔ کبھی کبھی مکتوب الیہ کو غائب فرض کر لیتے ہیں ان کے خطوط ذاتی واقعات سے پر ہیں۔ اگر کوئی چاہے ان سے ان کی پوری سوانح عمری مرتب کر سکتا ہے اور وہ حالات بھی لکھ گئے ہیں جو غالبؔ دوسرا اپنے بارے میں کبھی نہ لکھتا۔ خطوط ان کی زندگی کا آئینہ ہیں اور اس چیز کو خطوط نگاری میں خلوص کہا گیا ہے اس قسم کا خلوص بھی دوسری جگہ نہیں ملتا ہے اردو خطوط نگاری میں غالب، شبلی، مولانا آزاد، مہدی افادی نیاز فتحپوری زیادہ مشہور ہیں۔ علامہ اقبال اور مولوی عبدالحق صاحب کے خطوط بھی شائع ہوئے ہیں اور یہ دونوں حضرات بھی اس لحاظ سے بہت بڑی حیثیت کے مالک ہیں۔ سید سلیمان ندوی کے خطوط بھی اہتمام سے شائع ہوئے ہیں۔ مولانا مودودی کے خطوط کا مجموعہ بھی "مکاتیب زنداں" کے نام سے شائع ہو چکا ہے اور بہت سے لوگوں کے خطوط بھی شائع ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں لیکن میرے خیال میں خطوط نویسی کے بارے میں جو لوگ صاحب طرز کہے جا سکتے ہیں وہ غالب، شبلی، آزاد اور مہدی افادی ہیں۔ ان میں سے ہر شخص کی کوئی نہ کوئی ایسی خصوصیت ہے جو دوسرے میں نہیں ملتی یا نہ ملنے کے برابر ہے۔ مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد نے خطوط میں ایک نئی راہ نکالی ہے یہ سمجھتے ہوئے کہ شاید ان کے مخاطب کو کبھی خط نہ پہونچ سکیں گے، انہوں نے خط لکھے ہیں۔ تمام خطوط میں عالمانہ شان پائی جاتی ہے بڑے بلند پایہ علمی مباحث کو خطوط میں چھیڑا ہے اور ان پر فاضلانہ بحث کی ہے طرز ادا بھی ایک قسم کا اختیار کیا ہے، حضرت مولانا کی زندگی مختلف اور متضاد حیثیتوں میں بٹی ہوئی ہے وہ ایک ہی وقت میں مصنف بھی ہیں، مقرر بھی ہیں۔ مفکر بھی ہیں، ادیب بھی ہیں اور دینی علوم میں تبحر کے ساتھ عقلیات اور فلسفے کا ذوق بہت کم جمع ہوتا ہے۔ مولانا آزاد نے اپنی اسی جامعیت کا پورا پورا اظہار اپنے خطوط میں کر دیا ہے انہوں نے فلسفے کے مسائل بھی چھیڑے ہیں، ادب پر بھی روشنی ڈالی ہے، دینی مسائل کو بھی سامنے لانے کی کوشش کی ہے — شعر و شاعری کا بھی ذکر کیا ہے، تاریخی واقعات بھی بیان کئے ہیں، سیاسی حالات کا بھی سرسری ذکر کر دیا ہے، نغمہ و موسیقی پر بھی دلچسپ بحث کر ڈالی ہے۔ غرضکہ ان کے خطوط نیرنگیٔ موضوعات کی وجہ سے قوس قزح کی سی کیفیت پیش کرتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ ہر موضوع کے لحاظ سے طرز ادا اور عبارت آرائی کا رنگ بھی بدل جاتا ہے۔ شعر و شاعری اور موسیقی کے بیان میں کچھ اور رنگ ہے۔ چڑیا کی کہانی کا کچھ اور۔ تاریخ اور دینی مسائل کا کچھ اور۔

لیکن مولانا کی باقاعدہ موضوع پر لکھنے کی عادت نے ان کے خطوط میں مقالاتی کیفیت پیدا کر دی ہے وہ خطوط برائے نام رہ گئے ہیں۔ انہیں خطوط نما مقالات کہا جائے تو زیادہ موزوں ہوگا۔ چنانچہ بعض لوگ ان کے خطوط کو مقالات ہی کہتے ہیں خطوط کی سی بے تکلفی سادگی اور احساس رازداری مولانا کے یہاں بالکل مفقود ہے بالکل یہی کیفیت نیاز کے خطوط کی بھی ہے لیکن غالب، مہدی اور مولانا شبلی کے خطوط میں یہ تینوں خوبیاں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں۔ خط نویسی کے دوران میں اگر یہ خیال آ جائے کہ کیا لکھنا ہے اور کیا نہیں لکھنا تو خلوص، بے تکلفی اور سادگی کی فضا باقی نہیں رہتی۔ اظہار میں یگانگت نہیں رہتی اور بقول سید عبد اللہ کے "رنگ آشنائی" معدوم ہو جاتا ہے، مولانا آزاد خود ایک خط میں لکھتے ہیں "میری دکان سخن میں ایک طرح کی جنس نہیں رہتی لیکن آپ کے لئے کچھ نکالتا ہوں تو احتیاط کی چھلنی میں اچھی طرح چھان لیا کرتا ہوں کہ کسی طرح کی سیاسی ملاوٹ باقی نہ رہے۔"

مولانا آزاد کے خطوط کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ عبارت میں اشعار جگہ جگہ استعمال کرتے ہیں خطوط کی بے تکلف فضا

اس قدر اشعار کی گرانباری کو برداشت نہیں کر پاتی اور اکثر آورد کی شان پیدا ہو جاتی ہے اور آورد کا رنگ خط کے لئے بالکل مناسب نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اشعار سب برجستہ اور برمحل استعمال کئے گئے ہیں اور بجائے خود بڑے اعلیٰ معیار کے اشعار ہیں۔ عبارت میں نگینوں کی طرح جڑے ہوئے ہیں اور عبارت میں رنگینی و لطف دوبالا کر دیتے ہیں لیکن یہ طرز ایک ادبی مضمون کے لئے زیادہ موزوں اور خطوط کے لئے کم مناسب ہے۔ اس طرز پر اجمل خاں صاحب نے جس طرح تبصرہ کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے نثر میں شاعری کا رنگ بھرنے کی کوشش کی ہے گویا خطوط کی عبارت نثر کم ہے شاعری زیادہ ہے۔ "مولانا کی اپنی عبارت کے لحاظ سے بھی اور اشعار کی کثرت کے لحاظ سے بھی لکھتے ہیں اور انہوں نے نثر میں شاعری کی ہے اور جس مطلب کو ادا کیا ہے اس طرح کیا ہے کہ جدت فکر نقش آرائی کر رہی ہے اور وسعت تخیل رنگ و روغن بھر رہی ہے۔ اجتہادِ فکر ہر گوشے میں وہ طرزِ عام سے اپنی روش الگ رکھیں گے۔ انہوں نے جس وقت سے قلم ہاتھ میں سنبھالا ہے ہمیشہ حسین سدا صاحبِ اسلوب رہے ہیں بغیر کسی اہتمام اور کاوش کے قلم برداشتہ لکھتے گئے ہیں لیکن تسلسل بیان ہے جو بے ساختگی میں ابھری چلی آتی ہے اور کاوشِ فکر ہے جو آمد میں بھی آورد سے زیادہ بنتی اور سنورتی رہتی ہے۔ ظرافت ہے تو وہ اپنی بے داغ لطافت رکھتی ہے واقعہ نگاری ہے تو اس کی نقش آرائی کا جواب نہیں۔ فکر کا پیمانہ ہر جگہ بلند اور نظر کا معیار ہر جگہ ارجمند ہے:" اجمل خاں صاحب کی مندرجہ بالا عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف نے بھی تبصرے میں شاعری ہی کی ہے اور غبار خاطر کے رنگ کو اپنانے کی کوشش فرمائی ہے ورنہ غبار خاطر میں ظرافت کی بے داغ لطافت کے اظہار کا صرف ایک آدھ مقام پر موقع آگیا ہے وہ بھی سرسری ہے۔ چڑیا چڑے کی کہانی میں چند فقرے ناگہاں نکل گئے ہیں یا پنڈت نہرو وغیرہ کا جیل میں ذکر کرتے ہوئے کچھ فقرے چست ہو گئے ہیں۔ میرے خیال میں ان کی اہمیت اتنی نہیں کہ مولانا آزاد کی تحریروں میں ظرافت کا مستقل رنگ تلاش کیا جائے۔ ظرافت مولانا کے مزاج سے بالکل مناسبت نہیں رکھتی۔

مولانا شبلی کے خطوط کو بھی ان دنوں میں بہت شہرت حاصل ہوئی ہے اور یہ شہرت خصوصاً ان خطوط کی وجہ سے حاصل ہوئی ہے جو انہوں نے عطیہ فیضی کو لکھے تھے۔ مولانا کے خطوط ٹکنیک کے لحاظ سے غالب کے بعد بہترین خطوط شمار کئے جا سکتے ہیں۔ کیونکہ ان میں اکثر دل کی بات بلا کسی ذہنی تحفظات کے کہہ دی گئی ہے۔ جو بات دل میں ہوتی ہے مولانا بلا کم و کاست اس کو نوکِ قلم پر لے آتے ہیں اور یہی خلوص و صداقت خطوط کی ٹکنیک کی جان ہے۔ یہ صداقت مرزا غالب کے یہاں بھی موجود ہے اور مہدی الافادی کے خطوط میں بھی۔ مولانا آزاد اور نیاز فتح پوری کے خطوط اس سے محروم ہیں۔ مولانا، عطیہ بیگم کو خطوط لکھتے وقت ایسی باتیں بھی لکھ گئے ہیں جن کو آسانی سے ان کے زہد و ورع کے خلاف استعمال کیا جا سکتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اپنے مخاطب کی خاندانی شرافت اور وجاہت کی وجہ سے یہ پورا اعتماد تھا کہ ان کے خطوط کو کبھی شائع نہیں کیا جائے گا اور اس لحاظ سے ان کے خطوط تمام مشہور خطوط نویسوں سے اہمیت میں بڑھ گئے ہیں۔ کیونکہ غالب اور مہدی حسن کو بھی کچھ عرصے کے بعد یہ احساس ہو گیا تھا کہ ان کے خطوط کی قدر کی جا رہی ہے اور غالباً امکان ہے کہ ان کے خطوط کو شائع کر دیا جائے لیکن مولانا کو یقین تھا کہ کم از کم عطیہ بیگم والے خطوط ہرگز شائع نہیں ہوں گے۔ ان خطوط میں مولانا ایسی باتیں بھی لکھ گئے جن کو کہ لوگوں نے خوب ہوا دی اور اپنی ادبی شہرت کا زینہ بنا لیا۔ چنانچہ چند حضرات نے ان خطوط کو طرح طرح سے استعمال کیا۔ کسی نے ان خطوط کی روشنی میں حقیقیہ افسانہ تصنیف کیا۔ کسی نے مولانا کی فارسی غزلوں کا ترجمہ ان خطوط کے ذریعے سے کیا اور خطوط اور غزلیات میں تاریخی تطابق پیدا کرنے کی کوشش کی تاکہ یہ ثابت کیا جا سکے کہ مولانا کے خطوط ہی عطیہ بیگم کے لئے نہیں بلکہ غزلیات بھی عطیہ بیگم کے لئے ہی لکھی گئی تھیں۔ مگر میں جیسا کہ اس مضمون میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں۔ ان حضرات سے اختلاف کرتا ہوں۔ میرا خیال یہ ہے کہ نہ تو یہ خطوط عشقیہ خطوط تھے اور نہ مولانا کی فارسی غزلیات کسی ذات کو سامنے رکھ کر کہی گئی تھیں۔ دراصل اس بارے میں بہت زیادہ مبالغے سے کام لیا گیا ہے۔ مولانا فطرتی طور پر شگفتہ مزاج اور نفاست پسند قسم کے

آدمی تھے۔ انہیں صرف فارسی ادب سے ہی نہیں بلکہ ایرانی تہذیب و تمدن سے بھی بڑا لگاؤ تھا۔ ایران کے زمانے میں ہندوستانی معاشرت پہ ایرانی تمدن کی چھاپ کافی گہری تھی خطوط تک اکثر فارسی میں لکھے جاتے تھے۔ سینکڑوں سال کا اثر ایک ساتھ تو زائل ہو نہیں سکتا تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ وہ اثر آج تک بڑی حد تک باقی ہے۔ ایرانی مزاج میں مبالغہ آرائی ایک جزو لاینفک ہے اس کے علاوہ ان کے یہاں عام دوستوں اور شناساؤں سے تخاطب اسی طرح کیا جاتا ہے جس طرح ہم کسی محبوب کو مخاطب کرتے ہیں۔ مثلاً ہمارے یہاں میری جان ایک مبتذل قسم کا تخاطب ہے اور ہم عام طور پہ استعمال نہیں کرتے۔ ہاں کبھی بے تکلف دوستوں میں شاید کبھی استعمال ہو جائے لیکن چھوٹوں کو خصوصاً جوان لڑکیوں کو ہم ان الفاظ سے کبھی مخاطب نہیں کریں گے۔ لیکن ایران میں یہ تخاطب بالکل عام ہے اور چھوٹے بڑے مرد اور عورت میں کوئی امتیاز نہیں۔ اسی طرح دوسرے عاشقانہ الفاظ ایرانی ادب اور ایرانی گفتگو میں عام طور پہ بلاتکلف استعمال کئے جاتے ہیں اصل یہ بات صرف چند الفاظ تک محدود نہیں بلکہ کلام کے عام لہجے اور عام تعلقات میں بھی یہ رنگ پایا جاتا ہے۔ مولانا شبلی نے اپنے خطوط اور اپنی غزلیات میں اسی رنگ کو اختیار کیا ہے۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ عطیہ بیگم کے گھرانے میں زندگی ایرانی تہذیب کی سطح پہ ہی گذاری جاتی تھی۔ اس لئے مولانا شبلی نے وہی طرزِ تخاطب اختیار کیا اور عام تعلقات میں بھی اسی رنگ کو غالب رکھا اور ایرانی تہذیب اس کے طرزِ تخاطب، ایرانی ادب کے لہجے وغیرہ سے مولانا کے متعلق افسانہ طرازی کرنے والے مجھ سے کہیں زیادہ جانتے ہیں۔ لیکن حسنِ ظن سے کام لوں تو یہی کہہ سکتا ہوں ان لوگوں نے ایک شاعرانہ تعلق خاطر کو خالص ہوس انگیز رومان بنا دیا۔

اب چند باتیں مہدی حسن افادی کے خطوط کے متعلق عرض کر کے میں اس مضمون کو ختم کر دینا چاہتا ہوں۔ مہدی حسن مرحوم اپنی طرزِ نگارش میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں وہ طبعاً بڑے نازک مزاج، نفاست پسند، رنگین طبع اور دوست نواز قسم کے آدمی تھے، وہ عادتاً دوم درجے کی چیز پسند نہیں کرتے تھے، ان کا مذاقِ سلیم ان کو ہر چیز اعلیٰ درجے کی منتخب کرنے پر مجبور کرتا تھا چنانچہ ان کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لباس اور غذا کے معاملے میں بھی معیار ہمیشہ بلند رکھتے تھے۔ کتابوں کے معاملے میں بھی ان کی پسند اونچی تھی۔ ہمیشہ کوشش کرتے کہ اعلیٰ قسم کی طباعت والا ایڈیشن خریدیں۔ یہی بلند معیار انہوں نے اپنی تحریروں میں بھی برقرار رکھا ہے اور اس نفاستِ طبع کا سب سے زیادہ اظہار ان کے خطوط میں ہوتا ہے۔ افاداتِ مہدی کی عبارت میں بھی الفاظ کا انتخاب اس قدر اعلیٰ اور بر محل نہیں ہے جتنا کہ ان کے خطوط میں نظر آتا ہے۔ ان کے خطوط تکنیک کی تقریباً تمام شرائط کو پورا کرتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ وہ خطوط بہت سوچ سمجھ کر بڑی احتیاط اور بڑے اہتمام سے لکھتے تھے۔ لیکن یہ اس وجہ سے نہیں تھا کہ وہ ان خطوط کو شائع کرانا چاہتے تھے بلکہ عادتاً وہ محتاط تھے اور چاہتے تھے کہ اور چیزوں کی طرح ان کے خطوط بھی اول درجے کے ہوں۔ وہ خط لکھنے میں بڑی کاوش سے کام لیتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ اس اہتمام اور کاوش کی وجہ سے ان کے خطوط میں اکثر آورد اور تصنع کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن کمال یہ ہے کہ باوجود تصنع کے احساس کے قاری کی دلچسپی میں کمی نہیں ہوتی۔ ان کی طرزِ نگارش اور اسلوبِ تحریر قاری کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں اور اس وجہ سے ان کے خطوط میں "رنگِ آشنائی" کی نمود موجود رہتی ہے۔ کسی جگہ بیگانگی کا احساس نہیں ہوتا۔

مہدی حسن مرحوم بڑے رنگین طبع آدمی تھے۔ ان کی طبیعت کی رنگینی جا بجا ان کے خطوط میں جھلکتی ہے۔ صنفِ نازک سے انہیں خاص شغف تھا۔ اپنے خطوط میں طرح طرح سے ان کا ذکر کرتے ہیں اور بڑے والہانہ انداز میں کرتے ہیں جس طرح ریاض خیرآبادی اپنے اشعار میں شراب کا ذکر چسک چسک کر کرتے ہیں اور ایک گونہ بے خودی ان پہ طاری ہو جاتی ہے یہی حال مہدی حسن کا جنسِ لطیف کے بارے میں ہے کبھی کبھی وہ اس جنس کا ذکر محض مزاح پیدا کرنے کے لئے بھی کر جاتے ہیں لیکن یہ بات مسلم ہے کہ مرحوم آزادہ مزاج با عیاش طبع انسان نہیں تھے۔ ان کے خطوط کے مخاطب اکثر ان کے ہم عصر اہلِ قلم تھے جن میں سید سلیمان ندوی، مولانا آزاد، مولانا حبیب الرحمٰن

خاں شیروانی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا شبلی نعمانی وغیرہ سر فہرست ہیں۔

یہ سب لوگ باوجود اپنی ثقاہت اور وجاہت کے مہدی حسن کی شوخ طبعی کو خنداں پیشانی سے برداشت کرتے تھے وہ ان لوگوں کے متعلق بعض اوقات ناگفتنی کہہ جاتے تھے جس کی کوئی دوسرا شخص جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ مثلاً سید سلیمان ندوی نے دوسری شادی کی تو بیمار تھے، مہدی حسن کو شرارت سوجھی تو مبارک باد کے خط میں ایسی بات لکھ دی جو کوئی دوسرا شخص لکھنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ لکھتے ہیں: "جس کو دوستوں کی اصطلاح میں بستر شکن ہونا تھا وہ اپنی ——— کمزوری کی وجہ سے شکر بستر نکلا" اشاروں کنایوں کے پردے میں ناگفتنی کہہ جانا اس میں مزاح پیدا کر دینا اور ناگوار نہ ہونے دینا یہ مہدی حسن کا ہی کمال تھا کسی دوسرے کو یہ خوبی میسر نہ آتی۔ ایک دوسرے خط میں انہیں ثقہ بزرگوں میں سے ایک کو اس سے زیادہ عریاں فقرہ لکھ گئے ہیں۔ "عورت لذت آشنا ہو کر معاً لشہ ہو جاتی ہے" ان کی رنگین طبعی کا اثر ان کے خطوط کے معانی اور خیالات پر ہی نہیں پڑا بلکہ ان کا تخیل اور اسلوب عبارت بھی اس سے بہت متاثر ہوتے ہیں۔ ان کے خطوط کی عبارت اپنی رنگینی دل آویزی، روانی اور ترنم آفرینی میں غزل کی زبان معلوم ہوتے ہیں۔ مرحوم کو مطالعہ کا بہت شوق تھا۔ اگرچہ تحصیلدار تھے لیکن لکھنے پڑھنے کے لئے ہمیشہ وقت نکال لیا کرتے تھے۔ مطالعہ بہت وسیع تھا، اور کتب بینی اُن کا سب سے زیادہ دلچسپ مشغلہ تھا۔ مضمون نگاری سے انہیں بڑا شغف تھا اپنے دوستوں کو وہ مضامین اور کتابیں لکھنے پر ابھارتے اور شوق دلاتے، یہاں تک کہ "سوشلزم" کا انتخاب کر کے بھیجتا اچھے مضامین کی داد دیتے مہدی افادی کو فلسفہ سے بھی خاص لگاؤ تھا اپنے خطوط میں وہ فلسفیانہ مضامین چھیڑ کر، تفکر اور تعمق کی فضا پیدا کر دیتے ہیں مگر خطوط نگاری کی تکنیک میں فرق نہیں آنے دیتے۔

۵
آزمودہ دواؤں کا مرکب
انالجین
سر درد - کمر کا درد - دانت کا درد
ایام - انفلوئنزا اور ہر قسم کے دوسرے درد کے لئے
یقینی زود اثر اور بے ضرر علاج ہے
Opal
Sportic

پروفیسر وحید اللہ نظمی (ایم اے)

ابنِ ابی الربیع

(تاریخ فلسفۂ سیاسیات میں وہ پہلا مفکر ہے جس نے اقتدارِ اعلیٰ کا نظریہ قائم کیا اور اس کی آئینی حیثیت متعین کی سماج میں سیاسی اداروں کی حقیقی بنیادوں کا کھوج لگا کر فلسفۂ سیاسیات کی بنیاد عمرانیات پر رکھی اور نظریہ مملکت کے ساتھ ساتھ فنِ حکمرانی کے بھی بہترین اصول متعین کئے۔ اس نے سیاسی اعمال کو اخلاق کا پابند بنایا اور بادشاہ کے موضوع پر سب سے پہلی کتاب تصنیف کی)

احمد بن محمد بن ابی الربیع آٹھویں عباسی خلیفہ معتصم باللہ کے زمانۂ خلافت (۲۱۸ھ/۸۳۳ء تا ۲۲۷ھ/۸۴۲ء) میں عمرانی علوم کا ایک بہت بڑا ماہر تھا۔ خلیفہ معتصم اس کی صلاحیت اور عالمانہ مرتبے سے واقف تھا۔ چنانچہ اس نے ابن ابی الربیع سے ایک ایسی کتاب لکھنے کی فرمائش کی جس میں اخلاق اور معاملات کے مختلف پہلو جامع انداز میں پیش کئے گئے ہوں۔ ابن ابی الربیع نے جو معتصم کے حسن انتظام اور حسن سیرت سے ذاتی طور پر بہت متاثر تھا، اس فرمائش کے بموجب ایک کتاب "سلوک المالک فی تدبیر الممالک" کے نام سے لکھ کر پیش کی۔

یہ کتاب چار حصوں میں منقسم ہے، پہلے حصے میں مصنف نے مقدمۂ کتاب تحریر کیا ہے جس میں کتاب کے لکھنے کی غایت پر روشنی ڈالی ہے دوسرے حصے میں اخلاق کے احکام بیان کئے ہیں، تیسرے حصے میں سیرتِ عقلیہ کا ذکر کیا ہے اور چوتھے حصے میں سیاسیات کے اصول و احکام پر بحث کی ہے۔

سلوک المالک فی تدبیر الممالک جس زمانے میں لکھی گئی وہ تہذیب و تمدن کے اعتبار سے بڑے عروج اور ترقی کا زمانہ تھا۔ عباسی خلیفہ ہارون الرشید جو متفقہ طور پر سلاطین عالم میں سب سے زیادہ شان و شکوہ اور جاہ و جبروت والا حکمران مانا جاتا ہے، محفل ہستی سے ابھی رخصت ہوا تھا اس کے عہد میں عظیم مملکتِ اسلامیہ کا دارالخلافہ بغداد، جہاں عالمی سیاست کا سب سے بڑا مرکز تھا وہیں وہ اس وقت کی دنیا میں علوم و فنون کا بھی سب سے بڑا گہوارہ بھی تھا۔ اس کے بعد اس کے لائق فرزند مامون الرشید نے بیت الحکمت کا اضافہ کرکے بغداد کی عظمت میں اور چار چاند لگا دیے تھے۔ چنانچہ مامون ہی کے بیت الحکمت کا طفیل ہے کہ جدید دنیا یونانیوں کے علوم و افکار اور ان کے فنون و فلسفے سے روشناس ہوئی۔ پھر مامون نے جتنی عظیم الشان سلطنت پر فرماں روائی کی ویسی ہی عظیم الشان نظیر اپنے کردار کی یہ قائم کر گیا۔ کہ اپنے بعد اپنے بیٹے عباس کو ولیعہدی سے محروم کرکے اپنے بھائی معتصم کو

محض اس لئے جانشین مقرر کیا کہ اس میں اتنی بڑی سلطنت کے نظم و نسق کے سنبھالنے کی پوری صلاحیت موجود تھی اور وہ اپنی سیرت و کردار کے اعتبار سے بھی فائق تر تھا۔ معتصم جس نے اپنے عظیم المرتبت باپ ہارون الرشید کا عہد اور اس عہد کے علوم اور علماء کی قدر دانیاں اپنی آنکھوں سے دیکھی تھیں، پھر اپنے بھائی مامون کے عہد میں ان کا مزید فروغ اور ارتقاء ملاحظہ کیا تھا، جب خود سریر آرائے خلافت ہوا تو اس نے بھی اپنے عظیم پیش روؤں کی روایات کو برقرار رکھا اور علوم اور علماء کی قدر دانی میں کوتاہی نہ کی۔ ابن ابی الربیع نے بھی جو معتصم کی بے حد تعریف کرتا ہے، ہارون اور مامون کے زمانے کی رونقیں دیکھی ہوں گی۔ اس لئے اگر وہ معتصم کو ان دونوں کے معیار سے کمتر پاتا تو غالباً اتنی ستائش نہ کرتا۔

علمی مقام

سیاسی مفکر ہونے کی حیثیت سے ابن ابی الربیع، تاریخ فلسفہ سیاسیات میں بعض اہم خصوصیات کا حامل ہے اور ان میں سب سے بڑی خصوصیت جو اس کو حاصل ہے وہ یہ ہے کہ سیاسی فلسفے میں اقتدار اعلیٰ کا نظریہ قائم کرنے کا شرف سب سے پہلے اسی کو حاصل ہوا۔ ہمارے زمانے میں اقتدار اعلیٰ کی آئینی حیثیت کو سیاسی فلسفے میں سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے لیکن ابن ابی الربیع کا کمال یہ ہے کہ اقتدار اعلیٰ کی آئینی حیثیت کو اس نے آج سے تقریباً گیارہ سو (۱۱۰۰) سال پہلے ہی متعین کر دیا تھا۔ اس کے آٹھ نو سو سال بعد بوداں (BODIN) ہابس (HOBBES) اور آسٹن (AUSTIN) وغیرہ نے اقتدار اعلیٰ کے موضوع پر جو کچھ لکھا ہے اس میں ابن ابی الربیع ہی کا تتبع کیا گیا ہے۔

ابن ابی الربیع کے سیاسی فلسفے کی دوسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے سماج میں سیاسی اداروں کی اصل بنیاد کا کھوج لگایا ہے اور اس کا تفصیلی تجزیہ کیا ہے۔ اس طرح گویا اس نے اپنے سیاسی فلسفے کی بنیاد عمرانیات پر رکھی ہے اور آنے والی نسلوں کے لئے تحقیق کا ایک نیا اور وسیع میدان فراہم کر دیا ہے۔

اس کی تیسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے سیاسی فلسفے کی پیشکش میں محض نظریاتی اور تجریدی مباحث میں الجھ کر نہیں رہ گیا ہے بلکہ اس نے فن حکمرانی اور نظم سلطنت کو اپنا موضوع سخن قرار دیا ہے اور ایسے اصول متعین کئے ہیں جو کسی بھی دور کے حکمراں اپنے انتظام حکومت میں استعمال کر سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ قابل ستائش بات یہ ہے کہ ابن ابی الربیع نے جو فن حکومت پیش کیا ہے اس کی بنیاد از سر تا سر اخلاق پر رکھی ہے اور اس کی پابندی میں وہ اس درجہ مستحکم ہے کہ جنگ جیسے نازک موقع پر بھی وہ اخلاق کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔ فن حکمرانی کی اس بحث میں اس نے نظریہ مملکت کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے بلکہ اس پر بھی اپنے مخصوص نقطۂ نگاہ کے مطابق بڑی اہم بحث کی ہے۔

اس کی کتاب "سلوک المالک فی تدبیر الممالک" کا موضوع چونکہ "بادشاہ" ہے اس لئے تاریخی اعتبار سے یہ کتاب بادشاہ پر بھی پہلی کتاب ہے۔

سیاسی افکار

انسان کی فطرت اس کو بالطبع اُنس اور اجتماع کی طرف مائل کرتی ہے اور اس کی اس فطرت کا اظہار اس کی احتیاجات اور ضروریات کی معرفت ہوتا ہے۔ جب اجتماع قائم ہو جاتا ہے تو اس کو باقی رکھنے کے لئے سنن و فرائض (آئین) کی ضرورت ہوتی ہے جنہیں حکام نافذ کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ چیز بھی خالق فطرت خود ہی فراہم کرتا ہے۔ دوسرے الفاظ

میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے ایک خاص فطرت پر پیدا کیا ہے اور اس فطرت کے مطابق اس کی زندگی کو نظم بھی عطا کیا ہے)

انسانی فطرت

ابن ابی الربیع نے سیاست اور تمدن پر اپنی علمی بحث کا آغاز کرتے ہوئے سب سے پہلے اس مسئلے پر روشنی ڈالی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک خاص فطرت پر پیدا کیا ہے اور یہ فطری خصوصیت ہی اس کو " بالطبع انس اور اجتماع کی طرف مائل کرتی ہے " یعنی تمام مخلوقات میں انسان ایک ایسی نوع ہے جس کی فطرت اُسے ایک جانب تو اپنے ہی نوع کے ساتھ محبت و موانست کے بندھن میں باندھ دیتی ہے اور دوسری جانب اُسے ایک اجتماع یا معاشرے میں رہنے پر مجبور کرتی ہے اس لئے انسان صرف اس کو قرار دیا جائے گا جس میں یہ دونوں انسانی اوصاف یعنی محبت اور معاشرت پسندی موجود ہو اس بحث سے ایک نتیجہ یہ بھی اخذ ہوتا ہے کہ جہاں انسانوں کے درمیان انس و محبت کا وجود فطری ہے وہیں معاشرے کا وجود بھی کلیتہً فطری ہے ۔

معاشرے کا قیام

عملاً معاشرے کے قیام میں انسانی فطرت کا اظہار اس کی احتیاجات اور ضروریات کی معرفت ہوتا ہے یعنی وہ بنیادی ضروریں جن پر انسان کی زندگی کا انحصار ہے ، بالفعل معاشرے کے قیام کا وسیلہ بنتی ہیں ابن ابی الربیع کے نزدیک وہ ضرورتیں پانچ ہیں :۔

(۱) غذا ۔ زندگی بسر کرنے کے لئے انسان کو سب سے پہلے غذا کی ضرورت ہے اور یہ ضرورت اس لئے پیدا ہوتی ہے کہ ہر وقت محنت اور حرکت کی وجہ سے جسمانی قوتیں تحلیل ہوتی رہتی ہیں ۔ غذا اس کمی کو پورا کرتی اور قوتوں کو بحال رکھتی ہے اس لئے اگر غذا نہ ملے تو انسان زندہ ہی نہیں رہ سکتا ۔

(۲) لباس ۔ جسم کے تحفظ کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کو سردی گرمی اور ہوا کی تکالیف سے بچایا جائے چنانچہ یہ کام لباس کے ذریعے سے کیا جاتا ہے اس لئے اس کا شمار بھی بنیادی ضرورتوں میں ہوتا ہے ۔

(۳) مکان ۔ سکون و راحت حاصل کرنے اور ہر قسم کی آفتوں سے محفوظ رہنے کے لئے مکان کی ضرورت ہے ۔

(۴) ازدواج ۔ عالم امکان میں بقائے حیات کا طریقہ صرف یہ ہے کہ توالد و تناسل کا سلسلہ جاری رکھا جائے اس کے علاوہ بقائے شخصی کا بھی کوئی اور طریقہ موجود نہیں اس لئے ازدواج کو ضروری قرار دیا گیا تاکہ نسل اور نوع انسانی باقی رہے ۔

(۵) علاج ۔ جسم انسانی کو کبھی کبھی کچھ عارضے لاحق ہو جاتے ہیں جن کا دور کرنا اس کی بقا کے لئے انتہائی ضروری ہے اور یہ چیز چونکہ معالج کے ذریعے سے حاصل ہوتی ہے اس لئے اس کا شمار بھی بنیادی ضروریات میں کیا گیا ہے ۔

ابن ابی الربیع کے نزدیک یہ پانچ چیزیں ایسی ہیں کہ انسان اس سے کسی حال میں بھی مستغنی نہیں ہو سکتا اس سے ان چیزوں کا فراہم کرنا اس کے لئے ناگزیر ہے لیکن یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ ان اشیاء کی فراہمی ایک مربوط نظم کی محتاج ہے ۔ مثلاً جب انسان غذاؤں کا طلب گار ہوا تو اس نے اپنے لئے موزوں اور مناسب غذا حیوانات اور نباتات کو پایا لیکن ان دونوں کے حصول کے لئے ضروری ہوا کہ حیوانات کی پرورش اور حفاظت اور نباتات کی کاشت وغیرہ کا اہتمام کیا جائے پھر ان غذاؤں کو بھی محفوظ ۔ کھانے اور استعمال کے قابل بنانے کے لئے بہت سی صنعتوں کی ضرورت پیش آتی ۔ اس طرح ضروریات کی فراہمی کے ساتھ ساتھ یہ نئی

ضرورتیں پیدا ہو گئیں اور ان کا ایک بسیط سلسلہ قائم ہو گیا۔ ظاہر امر ہے کہ یہ تمام امور ہر انسان کے لئے ضروری ہیں لیکن ہر انسان تنہا ان امور کو انجام نہیں دے سکتا اس لئے تمام انسان ایک دوسرے کے تعاون کے محتاج ہوتے اور ایک کی ضرورت دوسرے سے وابستہ ہونے کی وجہ سے بہت سے لوگ ایک ہی مقام پر مل جل کر رہنے لگے تاکہ باہمی تبادلۂ محنت اور لین دین کے ذریعہ سے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کر سکیں، اس طرح شہر آباد ہو گئے اور معاشرے اور تمدن کی بنیاد پڑ گئی۔

مملکت کی ابتداء

ابن ابی الربیع کے خیال میں بستیوں یا شہروں کی آبادی کے ساتھ ہی ساتھ لوگوں نے مل جل کر کام کرنا بھی شروع کیا لیکن معاشرتی زندگی میں چونکہ عدل و انصاف اور ظلم و ستم دونوں ہی کا امکان تھا، اور ان امور میں ہر شخص علیحدہ علیحدہ روش بھی اختیار کر سکتا تھا جس کے نتیجے میں معاشرہ ہی منتشر ہو جاتا۔ اس لئے باری تعالیٰ کی شانِ ربوبیت اس طرف متوجہ ہوئی اور اس نے سب ہی کے لئے سنن و فرائض (آئین) مقرر فرما دئے تاکہ تمام لوگ اپنے معاملات میں ان پر عامل اور قائم رہیں۔ اختلافات کی صورت میں ان ہی کی جانب رجوع کریں اور ان لوگوں کو بھی جو ان سے انحراف کریں ان پر عمل پیرا ہونے کے لئے مجبور کریں تاکہ ان کے معاشرتی امور میں باضابطگی اور ان کے خصائل میں یکسانیت پیدا ہو۔ اس طرح تمام لوگ ظلم و ستم سے بچ جائیں گے۔ اور سنن و فرائض کی تنفیذ کے لئے چونکہ حکام کا ہونا ضروری تھا چنانچہ شریعت مطہرہ نے اس جانب بھی ہدایت فرما دی اور حاکموں کو بھی مقرر کر دیا تاکہ وہ احکام ربانی کی حفاظت کریں، اور لوگوں کو ان پر عمل پیرا ہونے کے لئے مجبور کریں۔

۱۔ ابن ابی الربیع کی یہ پوری بحث دراصل مملکت کی ابتداء اور اس کی تخلیق پر دلالت کرتی ہے اور یہ بتاتی ہے کہ اس کے نزدیک مملکت ایک فطری انجمن ہے اور اس کی بنیاد نہ کسی جبر اور خوف پر رکھی گئی ہے نہ یہ کسی باہمی معاہدے کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہے اور نہ یہ کسی لاشعوری ارتقاء کے باعث وجود میں آئی ہے بلکہ ان تمام ذہنی پیچیدگیوں سے ہٹ کر اس نے صاف اور سیدھی یہ بات بتا دی کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے ایک خاص فطرت پر پیدا کیا ہے اور اسی فطرت کے مطابق اس کی زندگی کو منظم بھی کیا ہے۔ ابن ابی الربیع کے نزدیک، اللہ تعالیٰ کی شانِ حکمت سے یہ قطعی بعید تھا کہ وہ انسان کو زمین پر اپنے خلیفہ کی حیثیت سے پیدا بھی فرماتا اور پھر اس کو تاریکیوں میں بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیتا۔ آدمی اگر آنکھیں کھول کر دیکھے تو وہ اس حقیقت کو پا لے گا کہ جس خدا نے زندگی جیسی شئے پیدا فرمائی ہے، اسی نے زندگی کی تمام ضروریات اور اس کے لئے اسباب و ذرائع بھی فراہم کر دئے ہیں اور یہ بات متحقق ہے کہ انسانی زندگی کی ضرورتوں میں سب سے بڑی ضرورت مملکت کی ہے اس لئے مملکت کو بھی بالفعل باری تعالیٰ ہی نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے سے قائم کر دیا اور قیامت تک اس کو باقی رکھنے کے لئے اصول و قوانین بھی بھیج دئے۔

۲۔ ابن ابی الربیع کی گفتگو سے دوسرا نتیجہ یہ اخذ ہوتا ہے کہ قیام مملکت کے لئے انسانی فطرت خود مطالبہ کرتی ہے لیکن بقائے مملکت کے لئے آئین و احکام شریعت کی ضرورت ہے، اور یہ اس لئے ہوتا ہے کہ نظم و ترتیب آئین کے بغیر ممکن ہی نہیں اور ظلم و جبر کا استیصال بھی قوانین کے بغیر ہو نہیں سکتا چنانچہ مملکت کے لئے یہ دونوں چیزیں مستقل طور پر شریعت ہی فراہم کرتی ہے۔

۳۔ تیسری بات اس کی گفتگو سے یہ اخذ ہوتی ہے کہ ہر مملکت میں حکمرانوں کا بنیادی فرض یہ ہے کہ وہ احکام ربانی کی اطاعت کریں ان احکام کی حفاظت کریں اور لوگوں کو ان کے مطابق زندگی بسر کرنے کی ہدایت کریں اگر وہ ایسا کریں گے تو بقائے شریعت کے ساتھ ساتھ مملکت بھی باقی رہ سکے گی ورنہ خود مملکت ہی کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔

اس امر کا پابند کرتا ہے کہ اس کے جملہ اعمال ایسے ہونے چاہئیں گویا کہ وہ انہیں رعایا کے روبرو انجام دے رہا ہے۔

بادشاہت کے جواز کے لئے وہ ایک دلیل یہ بیان کرتا ہے کہ ہر مملکت ایک محافظ اور مدبر کے لئے محتاج ہے اور مملکت کا یہ احتیاج ان تکالیف کی وجہ سے ہے جو انسان ایک دوسرے کو پہنچاتے ہیں بادشاہ چونکہ ان تکالیف کا ازالہ کرتا ہے اس لئے اس کا وجود ناگزیر ہے اور اس کا تدبر لوگوں کے لئے وہ مواقع فراہم کرتا ہے جن کی بدولت وہ مختلف پیشے اختیار کرتے ہیں اور دوسروں کی مداخلت کے خوف سے مستغنی ہو کر سب کے لئے زندگی کی ضروریات فراہم کرتے ہیں اس طرح پوری مملکت کے لئے معاشرت اور معیشت کا ایک نظم قائم ہو جاتا ہے۔

ابن ابی الربیع نے یہ دلیل بادشاہی نظام کے جواز کے لئے پیش کی ہے۔ لیکن اگر اس کا تجزیہ کیا جائے تو یہی دلیل ہر سیاسی نظام کے لئے جواز فراہم کر دیتی ہے اسی لئے یہاں یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ ابن ابی الربیع جس کو بادشاہی نظام قرار دیتا ہے حقیقت میں وہ بادشاہی نظام نہیں بلکہ عام سیاسی نظام ہے اور جس کے لئے وہ لفظ "مالک" استعمال کرتا ہے اس سے صرف بادشاہ نہیں بلکہ عام سیاسی سربراہ مراد ہے۔ کردار کے لحاظ سے بھی اس کا "مالک" عام بادشاہانِ عالم سے مختلف ہے۔

ارکانِ مملکت

ابن ابی الربیع نے اس باب میں مملکت پر ایک نئے انداز سے گفتگو کی ہے۔ اس کی یہ گفتگو محض نظری یا فلسفیانہ نہیں ہے اور نہ اس نے مملکت کے محض تجریدی تصور ہی کو موضوعِ بحث بنایا ہے بلکہ ایک مملکت کو صحیح خطوط پر چلانے کے لئے جن تدابیر کی ضرورت ہے ان پر اس نے بڑے حکیمانہ، مدبرانہ انداز میں گفتگو کی ہے۔ بغور دیکھا جائے تو اس کے سیاسی افکار کا حقیقی عکس اسی باب کے اندر جھلکتا ہے، وہ اپنے اس تخیل میں بالکل منفرد ہے کہ مملکت چار ستونوں پر قائم ہوتی ہے یا بہ الفاظ دیگر ارکانِ مملکت چار ہیں۔ (۱) بادشاہ (۲) رعایا (۳) عدل (۴) تدبیر۔ ان میں سے اگر ایک رکن بھی کم ہو جائے تو مملکت کی عمارت ہی منہدم ہو جائے گی۔ دوسرے تمام مفکرین کے نزدیک مسلمہ طور پر مملکت کے چار عناصر ترکیبی، رعایا، علاقہ، حکومت اور اقتدار اعلیٰ ہیں، لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو ابن ابی الربیع کا تخیل زیادہ جامع اور زیادہ معقول ہے اور وہ اس طرح کہ رعایا تو دونوں فریقوں کے یہاں مشترک ہے لیکن عام مفکرین نے حکومت اور اقتدار اعلیٰ کو الگ الگ جداگانہ مختلف عناصر کی حیثیت سے پیش کیا ہے ان میں اقتدار اعلیٰ کی حیثیت محض اعتباری ہے اس کا کوئی واقعی مظاہرہ بجز حکومت کے اور کہیں موجود نہیں ہوتا اس لئے ابن ابی الربیع نے ان دونوں کو بادشاہ کے اندر ضم کر دیا ہے۔ رہا علاقے کا معاملہ تو غالباً اس نے اس مفروضہ پر عمل کیا ہے کہ رعایا، بادشاہ اور اس کی حکومت وغیرہ، آخر یہ سب دائرہ میں زمین ہی پر تو ہوتی ہیں اس مختصر بحث میں زمین کو بھی ایک جزوِ اعظم کی حیثیت سے پیش کرنا اس نے تحصیل حاصل سمجھا اس طرح گویا اس کے ارکانِ مملکت میں عام مملکتوں کے چاروں مسلمہ عناصر ترکیبی تو لازماً شامل ہو ہی ہیں لیکن مملکت کو حقیقی معنوں میں مملکت بنانے کے لئے اس نے دو جونئے عناصر عدل اور تدبیر شامل کئے ہیں، فی الواقع ایسے ہیں کہ ان کے بغیر مملکت ایک جسدِ بے روح کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان ارکانِ مملکت کا مختصر جائزہ مندرجہ ذیل ہے:-

۱- بادشاہ

(سلطنت کا حصول اور اس کی بقا اعلیٰ اخلاق پر منحصر ہے اور اس اعلیٰ اخلاق کا مظہر سب سے زیادہ خود بادشاہ کو ہونا چاہئے)

پوری تاریخ فلسفۂ سیاسیات میں ابن ابی الربیع وہ پہلا مفکر ہے اور "سلوک المالک فی تدبیر الممالک" وہ پہلی کتاب ہے جس نے

بادشاہ کو سیاسی فلسفہ کا موضوع قرار دیا ہے اور اس کو مملکت کے رکنِ اول کی حیثیت سے پیش کیا ہے اس کتاب میں اگرچہ سیاسیات کے علاوہ بھی دوسرے عقلی اور اخلاقی مضامین پر مشتمل مستقل ابواب موجود ہیں لیکن پوری کتاب کی مدح یا اس کا مرکزی مقصد بالکل سیاسی ہے اور اس سیاست کا محور بادشاہ کی ذات ہے۔ یہی وجہ ہے مصنف نے خود کتاب کا عنوان "سلوک المالک فی تدبیر الممالک" تجویز کیا ہے۔ سادہ اور سہل الفاظ میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ مملکت کے لئے بہترین تدابیر اختیار کرنے میں بادشاہ کو کیا روش اختیار کرنی چاہئے چنانچہ اس عنوان سے اس امر کی قطعی طور پر تصدیق ہو جاتی ہے کہ اس کتاب کا اصل موضوع بادشاہ ہے لیکن تاریخی طور پر یہ بھی تسلیم ہے کہ یہ کتاب بادشاہ پر پہلی کتاب ہے۔

بادشاہت کے لوازم

مملکت کا بنیادی رکن ہونے کی حیثیت سے بادشاہ کے لئے ابن ابی الربیع چھ چیزیں ضروری قرار دیتا ہے۔

(۱) پہلی ضروری چیز یہ ہے کہ وہ شاہی خاندان سے تعلق رکھتا ہو اور اپنے پیش رو بادشاہ کا سب سے قریبی رشتہ دار ہو تاکہ تمام رعایا اس کی بادشاہت پر مطمئن ہو سکے۔ گویا وہ موروثی بادشاہت کا حامی ہے اور مملکت میں امن و استحکام کی واحد صورت اس کے نزدیک صرف یہی ہے کہ داخلی سیاست میں انقلابات یا انتخابات جیسے مضطرب احوال سے قطع نظر وراثت کا محفوظ اور پُر امن طریقہ اختیار کر لیا جائے۔ اپنے اس تصور کی تائید میں چونکہ ابن ابی الربیع نے کوئی دلیل پیش نہیں کی ہے اس لئے اس پر تنقید کی بجائے صرف اتنا کہہ دینا ہی کافی ہے کہ خلافتِ عباسیہ کے موروثی نظام کا یہ ایک تاثر ہے جو مصنف کے ذہن پر جم گیا ہے۔

۲۔ دوسری ضروری چیز یہ ہے کہ بادشاہ اولوالعزم اور عالی ہمت ہو یعنی اس نے اپنے نفس کا تزکیہ کر لیا ہو، اور اس کے اخلاق سنور گئے ہوں اور اس کی قوتِ غضبیہ بھی حالتِ اعتدال پر ہو کیونکہ جب تک اس میں یہ اخلاقی رفعت پیدا نہیں ہو جائے گی اس وقت تک سے ملک حاصل نہیں ہو سکے گا اور گو کسی طرح حاصل ہو بھی گیا تو باقی نہیں رہ سکے گا۔ یہ تصور اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ سلطنت کا حصول اور بقا اعلیٰ اخلاق پر منحصر ہے اور اس اعلیٰ اخلاق کا مظہر سب سے زیادہ خود بادشاہ کو ہونا چاہئے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ پورے فلسفۂ سیاسیات کا خلاصہ صرف یہی ایک بات ہے۔

۳۔ تیسری چیز جس کی بادشاہ کو سخت ضرورت ہے وہ مستحکم رائے ہے جس کے بغیر کوئی معاملہ طے نہیں ہو سکتا۔ رائے کی یہ اصابت مطالعۂ تاریخ اور گذرے ہوئے بادشاہوں کے حالات، ان کی تدابیر اور ان کے تجربات پر غور و فکر کرنے سے پیدا ہوتی ہے اور جب بادشاہ میں بھی یہ پیدا ہو جاتی ہے وہ لوگوں کے مکر و فریب کا آسانی کے ساتھ شکار نہیں ہو سکتا۔ یہ بات سیاسی افادیت کے لئے بڑی محکم اور سیاسی استقلال کے لئے بہت ضروری ہے اور اگر سیاسی سربراہ خود ہی اس سے محروم ہو تو امور مملکت بازیچۂ اطفال کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔

۴۔ چوتھی چیز صبر ہے، جو قوت اور شجاعت کے استعمال سے پیدا ہوتا ہے۔ جس بادشاہ میں یہ وصف موجود ہوتا ہے اس کے تمام امور پائیدار ہوتے ہیں اور دشمن اس کے مقابلے میں لپسپا رہتے ہیں۔ یہ بات بڑی پُر از حکمت ہے اور اس کا ماخذ اصلی یہ ہے کہ صبر ایک اخلاقی قوت ہے اور ایسی قوت ہے جو کبھی شکست یاب نہیں ہوتی اس لئے جس بادشاہ میں بھی یہ قوت موجود ہوگی وہ اپنے تمام امور میں غالب رہے گا۔

۵۔ پانچویں چیز مال ہے۔ بادشاہ اگر اپنے ملک کو آباد رکھے اور رعایا کے مال میں عدل اور انصاف سے کام لے تو اس کا خزانہ معمور رہے گا اور اس کی حکومت مستحکم رہے گی۔

۶۔ چھٹی اور آخری چیز یہ ہے کہ بادشاہ کے کچھ معتمد اور مخلص دوست ہوں جو اس کے دست و بازو کی طرح اس کا ساتھ دیں تاکہ شاہ کا دل مطمئن رہے۔ ایسے دوست بڑے التفات و اکرام اور بے پناہ لطف و عنایت کے ذریعے سے حاصل ہوتے ہیں اور ان کے انتخاب میں بڑی باریک بینی اور آزمائش کی ضرورت ہوتی ہے۔

بادشاہ کے سیاسی مشاغل

ابن ابی ربیع کے نزدیک مملکت کی جملہ سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بادشاہ کی ذات ہے اب اگر یہ مرکز سیاسی اعتبار سے درست ہے تو وہ یقین رکھتا ہے کہ مملکت کا پورا سیاسی نظام بھی درست رہے گا اور اگر یہ مرکز ہی خرابیوں کا شکار ہو گیا تو پھر مملکت کی پوری سیاسی زندگی خرابیوں میں مبتلا ہو جائے گی اور اس کا کوئی ایک گوشہ بھی ان خرابیوں سے محفوظ نہیں رہ سکے گا۔ چنانچہ اس نے اپنے پیش کردہ سیاسی نظام میں بادشاہ کو سیاسی اعتبار سے درست رکھنے کے لئے بڑی ٹھوس تجاویز پیش کی ہیں اور یہ بتایا ہے کہ ایک بادشاہ کو کس قسم کی سیاسی زندگی اختیار کرنا چاہئے تاکہ اس کے زیر اثر مملکت میں صحیح قسم کی سیاسی زندگی نشو و نما پا سکے اس کے خیال میں بادشاہ کی سیاسی زندگی کے پانچ پہلو ہیں اور پانچوں بہت اہم ہیں اس لئے اس نے ہر ایک پہلو کی الگ الگ وضاحت کی ہے اور اس کو درست رکھنے کے لئے مناسب تدابیر بھی بتائی ہیں جو ذیل میں درج ہیں :-

(۱) نفس کی سیاست

بادشاہ کی سیاسی زندگی کا سب سے اولین پہلو اس کے نزدیک خود بادشاہ کے اپنے نفس کی سیاست ہے یعنی اگر اس کا نفس درست حالت میں ہے اور وہ نیک نفس انسان ہے تو اس کے تمام امور خیر و خوبی کے ساتھ انجام پائیں گے لیکن اگر اس کا نفس ہی خراب ہے یا وہ خبیث النفس ہے تو پھر اس سے کسی بھی خوبی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ دنیا کے تمام سیاسی نظاموں میں جو کبھی قائم تھے یا آج قائم ہیں یہی نکتہ سب سے زیادہ قابل لحاظ ہے کہ خود سربراہ سیاست کی کیفیت نفس کیسی ہے؟ آیا وہ شریف النفس ہے یا خبیث النفس؟ صرف اس بات کے فیصلے پر سارے سیاسی نظام کی خوبی اور خرابی کا انحصار ہے، اس لئے ابن ابی الربیع نے بادشاہ کو سب سے پہلے خود اپنے نفس کی سیاست کی جانب رجوع کیا ہے اور اس کی تربیت کے طریقے بھی بتاتے ہیں تاکہ سیاسی نظام کی یہ خشت اول سیدھی جم جائے۔ اس نے بادشاہ کو یہ مشورہ دیا ہے کہ اس کو کاموں کے اعتبار سے اپنے اوقات اس طرح تقسیم کرنے چاہئیں کہ دن کا ابتدائی حصہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کے ذکر و فکر کے لئے مخصوص ہو۔ عبادت سے فارغ ہونے کے بعد دوپہر تک اس کو بنفس خود رعایا کے کاموں کو دیکھنا اور انہیں ٹھیک طور پر انجام دینا چاہئے۔ اس کے بعد کچھ وقت اپنے طعام اور آرام کے لئے رکھے اور دن کے آخری حصے میں کچھ وقت سیر و تفریح کے لئے مقرر کرے اس طرح اس کی زندگی ایک مقررہ نظام الاوقات کے مطابق بسر ہونی چاہئے۔ دوسری چیز یہ کہ بادشاہ کو دانا اور حکیم ہونا چاہئے اور اگر اس میں کچھ کمی ہو تو اسے حکمت و دانائی کے حصول کا شائق ضرور ہونا چاہئے۔ تاکہ اس کے معاملات میں نادانی یا حماقت جگہ نہ پا سکے تیسری چیز یہ کہ بادشاہ کو اچھی طرح یہ جان لینا چاہئے کہ اس کا حقیقی خزانہ رعایا کے دل ہیں، اب اگر وہ ان میں بھلائی ڈالے گا تو وہ محفوظ رہے گی اور اگر برائی ڈالے گا تو وہ بھی جمع رہے گی۔ اس لئے رعایا کے معاملات کی انجام دہی میں اسے سب سے زیادہ یہی بات ملحوظ رکھنی چاہئے کہ اس کے اس حقیقی خزانے میں کوئی برائی جمع نہ ہونے پائے۔ چوتھی چیز یہ کہ غلط عیب چینی سے مغموم یا غلط تعریف سے مسرور نہ ہونا چاہئے پانچویں چیز یہ کہ تقدیر کے فیصلوں پر گھبرانا نہ چاہئے اور کسی کام کو بھی اس کے غیر وقت میں نہ کرنا چاہئے۔ چھٹی چیز یہ

کہ ہر حال میں خدا کا شکر بجالائے اور لوگوں پر احسان کرنے کا ہر وقت خواہشمند رہے، ساتویں چیز یہ کہ کسی معاملے میں بھی غلط انداز
نہ کیا جائے اور اپنی ہر حالت سے اچھی طرح واقف رہے، آٹھویں چیز یہ کہ ہر کام میں حق و انصاف کو اپنا اصول کی حیثیت سے اختیار کرے
اور جو بھی ان کا فیصلہ ہو اس کے مطابق عمل کرے اور نویں چیز یہ کہ لوگوں کے غلط شوروں کو اپنی صائب رائے پر رکھ کر دیکھے
یہ اصول اگر بادشاہ اپنائے تو ابن ابی الربیع کا خیال ہے کہ سیاسی امور میں اس کا نفس اس کو غلط راستے پر نہ ڈال سکے گا اور ان
تمام خرابیوں کا بھی سد باب ہو جائے گا۔ جو کسی سیاسی سربراہ کے صرف نفس کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔

(۲) جسم کی سیاست

دوسرا پہلو بادشاہ کی سیاسی زندگی کا اس کی جسمانی کیفیات سے متعلق ہے یعنی اگر یہ کیفیات بھلی اور مائل بہ خوبی ہیں تو اس
کے اثرات ملکی سیاست پر بھی اچھے پڑیں گے لیکن اگر یہی جسمانی کیفیات بادشاہ کو پستی اور برائی کی جانب مائل رکھتی ہیں تو
اس کے زیر اثر جو سیاسی نظام قائم ہوگا اس میں بھی لازماً خرابیاں پیدا ہو کر رہیں گی۔ اس لئے ابن ابی الربیع اس کو بادشاہی سیاست کا
دوسرا باب قرار دیتا ہے اور اس کی اصلاح کی بھی فکر کرتا ہے، چنانچہ اس کا مشورہ یہ ہے کہ بادشاہ کو اپنی جسمانیت کا غلام بن کر نہیں
رہنا چاہئے بلکہ اس کو ہر حالت میں اور ہر ممکن طریقے سے اپنی شہوت کو مغلوب رکھنا چاہئے چنانچہ جو شخص شہوت کا بندہ بن گیا ہو
اس کو وہ سرے سے بادشاہت ہی کا مستحق نہیں سمجھتا دوسری چیز یہ کہ بادشاہ کو بڑی لذتوں کا خوگر نہیں ہونا چاہئے اور اس امر کا
اہتمام کرنا چاہئے کہ ان سے بالکل ہی محفوظ رہے۔ تیسری چیز یہ کہ اپنے اندر اعلیٰ اخلاقی اوصاف پیدا کرنا اور برے خصائل سے
پاک رہنا چاہئے۔ چوتھی چیز یہ کہ سستی، کاہلی اور غفلت کا شکار نہ ہو اور بروقت چوکنا اور مستعد رہے، پانچویں چیز یہ کہ اپنی خوابگاہ
سے کسی کو واقف نہ کرے، چھٹی چیز یہ کہ تندرست اور طاقتور رہے اور گھوڑے کی سواری میں مہارت حاصل کرے ساتویں چیز یہ کہ اگر
شکل و صورت اچھی ہو تو یہ بھی اس کے حق میں بہتر ہے آٹھویں چیز یہ کہ اس کے تمام اعضاء سلامت ہوں تاکہ چلنے پھرنے اور اپنی ذمہ داریاں
کو انجام دینے میں کوئی دقت محسوس نہ کرے۔ نویں چیز یہ کہ ملک کی آئندہ نسل کے لئے موجودہ حالت سے زیادہ آمادہ رکھے۔ دسویں چیز یہ کہ
کسی چیز کا عادی نہ بن جائے تاکہ اگر اس کو چھوڑنے کی ضرورت پیش آئے تو بہ آسانی چھوڑ سکے۔ گیارہویں یہ کہ ہر مفسدات کے وقت اپنے
دل بھر کے کاموں کا احتساب کرے اور بارہویں یہ کہ اپنی ذات کے مقابلے میں ملکی مصالح کو مقدم رکھے تاکہ مملکت کو سیاسی طور پر استحکام
حاصل ہو۔ ان بارہ اصولوں کو اختیار کر لینے کے بعد بادشاہ کے بارے میں ابن ابی الربیع مطمئن ہے کہ اس کی جسمانیت مملکت کے
سیاسی نشو و ارتقاء میں غلط طور پر اثر انداز نہ ہوگی اور وہ فتنے پیدا نہ ہو سکیں گے جو جسمانی تقاضوں کے آگے جھک جانے والے
فرماں رواؤں کے ذریعے سے لازماً پیدا ہوا کرتے ہیں۔

(۳) خاص لوگوں کی سیاست

مملکت کے سیاسی نظام کو چلانے کے لئے بادشاہ کے چند خاص اور معتمد لوگ ہوتے ہیں جو اس کے دست و بازو کی طرح خدمت
انجام دیتے ہیں۔ ان لوگوں کے ساتھ بادشاہ کا سیاسی تعلق ایک خاص نوعیت کا حامل ہوتا ہے اور اس خاص تعلق کو بہتر سے بہتر حالت
میں باقی اور برقرار رکھنے اور اس کو زیادہ سے زیادہ استوار کرنے ہی میں مملکت کی بھی بہتری پوشیدہ ہوتی ہے۔ اس لئے بادشاہ کو
سیاست کا یہ پہلو درست رکھنے کے لئے بڑی احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے۔ ابن ابی الربیع نے اسی باعث اس پہلو کی بھی وضاحت کی ہے

اور بادشاہ کو ان مصلحتوں سے روشناس کرایا ہے جن کی معرفت وہ اس مرحلے سے کامیابی کے ساتھ گزر سکتا ہے اس کے خیال میں ان خاص لوگوں میں سے بھی سلطنت کے محافظ تین اشخاص ہیں، وزیر، معتمد اور تحصیلدار اور بادشاہ کے جسم کے محافظ بھی تین ہیں، باورچی منجم[1] اور طبیب۔ اس لئے بادشاہ کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ان خاص لوگوں کی پوشیدہ اور علانیہ دونوں طریقوں سے نگرانی رکھے اور ان کی خبروں اور رازوں سے واقف رہے ہر وقت ان لوگوں کے ساتھ مہربانی سے پیش آئے اور اپنی ہی جان کی طرح ان کی بھی حفاظت کرے اگر کوئی معمولی سی خطا یا لغزش ان سے سرزد ہو جائے تو ان کو معاف کردے اور مواخذہ نہ کرے ان میں جو نسبتاً معزز ہوں تو ان کی حیثیت کے مطابق ان کے درجات بھی بلند کرے اور ان کے حقوق کی پوری طرح حفاظت کرے۔ ان کے بارے میں اگر کوئی شکایت موصول ہو تو بلا تحقیق اس پر یقین نہ کرے۔ پھر ان کے مراتب کا اس طرح لحاظ رکھے کہ کسی کی حیثیت غیر مناسب طور پر نہ بڑھ جائے ورنہ دوسرے لوگ بد دل ہو جائیں گے۔ طبیب کے ساتھ وقتاً فوقتاً اچھا سلوک کرتا رہے۔ عاقل اور اہل علم حضرات کو اپنا ہم نشین بنائے اور ان کی ضروریات کی کفالت کرے تاکہ ان کی صحبتوں سے مستفید ہو سکے۔ بادشاہ کے لئے ان تمام تدابیر کو اختیار کرنا اس کے نزدیک نہایت ضروری ہے ورنہ امور مملکت صحیح طریقے سے انجام نہیں پا سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ان تدابیر کو خاص لوگوں کی سیاست سے تعبیر کرتا ہے

(۴) عوام کی سیاست

مملکت کی حقیقی قوت عوام ہیں اور اگر غور سے دیکھا جائے تو مملکت ان ہی کے لئے قائم ہوتی ہے اور ان ہی کے دم سے باقی رہتی ہے سیاسی نظام کی خوبی اور خرابی کا انحصار بھی ان ہی پر ہے اس لئے بادشاہ کو ان کی جانب سے کبھی بھی غافل نہ رہنا چاہئے اور اپنی تمام قوتیں اور صلاحیتیں ان کی بہتری کے لئے صرف کرنی چاہئیں۔ بادشاہ کی زندگی میں جتنی بھی سیاستیں ہیں ان میں اہم ترین یہی عوامی سیاست ہے اور اسی باعث ابن ابی الربیع نے عوام کے ساتھ سیاسی روابط استوار کرنے کے لئے بادشاہ کو تفصیل کے ساتھ مشورے دئیے ہیں۔ اس کے اصل مشورے حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ رعایا کے دلوں کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کرے تاکہ وہ خوف سے نہیں بلکہ دلی رغبت سے اس کی اطاعت کریں۔

۲۔ پہلے ان کے ساتھ نرمی سے پیش آئے اور پھر ان کے دل میں اپنی قربت اور مدارج کی ترقی کی خواہش پیدا کرے۔

۳۔ ان کے رازوں سے واقف ہونے تک ان کی خبریں دریافت کرنے سے غافل نہ رہے۔

۴۔ ان کے دل میں اپنی محبت دنیادار جباروں کی طرح سے نہیں بلکہ مذہب کا سچا پیرو ہونے کی حیثیت سے پیدا کرے۔

۵۔ اپنی رعایا کے عادات و خصائل اور ان کی قابلیتوں کے بارے میں واقفیت پیدا کرے تاکہ صلاحیتوں کے مطابق ان کو عہدوں پر مامور کیا جا سکے۔

۶۔ اپنے قریب کے بادشاہوں کی خبریں دریافت کرتا رہے اور سرحدوں پر کثیر فوج رکھے۔

۷۔ اپنے لشکر کی اچھی طرح خبر گیری کرتا رہے اور انہیں انعام و اکرام سے نوازتا رہے تاکہ انہیں شکایت کا موقع نہ ملے۔

۸۔ پہلے دعوئ اور مطالبہ کا جواب نہ دے اس کے بعد جس کی زیادتی ہو اس کو سزا دے۔

---

[1] اسلامی نظام زندگی میں اس کی کوئی سند موجود نہیں ہے۔ سیاسی اعتبار سے بھی یہ ایک مہمل بات ہے کیونکہ اگر خود بادشاہ منجم کا مطیع بن گیا تو اصل سیاسی قوت منجم کے ہاتھ میں منتقل ہو جائے گی۔

۹۔ جو شخص ملنے کے لئے آئے اس کو خوش کر دے تاکہ اس کے اوصاف کی شہرت ہو۔
۱۰۔ شہر کی عمارتوں اور فروخت کی اشیاء کے نرخوں کی دیکھ بھال کرتا رہے۔
۱۱۔ اپنی رعایا کو وعدہ وعید اور اسباب وبیم میں نہ رکھے۔
۱۲۔ بادشاہ کو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ تمام طریقے سے لوگوں کو نفع پہونچانا بہترین اثر پیدا کرتا ہے۔
۱۳۔ اچھوں اور بروں کو ایک ہی درجے پر نہ رکھے کیونکہ اس طرز عمل سے اچھے لوگ بادشاہ سے نفرت کریں گے۔
۱۴۔ جھگڑے اور فساد کے اصل اسباب کی بیخ کنی کرے۔
۱۵۔ اپنی رعایا کو دوسری مملکت سے متاثر نہ ہونے دے ورنہ رفتہ رفتہ وہی مالک ہو جائیں گے۔
۱۶۔ تمام ملک پر سیاست جاری رکھے۔

مندرجہ بالا سولہ باتوں میں ابن ابی ربیع نے عوامی سیاست کے تقریباً تمام ہی بنیادی اصول بیان کر دئے ہیں تاکہ اگر کوئی بادشاہ چاہے تو بلا تامل ان سے استفادہ کر سکے۔ غور سے دیکھا جائے تو ابن ابی الربیع کے ان اصولوں کی پیروی کرنے والا بادشاہ جمہوری مملکتوں کے سربراہوں سے زیادہ بہتر اور زیادہ عوامی ہے۔

(۵) جنگی سیاست

جنگی سیاست دراصل سیاست خارجہ کا ایک حصہ ہے اور مملکت کے استحکام اور اس کی بقا کے لئے ایک بہت ہی اہم عنصر ہے اس لئے اس کو کسی حال میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ابن ابی الربیع نے بھی جتنی سیاستیں بادشاہ کے ساتھ مخصوص کی ہیں ان میں جنگی سیاست کو بھی شامل کیا ہے۔ ترتیب کے اعتبار سے اگرچہ یہ پانچویں اور آخری سیاست ہے جو بادشاہ اختیار کرتا ہے لیکن اہمیت کے اعتبار سے لہ اوقات یہی سیاست سب سے اول بھی ہے اس لئے اس معاملے میں اس نے بادشاہ کو جو مشورے دئے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:-

۱۔ دشمن سے غافل نہ رہے اور ہر وقت اپنے جاسوسوں کے ذریعے سے اس کی خبریں حاصل کرتا رہے۔
۲۔ دشمن اور بدسے خصائل والے سے اپنی خبروں کو پوشیدہ رکھے۔
۳۔ دشمن اور اس کے ساتھیوں کو دھوکا دینے اور ان کے دلوں کو اپنی طرف مائل کرنے کے لئے جتنی ممکن ہو دولت خرچ کرے۔
۴۔ دشمن کے ملک کا باشندہ اگر اپنے ملک میں پناہ گزیں ہو تو اس کے صحیح حالات جانے بغیر اس پر کبھی بھروسہ نہ کرے۔
۵۔ دشمن اگر قوی ہو تو کثیر فوج کے ساتھ خود اس کا مقابلہ کرے۔
۶۔ اگر دشمن کمزور ہو تو کسی شریف، دلیر اور قابل اعتماد آدمی کو اس کے مقابلے کے لئے بھیجے۔
۷۔ اپنی فوج کو ایسی جگہ رکھے جس سے دشمن غافل رہے۔
۸۔ دشمن کو رسد پہونچانے کے ذرائع اور وسائل سے محروم کر دے۔
۹۔ سپاہیوں کی ہر جماعت پر تجربہ کار اور صاحب ادراک افسر مقرر کرے۔
۱۰۔ دشمن سے چوکنا رہے اور اپنی فوج کو محفوظ مقام پر رکھے۔
۱۱۔ دشمن کو کبھی حقیر نہ سمجھے اور اس سے ڈٹ کر مقابلہ کرے۔
۱۲۔ جہاں تک ممکن ہو لڑائی سے بچنے کی کوشش کرے اور لڑائی اس وقت شروع کرے جب اس سے بچنے کی کوئی صورت ممکن نہ

نہ ہو اگر عداوت خرچ کر کے لڑائی ٹال سکتا ہو تو ٹال دے ۔

۱۳ ۔ اگر کسی حیلے سے لڑائی ٹال دے تو اس میں دولت اور جانیں دونوں ہی محفوظ رہیں گی ۔

۱۴ ۔ دشمن پر فتح حاصل ہو جانے کے بعد امن عام کا اعلان کر دے اور لوگوں کے ساتھ عدل و انصاف کیساتھ پیش آئے ۔

۱۵ ۔ مال غنیمت کو فوج میں تقسیم کر دے اور مستحقین کو ترقی دے ۔

۱۶ ۔ جھوٹی اور بے بنیاد باتوں کی تحقیق کرے اور جو جھوٹے ثابت ہو جائیں ان کو سزا دے ۔

ان سولہ امور میں ابن ابی الربیع نے جنگ کے بارے میں وہ بنیادی سیاسی اصول پیش کئے ہیں جن کو اختیار کرنے سے ایک مملکت عظیم خطرات سے بچ سکتی ہے ۔ ان اصولوں کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان کو پیش کرنے والے نے جنگی امور کو بھی اخلاقی حدود کے اندر رکھنے کی کوشش کی ہے ۔ اور طاقت کو محض غارت گری بنانے کی بجائے اس کو انسانیت کا محافظ بنایا ہے ۔ سیاسی تدبر کا یہ وہ مقام ہے جہاں بڑے بڑے سیاسی مفکرین نے ٹھوکریں کھائی ہیں لیکن ابن ابی الربیع وہ مفکر ہے جس نے سیاسی قدم آراؤں کے لئے بھی ان ٹھوکروں سے بچ نکلنے کا اہتمام کر دیا ہے ۔

بادشاہ کی سیاستوں کی تقسیم اور ان کا تعین کر چکنے کے بعد ابن ابی الربیع نے اپنے پیش کردہ اصولوں کو برتنے اور ان کو عمل میں لانے کے طریقوں کی بھی تفصیل کے ساتھ وضاحت کی ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ بادشاہ کو مختلف کاموں کے لئے لوگوں کا انتخاب کس طرح کرنا چاہئے اور اہل اور نااہل لوگوں کی شناخت کرنے کے طریقے کیا ہیں ۔ پھر بادشاہ جن چیزوں سے مستغنی نہیں ہو سکتا ان کی ایک تفصیل ہے اور ساتھ ہی بادشاہ کے لئے ضروری اور غیر ضروری چیزوں کی بھی فہرست مرتب کر دی ہے ۔ بادشاہ کے اچھے اور برے خصائل اور ان کے نتائج و اثرات پر بھی پوری طرح روشنی ڈالی ہے ۔ مختصر یہ ہے کہ اس باب میں اس نے فن حکمرانی کو مکمل طور پر پیش کر دیا ہے ۔

۲ ۔ رعایا

بادشاہ کی ذمہ داری یہ ہے کہ رعایا کو اپنے اپنے جائز پیشے اور کاموں میں مصروف رکھے اور کسی کو برائی میں پڑنے یا بری باتوں کو سوچنے کی مہلت نہ دے اور ایسا معقول بندوبست کرے کہ تمام لوگوں کی معیشت کا بہتر طور پر انتظام ہو جائے ۔ اور رعایا کا فرض یہ ہے کہ وہ مستقل طور پر اپنے بادشاہ کے اعمال و افعال کی نگرانی کرتی رہے ۔

ابن ابی الربیع کے نزدیک مملکت کا دوسرا رکن رعایا (عوام) ہیں ۔ امر واقعہ یہ ہے کہ مملکت ان ہی کے سہارے قائم ہوتی ہے اور ان ہی پر اس کی کل زندگی کا انحصار ہوتا ہے ۔ اگر ان کی حالت بہتر اور ان کا معیار بلند ہے تو مملکت بھی اسی اعتبار سے طاقتور اور ترقی یافتہ ہو گی لیکن اگر اس کے عوام پسماندہ اور ان کے احوال افسردہ ہوں گے تو مملکت بھی اسی تناسب سے کمزور ہو گی صرف حکومت کی شان و شوکت اور حکمرانوں کا طمطراق کبھی بھی مملکت کی عظمت کی دلیل نہیں بن سکتا ۔ مملکت عظیم اسی وقت ہوتی ہے جب اس کی رعایا عظیم ہو چنانچہ جس مملکت میں عوام کی بہتری کے لئے مسلسل کوشش نہیں کی جاتی وہ مملکت اپنے ظاہری روپ کے اعتبار سے کتنی بھی کیوں نہ ہو وہ حقیقی طاقت اور ترقی سے محروم ہی رہتی ہے ۔ رعایا کی اسی اہمیت کے پیش نظر ابن ابی الربیع نے اس کا تجزیہ کیا ہے اور لوگوں کی اقسام متعین کی ہیں تاکہ ان کے ساتھ سیاسی برتاؤ کرنے میں آسانی پیدا ہو جائے ۔

تقسیم براعتبار حالت

عام شہریوں کو اس نے سات قسموں میں بانٹ دیا ہے اور سب سے پہلی قسم میں ان لوگوں کو شامل کیا ہے جو زہد و تقویٰ اختیار کرتے ہیں اور ہمہ وقت خدا کی یاد اور اسی کی عبادت میں مشغول رہتے ہیں اور لوگوں کو اپنے نمونۂ اخلاق اور عملی ترغیب کے ذریعے سے نیکی کی تلقین کرتے ہیں۔ ایسے لوگ اللہ والے لوگ یا اہل اللہ کہلاتے ہیں۔ دوسری قسم میں وہ لوگ شامل ہیں جو علوم حکمت مثلاً طب، حساب، ہندسہ اور منطق وغیرہ سے واقف ہوتے ہیں ایسے لوگ حکماء یا اہل عقل کہلاتے ہیں۔ تیسری قسم میں اس نے علماء یا اہل علم کو شامل کیا ہے اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو سنن نبوی کے حامل اور انبیاء کے خلفاء ہیں اور جن کی جانب لوگ حلال و حرام اور تفسیر و تاویل کے مسائل میں رجوع کرتے ہیں۔ چوتھی قسم خاندانی یا صاحب نسب لوگوں پر مشتمل ہے یہ لوگ شریف، ذی عزت اور صاحب جاہ و مرتبت ہوتے ہیں۔ ملک میں ان کی کثرت خوبی کی دلیل ہے۔ یہ لوگ واجب الاحترام ہیں اور بادشاہ کا حقیقی سازو سامان بھی یہی لوگ ہیں۔ پانچویں قسم فوجیوں یا اہل سیف کی ہے یہ لوگ سلطنت کے محافظ ہیں۔ ان ہی کے ذریعے سے ملک فتح ہوتے ہیں اور دشمن کو.... شکست دے کر یہی اس کے شر سے ملک کو محفوظ رکھتے ہیں۔ چھٹی قسم بااستطاعت یا اہل ثروت کی ہے جن میں تمام اہل حرفہ، کاریگر، پیشہ ور اور تاجر وغیرہ شامل ہیں۔ ان لوگوں کے ذریعے سے لوگوں کے کام نکلتے ہیں اور سب کی ضروریات پوری ہوتی ہیں اور ساتویں قسم میں دیہات والے یا اہل دہ شامل ہیں یہ لوگ کاشت کاری کرتے اور جانوروں کو پالتے ہیں جن سے لوگوں کی بنیادی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں ان تمام اہل اللہ، اہل عقل، اہل علم، صاحب نسب، اہل سیف، اہل ثروت اور اہل دہ سے مملکت آباد ہوتی ہے چنانچہ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان تمام لوگوں کو اپنے اپنے مشاغل میں مصروف رہنے دیا جائے تاکہ مملکت کے تمدنی امور بطریق احسن انجام پاتے رہیں اور بادشاہ ہر ایک کے ساتھ اس کے احوال کو ملحوظ رکھتے ہوئے معاملہ کرے۔

تقسیم بہ اعتبار سیرت

مملکت میں تمام لوگ اپنی سیرت و کردار کے اعتبار سے یکساں نہیں ہوتے۔ ان میں کچھ لوگ تو اعلیٰ درجہ کی سیرت کے مالک ہوتے ہیں اور کچھ کی سیرت درمیانی حیثیت کی ہوتی ہے لیکن کچھ بدکردار بھی ہوتے ہیں، اسلئے ابن ابی الربیع ان سب کے ساتھ یکساں برتاؤ کو مناسب نہیں خیال کرتا۔

(i) اس کے نزدیک اچھے لوگ برائی کو دشمن اور بھلائی کو دوست رکھتے ہیں، پوری مستعدی کے ساتھ اوامر کی اطاعت کرتے اور نواہی سے باز رہتے ہیں اور جس چیز میں مملکت کی بھلائی ہو اسی کو اختیار کرتے ہیں چنانچہ ان کا حق یہ ہے کہ ان کے ساتھ کریمانہ معاملہ کیا جائے دوسروں پر ان کو مقدم رکھا جائے اور بڑی ذمہ داریوں کے عہدے ان کے سپرد کئے جائیں اور ہر طریقے سے ان کے مدارج بلند رکھے جائیں۔

(ii) متوسط درجے کی سیرت رکھنے والوں کے بارے میں اس کا خیال ہے کہ یہ لوگ برائی اور بھلائی کی جانب برابر نسبت رکھتے ہیں، اس لئے کبھی بھلائی کی جانب مائل ہو جاتے ہیں اور کبھی برائی کی جانب۔ چنانچہ ان کا حق یہ ہے کہ ان کی برائیوں کی اصلاح کی جائے جس طرح طبیب مریض کا علاج کرتا ہے۔ اسی طرح کبھی چشم پوشی کر کے اور کبھی سزا کے ذریعے ان کی بری عادتوں کو دور کیا جائے۔

(iii) جو لوگ نہایت بدباطن اور بدکردار ہوتے ہیں ان گروہ اچھے لوگوں کی بالکل ضد خیال کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ تعلیم و

تربیت سے انہیں کوئی فائدہ نہیں پہونچ سکتا کیونکہ یہ لوگ طبعاً موذی درندوں کے مانند ہیں۔ اس لئے ان کا حق یہ ہے کہ جب ان پر سزا کا کوئی اثر نہ ہو اور ان کی اصلاح سے قطعاً مایوسی ہو جائے تو ان کو کسی دور مقام پر رہنے کا حکم دیا جائے تاکہ ان کے شر سے عام رعایا مامون رہے۔

رعایا کے بارے میں بادشاہ کی ذمہ داری

مندرجہ بالا تمام اقسام کے لوگوں کے بارے میں بادشاہ کی ذمہ داری یہ ہے کہ ان کو اپنے اپنے جائز پیشے اور کاموں میں مصروف رکھے اور کسی کو برائی میں پڑنے یا بری باتوں کو سوچنے کی مہلت ہی نہ دے اور جو پیشے لوگ ہیں ان کی بادشاہ کے معاملات میں غور و خوض کرنے سے روک دے غریبوں کی گذر اوقات کے لئے مالداروں سے ان کی حیثیت کے مطابق وصول کرے۔ سیاست میں قریب اور بعید کو مساوی رکھے۔ مظلوم کو ہرگز نہ روکے بلکہ اس کو بلا روک ٹوک اپنے پاس آنے دے اور ظالم کے مقابلہ میں اس کی دادرسی کرے۔ رعایا کی شکایات سننے اور ان کی حاجت برآری کے لئے بہ وقت مستعد رہے۔ مضبوط شہر پناہ کے ذریعہ اپنی رعایا کو بیرونی دشمنوں سے محفوظ رکھے۔ رہزنوں سے ملک کو پاک کرے اشیائے خورد و نوش کی حفاظت کا اہتمام کرے۔ رعایا کے گھروں کو چوروں سے محفوظ رکھے۔ تمام راستوں میں امن بحال رکھے اور شریروں کی بیخ کنی کرتا رہے۔

رعایا کے فرائض

سیاسی فلسفہ کا یہ وہ پہلو ہے جس کو عام مفکر نظر انداز کر دیتے ہیں لیکن بعض مفکر رعایا کو مختار مطلق اور مقتدر اعلیٰ بھی سمجھتے ہیں۔ جس سے ان کے نزدیک رعایا فرائض سے بالا ہو جاتی ہے۔ بہرکیف دونوں ہی صورتوں میں رعایا کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاتا لیکن ابن ابی الربیع نے اپنے پیش کردہ سیاسی نظام میں رعایا کے فرائض سے بھی گفتگو کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ سیاسی نظام کی اس وقت تک تکمیل نہیں ہو سکتی جب تک کہ رعایا بھی اپنے فرائض کو ادا نہ کرے۔ مختصر طور پر اس کے نزدیک رعایا کے فرائض میں یہ امور شامل ہیں کہ وہ بادشاہ کی عیب جوئی اور اس کے رازوں کی جستجو نہ کریں۔ اگر بادشاہ کسی برے کام کا قصد کرے تو نرمی سے اس کو نصیحت کرنے سے باز نہ رہیں، لیکن یہ رعایا کی ذمہ داری ہے کہ وہ مستقل طور پر اپنے بادشاہ کے افعال و اعمال کی نگرانی کرتے رہیں۔ اصل یہ نگرانی سیاسی نظام کی بہتری کی دلیل ہے۔ اگر بادشاہ کے کسی خاص شخص سے کسی کو کوئی تکلیف پہونچی ہے تو اس سے کچھ نہ کہے بلکہ بادشاہ پر اپنی تکلیف کا اظہار کرے۔ اس طرح عمال حکومت برائیوں کے ارتکاب سے باز رہیں گے، بادشاہ کی مسرتوں میں اظہار مسرت کریں اور اس کے غموں میں شریک غم رہیں اور مدد کے وقت اس کی مدد کریں۔ بادشاہ جب بلائے تو حاضر ہو جائیں اور بلا وجہ اس کی مخالفت نہ کریں الغرض مملکت کی بھلائی اسی میں ہے کہ رعایا بھی اپنے فرائض خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دے۔

۳۔ عدل

(عدل ایک ذہنی کیفیت کا نام ہے جو ہر فرد کی سیرت کا ایک لازمی جزو ہے)

مملکت کا تیسرا رکن ابن ابی الربیع کے نزدیک عدل ہے اس بارے میں اس کا قول یہ ہے کہ "عدل مخلوق کے لئے اللہ کا ایک حکم ہے۔ اس کے قابل احترام ہونے کی دلیل یہ ہے کہ تمام قوموں نے مذاہب کے اختلافات کے باوجود تمام عدل پر اتفاق کیا ہے اور کوئی ایک قوم بھی ایسی نہیں ہے جس نے انصاف قائم کرنے کی ہدایت نہ کی ہو یا اس کی فضیلت سے واقف نہ کرایا ہو۔"

عام سیاسی مفکرین کی طرح عدل کے بارے میں ابن ابی الربیع کا تخیل بہت محدود نہیں ہے یعنی وہ صرف اسی شے کو عدل قرار نہیں دیتا جسے ایک سیاسی نظام اپنی عدالتوں کے ذریعے سے نافذ کرتا ہے بلکہ اس کے نزدیک عدل ایک ذہنی کیفیت کا نام ہے جو ہر فرد کی سیرت کا ایک لازمی جزو ہوتی ہے اور اسی کیفیت کی درستی اور نادرستی پر حقیقی عدل کا انحصار ہے۔ اس طرح وہ فرد ہی کو نہیں بلکہ پورے معاشرے کو عدل کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے اور اس ذمہ داری کو مذہبی عقائد کی معرفت ادا کرنے کی تلقین کرتا ہے اس کے نزدیک عدل کے تین درجے یا تین قسمیں ہیں:۔

پہلے درجے میں وہ عدل ہے جس کی رو سے بندے اللہ تعالیٰ کے حقوق ادا کرتے ہیں یعنی وہ تمام فرائض اور واجبات جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے مقرر فرمائے ہیں ان کو ادا کرتے ہیں، صرف اللہ کے لئے قربانیاں ادا کرتے ہیں، سجدہ کو ادا کرتے ہیں، نوافل کا اہتمام کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ آدمی اگر دیانت داری کے ساتھ غور کرے تو فی الواقع وہ ابن ابی الربیع کے اس خیال سے اتفاق کریگا کہ انسان پر سب سے پہلا حق اپنے پیدا کرنے والے کا ہے اس لئے حقیقی انصاف کا تقاضہ یہی ہے کہ بندہ سب سے پہلے اپنے خدا کا حق ادا کرے اور جو بندہ اس حق کو ادا نہیں کرتا اس سے پھر زندگی میں کسی بھی قسم کے انصاف کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

عدل کی دوسری قسم وہ ہے جس کی رو سے انسان ایک دوسرے کے حقوق کی حفاظت کرنے میں امداد و تعاون جس کی بنیاد بر خود معاشرہ قائم ہوتا ہے، عام کر دیتے ہیں۔ مثلاً اگر کچھ لوگ ان کے معاشرے میں تہی دست ہیں اور کسی وجہ سے وہ خود اپنی ضرورت پوری نہیں کر سکتے ہیں تو اپنے مال میں سے بلا تامل ان کو قرض دیں اور انہیں کھانے کمانے کے قابل بنائیں یا یہ کہ معاشرے کی جانب سے جو امانتیں یا جو ذمہ داریاں لوگوں کے سپرد کی جائیں وہ ان امانتوں کا پورا پورا حق ادا کریں اور اگر معاشرے کے کچھ لوگ یتیموں، بیواؤں اور اپنے اموال کی خود حفاظت نہ کر سکیں اور انہیں بطور امانت دوسروں کے سپرد کر دیں تو ان کی وہ تمام اشیاء واپس کی جائیں، کچھ لوگوں میں جب تنازعہ یا مناقشہ کی نوبت پیش آئے تو جاننے والے بالکل سچی گواہی دیں اور معاشرے کے تمام لوگ نیک کاموں کی جانب سبقت کریں۔

عدل کی یہ صورت دراصل معاشرے کے قیام اور بقا کی ضامن ہے۔ معاشرے کے ساتھ سب سے بڑا انصاف یہی ہے کہ گردش کے کچھ انسان معاشی جد و جہد میں ناکام ہو کر افلاس اور تنگدستی کا شکار ہو گئے ہیں تو ان کے لئے کوئی معقول اور باعزت سہارا فراہم کیا جائے تاکہ ان کے لئے کوئی معقول اور باعزت سہارا فراہم کیا تاکہ ان کی معاشی زندگی پھر استوار ہو سکے اور وہ جرائم یا بغاوت یا مایوسی کی دلدل میں نہ جا پڑیں اور اس طرح پورے معاشرے ہی کو خرابیوں میں مبتلا نہ کر دیں چنانچہ ابن ابی الربیع کی یہ تجویز کہ ان کو قرض دے کر پھر سنبھلنے کا موقع دیا جائے معاشرتی انصاف کی بڑی کارگر صورت ہے۔ پھر معاشرے کی بقا اس امر سے وابستہ ہے کہ اجتماعی ذمہ داریاں یا عہدے اور مناصب جو فی الحقیقت معاشرے کی امانتوں کی حیثیت رکھتے ہیں، شرط انصاف یہ ہے کہ ان کا پورا حق ادا کیا جائے اور کسی قسم کی بھی کوتاہی کو اس میں ہرگز روا نہ رکھا جائے۔ تاکہ معاشرہ شکست اور انتشار سے محفوظ رہ سکے۔ انفرادی امانتوں کا واپس کرنا بھی اسی لئے ضروری ہے کہ وہ قرین انصاف ہے اور اس سے بھی معاشرتی زندگی میں استحکام پیدا ہوتا ہے پھر اختلاف اور کشمکش کی صورت میں سچی گواہی کے بغیر انصاف کا قیام غیر ممکن ہے اس لئے ابن ابی الربیع اس کو بھی عدل کے لئے ایک ضروری فریضہ قرار دیتا ہے اور سب سے آخر میں تو وہ اجتماعی عدل کے تصور کو اس قدر وسیع کر دیتا ہے جہاں وہ نیکی کے ہم معنی بن جاتا ہے یعنی جو انسان نیکی اختیار نہیں کرتا وہ عدل کی شرائط پورے نہیں کرتا یا بہ الفاظ دیگر بدی اور ظلم اس کے نزدیک

ہم معنی ہیں[1]۔ اس پوری بحث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عدل کے اس تصور میں وہ چیز قطعاً شامل ہے جس کو ایک مملکت اپنی عدالتوں کے ذریعے نافذ کرتی ہے لیکن اس کے علاوہ انسان کی پوری اخلاقی زندگی بھی اس تصور کی رو سے عدل اور انصاف کی زندگی بن جاتی ہے۔

عدل کی تیسری قسم وہ ہے جس کی رو سے لوگ اپنے اسلاف کے حقوق کی حفاظت کرتے ہیں۔ غور سے دیکھا جائے تو انسان کی زندگی اور اس کے بیشتر اسباب زندگی کی فراہمی میں اس کے اسلاف کی کوششوں اور خدمتوں کا بہت بڑا دخل ہوتا ہے۔ اس لئے ہر نسل پر اس کے اسلاف کا بھی کچھ نہ کچھ حق فرض ہوتا ہے اور انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ جن کی کوششوں کے نتیجے میں ہمیں مہذب اور متمدن زندگی میسر آتی ہے ان کا بھی حق ادا کیا جائے۔ چنانچہ ابن ابی الربیع نے اپنے فلسفۂ عدل میں اس امر کا اہتمام کیا ہے۔ کہ اسلاف کے حقوق ادا کئے جائیں اور ان کی ادائیگی کی یہ صورت ہو کہ ان کی میتوں کی تجہیز اور تکفین کی جائے اور ان کی قبروں میں انہیں راحت فراہم کی جائے ان کے ذمے اگر کچھ قرضے ہوں تو ان کو ادا کر دیا جائے تاکہ ان کی روح اس بوجھ سے اور ان کا نام اس آلودگی سے پاک ہو جائے۔ ان کے یتیم بچوں کی تربیت اور تعلیم کا معقول انتظام کیا جائے اور ان کی جانب سے خیر خیرات کی جائے تاکہ انہیں ابدی سکون حاصل ہو۔

عدل کی اقسام بیان کرنے کے بعد ابن ابی الربیع اُن امور کو بھی بیان کرتا ہے جو ایک عادل کیلئے ضروری ہیں چنانچہ اس کے خیال میں وہ امور یہ ہیں :-

۱:- وفادار اور امانت دار ہو۔

۲- رحم دل ہو اور عیوب سے پاک ہے۔

۳- اپنے وعدوں کو یاد رکھے اور ان کو پورا کرے۔

۴- ہر معاملے میں سچا ہے۔

۵- عدل کے لئے جو طریقے مقرر ہیں ان کے خلاف نہ کرے۔

۶- ہر چیز کو اس کے حق اور صحیح مصرف پر پہنچا دے۔

عدل و انصاف کا وہ پہلو جسے مملکت کی عدالتیں جاری و نافذ کرتی ہیں اس کی اہمیت پر بھی ابن ابی الربیع بہت زور دیتا ہے اور اس کے قیام کی سفارش کرتا ہے۔ اس کے خیال میں مملکت کی بقا کے لئے بھی نظامِ عدل کا قیام نہایت ضروری ہے کیونکہ یہی وہ حقیقی روح ہے جس کے سہارے مملکت زندہ رہتی ہے۔ نیز وہ یہ سمجھتا ہے کہ مملکت میں انصاف کی وجہ سے امن اور نظم قائم رہتا ہے اور اگر انصاف ہی باقی نہ رہے تو مملکت میں فساد برپا ہو جاتا ہے۔ انصاف کا قیام احکام شریعت کے مطابق کیا جانا چاہئے اور جو سزائیں

---

[1] سقراط کے نزدیک خیر علم ہے اور شر جہل۔ یعنی جو شخص علم حاصل کرتا ہے وہ صاحبِ خیر ہے اور جو جاہل رہ جاتا ہے وہ مجسم شر اور برائی ہے۔ ابن ابی الربیع اپنی فکری گہرائی اور حقیقت پسندی میں یہاں سقراط سے آگے بڑھ گیا ہے اور وہ اس طرح کہ زندگی کے حقائق اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ اہل علم سے بھی برائیاں سرزد ہوتی ہیں اور بسا اوقات جاہل بھی نیکی کر گذرتے ہیں لیکن جو شخص ظلم کرتا ہے وہ یقیناً برا کام کرتا ہے اور کسی بھی مرحلے پر جا کر ظلم کو بدی سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ یعنی ظلم ایک برائی ہے اور ہر حالت میں اس کو برائی ہی سے تعبیر کیا جائے گا اور یہ صورت بعینہٖ جہل سے منسوب نہیں کی جا سکتی۔ البتہ افلاطون کے تعریف عدل ایک اخلاقی صفت ہے اور اسی صفت پر سیاست کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔

شریعت نے مقرر کی ہیں ان کو جاری ہونا چاہئے۔ اس سلسلے میں اس نے انصاف کرنے کے اصول اور قواعد بھی بیان کئے ہیں اور محکمہ انصاف کے حکام اور فیصلے کرنے والے قاضیوں کے اوصاف بھی تفصیل سے بتاتے ہیں۔ تاکہ انصاف کے پورے مرحلے میں کہیں کوئی نقص باقی نہ رہ جائے۔

۴ - تدبیر

(خوش تدبیری اور صائب رائے سے مملکت آباد اور خوش حال رہتی ہے، اس کو قوت اور استحکام حاصل ہوتا ہے اور اس کا نظم و نسق بھی ٹھیک رہتا ہے)

مملکت کا چوتھا رکن تدبیر ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو خوش تدبیری اور صائب رائے سے مملکت آباد اور خوش حال رہتی ہے اس کو قوت اور استحکام حاصل ہوتا ہے اور اس کا نظم و نسق بھی ٹھیک رہتا ہے اور اگر بے تدبیری اختیار کر لی جائے یا غلط تدابیر کی پیروی کی جانے لگے تو پھر مملکت زیادہ عرصے تک قائم نہیں رہتی۔ یہی وجہ ہے کہ ابن ابی الربیع تدبیر کو بھی مملکت کا ایک رکن قرار دیتا ہے اس کے خیال میں مملکت میں چار امور کی تدبیر بنیادی اہمیت کی حامل ہے، اول مملکت کو آباد رکھنے کے بارے میں، دوم رعایا کی حفاظت کی خاطر، سوم فوج کی تنظیم کے سلسلے میں اور چہارم مالی حالت کی درستگی کے لئے۔

(۱) مملکت کی آبادی

تدابیر مملکت میں سب سے پہلی تدبیر یہی ہے کہ مملکت کو زیادہ سے زیادہ آباد اور خوش حال رکھنے کی فکر کی جائے۔ لیکن چونکہ مملکت کی آبادی دو حصوں میں منقسم ہوتی ہے اس لئے ان دونوں حصوں کے لئے علیحدہ علیحدہ تدابیر اختیار کی جاتیں۔ آبادی کا ایک حصہ دیہات پر مشتمل ہوتا ہے جہاں کھیتی باڑی کی جاتی ہے اور لوگوں کی ضرورت کی اشیاء فراہم کی جاتی ہیں۔ مملکت کے لئے دیہات کا وجود ناگزیر ہے اور بادشاہ کے ذمے ان کے تین حقوق ہیں، اول یہ کہ احکام شریعت کے مطابق محصول مقرر کرے تاکہ کاشتکاروں پر ظلم و زیادتی نہ ہونے پائے اور وہ اطمینان کے ساتھ اپنے کام میں مصروف رہیں۔ دوم یہ کہ کاشتکاروں کو تکلیف نہ ہونے دے تاکہ وہ زراعت کو چھوڑ کر کسی دوسرے کام میں مصروف نہ ہو جائیں اور سوم یہ کہ دیہات میں پانی کا معقول انتظام کیا جائے تاکہ اہل زراعت کو دقتیں نہ اٹھانی پڑیں۔ بادشاہ ان حقوق میں سے کسی ایک کی بھی ادائیگی میں کوتاہی کرے یا کسی اور طریقے سے ان پر ظلم و زیادتی کر بیٹھے تو اس کے نتائج انتہائی سنگین برآمد ہوں گے اور مملکت ہرگز آباد اور خوش حال نہ ہو سکے گی۔

آبادی کا دوسرا حصہ شہروں میں رہتا ہے یہ شہر آبادی کے بڑے بڑے اجتماعات پر مشتمل ہوتے ہیں۔ جہاں لوگ مل جل کر رہتے ہیں اور تمدن کی خدمت کرتے ہیں۔ بادشاہ کو شہروں کے بارے میں جن امور کو ملحوظ رکھنا چاہئے وہ یہ ہیں کہ شہر کے لوگ راحت و سکون کی خاطر وطن بناتے ہیں اس لئے انہیں سکون حاصل رہنا چاہئے۔ ان کے مال و متاع کی اچھی طرح حفاظت ہونی چاہئے۔ اور ان کی عورتوں کی پردہ داری باقی رہنی چاہئے۔ اہل شہر کے لئے ضروری اشیاء کی فراہمی کا بھی معقول انتظام ہونا چاہئے اور اس امر کی بھی دیکھ بھال رکھنی چاہئے کہ جائز پیشے اختیار کرنے میں کوئی معترض نہ ہو۔ اگر شہروں میں ان میں سے ایک بھی چیز معدوم ہو تو پھر وہ رہنے کا مقام نہیں رہیگا اور اس کی آبادی اور رونق گھٹنے لگے گی۔

بادشاہ اگر کوئی نیا شہر بسانا چاہے تو اس صورت میں بھی چند امور کو ملحوظ رکھنا انتہائی ضروری ہے مثلاً وہاں میٹھا پانی

وافر مقدار میں موجود ہو اور کھانے پینے کا سامان بہ آسانی دستیاب ہوسکتا ہو مقام معتدل ہو اور آب و ہوا اچھی ہو۔ چراگاہیں قریب ہوں۔ مکانات خوف و خطرات سے محفوظ ہوں اور اطراف میں کھلے میدان ہوں۔

(۲) رعایا کا تحفظ

رعایا اللہ کی امانت ہے جس کی حفاظت اور نگہبانی خداوند عالم نے بادشاہ کے سپرد کی ہے، اس لئے بادشاہ پر واجب ہے کہ وہ اس امانت کا پورا پورا حق ادا کرے اور رعایا کی حفاظت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھے۔ (اس کی تفاصیل پہلے بیان ہو چکی)

(۳) فوج کی تنظیم

بیرونی خطرات سے مملکت کا دفاع افواج ہی کے ذریعے سے کیا جاتا ہے اور انہیں کے ذریعے سے ممالک فتح کئے جاتے ہیں، اس لئے ضروری ہے کہ فوج کو اچھی طرح منظم کیا جائے اور ٹھیک طور پر ان کی نگہداشت کی جائے، فوج کا سالار ایسے شخص کو مقرر کیا جائے جو ایماندار، عقلمند، کارگزار اور فنونِ جنگ سے بخوبی واقف ہو۔ اسی کے ساتھ ساتھ اطاعت شعار اور رازوں کی حفاظت کرنے والا ہو اور بادشاہ کو نیک نصیحت کرتا ہو۔

فوج میں ایسے لوگ نہ رکھے جائیں جو کاہل اور آرام پسند ہوں فوجوں کو ہر وقت سخت کوشی، محنت اور گھوڑے کی سواری میں مصروف رکھا جائے اور ان کی پوری طرح نگرانی کی جائے ان کی تنخواہیں معقول ہوں تاکہ دلجمعی کے ساتھ کام کریں، فوج کا ہر سپاہی تیز فہم اور زود فہم ہو، بہادر اور جنگجو ہو اور ہر وقت بادشاہ کی اطاعت پر کمربستہ رہے۔

بادشاہ ہر ماہ خود فوج کا معائنہ کرے اور اس کی تعداد قابل اطمینان حد تک بڑھائے۔ ذی مرتبہ اور فنونِ جنگ سے واقف لوگوں کو فوجی سرداریاں عطا کرے۔ فوج کی تنظیم اس طور سے کرے کہ ہر دس سپاہیوں پر ایک افسر ہو اور ایسے دس افسروں پر ایک رئیس مامور ہو اور اس طرح یہ سلسلہ سپاہ سالار تک پہونچ جائے۔ فوجیوں کی جملہ ضروریات کا کفیل رہے تاکہ انہیں شکایات کا موقع نہ ملے ورنہ ان تین خرابیوں میں سے ایک خرابی لازماً پیدا ہوگی۔ یہ کہ وہ رعایا پر مسلط ہو جائیں گے یا جو ان کو کافی تنخواہ دے گا اس کے پاس منتقل ہو جائیں گے یا پھر کسی کاروبار میں مشغول ہو جائیں گے۔ اس طرح ضرورت کے وقت وہ کسی کام نہ آسکیں گے۔

(۴) مالی حالت کی درستگی

مملکت کا نظام بغیر مال کے نہیں چلتا اس لئے ضروری ہے کہ مملکت کی مالی حالت کو درست اور مستحکم رکھا جائے تاکہ نظام میں خرابی واقع نہ ہو۔ مالی حالت کے استحکام کا ایک پہلو یہ ہے کہ آمدنی کے ذرائع متعین ہوں۔ یعنی شریعت نے جو طریقے متعین کر دئے ہیں ان کو نافذ کیا جائے اور ان کی بالکل خلاف ورزی نہ کی جائے۔ نیز منصف مزاج اور نیک نفس حکام نے جو ذرائع آمدنی پہلے سے مقرر کر دئے ہیں ان کو ختم نہ کیا جائے۔ اس طرح مملکت کی آمدنی کی ایک حیثیت متعین ہو جائے گی پھر مالیاتی استحکام کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ مصارف کا بھی تعین کیا جائے یعنی جن امور میں خرچ کرنا جائز اور ضروری ہے وہاں خرچ کیا جائے پھر اس کے بعد جو آمدنی بچ رہے اس کو عام بھلائی کے کاموں میں صرف کیا جائے اس طرح آمدنی اور خرچ میں جو نسبت قائم ہوگی اس کی تین نوعیتیں ہوں گی۔ پہلی یہ کہ آمدنی خرچ سے زیادہ ہوگی۔ جس مملکت میں یہ صورت قائم ہوگی وہ مملکت بہتر ہے اور اس کی تدبیر درست ہے کیونکہ اس طرح

جو آمدنی بچ رہے گی وہ ضرورت کے وقت کام آئے گی۔ دوسری نوعیت یہ کہ آمدنی خرچ سے کم ہوگی جہاں یہ صورت ہو وہ مملکت اور اس کی تدبیر خراب ہے اور مشکلات کے وقت میں وہ تباہی کا شکار ہو جاتے گی۔ تیسری نوعیت یہ ہے کہ آمدنی اور خرچ دونوں برابر ہوں گے جہاں یہ صورت ہوگی وہ مملکت امن کے زمانے میں اچھی حالت میں رہے گی۔ لیکن مصیبت کے وقت اس کی حالت خراب ہو جاتے گی۔ اس لئے ہوشمند اور مدبر بادشاہ کو اس معاملے میں بڑی احتیاط کے ساتھ قدم اٹھانا چاہئے۔

ارکانِ مملکت کی اس پوری بحث میں ابن ابی الربیع نے اصول اور فنِ حکمرانی کا پوری تفصیل اور بڑی گہرائی کے ساتھ جائزہ لیا ہے اور کارپردازانِ عالم کے لئے بہترین تجاویز پیش کی ہیں اپنی اس بحث میں اس نے سیاست کے جو اصول متعین کئے ہیں ان تمام کی بنیاد اخلاق پر رکھی ہے اور اس طریقے میں وہ اتنا پختہ اور مستحکم ہے کہ میدانِ جنگ میں بھی بداخلاقی کو کسی حیثیت سے روا نہیں رکھتا سیاسی مفکرین میں اس کو جو امتیاز حاصل ہے وہ درحقیقت یہی ہے اور اسی سے اس کی عظمت کا صحیح اندازہ بھی ہوتا ہے۔

ارکانِ مملکت کی بحث کے علاوہ، کاروبارِ حکومت چلانے کے لئے بادشاہ کو جن عمال اور کارکنوں کی ضرورت ہوتی ہے ——— ابن ابی الربیع نے ان کی بھی ایک فہرست مرتب کی ہے اور اس میں عالم وزیر، دانا معتمد، عاقل چوبدار، نیک افسر مال، پرہیزگار قاضی، منصف حاکم، ذہین تحصیلدار، مستعد کوتوال، بہادر لشکر، حاذق طبیب، نیک نفس مصاحب، حتیٰ کہ باورچی تک شامل ہے۔ پھر اس نے ان میں سے ہر ایک عہدیدار کے اوصاف اور ان کے فرائض اور ذمہ داریوں تک کی تفاصیل اور ان کے انتخاب کے طریقے بھی بتاتے ہیں۔ اس طرح فنِ حکومت پر ایک بہترین تصنیف آنے والی نسلوں کے لئے فراہم کر دی ہے جو تاریخ سیاسیات میں اس موضوع پر سب سے پہلی تصنیف ہے۔

محمد خان (جھنگ صدر)

اقبال کا فارسی کلام

حکیم الامت ڈاکٹر محمد اقبال کا کلام دو زبانوں میں ملتا ہے فارسی اور اردو۔ فارسی کلام اردو کلام کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے ان کا پورا کلام گیارہ مجموعوں کی صورت میں شائع ہوا ہے جن میں سات مجموعے فارسی کلام کے ہیں، تین اردو کلام کے اور ایک مجموعہ ایسا ہے جس میں فارسی اور اردو دونوں قسم کا کلام موجود ہے اس مجموعے کا نام ارمغان حجاز ہے۔ گویا ان کا دو تہائی سے زیادہ کلام فارسی ہے اور ایک تہائی سے کم اردو۔ ان کے اردو مجموعوں میں بھی فارسی اشعار کثرت سے مل جاتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا ذہن فارسی کی طرف زیادہ مائل تھا۔ ایک شعر میں وہ خود اپنی زبان شعری شیرازی بتاتے ہیں ؎

تنم گلے ز خیابانِ جنت کشمیر ——— دل از حریم حجاز و نوا ز شیراز است

اتفاق سے اقبال کو بچپن ہی میں فارسی شعر و ادب کے مطالعے کا موقع مل گیا۔ انہوں نے مرے کالج سیالکوٹ سے ایف۔ اے کیا، اُس زمانے میں فارسی کا نصاب کچھ اس قسم کا ہوتا تھا کہ اس میں شعر و شاعری اور ادب لطیف کی کثرت ہوتی تھی۔ نثر کی کتابیں بھی اشعار سے خالی نہ ہوتی تھیں ہر طالب علم میں اردو ذوق شعری پیدا ہو جاتا تھا۔ پھر ان کو مولوی میر حسن جیسا فاضل استاد مل گیا۔ جس کی صحبت نے ان کی خوابیدہ قوتوں کو بیدار کر دیا اور ان کے ذوق شعری کو جلا بخشی۔ اقبال ایک طبع بلند اور ذہن رسا لے کر آئے تھے اس لئے جلد ہی منازل شاعری طے کر گئے۔

ڈاکٹر اقبال نے اردو زبان چھوڑ کر فارسی میں شعر گوئی کیوں کی؟ اس کا جواب بالکل سہل اور آسان ہے وہ خود "اسرارِ خودی" میں اس کا جواب دیتے ہیں ؎

گرچہ ہندی در عذوبت شکر است ——— طرزِ گفتارِ دری شیریں تر است
فکرِ من از جلوہ اش مسحور گشت ——— خامۂ من شاخِ نخلِ طور گشت

پارسی از رفعتِ اندیشہ ام ——— در خورد با فطرتِ اندیشہ ام

یعنی گو اردو زبان میں بھی شیرینی اور مٹھاس ہے لیکن فارسی زبان اس سے شیریں تر ہے۔ نیز اردو کا ظرف تنگ اور محدود ہے، مجھے اپنی وسعتِ بیاں کے لئے فارسی کا سہارا لینا ناگزیر ہے، یہ مختصر مگر جامع جواب ہے جو انہوں نے مندرجہ بالا تین اشعار میں دیا ہے۔ اس کے بعد مزید بحث و تمحیص میں جانا تضیعِ اوقات سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اقبال نے دیگر شعرا کی طرح اپنے آپ کو کبھی شاعر نہیں کہا اور نہ خود کو شاعر سمجھا ہے، سید سلیمان ندوی کو ایک خط میں لکھتے ہیں "میں نے کبھی اپنے آپ کو شاعر نہیں سمجھا، اس واسطے کوئی میرا رقیب نہیں اور نہ میں کسی کو اپنا رقیب سمجھتا ہوں فن شاعری سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی ہاں بعض مقاصد خاص رکھتا ہوں جن کے بیان کے لئے اس ملک کے حالات و روایات کی رو

سے میں نے نظم کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ دوسرا ہے

نہ بینی خیر از آں مردِ فرودست ۔۔۔ کہ برمن تہمت شعر و سخن بست

یہ تو تھا ایک خط کا حوالہ، اب ان کے یہ اشعار بھی دیکھئے ہے

نغمہ کجا و من کجا سازِ سخن بہانہ ایست ۔۔۔ سوئے قطار می کشم ناقہ بے زمام را

نہ شیخ شہر نہ شاعر نہ خرقہ پوش اقبال ۔۔۔ فقیر راہ نشین است و دل غنی دارد

"اسرارِ خودی" کے دیباچہ میں لکھتے ہیں ہے

شاعری زیں مثنوی مقصود نیست ۔۔۔ بُت پرستی بُت گری مقصود نیست

آنچہ گفتم از جہانے دیگر است ۔۔۔ ایں کتاب از آسمانے دیگر است

اس انکار کی وجہ یہ ہے کہ وہ شاعر اور شاعری کا مقام بہت بلند سمجھتے تھے۔ وہ شاعر کو سینۂ ملت میں دل کی شکل تصور کرتے ہیں وہ شیلے کے اس خیال سے متفق تھے کہ "اخلاقیات کی بنیادیں واعظوں کے ہاتھ نہیں شاعروں کے ہاتھوں رکھی جاتی ہیں" یہی وجہ ہے کہ وہ شاعری کو وارثِ پیغمبری بتاتے ہیں۔

شاعری ہم وارثِ پیغمبری است

مختصر یہ کہ ان کی شاعری مقصدیت سے لبریز تھی۔ بعض خاص مقاصد کو پیش نظر رکھ کر انہوں نے شعر گوئی کا آغاز کیا۔ ان مقاصد میں سے دینی مقصد "سوئے قطار می کشم ناقہ بے زمام را" تھا یعنی بھولی بھٹکی قوم کو راہ راست پر لانا یا دوسرے لفظوں میں اصلاح ملت مقصود تھی محض تفریح طبع اور تفنن کے لئے شعر کہنا ان کا مطمح نظر نہ تھا۔ وہ مصلح قوم کی حیثیت سے شاعری کرتے رہے اس لئے ان کا نام قیامت تک صفحۂ ہستی سے نہیں مٹ سکتا۔

جب اقبال نے شعر و شاعری کا آغاز کیا تو اس وقت قوم کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ اس حالت کا نقشہ انہوں نے ایک خط میں یوں کھینچا ہے: "علماء میں مداہنت آگئی ہے یہ گروہ حق کہنے سے ڈرتا ہے۔ صوفیا اسلام سے بے پروا اور حکام کے تصرف میں ہیں۔ اخبار نویس اور آج کل کے تعلیم یافتہ لیڈر خود غرض ہیں اور ذاتی منفعت و عزت کے سوا کوئی مقصد ان کی زندگی کا نہیں ہے عوام میں جذبہ موجود ہے مگر ان کا کوئی بے غرض رہنما نہیں ہے"۔ اقبال کو یہ صورت حال ناپسند تھی اور وہ اس کی اصلاح کرنا چاہتے تھے، یہ اصلاح کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس کے لئے طویل وقت اور انتھک محنت درکار تھی۔ انہوں نے جب تاریخ کا مطالعہ کیا اور مسلمانوں کا روشن ماضی ان کی نظر سے گذرا تو وہ ششدر رہ گئے اور یہ سوچنے لگے کہ اب مسلمان کیوں محکوم و مظلوم بن کر رہ گیا ہے۔ اس پستی کے وجوہ اور اسباب کیا ہیں؟ آخر ان کو معلوم ہو گیا کہ ایمان کی کمزوری، مومنانہ خصائل کا فقدان اور قرآن سے بیزاری نے مسلمانوں کو ذلت و پستی میں مبتلا کر دیا ہے ورنہ قرآن کا یہ فرمان برحق ہے کہ انتم الاعلون ان کنتم مومنین یعنی ایمان والے لوگ کبھی ذلیل و رسوا نہ ہوں گے وہ ہمیشہ ہی غالب رہیں گے بشرطیکہ دولت ایمان کو کسی صورت میں بھی ہاتھ سے نہ جانے دیں شکم پرستی اور خود فروشی ایسے منافقانہ خصائل مسلمان کے شایانِ شان نہیں۔ دین فراموشی مسلمان کا وطیرہ نہیں۔ لیکن اس وقت کا ہندی مسلم خود فروشی، پیٹ کی پوجا اور دین فراموشی میں بلا خوف و خطر مصروف تھا ہے

مسلم ہندی شکم را بندہ ۔۔۔ خود فروش و دل ز دیں برکندہ

اقبال نے جب اپنی قوم کو کھوئی ہوئی عظمت یاد دلائی اور حالیہ پستی کا سبب پوچھا تو وہ کہنے لگی کہ یہ سب کچھ گردشِ دوراں کی کارستانی

ہے ، زمانہ سدا ایک سا نہیں رہتا حالات ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں اس نیلگوں فلک نے ہمارے عروج کو پستی میں بدل دیا ہے اس میں ہمارا کچھ قصور نہیں ۔ اقبال کے فہم سلیم نے یہ جواب شکن کر گرے لوکا اور واضح الفاظ میں بتا دیا کہ گردش دوراں کا شکوہ بالکل بے جا ہے اصل وجہ پستی کی "مہجوری" قرآن ہے ۔

خوار از مہجوری قرآں شدی		شکوہ سنج گردش دوراں شدی

اقبال لا الٰہ کی مشکلات کو جانتے تھے اس لئے جب وہ مسلمان ہونے کا دم بھرتے تو لرزہ براندام ہو جاتے تھے ؎

چو می گویم مسلمانم بلرزم		کہ دانم مشکلات لا الٰہ را

اقبال کی شاعری بجا طور پر قومی شاعری ہے اور وہ یقیناً ہمارے قومی و ملی شاعر ہیں ۔ انہوں نے اپنے کلام سے پیمبری کا کام لیا ہے ، یہ ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے ۔ ان کا کلام دیکھ کر ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ

از خمستانِ کہن جامِ شراب آوردہ		نغمۂ داؤد از تارِ رباب آوردۂ

اے حکیم روحِ ملت از دواتِ فلسفہ		دینِ ابراہیم را عہدِ شباب آوردۂ

ایک خط میں لکھتے ہیں : "میرے زیرِ نظر حقائق اخلاقی و ملی ہیں ۔ زبان میرے لئے ثانوی حیثیت رکھتی ہے بلکہ فنِ شعر سے بھی میں بحیثیت فن کے نابلد ہوں ۔" یہ جملہ اس بات کی واضح شہادت دیتے ہیں کہ وہ اصلاحِ ملت کے جذبہ سے سرشار تھے محض شہرت کے لئے طبع آزمائی نہیں کرتے تھے ۔

اقبال کا فارسی کلام بہت وسیع ہے راقم السطور کے لئے ان کے پورے فارسی کلام پر تبصرہ کرنا نہ صرف مشکل بلکہ محال ہے یہ تو گویا ایک وسیع و عریض بحر ہے جس کے تمام گوہروں کو پرکھنا میرے بس کی بات نہیں اس کے علاوہ میں فارسی داں نہیں ۔ فارسی خواں ہوں ۔ ہیچمداں ہوں ، فارسی شعر و ادب سے پوری طرح شناسا نہیں اس لئے چند سطحی باتیں عرض کروں گا ۔ قارئین کرام اور محترم نقاد حضرات سے گذارش ہے کہ وہ میری اس کوتاہی پر برہم ہونے کے بجائے صبر و سکون سے کام لیں ۔

یوں تو اقبال نے غالب ، بیدل ، فردوسی ، سنائی ، قاآنی ، فارابی ، حافظ ، رومی اور سعدی سب سے استفادہ کیا ہے لیکن وہ حافظ کے بڑے شائق تھے ۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ جب میں حافظ کے رنگ میں ہوتا ہوں تو ان کی اسپرٹ مجھ میں آ جاتی ہے ۔ حافظ فارسی کے مشہور غزل گو شاعر ہیں ۔ آہنگ تغزل[1] میں اقبال اُن سے بہت متاثر ہوئے ہیں اور ان کے متعلق کئی اشعار کہے ہیں ، رومی اقبال کے روحانی مرشد تھے ۔ اقبال کو ان سے بڑی گہری عقیدت تھی اس لئے جا بجا ان کی مدح کرتے ہیں مثلاً

پیرِ رومی مرشدِ روشن ضمیر		کاروانِ عشق و مستی را امیر

منزلش برتر ز ماہ و آفتاب		خیمہ را از کہکشاں سازد طناب

نورِ قرآں درمیانِ سینہ اش		جامِ جم شرمندہ از آئینہ اش

مولانا روم کی مثنوی جس کے متعلق جامی نے کہا ہے کہ یہ فارسی زبان میں قرآن ہے ؎

مثنوی مولوی معنوی		ہست قرآں در زبانِ پہلوی

اقبال کے کلام کا سرچشمہ ہے ، اقبال کا عالمگیر پیغام جو نظریہ خودی کے نام سے موسوم ہے رومی ہی کا مرہونِ منت ہے اس کا اظہار اقبال نے بڑی فراخدلی سے کیا ہے ؎

نقطۂ نورے کہ نام او خودیست		خاکِ ما پر از شرارِ زندگیست

[1] مگر حافظ نے باوجود شاہد و باشی رنگ کو جس پیرایہ میں نظم کیا ہے ، اس فکر و آہنگ کے علامہ اقبال مخالف تھے (م ۔ ق)

بیا کہ من ز خمِ پیرِ روم آوردم مئے سخن کہ جواں تر ز بادہ عنبی است

اس سلسلے میں ایک انگریزی اقتباس بھی ملاحظہ فرمائیے ۔

"I claim that the philosophy of ASRAR is direct development out of the experience and speculation of old Muslim Sufis and thinkers"

یعنی فلسفہ خودی میں نے پرانے صوفیا اور مفکرین اسلام کے افکار سے حاصل کیا ہے۔ اس تصریح کے بعد یہ کہنا کہ وہ نطشے، فکٹے، کانٹ، برگسان اور ہیگل سے متاثر ہیں اور ان کے افکار سے خوشہ چینی کر کے نظریات قائم کرتے ہیں کسی طرح قرین انصاف نہیں۔ دراصل مذکورہ بالا مغربی مفکرین نے تو ہمارے مسلم فلاسفروں شلاً بو علی سینا، امام غزالی، خواجہ نصیر الدین طوسی، امام فخر الدین رازی اور جلال الدین رومی سے استفادہ کیا ہے جس کا وہ خود بھی اعتراف کرتے ہیں۔

فلسفۂ خودی کیا ہے؟ اس کے متعلق مختصر عرض کئے دیتا ہوں۔ خودی سے مراد غرور اور تکبر نہیں بلکہ عرفانِ نفس اور خود شناسی ہے ۔ قرآن پاک میں حق تعالیٰ فرماتا ہے "مومنوں کے لئے روئے زمین پر میری عظمت اور وحدانیت کی بے شمار نشانیاں ہیں اور یہ نشانیاں خود انسان کے وجود میں بھی کثرت سے موجود ہیں۔ کیا یہ اندھا ان پر غور نہیں کرتا؟" گویا ہماری زندگی کا مقصد اپنی ذات کو پہچاننا اور دنیا میں اپنے مقام اور منصب کا ادراک کرنا بھی ہے۔ انسان نائبِ حق ہے۔ نیابت کا منصب بڑا بلند ہے، اشرف المخلوقات ہونا اس کی بزرگی کی دلیل ہے اتنی عظمت کے باوجود احساسِ کمتری کا شکار ہونا کسی طرح بھی اچھا نہیں۔ اقبال چاہتے ہیں کہ انسان اپنی عظمت و حقیقت کو سمجھے اپنی ذات سے دلچسپی لے اور اسے اپنے میلانِ ارتقا سے عشق ہو۔

ع ہست معشوقے نہاں اندر دلت

پھر اس نورِ معرفت میں حق تعالیٰ کی ذات و صفات کا نظارہ کرے۔ "اسرارِ خودی" میں بڑے لطیف پیرائے میں خود شناسی کی تلقین کرتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

تا کجا خود را شماری از رہین از گلِ خود شعلۂ طور آفریں
مثلِ حیواں خوردن آسودن چہ سود! گر بخود محکم نۂ بودن چہ سود
خویش را چوں از خودی محکم کنی تو اگر خواہی جہاں برہم کنی
گر فنا خواہی ز خود آزاد شو گر بقا خواہی بخود آباد شو

اے ز آدابِ امانت بے خبر از دو عالم خویش را بہتر شمر
اندکے اندر حرائے دل نشیں ترکِ خود کن سوئے حق ہجرت گزیں
محکم از حق شو سوئے خود گام زن لات و عزائے ہوس را سر شکن

اقبال کے والد ماجد شیخ نور محمد ایک صوفی منش بزرگ تھے۔ اقبال کو بھی قدرتی طور پر تصوف سے لگاؤ تھا لیکن وہ "اخلاص فی العمل" کو تصوف سمجھتے تھے ان کے یہاں درویشی تعطل اور بے عملی کا نام نہیں، ذاتی استغنا اور آزادیٔ ضمیر کا نام ہے۔ وہ تصوف کو فلسفہ بنانے کے مخالف ہیں یہی وجہ ہے کہ جب صوفی نظامِ عالم کے حقائق اور باری تعالیٰ کی ذات کے متعلق موشگافیاں کر کے کشفی نظریہ پیش کرتا ہے قرآن کی روح اس کے خلاف بغاوت کرنے کو تیار ہو جاتی ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں۔

-تصوف کا سب سے پہلا شاعر عراقی ہے اور سب سے آخری شاعر حافظ ہے۔ یہ حیرت کی بات ہے کہ تصوف کی تمام شاعری مسلمانوں کے پولیٹیکل انحطاط کے زمانے میں پیدا ہوئی اور ہونا بھی یہی چاہئے تھا۔ خود ہندوستان کے مسلمانوں کو دیکھئے کہ ادبیات کا انتہائی کمال لکھنؤ کی مرثیہ گوئی پر ختم ہوا:

اقبال بے عمل صوفیاء کے سخت مخالف ہیں۔ وہ حرکت کو روح زندگی سمجھتے ہیں۔ ملی احتیاجات سے بے خبر صوفیوں کو سوداگران دین فروش کا نام دیتے ہیں ؎

می شود ہر مو درازے خرقہ پوش   آہ زیں سوداگران دیں فروش
با مریداں روز و شب اندر سفر   از ضرورت ہائے ملت بے خبر
دیدہ ہا بے نور مثل نرگس اند   سینہ ہا از دولت دل مفلس اند

وہ حجرہ نشین صوفیاء کو میدان عمل میں آنے کی دعوت دیتے ہیں۔

اے کہ اندر حجرہ ہا سازی سخن   نعرۂ لا پیش نمرودے بزن
ایں کہ می بینی نیرزد با دو جو   از جلال لا الہ آگاہ شو

اقبال عمل ہی کو زندگی سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ہر چیز کوشش نا تمام سے زندہ ہے اور دنیائے فانی کے گلشن کی بہار عمل پیہم سے ہے اسے سوکی فلسفہ کہتے ہیں اور اسی وجہ سے انہیں پیمبر حرکت و حیات کا نام دیا جاتا ہے وہ کہتے ہیں کہ قوموں کے زوال اور انحطاط کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ وہ حرکت سے گریز کرتی ہیں اور سکون میں اپنی راحت دیکھتی ہیں ؎

چوں خرد اندیشۂ قومے خراب   ناسرہ گردد بدستش سیم ناب
میرد اندر سینہ اش قلب سلیم   در نگاہ او کج آید مستقیم
برکراں از حرب و ضرب کائنات   چشم او اندر سکوں بیند حیات

اس پیغام جد و جہد میں بھی اقبال رومی سے متاثر دکھائی دیتے ہیں۔ رومی نے ان سے کوئی سات سو سال پہلے بعینہ یہی پیغام دیا تھا جو آج کے ہندی مرید نے اپنی قوم تک پہنچایا ہے۔ مثنوی مولانا روم کا تقریباً دسواں حصہ اسی پیغام سعی و عمل پر مشتمل ہے۔ حرکت میں برکت اور جوئندہ یابندہ وغیرہ الفاظ ان کی مثنوی میں مل جاتے ہیں اس وقت کہا جاتا تھا کہ انسان مجبور محض ہے اس سے کچھ نہیں ہو سکتا ۔۔ جد و جہد لا حاصل ہے۔ توکل علی اللہ انسان کے لئے کافی ہے مولانا روم نے اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے قلم اٹھایا اور لوگوں میں جوش عمل پیدا کرنے کی کوشش کی ان کے چند اشعار دیکھئے ؎

ایں تحرک شد تبرک ما کلید   در تحرک گر دری اے دل مستفید
عاقبت جوئندہ یابندہ بود   چونکہ در خدمت شتابندہ بود
گر توکل می کنی در کار کن   کسب کن پس تکیہ بر جبار کن
رمز الکاسب حبیب اللہ شنو   از توکل در سبب غافل مشو

اقبال رہبانیت اور دنیا سے روگردانی کے سخت مخالف ہیں۔ ایسا فقر جو دنیا سے روگردانی کرنے، تنگ حجروں میں چلّے کاٹنے اور چنگ و رباب پر رقص کرنے کی تعلیم دے فقر کا فریب ہے۔ یہ خودی کے لئے پیام موت ہے، فقر کا مقصد ایک نگاہ والا بیں اور دل زندہ پیدا کرنا ہے۔ فقر ذوق و شوق اور تسلیم و رضا کا دوسرا نام ہے۔ مرد فقیر آفاقی ہوتا ہے اور تمام کائنات پر چھا جاتا ہے۔ جذب و سلوک اسے زبردست قوت کا

کا مالک بنا دیتے ہیں اور وہ سلاطین کے سامنے "لا ملوک" کا نعرہ لگانے سے دریغ نہیں کرتا ہے

فقر مومن چیست؟ تسخیر جہات	بندہ از تاثیر او مولا صفات
فقر کافر خلوت دشت و در است	فقر مومن لرزۂ بحر و بر است
آن خودی را کشتن و واسوختن	این خودی را چون چراغ افروختن

فقر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشرت ہے، اقبال بھی مرد فقیر تھے۔ اس کا اظہار خود انہوں نے اپنے اشعار میں کیا ہے اگر میں ان کو مرد فقیر کہتا تو شاید آپ اسے مبالغہ سمجھتے۔ وہ آخر دم تک اپنے آپ کو مرد فقیر کہتے رہے۔ یہ اشعار بطور شہادت پیش کرتا ہوں۔

از تب و تابم نصیب خود بگیر	بعد ازیں ناید چو من مرد فقیر
نہ شیخ شہر نہ شاعر نہ خرقہ پوش اقبال	فقیر راہ نشین است و دل غنی دارد

اس دنیائے فانی سے رخصت ہونے سے ایک گھنٹہ پہلے اقبال نے جو اشعار کہے ان میں بھی وہ خود کو فقیر ہی کہتے ہیں گویا عمر بھر انہیں اپنے فقر پر ناز رہا ہے

سرود رفتہ باز آید کہ ناید	نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگار این فقیرے	دگر دانائے راز آید کہ ناید

موت کا ڈر عموماً راہ عمل میں مانع ہوتا ہے۔ موت ایک ناگزیر شے ہے۔ اس سے گریز ممکن نہیں۔ انسان کی زندگی ایسے خوش نوا پرندے کی مانند ہے جو کوئی دم شاخ درخت پر بیٹھ کر چہچہائے اور پھر اڑ جائے۔ موت کا وقت معین ہوتا ہے جس میں تقدیم و تاخیر نہیں ہوتی۔ آنا وادہ عجید۔ تو ہم موت سے نہیں ڈرتے جب موت کا ایک دن آنا ہی ہے تو اس سے ڈرنا کیا۔ پھر مسلمان جو حیات بعد ممات کا قائل ہے موت سے کیوں ڈرے اس کی تو زندگی اور موت حق تعالیٰ کے لئے ہیں، حب مال اور ترس مرگ اس کے لئے فتنہ ہیں۔ علامہ موصوف چاہتے ہیں کہ مسلمان مال و زر کی محبت میں گرفتار ہو کر اور موت کے ڈر کو دل میں جگہ دے کر اپنے شاندار ماضی کو داغدار نہ کریں۔ دیکھئے مسلمانوں کی موجودہ ذہنیت پر کس طرح افسوس کرتے ہیں ؎

آنکہ بود اللہ او را ساز و برگ	فتنۂ او حب مال و ترس مرگ
ہمچو کافر از اجل ترسندہ ای	سینہ اش فارغ ز قلب زندہ ای

مسلمان باایمان خدا کے سوا کسی چیز سے نہیں ڈرتا وہ بیم غیر اللہ کو دل میں نہیں آنے دیتا کیونکہ یہ عمل کا دشمن اور کاروان زندگی کا راہزن ہے اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو ہمارے دل میں پوشیدہ ہر شر کی جڑ یہی ڈر ہے لہٰذا اس کو دور رکھنا از حد ضروری ہے۔

بیم غیر اللہ عمل را دشمن است	کاروان زندگی را رہزن است
ہر شر پنہاں کہ اندر قلب تست	اصل او بیم است اگر بینی درست

موت کا ڈر غلامی کی علامت ہے مرد مومن کے لئے زندگی لامتناہی ہے۔ اس کے صدہا مقامات ہیں موت بھی ایک مقام ہے وہ خوف اندیش تو ہوتا ہے، مرگ اندیش نہیں ہوتا، موت اسے تازہ زندگی بخشتی ہے اس لئے وہ خود موت کی طلب کرتا ہے۔

بندۂ حق ضیغم و آہوست مرگ	یک مقام از صد مقام اوست مرگ
ہر زمان میرد غلام از بیم مرگ	زندگی او را حرام از بیم مرگ
بندۂ آزاد را شانے دگر	مرگ او را می دہد جانے دگر

از خود اندیش است مرگ اندیش نیست — مرگِ آزاداں ز آنے بیش نیست

مردِ مومن جان دیتے وقت گھبراتا نہیں کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ موت ایک زینہ ہے جس کی مدد سے بلکہ اس دنیا سے اُس جہان کی طرف کوچ کرنا ہے جہاں میرے اسلاف پہلے سے ہی موجود ہیں اس لئے وہ مسکرا کر دنیا والوں کو الوداع کہتا ہے۔

نشانِ مردِ مومن با تو گویم — چو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

سوئے اتفاق سے علامہ موصوف کے عہد میں مسلمان محکوم اور مظلوم تھے وہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے، برصغیر پر انگریزوں کی حکومت تھی۔ ہندوؤں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی حالت ابتر تھی۔ انہوں نے سوچا کہ اگر برصغیر کو آزادی مل بھی گئی تو بیچارے مسلمان پھر بھی مغلوب رہیں گے اس لئے کہ ہندوان سے سہ گنا زیادہ ہیں۔ اسی اندیشہ کے پیشِ نظر انہوں نے پاکستان کا تصور پیش کیا انہوں نے صاف الفاظ میں یہ فرمایا کہ "اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک مخصوص علاقہ میں مرکز کر دیا جائے" پھر اس خاکے کا عملی حل اس طرح پیش کیا کہ "پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد ریاست قائم کی جائے" اکثر مسلمانوں نے اس نظریہ کی مخالفت کی اور اسے انتشار پیدا کرنے کی ایک کوشش قرار دیا۔ اقبالؔ مرحوم غلامی سے سخت نالاں تھے وہ مسلمانوں میں جوش آزادی پیدا کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ غلامی سے اس طرح نفرت دلاتے ہیں ؎

تا غلامم در غلامی زادہ ام — ز آستانِ کعبہ دور افتادہ ام
چوں بنامِ مصطفےٰ خوانم درود — از خجالت آب می گردد وجود
عشق می گوید کہ اے محکومِ غیر — سینۂ تو از بتاں مانندِ دیر
تا نداری از محمدؐ رنگ و بو — از درودِ خود میالا نامِ او

قیامِ پاکستان میں یقیناً اقبال کا اہم حصہ ہے یہ اور بات ہے کہ پاکستان ان کی وفات کے نو سال بعد وجود میں آیا۔

دنیا میں کئی مختلف نظامِ حکومت پائے جاتے ہیں لیکن ان عالم کا علمبردار صرف نظامِ شریعت ہے۔ دیگر نظام نقائص سے خالی نہیں ہیں اس لئے کہ وہ انسانوں کے بنائے ہوئے ہیں اور نظامِ شریعت خالقِ انسانیت نے خود اپنے دستِ قدرت سے بنایا ہے اس کی بنیاد مساوات انسانی پر رکھی گئی ہے اور یہ نوعِ انسانی کے تمام مصائب اور تکالیف کا کامیابی سے خاتمہ کر سکتا ہے اس لئے غیر شرعی نظامِ حکومت کے خلاف اقبالؔ نے آواز بلند کی اور کہہ دیا کہ ؎

تا تہ و بالا نہ گردد ایں نظام — دانش و تہذیب و دیں سودائے خام

شریعت اور طریقت میں کیا فرق ہے ہم رومیؔ کے الفاظ میں

"شریعت ہمچو شمعی است کہ راہ می نماید، چوں در راہ آمدی، ایں رفتن تو طریقت است، چوں بہ مقصود رسیدی آں حقیقت است"
(سوانح رومؔ از علامہ شبلیؔ)

اقبالؔ مرحوم کہتے ہیں ؎

آدمی اندر جہانِ خیر و شر — کم شناسد نفعِ خود را از ضرر
کس نداند زشت و خوب کار چیست — جادۂ ہموار و ناہموار چیست
شرع برخیزد ز اعماقِ حیات — روشن از نورش ظلامِ کائنات
از شریعت احسن التقویم شو — وارثِ ایمانِ ابراہیمؑ شو

(باقی صفحہ ۱۲ پر)

تحریر:۔ استاذ عبدالقادر عودہ شہید
ترجمہ:۔ مولانا محمد حسام اللہ شریفی

اسلامی حکومت میں مالیات کا شعبہ

اسلامی حکومت و سلطنت کے قیام کے روزِ اول ہی سے اسلام نے ایک ایسے مستقل مالیاتی شعبے کی بنیاد ڈالی کہ قبل ازیں لوگ اس سے یکسر ناآشنا تھے، اسلام کی بدولت ہی دنیا اس نظام سے روشناس ہوئی اور اسی دین کامل کے طفیل شعبۂ مالیات کا خاکہ اُن کے سامنے آیا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نظامِ حکومت چلانے کے لئے مختلف عہدیداروں کا تقرر فرمایا۔ عدلیہ کے لئے قاضی مقرر فرمائے انتظامیہ کے لئے ایسے افراد منتخب فرمایا جو کاروبارِ مملکت چلانے کی اہلیت رکھتے ہوں۔ ان کے علاوہ ایسے لوگوں کا بھی تقرر فرمایا جو امراء سے صدقات وصول کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ ان کے فرائض میں یہ بات شامل تھی کہ وہ طبقہ امراء سے صدقات جمع کر کے اسی علاقے کے فقراء و مساکین اور غرباء پر تقسیم کردیں اور فاضل رقوم بیت المال میں پہنچا دیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے مسلمانوں کو کامیابی اور کامرانی سے ہمکنار کیا اور ان کی حدود مملکت میں وسعت پیدا ہوئی تو اس شعبے کے فرائض میں بھی اضافہ ہوگیا اور صدقات، خراج، جزیہ، مالِ فے اور مالِ غنیمت سے آمدنی اور پھر اس کی تقسیم اسی شعبے کی وساطت سے ہونے لگی ــــ ان مختلف ذرائع سے وصول شدہ رقوم پہلے خزانے میں جمع کرادی جاتیں اور پھر بیت المال کی جانب سے اس کی تقسیم کتاب و سنت میں مذکور مصارف کے مطابق عمل میں آتی تاکہ کسی کے لئے اعتراض کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے اور کوئی شخص بھی محروم نہ رہنے پائے اور ہر آدمی کو اس کا حصہ بلا مانگے مل جائے۔ حضرت عمرؓ نے بیت المال سے ہر مرد اور ہر عورت، ہر بڑے اور ہر بچے کے لئے ماہانہ وظیفہ مقرر فرمائے۔ یہی نہیں بلکہ ہر نو مولود کا وظیفہ اُس کی ولادت کے وقت ہی سے مقرر فرما دیا اور عرصہ دراز تک یہ سلسلہ اسی طرح قائم رہا۔

جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ ہر شخص سے اس بات کا اعتراف کرا لیتے اور حلف اٹھوا لیتے تھے کہ:- کوئی شخص بھی اس مال میں کسی دوسرے آدمی سے زیادہ حصے کا مالک نہیں یہاں تک کہ مجھے بھی کسی دوسرے شخص سے زیادہ لینے کا حق حاصل نہیں۔ لہٰذا سب مسلمان، سوائے عبدِ مملوک اس مال میں برابر کے شریک ہیں:

کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ اور دین و مذہب کی خدمت کے لحاظ سے حضرت عمرؓ نے فرقِ مراتب کا خیال رکھا۔ وہ لوگ جنہوں نے اسلام لانے میں سبقت کی اور اس کی خاطر صعوبتیں اور تکلیفیں برداشت کیں۔ وظائف مقرر کرنے میں ان کا خاص خیال رکھا۔ ان کے علاوہ ضرورت مندوں، اشخاص اور اغنیاء، مہاجر اور انصار، غزوۂ بدر میں شرکت کرنے والے اصحاب اور اس سعادت سے محروم رہ جانے والے افراد اسی طرح دوسری خدمات اور امتیازات کو ملحوظ رکھتے ہوئے انہوں نے ماہانہ وظائف کی رقم کا تعین کیا۔ لیکن اپنے دورِ خلافت کے آخری حصے

میں حضرت عمر فاروق رضؓ نے اس تفریق و امتیاز کو عدل و انصاف اور مساوات کے خلاف سمجھتے ہوئے اس حکم کو منسوخ کر دیا اور خلیفۂ اول جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی موافقت کرتے ہوئے وظائف کی تقسیم میں سب لوگوں سے ایک ہی جیسا سلوک شروع کر دیا اور کسی کے درمیان کوئی فرق روا نہ رکھا۔

خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق اور خلیفۂ رابع جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہما تقسیم مال کے سلسلہ میں لوگوں کے درمیان مساوات کو ملحوظ رکھتے تھے اور اس معاملے میں ان دونوں بزرگوں کا ایک ہی مسلک تھا البتہ خلیفۂ ثالث جناب عثمان غنی رضی اللہ عنہ خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے طریقے پر عمل کرتے ہوئے فرق مراتب کا خیال رکھتے تھے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کی نگاہ میں حُر اور عبد دونوں ایک ہی درجہ رکھتے تھے۔ اسی بنا پر وہ تقسیم مال میں دونوں کو شریک کرتے تھے لیکن حضرت عمر فاروق رضؓ نے عبد کو اس میں شرکت سے محروم رکھا اور اس کی بنیاد انہوں نے اپنے اس اجتہاد پر رکھی کہ عبد چونکہ کسی چیز کا مالک نہیں ہو سکتا اس لئے اس رقم میں بھی اس کا حصہ نہیں رکھا جا سکتا۔ جناب سعد بن مالک رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا "یا رسول اللہؐ جو شخص قوم کا حامی اور مددگار ہو کر لڑ رہا ہو کیا اس کا اور دوسرے لوگوں کا حصہ برابر ہوگا؟" حضورؐ نے فرمایا "تم لوگ اپنی ہی جماعت کے کمزوروں اور ضعیفوں کے رزق کا سامان فراہم کرنے اور ان کی مدد کے لئے ہی ایسا کرتے ہو؟ پھر اس کا اور دوسرے لوگوں کا حصہ برابر کیوں نہ ہوگا۔"

اس حقیقت سے کون شخص انکار کر سکتا ہے کہ مال و دولت کی حقیقی ملکیت خدا ہی کو حاصل ہے۔

در حقیقت مالکِ ہر شے خداست

ایں امانت چند روزہ نزد ماست

لہٰذا اس کے بارے میں ہر قسم کا فیصلہ بھی اسی احکم الحاکمین اور مالک حقیقی ہی کا قابل قبول ہونا چاہیے۔ کوئی شخص بھی اس کی آمد و خرچ کے متعلق کسی قسم کا فیصلہ کرنے کا مجاز نہیں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں "میں کسی کو دیتا ہوں نہ محروم رکھتا ہوں بلکہ میں تو محض تقسیم کرنے والا ہوں جسے عطا کرنے کا حکم ملتا ہے اسے عطا کر دیتا ہوں" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی ہی کو حضرت عمر فاروق رضؓ نے دستور العمل کی حیثیت سے نافذ کیا اور جناب علی مرتضیٰ رضؓ نے اسی فرمان نبوی کی روشنی میں فرمایا "یاد رکھو تمہارے مال و دولت (بیت المال) کی کنجیاں اگرچہ میرے پاس محفوظ ہیں مگر مجھے اس میں سے ایک درہم بھی تمہاری اجازت کے بغیر لینے کا حق حاصل نہیں۔"

سربراہِ مملکت اپنے تمام اختیارات کے ساتھ پوری ملت مسلمہ کی نمائندگی کرتا ہے۔ شعبۂ مالیات کے نظم و نسق کا ذمہ دار بھی وہ ہے اور اراکین شعبہ کے عزل و نصب کا اختیار بھی اسی کو حاصل ہے۔ وہی انتظام و انصرام کرتا اور اس کی نگرانی کا فریضہ سرانجام دیتا ہے مگر اس مقام پر اس نکتے کو ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ کارکنانِ شعبہ ساری قوم کے نمائندے ہونے کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دیں گے۔ سربراہِ مملکت کی جانب سے ان کا تقرر کئے جانے کے باوجود وہ صرف اس کے ذاتی نمائندے کے طور پر کام نہیں کر سکیں گے اس شعبے کا عدلیہ ہی جیسا معاملہ ہے کہ محض حاکم وقت کے انتقال کر جانے سے عدلیہ ختم اور تقضاۃ معزول نہیں ہو جائیں گے اور بغیر کسی معقول سبب کے کوئی شخص بھی ان کو معزول نہیں کر سکے گا۔ (اس سلسلے میں خلیفۂ ثالث جناب عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دور خلافت خازن بیت المال کی مثال، اراکین شعبۂ مالیات کے فرائض اور ان کی حیثیت کی وضاحت کے لئے، بہت کافی ہے۔ خازن بیت المال کے خیال میں رقم کو اس مقصد کے لئے صرف کرنا درست نہیں تھا جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بیان فرما رہے تھے۔ جب خلیفۂ ثالث نے

اُس کی توجہ اس کے منصب کی طرف مبذول کرائی اور فرمایا کہ "تمہاری حیثیت صرف خازن کی ہے" تو اُس نے جواب میں کہا "وہ مسلمانوں کے بیت المال کا خازن اور نگراں ہے۔ حاکمِ وقت اور خلیفہ کا خازن نہیں"۔

کارکنانِ شعبۂ مالیات اپنے فرائض پوری ذمہ داری کے ساتھ قرآن و سنّت میں مذکورہ احکام کی روشنی میں بالکل آزادانہ طریقہ پر انجام دیتے تھے اسی نظم کے مطابق کاروبارِ مملکت انجام پاتے رہے یہاں تک کہ برسرِ اقتدار طبقے نے اسلام کے طریقے کو چھوڑ دیا اور اس کے احکام کو بدل ڈالا اور انہیں اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لینے کی کوشش کی۔

شعبۂ مالیات کے کارکن یا حاکمِ وقت اور سربراہِ مملکت مذکورہ ذرائع سے حاصل شدہ رقوم کسی بھی صورت میں اپنی مرضی کے مطابق خرچ نہیں کر سکتے بلکہ اسلام کی مقرر کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے ہی اس رقم کو استعمال میں لایا جا سکتا ہے۔ عمالِ حکومت کے مرتبے اور منصب اور ان کی مختلف حاجتوں اور ضرورتوں کو دیکھتے ہوئے وظائف کے طور پر جو رقم اُن کے لئے مقرر کی گئی ہے کسی بھی کارکن کو اس سے زائد رقم لینے کی اجازت نہیں۔ اُن کے منصب اور حاجتوں کو دیکھتے ہوئے اس حد کا تعین بھی خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دیا:۔

"مسلمانوں میں سے جس شخص کو حاکم مقرر کیا جائے وہ اپنے اور اپنی بیوی کے اخراجات حکومت کے خزانے سے وصول کر سکتا ہے خادم نہ ہونے کی صورت میں ایک خادم لے سکتا ہے اور اگر رہائش کے لئے مکان نہ ہو تو ایک مکان بھی حاصل کر سکتا ہے"۔

خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں "مجھے بتایا گیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی یہ بھی ہے"

من اتخذ غیر ذلک فھو غال او سارق (الحدیث)

جس شخص نے اس (اشیاء ثلاثہ) کے علاوہ مزید کچھ لیا وہ یا تو خائن ہے اور یا پھر چور ہے۔

اس کی مزید وضاحت جناب ختم المرسلین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے اس فرمان سے بھی ہو جاتی ہے:

من استعملناہ علیٰ عمل فرزقناہ رزقاً فما اخذ بعد ذلک فھو غلول (الحدیث)

جس شخص کو ہم نے کسی کام کے لئے کارندہ مقرر کیا (خلیفہ نہیں) تو اس کے کھانے پینے کا انتظام کرنا ہمارا فرض ہے اس کے علاوہ کچھ لے گا تو وہ خیانت کا مرتکب ہوگا۔

شعبۂ احتساب و نگراں

اس شعبے کا مقصد برسرِ اقتدار طبقہ کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھنا اور ان کے احتساب و نگرانی کا فریضہ سر انجام دینا ہے یہ شعبہ تمام امت کی ترجمانی کرتے ہوئے علماء و فقہاء پر مشتمل شوریٰ کے قیام میں مدد دیتا ہے۔

اس شعبے کا قیام دو وجوہ کی بنا پر ملتِ مسلمہ کے لئے نہایت ضروری ہے۔

اول یہ کہ برسرِ اقتدار طبقے کے قول و عمل کی نگرانی کرنا امت مسلمہ کا فرضِ اولیں ہے۔ وہ انہیں برائی میں مبتلا دیکھ کر خاموش ہو کر نہ بیٹھ جاتے بلکہ اللہ تعالیٰ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا جو عظیم فریضہ ملت مسلمہ پر عائد کیا ہے اس فریضے کو صحیح طریقہ سے بجا لاتے۔ دوسری امتوں سے اس ملت کے بہتر اور اشرف و افضل ہونے کا واحد سبب یہی ہے کہ دنیا میں پہونچ کر کائنات کے بسنے والوں کے نفع سے غفلت نہ برتتے۔ ان کو بھلائیوں کا حکم دے اور برائیوں سے روکے اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان و اعتقاد رکھے۔

كنتم خير امة اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنهون عن المنكر وتؤمنون بالله - (القرآن)

ولتكن منكم امة يدعون الى الخير ويامرون بالمعروف وينهون عن المنكر واولٰئك هم المفلحون (آل عمران : ۱۰۴)

تمہارے اندر ایک ایسی جماعت ہونی چاہیے جو دعوتِ خیر اور نیکیوں کا حکم دے اور برائیوں سے روکے - کامیابی و کامرانی ایسے ہی لوگوں کے قدم چومتی ہے جو ان صفات سے متصف ہوتے ہیں -

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کی وضاحت فرمادی کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے کو ترک کر دینے کا نتیجہ معاشرے میں فتنہ و فساد کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے - ارشاد فرمایا :

تامرون بالمعروف ولتنهون عن المنكر او ليسلطن الله عليكم شراركم ثم يدعو خياركم فلا يستجاب لهم (الحديث)

تم لوگ نیکیوں کا حکم دیتے رہنے، برائیوں سے روکتے رہنے کا فرض اپنے اوپر لازم قرار دے لو - ورنہ اس فریضہ کو ترک کر دینے کی صورت میں اللہ تعالیٰ ایسے افراد کو تم پر مسلط (اور تمہارے حاکم مقرر) کر دیگا جو تمہاری جماعت میں بدترین افراد ہوں گے) پھر (ان کے دورِ حکومت کے خاتمے کیلئے) تم میں سے نیک لوگ دعائیں کریں گے مگر ان کی دعائیں قبول نہ ہونگی -

اس لئے ہر شخص کو اپنی وسعت اور قدرت کے مطابق برائیوں کی روک تھام کا اہتمام کرنا چاہیے، عدم قدرت کے سبب جو لوگ عملاً برائی کی روک تھام کے لئے کوئی قدم اٹھانے سے معذور ہوں - ان کے لئے بھی نہایت ضروری ہے کہ وہ اس فعل کو دل سے برا سمجھیں اور اس برائی پر مبتلا اصحاب سے نفرت اور شدید ناراضگی کا اظہار کریں -

ومن رأى منكم منكراً فليغيره بيده فان لم يستطع فبلسانه - فان لم يستطع فبقلبه وذلك اضعف الايمان (الحديث)

تم میں سے جو شخص کسی برائی کو ہوتا ہوا دیکھے وہ قوت کے ذریعے اس کا استیصال کرے - قوت اور اقتدار سے محروم ہونے کی صورت میں زبان سے کلمۂ حق کہے اور اگر اس کی بھی قدرت نہ ہو تو کم از کم دل سے اسے برا سمجھے لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ یہ ایمان کا سب سے ادنیٰ درجہ ہے -

شعبۂ احتساب و نگراں کے قیام کا دوسرا سبب یہ ہے کہ چونکہ حاکمِ وقت، ملتِ مسلمہ کے نائب کی حیثیت سے احکام جاری کرکے براہِ راست ملت سے متعلقہ مسائل پر اثر انداز ہوتا ہے اور ان کے حقوق میں مداخلت کرتا ہے، ملت کے لئے اپنے حقوق کی حفاظت اور دفاع کی خاطر بھی اس شعبے کا قیام ناگزیر ہے - یہی نہیں بلکہ خود احکم الحاکمین نے برسرِ اقتدار طبقے کو ہر مسئلے میں ملتِ مسلمہ سے رجوع کرنے کی تلقین فرمائی ہے اور ہر معاملے میں التزاماً اس سے مشورہ کرتے رہنے کا حکم دیا ہے اور فرمایا :-

وشاورهم فى الامر (آل عمران : ۱۵۹)

اور کاروبارِ سلطنت میں ان سے مشورہ کیا کرو -

وامرهم شورىٰ بينهم (الشورىٰ : ۳۸)

اور ان کا طریقہ یہ ہے کہ وہ آپس کے مشورے سے نظامِ حکومت چلاتے ہیں -

بنابریں ملتِ مسلمہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ برسرِ اقتدار طبقے کے ہر ہر عمل کا محاسبہ کرتی رہے اور جب انہیں کوئی غلط کام کرتا

ہوئے دیکھے تو ان پر گرفت کرے اور جب بھی وہ راہِ راست سے ہٹتے ہوئے نظر آئیں ان کو صراطِ مستقیم پر لانے کا فریضہ سرانجام دے۔ حکام کی نگرانی اور احتساب کے باب میں نصوصِ صریحہ اور دلائلِ قطعیہ کی کثرت کے پیشِ نظر اس معاملے میں کسی قسم کے بحث و مباحثہ کی گنجائش نہیں رہتی۔

تاریخ کے اوراق اس حقیقت کو کبھی نظر انداز نہیں کر سکیں گے کہ خلفائے رسول اللہ نے سب سے پہلے اس کا عملی نمونہ دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اس تاریخی حقیقت کو وہی لوگ جھٹلاتے ہیں اور ان نصوصِ صریحہ کو وہ خود اعتناء تصور نہیں کرتے جو اپنی دنیاکی زندگی کو حیاتِ اخروی پر ترجیح دیتے ہیں اور سربراہِ مملکت پر ملتِ مسلمہ کے نگہبان اور تسلط کرانے اصحاب ہی عضوِ معطل کی حیثیت دینے کی جرأت کرتے ہیں جن کی نگاہوں میں احکامِ خداوندی کوئی اہمیت نہیں رکھتے وہ اپنے میں سے ایسے ظالم و جابر افراد کو، جو رعیت کے حقوق سلب کر لینے کو کوئی جارحانہ سمجھتے ہوں، مسندِ حکومت پر بٹھا کر امتِ مسلمہ کے حق میں کانٹے بو دینے ہی کو اپنا سب سے بڑا کارنامہ تصور کرتے ہیں پھر برسرِ اقتدار طبقہ عوام کی بالادستی سے چھٹکارا حاصل کر کے خود ان پر برتری حاصل کرنے کا خواہش مند ہوتا ہے اور اس کا واحد سبب یہ ہوتا ہے کہ ملتِ مسلمہ اپنے فرض کی ادائیگی میں کوتاہی برتتی ہے اور اللہ رب العزت کے احکام کو قائم کرنے کے بارے میں اپنے فرائض سے غافل رہ کر سکوت اختیار کر لیتی ہے اور اپنے حقوق کی واپسی کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھاتی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو خلیفۂ رسول منتخب کیا گیا تو پہلی بات جو آں کے منہ سے نکلی اس میں اسی بات کا اعتراف تھا کہ ملتِ مسلمہ کو حکمران طبقہ پر بالادستی حاصل ہے اور حاکمِ وقت کی جانب سے کجروی اختیار کر لینے کی صورت میں اس کو صراطِ مستقیم پر لانے کی ذمہ داری بھی ملتِ مسلمہ ہی پر عائد ہوتی ہے۔ بیعت کے بعد پہلے خطبے ہی میں ارشاد فرمایا:

"لوگو! مجھے تمہارا والی مقرر کیا گیا ہے حالانکہ میں تم میں سے بہتر نہیں ہوں اگر میں اچھائی کا کام کروں تو تم میری مدد کرو اور اگر میں برائی کی طرف مائل ہوں تو تم مجھے سیدھا کر دو۔"

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر کیا گیا تو انہوں نے قوم سے پہلی مرتبہ ہی خطاب کرتے ہوئے فرمایا: "جو شخص مجھے راہِ راست سے ہٹا ہوا دیکھے اس پر لازم ہے کہ وہ مجھے سیدھا کر دے۔" ایک اعرابی نے اٹھ کر کہا: "خدا کی قسم اگر ہم نے تجھ میں کجی دیکھی تو تجھے ہم اپنی تلواروں کے ذریعے سیدھا کر دیں گے۔"

جناب عثمان غنی رضی اللہ عنہ خلیفۂ ثالث منتخب ہوئے تو انتخاب کے فوراً بعد ملتِ مسلمہ سے خطاب کیا اور اس میں فرمایا:

"اگر تم مجھے کسی وقت صراطِ مستقیم سے ہٹا ہوا دیکھو تو اسی لمحے مجھے صراطِ مستقیم پر چلنے کی تلقین کرو اور ایسے اقدامات کرو کہ میں اس سے ایک قدم بھی ادھر ادھر نہ ہو سکوں۔"

علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی خلافت کے فرائض سنبھالنے کے بعد سب سے پہلا خطبہ یہی دیا۔ "کاروبارِ مملکت میں کسی شخص کو بھی دخل دینے کا حق حاصل نہیں سوائے اس کے جسے تم اجازت دو۔ حتیٰ کہ تمہاری اجازت اور مشورے کے بغیر میرے لئے اس میں دخل دینا درست نہیں یہ خالص تمہارے معاملات ہیں۔"

قرونِ اولیٰ کے صلحائے امت اسی طریقہ پر عامل رہے اور ہر صورت میں برسرِ اقتدار طبقہ پر انہوں نے اپنی بالادستی قائم رکھی اور اسلام کی جانب سے بخشے ہوئے اپنے اس حق کو استعمال کرتے رہے حضرت عمر بن الخطابؓ اور ایک شخص کے درمیان کسی معاملے میں بات چیت ہو رہی تھی۔ دورانِ گفتگو اس نے کہا: "امیر المومنین کچھ خدا کا خوف کرو۔" وہاں جو لوگ موجود تھے اُن میں سے ایک کہنے لگا: "تو امیر المومنین کو خدا سے ڈرنے کے لئے کہتا ہے؟" اگر امیر المومنین کو خدا کا خوف نہیں تو پھر اور کون خدا کا خوف کرے گا۔ خلیفہ دوم نے دخل در معقولات

کہنے والے شخص کو ڈانٹ پلائی کہ تم اس معاملے میں دخل نہ دو۔ اس نے کتنی عمدہ بات کہی ہے۔ پھر فرمایا "اگر تم ہم کو اس طرح نہ ٹوکو تو تم بھلائی سے محروم ہو اور ہمارا بھلائی سے کوئی تعلق نہیں اگر ہم اسے قبول نہ کریں"۔

خلیفۂ دوم جناب عمر فاروقؓ ایک دفعہ، دو چادروں سے تیار شدہ جبّہ پہنے ہوئے، منبر پر چڑھے اور فرمانے لگے "لوگو! ذرا توجہ سے سنو"۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا "ہم سننے کے لئے تیار نہیں" حضرت عمرؓ نے فرمایا "ابوعبداللہ، کیوں؟" انہوں نے کہا "تم نے سب کو ایک ایک چادر دی اور تمہارے جبّے سے ظاہر ہوتا ہے کہ خود عدل وانصاف کو چھوڑ کر ایک سے زائد حصہ رکھ لیں (کیونکہ تمہارا جبّہ ایک چادر میں تیار ہونا ممکن نہیں) خلیفۂ دوم نے فرمایا "ابوعبداللہ جلدی نہ کرو ذرا انتظار کرو" پھر عبداللہ کو آواز دی مگر خاموشی رہی تو آپؓ نے عبداللہ بن عمرؓ کہہ کر پکارا۔ انہوں نے لبیک کہہ کر جواب دیا۔ عمر فاروقؓ نے فرمایا "میں تمہیں خدائے ذوالجلال کی قسم دے کر دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ جس کپڑے کا میں نے جبّہ بنوا کر پہنا ہے وہ تمہارا ہی ہے؟" عبداللہ بن عمر نے جواب دیا "خدا کی قسم آپ درست فرماتے ہیں۔ یہ کپڑا میرا ہی ہے"۔ یہ سن کر حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ "ہاں اب کہو، ہم تمہاری بات سنیں گے"۔

جناب معاویہ رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ لوگوں کے وظائف روک لئے۔ ایک مجلس میں ابومسلم خولانیؒ کھڑے ہو کر کہنے لگے "اے معاویہ تو نے اپنی محنت سے نہیں کمایا۔ نہ تیرے باپ اور نہ تیری ماں نے محنت کرکے یہ دولت حاصل کی ہے"۔ یہ سن کر حضرت معاویہؓ کو بڑا غصّہ آیا۔ منبر سے اتر پڑے۔ لوگوں سے کہنے لگے کچھ دیر اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے رہو کر میرا انتظار کرو۔ تھوڑی دیر کے بعد اس حالت میں واپس آئے کہ جیسے نہا کر آرہے ہوں۔ پھر فرمایا "ابومسلم کے کلام نے مجھے غصّے میں مبتلا کردیا اور میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ غصّہ شیطان دلاتا ہے اور شیطان کی تخلیق آگ سے ہوئی ہے جسے پانی ہی بجھا سکتا ہے لہٰذا تم میں سے کسی شخص کو جب غصّہ آئے تو پانی کے ذریعے غصّہ کو دور کرنے کے لئے اُسے غسل کرلینا چاہئے، میں گیا اور اب غسل کرنے کے بعد واپس آیا ہوں۔

صدق ابومسلم انہ لیس من کدی	ابومسلم نے سچ کہا ہے کہ یہ دولت میں نے اور میرے باپ
ولا من کد ابی فھلموا الی عطائکم	نے محنت کے ذریعے حاصل نہیں کی۔ آؤ اور اپنے
	عطیات لے جاؤ۔

حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کو ابوجعفر منصور کے پاس لایا گیا۔ منصور نے آپ سے عرض کیا کسی معاملے میں آپ کو ہماری ضرورت محسوس ہوتی ہو تو فرمائیے۔ امام سفیان ثوریؒ نے فرمایا "خدا سے ڈر۔ تو نے زمین کو ظلم اور زیادتی سے بھر دیا ہے"۔ یہ سن کر اس نے سر جھکا لیا کچھ دیر بعد سر اُٹھا کر کہنے لگا "اپنی کوئی حاجت بتلائیے"۔ آپ نے فرمایا "تجھے اس مرتبے تک مہاجرین وانصار کی تلواروں نے پہنچایا ہے مگر تو نے ان کی اولاد سے بے توجہی برتی کہ انہیں فاقوں پر مجبور کردیا ہے خدا کا کچھ تو خوف کر اور ان کی ضروریات فراہم کرنے کی طرف توجہ دے ان کے حقوق ادا کر"۔ اس نے ذرا دیر کے لئے سر جھکا لیا اور پھر سر اُٹھا کر کہنے لگا آپ کوئی اپنی حاجت ظاہر کریں جسے پورا کردیا جائے"۔ امام ثوریؒ نے فرمایا "خلیفۂ دوم عمر بن الخطابؓ نے حج کیا تو اپنے خازن سے دریافت کیا کتنی رقم خرچ ہوگئی۔ خازن نے بتایا کہ دس درہم سے کچھ ہی زائد رقم صرف ہوئی ہے لیکن تمہارے ہاں خرچ کا کوئی حساب ہی نہیں اس کثرت سے مال اُٹھایا گیا ہے کہ اونٹ تک اس بوجھ کو اٹھانے کی طاقت نہیں رکھتے، یہ کہا اور نکل کر چلے گئے — خلفاء اور سربراہ مملکت ملت مسلمہ کے سامنے اسی بنا پر سر تسلیم خم کرتے اور اُن کی باتوں کو قبول کرتے رہے کہ وہ جانتے تھے امت اس حقیقت سے اچھی طرح باخبر ہے کہ اُسے حکمران طبقے کی نگرانی اور محاسبے کا پورا پورا حق حاصل ہے اور وہ ان کی کجی کو دور کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور انہیں غلط راستے پر چلتا دیکھ کر خاموش نہیں رہ سکتی بلکہ وہ اپنے حق کو استعمال کرکے انہیں صراط مستقیم پر لانے کی پوری پوری کوشش کرے گی۔

سفینۂ غزل

میر تقی میر —

ساقیا ہے کہ دور مُل ہے
مطرب غزلے کہ فصل گل ہے

عروج زیدی —

زندگی غم سے عبارت ہے تمہیں کیا معلوم
اور غم کس کی امانت ہے تمہیں کیا معلوم

نگہ شوق نے شہ پائی تو گستاخ ہوئی
اس میں کس کس کی شرارت ہے تمہیں کیا معلوم

شوخیٔ حسن کو فردوس نظر کہتے ہو
یہ تماشہ نہیں آفت ہے تمہیں کیا معلوم

میرا نام آتے ہی چہرے پہ شفق پھوٹی ہے
یہ بھی فیضان محبت ہے تمہیں کیا معلوم

میں تو شکوے کی بجائے شکر ستم کرتا ہوں
جو مجھے تم سے شکایت ہے تمہیں کیا معلوم

ہر قدم سود و زیاں ہی پہ نظر رہتی ہے
دوستی صرف تجارت ہے تمہیں کیا معلوم

تم تو ہونٹوں پہ مرے موج تبسم دیکھو
دل کی سینے میں جو حالت ہے تمہیں کیا معلوم

تم کو معلوم ہے سب حال پریشان عروج
اور یہ کس کی بدولت ہے تمہیں کیا معلوم

ڈاکٹر راہی (ایڈوکیٹ) —

جہاں مجھ کو خیال گردش ایام آتا ہے
وہیں بے ساختہ لب پر تمہارا نام آتا ہے

بنام خاص گردش میں جو کوئی جام آتا ہے
تری ساقی گری پہ ساقیا الزام آتا ہے

یہ سب موقع محل کی بات ہے اے حضرت ناصح
خرد بھی کام آتی ہے جنوں بھی کام آتا ہے

سوز ککرالوی —

ہر شخص کی نگاہ کو پہچانتا ہے دل
دھوکے تری نظر کے مگر کھا رہا ہے دل

اے چارہ گر! علاج کوئی اور ہی بتا
ترک وفا کی بات کہاں مانتا ہے دل

شاید کہ اب بہار چمن میں نہ آسکے
ذکر بہار ہی سے بہلنے لگا ہے دل

یکساں ہے التفات و تغافل کی آرزو
کھلتا نہیں کہ آپ سے کیا چاہتا ہے دل

آئے کسی لباس میں رنگینیٔ بہار
اپنے لہو کے رنگ کو پہچانتا ہے دل

نازک مزاج ایک تمہیں تو نہیں ہو سوز
دنیا میں سب کو ایک سا بخشا گیا ہے دل

افضل قریشی ـــــ

جانے کس گوشۂ ساحل میں نہاں ہوتا ہے　وہ جو طوفاں مری آنکھوں سے رواں ہوتا ہے
ہم نے دیکھی ہے بہت تیرے گلستاں کی سحر　سارے گلشن میں قیامت کا دھواں ہوتا ہے
اشک ہیں تیری امانت انھیں برباد نہ کر　میں جو روتا ہوں، تو تیرا ہی زیاں ہوتا ہے

بند کلیوں میں کہاں پھول کی خوشبو افضل
عمر بڑھتی ہے تو احساس جواں ہوتا ہے

آزردہ وسانی ـــــ

مجھ سے ہے کائنات میں رونق بزم کائنات
میں ہوں دلیل زندگی میں ہوں حقیقت حیات
میرے خیال و فکر سے دشت میں گل کھلے ہوئے
میری ہی انگلیوں کی ضرب نغمہ ساز ممکنات
زیر نگیں ہیں بحر و بر شمس و قمر ہے نظر
فرش سے عرش تک مرا دائرۂ تصرفات

ماہر القادری ـــــ

گلشن میں تم آجاؤ، اب رُت بھی سہانی ہے
کلیوں کا لڑکپن ہے، پھولوں کی جوانی ہے
اب وقت ہی ایسا ہے ایک ایک مسافر کو
طوفاں سے بھی لڑنا ہے، کشتی بھی بچانی ہے
کچھ دن سے گلستاں کے حالات پریشاں ہیں
بلبل کے بھی لہجہ میں آشفتہ بیانی ہے
اے حسن ترے صدقے! کیا خوب کرشمے ہیں
جلوے بھی دکھانے ہیں صورت بھی چھپانی ہے

جو اشک ترے غم میں مژگاں پہ ابھر آیا
رُک جائے تو موتی ہے بہہ جائے تو پانی ہے

روحِ انتخاب

ابوالعلاء معری کی شاعری

عربی شعر و ادب اور فلسفہ و حکمت کی تاریخ میں ابوالعلا کا نہایت بلند مقام ہے، عربی شاعری میں اس نے بڑا انقلاب پیدا
ا اس کو ایک نیا رنگ اور نئی روشنی بخشی، جو لوگ اس کو متنبی کا متبع اور خوشہ چیں بتاتے ہیں، ان کی رائے صرف اس حد تک صحیح
ہ ابتداً وہ متنبی سے متاثر تھا، لیکن بعد میں اس نے اپنی نئی راہ نکالی، دونوں شاعروں کے مزاج اور مذاق میں بہت اختلاف تھا
سے بنیادی طور پر ان کی شاعری میں بھی بڑا فرق پایا جاتا ہے۔ متنبی کے الفاظ اور اسلوب بیان ابوالعلاء کے مقابلہ میں زیادہ واضح ہیں
اس کا فلسفہ اور حکمت محض تکلف اور آورد ہے۔ اس کے مقابلے میں ابوالعلا فطری فلسفی اور حکیم ہے۔ اس کے فلسفیانہ خیا... بے
تکلف نہیں معلوم ہوتا۔ ابوالعلا نے شعر و ادب سے کبھی کوئی مادی فائدہ حاصل نہیں کیا لیکن متنبی کا پیشہ شاعری تھا، متنبی عزت نفس،
عظمت و شان کے دعوے کے باوجود مال و دولت کا حریص اور دنیا کا دلدادہ تھا۔ اس کے لئے عمر بھر بادشاہوں اور وزیروں کی مدح
تا، لیکن ابوالعلاء کو مال و دولت سے نفرت اور دنیا کے جاہ و حشم سے کوئی واسطہ نہ تھا اس لئے کبھی کسی کی مدح و ستائش نہیں کی، متنبی
د اور تکبر کے باوجود شاعری کو پیشہ بنانے میں عار نہ ہوا۔ لیکن ابوالعلا نے انکسار و تواضع کے باوجود زندگی بھر کسی کا احسانمند بننا پسند
، متنبی کو جاہ و حشمت کی طلب نے دروغ گوئی پر آمادہ کیا، اور ابوالعلا کی نگاہ میں دنیاوی جاہ و حشمت کی کوئی وقعت نہ تھی اور
ئی و راستبازی کا دامن اس کے ہاتھ سے کبھی نہ چھوٹا، متنبی دولت مند مگر بخیل تھا اور ابوالعلاء گولے بیٹھا لیکن دل کا غنی تھا
سے قدرتاً دونوں کی شاعری میں بھی بڑا فرق ہے، ابوالعلاء کی شاعری تکلف سے پاک سادہ اور عام انسانی جذبات اور بلند اخلاقی
فلسفیانہ خیالات کی صحیح عکاسی کرتی ہے۔

اس نے شاعری کو تخیل کی دنیا سے نکال کر حقیقت کا جامہ پہنایا اور ایسا فلسفیانہ طرز بیان ایجاد کیا جس سے لوگ اب تک ناآشنا
، گو ابوالعلاء سے بہت پہلے عربی شاعری فلسفیانہ خیالات سے آشنا ہو چکی تھی اور زہیر بن ابی سلمی، عدی بن زید، ابوالعتاہیہ اور
دیگروں نے بھی فلسفہ و حکمت کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا اور ابوالعلاء کا کوئی مقابلہ نہیں، زہیر
حکمت فطری اور ان کی سادہ زندگی کے تجربات کا نتیجہ تھی۔ اس لئے اس میں کسی خاص نظریہ اور فکر کو کوئی دخل نہیں ہے، عدی،
ں اور ابوالعتاہیہ مذہب اسلام کا پیرو تھا اور دونوں کی حکمت ان کے مذاہب سے ماخوذ ہے، متنبی کے فلسفہ و حکمت کی نوعیت محض
نی ہے، لیکن شاعری میں الہیات، طبعیات اور ریاضیات اور اخلاق کے متعلق فلسفیانہ خیالات پیش کرنا اور فلسفہ کو اس کے
مقام اور کتابوں سے نکال کر ایسی جگہ لے آنا کہ انسان کا ذہن خود بخود اس کی جانب مائل ہو جائے، ابوالعلاء کا کارنامہ ہے، ابوالعلاء

کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس نے ایک مستقل موضوع پر ایک پورا دیوان مرتب کیا، یعنی "درعیات" جس میں صرف زرہ کا ذکر ہے۔

اس کی شاعری کا ایک خاص مقصد اور نقطۂ نظر ہے، اس کی تفصیل آئندہ آئے گی، فحش، یا وہ گوئی، کذب بیانی، مبالغہ آرائی، بے جا مدح کا جس کو شاعری کا اصلی کمال سمجھا جاتا ہے۔ اس کے یہاں کوئی وجود نہیں۔

اذا قلت شعرا لست فیه بکاذب   فما انا تائب الا کلبید

جب میں شعر کہتا ہوں تو کوئی گناہ کی بات نہیں کرتا بلکہ لبید کی طرح میں بھی تائب ہو گیا ہوں

رسالۃ الغفران میں اپنی غلط تعریف کئے جانے پر ناگواری اور اپنی خطا کاری کا اعتراف کرتے ہوئے حضرت مسیح کے واقعہ سے استدلال کرتا ہے، وہ کہتا ہے کہ زبان و ادب کے جگادری اور نحو و لغت کے شواہد کی تلاش میری شاعری میں بے سود ہے وہ شاعری کیا جس سے صدق و کذب، صحیح و غلط اور ہدایت و ضلالت میں امتیاز نہ ہو سکے۔

من یبغ عندی نحوا او یروم لغۃ   فما یساعف من هذا ولا هذی

یکفیک شعر من الدنیا ومنقصۃ   ان لا یبین للشانی ری من الهاذی

وہ ان شاعروں پر افسوس کرتا ہے جن کی شاعری کا مقصد صرف لفاظی ہے، اس لئے ان کی پیداوار کذب، یا وہ گوئی اور مداحی تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے اور عام لوگ اسی کو کمال سمجھتے ہیں۔

بنی الآداب غرتکم قدیما   زخارف مثل زمزمۃ الذباب

وما شعراؤکم الا ذئاب   تلصص فی المدائح والسباب

اضر لمن تود من الاعادی   واسرق للمقال من الزباب

عام شاعروں کا حال وہ رسالۃ الغفران میں یہ بیان کرتا ہے کہ شعراء آوارہ اور بے راہ رو ہوتے ہیں، وہ الٹی سیدھی اور غلط سلط باتیں کرتے ہیں، قرآن کی اس آیت سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے الم تر انھم فی کل واد یھیمون وانھم یقولون ما لا یفعلون (ص ۲۴، ۲۵)

وہ اس اصول کا قائل ہے کہ شعر و ادب کو انسانی زندگی کے حالات و تجربات کا ترجمان ہونا چاہئے یہی وجہ ہے کہ انسانی فطرت کی صحیح تصویر اور انسانی زندگی کی جتنی دلچسپ تعبیر اس کے یہاں ملتی ہے اس کی مثال ان شاعروں کے یہاں تلاش کرنا بے سود ہے جن کا مقصد صرف خیال آرائی ہے۔

ومن تامل اقوالی رای جملا   یظل فیهن سر الناس مشروحا

ابو العلاء کا فلسفہ اس کے نقطۂ نظر کی طرح اس کی زندگی اور شخصیت میں بھی ڈھلا ہوا ہے، مثلاً اس کی طبعی سادگی و قناعت، عزلت، روزہ کی مداومت، شراب نوشی سے اجتناب، تجرد کی زندگی، والدین اور اپنے وطن، ماحول اور معاصرین کا بھی ذکر ہے۔

(مولوی ضیاء الدین اصلاحی)

ہماری نظر میں

شعلۂ جان

از :- قدر سعیدی، ضخامت ۱۰۸ صفحات، مجلد، رنگین سرورق، قیمت چار روپے۔
ملنے کا پتہ :- سلطان حسن اینڈ سنز، متصل مولوی مسافر خانہ، بندر روڈ، کراچی

جناب قدر سعیدی نے حالات کی ناسازگاری کے باوجود شعر و سخن میں ترقی کی منزلیں طے کی ہیں اور کسی پروپیگنڈے اور خارجی سہارے کے بغیر شہرت حاصل کی ہے۔ ان کی زندگی کشمکش کی زندگی بلکہ یوں کہئے ایک دکھی انسان کی زندگی رہی ہے، اُن کی شاعری پر اُن کے تخلص کا اثر پڑا ہے جس نے لذتِ درد کو سمو دیا ہے۔ قدر سعیدی کے کلام میں سوز و گداز اور احساس کی شدت پائی جاتی ہے۔

کیا کہوں اے ہم نفس، دنیا کی حالت کیا کہوں
دوستوں کی دشمنی اپنی محبت کیا کہوں

چند آہیں، چند آنسو، ذلت افلاس کے
جذبۂ انسانیت کی قدر و قیمت کیا کہوں

بلکہ میں مجرم ہوں میں نے ہی کیا ہے جرم یہ
دوسروں کے جرم پہ اپنی ندامت کیا کہوں

اہلِ عالم کا جنونِ سنگ باری کچھ نہ پوچھ
اور اپنے شیشۂ دل کی نزاکت کیا کہوں

ان شعروں میں قدر سعیدی نے "آپ بیتی" بیان کی ہے۔ زندگی سے انہیں تلخیاں اور ناکامیاں ملی ہیں! ان کی شاعری ٹوٹے ہوئے دل کی "صدائے بازگشت" ہے! چند منتخب اشعار :-

دامِ صیاد سے رہا ہو کر
ہیں اسیرِ حوادثِ پروانہ

اک وہم سہی ترا تصور
کچھ دل کو پناہ تو ملی ہے

کر نہ لے دوسرا صنم پیدا
میرے سجدوں کی ناپذیرائی

جہاں سینکڑوں بتکدے ڈھا دئے ہیں
خدا بھی تراشے ہیں کچھ بندگی نے

مٹ جاتے ہیں سینکڑوں حقائق
بنتا ہے کہیں جب اک فسانہ

اک لمحہ کو روک گردشِ جام
شاید کہ زمانہ لوٹ آئے

تیری ہی تلاش و جستجو میں
ہم دل میں ترے تجھے چھپائے

پہنچ جاتے ہیں سب منزل پہ اپنی
غبارِ کارواں بھی کارواں بھی

تیری زلفِ پریشاں سنورتی تو کیا
اک خوابِ پریشاں سے ہم ہو گئے

چین پاتا نہیں، یہاں بھی دل
اب کہاں جاؤں تیری محفل سے

پہچان سکو گے اب مجھے کیا
میں اپنے لئے بھی اجنبی ہوں

دوسروں کو فریب دیتے وقت
آدمی خود فریب کھاتا ہے

تیری آواز گر نہ آئے گی
سازِ ہستی کو توڑ ڈالوں گا

[illegible]

ہے اہلِ کمال طریقت یہ وہ مقام — گمراہیوں کا خوف مجھے راہبر سے ہے
رسوائیوں کے خوف کا عالم گذر گیا — اب دل کی دھڑکنوں کے چھپانے کے دن گئے

نعتِ رسولؐ میں یہ اشعار کس قدر ایمان افروز ہیں :—

ظلمات سے مہر و ماہ ڈالے — بکھرے ترا غم آبگینے
اُبھرے ہیں تمہارا نام لے کر — ڈوبے ہوئے سینکڑوں سفینے
مرنے کے لئے نہیں مسلماں — جینے کے سکھا دئے قرینے
لولاک لما خلقت الافلاک — پایا ہے شرف یہ آدمی نے

"شعلۂ جاں" میں اس قسم کے اشعار بھی نظر آئے جو انتخاب کرتے وقت چھانٹ دینے چاہئے تھے، مثلاً :—

نام اُن کی جفا کا کر رہا ہوں — اللہ اپنی وفا پہ مر رہا ہوں
خوابِ درازِ غم کی کسلمندیاں نہ پوچھ — محسوس ہو کہ نیند نہ آئی تمام رات
کیا آلِ یقین منزل ہے — وہم و فکر و نظر میں بیٹھے ہیں
خود نہیں معلوم اپنے دل میں کیا رکھتا ہوں — یعنی دور از عقل و فہم اک مدعا رکھتا ہوں
اپنی عظمت پہ ناز فرما ہوں — دیکھ کر خوئیں زمانے کی
تو نے گر مجھ سے بے وفائی کی — میں حسابِ وفا چکا لوں گا
نہ مر جائیں دلدادگانِ مدینہ — نہ چھیڑو کوئی داستانِ مدینہ
کام آئی نہ تیری سعیٔ کرم — آج تک بھی اُداس رہتا ہوں
اُبھرے نہ تھے خواب کے سفینے — آشفتگیٔ نظر سے پہلے

(یعنی ——— ! ؟ . . . .)

قمر سعیدی[1] نے نظمیں اور رباعیاں بھی کہی ہیں! اُن کی نظم "گریز کا استقبال" بڑی جاندار اور اثر انگیز نظم ہے اور ساتھ ہی شاعرانہ کردار پر چبھتی ہوئی طنز بھی! توقع ہے ادبی حلقوں میں "شعلۂ جاں" کی پذیرائی کی جائے گی۔

---

[1] جناب قمر سعیدی تین چار سال سے کینسر میں مبتلا ہیں اور اب کئی مہینے سے پریشان روزگاری اور بیماری کے ساتھ مرض بھی بہت زور پکڑ گیا ہے اور وہ موت و حیات کی کشمکش سے دوچار ہیں۔ قارئین "فاران" اُن کی صحت کے لئے دعا کریں اور .... اُن کا پتہ :—

قمر سعیدی، میونسپل لائبریری، ٹنڈو آدم (مغربی پاکستان)

آدم جی کاٹن ملز لانڈھی کراچی

مسرور حسین پبلشر نے انٹرنیشنل پریس کراچی میں چھپا کر دفتر ماہنامہ "فاران" کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱ سے شائع کیا۔

امتِ محمدیہ میں بہت سے فرقے پائے جاتے ہیں، ان کے آپس میں فقہ و عقیدہ کے اختلافات بھی ہیں، وہ ایک دوسرے کو گمراہ بھی سمجھتے ہیں ان میں باہمی مناظرے اور مباحثے ہوتے ہیں اور ہزارہا صفحے کا لٹریچر ایک دوسرے کی تردید میں ملتا ہے ایک وہ گمراہی ہوتی ہے جس پر کفر کا اطلاق ہوتا ہے ـــــ مثلاً یہ کہ بعض فلاسفہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ کو جزئیات کا علم نہیں ہوتا، جیسے جیسے واقعات ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں، اللہ تعالیٰ کو جزئیات کا علم ہوتا رہتا ہے (معاذ اللہ) یہ عقیدہ "کفریہ" ہے مگر یہ تمام فلسفیوں کا عقیدہ نہیں ہے اور کوئی فرقہ اس عقیدہ پر قائم ہے اسی طرح بعض دوسرے کفریہ عقائد ہیں جو کسی فرقہ کے بعض افراد کے ہو سکتے ہیں، مگر پورے فرقہ پر اُس کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اس لئے ان فرقوں کی "گمراہی" وہ "ضلالت" نہیں ہے، جو کسی فرد یا جماعت کو امت محمدیہ سے باہر اور دائرۂ اسلام سے خارج کرتی ہے، یہ تمام فرقے ان تمام اختلافات کے باوجود اسلام ہی سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کے ماننے والے مسلمان ہی کہلاتے اور سمجھے جاتے ہیں۔

ـــــ مگر ـــــ

اس دنیا میں دو ایسے گروہ بھی پائے جاتے ہیں، جن کے مسلمانوں جیسے نام ہیں، اور جو اپنی تقریر و تحریر میں قرآن و حدیث اور اسلامی ادب کی دوسری کتابوں سے استدلال کرتے ہیں، لیکن وہ امتِ محمدیہ سے خارج اور اسلام کے دائرے سے باہر ہیں: ان میں سے ایک فرقہ بہائی ہے، جو مسلمانوں سے بعض سرسری "مشابہتوں" کے باوجود اپنے کو "مسلمان" نہیں کہتا اور نہ خود کو "امتِ محمدیہ" میں شامل جانتا ہے بلکہ وہ اپنے کو دوسرے مذہبوں کی طرح جداگانہ مذہب سمجھتا ہے! بہائی اس معاملہ میں سچے ہیں کہ وہ اپنے کو مسلمان بتا کر اور اسلام کا بہروپ دھار کر اپنے مسلک و مذہب کی طرف لوگوں کو دعوت نہیں دیتے! اس کے برعکس دوسرا گروہ قادیانیوں کا ہے، یہ لوگ مرزا غلام احمد کو نبی تسلیم کرنے کے بعد امتِ محمدیہ میں شامل نہیں رہتے اور دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتے ہیں ـــــ مگر اُن کا دعویٰ یہی ہے کہ وہ "مسلمان" ہیں بلکہ اسلام کے حقیقی نمائندے وہی ہیں۔

اس تکلیف دہ بحث کو چھیڑنے کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ پاکستان میں پچھلے چند سالوں سے قادیانیوں کی جرأتیں بہت بڑھ گئی ہیں اور وہ کھل کر مسلمانوں کو اپنے مسلک کفر و ضلالت کی دعوت دینے لگے ہیں، ہمارے پاس بھی کچھ دنوں سے اُن کا لٹریچر آ رہا ہے جسے پڑھ کر جو روحانی تکلیف اور قلبی اذیت ہوتی ہے، اس کا اظہار الفاظ میں نہیں ہو سکتا، ہم نے ان لوگوں کو سختی کے ساتھ لکھا کہ اپنی خرافات ہمارے پاس نہ بھیجا کریں، قادیانیوں کو ہم امتِ محمدیہ سے باہر اور اسلام کے دائرے سے خارج سمجھتے ہیں اور مرزا غلام احمد قادیانی کا نام سن کر دل میں جو نفرت پیدا ہوتی ہے، اتنی نفرت ابوجہل اور ابولہب کا نام سن کر بھی نہیں ہوتی، اسی عقیدے پر ہم اپنا خاتمہ چاہتے ہیں ـــــ ہمارے اس لکھنے کے باوجود احمدیہ بلڈنگس لاہور سے "ضمیمے" اور "پمفلٹ" آتے رہتے ہیں، حال ہی میں عبدالمنان عمر کے نام سے ایک "ضمیمہ" آیا ہے، جو

"قادیانی علم کلام" کاش بیکار ہونے کے سبب کذب و افترا اور دجل و فریب کا "سیاہ نامہ" ہے!

جب قادیانی اپنے مسلکِ کفر کی طرف مسلمانوں کو بلا سکتے ہیں، اور اُن کو اس کی چھٹی ملی ہوئی ہے کہ وہ تحریر و تقریر کے ذریعہ اپنے فاسد اور کفریہ عقائد کی دعوت دیں اور مسلمانوں کو گمراہ کریں ——— تو ہمیں اس اجازت اور فطری حق سے کون محروم کر سکتا ہے۔ ہم اُن کے دجل و فریب کو منظرِ عام پر لاکر، اہلِ ایمان کو بتائیں کہ قادیانیوں کی دعوت کفر و ضلالت کی دعوت ہے، یہ لوگ حق کی تلبیس کرتے اور سچائی کو جھٹلاتے ہیں! یہ وہ گروہ ہے جس کے "کفر و ارتداد" پر مسلمانوں کے تمام فرقے متفق ہیں! اور آپس کے تمام اختلافات کے باوجود "قادیانیت" کے کفر پر سب کا اتفاق ہے!

قادیانیوں کی دو ٹولیاں ہیں، ایک وہ ٹولی جو مرزا غلام احمد کو "نبی" مانتی ہے جس کا صدر مرکز پاکستان میں "ربوہ" ہے، دوسری ٹولی "لاہوری جماعت" ہے جو غلام احمد کو "مجدد" کہتی ہے، مگر عقیدہ اور نتیجہ کے اعتبار سے یہ دونوں قادیانی ٹولیاں دائرہ اسلام سے خارج ہیں! اور "الکفر ملۃ واحدۃ" کی مصداق ہیں! اصل کی بات یہ ہے کہ غلام احمد "نبوت" کا دعویٰ کرنے کے بعد کافر و مرتد ہو گیا اور نبی کاذب کو جو کوئی "مجدد" کہتا ہے، وہ اپنے اس قول و عقیدہ کے سبب خود کافر ہو جاتا ہے!

غلام احمد قادیانی کے بعض دیکھنے والے ابھی تک پائے جاتے ہیں۔ اس کی لکھی ہوئی کتابوں کے بارے میں کسی نے یہ نہیں کہا کہ اُن میں لوگوں نے تحریف کر دی ہے اور عبارتوں کو الٹ پلٹ کر دیا ہے، غلام احمد نے کسی ابہام کے بغیر اس کا دعویٰ کیا کہ میں نبی ہوں اور عیسیٰ، موسیٰ اور دوسرے نبیوں کی مانند ایک نبی ہوں اُس کے ساتھیوں کو "صحابی" لکھا جاتا ہے اور اُس کی بیوی کو "ام المومنین" قادیان میں خود ساختہ نبوت کا پورا انسٹی ٹیوشن اپنے تمام لوازم کے ساتھ قائم تھا، ان آفتاب سے زیادہ روشن شواہد و حقائق کے ہوتے ہوئے "لاہوری جماعت" کا یہ کہنا کہ مرزا قادیانی نے نبوت کا نہیں "مجددیت" کا دعویٰ کیا تھا، کس قدر سفید جھوٹ ہے! لاہوری جماعت مرزا غلام احمد کو "مجدد" مان کر کفر کا ارتکاب بھی کرتی ہے اور جھوٹ بھی بولتی ہے!

راقم الحروف نے اوپر کہا تھا کہ ——— "مرزا غلام احمد قادیانی کا نام سُن کر دل میں جتنی نفرت پیدا ہوتی ہے، اتنی نفرت ابوجہل، ابولہب کا نام سُن کر بھی نہیں ہوتی" ——— یہ بات شاید بعض لوگوں کے دلوں میں کھٹک پیدا کرے اس لئے اس کی تصریح ضروری سمجھی گئی، سنئے اور پوری توجہ کے ساتھ سنئے:—

کسی ملک میں ایک شخص جو اُس ملک کی رعایا ہے، وہاں کے بادشاہ کی اطاعت سے انکار کرتا ہے تو اپنی اس حرکت کے سبب وہ بادشاہ کا باغی سمجھا جائے گا، مگر دوسرا شخص خود اپنی بادشاہت کا اعلان کرتا ہے اس اعلان کے باعث بادشاہ اور وہاں کی رعایا کی نگاہ میں یہ شخص اس باغی سے زیادہ مبغوض اور شدید تر مجرم قرار پائے گا کہ وہ بادشاہ کا صرف باغی اور نافرمان ہی نہیں بادشاہ کا "حریف" بھی ہے ——— تو ابوجہل اور ابولہب کافر ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاند ہیں مگر حضور کے "حریف" نہیں ہیں، مرزا غلام احمد قادیانی اپنی نبوت کے دعوے کے سبب حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کا "حریف" اور "مدِمقابل" قرار پاتا ہے، اس لئے حضور خاتم النبیین (روحنا فداہ الفداء) کے ہر اُمتی کے دل میں اس مدعی نبوت اور نبی کاذب سے نفرت تمام کافروں اور ملحدوں سے بڑھ کر ہونی چاہئے!

ایک اور مغالطہ کی تصریح بھی ضروری ہے ——— یہ بادشاہ جس نے اصل بادشاہ کے ہوتے ہوئے اپنی بادشاہت کا اعلان کیا ہے اس اعلان کے ساتھ یہ بھی کہتا جاتا ہے کہ میں تو بادشاہ سلامت کا خادم اور ادنیٰ فرمانبردار ہوں، میری بادشاہت تو حضور والا کی ملوکیت کا ظل اور بروز ہے، میں تو اعلیٰ حضرت خلد اللہ ملکہ کے طفیل میں "بادشاہ" بنا ہوں، بادشاہ سلامت ہی کا بنایا ہوا قانون میرے لئے واجب العمل ہے مگر ساتھ ہی وہ مدعی بادشاہت اپنا دار الخلافہ بھی قائم کرتا ہے، اس کے بعض کارکن "وزیر" کہلاتے ہیں، اُس کے نام کے ساتھ "جلالۃ الملک"

بادشاہ کی بیوی کے نام کے ساتھ "حضرت ملکہ عالیہ" لکھا جاتا ہے ـــــ انصاف سے بتایئے کہ اصلی بادشاہ کی تعریف میں اس جعلی بادشاہ کی مدیحہ خوانی اور اظہار عقیدت کو مضحکہ و منافقت اور دجل و فریب کے علاوہ اور کیا سمجھا جا سکتا ہے، یہی مثال مرزا غلام احمد قادیانی کے ان اقوال پر پوری اترتی ہے جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح و توصیف کی گئی ہے۔

قرآن کریم واضح طور پر کسی تشابہ اور رمز و کنایہ کے بغیر حضرت سیدنا محمد بن عبداللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو "خاتم النبیین" کہتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "لا نبی بعدی" فرماتے ہیں کہ میرے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے ـــــ کتاب و سنت کے ان تصریحات و اعلانات کے بعد مرزا غلام احمد کا "دعوائے نبوت" خدا اور رسول کو صریح طور پر جھٹلانا نہیں تو اور کیا ہے (معاذاللہ) ارشاد خداوندی اور اقوال رسول کی صریح تکذیب کرتے ہوئے مرزا غلام احمد کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح و منقبت کرنا، کتنی خطرناک منافقت اور کس درجہ گمراہ کن دجل و فریب ہے۔

"ختم نبوت" کے مسلم و متفق علیہ عقیدہ کے ہوتے ہوئے "نبوت" کا اعلان اس سے بڑی بغاوت، نافرمانی، مخالفت اور گستاخی شان نبوت میں اور کیا ہو سکتی ہے ـــــ اس صورت میں غلام احمد قادیانی جیسے کاذب کی زبان سے نبی آخر صادق و مصدوق کی مدح و توصیف اپنی جگہ خود ایک بہت بڑا دھوکا اور فراڈ ہے اور مسلمانوں کو بے وقوف بنانے کی ایک چال ہے۔

اسی انداز و نہج پر قادیانی اپنی تحریر و تقریر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو "خاتم النبیین" کہتے ہیں اور اس طرح مسلمانوں کو مغالطہ دیا جاتا ہے، امت مسلمہ "خاتم النبیین" سے یہ مراد لیتی ہے کہ اب قیامت تک کسی قسم کا کوئی (نیا) نبی نہیں آئے گا، ختم رسالت آپ پر نبوت کو ختم کر دیا گیا اور اللہ تعالیٰ کا دین ہر اعتبار سے مکمل ہو چکا، مگر قادیانی اس لفظ (خاتم النبیین) کو بول کر یہ مفہوم پیدا کرتے اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ "خاتم النبیین" سے مراد "افضل النبیین" ہے ـــــ نبوت اس معنیٰ میں ختم نہیں ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب کسی قسم کا کوئی "نبی" ہی نہیں آئے گا ـــــ دین کی تجدید و اصلاح کے لئے "انبیاء" آتے رہیں گے ـــــ وعلم جرا ـــــ تو قادیانیوں کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو "خاتم النبیین" کہنا، اس تصور عقیدہ اور نظریہ سے بالکل مختلف ہے، جو عقیدہ اور نظریہ امت مسلمہ کا ہے۔

ختم نبوت کے بنیادی عقیدہ کی تکذیب و نفی کرنے اور نبی کاذب کو نبی ماننے کے بعد "قادیانی" کسی تذبذب و اشتباہ کے بغیر کافر ہو جاتے ہیں، اور کفر کے بعد کوئی عمل خیر مثلاً نماز، روزہ، حج، قرآن کا پڑھنا، زکوٰۃ کا دینا ـ ـ ـ ـ ـ اُن کے لئے نفع بخش نہیں ہو سکتا، نیک اعمال "ایمان" کے ساتھ فائدہ دیتے اور آخرت میں کام آتے ہیں، کفر و ارتداد کی حالت میں اُن کا حال ریت کے ذرات کی طرح ہے جو ذرا سی پھونک مارنے سے اُڑ جاتے ہیں۔

قادیانی جو پوری امت مسلمہ اور اُس کے تمام فرقوں کے نزدیک امت محمدیہ اور اسلام کے دائرے سے خارج ہیں "اسلام" کا نام لے کر، اپنے مسلک کفر و ضلالت کی طرف دعوت دیتے ہیں، اسلام، قرآن، خدا اور رسول کے ناموں اور اصطلاحوں کو ان لوگوں نے اپنے کفریہ عقائد کی تبلیغ کے لئے آڑ بنا رکھا ہے۔

۱۹۵۷ء میں اس گنہگار کو حرمین شریفین کی زیارت اور اُس ارض مقدس کی حاضری نصیب ہوئی، میں نے محسوس کیا کہ قادیانیوں کا نام سنتے ہی نجد و حجاز اور مصر و شام کے علماء کی پیشانیوں پر بل پڑ جاتے ہیں، جیسے یہ ذکر اُن کے لئے انتہائی تکلیف دہ ہے، قادیانیوں کے "کفر" کے سب قائل ہیں۔

میں نے پتہ لگایا تو معلوم ہوا کہ شریف حسین کے عہد حکومت میں پاک پتن (پنجاب) کے کچھ قادیانی تاجر حجاز آ گئے تھے، جن کی جدہ میں تجارت تھی، یہ لوگ "نفتی" کہلاتے تھے انہوں نے یہاں کے لوگوں میں اپنے عقائد کی تبلیغ روپیہ پیسہ کے لالچ سے شروع کی، کچھ دن تک یہ

معاملہ چلتا رہا پھر یہ بات پھوٹ نکلی، یہاں تک کہ حکومت کو اس فتنہ کا علم ہوگیا۔

حکومت کے احتساب کا رنگ دیکھ کر پاک پٹن کے وہ قادیانی تاجر تو فرار ہوگئے، مگر وہ عرب جو قادیانیوں سے میل جول رکھتے تھے پکڑے گئے، پولیس نے کچھ رجسٹر بھی برآمد کئے جن میں ان لوگوں کے نام لکھے تھے جن کو یہ قادیانی سوداگر تنخواہ دیا کرتے تھے ——— بے پڑھے لکھے لوگوں کو تو حکومت نے باز پرس کے بعد چھوڑ دیا، مگر وہ عرب جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے، ان کو کچھ دن قید و بند میں رکھا کہ تم ان کے دام اور دھوکے میں کیسے آگئے؟ انہوں نے اپنی صفائی میں یہی کہا کہ یہ "فتنی" مرزا غلام احمد کا ہم سے ذکر کیا کرتے تھے کہ اس شخص نے اسلام کی خدمت کی ہے، بس اسی حد تک ہم جانتے ہیں، ہمیں اور کسی بات کا پتہ نہیں، چند دن کے بعد یہ لوگ چھوڑ دئے گئے اور اس طرح قادیانی فتنہ کا بالکل شروع ہی میں سر کچل دیا گیا کہ ———

سرِ چشمہ باید گرفتن بہ میل

سلطان ابن سعود مرحوم کے دورِ حکومت میں کسی قادیانی کے جدہ آنے کی حکومت کو اطلاع ملی تھی، جب وہ قادیانی جدہ میں آیا تو اسے گرفتار کر لیا گیا اور پھر جدہ سے باہر باہر لوٹا دیا گیا کہ حدودِ حرم میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اُمتی داخل ہو سکتے ہیں، مرزا غلام احمد قادیانی کے اُمتی قدم نہیں رکھ سکتے۔

مغربی ممالک میں عیسائی ان قادیانیوں کے دام تزویر میں اسلام ہی کے نام پر آجاتے ہیں، یہ فتنہ ساز شروع میں مرزا غلام احمد قادیانی کا نام مسلمانوں کے ایک پیرو کی حیثیت سے اُن کے کان میں ڈال دیتے ہیں، جب کوئی عیسائی اسلام قبول کر لیتا ہے تو پھر اُسے یہ باور کراتے ہیں کہ مرزا غلام احمد کو نبی یا مجدد ماننا اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے بس وہ بے چارہ دین سے ناواقفیت کے سبب ان کے چکر میں آجاتا ہے، مگر جو نومسلم اس حقیقت سے باخبر ہو جاتے ہیں وہ ایک منٹ کے لئے بھی قادیانیوں کے کیمپ میں نہیں رہ سکتے! عام مسلمانوں کی اس بدگمانی کو دور کرنے کے لئے لارڈ ہیڈلے فاروق نے جب ہندوستان کا دورہ کیا تھا تو انہوں نے کھلے خزانے اعلان فرمایا تھا کہ میں مسلمان ہوں قادیانی نہیں ہوں۔

قادیانی عام مسلمانوں کو ایک اور مغالطہ دیتے ہیں کہ اپنے مذہب کو "سلسلۂ احمدیہ" اور مرزا غلام احمد کو "بانی سلسلہ" کہتے ہیں مسلمانوں میں طریقت کے جو چار سلسلے (قادری، نقشبندی، چشتی اور سہروردی) پائے جاتے ہیں کیا "سلسلۂ احمدیہ" بھی اسی قبیل کا کوئی سلسلہ و مشائخ ہے؟ پھر مسلمانوں میں جو فقہی مذاہب پائے جاتے ہیں "قادیانیت" اس طرح کا کوئی فقہی مسلک و مذہب بھی نہیں ہے! یہ سلسلہ نہیں ایک نبیِ کاذب کی مستقل امت ہے!

یہ کردار ———!؟

ہمارے پاس احمدیہ بلڈنگس لاہور سے عبدالمنان عمر نے جو ضمیمہ ماہنامہ روحِ اسلام (ماہ مارچ) بھیجا ہے وہ چار ورقوں پر مشتمل ہے اور شروع سے لے کر آخر تک دجل و فریب اور غلط قسم کی تاویلات کے سوا اور کچھ نہیں ہے!

اس سے کس اہلِ ہوش و دانش صاحبِ ایمان و یقین کو انکار ہے کہ ہر دور میں امام، مجددین اور مصلحین پیدا ہوتے رہیں گے، مسیح موعود بھی تشریف لائیں گے اور امام مہدی بھی!

——— مگر ———

غلام احمد قادیانی نہ مجدد تھا نہ مصلح تھا، نہ امامِ وقت تھا، نہ مسیح موعود اور امام مہدی تھا یہ شخص جھوٹی نبوت کا دعویٰ کر کے مرتد اور خارج اسلام ہوگیا اور جو کوئی فرد یا ادارہ اس شخص کی امامت، مجددیت، مہدویت، مسیح موعودیت اور نبوت کی طرف لوگوں کو بلاتا ہے وہ خود گمراہ ہے اور دوسروں کو گمراہ کرنا چاہتا ہے!

غلام احمد قادیانی کی شاعری گھٹیا درجہ کی شاعری ہے اور یہی حال اس کی اُردو نثر کا ہے۔ انبیاء کرام کو اللہ تعالیٰ نے اعلیٰ درجہ کی فصاحت و بلاغت اور "جوامع الکلم" عنایت فرمائے ہیں اور انبیاء کرام شاعری بھی نہیں کیا کرتے یہ اُن کے مرتبہ اور مقام سے فروتر چیز ہے۔

اس کے علاوہ مرزائے قادیان کے جو حالات اور اقوال ملتے ہیں اُن میں نہ وہ پاکیزگی اور اولوالعزمی نظر آتی ہے جو مجددین اور مصلحین وقت کے یہاں پائی جاتی ہے نہ اُس میں بلندیٔ فکر ملتی ہے اور نہ حریتِ خیال! مرزا غلام احمد قادیانی نے پنجاب کے لفٹنٹ گورنر کو جو درخواستیں دی تھیں اُن کے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیے:-

- "میں دعوے سے گورنمنٹ کی خدمت میں اعلان دیتا ہوں کہ باعتبار مذہبی اصول کے مسلمانوں کے تمام فرقوں میں سے گورنمنٹ کا اول درجہ کا وفادار اور جان نثار یہی نیا فرقہ ہے، جس کے اصولوں میں سے کوئی اصول گورنمنٹ کے لئے خطرناک نہیں۔"
- "جو ہدایتیں اس فرقے کے لئے میں نے کی ہیں جن کو میں نے ہاتھ سے لکھ کر اور چھاپ کر ہر ایک مرید کو دیا ہے کہ اُن کو اپنا دستور العمل رکھے۔ ۔ ۔ ۔ ان ہدایتوں کو پڑھ کر۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ گورنمنٹ کو معلوم ہوگا کہ کیسے امن بخش اصولوں کی اس جماعت کو تعلیم دی جاتی ہے اور کس طرح بار بار اُن کو تاکیدیں کی گئی ہیں کہ وہ گورنمنٹ برطانیہ کے سچے خیرخواہ اور مطیع رہیں۔"
- "یہ ایک ایسی جماعت ہے جو سرکار انگریزی کی نمک پروردہ اور نیکیاں حاصل کردہ اور مورد مراحم گورنمنٹ ہے۔"
- "ہماری تو یہی دعا ہے کہ خدا اس گورنمنٹ محسنہ کو جزائے خیر دے اور اس سے نیکی کرے جیسا کہ اس نے ہم سے نیکی کی یہی وجہ ہے کہ میرا باپ، میرا بھائی اور خود میں روح کے جوش سے اس بات میں مصروف رہے کہ اس گورنمنٹ کے فوائد و احسانات کو عام لوگوں پر ظاہر کریں اور اُس کی اطاعت کی فرضیت کو لوگوں کے دلوں میں جما دیں اور یہی وجہ ہے کہ میں اٹھارہ برس سے ایسی کتابوں کی تالیف میں مشغول ہوں کہ جو مسلمانوں کے دلوں کو گورنمنٹ انگلشیہ کی محبت اور اطاعت کی طرف مائل کر رہے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

انگریز کو اسلام اور مسلمانوں سے جتنی کد اور عناد رہا ہے، وہ کسی ثبوت کا محتاج نہیں ہے، انگریزی حکومت کی جانب داری بھی سب پر روشن ہیں جس شخص نے ایسی متعصب اور اسلام دشمن حکومت کی "اطاعت کی فرضیت" لوگوں کے دلوں میں جمانے اور مسلمانوں کے دلوں کو انگریزی حکومت کی محبت و اطاعت کی طرف مائل کرنے کے لئے اٹھارہ برس تک ریاضت و محنت کی ہو، اُس شخص کے کردار و سیرت کے بارے میں کیا کوئی اچھی رائے قائم کی جا سکتی ہے؟ قرآن کریم میں جس "اولوالامر" کی اطاعت کا حکم ہے اُس کا مسلمان ہونا لازمی ہے، جو شخص "انگریز کی اطاعت" کو منصوص اور فرض سمجھتا ہو، اس کی دینی فکر کس قدر پست، سطحی بلکہ غیر اسلامی ہے کیا امام وقت اور مجدد زمان کا ایسا ہی کردار اور اُن کی فکر و فراست اسی قسم کی ہوا کرتی ہے۔

جو فرقہ انگریزی حکومت کا "نمک پروردہ" ہو، جس کی اطاعت و وفاداری پر اس فرقہ کا بانی اور پیشوا فخر کرتا ہو اور لفٹنٹ گورنر کی خدمت میں درخواستیں بھیج کر اپنی نیازمندی کا یقین دلاتا ہو ——— اس سے اندازہ کر لیجئے کہ وہ "فرقہ" کیا ہوگا اور اس کے بانی والے کے قول و کردار کی سطح کیا ہوگی؟ "قادیانیت" نے دراصل انگریز کے سایہ عاطفت میں نشو و نما پائی ہے اور اس امت کے "نبی کاذب" کی عمر کا خاصہ حصہ انگریز کی قصیدہ خوانی، وفاداری اور نیازمندی میں بسر ہوا ہے، ہم مسلمانوں کو جنہوں نے انگریزی سامراج سے ٹکر لی ہے اُس شخص کی خود ساختہ نبوت، مسیحیت، امامت

و مہدویت کی طرف دعوت دی جاتی ہے، جو انگریزی لفٹنٹ گورنروں کو اپنا محسن اور آقا سمجھتا تھا اور اُن کی چشمِ کرم کی آس لگائے رکھتا تھا۔

اس سے زیادہ فسکر و نظر کی پستی اور حقانیت و صداقت کے ساتھ مذاق اور کیا ہو سکتا ہے کہ گندے پانی کا غلیظ تالاب، کوثر و تسنیم کو اپنی طرف بُلانے کے لئے، اصرار کرتا ہے، نجاست میں لتھڑے ہوئے ٹھیکرے اور خزف ریزے، صاف و شفاف لعل و گوہر کو اپنے نظام کی دعوت دیتے ہیں حنظل شہد پر، دھتورا لالہ و گل پر، زہر آبِ حیات پر اور اندھیرا اُجالے پر طنز کرتا ہے اور کفر ندامت کی بجائے اُلٹا ایمان کا مذاق اڑاتا ہے، بُرائی سچائی پر، جھوٹ سچ پر اور گمراہی ہدایت پر طعنہ زن ہے۔

مجددیت جن نفوسِ قدسیہ کو زیب دیتی ہے ان میں قرنِ اول کے متصل بعد ہی جس مقدس شخصیت پر نگاہ پڑتی ہے وہ حضرت سیدنا عمر ابن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کی ذاتِ گرامی ہے! امت مسلمہ کی غالب اکثریت تقریباً بارہ سو سال سے ہر دور میں اس مجددِ دوسال اور امامِ وقت کو خراجِ عقیدت پیش کرتی رہی ہے ــــــ ہندوستان کے صلحاء اور اکابر اتقیاء میں حضرت احمد سرہندی قدس سرہ العزیز کا نام سب سے نمایاں ہے، "مجدد" اُن کے نام کا جزو لاینفک بن کر رہ گیا ہے، اُن کے بعد شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز کی عظیم شخصیتیں ہیں جنہوں نے تجدید و اصلاح کے کارنامے انجام دئے ہیں! مرزا غلام احمد کے زمانے میں جو شخصیتیں علم و تقویٰ، تزکیۂ نفس اور عزیمت و استقامت میں نمایاں حیثیت رکھتی ہیں اور جن کی صحبت اور فیض تربیت سے خیر و ہدایت پھیلی ہے، اُن چند کے نام یہ ہیں۔

حضرت شاہ امداد اللہ مہاجر، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی، حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی، حضرت مولانا محمد شیر میاں پیلی بھیتی . . . . . رحمہم اللہ تعالیٰ، ان بزرگوں کا جو کردار ہے، سیرت و اعمال میں تعلیم و تربیت ہے، اُس کے مقابلہ میں غلام احمد قادیانی کی حیثیت اتنی بھی نہیں ہے، جتنی بادشاہ کے مقابلے میں ایک شاگرد پیشہ، چوبدار اور غلام کی ہوتی ہے! ان نفوسِ قدسیہ کے ہوتے ہوئے، کس بے وقوف اور کور باطن کی نگاہ مرزا غلام احمد کی طرف جا سکتی تھی! جن بزرگوں نے انگریزی حکومت سے جہاد کیا ہو، ایک مسلمان کا دل اُن کی طرف کھنچے گا یا اُس شخص کی طرف جس نے اٹھارہ سال تک انگریز کی اطاعت و نیازمندی کی مسلمانوں کو دعوت دی ہو اور انگریزی حکومت کی اطاعت کو شریعت کی رو سے فرض اور منصوص ثابت کیا ہو ــــــ جب ستم ماری جاتی ہے، دل و دماغ پر گمراہی کا پوری طرح تسلط ہو جاتا ہے اور "یتخبطہ الشیطان" جیسی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے تو پھر عبدالماجد کرم جیسے لوگ ہدایت پاتے ہوؤں کو کفر و ضلالت کی طرف بلاتے ہیں اور مغالطہ آمیز منطق چھانٹتے ہیں! کشف، الہام اور رویائے صادقہ اور طہارت و اخلاق سے نسبت اپنی جگہ درست مگر مرزا غلام احمد کو ان کیفیات سے دور کی نسبت بھی نہیں ہے، کشف و روحانیت تو اونچی باتیں ہیں، ایک عالم، شاعر، ادیب، انشاء پرداز اور مفکر و دانشور کے اعتبار سے بھی مرزا غلام احمد صفر ہی نظر آتا ہے۔

احمدیہ بلڈنگس لاہور کے "ضمیمہ پیغامِ اسلام" میں مجددیت، امامت، موعود مسیحیت اور مہدویت کی جو فضول بحث چھیڑ دی گئی ہے اس سلسلہ میں عرض ہے کہ بیشک امت میں ائمہ اور مجددین پیدا ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے مگر مرزا غلام احمد نہ مجدد ہے اور نہ امام ہے! حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جس زمانہ میں نزول اور امام مہدی کا جس دور میں ظہور ہوگا امت مسلمہ کا متفقہ فیصلہ ہے کہ وہ دور ابھی نہیں آیا، اس لئے اپنے ان دعووں کے سبب مرزائے قادیان امت مسلمہ کی نگاہ میں غیر صادق بلکہ کاذب قرار پاتا ہے! اب رہی نبوت تو اُس کا دروازہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی پر بند ہو چکا۔ اس لئے مرزائے قادیان کی نبوت امت مسلمہ کے نزدیک دجل و فریب اور کفر و ضلالت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

حرفِ آخر

"ختم نبوت" پر ہزاروں صفحوں کا لٹریچر مختلف زبانوں میں موجود ہے، جس کسی کو شبہ اور تذبذب ہو وہ ان کتابوں کو پڑھ کر اپنی تسلی کر سکتا ہے! حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے درجات اللہ تعالیٰ آخرت میں بلند فرمائے کتنی معقول اور سچی بات فرما گئے ہیں ــــــ کہ جو کوئی نبوت کا دعویٰ کرے اور کوئی مسلمان اس مدعی نبوت سے ثبوت طلب کرے تو

وہ ثبوت طلب کرنے والا کافر ہو جاتا ہے ——— اس کا سبب یہ بتایا گیا ہے کہ اُس مسلمان کا "ختم نبوت" پر ایمان نہیں، جبھی تو وہ
مدعی نبوت (متنبی) سے ثبوتِ نبوت طلب کرتا ہے اسلئے ختم نبوت پر ایمان نہ رکھنے اور حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد "نئے نبی"
کے ظہور و بعثت کے امکان کو ماننے کے بعد وہ مسلمان کافر ہو گیا۔

بالکل سامنے کی بات یہ ہے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی قسم کی نبوت کا بھی ظہور صحابہ کرام کے نزدیک ممکن
اور جائز ہوتا تو دورِ خلافت میں جن لوگوں نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا، اُن سے جنگ کرکے، اُنہیں قتل نہ کیا جاتا بلکہ پہلے اُن کے حالات معلوم
کئے جاتے، اُن کی زندگیوں کو جانچا اور پرکھا جاتا، اُن سے نبوت اور مامور من اللہ ہونے پر گفتگو کی جاتی ——— مگر صحابہ کرام چونکہ نبی آخر
کے بعد کسی نئے نبی کے ظہور و بعثت کے قائل نہ تھے، اس لئے انہوں نے مدعیانِ نبوت کو کاذب مفسد و مفتری اور حریف خاتم النبیین سمجھ کر اُن سے جدال اور قتال
کیا اور کافروں اور مرتدوں کی طرح اُن سے جنگ کی جس طرح غیرتِ توحید اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے الٰہ کو گوارا اور برداشت نہیں کرسکتی اسی طرح غیرتِ نبوت
حضور سید المرسلین حضرت خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے بعد کسی نئے نبی کے ظہور کو گوارا اور برداشت نہیں کرسکتی اس مسئلہ میں جو کوئی تساہل برتتا اور رواداری
سے کام لیتا ہے وہ منافق ہے۔

رواداری جن مسائل میں برتنی چاہیئے اور امت کو نزاع و جدال سے بچانا چاہیئے وہ فقہی اختلافات ہیں جو کوئی رفع یدین، آمین بالجہر اور قرأۃ خلف الامام
پر ہنگامہ برپا کرتا ہے وہ امت میں اختلاف ڈالنے اور انتشار و تفریق کے جرم عظیم کا ارتکاب کرتا ہے!

——— مگر ———

ختم نبوت کا مسئلہ کوئی فروعی فقہی مسئلہ نہیں ہے یہ تو ایمانیات کا بنیادی مسئلہ ہے اس کے نہ ماننے سے ایمان و اسلام کی نفی ہوتی ہے!

امت مسلمہ میں سب سے بڑا اختلاف و افتراق تو مرزا غلام احمد قادیانی کا پیدا کیا ہوا ہے کہ "امت محمدیہ" کے مقابلہ میں امت احمدیہ قادیانی پیدا کرکے اور خود
ساختہ جھوٹی نبوت کا نیا انسٹی ٹیوشن قائم کردیا "قادیانیت" کا وجود ہی اسلام اور امت میں اختلاف و افتراق کا سب سے بڑا فتنہ ہے — یہ فتنہ جب اپنی تبلیغ کرسکتا ہے اپنے مسلک
کفر و ضلالت کی طرف مسلمانوں کو بلا سکتا ہے اور اس کی ضلالت آمیز تبلیغ پر کوئی پابندی اور قدغن نہیں تو اس فتنہ کی تردید کا کیا مسلمانوں کو حق حاصل نہیں ہے؟ جھوٹی نبوت کی تردید
جو کوئی ملک میں تفریق و انتشار برپا کرنے کا سبب سمجھتا ہے اُسے اپنے ایمان اور ——— اسلام کا جائزہ لینا چاہیئے۔

فساق و فجار اور کافروں کو بھی کبھی کبھار سچا خواب نظر آسکتا ہے اور کاہنوں، نجومیوں اور جوتشیوں کی پیشین گوئیاں بھی
ٹھیک ثابت ہوتی ہیں، ان باتوں کی اہمیت "ایمان" کے ساتھ ہے "کفر" کے ساتھ ان کا کوئی وزن اور اہمیت نہیں ہے، تو جو شخص حضور
خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد "نبوت" کا دعویٰ کرکے کافر و مرتد ہو چکا اُس کے کسی سچے خواب کا نہ تو کوئی وزن ہے اور نہ
اُس کی کسی پیشین گوئی کا درست ثابت ہونا، اُس کے دعوائے نبوت کے "کذب" اور کفر و ارتداد کو ہلکا کرسکتا ہے! اس کے علاوہ جھوٹے نبی
کے ماننے والے رویائے صادقہ اور پیشین گوئیوں کے بارے میں بھی مغالطہ آمیز تاویلوں اور کذب و افترا سے کام لیتے ہیں۔

جہاں تک امامت اور تجدید و اصلاح کے منصب کا تعلق ہے امت کی نگاہ اُن شخصیتوں کی طرف جائے گی جو مسلمان ہیں، عالم دین
ہیں، صاحب تقویٰ ہیں، جن کی زندگیوں میں وہ خوبیاں ملتی ہیں جو اسلام کو مطلوب اور اللہ اور رسول کے نزدیک پسندیدہ ہیں!

امام الانبیاء، قدوۃ الاصفیاء، سید المرسلین، خاتم النبیین حضرت سیدنا و مطاعنا محمد عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام فداہ
ابی و امی پر اللہ تعالیٰ نے نبوت کے سلسلہ کو ختم فرما دیا اب قیامت تک کسی قسم کا بھی کوئی نبی نہیں آئے گا یہ امت مسلمہ کا متفقہ عقیدہ۔
اس کی مخالفت میں کسی مدعی نبوت کی طرف جب بھی کوئی دعوت دی جائے گی اُس سے دین و ملت میں انتشار پیدا ہوگا اور اس فتنہ کی تردید
اور سدِّباب تمام مسلمانوں پر واجب ہوگا، قادیانیوں کے تازہ لٹریچر کے جواب میں ہم نے اس فریضہ کو ادا کیا ہے!

ماہر القادری

از:- حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ
تلخیص ترجمہ:- عزیز الرحمٰن سواتی
متعلم دار العلوم کراچی

الم نجعل الارض مهادا والجبال اوتادا ○ و
خلقناکم ازواجا وجعلنا نومکم سباتا وجعلنا
اللیل لباسا وجعلنا النهار معاشا وبنینا فوقکم
سبعا شدادا وجعلنا سراجا وهاجا
وانزلنا من المعصرات ماء ثجاجا لنخرج
به حبا ونباتا وجنات الفافا ○

کیا ہم نے زمین کو فرش اور پہاڑوں کو میخیں نہیں بنایا اور ہم ہی نے تم کو جوڑا بنایا اور ہم ہی نے تمہارے سونے کو راحت کی چیز بنایا اور ہم نے رات کو پردہ کی چیز بنایا اور ہم ہی نے دن کو معاش کا وقت بنایا اور ہم ہی نے تمہارے اوپر سات مضبوط آسمان بنائے اور ہم نے ایک روشن چراغ بنایا اور ہم ہی نے پانی بھرے بادلوں سے کثرت سے پانی برسایا تاکہ ہم اس پانی کے ذریعہ سے غلہ اور سبزی اور گنجان باغ پیدا کریں۔

ان فی خلق السموٰت والارض واختلاف اللیل
والنهار والفلک التی تجری فی البحر بما ینفع الناس
وما انزل اللّٰه من السماء من ماء فاحیا به الارض
بعد موتها وبث فیها من کل دابة وتصریف الریاح
والسحاب المسخر بین السماء والارض لاٰیات
لقوم یعقلون ○

بلاشبہ آسمانوں کے اور زمین کے بنانے میں اور یکے بعد دیگرے رات اور دن کے آنے میں اور جہازوں میں جو کہ سمندر میں چلتے ہیں آدمیوں کی نفع کی چیزیں لے کر اور پانی میں جس کو اللہ نے آسمان سے برسایا پھر اس سے زمین کو تر و تازہ کیا اس کے خشک ہوئے پیچھے اور ہر قسم کے حیوانات اس میں پھیلا دیئے اور ہواؤں کے بدلنے میں اور سایہ میں جو زمین و آسمان کے درمیان مقید رہتا ہے۔ دلائل ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل رکھتے ہیں۔

الم تروا کیف خلق اللّٰه سبع سموٰت طباقا ○ و
جعل القمر فیهن نورا وجعل الشمس سراجا ○
واللّٰه انبتکم من الارض نباتا ○ ثم یعیدکم
فیها ویخرجکم اخراجا ○ افرءیتم ما تمنون
ءانتم تخلقونه ام نحن الخالقون ۔

کیا تم کو معلوم نہیں کہ اللہ نے کس طرح سات آسمان اوپر تلے پیدا کئے اور ان میں چاند کو نور بنایا اور سورج کو چراغ بنایا، اور اللہ نے تم کو زمین سے ایک خاص طور پر پیدا کیا پھر تم کو پھر زمین ہی میں لے جائے گا اور تم کو باہر لے آوے گا ○ اچھا پھر یہ بتلاؤ تم جو منی پہونچاتے ہو اس کو تم آدمی بناتے ہو یا ہم بنانے والے ہیں

ان آیتوں کو بار بار پڑھئے اور اس کائنات میں غور کیجئے زمین و آسمان کی یہ عجیب و غریب مخلوقات، قسم قسم کے حیوانات، طرح طرح کے

سبزہ زار اور کائنات کا یہ مضبوط اور مسلسل چلتا ہوا نظام جو کبھی ٹوٹتا ہے اور نہ کبھی اس میں کوئی خلل واقع ہوتا ہے، کیا یہ سب کچھ از خود ہو رہا ہے؟ کیا یہ عجیب و غریب نظام کسی پیدا کرنے والے سے بے نیاز ہے؟ اگر آپ کے دماغ میں کوئی فتور نہیں ہے تو آپ ان سوالات کا جواب ضرور نفی میں دیں گے، بلکہ آپ یقین کر لینے پر مجبور ہو جائیں گے کہ یہ کائنات ضرور کسی عظیم فرمانروا کے تابع ہے اور اسی کی تدبیر و تصرف سے اس کا یہ نظام قائم ہے۔ یہی بات قرآن کریم کی ان آیتوں میں بھی بتلائی گئی ہے۔

أَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؟

کیا اللہ کے بارے میں شک ہے جو کہ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے؟

اللہ تعالیٰ نے دعوت و تبلیغ کے لئے انبیاء بھی بھیجے اور کتابیں بھی نازل کیں، انہوں نے مخلوق کو توحید کی طرف تو بلایا لیکن یہ کہیں نہیں کہا کہ تم صانع کا اقرار کرو اس لئے کہ یہ بات پہلے ہی سے ان کی عقلوں میں صرف موجود ہی نہیں بلکہ راسخ تھی جیسے ہی انہوں نے ہوش سنبھالا انسان میں عقل آ گئی نہیں اس بات کا یقین ہو گیا کہ اس کائنات کا ضرور کوئی پیدا کرنے والا ہے اس بات کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی ان آیتوں میں بیان فرمایا ہے۔

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۝

اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمان و زمین کو کس نے پیدا کیا ہے تو ضرور یہی جواب دیں گے کہ "اللہ" نے پیدا کیا ہے۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ

تو تم یکسو ہو کر اپنا رخ اس دین کی طرف رکھو اللہ کی دکھائی قابلیت کا اتباع کرو جس پر اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے بدلنا نہ چاہئے بس سیدھا دین یہی ہے۔

علامہ اسمٰعیل شہید دہلویؒ فرماتے ہیں :-

"اس عالم میں غور کرنے کے بعد کہ اس کا ایک شاندار نظام ہے ایک کامل اور مضبوط تدبیر سے یہ نظام چل رہا ہے اس میں بلند و پست اور غائب و حاضر کے درمیان ایک خاص ربط ہے، اس میں قسم قسم کے تصرفات اور تبدیلیاں ایک خوب صورت اور بہتر تناسب سے پائی جاتی ہیں، ایک عقلمند آدمی اس نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ یہ سب کچھ ضرور کسی کے ارادے سے ہو رہا ہے اگر ان واضح دلائل کے بعد بھی وہ اس صانع و مختار کا انکار کرے تو اس کی مثال ایسی ہی ہوگی جیسے کوئی شخص ایک حسین مضمون کو دیکھے کہ اس میں شاندار سے شاندار الفاظ بہترین ترتیب سے موجود ہیں اور اس میں تمام فنی خوبیوں کی رعایت رکھی گئی ہے، اور اس کے بعد وہ اس عبارت سے یہ نتیجہ نکالے کہ اصل میں ہاتھ کو لرزہ ہوا تھا اس وقت ہاتھ میں قلم بھی موجود تھا تو اس لرزے کی وجہ سے قلم نے غیر اختیاری طور سے کاغذ پہ کچھ لکھا اور اتفاقی طور سے اچانک اس میں یہ شاندار ترتیب قائم ہو گئی، کہ نہ تو الفاظ میں کمی ہے نہ وہ الفاظ غیر مفید ہیں اور نہ اس میں کوئی غلطی پائی جاتی ہے، تو کیا آپ کے خیال میں ایسے شخص کو پاگل خانہ نہیں بھیجا جائے گا؟ یا یہ مثال لے لیجئے کہ ایک شخص ایک قصیدہ سنتا ہے جس میں وزن کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے اور طرح طرح کی صنعتیں اس میں موجود ہیں، فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ معیار پر وہ پورا اترتا ہے اور اس کے بعد وہ یہ رائے قائم کرتا ہے کہ دراصل شاعر درد سے بے چین تھا اس کے منہ سے چیخیں نکل رہی تھیں اتفاق سے وہ چیخیں مخارج سے ٹکرا کر الفاظ میں تبدیل ہو گئیں۔ الفاظ میں ایک خاص قسم کا تسلسل پیدا ہو گیا اور پھر یہ شاندار ترتیب قائم ہو گئی، اس کے بعد خود بخود اس میں وزن اور قافیہ پیدا ہو گیا اور اسی طرح اتفاقاً ایک شاندار

قصیدہ بن گیا، نہ شاعر نے وزن وقافیہ کی طرف توجہ کی تھی نہ اس نے قصیدہ کہنے کا ارادہ کیا تھا اور نہ اس نے اس قصیدہ میں قسم قسم کی صنعتیں پیدا کرنے کا خیال تک کیا تھا، کیا آپ اپنے معاشرے میں ایسے عقلمند کا وجود برداشت کریں گے؟ ایک بدوی سے پوچھا گیا تھا کہ صانع کے وجود کی دلیل کیا ہے؟ سبحان اللہ! کیسا شاندار جواب دیا، کہنے لگا :-

"اونٹ کی مینگنیوں کو دیکھ کر اس سے ہم اونٹ کی موجودگی کا اندازہ لگاتے ہیں اور جب ہم کو کہیں پاؤں کے نقوش نظر آتے ہیں تو ہم سمجھ لیتے ہیں کہ یہاں سے کوئی گزرا ہے۔ یہ آسمان جس میں تارے جگمگاتے ہیں اور یہ زمین جو دلکش نشیب و فراز سے معمور ہے اور یہ سمندر جس میں کہ بیکراں موجیں اٹھتی ہیں، کیا یہ ایک لطیف و خبیر کے وجود میں دلالت نہیں کرتے؟"

امام رازیؒ نے نقل کیا ہے کہ ایک دفعہ خلیفہ ہارون رشید نے امام مالکؒ سے وجود باری کی دلیل پوچھی تو آپ نے فرمایا "یہ قسم قسم کی بولیاں اور طرح طرح کی آوازیں اور جدا جدا لہجے اللہ تعالیٰ کے وجود پر دلالت کرتے ہیں" ——— ذرا غور تو فرمائیے دنیا میں اربوں جاندار ہیں ان میں سے ہر ایک کی آواز ایک انچ یا اس سے کم جگہ سے نکلتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے ان سب آوازوں میں ایسا فرق پیدا کر دیا ہے کہ سننے والا گھوڑے اور گدھے، انسان و حیوان، ہر ایک کی آواز میں فرق کر سکتا ہے، اسی طرح انسانوں میں بھی ہزاروں قسم کی زبانیں بولی جاتی ہیں لیکن سننے والے کو قطعاً کوئی اشتباہ نہیں ہوتا اور وہ ان میں واضح فرق محسوس کرتا ہے، فقروں اور لہجوں میں اللہ تعالیٰ نے ایسا امتیاز پیدا کر دیا ہے کہ بچہ ہو یا بوڑھا، عورت ہو یا مرد، نوجوان ہو یا ادھیڑ عمر کا ہر ایک کی آواز کو جدا جدا پہچانا جاتا ہے اور اس سے بولنے والے کا نوجوان یا بچہ، مرد یا عورت ہونا معلوم کیا جا سکتا ہے، اس دنیا میں اربوں انسان بستے ہیں۔ لیکن ہر ایک کی آواز دوسرے سے مختلف ہے کیا آپ اسے اللہ تعالیٰ کی قدرت کا عجیب و غریب کرشمہ نہیں کہیں گے؟ کوئی شخص یہ کہہ کر کہ یہ محض اتفاق ہے اپنی عقلمندی کا ثبوت نہیں دے سکتا، ایک ملحد نے امام ابو حنیفہؒ سے وجود صانع کی دلیل پوچھی، آپ نے فرمایا :-

"مجھے تھوڑی دیر کے لئے مہلت دو، کچھ لوگوں نے مجھ سے ایک بات کہی ہے میں اس پر غور کرنا چاہتا ہوں، چند لوگ آئے اور مجھ سے کہنے لگے کہ سمندر میں ایک بہت بڑی کشتی ہے اس میں طرح طرح کا سامان تجارت لدا ہوا ہے، نہ اس میں کوئی محافظ ہے اور نہ ملاح، وہ کشتی خود بخود چلتی ہے اور بڑی بڑی موجوں کو پھاڑتی ہوئی نکل جاتی ہے، جہاں جانا چاہتی ہے ملاح کے بغیر اپنے لئے راستہ بناتی ہے اور پہنچ جاتی ہے"

وہ لوگ سن کر کہنے لگے کہ یہ تو کسی عاقل کے کہنے کی بات نہیں ہے، تو امام نے فرمایا :-

"خدا کے بندو! غور تو کرو! یہ کائنات جس میں سورج اور چاند کا جدا نظام ہے اور زمین کا جدا اور اس میں قسم قسم کی عجیب و غریب چیزیں ہیں کیا ان کا کوئی پیدا کرنے والا نہیں؟"

حاضرین امام صاحب کی اس حاضر جوابی اور ٹھوس استدلال کو سن کر بہت حیران ہوئے اور سب نے ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا،

ایک دفعہ امام شافعیؒ سے وجود صانع کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا :-

"یہ دیکھئے! توت کا پتہ ہے یہ ایک ہی ذائقہ رکھتا ہے، لیکن اس پتہ کو کیڑا کھاتا ہے تو اس سے ریشم نکلتا ہے اور جب شہد کی مکھی اس کو کھاتی ہے تو اس سے شہد پیدا ہوتا ہے اور جب اس پتہ کو بکری، گائیں، اور دوسرے جاندار کھاتے ہیں تو یہ مینگنی اور لید کی شکل اختیار کر لیتا ہے، اور ہرنی جب اسے کھاتی ہے تو یہی پتہ مشک بن جاتا ہے حالانکہ

پتہ دیتی ہے معلوم ہوا کہ اس میں یہ خاصیت از خود نہیں آتی بلکہ کسی کے پیدا کرنے سے آتی ہے۔

یہی سوال امام احمد بن حنبلؒ سے بھی کیا گیا تھا آپ نے فرمایا تھا:۔

"یہ دیکھئے! ایک مضبوط اور چکنا قلعہ ہے جس میں نہ کوئی سوراخ ہے اور نہ دروازہ، اس کا ظاہر چاندی کی طرح سفید چمکدار ہے اور اندر کا حصہ سونے کی طرح زرد سنہرا ہے، اچانک اس قلعہ کی دیوار پھٹ جاتی ہے اور اس میں سے ایک خوبصورت اور کشیریں آواز والا جانور نکل آتا ہے جو چلتا پھرتا بھی ہے اور سنتا دیکھتا بھی ہے"

(امام کی مراد انڈا ہے)

کیا آپ اسے اتفاق کا نتیجہ کہیں گے؟ قطعاً نہیں یہ ضرور کسی مدبر و صانع کی قدرت سے ہوا ہے، تعجب کی بات ہے لوگ ان کھلی نشانیوں کے بعد بھی اللہ کے وجود کا انکار کرتے ہیں اور اس کی نافرمانی کرتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ ہر چیز میں اس کے واحد و یکتا ہونے پر دلالت کرنے والی علامات و دلائل موجود ہیں، ——— (علامہ ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں یہ اقوال نقل کئے ہیں)

توحید خداوندی کے دلائل

رہی یہ بات کہ صانع کی توحید کی کیا دلیل ہے تو ہم اس وحدانیت کو سب سے پہلے ایک عقلی دلیل سے ثابت کرتے ہیں، اصطلاح میں اس دلیل عقلی کو برہان تمانع کہا جاتا ہے، قرآن کریم میں وحدانیت کو اسی برہان تمانع کے ذریعہ ثابت کیا گیا ہے علامہ کلنبویؒ فرماتے ہیں کہ تمانع کے دو معنی بیان کئے جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ صانع متعدد ہیں ان میں سے ایک مقدور اور معنوی کے وجود کو چاہتا ہے اور دوسرا اس کی نفی اور عدم کا تقاضا کرتا ہے، علامہ فرماتے ہیں کہ دراصل برہان تمانع کا اطلاق اسی قسم پر ہوتا ہے۔

دوسرے یہ کہ صانع کثیر ہیں اور ان میں سے ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ صرف میں ہی اس مقدور کو پیدا کروں، دوسرا "خدا" اس کے پیدا کرنے میں قطعاً کوئی دخل نہ دے، ظاہر ہے کہ ایک چیز دو قادروں کا مستقلاً مقدور نہیں بن سکتی، متکلمین جو کہتے ہیں کہ اگر خدا کئی مان لئے جائیں تو ممکنات میں سے کوئی چیز وجود میں نہیں آسکتی اس کا مطلب یہی ہے کہ اس صورت میں یا تو ترجیح بلا مرجح لازم آتی ہے، یا ایک مقدور پر دو قادروں کا عمل کرنا لازم آتا ہے اور یہ دونوں باتیں محال ہیں۔

اس اجمال کے بعد ہم اس دلیل کو قدرے تفصیل کے ساتھ ذکر کرتے ہیں ——— اس دلیل کی تفصیل یہ ہے کہ اگر ایسے دو خدا مان لئے جائیں جن میں ہر ایک کامل طریقہ سے کسی چیز کے پیدا کرنے کی قدرت رکھتا ہو تو ایسی صورت میں ان دو خداؤں کے درمیان تمانع لازم آئے گا۔ اور وہ باطل ہے اس لئے کہ اگر وہ دو خدا تمانع کریں یعنی ان میں سے ہر ایک یہ چاہے کہ میں ہی اس مقدور کو دوسرے خدا کی شرکت کے بغیر پیدا کروں تو ایسی صورت میں یا تو وہ مقدور پایا ہی نہ جائے گا یا پھر ہر ایک کی قدرت سے یعنی شرکت سے موجود ہوگا اور یا ایک ہی خدا اس کا صانع ہوگا اور اسی کی ایجاد سے وہ موجود ہوگا دوسرے خدا کو اس کی ایجاد میں کوئی دخل نہیں ہوگا، یہ تینوں صورتیں صحیح نہیں ہیں، پہلی صورت میں تو ظاہر ہے پایا ہی نہ گیا، دوسری صورت میں بھی اس کا وجود ممکن نہیں ہے، اس لئے کہ جب ان میں سے ہر ایک کامل خدا ہے اور ہر ایک کو مستقلاً اپنے ارادے کے نافذ کرنے کا کلی اختیار ہے تو ایسی صورت میں کسی چیز کا دونوں کی شرکت سے معرض وجود میں آنا دونوں کی کمزوری اور عجز کی علامت ہے، چونکہ ان دونوں میں سے کوئی بھی اپنے ارادہ کو پورا نہ کرسکا بلکہ وہ چیز دونوں کے اشتراک سے موجود ہوئی، ایسی صورت میں وہ دونوں کامل طریقہ سے "خدا" کہلانے کے مستحق نہیں ہوسکتے، حالانکہ شروع میں ہم مان چکے تھے کہ ان دونوں میں سے ہر ایک کامل طریقہ سے قادر ہے اور ہر ایک کو اس کا کلی اختیار ہے کہ وہ مستقلاً بلا شرکت غیرے اپنے ارادے کو بروئے کار لائے، تیسری صورت بھی صحیح نہیں ہے اس لئے کہ جب اس مقدور کو صرف ایک خدا نے پیدا کیا اور دوسرے نے پیدا نہ کیا حالانکہ وہ دونوں خدا تھے اور اس کو

پیدا کرنا چاہتے تھے تو معلوم ہوا کہ اس دوسرے میں پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں تھی اور وہ قادر نہیں تھا لہذا یہ بھی خدا نہیں ہو سکتا جب لازم کا بطلان ظاہر ہو گیا تو ملزوم یعنی کئی خداؤں کے پائے جانے کا بطلان بھی واضح ہو گیا، اور وحدانیت ثابت ہو گئی اب یہ بات پوری طرح واضح ہو گئی کہ بالفرض اگر تعدد کی صورت میں معرضِ پایا جائے گا تو دو میں سے ایک کا امکان لازم آئے گا ـــــ گویا تو امکان توارد لازم آئے گا اور یا امکان ترجیح بلا مرجح تفصیل ما قبل میں آ چکی ہے اس تقریر کے بعد قرآن کریم کی اس آیت پر غور کیجئے۔

لو کان فیہما آلھۃ الا اللہ لفسدتا

یعنی "اگر زمین و آسمان میں اللہ کے سوا دوسرے خدا بھی ہوتے تو یہ دونوں فاسد ہو جاتے"

عام طور سے اس دلیل کو اقناعی سمجھا جاتا ہے لیکن اگر اس آیت میں "فساد" کے معنی یہ لے لئے جائیں کہ "وہ وجود ہی میں نہ آتے" تو یہی دلیل قطعی بھی ہو سکتی ہے،

توحید کی ایک اور دلیل

توحید باری کی ایک اور دلیل بھی بیان کی جاتی ہے جو بہت واضح اور معقول ہے اور وہ یہ کہ اس دنیا میں جب بھی ایک جنس کی دو چیزیں پائی جاتی ہیں تو ان میں بعض باتیں مشترک ہوتی ہیں اور بعض باتیں مختلف، فرض کیجئے زید اور بکر دو انسان ہیں، ان میں بعض باتیں تو مشترک ہیں، مثلاً یہ کہ دونوں انسان ہیں، دونوں مرد ہیں، دونوں چلنے پھرنے پر قادر ہیں، دونوں کے جسم میں آنکھیں، کان اور ناک موجود ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی بعض چیزیں یقیناً مختلف بھی ہیں، مثلاً یہ کہ ایک زید ہے، دوسرا بکر، زید خالد کا بیٹا ہے اور بکر محمود کا، زید عقلمند ہے، بکر اتنا ہوشیار نہیں ہے، زید مالدار ہے اور بکر مفلس اور غریب ہے، اگر ان دونوں میں اس قسم کا کوئی اختلاف نہ ہو تو یہ دو نہیں رہیں گے، ایک بن جائیں گے، جو باتیں ان میں مشترک طور سے پائی جاتی ہیں انہیں منطق کی اصطلاح میں "ما بہ الاشتراک" کہتے ہیں اور جو باتیں مختلف ہیں انہیں "ما بہ الامتیاز" کہا جاتا ہے، آپ اس کائنات کی کسی بھی دو چیزوں کو لے لیجئے، ان میں بعض چیزیں ما بہ الاشتراک ہوں گی اور بعض چیزیں ما بہ الامتیاز۔

اس بات کو سمجھنے کے بعد دیکھئے کہ اگر اس کائنات میں ایک سے زیادہ خدا مان لئے جائیں تو لامحالہ ان دونوں میں کچھ چیزیں ما بہ الاشتراک ہوں گی جو دونوں میں مشترک طور سے پائی جائیں گی، اور کچھ چیزیں ما بہ الامتیاز ہوں گی جو ایک میں پائی جائیں گی، دوسرے میں نہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ ان دونوں کے درمیان ما بہ الامتیاز کیا ہو گا؟ یعنی وہ کون سی چیز ہو گی جو ایک کو دوسرے سے ممتاز کرے گی ظاہر ہے کہ ان کی ماہیت و حقیقت تو ما بہ الامتیاز نہیں ہو سکتی اس لئے کہ ہم دونوں کی ماہیت و حقیقت ایک ہی مان چکے ہیں کہ وہ دونوں خدا ہیں۔ اگر آپ کہیں کہ ما بہ الامتیاز ان کی کوئی صفت ہو گی تو سوال یہ ہے کہ آیا وہ صفت صفتِ کمال ہے یا صفتِ نقص اگر وہ صفتِ کمال ہے اور خدا ۱ میں پائی جا رہی ہے تو ظاہر ہے کہ خدا ۲ میں یہ صفتِ کمال نہ ہو گی (کیونکہ یہ صفت ما بہ الاشتراک نہیں ہے بلکہ ما بہ الامتیاز ہے) اس صورت میں لازم آئیگا کہ خدا ۲ ایک صفتِ کمال سے محروم ہے اور وہ خدا ہی کیا ہوا جو کسی صفتِ کمال سے محروم ہو؟ اور اگر آپ یہ کہیں کہ وہ صفتِ نقص ہے جو خدا ۱ کو خدا ۲ سے ممتاز کر رہی ہے تو اس سے خدا ۲ تو نقص سے محفوظ رہے گا لیکن لازم آئیگا کہ خدا ۱ میں ایک نقص پایا جاتا ہے اور جس ذات میں کوئی نقص ہو اُسے خدا کیسے کہا جا سکتا ہے؟

اور اگر یہ کہا جائے کہ خدا ۱ کا کوئی جزء اسے خدا ۲ سے ممتاز کرتا ہے تو اس سے لازم آئیگا کہ خدا اجزاء سے مرکب ہے، حالانکہ خدا میں اجزاء نہیں ہو سکتے اس لئے کہ ہر مرکب اپنے وجود میں اپنے اجزاء کا محتاج ہوتا ہے انسان اُس وقت تک وجود میں نہیں آ سکتا جب تک کہ اس کے اجزاء یعنی سر، چہرہ، ہاتھ، پاؤں وغیرہ نہ ہوں اس لئے وہ ان اجزاء کا محتاج ہے، درخت اس وقت تک درخت نہیں کہلا سکتا جب تک کہ اس میں تنا نہ ہو ٹہنیاں نہ ہوں، اور پتے نہ ہوں، اگر آپ خدا کے اندر بھی اجزاء فرض کر لیں گے تو لازم آئیگا کہ خدا اپنے وجود میں اپنے اجزاء کا محتاج ہے حالانکہ خدا کسی کا محتاج نہیں ہوتا اس لئے کسی جزء کو بھی ما بہ الامتیاز نہیں بنایا جا سکتا۔ جب یہ ثابت ہو گیا کہ دو خداؤں میں کوئی چیز ما بہ الامتیاز نہیں بن سکتی تو لامحالہ ایک سے زیادہ خدا کا وجود بھی باطل ہو گیا اس لئے کہ دو چیزیں بغیر ما بہ الامتیاز کے نہیں پائی جا سکتیں۔

مولانا محمد مصطفیٰ
(علی گڑھ)

اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ

۱

۹۔ ایاک نستعین سے تمام مخلوق حتیٰ کہ افضل المخلوقات یعنی حضرات انبیاء علیہم السلام کا بھی عاجز و درماندہ و محتاج درگاہ الٰہی ہونا ظاہر ہوا کیونکہ صاحب قدرت کاملہ کو مدد مانگنے کی کیا حاجت ؟

۱۰۔ اور اھدنا الصراط المستقیم سے تمام مخلوق کا عالم الغیب نہ ہونا بھی ثابت ہوا کیونکہ جسے علم غیب حاصل ہے اُسے صراط مستقیم دریافت کرنا چہ معنی دارد ؟

ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوا کہ علم محیط اور قدرت کاملہ خصائص حق تعالیٰ شانہ ہے اور ہونا بھی یوں چاہئے، اس لئے کہ قدرت کا تعلق فعل اور عمل سے ہوتا ہے اور فعل و عمل کا سرزد ہونا بغیر علم کے ناممکن، پس جب قدرت کاملہ ہوگی تو علم بھی محیط و کامل ہوگا اور جب تمام مخلوق عاجز ٹھہری تو علم محیط یعنی علم غیب سے بھی بے بہرہ ہوئی، چنانچہ عارف معارف الٰہیہ صاحب علوم لدنیہ ول المرسلین فی العلم، افضل الرسل و اکملین فی الحسن سیدنا و مولانا محمد خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ارشاد باری ہوتا ہے۔

(قل لا املک لنفسی نفعاً ولا ضراً الا ما شاء اللہ ولو کنت اعلم الغیب لاستکثرت من الخیر وما مسنی السوء) کہ دیجئے اے نبی کہ میں اپنی ذات کے لئے کسی نفع و نقصان کا اختیار نہیں رکھتا مگر یہ کہ اللہ چاہے اور میں علم غیب رکھتا تو بہت کچھ ۔۔۔۔ خیر و نفع حاصل کر لیتا اور مجھے نقصان و ضرر نہ پہونچتا

صاف طور پر قدرت کاملہ اور علم غیب کی نفی ہوتی ہے۔ حیرت ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور دوسرے خاصان خدا کے بارے میں یہ علم غیب کا عقیدہ جو سراسر نصوص قرآنی اور تصریحات ائمہ شریعت و طریقت کے خلاف ہے، امت مرحومہ کے بعض افراد نے کہاں سے اخذ کیا، انصاف شرط ہے کہ جب خصائص نبوت سے اپنے تئیں متصف کرنا غلامان و شیدایان حضرت رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے لئے بھی قابل گرفت ہے تو پھر کیا خصائص الوہیت سے حضرات انبیاء و اولیاء کو متصف سمجھنا کم از کم اتنا بھی قابل مواخذہ نہیں، بلکہ، قاعدہ تو یہ چاہتا ہے کہ اور بھی زیادہ مذموم ہے کیونکہ پہلی صورت میں مخلوق کی مماثلت مخلوق سے ہوتی اور وہ دونوں متناہی خواہ ایک اسفل بھی اور دوسری اجل، اور دوسری شکل میں مخلوق کی مماثلت خالق سے ہوتی حالانکہ مخلوق متناہی اور خالق لامتناہی ہے

عنقا شکار کس نشود دام باز چیں — کایں جا ہمیشہ باد بدست است دام را

صاحب قصیدہ بردہ شیخ بوصیری علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں۔

منزہ عن شریک فی محاسنہ — فجوھر الحسن فیہ غیر منقسم

یعنی محاسن ظاہری و باطنی میں سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والتسلیمات کا شریک و سہیم کوئی بھی نہیں۔ چونکہ اس اسلوب بیان سے شبہ ہو سکتا ہے کہ کہیں آپ خدا تو نہیں ہیں (نعوذ باللہ منہ)

لہٰذا اس وہم و شبہ سے بچانے کے لئے آگے فرماتے ہیں :-

دع ما ادعته النصارٰی فی نبیھم — واحکم بما شئت مدحاً فیہ واحتکم
وانسب الٰی ذاتہ ما شئت من شرف — وانسب الٰی قدرہ ما شئت من عظم
فان فضل رسول اللّٰہ لیس لہ — حد فیعرب عنہ ناطق بفم

یعنی جس طرح نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں خصائص الوہیت کا دعویٰ کیا ، تم ایسی باتیں نہ کرنا اور اس کے علاوہ اور جو بڑے سے بڑے روحانی فضائل اور کمالات ہو سکتے ہیں وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح و نعت میں نہایت وثوق کے ساتھ کہنا کیونکہ آنحضرت کے فضل و کمال ایسے نہیں ہے جسے قوت ناطقہ حیطۂ بیان میں لا سکے ۔ ہاں اس قصیدہ میں اس شعر سے علم غیب کا شبہ نہ کیا جائے ۔

فان من جودک الدنیا وضرتھا — ومن علومک علم اللوح والقلم

کہ جب لوح و قلم کا علم حضور کے علوم کا جزو ہے تو حضور کو علم غیب حاصل ہے ، اس لئے کہ لوح میں قیامت تک کے حالات قلم بند ہیں حضور کو بعض دیگر حالات آخرت کا بھی علم ہے جیسا کہ شیخ خالد ازہری یا شیخ باجوری نے توجیہ و تشریح کی ہے ، بلکہ احقر لیہ عرض کرتا ہے علوم و معارف ، ومواجید وواردات کی تو حالت عبد و معبود کے کی کہ فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہوتی چنانچہ لی مع اللّٰہ وقت لا یسعنی فیہ ملک مقرب ولا نبی مرسل) میں بھی اسی طرف اشارہ ہے ۔

ہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ حضور کے مراتب و علوم میں جس طرح آناً فآناً حیات طیبہ میں اضافہ ہوتا رہتا تھا اسی طرح اب حیات برزخیہ میں بھی آناً فآناً ترقی اضعافاً مضاعفہ ہوتی رہتی ہے ، چنانچہ من جملہ دیگر دلائل کے ان اللّٰہ وملائکتہ یصلون علی النبی یایھا الذین آمنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما میں جو بشارت اور حکم ہے اس سے بھی یہ بات روشن ہو جاتی ہے کیونکہ نزول رحمت مستلزم ترقی روحانی کو اور ترقی روحانی مستلزم ہے ترقی علوم و معارف الٰہیہ کو ، پس غور فرمایا جائے کہ جب علوم شریفہ نبویہ میں ہر لحظہ اضافہ ہوتا رہتا ہے تو غیب کہاں رہا ، علم غیب کی تو یہ شان ہے کہ الآن کما کان ، اللّٰھم ارنا الاشیاء کما ھی بالنبی الامی وآلہ وصحبہ صلی اللّٰہ علیہم اجمعین ، آمین ،

صراط الذین انعمت علیھم پہلے بندہ نے اپنے رب سے صراط مستقیم کی جانب ہدایت فرمانے کی درخواست کی تھی اور بدل کے طور پر وہ عرض کرتا ہے کہ مراد راستہ اُن حضرات کی جن پر آپ نے انعام فرمایا جو علم معرفت اور عمل خیر کے جامع تھے ، غیر المغضوب علیھم ولا الضالین اور نہ مغضوب تھے اور نہ ضال تھے نہ وہ جن پر آپ کا غضب ہوا اور نہ جو گمراہ تھے یعنی کوئی نیا راستہ مطلوب نہیں بلکہ وہی جو مجمع علیہ ہے ، وہی جو سب مقبولین بارگاہ کا ہے ، جس پر قولاً و فعلاً اجماع بھی ہو چکا ہے اور کن حضرات کا الذین انعم اللّٰہ علیھم من النبیین والصدیقین والشھداء والصالحین انبیا اور صدیقین اور شہداء اور صالحین یہ حضرات نعمت ایمان اور نعمت سلامت ہر دو دونوں سے بہرہ ور ہیں ، جن کا حال بھی اچھا ، قال بھی اچھا اور مآل بھی اچھا ، جنہوں نے نہ قوت نظریہ کو غلط استعمال کر کے گمراہی اختیار کی اور نہ قوت عملیہ کو بے جا کام میں لا کر غضب الٰہی کے مستحق ہوئے بلکہ وہ حضرات اپنی تعلیمات و توجہات سے نفوس کا تزکیہ فرماتے ہیں اور حکمت الٰہی کے مسائل نظری و عملی کا آب حیات پلاتے ہیں ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ جن کے صدق و دیانت پر جن کی عظمت و مقبولیت پر تمام عالم کی تاریخ شاہد ہے جن کے نفوس قدسیہ اور ہیبت کے سامنے جابر و سرکش بادشاہ مبہوت و ششدر رہ جاتے ہیں (فبھت الذی کفر) ہاں ہاں ! جن حضرات کو آپ نے اپنا معاونت و معیت میں بھی چاہا ہے (واولٰئک مع الذین انعم اللّٰہ علیھم الآیۃ) انہی کے نقش قدم پر سر کے بل چلنا مجھے ہے ۔ انہی کی تقلید میرے لئے خضر راہ ہے نہ اُن لوگوں کی جنہوں نے قوت عملی کا بے جا استعمال کیا اور گمراہ و بدراہ ہو گئے ۔

تقلید تو کفار کا شیوہ ہے جن کے لئے آپ نے فرمایا ہے اولو کان آباؤھم لا یعقلون شیئاً ولا یھتدون جو بے عقل اور بے راہ لوگوں کی لیکھ کو پیٹتے چلے جاتے ہیں، میں ایسوں سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں۔ اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔

مغضوب علیہم اور ضالین میں شیطان ابلیس بھی داخل ہے اُس نے قوت عملی کا بے جا استعمال کیا۔ آبیٰ یعنی اطاعت نہ کی اور یہ انکار کسی تواضع یا حُسنِ ادب کی وجہ سے نہ تھا (مثلاً کوئی بزرگ اپنے کسی معتقد سے سرہانے بیٹھنے کے لئے کہے اور وہ ازراہِ عجز کالے اور سرہانے نہ بیٹھے) بلکہ غرور کے سبب واستکبر اور اس میں افراط بھی ہے کیونکہ جس طرح پاس نفس و خودداری محمود ہے اسی طرح کبر و نخوت اور عجب مذموم ہے اور قوت نظری کو بھی غلط موقع پر استعمال کیا یعنی نص صریح اور حکم ناطق کے مقابلہ میں اور جو قیاس کیا وہ بھی اصولاً اور عقلاً غلط یعنی خلقتنی من نار وخلقتہ من طین کیونکہ مقدمہ کبریٰ مضمر ہے یعنی " والنار افضل من الطین یا " والنار اشرف من الطین " اور یہ افضلیت ناری کی خاکی پر اُس نے اپنے زعم باطل میں بغیر کسی تمسک کے قرار دی اور یہ نتیجہ تھا اُس کی انانیت کا، بس اس کی دلیل کیا تھی ایک سفسطہ تھا جس کا ثمرہ وان علیک لعنتی الی یوم الدین ملا۔

نکات و استنباطات :- ۱- صراط الذین انعمت علیہم سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ راہ راست ایک ہی ہے اسی واسطے اُسے جمع موصول کی طرف مضاف کرتے ہوئے بھی واحد یعنی " صراط " استعمال کیا ہے نہ کہ صُرط کہا جاتا ہے، یہ بھی دلیل ہے مذہب حق کے تفرد اور عدم تعدد کے علاوہ اس دلیل کے جو اھدنا الصراط المستقیم کے تحت میں سابقاً تحریر کی گئی تھی۔

۲- اور بدل الکل کے طور پر استعمال کرنے میں یہ راز بھی ہے تاکہ واضح ہو جائے کہ یہ صراط مستقیم موجب حصول انعام ہے اور سبب نعمت ہے اس کا سالک مامون و محفوظ ہے۔

۳- انبیاء اور صدیقین کی تقلید مامور بہ اور شہداء اور صلحاء کی فی حد ذاتہ مستحسن ہے اور بصورت اختلاف ظاہری بقاعدہ الاقدم فالاقدم مقدم کے مقابلہ میں مؤخر متروک رہے گی۔

۴- گمراہوں اور بدراہوں کی تقلید ناجائز اور مردود ہے۔

۵- " صراط الذین " سے یہ بھی مستنبط ہوا کہ انبیاء علیہم السلام اصول میں متفق و متحد ہیں۔ فروع میں مختلف ہیں اور یہ فروع بھی انہی اصول صحیحہ پر متفرع ہیں، اور یہ صوری اختلاف باختلاف زمان و مکان و بلحاظ امزجۂ اقوام و ملل ہو گیا ہے جس طرح مجربین واطبہ کے حذاق کے قول کے مطابق بعض ادویہ کی مقدار و طرق استعمال میں اختلاف ناگزیر ہوتا ہے۔

۶- غیر المغضوب علیہم کے بجائے " الذین غضبت علیہم " اور ولا الضالین کے بجائے " ولا الذین اضللتہم " نہیں فرمایا گیا، قرآن حکیم کا اسلوب بیان یہ بھی ہے کہ عموماً مکروہ و مبغوض چیزوں کی نسبت رب العباد کی جانب نہیں کی جاتی، بجز اس حالت کے کہ توحید افعال کا بیان ہو چنانچہ واذا مرضت فھو یشفین میں مرض کی نسبت اپنی طرف کی گئی یہ نہیں کہا کہ واذا مرضتنی بلکہ شفا دینے کی نسبت حق تعالیٰ کی جانب کی گئی فھو یشفین اسی طرح یہاں انعام دینے کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا الذین انعمت علیہم اور غضب و ضلال کو اُن لوگوں کی طرف جنہوں نے گمراہی اور بدکاری کو اپنی طبیعت ثانیہ بنالیا اس لئے غضب الٰہی کے مستحق ہوئے اور بھٹکتے اور مارے پڑے سے

ہر چہ ہست از قامت ناساز بیاندام ماست
ورنہ تشریف تو بر بالائے کس کوتاہ نیست

۷- مغضوب علیہم اور ضالین میں یہود و نصاریٰ ہی داخل نہیں ہیں بلکہ وہ تمام لوگ بھی جو شریعت اسلامیہ کا بائیکاٹ کرتے ہیں، اپنی دینی ایجادات و اختراعات سے سنت نبوی کی عدم ترویج کا باعث ہوتے ہیں۔ کیونکہ فرمایا نبی صادق مصدوق علیہ السلام نے کل بدعۃ ضلالۃ (ہر بدعت ضلالت و گمراہی ہے) بار الٰہا ہمیں توفیق دیجئے کہ ہم آپ کی رضامندی میں جئیں اور آپ ہی کی رضامندی پر مریں آپکے قرآن کو اپنا قانون اور

پروفیسر اسرار احمد سہاوری

انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ تکرار سے گھبرا جاتا ہے۔ ایک دفعہ کے بعد کسی چیز کا دوبارہ ذکر کیا جائے تو وہ لطف نہیں رہتا۔ اگر بار بار ذکر کیا جائے تو طبیعت اکتا جاتی ہے۔ بقول مولوی محمد حسین آزاد کے "حلوہ ہو یا پوری گلے کا ہار ہو جائے تو اجیرن ہو جاتی ہے" لیکن محبت کا معاملہ اس سے جداگانہ ہے۔ محبوب کے ذکر کی تکرار میں جو لطف ہے کسی دوسری چیز میں نہیں۔ اس کے ذکر کے لئے تو طبیعت بہانہ جوئی کرتی رہتی ہے کہ کوئی تقریب ہاتھ آئے تو اس کا ذکر کیا جائے۔ پھر محبوب، محبوب میں بھی فرق ہوتا ہے۔ بعض محبتیں بھی اکتا دینے والی ہوتی ہیں۔ غالب نے تو ہر قسم کی محبت اور اس کی وفاداری کو عین ایمان کہہ دیا۔ لیکن مجھے مرحوم سے اس معاملے میں تھوڑا سا اختلاف ہے۔ وفاداری کا معیار بھی محبوب کے معیار سے ہی متعین ہونا چاہئے ورنہ محبت کرنے والا بہت خسارے میں رہے گا۔ اگر محبوب گھٹیا معیار کا ہے یا خود وفادار نہیں تو میں یک طرفہ وفاداری اور استواری کا قائل نہیں ہوں۔ چنانچہ غالب کو بھی ایک جگہ یہ کہنا پڑا، غالباً دنیاوی محبوبوں کی نااستواری کو دیکھ کر اپنے خیال سے رجوع کیا ہوگا۔ فرماتے ہیں ؂

چاک مت کر جیب بے ایام گل　　کچھ اُدھر کا بھی اشارہ چاہئے

میں بھی یہی عرض کر رہا تھا کہ بغیر اُدھر کے اشارے کے چاک گریباں کچھ لطف نہیں دیتا لیکن ایک محبوب ایسا بھی ہے کہ جس کے ذکر کی تکرار میں کبھی بے لطفی پیدا نہیں ہوتی، جس کے حضور میں معیار کی انتہائی بلندیاں بھی پست ہو کر رہ جاتی ہیں جس کے لئے وفاداری بشرط استواری واقعی عین ایمان ہو جاتی ہے جس کی محبت کے سہارے کے بغیر زندگی کی حقیقت ایک تہمت سے زیادہ نہیں رہتی اور اس تہمت کو برداشت کرنا واقعی بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ دیکھئے فانی مرحوم کا شعر اس وقت لطف دے گیا، فرماتے ہیں ؂

جینے جانے کی تہمت کس سے اٹھتی کس طرح اٹھتی　　ترے غم نے بچا لی زندگی کی آبرو ورنہ

واقعی اگر اس کے غم کا سہارا نہ ہو تو زندگی کی آبرو کا گریبان بہت سے دیوانوں کے ہاتھوں تار تار ہو کر رہ جائے۔ اس کی محبت کا غم قدم قدم پر سہارا دیتا ہے اور انسان زندگی کی تہمت کو برداشت کرتا چلا جاتا ہے اور لطف یہ ہے محبوب ترین محبوب ہونے کے باوجود بے نیازی کا گلہ بھی ممکن نہیں۔ کبھی محبت کا جواب سرد مہری سے نہیں دیتا، محبت کی پکار کا جواب محبت سے ہی ملتا ہے۔ اصغر مرحوم خوب فرما گئے ہیں ؂

ہمہ تن ہستیٔ خوابیدہ مری جاگ اٹھی　　ہر بُنِ مو سے مرے اس نے پکارا مجھ کو

جس محبوب نے محب کے ہر بن مو سے اگر پکارا ہو اس کے لئے انسان کیا کچھ قربان نہیں کر سکتا۔ زندگی کا نذرانہ تو اس مقام پر بڑا کم قدر اور حقیر نظر آنے لگتا ہے یہ در اصل کوئی قدر ہی کے لئے بھی لائق پذیرائی نہیں۔ دیکھئے ایک غیر معروف سے شاعر کا ایک شعر یاد آ گیا۔ کسی مشاعرے میں سنا تھا ؂

آئی پیام یار فراز دو آئے خستیں　　دیدۂ اجل کو جامۂ ہستی اتار کے

شاعر غیر معروف ہے لیکن شعر کس بلا کا ہے۔ محبوب کی قدر افزائی اور اپنی سپردگی کی انتہا کر دی ہے کہ پیام لانے والا موت کا فرشتہ ہے پیغام موت کا

م ہے لیکن جس کا پیغام ہے وہ اس قدر محترم اور محبوب ہے کہ پیامبر کو اپنی جان کا تحفہ نذر کر دیتا ہے کیونکہ یہ تحفہ محبوب کے شایان شان نہیں تھا اسی لائق کہ اس کے پیامبر کے قدموں پر نثار کر دیا جائے اب آپ اندازہ کریں کہ ایسے محبوب کے ذکر کی تکرار میں بے لطفی یا اکتاہٹ کس طرح پیدا ہو سکتی ہے اس کا جب بھی ذکر نیا ہی معلوم ہوگا اور قند مکرر کا ہی لطف دے گا۔ حالی نے غضب کی بات کہی ہے ؎

نیا ہے لیجئے جب نام اُس کا بڑی وسعت ہے میری داستاں میں

داستاں کی وسعت کا اندازہ آپ اس بات سے کر لیں کہ اس کا ذکر ہماری زندگی کا محبوب ترین مشغلہ ہے، دن میں پانچ وقت نمازوں میں پابندی سے ذکر کرتے لیکن ذرا نہیں تھکتے۔ اس کے علاوہ ہزار قسم کے بہانے تراشتے ہیں اور اس کے ذکر کی تقریب نکال لیتے ہیں اور آج بھی ہمارے شوق جستجو نے ایک تقریب مہیا کر ہی لی ہے کہ اس کے کلام کا ذکر کر کے اس کو یاد کر لیں اس کے کلام کا نام قرآن بھی ہے اور فرقان بھی۔ میں اس صحبت میں صرف فرقان کے ... چند خصوصیات کا ذکر کروں گا۔

توحید و شرک:۔ فرقان کے معنی ہیں کسوٹی جو کھرے اور کھوٹے میں تفریق کر دے قرآن نے چونکہ حق و باطل میں امتیاز پیدا کیا، ان دونوں کی ... کا فرق سفید و سیاہ کی طرح واضح کر دیا۔ اس لئے اس کو الفرقان کے خطاب سے نوازا گیا۔ باطل کے بہت سے عقائد انسانی ذہن میں مستحکم ہو ... تھے، جن کو قرآن نے آکر ختم کیا۔ لیکن یہاں میں صرف ایک کا ہی ذکر کروں گا۔ سب سے بڑا باطل جس نے اسلام سے قبل اس دنیا کے باشندوں کے دل و دماغ پر قبضہ جما لیا۔ وہ شرک ہے، عیسائیوں نے تثلیث کا عقیدہ اختیار کر لیا تھا اور حضرت عیسیٰ جبریل اور حضرت مریم کو بھی خدا کا شریک ٹھہرا لیا۔ یہودیوں نے دعویٰ کیا کہ حضرت عزیر خدا کے بیٹے تھے، ہندو مذہب میں بت پرستی اور فطرت پرستی عین ایمان تھی، جین اور بدھ مت نے اول تو خدا کا کوئی واضح ... تصور ہی نہیں دیا لیکن بعد میں انہوں نے بھی باقاعدہ بت پرستی شروع کر دی، غرضیکہ دنیا میں کہیں خالص توحید پرستی باقی نہ رہی تھی، حالانکہ حق صرف توحید ہے ... شرک سراسر باطل ہے بلکہ توحید پرستی تو اللہ تعالیٰ نے انسان کے خمیر میں گوندھ دی ہے، انسان نے اپنی شامت اعمال سے شرک کو اپنے ذہن میں پیدا کیا ہے اس کا ... یہ ہے کہ دنیا کی قدیم ترین آبادیوں کی تاریخ بتاتی ہے کہ تاریخ کے ابتدائی دور میں انسان توحید پرست ہی تھا، دریائے نیل کی وادیوں کی آٹھ ہزار سال قبل ... کی تہذیب کے آثار محققین نے تلاش کر لئے ہیں ان میں کچھ نوشتے بھی ملے ہیں ان نوشتوں میں معبود اعظم "ازلی بادشاہ" اور "آخرت کے مالک" جیسے الفاظ ... ہیں جو اس بات کی بین دلیل ہیں کہ خدا کے واحد اور قادر مطلق کا تصور انسانی زندگی کے اس ابتدائی دور میں موجود تھا۔ اس کے علاوہ موہنجو داڑو کے آثار قدیمہ ... کھدائی نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہاں بھی توحید الٰہی کا تصور موجود تھا وہ اپنے خدائے واحد کو "آرن" کہہ کر پکارتے تھے۔ ان تمام انکشافات سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ اول انسان کا قدیم ترین خدائی تصور توحیدی تھا اس میں شرک کا شائبہ بھی نہ تھا۔ اس وقت اس کی فطرت اپنی اصلی حالت میں تھی۔ دنیا وی آلودگی ... پاک صاف اس لئے اس کی آنکھ اپنے اصلی مرکز یا سرچشمہ کی طرف ہی لگی ہوئی تھی، لیکن بعد میں آہستہ آہستہ شیطانی وسوسوں کو ابھرنے کا موقع ملا اور ... پر باطل غالب ہوتا چلا گیا۔ الفرقان نے باطل کے اس پردے کو تار تار کر دیا اور حق کی جلوہ نمائیاں از سر نو ہونے لگیں اور خدا کی توحید کا نور ... آب و تاب سے چمکنے لگا۔ بلکہ یہی نہیں توحید کے تصور میں بھی ایک اضافہ ہوا وہ یہ کہ اس سے پہلے خدا کے تصور میں تمثیل اور تجسیم کا عنصر بہت نمایاں تھا ... قرآن نے انتہائی تنزیہی تصور پیش کیا۔ مثلاً قرآن کریم نے فرمایا۔ لیس کمثلہ شیٔ" یعنی اس جیسی کائنات میں کوئی چیز نہیں ہے۔ ایک اور جگہ میں ... فرمایا "لا تدرکہ الابصار" نگاہیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں وغیرہ وغیرہ۔ بابا فغانی نے اس کیفیت کو شاعرانہ انداز میں خوب بیان کیا ہے ؎

مشکل حکایتے است کہ ہر ذرہ عین اوست لیکن نمی تواں کہ اشارت بہ او کنند

لیکن قرآن کریم نے اس بات کا خیال ضرور رکھا ہے کہ انسانی ذہن کی گرفت اور رسائی محدود ہے اس لئے تنزیہ کو اس حد تک نہ بڑھایا جائے کہ نفی ... محض کی صورت پیدا ہو جائے۔ اسی وجہ سے اس نے خدا کی وہ صفات جو انسانی تصور میں آ سکتی ہیں انسان ان میں خود بھی جانی پہچانی ہیں بیان کی ہیں مثلاً وہ ... سنتا ہے، رحیم و کریم ہے، سمیع و بصیر ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی صاف کہہ دیا کہ وہ عدیم المثال ہے۔ "لیس کمثلہ شیٔ" تاکہ انسان یہ بھی سمجھ

ہے کہ اس کے جسم وکرم، سماعت اور بصارت اور خدا کے جسم وکرم، سماعت وبصارت میں کوئی نسبت نہیں ہے اور اگر ہے بھی تو نہ ہونے کے برابر ہے

قانون بقائے اصلح: القرآن نے صرف حق وباطل کو علیحدہ کر کے ہی نہیں دکھایا بلکہ ایک قانون خداوندی یہ بھی بتا دیا کہ حق باعث خیر ہے اور باطل باعث شر اور خدا کی سنت یہ ہے کہ اس دنیا میں بقائے انفع کا قانون نافذ ہے[1] یعنی یہاں صرف مفید چیز باقی رہے گی، اور مضر چیز کو آہستہ آہستہ ختم کر دیا جائے گا۔ "جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقا" یعنی جب حق آیا باطل معدوم ہو گیا۔ ایک اور جگہ فرمایا "فاما الزبد فیذھب جفاء واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض" یعنی جھاگ سے جو میل کچیل پیدا ہوتا ہے وہ ضائع کر دیا جاتا ہے اور جس چیز میں انسان کے لئے نفع ہے وہ زمین میں باقی رہ جاتی ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ باطل کو فوراً ختم نہیں کر دیتا ہے وہ اسے کچھ مہلت دیتا ہے تاکہ اتمام حجت ہو جائے اور مہلت نہ ملنے کی بھی حسرت نہ رہے اور دراصل اس کی رحمت کا تقاضا بھی یہی تھا۔

کہ توبہ دراصل کا دروازہ آخر وقت تک کھلا رکھا جائے اس لئے اس کا نام غفور اور رحیم ہے" وربک الغفور ذوالرحمة" یعنی "بے شک تمہارا رب بڑا صاحب رحمت اور بخشنے والا ہے" ایک اور جگہ فرمایا کہ مومن خدا سے مایوس نہیں ہوتا، حدیث شریف میں آیا ہے "التائب من الذنب کمن لا ذنب له" یعنی توبہ جس کی قبول ہو گئی، وہ گناہوں سے پاک ہو گیا۔ ان آیات اور مندرجہ بالا حدیث سے اس عقیدے کی تردید ہو جاتی ہے کہ ایک دفعہ گناہ سرزد ہو جائے تو پھر بغیر سزا کے چارہ نہیں، اس عقیدے کی بنا پر عیسائیوں میں کفارے کا عقیدہ پیدا ہوا جس نے انسانوں کے گناہوں کی معافی کے لئے کفارے کے طور پر حضرت عیسیٰ کو سولی پر چڑھائے جانے کا قصہ اور جان دے کر اپنی امت بخشوانے کی کہانی بیان کی۔

حیات بعد الموت: نزول قرآن کے وقت کفار مکہ سب سے زیادہ حیات بعد الموت کے عقیدے پر چڑتے تھے وہ کہتے تھے کہ زمانہ ہمیں معدوم کر دیگا۔ مٹی میں مل جانے کے بعد بھلا دوبارہ زندگی کو کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کے ذریعہ سے ان کے باطل عقائد کی تردید کی اور فرمایا تخلیق اول، تخلیق ثانی سے زیادہ مشکل نہیں۔ پھر فرمایا کہ اگر تمہاری بات بھی مان لی جائے کہ زندہ مرنا اور جینا ہے تو زمانہ بھی میں ہی ہوں۔ مجھ سے بچ کر تم کسی طرح نہیں نکل سکتے، مولانا آزاد ترجمان القرآن میں اس باب میں فرماتے ہیں کہ انسان کرۂ ارض کی بہترین مخلوق ہے۔ جس مخلوق کی جسمانی اور معنوی نشو ونما کے لئے خاطر کائنات نے اس قدر اہتمام کیا ہے کیونکر ممکن ہے کہ محض دنیا کی چند روزہ زندگی کے لئے ہی بن گیا ہو اور اس کی زندگی کا کوئی بہتر مقصد نہ ہو۔ "افحسبتم انما خلقنکم عبثا وانکم الینا لا ترجعون" یعنی کیا تم خیال کرتے ہو کہ ہم نے تمہیں یونہی بلا مقصد پیدا کر دیا ہے اور تم ہماری طرف لوٹ کر نہیں آؤ گے۔ کائنات میں ہر جگہ ارتقا کا قانون کام کر رہا ہے ہر چیز درجہ بدرجہ آگے کی طرف بڑھ رہی ہے تو انسان اپنی جگہ جامد وساکن کس طرح رہ سکتا ہے۔ یقینی طور پر وہ بھی ایک بہتر ملکوتی زندگی کی طرف بڑھ رہا ہے ممکن ہے کہ ہر درجہ ارتقا کے بہت زمانے نہ کر سکے اور پیچھے رہ جاتے لیکن بحیثیت ایک نوع کے انسان ضرور آگے بڑھے گا۔ مولانا روم نے بھی اپنی مثنوی میں اسی خیال کا اظہار کیا ہے کہ میں جمادات، نباتات، حیوانات کے مدارج سے گزر کر انسانی قالب میں نمودار ہوا ہوں اب یہ قالب بدل کر اس سے بہتر قالب اختیار کرنے والا ہوں۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں ؎

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید — کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

صفات جلال وجمال: اللہ تعالیٰ کی صفات جلال وجمال کے بارے میں بھی بڑی گمراہیاں پھیل گئی تھیں بعض لوگوں نے جلال کے پہلو پر اس قدر زور دیا کہ جمالی رخ بالکل پس پردہ چلا گیا۔ بعض لوگوں نے جمالی پہلو کو اس قدر اجاگر کیا کہ جلالی کیفیات بالکل معدوم ہو کر رہ گئیں۔ یہ معاملہ افراط وتفریط کا تھا صحیح راستہ دراصل درمیان کا راستہ تھا جو دونوں گروہوں کی نظروں سے اوجھل تھا۔ یہودیوں نے خدا کے جلالی

---

[1] ترجمان القرآن مولانا آزاد

تصور کو اپنا لیا تھا۔ مجوسی تصور یہ تھا کہ نور و ظلمت کی دونوں طاقتیں برابر کی ہیں۔ کبھی ایک غالب آ جاتی ہے کبھی دوسری۔ عیسائی تصور جمالی پہلو کو اپنا کر صرف رحم و محبت کے رخ کو دیکھتا رہا اور اس کی وجہ سے یوم آخرت اور حساب و کتاب کا معاملہ بالکل بے معنی ہو کر رہ گیا۔ انسان کو من مانی کرنے کی پوری آزادی ہو گئی۔ اسی طرح بعض امتوں نے بھی رحم و کرم کی صفت کو اپنا لیا۔ اس طرح سیاہ روی کے لئے کوئی گنجائش باقی نہ رہی۔ عدل و عدالت کا راستہ کثرت تعبیر سے معدوم ہو کر رہ گیا۔ لیکن قرآن کریم نے یہاں بھی حق و باطل میں فرق کر دیا اور دونوں انتہاؤں کو دکھا کر درمیان کے راستے کی واضح نشاندہی کر دی نہ تو جلالی پہلو نمایاں کیا کہ انسان نجات سے بالکل مایوس ہو جائے نہ جمالی تصور کو اس قدر حاوی ہونے دیا کہ مخلوق، خالق کے مقابلے میں ہی گستاخی کرنے لگے۔ چنانچہ اس کو اصطلاحاً امید و بیم کی کیفیت کہا گیا ہے۔ صحیح ایمانی کیفیت دراصل امید و بیم کے درمیان ہی حاصل ہو سکتی ہے، یعنی خدا کی جباریت اور قہاریت پر بھی ایمان ہو اور اس کی رحمت اور ربوبیت پر بھی اعتماد ہو پھر ایمان میں توازن پیدا ہوتا ہے اور یہ ایمانی توازن ہی قرآن کا اصل مقصد ہے توازن سے ہی زندگی میں سکون، اطمینان، اصلاح و بہبود میسر ہونا ممکن ہے، عدم توازن تو بہر حال تباہی و بربادی کا پیش خیمہ ہے، اسی متوازن زندگی کے فلسفے کی وجہ سے امت مسلمہ کو امت وسط کا خطاب ملا ہے۔ قرآنی فلسفہ حیات نے افراط و تفریط سے زندگی کے ہر شعبہ میں دامن بچانے کی کوشش کی۔ حالانکہ طاقت سے زیادہ عبادت کرنے کی بھی اجازت نہیں ہے قرآن جیسی ہمہ گیر کتاب کا ذکر اتنے مختصر سے مضمون میں اس کے شایان شان ممکن نہ تھا۔ بہر حال جو کچھ ممکن ہو سکا اختصار کے ساتھ عرض کرنے کی کوشش کی ہے ؎

تا دست رسم بود زدم چاک گریباں
شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم

۵
آزمودہ دواؤں کا مرکب
انالجین
سر درد - کمر کا درد - دانت کا درد
ایام - انفلوئنزا اور ہر قسم کے دوسرے درد کے لئے
یقینی زود اثر اور بے ضرر علاج ہے
Opal

شمس تبریزخاں آرزوی

حَدِیث بطورِ تفسیرِ قرآن

منکرین حدیث کے جواب میں اب اردو میں کافی ذخیرہ ہو چکا ہے، جن میں افتخار یحییٰ صاحب کی " فتنۂ انکار حدیث کا منظر و پس منظر " تدوین حدیث، مولانا گیلانی ؒ اور ترجمان القرآن، کے منصب رسالت نمبر، اور مولانا مودودی کی دوسری کتابیں اس موضوع پر نمائندہ کتابیں ہیں اس لئے میں شاید صیحح موضوع نیا ہے۔ مگر عربی مفسرین خصوصاً ابن جریر اور ابن کثیر، سیوطیؒ (صاحب در منثور) نے اس کا التزام کیا ہے کہ قرآن کی تفسیر حدیث سے کریں۔ یہ کام کچھ زیادہ مشکل نہیں شاید کوئی حدیث ایسی نہیں جو کسی نہ کسی آیت کے ذیل میں آ کر اس کی تشریح و تفسیر، توضیح و تعبیر کا کام نہ کرے۔ قرآن و حدیث کے اس ربط و ضبط اور گہرے تعلق کی مثال دنیا کی کسی اور کتابوں میں نہیں، قرآن و حدیث کا باہمی رشتہ جان و تن اور چولی دامن کا رشتہ ہے ؏

ایں دو شمع اند کہ از یک دگر افروختہ اند!

مولانا آزاد نے تذکرہ کی کئی فصلوں میں قرآن اور سیرت کے باہمی ربط پر روشنی ڈالی ہے چند سطریں ملاحظہ ہوں :-

" در اصل قرآن اور حیاۃ نبوۃ معناً ایک ہی ہیں قرآن متن ہے اور سیرت اس کی شرح، قرآن علم ہے اور سیرت اس کا عمل : قرآن قراطیس ما بین الدفتین اور فی صدور الذین اوتوا العلم میں ہے اور یہ ایک مجسم و متشکل قرآن تھا جو یثرب کی سرزمین پر چلتا پھرتا نظر آتا تھا کما قالت الصدیقۃؓ : و کان خلقہ القرآن،

ما دو جانے آمدہ در یک بدن ، من کیم ؟ لیلیٰ ، و لیلیٰ کیست ؟ من . . . .

بعض عرفاء اصحاب اشارات نے کہا ہے کہ بسم اللہ سے والناس تک جو کچھ ہے گو حکایت موسیٰ و کلیم کی ہو لیکن ان سب کا مقصود ایک ہی ہے اور گو نام دو دو کے ہوں مگر روئے سخن اسی طرف ہے ؏ چشم سوئے فلک و روئے سخن سوئے تو بود

والکنایۃ ابلغ من التصریح : خوش دلکش ست قصۂ خوبانِ روزگار تو یوسفی و قصۂ تو احسن القصص

حق یہ ہے کہ قرآن اور صاحب سنت کی باہمی یگانگت و اتحاد کے باب میں جو کچھ بھی اور جس قدر کہا جائے اس سے بہت کم ہے جس قدر کہنا چاہئے . . . .

حتیٰ کہ اگر تاریخ شریعت کے تمام وسائل معدوم ہو جائیں اور روایات و حکایت کے تمام صحائف سے قطع نظر کر لیا جائے جب بھی صاحب شریعت کے وجود و سیرت کی تاریخی حقیقت اسی طرح روشن و مبین باقی رہے گی جس طرح تاریخ کے دفاتر میں ہے اور اگر دنیا چاہے تو اس کی پوری سوانح عمری اور تاریخ حیات صرف ایک کتاب اللہ کی لوح محفوظ اور کتاب قیم ہی سے بلا ایک نقطہ کی فروگذاشت کے مرتب کرے " (ص ۱۴۲)

خود قرآن نے "حکمت" - "ذکر" "علم" "تزکیہ" اور "ما نزل معہ" جیسے الفاظ میں حدیث کا تعارف کرایا ہے حیرت ہے کہ بعض لوگ قرآن کو مانتے ہیں اور حدیث کا انکار کرتے ہیں یومنون ببعض الکتاب و یکفرون ببعض اسم و مسمیٰ، صورت و معنی، چاند اور چاندنی، آفتاب اور اس کی روشنی کے تعلق کا انکار خیرہ چشمی و کج مذاقی

ابوہریرہ کی حدیث میں فرمایا کل رات ایک جن میری نماز خراب کرنا چاہتا تھا میں نے ارادہ کیا کہ ستون سے باندھ دوں تا کہ تم بھی دیکھ لیتے مگر اپنے بھائی سلیمانؑ کا قول یاد آگیا " رب ھب لی ملکا لا ینبغی لاحد من بعدی" پھر اسے چھوڑ دیا۔ جریر بن عبداللہ کہتے ہیں کہ قبل طلوع و قبل غروب نمازوں کی تاکید کے بعد آپ نے پڑھا " فسبح بحمد ربک قبل طلوع الشمس وقبل الغروب" انس فرماتے ہیں کہ آپ نے فرمایا جو نماز بھول جائے وہ قضا پڑھ لے جب اسے یاد آئے " اقم الصلوۃ لذکری"

حضور ایک بار حضرت علیؓ کے ہاں آئے حضرت فاطمہؓ بھی تھیں پوچھا ابھی نماز نہیں پڑھی؟ حضرت علیؓ نے کہا جب اللہ چاہے گا تبھی تو پڑھیں گے حضور یہ کہتے ہوئے تشریف لے گئے " وکان الانسان اکثر شئی جدلا"

بے عملی کی تردید میں حضور نے حدیث علیؓ میں فرمایا نیکی بدی سب کی توفیق ملتی ہے " فاما من اعطی واتقی الخ"

براءؓ کی حدیث ہے کہ حضور نے فرمایا: مومن قبر میں توحید و رسالت کی گواہی دے گا اسی طرف آیت میں اشارہ ہے " یثبت اللہ الذین امنوا بالقول الثابت فی الحیوۃ الدنیا وفی الاخرۃ"

ابوہریرہؓ کی حدیث ہے کہ زکوۃ نہ دینے والا قیامت میں اژدہا کا طوق پہنے گا وہ انا مالک انا کنزک کہہ کر کاٹے ڈسے گا۔
پھر تلاوت کی " ولا تحسبن الذین یبخلون ..... بما اتھم اللہ من فضلہ ھو خیرا لھم بل ھو شر لھم سیطوقون ما بخلوا بہ یوم القیمۃ"

حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث ہے کہ میں ہر مسلمان سے اس کے دین دنیا کا زیادہ حقدار ہوں " النبی اولی بالمومنین من انفسھم" مرنے والے کا ورثہ اس کا خاندان ہوگا اور قرضہ میرے ذمہ ہوگا۔

ابن عمرؓ کی حدیث ہے کہ مومن سے اللہ کہے گا میں نے تمہارے گناہ دنیا میں چھپائے اور آج یہاں بیان کرتا ہوں۔ کافروں اور منافقوں کا معاملہ ہوگا " فیقول الاشھاد ھؤلاء الذین کذبوا علی ربھم الا لعنۃ اللہ علی الظلمین"

اشعث بن قیس کی حدیث ہے کہ حضور نے جھوٹی قسم والے کے لئے یہ آیت پڑھی " ان الذین یشترون بعھد اللہ وایمانھم ثمنا ..... ولھم عذاب الیم۔ حضرت ابی بن کعبؓ کہتے ہیں حضور نے یہ آیت پڑھی۔ قال الم اقل لک انک لن تستطیع معی صبرا" حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت نے سورج کے طلوع و غروب کا حال بتا کر یہ آیت تلاوت فرمائی۔ " والشمس تجری لمستقر لھا ذلک تقدیر العزیز العلیم"

حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ حضور نے قیامت کا ذکر کرکے یہ پڑھا۔ " وتضع کل ذات حمل حملھا وتری الناس سکری وما ھم بسکری ولکن عذاب اللہ شدید"

حضرت ابن عباسؓ کی حدیث ہے کہ حضور نے فرمایا میں قیامت میں اپنے اصحاب کے لئے کہوں گا جیسے عبد صالح (عیسیٰؑ) کہیں گے " وکنت علیھم شھیدا ما دمت فیھم فلما توفیتنی کنت انت علیھم الخ"

حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ صحابہ نے یہ آیت " الذین امنوا ولم یلبسوا ایمانھم بظلم" سن کر حضور سے کہا یا رسول اللہ! ہم میں سے کون ظلم سے بچا ہوگا؟ پھر ہمارا کیا حشر ہوگا؟ آپ نے انہیں تسلی دی اور یہ آیت پڑھی " یابنی لا تشرک باللہ ان الشرک لظلم عظیم۔

حضرت ابن عباسؓ کی حدیث ہے حضور نے فرمایا کہ تم قیامت میں ننگ دھڑنگ اور غیر مختون اٹھائے جاؤ گے پھر یہ آیت پڑھی " کما بدانا اول خلق نعیدہ وعدا علینا انا کنا فعلین۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے صحابہؓ کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ اس کے بارہ میں مجھے کوئی حکم نہیں ملا مگر یہ جامع و منفرد آیت "فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ"۔ انہی کی حدیث ہے کہ آپ نے ایک مہمان کے لئے دولت کدہ سے کچھ طلب فرمایا تو ازواج مطہرات کی طرف سے جواب آیا کہ گھر میں صرف پانی موجود ہے آپ نے حاضرین سے کہا کون ان کی مہمانی کرے گا؟ ایک انصاری اپنے گھر لے گئے اور بیوی سے کہا کہ مہمان رسول کی ضیافت کرو۔ بیوی نے کہا ہمارے ہاں صرف بچوں کی خوراک ہے انہوں نے کہا وہی لاؤ اور چراغ بجھا کے بچوں کو بہلا کر سلادو ــــــ پھر دونوں مہمان کے ساتھ اس طرح بیٹھے رہے گویا کھا رہے ہیں اس طرح رات بھوکے رہے صبح کو حضورؐ نے فرمایا اللہ تمہارے ایثار پر خوش ہو کر عرش پر آیا اس پر یہ آیت نازل کی "ویؤثرون علی انفسہم ولوکان بہم خصاصۃ ومن یوق شح نفسہ فاولٰئک ہم المفلحون۔"

حضرت سعدؓ کہتے ہیں کہ میں نے صرف عبداللہ بن سلامؓ کے بارہ میں حضورؐ سے سنا ہے کہ وہ جنتی ہیں اور انہی کے بارے میں ہے "وشہد شاہد من بنی اسرائیل"۔

حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ غزوۂ بدر میں آپ "سیہزم الجمع ویولون الدبر" پڑھتے ہوئے عریش سے نکلے ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ آپ نے مقتولین بدر کے کنوئیں پر کھڑے ہو کر فرمایا "ھل وجدتم ما وعد ربکم حقا؟"

حضرت عمرؓ کا واقعہ ہے کہ حضورؐ نے انہیں طلب فرما کر کہا مجھ پر رات وہ آیت اتری ہے جو دنیا و مافیہا سے زیادہ عزیز ہے۔ پھر یہ آیت تلاوت کی "انا فتحنا لک فتحا مبینا"

(کتاب التفسیر)

ابوسعید بن معلیؓ کہتے ہیں کہ آپ نے کہا میں قرآن کی بڑی آیت بتاتا ہوں پھر الحمد کی تلاوت فرمائی۔

سعید بن زیدؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا "الکماۃ من المن ...... شفاء للعین"

ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ یہود تورات کو عربی میں بیان کرتے تھے حضورؐ نے فرمایا کہ اہل کتاب کی تصدیق و تکذیب مت کرو پھر آپ نے پڑھا "وقولوا آمنا باللہ وما انزل الینا" انہی کی حدیث ہے کہ حضورؐ نے فرمایا مسکین وہ نہیں جسے ایک دو کھجوریں ایک دو لقمے مل جاتے ہیں بلکہ اصل مسکینیت یہ ہے کہ انسان سوال نہ کرے پھر فرمایا چاہو تو یہ پڑھو "لا یسألون الناس الحافا"

حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی "ھو الذی انزل علیک الکتاب الی قولہ اولوا الالباب" اور فرمایا جب تم لوگوں کو متشابہات کا تابع دیکھو تو سمجھ لو کہ وہی کج فہم ہیں۔ "وانی اعیذہا بک وذریتہا من الشیطان الرجیم"

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں حضورؐ نے فرمایا قیامت میں زکوٰۃ نہ دینے والوں کے مال اژدہا بن کر ڈسیں گے اور کہیں گے انا مالک انا کنزک پھر آیت پڑھی "ولا تحسبن الذین یبخلون بما آتاہم اللہ من فضلہ الخ"

ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ میں نے حضورؐ کو دیکھا رات کے آخری حصہ میں اٹھے اور آسمان کو دیکھ کر فرمایا "ان فی خلق السموات والارض واختلاف اللیل والنہار لاولی الالباب"

عمرو بن مرہؓ کہتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے قرآن سناؤ میں نے عرض کیا بھلا میں آپ کو سناؤں آپ پر تو قرآن اترا ہی ہے؟ آپ نے فرمایا مجھے دوسروں سے سننے میں مزا آتا ہے! اس پر میں نے سورۂ نساء سنائی جب اس آیت پر پہنچا "فکیف اذا جئنا من کل امۃ بشہید وجئنا بک علی ھؤلاء شہیدا" تو آپ نے کہا ٹھہر جاؤ میں نے آپ کی طرف دیکھا تو چشم نبوت اشک افشاں تھیں۔

سالم بن عمرؓ راوی ہیں کہ آپ نے فرمایا غیب کی کنجیاں پانچ ہیں، پھر یہ آیت تلاوت کی "ان اللہ عندہ علم الساعۃ وینزل الغیث ویعلم ما فی الارحام وما تدری نفس ماذا تکسب غدا وما تدری نفس بای ارض تموت ان اللہ علیم خبیر"

ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ ہم سے حضورؐ نے پوچھا بتاؤ اس درخت کا نام جو مرد مومن کے مشابہ ہوتا ہے اور جس کا ہر پتا مفید ہے اور ہر وقت وہ پھل دیتا ہے (تؤتی اکلہا کل حین) میں نے خیال کیا کہ وہ کھجور ہے مگر چونکہ ابوبکرؓ و عمرؓ خاموش تھے میں لب کشا کیوں کرتا، پھر حضورؐ نے خود ہی بتایا وہ کھجور ہے، راوی کہتے ہیں میں نے والد صاحب (حضرت عمرؓ) سے کہا "ابا یہ جواب میرے ذہن میں آیا تھا" انہوں نے کہا پھر بتایا کیوں نہیں؟ میں نے کہا یہ سوچ کر ادب تھا حضرت عمرؓ نے کہا اگر تم نے بتا دیا ہوتا تو مجھے بڑی مسرت ہوتی۔

ابن عازبؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ مسلمان قبر میں جوابا کلمہ شہادت پڑھے گا اور یہی ہے جس کا ذکر اللہ نے کیا ہے یثبت اللہ الذین امنوا بالقول ...... فی الحیٰوۃ الدنیا وفی الاخرۃ۔

ابوسعید بن المعلی کہتے ہیں کہ حالت نماز میں حضورؐ نے مجھ کو بلایا مگر میں نماز پڑھ کے حاضر ہوا اور حضور کے استفسار پر عرض کیا کہ نماز پڑھ رہا تھا آپ نے فرمایا کیا اللہ نے نہیں کہا ہے "یایہا الذین امنوا استجیبوا للّٰہ وللرسول"؟

ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ فتح مکہ میں حضورؐ نے خانہ کعبہ میں ۳۶۰ بت دیکھے، دست مبارک میں ایک لکڑی تھی جس سے ان کو گراتے اور پڑھتے جاتے تھے — جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقا۔

ابوہریرہؓ کا ارشاد ہے حضورؐ نے فرمایا قیامت میں دنیا کے موٹے تازے اور بڑے لوگ آئیں گے مگر اللہ کے ہاں ان کی قدر و قیمت مچھر کے پر کے برابر بھی نہ ہوگی پھر کہا اقرؤا — فلا نقیم لھم یوم القیٰمۃ وزنا۔

انہی کی روایت ہے حضورؐ نے فرمایا ہر بچہ اسلام پر پیدا ہوتا ہے مگر اس کے ماں باپ اسے یہودی، عیسائی اور مجوسی بنا دیتے ہیں پھر یہ آیت پڑھی فطرت اللہ التی فطر الناس علیہا لا تبدیل لخلق اللہ ذالک الدین القیم۔

آپؓ ہی کی حدیث ہے حضورؐ نے فرمایا کہ اللہ کہتا ہے میں نے صالحین کے لئے وہ بنا رکھا ہے جسے نہ کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی کان نے سنا نہ کسی بشر کے دل میں خیال گذرا پھر تلاوت فرمائی — فلا تعلم نفس ما اخفی لھم من قرۃ اعین جزاء بما کانوا یعملون۔

آپؓ کی دوسری روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا موسیٰ بہت حیادار تھے اللہ کے اس قول سے پتہ چلتا ہے "یایہا الذین امنوا لا تکونوا کالذین اذوا موسیٰ فبراہ اللہ مما قالوا وکان عند اللہ وجیہا"۔

ابن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک یہودی عالم نے آپ سے کہا کہ تورات میں ہے قیامت میں اللہ ایک انگلی پر آسمان، زمین، درخت، سمندر، مٹی اور تمام مخلوقات کو رکھ کر کہے گا "انا الملک" اس پر آپ کھلکھلا کر ہنسے پھر تلاوت فرمایا — وما قدروا اللہ حق قدرہ۔

ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ آنحضرتؐ کی بددعا سے قریش پر ایسا قحط آیا کہ زمین سے آسمان تک دھواں دھواں ہو گیا تھا۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی فارتقب یوم تاتی السماء بدخان مبین یغشی الناس ھذا عذاب الیم تا عائدون۔

ابوہریرہؓ فرماتے ہیں حضورؐ نے فرمایا اللہ نے جب مخلوقات پیدا کیں تو رحم نے ان کی کمر تھام لی اللہ نے کہا تم اس پر راضی نہیں کہ جو تجھے جوڑے اسے میں جوڑوں اور جو تجھے توڑے اس سے میں رشتہ توڑوں رحم نے کہا میں اس پر راضی ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا تم پڑھ سکتے ہو فہل عسیتم ان تولیتم ان تفسدوا فی الارض وتقطعوا ارحامکم۔

حضرت انسؓ حضورؐ سے نقل کرتے ہیں کہ جہنم کہتی رہے گی ھل من مزید، آخرکار اللہ اپنے پاؤں رکھ دیگا تو کہے گی بس کافی ہو چکا۔

جریر بن عبداللہ کہتے ہیں کہ ہم نبی کریمؐ کے ساتھ ایک رات بیٹھے ہوئے تھے آپ نے چودھویں کے چاند کی طرف دیکھ کر فرمایا تم اللہ کو اس طرح دیکھو گے جیسے اسے دیکھ رہے ہو، کوئی رکاوٹ نہ ہوگی اور قبل طلوع و غروب کی نماز کی پابندی کرو۔ پھر آپ نے آیت پڑھی "فسبح بحمد ربک قبل طلوع الشمس وقبل الغروب"۔

"ومن دونهما جنتان" ابن قیسؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا دو جنتیں ایسی ہیں جن کے سامان چاندی اور دو کے سونے کے ہوں گے۔

"وظل ممدود" ابوہریرہؓ کہتے ہیں آپؐ نے فرمایا جنت میں ایک ایسا درخت ہے کہ سوار سو سال میں بھی اسے نہ طے کر پائے گا پھر یہ آیت پڑھی۔

ام عطیہ کہتی ہیں کہ حضورؐ نے یہ پڑھ کر ہم سے بیعت لی "ان لا یشرکن باللّٰہ" نوحہ سے منع کیا تو ایک عورت نے کہا کہ میں ایک عورت کا بدلہ دینا چاہتی ہوں تو حضورؐ خاموش رہے چنانچہ وہ گئی اور پھر واپس آکر حضورؐ کے ہاتھ پر بیعت کی۔

ابن عمرؓ فرماتے ہیں حضورؐ نے فرمایا "یوم یقوم الناس لرب العالمین" کا عالم یہ ہوگا کہ لوگ کانوں تک پسینے میں ڈوبے ہوں گے۔

عبداللہ بن زمعہؓ کہتے ہیں میں نے حضورؐ کا وہ خطبہ سنا تھا جس میں آپ نے ناقہ ثمود کا ذکر کیا تھا آپ نے "اذ انبعث اشقاھا" کی تشریح میں فرمایا کہ وہ اپنی قوم کا سردار تھا جیسے ابوزمعہ ہے جو زبیر کا چچا ہے۔

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ ہم حضورؐ کے ساتھ بقیع میں ایک جنازے میں شریک تھے آپ نے فرمایا ہر آدمی کا مقام جنت یا دوزخ میں لکھا ہوا ہے صحابہؓ نے عرض کی یا رسول اللہ پھر کیا ہم اس تقدیر پر توکل نہ کرلیں؟ آپ نے فرمایا عمل کرو اس لئے کہ ہر آدمی کے لئے آسانیاں ہیں پھر آپ نے تلاوت فرمائی "فاما من اعطی واتقی وصدق بالحسنی فسنیسرہ للیسری" الخ۔

ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ ہم نے ایک غزوہ میں حضورؐ سے خصی کی اجازت مانگی تو آپ نے روکا اور متعہ[1] کی اجازت دی اور پھر آیت پڑھی "یا ایھا الذین امنوا لا تحرموا طیبات ما احل اللّٰہ لکم ولا تعتدوا ان اللّٰہ لا یحب المعتدین"

ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ سرور عالمؐ نے فرمایا بدگمانی سے بچو وہ سب سے بڑا جھوٹ ہے "ولا تحسسوا ولا تجسسوا" "ولا تحاسدوا ولا تباغضوا ولا تدابروا وکونوا عباد اللّٰہ اخوانا"

آپ ہی کی روایت میں ہے حضورؐ نے ارشاد فرمایا۔ قیامت قائم نہ ہوگی جب تک کہ سورج مغرب سے طلوع نہ ہو اور جب ایسا ہوگا تو سب ایمان لائیں گے مگر "لا ینفع نفسا ایمانھا لم تکن امنت من قبل او کسبت فی ایمانھا خیرا"

حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں سرکار دو عالمؐ نے فرمایا۔ نوحؑ قیامت میں پوچھے جائیں گے کہ کیا آپ نے پیغام پہونچایا تھا وہ کہیں گے ہاں مگر ان کی امت کہے گی "ما جاءنا من نذیر" تو وہ گواہی میں محمدؐ اور تم کو (امت محمدیؐ) کو لائیں گے تو تم گواہی دو گے پھر آپ نے پڑھا "وکذالک جعلناکم امۃ وسطا لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا"

امام بخاریؒ نے ایک باب قائم کیا ہے "قول النبی الماھر بالقرآن مع السفرۃ الکرام البررۃ" (ج ۲ ص ۱۱۲۰)

ان احادیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن اور سنت میں کس قدر ربط اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور قرآن کے سمجھنے اور اس کے احکام کی تعمیل کے لئے ہم احادیث رسولؐ کے کس قدر محتاج ہیں!

---

[1] لیکن پھر یہ اجازت ہمیشہ کے لئے منسوخ کردی گئی۔

ماہر القادری

جھلکیاں

کس زور شور کے ساتھ فرمایا جا رہا تھا بلکہ اعتماد ہو رہا تھا کہ اعلانِ تاشقند سے مسئلہ کشمیر کے تصفیہ کی راہیں نکلیں گی ـــــ مگر چار سال گزر گئے، نہ کوئی سبیل پیدا ہوئی، یہ مسئلہ اپنی جگہ سے بال برابر بھی ادھر سے اُدھر ہوا! وہی روزِ اول! بھارت اسی طرح دندنا رہا ہے کہ کشمیر ہندوستان کا "اٹوٹ انگ" ہے! پاکستان کے جن رہنماؤں نے کہا تھا کہ اعلانِ تاشقند سے کشمیر کے مسئلہ کو فائدہ نہیں نقصان پہنچا، کسی شرط کے سوائے بغیر تو جنگ بندی ہونی چاہئے تھی نہ فوجوں کی واپسی اور نہ کوئی معاہدہ ـــــ ان بیچاروں کو "امن پسند" ٹھیرایا گیا اور وہ بارگاہ و فلک جناب میں معتوب قرار پائے!! ارباب اقتدار کی خوشی و ناخوشی اور عتاب و کرم کے پیمانے ہر دور میں ایک ہی جیسے رہے ہیں! حق پسندوں اور سچی بات کہنے والوں کو کم ہی برداشت کیا گیا ہے! اور ہمارا ماری کا مزاج رکھنے والوں اور ہاں میں ہاں ملانے والوں کے بارے میں راوی چین ہی چین لکھتا رہا ہے۔
طاقت کے مقابلہ میں سچی بات کہنے کی جرأت اور ہمت کہاں ہوتی ہے دنیا کی تاریخ میں زیادہ تر "تعالی کے بیگن" ہی نظر آتے ہیں! ہاں! جب کبھی حضرت مجدد الف ثانی جیسے حق گو مجاہد پیدا ہو گئے ہیں! تو اقتدار کو لاچار ہو کر جھکنا پڑتا ہے!

یہ حالت ہو گئی ہے ان دنوں اپنے گلستاں کی
نہ جانے کب خزاں جائے، نہ جانے کب بہار آئے

---

۲۲ اپریل کا روزنامہ جنگ ہمارے سامنے ہے، اُس کے آخری صفحہ پر دو جلی سرخیاں نظر آئیں۔

زکوٰۃ کی قرآنی شرح میں کمی بیشی نہیں کی جا سکتی
ماڈرن مجتہدین کا جاہلانہ اجتہاد برداشت نہیں کیا جائیگا

اس کے بعد مندرجہ ذیل بیان ہے۔

"لاہور ۲۱ اپریل، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی امیر جماعت اسلامی پاکستان نے ادارہ تحقیقات اسلامی کے ڈائرکٹر مسٹر فضل الرحمن کی اس تجویز پر شدید نکتہ چینی کی ہے کہ حکومت زکوٰۃ کی شرح میں اضافہ کر سکتی ہے، مولانا مودودی نے آج ایک بیان میں کہا، جس طرح نماز کی رکعتیں اسلام نے مقرر کر دی ہیں اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی، اسی طرح زکوٰۃ کی شرح میں کمی بیشی ممکن نہیں مولانا نے زکوٰۃ کی رقم کو ترقیاتی منصوبوں پر خرچ کرنے کی تجویز کی بھی مخالفت کی اور کہا کہ زکوٰۃ کے مصارف قرآن نے مقرر کئے ہیں، امیر جماعت اسلامی نے سرکاری قرضوں پر سود کی ادائیگی کے بارے میں مسٹر فضل الرحمن کے فتوے پر کڑی نکتہ چینی کی اور اسے جاہلانہ اجتہاد قرار دیا۔

مولانا مودودی نے اپنے بیان میں کہا کہ اخباری اطلاعات سے معلوم ہوا ہے کہ ۱۶ اپریل سے راولپنڈی میں اسلامی مشاورتی کونسل کا جو اجلاس ہو رہا ہے اس میں یہ تجویز بھی زیر غور آنے والی ہے کہ زکوٰۃ کی شرح میں اضافہ کیا جائے اور اس سے ترقیاتی سرگرمیوں کے کچھ اخراجات پورے کئے جائیں، اس تجویز کے حق میں کونسل کے ایک رکن نے اخبارات کو بیان بھی دیا ہے، مولانا نے کہا کہ یہ جاہلانہ

اجتہاد اور احکام میں شریعت میں کھلی کھلی تحریفات جو صاحب فرما رہے ہیں وہ میکگل یونیورسٹی کے ڈاکٹر استمتہ کی تربیت میں مجتہد بن کر تشریف لاتے ہیں اور ہماری حکومت نے ان کو نہ صرف ادارۂ تحقیقات اسلامی کا ڈائرکٹر بنایا ہے بلکہ اسلامی مشاورتی کونسل کا رکن بھی نامزد کیا ہے، میں حکومت سے پوچھتا ہوں کہ ایسے لوگوں کو قوم کے خرچ پر دین کی مرمت کے لئے مقرر کرنے کا اسے کیا حق ہے! اگر بعض حکمرانوں کی ذاتی رائے میں اس طرح کے لوگ واقعی مجتہد اعظم ہیں اور ان کے ذریعہ سے وہ اسلام کا نیا ایڈیشن تیار کرانا چاہتے ہیں تو وہ خود اپنے ذاتی سرمائے سے ان کی سرپرستی فرمائیں، قومی روپیہ اس کام پر صرف کرنے کا انہیں کوئی حق نہیں، آخر کتنے فی ہزار بلکہ فی لاکھ مسلمان ان مجتہدوں کے علم و دیانت پر اعتماد رکھتے ہیں، اس حالت میں مسلمانوں کا روپیہ ان اجتہادات کو فروغ دینے پر خرچ کرنا کیسے جائز ہوسکتا ہے:

اس بیان کے نیچے یہ خبر درج ہے:۔

زکوٰۃ کی شرح میں اضافہ کی تجویز

مخالفت ——— ناراضگی ——— برہمی

کراچی، ۱۰ مئی (اسٹاف رپورٹر) آج نماز جمعہ کے اجتماعات کے موقع پر اکثر مساجد میں علماء اور خطیبوں نے اسلامی مشاورتی کونسل کے رکن ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی اس تجویز کی شدید مخالفت کی کہ زکوٰۃ کی شرح میں اضافہ کرکے یہ بطور ٹیکس سرکاری طور سے وصول کی جائے۔ علماء نے اپنے خطبوں اور تقریروں کے دوران اس بات پر زور دیا کہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی تجویز شرائط انگیز اور دین میں تحریف کے مترادف ہے، انہوں نے ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے اس اجتہاد کو بھی لغو قرار دیا کہ تجارتی قرضوں پر سود جائز ہے! انہوں نے کہا کہ ہر طرح کے سود قرآن کی رو سے حرام ہیں اور اس کے لینے اور دینے والے کے لئے کلام پاک میں سب سے زیادہ سخت وعید ہے اور کہا گیا ہے کہ سود کے لینے اور دینے والے اللہ سے لڑائی کے لئے تیار ہو جائیں!

اکثر مساجد میں قرار دادیں منظور ہوئیں کہ اسلامی مشاورتی کونسل مذکورہ تجاویز منظور نہ کرے، جامع مسجد نیو ٹاؤن کے اجتماع میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے دونوں بیانات کی مذمت کرتے ہوئے ایک قرار داد منظور ہوئی جس میں کہا گیا ہے کہ یہ بیانات اسلام، صحابۂ اسلام اور دستور کے خلاف اعلان جنگ ہے وہ ہرگز ادارۂ تحقیقات اسلامی یا اسلامی مشاورتی کونسل کی رکنیت کے اہل نہیں ہیں، انہیں اسلامی تربیت بھی حاصل نہیں ہے انہیں ان عہدوں سے ہٹایا جائے اور پاکستان سے اخراج کا حکم دیا جائے"

علماء کرام کی یہ فریاد، واویلا، دینی غیرت، اسلامی جوش حمیت اور احتجاج اپنی جگہ درست، بجا بلکہ قابل مبارک باد! بیشک جو قدریں اور پیمانے منصوص ہیں، ان میں گھٹانے بڑھانے اور ترمیم و اصلاح کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے، مگر "عائلی قوانین" پر مسلمانوں کے احتجاج کی، ہماری حکومت نے کب پروا کی تھی؟ جواب اس سے توقع کی جائے! عوام کے احتجاج کو "جمہوریت" کی فضا میں اہمیت دی جاتی ہے "بنیادی جمہوریت" کا جہاں دور دورہ ہو وہاں بے چارے عوام کس کھیت کی مولی ہیں! اور ان غریب علماء کو کون پوچھتا ہے!

علماء نے بالاتفاق کہا کہ "خاندانی منصوبہ بندی" دین و اخلاق کے خلاف ہے، مگر ان کے فتوؤں کے علی الرغم "خاندانی منصوبہ بندی" پر کروڑوں روپیہ خرچ ہو رہا ہے ——— علماء نے "عائلی قوانین" کی ایک ایک دفعہ کا تجزیہ کرکے بتایا کہ ان میں کون کون سے اجزاء دین و شریعت کے خلاف ہیں، لیکن ان کی رائے اور مشورہ کو "مشترکہ" ہی میسر آئیں!! "عورتوں کے کھانا ڈانسنگ" پر علماء چیخ رہے ہیں اور فریاد کر رہے ہیں کہ خدا کے لئے پاکستان کے معاشرے کو ان فواحش سے بچاؤ، مگر ... نتیجہ ——— وہی ڈھاک کے تین پات!

حاکم ہو یا محکوم، خواص ہوں کہ عوام، جاہل ہو یا عالم، دو "خوف" ہیں جو آدمی کو زیادتیوں اور غلطیوں سے روکتے ہیں، ایک خدا کا خوف اور دوسرا بندوں کا ڈر ——— مگر جب ....!!

بھٹو آن ناصر صاحب نے شاہ فیصل کو زبردست حملہ کی دھمکی دے دی، قصور؟ یہ کہ تم اسلامی ممالک میں "اتحاد" کا نعرہ کیوں بلند کرتے ہو! ناصر صاحب کو سب سے زیادہ چڑ "اسلامی اتحاد" سے ہے! "اسلامی اتحاد" پر وہ سامراجیت کی پھبتی چست فرماتے ہیں!

شاہ فیصل کی حکومت پر چڑھائی دراصل ارضِ مقدس پر چڑھائی ہے، اس ارضِ مقدس پر جہاں مکہ اور مدینہ نام کے شہر آباد ہیں! اور کوئی بُرے سے بُرا مسلمان بھی مکہ اور مدینہ پر حملہ کرنے کا تصور تک نہیں کر سکتا! مکہ اور مدینہ سے محبت و عقیدت مسلمان کے دین و ایمان کا تقاضا ہے — مگر جب دل میں فرعون کی محبت گھر کر گئی ہو، وہاں حرمین شریفین کا احترام اور محبت و عقیدت کہاں باقی رہ سکتی ہے! خدا کی قسم شاہ فاروق کی ملوکیت، ناصر کی "جمہوریت" سے ہزار درجہ غنیمت تھی! آہ! اس دور کے مسلمانوں کو کیسے کیسے حاکموں اور فرمانرواؤں سے واسطہ پڑا ہے۔

کراچی یا لاہور سے نہیں بغداد سے خبر آئی ہے کہ "غیر جانبدار ملکوں کے سربراہوں کی کانفرنس ہو رہی ہے" — یہ غیر جانبدار ملک کون ہیں؟ ان کے اسمائے گرامی بھی سن لیجئے — بھارت، یوگوسلاویہ اور مصر! ان کانفرنسوں میں کیا ہوگا؟ — "عالمی امور پر غیر جانبداری کے نقطۂ نگاہ سے غور و فکر"!

———— مگر ————

یہ تینوں سربراہ کیا "مسئلہ کشمیر" پر غور و فکر کرنے کی زحمت فرمائیں گے، یہ بھی تو عالمی مسئلہ ہے کہ اس حل سے ایشیا کا امن و امان اور مشرقی ممالک کی سلامتی وابستہ ہے!

———— مگر ————

مصر اور یوگوسلاویہ کے سربراہوں نے پاک و ہند کے مابین جنگ کے دوران ہی جب "مسئلہ کشمیر" کی کچھ اہمیت نہیں سمجھی تو اب کیا سمجھیں گے!!

؎ یہ بازو مرے آزمائے ہوئے ہیں

———— اور ————

؎ من جرب المجرب حلت بہ الندامۃ

شاہ فیصل کی "اتحاد اسلامی" کی دعوت پر جمال ناصر صاحب کی وہ برہمی! کہ حکومت نجد و حجاز کو "مسلمین" کی آڑ بنا کر جنگ تک کا الٹی میٹم دے دیا، مگر کافر سربراہوں سے "اتحاد" کے لئے اتنی سرگرمی اور دوڑ دھوپ!

ایک شاعر کو ٹوکا گیا کہ تم شراب کی زبان سے مذمت کرتے ہو، یہ حرام ہے، ام الخبائث ہے، مگر شاعری میں "جام و مینا" اور "بادہ و صہبا" کا ذکر کرتے ہو، یہ تضاد کیوں؟ شاعر نے جواب دیا :—

میں شرابی نہیں ہوں شاعر ہوں
اصطلاحاً شراب پیتا ہوں

اس پر تاقضی شرابیوں کے چہروں سے "شرمندگی" کی تراوش ہونے لگی۔

اسی دور کے چند منتخب اشعار، جن سے راقم الحروف محظوظ ہوتا رہا ہے :—

یہ بھی نہ جا سکے گی ۔ اگر وہ نہ آسکے | دامن پکڑ لیا ہے شبِ انتظار کا (رام پرشاد گوپال ساری)
اس ترے سر کی قسم فرق سر مو بھی نہیں | جس طرح ہم ہیں پریشاں ترے گیسو بھی نہیں (قمر جلالوی)

تڑپتے تڑپتے سکوں پا گئے ہیں	جہاں سے چلے تھے وہیں آ گئے ہیں	(زیبا ردولوی)
دیکھ کر حال پریشان اپنا	ہم بھی ہنس لیتے ہیں دنیا کی طرح	(نازش دہلوی)
آخری وقت آہ کرتا ہوں	آج پہلا گناہ کرتا ہوں	(منتخب چارچوی)
جب تذکرہ ہوا ہے شبابِ جمال کا	محسوس یہ ہوا کہ گلستاں میں آ گئے	(منظر اکبرپوری)
ہم ترے نام پہ جینے والے	تجھ پہ مرنے کے سوا کیا کرتے	(ذکی کیفی)
شیر بھی جا دو ساقی پہ دو گھڑی کیلئے	تمام عمر پڑی ہے رہ وار روی کے لئے	(شاعر کا تخلص یاد نہیں!!)
وہ مخاطب بھی ہیں، قریب بھی ہیں	اُن کو دیکھیں کہ اُن سے بات کریں	(فراق گورکھپوری)
بدلی جو چشم ساقی، میخانہ چھوڑ آیا	کس تشنگی میں، کیا میخانہ چھوڑ آیا	(منظر صدیقی آبادی)
کبھی سر بھی رکھ دیجئے اُن کے قدم پہ	ابھی صرف نقشِ قدم دیکھتے ہیں	(اکرم لکھنوی)

چند شاہکار مصرعے، جن کے اشعار کے مصرعے یاد نہیں رہے :—

؎ بڑے آئے مرا چاک گریباں دیکھنے والے
؎ بنتے ہوئے دیکھا ہے محبت کو ہوس بھی
؎ اُن کی دھار پہ مہتاب کٹ گیا ہوگا
؎ خونِ دل صرف کیا ہے تو بہار آئی ہے
؎ کہیں بھی ہوں تری خوشبو کی طرح آ جاؤں

مولانا محمد حسام اللہ شریفی

تاثرات

(۱)

تاریخ کے کسی دور میں بھی دنیا کی کسی تحریک اور کسی مذہب میں فرزانوں سے وہ کام نہیں ہو سکا جو دیوانگانِ عشق نے کر دکھایا۔ فرزانے ہر معاملہ میں سود و زیاں ہی کے چکر میں پڑے رہے اور دیوانے نفع نقصان سے بے نیاز ہو کر بے خوف و خطر میدانِ عمل میں کود پڑے اور اپنی اسی جرأت رندانہ اور ہمت مردانہ کے سبب تاریخ عالم میں ایک انقلاب عظیم برپا کر کے انہوں نے اس دنیا کے باسیوں کو حیران کر دیا۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

جب ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والتسلیم تن تنہا ایک عظیم طاقت سے ٹکرا جاتے ہیں تو اس کی جانب سے آپ کو دہکتی آگ میں ڈال دئے جانے کا حکم دیا جاتا ہے اس حکم کو سن کر آپ پر کوئی خوف و ہراس طاری نہیں ہوتا۔ آپ کی پیشانی پر بل تک نہیں پڑتا اور نہ آپ کے کسی فعل سے کسی قسم کی گھبراہٹ ظاہر ہوتی ہے ـــــــ اہل عقل و خرد سوچتے رہ جاتے ہیں مگر عشق اور خلوص و ایمان آپ کو خوشی خوشی اس آگ میں کود پڑنے پر آمادہ کر دیتے ہیں اور پھر دنیا دیکھتی ہے کہ اس کے نتیجے میں وہی آگ گل و گلزار کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

ایک مدت کے بعد پھر میدان میں پھر چند عاشقانِ صادق نظر آتے ہیں جو نتائج سے بے پروا ہو کر میدان جنگ میں کود پڑے اور ہزاروں کے لشکر سے ٹکرا جانے کی ہمت پیدا کر لی اور پھر اپنے عمل سے دنیا کو بتا دیا کہ کامیابی ایسے ہی لوگوں کے قدم چومتی ہے جو نفع نقصان کو یکسر نظر انداز کر کے عشق کے راستے پر چلنا پسند کرتے ہیں۔

دنیا کی تاریخ ساز ہستیاں یہی مردانِ کار ہی تو رہے ہیں۔ انہوں نے اس مقصد کے لئے تخیل پرستوں سے زیادہ کام کیا ہے ـــــ کربلا کے تپتے میدان آج بھی اس حقیقت کی گواہی دے رہے ہیں کہ جناب حسین علیہ السلام اپنے بہتر ساتھیوں کی معیت میں جب ایک لشکر جرار کا مقابلہ کرنے کے لئے نکلتے ہیں تو عقل مصلحت وقت کا ساتھ دینے اور مداہنت سے کام لینے کی تلقین کرتی ہے مگر عشق کا فیصلہ اس سے یکسر مختلف ہوتا ہے۔ تب امام موصوف عقل و خرد کے فتوے پر عشق کے فیصلے کو ترجیح دیتے ہیں اور اس پر عمل کر کے اپنی جان تک کی بازی لگا دیتے ہیں ـــــ گو وقتی طور پر مخالفین امام حسین علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں پر غالب آ جاتے ہیں لیکن بالآخر فتح عشق اور اخلاص ہی کی ہوتی ہے اور حق و صداقت ہی غالب رہتے ہیں ـــــ آج اس عاشق صادق کے نام لیوا تو بے شمار مل جاتے ہیں مگر اس کے مخالف کو یاد رکھنے والے اور پھر اپنے آپ کو اس کی جماعت میں شمار کرنے والے گنتی کے چند لوگوں کے سوا شاید ہی کوئی مل سکے۔

تاریخ کے اس ایمان افروز قافلہ سے اور آگے بڑھئے تو امام مالک، امام ابو حنیفہ اور امام احمد بن حنبل بھی طوق و سلاسل پہنے سرفروشوں کی اسی صف میں کھڑے ہوئے نظر آتے ہیں ہزار طرح کی تکلیفیں برداشت کرنے کے باوجود بھی اخلاص و وفا کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑتے ـــــ کوڑوں کی ضرب سے سارا جسم لہولہان اور چھلنی ہو جانے اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے بھی وہ اس راستے کو کسی صورت ترک کر دینے پر آمادہ نہیں ہوتے۔

تاریخ کے مزید کچھ اوراق الٹئے تو اسی جماعت کے ایک دوسرے سرگرم رکن حضرت مجدد سرہندی سے ملاقات ہوتی ہے۔ گوالیار کے قلعہ میں طرح طرح کی مصیبتیں جھیلتے ہیں مگر پائے استقلال میں ذرا بھی لغزش نہیں آنے پاتی اگر یہ سب عشق کی کارفرمائی نہیں تو پھر اور کیا ہے۔

برصغیر کی حالیہ تاریخ میں بھی ان لوگوں ہی نے کار ہائے نمایاں سرانجام دئے جن کا تعلق سرفروشوں اور حق پرستوں کی اسی جماعت سے تھا جنہوں نے اپنے آپ کو خدمتِ ملک و ملت کے لئے حد تک وقف کر دیا تھا۔ محمد علی جوہر، حسرت موہانی، اور ظفر علی خاں ایسے ہی دیوانوں میں سے تھے۔

تاریخ کی ورق گردانی اس حقیقت کو ظاہر کرتی ہے کہ ازل سے سرفرازی و سربلندی ان لوگوں کے لئے مقدر ہو چکی ہے جو عقل پر عشق کو اور فرزانگی پر دیوانگی کو ترجیح دیتے ہیں جو حالات اور مصلحت سے صلح کر لینے کے قائل ہونے کے بجائے صداقت اور اظہارِ حقیقت کو اپنا شعار قرار دیتے ہیں اور حق گوئی کی خاطر مرنا اپنے لئے باعثِ صد افتخار تصور کرتے ہیں۔

ہمارا معاشرہ جس تیزی سے پستی کی طرف جا رہا ہے اور ہر معاملے میں وہ تعلیم و تہذیب کا مسئلہ ہو یا ثقافت و معاشرت کا، وہ اخلاق و کردار سے ہو یا مسلک و نظریہ سے، وہ اندرونِ خانہ کے معاملات سے متعلق ہو یا بیرونِ خانہ سے، وہ عائلی اور تمدنی مسائل سے اس کا تعلق ہو یا آئین و انکار سے، غرض اس زندگی کے کسی بھی شعبہ و رسوم و معاملات سے تعلق رکھتے ہوں۔ اسلامی ہدایات کی جس طرح کھلے بندوں خلاف ورزی کی جا رہی ہے اور اپنی من مانی خواہشات اسلامی احکام سے تعبیر کر کے اسلام کے ساتھ جو سنگین مذاق کیا جا رہا ہے اس کی روک تھام کے لئے اہلِ عزیمت کی ضرورت ہے۔

(۲)

اتفاق و مباحثے کے سلسلے میں ایک اشتہار نظر سے گزرا۔ موضوعِ مباحثہ ہے "جہیز ایک معاشرتی لعنت ہے" مختلف رسائل و جرائد میں بھی اس سے متعلق مضامین دیکھنے میں آتے رہتے ہیں مگر ان تمام مضامین کے مطالعہ سے یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ یہ سب لوگ یا تو افراط کا شکار ہیں یا تفریط میں مبتلا ہیں۔ ما و اعتدال سے دونوں ہی گروہ ہٹے ہوئے نظر آتے ہیں۔

شادی کے معاملے میں فریقین کا نقطۂ نظر یہ ہوتا ہے کہ کسی طرح اپنے سے برتر لوگوں اور اعلیٰ طبقے سے تعلقات قائم کئے جائیں۔ وہ اپنے سے ادنیٰ طبقے کو ان میں بہت سی خوبیاں ہونے کے باوجود یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں ——— اور ظاہر ہے اسلام کی ہدایات کو ترک کر دینے کے نتائج برآمد ہونے چاہئیں اور اس سے معاشرے میں جو فساد رونما ہونا چاہئے وہ یہی ہے جس کی صدائے بازگشت "مشرق" و "مغرب" میں سنائی دے رہی ہے۔

اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے جب تک اسلام کا بتایا ہوا طریقہ اختیار نہیں کیا جاتا یہ مسئلہ سلجھنے کے بجائے الجھتا ہی چلا جائے گا اور اس پر رسم و رواج کی دبیز تہیں چڑھتی چلی جائیں گی تاآنکہ اسلام کی اصل شکل کا پتہ چلانا ہی دشوار ہو جائے گا۔

اسلام اور پیغمبرِ اسلام جناب محمد مصطفیٰ علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے اس سلسلے میں جو ہدایات دی ہیں وہ بالکل واضح ہیں ——— لڑکی کے سب سے بڑا جہیز اس کے اخلاق و اعمال اور کردار و افعال کی درستی، علم و عمل سے آشنائی اور دین سے دلچسپی ہے۔ اگر والدین نے لڑکی میں یہ صفات پیدا کرنے کی سعی نہیں کی تو جہیز میں زیادہ سے زیادہ اور قیمتی سے قیمتی سامان بھی اس کی تلافی نہیں کر سکتا اور اگر وہ اپنی لڑکی میں یہ صفات پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں تو پھر اس سے بڑھ کر کوئی جہیز نہیں ہو سکتا ——— لڑکے والوں کو بھی سراب کے پیچھے بھاگنے کے بجائے اس حقیقی جہیز ہی کو تلاش کرنا چاہئے۔ جہیز کا بیش قیمت سامان بھی ان صفات کے سامنے ہیچ ہے۔

ضروری نہیں کہ سامانِ جہیز اپنے ساتھ خوشی و مسرت بھی لے کر آئے۔ جب کہ یہ یقینی امر ہے کہ صفاتِ مذکورہ سے آراستہ ایک لڑکی اپنی اور اپنے ساتھی کی زندگی کو بہتر طریقے سے سنوار دے گی اور اس کے لئے خوشی و مسرت کے پیمانے لبریز کر دے گی۔

دوسری جانب سے لڑکی والوں کو کسی لمحے بھی یہ حقیقت فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ مہر کی زیادتی کبھی پائیدار اور خوش حال زندگی کی ضمانت نہیں بن سکتی (اور بقسم مہر کی زیادتی کو محض اس لئے نظر انداز کر دینا کہ اس رقم کو ادا تو کرنا ہی نہیں پھر زیادہ یا کم ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ایک ایسی غلطی ہے جس سے صرفِ نظر کرنا کسی صورت میں بھی درست نہیں ایسے لوگوں کو یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اس طرح ان کا

نکاح ہی جائز نہ ہوگا اور وہ زندگی بھر فعل حرام کے مرتکب ہوتے رہیں گے۔ اور ان کی اولاد بھی صحیح النسب نہیں ہوگی۔) ——

عین ممکن ہے کہ مہر کی یہ زیادتی ہی خوش حال زندگی کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ بن جائے۔ اس لئے اہل معاملہ کے لئے اس امر پر نظر رکھنا نہایت درجہ ضروری ہے کہ جہیز کی مروجہ رسم قبیح کے ساتھ ہی ساتھ زرِ مہر کو بھی دائرۂ اعتدال میں لانے کے لئے مناسب قدم اٹھائیں —— افرادِ ملت سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ نمود و نمائش کی غرض سے زیادہ سے زیادہ سامانِ جہیز دینے سے اجتناب کریں اور اس حقیقی اور پائیدار جہیز کی طرف زیادہ توجہ کریں جس کی طرف سطورِ بالا میں اشارہ کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ہی رسمِ مہر کی تحدید کے لئے ہم جدوجہد کی جائے۔

خوش حال زندگی بسر کرنے کے لئے ایک اور اہم مسئلہ، جسے عام طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہے حالانکہ وہ بنیادی اہمیت کا حامل ہے، یہ ہے کہ دونوں کے درمیان فکری اور نظریاتی طور پر ہم آہنگی پائی جاتی ہو —— اس کے بغیر وہ اپنی زندگی بہتر طریقے سے گزارنے کے لئے کبھی بھی کوئی مشترک لائحہ عمل مرتب نہیں کر سکتے —— فریق اول ہر مسئلے کو مشرقی نقطۂ نظر سے دیکھنے کا اور فریق ثانی مغربی عینک کی وساطت سے اس کا مطالعہ کرنے کا عادی ہو تو دونوں کے نقطہ ہائے نظر کے درمیان اس قدر بُعد اور اختلاف پیدا ہو جانے کا قوی امکان ہے کہ اس بُعد کو ختم کرنے کی کوئی شخص ہمت نہیں کر سکے گا۔ اور نتیجۃً وہ اپنی زندگی ہی میں جہنم کی سیر کر لیں گے۔ اس لئے متعلقہ افراد (لڑکے اور لڑکی) کے درمیان فکری اور نظریاتی ہم آہنگی کا ہونا بھی اشد ضروری ہے۔

تقریر سیرت النبیؐ کی مفت تقسیم

اخبار "الجماعت" کراچی کی طرف سے ہر سال عید میلاد النبیؐ پر سیرت حضور رحمۃ العالمین صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان افروز کتابیں شائع کی جاتی ہیں جو سارے ملک میں مفت تقسیم کی جاتی ہیں۔ اس سال ربیع الاول کے پہلے ہفتہ میں تقریر سیرت "رسول اللہ کے میٹھے بول" شائع کی جا رہی ہے جو پاکستان اور ہندوستان ہر جگہ وسیع پیمانہ پر مفت تقسیم کی جائیگی۔ صرف ڈاک خرچ کیلئے سات پیسے کے ٹکٹ لفافہ میں ارسال کر کے اپنا نام و پتہ پہلے ہی درج کرالیں تاکہ میلاد النبیؐ سے پہلے پہلے آپ کو بذریعہ ڈاک تقریر سیرت مفت ارسال کی جائے۔

(نوٹ) بھارت کے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے لئے ڈاک کے ٹکٹ ہم اپنے پاس سے لگائیں گے

پتہ:-

سرور شاہ گیلانی ایڈیٹر الجماعت کراچی ۳۲

سوز و ساز

تسکین قریشی

مجھ سے مل کر بھی اے دوست ہم کیا کریں
دل سے جاتا نہیں دل کا غم کیا کریں

اب کسی اور سے عرضِ غم کیا کریں
جب تمہیں کہہ رہے ہو کہ "ہم کیا کریں"

لذتِ شغلِ آہ و فغاں کیا کہیں؟
شکرِ انعامِ شب ہائے غم کیا کریں؟

کیا کریں اُن کے جور و ستم کا گلہ
دل بھی ظالم نہیں اُن سے کم کیا کریں

عاشقی عاشقی ہے، گدائی نہیں
پھر کسی سے سوالِ کرم کیا کریں

تھی بہت حسرتِ پائمالی مگر
رُک گئے خود اُنہیں کے قدم کیا کریں

کام آئی نہ تسکیں سلامت روی
پڑ گئے اور بھی پیچ و خم کیا کریں

(۲)

اُدھر مستی، اُدھر سیرِ خرابات
مبارک ہے پرستانِ خوش اوقات

غمِ دل کے بہت نازک ہیں حالات
شکایت لب پہ آئی اور بگڑی بات

سمجھ میں اہلِ دنیا خوب یہ بات
کہ دنیا ہی نہیں دارِ مکافات

بہت دلکش سہی ہر عالمِ حسن
مگر ہے بے رخی میں اور ہی بات

کمالِ عشق میں یکساں ہیں دونوں
غمِ فرقت ہو یا عیشِ ملاقات

نظر اُٹھتی نہیں اور کہہ گئے وہ
زباں کھولی نہیں اور ہو گئی بات

سراپا شوق و یکسر بے نیازی
یہی جذب و جنوں کی ہیں علامات

زیارت گاہِ اہلِ جستجو ہیں!
مری ہر لغزشِ پا کے نشانات

خرد کی دسترس، حدِ نظر تک
جنوں ہے صاحبِ کشف و کرامات

مجھے کل صحبتِ واعظ میں تسکیں
بہت یاد آئے میخانے کے دن رات

جوش ترمذی

وہ تقاضائے جنوں اب کے بہاروں میں نہ تھا
ایک دامن بھی تو اُلجھا ہوا خاروں میں نہ تھا

اشکِ غم تھم گئے یاد آتے ہی اُن کی صورت
جب چڑھا چاند تو پھر نور ستاروں میں نہ تھا

مرنے جینے کو نہ سمجھے تو خطا کس کی ہے
کون سا حکم ہے جو اُن کے اشاروں میں نہ تھا

ہر قدم خاک سے دامن کو بچایا تم نے
اور یہ شکوہ کہ میں خاکنشینوں میں نہ تھا

تم سا لاکھوں میں نہ تھا جانِ تمنا لیکن
ہم سا محرومِ تمنا بھی ہزاروں میں نہ تھا

جوش کرتے نہ اگر ضبطِ فغاں کیا کرتے
پرسشِ غم کا سلیقہ بھی تو یاروں میں نہ تھا

رُوحِ اِنتخاب

طلبہ کمیشن کی رپورٹ

ایک جائزہ

(اسلامی جمعیتہ طلبہ کراچی کی جانب سے ایک کتابچہ شائع ہوا ہے جس میں طلبہ کمیشن کی رپورٹ کا جس ایمانی فراست علمی و تعلیمی بصیرت اور بالغ نظری کے ساتھ جائزہ لیا گیا ہے، وہ اس کا متقضی ہے کہ یہ مکمل "تبصرہ" قارئین فاران "تک پہونچا دیا جائے —— م۔ ق)

دسمبر ۱۹۶۴ء میں حکومت نے سپریم کورٹ کے جج جناب حمودالرحمٰن صاحب کی سرکردگی میں جو کمیشن قائم کیا تھا اس کی رپورٹ اس ماہ شائع کردی گئی ہے۔ کمیشن کا کام یہ تھا کہ تعلیمی دنیا کو جو مسائل درپیش ہیں ان کا جائزہ لے اور ان کے حل کے لئے ٹھوس اور عملی سفارشات پیش کرے۔ کمیشن نے پورے ملک کا دورہ کر کے اساتذہ، طلبہ اور تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے دیگر تمام افراد سے ملاقاتیں کی ہیں اور تقریباً ایک سال کی محنت اور غور و فکر کے بعد یہ رپورٹ مرتب کی ہے۔

۱- نظریاتی پہلو

ہمارے نظام تعلیم کا اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ اب تک نظریاتی بنیادوں پر اس کی تشکیل نو نہیں کی گئی ہے۔ ایک لادینی اور مادی تہذیبی نظام کے لئے یہ چاہے بالکل مناسب ہو لیکن ایسی ریاست کے لئے جس کی بنیاد اسلام کا ہمہ گیر نظریۂ حیات ہے، یہ نہ صرف غیر اطمینان بخش ہے بلکہ مثبت طور پر اس کو نقصان پہنچانے والا ہے۔ قومی لحاظ سے ہمارے لئے اس سے بڑی ناکامی اور کوئی نہیں کہ ۱۸ یا ۱۹ سال کی مدت میں بھی ہم اس نظام کو نئی شکل نہیں دے سکے ہیں۔ اس خامی کو سب محسوس کرتے ہیں خطبہائے تقسیم اسناد میں طلبہ میں اعلیٰ اخلاقی اقدار اور مضبوط سیرت و کردار کے فقدان کا شکوہ سب کرتے ہیں لیکن کوئی ٹھوس قدم اصل مسئلہ کو حل کرنے کے لئے نہیں اٹھایا جاتا۔ جب تک نظام تعلیم طلبہ کو زندگی کا کوئی اعلیٰ مقصد عطا نہ کر دے گا، ان میں نظم و ضبط کا فقدان اخلاقی اقدار سے روگردانی یہاں تک کہ پڑھائی تک میں عدم دلچسپی کی شکایات دور نہیں ہو سکتیں۔ قومی تعلیمی کمیشن کی صریح ناکامی بھی یہی تھی کہ اس نے انگریزوں کے چھوڑے ہوئے اس نظام تعلیم میں کسی بنیادی اور ہمہ گیر تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں کی اس لئے اسے ایک مایوس کن رپورٹ قرار دیا گیا۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ موجودہ رپورٹ بھی، اپنی بعض جزوی خوبیوں کے باوجود اس بنیادی مسئلہ کو حل کرنے کی کوئی خاطر خواہ کوشش نہیں کرتی۔ بلکہ مقام حیرت و افسوس ہے کہ تبدیلی کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتی!

کمیشن کا دائرہ کار محدود نہ تھا اس نے خود یہ تسلیم کیا ہے کہ اس کا دائرہ کار اتنا وسیع تھا کہ تعلیمی دنیا سے متعلق ہر مسئلہ اس میں آسکتا تھا (صفحہ ۱) یہی وجہ تھی کہ جمعیت نے کمیشن کے سامنے جو یادداشت پیش کی اس میں جہاں بھرپور انداز سے جزوی اور وقتی مسائل کی طرف توجہ دلائی وہیں پر زور الفاظ میں یہ بھی واضح کیا کہ موجودہ نظام کو اسلام کے سانچے میں ڈھالے بغیر ترقی کے حق کی توقع عبث ہے۔ تعلیمی نظام کے غلط رخ پر چلنے کی وجہ سے جو مسلسل اور ناقابل تلافی نقصان ایک آزاد مسلمان قوم کی حیثیت میں ہم کو پہونچ رہا ہے، اس کی بنا پر توقع تھی کہ کمیشن اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہونے کے لئے نظام تعلیم میں بنیادی تبدیلی کی سفارش ناگزیر تصور کریگا لیکن کمیشن نے نہ صرف یہ کہ موجودہ نظام پر اپنے کامل اطمینان و اعتماد کا اظہار کیا ہے بلکہ یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ "وہ بے مقصدیت جو اب تک ہمارے نظام تعلیم پر چھائی ہوئی تھی اب ختم ہو چکی ہے" (صفحہ ۲۴۴) کمیشن نے لکھا ہے کہ "ہم نے کوشش کی ہے کہ اپنی موجودہ تعلیمی پالیسی میں اور حالات کے اس نظام میں جو اس وقت جاری ہے کسی قابل لحاظ تبدیلی کی سفارش نہ کریں" (صفحہ ۱۹۲) کمیشن نے جا بجا سوائے زمانہ قومی تعلیمی کمیشن کی رپورٹ کو مرکزی نقطہ اور معیار حق مانا ہے اور انہیں اس میں کوئی خرابی نظر نہیں آسکی۔ اس طرح یہ دراصل اسی رپورٹ کا ایک تتمہ ہے اور یہ شبہ ہوتا ہے کہ اس کی سفارشات کو زیادہ خوش اسلوبی سے نافذ کرنے کا رستہ بتانے والی ہے۔

اسلامی نظام تعلیم کے بارے میں کمیشن کے فاضل ممبران نے جس پریشان خیالی کا اظہار کیا ہے وہ اس امر کی عکاس ہے کہ یا تو تعلیم کے اساسی اور خصوصیت سے نظریاتی امور کے بارے میں ان کا علم بہت محدود ہے (اور اس کا اعتراف تو خود کمیشن نے کیا ہے کہ اس کا کوئی بھی ممبر طلبہ یا تعلیم گاہوں کے معاملات سے براہ راست تعلق نہ رکھتا تھا۔ صفحہ ۲) یا پھر وہ اسلام کے تصور تعلیم سے ناواقف ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ "مختلف علوم وفنون میں مسلمانوں کا جو حصہ رہا ہے اگر اسے بھی پڑھا دیا جائے تو یہ بہت کافی ہے (صفحہ ۱۰۵) پھر وہ یہ فرماتے ہیں کہ طبیعات۔ ڈاکٹری، انجینیرنگ اور دوسرے سائنسی اور فنی مضامین کو اسلامی نہیں کیا جاسکتا اس لئے کہ کیا ہم یہ سفارش کریں کہ ان علوم میں مسلمانوں کے زمانے کے بعد جو کچھ ترقی ہوئی ہے اس سے ہم اپنے طلبہ کو ناواقف رکھیں (صفحہ ۱۰۵) اسلامی نظام تعلیم کے بارے میں اتنی بچکانہ بات کی توقع کمیشن کے فاضل ممبران سے کوئی بھی نہ کرسکتا تھا۔ افسوس ہے کہ وہ اس بنیادی بات کو بھی نہیں سمجھ سکے کہ نظام تعلیم کسی نہ کسی تہذیب اور ثقافت کا آئینہ دار ہوتا ہے اور اپنے طلبہ کو اس مخصوص نظام کا علمبردار بناتا ہے یہ نظریہ حیات اس کے طریق تعلیم اور طرز تعمیر ہی میں نہیں، نصابات مضامین کی ایک ایک سطر میں اور تعلیم گاہوں کے روزمرہ کے معمولات تک میں سمویا ہوا ہوتا ہے۔ اس کے تحت تربیت پانے والے کی پوری شخصیت پر اس کی چھاپ ہوتی ہے۔ پھر وہ کسی دوسری تہذیب کے نقال اور اس کے گن گانے والے نہیں ہوتے۔ جب اس ملک کے باشندے اسلامی نظام تعلیم کا مطالبہ کرتے ہیں تو وہ اپنی اولاد کے لئے ایسے نظام تعلیم کا مطالبہ کرتے ہیں جو سائنس اور ٹیکنالوجی اور دوسرے علوم میں ان کو درجہ اول کا ماہر تو بنائے لیکن ان کی شخصیت ان کی فکر اور ان کا عمل اسلامی نظام حیات کا عملی پیکر ہو۔ معلوم نہیں کمیشن کے معزز ممبران یہ موٹی سی بات کیوں سمجھ نہیں پاتے کہ جب تک ہمارا نظام تعلیم زیر تعلیم نسل کو ہمارے بنیادی عقائد سے کائنات کا ایک خالق ہونے کے، اسلام کے مکمل ضابطہ ہدایت ہونے کے اور آخرت میں جوابدہی کے تصورات سے آراستہ نہیں کرے گا ہم نہ تو اچھے مسلمان بن سکیں گے اور نہ اچھے ماہر۔ مغرب کی خوشہ چینی کرکے ہم دنیا کی فکری قیادت نہیں سنبھال سکتے، دینیات کے ایک پیریڈ نے خواہ وہ بی اے تک ہو یا آٹھویں تک، نہ یہ کام ماضی میں سرانجام دیا ہے اور نہ مستقبل میں دے گا۔ کیا ۱۸ سال کا تجربہ ہمیں یہ بتانے کے لئے کافی ہے کہ اس بنیادی اصلاح کو نہ کرنے اور اپنا رشتہ اپنی تہذیب وثقافت سے نہ جوڑنے کی وجہ سے ہم تعلیم کے میدان میں برابر روبہ تنزل ہیں اصلاح کی جزوی کوششیں اسی لئے ناکام ہوئی ہیں کہ بنیادی خرابی سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا۔ ہمارے ارباب کار کا دعویٰ ہے کہ گزشتہ ۱۸ سال میں تعلیم کے میدان میں نمایاں ترقی ہوئی ہے لیکن اس رپورٹ نے تعلیمی اداروں کا جو آنکھیں کھول دینے والا نقشہ کھینچا ہے وہ خود گواہ

ہے کہ کیا ترقی ہو سکتی ہے!! بلکہ اس کمیشن کی سب سے بڑی ناکامی یہی ہے کہ اس نے نظریاتی تشکیل نو کی ضرورت محسوس نہیں کی ہے اور تعلیم اور اسلام کو دو علیحدہ عناصر تصور کیا ہے۔

تعلیم کی نظریۂ حیات سے لا تعلقی کا بنیادی نقطۂ نظر ہے جو ساری سفارشات میں کارفرما ہے۔ چونکہ وہ تعلیم اور نظریۂ حیات میں کوئی ربط تلاش نہیں کر سکے ہیں اس لئے یہ اگر مشنری اسکولوں میں دی جائے تو بھی مناسب ہے!! اور قومی زبان میں نہ دی جائے تب بھی کوئی فکر کی بات نہیں!! اسی لئے ان کی ساری سفارشات اس محور کے گرد گھومتی ہیں کہ تعلیم کے لئے انتظامات مناسب ہونے چاہئیں۔ کلاس روم کٹ وہ ہوں کھیلوں کے میدان موجود ہوں، فرنیچر مناسب ہو، رہائش کا انتظام معقول ہو ——— یہ سب بجا لیکن کیا یہ ہمارے مرض کا حل ہے، کیا یہ طلبہ کی بے چینی کو، ان میں نظم و ضبط کے فقدان کو مایوسی اور بے اطمینانی کے احساسات کو تعلیم کے تشویشناک گرتے ہوئے معیار کو اور امتحانات میں ناجائز ذرائع کے کھلے بندوں استعمال کو (صفحہ ۵) ختم کر دے گا۔ کاش کہ وہ یہ محسوس کریں کہ جب تک ہم اپنے طلبہ کو کسی مقصد حیات سے سرشار نہ کریں انسان کی ساری سعی و جہد کو اس اعلیٰ ترین مقصد کے گرد نہ گھمائیں جو اسلام ان کو عطا کرتا ہے ان کوششوں کے لئے ناکامی مقدر ہے، اور اگر ان کوششوں کو کامیابی نصیب ہو بھی جائے تو اس کا حاصل اس کے علاوہ اور کیا ہوگا کہ ہم مغرب کی تہذیب کو جس کا علمبردار یہ نظام تعلیم ہے زیادہ بہتر اور مستعد کارکن فراہم کر کے دیں گے!

۲- واحد نظام تعلیم

کمیشن کی دوسری اہم ناکامی یہ ہے کہ وہ پورے ملک کے لئے ایک کل اور ہمہ گیر نظام تعلیم کی ضرورت محسوس کرنے سے قاصر رہا ہے ——— رائج الوقت نظام مختلف نصاب ہائے تعلیم کے تحت ذہنی و فکری لحاظ سے متضاد افراد تیار کر رہا ہے مستقبل کے لئے یہ جتنا بڑا خطرہ ہے اس کا اندازہ ہر کسی کو ہے لیکن کمیشن اسے جاری رکھنے کے حق میں ہے۔ چنانچہ اس کی سفارش ہے کہ "عربی مدارس و مکاتب پرائمری کے بعد از خود ہی کی ذمہ داری سنبھالیں جو ان کی تعلیم حاصل کرنا چاہیں" صفحہ ۲۲۳۔ یہ مطالبہ بھی رد کر دیا گیا ہے کہ انگلش میڈیم اور کنڈر گارٹن اسکولوں اور عام اسکولوں کے تفاوت کو دور کیا جائے۔ (صفحہ ۱۷) کمیشن نے یہ تسلیم کیا ہے کہ "ہمارے سامنے مختلف طبقات کے لئے مختلف قسم کی تعلیم گاہوں میں مختلف طرز تعلیم کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے" لیکن ان کے لئے جو علاج تجویز کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ جاپان کی طرح سارے مڈل اور ہائی اسکولوں میں اسکول یونیفارم جاری کرنے پر غور کیا جائے۔ کمیشن نے توقع ظاہر کی ہے کہ اس طرح وہ تصورِ مساوات حاصل ہوگا جو اسلام پیدا کرنا چاہتا ہے۔ (صفحہ ۲۳۳)

مشنری اسکول

ان مختلف قسم کے اداروں میں ایک قسم مشنری اسکولوں کی ہے جن کے لئے کمیشن نے جا بجا کلمات خیر کہے ہیں یہاں تک کہ معدوم ہوا کہ دینیات کی تعلیم بھی سب سے اچھی یہیں دی جاتی ہے (صفحہ ۱۷) صرف ایک مختلف اسکول ہونے کے لحاظ سے نہیں بلکہ صریح طور پر نظریہ پاکستان اور پاکستان کے مفادات کے خلاف کام کرنے والے اداروں کی حیثیت سے ان کے بند کرنے یا انہیں صرف ان کے ہم مذہبوں تک محدود کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ ان اسکولوں کے بارے میں اخبارات میں آئے دن واقعات شائع ہوتے رہتے ہیں کہ کس طرح یہ اسلام اور اسلامی عقائد کی اہانت اور عیسائیت کی تبلیغ کرتے ہیں ان کی وسعت و اشاعت کا عالم یہ ہے کہ صرف کراچی میں صرف کیتھولک بورڈ ۴۴ پرائمری و سیکنڈری اور ۳ کالج چلا رہا ہے۔ عوام میں ان کی سرگرمیوں کے خلاف سخت غم و غصہ ہے لیکن کمیشن نے انہیں بھی وہ تحفظ عطا کیا ہے اور بہترین کارکردگی کا وہ سرٹیفکیٹ عنایت فرمایا ہے جو اس سے پہلے سرکاری طور پر انہیں شاید نہ ملا ہو۔ یہ الزام کہ ان اسکولوں میں مشنری کام ہوتا ہے اور جو طلبہ منتظمین کے ہم مذہب نہیں ہوتے انہیں مختلف طریقوں سے مذہب تبدیل کرنے پر آمادہ کیا جاتا ہے صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

اس کے لئے کوئی ثبوت نہیں " (صفحہ ۱۰۷)

۳- تحدیدِ تعلیم

تعلیم کو محدود کرنے اور اعلیٰ تعلیم کو کم سے کم خوش قسمت افراد کے لئے قابل تحصیل بنانے کے بارے میں یہ تعلیمی کمیشن کا مکمل موقف ہے
اس کی نظر میں بہت سے مسائل کالجوں میں بے جا ہجوم کا نتیجہ ہیں۔ طلبہ کی تعداد میں زیادتی انہیں ناگوار گذرتی ہے۔ وہ اس کا علاج یہ نہیں بتلاتے
کہ کالج اور کھولے جائیں بلکہ یہ بتاتے ہیں کہ طلبہ ان کالجوں تک کم پہونچیں۔ چنانچہ " نہ تو یہ ممکن ہے اور نہ پسندیدہ ہے کہ تیسرے پنجسالہ منصوبے
کی مدت میں آٹھویں جماعت تک لازمی تعلیم کر دی جائے " (صفحہ ۳۴) اگر کالجوں میں " بے سوچے سمجھے داخلہ کی سد " کو کم کرنا ہے تو BIFURCATION
کی اسکیم پر عمل ضروری ہے (صفحہ ۳۶) کمیشن کی نظر میں طلبہ کو میٹرک کے بعد تعلیم چھوڑ دینی چاہئے یا بہت سے بہت انٹر کے بعد۔ ڈگری کالجوں میں بہت کم
طالب علم پہنچیں تاکہ انہیں سلیقہ سے پڑھایا جا سکے اور بیرون کلاس کے مسائل بھی پیدا نہ ہوں۔

شام کے کالج

شام کے کالجوں کے بارے میں بھی اس روشنی میں سفارش کی گئی ہے کہ " اب جب کہ سارے بورڈ اور یونیورسٹیاں بیرونی امتحانات کی
اجازت دے رہے ہیں تو ان طالب علموں کے لئے جو ملازمت کرتے ہوں یا کسی وجہ سے دن کے کالج میں داخلہ نہ لے سکے ہوں، دروازے کھلے
ہوئے ہیں اس طرح اب شام کے کالجوں کی ضرورت کم سے کم تر ہو گئی ہے۔ بورڈ یا یونیورسٹی سے باقاعدہ الحاق کے بغیر یہ شام کے وقت
COACHING CENTRES کے انداز پر چل سکتے ہیں۔ (صفحہ ۴۹)

۴- ذریعۂ تعلیم

گزشتہ چند سالوں میں ذریعۂ تعلیم کے مسئلہ کو ملک کے ماہرین تعلیم نے سنجیدگی سے سوچا ہے اس کے نتیجہ میں کراچی اور پنجاب کی جامعات
نے اپنی حد تک اردو ذریعۂ تعلیم اختیار کرنے کے لئے عملی اقدامات بھی کئے ہیں ادھر مشرقی پاکستان میں بھی راجشاہی یونیورسٹی نے بنگلہ
کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی طرف عملی اقدام شروع کر دیئے ہیں۔ ہمارے ارباب کار میں ایک موثر طبقہ ایسے افراد کا ہے جو اب تک انگریزی سے
اتنا تعلق محسوس کرتے ہیں کہ کسی نہ کسی بہانے قومی زبانوں کی ترویج کو ٹالنا چاہتے ہیں۔ بدقسمتی سے کمیشن نے اپنا وزن اسی دوسرے گروہ کے پلڑے
میں ڈالنا پسند کیا ہے۔ پنجاب اور کراچی کی جامعات نے جن مشکلات اور حالات کے علی الرغم قومی زبانوں کو ذریعۂ تعلیم کی حیثیت سے اختیار کیا ہے
اس پر ہمت افزائی کا کوئی کلمہ لکھا گیا، کمیشن نے اس پر اپنے غیظ و غضب کا اظہار کیا ہے۔ اس میدان میں جو انتشار فکر ہے اور کسی متوازن اور
ہم آہنگ پالیسی کے فقدان کی جو کیفیت ہے، اس پر حکومت کی کوئی گرفت نہیں کی گئی ہے۔ اس معاملہ پر کمیشن نے ۹ (۱۰۸-۱۱۷) صفحے لکھے ہیں
ہم چند اقتباسات پر اکتفا کریں گے۔ " ہم اس بات پر افسوس کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ہماری بعض یونیورسٹیوں نے ذریعۂ تعلیم کی تبدیلی
کی رفتار کو تیز کرنے میں معقول حدود سے تجاوز کر کے ٹھنڈے فیصلے سے زیادہ جذبات میں بہنے کو ترجیح دی ہے " (صفحہ ۱۱۴) " بنگلہ اور اردو
اصطلاحات ہمارے طالب علموں کے لئے ناقابل فہم ہوں گی " (صفحہ ۱۱۵) " کراچی یونیورسٹی کا فیصلہ تو اتنا DRASTIC ہے کہ ۶۹-۱۹۶۸ء
کے بعد ہر کوئی طالب علم جس نے انگلش میڈیم اسکولوں میں پڑھا ہو اس کے تعلیمی اداروں میں اعلیٰ تعلیم کے حق سے محروم رہے گا۔ ہمیں نہیں
معلوم کہ کراچی یونیورسٹی کو اس بات کا کیا حق تھا کہ وہ طلبہ کے ایک معتدبہ طبقہ کو اس طرح تعلیم سے محروم کر دے " (صفحہ ۱۱۵-۱۱۶) کیا ہم یہ
عرض کریں کہ ہمارے تعلیمی اداروں کو یہ حق کہاں سے حاصل ہو گیا ہے کہ وہ انگریزی ذریعۂ تعلیم برقرار رکھ کر اردو میڈیم اسکولوں کے طلبہ
کو اعلیٰ تعلیم سے محروم کریں؟ پھر کیا اس مسئلہ کا حل یہ نہیں ہے کہ انگلش میڈیم اسکولوں میں بھی قومی زبان کو اختیار کیا جائے نہ کہ ان کی
مٹھی بھر تعداد کی خاطر اعلیٰ تعلیم کا سارا نظام خراب کیا جائے؟ آخر ہمارے فاضل ممبران کے جذبات انگلش میڈیم اسکول کے طلبہ کے لئے

اتنے نازک کیوں ہو جاتے ہیں ؟ ——— ذریعہ تعلیم کے مسئلہ پر یہ کمیشن بس اب اس مقام پر آ کھڑا ہوا ہے کہ "مرکزی وزیر تعلیم کی قیادت میں ایک کمیٹی بنائی جائے جو ساری صورت حال کا تفصیلی جائزہ لے کر بتائے کہ ذریعہ تعلیم میں تبدیلی کب سے کی جائے ؟ اور جب تک یہ کمیٹی مطمئن نہ ہو کہ تبدیلی ممکن ہے کسی یونیورسٹی کو اجازت نہ ہو کہ وہ از خود ذریعہ تعلیم تبدیل کر سکے" صفحہ ۲۱۱ - گویا کہ ہنوز روز اول کی کیفیت ہے اور جو قدم صحیح سمت میں آگے بڑھ چکے ہیں ان کو قلم زد کر دیا جائے۔ کراچی اور پنجاب کی یونیورسٹیوں نے ایک ہی تو ایسا فیصلہ کیا تھا جس پر پوری قوم نے ان کی تائید کی تھی - لیکن افسوس کہ کمیشن کو یہی اقدام سب سے زیادہ ناگوار گذرا ہے۔ انگریزی کے لئے یہ رواداری غیر ملکی مشنری اداروں کے لئے یہ وسعت اور بے چاری قومی زبان کے لئے یہ غیظ و غضب ! اس تم ظریفی کا کیا ہم شکوہ کریں گیا

۵ - مخلوط تعلیم، عورتوں کی تعلیم اور خواتین یونیورسٹی

عورتوں کی تعلیم کے بارے میں بھی کمیشن کوئی صحیح طرز فکر پیش نہ کر سکا۔ کمیشن نے اس پر علیحدہ گفتگو میں صرف ایک صفحہ صرف کیا ہے اور تینوں اہم ترین مسائل کو اس میں نمٹا دیا ہے۔ مخلوط تعلیم کا ہمارے دین اور معاشرت کے خلاف ہونا تو امر مسلمہ ہے ہی لیکن گذشتہ سالوں میں اس نے تعلیم گاہوں کے اخلاقی ماحول کو طلبہ اور طالبات کی تعلیم میں دلچسپی کو اور نتیجتاً تعلیم کے معیار کو جس تشویشناک انداز سے متاثر کیا ہے، وہ آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی ہے پھر عورتوں کی خصوصی ضروریات اور معاشرہ میں ان کے مقام کے لحاظ سے ان کے لئے مکمل طور پر علیحدہ نصاب کا مطالبہ بھی طور پر ایک مناسب اور ضروری مطالبہ تھا۔ لیکن کمیشن نے موجودہ طرز تعلیم ہی کو سند جواز عطا کی ہے اور کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں کی ہے۔ ان کے خیال میں "یہ بات عام طور پر تسلیم شدہ ہے کہ ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم کے زمانے میں مخلوط تعلیم پر کوئی اعتراض نہ ہونا چاہئے یہ بہتر سمجھا جاتا ہے کہ ۱۱ (اور ۱۸ سال کی عمر کے درمیان انہیں علیحدہ رکھا جائے۔ ہمارا نظام انہی اصولوں کی روشنی میں مرتب ہوا ہے اور بہت اچھا چل رہا ہے" (صفحہ ۱۸۵) "معاشرہ کے قدامت پسند طبقہ کا لحاظ رکھتے ہوئے ہم نے ہر ضلع میں علیحدہ انٹر کالج کی سفارش کی ہے ——— لیکن ہم اس پوزیشن میں نہیں کہ علیحدہ ڈگری کالج کی بھی سفارش کریں" علیحدہ نصاب کا تصور تو کمیشن کے لئے دور از کار بات تھی، یہ کہہ گیا ہے کہ "یونیورسٹیوں میں انہیں، ان کی ضروریات کے لحاظ سے مناسب مضامین پڑھائے جائیں" خواتین یونیورسٹی کا مطالبہ رد کر دیا گیا ہے "ہمارے نزدیک اس کے لئے کوئی حقیقی وجہ جواز نہیں ہے" کمیشن نے بار بار ہمسایہ ممالک کا ذکر کیا ہے کیا اسے یہ معلوم نہیں کہ دین و ایمان کی خاطر نہیں، روایات و ثقافت کی خاطر نہیں، صرف تعلیمی ضروریات ہی کی خاطر ہندوستان نے ایک نہیں دو دو خواتین یونیورسٹیاں قائم کی ہیں ! آخر کیا وجہ ہے کہ مغرب کی اندھی تقلید کی راہ سے ہٹ کر سوچنا ہی ہمارے لئے مشکل ہو گیا ہے ؟ اچھے اچھے لوگ جن کی اپنی پرورش اسلامی روایات کی آغوش میں ہوئی ہے وہ بھی جب زندگی کے حقیقی مسائل کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں تو اپنے کو مغرب کی مرعوبیت سے آزاد نہیں کر پاتے۔

۶ - طلبہ کے اداروں میں جمہوری رجحانات کا خاتمہ

طلبہ کے مسائل کے پیدا ہونے اور ان کے بگڑنے کی سب سے بڑی وجہ انتظامیہ کی طلبہ پر عدم اعتماد ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ کمیشن اس بارے میں ضرور کوئی مفید خدمت انجام دے گا۔ لیکن یہاں بھی مایوسی ہوتی ہے۔ الفاظ کی حد تک تو کمیشن نے یہ بات کہی ہے کہ طلبہ قابل اعتماد ہیں اور وہ لازماً سیاسی پارٹیوں کے بہکائے ہوئے ہی نہیں ہوتے لیکن جب اس نے کالج یونینز کے لئے نیا نظام تجویز کیا ہے تو خود طلبہ پر بدترین قسم کی بداعتمادی اور سوء ظن کا ثبوت دیا ہے۔ یونیورسٹی کے مراحل تک وہ طلبہ کو آزادی سے کام کرنے کا موقع نہیں دینا چاہتے۔ ملک کے بی۔ ڈی سسٹم کے طرز پر ایک نیم آزاد نظام تجویز کیا گیا ہے۔ وہاں وجہ جواز عوام کا "جاہل" ہونا تھا۔ کیا اب جہالت ہمارے طلبہ میں آگئی ہے کہ وہ اپنے مسائل کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ یا پھر اصل مطلب آزادی عمل اور رائے کو ختم کرنا ہے !! کمیشن کے مجوزہ نظام کے تحت (صفحہ ۱۸۱-۱۸۳) کالج کی ایک کونسل ہوگی جو ۵۰ طلبہ کے منتخبہ ایک نمائندے پر مشتمل ہوگی۔ اب یہ کونسل سارے امور کی

ذمہ دار ہے۔ یہاں تک کہ نائب صدر اور جنرل سکریٹری بھی منتخب کرے گی۔ کالج کے طلبہ اس لائق بھی نہیں کہ وہ براہ راست جنرل سکریٹری منتخب کرسکیں۔ کونسل کا صدر لازماً وائس چانسلر یا پرنسپل ہوگا اور اسے کونسل کو دو ماہ معطل کرنے، ایجنڈا منظور کرنے، میٹنگ کی تاریخ یا وقت مقرر کرنے اور کسی فیصلہ شدہ امر پر عملدرآمد روکنے کے اختیارات ہوں گے۔ غالباً اسکولوں کی انجمنیں اس سے زیادہ آزادی سے کام کرتی ہیں!

ہمیں نہیں معلوم کہ کمیشن نے کیا سوچ کر یہ سفارشات پیش کی ہیں شاید وہ چاہتے ہیں کہ طلبہ اپنے اجتماعی معاملات میں دلچسپی لینا چھوڑ دیں، اس لئے کہ اس سے سارے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر کمیشن نے طلبہ کی ان تنظیموں پر بھی بڑی سخت گرفت کی ہے اور وہ ان کو زندگی کا حق دینے کے لئے بھی تیار نہیں ہیں جو بین الکلیاتی بنیادوں پر کام کرتی ہیں۔ کمیشن کی تحقیق یہ ہے کہ یہ تنظیمیں کالج میں داخل ہونے والے نئے طالب علموں کو بہکا لیتی ہیں، اس لئے اگر انہیں ختم کردیا جائے تو صورت حال قابو میں آجائے گی۔ یہ مسائل کو حل کرنے کی خالص نوکر شاہی ذہنیت ہے اور اس طرح مسائل کبھی حل نہیں ہوتے۔ طلبہ کی اچھی اور بری سب ہی طرح کی تنظیمیں ہو سکتی ہیں، کمیشن کو رجسٹریشن کے قواعد کی سفارش کرنے کی بجائے طلبہ کے شعور پر اعتماد کیوں نہیں ہے کہ وہ غلط انداز کی تنظیموں کو خود جگہ نہ دیں گے۔ مسائل کے اٹھنے اور ان پر طلبہ کے جذبات نازک ہونے کی وجہ اس کے علاوہ اور کیا ہے کہ یہ مشکلات موجود ہیں اور جیسا کہ کمیشن نے خود بھی تسلیم کیا ہے۔ حکومت دعوے کرتی ہے مگر عملی اقدام نہیں کرتی۔ اگر اس امر کی اصلاح ہوجائے تو طلبہ کا ماحول سدھر سکتا ہے۔ اور پھر کوئی وجہ نہیں کہ یہ تنظیمیں دوسری تعمیری سرگرمیوں میں مشغول نہ ہوں لیکن اگر کمیشن طلبہ کی مشکلات دور کرانے کے اس ذریعہ کو بھی ختم کرنا چاہتا ہے تاکہ سرے سے آواز ہی نہ اٹھے، تو کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جانتا ہے کہ حکومت اپنی روش بدلنے والی بہرحال نہیں ہے اور اگر ایسا نہیں ہے تو کمیشن کو اس پر کیا اعتراض ہے کہ طلبہ اپنی آواز متحدہ پلیٹ فارم سے اٹھاتے رہیں۔

۷۔ فیسوں کی شرح

فیسوں کے بارے میں کمیشن کا فیصلہ یہ ہے۔

حکومت یا مقامی اداروں کے تحت چلنے والے اسکولوں میں فیسیں کسی طرح بھی زیادہ یا غیر معقول نہیں ہیں۔ ان اداروں میں فیس کم کرنے کا کوئی جواز ہمیں نظر نہیں آتا؛ صفحہ ۹۹۔ ہم کالجوں میں پچاس یا چالیس فی صد کمی کے مطالبہ کو حق بجانب سمجھنے پر مطمئن نہیں ہیں۔ انٹرمیڈیٹ اور ڈگری دونوں جگہ، ۱۰سے ۲۰ روپے ماہانہ تک فیس لی جاتی ہے اور اسے کسی طرح بھی زیادہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ صفحہ ۱۰۵۔ مغربی پاکستان کے بعض طلبہ نے امتحانات کی فیسوں میں کمی کا مطالبہ بھی کیا ہے۔ ہم مطمئن ہیں کہ امتحانات کی جو فیسیں اس وقت لی جاری ہیں وہ معقول ہیں اور ان میں مزید کمی کا کوئی سوال نہیں۔ اس لئے ہم اس مطالبہ کو حق بجانب نہیں سمجھتے؛ صفحہ ۱۰۶۔

۸۔ یونیورسٹی آرڈیننس

طلبہ کے حالیہ احتجاج کو بروئے کار لانے والے عوامل میں سے ایک یونیورسٹی آرڈیننس بھی تھا جس کے بارے میں توقع تھی کہ کمیشن اس کے سراسر غیر جمہوری مزاج کے پیش نظر اس کی تنسیخ یا کم ازکم اس میں بنیادی ترمیمات کی سفارش کرے گا۔ لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ! کمیشن نے اس بارے میں طلباء اور اساتذہ کے نقطۂ نظر کو سمجھنے میں بڑی کوتاہی کی ہے۔ اس آرڈیننس نے تعلیمی زندگی کو ایسے ناروا ضابطوں اور بندشوں میں باندھ دیا ہے کہ یونیورسٹیاں سرکاری ڈیپارٹمنٹوں میں بدل گئی ہیں۔ اور باہم اعتماد کی فضا معدوم ہوگئی ہے۔ کمیشن کا محض یہ کہہ دینا کہ اختیارات پہلے بھی تھے کوئی حل نہیں۔ بلاشبہ انتظامی امور میں کچھ ناخوشگوار لمحات بھی آتے ہیں لیکن ان کی بناء پر مسلّمہ اور [illegible] کو سلب کرنے کا جواز نہیں دیا جاسکتا۔ مشنری اداروں اور انگریزی ذریعہ تعلیم کے اداروں کے سلسلہ میں تو کمیشن کو دستور کے بنیادی حقوق کا بڑا خیال رہا

لیکن تمام اساتذہ اور تمام طلبہ کے معاملہ میں آخر انہی بنیادی حقوق کا احساس کیوں پیدا نہ ہوا ؟

کمیشن کی تعمیری تجاویز

ہم اس دیانتدارانہ جائزہ میں کوتاہی کے مجرم ہوں گے اگر یہ اعتراف نہ کریں کہ ان کمزوریوں کے باوجود اس رپورٹ کے بعض اچھے پہلو بھی ہیں۔ ظاہری خرابیوں کو دور کرنے کے لئے جو کچھ تجاویز پیش کی جاسکتی تھیں وہ اس نے پیش کی ہیں اور کئی بہت مفید اور تعمیری تجاویز پیش کی ہیں۔ لیکن ان تجاویز کے سود مند ہونے اور نتیجہ خیز ہونے کا سارا انحصار اس پر ہے کہ حکومت ان پر خلوص و دیانتداری سے عمل کرے کمیشن نے تعلیمی اداروں کے لئے بنیادی ضرورتوں کی جو فہرست دی ہے، جلد از جلد سب اداروں کو اس معیار پر پہنچنا چاہئے۔ کمیشن نے سفارش کی ہے کہ طلبہ کے لئے مفت طبی امداد کے لئے انتظامات کئے جائیں، بسوں کے کرایوں میں رعایت کا انتظام کیا جائے کراچی میں سرکلر ریلوے یونیورسٹی سے قریب اسٹیشن قائم کرے، ہوسٹلوں کا معقول اور مناسب انتظام ہو، نصابی کتب سستی ہوں، بار بار نہ بدلیں اور آسانی سے دستیاب ہوں۔ امتحانات میں ناجائز ذرائع کے استعمال کا سدباب کیا جائے تعلیمی اداروں میں پولیس کا داخلہ ممنوع ہو۔ چانسلر سے ڈگری واپس لینے کا اختیار واپس لیا جائے۔ اساتذہ کو باعزت مقام دیا جائے۔ ملازمتوں کے قوانین فطری انصاف کے اصول کے خلاف نہ ہوں — اور اس طرح کی دوسری وہ سفارشات جنہیں کمیشن نے حق بجانب مانا ہے ہم حکومت سے پرزور مطالبہ کریں گے اب جبکہ یہ مطالبات طلبہ کے مطالبات نہیں بلکہ کمیشن کے مطالبات ہیں اور ان پر سیاسی پارٹیوں کے بہکانے کا الزام نہیں لگ سکتا تو وہ کسی مختصر اور متعین مدت میں ان کو پورا کرے۔ لیکن اس ضمن میں ہم فاضل ممبران کمیشن، ارباب حکومت اور عام اساتذہ و طلبہ کو ایک نکتہ کی طرف دعوت فکر دیں گے

یہ تجاویز ایسی نہیں جن کی اچھائی آج کمیشن نے دریافت کی ہو گزشتہ ۱۸ سال میں یہ امر کبھی مشتبہ نہ تھا کہ طلبہ کے لئے رہائش کا انتظام معقول ہونا چاہئے مگر عملاً ایسا نہیں ہوا۔ اب ہم کس بنیاد پر یہ توقع کریں کہ ان تجاویز پر عمل ہو جائے گا ؟ ہم یہ عرض کریں گے کہ ان تجاویز پر عمل کے لئے ضروری ہے کہ ساری مشینری دیانتدار ہو، خدا سے ڈرنے والی اور آخرت کی جوابدہی کا احساس رکھتی ہو اور خود عوام کے سامنے بھی جوابدہ ہو۔ اگر یہ نہ ہو اور سفارش کرپشن اور رشوت کا دور دورہ ہو تو محض قواعد قوانین یا تجاویز و سفارشات کبھی کوئی اصلاح نہیں لایا کرتیں۔ غور کے لئے دو مثالیں ہیں۔

کمیشن نے خود تسلیم کیا ہے کہ INTERNAL EVALUATION کے لئے ہم نے کسی سے کلمۂ خیر نہیں سنا (صفحہ ۵) اس کی ناکامی کی کیا وجہ ہے ؟ اساتذہ کا کردار ؟ یا کچھ اور ! لیکن کمیشن کے پاس اس کے لئے کوئی سفارش نہیں کہ کم از کم اساتذہ کے ٹریننگ کالج میں کردار کی تعمیر تربیت کا اور اسلامی عقائد کی بنیادوں پر انتظام کیا جائے اور اساتذہ کی عملی تربیت کی فکر کی جائے۔

امتحانات میں بدعنوانیوں کی بابت ان گنت شکایات پر کمیشن نے تشویش محسوس کی اور اس کے لئے اس نے اپنا انکا تی منصوبہ پیش کیا ہے صفحہ ۳۰۱-۴۰۱۔ لیکن یہ کوئی نرالے قواعد نہیں۔ ان پر عمل پہلے بھی ہوتا ہے لیکن بدعنوانیاں اس کے باوجود ہوتی ہیں۔ کیا طلبہ اساتذہ اور منتظمین میں خدا کے موجود اور علیم و بصیر ہونے کے احساس کو زندہ ایمانی قوت بنائے بغیر اس مسئلہ کا حل ہو سکتا ہے ؟

اسی طرح دیگر تجاویز ہیں۔ سب کے لئے ضروری ہے کہ حکومت کی رقم ایمانداری سے خرچ کی جائے لیکن سب جانتے ہیں کہ کل رقم کا کتنا حصہ مد میں لگتا ہے اور کتنا کرپشن کی نذر ہو جاتا ہے۔ کیا اس کی اصلاح محض قواعد قوانین سے ہو سکتی ہے ؟

ہم آخر میں پھر اس بات پر زور دیں گے کہ آج ہمارا اہم ترین مسئلہ پاکباز مسلمان پیدا کرنا ہے۔ نظام تعلیم کا یہ فریضہ ہے کہ وہ یہ کام انجام دے اور معاشرے کے بگڑتے ہوئے رجحانات کے آگے سد بن جائے۔ نہ کہ ان کو آگے بڑھانے کا ذریعہ بنے۔ اور یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ ہمارا نصاب اور طریق تعلیم ہمارے نظریہ حیات سے ہم آہنگ نہ ہو، دینیات کا پیریڈ، میٹرک تک ہو یا بی اے تک، دینی معلومات میں اضافہ تو کرے لیکن وہ کردار پیدا نہیں کر سکتا جو صرف اسی صورت میں پیدا ہو سکتا ہے کہ پورا نظام تعلیم اسلام کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہو اور اپنے زیر تعلیم نسل کو اسلام کے سانچے میں اس طرح ڈھالے کہ توحید، رسالت اور آخرت کے عقیدے اس کی زندگی کے وہ بنیادی اصول ہوں جن سے روگردانی دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت

اکمل البیان فی تائید تقویۃ الایمان

تالیف :- مولانا حافظ عزیز الدین مراد آبادی ،
ضخامت ۲۱۶ صفحات ۔
مجلد ، رنگین سرورق ، قیمت اٹھارہ روپے ۔
ملنے کا پتہ :- مکتبہ رشید مل روڈ ، لاہور ۔

حضرت مولانا شاہ محمد اسمٰعیل رحمتہ اللہ علیہ نے تلوار کے ذریعہ سکھوں سے اور زبان و قلم سے شرک و بدعات کے مظاہر اور رسوم و عقائد سے جہاد کیا ، حضرت شاہ شہید جرأت ایمانی سے کام لے کر شرک و بدعات کا رد نہ فرماتے تو متحدہ ہندوستان میں توحید خالص کا مطلع غبار آلود رہتا ، یہ ان کی جد و جہد تھی ، جس کی بدولت آج پاکستان اور ہندوستان کے مسلمانوں میں توحید و سنت اور شرک و بدعات کے درمیان امتیاز کیا جاتا ہے ! "تقویۃ الایمان" شاہ شہیدؒ کی شہرۂ آفاق اور بے مثال تصنیف ہے ، شرک و بدعت کے لئے سچ مچ "ضرب کلیم" ! وہ لوگ جو مشرکانہ عقائد و رسوم اور بدعات سے شغف رکھتے ہیں ، اُن کو سب سے زیادہ جلن تقویۃ الایمان کا نام سن کر ہوتی ہے کہ یہ کتاب قبر پرستوں کے مسلک ضلالت پر فیصلہ کن ضرب لگاتی ہے ۔

مولانا احمد رضا خاں بریلوی ، جن کے نام کے ساتھ اُن کے معتقدین "اعلیٰ حضرت" لکھتے ہیں ، مولانا مفتی نعیم الدین مراد آبادی (المتوفی ۹ ذی الحجہ ۱۳۶۷ھ) "اعلحضرت" کے مشہور شاگرد اور خلیفہ گزرے ہیں ۔ ان مراد آبادی صاحب نے "تقویۃ الایمان" کے رد میں "اطیب البیان" نام کی ایک کتاب لکھی تھی جس کے جواب اور تردید کی توفیق اُسی شہر کے ایک توحید شناس عالم ـــــ مولانا حافظ عزیز الدین ـــــ کو میسر آئی ۔

یہ کتاب (اکمل البیان) فاضل ناقد نے مولانا ثناء اللہ امرتسری مرحوم و مغفور کے ایماء پر لکھنی شروع کی تھی ، جس کے بعض اجزاء اخبار "اہل حدیث" امرتسر میں شائع ہوتے رہے ، مگر اشاعت کا یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا ۔ مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی اگر جد و جہد نہ فرماتے تو یہ نادر و شاہکار تالیف گمنامی کی نذر ہو کر رہ جاتی ، مولانا ممدوح نے ۱۹۵۵ء میں دہلی جا کر اس کتاب کا پتہ لگایا ، اُسے حاصل کیا ، اور پھر اس کی ترتیب و تبویب کی ، جہاں شدید ضرورت محسوس کی گئی ، وہاں عبارت کو درست فرما دیا ، مولانا محمد عطاء اللہ صاحب نے جس پُرخلوص محنت و عرق ریزی کے ساتھ "اکمل البیان" کی ترتیب و تہذیب کی ہے ، اس دینی کارنامہ پر وہ ملت اسلامیہ کی جانب سے تحسین و تبریک کے مستحق ہیں ۔

کتاب کی ترتیب و تبویب کے بعد اس کی کتابت و طباعت کا مرحلہ درپیش آیا ، یہ مرحلۂ دشوار مولانا محمد اسمٰعیل صاحب امیر مرکزی جمعیۃ اہل حدیث مغربی پاکستان کی کوششوں سے طے ہو گیا ۔ اُن کے بعض احباب نے طباعت و اشاعت کی مالی ذمہ داری اپنے سر لے لی ، اور اس طرح شرک و بدعت کے رد میں یہ "انسائیکلوپیڈیا" تیار ہو کر منظر عام پر آ گئی ۔

اس کتاب پر جناب مولانا محمد عطاء اللہ حنیف نے جو مقدمہ بعنوان "تصدیر" لکھا ہے وہ معلومات آفریں ہے ، فرماتے ہیں :-

"تقویت الایمان" پر اعتراضات مولانا فضل حق صاحب خیرآبادی مرحوم کو بھی تھے، مثلاً وہ جو بعد میں "مسئلہ امکان و امتناع نظیر" کا عنوان پا گیا، جس کا جواب خود مولانا شہیدؒ ہی نے قلم برداشتہ لکھ دیا تھا، جو "یک روزی" کے نام سے شائع ہو چکا ہے، غالباً اس کے بعد مولانا خیرآبادی موصوف نے "تحقیق الفتویٰ فی ابطال الطغویٰ" کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی، جس کا جواب مولانا حیدر علی رامپوری (ٹونکی) (متوفی ۱۲۷۳ھ) نے تحریر فرمایا (صراط حق ص ۲۶)

اس سلسلہ میں مولانا شہید کی قوت دلیل کا شاید نتیجہ تھا کہ مولانا فضل حق کے بعض شاگردوں نے بھی مولانا کی تائید کی، مثلاً مولانا سراج الدین لکھنوی، جنہوں نے استاد کے رد اور مولانا کے حق میں ایک رسالہ لکھا (نزہۃ الخواطر ص ۱۹۷ ج ۷) بلکہ حضرت مفتی صدر الدین آزردہ وغیرہ نے بھی مولانا کی تائید میں تحریریں شائع کرائیں۔

"معلوم ہوتا ہے کہ یہ شورش یا رد و قدح بمصداق "الناس اعداء لما جھلوا" غلط مفروضوں پر مبنی اور زیادہ تر علمی یا معاصرانہ چشمک قسم کی رہی، تکفیر و تبدیع کے فتووں تک اس کی نوبت نہیں پہونچی تھی، اور نہ مولانا پر "وہابیت" کا ٹھپہ لگایا گیا تھا، اور جوں جوں غلط فہمیوں کے بادل چھٹتے گئے، وہ مخالفت بتدریج کم ہوتے ہوتے تقریباً ختم ہی ہو گئی تھی، مولانا رشید الدین بھی "خوبیں مانڈ پڑ گئے، مولانا فضل حق خیرآبادی نے تو (اپنی) غلطی کا اعتراف ہی فرما لیا تھا بروایت مفتی عنایت احمد صاحب (مصنف علم الصیغہ) کہ:۔

"مولوی فضل حق صاحب بہت نادم تھے اور روتے تھے کہ وہ مجھ سے سخت غلطی ہوئی کہ میں نے مولوی اسمٰعیل صاحب کی مخالفت کی، وہ بے شک حق پر تھے، اور میں غلطی پر تھا" (اکمل البیان ص ۱۱۸ بحوالہ امیر الروایات)

اس کے بعد مولانا موصوف نے وہ تفصیل بیان کی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انگریزی حکومت کے اشارے سے "وہابیت" کے پر توحید و سنت کے احیاء کی اس مقدس تحریک کی کس کس طرح مخالفت کی گئی! اور اس سے مقصود مجاہدین کو ہندوستان کے مسلمانوں میں بدنام کرنا اور غیر مقبول بنانا تھا۔

مولانا مفتی نعیم الدین مرادآبادی نے "تقویۃ الایمان" کے رد میں جو زبان استعمال کی ہے وہ سب دشنام کی زبان ہے اور جہاں تک دلائل کا تعلق ہے وہ اکثر و بیشتر انتہائی کمزور و ضعیف، بلکہ پوچ بلکہ متعدد مقامات پر مضحکہ انگیز ہیں، بدعت و شرک کا اثر دنیا میں یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ ہر عقل فہم صحیح اور سوچنے سمجھنے کی قوت سے محروم ہو جاتا ہے! مولانا حافظ عزیز الدین مرادآبادی نے اس قدر معقول اور مسکت جواب دیتے ہیں کہ ان کے لئے ایک ایک سطر پر دل سے دعائیں نکلتی ہیں!

کتاب کی زبان بھی سادہ، اور عام فہم ہے مگر کہیں کہیں "خرافات" (ص ۹۶م) اور "انبیاؤں، اولیاؤں" (ص ۶۸، بھی پڑھنا پڑا، صفحہ ۷۶ پر "تبرکاً ان ناموں کو جپا کرتے تھے" نظر آیا یہ کتابت کی غلطی ہے کہ "جپا کرتے" تھے کی بجائے "چبا کرتے تھے" چھپ گیا۔

یہ کتاب ہے تو، "اطیب البیان" کے رد اور تقویۃ الایمان کی تائید میں، مگر اس میں تقریباً وہ سب آ گئے ہیں جو مشرکانہ عقائد

در سوم اور بدعات کی بنیاد رہیں یا خود راقم الحروف کے ذہن و فکر میں بعض خلجانات تھے، جو اس کتاب کے مطالعہ سے دور ہو گئے! شرک و بدعت کی اس قدر تفصیل و توضیح کے ساتھ تردید اور کسی کتاب میں دیکھنے میں نہیں آئی، پھر جو بات کہی ہے عقلی و نقلی دلائل کے ساتھ کہی ہے یہ کتاب خواص و عوام سبھی کے پڑھنے کے لائق ہے، فاضل مصنف نے اہل شرک و بدعت کے " علم کلام " کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دی ہیں، اور اُن کے مسلکِ ضلالت کو پوری طرح بے نقاب کر دیا ہے! یہ کتاب اپنے موضوع پر ہر اعتبار سے کامیاب، مفید اور قابل مطالعہ ہے! مکتبہ شبیش محل روڈ لاہور کے کارکنوں کو بھی اس کتاب کی اشاعت پر اللہ تعالیٰ دارین میں اجر عطا فرمائے گا!

براۃِ عثمانؓ

از :- مولانا ظفر احمد عثمانی، ضخامت ۸۰ صفحات، قیمت بارہ آنے،
ملنے کا پتہ :- مرکزی مجلس خدام صحابہ ملتان۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنے رسالہ " ترجمان القرآن " میں ایک طویل مقالہ ـــــ خلافت راشدہ سے ملوکیت تک ـ لکھا تھا، اس مضمون میں حضرت سیدنا عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دورِ خلافت کے بعض اُن واقعات پر تنقید کی گئی تھی جن میں قریب قریب تمام مورخین کے نزدیک " اضطراب " پایا جاتا ہے! مولانا موصوف کے اس مقالہ پر دینی حلقوں میں خاصی چہ میگوئیاں ہوئیں، اور بعض جرائد میں اس کا جواب بھی دیا گیا! ہفتہ وار " شہاب " (لاہور) میں حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی نے خاصی تفصیل کے ساتھ مولانا مودودی کے مقالہ کا جواب تحریر فرمایا جسے مرکزی مجلس خدام صحابہؓ پاکستان ملتان نے کتابی صورت میں " براۃِ عثمانؓ " کے نام سے شائع کیا ہے۔

مولانا ظفر احمد عثمانی کا علم و فضل اہل علم کے نزدیک مسلم ہے، ان کی کوئی ایسی تحریر بھی ہماری نظر سے نہیں گزری، جس میں مولانا مودودی کی ذات سے کد اور عناد کی جھلک پائی جاتی ہو، مولانا موصوف نے یہ مقالہ خلوص و حقانیت کے جذبہ کے تحت لکھا ہے، اپنے مسلک اور تحقیق کی تائید میں انہوں نے تاریخی حوالوں سے استدلال کیا ہے، زبان اور لہجہ بھی شائستہ ہے، اس کتاب کو پڑھ کر اگر کسی کا قلب اس پر مطمئن ہو جائے کہ حضرت عثمانؓ کی پالیسی اور عمل سے جو " اضطرابات " منسوب کئے جاتے ہیں، وہ جرح کے نہیں " تعدیل " کے مستحق ہیں ـــــ تو ہم اس " قلب مطمئن " کے بارے میں کوئی کھٹک محسوس نہیں کریں گے، بلکہ اُس کو قدر و استحسان کی نگاہ سے دیکھیں گے!

ہم نے ابھی ابھی " براۃِ عثمانؓ " کے فاضل مصنف کے زبان و لہجہ کی تعریف کی ہے مگر اس کتاب پر مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے جو مقدمہ تحریر فرمایا ہے۔ اُس سے جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کے خلاف بغض و عداوت کا جذبہ نمایاں طور پر جھلکتا ہے، ہم اُن علماء کو جانتے ہیں جنہوں نے جماعت اسلامی اور اُس کے امیر پر بے بنیاد الزامات لگا کر اور غلط تہمتیں جوڑ کر عوام کو گمراہ کیا ہے!

اس کتاب (براۃِ عثمانؓ) پر نقد و تبصرہ کے سلسلہ میں جو موضوع سامنے آتا ہے، اس پر ہم قدرے تفصیل کے ساتھ گفتگو کرنا چاہتے ہیں!۔ صحابہ کرام کے درمیان جو اختلافات رونما ہوئے، نوبت نزاع اور جنگ و جدل تک پہونچی اور نوشتہ تقدیر پورا ہو کر رہا اس کے بارے میں تین مسلک ہیں (۱) یہ کہ ان معاملات میں سرے سے ہی گفتگو ہی نہ کی جائے، خاموشی ہی بہتر ہے کیونکہ قیامت کے دن ہمارے اپنے اعمال کے بارے میں باز پرس کی جائے گی، صحابہ کرام کے معاملات میں ہماری کیا رائے اور فیصلہ ہے، اس کی باز پرس نہ ہوگی، ـــــــــ

(۲) یہ کہ صحابہ کرام پر جرح کے مقابلے میں " تعدیل " کو ترجیح دی جائے، اگر ایسی روایت جو کمزور اور ضعیف ہو اس سے کسی صحابی کے محلِ اعتراض قول و فعل کی، تعدیل ہوتی ہو تو اُسے قبول کر لیا جائے (۳) یہ کہ صحابہ کرام کے درمیان جو واقعات پیش آئے، وہ تاریخ کی کتابوں میں موجود ہیں جن ثقہ مورخین نے ان واقعات کو قلمبند کیا ہے وہ صحابہ کرام کے معاند اور دین کے بدخواہ نہیں تھے! جو واقعات سینکڑوں صفحات میں پھیلے ہوئے ہیں، اُن کے بارے میں اہل علم اور اہل تحقیق گفتگو اور مذاکرہ کریں تو اُن کے اس فعل کو " تنقیصِ صحابہؓ " سے منسوب اور موسوم نہیں کیا جائے گا۔ تاریخ کی ان کتابوں کو مسلمان ہی نہیں غیر مسلم بھی پڑھتے ہیں، ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب تک میں بعض کتابیں داخل ہیں،

ان کتابوں کے ساتھ دو سلوک کئے جا سکتے ہیں ایک یہ کہ ان میں اختلافِ صحابہ کے جو واقعات ہیں، اُن پر کوئی رائے نہ دی جائے نہ گفتگو اور محاکمہ کیا جائے، ان واقعات کے پڑھنے والے جو چاہیں رائے قائم کریں، دوسرا یہ کہ ان واقعات پر محتاط انداز میں نقد و تبصرہ کر کے قارئین کو وہ تصور دیا جائے جو اعتدال و انصاف سے زیادہ سے زیادہ قریب ہو، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اس سلسلہ میں لکھتے ہیں۔

"اب غور فرمائیے ـــــ یہی وہ ماخذ جن سے میں نے اپنی بحث میں سارا مواد لیا ہے، اگر یہ اُس دور کی تاریخ کے معاملہ میں قابل اعتماد نہیں تو پھر اعلان کر دیجئے کہ عہدِ رسالت سے آٹھویں صدی تک کی کوئی اسلامی تاریخ دنیا میں موجود نہیں ہے کیونکہ عہدِ رسالت کے بعد سے کئی صدیوں تک کی پوری اسلامی تاریخ، تیغین کی تاریخ سمیت، انہی ذرائع سے ہم تک پہونچی ہے، اگر یہ قابل اعتماد نہیں ہیں تو ان کی بیان کی ہوئی خلافتِ راشدہ کی تاریخ اور ائمہ اسلام کی سیرتیں اور ان کے کارنامے سب اکاذیب کے دفتر ہیں، جنہیں ہم کسی کے سامنے بھی وثوق کے ساتھ پیش نہیں کر سکتے، دنیا بھی اس اصول کو نہیں مان سکتی اور گونیا کیا، خود مسلمانوں کی موجودہ نسلیں بھی اس بات کو ہرگز قبول نہ کریں گی کہ ہمارے بزرگوں کی جو خوبیاں یہ تاریخیں بیان کرتی ہیں وہ تو سب صحیح ہیں، مگر جو کمزوریاں بھی کتب میں پیش کرتی ہیں، وہ سب غلط ہیں، اور اگر آپ کا خیال ہے کہ شیعوں کی سازش ایسی طاقت ور تھی کہ ان کے دسائس سے اہلِ سنت کے یہ لوگ بھی محفوظ نہ رہ سکے اور ان کتابوں میں بھی شیعی روایات نے داخل ہو کر اُس دور کی تصویر بگاڑ کر رکھ دی ہے، تو میں حیران ہوں کہ ان کی اس عمل اندازی سے آخر حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کی سیرت اور اُن کے عہد کی تاریخ کیسے محفوظ رہ گئی؟"

مولانا مودودی کی تحریر کا جو اقتباس اوپر دیا گیا ہے، وہ ایک محتاط، معقول اور صاحبِ تحقیق و نظر انسان کی رائے ہے۔

یہ بات بھی غور کرنے کی ہے کہ ابن سعد، ابن جریر طبری، حافظ ابن عبدالبر، ابن الاثیر اور ابن کثیر (رحمۃ اللہ علیہم) نے خدانخواستہ صحابہ کرام کو بدنام اور مطعون کرنے کی نیت سے ان واقعات کا ذکر نہیں کیا، ان کے بعد جس کسی نے بھی اُس دور کی تاریخ لکھی ہے، ان واقعات کو دُہرایا ہے اور بعض مورخین نے ان واقعات کے مابین محاکمہ بھی کیا ہے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے بھی ان واقعات کو مستند تاریخی حوالوں کے ساتھ پیش کر کے نتیجہ اخذ کیا ہے ـــــ گزشتہ اکابر مورخین اور اہلِ نقد و نظر کو ایسا کرنے کے سبب "قدحِ صحابہ" کا کسی نے مجرم نہیں گردانا ـــــ اس صورت میں مودودی صاحب پر بھی فردِ جرم بھی نہیں لگائی جا سکتی، زیادہ سے زیادہ اُن کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے، کہ وہ ان مباحث سے صرفِ نظر کر جاتے تو اچھا تھا۔

اس قسم کے مضامین اور اس نوع کی تحریروں میں سب سے پہلے یہ چیز دیکھنی کی ہے کہ لکھنے والے کا مسلک کیا ہے! مثلاً ایک عالم "سنتِ رسول" کو دین میں حجت سمجھتا ہے اُس نے اپنی تحریروں اور کتابوں میں جگہ جگہ "سنتِ رسول" کو دینی حجت کی حیثیت سے پیش کیا ہے، اس عقیدہ کے ساتھ بعض روایات پر جو حضورؐ یا کسی دوسرے نبیؑ کی سیرت یا کسی دینی اصل سے متصادم نظر آتی ہیں، وہ جرح بھی کرتا ہے تو ایسا کرنے کے سبب اُس پر "انکارِ حدیث" کی فردِ جرم نہیں لگائی جائے گی! اسی طرح ایک اہلِ قلم جو صحابہ کرام کے "عدول" ہونے کا عقیدہ رکھتا ہے، اُس نے اپنی تحریروں میں صحابہ کرام کے اقوال و آثار کو جگہ جگہ دینی سند کے طور پر پیش کیا ہے اور وہ نہ تو ناصبی ہے اور نہ خارجی اور رافضی ہے، اس مسلک اور عقیدہ کے ساتھ مستند تاریخی روایات کا تذکرہ اور اُن کے مابین محاکمہ کرتے ہوئے، دو چار صحابہ کے بعض مابہ النزاع احوال و واقعات پر نقد و نظر کی نوبت تک آ جاتی ہے تو ایسا کرنے کے سبب صحابہ کرام

کی اہانت کا الزام اُس پر نہیں لگایا جا سکتا۔

اس عقیدے کی صحت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ عصمت صرف نبوت و رسالت کی صفت اور خصوصیت ہے، صحابیت یا ولایت کی صفت "عصمت" نہیں ہے، اسی لئے تنقید سے بالاتر صرف انبیاء کرام کی مقدس شخصیتیں ہیں! بعض لوگ "تنقید" کا نام سُن کر برافروختہ ہو جاتے ہیں، تنقید کے معنیٰ عیب جوئی کے نہیں بلکہ "پرکھنے" کے ہیں، انبیاء معصوم ہیں لہٰذا وہاں "پرکھنے" کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا! صحابہ کرام معصوم نہیں ہیں، وہاں "تنقید" کی گنجائش کا امکان ہے! "تنقید" کے معنیٰ صحابہ کرام کی تکفیر، تفسیق، تفسیق، اہانت کے ہرگز نہیں، ہیں! ناصبی، خارجی اور رافضی جو معاملہ صحابہ کرام کے ساتھ کرتے ہیں وہ کھلی ہوئی ضلالت وگمراہی کا معاملہ ہے، اللہ تعالیٰ ان فاسد عقائد سے ہر اہلِ ایمان کو محفوظ رکھے۔ (آمین)

مذاہب اربعہ میں جن فقہی مسائل کے درمیان اختلاف پائے جاتے ہیں ان میں اصل بنیاد یہی تو ہے کہ صحابہ کرام کے اقوال و آثار اور فتاویٰ کے درمیان محاکمہ کر کے ایک کو دوسرے پر ترجیح دی گئی ہے، بلکہ بعض مسائل میں ائمہ فقہ نے کسی ایک یا چند صحابہ کے قول و عمل اور فتویٰ کے مقابلہ میں دوسرے صحابی کے قول و عمل کو صحیح اور درست نہیں سمجھا! ارباب فقہ کا یہ عمل "پرکھنا" (تنقید) نہیں تو اور کیا ہے! جب یہ بات کہی جاتی ہے کہ انبیاء کرام کے علاوہ اور کوئی شخصیت تنقید سے بالاتر نہیں ہے تو اس سے یہ غلط نتیجہ نکالنا ذہن کی کجی کی دلیل ہے کہ اس عقیدہ اور نظریہ نے معاذاللہ صحابہ کرام کو غلط کار ٹھیرا دیا اور ان کا "عدول" ہونا مجروح ہو گیا!

"تنقید کی دو مثالیں" ـــــ حضرت سیدنا ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سب کے نزدیک محترم اور مکرم ہیں، اُن کے قدموں کی دھول بھی ہم جیسوں پر پڑ جائے تو ہم پاک ہو جائیں لیکن جب اُن کی سیرت کا ذکر ہو گا تو مال و اسباب اور ذرائع و وسائل کے بارے میں جو نظریہ وہ رکھتے تھے، اُس پر ضرور تنقید کی جائے گی، کہ اس مسئلہ میں وہ بہت زیادہ شدید اور انتہا پسند تھے اور اُن کے اس نظریہ کے ساتھ دنیا کے کاروبار کا چلنا مشکل ہے ـــــ کیا اس قسم کی تنقید پر "تنقیص" کا گمان ہو سکتا ہے، اور یہ تنقید کیا جائز تنقید نہیں ہے، جس سے دین ہی کی بھلائی مقصود ہے، دوسری مثال حضرت سیدنا عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی ہے کہ "معوذتین" کو دوسری سورتوں کی طرح قرآن کا جزو سمجھنے میں اُن کی رائے دوسرے صحابہ سے منفرد بلکہ مختلف تھی، حضرت عبداللہ ابن مسعود کی عظمت، صحابیت، تفقہ فی الدین اور علم و تقویٰ اپنی جگہ مسلّم مگر اُن کی اس رائے کو قبول نہیں کیا گیا اور نہ کیا جائے گا اور جب بھی جمع و ترتیب قرآن کی مفصل تاریخ لکھی جائے گی تو اُن کی اس منفرد رائے پر ضرور تنقید ہو گی۔

"تنقید کی ایک اور مثال جو ان دونوں مثالوں سے شدید تر ہے، وہ حضرت سعد ابن عبادہ رضی اللہ عنہ کی ہے کہ انہوں نے حضرات شیخین (صدیق و فاروق رضی اللہ عنہما) کی بیعت نہیں کی، حضرت سعد کا یہ طرزِ عمل پسندیدہ نہ تھا، مولانا امین احسن اصلاحی نے تو حضرت موصوف کے اس خاص طرزِ عمل "قبائلی عصبیت" کو منسوب کیا ہے، ایک اور ثقہ عالم، جو کتنی ہی کتابوں کے مصنف ہیں اور حنفی مذہب کی مدافعت میں مجاہد کی حیثیت رکھتے ہیں، اُن سے اس واقعہ کا ذکر آیا تو فرمایا کہ حضرت سعد ابن عبادہ کے اس طرزِ عمل میں اُن کا "نفس" شریک تھا!

کبھی کبھار بہ تقاضائے بشری بعض صحابہ کرام سے اس قسم کی کمزوریاں یا رائے کی غلطیاں ظہور میں آئی ہیں، تو اُن پر تنقید کرنے کو "اہانت" یا "قدح" نہیں کہا جا سکتا، اور نہ اس سے "الصحابۃ کلہم عدول" کی واقعیت پر حرف آتا ہے، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنے مضمون میں اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے :-

"صحابہ کرام کے متعلق میرا عقیدہ بھی وہی ہے جو تمام محدثین و فقہاء اور علماء امت کا عقیدہ ہے کہ "کلہم عدول"
ظاہر ہے کہ ہم تک دین کو پہنچنے کا ذریعہ وہی ہیں! اگر اُن کی عدالت میں ذرہ برابر شبہ پیدا ہو جائے تو دین ہی مشتبہ

ہوجاتا ہے، لیکن میں "الصحابہ کلہم عدول" (صحابہ راستباز ہیں) کا مطلب یہ نہیں لیتا کہ تمام صحابہ بے خطا تھے، اور ان میں کا ہر ایک ہر قسم کی بشری کمزوریوں سے بالاتر تھا اور ان میں سے کسی نے کبھی کوئی غلطی نہیں کی ہے، بلکہ میں اس کا مطلب یہ لیتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرنے یا آپ کی طرف کوئی بات منسوب کرنے میں کسی صحابی نے کبھی راستی سے ہرگز تجاوز نہیں کیا ہے، پہلا مطلب اگر لیا جائے تو تاریخ ہی نہیں، حدیث کی مستند اور قوی روایات بھی اس کی تائید نہیں کریں گی، اور دوسرا مطلب اگر لیا جائے تو وہ قطعی طور پر ثابت ہے، جس کے خلاف کوئی شخص کسی قابل اعتماد ذریعہ سے کوئی ثبوت نہیں لا سکتا، حد یہ ہے کہ صحابہ کی باہمی لڑائیوں تک میں جب کہ سخت خونریزیاں اُن کے درمیان ہوئیں کبھی کسی فریق نے کوئی حدیث اپنے مطلب کے لئے اپنی طرف سے گھڑ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہیں کی، نہ کسی صحیح حدیث کو اس بنا پر جھٹلایا کہ وہ اس کے مفاد کے خلاف پڑتی ہے، اس لئے مشاجرات صحابہ کی بحث میں یہ ذہنی الجھن لاحق نہیں ہونی چاہئے کہ اگر کسی کا غلطی پر ہونا مان لیا جائے تو اس سے دین خطرے میں پڑ جائے گا۔۔۔۔۔۔۔"

"میں صحابہ سمیت تمام غیر نبی انسانوں کو غیر معصوم سمجھتا ہوں، اور معصومیت میرے نزدیک صرف انبیا کیلئے خاص ہے، میرا خیال یہ ہے کہ غیر نبی انسانوں میں کوئی شخص اس معنیٰ میں بزرگ نہیں ہوتا کہ اس سے غلطی کا صدور محال ہے یا اس نے عملاً کبھی غلطی نہیں کی ہے بلکہ اس معنیٰ میں بزرگ ہوتا ہے کہ علم و عمل کے لحاظ سے اُس کی زندگی میں خیر غالب ہے، پھر جتنا زیادہ کسی میں خیر غالب ہوتا ہے، میں اس کو اتنا ہی بڑا بزرگ مانتا ہوں!

اس معاملے میں میرے اور دوسرے لوگوں کے نقطۂ نظر میں ایک بنیادی فرق ہے جس کی وجہ سے بسا اوقات میری پوزیشن کو سمجھنے میں غلط فہمی لاحق ہو جاتی ہے، لوگ سمجھتے ہیں کہ جو بزرگ ہے وہ غلطی نہیں کرتا اور جو غلطی کرتا ہے وہ بزرگ نہیں ہے، اس نظریے کی بنا پر وہ چاہتے ہیں کہ کسی بزرگ کے کسی کام کو غلط نہ کہا جائے اور مزید برآں وہ یہ بھی گمان کرتے ہیں کہ جو شخص ان کے کسی کام کو غلط کہتا ہے وہ ان کو بزرگ نہیں مانتا، میرا نظریہ اس کے برعکس ہے، میرے نزدیک ایک غیر نبی بزرگ کا کوئی کام غلط بھی ہو سکتا ہے اور اس کے باوجود وہ بزرگ بھی رہ سکتا ہے۔۔۔۔۔۔"

۔۔۔۔۔ غلطیاں بڑے سے بڑے انسانوں سے بھی ہو جاتی ہیں اور ان سے اُن کی بڑائی میں کوئی فرق نہیں آتا، کیونکہ ان کا مرتبہ ان کے عظیم کارناموں کی بنا پر متعین ہوتا ہے نہ کہ اُن کی کسی ایک یا دو چار غلطیوں کی بنا پر"

مولانا مودودی کی اس وضاحت وتصریح کے بعد اُن لوگوں کا ذہن صاف ہو جانا چاہیے جو اُن کی بعض تنقیدوں سے بزرگوں کی اہانت یا سوءِ ادب منسوب کرتے ہیں، بہ تقاضائے بشریت مودودی صاحب کا قلم تنقید میں کہیں تیز ہو گیا ہے اور یہ "تیزی" اُن پر واضح کر دی جائے تو وہ صرف اپنی لکھی ہوئی عبارت پر اصرار نہیں کرتے، دلائل کے ذریعہ مطمئن ہو جانے کے بعد وہ اپنی تحریروں میں رد و بدل اور حذف و اضافہ کرنے میں پس و پیش نہیں کرتے! مجھ جیسے ہیچمدان نے اُن کے لکھے ہوئے بعض جملوں پر ٹوکا تو مودودی صاحب نے فراخدلی کے ساتھ اپنی لغزش تسلیم کر کے مان لیا۔ مودودی صاحب کی عظمت و احترام کے باوجود میں اُن کو غلطیوں سے محفوظ نہیں سمجھتا، مگر مولانا مودودی بشمول

کمزوریوں اور غلطیوں کے باوجود گمراہ نہیں ہیں، وہ دین وملت کے خیرخواہ اور ہمدرد ہیں اُن کے زبان وقلم اور فکر وعمل کی قوتوں سے دین وملت کو فائدہ پہونچا ہے اور انہوں نے ہر محاذ پر زبان وقلم سے اسلام کی مدافعت کی ہے، اُن کی کتابیں اسلامی ادب کا قابل قدر سرمایہ ہیں جو لوگ مودودی صاحب سے "دین کی تخریب" منسوب کرتے ہیں وہ عناد وتعصب اور بغض وحسد میں مبتلا ہیں اور انہیں اس تہمت تراشی اور افتراپردازی کی اللہ تعالیٰ کے یہاں جواب دہی کرنی ہوگی۔

اب ہم نفس مسئلہ کی طرف آتے ہیں ——— حضرت سیدنا ابوبکر صدیق اور حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہما کا زمانہ ہر اعتبار سے دینی ترقی کے شباب وجمال کا زمانہ ہے، خلیفہ کے طرز انتخاب کا معاملہ ہو یا باغ فدک کا مسئلہ مرتدین اور معاندین زکوٰۃ سے جنگ کا موضوع ہو یا اصول حکمرانی کا مبحث، سا تھ ہی "اقامت دین" کا مسئلہ بھی ——— ان تمام مسائل اور واقعات وحالات میں مسلمانوں کے ایک فرقہ کے علاوہ پوری ملت اسلامیہ حضرات شیخین کے موقف اور طرز عمل کو نہ صرف حق بہ جانب بلکہ عین حق سمجھتی، جانتی اور مانتی ہے! جو مورخین شیخین کے دور خلافت کو سراہتے ہیں، انہی نے حضرت سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دور خلافت کے "اضطرابات" کا ذکر کیا ہے یہ تمام کے تمام "اضطرابات" جعلی، فرضی اور وضعی نہیں ہیں، مولانا مودودی نے بھی اپنے مقالہ میں عہد عثمانی کے ان اضطرابات کو دہرایا ہے! اس حقیقت اور واقعیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ حضرت صدیق وفاروق کے دور خلافت میں حکومت کی مشین جس حسن تناسب کے ساتھ کسی ہوئی تھی، حضرت عثمانؓ کے عہد میں وہ بالکل ویسی نہیں رہی، حکومت کے کل پرزوں میں کہیں کہیں ڈھیل پیدا ہوگئی! اس ڈھیل کا نمایاں مظہر بنو امیہ کا عروج ہے، جس نے آگے چل کر خلافت کا رخ ملوکیت کی طرف موڑ دیا۔

مولانا مودودی نے عہد عثمانی کے اضطرابات کا بیشک ذکر کیا ہے، مگر انہوں نے ان واقعات سے کوئی ایسا نتیجہ نہیں نکالا جس سے حضرت سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی نیت پر کوئی حرف آتا ہو ——— مودودی صاحب لکھتے ہیں:-

> "سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے اقرباء کے معاملہ میں جو طرز عمل اختیار فرمایا، اس کے متعلق میرے وہم وگمان میں بھی، کبھی یہ شبہ نہیں آیا کہ معاذ اللہ کسی بدنیتی پر مبنی تھا، ایمان لانے کے بعد سے ان کی شہادت تک ان کی پوری زندگی اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخلص ترین اور محبوب ترین صحابیوں میں سے تھے، دین حق کے لئے ان کی قربانیاں ان کے نہایت پاکیزہ اخلاق اور ان کے تقویٰ وطہارت کو دیکھ کر، آخر کون صاحب عقل یہ گمان کرسکتا ہے کہ اس سیرت وکردار کا انسان بدنیتی کے ساتھ وہ طرز عمل اختیار کرسکتا ہے، جس کو آج کل کی سیاسی اصطلاح میں خویش نوازی (NEPOTISM) کہا جاتا ہے دراصل ان کے اس طرز عمل کی بنیاد وہی تھی، جو انہوں نے خود بیان فرمائی ہے وہ اسے صلہ رحمی کا حکم سمجھتے تھے اور ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ جو بھلائی کرنا بھی آدمی کے اختیار میں ہو، وہ اس سے دریغ نہ کرے یہ نیت کی غلطی نہیں، رائے کی غلطی ہے یا بالفاظ دیگر اجتہادی غلطی تھی ...."

یہ تو ناصبیوں خارجیوں اور رافضیوں کا مسلک اور طرز تنقید واحتساب ہے کہ وہ خلفاء راشدین کی غلطیاں جتا کر (خاکم بدہن گستاخ) انہیں گمراہ، ظالم بلکہ کافر تک کہتے ہیں! مولانا مودودی کا اس مسلک سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ان کے کسی مضطرب واقعہ کے بارے میں معاذ اللہ بدنیت نہیں سمجھتے، وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاکیزہ اخلاق اور طہارت وتقویٰ کے قائل ہیں اُن کی دینی قربانیوں کو مانتے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخلص ترین اور مخصوص ترین صحابیوں میں اُنہیں شمار کرتے ہیں۔

ہم نے اوپر کہا تھا کہ حضرات شیخین کے دور خلافت کے مقابلے میں عہد عثمانی میں حکومت کی مشین میں کہیں کہیں ڈھیل پیدا ہوگئی تھی،

اس عقیدے کے ساتھ ہم انہیں کامل الحیا اتم الایمان، خلیفہ راشد، ذوالنورین، دین و ملت کا محسن، صاحب طہارت و تقویٰ، مجرب یسوع اور اپنا مخدوم سمجھتے ہیں، بیشک سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کی بشارت دی تھی، آپ کی نیت اور ایمان کے اخلاص میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا اور ہمارا دل یہ چاہتا ہے کہ ان اضطرابات میں روایات و استدلال کے ذریعہ مورخین ہمارے مجروح ہو جاتے ہیں، مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے جو بعض مضطرب واقعات منسوب ہیں اُن کی تعدیل ہو جائے (رضی اللہ عنہ)

مروان کی شخصیت کے بارے میں مولانا ظفر احمد عثمانی نے اپنی کتاب (براءۃ عثمان) میں جو "تعدیل" کی زحمت فرمائی ہے، وہ بہت کچھ محل نظر ہے! تاریخ کی مستند روایات یہ بتاتی ہیں کہ مروان سے جو اعمال و واقعات ظہور میں آئے ہیں وہ قتل عثمان رضی اللہ عنہ کا سبب بنے، مروان حضرت عثمان کی طرف سے اُن کی اطلاع کے بغیر بھی حکم دے دیا کرتا تھا! حضرت عبداللہ ابن زبیر رضی اللہ عنہ کی حکومت قائم نہ ہونے دینے میں، تفرقہ کا باعث "مروان" ہی قرار پاتا ہے، طبقات ابن سعد میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول مروان کے بارے میں ملتا ہے۔

"لیمدن سرایۃ ضلالۃ ......"

(مروان ضلالت کا جھنڈا اُٹھائے گا)

جو لوگ مروان اور یزید کی "تعدیل" کی ذمہ داری اپنے سر لیتے ہیں وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی "تعدیل" کو بھی کھٹائی محل نظر بنا دیتے ہیں۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا معاملہ حضرت سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے بالکل مختلف ہے، امت کا اس پر اجماع ہے کہ جمل و صفین میں حق حضرت سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہ کے ساتھ تھا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو جمل کے واقعہ پر ندامت و مراجعت کی توفیق نصیب ہوئی، حضرت امیر معاویہ اپنے موقف پر جمے رہے، انہوں نے خلافت راشدہ کے مقابلہ میں اپنی امامت قائم رکھی اور شروع ہی میں خلیفہ راشد نے انہیں گورنری سے معزول کیا، تو اس کے حکم کی خلاف ورزی کی! فقہ حنفی کی شہرۂ آفاق کتاب ہدایہ میں امیر معاویہ کو "سلطان جائر" بتایا گیا ہے، اور حضرت علی کرم اللہ وجہ کے موقف کے بارے میں لکھا ہے۔

"..... والحق بید علی رضی اللہ عنہ"

یہ موقف کہ حضرت علی ناحق پر تھے، اور امیر معاویہ حق پر تھے، ناصبیوں کا موقف ہے جو سو فیصدی غلط اور گمراہ کن ہے، دوسرا موقف یہ کہ حضرت علی اور امیر معاویہ دونوں حق پر تھے، یہ بھی درست نہیں ہے، سچی بات یہی ہے اور یہی صحیح موقف ہے کہ امیر معاویہ اور حضرت علی کے معاملہ میں "حق" علی کے ساتھ تھا! اور امیر معاویہ نے خلافت کو ملوکیت میں تبدیل کر دیا! اُن کے چہیتے بیٹے، ولی عہد اور جانشین ـــــ یزید ـــــ نے بادشاہ بن کر جو کچھ کیا وہ اسلامی تاریخ کے سیاہ اوراق ہیں!

مولانا عثمانی نے یزید کی ولی عہدی کے جواز میں جو دلائل پیش کئے ہیں، ان میں "امویت" کی جھلک پائی جاتی ہے، یزید کی ولی عہدی امیر معاویہ کا ناپسندیدہ کارنامہ ہے!

لہ مروان کا معاملہ صغار صحابہ میں نہ تو حضرات حسنین رضی اللہ عنہما اور عبداللہ ابن زبیرؓ جیسا ہے اور نہ بڑی عمر کے صحابہ میں امیر معاویہؓ کی مانند ہے! اب رہی احادیث کی روایت تو اہل تشیع سے بعض روایتیں محدثین نے لی ہیں۔

مولانا ظفر احمد عثمانی فقہ حنفی کے گنتے بڑے عالم اور "اعلاء السنن" جیسی معرکۃ الآراء کتاب کے مصنف اور مولف ہیں، حیرت ہے کہ وہ اس حقیقت سے صرف نظر کر جاتے ہیں کہ "بُغات" کے مسئلہ میں فقہ حنفی میں اصل "قدوہ" حضرت سیدنا علی مانے گئے ہیں اور آن سے لڑنے والے باغی ٹھیرائے گئے ہیں؛ خلیفہ راشد حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مقابلہ میں حضرت امیر معاویہ کی حیثیت باغی گروہ کی ہے؛ اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حق "واضح ہوگیا تھا۔

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو یزید کے ولی عہد بنانے کی جو بات سُجھائی تھی وہ درست مشورہ نہ تھا اور حضرت عمرو بن العاص نے حضرت امیر معاویہ کو لڑائی میں جو یہ مشورہ دیا تھا کہ فوج نیزوں پر قرآن کو اٹھالے یہ بیشک جنگی چال تھی۔ مگر ایسی چال جس کی تحسین نہیں کی جاسکتی، پھر تحکیم کے مسئلہ میں حضرت ابوموسیٰ اشعری کے ساتھ حضرت عمرو بن العاص نے جو معاملہ کیا اُس کی جو کوئی "تعدیل" کرے گا، وہ صریحی غلطی کا ارتکاب کرے گا۔ کھلی ہوئی غلطیوں اور زیادتیوں کی "تعدیل" اپنی جگہ خود بہت بڑی غلطی ہے

اس ہمارے زمانے میں محمود عباسی نے یہ فتنہ کھڑا کیا ہے کہ امیر معاویہ کے مقابلہ میں حضرت علی کے موقف کو ناحق اور یزید کے مقابلہ میں حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو خطا کار ثابت کرنے کی مذموم کوشش کی ہے، یہ "ناصبیت" ہے، جو ضلالت کا مسلک ہے، ہم اس مسلک سے اپنی بیزاری کا اظہار کرتے ہیں، افسوس ہے کہ شیعیت سے خفگی اور ناراضگی کے جوش میں بعض اہل سنت محمود عباسی کے مسلک ناصبیت سے متاثر ہو گئے ہیں۔

حضرت سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے موقف کی "تعدیل" کرتے کرتے خود فاضل مصنف (مولانا ظفر احمد عثمانی) اُن روایتوں کو درج کر گئے ہیں، جن سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا موقف مجروح ہوتا ہے:۔

- "ابن عساکر وغیرہ نے حضرت شعبی (رحمتہ اللہ علیہ) سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر کی وفات اُس وقت تک نہیں ہوئی، جب تک قریش اُن سے اُکتا نہ گئے، انہوں نے قریش (کے مہاجرین) کو مدینہ میں محصور کر دیا تھا۔ (ص ۲۴)
- "قریش کے وہ افراد جو مہاجرین کہے جاتے تھے، سب ہی خلافت کے اہل تھے، اس لئے ان سب کو حضرت عمر نے مدینہ سے باہر جانے کی اجازت نہیں دی، بلکہ مدینہ میں محصور رکھا ....." (ص ۲۵)
- "اگر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان بلوائیوں کی پوزیشن مضبوط نہ کرتے کہ مالک اشتر نخعی کو فوج کا کمانڈر انچیف بنا دیا اور محمد بن ابی بکر کو اپنا مشیر خاص یا سکریٹری بنالیا (جو فتنہ قتل عثمان کے بانی تھے) اور ان کے ساتھیوں میں سے بھی کسی کو مجلس شوریٰ میں شامل کر لیا گیا، کچھ کو فوج میں؛ بلکہ خلافت کا منصب سنبھالتے ہی مسلمانوں سے اپیل کرتے کہ ان بلوائیوں کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ تو حضرت طلحہ اور زبیر اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہم کو مطالبہ دم (خون) عثمان کے لئے راست اقدام سوچنے کی نوبت نہ آتی"
- اسی چیز نے حضرت معاویہ اور ان کے ہم خیال صحابہ کی نظروں میں خلافت علی کو مشتبہ بنا دیا اور جنگ جمل نے اس خدشہ کو زیادہ قوی کر دیا۔

حضرت عثمان غنی رض کے دور خلافت کے سلسلہ میں سید ابوالاعلیٰ مودودی نے جن روایتوں کو نقل کیا ہے اور حضرت عمر اور حضرت علی کے بارے میں مولانا ظفر احمد عثمانی نے جن روایتوں کو دہرایا ہے ۔۔ اس صورت میں روایات کے نقل و اعادہ سے "تقدیر صحبہ" کی جو صورت پیش آتی ہے اس میں دونوں بزرگ کا ایک ہی مرتبہ ہے

آئینِ وفا از ڈاکٹر سید صفدر حسین، ضخامت ۱۰۴ صفحات، مجلد، رنگین سرورق، کتابت، طباعت، کاغذ ہر چیز دیدہ زیب)
قیمت: تین روپے۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ دانش افروز ۱۴ فرید مانشنز اسکوائر ساہن روڈ کرشن نگر لاہور۔

سید صفدر حسین صاحب کو، راقم الحروف اُس وقت سے جانتا ہے جب وہ "ڈاکٹر" نہیں ہوئے تھے، اور غالباً ایم اے کے طالب علم تھے، تیرہ میں اُن سے بارہا ملنا ہوا یہ اب سے ۲۲ - ۲۴ سال پہلے کی بات ہے، ربع صدی تقریباً ختم ہو رہی ہے! اچھے شاعروں سے ملنے اور شعر و ادب کی نشستوں اور صحبتوں میں شریک ہونے کا صفدر صاحب کو بہت شوق تھا شعر و سخن کے موضوع پر وہ دلچسپ گفتگو بھی کیا کرتے تھے —— مگر اُن کا کوئی شعر اُن کی زبان سے نہیں سنا۔ یہ انکشاف تو کراچی میں اب سے چھ سات برس پہلے ہوا کہ وہ بدیع خود بھی سے شعر کہہ رہے ہیں، مگر متحدہ ہندوستان میں شاعر کی حیثیت سے نمایاں ہونے کی انہوں نے کوشش نہیں کی! پاکستان میں وہ منظر عام پر آئے اور اس شان سے آئے کہ اونچے درجہ کے اہل نقد و نظر کو چونکا دیا! "شہرت و تعارف" کے لئے کس سلیقہ کی ضرورت ہے اس گُر سے صفدر صاحب واقف ہیں۔

سید صفدر حسین علی گڑھ کے ایم، اے، ایل، ایل بی اور پنجاب کے پی، ایچ، ڈی ہیں۔ کراچی میں کئی سال محکمہ تعلیمات کے ڈپٹی ڈائرکٹر رہے اور اب گورنمنٹ کالج جوہرآباد کے پرنسپل ہیں؛ اُن کی نظم و نثر کی متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں "رقص و طاؤس" جو اُن کی رومانی نظموں کا مجموعہ ہے، اُس پر "فاران" میں خاصی تفصیل کے ساتھ تبصرہ آچکا ہے، ڈاکٹر صاحب موصوف کے تنقیدی مضامین معلومات آفریں ہوتے ہیں۔ اُن کی تالیفات کی تعداد گیارہ کتابوں تک پہونچ چکی ہے!

شعر گوئی اور نثر نگاری کے علاوہ "مرثیہ خوانی" ڈاکٹر صفدر حسین صاحب کا خاص فن ہے۔ کراچی کی مجالس عزا میں اُنہوں نے اس شان سے مرثیے پڑھے کہ شہر میں دھوم مچ گئی (زیر تنقید کتاب (آئینِ وفا) میں ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، جناب مجتبیٰ حسین اور راقم الحروف کے وہ تاثرات شامل کئے گئے ہیں، جن میں صفدر صاحب کی مرثیہ خوانی کو خراج تحسین و عقیدت پیش کیا گیا ہے۔

"آئینِ وفا" —— ڈاکٹر صفدر حسین کا لکھا ہوا مرثیہ ہے۔ جس میں حضرت عباس علمدار کی سیرت، حیات اور نام آوری کو پوری قوت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ سید عابد علی عابد نے اس پر فاضلانہ مقدمہ لکھا ہے، اس کے بعد خود شاعر نے اپنے بعض نظریات کے اقتباسات پیش کئے ہیں جو مرثیہ گوئی کی صنف پر دلکش اور جاندار تبصرہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

"آئینِ وفا" میں صفدر صاحب نے بڑے سلیقہ اور عقیدت و محبت کے ساتھ اپنے جذبات و احساسات پیش کئے ہیں اور صنفِ مرثیہ کی روایتوں کا خیال رکھا ہے اور اپنی حد تک کوشش کی ہے کہ "مرثیہ" کی خصوصیات اول سے آخر تک جھلکتی رہیں۔ حضرت عباس کی منقبت میں یہ بند کتنا پرشکوہ ہے:—

عزم وہ جس کے لئے تنگ ہو ظرفِ کونین
وہ شجاعت جو بنی قوتِ بازوئے حسین
وہ جلالت کہ جو تھی آیتِ ربّ الثقلین
ہمہ تن حوصلۂ فاتحِ صفین و حنین
سر بسر باپ کے اوصاف کی تنویر لئے
آئینہ عرش سے اترا وہی تصویر لئے

ایک اور دلکش بند:—

مدحِ عباس کا منصب مری قسمت کو ملا
ایک ایک بیت پہ لینا ہے محمدؐ[1] سے صلا

[1] حضورؐ کے اسم گرامی کی بجائے "پیمبر" نظم کرنا چاہئے تھا!

ہاں! مری طبع چمن خیز وہ گلزار کھلا
جس کے پھولوں کو لگی ہو نہ گلستاں کی ہوا

ذہن بیدار ہوں، یوں بوتے گلِ تر پھیلے
دور تک نکہتِ گیسوئے معنبر پھیلے

اور

راہ طے کرکے ہوئے داخلِ مکۂ شبیرؑ
چار سو پھیل گئی جلوۂ حق کی تنویر
ارضِ کعبہ کی بڑھی گردِ قدم سے توقیر
سیرتِ پاک نے دکھلا دی نبیؐ کی تصویر

حسنِ اخلاق کا کلمہ پڑھا سب گاؤں نے
آتے ہی گھیر لیا شمع کو پروانوں نے

چند منتخب بند اور ابیات :—

جاگلیں لے کے بڑھا، آپ علمدار جری
فرس و قاطر و اشتر ہوئے سیراب سبھی
سوکھے ہونٹوں پہ نمایاں تھی لشکر کی تری
دل عقیدت سے بھرا، آنکھ ندامت سے جھکی

شرمِ احساں سے ہوئی فوجِ ستمگر پانی
اس کو کہتے ہیں کرم، ہو گئے پتھر پانی

گھر کے ابرِ کرمِ ساقیِ کوثر آئے
مشک کاندھے پہ اٹھائے علی اکبر آئے

لے گئی دل کی کشش منزلِ جاناں کی طرف
مڑ گئی رحمتِ معبود بیاباں کی طرف

دیکھ کر بے ادبیِ شہ کوفہ و شام
کبھی ہوتا تھا جو برہم وہ علیؑ کا ضرغام
پیار سے دوشِ مبارک کو تھپکتے تھے امام

[illegible]

جن کے کہتے تھے کہ غصہ ہے شجاعت پہ حرام
مرحمت شاہ کی جب آئینہ دکھلاتی تھی
ہر شکن ابروئے عباسؑ کی مٹ جاتی تھی

پیش قدمی کوئی کرتا، یہ نہ تھی تاب و مجال
ابتری فوج میں ظاہر ہوئی جیسے بھونچال
شاطرانِ سپہِ شام تھے بگڑے ہوئے چال
بدحواسی میں سمجھنے لگے تلوار کو ڈھال
دوش پر جاتے کماں خنجرِ بُرّاں رکھا
تیغ ترکش میں رکھی میان میں پیکاں رکھا

پاس وجب اُن کے محافظ تھے سمندِ ل پہ سوار
شاہدِ حوصلۂ عزم تھی جن کی رفتار
نہ سپر پشت پہ اور نہ کمر میں تلوار
چشمِ اندک نے دیکھے تھے نرالے جرّار
دل شگفتہ تھے دلیروں کے چمن کی صورت
دستِ فولاد میں نیزے تھے کرن کی صورت

یک بیک دور سے بڑھتے ہوئے سائے دیکھے
کچھ جری دوش پہ مشکیزے اٹھائے دیکھے

تابعِ حکمِ علمدار تھے وہ تیس سوار
جن کی ثابت قدمی لفظِ شجاعت کا وقار
جن کے زخموں سے کیا گلشنِ ملّت نے سنگھار
خون سے جن کے لکھی وقت نے تاریخِ بہار

(افسوس ہے اتنے جاندار شعروں کے بعد اس بند کی آخری بیت —
جن کا افسانہ روایاتِ نکو کی سُرخی
چہرہ فرض پہ ہے جن کی لہو کی سُرخی
میں کس قدر "آورد" پائی جاتی ہے)

دم بخود نوح ہوئی شہر خموشاں کی طرح
خاک اُڑنے لگی ڈیروں میں بیاباں کی طرح

پیاس اس طرح سے ٹھکرا دے بھلا پانی کو
موڑ دیتی ہے رخ فطرتِ انسانی کو

دوسرا رخ :-

چہرہ تصویر بنا رنگ شہادت کے لئے　　اُن کی تلوار بنی ہاتھ مشیت کے لئے　　(ص ۴۹)

مصرعہ ثانی میں "آمد" کی بجائے "آورد" نمایاں ہے۔

یہ وہ پانی کہ شجاعت کا ہے قلزم جس سے　　ہوا دو لاکھ کے لشکر میں تلاطم جس سے　　(ص ۵۱)

مصرعہ اولیٰ اظہار خیال اور اسلوب ادا کے اعتبار سے "ناپختہ" ہے۔

جلوۂ نورِ حسینی کی ہے عباس میں ضو　　ان کے آئینے پہ ہے شیرِ خدا کا پرتو　　(ص ۵۲)

"ان کے آئینے" سے آخر کیا مراد ہے؟ شاید "آئینۂ دل" تو پھر "دل" کا آنا ضروری تھا!

ہوئے پیدا تو کھلی گود میں شبیر کی آنکھ　　عمر بھر دیکھی اُسی صاحبِ توقیر کی آنکھ　　(ص ۵۳)

محاورہ یوں ہے کہ "فلاں شخص بزرگوں کی آنکھیں دیکھے ہوئے ہے" اس میں "آنکھوں" کا جمع لانا ضروری ہے، واحد کے ساتھ جس طرح اس مصرعہ :-

عمر بھر دیکھی اُسی صاحبِ توقیر کی آنکھ

میں ہے، درست نہیں؛ خود شاعر بھی اس مصرعہ کی صحت اور درایت کے بارے میں مذبذب ہے اس لئے ذیلی حاشیہ میں اس کا بدل یہ مصرعہ :-

نظر آئی تو اُسی صاحبِ توقیر کی آنکھ

بھی لکھ دیا ہے، مگر اس مصرعہ میں شاعرانہ لطف کی خاصی کمی محسوس ہوتی ہے! "تو" نے بات کو اور زیادہ بگاڑ دیا، کیا حضرت عباس کو امام حسین کی آنکھ کے علاوہ پورے گھرانے میں اور کسی کی آنکھ ہی دکھائی نہیں دیتی تھی۔

ہر بُنِ مُو سے نمایاں ہوئی تنویر کی آنکھ
آنکھ وہ آنکھ کہ کہئے جسے تاثیر کی آنکھ

"تنویر کی آنکھ" کیا ہوتی ہے؛ "تاثیر کی آنکھ" اس سے زیادہ مضحکہ خیز! شاعر کا پہلا مصرعہ خاصہ اچھا ہے (ہوئے پیدا تو کھلی گود میں شبیر کی آنکھ) اس مصرعہ کو برقرار رکھنے کے لئے انہوں نے بعد کے تین مصرعے جوڑے ہیں!

ہوئی عباس کو تفویض غلامئ حسین　　لوحِ قسمت پہ کھدا نامِ گرامئ حسین　　(ص ۵۴)

مصرعہ ثانی میں بڑا تکلف پایا جاتا ہے! "کھدا" نے شعر کی لطافت کو مجروح کر دیا۔

دل سے آواز یہ آتی تھی اُجالا کیجئے　　عزم کہتا تھا کہ دنیا تہ و بالا کیجئے　　(ص ۵۵)

اس سے پہلے مصرعوں میں "اندھیرے" کا ذکر آتا تو بند کی آخری بیت میں "اجالا کیجئے" موزوں لگتا!

ہیبتِ شبیر سے گونگی ہوئی حاکم کی زبان　　گرچہ سرِ دفترِ اشرارِ مدینہ مروان　　(ص ۵۶)

مصرعہ ثانی میں "تھا" یا "سمجھا جاتا تھا" لانا ضروری تھا۔ ایسے موقعوں پر الفاظ کا محذوف ہونا شاعر کی ناپختہ کاری کی دلیل ہے۔

حائل یہ دل عباس کے حق میں ہوا تیر ۔۔۔ زوجہ حضرت مسلم تھیں حقیقی ہمشیر (ص ۵۹)

مصرعہ اولیٰ کس قدر کمزور بلکہ بھونڈا ہے۔

مانگ اللہ کو کچھ ہے کیا امر الٰہی میں بہن ۔۔۔ امتحان فرض کا ہوتا ہے تباہی میں بہن

اس بیت میں "شعریت" کا فقدان تو ہے ہی نہیں! "مانگ اور کچھ ہے کیا" اس ٹکڑے نے شعر میں ناگوار قسم کا ابہام بھی پیدا کر دیا۔

ہمنہ مایوس ابھی قہر خدا راہ میں ہے ۔۔۔ ہم کو طینت مولائے حق آگاہ میں ہے (ص ۶۰)

صرف لفظوں کو جوڑ کر شعر استوار کر دیا ہے، حالانکہ شاعری لطفِ بیان کا نام ہے۔

کئی دن سے نہ ملا تھا انہیں اک قطرۂ آب ۔۔۔ ہر تشنگی وو دو نے دکھایا تھا تماشائے سراب
شکیں خالی تھیں اور اشکوں سے بھری تھیں آنکھیں ۔۔۔ سامنے نہیں الم مدنی تھی آنکھیں

دونوں شعروں کے ثانی مصرعوں میں "آورد" کے علاوہ اور کیا رکھا ہے!

آرزو یہ ہے کہ حضرت نہ مصیبت میں پڑیں ۔۔۔ کون چاہے گا کہ سرکار ہلاکت میں پڑیں (ص ۶۵)

مسدس کی آخری بیت اور اتنی کمزور!

میں ہوں حاضر متوجہ ہو جدھر پا مضطراب ۔۔۔ آپ کا عزم ہمایوں ہے سراپا سے صواب (ص ۶۶)

یہ شاعری نہیں، شاعری کے ساتھ مذاق ہے!

دوسری ماہ محرم سے دہم تک پیہم ۔۔۔ امتحاں گاہ میں تھے نازشِ آدم کے قدم (ص ۶۹)

"نازشِ آدم" وجدان کو کس قدر کھٹکتا ہے۔

ایک لمحے کے لئے اذن دغا مل جائے ۔۔۔ چین ابرو کی قسم گرتے زمیں ہل جائے (ص ۷۱)

"گرتے زمیں" کی ترکیب نے شعر کی قوت اور مضمون کے شکوہ کو بہت کچھ کم کر دیا۔

روک لو ہاتھ یہ امت کہیں برباد نہ ہو ۔۔۔ میرا منشا ئے شہادت کہیں برباد نہ ہو (ص ۷۲)

کمزور "بیت"! "منشا کا برباد ہونا" یہ کیا انداز بیان اور روزمرہ و زبان ہے۔

چہرے بیساختہ پن آگیا تنویروں میں ۔۔۔ ولولے قید ہوئے حلم کی زنجیروں میں (ص ۷۴)

"تنویروں" میں "بیساختہ پن آنا" عجیب اسلوب اظہار ہے، اس پر مستزاد "ولولوں کا حلم کی زنجیروں میں قید ہونا"!

دل پہ گھر کر الم و غم کا سحاب آتا ہے ۔۔۔ پسرِ ساقیٔ کوثر ہوں حجاب آتا ہے (ص ۷۶)

—— مگر ——

میر انیس جو فرما چکے ہیں:—

تو زباں خشک جو اپنی مجھے دکھلاتا ہے
پسرِ ساقیٔ کوثر کو حجاب آتا ہے

اتنی مشہور بیت کے مصرعہ ثانی سے توارد کیسے اور کیوں؟ ابرِ الم کے بادل کے گھرنے سے پسرِ ساقیٔ کوثر کے حجاب آنے کو کیا نسبت ہے؟ ہاں! میر انیس کہتا ہے "پسرِ ساقیٔ کوثر کا حجاب آنا ٹھیک نظم ہوا ہے کہ وہ جو پسر ساقیٔ کوثر ہے، کربلا میں پیاسے گھوڑے کی پیاس نہیں بجھا سکتا۔

جنگ صفین سے بھاگے ہوئے غم کھائے ہوئے ۔۔۔ دست کرار سے زخموں کا مزا پائے ہوئے (ص ۷۹)

"غم کھائے ہوئے" نے اس بیت کو سطحی اور بے لطف بنا دیا ۔ "دستِ گراں" کی جگہ "تیغِ گراں" ہوتا تو شعر میں نیا وہ قوت پیدا ہو جاتی ۔

بندشِ آب میں جوڑے ہوئے سر کو باہم　　　　وہ زن تھے کہ بٹے ہیں کہیں مردوں کے قدم　　(ص ۸۰)

"بندشِ آب" کی ترکیب اول تو اس طرح نامانوس محسوس ہوتی ہے ـــــ پھر یہ ٹکڑا "جوڑے ہوئے سر کو باہم" پہلے مصرعہ کے لفظی دروبست کے ساتھ عجیب سا لگتا ہے ۔

ہم جو گرمیں تو پہاڑوں کے جگر ہلتے ہیں　　　　قصرِ بدعت کی بنا ہلتی ہے در ہلتے ہیں　　(ص ۸۲)

مصرعہ اولیٰ کوئی شک نہیں مضبوط اور پرجوش ہے مگر دوسرے مصرعہ میں لفظ "بدعت" بھرتی کا لفظ ہے ۔ "قصرِ شاہی" کہنا تھا، پھر "بنیاد کے ہلنے" کے بعد یہ کہنا کہ "در ہلتے ہیں" کس قدر کمزور اندازِ بیان ہے! یعنی "ترقی" کی بجائے "تنزل"

مشکیں بھر بھر کے برآمد ہوتے پیاسے ذی جاہ　　　　نہر تھی آپ پہونچ جاتے سوئے خیمۂ شاہ　　(ص ۸۵)

"پانی" کی بجائے "آب" مصرعہ ثانی میں کس قدر کھٹکتا ہے!

جوش نے دورۂ خوں کے جو نفس تیز کیے　　　　ہاتھ نیزے پہ گئے، گھوڑے کو مہمیز کیا　　(ص ۸۶)

"دورۂ خوں" لانے کی کیا ضرورت تھی کہ یہاں "فنِ طب" موضوعِ سخن نہیں ہے، پھر اس مصرعہ میں "تعقید" کا عیب بھی پیدا ہو گیا! اس بیت کا مصرعہ ثانی خوب نہیں ۔ بہت خوب ہے ۔

جملہ اطفالِ شہنشاہِ مدینہ نے پیا　　　　پی چکے اصغرِ ناداں تو سکینہ نے پیا　　(ص ۹۱)

"جملہ اطفال" نرا بھرت لگتا ہے ۔ "اصغرِ ناداں" کہنے کا یہ کیا محل تھا ۔ "اصغرِ کمسن" موزوں لفظ تھا ۔

سجدۂ حق میں وہ دن رات گزارے سب نے　　　　خاک پر گیسوئے احوال سنوارے سب نے　　(ص ۹۳)

دوسرا مصرعہ تکلف و آورد کا مجموعہ ہے!

نہ کر زد رکی نہ بچوں کی جدائی کا خیال　　　　وجہ تشویش تھا ہر حال میں بھائی کا خیال　　(ص ۹۴)

"ہندانِ توجیہ دررا منند" ـــــ کی مثل ایسے ہی شعروں پر صادق آتی ہے ۔

ٹکڑے ہو جائے گا گلزارِ جنابِ شبیر　　　　چھد کے رہ جائے گا میدان میں اکبر کا جگر　　(ص ۹۷)

"گلزار کا ٹکڑے ہو جانا" یہ کہاں کی زبان ہے! ہاں! جب کسی باغ کا بٹوارہ ہوا اور اسے بہت سے حصوں میں تقسیم کیا جائے تو "باغ کا ٹکڑے ٹکڑے ہونا" اس وقت بولا جائے گا۔

قافلہ وقت کا گو زحمتِ ہر گام میں ہے　　　　ماندگی شہدا حالتِ آرام میں ہے　　(ص ۱۰۰)

صفدر صاحب نے متعدد مقامات پر "آورد و تکلف" کو شاید "صنعت" سمجھ کر استعمال کیا ہے! اس بیت کا بھی یہی رنگ ہے ـــ

ہے ازل سے یہی قانونِ طبیعت آقا　　　　کہ شجاعت ہے اک ایمان کی شدت آقا　　(ص ۱۰۲)

دوسرا مصرعہ تو منطقیوں کے کہنے کا ہے ۔

جذبہ بندۂ مودودیؔ مولا ہو قبول　　　　اپنے اس صفدرِ ناچیز کا سجدہ ہو قبول　　(ص ۱۰۳)

"جذبہ" کی جگہ "ہدیہ" لانا تھا! تیسرا مصرعہ یوں ہے ـــــ

لکھ کے نام آپ کا سجدے میں قلم ہے حضرت

ـــــــ مگر ـــــــ

اپنے اس صفدرِ ناچیز کا سجدہ ہو قبول

اس میں تسلیم کے سجدے کی طرف ذہن نہیں جاتا، بلکہ لفظوں سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر اپنے ممدوح کو پیشانی سے سجدہ کرتا ہے۔ حالانکہ سجدہ صرف ذاتِ باری کو سزاوار ہے۔

ڈاکٹر صفدر حسین کے مرثیہ کی ایک بیت ہے ۔

یہ رسالے یہ قطاریں یہ پیادے کیا ہیں
زندہ رہنا ہے تو کہہ دو کہ ارادے کیا ہیں

کاش! اُن کے مرثیہ میں شروع سے لے کر آخر تک یہی رنگ و آہنگ قائم رہتا ـــــ صورت یہ ہے کہ ایک ہی بند میں تین چار مصرعے خاصے بلند ہیں مگر ایک دو مصرعے بہت پست بھی آگئے ہیں، کہیں لفظوں کے دروبست میں جھول ملتا ہے، کسی جگہ آورد اور تکلف! اُن کی شاعری میں چاہے وہ غزل ہو یا مرثیہ، نظم ہو یا سلام و رباعی ـــــ ابھی وہ پختگی پیدا نہیں ہوئی جو بڑے شاعروں کا طرۂ امتیاز ہے۔ صفدر صاحب ابھی میدانِ شاعری میں آئے، اور آتے ہی ان کی شاعری پر مضامین بھی رسالوں میں چھپنے لگے، انہوں نے شہرت کے طوفانی آغاز ہی میں کئی کتابیں بھی مرتب کر ڈالیں، لوگوں نے تعریف و تحسین بھی کی، اس ماحول میں اگر "بلوغِ کمال اور تکمیلِ فن" کا احساس پیدا ہو جائے تو کچھ مستبعد نہیں ہے مگر اس طرح مشق کی حرکت رک جاتی ہے، اور وقت سے پہلے "بلوغِ کمال" کی خوش فہمی میں شاعر مبتلا ہو جاتا ہے۔

شہرت و تحسین سے کوئی شک نہیں شاعر و ادیب کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے مگر یہ چیز "ترقی" کی راہ میں رکاوٹ بھی بن جاتی ہے۔

شعر و ادب کے معاملے میں ہم، افسوس ہے کہ رواداری اور مروت کو "نا انصافی" سمجھتے ہیں، شعر یا نثر میں ذرا سی بھی کہیں اونچ نیچ اور کسر محسوس ہوتی ہے تو ہم اُس کا اظہار کر دیتے ہیں، اسی صاف گوئی نے ہمیں نہ جانے کس کس کی نگاہ میں مبغوض اور ناپسندیدہ بنا رکھا ہے۔

ع آئینہ اپنی لطافت کی سزا پاتا ہے

تعلیم کا مسئلہ

ترتیب دینے والے:- ظہور احمد، عتانا احمد، عارف الحق ـــ ضخامت ۹۶ صفحات، قیمت سفید کاغذ پر ۳ روپے، نیوز پرنٹ پر ۲ روپے۔ ملنے کا پتہ:- ادارہ مطبوعات جمعیۃ طلبہ، ۲۳ اسٹریچن روڈ، کراچی

اسلامی جمعیۃ طلبہ پاکستان میں طلبہ کی فلاح و بہبود اور ان کے اندر اسلامی روح اور دینی اخلاق پیدا کرنے کی برسوں سے کوشش کر رہی ہے اللہ تعالیٰ کے فضل سے، اس ادارے کی کوششوں کے بڑے مفید نتائج نکلے ہیں، اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جہاں بھی جمعیۃ طلبہ کے متاثرین نظر آئیں گے، وہ اپنے بلند اور پاکیزہ اخلاق کے سبب پہچانے جا سکتے ہیں، مغرب زدگی، اشتراکیت اور بداخلاقی کی دلدل میں اُن کا حال "کنول" کی مانند ہے! یہ طلبہ تعلیم میں بھی اپنے دوسرے ساتھیوں سے کسی طرح پیچھے نہیں ہیں بلکہ مجموعی طور پر اُن میں ممتاز نظر آتے ہیں!

اسلامی جمعیۃ طلبہ پاکستان کی سرزمین میں اللہ تعالیٰ کی آیۂ رحمت ہے! اسلامی اخوت نے مغربی اور مشرقی پاکستان کے دین پسند طلبہ میں ناقابلِ شکست اتحاد پیدا کر دیا ہے۔

اس ادارے کی بارہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں، جن کا پورا سیٹ چار روپے میں مل سکتا ہے! اس نے عید کارڈ، نعت کتابی، پوسٹ کارڈ، لفافے، اور مجلے بھی شائع کئے ہیں، جن کی ہر سطر دین و دانش سے معمور ہے۔

اس کتاب "تعلیم کا مسئلہ" میں جتنے بھی مضامین ہیں اونچے درجہ کے مضامین ہیں ـــــ چند مضامین :-

نظامِ تعلیم اور اربابِ اختیار (مولانا امین احسن اصلاحی) ـــــ تعلیم کا بگاڑ (ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی) ـــــ تعلیم کی ماہیت (ڈاکٹر سید عبداللہ) ـــــ تعلیم کے نقائص (خورشید احمد) ـــــ نظامِ تعلیم کا اساسی تخیل (عبدالحمید صدیقی)

تعلیم کا مقصد (راے رکے بروہی) ——— یہ تعلیم اچھے اخلاق کیوں پیدا نہیں کرتی (سید ابوالاعلیٰ مودودی) ———
ہمارے دینی مدارس (نعیم صدیقی) ——— ہندوستان کا نظام تعلیم ——— ایک تاریخی تجزیہ (خورشید احمد)

ہر مقالہ اپنی جگہ ایک علمی منشور اور تعلیمی دستاویز ہے اچھی باتیں، مفید مشورے، دانشورانہ تجزیے، اس کتاب کو بڑے سلیقہ اور خوش ذوقی کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے!

ان ضخامہ مقالوں کے علاوہ یونیورسٹی آرڈیننس اور قومی تعلیمی کمیشن کی رپورٹ پر بھی تبصرہ کیا گیا ہے، یہ تبصرے متوازن اور عادلانہ ہیں، ساتھ ہی جرأت آمیز بھی! خطرات سے بے پرواہ ہو کر، اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لئے اظہار حق، یہ مرد مومن کی خاص شان ہے!

یہ کتاب حکومت کے محکمہ تعلیمات کے ارباب بست وکشاد کو خاص طور سے دعوت فکر دیتی ہے! اخبارات میں بھی اس کے مضامین آنے چاہئیں! جمعیۃ طلبہ کو ہم اس علمی اور تعلیمی پیشکش پر مبارکباد دیتے ہیں!

آدم جی کاٹن ملز۔ لانڈھی کراچی

نقشِ اوّل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

و

نصلّی علی النبی الخاتم من قال

"لا نبی بعدی"

مسئلہ قادیانیت پر پھر لکھنے کی اس لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ احمدیہ انجمن اشاعتِ اسلام (لاہور) سے تین کتابچے اور دو خطوط میں وصول ہوئے ہیں، اس تمام لٹریچر کا خلاصہ یہ ہے کہ قادیانیوں کی "لاہوری جماعت" مرزا غلام احمد کو نبی نہیں مجدد، امام اور مسیح موعود مانتی ہے۔ "نبی" نہیں مانتی۔ ان رسالوں میں مرزائے قادیان کے وہ اقوال بھی پیش کئے گئے ہیں، جن میں آنجہانی نے، دعویٰ نبوت سے انکار کیا ہے اور مدعیٔ نبوت کو کاذب اور کافر کہا ہے ——— عبدالمنان عمر نے طویل خط میں اپنے اس عقیدے کا اظہار کیا ہے۔

"میں سیدنا محمد عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام فداہ ابی و امی کو آخری نبی (خاتم النبیین) مانتا ہوں اور حضرت مرزا غلام احمد کو آپ کا محکوم، آپ کا خادم، آپ کے دین کو پھیلانے والا اور آپ کی بتائی ہوئی اور پہلے علماء اور آپ کی بعض پیش گوئیوں کا مصداق سمجھتا ہوں، مثلاً حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس مشہور پیش گوئی کا "ان اللہ یبعث لھذہ الامۃ علی راس کل مائۃ سنۃ من یجدد لھا دینھا" میرے نزدیک حضرت مرزا صاحب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی اور محض قرآن مجید کی پیروی کے نتیجہ میں انہیں بعض غیب کی خبریں عطا ہوتی تھا جو الہام اور رؤیا پر مشتمل ہوتی تھیں۔ اور جن تک آج پوری کائنات میں بجز پیروی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کوئی سائے نہیں کیا جا سکتا، اور اس طرح آپ حضور علیہ السلام کی روحانی وارثت سے حصہ پاکر اور آپ کے نور سے مستفید ہو کر اور آپ کی غلامی کا شرف پاکر: مبشرات سے حصہ پاتے، اور بعض غیب کی خبریں دیئے اور شرف مکالمہ و مخاطبہ الٰہیہ پاتے

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

ایک کتابچہ میں، جس کا عنوان ہے ———

المرسلین، خاتم النبیین، فخر الاولین والآخرین حضرت سیدنا محمد صلی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تعریف اور مدعی نبوت کے لئے اکرام و تعظیم کا کوئی لفظ ان اور قسم سے نہیں نکل سکتا۔ (م۔ق) ستہ نقل کفر کفر نہ باشد ——— علیہ ما علیہ

”جماعت ربوہ اور جماعت لاہور کے عقائد“

صدرالدین صاحب نے ربوہ کی قادیانی جماعت والوں کو مخاطب کرکے اُن کی اس غلط فہمی اور غلط اندیشی پر متنبہ کیا ہے کہ وہ مرزا غلام احمد کو نبی ماننا چھوڑ دیں، بلکہ اُنہیں مجدد زماں اور مسیح موعود مانیں .... !

لاہوری جماعت کے اس مسلک کے دجل و فریب، کذب و جہالت پر ہم آگے چل کر گفتگو کریں گے، سردست برسبیل تنزل (یعنی بر عنوان لو فرضنا) ہم یہ عرض کرتے ہیں کہ اگر لاہوری جماعت والے اپنے اس قول میں صادق ہیں، تو انہیں ربوہ کی قادیانی جماعت کے ”کفر“ کا سب سے پہلے اعلان کرنا چاہئے، کیونکہ مذکورہ بالا کتابچہ میں یہ عبارت بھی نگاہ سے گزری۔

”.... نبوت کی وحی جاری ہونے سے اسلام کا تختہ الٹ جاتا ہے غرض اُنہوں (مرزا غلام احمد) نے نہایت شدومد سے یہ بیان کیا ہے کہ نبوت کا جاری ہونا اسلام کا خاتمہ ہے“

اس کتابچہ میں اس کا فوراً اعلان کیا گیا ہے کہ —— ”اہل ربوہ اور جماعت لاہور کے درمیان جو اختلاف ہے وہ فروعی نہیں بلکہ اصولی ہے۔ —— مگر اس کتابچہ میں اس کا اعلان نہیں کیا گیا کہ غیر نبی کو چاہے وہ مجدد ہی کیوں نہ ہو، جو کوئی فرد اور گروہ ”نبی“ مانتا ہے وہ کفر کا ارتکاب کرتا ہے اور دائرہ اسلام اور امت محمدیہ سے خارج ہو جاتا ہے! اس کتابچہ میں تو قادیانیوں کی جماعت ربوہ کو امت محمدیہ میں شامل سمجھ کر ”مصالحت“ کی دعوت دی گئی ہے اور یہ ”مصالحت“ ظاہر ہے کسی ایسے عقیدہ سے متعلق نہیں، جس پر کفر و ایمان کا دارومدار ہے[1]۔ پھر یہ انداز کس قدر ہمدردانہ ہے، جو ان دونوں جماعتوں (لاہوری پارٹی اور جماعت ربوہ) کے درمیان تعلق خاطر، عقائد کی یک رنگی اور ہم سبی اخوت کا پتہ دیتا ہے:۔

”..... وہ یہ کہ ہماری دونوں جماعتیں، قرآن کریم و حدیث شریف کی نصوص کو متعین ماہ الیقین کریں“
(احمدیہ بلڈنگس لاہور کا کتابچہ ص ۴۳)

صحیح اعداد و شمار تو ہمارے پاس نہیں ہیں مگر ایک سرسری اندازے کے مطابق ہمارے خیال میں قادیانیوں کی تعداد ساری دنیا میں چار لاکھ سے زیادہ نہ ہوگی۔ مسلمان، جو ختم نبوت پر ایمان رکھتے ہیں، ان کی تعداد اللہ تعالیٰ کے فضل سے ساٹھ کروڑ ہے، یہ سب کے سب مسلمان مرزا غلام احمد کو نبی کاذب اور مرتد سمجھتے ہیں، پھر جناب والا مرزائے قادیان کی کتابوں میں علم ہیں اُن میں کس درجہ تناقض، بے ربطی اور لچید ادیبی ہے، وہیں اور فریب کا سامنا توجیہیں پائی جاتی ہیں۔ لاہوری جماعت کا اگر واقعی یہ مسلک ہے کہ ”مرزائے قادیان کے دعوائے انکار سے کوئی مسلمان کافر نہیں ہو جاتا“ تو پھر امت میں اختلاف برپا کرنے اور کروڑوں مسلمانوں کے دلوں کو اذیت پہنچانے کے لئے وہ غلام احمد قادیانی کی ”مجددیت“ اور ”امامت“ کی طرف دعوت کیوں دیتے ہیں، ایسی مشتبہ اور مبغوض شخصیت جسے پوری اُمت مسلمہ انتہائی ناپسند کرتی ہو، کیا اس قابل ہے کہ اس کی ذات اور مشن کی طرف لوگوں کو بلایا جائے، اور قرآن کریم کی تفسیروں تک میں اس کا ذکر کیا جائے! غلام احمد قادیانی کی کتابوں میں آخر وہ کون سی ایسی دینی بصیرت اور اخلاقی حکمت پائی جاتی ہے جس کی اُمت مسلمہ محتاج ہے اور اس کی شخصیت کی طرف رجوع کئے بغیر دین و اخلاق اور عمل سے بے بہرہ ہیں۔

حضرت عمر ابن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کو ”مجددیت“ زیب دیتی ہے کہ آپ نے شاہان بنو امیہ کی بدعتوں اور زیادتیوں کو مٹا کر چھوڑا اور اسلامی

---

[1] حالانکہ ”ختم نبوت“ کا مسئلہ کفر و ایمان کا بنیادی مسئلہ ہے، یہ وہ جائز و ناجائز اور حرام و حلال نہیں ہے جو فقہی مذاہب کے اختلافات میں پایا جاتا ہے

بنیا محسوس کرنے لگی کہ جیسے خلافت راشدہ کا دور سعید لوٹ آیا ہے، حضرت شیخ احمد فاروقی سرہندی جو "مجدد الف ثانی" کے لقب سے مشہور ہیں، اُن کی استقامت، عزیمت، صداقت اور حق گوئی نے خالص ملوکیت کے دور میں بعض دینی معتقدات و اعمال کی تجدید کی اور غیر دینی رسموں کو حتٰی یہاں تک کہ شہنشاہ جہانگیر کو اس فقیر بے نوا اور قلعہ گوالیار کے قیدی کے سامنے جھکنا پڑا ـــــــــ انیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں حضرت مولانا اسمٰعیل اور شہید نے مشرکانہ رسوم و بدعات کے خلاف زبان و قلم سے جہاد کر کے، تجدید و احیاء سنت کا عظیم کارنامہ انجام دیا، یہ وہ بزرگ ہیں، جن سے تجدید و احیاء دین کی نسبت کی جاتی ہے اور کی جانی چاہئیے، مگر ان میں سے کسی بزرگ کا یہ درجہ اور مرتبہ نہیں ہے کہ اُن کی "مجددیت" سے انکار کو کفر سمجھا جائے اور نہ مسلمانوں کا کوئی فرقہ ان نفوس قدسیہ کی طرف دعوت دینے ہی کو ایمان و اسلام کی سب سے بڑی خدمت سمجھتا ہے، ایک طرف اسلامی تاریخ کی یہ عظیم شخصیتیں رحمہم اللہ تعالیٰ ہیں، دوسری طرف مرزا غلام احمد ہے، جس کا کوئی تجدیدی کارنامہ منظر عام پر نہیں آیا، سوائے اس کے کہ اس نے پہلے مجدد، پھر مثیلِ مسیح اور آنحضرت کے بعد نبی ہونے کا دعویٰ کیا، اور امتِ محمدیہ میں انتشار و افتراق و اختلاف پیدا کر کے اپنی "ایک مستقل اُمت" قائم کر لی، جو اپنے علاوہ تمام مسلمانوں (بشمول قادیانیوں) کو کافر اور گمراہ سمجھتی ہے!

لاہوری جماعت کا مرزا غلام احمد کی "مجددیت" "امامت" اور موعود مسیحیت کی طرف مسلمانوں کو بلانا، اس شخص کے نام کیساتھ "حضرت" لکھنا اُس کی حق شناسی اور صداقت و تقویٰ کے تعصب سے پڑھنا، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ بنیادی مقصد کے اعتبار سے یہ دونوں جماعتیں ایک جیسی ہیں، یعنی ایک ہی شخصیت اور نات دونوں جماعتوں کی عقیدت و محبت کا مرکز ہے! اور اسی شخصیت یعنی ـــ مرزا غلام احمد کو آیۂ حق ان کر اسی محور کے اردگرد اُن کی جدوجہد اور تبلیغ و تعلیم کی تمام ترکوششیں جاری رہتی ہیں! اس صورت میں اکابر علماء امت لاہوری جماعت اور جماعت ربوہ کے مسلک کفر و ضلالت میں کوئی فرق نہیں کرتے! مولانا عبدالماجد دریا بادی مدیر "صدق جدید" نے حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ایک خط بھیجا تھا، جس میں لکھا تھا ـــ

"۔۔۔۔۔ ایک تراشہ پیغام صلح" کا ملفوف ہے، یہ لاہور کی قادیانی جماعت کا پرچہ ہے، یہ لوگ ٹھیٹھ قادیانیوں کے مقابلہ میں بہت غنیمت ہیں۔۔۔۔۔۔"

مولانا دریا بادی کے اس استفسار کے جواب میں حضرت مولانا تھانوی نے تحریر فرمایا ـــ

"۔۔۔۔ میں اس میں موافقت کرنے سے اس لئے معذور ہوں کہ اُن کے ضرر کو معتقدین نبوت مرزا کے ضرر سے اشد سمجھتا ہوں، کیونکہ وہ لوگ جب نبی کہتے ہیں، سب کو نفرت ہو جاتی ہے اور محفوظ رہتے ہیں اور یہ لوگ جب نبوت کی نفی اور ولایت کا اثبات کرتے ہیں، تو نفرت نہیں ہوتی اور اشتیاق ہوتا ہے اور اُس کی کتابیں دیکھنے کا ـــــــ پھر دیکھ کر گمراہ ہو جاتے ہیں۔"

توحید کے بعد ختم نبوت کا عقیدہ اُن ایمانی مسلمات میں شامل ہے، جس کا انکار کرنے سے ایک مسلمان کافر ہو جاتا ہے اور اُس کی صرف تنہا یہی ایک "وجہِ کفر" اُسے کافر بنا دیتی ہے، چاہے اُس میں اور تمام دوسرے وجوہِ اسلام پائی جاتی ہوں ـــــــ وہ شکل جس میں گمراہ بلکہ "کفریہ عقیدہ" کے بعد بھی کسی مسلمان کو دائرہ اسلام سے خارج نہیں کیا جا سکتا، اُس کی صورت یہ ہے کہ ایک مسلمان "نماز" کو دین کا رکن سمجھتا ہے اور اس کی فرضیت کا قائل ہے، مگر وہ ساتھ ہی یہ عقیدہ بھی رکھتا ہے کہ "یقین" کا درجہ کامل حاصل ہو جانے کے بعد "نماز" ساقط ہو جاتی ہے، یہ عقیدہ اگرچہ "کفریہ" ہے مگر اس عقیدہ رکھنے والے کو، جو دوسرے "وجوہِ اسلام" رکھتا ہے، گمراہ سمجھا جائے گا مگر کافر اور دین اسلام سے خارج قرار نہیں دیا جا سکے گا! یہی حال بعض مسلمان فلسفیوں کے کفریہ اقوال و آراء کا ہے یا بعض ایسے گمراہ کن عقائد بھی ہیں جن کے "کفر" ہونے میں اختلاف ہے، مثلاً فارابی اور بو علی سینا کی تکفیر بعض شدید ضلالت آمیز عقائد و اقوال کے سبب کی گئی ہے، مگر مجموعی طور پر تمام مسلمان فرقے

ان فلسفیوں کو "کافر" اور دائرۂ اسلام سے خارج نہیں سمجھتے ـــــ تو مرزا غلام احمد کی حیثیت نہ حلاج بن منصور کی ہے اللہ فارابی اور بوعلی سینا جیسی ہے، اس شخص کا اور اس کے ماننے والوں کا ارتداد اور کفر کھلا ہوا ہے، جس کے بارے میں امت مختلف الرائے نہیں ہے، مرزا اور اس کی امت و معتقدین کے کفر پر سب متفق ہیں ۔

قادیانیوں کی لاہوری جماعت کے لٹریچر میں بعض صوفیوں کے "اقوال" جو مثال میں پیش کئے جاتے ہیں تو اس سلسلہ میں عرض ہے کہ دین میں صوفیاء کے اقوال واحوال کی کوئی مستقل حیثیت نہیں ہے، ہر کسی کے قول و عمل کے جانچنے اور پرکھنے کی کسوٹی اللہ تعالیٰ کی کتاب اور رسول اللہ کی سنت ہے، اس کسوٹی پر جس کسی کا بھی قول پورا نہیں اترے گا اُسے رد کر دیا جائے گا :

جہاں تک بعض لوگوں کے اقوال و کلمات اور افکار و تصورات کا تعلق ہے ہر قسم کی گمراہی اور کفر کہیں نہ کہیں مل جاتا ہے ! ـــــ مثلاً ـــــ شیطان موحد اعظم تھا ـــــ فرعون کے ایمان کی تصدیق ـــــ یہودیوں کی گوسالہ پرستی کی تاویل بلکہ تحسین ـــــ ہندوؤں کے عقیدہ "تناسخ ارواح" کا اثبات ـــــ امرد پرستی کو معرفت الٰہی کا ذریعہ قرار دینا ـــــ اللہ تعالیٰ کے حلول و اتحاد کا عقیدہ ـــــ اس قسم کے شطحیات، ہذیانات اور ہفوات کو دین کے کسی بنیادی عقیدہ کے جواز و عدم جواز کے لئے مثال و حجت کے طور پر پیش کرنا، دین و دانش سے جہالت و بے خبری کی دلیل ہے ! اگر کوئی شخص اپنے "خدا" ہونے کا اعلان کر دے، تو اُس کے اس "کفر تام" کے جواز یا تاویل کے لئے پچھلی کتابوں سے "شعر و تصوف" کا ایک آدھ ایسا قول مل سکتا ہے، جس کو بنیاد بحث بنا کر گفتگو کی جا سکتی ہے !

اللہ تعالیٰ کو انسان کی طرح مجسم ماننا یہ "کفریہ عقیدہ" ہے، علامہ اقبال اللہ تعالیٰ کے تجسم کے قائل نہ تھے، اس بارے میں اُن کا عقیدہ اشاعرہ کے مسلک کے مطابق تھا، یہ واقعہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ جسمانیت سے منزہ ہے، مگر کوئی شخص علامہ اقبال کے اس شعر کو ـ

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا
یا میرا گریباں چاک یا دامن یزداں چاک

اللہ تعالیٰ کے "تجسم" پر دلیل لائے کہ علامہ اقبال اس کے بھی قائل تھے کہ اللہ تعالیٰ کا نہ صرف یہ کہ جسم ہے بلکہ وہ اپنے جسم پر لباس بھی پہنے ہوئے ہے جیسی تمہاری ہوں گے ـ

"یا دامن یزداں چاک"

کہا ہے ! تو ایسے گمراہ اور بے وقوف شخص کو سمجھایا جائے گا کہ اقبال اللہ تعالیٰ کے "تجسم" کے ہرگز قائل نہ تھے، یہ تو ایک شاعرانہ پیرایہ بیان اور "نازِ طفلانہ" جیسی بات ہے ـــــ وہ شخص اس توجیہہ کو بھی قبول نہ کرے گا، تو پھر کہا جائے گا کہ جو تم نے سمجھا ہے اگر اقبال کا بھی واقعی یہی مطلب تھا تو اس شعر کو اور اس کے مرکزی خیال کو ہم سرے سے غلط سمجھتے ہیں، اور ہمارے لئے دین میں حجت کتاب و سنت ہیں ـ کلام اقبال نہیں ہے ـ

کسی صوفی کے یہاں "فنا فی الرسول" یا ولایت کے لئے "ظل نبوت" کی اصطلاح ملتی ہے، تو رسول کی ذات میں فنا ہونے سے اُس کا مقصد رسول جیسا "ظلی یا بروزی" نبی ہونا ہرگز نہیں ہے، بلکہ "فنا فی الرسول" کا مقصد ہے اپنی تمام مرضیات اور خواہشات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام و مرضیات کے تابع بنا دینا اور اپنی شخصیت کو اطاعت رسول میں گویا کہ فنا اور گم کر دینا ہے ـ اور "ظل نبوت" سے مراد سیرت نبوت کا فیضان اور اس کا اتباع ہے یعنی صاحب ولایت کی اصل شان یہ ہے کہ اُس کی زندگی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس سیرت زیادہ سے زیادہ منعکس نظر آئے ! یعنی اُس کی پوری زندگی اتباع رسول کا بہترین نمونہ ہو !

"فنا فی اللہ" اور "فنا فی الرسول" کی اصطلاحیں نہ تو کتاب و سنت میں بیان ہوئی ہیں اور نہ فقہاء اور محدثین کے یہاں ملتی ہیں ان اصطلاحوں کی دین و شریعت میں کوئی اصل اور وزن نہیں ہے، "فنا فی الرسول" کتاب و سنت کی رو سے کوئی منصب اور عہدہ نہیں ہے، جس پر فائز ہونے کا

کوئی دعویٰ کرے، جس طرح آج عام بات میں محاورے کے طور پر کہتے ہیں کہ فلاں شخص نے قوم کی خدمت کے لئے اپنے کو فنا کر دیا، اسی طرح یوں بھی بول دیتے ہیں کہ فلاں شخص اللہ اور رسول کے لئے "فنا" ہو گیا ــــ مگر مرزا غلام احمد قادیانی نے "فنا فی الرسول" کی آڑ لے کر جو دعوے کئے ہیں، اور قرآن کریم کی آیتوں کے مفہوم کو مسخ کیا ہے وہ علم و دانش اور عقل و بصیرت کی خریداری ہے، کوئی شخص جو نبوت کے مفہوم کو جانتا ہو، قرآن میں تھوڑا بہت درک رکھتا ہو اور اس کے دل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور عظمت ہو اس قسم کی خرافات اور ہفوات نہیں بک سکتا ــ

"... حق یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی وہ پاک وحی جو میرے پر نازل ہوتی ہے اس میں ایسے الفاظ رسول اور مرسل اور نبی کے موجود ہیں، نہ ایک دفعہ بلکہ صدہا دفعہ" (ایک غلطی کا ازالہ از مرزا غلام احمد قادیانی)

لاہوری جماعت کے ارباب فکر سے ہم پوچھتے ہیں کہ مجدد یا امام وقت پر الہام ہوتا ہے یا "وحی" آتی ہے، "وحی" جب نبوت کے نام پر ہوگی، تو "مہبط وحی"[1] نبی ہی ہوگا اور پھر وہ شخص خود یہ سمجھ کہ رہا ہو کہ، مجھ میں نہیں سینکڑوں بار مجھے رسول، مرسل اور نبی بھی خدا کی جانب سے کہا گیا ہے، اس کو "وحی ولایت" (حالانکہ یہ اصطلاح بھی مرزا کے دعووں کے پیش نظر بڑے جھگڑے اور دھوکے کی اصطلاح ہے) بھی نہیں کہہ سکتے، یہ تو صاف واضح طور پر "نبوت" کا اعلان اور دعویٰ ہے ــــ اس کے بعد مرزا قادیانی کہتا ہے:۔

"...... چنانچہ وہ مکالمات الہیہ جو براہین احمدیہ میں شائع ہو چکے ہیں، ان میں سے ایک یہ وحی اللہ ہے ــ ھو الذی ارسل رسولہ بالھدی و دین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ (دیکھو صفحہ ۴۹۸ براہین احمدیہ) اس میں صاف طور پر اس عاجز کو "رسول" کر کے پکارا گیا ہے ......"

یہ آیت جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھی تو حضور نے اور تمام صحابہ نے اس کا یہی مفہوم سمجھا کہ "ارسل رسولہ" سے ذات محمد ابن عبداللہ مراد ہے، اور چودہ سو سال کی اس لمبی مدت میں ساری امت اس کا یہی مفہوم سمجھتی رہی ہے ـــ مگر مرزا قادیانی کہتا ہے کہ اس آیت میں اس عاجز کو "رسول" کہہ کر پکارا گیا ہے! کیا کوئی شخص جو اپنے دل میں اللہ کا خوف اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و محبت رکھتا ہے اور قیامت کے محاسبہ پر اس کا ایمان ہے، قرآن میں اتنی کھلی ہوئی معنوی تحریف کا ارتکاب کر سکتا ہے!

لاہوری جماعت نے مرزا غلام احمد کا رسالہ "ایک غلطی کا ازالہ" جو شائع کیا ہے، اس میں مرزا لکھتا ہے:۔

"... نبوت کی تمام کھڑکیاں بند کی گئیں مگر ایک کھڑکی سیرت صدیقی کی کھلی ہے یعنی فنا فی الرسول کی! پس جو شخص اس کھڑکی کی راہ سے خدا کے پاس آتا ہے اس پر ظلی طور پر وہی نبوت کی چادر پہنائی جاتی ہے، جو نبوت محمدی کی چادر ہے، اس لئے اس کا نبی ہونا غیرت کی جگہ نہیں۔ کیونکہ وہ اپنی ذات سے نہیں بلکہ اپنے نبی کے چشمہ سے لیتا ہے اور نہ اپنے لئے بلکہ اسی کے جلال کے لئے۔ اسی لئے اس کا نام آسمان پر محمد اور احمد ہے، اس کے یہ معنی ہیں کہ محمد کی نبوت آخر محمد ہی کو ملی۔ گو بروزی طور پر مگر نہ کسی اور کو" (صفحہ ۵)

آخر اس دعوے کے لئے کتاب و سنت سے کیا کوئی دلیل ملتی ہے کہ "خدا تک پہنچنے کے لئے ایک کھڑکی" "فنا فی الرسول" کی ہوتی ہے اور جو فنا فی الرسول ہوتا ہے اس کو ظلی طور پر وہی نبوت کی چادر پہنائی جاتی ہے، جو نبوت محمدی کی چادر ہے ... "ظلی اور بروزی نبوت" کی یہ شعبدہ بازی جو مرزا قادیان کے اپنے دماغ کی اپج ہے جسے کوئی صحیح العقل انسان ایک منٹ کے لئے بھی قبول نہیں کر سکتا ــــ پھر اس کا یہ کہنا کہ "محمد کی نبوت آخر محمد ہی

---

[1] ذرا اس "مہبط وحی" کی زبان دانی تو دیکھئے! اصل رسالے میں یوں ہی چھپا ہے مگر یہ غالباً کتابت کی غلطی ہے صحیح لفظ "غیرت" ہونا چاہئے۔

کو ملی، گو بروزی طور پر مگر نہ کسی اور کو . . . " عبداللہ ابن سبا کے اس ضلالت آمیز عقیدہ کی صدائے بازگشت ہے کہ جب عیسیٰ علیہ السلام دنیا میں دوبارہ آ سکتے ہیں تو محمد رسول اللہ کیوں نہیں آسکتے! اور یہ جملہ کہ — "محمدی نبوت آخر محمد ہی کو ملی" — کس قدر خطرناک اور گمراہ کن ہے — اور سنیئے:

"وحی الٰہی میں میرا نام محمد رکھا گیا اور رسول بھی . . ."

مرزا کا نام تو اُس کے گھر والوں نے "غلام احمد" رکھا تھا، وحی الٰہی میں اس کا نام "محمد" کس طرح رکھا گیا اور ساتھ ہی "رسول" بھی! پھر رسول نام ہے یا لقب؟

"... اگر کوئی شخص اسی خاتم النبیین میں ایسا گم ہو کہ بباعث نہایت اتحاد اور نفی غیریت اُسی کا نام پالیا ہو اور صاف آئینہ کی طرح محمدی چہرہ کا اُس میں انعکاس ہو گیا ہو، تو وہ بغیر مہر توڑنے کے نبی کہلائے گا کیونکہ وہ محمد ہے گو ظلی طور پر . . ."

آخر یہ کس مذہب کا "علم کلام" اور کس دین کا "فلسفہ" ہے کہ کوئی اُمتی، اپنے نبی میں ایسا گم ہو جاتا ہے کہ کمال و نہایت اتحاد کے سبب اُن میں "غیریت" ہی باقی نہیں رہتی! اسلامی ادب اور کتاب و سنت میں تو اس قسم کے تصورات و عقائد اور نکتہ آفرینیاں کہیں نہیں ملتیں، ہاں! ہندو جو تناسخ اور اوتار وغیرہ کے فاسد عقائد رکھتے ہیں، وہ اس طرز فکر کی شاید داد دے سکیں۔

اگر بفرض محال (خاک بہ دہن گستاخ) مرزا غلام احمد قادیانی بقول اُس کے "محمد ثانی" بن گیا تھا، اور محمد مصطفیٰ ابن عبداللہ اور غلام احمد قادیانی ابن غلام مرتضیٰ دونوں میں غیریت باقی نہیں رہی تھی، تو دونوں کی صورت اور سیرت میں بھی اتحاد ہونا چاہئے حالانکہ حضور خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والسلام ظاہری حسن و صورت اور شکل و شمائل کے اعتبار سے بھی اپنی جگہ بے مثال تھے، اور مرزا غلام احمد کے دیکھنے والوں نے اُسے معمولی خوب صورت آدمی بھی نہیں کہا، اور اس کا جو فوٹو ہم نے کتابوں میں دیکھا ہے وہ ایک بدصورت آدمی کا عکس ہے، جس کی آنکھ "چندھی" تھی، اور "چندھا آدمی" (ذاتی تشخص) خوبصورت نہیں ہوا کرتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "افصح العرب" جن کو اللہ تعالیٰ نے "جوامع الکلم" عطا فرمائے تھے، حضور کا ایک ایک جملہ فصاحت و ادب کا شاہکار ہے اور اس "ظل محمد" (؟؟) غلام احمد قادیانی کی اُردو بھی درست نہیں ہے، خود اس کے زمانے میں ہزاروں لاکھوں اہل قلم اس سے بہت اچھی اُردو لکھتے اور بولتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی "شعر" نہیں کہا اور مرزا غلام احمد نے اپنا مستقل دیوان چھوڑا ہے، مگر شعر و ادب کی تاریخ میں اس کی شاعری کو اہل نقد و نظر نے کوئی مقام نہیں دیا۔ اچھا "ظلی نبی" ہے جو اپنے "اصل" کے برخلاف شعر بھی کہتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حسن و جمال میں بے مثال ہونے کے علاوہ صحت جسمانی کے لحاظ سے بھی اپنا جواب نہ رکھتے تھے، اور کوئی مرض یا کسی قسم کی کمزوری حضور کے جسم و صحت میں نہیں پائی جاتی تھی، مگر اس "ظل محمد" (خاک بہ دہن کاذب) کی صحت کی داستان خود اُسی کی زبان سے سنئے!

● — "جس قدر ضعف دماغ کے عارضہ میں یہ عاجز مبتلا ہے، مجھے یقین نہیں، آپ کو ایسا ہی ہو، جب میں شادی کی تھی تو مدت تک مجھے یقین رہا کہ میں نامرد ہوں۔" (مکتوب احمدیہ جلد پنجم خط ۵)

● — "مجھے دو مرض دامن گیر ہیں، ایک جسم کے اوپر حصہ میں کہ سر درد اور دوران سر اور دوران خون کم ہو کر ہاتھ پیر سرد ہو جانا نبض کم ہو جانا اور دوسرے جسم کے نیچے حصہ میں کہ پیشاب کثرت سے آنا اور اکثر دست آتے رہنا۔" (نسیم دعوت ص ۶۹ مصنفہ مرزا غلام احمد)

● — "میں ایک دائم المریض آدمی ہوں . . . . بیماری ذیابیطس ہے کہ ایک مدت سے دامن گیر ہے

اور بسا اوقات سو سو دفعہ رات کو یا دن کو پیشاب سے جس قدر عوارض وغیرہ ہوتے ہیں، وہ سب میرے شامل حال رہتے ہیں۔ (ضمیمہ اربعین نمبر ۳-۴ ص ۴ مصنفہ غلام احمد قادیانی)

ھ میرا حافظہ بہت خراب ہے، اگر کئی دفعہ کسی کی ملاقات ہو تب بھی بھول جاتا ہوں، یاد دہانی عمدہ طریقہ ہے، حافظہ کی یہ ابتری ہے کہ بیان نہیں کر سکتا۔۔۔ (مکتوبات احمدیہ جلد پنجم نمبر ۳ ص ۲۱ مجموعہ مکتوبات مرزا غلام احمد قادیانی)

رسالہ ریویو قادیان (صفحہ ۱۰ اگست ۱۹۲۶ء) سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مرزا کو مراق کا مرض بھی لاحق تھا ——— "مراق کا مرض حضرت مرزا صاحب کو موروثی نہ تھا بلکہ یہ خارجی اثرات کے ماتحت پیدا ہوا تھا" ——— مرزا کا بیٹا بشیر احمد قادیانی کہتا ہے :-

"بیان کیا مجھ سے حضرت والدہ صاحبہ نے ایک دفعہ تمہارے دادا کی زندگی میں حضرت (مرزا) صاحب کو سل ہو گئی تھی، حتیٰ کہ زندگی سے ناامید ہو گئی" (سیرۃ المہدی حصہ اول ص ۲۳)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے "ظل و بروز" اور اتحاد و نفی غیریت کا مدعی مرزا غلام احمد قادیانی، جو یہاں تک دعویٰ کرتا ہے کہ "محمد کی نبوت آخر محمد ہی کو ملی" شکل و صورت، کلام و گفتگو اور جسمانی صحت میں حضور کی بالکل ضد واقع ہوا ہے! "اصل" اور "ظل" میں اتنا فرق، اس قدر مغایرت اور اختلاف! اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ مراقی اور ضعف باہ، سل اور ذیابیطس کا مریض، اُس انسان کامل کا "بروز" اور "ظل" کس طرح ہو سکتا ہے جس کا مدینہ میں خیر مقدم ———

"اشرق البدر علینا"

کے نغمہ سے کیا گیا، بے شک حضورؐ حسن و جمال کے "بدر کامل" اور اخلاق و نیکی کے مہر نیم روز تھے۔

من وجهك المنير لقد نور القمر

مرزا غلام احمد قادیانی اپنے "ہفوات" ——— براہین احمدیہ ——— کا اس انداز میں ذکر کرتا ہے، جیسے یہ قرآن، زبور، توریت اور انجیل کی طرح کوئی صحیفہ آسمانی ہے کہ اس میں جو کچھ درج ہے وہ الہام ربانی اور وحی الٰہی ہے اور وحی الٰہی پر ظاہر ہے ایمان لانا ہر مسلمان کا فرض ہے :

"۔۔۔ ایسا ہی میرے مخالف حضرت عیسیٰ بن مریم کی نسبت کہتے ہیں کہ وہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد دوبارہ دنیا میں آئیں گے، اور وہ چونکہ وہ نبی ہیں، اس لئے ان کے آنے پر بھی وہی اعتراض ہوگا جو مجھ پر کیا جاتا ہے یعنی خاتم النبیین کی مہر ختمیت ٹوٹ جائے گی"

مرزا کی بے بصیرتی اس کے ان اقوال ہی سے ظاہر ہے! حالانکہ قرآن کریم کے مفسرین اسی خدشہ کا صدیوں پہلے جواب دے چکے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کوئی نئے نبی نہیں ہیں، ان کا ظہور تو حضور سے بہت پہلے ہو چکا ہے، ختم نبوت کو توڑنے والی چیز "نئے نبی" کا ظہور ہے اور پھر حضرت عیسیٰ دنیا میں اس حیثیت سے تشریف لائیں گے کہ شریعت محمدیہ کے تابع ہوں گے۔ مگر یہ سامنے کی بات اُس شخص کی سمجھ میں نہیں آتی، جس کا دعویٰ یہ ہے، کہ مجھے اللہ تعالیٰ غیب پر مطلع فرماتا ہے اور میں "بروزی" اور "ظلی" نبی ہوں، اور جو نبوت مجھ کو ملی ہے تو وہ در اصل "محمد" ہی کی نبوت تھی، ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔!

مثال! مرزا کا بیٹا اور جانشین مرزا محمود احمد اُس کی اصطلاحات کے مطابق مرزا کا "ظل اور مثیل" کہا جا سکتا ہے کہ وہ جسمانی امراض کے معاملے میں باپ کی مثل تھا، وہ کہتا ہے :- "میری صحت تو بچپن ہی سے خراب ہے، اس لحاظ سے تو میری پہلی شادی بھی نہیں ہونی چاہئے تھی بچپن میں میری صحت خراب تھی اسی وجہ سے حضرت (مرزا) صاحب نے حساب کی تعلیم مجھ سے چھڑا دی تھی"۔۔۔ (خطبہ جمعہ میاں محمود احمد مندرجہ الفضل قادیان ۲۳ مارچ ۱۹۳۱ء)

قرآن کی تحریف اور دعوے

قرآن کریم کی آیات کے ساتھ مرزا غلام احمد نے تحریف کا جو توہین آمیز سلوک کیا ہے وہ اس کی "ضلالت" کا کھلی ہوئی شہادت ہے۔ ہم دل پر جبر کر کے اس کے بیانات یہاں نقل کر رہے ہیں۔

- "چنانچہ وہ مکالمات الٰہیہ جو براہین احمدیہ میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ وحی اللہ ہے — ھو الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ (براہین احمدیہ) اس میں صاف طور پر اس عاجز کو رسول کر کے پکارا گیا ہے۔ پھر۔۔۔ اسی کتاب میں اس مکالمہ کے قریب یہ وحی اللہ ہے محمد رسول اللہ والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینھم اس وحی الٰہی میں میرا نام محمد رکھا گیا (ایک غلطی کا ازالہ از مرزا غلام احمد)

- "قل یایھا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعا" (اے مرسل من اللہ) کہہ (اے غلام احمد) اے تمام لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول ہو کر آیا ہوں (البشریٰ جلد دوم مجموعہ الہامات مرزا غلام احمد)

- — وما ارسلنٰک الا رحمۃ للعالمین اور ہم نے دنیا پر رحمت کرنے کے لئے تجھے بھیجا ہے۔ (اربعین نمبر ۳ صفحہ ۲۳ مصنفہ مرزا غلام احمد قادیانی)

- — وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ اور یہ (مرزا) اپنی طرف سے نہیں بولتا بلکہ تم جو کچھ سنتے ہو یہ خدا کی وحی ہے (اربعین نمبر ۳ صفحہ از مرزا غلام احمد قادیانی)

قرآن کریم کی یہ آیات جن کا مصداق حضور خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی ذات قدسی صفات ہے اور اس بارے میں دو رائیں نہ ہوئی ہیں اور نہ ہو سکتی ہیں — مرزا کا اپنی ذات کو ان آیات کا مخاطب قرار دینا اللہ تعالیٰ اور قرآن کے ساتھ نفاق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گستاخی وحی الٰہی کی معنوی تحریف اور کھلا ہوا دجل و فریب نہیں تو اور کیا ہے۔

حد ہو گئی "دجل و تحریف" کی، کہ ظالم نے "واتخذوا من مقام ابراھیم مصلی" کی یہ تاویل و تحریف کی — کہ (یہ آیت) اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ جب امت محمدیہ میں بہت فرقے ہو جائیں گے، تب آخر زمانہ میں ایک ابراہیم پیدا ہوگا اور ان سب فرقوں میں وہ نجات پائے گا جو اس ابراہیم کا پیرو ہوگا (اربعین نمبر ۳ مصنفہ مرزا غلام احمد قادیانی)

ایسی باتیں وہی کر سکتا ہے جو مراقی اور آسیب زدہ ہو اور "یتخبطہ الشیطان" کا پوری طرح مصداق ہو! اور جسے نہ خدا کا خوف ہو اور نہ بندوں کی شرم! جو شخص اپنی شروع کی تحریروں میں یہ لکھ چکا ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا متبع اور غلام ہوں اور حضور ہی کے واسطہ سے مجھے سب کچھ ملا ہے — پھر وہ ایسی "کفریات" بھی بکنے لگتا ہے۔

"اس کے (یعنی نبی کریم کے) لئے (صرف) چاند گرہن کا نشان ظاہر ہوا اور میرے لئے چاند اور سورج دونوں (کے گرہن) کا اب کیا تو انکار کرے گا (اعجاز احمدی مصنفہ مرزا غلام احمد قادیانی)

اور

- — "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت اس کے تمام احکام کی تکمیل ہوئی اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے وقت میں اس کے ہر ایک پہلو کی اشاعت کی تکمیل ہوئی، اور مسیح موعود کے وقت میں اس کے روحانی حقائق اور اسرار کے ظہور کی تکمیل ہوئی" (براہین احمدیہ حصہ پنجم حاشیہ مصنفہ مرزا غلام احمد قادیانی)

- — "ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانیت نے پانچویں ہزار میں اجمالی صفات کے ساتھ ظہور فرمایا

اور وہ زمانہ اس روحانیت کی ترقیات کا انتہا نہ تھا بلکہ اس کے کمالات کے معراج کے لئے پہلا قدم تھا پھر اس روحانیت نے چھٹے ہزار کے آخر میں یعنی اس وقت پوری طرح تجلی فرمائی "

(خطبہ الہامیہ ص ۱۷۷ مصنفہ مرزا غلام احمد قادیانی)

● — " اسلام ہلال کی طرح شروع ہوا، اور مقدر تھا کہ انجام کار آخر زمانہ میں بدر ہو جائے خدا تعالیٰ کی حکمت نے چاہا کہ اسلام اس صدی میں بدر کی شکل اختیار کرے جو شمار کی رو سے بدر کی طرح مشابہ ہو (یعنی چودھویں صدی) پس ان ہی معنوں کی طرف اشارہ ہے خدا تعالیٰ کے اس قول میں کہ لقد نصرکم اللہ ببدر[1] "

(خطبہ الہامیہ ص۱۸۴ مصنفہ مرزا غلام احمد)

مرزائے قادیان کے ان اقوال میں قدر مشترک " رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر آپ (مرزا) کی فضیلت کا پہلو " ہے۔ ان اقوال سے ہم نے کوئی نکتہ پیدا نہیں کیا ہے، بلکہ آپ کے بیٹے اور جانشین مرزا محمود احمد نے بھی ان اقوال سے یہی بات سمجھی ہے۔ وہ اپنی تقریر میں کہتا ہے:۔

" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم معلم ہیں اور مسیح موعود بطور شاگرد۔ شاگرد خواہ استاد کے علوم کا وارث پورے طور پر ہو جائے، یا بعض صورتوں میں بڑھ بھی جائے، مگر استاد بہرحال استاد ہی رہتا ہے اور شاگرد شاگرد ہی "

(تقریر محمود احمد خلیفہ قادیان مندرجہ اخبار الحکم قادیان ۲۸ اپریل ۱۹۱۴ء منقول از البدر کی نمبر ۱ ص ۳)

اس کے بعد ایک قادیانی کے دو شعر ملاحظہ کیجئے۔ جو مرزا غلام احمد کے ان اقوال کا " عطر اور ظل " ہیں۔

محمد پھر اتر آئے ہیں ہم میں — اور آگے سے ہیں بڑھ کر اپنی شاں میں
محمد دیکھنے ہوں جس کو اکمل — غلام احمد کو دیکھے قادیاں میں

(قاضی محمد ظہور الدین اکمل قادیانی منقول از اخبار پیغام صلح، لاہور ۱۴ مارچ ۱۹۱۶ء)

درثمین (ص ۲۸۷ - ۲۸۸) میں مرزا غلام احمد قادیانی، تمام انبیاء علیہم السلام پر اپنی فضیلت کا اعلان کرتا ہے:۔

انبیاء گرچہ بودہ اند بسے — من بعرفاں نہ کمترم ز کسے
آنچہ داد ست ہر نبی را جام — داد آں جام را مرا بہ تمام
کم نیم زاں ہمہ بروئے یقین — ہر کہ گوید دروغ ہست لعین

ان شعروں سے اکابر قادیان نے کیا مفہوم لیا اس کا اندازہ مرزا بشیر احمد قادیانی کے ان جملوں سے کیا جا سکتا ہے:۔

" اس کے (آنحضرت صلعم کے) شاگردوں میں علاوہ بہت سے محدثوں کے ایک نے نبوت کا بھی درجہ پایا اور نہ صرف یہ کہ نبی بنا، بلکہ اپنے مطاع کے کمالات کو ظلی طور پر حاصل کر کے، اولوالعزم نبیوں سے بھی آگے نکل گیا۔"

(حقیقۃ النبوۃ ص ۲۵۷)

اور

" پس مسیح موعود کی ظلی نبوت کوئی گھٹیا نبوت نہیں، بلکہ خدا کی قسم اس نبوت نے جہاں آقا کے درجہ کو بلند کیا

---

[1] ایک چھوٹے سے جملہ میں چار بار "کے" آیا ہے۔ یہ ہے قادیانی نبی کی آتش بیانی، جس سے وحی و الہام کو نسبت دی جاتی ہے۔
[2] قرآن کریم کو اپنی ہوائے نفس اور بدعت کی جانب لے جانے کے لئے اس طرح مضحکہ بنانا کتنی تکلیف دہ بات ہے۔

وہاں اس مقام پر کھڑا کر دیا جن تک انبیاء بنی اسرائیل کی پہونچ نہیں"

(کلمۃ الفصل مندرجہ رسالہ ریویو آف ریلیجنز ص ۱۱۳، نمبر ۳، جلد ۱۴)

مرزا کے بیٹے کے یہ الفاظ ——— "اس نعمت نے جہاں آقا کے درجہ کو بلند کیا ——— غور طلب ہیں۔ یعنی مرزا کی ظلی نبوت کے سبب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درجہ کو بلندی میسر آئی۔ (لعنۃ اللہ علیٰ من قال ھکذا و ھکذا)

● ——— "پس اس امت کا یوسف یعنی یہ عاجز (مرزا غلام احمد قادیانی) اسرائیلی یوسف سے بڑھ کر ہے۔ کیونکہ یہ عاجز قید کی دعا کر کے بھی قید سے بچایا گیا مگر یوسف بن یعقوب قید میں ڈالا گیا اور اس امت کے یوسف (مرزا غلام احمد) کی بریت کے لئے پچیس برس پہلے ہی خدا نے آپ گواہی دے دی اور بھی نشان دکھلائے، مگر یوسف بن یعقوب اپنی بریت کے لئے انسانی گواہی کا محتاج ہوا (براہین احمدیہ حصہ پنجم ص ۷۶ مصنفہ مرزا غلام احمد قادیانی)

——— یہ مضحکہ خیز تماشہ بھی دیکھئے ———

"اور یہ بھی مدت سے الہام ہو چکا ہے کہ انا انزلناہ قریباً من القادیان ..... اس جگہ مجھے یاد آتا ہے کہ جس روز وہ الہام مذکورہ بالا جس میں قادیان میں نازل ہونے کا ذکر ہے ہوا تھا اس روز کشفی طور پر میں نے دیکھا کہ میرے بھائی صاحب مرحوم مرزا غلام قادر میرے قریب بیٹھ کر با آواز بلند قرآن شریف پڑھ رہے ہیں اور پڑھتے پڑھتے انہوں نے فقرات کو پڑھا انا انزلناہ قریباً من القادیان، تو میں نے سن کر بہت تعجب کیا کہ قادیان کا نام قرآن شریف میں لکھا ہے .... تب میں نے دل میں کہا کہ واقعی طور پر قادیان کا نام قرآن شریف میں درج ہے، اور میں نے کہا کہ اور تین شہروں کا نام قرآن شریف میں اعزاز کے ساتھ لکھا ہوا ہے، مکہ، مدینہ، قادیان، یہ کشف تھا کہ کئی سال ہوئے مجھے دکھلایا گیا تھا" (ازالۂ اوہام ص ۷۶ مصنفہ غلام احمد قادیانی)

ایک مرض ہی ہے کہ جو منہ میں آتا ہے بکتا چلا جاتا ہے۔ ان احمقوں اور جاہلوں کو کیا کہئے کہ جو، ان "بنیانات" کو الہام و وحی سمجھے ہوئے ہیں اور اس قسم کے خرافات پڑھ کر بھی مرزائے قادیان کی عظمت کرتے ہیں اور اس کی ذات سے ان کی عقیدت میں کمی نہیں آتی! یہ کفر و ضلالت کا وہ آخری درجہ ہے کہ ذہن و قلب سے حق شناسی اور اچھے برے کے جاننے پہچاننے کی تمیز ہی سرے سے جاتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ ان کے دلوں پر مہر لگا دی جاتی ہے!!

اس کفر و ضلالت کی آخری پستی یہ ہے کہ: ———

● ——— "انت منی بمنزلۃ ولدی" "تو مجھ سے بمنزلہ میرے فرزند کے ہے" (حقیقۃ الوحی ص ۸۶ مصنفہ مرزا غلام احمد قادیانی)

● ——— "انت منی وانا منک ظہورک ظہوری" ——— "تو مجھ سے ہے اور میں تجھ سے ہوں، تیرا ظہور میرا ظہور ہے"

(الہام مرزا غلام احمد قادیانی مندرجہ تذکرہ وحی مقدس مجموعہ الہامات و مکاشفات مرزا ص ۱۵۰)

● ——— "یحمدک اللہ من عرشہ ویمشی الیک" "خدا عرش سے تیری (یعنی مرزا کی) تعریف کرتا ہے اور تیری طرف چلا آتا ہے" (انجام آتھم ص ۵۵ مصنفہ مرزا غلام احمد قادیانی)

● ——— "خدا قادیان میں نازل ہوگا" (البشریٰ جلد اول ص ۵۶ مجموعہ الہامات مرزا غلام احمد)

● ——— "میں نے تجھ سے ایک خرید و فروخت کی یعنی ایک چیز میری ——— جس کا تو مالک بنایا گیا، اور ایک چیز تیری تھی جس کا میں مالک بنایا گیا، تو بھی اس خرید و فروخت کا اقرار کر اور کہہ دے کہ خدا نے مجھ سے فروخت کی۔ تو مجھ سے ایسا ہے جیسا کہ اولاد، تو مجھ میں سے ہے اور میں تجھ میں سے ہوں"

(مرزا غلام احمد ——— کتاب البریہ ص ۸۵، ۸۶ و تذکرہ مجموعہ الہامات و مکاشفات مرزا)

یہ ہیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ مرزا قادیان کے "بیاہوری" کے تعلقات اور معاملات ۔ ۔ ۔ ۔ !! واستغفراللہ ؟

تمام اہل ایمان جانتے ہیں کہ مسیح موعود حضرت عیسیٰ ابن مریم ہوں گے —— مرزا قادیان نے "مسیح موعود" کا دعویٰ کیا ہے، اس کے لئے "ابن مریم" کا ثبوت فراہم کرنے کی خاطر وہ اس مضحکہ خیز ضلالت پر عمدہ ذہانت سے بیان کیا، کہتا ہے:—

"مریم کی طرح عیسیٰ کی روح مجھ میں نفخ کی گئی اور استعارہ کے رنگ میں مجھے حاملہ ٹھہرایا گیا، اور آخر کئی مہینہ کے بعد جو دس مہینہ سے زیادہ نہیں، بذریعہ الہام کے مجھے مریم سے عیسیٰ بنایا گیا پس اس طور سے میں ابن مریم ٹھہرا"
(کشتی نوح ص ۴۷ مصنفہ مرزا غلام احمد قادیانی)

کسی شریف، معقول اور سنجیدہ آدمی کے منہ سے بھلا ایسی بے تکی باتیں نکل سکتی ہیں؟ "دیوانہ کی بڑ" میں بھی ایک طرح کی معقولیت ہوتی ہے مگر

ع یہ خرافات تو دورہیں کو بھی نہ دیکھے نہ سنے

"ہر ایک پہلو سے خدا نے مجھے مدد دی، چنانچہ ہزارہا شکر کا مقام ہے کہ قریباً چار لاکھ[1] انسان اب تک میرے ہاتھ پر اپنے گناہوں سے اور کفر سے توبہ کر چکے ہیں" (تتمہ حقیقۃ الوحی ص ۴۲ مصنفہ مرزا غلام احمد قادیانی)

اول تو یہ تعداد انتہائی مبالغہ آمیز اور گمراہ کن ہے کہ چند ہزار کو چند لاکھ تک پہنچا دیا پھر جن مسلمانوں نے مرزا کے ہاتھ پر توبہ کی ان کو وہ "کافر" کہتا ہے یعنی مرزائے قادیان کو نبی نہ ماننے سے پہلے وہ مسلمان کفر میں مبتلا تھے۔

—— اس صورت میں ——

لاہوری جماعت کی یہ بات غلط اور بے اصل ثابت ہوتی ہے اور خود ان کے "مسیح موعود" کی تعلیمات کے مخالف ہے۔

"..... جماعت لاہور کے اعتقادات یہ ہیں کہ حضرت مسیح موعود نبی اللہ نہیں ہیں بلکہ مجدد ہیں اور یہ کہ آپ کے دعوے کے انکار سے کوئی مسلمان کافر نہیں ہو جاتا"

لاہوری جماعت کے اس دجل و فریب کا پردہ خود مرزا اس طرح چاک کر چکا ہے۔

"کفر دو طرح پر ہے ایک کفر یہ کہ ایک شخص اسلام سے ہی انکار کرتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول نہیں مانتا دوسرے یہ کفر کہ مثلاً وہ مسیح موعود کو نہیں مانتا .... اور اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ دونوں قسم کے کفر ایک ہی قسم میں داخل ہیں" (حقیقۃ الوحی ص ۱۷۹ مصنفہ مرزا غلام احمد قادیانی)

اقوال میں تناقض اور ہذیانات میں درجہ بدرجہ ترقی

۱۸۹۱ء میں بیشک مرزا غلام احمد قادیانی کا یہ عقیدہ تھا:—

"ان تمام امور میں میرا وہی مذہب ہے جو دیگر اہل سنت و جماعت کا مذہب ہے ... اب میں مفصلہ ذیل امور کا مسلمانوں کے سامنے صاف صاف اقرار کرتا ہوں اس خانہ خدا (جامع مسجد دہلی میں) کہ میں جناب خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت کا قائل ہوں اور جو شخص ختم نبوت کا منکر ہو اس کو بے دین اور دائرہ اسلام سے خارج سمجھتا ہوں" (مرزا غلام احمد کا تحریری بیان، مندرجہ تبلیغ رسالت جلد دوم ص ۴۴)

---

[1] اگر مرزائے قادیان کے زمانہ حیات میں چار لاکھ قادیانی تھے، تو آج ان کی تعداد تقریباً پچاس لاکھ ہونی چاہئے تھی؛ پھر اس کے ہاتھ پر بیعت کرنے والے غالب تعداد میں مسلمان ہی ہونے چاہئیں۔ سکھ اور ہندو تو شاذ و نادر ہی قادیانی بنے ہیں۔

● —— "ظاہر ہے کہ اگرچہ ایک ہی دفعہ وحی کا نزول فرض کیا جائے اور صرف ایک ہی فقرہ حضرت جبریل لاویں اور پھر چپ ہو جاویں، یہ امر بھی ختم نبوت کے منافی ہے۔ ..." (ازالہ اوہام ص۵۷۷ مرزا غلام احمد قادیانی)

اس صحیح صاف اور سچے عقیدہ کے بعد مرزا ولایت و مجددیت کا دعویٰ کرتا ہے:—

"ان پر واضح رہے، ہم بھی نبوت کے مدعی پر لعنت بھیجتے ہیں اور لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے قائل ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت پر ایمان رکھتے ہیں اور وحی نبوت نہیں بلکہ وحی ولایت جو زیر سایہ نبوت محمدؐ اور بہ اتباع آں جناب صلی اللہ علیہ وسلم اولیا کو ملتی ہے، اس کے ہم قائل ہیں اور اس سے زیادہ جو شخص ہم پر الزام لگاتے وہ تقوےٰ اور دیانت کو چھوڑتا ہے، غرض نبوت کا دعویٰ اس طرف بھی نہیں، صرف ولایت اور مجددیت کا دعویٰ ہے۔" (اشتہار مرزا غلام احمد مورخہ ۲۰ شعبان ۱۳۱۴ھ مندرجہ تبلیغ رسالت جلد ششم ص۳۰۲)

یہ ولایت کا دعویٰ کیا اور کیوں! یہیں سے دماغ کا فساد اور ذہن و فکر کی خرابی کا آغاز ہوتا ہے "وحی ولایت" خود بڑے جھگڑے اور خطرے کی بات ہے!

—— اس کے بعد ——

"نبوت کا دعویٰ نہیں بلکہ محدثیت کا دعویٰ ہے، جو خدا تعالیٰ کے حکم سے کیا گیا، اور اس میں کیا شک ہے کہ محدثیت بھی ایک شعبہ قویہ نبوت کا اپنے اندر رکھتی ہے۔" (ازالہ اوہام ص۴۲۱، مصنفہ مرزا غلام احمد)

"وحی ولایت" کے بعد، محدثیت کا دعویٰ اس اعلان کے ساتھ کہ "محدثیت ایک شعبہ قویہ نبوت اپنے اندر رکھتی ہے"!

—— پھر وہ کہنے لگا ——

"مجھے مسیح ابن مریم ہونے کا دعویٰ نہیں اور نہ میں تناسخ کا قائل ہوں بلکہ مجھے تو فقط "مثیل مسیح" ہونے کا دعویٰ ہے، جس طرح محدثیت نبوت سے مشابہ ہے ایسا ہی میری روحانی حالت ابن مریم کی روحانی حالت سے مشابہت رکھتی ہے۔ (اشتہار مرزا غلام احمد قادیانی مندرجہ تبلیغ رسالت جلد ۲ صفحہ ۲۱)

حالانکہ "کشتی نوح" میں مرزا اپنے کو "ابن مریم" ٹھیرا تا ہے، جس کا حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے!

ہوائے نفس نے اور آگے بڑھایا، اور وہ اس حد تک پہنچ گیا —

"میرا دعویٰ ہے کہ میں وہ مسیح موعود ہوں، جس کے بارے میں خدا تعالیٰ کی تمام پاک کتابوں میں پیش گوئیاں ہیں کہ وہ آخری زمانے میں ظاہر ہوگا۔ (تحفہ گولڑویہ ص۱۹۵ مصنفہ مرزا غلام احمد قادیانی)

مسیح موعود کے دعوے کے بعد "نبی" ہونے کا اعلان کیا گیا —

"میں کوئی نیا نبی نہیں ہوں، پہلے بھی کئی نبی گزرے ہیں جنہیں تم لوگ سچا مانتے ہو"

(مرزا غلام احمد قادیانی مندرجہ اخبار بدر صفحہ ۵ مارچ ۱۹۰۸ء)

اس دعوے میں "بروزی" اور "ظلی" ہونے کا دُم چھلا بھی اڑا دیا گیا، اور گزشتہ انبیاء علیہم السلام کی مانند، اپنے "نبی" ہونے کا دعویٰ کیا گیا۔

۱۸۹۹ء میں مرزا غلام احمد کا یہ عقیدہ تھا :—

"میرے لئے کافی فخر ہے کہ میں ان لوگوں (صحابہ) کا مداح اور خاک پا ہوں، جو جزوی فضیلت خدا تعالیٰ نے انہیں بخشی ہے وہ قیامت تک اور شخص نہیں پا سکتا" (اعلان مرزا غلام احمد قادیانی مندرجہ اخبار الحکم قادیان اگست ۱۸۹۹ء)

مگر

آگے چل کر کہا ۔۔۔۔۔

؎ صد حسین است در گریبانم

پھر انبیاء کرام سے اپنے کو افضل ٹھیرایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پر خود کو فضیلت دکا جس کے اقتباسات اوپر دئے جا چکے ہیں۔
جو شخص صحابہ کرام کی خاک پا ہونے پر فخر کرتا تھا، پھر یوں کہنے لگا ۔۔۔۔۔

● ۔۔۔ "خدا عرش پر تیری تعریف کرتا ہے، ہم تیری تعریف کرتے ہیں، اور تیرے پر درود بھیجتے ہیں"
(رسالہ درود شریف، بحوالہ اربعین نمبر ۲، نمبر ۳، مصنفہ مرزا غلام احمد قادیانی)

● ۔۔۔ "سلام علی ابراہیم (ابراہیم پر سلام، یعنی اس عاجز پر)۔" (اربعین نمبر ۲ صفحہ ۲۰ از مرزا غلام احمد قادیانی)

● ۔۔۔ "ان الہامات کے کئی مقامات میں اس خاکسار پر خدا تعالیٰ کی طرف سے صلوٰۃ اور سلام ہے"
(اربعین نمبر ۲ ص [illegible]، از مرزا غلام احمد قادیانی)

اور

● ۔۔۔ (مرزا نے) فرمایا کہ پہلا مسیح صرف مسیح تھا، اس لئے اُس کی امت گمراہ ہو گئی اور موسوی سلسلہ کا خاتمہ ہوا، اگر میں بھی صرف مسیح ہوتا، لیکن میں مہدی ہوں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا بروز بھی ہوں، اس لئے **میری اُمت کے دو حصے ہوں گے**، ایک وہ جو مسیحیت کا رنگ اختیار کریں گے، اور یہ تباہ ہو جائیں گے، اور دوسرے جو مہدیت کا رنگ اختیار کریں گے" (ارشاد مرزا غلام احمد قادیانی مندرجہ اخبار الفضل ۲۶ جنوری ۱۹۱۶ء)

اور پھر اس "نبی" کا "نبی" نے اعلان کیا ۔۔۔۔۔
"آج سے انسانی جہاد جو تلوار سے کیا جاتا تھا، خدا کے حکم کے ساتھ بند کیا گیا، اب اس کے بعد جو شخص کافر پر تلوار اٹھاتا اور اپنا نام غازی رکھتا ہے، وہ اس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کرتا ہے ۔۔۔۔۔ سو اب میرے ظہور کے بعد تلوار کا کوئی جہاد نہیں":

اب چھوڑ دو جہاد کا اے دوستو! خیال — دیں کے لئے حرام ہے اب جنگ اور قتال
دشمن ہے وہ خدا کا جو کرتا ہے اب جہاد — منکر نبی کا ہے جو یہ رکھتا ہے اعتقاد

(اعلان مرزا غلام احمد قادیانی مندرجہ تبلیغ رسالت جلد نہم)

اور

جھوٹی نبوت کی اس "دوکانداری" میں "نبی" کا یہ آخری پتہ ۔۔۔۔۔
"**چونکہ میری تعلیم میں امر بھی ہے اور نہی بھی، اور شریعت کے ضروری احکام کی تجدید ہے**، اس لئے خدا تعالیٰ نے میری تعلیم کو اور اس وحی کو جو میرے اوپر ہوتی ہے، فلک یعنی کشتی کے نام سے موسوم کیا۔ ۔ ۔ ۔
اب دیکھو خدا نے میری وحی اور میری تعلیم اور میری بیعت کو نوح کی کشتی قرار دیا اور تمام انسانوں کے لئے اس کو معیار نجات ٹھیرایا جس کے آنکھیں ہوں دیکھے، اور جس کے کان ہوں سنے"
(حاشیہ اربعین ۴ صفحہ ۶ مصنفہ مرزا غلام احمد قادیانی)

جو شخص اپنے ماننے اور بیعت کرنے والوں کو "میری امت" کہہ کر خطاب کرے، اُس کی جانب سے اس بات کا اعلان کیا جائے کہ میری تعلیم میں امر بھی ہے اور نہی بھی، اور جس کے حکم سے "فریضۂ جہاد" منسوخ کیا جائے اور جس کا یہ دعویٰ ہو کہ "مسیح موعود" کو نہ ماننا کفر ہے، جو انبیاء کرام سے اپنے کو افضل سمجھتا ہو، یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی کسی نہ کسی جہت سے اپنی "فضیلت" ثابت کرتا ہو، اور قرآن کریم کی متعدد آیات کا اپنی ذات کو مخاطب اور مصداق جانتا ہو ـــــ اُس کے بارے میں لاہوری جماعت کا مسلمانوں کو اس طرح دھوکا دینا کہ مرزا نے مجدد، امام اور صرف "مسیح موعود" ہونے کا دعویٰ کیا تھا "نبوت" کا دعویٰ نہیں کیا کتنی جھوٹ اور مغلطات ہے! "کشتی نوح" کے صفحہ ۵۶ پر مرزا قادیانی کسی ابہام و تشابہ کے بغیر کھل کر کہتا ہے :ـــ

"ہلاک ہو گئے، وہ جنہوں نے ایک برگزیدہ رسول کو قبول نہیں کیا مبارک وہ جس نے مجھے پہچانا، میں خدا کی راہوں میں سے آخری راہ ہوں، اور اُس کے نوروں سے میں آخری نور ہوں، بدقسمت ہے وہ جو مجھے چھوڑتا ہے کیونکہ میرے بغیر سب تاریکی ہے ....."

وہ جو کسی نے کہا ہے کہ "دروغ گو را حافظہ نباشد" ـــــ تو مرزا کے دروغ گو اور جھوٹے ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اس کے کلام میں صد درجہ تناقض پایا جاتا ہے، کبھی کچھ کہتا ہے، اور کبھی کچھ! اُس کے اقوال و احوال گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے ہیں، اُس کے یہاں ایسے اقوال بھی ملتے ہیں جن میں "دعویٰ نبوت" کا انکار ہے مگر بعض دوسرے اقوال میں اُس کے نبی ہونے کا دعویٰ بھی ہے، وہ خود بھی کہتا ہے :ـــ

"جھوٹے کے کلام میں تناقض ضرور ہوتا ہے" (ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۱۱۱ از مرزا غلام احمد قادیانی)

ــــــــــــــــــ تو ــــــــــــــــــ

اپنے ہی قول کی رو سے "کلام میں تناقض" ہونے کے سبب مرزا "جھوٹا" قرار پاتا ہے، یہی وہ جادو ہے جو سر پر چڑھ کر بولتا ہے! اور اللہ تعالیٰ اسی دنیا میں جھوٹوں اور لپاڑیوں کے کذب و افترا کا پردہ چاک کر دیتا ہے۔

انگریزی حکومت کی نیازمندی مرزا غلام احمد قادیانی کی سیرت و کردار کی یہی جھلک آپ کے بے نقاب کرنے کیلئے کافی ہے کہ گورنمنٹ برطانیہ کی وفاداری اور نیازمندی پر اُس نے فخر کیا ہے :ـــ

"(مرزا نے لکھا ہے) کہ میں نے کوئی کتاب یا اشتہار ایسا نہیں لکھا، جس میں گورنمنٹ کی وفاداری اور اطاعت کی طرف اپنی جماعت کو متوجہ نہیں کیا ....."

ــــــــــــــــــ اور ــــــــــــــــــ

"اس لئے میری نصیحت اپنی جماعت کو یہی ہے کہ وہ انگریزوں کی بادشاہت کو اپنے اولی الامر میں داخل کریں اور دل کی سچائی سے ان کے مطیع رہیں" (ضرورۃ الامام صفحہ ۲۳ مصنفہ مرزا غلام احمد قادیانی)

جو شخص اپنے کو نبوت کا ظل اور بروز کہتا ہو، وہ قرآن کے "اولی الامر" سے یہ مفہوم اخذ کرتا ہے کہ انگریزی گورنمنٹ اس حکم میں داخل ہے اور اس کافر حکومت کی اطاعت منصوص ہے!

"یہ وہ فرقہ ہے جو فرقہ احمدیہ کے نام سے مشہور ہے اور پنجاب اور ہندوستان اور دیگر متفرق مقامات میں پھیلا ہوا ہے یہی وہ فرقہ ہے جو دن رات کوشش کر رہا ہے کہ مسلمانوں کے خیالات میں سے جہاد کی بیہودہ رسم کو اٹھا دے۔ گورنمنٹ کے اعلیٰ حکام کی طرف سے ایسی کارروائیوں کا ہونا ضروری ہے جس سے مسلمانوں کے دلوں میں منقوش ہو جائے کہ یہ سلطنت اسلام کے لئے درحقیقت چشمۂ فیض ہے"

(قادیانی رسالہ ریویو آف ریلیجنز ۱۹۰۲ء جلد ۱ نمبر ۴ اقتباس معروضہ مرزا غلام احمد قادیانی جو اُس نے حکومت کو پیش کیا)

جس شخص نے انگریزوں کی خوشنودی کی خاطر "فریضۂ جہاد" کو "بیہودہ رسم" کہا ہو اور حکومت انگریزی کو اسلام کے لئے "چشمۂ فیض" سمجھتا ہو ـــــ کیا وہ دین، محمد علیہ

ہو سکتا ہے ؟ اسلام کے مسلمہ فریضہ اور منصوص رکن کو جس شخص نے منسوخ کر دیا، اُس نے دین کی تجدید کی ہے یا دین کی بنیاد کو ڈھایا ہے ! انگریز مسلمانوں کے "جوشِ جہاد" سے ڈرتا تھا، اور مرعوب تھا، مرزائے قادیان نے انگریز کی دل رہی اور خوشنودی کے لئے دین کے اس عظیم رکن کی تنسیخ کا اعلان کر دیا ——— اس دناءت و ناحمیت، بے شرمی اور انگریز پرستی پر دعویٰ یہ کہ مجھ پر وحی آتی ہے، اللہ تعالیٰ مجھے شرفِ کلام سے نوازتا ہے، کیا "جہل مرکب" کا ایسا کوئی علاج ہو سکتا ہے !

——— اور سنئے ———

"اطلاع :- براہین احمدیہ کے صفحہ ۲۴۱ میں ایک پیش گوئی گورنمنٹ برطانیہ کے متعلق ہے اور وہ یہ ہے کہ وما کان اللہ لیعذبھم وانت فیھم اینما تولوا فثم وجہ اللہ۔ یعنی خدا ایسا نہیں ہے کہ اس گورنمنٹ کو کچھ تکلیف پہنچائے، حالانکہ تو اُن کی عملداری میں رہتا ہو، جدھر تیرا منہ خدا کا اُسی طرف منہ ہے[1] ——— کیونکہ خدا تعالیٰ جانتا تھا کہ مجھے اس گورنمنٹ کی پُر امن سلطنت اور ظلِ حمایت میں دل خوش ہے، اور اس کے لئے میں دعا میں مشغول ہوں کیونکہ میں اپنے کام کو نہ مکہ میں اچھی طرح چلا سکتا ہوں نہ مدینہ میں نہ روم میں نہ شام میں نہ ایران میں نہ کابل میں ! مگر اس گورنمنٹ میں جس کے اقبال کے لئے دعا کرتا ہوں، لہٰذا وہ اس الہام میں ارشاد فرماتا ہے کہ اس گورنمنٹ کے اقبال اور شوکت میں تیرے وجود اور تیری دعا کا اثر ہے اور اس کی فتوحات سب تیرے سبب سے ہیں، کیونکہ جدھر تیرا منہ اُدھر خدا کا منہ۔

اب گورنمنٹ شہادت دے سکتی ہے کہ اس کو میرے زمانہ میں کیا کیا فتوحات نصیب ہوئیں، یہ الہام ستر ہ برس کا ہے، کیا یہ انسان کا فعل ہو سکتا ہے، غرض میں گورنمنٹ کے لئے بمنزلہ حرزِ سلطنت کے ہوں (عریضہ بعالی خدمت گورنمنٹ عالیہ انگریزی منجانب مرزا غلام احمد قادیانی مندرجہ تبلیغ رسالت جلد ہشتم، حاشیہ صفحہ ۶۹ مولفہ میر قاسم علی قادیانی)

حکومت انگریزی جیسی مستبد اور اسلام دشمن حکومت کے اقبال و شوکت اور فتوحات کو جو شخص اپنی دعا کا اثر بتاتا ہو اور یہ کہتا ہو کہ "میں گورنمنٹ کے لئے بمنزلہ حرزِ سلطنت کے ہوں" ——— کیا ایسا شخص دین، ملت اور مسلمانوں کا خیر خواہ ہو سکتا ہے ؟ اور حکومت کا اس درجہ خوشامدی اور کاسہ لیس، جس نے شاعروں کو بھی بادشاہوں کی بھٹئی اور قصیدہ خوانی میں منزلوں پیچھے چھوڑ دیا ہو، مذمت کا مستحق ہے یا منقبت کا ؟

اس نبی کاذب کا ایک اور عجیب و غریب کارنامہ ملاحظہ کیجئے ——

عدالتی اقرار نامہ

اقرار نامہ مرزا غلام احمد قادیانی بمقدمہ فوجداری، اجلاس مسٹر جے۔ ایم ڈوئی صاحب بہادر، ڈپٹی کمشنر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ضلع گورداسپور، مرقومہ ۵ر جنوری ۱۸۹۹ء فیصلہ ۲۴ر فروری ۱۸۹۹ء

نمبر بستہ تو دیان نمبر مقدمہ سپلہ ....

میں مرزا غلام احمد قادیانی بحضورِ خدا وند تعالیٰ بالقرار صالح اقرار کرتا ہوں کہ آئندہ

(۱) میں ایسی پیش گوئی شائع کرنے سے پرہیز کروں گا جس کے یہ معنی ہوں یا ایسے معنی خیال کئے جا سکیں کہ کسی شخص کو (یعنی مسلمان ہو خواہ ہندو ہو، یا عیسائی وغیرہ) ذلت پہنچے گی یا مورد عتاب الٰہی ہو گا۔

(۲) میں خدا کے پاس ایسی اپیل (فریاد و درخواست) کرنے سے بھی اجتناب کروں گا۔ کہ وہ کسی شخص کو (یعنی خواہ مسلمان ہو، خواہ ہندو یا عیسائی وغیرہ) ذلیل کرنے سے یا ایسے نشان ظاہر کرنے سے کہ وہ مورد عتاب الٰہی ہے یہ ظاہر کرے کہ مذہبی مباحثہ

---

[1] قرآن کریم کی اس آیت کا ترجمہ مرزا نے جن لفظوں میں کیا ہے اُسی سے اُس کی عربی دانی اور اُردو دانی پر علاوہ اور سا تھ ہی خبثِ نفس کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے ملک ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے۔

ہیں کون سچا اور کون جھوٹا ہے۔

(۳) میں کسی چیز کو الہام بنا کر شائع کرنے سے مجتنب رہوں گا جس کا یہ منشا ہو یا جو ایسا منشا رکھنے کی معقول وجہ رکھتا ہو کہ فلاں شخص (یعنی مسلمان ہو، خواہ ہندو یا عیسائی وغیرہ) ذلت اٹھائے گا اور یا مورد عتاب الٰہی ہوگا۔

(۴) جہاں تک میرے احاطہ طاقت میں ہے، میں تمام اشخاص کو جن پر کچھ میرا اثر یا اختیار ہے، ترغیب دوں گا کہ وہ بھی بجائے خود اس طریقہ پر عمل کریں جس طریق پر کاربند ہونے کا میں نے دفعہ ۱ تا ۴ میں اقرار کیا ہے۔

العبد ــــــــــ | گواہ شد ــــــــــ
مرزا غلام احمد بقلم خود | خواجہ کمال الدین
| بی اے، ایل ایل بی۔

دستخط جے ایم ڈوئی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ

۲۴ فروری ۱۸۹۹ء

مسیح موعود اور نبی اپنے "الہام" کے شائع نہ کرنے کا "اقرار نامہ" انگریز مجسٹریٹ کے حضور پیش کر رہا ہے، آخر یہ کیا تماشا، سوانگ اور مضحکہ ہے

"..... پہلے میرا عقیدہ یہ تھا کہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ہمسر نہیں ہو سکتا، کیونکہ وہ رسول تھے، مگر بعد ازاں مجھ پر وحی کی بارش ہوئی، مجھے اپنا سابقہ عقیدہ ترک کرنا پڑا، اب اللہ مجھے رسول کہہ کر پکارتا ہے اور مجھے اس نے واضح طور پر اپنا رسول مقرر کیا ہے (حقیقۃ الوحی ص ۱۴۹ - ۱۵۰ از مرزا غلام احمد قادیانی)

کیا انبیاء اور رسول "عقیدہ" بھی بدل دیا کرتے ہیں؟ جھوٹ اور دجل و فریب کی بھی کوئی حد ہوا کرتی ہے! اور جہاں تک "نسخ" کا تعلق ہے وہ فقہی احکام میں واقع ہوتا ہے، عقائد میں نہیں!

صحیح حدیث میں آیا ہے کہ حضرت مسیح دمشق کے منارۂ سفید کے پاس نازل ہوں گے ـــ اس حدیث کے مفہوم کی شرح و تفسیر مرزائے قادیان کی زبانی سے سنئے:-

"اب یہ بھی جاننا چاہئے کہ دمشق" کا لفظ جو "مسلم" کی حدیث میں وارد ہے یعنی صحیح مسلم میں جو لکھا ہے کہ حضرت مسیح دمشق کے منارۂ سفید مشرقی کے پاس اتریں گے، یہ لفظ ابتداء سے محقق لوگوں کو حیران کرتا چلا آیا ہے...... واضح ہو کہ دمشق کے لفظ کی تعبیر میں میرے پر من جانب اللہ یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ اس جگہ ایسے قصبہ کا نام رکھا گیا ہے جس میں ایسے لوگ رہتے ہوں جو یزیدی الطبع اور یزید پلید کے عادات اور خیالات کے پیرو ہوں..... خدا تعالیٰ نے مجھ پر یہ ظاہر فرما دیا کہ یہ قصبہ قادیان بوجہ اس کے کہ اکثر یزیدی الطبع لوگ اس میں سکونت رکھتے ہیں، دمشق سے ایک مناسبت اور مشابہت رکھتا ہے" (حاشیہ ازالہ اوہام ص ۶۳ تا ۷۳)

؎ نازکی نے تیرے صیاد نہ چھوڑا زمانے میں

جائزہ مرزا غلام احمد قادیانی ہی کے اقوال اور تحریروں سے اُس کی جو شخصیت سامنے آتی ہے وہ ایک الیسپلٹ و عامی شخص کی شخصیت ہے جو مراق ضعف باہ، سل، ذیابیطس اور سوءِ حفظ[1] کا مریض تھا، پھر یہی شخص شروع شروع میں (۱۸۸۰ء سے ۱۸۹۱ء تک) مناظر اسلام اور

---

[1] شکوت الی وکیع سوءَ حفظی — فارشدنی الی ترک المعاصی

(میں نے اپنے استاد وکیع سے "خرابیِ حافظہ" کی شکایت کی تو انہوں نے مجھے "ترکِ معاصی" کی نصیحت کی (کیونکہ گناہ کرنے سے حافظہ خراب ہو جاتا ہے)

مبلغ اسلام بن کر منظر عام پر آتا ہے — پھر وہ "مہبط وحی و ولایت" "مجدد وقت" اور "مامور من اللہ" ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور ساتھ ہی مسیح علیہ السلام سے اپنی مماثلت کا اظہار بھی (تقریباً دو تین سال (۱۸۸۸ء سے ۱۸۹۱ء تک) یہی سلسلہ چلتا رہتا ہے" پھر ۱۸۹۱ء میں وہ حضرت مسیح علیہ السلام کی موت کا اعلان کر کے خود اپنے مسیح موعود اور مہدی موعود ہونے کا مدعی بنتا ہے! اور اس کے بعد ۱۹۰۱ء میں اپنے نبی اور رسول ہونے کا اعلان کرتا ہے۔

اس اعلان کے بعد قادیان میں "جدید نبوت" کا باقاعدہ نسخہ تیار اور سکہ قائم ہو جاتا ہے کہ وہ خود "علیہ السلام" ہے، اس کے ساتھی صحابہ "رضی اللہ عنہم" ہیں اور اس کی بیوی "ام المؤمنین" ہے! اس کے اقوال میں تضاد و تناقض کا یہ عالم ہے — "کوئی شخص بہ حیثیت رسالت ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہرگز نہیں آسکتا — اور — سیدنا و مولانا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ختم المرسلین کے بعد کسی دوسرے مدعی نبوت و رسالت کو کاذب اور کافر جانتا ہوں — اور جو شخص ختم نبوت کا منکر ہو، اس کو بے دین اور دائرۂ اسلام سے خارج سمجھتا ہوں!

مگر

وہ پھر "بروز" اور "ظل" کی اصطلاحات کو پس پشت ڈال کر اپنی ایسی نبوت کا دعویٰ کرتا ہے جس میں امر بھی ہے اور نہی بھی ہے، یہاں تک کہ ایک مستقل نبی اور رسول کی حیثیت سے "فریضۂ جہاد" کی تنسیخ کا اعلان کر دیتا ہے اور اس طرح اپنے ہی قول کے مطابق دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے، کبھی کہتا ہے کہ میں "فنا فی الرسول" ہوں اور مجھے جو کمالات ملے ہیں وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض اور واسطہ سے ملے ہیں، مگر اس کے بعد وہ اپنے کو تمام انبیاء علیہم السلام بلکہ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی افضل[1] قرار دیتا ہے! کبھی کہتا ہے کہ میں ابراہیم اور موسیٰ ہوں، کبھی یہ دعویٰ کہ میں ہی محمد اور احمد ہوں! اور اس کے بعد اس کی فساد زدہ ذہنیت نے جو جھرجھری لی، تو یہ بھی کہہ دیا کہ ہندوؤں کا اوتار کرشن بھی میں ہی ہوں۔

مرزا غلام احمد قادیانی کہیں یہ کہتا ہے — "مجھے مسیح ابن مریم ہونے کا دعویٰ نہیں اور نہ میں تناسخ کا قائل ہوں" — مگر اس کی تردید اس کی اپنی تحریر میں، ان الفاظ میں ملتی ہے:—

"مریم کی طرح عیسیٰ کی روح مجھ میں نفخ کی گئی، اور استعارے کے رنگ میں مجھے حاملہ ٹھیرایا گیا اور آخر کئی مہینے کے بعد جو دس مہینے سے زیادہ نہیں، بذریعہ الہام کے مجھے مریم سے عیسیٰ بنایا گیا۔ پس اس طور سے میں ابن مریم ٹھیرا"

اس ضلالت کی بھلا کوئی حد انتہا ہے کہ قرآن کریم کی وہ آیتیں جن کا مخاطب اور مصداق نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مقدس ذات ہے انہیں اپنے اوپر منطبق کرتا ہے:—

- — "میں وحی کے بغیر کچھ نہیں کہتا" (حقیقۃ الوحی ص ۸۵)
- — "اللہ نے مجھے رحمۃ للعٰلمین بنا کر بھیجا ہے" (حقیقۃ الوحی ص ۱۰۴)
- — "اللہ نے مجھے کوثر عطا کیا ہے" (ضمیمہ انجام آتھم ص ۳۵)

یہ کفر و ضلالت اس حد تک پہونچی کہ اس "نبی کاذب" نے الوہیت تک کا دعویٰ کر دیا۔

"میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ میں ہی خدا ہوں اور میں نے ہی یہ زمین و آسمان پیدا کئے ہیں" (آئینہ کمالات ص ۵۶۴ و ۵۶۵)

مرزا غلام احمد قادیانی نے کبھی یہ کہا کہ قرآن میں "قادیان" کا ذکر آیا ہے، کبھی شہر دمشق کی "قادیان" سے مشابہت دی تاکہ جھوٹا دعویٰ "مسیح موعود" کے لئے ثبوت میسر آسکے!

وہ جو نبوت بلکہ الوہیت تک کا دعویٰ کر ڈالتا ہے، انگریزی حکومت کی نیازمندی اور وفاداری پر فخر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ حکومت (انگریز) کو چشان ر

---

[1] مرزا صاحب قادیان کی تصنیفات کے اقتباسات ابھی درج کئے جا چکے ہیں ان کا اعادہ طوالت کا باعث ہو گا۔

ظ حرکت مقامات مقدسہ میں آن کا سبب ایسی ہی مقامات اور دعا گو رہتے ہیں! اور میرا وجود بھی انگریزی گورنمنٹ کے لئے بطور ایک مطلق سلطنت کے ہے! جو شخص انگریزی مجسٹریٹ کی عدالت میں اقرار نامہ داخل کرتے ہیں لوگوں کی رسوائی جن سے ہوتی ہے جیسے کہ "الہامات" اب شائع نہیں ہوا کریں گے۔ اور میں خدا کے پاس ایسی درخواست کرنے سے بھی اجتناب کروں گا، جس سے کوئی شخص ذلیل یا مورد عتاب الٰہی ہوتا ہو! "خانہ ساز نبوت" کا یہی مزاج اور عمل جانا بھی چاہیے!

ایسے گھٹیا درجہ کا آدمی اور اس پست کردار اور جاہلانہ بیہودگی کا بوجھ کالافتیٰ جس کی تحریروں میں شدید تناقض پایا جاتا ہے جس کے دعوے "مجذوب کی بڑ" سے بھی فروتر ہیں اور جس کے ہفوات وہذیانات کفر واستہزاء سے لبریز ہوں کیا اس قابل ہے کہ اس کو اصلی نبی یا ظلی و بروزی نبی یا مسیح موعود اور مہدی منتظر یا مجدد امام کا مقام دے کر اس کی طرف لوگوں کو دعوت دی جائے! جماعت ربوہ مرزا غلام احمد کی نبوت کی طرف لوگوں کو دعوت دیتی ہے اور لاہوری جماعت ان کی مجددیت اور امامت کی طرف مسلمانوں کو بلاتی ہے۔ دونوں جماعتوں کی عقیدت ومحبت کا مرکز ایک ہی شخصیت ہے اس لئے یہ دونوں جماعتیں ایک ہی جیسی ہیں اور ایک ہی طرح کی ضلالت میں مبتلا ہیں۔

مرزا غلام احمد کی تحریر کا اقتباس اوپر درج ہو چکا ہے۔ کہ ——

"میں اپنے کام کو نہ مکہ میں اچھی طرح چلا سکتا ہوں نہ مدینہ میں، نہ روم میں نہ شام میں نہ ایران میں نہ کابل میں۔ مگر اس گورنمنٹ میں جس کے اقبال کے لئے اللہ سے دعا کرتا ہوں"

مکہ، مدینہ، روم، شام اور ایران وکابل میں مسلمانوں کی حکومتیں تھیں، مرزا غلام احمد قادیانی کو یہ حکومتیں اس لئے ناپسند تھیں کہ ان میں اس کی جھوٹی نبوت کی تبلیغ نہیں ہو سکتی تھی۔ "قادیانیت" کافروں کی حکومت میں پنپ سکتی تھی۔ اس لئے قادیانی کسی ملک میں بھی مسلمانوں کی حکومت کو دل سے پسند نہیں کر سکتے! اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حکومت پاکستان سے ان کی وفاداری اور تعلق خاطر کے معاملے میں ان کے دلوں کا کیا حال ہو گا؟

قادیانی جو اپنے مشن کی تبلیغ بڑی سرگرمی سے کر رہے ہیں ان کے دجل وفریب سے مسلمانوں کو بچانے کے لئے ہم نے بھی قادیانیت کے خدوخال نمایاں کر دئیے ہیں تاکہ مسلمان ان کے دام تزویر میں آنے سے محفوظ رہیں، انہیں قادیانیت کی تبلیغ کا حق حاصل ہے، تو ہمیں اسلام کی مدافعت سے کون روک سکتا ہے!

طاہر القادری

۲۳ جون ۱۹۶۲ء

---

[1] جو شخص انبیاء کرام کی تنقیص کرتا ہو، وہ اپنے اقوال کی صدائے بازگشت اور اپنے کرتوتوں کے ردعمل سے کس طرح محفوظ رہ سکتا ہے۔ [2] ہمارے غم وغصہ کی کوئی حد نہیں رہتی، جب قادیانیوں کا ایسا لٹریچر ہمارے پاس آتا ہے، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے "حریف نبی کاذب" کے نام کے ساتھ "حضرت اقدس" جیسے تعظیم وتکریم کے القاب وآداب لکھے ہوتے ہیں! جس شخص نے انبیاء کرام اور سید الصفات خاتم النبیین پر اپنی فضیلت وبرتری کا اعلان کیا ہو اور بعض انبیاء کی تنقیص کی ہو اس کے لئے ہمارے زبان اور قلم سے تعظیم وتکریم کا کوئی لفظ نہیں نکل سکتا! جھوٹے نبی کے لئے وہی الفاظ استعمال کئے جائیں گے جو اس کے لائق ہیں! مرزائے قادیان نے کروڑوں مسلمانوں کی دل آزاری کی پرواہ نہیں کی، اور اس کی وہ کتابیں قادیانی برابر شائع کر رہے ہیں —— تو اس صورت میں ہم چند لاکھ قادیانیوں کی دلجوئی کے لئے "حریف نبوت" کا احترام وتکریم کرنے سے معذور ہیں۔

آزمودہ دواؤں کا مرکب
انالجین
سر درد ۔ کمر کا درد ۔ دانت کا درد
ایام ۔ انفلوئنزا اور ہر قسم کے دوسرے درد کے لئے
یقینی زود اثر اور بے ضرر علاج ہے
Opal

مفتی ولی حسن ٹونکی

اقسام حدیث

موقر ماہنامہ "فاران" کے شمارہ اپریل میں "قربانی کی شرعی حیثیت" کے عنوان سے ایک طویل مقالہ نظر سے گذرا جس کو جناب جلال الدین ٹونکی مدظلہم نے تحریر فرمایا تھا اس پر مقدمہ علامہ تمنا سرہندی صاحب نے لکھا تھا، مقدمہ میں حدیث کی مختلف اقسام اور ان کی تعریفات بیان کی گئی تھیں تعریفات دیکھ کر سخت تعجب ہوا۔ تقریباً سب کی سب غلط تھیں، اس لئے بطور استدراک اقسام حدیث اور اُن کی تعریفات حوالہ قرطاس ہیں تعریفات صرف اُنھیں کی ہیں جو مقالہ میں ذکر کی گئی ہیں، یہ تمام تعریفات اصول حدیث کی مستند کتاب "تدریب الراوی فی شرح تقریب النواوی" کے پیش نظر لکھی گئی ہیں۔

۱۔ **صحیح** ۔ وہ حدیث جس کی سند متصل ہو، راوی نہایت عادل، ضابط ہوں اور حدیث میں شذوذ، علت، نکارت نہ ہو۔

<u>سند متصل ہو</u> ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سند میں کوئی راوی ترک نہ ہو۔ پوری سند از اول تا آخر پوری ہو۔

<u>عادل</u> کا مطلب یہ ہے کہ راوی تقویٰ، طہارت امانت، دیانت سے آراستہ ہو۔

<u>ضابط</u>، جس کا حافظہ ہر قسم کے سقم سے پاک ہو، شیخ سے سماع کے وقت بھی صحیح یاد رکھا، پھر کتاب یا حافظہ میں صحیح اور بلاکمی و بیشی رکھا اور اسی طرح اپنے تلمیذ کے سامنے بلا کم و کاست بیان کیا، غرض تینوں درجوں میں راوی ضبط کی صفت سے متصف ہو۔

<u>شذوذ</u>۔ یعنی ثقہ راوی کا اپنے سے زیادہ راجح اور اوثق راوی کی مخالفت کرنا۔

<u>نکارت</u>۔ ضعیف راوی کا قوی راوی کی مخالفت کرنا۔

<u>علت</u>۔ سقم، یا عیب کو کہتے ہیں، علماء اصول حدیث کے نزدیک جو اسقام یا عیوب سمجھے جاتے ہوں اُس سے وہ حدیث خالی ہو، علت کی جمع علل ہے، علل حدیث سمجھنا نہایت دقیق فن ہے، علل کبھی متن حدیث میں ہوتی ہیں اور کبھی سند میں، پھر یہ علل کبھی ظاہر ہوتی ہیں کبھی نہایت خفیہ۔ علل حدیث پر مستقل کتابیں بھی لکھی گئی ہیں، ابن ابی حاتم کی کتاب العلل مشہور ہے۔

۲۔ **حسن** :۔ مثل صحیح کے ہے فرق صرف اس قدر ہے کہ اس کے راوی "صحیح" کے رواۃ کے مقابلہ میں صفت ضبط میں کم تر ہوں۔

۳۔ **ضعیف** :۔ وہ حدیث جس میں حدیث "صحیح" یا "حسن" کی صفات نہ ہوں، یعنی یا تو اس کے راویوں میں عدالت، حفظ، ضبط کے لحاظ سے کمی ہو، یا اس میں شذوذ، نکارت، علت وغیرہ پائی جائے۔

جس طرح "صحیح" کے درجات ہیں، اسی طرح حدیث ضعیف کے درجات ہیں۔

۴۔ **مدرج** :۔ وہ حدیث جس میں راوی نے مشکل الفاظ کی شرح یا حدیث کی وضاحت کے سلسلہ میں کچھ لفظ اضافہ کر دیئے ہوں۔

۵ ۔ متروک :۔ وہ حدیث جس کو ایسے راوی نے روایت کیا ہو جس کا جھوٹ بولنا حدیث کے علاوہ دوسرے موقعوں پر ثابت ہو گیا ہو ۔

۶ ۔ مسند :۔ وہ حدیث جو مرفوع یعنی جس کا سلسلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہونچے اور سند پوری اور متصل ہو ۔

۷ ۔ مسلسل بالحلف :۔ وہ حدیث جس کو ہر راوی نے اپنے تلمیذ کے سامنے حلف اٹھا کر روایت نقل کی ہو ۔

۸ ۔ عالی :۔ وہ حدیث جس میں وسائط کم ہوں ۔

۹ ۔ متصل :۔ وہ حدیث جس کی سند میں کوئی راوی ترک نہ ہوا ہو ۔

۱۰ ۔ منقطع :۔ وہ حدیث جس کی سند سے ایک یا کئی راوی متفرق مقامات سے ساقط ہوں ۔

۱۱ ۔ موضوع :۔ وہ حدیث جس کے راوی کے متعلق ثابت ہو گیا ہو کہ وہ جھوٹی حدیثیں بناتا ہے ۔

۱۲ ۔ مرسل :۔ وہ حدیث جس میں تابعی سے اوپر کا راوی ساقط ہو ۔

۱۳ ۔ معنعن :۔ وہ حدیث جو عن فلان ، عن فلاں سے روایت کی گئی ہو ۔

۱۴ ۔ مبہم :۔ وہ جس کے راوی کا نام ذکر نہ کیا گیا ہو ۔

(باقی صفحہ ۲۶ پر)

بالکل واضح ہیں، اُن کے بارے میں دو رائے نہیں ہو سکتیں، پاکستان کے ہر فکر اور ہر شعبہ حیات کا یہی رنگ ہونا چاہئے کہ ان میں "معروف" (نیکی) کا غلبہ ہو اور "منکر" (بدی) کے لئے کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔

ریڈیو صرف خبریں اور اطلاعات پہونچنے کا ذریعہ ہی نہیں ہے بلکہ ملک و ملت کے ذہن و فکر کی تربیت کا موثر واسطہ اور ذریعہ بھی ہے، اوپر کہا جا چکا ہے کہ پاکستان "اسلام" کے نام پر اور اسلام کے لئے وجود میں آیا ہے، اسلئے پاکستان کی "نشریات" کو اسلامی قدروں اور دینی نظریوں کا ہر جہت سے مکمل ترجمان ہونا چاہئے روس، چین اور دوسرے اشتراکی ملکوں کی مثال ہمارے سامنے ہے، وہاں ریڈیو اشتراکیت کے معلم اور مبلغ بنے ہوئے ہیں، اشتراکی ملکوں کی نشریات کا کوئی پروگرام اشتراکی نظریہ کا مخالف ہو ہی نہیں سکتا۔

پاکستان کی "نشریات" جن کو سو فیصد اسلام کا مظہر اور ترجمان ہونا چاہئے اُن میں چند دن سے اسلام کی جھلک پائی جاتی ہے، اور اس کا بھی یہ رنگ ہے کہ قرآن کریم کی چند منٹ کی تلاوت اور اُس کی تفسیر و ترجمانی کے بعد لیا وہ وقت "طاؤس و رباب" ہی میں صرف ہوتا ہے: اس طرح اللہ اور رسولؐ کے ذکر سے دلوں میں جو گداز کی کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ فلمی نغموں اور گانے بجانے کی لذتوں میں گم ہو کر رہ جاتی ہے!

گانے بجانے اور رقص و سرود سے سفلی جذبات اور ہوا و ہوس کو غذا ملتی ہے، یہ ہوس انگیز "لغویات" اسلامی مزاج سے کوئی مناسبت نہیں رکھتیں اور یہ فنکار اپنی ذات سے بھی پاکبازی اور خیر و تقویٰ کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتے، سازندوں، طوائفوں، نرت کاروں، رقاصاؤں اور اداکاروں کے کیرکٹر عام طور پر دینی اخلاق اور پاکبازی کی ضد ہوتے ہیں! اس لئے ان کے ذریعہ جس "فن" کا مظاہرہ ہوتا ہے وہ ان کے کردار کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

صوفیائے کرام کے "سماع" کا آج کل کے رقص و غناء سے کوئی واسطہ ہی نہیں ہے، ان بزرگوں کے یہاں "سماع" کی سخت شرطیں ہیں، ان کی اکثریت آلاتِ مزامیر کی مخالف رہی ہے، اور عورت کا گانا بجانا تو بالاتفاق سب کے نزدیک ناجائز اور حرام ہے!

اسلام دین فطرت ہے، اس لئے خوش آوازی کو پسند کرتا ہے۔ ریڈیو کی نشریات کو "خوش آوازی" اور ترنم کے ذریعہ دلکش بنانے میں کوئی قباحت نہیں ہے! "حسن صوت" اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے۔

اس گذارش کا مقصد یہ ہے کہ مزاحیہ فیچر ہوں، یا سنجیدہ ڈرامے، سیاسی یا تنقیدی مضامین ہوں یا تاریخی مقالے ان کا مزاج، آہنگ اور اسپرٹ ایسی ہونی چاہئے جس سے دینی نظریوں اور اسلام کی اخلاقی قدروں کو تقویت پہونچتی ہو!

ہندوستان کے خلاف جن دنوں پاکستان نے جہاد کیا تھا، اُن دنوں "نشریات" کے ذریعہ ملک کے طول و عرض میں ایثار و قربانی، خوف خدا، اطاعت دین اور خیر و نیکی کی جو فضا اور ماحول پیدا ہو گیا تھا، وہ اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے ابھی تک ملت کا مزاج دینی اور اسلامی اور بہت سے اور بہت سی اخلاقی کمزوریوں کے باوجود، قوم یہی چاہتی ہے کہ معاشرے کو فکر و عمل کی پاکیزگی میسر آئے — ریڈیو اس ترے کو پاکیزہ بنانے میں بڑا موثر پارٹ ادا کر سکتا ہے!

دینی قدریں اور اسلامی تصورات کس طرح علوم و فنون میں سموئے جا سکتے ہیں۔ اُس کی دو مثالیں پیش کرتا ہوں —— مثلاً "سائنس" پر کوئی مقالہ نشر کیا جا رہا ہے، اس مقالہ میں تمام فنی مصطلحات اور معلومات کے ساتھ کہیں کہیں یہ جھلک پیدا کر دی جائے کہ کائنات کی پیچیدگی اور تنظیم ایک خالق اور منظم (creator + organiser) کے وجود کا پتہ دیتی ہے اور اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے مادہ اور توانائی کو مسخر کر دیا ہے، اس ذکر سے سائنس کی ترقی اور قوت اکتشاف کو ذرہ برابر بھی کوئی نقصان نہیں پہونچے گا، مگر اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کے وجود اور اُس کی خالقیت اور ربوبیت کا تصور اور عقیدہ ذہنوں میں راسخ ہو جائے گا! اشتراکیت کے ماننے والے جب اپنی تمام توانائیاں اور صلاحیتیں اس میں صرف کر سکتے ہیں کہ خدا کا تصور ذہنوں سے محو ہو جائے تو اسلام پر عقیدہ رکھنے والے کیا اللہ تعالیٰ کے تصور و یقین اور ایمان کو جلوہ گر کرنے کے لئے اپنی صلاحیتیں صرف نہیں کر سکتے! مثلاً روس کا ہوا باز جب چاند کے قریب پہونچا ہے تو اس نے اعلان کیا کہ اُس فضا میں "خدا" کہیں نظر نہیں آیا! خدا کے وجود کی نفی کا یہاں کوئی موقع

تھا۔ مگر اشتراکیت کے پروگرام اور مزاج میں وجود باری کی نفی وانکار شامل ہے۔ اس لئے روس میں اس موقعہ سے فائدہ اٹھایا گیا ۔ ہم مسلمانوں کے ہوابازوں کو ایسے موقعہ پر اللہ تعالیٰ کی قدرت ، صنعت اور ربوبیت کا اعلان کرسکتے ہیں کہ یہ سورج کا کیپ اور افلاک کا نظام اللہ تعالیٰ کی بے کراں قدرت کی شہادت

ایک دوسری مثال :— ریاضی کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ اس علم کے ذریعہ بھی دینی تعصبات کو اجاگر کیا جاسکتا ہے ، تو اس پر بعض لوگ شاید ہنس دیں گے ؛ مگر ذہن وفکر دینی اور اسلامی ہوں تو ریاضی کے ذریعہ بھی بچوں کو دینی تعلیمات سے روشناس کراسکتے ہیں ، مثلاً اس سوال کی بجائے کہ " چار گھوڑے ، اور دو بیل ، کل کتنے جانور ہوتے " ——— اگر یوں سوال کریں ——— " ایک شخص نے صبح کی نماز میں چار رکعتیں ، ظہر کی نماز میں بارہ اور عصر کی نماز میں چار پڑھیں ، بتاؤ اس نے کل کتنی رکعتیں پڑھیں ؟ " تو اس سوال سے بچوں کو ریاضی کے قاعدہ " جمع " کے سیکھنے میں بھی کوئی دقت پیش نہیں آئے گی اور ساتھ ہی " نماز " دینی تصورات ان کے ذہن وفکر میں تازہ ہوجائے گا ۔

حکومت اگر " نشریات " کی اصلاح وترقی چاہتی ہے ، تو دین کی اخلاقی قدروں پر اُس کی بنیاد ہونی چاہئے ! اس مقصد کی تکمیل کے لئے ایسے ایسے بھی مل سکتے ہیں ، جو شعر وادب اور علم وفن میں دینی تصورات کو اس طرح سمو سکتے ہیں کہ " نشریات " کی دلکشی ، حسن اور دلچسپی باقی رہے اور عوام ان پاکیزہ کوشش کو بے مزہ نہ ہوں ۔

آخر میں مجھے " اُردو " کے بارے میں کچھ عرض کرنا ہے ۔ " نشریات " کے سلسلہ میں زبان کا مسئلہ بڑی اہمیت رکھتا ہے ! یہ واقعہ ہے اور حقیقت ہے کہ سارے ہندوستان کی جنگِ آزادی میں " اردو زبان " نے تنہا جو نمایاں رول ادا کیا اور کارنامہ انجام دیا ، وہ متحدہ ہندوستان کی تمام زبانوں کی مجموعی کوششوں پر ہے ! پھر مسلم لیگ کو جو عظیم الشان کامیابی حاصل ہوئی ہے اُس کا سب سے بڑا ذریعہ " اُردو " زبان تھی ، پاکستان بننے سے پہلے متحدہ ہندوستان کے ہر صوبہ اور کے مسلمانوں کا یہی دعویٰ تھا کہ " اُردو زبان " ہندوستان کی " لنگوا فرینکا " ہے ! قیام پاکستان کی جدوجہد کے دوران ہر مسلمان یہی توقع رکھتا تھا کہ پاکستان بننے کے بعد یہاں " اسلام " قائم ہوگا اور " اُردو " یہاں کی حکومت کی زبان ہوگی ،

——— مگر ———

افسوس ہے کہ حکومتوں کی بے تدبیری اور کیبنٹوں اور صوبائی عصبیت کے مارے ہوؤں کی رخنہ اندازی کے سبب " اُردو " کو وہ مقام پاکستان میں حاصل نہ ہوسکا جس کی وہ مستحق ہے ! بہرحال یہ بات ہر شخص کے نزدیک مسلّم ہے کہ پورے پاکستان میں صرف " اُردو " ہی ایسی زبان ہے ، جو ہر خطہ میں سمجھی جاتی ہے ۔

اس لئے

ریڈیو پاکستان کو " اُردو " کی اس مسلمہ حیثیت کے پیش نظر " اُردو نشریات " کو زیادہ سے زیادہ موقعہ اور حصہ دینا چاہئے ۔

یہ چند گزارشیں ہیں جن کو اخلاص وتعمیر کے جذبہ کے تحت پیش کیا گیا ہے ———

(ص ۲۲ کا بقیہ)

۱۵ ۔ متواتر :— وہ حدیث جس کو اس قدر اشخاص بیان کریں کہ اُن کا جھوٹ پر جمع ہونا محال ہو ۔

۱۶ ۔ مشہور :— جس حدیث کے راوی ہر طبقہ میں تین فرد ہوں ، یا جس کی روایت عہدِ صحابہ میں کم ہو ، دوسرے اور تیسرے عہد میں کثرت سے اُس کی ہوتی ہو ۔

۱۷ ۔ عزیز :— وہ حدیث صحیح جس کے سلسلہ رواۃ میں ہمیشہ دو ہی راوی پائے جائیں ۔

۱۸ ۔ احاد :— وہ احادیث جن کی روایت کرنے والے ایک ایک ہوں ۔

۱۹ ۔ غریب مطلق :— وہ حدیث جس کی سند میں صحابی سے روایت کرنے والا منفرد ہو ۔

۲۰ ۔ مرفوع :— وہ حدیث جس کی سند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر منتہی ہو اور اس کے سب راوی ثقہ ہوں ۔

۲۱ ۔ موقوف :— وہ حدیث جس میں راوی صحابی کے قول وفعل یا تقریر کو بیان کرے ۔

۲۲ ۔ مقطوع :— جس میں راوی تابعی کے قول ، فعل ، تقریر کو بیان کرے ۔

ڈاکٹر محمد اسلام

جگر کا تصوف

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے صحیح لکھا ہے کہ

"تصوف کا اصل مایہ خمیر عشقِ حقیقی ہے"[1]

اور احمد فاخر نے حسن کے مسئلہ کی وضاحت افلاطونی فلسفہ کے تحت یوں کی ہے

"حقیقت حسن ہے اور مجاز عکسِ حقیقت"[2]

حسن کی تعریف میں مشہور چینی حامی سریت لاؤتسے (Lao Tse) نے بھی اپنے مخصوص عارفانہ مگر نہایت دلچسپ انداز میں کی ہے :-

"ہم تاؤ (حق) کی طرف دیکھتے ہیں اور ہمیں کچھ نظر نہیں آتا، اس کا کوئی رنگ نہیں، ہم تاؤ کو کان لگا کر سنتے ہیں اس کی کوئی آواز نہیں، ہم تاؤ کو ٹٹولتے ہیں لیکن وہ ہمیں کہیں ہاتھ نہیں آتا اس کا کوئی جسم نہیں، ہمیشہ! ہاں ہمیشہ تاؤ بے نام و نشان رہتا ہے، اور بار بار عدم ہی کی جانب واپس آتا ہے"[3]

عشق بھی ایک طرح کا غیر معمولی اور منفی تجربہ ہے جس کی تعریف کرنے کی کوشش بہتوں نے کی ہے، جگر نے خوب کہا ہے :

یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجے　　اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

صوفیہ نے اپنے وجدان سے حسن و عشق دونوں پر مشتمل کچھ نظریات قائم کئے ہیں جن کو مولانا نیاز فتحپوری نے بالترتیب چار نظریوں میں تقسیم کیا ہے۔

پہلا نظریہ :- عشق خالقِ حسن ہے۔

دوسرا نظریہ :- اصل حقیقت محض حسن ہے اور حسن کا تقاضا ہے ظہور و خود نمائی اور یہ تقاضا ہے عشق کا محرک اور خالق ہے اور مذہب کی اصطلاح میں اسی کو تزئین کہتے ہیں۔

تیسرا نظریہ :- حسن و عشق دونوں اپنی اپنی جگہ مستقل ہستیاں ہیں مگر ہر شخص کا معیارِ حسن فطری طور پر مختلف ہوتا ہے اور فطرت اپنے معیارِ بلند کی جستجو میں رہتی ہے اور جب اتفاق سے وہ چیز سامنے آجاتی ہے تو دبی ہوئی چنگاریاں بھڑک اٹھتی ہیں۔ اسا ہی تقابل حسن و عشق سے دونوں کا فطری رنگ نکھر آتا ہے۔

چوتھا نظریہ :- تمام کائنات عالم چونکہ محض ایک حسنِ ازل کا پرتو ہے لہٰذا حسن و عشق کی حقیقت ایک اور شانیں مختلف ہیں۔[4]

اور جگر نے کہا ہے کہ :-

---

[1] میر تقی میر۔ حیات اور شاعری صفحہ ۴۹۱ ، [2] "جام نو" جنوری ۱۹۶۱ء صفحہ ۲۹ [3] الہامی فلسفہ (مطبوعہ ۱۹۵۳ء) صفحہ ۴۶ ،
[4] "جام نو" جنوری ۱۹۶۱ء صفحہ ۳۰-۳۱

"حسن نام ہے مناسبت اور صحت کا۔"

اسے آنکہ بہ امتزاج کامل	در جملہ صفات برگزیدہ

خدا حسنِ تمام کا مجموعہ ہے۔

لفظ و معنی جس کو چھو سکتے نہیں	وہ مرا اک نقطۂ آغاز ہے

حقیقتِ کاملہ کی خاص کوئی تعریف ہو نہیں سکتی وہ مقام وسطی ہے جہاں تمام حقائق ایک نقطہ پر سمٹ آتے ہیں۔
حُسنِ حقیقت سے نسبت ہو جانے پر انسان کی ظاہری و باطنی کیفیات میں سائنٹیفک تغیرات ہونے لگتے ہیں چونکہ نسبت کے بھی مدارج ہیں اپنا اپنا مراسم کی مناسبت ہی سے ان تغیرات کا ظہور ہوتا رہتا ہے۔
حسن ایک حقیقتِ کاملہ ہے جس کا احاطہ ممکن نہیں لیکن کائنات مظاہرِ حسن کا مجموعہ نسبت اگر حسن کامل سے ہے تو ظاہر ہے کہ مظاہرِ حسن اس کے بعد کچھ ہیں لیکن وہ ہمیشہ خوب سے خوب تر کا متلاشی رہتا ہے اور اس کی ترقی کی منتہا گہری کی جانب بڑھتی جاتی ہے اور اس کے اثر میں پاکیزگی و لطافت بدرجہ اتم ہوگی۔[1]

تصوف کے بارے میں جگر نے اپنی رائیں اپنے بعض اشعار میں بھی نظم کر دی ہیں ملاحظہ فرمایئے ؎

یہ حسنِ طلب ہی کا اک جلوۂ رعنا ہے	کس نے اسے دیکھا ہے کس نے اسے پایا ہے
اگر نہیں پس پردہ کوئی حقیقت میں	یہ کون بول رہا ہے طلسم صورت میں
مجسم بنا جا رہا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں	میں وہ ہوں تو نے عالم با خود جس کی آرزو کی
کبھی میں رہے مجھ سے مستور ہو کر	بہت پاس نکلے بہت دور ہو کر
وہی حسن جس کے ہیں یہ سب مظاہر	اسی حسن میں حل ہوا جا رہا ہوں
پردہ جب اٹھ گیا ہے دیکھا یہی ہے اکثر	اپنی ہی آرزو میں اپنی ہی جستجو کا
ہر حقیقت کو بہ انداز تماشا دیکھا	خوب دیکھا تجھے جلوؤں کو گر کے دیکھا
ہم نے ایسا نہ کوئی دیکھنے والا دیکھا	جو یہ کہہ دے کہ ترا حسن سراپا دیکھا
نقاب حسن دو عالم اٹھائی جاتی ہے	مجھی کو میری تجلی دکھائی جاتی ہے
یہ سب لالہ و گل یہ سب چاند تارے	ترے اک تبسم کے چند استعارے
ہر ذرۂ عالم پر حاوی ہیں صفات اس کے	سب کہنے کی باتیں ہیں مختاری و مجبوری

اُردو شاعری کے بیشتر موضوعات فارسی شاعری کی تقلید میں اردو شاعری کا تصوف بھی فارسی شاعری سے متاثر ہے فارسی میں حافظ، خیام، عطار، احمد، رومی سب کے سب صوفیانہ رنگ کے شاعر تھے اس لئے ان کی شاعری ان کے واردات قلبی کا مظہر ہے بقول مرزا تسنیم ان کا عقیدہ ہے کہ :۔

یہ کائنات ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ہمیں حسنِ مطلق (ABSOLUTE BEUTY) کی جھلک ملتی ہے انسان چونکہ اس کائنات کا ایک اہم جزو ہے اس لئے اس میں بھی حسنِ مطلق کی ضو موجود ہے یہ ضو

---

[1] احمد رفاعی صاحب کا مضمون بعنوان "نظریاتِ جگر" (غیر مطبوعہ) جسے عبداللطیف اعظمی صاحب ایڈیٹر "جامعہ" نے راقم الحروف کو عطا فرمایا اب یہ مضمون نگارشاتِ جگر میں شامل کر دیا گیا ہے۔

اس میں اضطراب پیدا کرتی ہے اس بات کا کہ وہ حسن مطلق کو اپنے حلقۂ فہم میں لے آئے مگر یہ ممکن نہیں کیوں کہ حسن بیکراں و [illegible] ہے اور انسان محدود و [illegible] ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ عمر بھر اس حسن بیکراں کا عاشق بنا رہتا ہے مگر وصل نصیب نہیں ہوتا۔ [1]

اُردو شعراء میں میر درد کا کلام تصوف میں ڈوبا ہوا ہے ان کے بعد غالب کے یہاں بھی تصوف کا کچھ عنصر مل جاتا ہے اور بیسویں صدی کے شعراء میں اصغر نے حسن کو چشم باطن سے بھی دیکھا اور وہ قوت شامہ اور قوت سامعہ کو بھی بروئے کار لائے۔

جگر اگرچہ صوفی شاعر نہیں ہیں ان کو خود بھی اس کا اعتراف ہے ؂

میں نہ زاہد ہے ہوں شرمندہ نہ صوفی ہے جگر
مسلکِ عشق مرا مسلک رندانہ بھی

پھر بھی ان کو ماحول ہر اعتبار سے صوفیانہ ملا ان کا گھریلو ماحول مذہبی تھا ان کے والد ایک صوفی منش اور اللہ والے انسان تھے اور بزرگانِ دین و اولیائے کرام سے بے پناہ عقیدت رکھتے تھے انہیں کا اثر جگر پر بھی پڑا بالکل ابتدائی زمانے میں والد کی تربیت میں رہے اور پھر جب شعر و شاعری کے میدان میں قدم رکھا تو حضور احمد صاحب مرحوم مرادآبادی وغیرہ جیسے صوفی شعراء کا ساتھ ہو گیا جن کے انتقال کے بعد انہوں نے ایک دفعہ ان کو مدہوشی کے عالم میں خواب دیکھا اُن سے رسول مقبولؐ کی خدمت میں سلام عرض کرنے کے لئے گزارش کی۔

جگر مرادآبادی کو اصغر گونڈوی کی صحبت سے فیض اٹھانے کا موقع ملا اور پھر وہ شاہ عبدالغنی صاحب منگلوری سے بیعت ہو گئے جن کا روحانی فیض ان پر ہمیشہ جاری رہا اسی طرف انہوں نے اپنے اس شعر میں اشارہ کیا ہے ؂

تجھ سے وحشی ترے غافل نہیں ہونے پاتے | رندا کر کوئی زنجیر ہلا دیتا ہے

یہ صحیح ہے کہ جگر ابتداء سے آخری عمر تک حسن کی تعریف و توصیف میں محو رہے لیکن بعد کو وہ ایک ایسے مقام پر پہونچ گئے جہاں انہیں حسن کی لہریں پردہ حقیقت غالباً محسوس ہونے لگی، فرماتے ہیں۔

رابعہ باطن اس کو کہتے ہیں کہ روز اولیں | روح مضطر ہی رہی جب تک نہ پیدا غم ہوا

اس لئے یہ خیال کہ جگر کے کلام میں تصوف کا رنگ اصغر کی ملاقات کے بعد آیا یا وہ اصغر اور ان کے کلام سے متاثر ہو کر تصوف کی طرف راغب ہوئے صحیح نہیں معلوم ہوتا ان کے تصوف کی بنیاد تو ان کے خاندان اور ابتدائی دور شاعری کی صحبت ہی میں پڑ چکی تھی، لیکن اصغر سے جب ملاقات ہوئی اور وہ شاہ عبدالغنی صاحب سے بیعت ہوئے تو ان کا یہ جوہر اور نکھر آیا۔

جگر کے بالکل ابتدائی زمانے میں ایسے اشعار ملتے ہیں جنہیں خالص صوفیانہ کہا جا سکتا ہے مثلاً ؂

دیدۂ حق بیں میں کیا فرق کیا امتیاز | ایک ہی جلوہ کہیں مجنوں کہیں لیلیٰ ہوا
کیا کروں گا اب بہار گل بداماں دیکھ کر | محو حیرت ہوں خود اپنا حسن پنہاں دیکھ کر
وہی گل ہے وہی بلبل وہی پروانہ ہے | شان ہے ایک مگر رنگ جداگانہ ہے

اس کے بعد ان کے یہاں ایک سنبھلی ہوئی کیفیت ملنے لگتی ہے ؂

اللہ اللہ یہ مری ترک و طلب کی وسعتیں | رفتہ رفتہ سامنے حسن تمام آ ہی گیا

---

[1] "نظام جدید" ۱۶ اور ۲۳ ستمبر ۱۹۵۷ء صفحہ ۱۲

اوّل اوّل ہر قدم پر تھیں ہزاروں منزلیں　　　آخر آخر اک مقامِ بے مقام آ ہی گیا

اس کے بعد جب وہ حضرت شاہ عبدالغنی صاحب منگلوری کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے تو ان کے اس صوفیانہ رنگ میں اور نکھار پیدا ہوا ؂

ہمہ تن محو دل اک نغمۂ بے ساز میں ہے　　　اب نہ مطرب میں کوئی فرق نہ آواز میں ہے

گوشِ مشتاق کی کیا بات ہے اللہ اللہ　　　سن رہا ہوں میں وہ نغمہ جو ابھی ساز میں ہے

جگر نے حسنِ حقیقی کی تلاش حسن مجازی کے ذریعہ کی اور اس تلاش میں انہوں نے حسنِ حقیقی کو حسنِ مجازی کے حلقے سے پا لیا ؂

صوفی نے جس کو شاہدِ مطلق سمجھ لیا　　　اک پرتوِ لطیف تھا حسنِ مجاز کا

رفتہ رفتہ ان کا عشق کسی مرکزِ نگاہ کا مرہونِ منت نہیں رہ گیا بلکہ وہ بذاتِ خود سراپا جذبۂ عشق بن گیا اور وہ ایسے مقام پر پہونچ گئے جس کے آگے کوئی مقام نہیں ؂

اوّل اوّل ہر قدم پر تھیں ہزاروں منزلیں　　　آخر آخر اک مقامِ بے مقام آ ہی گیا

ان کا خیال تھا کہ مشاہدہ صرف اپنی ہی ذات کا ہوا کرتا ہے اپنی ذات سے ہٹ کر کسی چیز کا مشاہدہ لایعنی ہے ؂

یہ محفلِ ہستی بھی کیا محفلِ ہستی ہے　　　جب کوئی اٹھا پردہ میں خود ہی نظر آیا ہوں

اللہ رے کمالِ خودی کی یہ وسعتیں　　　میرا ہی سامنا ہے جدھر دیکھتا ہوں میں

آئینہ خانۂ عالم میں کہیں کیا دیکھا　　　تیرے دھوکے میں خود اپنا ہی تماشا دیکھا

کیسا مجاز اور کیسی حقیقت　　　اپنے ہی جلوے اپنے ہی سامنے

باتیں ہیں دو مقصود ہے ایک　　　تیری طلب یا اپنی طلب

ہزار جانِ گرامی فدا ہو اس نسبت　　　کہ میری ذات سے اپنا پتا دیا تو نے

میں عشق ہوں مکمل میں تفریق ہوں مسلسل　　　گویا تمام عالم میری ہی داستاں ہے

جگر نے عشق کو کہیں خالقِ حسن مانا ہے اور کہیں اصل حقیقت محض حسن کو بتایا ہے اور کہیں حسن و عشق دونوں کو مستقل ہستیاں سمجھا ہے اور کہیں حسن و عشق کی حقیقت کو ایک ادراک کی شانوں کو مختلف بتایا ہے مثلاً

جگہ یار خود تڑپ اٹھی　　　شرطِ اوّل عتاب ہونا تھا

حسن بے تاب تجلی خود ہے لیکن اے جگر　　　ایک ہلکا سا حجابِ چشمِ حیراں چاہیئے

حسن میں بیشک کہ یہ شانِ خود آرائی نہ تھی　　　عشق میں مستی تھی لیکن خوئے رسوائی نہ تھی

عشق کیا ہے پرتوِ حسنِ تمام　　　شوق کیا ہے حسن کا عکسِ شباب

حسن بے قید ہی عشق بھی محدود نہیں　　　مجھ کو پاتیں گے جہاں تک وہ نمایاں ہوں گے

جس رنگ میں دیکھو اسے وہ پردہ نشیں ہے　　　اور اس پہ یہ پردہ ہے کہ پردہ ہی نہیں ہے

وہی ہے عشق، وہی حسن ہے وہی سب کچھ　　　مگر کسی سے کسی کا جواب ہو نہ سکا

جب عشق اپنے مرکزِ اصلی پہ آ گیا　　　خود بن گیا حسین دو عالم پہ چھا گیا

یہ حسن ہے کیا! یہ عشق ہے کیا! کس کو ہے خبر اس کی لیکن

بے جام ظہورِ بادہ نہیں، بے بادہ فروغِ جام نہیں

تجدِ عشق معتبر یہ کسی کو خبر نہیں
ایسا بھی حسن ہے جو بقید نظر نہیں

جگر نے بعض اشعار میں اپنی اجتہادی آرٹ کی بدولت حسن و عشق دونوں کو الگ الگ ہستیاں تسلیم کرنے کے بجائے دونوں کو ایک ہی محور پر لے آئے ہیں مثلاً

حسن سے عشق جدا ہے نہ جدا عشق سے حسن
کون سی شے ہے جو آغوش کش و آغوش نہیں

عشق کا سحر کامیاب ہوا
میں ترا تو مرا جواب ہوا

تیرا کمالِ عشق ہے تو ہی کمالِ عشق ہے
اپنے سوا کسی طرف آنکھ اٹھا کے بھی نہ دیکھ

اس طرح نہ ہوگا کوئی عاشق بھی تو پابند
آواز جہاں دو آئے وہ شوخ وہیں ہے

جگر کے صوفیانہ کلام میں وجدان کی سرمستی بھی ملتی ہے۔

پھر کے دیکھوں اگر سینۂ مستیٔ عشق
توڑ کے رکھ دوں ابھی آئینۂ مہر و ماہ

ہر پردۂ ہستی میں جب تو متشکل ہے
حیراں ہوں یہ جلوہ پھر کون باطل ہے

کیا چیز ہے کل عالم کیا چیز مرا دل ہے
حیرت کا اک آئینہ حیرت کے مقابل ہے

وہ بزم تماشا بھی کیا بزم تماشا ہے
جو جلوہ ہے پیدا ہے جو پردہ ہے اٹھا ہے

جگر کے یہاں تصوریت کا عنصر بھی پایا جاتا ہے۔

گم ہو کے تو گم ہو جا بطریقۂ بے خبری
یہ کل جہاں ہے فریب تجلیٔ نظری

صحرا ہے نہ بستی ہے دریا ہے نہ ساحل ہے
جو کچھ نظر آتا ہے یہ شعبدۂ دل ہے

جگر نے مندرجہ ذیل اشعار میں ایک نئی حقیقت کے ساتھ ساتھ اپنے فکر و وجدان میں گہرائی اور معنویت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے ؎

یہ سب نمود نمائش ہے تیرے جلوے سے
جو ترے پردے میں ہوتا تو میں کہاں ہوتا

ذرّے ذرّے سے نمایاں شانِ ہستی دیکھ کر
کھل گئیں آنکھیں طلسم حسن فطرت دیکھ کر

ہر چیز پہ پڑتی ہیں تحیر کی نگاہیں
چھایا ہوا ہے سلسلۂ بے خبری سے

ان کے یہاں موضوعی تصوریت کا داخلی معیار بھی پایا جاتا ہے ؎

چشم نظر پرست میں جس کا جہاں نام ہے
حسن تمام یار کا جلوۂ ناتمام ہے

خود ضیا بار ہو اک جلوۂ مستور نہ ہو
آئینہ خانۂ عالم میں کہیں نور نہ ہو

"مسرت" کے معاملہ میں وجدان ہماری رہنمائی کرنے سے قاصر ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں ؎

کام نہ آئیں عقل کی عقدہ کشائیاں جگر
اور اضافہ ہو گیا سلسلہ ہائے راز میں

اس جلوۂ تمام کی ہم کو خبر ہی کیا
اک ناتواں سا رشتۂ تارِ نظر ہی کیا

جگر کی عملی اور نظری مسرت بھی بالترتیب ملاحظہ فرمایئے۔

اب اس صورت سے کیا آئیں تیرے آئینہ خانے میں
تری تصویر ہی بن کر تری تصویر دیکھیں گے

تیری ہر اک شان کے شایاں بنا دیا
انساں کو دردِ عشق نے انساں بنا دیا

ہم سے پوچھو وہ کہاں ہے اور کس مسکن میں ہے　　درد کی بیتابیوں میں قلب کی دھڑکن میں ہے
سراپا دید ہو کر غرقِ موجِ نور ہو جانا　　ترا ملنا ہے خود ہستی سے اپنی دور ہو جانا
اک شاہدِ بے ثانی اک پیکرِ محبوبی　　ہر درد میں شامل ہے ہر سانس میں پنہاں ہے
ایک نقشے کا اگر حسن نمایاں ہو جائے　　آدمی شدتِ افکار سے حیراں ہو جائے
اگر نہیں پسِ پردہ کوئی حقیقت میں　　یہ کون بول رہا ہے طلسمِ صورت میں

ان کے صوفیانہ تجربات بھی ملاحظہ فرمائیے ؎

تفسیرِ حسن و عشق جگر مصلحت نہیں　　افشائے رازِ قطرہ و دریا نہ کیجئے
لفظ و معنی میں نہیں جلوۂ و صورت میں نہیں　　عشق اک چیز ہے جو حرف و حکایت میں نہیں

جگر کے کچھ خالص وجدانی اشعار بھی دیکھئے ؎

یہ کیا کیا کہ عطا کر کے عشقِ لامحدود　　مجھے حریفِ مقابل بنا دیا تو نے
کچھ اس طرح وہ پسِ پردۂ مجاز رہے　　حجاب سازِ میں جیسے نوا کے ساز رہے
اس بزمِ حقیقت کی حقیقت میں کہوں کیا　　نغموں کا تلاطم تو ہے آواز نہیں ہے

اب تصوف سے متعلق مختلف موضوعات پر جگر کے کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیے جن سے ان کے لطیف مختلف نظریات کا پتہ چلتا ہے ؎

کثرت میں بھی وحدت کا تماشا نظر آیا　　جس رنگ میں دیکھا تجھے یکتا نظر آیا
جب دیکھ نہ سکتے تھے تو قطرہ بھی تھا دریا　　جب آنکھ کھلی قطرہ بھی دریا نظر آیا
وارفتگیٔ شوق کا اللہ رے کمال　　جو بے خبر ہوا وہ بڑا باخبر ہوا
کون مجھ پا سکے کس کی ہے یہ دستگاہ　　عشق سر گم کردہ ہوش عقل سر گم کردہ راہ
سنتا ہوں کہ ہر حال میں وہ دل کے قریں ہے　　جس حال میں ہوں اب مجھے افسوس نہیں ہے
مجھ سے کوئی پوچھے ترے ملنے کی ادائیں　　دنیا تو یہ کہتی ہے کہ ممکن ہی نہیں ہے
فنا کے دل سے ہر اک نقشِ دل نشیں میں نے　　تجھے بھی دیکھ لیا پا لیا یہیں میں نے
اسی تلاش و تجسس میں کھو گیا ہوں میں　　اگر نہیں ہوں تو کیونکر؟ جو ہوں تو کیا ہوں میں
من بہ پنہاں جگر تلاشش کنم　　او مگر آشکارہ می آید
اغیار بہ دل خندہ تن و دل بتو مشغول　　خلق پسِ دیوانہ و دیوانہ بکارے
کوئی مانے نہ مانے اس کو، لیکن یہ حقیقت ہے　　ہم اپنی زندگی میں غیب کو شامل سمجھتے ہیں
فضائے کعبہ ہو یا سرزمینِ بت خانہ　　ترے سوا نہ حقیقت نہ کوئی افسانہ
جب تجھے دیکھ کر کونین کی وسعت دیکھی　　حسن ہی حسن محبت ہی محبت دیکھی
تسکین مدعا جب نہ کسی طرح ہو سکی　　سب اپنی اپنی دھن میں لگے کچھ پکارنے
اپنا ہی عکس پیشِ نظر دیکھتے رہے　　آئینہ روبرو تھا جدھر دیکھتے رہے
میں نے دیکھا ہے سرِ دیر و حرم تجھ کو جگر　　میں نے پایا ہے جبینِ حرمِ ناز کے
عالم ہمہ پر ز جلوۂ دوست　　اے وائے نگاہِ نارسیدہ

زندگی ہے ترے فراق کا نام　　اور تو زندگی سے دور نہیں
عینِ ایماں ہے انا الحق کا ترانہ لیکن　　ہے یہی کفر، اگر دیدۂ منصور نہ ہو

ان اشعار میں جو جذب و سرور، کیف و مستی اور عرفان و بصیرت ملتی ہے وہ اس کی گواہی دیتی ہے کہ جگر اہلِ دل تھے اُن کی شاعری میں دماغ بہت ہی کم، زیادہ تر "دل" شریک ہے۔

ماہرالقادری

یادِ رفتگاں

نیاز فتحپوری

میری عمر بہت سے بہت تیرہ چودہ سال کی ہوگی، مجھے یاد پڑتا ہے کہ نیاز صاحب کی ایک دو نظمیں رسالوں میں میری نگاہ سے گزری تھیں، اس کے بعد ۱۹۲۶ء میں رسالہ نگار کے دو چار شمارے کسی کے یہاں پڑھنے کو مل گئے، مضامین کی ترتیب و تنوع اور ایڈیٹر کے انداز نگارش نے وجدان و طبیعت کو چونکایا اس زمانہ تک میرا مطالعہ انتہائی محدود تھا، اس سے پہلے کانپور کے ماہنامہ "زمانہ" بدایوں کے "نقیب" و "نقاش" اور الٰہ آباد کے رسالہ "ادیب" کے چند شمارے پڑھ چکا تھا! یہ وہ دور تھا کہ کسی ادیب و انشاء پرداز کی تحریر میں —— علو تحدید مراتب، شعلہ مستعجل، ما بہ الاشتراک، العشق دجہ البصیرت —— جیسی ترکیبیں نظر آئیں تو ذہن مرعوب ہو جاتا! ۱۹۲۷ء میں قصبہ ڈبائی ضلع بلند شہر کے شاعر عاشق ڈبائوی صاحب نے مجھ سے اُردو کے کسی رسالہ کی خریداری کا مشورہ کیا، تو میں نے چھوٹتے ہی "نگار" کا نام بتایا اور وہ نگار کے خریدار بن گئے!

۱۹۲۸ء میں سب سے پہلی بار حیدرآباد دکن جانا ہوا، وہاں دارالمطالعہ بھی تھے، آصفیہ لائبریری بھی اور گشتی کتب خانہ بھی! مطالعہ کی کوئی حد و نہایت نہ رہی، جو کتاب بھی مل گئی اُسے پڑھ ڈالا! رسالہ نگار بھی نگاہ سے گزرتا رہا، یہ تقریباً وہ زمانہ ہے جب نیاز فتحپوری نے بڑی شدت کے ساتھ "مولوی" اور "مولانا ازم" پر طعن و طنز کی شدید بوچھاڑ شروع کر دی تھی "سوطنز کا دوسرا قدم" "اسلامی فقہ" کا مذاق اڑانا اور بعض دینی معتقدات بلکہ مسلمات کو مجروح کرنا تھا، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک دن شام کے وقت مہاراجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنت صدر اعظم حکومت حیدرآباد کے دربار میں ہوش بلگرامی[1] نیاز صاحب کا وہ مضمون مزے لے لے کر سنا رہے تھے، جس میں "جنت" کا مذاق اُڑایا گیا ہے۔

---

[1] ناظر الحسن نام تھا ہوش تخلص، بلگرام کے رہنے والے تھے اور اپنے نام کے ساتھ "سید" لکھتے تھے، بڑی بذلہ سنج اور ظریفانہ طبیعت پائی تھی، دربا‌سداری کے فن میں طاق! کئی سال نواب حامد علی خاں والیٔ رام پور کے مصاحب رہے، پھر حیدرآباد دکن میں مہاراجہ سرکشن پرشاد اور دوسرے امراء کے دربار میں اپنی بذلہ سنجی کے سبب باریابی اور قرب حاصل کیا، نیاز فتحپوری سے بڑا یارانہ تھا، نیاز صاحب کو بار ہا حیدرآباد بلایا، اور امراء سے ہزاروں روپیہ دلوایا!

ناظر الحسن ہوش بلگرامی نے حیدرآباد دکن سے ماہنامہ "ذخیرہ" نکالا، جو کچھ دنوں کے بعد بند ہو گیا، اس ماہنامہ کا خاصہ بلند معیار تھا، پھر ہوش صاحب کے لئے ناظم پشہ (پوسٹ ماسٹر جنرل) کے دفتر میں سیونگ بنک کے انسپکٹر کی خاص طور سے پوسٹ بنائی گئی، دو سو روپیہ ماہوار کے قریب تنخواہ تھی، مگر اس زمانے میں وہ بنگلہ میں رہتے اور سواری کے لئے فٹن رکھتے، ماہانہ مصارف پانسو روپیہ سے کیا کم ہوں گے! ہوش صاحب کے ٹھاٹ باٹ کا یک عمل میں حربائی صـ۲ پر ۲

(غالباً) ۱۹۲۳ء میں نیاز صاحب کو میں نے زندگی میں سب سے پہلا خط لکھا، خط لکھنے کی تقریب میری ایک نظم تھی، جو میں نے "نگار" میں چھپنے کے لئے ان کی خدمت میں بھیجی تھی۔ اس کے جواب میں اُن کا کارڈ حیدرآباد دکن کا لکھا ہوا میرے نام آیا کہ آپ کی نظم خوب ہے، نگار میں چھپے گی، آپ مجھ سے ہوش بلگرامی صاحب کے یہاں آکر ملئے! کارڈ ملنے کے دوسرے دن میں اُن سے جاکر ملا، ملے تو وہ تپاک کے ساتھ مگر اُن کا انداز ملاقات بتا رہا تھا کہ وہ دیر آشنا اور کم آمیز واقع ہوئے ہیں! انہی دنوں مہاراجہ کشن پرشاد بہادر کے یہاں طرحی مشاعرہ ہوا، جو بلی جل پڑا اُن کے نو تعمیر بنگلہ میں، حسن اتفاق سے حضرت ناطق لکھنوی مرحوم بھی حیدرآباد آئے ہوئے تھے، نیاز فتحپوری اس مشاعرے میں شریک ہوئے مگر انہوں نے غزل نہیں پڑھی، سب سے اچھی غزل ناطق صاحب

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۳) ذکر آیا تو مولانا مفتی عبدالقدیر بدایونی مرحوم نے بڑے مزے اور بے تکلفی کی بات کہی جو لطیفہ کے طور پر آج تک بیان کی جاتی ہے کہ:-

"ہوش صاحب کو قرضہ کی خاصی آمدنی ہے"

مہاراجہ کشن پرشاد کے علاوہ نواب سالار جنگ بہادر اور مہاراجہ دھن راج گیر کے یہاں سے بھی ہوش صاحب کو "مالی فتوحات" ہو جاتی، اس کے بعد وہ محکمہ فوج میں مددگار معتمد (ڈپٹی سکریٹری) ہو گئے، اور کئی سال بڑی محنت اور قابلیت کے ساتھ سرکاری فرائض انجام دئے، سینکڑوں صفحوں کی پرانی مسلوں (فائلوں) کا خلاصہ چند صفحوں میں کر دیتے، نواب صمد یار جنگ بہادر جو محکمہ فوج کے سکریٹری (معتمد) تھے، ہوش صاحب کی ذہانت، سلیقۂ تحریر اور معاملہ فہمی سے بہت متاثر تھے۔

نواب اعظم جاہ بہادر اور نواب معظم جاہ بہادر کی نئی نئی شادیاں ہوئی تھیں اور وہ باپ (حضور نظام) کے پابند ماحول کی بجائے "بلاروستا" کی آزاد فضا میں رہنے لگے، ہزاروں روپیہ ماہوار کی تنخواہیں مقرر ہو گئیں، ہوش بلگرامی بھی اُن کے یہاں حاضری دینے لگے اور کہا جاتا ہے کہ "تعارف دربار یابی" کا آغاز "کھانوں" سے ہوا، ہوش صاحب کو انواع و اقسام کے اچھے سے اچھے کھانے پکوانے کا بڑا شوق اور تجربہ تھا، شہزادوں کے یہاں ہوش بلگرامی نے طرح طرح کے لذیذ و نفیس کھانے بھجوائے، اس کی خبر نواب میر عثمان علی خاں والیٔ دکن کو بھی ملی، حضور نظام کے ایما پر ہوش صاحب ایک دن کئی نوع کے کھانے کنگ کوٹھی مبارک میں لے کر حاضر ہوئے، کھانوں سے زیادہ ہوش صاحب کی بذلہ سنجی نظام دکن کو پسند آئی اور اس دن سے وہ روزانہ دربار شاہی میں حاضری دینے لگے۔

تمام درباریوں اور مصاحبوں میں نظام دکن کے سب سے زیادہ مزاج شناس ہوش بلگرامی تھے۔ اس لئے شاہانہ عتاب کی کبھی نوبت نہیں آئی۔ قدرت نے اس شخص کو درباداری کے لئے ہی شاید پیدا کیا تھا۔

فرماں روائے دکن نواب میر عثمان علی خاں نے جب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا معائنہ کرنے کے لئے سفر کیا تو اس سفر میں ہوش بلگرامی اُن کے ہم رکاب تھے، اس سفر کی روداد انہوں نے "روزنامہ رہبر دکن" میں چھپوائی اُن کے مضامین کی ترتیب و تسوید میں مشہور شاعر علی اختر مرحوم کے قلم کو بہت کچھ دخل تھا،

علی اختر مرحوم سے ہوش بلگرامی کے گہرے تعلقات تھے، محکمہ تعمیرات میں ہوش صاحب ہی کی سعی و سفارش سے وہ مددگار معتمد (ڈپٹی سکریٹری) بنے، تنخواہ ایک ہزار سے کچھ زیادہ ہی ہو گی! جناب جوش ملیح آبادی سے ہوش بلگرامی کی صفائی نہ تھی! نیاز فتحپوری نے جوش صاحب کے کلام پر "نگار" میں جب مفصل تنقید کی تو یہ تک لکھ دیا کہ علی اختر بھی جوش صاحب سے اچھا کہتے ہیں۔

ہوش بلگرامی کو خسرو دکن نے پھر "ہوش یار جنگ" کا خطاب عطا فرمایا اور وہ محکمہ تعمیرات کے معتمد (سکریٹری) ہو گئے! اب وہ دفتری امور میں بہت کم دلچسپی لیتے تھے، سارا کام علی اختر صاحب پر چھوڑ رکھا تھا، علی اختر صاحب انتہائی دیانت دار تھے، مگر ہوش صاحب کے شاہانہ مصارف کے لئے تحریر آمدنی کی ضرورت تھی، صرف تنخواہ میں نوابی ٹھاٹ باٹ کے لئے کہاں پورا پڑ سکتا تھا۔

دربار شاہی میں تقرب کے سبب ہوش بلگرامی کی شخصیت بڑی ممتاز سمجھی جاتی تھی، بعض لوگ پیٹھ پیچھے ہوش صاحب کو چاہے "درباری مسخرہ" کہتے ہوں مگر سامنا ہوتا، تو جھک کر ملتے! سر اکبر حیدری ہوں یا نواب صاحب چھتاری اور غلام محمد صاحب (گورنر جنرل پاکستان، جو حیدرآباد میں وزیر مالیات تھے) ہوں یا

(بسلسلہ حاشیہ ص ۳۵ پر)

کی بس دو شعر یاد رہ گئے ہیں۔

اس اہتمام سے مجھ کو فلک وقار کیا — جلا کے خاک کیا، خاک کو غبار کیا
یہ دو سبب ہوئے اے دل تری تباہی کے — کہ اس نے وعدہ کیا تو نے اعتبار کیا

میری غزل کا بس یہ شعر کچھ غنیمت تھا۔

دل حزیں! تری سب زہد کوششیں معلوم — جو کوئی بس نہ چلا، صبر اختیار کیا

میری نظم "تتلی" کے بعد ماہنامہ "نگار" میں میرا کلام وقتاً فوقتاً چھپتا رہا (غالباً) ۱۹۴۹ء میں نیاز صاحب حیدرآباد تشریف لائے تو ان سے ملنا ہوا تو بولے کہ آپ کی ایک نظم پر نگار میں تنقید آرہی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ اگر تنقید میں کچھ باتیں محض نظم پر تھیں تو کیا ان پر بحث و گفتگو کو آپ نگار میں شائع

(بقیہ حاشیہ ص ۳۵) کوئی اور بڑے عہدیدار ہوش صاحب کی دعوتوں میں ان کی دل دہی کے لئے تمام اکابر حیدرآباد شریک ہوتے تھے ان سے ربط و تعلق قائم رکھتے۔
ایک چھوٹے چار بیبیاں، نفیس کوٹھی، دیدہ زیب فرنیچر، شاندار موٹر، چاندی کے پاندان سے لیکر پرنٹر کے قالین تک ہر چیز میں انتہا درجہ کی صفائی اور سلیقہ، راقم الحروف سے ہوش صاحب کی خاصی بے تکلفی تھی۔ اپنی ہر چیز کی تعریف کرنے اور سننے کا شوق تھا، ایک دن مجھ سے کہنے لگے —
ماہر صاحب! یہ جو میرے مکان کی صدر محراب ہے، کئی امریکی سیاح اس کے فوٹو لے گئے ہیں!

ساحل بلگرامی مرحوم ہوش صاحب کے چھوٹے بھائی تھے، شہر حیدرآباد کی بلدیہ (کارپوریشن) میں ہوش صاحب نے ٹیکس کلکٹر کرا دیا تھا، ٹھکانے سے رہتے تو بڑی ترقی پاتے، مگر وہ دو تین ہزار روپیہ کا غبن کر کے حیدرآباد سے فرار ہو گئے، یہ رقم بعد میں ہوش صاحب کو بھرنی پڑی۔

حکومت حیدرآباد کے زوال کے بعد ہوش بلگرامی نے بھارت کے نیتاؤں کی خوشنودی کے لئے ایک کتاب لکھی جس میں حضور نظام جو ان کے مربی اور محسن تھے، ان پر خوب خوب پھبتیاں کسیں اور قصر و ایوان کی پردے اسرار کی باتوں کو قلم کے ذریعہ منظر عام پر لائے! مگر اس کتاب نے ہندوستان کے ارباب اقتدار کے یہاں بار پانے اور رسائی حاصل کرنے میں ہوش صاحب کی مدد نہیں کی۔

ہوش بلگرامی کا انتقال ایسے عالم میں ہوا کہ وہ اپنی پچھلی قدر و منزلت کے آثار ڈھونڈتے تھے مگر کہیں نظر نہ آتے تھے، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

(حاشیہ ص ۳۴ سطر) ——— اس نظم کو بھیجتے ہوئے میں نے نیاز فتحپوری کو لکھا کہ تتلی اور تیتری دونوں طرح بولا اور لکھا جاتا ہے آپ جس لفظ کو پسند فرماتے ہوں، نظم کا "عنوان" بنا دیں! انہوں نے "تیتری" پسند کیا۔ دلی میں بھی زیادہ تر "تیتری" ہی بولا جاتا ہے مگر میں "تتلی" کو صوتی لطافت اور نغمگی کی بنا پر ترجیح دیتا ہوں اور اس ترجیح پر مجھے اصرار ہے! میری ایک دوسری نظم کا ایک شعر ہے۔

ہواؤں میں اڑتی ہوئی تتلیاں — پلک مارتے میں یہاں سے وہاں

سلہ مہاراجہ سرکشن پرشاد کی ایک مثنوی ہے، جس میں اکبر یا جہانگیر میں سے کسی ایک بادشاہ کا واقعہ نظم کیا گیا ہے، رواداری اور ہندو مسلم اتحاد اس نظم کا مرکزی تخیل ہے اس نظم کی فلم بنانے کے لئے ایک کمیٹی قائم ہوئی اور ہوش بلگرامی کے مشورے اور سفارش سے نیاز فتحپوری کو اس کے مکالمے لکھنے کے لئے حیدرآباد دکن بلایا گیا، تنخواہ غالباً ساڑھے تین سو روپیہ ماہوار قرار پائی رہنے کے لئے مکان اس کے علاوہ، نیاز صاحب نے کئی مہینے بلدہ حیدرآباد میں قیام کیا "نگار" کے کاتب کو بھی انہوں نے لکھنؤ سے حیدرآباد بلا لیا تھا مگر یہ فلم تھوڑی سی بن کر رہ گئی۔ (یہ ۱۹۴۱ء سے آٹھ سال قبل کا واقعہ بیان کر رہا ہوں)

علی اختر مرحوم اور میں شام کے وقت اکثر نیاز صاحب کی قیام گاہ پر جایا کرتے تھے، ایک دو گھنٹہ تاش کا شغل رہتا، نیاز صاحب کو تاش سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی ہماری خاطر وہ کھیل میں شامل ہو جاتے اور "کٹ تھروٹ" میں بار بار غلطیاں کرتے۔ یہ ۱۹۳۲ء کا ذکر ہے، حضرت فانی بدایونی علامہ الطاف کی پہلی ملاقات نیاز صاحب کی قیام گاہ پر ہوئی ہوش بلگرامی انہیں مہاراجہ کشن پرشاد کے یہاں سے اپنی کار میں لے گئے تھے۔

فرمائیں گے، بولے، ضرور...... اسی لئے تو تنقید کا یہ سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔ چند ماہ کے بعد میرا آگرہ آباد (گجرات) جانا نکل آیا، وہاں ایک مشاعرہ تھا، ایک صاحب نے مجھے اُس مہینہ کا نگار لا کر دیا۔ جس میں میری نظم پر "مالہ و ماعلیہ" کے تحت نیاز صاحب نے تنقید فرمائی تھی، یہ تنقید پڑھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی، بعض اعتراضات بالکل سطحی بلکہ غلط تھے، مثلاً میں نے "بادہ ہائے ناب" نظم کیا تھا، اس پر نیاز صاحب نے یہ اعتراض بلند کیا کہ "بادہ ناب" کی جمع نہیں آتی، میں نے اس کے جواب میں غالب کی "مسلسل غزل" کا یہ مصرع ثبوت میں پیش کیا۔

وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے

اسی طرح بعض دوسرے اعتراضات کا دلیل کے ساتھ جواب دیا گیا مگر نیاز صاحب نے میرا یہ خط نگار میں شائع نہیں فرمایا۔ میں نے یاد دہانی بھی کی، لیکن شنوائی نہیں ہوئی، آخر کار، ماہنامہ شاعر میں جو اُن دنوں آگرہ سے نکلتا تھا، میں نے اپنا یہ خط چھپوا دیا۔

نیاز صاحب سے میرے مراسم بس اسی حد تک تھے کہ میں نے کوئی نظم یا غزل اُن کے یہاں چھپنے کے لئے بھیج دی اور انہوں نے رسید کے طور پر خط لکھ دیا... اپنے رسالہ میں "مالہ و ماعلیہ" کے تحت انہوں نے میری کتنی ہی غزلوں اور نظموں پر تنقید فرمائی اور شاقب کانپوری کی ایک غزل پر تنقید کرتے ہوئے اس کا اعلان کیا کہ میں اُن شاعروں کے کلام پر تنقید کرتا ہوں جن کو اپنے نزدیک بلند یا صف اول کا شاعر سمجھتا ہوں (الفاظ ٹھیک طرح ذہن میں محفوظ نہیں رہے، مفہوم یہی تھا۔)

پاکستان بننے کے (غالباً) چار پانچ سال بعد نیاز صاحب یہاں تشریف لائے اور "پاک و ہند مشاعرے" کی صدارت فرمائی، جگر، جوش، فراق حفیظ جالندھری جیسے خوش فکر شعراء اس مشاعرے میں شریک تھے انہی دنوں نیاز صاحب نے اپنے تمام دانت نکلوا دئے تھے، جس کے سبب وہ بوڑھے سے نظر آتے تھے حالانکہ صحت اچھی تھی اور قوا ایسے تھے، جیسے ادھیڑ عمر والے کے ہوتے ہیں: ان دنوں یہ اطلاع بھی کئی حضرات سے سننے میں آئی کہ اُس وقت کی حکومت نیاز صاحب کو پاکستان اس غرض سے بلانا چاہتی تھی کہ یہاں آکر وہ دین، اہل قلم اور اسلام پسند دانشوروں کے توڑ پر "آزاد خیالی اور تجدد" کا رنگ پیدا کریں گے مگر نیاز صاحب نے لمبے چوڑے مطالبے اور شرطیں پیش کیں، جس کے سبب معاملہ پٹ نہ سکا، یہ بھی سننے میں آیا کہ حکومت کو بعض مشیروں نے یہ مشورہ بھی دیا کہ نیاز صاحب دینی حلقوں میں بدنام ہیں، اُن کے لکھے ہوئے مضامین اس بناء پر زیادہ کارگر نہ ہو سکیں گے!

اس مشاعرے کے بعد وہ اپنے عزیزوں سے ملنے اور ساتھ ہی یہاں کے ماحول اور فضا کا جائزہ لینے کے لئے ایک دو بار آئے، بشیر فاروقی صاحب کے ——— یہاں ان کے اعزاز میں ایک بزم مشاعرہ برپا ہوئی، میں نے بھی اس میں شرکت کی پھر وہ ۱۹۶۲ء میں مستقل طور پر پاکستان آگئے، یہاں ان کی جو پذیرائی ہوئی وہ اُن کی توقعات سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھی، کئی اداروں سے اُن کا علمی تعلق تھا، ماہانہ آمدنی تین ہزار روپیہ سے کیا کم ہوگی، سب سے زیادہ فائدہ اُنہیں نیشنل بنک پاکستان کے ناظم اعلیٰ جناب ممتاز حسن کی ذات اور واسطے سے پہونچا، ممتاز صاحب بڑے علم دوست اور اہل علم کے قدردان واقع ہوئے ہیں اور خود بھی صاحب علم و فضل ہیں، نیاز صاحب کو اس کا ملال تھا کہ پاکستان بہت پہلے وہ کیوں نہیں آگئے!

لکھنؤ میں وہ عام طور پر مشاعروں اور جلسوں میں شرکت سے گریز ہی کرتے تھے۔ مگر کراچی کی متعدد ادبی و شعری نشستوں میں اُنہیں دیکھا گیا، دو تین جگہ انہوں نے اپنے شعر بھی سنائے، اُن کی اس غزل پر جس کا ایک شعر یہ ہے۔

چشم تر ہے اِس طرف اور اُس طرف ابر بہار
دیکھنا ہے آج کس سے، کتنا برسا جائے ہے

ایک نشست میں بہت داد ملی! انجم صدیقی صاحب مدیر "شاعر" (بمبئی) کراچی تشریف لائے، تو ایک ادبی محفل میں اُن کی مدح میں نیاز صاحب نے ایک نظم پڑھی! پاکستان میں آکر اُن کی خلوت پسندی اور کم آمیزی میں "جلوت" کا خاصہ رنگ پیدا ہو گیا۔

پاکستان میں مالی فراغت اور ہر طرح کے آرام و راحت سے وہ پوری طرح لطف اندوز بھی نہ ہونے پائے تھے کہ "کینسر" جیسے موذی مرض میں مبتلا

ہو گئے، قیمتی سے قیمتی علاج جو کراچی میں ممکن ہو سکتا تھا اور میسر آسکتا تھا، ہوا، مگر مرض بڑھتا ہی چلا گیا، ایک سال سے حالت بہت غیر تھی ہسپتال میں داخل ہوئے تو آپریشن ہوا، جسے بہت کامیاب بتایا گیا، اُن کے احباب اور قدردان "جشن صحت" کا اہتمام کر رہے تھے، مگر یہ ان کا دراصل سنبھالا نکلا۔ اور اسی مرض نے آخر کار، اُنہیں اُس دنیا میں پہونچا دیا، جس کے بارے میں مظفر علی اسیر لکھنوی نے فرمایا ہے :-

مُردہ سُنتا ہی نہیں چپلا کے روتے ہیں عزیز
دم میں کتنا فصل اللہ اکبر ہو گیا

اخباروں اور رسالوں اور بہت اور ادب نوازوں نے اُن کی تعزیت کی اور ادبی خدمات کا اعتراف بھی، یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے :

اعتراف جناب نیاز فتحپوری کے قلم نے نصف صدی سے بھی زیادہ مدت تک زبان و ادب کی خدمت انجام دی ہے! وہ بہت سی کتابوں کے مصنف، مولف اور مترجم ہیں، افسانہ، شاعری، تنقید، جنسیات، مذہب، معاشرت، معاشیات، سیرت، تذکرہ، غرض زبان و ادب کی ہر صنف میں اُن کی قلمکاری کے نمونے ملتے ہیں، یہ دلیل ہے ان کے مطالعہ کی وسعت اور ذہانت وہمہ گیری کی! اُن کا رسالہ "نگار" پاکستان اور ہندستان کے صف اول کے مجلوں میں شمار کیا جاتا ہے، کیسے کیسے شاندار "خاص نمبر" اس رسالہ کے شائع ہو کر مقبول خاص و عام ہوئے ہیں، "نگار" کو دبستان فکر و ادب سمجھ کر بہت سے ادیبوں اور ادب نوازوں نے اس سے استفادہ کیا ہے، اُردو ادب کی تاریخ لکھتے وقت نیاز کا بڑے سے بڑا مخالف بھی اُن کے نام اور کام کو نظر انداز نہیں کر سکتا... "نگار" کے "نیاز نمبر" میں ہندستان اور پاکستان کے مشہور ادیبوں اور انشا پردازوں نے نیاز کو خراج تحسین و عقیدت پیش کیا، ہندوستانی حکومت نے ان کی ادبی خدمات کا اعتراف اس طرح کیا کہ "پدم بھوشن" کا اعزاز دیا۔

نیاز فتحپوری کی خانگی زندگی مطمئن اور خوشحال گزرتی، معاش واقتصاد کے معاملات میں خاصے محتاط تھے، پھونک پھونک کر پاؤں پھیلاتے تھے — ان میں انتظامی قابلیت بھی تھی، اس لئے رسالہ "نگار" اور ان کی مطبوعات سے انہیں ہمیشہ فائدہ ہی ہوا۔ رنگ رنگ، شراب، کباب اور اس قسم کے دوسرے کھیلوں کی جانب اُن کے مزاج و طبیعت کا میلان نہ تھا۔ کتابوں کا مطالعہ اور تحریر و انشاء ہی اُن کی سب سے بڑی تفریح اور دلچسپی کا سامان تھی! لکھنؤ[1] رئیسوں لیڈروں اور تعلقہ داروں کا شہر ہے مگر نیاز صاحب نے اپنی ادبی شہرت کو اُن کے یہاں باریابی حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں بنایا اپنی قوتِ بازو پر ہمیشہ اعتماد کیا اور قلم کے ذریعہ روزی کمائی! اور چین آرام کی زندگی بسر کی!

دوسرا رُخ نیاز فتحپوری دنیا کے شاید پہلے اور ممکن ہے آخری انشاء پرداز ہوں، جن کی تصنیف و تالیف کی حیثیت بہت مشتبہ ہے! اُن پر اہل نقد و نظر نے "نقل بسرقہ" کے الزامات لگائے ہیں اور اُن الزامات کی صحت کے لئے ثبوت پیش کئے ہیں! اُن کی کتاب "تاریخ الدولتین" مشہور مستشرق جرجی زیدان ایڈیٹر الہلال (مصر) کی عربی تاریخ "التمدن الاسلامی" کی جلد چہارم کی تمام تر تلخیص ہے، اُن کی "صحابیات" دارالمصنفین کی "سیرت الصحابیات" کا چربہ ہے، "ترغیبات جنسی" ۱۹۳۰ء کے نگار کا سالنامہ جو "شہوانیات" سے متعلق تھا اس میں چھپ کر آیا ہے... انہیں سے حاصل ہے مگر اس "نقل واستفادہ" کا ذکر نہیں فرمایا ——— اسی طرح اُن کی بعض دوسری کتابوں اور مضامین میں اس قسم کا توارد ملتا ہے جسے "سرقہ" کہا جائے تو یہ کوئی خلاف واقعہ یا مبالغہ آمیز بات نہ ہوگی! جب میرا حیدرآباد دکن میں قیام تھا، تو جامعہ عثمانیہ کے ایک ایم۔ اے کے طالبعلم نے مجھ سے ذکر کیا کہ میں نے ایک افسانہ ماہنامہ نگار میں چھپنے کے لئے بھیجا تھا۔ اس کی رسید تک نیاز صاحب نے نہیں بھیجی، یاد دہانی کی، اُس کا بھی کوئی جواب نہ ملا، ڈیڑھ دو سال کے بعد میرا وہی افسانہ تھوڑے بہت تغیر کے بعد نیاز صاحب کے نام سے "نگار" میں شائع ہوا......"

۱۹۵۶ء میں مجلہ نگار کا سالنامہ "خدا نمبر" کے نام سے منظر عام پر آیا اور ادبی حلقوں میں اس کی بڑی دھوم مچ گئی تھی اس خاص شمارے کی ترتیب و تدوین کی داستان جناب محمد اسحاق صدیقی سے سنئے، جو ماہنامہ "فروغ اُردو" لکھنؤ کے اکتوبر ۱۹۶۲ء کے شمارہ میں شائع ہوئی ہے ———

[1] نیاز صاحب ایک سال سے صاحب فراش تھے مگر اس مدت میں اُن کے نام سے اُن کے مضامین برابر چھپتے رہے!! یہ "راز" بھی تحقیق طلب ہے۔

کچھ نگار کے خدا نمبر کے بارے میں

"اُردو کے مشہور اور معتبر جریدوں میں نگار کا جو مقام ہے، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے یہ رسالہ ۱۹۲۲ء سے حضرت نیاز فتحپوری کی ادارت میں جاری ہے جو اردو کے صاحبِ طرز انشا پرداز ہیں۔ درجنوں علمی و ادبی کتابوں کے مصنف ہیں جنہیں ان کے تبحرِ علمی کی بنا پر علامہ کہا جاتا ہے اور جنہیں حکومتِ ہند نے اپریل ۱۹۶۲ء میں اُن کے علمی و ادبی خدمات سے متاثر ہو کر سب سے بڑا ادبی اعزاز "پدم بھوشن" عنایت کیا تھا لیکن مجھے افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ اتنے بڑے ادیب اور عالم میں جو علمی دیانت داری ہونی چاہئے وہ نہیں ہے۔ کچھ عرصہ ہوا ہفتہ وار سرفراز (لکھنؤ) میں ایک مضمون شائع ہوا تھا "علامہ کیسے بنتے ہیں"[1] جس میں علامہ نیاز فتحپوری کے ادبی سرقوں کی متعدد مثالیں پیش کی گئی تھیں۔ میں نے ہر چند کوشش کی کہ اُن کا دامنِ شہرت زیادہ داغدار نہ ہونے پائے اور اس کے لئے میں نے حضرت نیاز سے اُن کے کراچی جانے کے بعد خط و کتابت بھی کی لیکن افسوس کہ انہوں نے مجھ ناچیز کی درخواست کو قابلِ اعتنا نہ سمجھا، اس لئے مجھے مجبوراً اس حقیقت کو ظاہر کرنا پڑتا ہے جسے میں نے اب تک ظاہر نہیں کیا تھا۔

حضرت نیاز فتحپوری عرصہ سے ہر سال اپنے رسالہ نگار کا ایک خصوصی شمارہ بطور سالنامہ پیش کرتے رہے۔ ۱۹۵۶ء کا سالنامہ "خدا نمبر" تھا جس میں عہدِ وحشت سے عہدِ حاضر تک مختلف مذاہب میں خدا کے تصور کا جائزہ لیا گیا تھا۔ یہ نمبر تمام تر اس خاکسار نے درجنوں کتابوں کے مطالعے کے بعد نیاز صاحب کی فرمائش پر تیار کیا تھا اور نیاز صاحب نے پہلے اس کا تحریری طور پر اعتراف بھی کیا تھا۔ لیکن بعد میں انہوں نے مختلف (اور مجھے دکھ کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ "ناپسندیدہ") طریقوں سے اسے اپنانے اور میری ساری محنتوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی یہ سب کیسے ہوا، اس کا جاننا شاید دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

نگار کا سالنامہ ۱۹۵۶ء "خدا نمبر" لکھنے سے پہلے میرے حسبِ ذیل مضامین نگار میں شائع ہو چکے تھے:

(۱) آدمی نے لکھنا کیسے سیکھا .... جون سے اگست ۱۹۴۹ء تک۔

(۲) اظہارِ اعداد کے طریقے زمانۂ قدیم سے کر اب تک .... اگست سے دسمبر ۱۹۵۰ء تک۔

(۳) مذہبِ عالم کی تخلیق اور قطبِ شمالی (نامکمل) .... اگست سے نومبر ۱۹۵۲ء تک۔

(۴) پیدائشِ عالم اور اساطیری روایات کا تقابلی مطالعہ .... دسمبر ۱۹۵۲ء

(۵) فنِ تحریر کی تاریخ (نامکمل) .... جون سے نومبر ۱۹۵۳ء تک

جولائی سے دسمبر ۱۹۵۵ء تک۔

مارچ سے اکتوبر ۱۹۵۹ء تک۔

اگر اسے خودستائی پر محمول نہ کیا جائے تو یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ نیاز صاحب میرے مضامین سے بہت متاثر تھے، اسی لئے ۱۹۵۵ء میں جب انہوں نے "خدا نمبر" نکالنے کا ارادہ کیا تو ساری ذمہ داری میرے سپرد کرنی چاہی۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک دن میں اس نمبر کی تیاری کے سلسلے میں نیاز صاحب کی خواہش پر انہیں امیر الدولہ پبلک لائبریری (لکھنؤ) لے گیا اور انہیں وہ تمام کتابیں دکھائیں، جن سے اس سالنامے کی تیاری میں مدد مل سکتی تھی۔ ان میں سے بیشتر کتابیں کتبِ محفوظ (RESERVED) تھیں کتابوں کی کثیر تعداد کو دیکھ کر اور اُن سے مفید مطلب معلومات

---

[1] مورخہ ۹ر دسمبر ۱۹۶۳ء

اخذ کرنے میں جو غیر معمولی محنت کرنا پڑتی اُس کے پیشِ نظر نیاز صاحب کو "خدا نمبر" نکالنے میں تامل ہوا اور بولے : "مجھ سے بڑھاپے میں اتنی محنت نہیں ہو سکتی کہ یہاں آکر سب کتابیں پڑھوں اور اتنے بڑے ٹاپک پر لکھوں۔ اگر آپ اس کام کا بیڑا اٹھائیں تو میں "خدا نمبر" نکالوں گا۔ ورنہ کوئی دوسرا نمبر نکالنے کے متعلق سوچوں گا۔" میں نے انہیں یقین دلایا کہ میں یہ کام کر سکتا ہوں، لیکن میری دو شرطیں ہیں ، ایک تو یہ کہ "خدا نمبر" رسالے کی صورت میں نہ پرنٹ ہو بلکہ کتابی صورت میں اچھے سفید کاغذ پر شائع ہو اور دوسرے یہ کہ پوری کتاب میرے نام سے چھپے۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ پیش لفظ میں یہ لکھیں کہ "اگر اسحاق صدیقی میری مدد نہ کرتے تو شاید یہ سالنامہ منظرِ عام پر نہ آتا۔" ظاہر ہے کہ آپ مشہور ادیب ہیں آپ کی شہرت کے آگے میرا نام دب کر رہ جائے گا۔" نیاز صاحب اس پر راضی ہو گئے کہ پورا "خدا نمبر" میں مرتب کروں گا اور رسالے پر مرتب کی حیثیت سے میرا نام دیا جائے گا۔ اسی کے ساتھ انہوں نے یہ وعدہ کیا کہ وہ مجھے اس محنت کے لئے معقول معاوضہ بھی دیں گے البتہ انہوں نے "خدا نمبر" کو کتابی صورت میں شائع کرنے سے معذوری ظاہر کی کیونکہ اس طرح لاگت زیادہ آتی اور نگار کے خریداروں کو بھیجنے میں ڈاک خرچ بھی زیادہ لگتا۔ بات معقول تھی اس لئے میں نے اس پر اصرار نہ کیا۔

کچھ عرصے کے بعد میں نے نیاز صاحب سے جا کر کہا : "آپ کی لائبریری میں جو کتابیں دیکھی تھیں ، وہ سب پرانی ہیں۔ یہ چند نئی کتابوں کی فہرست ہے ان کا خریدنا نہایت ضروری ہے تاکہ جدید ترین تحقیقات سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔" نیاز صاحب فہرست دیکھ کر خوش ہوتے اور بولے "ضرور منگوا لیجئے" اور اسی وقت سو روپے کا چیک لکھ کر دیا۔

میں نے ایک مقامی کتب فروش کے ذریعہ کتابیں منگوا لیں اور مطالعے میں غرق ہو گیا۔ اب میرا روز کا یہ معمول تھا کہ دفتر کے بعد سیدھا لائبریری پہونچتا اور جب تک وہ بند نہ ہو جاتی مختلف کتابوں سے نوٹس تیار کرتا۔ مجھے امیر الدولہ پبلک لائبریری کے علاوہ رام کرشنا مشن آشرم لکھنؤ کے کتب خانہ سے بھی بڑی مدد ملی ، جہاں ہندو مذہب کے متعلق کافی کتابیں تھیں۔ میں ان دونوں کتب خانوں سے گھر بھی کتابیں پڑھنے کے لئے لایا کرتا تھا۔ گھر آکر کھانے کے بعد رات گئے تک لکھنے پڑھنے کا سلسلہ جاری رہتا اور صبح کو ۶ بجے سے ۹ بجے تک بھی لکھتا پڑھتا اس کے بعد کھانا کھا کر دفتر چل دیتا۔

سالنامے کی تیاری کے سلسلے میں پہلا کام میں نے یہ کیا کہ مذاہب کی قدامت کے لحاظ سے عنوانات کی ایک فہرست مرتب کی اور پھر ہر مذہب پر سلسلہ وار متعلقہ کتابوں کا مطالعہ کرتا اور مضمون لکھنا شروع کیا جب ایک عنوان پر مضمون تیار ہو جاتا تو وہ نیاز صاحب کے حوالے کر دیتا اور وہ اُسے دیکھنے کے بعد کاتب کے حوالے کر دیتے یہ سلسلہ آٹھ نو ماہ تک جاری رہا یہاں تک کہ "خدا نمبر" مکمل ہو گیا اور جب وہ شائع ہو گیا تو میں بڑی اُمیدوں کے ساتھ نیاز صاحب کے پاس پہونچا اور معاوضہ طلب کیا۔

میرا خیال تھا کہ اس شبانہ روز کی محنت کے لئے نیاز صاحب مجھے کئی سو روپے معاوضہ دیں گے کیونکہ وہ اس سے پہلے بھی مجھے نگار میں مضامین لکھنے کے لئے کئی سال سے خصوصی معاوضہ دیا کرتے تھے یعنی فی صفحہ ایک روپیہ (لیکن بقول نیاز یہ معاوضہ نہ تھا بلکہ جن نامساعد حالات میں میں کام کر رہا تھا ، اُسے جاری رکھنے کے لئے میری مدد تھی) لیکن نیاز صاحب نے صاف انکار کر دیا اور کہا : "معاوضہ کیسا ! جو کچھ مجھے دینا تھا دے چکا" میں اپنے اُس وقت کے جذبات کو ٹھیک طور سے بیان نہیں کر سکتا لیکن مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے میرے سامنے ایک ادیب اور عالم نہیں ہے بلکہ ایک سرمایہ دار ہے جو مزدور کو اُس کی مزدوری بھی نہیں دینا چاہتا۔ انہوں نے دورانِ گفتگو میں یہ بھی فرمایا کہ "معاوضہ تو آپ کو تب دیتا ، جب "خدا نمبر" آپ کے نام سے شائع نہ ہوتا اس سے آپ کی کتنی شہرت ہو گی یہ سوچئے" میرے اور ان کے درمیان اور کیا گفتگو ہوئی۔ اس کا ذکر نہایت تکلیف دہ ہے۔ اخیر میں انہوں نے کہا کہ "فی الحال میں باہر جا رہا ہوں اور وہاں سے واپسی پر کچھ اور دوں گا" اس کے کئی مہینے بعد جب میں ان سے ملنے گیا تو انہوں نے ۵ روپے عنایت کئے لیکن یہ قسم کھا کر

سلہ نیاز صاحب کا سنہ پیدائش [illegible] ہے اور میرا ۱۹۲۹ء گویا وہ مجھ سے عمر میں ۴۵ سال بڑے ہیں۔ میں نے نگار کا خدا نمبر ۱۹۵۵ء میں لکھا تھا اُس وقت نیاز صاحب کی عمر ۷۱ سال تھی اور میری ۲۶ سال۔

میں اور میں دل برداشتہ ہو گیا اور یہ طے کر لیا کہ آئندہ نگار میں کوئی مضمون نہ لکھوں گا۔ حالانکہ میرے بعض مضامین نامکمل تھے۔

نیاز صاحب نے نگار کے "خدا نمبر" کی کچھ فالتو کاپیاں بھی اس خیال سے چھپوائی تھیں کہ نگار کے مستقل خریداروں کے علاوہ دوسرے لوگ بھی اس خصوصی پرچے کو خریدنا چاہیں گے اور جیسے جیسے مانگ آتی رہتی تھی رسالے بھیجے جاتے تھے۔ ایک دن ایسا ہوا کہ نیاز صاحب کے کاتب میرے پاس آئے اور بولے "آج شاید نگار کے خدا نمبر کی مانگ اور آئی ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ "نگار" کی کاپیاں اندرونی سرورق پھاڑ کر بھیجی جا رہی ہیں (اس کے پہلے صفحہ پر میرا نام تھا اور دوسرے صفحہ پر نیاز صاحب کا تعارف جس میں میری بڑی تعریف تھی) معلوم نہیں کہ اس سے قبل جو کاپیاں خریداروں کو بھیجی گئی تھیں ان کا اندرونی سرورق پھاڑ دیا گیا تھا یا نہیں؟ لیکن آج تو میں تو دیکھ کر آ رہا ہوں۔ معاوضے کے سلسلہ میں آپ کے ساتھ جو زیادتی ہوتی رہی ہے اس کا مجھے افسوس ہے لیکن اس سے زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ نیاز صاحب آپ کا نام شائع کرنے کے سلسلہ میں ادبیہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں "خدا نمبر" آپ کا لکھا ہوا ہے۔" میں نے ارادہ کیا کہ نیاز صاحب سے جا کر دریافت کروں کہ آخر یہ کیا حرکت ہے؟ لیکن کاتب صاحب نے منع کر دیا۔ اُن کی روزی کا سوال تھا اس لئے میں نے بھی نیاز صاحب کے یہاں جانا مناسب نہ سمجھا۔ لیکن کاتب صاحب کے بیان کی تصدیق کرنے کے لئے سوچا کہ کسی مقامی کتب فروش کے وہاں جا کر دیکھ آؤں کہ ان کے وہاں نگار کی جو کاپیاں بکنے کے لئے گئی تھیں شاید ان میں سے کچھ بچ گئی ہوں اور ان کا اندرونی سرورق پھٹا ہوا ہے یا نہیں۔ چنانچہ میں ایک مقامی پبلشر اور بک سیلر "کتابی دنیا" [illegible] لکھنؤ یہاں گیا۔ نگار کی کچھ کاپیاں موجود تھیں۔ انہیں دیکھا اندرونی سرورق غائب تھا۔ میں نے دریافت کیا: "یہ رسالے آپ نے کہاں سے منگوائے تھے؟" بولے: "کیوں؟ ظاہر ہے کہ نگار کے دفتر سے"۔ جب میں نے وجہ بتائی تو انہیں نیاز صاحب کی حرکت پر سخت تعجب ہوا۔ میں نے ایک سالنامہ خرید لیا اور رسید پر لکھوا لیا "پہلا ورق پھٹا ہوا" تاکہ ثبوت رہے۔ اس کے بعد میں گھر چلا آیا لیکن نگار کی ان کاپیوں کو دیکھ کر مجھے جو ذہنی اذیت پہنچی ہو گی اور میرے قلب کی جو حالت ہو گی، اس کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں بہرحال میں نے اپنے چند احباب سے اس کا ذکر کیا اور انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ تم اخبار میں سارے واقعات لکھو لیکن باوجود اس امر کے کہ میرے ساتھ انتہائی زیادتی کی گئی تھی میری مروت نے اس اقدام کو پسند نہ کیا اور سوچا کہ ایک مشہور ادیب اور عالم کی شہرت کو داغدار کرنے سے کیا فائدہ، جو چیز میری ہے وہ میری ہی رہے گی۔ دوسری صورت یہ تھی کہ میں نیاز صاحب سے جا کر ملتا اور اس بارے میں اُن سے گفتگو کرتا لیکن میں اُن کی نیت سمجھ چکا تھا۔ اس لئے میں نے اُن کے پاس جانا مناسب نہ سمجھا اور یہ خیال کیا کہ یہ گفتگو نہ صرف لاحاصل ہو گی بلکہ اس کا بھی امکان ہے کہ بات چیت کے دوران مزید بدلطفی پیدا ہو جائے۔

کچھ دنوں کے بعد نیاز صاحب سے نظیر آباد میں ایک کتاب کی دکان "بک لورز کا منڈ" پر ملاقات ہو گئی (جہاں وہ انگریزی ناولیں کرایہ پر لے کر پڑھا کرتے تھے، اور میں پرانی کتابیں اور رسائل خریدنے کے شوق میں جایا کرتا تھا) میں نے سلام کرنا اپنا فرض سمجھا۔ پھر اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ اس دکان پر دو چار بار پھر اُن سے اسی طرح ملاقات اور گفتگو رہی۔ ایک دن انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ "بہت دنوں سے آپ آئے نہیں؟" میں نے اُن سے اس وقت بھی اصل سبب بتانا مناسب نہ سمجھا۔ البتہ میں اُن کے یہاں حسب سابق آنے جانے لگا۔ اس واقعہ کے کئی سال بعد نیاز صاحب جب "پدم بھوشن" ہو کر ۱۹۶۲ء میں پاکستان تشریف لے گئے تو میں اُن سے خط و کتابت کرنے لگا۔ اسی دوران نگار میں کئی اشتہار نظر سے گزرے جن سے پتہ چلا کہ "خدا نمبر" پھر شائع ہونے والا ہے لیکن ان اشتہاروں میں کہیں میرا نام نہ تھا اس لئے مجھے شبہ ہوا کہ اس مرتبہ کہیں نیاز صاحب یہ نمبر اپنے ہی نام سے نہ شائع کر دیں۔ میرا یہ شبہ یقین سے بدل گیا۔ جب نگار کا سالنامہ ۱۹۶۳ء "نیاز نمبر" حصہ دوم مجھے ملا۔ اس میں فرمان فتحپوری صاحب کا ایک مضمون ہے۔ "نگار اور نگار کے خاص نمبر" اس سلسلے میں وہ صفحہ ۱۳۴ پر فرماتے ہیں:

"جنوری۔ فروری ۱۹۵۶ء کا "خدا نمبر" کے نام سے شائع کیا گیا۔ پورا نمبر نیاز کا نتیجہ فکر ہے۔ اس میں

۱؎ نیاز صاحب کے کاتب شہنشاہ حسین صاحب کو جو انہیں کے گھر میں بیٹھ کر نگار کی کتابت کیا کرتے تھے سارے واقعات معلوم تھے اور انہیں مجھ سے ہمدردی پیدا ہو گئی تھی۔ جن صاحبان کے پاس ایسے رسالے موجود ہوں اگر وہ مجھے مطلع فرمائیں تو عین نوازش ہو گی۔

نیاز فتحپوری نے دنیا کے مختلف مذاہب کا تاریخی و تحقیقی جائزہ لے کر بتایا ہے کہ مختلف عہدوں اور مختلف قوموں میں خدا کا تصور کیا تھا اور کیا ہے۔ اس طرح سے جہاں مدیر نگار کی وسعت مطالعہ اور مذاہب عالم سے ان کی گہری واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے وہاں مذاہب پر ایک نادر مواد سامنے آجاتا ہے۔ (جملہ نامکمل ہے۔ غالباً یہ کہنا چاہتے تھے "جو کہیں اور دستیاب نہیں ہو سکتا")

مجھے اس تحریر سے جو تکلیف ہوئی، وہ بیان سے باہر ہے۔ میں نے فرمان صاحب اور نیاز صاحب کو کئی خط لکھے کہ ایک تردیدی بیان نگار کی کسی قریبی اشاعت میں شائع کیجئے کہ نگار کا "خدا نمبر" اسحاق صدیقی کا لکھا ہوا تھا نہ کہ نیاز فتحپوری کا اور جب "خدا نمبر" دوبارہ شائع ہو تو اس کا خیال رکھیئے کہ اس میں مولف کی حیثیت سے میرا نام ہو اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو مجھے مجبوراً اخبارات کے ذریعہ صداقت کو بے نقاب کرنا پڑے گا جو علامہ نیاز کے لئے کشف ہتک کا باعث ہوگا۔ میں اپنی چیز کو اپنا ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دوں گا اور میرے پاس اس کے لئے کافی ثبوت موجود ہے۔ بہرحال میں علامہ نیاز کے لئے بے پناہ عقیدت ہے لیکن آپ لوگ مجھے اس بات پر مجبور کر رہے ہیں کہ میری عقیدت اور محبت نفرت سے بدل جائے اور وہی زبان اور قلم جو نیاز کی تعریف سے کبھی نہ تھکتا تھا اُن کے خلاف حرکت میں آجائے۔ ظاہر ہے کہ علامہ نیاز کی شہرت کو داغدار کر کے مجھے خوشی نہ ہوگی لیکن یہاں سوال اندھی شخصیت پرستی کا نہیں ہے بلکہ یہ خیر و شر کی قدیم جنگ ہے اور مجھے امید ہے کہ آخر میں جیت سچ کی ہوگی۔

۱۷ راگست ۱۹۶۳ء کو نیاز صاحب نے مجھے ایک خط لکھا:

"عزیزم، فرمان کے نام رجسٹری ملی۔ آپ کا اضطراب دیکھ کر سخت تعجب ہوا۔ میں آپ کو لکھ چکا ہوں کہ خدا نمبر میں آپ کے نام کا اظہار کر دیا جائے گا اور آئندہ ستمبر کے اشتہار میں بھی۔ فرمان صاحب کا بہر تقاضہ کہ انہوں نے مجھ سے پوچھے بغیر اشتہار شائع کر دیا۔ میں خود اب کسی کام کو نہیں دیکھتا۔ بالکل فرصت نہیں ہے۔ خدا نمبر آپ کو ضرور بھیجا جائے گا۔ نیاز"

یہ خط مجھے ۲۰ راگست ۱۹۶۳ء کو ملا۔ اس سے دو روز قبل مجھے فرمان صاحب کا ایک تار ملا تھا:

1915 APM 156 KARACHI 12 12/13

ISHAQUE SIDDIQUI 26 GWYNNE TALAB

LUCKNOW

DONT WORRY SEE NEXT ISSUE

FARMAN

ترجمہ:

۱۹۱۵ اے پی ایم ۱۵۶ کراچی ۱۲ ۱۲/۱۳

اسحاق صدیقی ۲۶ گوئن تالاب لکھنؤ

پریشان نہ ہوں۔ آئندہ شمارہ دیکھئے۔

فرمان

غالباً تار دینے کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ کہیں میں اخبارات میں سارا واقعہ نہ لکھ دوں۔ بہرحال فرمان صاحب نے ستمبر ۱۹۶۳ء یا اس کے بعد نگار کے کسی پرچے میں کوئی بیان اپنی غلط فہمی کے بارے میں شائع نہیں کیا۔ مارچ ۱۹۶۶ء میں "خدا نمبر" کا جدید ایڈیشن مل گیا جس کے دیکھنے سے

معلوم ہوا کہ نیاز صاحب نے مرحوم کی اصل تالیف میں کوئی تبدیلی نہیں کی ہے لیکن فہرست کے چند صفحات میں بعض اہم تبدیلیاں معلوم کی ہیں۔ مثلاً :
سالنامہ ۱۹۵۶ء کے اندرونی سرورق کے پہلے صفحہ کی عبارت حسب ذیل تھی :

خدا کا تصور

اور

اُس کا ارتقاء

(عہدِ وحشت سے عہدِ حاضر تک)

مرتبہ :- محمد اسحاق صدیقی

ناشر :- نگار بک ایجنسی لکھنؤ

قیمت تین روپیہ

اسی سرورق کے دوسرے صفحہ پر نیاز صاحب نے " تعارف " لکھا تھا جو یہ ہے :

تعارف

" مذہب بڑے دلچسپ و وسیع مطالعہ کی چیز ہے ، علم الانسان ، جغرافیہ ، تاریخ
نفسیات ، ہیئت و علم الجو جیسی علوم اس سلسلہ میں ہمارے سامنے آجاتے ہیں ۔

مذہب فطری چیز ہو یا غیر فطری ، لیکن اخلاقیات مذہبی یقیناً فطری چیز ہے کیونکہ متمدن انسان کی تمدنی تنظیم و ترقی اس کے بغیر ممکن نہیں ۔

مذہب کی اساس خدا کے تصور پر قائم ہے اور گو وہ ایک منطقی نتیجہ ہے انسان کے جہل و مجبوری کا ، لیکن کس قدر عجیب بات ہے کہ اس تاریکی و بے اختیاری نے انسان میں خود آگہی پیدا کی اور خدا کی جستجو میں خدا تک پہنچا ہو یا نہ پہنچا ہو لیکن اُس نے اپنے آپ کو ضرور پہچان لیا ۔

انسان کا جمادات ، نباتات و حیوانات سے گزر کر قوتِ مجردہ تک پہنچ جانا اور فطرت کے سربستہ رازوں کو واشگاف کر دینا عقلِ انسانی کا بڑا کارنامہ ہے ، لیکن انسان کو اس منزل تک صرف خدا کی جستجو نے پہنچایا ۔

- — "دنیائے شاعری مشکل سے ایسے ایجاز، سیر بیانی جزیل استعارات انتخی کی مثال پیش کر سکتی ہے۔"
- — "میرے کمالات سے استبعاد حقیقی ہے۔"
- — "جسارت مستمرہ اور سلاست مقالی عود کر آئی"

افسانہ نگاری میں انہوں نے سجاد حیدر یلدرم کے طرز نگارش کا اثر شروع شروع میں قبول کیا جن کے یہاں "احساسات اور انجذابات" جیسے بوجھل الفاظ اور رومانی ترکیبیں ملتی ہیں اس کے بعد نیاز صاحب کا اسلوب تحریر سہل اور سلیس ہوتا گیا، وہ کوئی ٹکسالی نہیں اچھے انشا پردازوں میں گو سرسید، شبلی، نعمانی حالی، ابوالکلام آزاد، عبدالماجد دریاآبادی اور آغا حیدر حسن کی طرح "صاحب طرز" انشا پرداز نہیں ہیں! نیاز — تحریر و انشا میں قاضی عبدالغفار کے درجہ کے ادیب اور صاحب قلم ہیں —————— نیاز صاحب کے یہاں ایسے مہمل جملے بھی ملتے ہیں —— "وہ آنکھیں جن کی گہرائی میں سمندر کا عکس ڈوب جاتا تھا" مگر قاضی عبدالغفار کی تحریریں اس قسم کے اہمال سے پاک ہیں۔

نیاز صاحب کے نام کے ساتھ بعض لوگ "علامہ" لکھتے ہیں یہ غلط قسم کی مرعوبیت ہے، "علامہ" کے لئے جس جامع قابلیت اور علم و فضل کے لوازم ضروری ہیں۔ اُن سے نیاز صاحب بڑی حد تک کورے تھے، ان کو "مولانا" بھی نہیں کہا جا سکتا کہ "مولانا" کے لئے لازمی شرط ہے "دین و مذہب" کا رنگ ملا مدعی اختیار کرنا۔ مگر نیاز صاحب نے اس کے برعکس اپنی زندگی کا خاصہ حصہ دین و مذہب کی تنقیص و تکذیب میں گزارا اور اس روش و رنگ کا مذاق اُڑایا۔

نیاز صاحب اس کا سلیقہ رکھتے تھے کہ کسی فن پر کوئی کتاب یا مقالہ پڑھا اس کا خلاصہ اردو میں منتقل کر دیا، نگار کے "باب المراسلات" میں جانے کتنے سوالات انہوں نے مرتب کئے، اور خود ہی جواب دئے! مثلاً سائنس کی اور روزمرہ کے برتنے کی چیز "دیاسلائی" ہے۔ مگر اس کی تاریخ کون جانتا ہے، ہاں! انسائیکلوپیڈیا یا اس قسم کی دوسری کتابوں اور قاموسوں میں "دیاسلائی" کی تاریخ مل سکتی ہے، اب کوئی شخص انسائیکلوپیڈیا میں دیاسلائی کی تاریخ پڑھ کر اپنے رسالہ میں دیاسلائی پر کسی فرضی نام سے استفسار کرے اور جواب میں انسائیکلوپیڈیا کی عبارت کا ترجمہ حوالہ کے بغیر درج کر دے تو ایسے ناقل اور مترجم کو محقق ہرگز نہیں کہہ سکتے! ہاں! جن لوگوں کا مطالعہ محدود ہے یا مضمون نگار کی قابلیت و استعداد سے واقف نہیں ہیں وہ ضرور مرعوب ہو جائیں گے! یہی حال نیاز فتحپوری کی "باب المراسلات" والی تحریروں کا ہے! جن کو پڑھ کر لوگ انہیں علامہ اور محقق سمجھنے لگے ہیں ایک تو وہ شخص ہوتا ہے جو کسی فن میں عبور یا درک رکھتا ہے اور ایک شخص وہ ہے جس نے کسی فن پر کوئی مضمون یا کتاب پڑھی اور جو باتیں اُس کی سمجھ میں آئیں انہیں اپنی زبان میں منتقل کر دیا، نیاز صاحب کا شمار بھی اسی دوسری صف کے لوگوں میں ہوتا ہے، مثلاً فن عروض پر وہ بہت کچھ لکھتے رہے ہیں مگر اس کی زیادہ تر لغت عروض کی کتابوں سے اخذ و نقل کی ہے! اگر وہ عروض جانتے ہوتے تو رباعیوں کے ایک ایسے مجموعہ کی دیباچہ میں تعریف نہ کرتے جس کی ڈیڑھ سو رباعیوں میں کم از کم ۸۰ رباعیاں ساقط الوزن ہیں۔

نظام رامپوری کا تذکرہ لکھا، قرآن کے بارے میں ایک آدھ مضمون یا کتاب کو پڑھا حالات کی تحقیق نہیں کی، اس ناقص مطالعہ اور سرسری معلومات کا یہ نتیجہ نکلا کہ اول تو شاعر کا نام غلط لکھا پھر اُن کو "مجرد" بتایا حالانکہ نظام رامپوری کی شادی بھی ہوئی اور اولاد بھی! ہاں! یہ ضرور ہوا کہ اُن کی اولاد زندہ نہیں رہی۔

تاریک پہلو

نیاز فتحپوری کی زندگی کا سب سے زیادہ افسوسناک اور قابل مذمت و بیزاری پہلو دین کی مخالفت، تکذیب اور تردید ہے! اُن کی یہ روش نہ جانے کتنے نوجوانوں کو گمراہ کیا اور اُن کے اندر دین سے بُعد اور نفرت پیدا کر دی۔

نیاز صاحب نوجوانی میں ڈاڑھی رکھتے تھے، نماز روزے کے بڑے پابند تھے، جس زمانے میں وہ مسیح الملک اجمل خاں مرحوم کے صاحبزادے جمیل خاں کے دلی میں اتالیق تھے، تو ملا واحدی دہلوی کا بیان ہے کہ نیاز صاحب کے ڈاڑھی تھی اور نماز کی شدت کے ساتھ پابندی کرتے تھے۔
—— پھر نہ جانے کسی مولوی کے ساتھ اُن کا کیا معاملہ پیش آیا کہ مولویوں کے شدت کے ساتھ مخالف ہو گئے اور یہ مخالفت جو مولویت کی تردید سے شروع ہوئی تھی، فقہ، حدیث، قرآن، خدا، انبیاء، ملائکہ، نماز، روزہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کی تنقیص و توہین کی حد تک پہونچ گئی، انہوں نے یہ تک لکھ مارا ہے —

”کلام مجید کو نہ میں کلام خدا سمجھتا ہوں، نہ الہام ربانی بلکہ ایک انسان کا کلام جانتا ہوں . . . . . .“ (نگار، ماہ جون ۱۹۶۲ء)

ہمیں نہیں معلوم کہ ان ملحدانہ اور کافرانہ خیالات سے انہیں توبہ کی توفیق نصیب ہوئی یا نہیں، ان کی ملحدانہ تحریروں پر جب مسلمانوں نے لکھنؤ میں احتجاج کیا، تو معاشرے کے دباؤ میں آکر انہوں نے باقاعدہ توبہ نامہ اپنے رسالے میں چھاپا! مگر وہ اپنے اس عہد پر قائم نہ رہ سکے اور پھر اسی بیدینی و الحاد کی اشاعت و تبلیغ شروع کر دی ——

عمر کے آخری حصہ میں نیاز فتحپوری کے قلم کو یہ کمک بھی لگ گئی کہ انہیں ”قادیان“ بلایا گیا، وہاں ان کی خوب آؤ بھگت ہوئی اور اس مہمان نوازی اور میزبانی میں خالی عزت و تکریم ہی نہیں، فتوحات بھی شریک تھیں، قادیانیوں کے اس کرم و نوازش کا انہوں نے بدلہ اس طرح ادا کیا کہ اپنے مجلہ ”نگار“ میں مرزا غلام احمد قادیانی کی خوب خوب تعریفیں کیں، اور اس حریف نبوت اور نبی کاذب کو ”عاشق رسول“ تک لکھ دیا۔

نیاز فتحپوری نے متحدہ ہندوستان میں مسز اینی بسنٹ کی ہوم رول کی تحریک سے لے کر، خلافت، کانگریس اور مسلم لیگ کے تمام دور اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے، وہ جمہوریت اور مطلق العنانی، آزادی اور غلامی کے فرق کو اچھی طرح جانتے تھے، اُن کو یہ بھی معلوم تھا کہ کرسی اقتدار پر جمے رہنے کے لئے کیسی کیسی حکمت عملیوں سے کام لیا جاتا ہے، پاکستانی عوام کے تقاضوں سے بھی وہ اچھی طرح باخبر تھے انگریز کے دور استبداد اور اس کے سیاسی ہتھکنڈوں کا بھی اُن کو پوری طرح تجربہ تھا۔ مگر پاکستان میں آکر اُن کا قلم حیت فکر کے مقابلہ میں زیادہ تر مصلحت شناس ہی رہا، خوف یہ تھا کہ اگر آزادی رائے کو استعمال کیا گیا تو اردو ترقی بورڈ، انجمن، میوزیم اور روز نامہ جنگ سے جو مالی فائدہ کا تعلق ہے وہ خطرہ میں پڑ جائیگا! حالانکہ دین اور ملک کے باغیوں کو حکومت و سیاست کے معاملے میں اتنا ڈرا اور بے باک دیکھا گیا ہے مگر نیاز صاحب . . . . !

تضمین

ڈاکٹر انعام حسن حریف مارہروی

جناب انعام حسن میڈیکل کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے فارغ التحصیل (M.B.B.S) ڈاکٹر ہیں۔ امراض چشم کے علاج میں خاص بصیرت، تجربہ، اور شہرت رکھتے ہیں، شعر و ادب کا ذوق اور سخن فہمی ان کے اپنے قابلِ فخر ماموں حضرت مولانا احسن مارہروی مرحوم سے ورثہ میں پایا ہے، بعض اوقات شعر پڑھتے ہیں کہ کئی کئی سکنڈ تک سننے والوں کو تلفظ کی ادائیگی کا انتظار کرنا پڑتا ہے، ان کے مزاج و ظرافت پیدا ہو جاتا اور یہ انداز لطف و تفریح کا سبب بن جاتی ہے۔
یہ ایک غزل کی انوکھی "تضمین" کی ہے جو قارئین فاران کے مزہ بدلنے کے خیال سے درج ذیل کی جاتی ہے! (م۔ق)

میری ہنسی ہنسی نہ سہی، گل پھنسی سہی
دل پر جو ہاتھ ہے، یہ گریباں دری سہی
وحشت سہی، جنون سہی، بے خودی سہی
"ان کی خوشی یہی ہے تو اچھا یوں ہی سہی
الفت کا نام آج سے دیوانگی سہی"

کیا حال پوچھتے ہیں مرا، کیا کہوں جناب
بیٹھا ہوں لڑ لڑا کے اسمبلی کا انتخاب
اخبار میں سب ہے یہی کہ اپنے ہیں بے نقاب
"ہرچند نامراد ہوں پھر بھی ہوں کامیاب
کوشش تو کی ہے کوشش برباد ہی سہی"

میرے نفس نفس میں ہے اک طرفہ بے کلی
بیٹھے ہوئے ہیں آپ جو رس کے بھرے ہنسی
کافی نہیں حضور تبسم کی چاشنی
"غنچوں کے دل سے پوچھئے لطف شگفتگی
بادِ صبا پہ تہمت آوارگی سہی"

نسکرین کی سامنے رکھی ہے جو کھرل
گھبرائے شوخ رنگ کروں کیوں اس میں حل
شاید اسی طرح یہ بلا سر سے جائے ٹل
"جب چھڑ گئی ہے کاکلِ شب رنگ کی غزل
ایسے میں اک قصیدۂ رخسار بھی سہی"

ماہر بھی اے حریف ہے معجونِ ادب و رنگ
جس کا مزاج خشک نہ تر، بلکہ معتدل
ماہر کی انکھڑیوں میں ہے اک حشرِ منفعل
"ماہر سے اجتناب نہ فرمائیں اہلِ دل
(اچھوں کے ساتھ ایک گنہگار بھی سہی)"

مولانا ابوالکلام آزاد

روحِ انتخاب

ماہ ربیع الاول

آں راز کہ در سینہ نہانست نہ وعظ است
بردار تواں گفت، بہ منبر نہ تواں گفت

ماہ ربیع الاول کا ورود تمہارے لئے جشن و مسرت کا ایک پیغام عام ہوتا ہے۔ کیونکہ تم کو یاد آجاتا ہے کہ اسی مہینے کے ابتدائی ہفتوں میں خدا کی رحمت عامہ کا دنیا میں ظہور ہوا اور اسلام کے داعی برحق کی پیدائش سے دنیا کی داغی غم انگیزیاں اور سرگشتگیاں ختم کی گئیں صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم۔ تم خوشیوں اور مسرتوں کے ولولوں سے معمور ہو جاتے ہو تمہارے اندر خدا کے رسولِ برحق کی محبت و شیفتگی ایک بیخودانہ جوش و حرکت پیدا کر دیتی ہے تم اپنا زیادہ سے زیادہ وقت اسی کی یاد میں، اسی کے تذکرے میں اور اسی کی محبت کے لذت و سرور میں بسر کرنا چاہتے ہو۔

تم اس کے ذکر و نسبت کی مجلسیں منعقد کرتے ہو ان کی آرائش و زینت میں اپنی محنت و مشقت کی کمائی بے دریغ لٹاتے ہو خوشبودار اور تر و تازہ پھولوں کے گلدستے سجاتے ہو۔ کافوری شمعوں کے خوبصورت فانوس اور برقی روشنی کے بکثرت قمقمے روشن کرتے ہو، عطر و گلاب کی مہک اور اگر کی بتیوں کا بخور جب ایوانِ مجلس کو اچھی طرح معطر کر دیتا ہے تو اس وقت مدح و ثنا کے زمزموں اور درود و سلام کے مقدس ترانوں کے اندر اپنے محبوب و مطلوب مقدس کی یاد کو ڈھونڈتے ہو اور بسا اوقات تمہاری آنکھ کے آنسو اور تمہارے دل کی محبت و دروں کی آہیں اس کے اسم مبارک سے والہانہ عشق کرتیں اور اس کے عشق سے حیات و روحانی حاصل کرتی ہیں۔

پس کیا ہی مبارک ہیں وہ دل جنہوں نے اپنے عشق و شیفتگی کے لئے رب السموٰت والارض کے محبوب کو چنا! اور کیا پاک و مطہر ہیں وہ زبانیں جو سید المرسلینؐ اور رحمۃ للعالمین کی مدح و ثنا میں زمزمہ سنج ہوئیں!

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار
بگذارند و خم طرۂ یارے گیرند

انہوں نے اپنے عشق و شیفتگی کے لئے اس کی محبوبیت کو دیکھا جس کو خود خدا نے اپنی چاہتوں اور محبتوں سے ممتاز کیا۔ ان کی زبانوں نے اس کی مدح و ثنا کی جس کی مدح و ثنا میں خود خدا کی زبان، اس کے ملائکہ اور قدسیوں کی زبان ان کی شریک و ہمنوا ہے۔

ان اللّٰہ وملائکتہ یصلون علی النبی یا ایہا الذین اٰمنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما

خدا کی الوہیت و ربوبیت جس طرح وحدہٗ لاشریک ہے کہ کوئی ہستی اس کی شریک نہیں۔ اسی طرح اس انسان کامل کی انسانیت اعلیٰ العبدیت کبریٰ

بھی وحدہ لاشریک ہے کیونکہ اس کی انسانیت وعبدیت میں کوئی اس کا ساجھی نہیں اور اس کے حسن وجمال فردانیت کا کوئی شریک نہیں۔

منزہ عن شریک فی محاسنہ
فجوهر الحسن فیه غیر منقسم

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں تم دیکھتے ہو کہ تمام انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کا ذکر جہاں کہیں کیا گیا وہاں ان سب کو ان کے ناموں سے پکارا ہے اور ان کے واقعات کا بھی ذکر کیا ہے تو ان کے ناموں کے ساتھ کیا ہے لیکن اس انسان کامل اس فرد اکمل، اس صفات عبدیت کے وحدہ لاشریک کا اکثر مقامات میں اس طرح ذکر کیا ہے کہ نہ تو اس کا نام لیا گیا اور نہ کسی دوسرے وصف سے نامزد کیا گیا بلکہ صرف عبد کے لفظ سے اس کے پروردگار نے اسے یاد فرمایا اس خصوصیت و امتیاز سے اسی حقیقت کو واضح کرنا مقصود الٰہی تھا کہ اس وجود گرامی کی عبدیت اور بندگی اس درجہ آخری و مرتبہ قصویٰ تک پہنچ چکی ہے جو انسانیت کی انتہا ہے اور جس میں اللہ کوئی عبد اس عبد کامل کا شریک و سہیم نہیں پس عبدیت کا فرد کامل وہی ہے اور اس لئے بغیر اضافت و نسبت کے صرف "عبدہ" کا لقب اس کو ناموں اور علموں کی طرح پہنچنا دیتا ہے کیونکہ تمام کائنات ہستی میں اس کا سا اور کوئی عبد نہیں!

پس جس کی قدوسیت وجبروتیت کا یہ مرتبہ ہو اس کی یاد میں جتنی گھڑیاں بھی کٹ جائیں، اس کے عشق میں جتنے آنسو بہہ جائیں، اس کی محبت میں جتنی آہیں بھی نکل جائیں اور اس کی مدح وثنا میں جس قدر بھی زبانیں زمزمہ پیرا ہوں، انسانیت کا حاصل، روح کی سعادت، دل کی طہارت، زندگی کی پاکی اور ربانیت عالمیت کی بادشاہی ہے۔ ولله در ما قال!

راہ تو بہر قدم کہ پویند خوش است
وصل تو بہر سبب کہ جویند خوش است
روئے تو بہر دیدہ کہ بینند نکو است
ذکر تو بہر زباں کہ گویند خوش است

تم ربیع الاول میں آنے والے کی یاد اور محبت کا دعویٰ رکھتے ہو اور مجلسیں منعقد کرکے اس کی مدح وثنا کی صدائیں بلند کرتے ہو لیکن تمہیں کبھی بھی یہ یاد نہیں آتا جس کی یاد کا تمہاری زبان دعویٰ کرتی ہے اس کی فراموشی کے لئے تمہارا عمل گواہ ہے اور جس کی مدح وثنا میں تمہاری صدائیں زمزمہ سرا ہوتی ہیں اس کی عزت کو تمہارے وجود سے بٹہ لگ رہا ہے وہ دنیا میں اس لئے آیا تھا کہ انسانوں کو انسانی بندگی سے ہٹا کر صرف اللہ کی عبودیت کی صراط مستقیم پر چلائے اور غلامی کی ان تمام زنجیروں سے ہمیشہ کے لئے نجات دلادے جن کے بڑے بڑے بوجھل حلقے انہوں نے اپنے پاؤں میں ڈال لئے تھے۔

یضع اصرهم والاغلال التی کانت علیهم۔ (القرآن)	پیغمبر اسلام کے ظہور کا مقصد یہ ہے کہ گرفتاریوں اور بندشوں سے انسان کو نجات دلائے اور غلامی کے جو طوق انہوں نے اپنی گردنوں میں پہن رکھے ہیں ان کے بوجھ سے رہائی بخشے۔

اس نے کہا کہ اطاعت صرف ایک ہی کی ہے اور حکم فرمان صرف ایک ہی کے لئے سزاوار ہے۔

ان الحکم الا للّٰہ	(القرآن)	حکم وطاقت کسی کے لئے نہیں مگر صرف اللہ کے لئے۔

اس نے سب سے پہلے انسان کو اس کی کھوئی ہوئی آزادی وحریت واپس دلائی اور کہا کہ مومن نہ تو بادشاہوں کی غلامی کے لئے ہے نہ کاہنوں کی اطاعت کیلئے نہ کسی اور انسانی طاقت کے آگے جھکنے کے لئے، بلکہ اس کے سر کے لئے ایک ہی چوکھٹ، اس کے دل کے لئے ایک ہی عشق، اس کے پاؤں کے لئے ایک ہی طوق اطاعت ہے ــــ وہ جھکتا ہے تو اسی کے آگے، روتا ہے تو اسی کے لئے، اعتماد کرتا ہے تو اسی کی ذات پر، ڈرتا اور لرزتا ہے تو اسی کی ہیبت سے، اُمید کرتا ہے تو اسی کی رحمت پر، وہ مشرک نہیں ہے کہ خدا کی طرح انسانوں کو بھی ہیبت اور قہاریت کی صفت بخشے۔

پس اگر ربیع الاول کا مہینہ دنیا کے لئے فرحت و مسرت کا مہینہ تھا، تو صرف اس لئے کہ اس مہینے میں دنیا کا وہ سب سے بڑا انسان آیا ــــــ جس نے مسلمانوں کو ان کی سب سے بڑی نعمت یعنی خدا کی بندگی اور انسانوں کی آقائی سے نجات دی اور اس کو اللہ کی خلافت و نیابت کا لقب دے کر خدا کی ایک پاک و محترم امانت ٹھیرایا۔ پس ربیع الاول انسانی حریت کی پیدائش کا مہینہ ہے غلامی کی موت اور ہلاکت کی یادگار ہے خلافتِ الٰہی کی بخشش کا اولین یوم ہے۔ مساواتِ ارضی کی تقسیم کا اولین اعلان ہے اسی ماہ میں کلمۂ حق و عدل زندہ ہوا اور اسی میں کلمۂ ظلم و فساد اور کفر و ضلالت کی لعنت سے خدا کی زمین کو نجات ملی ــــــ پس اُس کے آنے کی خوشی اور اس کے تذکرہ و ذکر کی لذت ہر اس شخص کی روح پر حرام ہے۔ جو اپنے ایمان اور عمل کے اندر اس پیغام الٰہی کی تعمیل و اطاعت اور اس اسوۂ حسنہ کی پیروی کے لئے کوئی نمونہ نہیں رکھتا۔ فبشر عبادی الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ اولئک الذین ھداھم اللہ و اولئک ھم اولوالالباب ــ

ACM
آدم جی کاٹن ملز۔ لانڈھی کراچی

ہماری نظر میں

حیاتِ فخر

تالیف :- جناب مشتاق احمد خاں ، ضخامت ۴۰۰ صفحات مجلد، رنگین و دلکش سرورق، کتابت و طباعت دیدہ زیب ،
قیمت پانچ روپے، ملنے کا پتہ :- فخر منزل ، ۱۰۸ اے ڈی ، ماڈل ٹاؤن لاہور

جو لوگ حیدرآباد دکن کے حالات اور تاریخ سے دلچسپی رکھتے ہیں، اُن کو نواب فخر یار جنگ بہادر مرحوم کے نام اور شخصیت سے ضرور واقف ہونا چاہئے۔ نواب صاحب مرحوم کی دیانت، فرض شناسی اور خدا ترسی نے "ضرب المثل" کی حیثیت اختیار کر لی تھی، صاحب موصوف اپنی ذاتی قابلیت اور محنت و جدوجہد کی بدولت درجہ بدرجہ ترقی کرتے ہوئے وزارت مالیات کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہو گئے۔ نواب صاحب مرحوم کے خلف اکبر اور لائق فرزند جناب مشتاق احمد خاں صاحب نے اپنے والد کے سوانح حیات لکھ کر ادب میں "سیرنگاری" کی صنف میں قابل قدر اضافہ کیا ہے۔

مشتاق احمد خاں صاحب حکومت حیدرآباد دکن کے محکمہ مالیات کے سب سے بڑے افسر تھے، ۱۹۴۸ء میں پاکستان میں ایجنٹ جنرل برائے حیدرآباد کی حیثیت سے اُن کا تقرر عمل میں آیا اور کئی سال تک اس منصب کے فرائض کو دیانت و قابلیت کے ساتھ انجام دیتے رہے۔ عربی کی مشہور ضرب المثل۔

"الولد سر لابیہ"

مشتاق صاحب کی ذات اور شخصیت پر صادق آتی ہے۔ بہت سی خوبیاں وہ اپنے والد صاحب سے پائے ہوئے ہیں، خاص طور سے دینداری اور خیر پسندی باپ بیٹے دونوں کی زندگیوں میں قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس کتاب میں سولہ (۱۶) ابواب ہیں، کتاب کا اختتام "ضمیمہ جات" پر ہوتا ہے۔ پہلے باب میں لائق مولف نے اپنے خاندان کے حالات بیان کئے ہیں، دوسرے باب میں انہوں نے اپنے دادا خان بہادر غلام احمد خاں مشیر مال ریاست جموں و کشمیر کی زندگی اور سوانح حیات پر روشنی ڈالی ہے اس کے بعد کے ابواب میں نواب فخر یار جنگ بہادر کی سیرت بڑے دلچسپ انداز میں پیش کی ہے۔

اس کتاب کے پڑھنے سے حکومت حیدرآباد دکن کی داخلی سیاست، مقامی سازش اور دفتری رقابت کا بھی اتا پتہ ملتا ہے، یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ صاحب سیرت نواب فخر یار جنگ مرحوم نے سخت سے سخت آزمائشوں میں بھی حق و صداقت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا، اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے سچائی ہی کی آخر کار جیت ہوئی۔

نواب صاحب مرحوم کی عائلی زندگی بڑی خوشگوار تھی، بیوی بچوں سے انتہا درجہ کا لگاؤ اور محبت و شفقت تھی۔ نواب صاحب کی عمر پچاس سے بھی کم تھی، جب ان کی بیگم صاحبہ کا انتقال ہوا، مگر انہوں نے دوسری شادی نہیں کی، اُن کی محبت یکسو ہو کر اولاد کی تربیت میں صرف ہوئی۔

نواب صاحب مرحوم کی مذہبیت اور دینداری کا ایک واقعہ :-

> "ابا جان کی نماز میں پابندی حیدرآباد میں ضرب المثل بن گئی تھی، نماز کے وقت خواہ وہ کسی جگہ ہوں، بلا تکلف فوراً نیت باندھ لیتے تھے، ایک مرتبہ مہاراجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنت سے ملنے کے بعد الوال سے واپس آ رہے تھے، مغرب کا وقت آیا تو ڈرائیور کو موٹر ٹھیرانے کے لئے حکم دیا، ڈرائیور نے عرض کی صرف پانچ منٹ کی مسافت باقی ہے گھر پہنچ کر نماز پڑھ

لیجئے گا، ابا جان نے فرمایا ——— کیا معلوم آگے کیسی ہے۔ موٹر لگا جائے اور میں زندہ سلامت اپنی منزلِ مقصود تک نہ پہونچوں، اپنی نماز کے ناغہ ہونے کا خطرہ کیوں مول لوں، چنانچہ وہیں سڑک پر ہی اتر کر جنگل میں نماز پڑھی۔"

اس آخرت فراموش دور میں تو یہ باتیں "معجزہ اور کرامت" معلوم ہوتی ہیں!

باپ کی سیرت بیٹے نے لکھی ہے مگر احترام و عقیدت اور محبت کی شدت نے مبالغہ کا رنگ اختیار نہیں کیا، بڑی ذمہ داری اور وثوق کے ساتھ حالات قلمبند کئے ہیں اور اکثر مقامات پر حوالوں کے نام تک درج کر دئے ہیں۔

"موسیو رے ہان" (ص ۷۷) صحیح تلفظ "رسیو ہان" ہے ——— "نواب نصیر یار جنگ بھی اپنے بیٹے بہادر خاں کو اپنے ساتھ لاتے تھے (ص ۱۰۱)" نواب بہادر یار جنگ کے والد کا خطاب "نواب نصیب یار جنگ" تھا ——— "انہیں وہاں ملنے کے لئے آتے" (ص ۲۲۳) "آں سے وہاں ملنے کے لئے آتے" صحیح روزمرہ ہے ——— "اُن کے علمی تجربہ سے استفادہ حاصل کرنے کی کوشش کی" (ص ۲۳۶) "استفادہ" کے ساتھ "حاصل" حشو و زائد ہے، "استفادہ" میں فائدہ اور فیض حاصل کرنے کا مفہوم موجود ہے۔

"حیاتِ فخر" سیرت نگاری کا اچھا نمونہ ہے، اس کے مطالعہ سے دل و دماغ خیر و نیکی اور شرافت و خدا ترسی کا اثر قبول کرتے ہیں، جناب مشتاق احمد خاں صاحب کی کوئی ادبی تحریر اس سے پہلے ہماری نگاہ سے نہیں گزری، یہ کتاب اُن کی انشا پردازی کے جوہر کی آئینہ دار ہے، جس سے اگر وہ بدذوقی اور کم شعوری سے کام لیتے تو اُن کا شمار اُردو زبان کے مشہور اہلِ قلم اور ادیبوں میں ہوتا۔

تذکرۂ زنداں

از:- خورشید احمد ایم، اے، ایل، ایل بی ضخامت ۲۶۴ صفحات قیمت ستا ایڈیشن چھ روپے، اعلیٰ ایڈیشن (معہ چانک کور) دس روپے۔ ملنے کا پتہ:- مکتبہ چراغِ راہ کراچی (۲) اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ ۱۳- ای، شاہ عالم مارکیٹ لاہور

۶ جنوری ۱۹۶۴ کو پاکستان میں یہ المناک سانحہ پیش آیا کہ پاکستان کی سب سے بڑی دینی اور سیاسی تنظیم "جماعتِ اسلامی" کو خلافِ قانون قرار دیا گیا اور اس کے کارکن گرفتار کر لئے گئے، پروفیسر خورشید احمد صاحب بھی انہی جانثاروں کی جماعت اور اسیرانِ حق و صداقت میں شامل تھے، اُن کی اسیری کی میعاد ۷ جنوری ۱۹۶۴ء سے شروع ہو کر ۹ اکتوبر ۱۹۶۴ء کو ختم ہوئی اور عدلیہ نے انتظامیہ کے اس اقدام کو غلط قرار دیا۔

اس کتاب کو خورشید صاحب نے اپنے چھوٹے بھائی ——— انیس ——— کے نام معنون کیا ہے! انتساب کا یہ انداز کس قدر فکر انگیز ہے۔

اپنے پیارے بھائی

انیس

کے نام

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

ان چند لفظوں کو راقم الحروف نے بار بار پڑھا اور دل نے بڑا اثر قبول کیا! انیس اپنے بڑے بھائی (خورشید) کے قوتِ بازو ہی نہیں ہیں، بلکہ ہم فکر اور ہم خیال بھی ہیں، یک جان دو قالب کی کہاوت کتابوں میں پڑھی اور باہا کانوں سے سنی، مگر ان دونوں بھائیوں میں اس ضرب المثل کو مجسم دیکھ لیا۔

مضامین کی فہرست:-

عشق اپنے مجرموں کو سوئے زنداں لے چلا ——— وہ مرا پہلا دن: داخلِ زنداں ہونا ——— پھانسی گھاٹ کے شب و روز ——— ہم ہیں باشندے جیل خانہ کے ——— کیسے ازلاہم آید ——— وہ پابند قفس جو فطرتاً آزاد ہوتا ہے ——— انیس کے نام ——— کٹ گئی قید میں ماہِ رمضاں۔ ——— زنداں کی عید ——— پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق ——— جس نے ہنگامۂ عدالت کا تری دیکھا ہے ——— جرم اور دفاع ——— لاہور جیل میں ۳۳ دن ——— پھر وہی وادی وہی خارِ مغیلاں ہوں گے ——— وہ میں ہے خوش ہم کہاں دیکھئے تھے ——— یارانِ زنداں ——— رخصت اے زنداں جنوں

زنجیر بند کھڑکا رہے ہے!

ان عنوانات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس کتاب میں کیا ہو گا؟ دلچسپی کے ساتھ سوز و تاثیر بھی! دل کی چوٹیں پیچ پیچ کا غذ پر اُبھر رہی ہیں! کتاب کے مطالعہ سے "صبر و استقامت" اور ایثار و قربانی کا وہ مفہوم سمجھ میں آتا ہے جو صرف خیالی نہیں رہا بلکہ عمل و تجربہ کی راہ سے گزرا ہے!

پھانسی گھاٹ کی خوفناک اور بھیانک راتیں، کھانے پینے، رہنے سہنے اور سونے کی دشواریاں شروع میں ہر ناقابلِ برداشت تکلیفیں، مگر کسی طرح کا خوف و ہراس نہیں، زبان شکوہ سرا ہونے کی بجائے اللہ تعالیٰ کے شکر و ذکر سے تر! وہ جو غالبؔ نے کہا ہے۔

میں چمن میں کیا گیا، گویا دبستاں کھل گیا

—— ۲ ——

ان اسیرانِ محبت نے بھی زنداں کو دین و اخلاق کی درسگاہ بنا دیا، قرآن و حدیث کا درس، دینی موضوعات پر گفتگو اور مذاکرے، سب سے بڑھ کر خشیت و انابت کی کیفیت! فاضل تذکرہ نگار نے اپنے رفقاء زنداں کی سیرت و کردار کی جو عکاسی اور ترجمانی کی ہے وہ پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے!

لاہور جیل میں ان مجاہدانِ حق و صداقت کو امیرِ جماعت اسلامی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی رفاقت میسر آئی اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے اُن کی کلفت کا ازالہ فرما دیا۔

عدالت کے سامنے خورشید احمد صاحب نے جو بیان دیا تھا۔ وہ پورے کا پورا اس کتاب میں درج کیا گیا ہے "تذکرۂ زنداں" کی اس بیان نے بڑی تاریخی اور قانونی بلکہ علمی اہمیت عطا کی ہے! کس سلیقہ کے ساتھ اپنے دفاع میں قانونی نکات اور دلائل و نظائر پیش کئے گئے ہیں، کتنی دلنشین اور اثر انگیز زبان ہے! یہ بیان اس امر کا زندہ شہادت ہے کہ دین انسان کو کس قدر بصیرت اور روشنی عطا کرتا ہے اور صحیح معنیٰ میں "دینی آدمی" کتنا بے باک و جری، صاحبِ فراست اور صاحبِ فہم ہوتا ہے!

"تذکرۂ زنداں" میں دینی و اخلاق اور حیات کے بہت سے مسائل بھی آ گئے ہیں، اسلوبِ نگارش اور زبان پُرکار و سادہ ہیں!

فارسی اشعار کے ترجمے جو حاشیے میں دئے گئے ہیں وہ شاید بعض پڑھنے والوں کو کھٹکیں کہ مصنف نے فارسی سے نابلد کیوں سمجھا؟ مولانا ابوالکلام آزاد کے "غبارِ خاطر" کی طرح "تذکرۂ زنداں" میں بھی اشعار قریب قریب ہر صفحہ پر ملتے ہیں مگر افسوس ہے کہ شعروں کی خاصی تعداد ایسی ہے جن کی کتابت صحیح نہیں ہوئی جس کے سبب اشعار ناموزوں ہو گئے! اس کوتاہی کی ساری ذمہ داری کاتب پر نہیں ڈالی جا سکتی، مصنف کے حافظہ اور مذاق سے بھی بھول چوک ہوئی ہے۔

تذکرۂ زنداں نے اردو ادب کی ثروت میں اضافہ کیا ہے، یہ کتاب پڑھنے والے کے لوحِ دل و دماغ پر گہرا نقش چھوڑتی ہے، محکمہ جیل کے عمال و حکام اس کتاب سے قید خانہ کا نظم و نسق درست کرنے میں بہت کچھ استفادہ کر سکتے ہیں!

نذیرِ عرشی

مرتبہ:- مالک رام اور مختار الدین احمد، ضخامت ۰۰ صفحات (مجلد، رنگین و حسین سرورق، کاغذ اور کتابت و طباعت انتہائی دیدہ زیب) قیمت درج نہیں کی گئی۔ ملنے کا پتہ:- مجلس نذرِ عرشی، نئی دلی۔

علمی و ادبی دنیا میں مولانا امتیاز علی خاں عرشی (ولادت ۱۹۰۴ء) کا آغازِ تعارف کتب خانہ ریاست رامپور کے ناظم و نگراں کی حیثیت سے ہوا اور اس تعارف کو پھیلانے اور اس شہرت کو مروج مولانا موصوف کی اُن کتابوں سے ملا جو مرزا غالبؔ پر انہوں نے مرتب کی ہیں! غالبؔ کی نظم و نثر کا ذکر آتے ہی مولانا عرشی کا تصور ذہن میں اُبھرتا ہے!

مولانا امتیاز علی خاں عرشی متعدد کتابوں کے مصنف، مولف اور مرتب ہیں بہت سے علمی موضوعات پر انہوں نے اونچے درجہ کے مضامین بھی لکھے ہیں، مولانا موصوف کا مطالعہ بہت وسیع ہے، اللہ تعالیٰ نے انہیں علم و ادب کا صحیح ذوق اور ساتھ ہی شوقِ تجسس بھی عطا فرمایا ہے، رامپور لائبریری سے خدمت کا تعلق ہونے کے سبب انہیں علمی و ادبی کام کرنے کے مواقع اور سہولتیں بھی میسر آئیں! جن سے انہوں نے پورا فائدہ اٹھایا اور اپنی زندگی کو علم و ادب کی خدمت کے لئے وقف کر دیا۔ علم و فضل کے ساتھ وہ خود دار و ذکی اور محنتی اور جفاکش بھی واقع ہوئے ہیں اس لئے جس موضوع کو چھیڑا اور جس بحث پر قلم اٹھایا اپنی علم و استعداد کی حد تک اُس کا

حق ادا کر دیا۔

جناب امتیاز علی خاں عرشی کی علمی شخصیت اور ادبی حیثیت کے مستند و مسلّم ہونے کا زندہ ثبوت یہ ہے کہ ہندوستان میں "مجلس نذرِ عرشی" کا قیام عمل میں آیا جس کے صدر ڈاکٹر ذاکر حسین خاں (بحالت متن نائب صدر جمہوریہ ہند) منتخب ہوئے اور مجلس کے ارکان میں ہندوستان کے چوٹی کے ادیب اور صفِ اول کے اہلِ علم اور نامور شخصیتیں شامل ہوئیں، دوسرے ملکوں کا تو ہمیں علم نہیں مگر پاکستان اور ہندوستان میں کسی ادیب دانش پرداز اور عالم و محقق کو خراجِ تحسین و عقیدت پیش کرنے کے لئے اتنے بڑے آدمیوں پر مشتمل کوئی مجلس آج تک وجود میں نہیں آئی!

"مجلس نذرِ عرشی" نے مولانا عرشی کی اکسٹھویں سالگرہ پر ایک کتاب ——— نذرِ عرشی ——— مرتب کر کے، اُن کی خدمت میں پیش کی۔ یہ "نذر" اور "ہدیہ" زر و جواہر سے کہیں زیادہ قیمتی ہے! اور قدرشناسی کے اظہار و اعتراف کی حسین صورت ہے۔

"نذرِ عرشی" کا مقدمہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے لکھا ہے، پھر شہرہ آفاق پر واز جناب مالک رام (ایم۔ اے) نے مولانا عرشی کے سوانحِ حیات مرتب کئے ہیں ——— اس کے بعد ———

نگارشاتِ عرشی　　از اکبر علی خاں

عرشی ـ شمعِ علم و یقین، دلیلِ سحر　　از ڈاکٹر سید عابد حسین

عرشی صاحب　　از سید صباح الدین عبدالرحمٰن

یہ وہ مضامین ہیں جو عرشی صاحب کے تذکرہ و تعارف سے تعلق رکھتے ہیں اور انہیں پڑھ کر موصوف کی علمی شخصیت اُبھر کر سامنے آتی ہے ——— پھر مقالات شروع ہوتے ہیں یہ مضامین و مقالات بلند پایہ اور معلومات آفریں ہیں! مقالات کی بلندی کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ شبیر احمد خاں غوری کا تنہا مقالہ، "محقق طوسی کی شہرہ آفاق کتاب "تجرید" پر ہے علم و دانش کا مستقل صحیفہ ہے۔ یہی حال انگریزی مقالوں کا ہے، آٹھوں مقالے خوب نہیں، بہت خوب ہیں۔

"مگر غالب نے یہ کہا کہ یا کہ میرا فارسی کا کلام دیکھو جو نقش ہائے رنگ رنگ ہے، میرے مجموعہ اُردو میں کیا رکھا ہے وہ محض بے رنگ ہے" (ص ۲۷۳ ـ ڈاکٹر سید عبداللہ) "میرے مجموعہ اردو میں کیا رکھا ہے" لکھا تھا "کیا پڑا ہے" ایسے موقع پر نہیں بولا جاتا ——— صفحہ ۱۷۱ (سطر ۸) "تذکرہ تحابات کے بنے کا جو ذکر ہے، اس میں کاتب کی غلطی کے سبب ۱۲۶۱ھ کی جگہ ۱۲۷۱ھ چھپ گیا۔

اس کتاب کے مقدمہ میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں لکھتے ہیں: ـــ

"مولانا امتیاز علی خاں عرشی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں، ان کے متعدد تصنیفی کارنامے علمی اور ادبی حلقوں سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں، پچھلے ۲۵ - ۳۰ برس میں انہوں نے جو تحقیقی اور تنقیدی کام کیا ہے، اس سے جہاں ہماری زبان کے خزانے میں بیش بہا اضافہ ہوا، وہیں ہمارے نئے لکھنے والوں کو راہ ملی ہے، کئی قیمتی اور قابلِ قدر کتابیں محض انہیں کی کاوش اور ذوقِ جستجو کی بدولت پہلی مرتبہ منظرِ عام پر آئی ہیں، کئی پرانی کتابوں کو انہوں نے اپنے حسنِ ترتیب سے نئی زندگی بخش دی ہے، خاص طور پر متون کے تحشیہ و تدوین کا جو بلند معیار انہوں نے قائم کیا ہے وہ کسی زبان کے لئے بھی باعثِ فخر ہو سکتا ہے۔

...... مجھے خوشی ہے کہ ان کے احباب اور قدرشناس اُن کی اکسٹھویں سالگرہ پر ایک مجموعہ مضامین اُن کی نذر کر رہے ہیں یہ گویا ہم سب کی طرف سے ان کی علمی خدمت کا اعتراف ہے۔"

ڈاکٹر صاحب موصوف کا یہ "اعتراف" اُردو دنیا کے جذبات کی صحیح ترجمانی کرتا ہے۔

مہاشہ گیان چند جی کا مضمون، "مشترک رسم خط" فنی حیثیت سے کوئی شک نہیں معلومات آفریں ہے مگر انہوں نے ہندوستان کی زبانوں (خاص طور سے دیوناگری) کے لئے رومن رسم الخط اختیار کرنے کی جو تجویز کی ہے، وہ دوسری زبانوں کے لئے مفید ہو تو ہو، جس کا فیصلہ ان زبانوں کے علماء اور محققین کریں گے مگر اردو زبان

رومن رسم الخط" میں منتقل ہوگئی، تو یہ اُس کی "خودکشی" ہوگی۔

. . . .

"فنون اور ترکہ اسلام" ـــــ عبدالرحمٰن چغتائی کا یہ مقالہ زیادہ تفصیل اور تحقیق چاہتا تھا۔ اُس کا عنوان "فنون اور مسلمان" ہونا چاہئے تھا، کہ مغلوں کی مصوری، جس میں جاندار تصویریں بھی شامل ہیں، اسلام کا ترکہ نہیں بلکہ مسلمانوں کا ترکہ ہیں۔

"نذر عرشی" ـــــ کوئی شک نہیں ہر اعتبار سے اونچے درجہ کی کتاب ہے اور یہ مقالات بڑے سلیقہ کے ساتھ مرتب کئے گئے ہیں اور کتابت کی صحت کا خاص خیال رکھا گیا ہے، کتاب خط بری شکل وصورت (گیٹ اپ) کے لحاظ سے بھی انتہائی دیدہ زیب اور جاذبِ نظر ہے۔

تحریکِ اسلامی ایک نظر میں

مرتبہ:۔ اسعد گیلانی، ضخامت ۲۰۰ صفحات، قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ آئین ۱۲ ریلوے روڈ، لاہور

عالمِ اسلام میں یہ سعادت وشرف مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے حصہ میں آیا ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے پورے کے پورے دین کو قائم وبرپا کرنے کے لئے منظم تحریک کا آغاز کیا۔ "اقامتِ دین" کی اس تحریک اور تنظیم کو اگر ہم "تجدید وانقلاب" کے نام سے تعبیر کریں تو یہ کوئی مبالغہ کی بات نہ ہوگی۔

جناب اسعد گیلانی نے مولانا موصوف (داعیِ تحریکِ اسلامی) کی تصنیفات، تحریروں اور دوسرے لٹریچر کے اہم اور منتخب اقتباسات سے یہ کتاب مرتب کی ہے، جو شروع سے لے کر آخر تک دین ودانش کی آئینہ دار اور فکرِ صحیح کی ترجمان ہے ـــــ مضامین:۔

نگاہِ اولین ـــــ آغازِ کار کا پس منظر ـــــ دعوت اور نصب العین ـــــ لائحہ عمل ـــــ انتخابی پالیسی ـــــ پروگرام اور طریقِ کار۔ ـــــ تنظیمِ جماعت ـــــ کارکنوں کے اوصاف ـــــ تحریکِ اسلامی کا مستقبل ـــــ نگاہِ واپسیںؔ

پوری کتاب علمی اور دینی جواہر پاروں سے لبریز ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے "جماعتِ اسلامی" کے مزاج، طریق کار اور اساس کی اصل تحریک سے واقفیت ہوتی ہے۔

تہذیب وثقافت

مرتبہ:۔ مولانا عاصم الحداد شریفی، ضخامت ۱۴۴ صفحات، قیمت ایک روپیہ، ملنے کا پتہ:۔ اسدی اکاڈمی ایبک روڈ، لاہور

اس کتاب میں "تہذیب وثقافت" پر دس مقالے، مندرجہ ذیل مشاہیر کے لکھے ہوئے منتخب کئے گئے ہیں۔

مولانا عبدالحلیم شرر، مولانا ابوالکلام آزاد، خواجہ حسن نظامی، مولوی محمد شفیع، ڈاکٹر عبدالحق، مولانا صلاح الدین احمد، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا عبدالمجید سالک، شوکت تھانوی، اختر الایمان۔

"مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی، نواب وقار الامرا کے آتالیق کی حیثیت سے کم وبیش ڈیڑھ سال انگلستان میں مقیم رہے" (ص ۹) صحیح خطاب "نواب وقار الملک" ہے، جن کے صاحبزادے نواب ولی الدولہ کے مولانا شرر آتالیق تھے، "نئی نئی اختراعات پیدا کیں" (ص ۷۵)، "اختراعات" کے ساتھ "نئی" کہنا حشو وزائد ہے!

یہ مقالے مجموعی طور پر دلچسپ، مفید اور بڑے کام کے ہیں، اسی قسم کے "انتخابات" کے مجموعے آتے رہنے چاہئیں!

مسجد سے میخانے تک

از:۔ ملا ابن العرب مکی، ضخامت ۱۴۴ صفحات، قیمت پانچ روپے۔

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ تجلی دیوبند (ضلع سہارنپور، انڈیا)

ص۔ "نگاہِ واپسیں" ـــــ یہ عنوان کھٹکا، "نگاہِ واپسیں" مرنے والے کی آخری نگاہ کو کہتے ہیں (دمِ واپسیں کی نگاہ) امیر مینائی کہتے ہیں۔

اسی دن کے لئے آنکھوں میں ہم نے تجھ کو پالا ہے
بڑی آرزو بھری حسرت اے نگاہِ واپسیں نکلی

بھارت کے مشہور و مقبول دینی ماہنامہ "تجلی" (دیوبند) میں ملا ابن العرب مکی کی "آپ بیتیاں" آتی رہتی ہیں، جن کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ یہ ملا ابن العرب مکی آخر ہیں کون؟ یہ بات اب راز نہیں رہی، مولانا عامر عثمانی اس قلمی نام (PEN NAME) سے اس قسم کے طنزیہ مضامین لکھتے رہے ہیں، جن کی ہر طبقہ میں پذیرائی ہوئی ہے اور "تجلی" پڑھنے والے "مسجد سے میخانے تک" کو بڑے شوق سے پڑھتے ہیں ـــ انہی مضامین کا انتخاب اس کتاب میں چھاپا گیا ہے۔

یہ کتاب طنز و مزاح اور شوخیٔ قلم کا شاہکار ہے، دلچسپ اتنی کہ ہاتھ میں لے کر ختم کرنے سے پہلے کوئی اور کام کرنے کو جی نہیں چاہتا! اس میں خالی ادبی چٹخارے اور ظرافت کے چٹکلے ہی نہیں ہیں بلکہ علم و ادب اور دین و سیاست کے بہت سے مسائل بھی آ گئے! موجودہ سوسائٹی جس سے آج کی دنیا گزر رہی ہے اس پر وہ چوٹیں کی ہیں کہ متجددین اور اہلِ بدعت کے چہروں کا رنگ فق ہو جاتا ہے ـــ چند اقتباسات:۔

● ـــ "بابا! پپیہارے! پی پی نہ بول، میری پی پی نہ بول، ستیاناس! پپیہا پی پی نہ بولے گا تو کیا ڈھیچوں ڈھیچوں کرے گا......"

● ـــ "مشاعروں کے بارے میں میرا تاثر کچھ ایسا ہے، جیسے چٹخارا لگ بھر حلوہ کھانے کے لئے من بھر تھوڑ چبانے ضروری ہوں، دس نکمے شعر سنئے، تب کہیں جا کر ایک اچھا شعر پلے پڑتا ہے۔"

● ـــ "ان کی آواز، بڑی ہنگامہ خیز ہے، گر وہ اسٹارٹ ہی اتنے بلند سروں میں لے لیتے ہیں کہ اترنے کے لئے گنجائش باقی نہیں رہتی۔"

● ـــ "ایک شاعر ـ جن کا نام یا تو جنبل فدائی تھا، یا مستنبل فدائی یا شاید دلدل بقائی۔ تینوں نام یادداشت کے خانے میں ایسے گڈمڈ ہوتے ہیں کہ یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا، بہرحال وہ اوسطاً دو شاعروں کے برابر تھے، بلکہ عامر عثمانی نشتر، صبا اور روش صدیقی تینوں کی ایک ساتھ مشکیں کس دی جائیں تو گولائی ان سے زیادہ نہیں بنے گی، رنگ پکا جامنی، آنکھیں گول، جن کا قطر نئے پیسے سے زیادہ نہ ہوگا، دہانہ کم و بیش نصف بالشت چوڑا ـــ

انہیں دیکھ کر، میں نے بحیرت سے پوچھا ـــ

"کیوں پیر صاحب! کیا آپ کو یقین ہے کہ ان کا اور شبنم رومانی کا خالق ایک ہی ہے؟"

"اماں کیوں کفر بکتے ہو" ـــ وہ آنکھیں پھڑپھڑا کر بولے۔

● ـــ "یہی مسخرہ پن ہے، جس نے بے شمار سچائیوں کو دفن کر دیا اور ان گنت جھوٹ، اوہام اور مفروضے حقائق بن گئے۔"

ملا ابن العرب مکی کی ایک غزل بھی پڑھنے اور لطف لینے کے قابل ہے، فرماتے ہیں۔

بخشش نہ ہوگی بندگیٔ اولیا بغیر — قبلہ نظر نہ آئے گا، قبلہ نما بغیر
خواجہ سے لو لگی ہے، تو قرآن سے عشق ہے — پیتے نہیں شراب بھی ہم فاتحہ بغیر
فیض قبور کلیر و اجمیر کی قسم — اپنی تو کٹ رہی ہے مزے سے خدا بغیر
جب حور ہی نہیں تو صلوٰۃ و زکوٰۃ کیا — ہوتی نہیں صفائی باطن غنا بغیر
میں فاتحہ پڑھوں گا، پلاؤ کی قاب لا — ملتا نہیں ثواب عبادت غذا بغیر

ملا ہمیں بھی جبہ و دستار لا کے دے
چلتا نہیں ہے کام نمود و ریا بغیر

یہی وہ برقِ تپاں ہے کہ جس کی ہیبت سے
تڑپ رہے ہیں ستمگر لرز رہے ہیں غنیم
یہی وہ غنچۂ قدس ہے جس کی خوشبو سے
دیارِ پاک مہکتا ہے مثل باغ نعیم
اسی نے دہر کو بخشا محبتوں کا شعور
یہی وہ بزم مساوات ہے جس میں مقیم

مہر و مہ و انجم کا جہاں تیرے لئے ہے
ہے نغمۂ ناہید و ثریا ترا ہم راز
اے پاک ہوا باز !

ہر قدم پر ہے ڈھاکہ نئے رنگ میں
حُسنِ فطرت نمایاں چٹاگانگ میں
کیا جادو ہے سلہٹ کے آہنگ میں
راجشاہی کے شام و سحر مرمریں
اے وطن کی زمیں
تیرے دریا جواہر اُگلتے رہیں
تیرے کہسار سونے میں ڈھلتے رہیں
تیرے جنگل بہاروں میں پلتے رہیں
تیرے کھیتوں سے اُگتا ہے نورِ یقیں
اے وطن کی زمیں

پوری نظم کا یہی رنگ ہے ! (اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ)

ہم چٹانوں کی مانند مضبوط ہیں
ہم کہ فولاد و آہن کی دیوار ہیں
دوستوں کے لئے ریشم و پرنیاں
دشمنوں کے لئے تیغ کی دھار ہیں

ے کو خدا ! ع نام جو میدان میں آ گئے
نصرت کے پھول گوشۂ داماں میں آ گرے

دوسرا رخ : ــــ

ترے ضمیر کی آواز سے کھنک اُٹھے
مشیتوں کے تجلی بدوش کاشانے
ترے صحیفۂ عرفاں کے ہر اشارے پہ
مچل رہے ہیں زمان و مکاں کے افسانے (ص ۱۷)

نظم میں علامہ اقبال سے خطاب کیا گیا ہے ــــ "مشیتوں کے تجلی بدوش کاشانے" یہ کیا بات ہوئی ! پھر جام و ساغر "کھنکا" کرتے ہیں، کاشانوں میں زمے جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اُس کو "کھنک اُٹھے" کہنا درست نہیں۔ "صحیفۂ عرفاں کا اشارہ" کیا ہوتا ہے ! پھر افسانوں کا مچلنا اس پر مستزاد۔

درسِ امن ہے ایمان کا پیامی تو ہے
روحِ مرد وہ ہے انصاف کا حامی تو ہے (ص ۴۴)

محبت کی جو آرزو میں نہیں آتی اور اگر کہیں ناگزیر ضرورت محسوس ہوگی، تو اس کا محل اور موقعہ دوسرا ہوگا۔

"روحِ مزدور" یہاں لانے کی کیا تُک تھی!

تم پیکرِ فولاد ہو میثاقِ ازل سے — ہر گام پہ تم آنکھ ملاتے ہو اجل سے

"ازل کے دن سے" کہنا تھا، یا "یومِ میثاق" سے!

اپنی توپوں کے دہن — جب کھُلے جانبِ رَن — (ص ۶۳)

"جانب" عربی اور "رن" ہندی ہے، اس لئے ان دونوں لفظوں کے درمیان اضافت جائز نہیں!

اہلِ جنوں کا عزم جب انگیر جاگ اُٹھا — پیرِ جواں بہ سرعتِ شمشیر جاگ اٹھا (ص ۷۵)

"اہلِ جنوں" سے دنیا کی تسخیر اور کائنات پر حکمرانی کرنے کی نسبت کچھ میل نہیں کھاتی، مصرعہ ثانی کو "بہ سرعتِ شمشیر" کی ترکیب نے بچکانہ سا بنا دیا

جنت نشاں بہاریں معدوم ہو چکی ہیں — نغموں کی آبشاریں معدوم ہو چکی ہیں (ص ۸۶)

"آبشار" مونث ہے!

تجھ کو حاصل دعا شاہ گردیز کی — تجھ میں تنویر ہے شمس تبریز کی (ص ۹۰)

ملتان یا پاکستان کے کسی خطہ یا شہر میں شمس تبریز رحمتہ اللہ علیہ نہیں آئے، ملتان میں جن کا مزار ہے وہ ایک اور بزرگ ہیں، جن کا نام بھی "شمس" ہے۔

معبدِ بند سے خلوت گہِ چونڈہ تک — ہر اک مقام سے ہم لوگ کامراں گزرے (ص ۱۲۱)

"چونڈہ" کے ساتھ "خلوت گہ" کی ترکیب بالکل بے معنی ہے! یہ مصرعہ یوں ہو سکتا تھا۔

عین و ہند سے لاہور اور چونڈہ تک

"جہادِ مسلم" کو فرینڈز پبلیکیشنز ملتان نے بڑے سلیقہ سے شائع کیا ہے، جذبہ جہاد کو گرم و تازہ رکھنے کے لئے اس مجموعہ کی زیادہ سے زیادہ اشاعت ہونی چاہئے۔

بنیادی بیماریاں اور گرانک میازم

مولفہ:۔ ڈاکٹر سید حسن عزیز، ضخامت ۵۰۰ صفحات (پلاسٹک کور) قیمت دس روپے
سینٹرل ہومیوپیتھک اسٹور، آرام باغ روڈ کراچی

ڈاکٹر سید حسن عزیز صاحب کراچی کے مشہور ہومیوپیتھ ڈاکٹر ہیں، نوجوانی کے بعد ان کی زندگی اسی فن کی تحقیق اور تجربہ میں گزری ہے! یہ کتاب اُن کے مطالعہ، تحقیق اور تجربہ کا نچوڑ ہے، اس میں انہوں نے تفصیل کے ساتھ "بنیادی بیماریوں" کے اسباب و علامات بیان کی ہے اور ہدایات پوری تفصیل کے ساتھ لکھی ہے! اپنے تجربہ کی بنا پر صاحب موصوف نے کہیں کہیں ڈاکٹروں کی عام رائے سے اختلاف بھی کیا ہے۔

ڈاکٹر سید حسن عزیز صاحب ہومیوپیتھک طریقہ علاج کے تجربہ کار طبیب بلکہ عالم ہیں، آنجناب نے کتابوں سے ماورا مریضوں کی نفسیات کا بھی گہرا مطالعہ کیا ہے اس لئے آپ کی اس کتاب میں بعض ایسے "انکشافات" ملتے ہیں، جو دوسری کتابوں میں نہیں مل سکتے!

مرض کے علاج کے لئے بنیادی شرط یہ ہے کہ طبیب کو اس مرض کا اصل سبب معلوم ہو جائے، اس کے لئے بڑی محنت اور غور و فکر کی ضرورت ہے اور ڈاکٹر صاحب اس محنت اور غور و فکر کے عادی ہیں بلکہ اس فن میں "اسپیشلسٹ" ہیں۔

یہ کتاب[1] "بنیادی بیماریاں" ہر لحاظ سے کارآمد اور مفید ہے، ہومیوپیتھ ڈاکٹروں کو اس سے ضرور استفادہ کرنا چاہئے! اُردو ادب میں اس موضوع پر غالباً یہ پہلی کتاب منظرِ عام پر آئی ہے

---

[1] کتاب میں کتابت کی غلطیاں کہیں کہیں ملتی ہیں مثلاً "گھٹیا" کو جگہ جگہ "گھٹیا" لکھا گیا ہے، دوسرے ایڈیشن میں کتابت کی غلطیوں کی تصحیح کر دینی چاہئے۔

اردو ڈائجسٹ
سالنامہ ۱۹۶۶ء

مجلس ادارت:۔ ڈاکٹر خواجہ اعجاز حسین قریشی (اعزازی صدر مجلس) الطاف حسن قریشی (مدیر مسئول) ظفر اللہ خاں (مدیر) ـــ میاں ... معاون ـ ضیا شاہد، مقبول جہانگیر اور آباد شاہ پوری ـــ ضخامت ۲۴۴ صفحات، کاغذ، اور کتابت و طباعت، ہر چیز دیدہ زیب، سرورق رنگین وسادہ اور جاذب نظر، قیمت۔ دو روپیہ پچاس پیسے۔
ملنے کا پتہ:۔ اردو ڈائجسٹ، سمن آباد، لاہور ـــ کراچی آفس ۱۲/۱۳، رضویہ کالونی، کراچی ۱۸

اردو ڈائجسٹ پاکستان کا سب سے زیادہ کثیر الاشاعت اور مقبول اردو ماہنامہ ہے، ہم نے ریلوں اور ہوائی جہازوں میں، اردو ڈائجسٹ ہی عام طور پر مسافروں کے ہاتھوں میں دیکھا ہے! اس کا سالنامہ جو اس وقت ہمارے سامنے ہے ایک لاکھ سے کیا کم چھپا ہوگا! جب کہ اس کی عام اشاعت ستر پچھتر ہزار بتائی جاتی ہے۔

سالنامہ کے مضامین میں بڑا تنوع پایا جاتا ہے اور ساتھ ہی ترتیب کا سلیقہ بھی! ترجمے ہیں اور یجنل مضامین ہیں اور منتخبات ہیں، پڑھنے والے دلچسپیوں کا مرقع ہے سب سے زیادہ خوبی کی بات یہ ہے کہ دین و اخلاق کے تقاضوں کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے، نوجوان لڑکیاں اور لڑکے بے کھٹکے اس سالنامہ کو تنہائی میں پڑھ سکتے ہیں۔ سنجیدہ اور باوقار ادب کا گلدستہ! بعض مضامین معلومات میں اضافہ کرنے والے بھی ہیں۔

جناب الطاف حسین قریشی "انٹرویو" کے سبب اتنے مشہور ہو گئے ہیں کہ یہ لفظ کہیں اُن کا لقب اور تخلص بن کر نہ رہ جائے، اس سالنامہ میں بھی جناب ذوالفقار علی بھٹو (وزیر خارجہ پاکستان) کا "انٹرویو" شامل ہے، جس کے بعض حصے دعوت غور و فکر دیتے ہیں!

جناب عبدالرب نشتر مرحوم کے حالات زندگی بھی، الطاف حسن قریشی ہی نے مرتب کئے ہیں، جو پڑھنے اور سبق لینے کے لائق ہیں۔

حصہ نظم میں حضرت حفیظ جالندھری کی "ناتمام غزلیں" ذوق و وجدان کو اپنی طرف نہیں کھینچتیں! جناب احمد ندیم قاسمی کے کلام کا انتخاب خوب ہے، مگر حیرت ہے کہ اس میں ایسے سطحی شعر بھی آگئے ہیں۔

آپ کیوں سامنے نہیں آتے　　　آپ کیوں روح میں سماتے ہیں　　　(ص ۱۴۰)

کتنا بے کیف اور سطحی ہے یہ شعر!

زمانہ ہو چکا اُس اولیں مڈبھیڑ کو لیکن　　　سنائی دے رہی ہے تیری نظروں کی پکار اب تک

"اولیں مڈبھیڑ" نے شعریت کا لطف غارت کر دیا، حضرت جگر مراد آبادی کے یہاں یہی خیال کس خوبی اور لطافت کے ساتھ نظم ہوا ہے فرماتے ہیں:۔

مدت ہوئی اک حادثۂ عشق کو لیکن
اب تک ہے ترے دل کے دھڑکنے کی صدا یاد

احمد ندیم قاسمی صاحب کہتے ہیں۔

ترے مذاق کے صدقے بکھیر دیں تو نے　　　قدم قدم پہ کئی قمریاں، کئی شمشاد

اس شعر کا مفہوم ہمارے تو پلّے پڑا نہیں! "قمریوں کا بکھیر دینا" مضحکہ خیز انداز بیان!

سر عرش یہ کون مسند نشیں ہے　　　کوئی دیکھا بھالا ثریا جبیں ہے　　　(ص ۱۴۱)

یہ کیا شاعری ہے!

جب بھجر کی رات چاند ڈوبا　　　دل چیخ اٹھا کہ مر گیا چاند　　　(ص ۱۴۴)

نرا بچکانہ شعر!

اتنا ستیاں ہے یہ پل کہ گماں ہوتا ہے　　　میں ترے جسم کو چھو لوں تو پگھل جاؤں گا

آخر یہ بات کیا ہوئی ! پھر محبوب کے جسم کی حرارت، گرمی اور تابناکی شاعر کو "تپ" (یعنی وقت) کے استعمال ہونے کی وجہ سے محسوس ہوتی ہے !

چارہ گر ! آپ ستاروں کی قسم کھا کے بتا   کس نے انسان کو تبسم کے لئے ترسایا   (ص ۱۴۶)

چارہ گر سے مریض بجبر و غم کیا یہ سوال کرسکتا ہے۔

؎ کس نے انسان کو تبسم کے لئے ترسایا

یہ نفسیات کا ناقص مطالعہ ہے !

شب نہ کٹتی، تو نئی آگ نہ جلتی دل میں
صبح کی ساری شرارت ہے اسی شام کا نام

الفاظ موجود ——— مگر مفہوم !؟ — !

"اُردو ڈائجسٹ" کا یہ سالنامہ یقیناً مقبول ہوگا، اور خواص و عوام سب ہی اسے پسند کریں گے !

PIA

جلد ۱۸

شمارہ ۵

ماہنامہ

فاران

کراچی

ماہ اگست سنہ ۱۹۶۶ء

ایڈیٹر ——— ماہر القادری

ترتیب

نقشِ اول	ماہر القادری	۳
سورہ التوحید	مولانا محمد مصطفیٰ (علی گڑھ)	۷
آبشار	ماہر القادری	۱۰
سوز و ساز	مختلف شعراء	۱۱
مذہب کی ضرورت	پروفیسر اسرار احمد	۱۳
یہ امت خرافات میں کھو گئی	ماہر القادری	۱۷
تاثرات	مولانا محمد عصام اللہ شریفی	۴۳
روحِ انتخاب	عبدالمجید صدیقی (ایم اے)	۴۶
ہماری نظر میں	. . . .	۴۷

قیمت فی پرچہ ۶۲ پیسے

پبلشر ——— مشرف حسین

مقامِ اشاعت

دفتر ماہنامہ فاران، کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱

چندہ سالانہ سات روپے

مشرف حسین پبلشر نے انٹرنیشنل پریس کراچی میں طبع کرا کر دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

آج کی دنیا میں سب سے بڑی تین طاقتیں ہیں، جو عالمی سیاست پر اثر انداز ہیں بلکہ یوں کہئے کہ یہ طاقتیں دراصل سیاست کا محور ہیں۔ دورِ حاضر کا شاید ہی کوئی بین الاقوامی مسئلہ ایسا ہو، جس کا کسی نہ کسی عنوان سے، امریکہ، روس اور چین سے تعلق نہ ہو۔ ان طاقتوں کی کشمکش نے ایک طرف دنیا کو شدید خطرات اور بے پناہ بے اطمینانی میں مبتلا کر رکھا ہے تو دوسری طرف اس کشمکش کے سبب سیاستِ عالم کا توازن بھی قائم ہے ـــــ ورنہ کہیں کسی ایک ہی طاقت کو غلبہ میسر آجائے، تو دنیا میں جو تھوڑا بہت امن پایا جاتا ہے، وہ بھی رخصت ہو جائے!

امریکہ، روس اور چین کے بارے میں ٹھیک طور پر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ خود ان حکومتوں کے درمیان ’طاقت‘ کا تناسب کیا ہے۔ سائنسی ایجادات اور برق و بخار کی قوت میں امریکہ اور روس چین سے بڑھے ہوئے ہیں، مگر جہاں تک آبادی یعنی MAN POWER کا تعلق ہے، چین ان دونوں ریاستوں کی مجموعی قوت سے تقریباً دگنی قوت رکھتا ہے! اور بیس پچیس لاکھ نہیں، کروڑوں سپاہی محاذِ جنگ پر بھیج سکتا ہے۔ مال و دولت اور بعض دوسرے ذرائع اور مادّی وسائل میں روس کے مقابلہ میں امریکہ کا پلّہ بھاری ہے، مگر امریکہ سرمایہ داروں کا ملک ہے اور روس مزدوروں کی تحریک کا علمبردار ہے، اس لئے روس کے عوام میں جو جوش و عزم پایا جاتا ہے، امریکہ کی پبلک اس سے بڑی حد تک محروم ہے۔ سائنسی ایجادات میں امریکہ اور روس کے مقابلے ہوتے رہتے ہیں، یہ دونوں ریاستیں اپنی سائنسی قوت کا آئے دن مظاہرہ کرتی رہتی ہیں تاکہ دنیا ان کا نہ صرف رعب اور ان کی قوت کو محسوس کرے بلکہ دبی رہے، [illegible]

چین اور روس ہم عقیدہ ہیں مگر اس کے باوجود ایک دوسرے کے حریف اور رقیب بنے ہوئے ہیں! چین ”ملّا قسم کا اشتراکی“ ہے جو اشتراکیت کے ظاہر پر بہت زور دیتا ہے، اس کے برخلاف روس ”متجدد اور آزاد خیال کمیونسٹ“ ہے! اور یہ عام خود اپنے اشتراکیت کے لفظوں کو نہیں بلکہ روحِ اشتراکیت کو پیشِ نظر رکھتا ہے، اس اختلاف کے ساتھ وطنی عصبیت بھی ابھر آئی ہے، روس، چین کی بڑھتی ہوئی طاقت سے خطرہ محسوس کرتا ہے، چین کی موجودہ ”عوامی حکومت“ روسی حکومت کے مقابلہ میں کمسن ہے، اس لئے روس میں ملکی تنظیم، چین کے مقابلہ میں بہتر ہے، مگر چین جس تیزی کے ساتھ ترقی کر رہا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بہت جلد اپنی کمسنی کی ہر کمی کو پورا کرے گا!

امریکہ، روس اور چین دونوں کا دشمن ہے مگر ان دونوں میں اس کی زیادہ دشمنی جس کی کوئی حد و نہایت نہیں، چین کے ساتھ ہے، روس کے ساتھ دشمنی کے باوجود امریکہ پھر بھی کسی نہ کسی حد تک نرم گوشہ رکھتا ہے، مگر چین کے ساتھ اس کا معاملہ اس دشمنی کا ہے، جہاں نرمی، صلح و مفاہمت اور عام انسانی مروّت و اخلاق کا سرے سے وجود ہی نہیں پایا جاتا! دشمنی سو فیصد دشمنی اور صرف دشمنی!

روس اور چین کے اختلافات نے دنیا کے اشتراکیوں کو دو ٹولیوں (GROUPS) میں تقسیم کر دیا ہے، ایک ٹولی چین کی حامی ہے اور

دوسری مدرسی کی ! اس اختلاف نے دنیا میں اشتراکیت کی رفتار ترقی کو خاصہ دھیما کر دیا ہے ! اشتراکیت کی مقبولیت کو سب سے زیادہ صدمہ مشرقی جرمنی پہ روس کے ناعاقبت اندیشانہ قبضہ نے پہونچایا ہے، امریکہ دنیا کی وہ پہلی طاقت ہے جس نے ہیروشیما میں ایٹم بم استعمال کرنے میں پہل کی، تقدا بادکی طلعہ کا مصداق بن گیا، ہندوستان کو چھوڑ کر، امریکہ، چین اور روس، ان تینوں طاقتوں میں دنیا کے عوام "چین" کے بارے میں نسبتاً اچھی رائے رکھتے ہیں۔ چین کی پالیسی جارحانہ منظر عام پر آئی ہے وہ یہ ہے کہ چین دوستی اور دشمنی کے معاملہ میں دوغلی پالیسی نہیں رکھتا، وہ جس کا دوست ہے کھلا دوست ہے اور جس کا دشمن ہے کھلا ہوا دشمن ہے، اس لئے سیاسیات میں اس کا نقطۂ نگاہ اور طریق کار پیچیدہ اور پُراسرار نہیں ہے۔

"تلک الایام نداولہا بین الناس" کے مطابق، اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تحت دنیا کے حالات سدا ایک جیسے نہیں رہتے، ان میں لوٹ پھیر اور ادل بدل ہوتی رہتی ہے۔

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

پہلی جنگ عظیم میں چین کوئی قابل ذکر طاقت ہی نہ تھی، دنیا اسے "افیونیوں کا ملک" سمجھتی تھی، روس میں زاریت کا دور دورہ تھا، اشتراکی حکومت ابھی وجود میں کہاں آئی تھی، امریکہ کی طاقت بڑی تھی مگر برطانیہ، فرانس اور جرمنی کے مقابلہ میں کم تر، اس دور میں برطانیہ عظیم ترین طاقت سمجھی جاتی تھی ! جس کے حدود مملکت میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا، انگریز اس زمانہ کا سب سے بڑا مہذب سمجھا جاتا تھا۔ ساری دنیا کی نگاہیں بکنگھم پیلس اور ڈاؤننگ اسٹریٹ پر لگی رہتی تھیں۔ لندن کی سیاست کی ہوا کا جو رخ ہوتا تھا اسی سمت بین الاقوامی پالیٹکس کا سفینہ حرکت کرتا تھا ! برطانیہ کی طاقت کے بعد اپنے عظیم الشان بحری بیڑے کے سبب فرانس کا نمبر تھا !

مگر

ان پچاس سال کی مدت میں دنیا کے حالات یکسر دگرگوں ہوگئے، کتنی شہنشاہیاں اس عرصہ میں ختم ہو گئیں۔ کتنے ملک آزاد ہو گئے، کتنی ریاستیں ابھر گئیں اور کہیں کی کہیں جا پہنچیں۔ زار روس کا تختہ الٹ دیا گیا، فضا سے بم برستے رہے۔ برطانیہ اور فرانس کی اب کوئی نمایاں حیثیت بین الاقوامی سیاست میں نہیں ہے، بلکہ دو بڑی طاقتوں کے درمیان کشمکش ہوتی ہے تو یہ دونوں حکومتیں خود اپنی جان بچانے کی فکر میں رہتی ہیں کہ کہیں ہم ان کے بیچ میں نہ آجائیں ! ونسٹن چرچل نے بہت عمر پائی، اس نے برطانیہ عظمیٰ کے عروج و زوال کے دونوں منظر دیکھ لئے۔ انگریزی حکومت کے تیز اقبال کا طلوع بھی اور غروب بھی !

بدنام حکومت

بعض مشاہدات و خصوصیات کے لحاظ سے یہ کہا جاتا ہے کہ امریکہ موجودہ دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے، تو شاید کوئی مبالغہ کی بات نہ ہوگی ! اس کی دولت کا یہ عالم ہے کہ امریکہ کی بعض بعض کمپنیوں کی اتنی آمدنی ہے کہ مشرقی ملکوں کا مجموعی بجٹ اس سے کم ہی ٹھیرے گا۔

امریکہ دنیا کی جس قدر سب سے بڑی طاقت ہے اسی قدر دنیا میں سب سے بڑھ کر بدنام ہے، "سامراج" کا لفظ بول کر آج کی دنیا ان سے "امریکہ" مراد لیتی ہے، اس دور میں سامراجیت کی سب سے بڑی علامت امریکہ سمجھا جاتا ہے، دنیا کے کم ہی اخبار ہوں گے، جن میں امریکہ کا نام برائی کے ساتھ نہ آتا ہو، اور اس پر کسی نہ کسی عنوان سے طنز نہ کی جاتی ہو ! اگر دنیا کی اچھی شہرت اسٹاک مارکیٹ کا کوئی نرخ ہے، تو امریکہ بے پناہ طاقت کے باوجود شہرت و ہر دلعزیزی یا اساس پسندیدگی عوام کی صف میں ہلکا اور بے قدر نظر آتا ہے۔

یہ نہیں ہے کہ امریکہ کے دشمنوں نے جھوٹا اور غلط پروپیگنڈہ کر کے اسے سارے جہان میں بدنام کر دیا ہے ! امریکہ کی سیاست ہر ڈپلومیسی سب کے سامنے ہے، اور اس کا کردار کھلی کتاب کی طرح منظر عام پر آتا رہتا ہے۔ کوئی شک نہیں امریکہ میں آزادی رائے پر ذرا برابر بندش نہیں ہے، وہاں کے صدر تک کی پرائیویٹ زندگی پر نکتہ چینی ہو سکتی ہے اور یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ امریکی دانشور اور صاحبان

فکر و نظر والوں کے ارباب حل و عقد کے سامنے یہ حقائق کیوں نہیں لاتے کہ بین الاقوامی دنیا میں امریکہ کی ڈپلومیسی نے اُسے سب سے عالم میں بدنام اور رسوا کر دیا ہے، بدنامی اور رسوائی کی زندگی کوئی اچھی زندگی نہیں ہے!

امریکہ کی ریاستیں کرۂ ارض کے ایسے دور دراز گوشہ میں واقع ہیں، کہ وہاں نہ تو کسی غیر حکومت سے سرحد کا جھگڑا ہے اور نہ ہوائی جہازوں کی پرواز اور بحری بیڑے کی گزرگاہ کا کوئی قضیہ ہے، امریکہ کا جغرافیائی موقف گوشہ عافیت کا موقف ہے ـــــ پھر اس کے یہاں زمین کی بھی تنگی نہیں ہے کہ کثرتِ آبادی نے زمین کی وسعت کا کوئی مسئلہ پیدا کر دیا ہو ـــــ غلہ کی پیداوار کا یہ عالم ہے کہ لاکھوں ٹن فاضل غلہ اُسے دریا برد کر دینا پڑتا ہے ـــــ سوئی اور آلپن سے لے کر ہوائی جہاز اور راکٹ تک زندگی کی ہر ایک ضرورت کے لئے وہ پوری طرح خود کفیل ہے، دوسروں کا محتاج اور دست نگر نہیں ہے ـــــ امریکہ میں سچ مچ دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہیں ہر چیز خالص اور ملاوٹ سے پاک و صاف ہے ـــــ امریکہ کی آمدنی کی فراوانی کا یہ عالم ہے کہ اُس کے سالانہ بجٹ کے لئے، عدد ناکافی نظر آتے ہیں، دولت اور مال و زر کی کوئی حد و انتہا نہیں! وہاں کا معیارِ زندگی اس قدر بلند ہے کہ امریکہ کے خاکروب کیڈلک کاریں رکھتے ہیں۔ دنیا میں عیش و راحت کے جتنے سامان ہو سکتے ہیں، امریکہ کے باشندوں کو تمام کے تمام میسر ہیں!

اتنی عیش و آرام کی بے غش زندگی کے ہوتے ہوئے یہ جو امریکہ نے ہر ملک میں اپنی سیاست اور ڈپلومیسی کی ٹانگ اڑا رکھی ہے۔ اس میں آخر اُس کا کیا فائدہ ہے؟ وہ جو مشہور ضرب المثل ہے کہ ـــــ غم نہ داری بز بخر ـــــ تو اُس نے خواہ مخواہ کے جھمیلے مول لے رکھے ہیں اور بہت سے دردِ سر پال رکھے ہیں، جس کا حاصل رسوائی کے سوا اور کچھ بھی نہیں! امریکہ کو خود اس کا تجربہ ہے کہ کتنے بہت سے ملکوں میں اس کی حکمت عملی قطعاً ناکام ہو چکی ہے! آج کی دنیا میں نہ صرف امریکہ بدنام ہے بلکہ اُس کا سکہ "ڈالر" بھی رسوائی کا "SYMBOL" بن کر رہ گیا ہے!
ساری دنیا کا جو دھرم پنجہ کی ہوس ہے، عوام میں بغیر بڑا لٹریچر، بدنامی اور رسوائی حاصل کر کے، امریکہ نفع میں نہیں ٹوٹے میں رہا ہے:
اُس کا خرچ کیا ہوا ایک ایک ڈالر اُس کے لئے "دشنام" بن کر رہ گیا ہے: ڈالروں کے ذریعہ امریکہ نے کچھ برے آدمیوں کے ضمیر تو بے شک خرید لئے ہیں، مگر عوام کے دلوں میں اپنے لئے نفرت و بیزاری کے جذبات پیدا کر دئے ہیں۔

امریکہ کی برسرِ عام ڈپلومیسی میں یہودی سرمایہ داروں کا بھی بہت کچھ عمل دخل ہے، یہودی جس ملک کی سیاست میں دخیل ہوں گے وہاں کی یہ حالت اور اسباب سیاست کو بے آبرو بنا دیں گے، ترکی میں بے دینی کی فضا پیدا کرنے میں یہودیوں نے نمایاں پارٹ ادا کیا ہے خاص طور سے مسلم حکومتوں کو جس طرح بھی ممکن ہو نقصان پہنچانا، یہودیوں کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد ہے! جلالۃ الملک شاہ فیصل کے ساتھ امریکہ کے حالیہ دورے میں جو نازیبا سلوک ہوا ہے، وہ اس حقیقت کا واضح ثبوت ہے کہ یہودی امریکہ میں کس قدر اثر و رسوخ رکھتے ہیں امریکہ میں جب تک یہودیوں کا عمل دخل رہے گا وہاں کی ڈپلومیسی اُسے تمام دنیا میں اور خاص طور سے مسلم حکومتوں میں غیر ہر دلعزیز اور رسوا ہی کرتی رہے گی۔

وہ دوسری بات ہے کہ حکومتیں ایک دوسرے کے حالات کا اتا پتا لگانے کے لئے اپنے جاسوس دوسرے ملکوں میں رکھتی ہیں، مگر امریکہ نے تو یہ غضب ڈھا رکھا ہے کہ اس کا ایک باقاعدہ محکمہ ـــــ سی، آئی، اے ـــــ کے نام سے قائم ہے جس پر اربوں ڈالر خرچ ہوتے ہیں اور یہ خوفناک محکمہ غیر ملکوں میں انقلاب لانے کے لئے طرح طرح کی سازشیں کرتا رہتا ہے۔ امریکہ کی یہ خفیہ تنظیم روپیہ پیسہ کی طمع، جاہ و منصب کے لالچ، زوالِ نعمت کی دھمکی اور خوف کے ذریعہ کسی ملک میں بھی ہر طرح کا انقلاب لا سکتی ہے ـــــ خونریز انقلاب بھی! سی، آئی، اے کا وجود اب کوئی راز نہیں رہا، اخبارات کے ذریعہ اس تنظیم کے اغراض و مقاصد اور اُس کے عزائم کی تفصیلات منظرِ عام پر آ چکی ہیں! حیرت ہے کہ دنیا کی حکومتیں امریکہ کی اس خوفناک خفیہ تنظیم کو کس طرح گوارا کئے ہوئے ہیں؟ انہیں

کم از کم اس مسئلہ میں متفقہ طور پہ امریکہ کو الٹی میٹم دینا چاہئے کہ بین الاقوامی روابط کے مدنظر امریکہ یا کسی دوسری حکومت کو اس قسم کی تنظیم قائم کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے اس تنظیم کو فوراً توڑ دینا چاہئے ! ـــــ سی آئی اے امریکی سیاست کا وہ شاہکار ہے جس کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے ! جس ملک کے یہ عزائم اور ایسے کرتوت ہوں کیا وہ دنیا میں قیام امن کا داعیہ اپنے اندر رکھتا ہے اور اس کی کوششیں اس مقصد کو فائدہ پہونچا سکتی ہیں !

...... غبار سا ہے !!

تقسیم ہند کے بعد امریکہ نے پاکستان اور ہندوستان دونوں ملکوں کی مالی امداد کی، مگر اس نظریہ کے تحت کہ ہندوستان بہت بڑا ملک ہے، امریکہ کی ہمدردیوں اور نوازشوں کی زیادہ تر بارش بھارت پر ہوتی رہی ہند و پاک کی جنگ میں امریکہ کا جو رول رہا ہے، وہ سب پر ظاہر ہے، اس کے طرز عمل سے اس جنگ میں جتنا بھی فائدہ پہونچا ہے، بھارت کو پہونچا ہے !

امریکہ جو سارے جہان کے حالات کی خبر رکھتا ہے، کیا وہ مسئلہ کشمیر کی حقیقی پوزیشن سے نا واقف ہے ؟ نہیں ایسا نہیں ہے مسئلہ کشمیر کا ہر پہلو اس پہ آئینہ کی طرح روشن ہے، مگر وہ اپنی مصلحتوں کے پیش نظر اس گتھی کو سلجھانا نہیں چاہتا، وہ بھی طرح جانتا ہے کہ پاکستان کا موقف حق پسندانہ ہے، مگر امریکہ حق کا نہیں اپنی مصلحتوں کا ساتھی ہے ! دوسری طرف پاکستان کے داخلی مسائل کا جہاں تک تعلق ہے اخبارات میں یہ خبریں تک چھپ چکی ہیں کہ مشرقی پاکستان کی مغربی پاکستان سے علیحدگی کی جانب امریکہ میلان رکھتا ہے، اس خبر میں جتنی بھی صداقت ہے، بہر حال یہ خبر امریکی ڈپلومیسی سے تعلق کے سبب کتنی خوفناک نظر آتی ہے ۔

مسئلہ کشمیر کے تصفیہ کی آخری صورت جنگ ہی ہو سکتی تھی، جنگ بھی کر کے دیکھ لی، پھر صلح بھی ہو گئی، مگر جنگ و صلح کی تدبیر اور تجربہ کے بعد بھی کشمیر کا مسئلہ حل نہ ہو سکا ! معاہدہ تاشقند جس کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا تھا کہ اس سے کشمیر کے تصفیہ کی سبیل پیدا ہوگی "وہ سبیل" کا دور دور کہیں پتہ نہیں، جن دانشوروں اور رہنماؤں نے اس معاہدہ کو بے مصرف بتایا ان کو انتہا پسند ٹھیرایا گیا ہندوستان جس سے ساتھ معاہدہ ہوا تھا اس نے صبح ہوتے ہی اعلان کر دیا کہ کشمیر بھارت کا اٹوٹ انگ ہے ! اس معاہدہ کے بعد مقبوضہ کشمیر کے مسلمانوں پہ بھارت کے ظلم و ستم میں اور اضافہ ہو گیا ! روس اور امریکہ کی ہمدردیوں کا زیادہ تر رخ بھارت کی جانب ہے، چین، ایران، ترکی اور بعض دوسرے ہمارے ہمدرد ممالک پر عالم حیرت سا طاری ہے !

مقام ہوش و خرد سے آگے تمام عالم غبار سا ہے

نہ جانے یہ دھند کب چھٹے گی اور یہ غبار کیسے دور ہوگا ؟

طاہر قادری

۲۵ فروری سنہ ۶۶ء

مولانا محمد مصطفیٰ (علی گڑھ)

سورۃ التوحید

اس صورت کے کئی نام ہیں۔ زیادہ مشہور نام سورۃ اخلاص ہے۔ اور یہ تہائی قرآن کے برابر ہے۔ اس لئے کہ مضامین قرآن تین قسم کے ہیں۔ عقائد، احکام، قصص۔ اور یہ صورت اُمہات العقائد پر نہایت وجازت سے حاوی ہے۔ یا یہ کہ اُمہات العقائد تین طرح کے ہیں، وحدانیت، نبوت، معاد اور یہ سورت وحدانیت کے مسائل سے بھرپور ہے۔

جب غیر مسلم داعیٔ توحید آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت بابرکت میں اللہ جل شانہ کے اوصاف دریافت کرنے آتے ہیں تو بارگاہِ عزت سے حکم ہوتا ہے، فرما دیجئے کہ وہ اللہ ایک ہے۔

قل ھو اللہ احد ایک سے مراد یہ ہے کہ اس میں تعدد نہیں، ترکیب نہیں۔ اس کا کوئی مثل نہیں، نظیر نہیں، لیس کمثلہ شیٔ ہے

نظیر دوست ندیدم اگرچہ از مہ و مہر نہادم آئینہ ہا در مقابل رخ دوست

پس اس کی وحدت ذاتی اور حقیقی ہے۔ عدد ایک ایسی نہیں جو زائل ہو جائے اور دوئی سے بدل جائے مثلاً ۱+۱=۲۔ کیونکہ یہ وحدت حقیقی نہیں، یہی وجہ ہے کہ ایک معدوم بھی ہو جاتا ہے مثلاً ۱-۱=۰، اور جب صفر کہ نام ہے عدم کا مضروب ہوتا ہے تو خود عدم بن جاتا ہے مثلاً ۰×۱=۰، اس کا تجزیہ بھی ہو جاتا ہے، مثلاً ½، ۱÷۳=⅓ اور ۱÷۵=⅕ اور ۱÷۲=½ اور اس کی تضعیف بھی ہو جاتی ہے مثلاً ۱×۱۰=۱۰، بلکہ غور فرمائیے تو وہ عدم ہے مگر کبھی اضعافاً مضاعفہ ہو جاتا ہے مثلاً ۱۰ اور ۱۰۰ اور ۱۰۰۰، اول پہلی شکل میں عشرات، دوسری میں مآت اور تیسری میں آحاد کا درجہ شمار ہوتا ہے۔

اسی واسطے بعض اہل علم نے کہا ہے کہ "احد" حق تعالیٰ کے خصوصی صفات میں سے ہے، نہیں کہتے کہ احد، اثنان، ثلاثہ، اربعہ۔۔۔ بلکہ یوں کہتے ہیں کہ واحد، اثنان، ثلاثہ، اربعہ۔ اور نہیں کہا جاتا ہے کہ رأیت رجلاً احداً بلکہ یوں کہا جاتا ہے کہ رأیت رجلاً واحداً۔

اور اس میں تعدد نہیں، کیونکہ تعدد ہوگا یعنی ایک سے زائد خدا ہوں گے تو لازم ہے کہ ان میں کچھ مابہ الامتیاز بھی ہوگا۔ (ورنہ تعدد کیونکر ہو سکتا ہے) اور کچھ مابہ الاشتراک ہوگا اور وہ کم از کم وجوب ذاتی کی صفت ہوگی (ورنہ الٰہ ہونا ناممکن ہے) پس اس صورت میں وہ سب کے سب مرکب ہوں گے، مابہ الامتیاز اور مابہ الاشتراک سے اور مرکب حادث ہوتا ہے کیونکہ اپنے اجزاء سے مؤخر ہوتا ہے۔ اور مؤخر ہونا دلیل ہے حدوث کی، اور حادث واجب الوجود نہیں ہوتا پس وہ خدا نہیں ہو سکتے اس سے ثابت ہوا کہ خدا ایک ہی ہے۔

مزید برآں، خدا کی شان یہ ہے کہ وہ جامع کمالات ہو، (خدا اور ناقص ہو! توبہ توبہ) اور تعدد کی صورت میں مابہ الامتیاز اور مابہ الاشتراک کے تسلیم کرنا پڑے گا کہ کسی خدا میں اگر ایک خوبی ہے تو دوسرے خدا میں دوسری خوبی مثلاً ایک قدیر ہے اور دوسرا علیم۔ تو پہلا علم سے محروم رہا اور دوسرا قدرت سے، اس لئے کوئی بھی جامع کمالات نہ رہا حالانکہ واجب الوجود کے لئے جامع کمالات ہونا لازم ہے۔ یہ مضمون اظہر من الشمس ہو گیا کہ ایک سے زیادہ خدا

ماہر القادری

آبشار

جناب فانی کرنالی کے مجموعہ کلام "جو ہر قسم" پر تبصرہ کرتے ہوئے میں نے یہ اعتراض وارد کیا تھا کہ "آبشار" مونث نہیں، مذکر ہے! اس سلسلہ میں بعض حضرات نے مجھے لکھا کہ "آبشار" کے بارے میں مزید تحقیق ضروری ہے کیونکہ جوش ملیح آبادی کے لکھنوی سے اس لفظ کا "مونث" ہونا بھی ثابت ہے۔

راقم حروف کی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ لکھنؤ میں یہ لفظ "مونث" بھی بولا جاتا تھا، مگر نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی "فرہنگ اثر" (حصہ دوم) میں لکھتے ہیں :-

"اس لفظ کو مرتب نور اللغات اور جلال وغیرہ نے مونث قرار دیا ہے مگر جن لوگوں نے "آبشار" دیکھا ہے اس کو مونث ہرگز نہ کہیں گے، پانی کا حجم اور زور و شور کیف قد بلندی سے گرنا، اس کی تانیث کے منافی ہے۔ حسن اتفاق سے ایک مثال مذکر کی سند میں مل گئی (طلسم فصاحت مولفہ محمد حسین جاہ لکھنوی)

"پہاڑیوں سے آبشار گرتا، گھاٹیوں سے جھرنا جھڑتا"

اگر لکھنؤ میں یہ لفظ ــــ آبشار ــــ زیادہ تر بھی "مونث" بولا جاتا تو اثر لکھنوی کی زبان پر اسے مونث ہی ہونا چاہئے تھا مگر موصوف اس کے "مذکر" ہونے پر اصرار کرتے ہیں۔

میر تقی میر کے دو شعر ہیں :-

ادھر کے تئیں ایک تھا آبشار   وہ البتہ شایان سیر و شکار

ــــ اور ــــ

آبشار آنے لگے آنسو کے پلکوں سے تو میر   کب تلک یہ آب جاری منہ پہ تانا کیجئے

نسیم دہلوی نے بھی میر کی طرح "آبشار" کو مذکر ہی نظم کیا ہے :-

آبشار اشک کے کام آتے ہیں طغیانی میں   کو شرمندہ کئے ہیں اکثر مجھے چپ دو آنسو

طلسم ہوشربا (جلد اول صفحہ ؟) میں بھی مذکر ہی لکھا گیا ہے۔

"آن کے آبشار نے ساون بھادوں کی گھٹا کو شرما دیا"

لفظ کی تذکیر و تانیث کا معاملہ یہ ہے کہ قدیم شاعروں اور ادیبوں کی نظم و نثر سے بیشک ہم سند لیتے ہیں مگر بعض الفاظ ایسے بھی ہیں جن کو دور حاضر کے عوام و خواص نے تذکیر یا تانیث کی سند سے دی ہے، مثلاً غالب اور اثر لکھنوی نے "بلبل" کو مذکر باندھا ہے مگر اب یہ لفظ بالاتفاق "مونث" ہے جو کوئی "مذکر" بولتا ہے وہ ... زمرہ کی مخالفت کرتا ہے!

اسی طرح "خار زار" میر تقی میر کے زمانہ میں مونث بولا جاتا ہوگا۔ ان کی غزل کا مطلع ہے۔

جہاں اب خارزاریں ہوگئی ہیں   وہاں پہلے بہاریں ہوگئی ہیں

مگر اب یہ "گلزار" "سبزہ زار" "جوئبار" اور "خارزار" وغیرہ مذکر بولے جاتے ہیں، یہی عوام و خواص کی بول چال اور زبان کا فیصلہ ہے تو "آبشار" بھی ڈیڑھ سو برس پہلے بھی زیادہ تر "مذکر" ہی بولا جاتا تھا اس کی تانیث کی مثالیں خال خال ہی ملتی ہیں مگر اب یہ بالاتفاق مذکر بولا جاتا ہے۔

پروفیسر اسرار احمد

مذہب کی ضرورت

۱۔ مذہب کے لغوی معنی چلنے کے راستے کے ہیں، زندگی اور حرکت لازم و ملزوم چیزیں ہیں اگر زندگی ہے تو حرکت کی ضرورت ہے۔ حرکت کرنے کے لئے کسی راستے کی ضرورت ہے، راستہ نہ ہوگا تو حرکت آسان اور مفید نہیں ہو سکتی، اسی آسانی مہیا کرنے والے راستے کا نام مذہب ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ زندگی اور حرکت لازم و ملزوم۔ چنانچہ زندگی اور زندگی کا سفر طے کرنے کا راستہ بھی لازم و ملزوم ہو گئے ایک کے بغیر دوسرے کا وجود ممکن نہیں۔

۲۔ انسان معاشرتی زندگی گزارنے پر مجبور ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کی زندگی کا ڈھنگ ہی اس قسم کا بنایا ہے کہ وہ اجتماعی اور گروہی زندگی کے بغیر زندہ ہی نہیں رہ سکتا۔ جانوروں کے بچے تھوڑی سی مدت میں خود کفیل اور آزاد ہو جاتے ہیں لیکن انسان کا بچہ سالہا سال تک ماں باپ عزیز و اقارب کی نگرانی کا محتاج رہتا ہے۔ اس وجہ سے انسانی زندگی گروہی زندگی بن جاتی ہے۔ جب بہت سے انسان ایک جگہ رہتے ہیں تو ایک دوسرے سے واسطہ پڑتا ہے تعلقات قائم ہوتے ہیں۔ تعلقات سے حقوق و فرائض قائم ہوتے ہیں ان کے لئے اصول و قوانین کی ضرورت پڑتی ہے اگر یہ قوانین نہ ہوں تو وحشت کی زندگی ہو جاتی ہے انہیں زندگی کے اصول و قوانین کا نام مذہب ہے۔ جب انسان معاشرتی زندگی گزارنے کے لئے موجود ہے تو اس کے قوانین حاصل کرنے کے لئے بھی مجبور ہے، وہی قوانین اصطلاحاً مذہب کے نام سے موسوم ہیں۔ اس لئے انسان مذہب سے گریز نہیں کر سکتا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ مذہب نام ہے خدا کے دیئے ہوئے قوانین کا۔ تو کیا یہ ضروری ہے کہ خدا کے دیئے ہوئے قوانین پر ہی زندگی گزاری جائے۔ کیوں نہ انسان خود اپنی زندگی کے قوانین بنالے۔ اس کا سادہ سا جواب یہ ہے کہ جو ذات ہزاروں سال پوری قوت سے غور و خوض کرنے کے بعد آج تک یہی فیصلہ نہ کر سکی کہ زندگی کیا ہے، کہاں سے آتی، کس نے پیدا کی، کب ختم ہوگی۔ ختم ہونے کے بعد دوبارہ پیدا ہوگی یا نہیں۔ پیدا ہونے کا سبب کیا ہے۔ فرد کو کیوں موت آتی ہے، انسانی فطرت کے اسرار سربستہ کیا ہیں۔ وہ ذات انسانی زندگی کے لئے متوازن، مفید اور ہمہ جہتی قوانین کس طرح بنا سکتی ہے۔ زندگی کے لئے قوانین بنانے کی سب سے زیادہ حقدار اور موزوں وہ ہستی ہے جس نے زندگی کو پیدا کیا، جو زندگی کے تمام اجزائے ترکیبی کو جانتا ہے جو زندگی کی تمام کمزوریوں سے آگاہ ہے۔ جو تمام آرزوؤں اور تمناؤں کو سمجھتا ہے جس نے زندگی کی صلاحیتوں اور ان کے تناسب کی خود تخلیق کی ہے۔ چنانچہ ہمارے اس دعوے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ انسان کے بنائے ہوئے قوانین روزانہ بدلتے رہتے ہیں کہ خدا کے بنائے ہوئے قوانین ازلی اور ابدی ہیں ان میں تبدیلی کی ضرورت نہیں پڑتی۔ "ولن تجد لسنت اللہ تبدیلا" "خدا کی سنت میں تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔" اور بات ہے کہ انسان اپنے زعم باطل میں اس سنت سے منہ موڑ لے اور سرکشی اختیار کرے لیکن اس سرکشی سے انسان نے کبھی مفید نتائج برآمد نہیں کئے۔ انسانی کمزوری زندگی کے قوانین پر کس طرح اثر انداز ہوتی ہے اس کا ایک اہم ثبوت امریکہ کا قانون امتناع شراب ہے کہ انہوں نے شراب کی تباہ کاریاں دیکھ کر اس کو پہلے خلاف قانون قرار دیا۔ لیکن جب بغیر شراب کے زندگی دوبھر ہو گئی تو باوجود اس کے نقصانات کو جاننے اور دیکھنے کے قانون کے خلاف بغاوت کر دی اور خود اپنی ایک کمزوری کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنا ہی بنایا ہوا قانون صرف تین سال کے بعد ختم کر دیا لیکن خدا کے قانون میں شراب ابدی طور پر حرام ہے۔ اس کو کوئی قانون ساز اسمبلی کسی قسم کی اکثریت سے۔ کوئی اقتدار اعلیٰ حلال قرار نہیں دے سکتا۔

۳۔ مذہب کے تصور کی بنیاد دراصل خدا کا تصور ہے۔ بغیر خدا کے تصور کے مذہب کا تصور نہیں کیا جا سکتا کیونکہ مذہب کے قوانین دینے والی ان کو نافذ کرنے والی اور سزا و جزا دینے والی اسی کی ذات ہے۔ اسی وجہ سے بعض مذہب اور جن مذہب کے اصول و قوانین یکطرفہ اور محدود ہو کر رہ گئے۔ ان میں سخت افراط و تفریط پیدا ہو گئی۔ ان مذاہب میں خدا کا تصور واضح نہیں بلکہ تقریباً معدوم سا ہے۔ اسی وجہ سے ان کا زندگی کا تصور منفی ہے وہ ترک دنیا اور

رہبانیت کی طرف سختی سے مائل ہیں، ایک بے قصور کی جان لینا بھی گناہِ عظیم ہے، دشمن کا مقابلہ اپنی جان دے کر کرتے ہیں۔ ایسی دنیا میں جہاں ایک کی زندگی کا انحصار دوسرے کی موت پر ہو اس قسم کے قوانین زندگی کا ساتھ نہیں دے سکتے کمزور کو کون زندہ رہنے کا پروانہ دیتا ہے۔ طاقت ور کمزور کو نگل جاتا ہے، بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھا جاتی ہے۔ بڑا درخت چھوٹے پودوں کو نہیں پنپنے دیتا۔ جراثیم جاندار ایک دوسرے کی فطرتی طور پر خوراک ہیں، ہماری ایک سانس میں لاکھوں جراثیم جسم کے اندر جا کر مر جاتے ہیں۔ ہم اس زندگی میں مکمل اہنسا پر عمل کر ہی نہیں سکتے، چنانچہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جین اور بدھ مذہب والے ناک سے رومال باندھے بیٹھے ہیں لیکن باوجود رومال لاکھوں جراثیم کپڑے کے سوراخوں میں سے گزر کر ان کے جسم میں داخل ہو کر مر جاتے ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان کا قانون خدائی قانون نہیں اس لئے نامکمل اور غیر متوازن ہے، خدا کے واضح تصور کی ضرورت اس لئے بھی ہے کہ انسان ہر لحاظ سے بہت کمزور ہے، اسے زندگی گزارنے کے لئے کسی نہ کسی سہارے کی ہر وقت ضرورت رہتی ہے۔ بقول فانی مرحوم ؎

جیتے جانے کی تہمت کس سے اٹھتی کس طرح اٹھتی
تیرے غم نے بچائی زندگی کی آبرو برسوں

دنیا میں بغیر خدا کے سہارے کے زندگی کی آبرو بچانا بہت مشکل ہے۔ یہاں پریشانیاں اور ناکامیاں اس قدر ہیں کہ زندگی کے کسی نہ کسی مرحلے میں ہر شخص زندگی کا دامن تار تار کرنے کی ٹھان لیتا ہے۔ ایسے نازک وقت میں خدائے رحیم و کریم کا تصور ہی انسان کی ڈھارس بندھاتا ہے اور زندگی کو ختم کرنے کے خیال سے باز رکھتا ہے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جیسے جیسے خدا کا تصور ختم کیا جا رہا ہے خودکشی کی وارداتیں بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔ پچھلے سال جاپان جیسے چھوٹے سے ملک میں چالیس لاکھ خودکشی کی وارداتیں ہوئیں۔ سب سے زیادہ خوشحال اور سویڈن، امریکہ میں تمام ملکوں سے زیادہ خودکشی کا رواج ہوتا جا رہا ہے یہ ہے انسان کی مجبوری اور بے بسی۔ جب ہر طرف سے مصائب و آلام کا ہجوم ہو اور سہارا کوئی نہ ہو تو انسان بھی غریب کیا کرے اور دنیا کے تمام سہارے بہت کمزور ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "ضعف الطالب والمطلوب" یعنی دنیا کے طالب بھی کمزور ہیں اور مطلوب بھی ایک دوسرے کو سہارا دینے کے قابل بھی نہیں بلکہ دنیا کے تمام سہاروں کو ایک جگہ مکڑی کے جالے سے تشبیہ دی ہے جو ایک تنکے کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتا۔ ذرا انگلی لگا دیجئے اور مکڑی کا پورا محل صاف۔ آپکی انگلی سے لپٹ کر ختم ہو جائے گا۔

۴۔ خدا کے تصور کے بغیر ہماری زندگی میں اخلاقی قوانین نافذ نہیں ہو سکتے۔ اخلاقی زندگی ہماری زندگی کا ایک بہت بڑا حصہ ہے اور ہم یہ جانتے ہیں کہ اخلاقی قوانین کو دنیا کی کوئی عدالت نافذ نہیں کرتی۔ یا تو وہ رائے عامہ کے ذریعہ نافذ ہوتے ہیں یا نیکی برائے نیکی کے تصور سے یا خدا کے تصور سے۔ نیکی برائے نیکی کے تصور سے اخلاقی قدروں کے بہت کم لوگ پابند ہو سکتے ہیں۔ سیکڑوں لوگ کہنے کو ایسے ہیں گے جو ہوتے ہیں عملاً نہیں ہوتے۔ رائے عامہ کی پابندی میں ایک بہت بڑی خرابی یہ ہے کہ بغیر خدا کے تصور کے اکثر اس کی تربیت غلط اور ناقص ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر امریکہ کے امتناعِ شراب کے قانون کو ہی لے لیجئے کہ اس رائے عامہ نے شراب کو حرام قرار دیا اور باوجود نقصان اور بربادی کے عادت پڑ جانے کی وجہ سے پھر اس کو جائز اور حلال قرار دے دیا۔ اس قسم کا غلط اور تباہ کن دباؤ ہر وقت رائے عامہ پر پڑ سکتا ہے۔ لیکن خدا کی ذات ان تمام کمزوریوں سے پاک ہے، اس کے فیصلے اور پسند و ناپسند کو کوئی چیز متاثر نہیں کر سکتی۔ اس کی سنت اور اس کے قانون ازلی و ابدی ہیں۔ اس کے خیر و شر کا معیار مستقل ہے، اس کی اخلاقی قدریں تغیر ناپذیر ہیں اور اس لئے ہر زمانے کے لئے باعثِ سکون و طمانیت ہیں۔ برخلاف اس کے رائے عامہ کی اخلاقی قدریں زمان و مکان کے فرق سے ہر دم بدلتی رہتی ہیں اور ان کو کسی طرح قرار نہیں۔ انسان کا ازلی دشمن شیطان ہر لحظہ ان کو بداخلاقی کے نئے نئے راستے دکھاتا رہتا ہے اور اس طرف مائل کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔

۵۔ خدا کا تصور ایک اعلیٰ ذات کا تصور ہے۔ ایک بلند ہستی کا یقین ہے۔ یہ بلندی کا تصور انسان کو سربلند رکھتا ہے۔ یہ تو عام سی بات ہے اور ہم میں سے ہر شخص اس کو آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ محبوب جس قدر اعلیٰ اور بلند ہوتا ہے محبت کرنے والے کو بھی اتنا ہی بلند

اٹھانا پڑتا ہے ورنہ محبوب تک رسائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور ہر مخلص محبت کرنے والا محبوب تک پہونچنے کے لیے جان تک کی بازی لگا دیتا ہے۔ تو میں آپ سے دریافت کرتا ہوں کہ عرش نشین سے زیادہ بلند محبوب آپ کو کون ملے گا۔ خدا کا تصور اگر توحید کے ساتھ وابستہ ہو تو انسان کو دنیا و مافیہا سے بڑی حد تک بے نیاز کر دیتا ہے اور انسان کے کردار میں انتہائی بلندی اور مضبوطی پیدا کر دیتا ہے اس کے مقابلے میں شرک اور بہت سے خدائوں کو پوجنے والا عموماً پست حوصلہ اور کم ہمت ہو جاتا ہے ہر معمولی چیز کے سامنے سجدہ ریز ہو جانا ہر طاقت کے آگے پیشانی جھکا دینا اس کا معمول بن جاتا ہے۔ حد یہ ہے کہ کیڑے مکوڑوں اور درختوں کے سامنے بھی پیشانی ٹکا دیتے ہیں اس کو عار نہیں آتا۔ ایسا شخص جو درختوں اور کیڑے مکوڑوں کو اپنا معبود و مسجود قرار دے ڈالے اپنے کردار میں کیا استقامت اور بلندی پیدا کر سکتا ہے۔ ایک خدا کو سجدہ کرنے والا دنیا کی تمام طاقتوں سے بے نیاز ہو جاتا ہے علامہ اقبال نے خوب کہا ہے ؎

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

۷۔ اب خدا کے تصور کی اہمیت پر کچھ گفتگو کرنے کے بعد اس بات کی بھی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ کہ خدا کے موجود ہونے کے عقلی و نقلی دلائل پر بھی نہایت مختصر سی گفتگو کر لی جائے کیونکہ یہ موضوع بھی ابتدائے آفرینش سے انسان کے لئے بہت اہم اور دلچسپ رہا ہے اور آج بھی یہ موضوع بحث و مباحثے کے لئے اسی طرح تر و تازہ ہے۔ ابتدائے آفرینش سے آج تک ہزاروں فلاسفہ نے اس موضوع پر بحث کی ہے۔ کسی نے اس کا وجود ثابت کیا ہے اور کسی نے اس کا عدم لیکن ابھی تک اہل عقل اس مسئلے کا حتمی فیصلہ نہیں کر سکے ہیں لیکن مجھے اس سلسلے میں خدا کے وجود پر سب سے زیادہ قرآن کریم کا استدلال پسند ہے میں یہاں پر اس قرآن کے حوالے سے بات کروں گا۔

۸۔ خدا کے موجود ہونے کا سب سے بڑا ثبوت قرآن کریم نے متعدد مقامات پر یہ دیا ہے کہ ابتدائے آفرینش سے انسان کے دل میں کسی نہ کسی رنگ میں ما فوق الفطرت ہستی کا تصور موجود ہے جس کو وہ مصیبت کے وقت خصوصیت کے ساتھ پکارتا ہے کشتی ڈوبنے لگتی ہے تو اس کو پکارتا ہے لیکن جب ساحل پر لگ جاتی ہے تو پہلو بدل جاتا ہے۔ مصائب میں گھر جاتا ہے تو بڑی طویل دعائیں مانگتا ہے لیکن سکون حاصل ہونے پر ایک سجدہ بھی گراں گزرتا ہے انسانی تہذیب و تمدن کی تاریخ بھی اس بات کی گواہ ہے کہ نیم وحشیانہ زندگی گزارنے والے قبائل میں خدا کا تصور موجود رہا ہے مولانا آزاد نے اپنی تفسیر ترجمان القرآن میں بڑی تفصیل سے اس موضوع پر بحث کی ہے اور دلائل و شواہد سے اپنے دعوے کو ثابت کیا ہے۔ خدا کے موجود ہونے کا دوسرا زبردست اور قابل تردید ثبوت کائنات کی ہر چیز میں باقاعدگی اور اصول کی پابندی ہے جس کو میں نے اس سے پہلے سنت اللہ کہا ہے ہر چیز اپنی جگہ پر مسخر ہے، سر مو اپنے وظائف سے انحراف نہیں کر سکتی ہر چیز کو اللہ تعالیٰ نے آیات خداوندی کا نام دیا ہے۔ مثلاً دن اور رات کا ایک دوسرے کے پیچھے مسلسل آتے رہنا۔ ستاروں اور سیاروں کا اپنی اپنی جگہ مسخر ہونا لاکھوں سالوں سے اپنے محور پر قائم رہنا۔ اپنے اپنے بروج میں مقررہ اوقات میں سفر پر قائم رہنا۔ بارش کا ہونا، کھیتوں کا ہرا بھرا ہونا، بہار و خزاں کی آمد و رفت کشتیوں کا سمندر میں رواں ہونا، پرندوں کا فضا میں پرواز کرنا وغیرہ وغیرہ۔ در اصل ان سب چیزوں اللہ تعالیٰ کی نشانی ہے جو اس کے وجود کی طرف اشارہ کر رہی ہے ان تمام چیزوں کو چھوڑ دیجئے فی الحال ایک حقیر سے ذرے کو دیکھئے کہ جب اس کو توڑا گیا تو معلوم ہوا کہ اس کی ساخت میں پورا نظام شمسی موجود ہے یعنی اس قسم کی گردش۔ اسی قسم کی توانائی۔ اس قسم کے چاند سورج اور بالکل وہی نظام کار۔ علامہ اقبال نے شاید تحت الشعور طور پر یہ بات کہدی تھی کہ

"لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں" واقعی جب ذرے کا دل چیرا گیا تو ساری جلوہ نمائی خورشید ہی کی نکلی، چھوٹے چھوٹے ذرے اپنے مرکز کے گرد لاکھوں میل کی رفتار سے اپنے اپنے مقررہ راستوں پر چکر کاٹتے ہیں لیکن کیا مجال ہے جو آپس میں ٹکرا جائیں۔ اگر ٹکراتے تو دنیا میں زندگی باقی نہیں رہ سکتی تھی کیونکہ ہر وقت ایٹمی دھماکے ہوتے اور ہر شے فنا ہو جاتی ان پر سالمات کو کسنے مسخر اور پابند کر دیا ہے۔ خود بخود اتنی باقاعدگی کس طرح پیدا ہو سکتی ہے۔

آپ جنگل میں نکل جاتے ہیں، پھول بھی ہوتے ہیں، جھاڑیاں بھی، پودے بھی لیکن بے ترتیب آپ سمجھ لیتے ہیں کہ یہاں کوئی مالی نہیں لیکن کسی ملک

میں چلے جاتیں تو ہر روش، ہر تختۂ گل پکار پکار کر کہتا ہے کہ میری ترتیب اور باقاعدگی کسی ہوشیار باغبان کی مرہونِ منت ہے، جب اتنی بڑی کائنات کے ذرے ذرے میں اتنی زبردست باقاعدگی ہو کہ ہماری سمجھ میں بھی نہیں آسکے اور ہم سوائے حیران ہونے کے کچھ نہ کر سکیں تو پھر ہم یہ کس طرح نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اس پردۂ زنگاری میں کوئی محبوب نہیں ہے اور اس عظیم عمارت کا بنانے والا کوئی عظیم ترین انجینئر نہیں۔

ج ۔ مذہب اور خدا کے ماننے والے کہتے ہیں کہ اس باقاعدہ کائنات کو ایک قادرِ مطلق خدا نے ایک خاص مقصد کے لئے بنایا۔ لیکن دہریے جو خدا کو نہیں مانتے وہ کہتے ہیں کہ یہ کائنات خود بخود یونہی پیدا ہو گئی۔ وہ یہ نہیں بتا سکتے کہ یونہی کس طرح پیدا ہو گئی، جبکہ دوسری کوئی چیز یونہی بغیر کسی سبب یا خالق کے نہیں پیدا ہو سکتی، پھر کائنات بھی ایسی کہ جس کے ہر ذرے میں ایک عالم پوشیدہ ہے اور اس کے چھوٹے اجزا بھی ایک اصول کے تحت گردش کرتے ہیں۔ ایک فلسفی سائنس دان نے جو کہ خدا کے وجود کا قائل ہے اس ضمن میں ایک بڑی اچھی مثال دی ہے وہ کہتا ہے کہ اگر کسی بوتل میں سو دانے ڈالے جائیں اور ایک دانے پر نشان لگا دیا جائے پھر ان دانوں کو بوتل کو کئی لاکھ مرتبہ ہلانے سے اتفاق سے صرف ایک مرتبہ یہ اوپر آسکے گا تو اتنی بڑی کائنات میں اتنے کام، اتفاق سے فہرست کے مطابق سر انجام پانے کے لئے اتنا وقت درکار ہوگا کہ جس کا اندازہ بھی نہیں ہو سکتا اور جو کسی طرح ممکن ہی نہیں، پھر یہ تو معمولی سمجھ کا آدمی بھی اندازہ لگا سکتا ہے کہ یہ بات زیادہ مناسب ہے کہ مخلوق کا کوئی خالق ضرور ہے یا یہ دعویٰ زیادہ معقول ہے مخلوق بغیر کسی خالق کے یونہی نہ معلوم کیسے پیدا ہو گئی، ہر شخص اپنی عقلِ سلیم سے، خود ہی سوال کر کے جواب معلوم کر سکتا ہے۔

اس کے علاوہ دہریوں نے یہ دعویٰ تو کیا ہے کہ ہم عقل سے خدا کے وجود کو ثابت نہیں کر سکے لیکن کسی نے دعویٰ نہیں کیا کہ ہم خدا کے عدم یا نہ ہونے کو عقل سے ثابت کر سکے ہیں اور کسی کے وجود کا عقل سے ثابت نہ ہونا اس کے عدم کی دلیل نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ آج سے دو سو سال پہلے ہم بہت سی چیزوں کا وجود عقل سے ثابت نہیں کر سکتے تھے لیکن آج وہ ہماری عقل میں آرہی ہیں اور ان کا نہ ماننے والا جاہل اور اندھا کہلائے گا۔

میرے خیال سے آخر میں ایک الزامی جواب کے قسم کا لطیفہ بھی معنی خیز اور عبرت انگیز رہے گا، ایک دہریئے سے بحث کے دوران ایک خدا پرست نے خوب کہا کہ حضرت اگر خدا نہ بھی ہوا تو ہمارا کچھ نہیں بگڑتا۔ اس کے تصور سے زندگی سنورتی ہے زندگی میں اچھی اور پاکیزہ قدریں ابھرتی ہیں۔ پرسکون اور معتدل زندگی گذارنے کا موقع ملتا ہے لیکن اگر خدا نکل آیا تو تمہاری مٹی پلید ہو جائے گی "نہیں کہیں پناہ ملے گی۔" ان سزاؤں اور عقوبتوں کا بھی ذرا اندازہ کر لو جو ایک قادرِ مطلق خدا ایک باغی اور نافرمان بندے کو دے سکتا ہے۔

آزمودہ دواؤں کا مرکب
انلجین
سر درد۔ کمر کا درد۔ دانت کا درد
ایام۔ انفلوئنزا اور ہر قسم کے دوسرے درد کے لئے
یقینی زود اثر اور بے ضرر علاج ہے

ماہر القادری

یہ امت خرافات میں کھو گئی

دین میں جو چیز اصل حجت اور حقیقی سند ہے وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے، یہاں تک کہ صحابہ کرام کے اقوال و آثار کے درمیان کتاب و سنت کی روشنی میں محاکمہ اور موازنہ کیا جاتا ہے کہ کس صحابی کا قول و اثر اقرب الی الحق اور کتاب و سنت سے زیادہ قریب ہے، فقہی مذاہب کی بنیا اس محاکمہ اور موازنہ پر ہے کہ کس صحابی کا قول راجح ہے اور کس کا قول مرجوح ہے، کتاب و سنت کے بعد صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے آثار بیں تو دینی مسائل اور اسلامی قوانین میں "نظائر" کا درجہ رکھتے ہیں اور صحابہ کرام کا جس فقہی مسئلہ میں "اجماع" ہو جائے وہ امت کے لئے "دینی سند" بن جاتا ہے۔

کتاب و سنت اور آثار صحابہ کے بعد چاہے وہ فقہ کا امام ہو یا حدیث و تفسیر کا شیخ الشیوخ یا تصوف کا قطب الاقطاب، ان میں ہر بزرگ کے قول و عمل کو کتاب و سنت کی کسوٹی پر جانچا اور پرکھا جائے گا جس کسی کا قول و عمل اس کسوٹی پر پورا نہیں اترے گا، اسے بلا کسی جھجک کے رد کر دیا جائے گا، اس کے رد کرنے سے کسی بزرگ کی تنقیص ہرگز ہرگز نہیں ہوتی، اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کوئی بھی شخص اور فرد دین میں "حجت قطعی" تسلیم کئے جانے کا منصب نہیں رکھتا، اور "معصومیت" صرف نبوت کا خاصہ ہے "وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ" یہ صرف نفسِ رسالت کی صفت اور خصوصیت ہے!

کسی دینی مسئلہ میں جب اختلاف واقع ہو جائے تو امت کو یہ مشورہ اور حکم نہیں دیا گیا کہ تم امت کے اکابر افراد اور بزرگوں کی طرف مراجعت کرو، بلکہ یہ حکم دیا گیا ہے کہ "فردوہ الی اللہ والرسول" ——— پس دین میں اصل حکم، حجت اور معیار و میزان کتاب و سنت قرار پائے۔

اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ "اقیموا الصلوٰۃ" مگر سوال یہ ہے کہ نماز کس طرح ادا کی جائے؟ اس کا آغاز کس ہیئت کے ساتھ ہو، رکوع، سجدہ اور قومہ کس طرح کریں، تکبیر و تسبیح کے طور پر کیا پڑھیں؟ ان سوالات کی پوری تفصیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں ملتی ہے، اسی لئے حضور نے ارشاد فرمایا ... "جس طرح تم مجھے نماز پڑھتے دیکھتے ہو اسی طرح تم بھی نماز پڑھا کرو" سنت نبوی کی اتباع نماز ہی تک محدود نہیں ہے سنتِ رسول تمام دین کا مظہر اور عملی نمونہ ہے "قرآن" لفظ ہے اور سنتِ رسول معنیٰ اور عمل ہے! دین دراصل اسی صراطِ مستقیم اور شاہراہ کا نام ہے جس میں حضور کے نقش قدم نظر آتے ہیں! اطاعتِ رسول کا اصل مقصد اور غایت اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنا ہے اور رضائے الٰہی، اطاعتِ رسول کے بغیر حاصل ہو ہی نہیں سکتی۔

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر دین کا اتمام کر دیا گیا، اور خیر و تقویٰ کے تمام کلیات اور بنیادی اصول بنا دئے گئے جن میں نہ تو اضافہ ممکن ہے اور نہ ترمیم! تمدن و تہذیب اور معاشرے کے حدود جب وسیع تر ہوتے تو صحابہ کرام نے خیر و تقویٰ کے ان کلیات و اصول کو زندگی میں حسن و خوبی سے برت کر دکھایا اور زندگی اور فطرت کے عین مطابق پایا۔ امت میں کسی فرد کو چاہے وہ کتنا ہی بڑا بزرگ کیوں نہ ہو یہ حق اور منصب حاصل نہیں ہے کہ وہ دین میں کسی ایسے اصول، طریقہ

یا رسم کو وضع کرے، جس کی سند، مثال، نمونہ اور نظیر کتاب و سنت اور آثار صحابہ میں نہ پائی جاتی ہو۔ دین میں کوئی نئی بات نکالنا دراصل اس بات کی طرف ذہن کو لے جاتا ہے کہ اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خیر و تقویٰ اور حصول سعادت کے کچھ اصول و رسوم بیان کرنے سے رہ گئے تھے اور گویا کہ نئے مخاطبین اوّلین اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شاگرد اور تربیت یافتہ صحابہ (رضوان اللہ علیہم اجمعین) بھی ان اصول اور رسموں سے بے خبر رہے۔

پچھلی امتوں کی تباہی اور خسران و ہلاکت کا سبب یہی تھا کہ انہوں نے اللہ کے دین میں نئی نئی باتیں ایجاد کر لیں اور اپنے بزرگوں اور نبیوں کی شان میں اس قدر مبالغہ کیا کہ ان کی شخصیتوں کو "الوہیت" سے ملا دیا۔ یہ بات ہم اپنی طرف سے نہیں کہہ رہے ہیں قرآن کریم اس کی خبر دیتا ہے کہ یہود حضرت عزیر کو اور نصاریٰ حضرت عیسیٰ کو "ابن اللہ" کہتے تھے۔ یہ عقیدہ ان لوگوں کی شدت عقیدت اور فرط محبت نے تراشا ہے، اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ کسی بزرگ، پیر، ولی یا نبی کے ساتھ عقیدت شرعی حدود سے تجاوز کر جاتی ہے، تو اس مبالغہ آمیز عقیدت کا سلسلہ رفتہ رفتہ "شرک" کی حد تک پہونچا کر رہتا ہے۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا کہ "مجھے میرے رتبہ سے زیادہ نہ بڑھاؤ" معلوم ہوا کہ یہ صرف اللہ تعالیٰ کی صفت اور شان ہے کہ وہاں حمد و ثنا میں جتنا بھی مبالغہ کیا جائے وہ حقیقت سے کم ہی بیٹھے گا۔ مگر بندے چاہے وہ انبیاء و رسل ہی کیوں نہ ہوں، اُن کی نعت و منقبت کے کچھ حدود ہیں جن کا حافظ و پاس کرنا ضروری ہے۔ مراتب میں فرق نہ کرنے اور عابد و معبود کو ایک سطح پر رکھنے کا دوسرا نام "زندقہ" ہے۔

گر فرق مراتب نہ کنی زندیقی

کافروں اور مشرکوں کے یہاں اہل توحید کے مقابلہ میں جو چیز نمایاں نظر آتی ہے وہ یہی ہے کہ اپنے رشیوں، منیوں اور بزرگوں کی شان میں وہ اس درجہ مبالغہ کرتے ہیں کہ عبدیت الوہیت کا روپ دھار لیتی ہے، وہ اپنے پیشواؤں میں کسی کو رام کہتے ہیں اور کسی کو بھگوان! کسی کو ایشور کا اوتار سمجھتے ہیں! کسی دیوی کے بارے میں اُن کا یہ عقیدہ ہے کہ یہ مال و دولت عطا کرتی ہے اور کوئی دیوتا دنیا والوں کو صحت و تندرستی بخشتا ہے۔ یہی عقیدت مندی اور حرمت شائوں میں تبدیل کر کے آگے سیس لوتی، اُن پر چڑھاوے چڑھاتی، اُن کے ناموں کی دہائی دیتی اور جے پکارتی ہے۔ شرک و بت پرستی کی انتہا یہ ہے کہ یہ لوگ گنگا جی اور پیپل کو پوجتے ہیں اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ گنگا مائی نے ہماری مصیبت کو دور کر دیا۔ اور پیپل کا طواف کرنے سے فلاں کا فلاں مرض جاتا رہا۔ مندروں اور دیوالوں پر میلے لگتے ہیں اور شرک کی نجاست میں مبتلا ہو کر یہ تعلق و عقیدت سے کرتے ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے بڑے دھرم کا کام کیا ہے اور دیویوں اور دیوتاؤں کو خوش کر کے بڑی نیکی کمائی ہے۔

مسلمانوں میں بھی جہاں جہاں عقیدت کا بے جا غلو پایا جاتا ہے وہاں مشرکوں اور بت پرستوں کی رسموں اور تہواروں سے مشابہ رسوم اور تہوار اور اُن کے اعتقادات سے ملتے جلتے عقیدے کسی نہ کسی طرح راہ پا گئے ہیں، اور جہالت و بے خبری کی انتہا ہے کہ جو کوئی ان بدعات اور مشرکانہ رسوم کے خلاف زبان کھولتا ہے تو الٹا اُسی بے چارے کو مطعون کیا جاتا ہے کہ تم بزرگانِ دین سے سوءِ ظن رکھتے ہو اور اُن سے بدعقیدہ ہو گئے ہو! اُس بیمار کو کیا کہئے جو طبیب و معالج کو مریض سمجھ کر اس کو نصیحتیں کرتا ہو، اور اپنے مرض کو عین صحت سمجھ بیٹھا ہو۔

اللہ تعالیٰ کے علاوہ نہ کوئی داتا ہے نہ مشکل کشا ہے اور نہ فریاد رس اور غریب نواز ہے، مگر بعض مسلمانوں کے غلو عقیدت نے یہ القاب جو اللہ تعالیٰ کی قدرت و ربوبیت کو مزا وار ہیں، بزرگان دین کو دے رکھے ہیں! جس طرح زہر سے آدمی پرہیز کرتا ہے اور ڈرتا ہے کہ کسی چیز میں چاہے وہ کتنی ہی خوش ذائقہ کیوں نہ ہو اگر سوئی کی نوک سے بھی مقدار میں کم زہر کا شبہ ہو جائے تو اُس چیز کو وہ چھوئے گا بھی نہیں، اس خوف سے کہ کہیں زہر کی ملاوٹ کے سبب اُس کی ہلاکت واقع نہ ہو جائے، مگر "شرک" جو ایمان کے لئے زہر کی طرح قاتل ہے اُس کے معاملے میں مسلمان کیسے بے پروا ہو گئے ہیں! کہ قبروں کو سجدہ کر کے اور اُن سے مرادیں مانگ کر بھی نہ اُن کے ایمان میں کوئی خلل واقع ہوتا ہے اور نہ اُن کے اسلام میں کسی قسم کی خرابی پیدا ہوتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی قبر کے بارے میں امت کو تنبیہ کی تھی کہ آپ کہیں "بت" نہ بنا لینا اور یہود و نصاریٰ پر لعنت بھیجی تھی کہ انہوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔ عرس، تیجا، بیسواں، چالیسواں، برسی اور سالگرہ، مردوں کے لئے نذر نیاز، ان رسموں سے صحابہ کرام واقف ہی نہ تھے، اور ابتدائی صدیوں تک اسلامی ادب کی کتابوں میں ان تقریبات کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ حضور نے قبروں پر چراغ جلانے والوں کو ملعون قرار دیا ہے، مگر مسلمان حضور

کے اس ارشاد کے مطابق لوگ قبروں پر چراغاں کرتے ہیں اور میلے لگاتے ہیں! اور مشرکانہ رسوم و بدعات کا یہ سلسلہ "دین و عقیدت" بن کر رہ گیا ہے!

یہ ہمارا ذاتی مشاہدہ اور تجربہ ہی نہیں ہے اور نہ ہم نے اس باب میں ذرا بھی غلو کیا ہے، کئی سو سال سے نہ جانے کتنے مسلمان مشرکانہ رسوم اور بدعات کی وبا میں مبتلا ہیں حضرت شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ نے اب سے دو سو سال قبل اسی المیہ کا اظہار ان لفظوں میں کیا ہے:۔

"اگر تم مشرکین عرب کے عقائد اور ان کے اعمال و احوال کے حالات کی پوری پوری تصویر سے واقف ہونا چاہتے ہو تو اس زمانہ کے عوام و جہلا کو دیکھو کہ وہ قبروں اور آستانوں پر جاتے ہیں اور طرح طرح کے شرک کا ارتکاب کرتے ہیں، غرض اس زمانہ کی آفتوں میں سے کوئی آفت نہیں جو اس زمانہ کی ایک قوم اس کا ارتکاب نہیں کرتی اور ان کے مثل اعتقاد نہیں رکھتی، خدا ہم کو ایسے عقائد و اعمال سے بچائے۔ (الفوز الکبیر ــــ اردو ترجمہ)

بدعت جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "ضلالت" سے تعبیر فرمایا ہے کبھی ایک حال پر نہیں رہتی، شروع شروع میں اس کی بعض صورتیں سادہ اور بے ضرر سی معلوم ہوتی ہیں، مگر اس پر اضافہ ہوتے چلے جاتے ہیں اور پھر گمراہی کی کوئی حد و انتہا نہیں رہتی! مثلاً کسی شخص نے کسی بزرگ کے یوم وفات پر بزرگ کی قبر کی زیارت کی ہوگی، پھر کچھ قرآن شریف پڑھ کر اس کا ثواب اُن بزرگ کی روح کو بخشا ہوگا اور ایصال ثواب کے لئے فقراء کو کھانا بھی کھلایا ہوگا، اس کے بعد ہر سال کسی سال اُسی قبر پر دوسرے عقیدت مندوں نے آنا شروع کیا، اور رفتہ رفتہ زائرین کا اجتماع ہونے باقاعدہ میلے ٹھیلے کی صورت اختیار کرلی جسے "عرس" کا نام دیا گیا، پھر اس قبر کا طواف ہونے لگا اور بعض لوگ اُسے چومنے لگے بلکہ سجدہ تک کرنے لگے! کسی بادشاہ یا امیر نے اُس قبر کے مصارف کے لئے جائداد وقف کی اس طرح سجادہ نشینی کا سلسلہ چل پڑا باپ کی جگہ بیٹا اور بیٹے کے بعد پوتا گدی کا وارث قرار پایا اور اس وراثت کے ایک سے زائد دعوے دار ہوتے تو عدالتوں میں مقدمہ بازی تک کی نوبت تک آ گئی، سجادہ نشینی کے منصب کے علاوہ "مزار مبارک" کی "خدمت" کچھ لوگوں سے متعلق ہوئی اور اس طرح "خادم" کے نام سے باقاعدہ ایک پوسٹ (POST) بن گئی، اور "خدام" زائرین سے نذرانہ اور حق خدمت وصول کرنے لگے۔

یہ عرس ہے ـــــ دُور دُور سے زائرین "شد رحال" کر کے مزار مبارک کی زیارت کے لئے آرہے ہیں! قبر پر چادریں چڑھائی جارہی ہیں، کھانے کی دیگیں لٹ رہی ہیں، کہیں سماع کے نام پر گانے بجانے کی محفلیں جم رہی ہیں، صاحب قبر سے مرادیں مانگی جارہی ہیں، مزار کے دروازے پر بہت سے حاجت مندوں نے تو اپنی عرضیاں لکھ کر لٹکا دی ہیں، کوئی جھولی پھیلائے کھڑا ہے اور رو رو کر التجا کر رہا ہے کہ سرکار! اس در سے خالی ہاتھ واپس نہیں جاؤں گا، اس فقیر کی جھولی میں تو حضور کو کچھ نہ کچھ ڈالنا ہی ہوگا! قبر کا طواف ہے، سجدے ہیں، صاحب قبر سے استمداد و التجا اور استغاثہ ہے، قبر کا غسل ہے، جس کے پانی کو مستفدین بڑی عقیدت کے ساتھ پی رہے ہیں، اور بہت سے تو شیشیوں میں بھر کر لئے جارہے ہیں ــــــ خدا کے لئے غور کیجئے کہ عرس، زیارت قبر کے اس کاروبار کا اسلام سے کوئی دُور کا بھی واسطہ ہے، اگر یہ شرک و بدعت نہیں ہے تو پھر شرک و بدعت کا دنیا میں سرے سے وجود ہی نہیں ملتا اور کتاب و سنت میں "شرک و بدعت" کا جو ذکر آیا ہے، تو معاذ اللہ یہ یوں ہی "برائے بیت" ہے، اس نام کی کوئی برائی دنیا میں نہیں پائی جاتی۔

ایک تو جاہل عوام اور جاہل علماء ہیں جو زیارت قبر اور عرس کے اس انسٹی ٹیوشن کو کار ثواب سمجھے ہوئے ہیں مگر بعض ایسے علماء جو کتاب و سنت اور آثار صحابہ پر نگاہ رکھتے ہیں، ان پر افسوس ہوتا ہے کہ وہ ان خرافات پر نکیر نہیں کرتے اور جو خدا کا بندہ ان لغویات پر نکیر کرتا ہے، اُس کی یہ علماء تائید نہیں فرماتے بلکہ اُس کے موقف کو مشتبہ بنانے کے لئے طنز و مزاح کا رنگ اختیار کر لیتے ہیں، ان اہل علم کی اس روش سے "شرک و بدعات" کے ان مظاہر کو فائدہ پہونچتا ہے یہ حضرات اس غلط فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ ہماری روش اعتدال و احتیاط کی روش ہے اور ہم نے افراط و تفریط سے دامن بچا کر معتدل موقف اختیار کیا ہے! یہ اُن علماء کی بھول ہے! شرک و بدعت اور توحید و سنت کے مابین "اعتدال" اور "درمیانی راہ" کا تصور ہی سرے سے غلط ہے! توحید و شرک اور سنت و بدعت کے درمیان نہ تو مصالحت ہو سکتی ہے اور نہ بین بین کوئی مسلک وضع کیا جا سکتا ہے۔

"ایصال ثواب" کا مسئلہ اپنی جگہ درست ہے مگر اصل سوال رسم اور طریقہ کا ہے! دیکھنا یہ ہے کہ ان مسائل و معاملات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

یہ کیا عمل اختیار فرمایا اور صحابہ کرام کس طریقہ پر کاربند رہے؟ کسی کتاب میں کوئی ضعیف قول بلکہ موضوع روایت تک بھی ایسی نہیں ملتی، جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانے پینے کی چیزوں اور پھل وغیرہ کو سامنے رکھ کر فاتحہ پڑھی ہو اور اس فاتحہ اور اشیاء کا ثواب کسی مردے کی روح کو پہنچایا ہو اور صحابہ کرام کا یہ عمل رہا ہو! اور نہ فقہ کی کتابوں میں اس کا کوئی ذکر ملتا ہے! اس صورت میں یہ بات غور کرنے اور سوچنے کی ہے کہ مسلمانوں نے بزرگوں کی نذر و نیاز اور فاتحہ کی جو رسم اور طریقے نکال لئے ہیں کہ یہ بی بی کی صحنک ہے، یہ بو علی شاہ قلندر کی سہمنی نیاز ہے، یہ فلاں بزرگ کے نام کے کونڈے ہیں، یہ تبارک کی روٹیاں ہیں، یہ شب برات کا حلوہ ہے، یہ فلاں صاحب ولایت کا توشہ ہے، یہ گیارہویں کی نیاز اور چھٹی شریف کی فاتحہ ہے —— ان کے لئے کوئی دلیل، کوئی سند جواز، ان کی اباحت اور استحباب کے لئے کوئی نظیر! اس قسم کی رسمیں اور طریقے ہندوؤں، پارسیوں، یہودیوں، عیسائیوں وغیرہ کے یہاں سے آتے ہیں، جن کو دین اور کار ثواب سمجھ لیا گیا ہے، اور جن کے خلاف اہل بدعت ایک لفظ بھی سننا گوارا نہیں کرتے۔

جس طرح مسلمانوں کو بدنام کرنے اور عوام کو ان سے نفرت دلا کر ان سے دور رکھنے کے لئے قریش مکہ نے "صابی" کی اصطلاح وضع کی تھی، اسی طرح اہل بدعت نے "وہابی" اور "دیوبندی" کی اصطلاح ایجاد کی ہے، جو کوئی توحید و سنت کی دعوت دیتا اور شرک و بدعت پر نکیر کرتا ہے اس پر "وہابیت" اور "دیوبندیت" کی پھبتی کسی جاتی ہے۔

حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حجر اسود کو چومتے ہوئے کہا تھا کہ اے پتھر! تو نہ نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ نقصان، میں تجھے اس لئے چوم رہا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تجھے چوما تھا، انہی حضرت فاروق اعظم نے اس درخت کو کٹوا دیا تھا جس کے نیچے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے "بیعت رضوان" لی تھی، اور لوگ اس درخت کے ارد گرد جمع ہونے لگے تھے، اس کا اندیشہ تھا کہ آگے چل کر کہیں یہ درخت نشان پرستش نہ بن جائے! — یہ ہے توحید شناسوں کا مزاج، ذہن و فکر اور عمل و عقیدہ! شرک و بدعت کی تردید و استیصال اور توحید و سنت سے تمسک کا نام اگر "وہابیت" ہے تو پھر یوں کہنا چاہئے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سب سے بڑے "وہابی" تھے کہ ایک متبرک درخت کو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شرف نسبت رکھتا تھا، محض اس اندیشہ کے سبب کٹوا دیا کہ لوگ اس کی تعظیم و تکریم میں ایسا مبالغہ نہ کرنے لگیں، جو پرستش کی حد تک پہنچ جائے!

حدیث شریف میں ہے:—

کنت نهیتکم عن زیارة القبور فزوروها فانها تزهد فی الدنیا وتذکر الآخرة (میں نے تمہیں زیارت قبور سے منع کیا تھا، اب قبروں کی زیارت کیا کرو، یہ چیز دنیا سے بے رغبت کرتی اور آخرت کی یاد دلاتی ہے)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد کس قدر واضح ہے اس میں قبروں کی زیارت کی غایت بتا دی گئی ہے —— دنیا سے بے رغبتی اور آخرت کی یاد —— حضور نے یہ نہیں فرمایا کہ قبروں پر جا کر صاحب قبر سے مرادیں مانگا کرو یا ان سے اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کرنے کی درخواست کیا کرو، وہاں فیض اور ہدایت حاصل کرنے کے لئے میلے لگایا کرو، بلکہ اس کے برخلاف خود اپنی قبر کے بارے میں یہ ہدایت فرمائی:—

لا تجعلوا قبری عیدا

(میری قبر کو "عید" نہ بناؤ)

"عید" کہتے ہیں میلہ لگانے کو۔ یہ آج کل کے "عرس" "عید" (یعنی میلے) نہیں تو اور کیا ہیں! پھر حضور نے دنیا سے تشریف لے جانے سے پہلے مرض الموت میں فرمایا کہ

لعن اللہ الیہود والنصاری اتخذوا قبور انبیاءهم مساجد

(لعنت ہو اللہ کی یہود و نصاریٰ پر کہ انہوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو مساجد بنا لیا)

پھر حضور نے فرمایا:—

لعن اللہ زائرات القبور والمتخذین علیها المساجد والسرج (مشکوٰۃ)

(لعنت کی اللہ نے ان عورتوں کو جو زیارت کریں قبروں کی اور ان لوگوں پر لعنت خدا کی جو قبروں پر مسجدیں بنائیں اور روشن کریں (قبروں پر) چراغ)

اس ہدایت کے ساتھ ساتھ قبروں پر پختہ کرنے اور ان پر گنبد اور عمارت بنانے سے بھی منع فرمایا! احادیث کی اس صاف و واضح روشنی میں سوچئے کہ مسلمانوں نے بزرگانِ دین کی قبروں کو کیا سے کیا بنا دیا ہے، اور قبروں کے ساتھ مسلمان عقیدت و تکریم کا جو سلوک کرتے ہیں وہ منشاء رسولؐ سے کتنا مغایر اور مخالف ہے!

امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ نے مسلمانوں کے اس خلاف قرآن و سنت عمل پر سینکڑوں سال پہلے نکیر کی ہے۔

انہم وضعوا ھذہ الاصنام والاوثان علی صور انبیائہم واکابرھم وزعموا انہم متی اشتغلوا العبادۃ ھذہ التماثیل فان اولئک الاکابر تکون شفعاء ھم عند اللہ تعالیٰ ونظیرہ فی ھذا الزمان اشتغال کثیر من الخلق بتعظیم قبور الاکابر علی اعتقاد انہم اذا عظموا قبورھم، فانہم یکونون شفعاء ھم عند اللہ

(یعنی بت پرستوں نے اصنام و اوثان اپنے انبیاء و اکابر کی صورتوں پر تراشے تھے اور یہ خیال کرتے تھے کہ جب ہم ان کی عبادت میں مشغول ہوں گے، تو یہ اکابر اللہ تعالیٰ کے پاس ہماری سفارش کریں گے، اس کی نظیر اکثر لوگوں کی اپنے بزرگوں کی قبروں سے مشغولیت ہے اس اعتقاد سے اگر ہم ان قبروں کی تعظیم کریں گے، تو یہ اللہ کے نزدیک ہمارے شفیع ہوں گے)

کیا امام فخر الدین رازی بھی "وہابی" تھے، "قبر پرستی" کے خلاف انہوں نے اس شدت کے ساتھ احتجاج کیا ہے کہ "قبوری مسلمانوں" کی "بت پرستوں" کے ساتھ مشابہت دکھائی ہے!

اللہ تعالیٰ ہی عالم الغیب مشکل کشا اور کارساز ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث و صحابہ کرام کی کتابیں بھری پڑی ہیں جو ادب منقول ہیں کہ حضورؐ نے یا کسی صحابیؓ نے ایک لفظ بھی ایسا نہیں فرمایا جو عبد و معبود کے تعلق کو مشتبہ بناتا ہو، "انا الحق" کا نعرہ "من تو شدم تو من شدی" کی شاعرانہ نکتہ آفرینی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت اس انداز میں ہے۔

تو سلطانی صاحب سریر آمدی

علیٰ کل شئی قدیر آمدی

یہ سب شعر و تصوف" کی شطحیات، شوخیاں اور نیرنگیاں ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید خاص کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے اس قدر احتیاط کو ملحوظ رکھا ہے کہ "جو اللہ چاہے اور جو محمد چاہیں" تک کہنے سے بھی روکا ہے۔

اخرج فی شرح السنۃ عن حذیفۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لا تقولوا

ماشاء اللہ وشاء محمد وقولوا ماشاء اللہ وحدہ (مشکوٰۃ، باب الاسامی)

(حضرت حذیفہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یوں نہ کہا کرو "جو چاہے اللہ اور جو چاہے محمدؐ بلکہ یوں کہا کرو" جو اللہ تعالیٰ تنہا چاہے")

پھر حضورؐ نے اس لوں کو "ملک الملاک" (بادشاہوں کا بادشاہ) کہنے سے منع فرمایا، کہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور شہنشاہی سے لفظی مشابہت کا پہلو نکلتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے خود اپنی ذات کے بارے میں ——— مالک و مختار، شہنشاہ، دستگیر، فریادرس، مشکل کشا، عالم الغیب داتا، کارساز، بندہ نواز، ——— جیسے کوئی لقب ادب نام نہیں سنا گیا، اور نہ صحابہ کرام نے حضورؐ کو اس قسم کے القاب و آداب سے مخاطب اور یاد کیا، یہ تو شاعروں کی مبالغہ آمیزیاں ہیں جو عقیدت رسولؐ کا مذہب بن کر رہ گئی ہیں، قرآن پاک میں تو ان عقائد کے علی الرغم زبانِ رسولؐ سے یہ کہلوایا گیا ہے۔

قل لا املک لنفسی نفعاً ولا ضراً الا ماشاء اللہ۔

اے محمدؐ (صاف صاف کہہ دیجئے کہ میں اپنی ذات کے لئے کسی نفع اور نقصان کا مالک نہیں ہوں، مگر جو اللہ چاہے۔

ولو کنت اعلم الغیب لاستکثرت من الخیر وما مسنی السوء ان انا الا نذیر

(اگر میں غیب جانتا تو بکثرت بھلائی حاصل کر لیتا اور کوئی نقصان دہ بات مجھے پیش نہ آتی، میں تو صرف (خدا کے عذاب سے) ڈرانے والا ہوں !

---------- اور ----------

قل لا اقول لکم عندی خزائن اللّٰہ ولا اعلم الغیب ولا اقول لکم انی ملک ان اتبع الا ما یوحیٰ الی

اے محمد، کہہ دیجئے کہ میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب جانتا ہوں اور نہ میں یہ کہتا ہوں کہ میں کوئی فرشتہ ہوں میں تو اپنی طرف نازل ہونے والی وحی کا اتباع کرتا ہوں !

" لا اقول لکم عندی خزائن اللّٰہ " (میں نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے) فرما کر اس کا بھی اعلان کر دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مال و دولت کا خزانہ ہی نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی بندے کے خزانے بھی نہیں ہیں ۔ ان واضح آیات اور ارشادات کے ہوتے ہوئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کون و مکان کا مالک سمجھنا اور یہ عقیدہ رکھنا کہ کائنات میں جس کو بھی جو کچھ ملتا ہے حضورؐ کے خزانے اور داتا نے سے ملتا ہے، لوگوں کی تقدیریں حضورؐ بناتے ہیں، مریضوں کو شفا آپ دیتے ہیں اور نہ صرف آپ ــــ بلکہ ہر ولی، پیر اور شہید کائنات میں متصرف ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان بزرگوں کو انسانوں کی حاجت روائی پر مامور فرمایا ہے ــــ اس قسم کے تمام عقائد " توحید " کی تردید کرنے والے ہیں !

صحابہ کرام کیسی کیسی مشکلات میں مبتلا رہے ہیں مگر کسی صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مدد کے لئے نہیں پکارا اور نہ روضۂ رسولؐ پر جا کر فریاد و استغاثہ کیا ! صحابہ کرام سے مرتبہ میں بڑھ کر کون غوث، قطب اور ابدال ہو سکتا ہے مگر ان تک پر مصائب آکر پڑے ہیں اور قضا و قدر کے آگے وہ مجبور پائے گئے ہیں !

اگر وہ مالک و مختار، مشکل کشا اور عالم الغیب ہوتے تو جمل و صفین کے " الم ناک واقعے " ہی سرے سے پیش نہ آتے " حضرت علی کرم اللہ وجہہ قاتلین عثمانؓ ہی کی شناخت نہ کر سکے ! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی انگوٹھی حضرت سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی انگلی سے کنوئیں میں گر پڑی، صحابہ کرام نے بہت کچھ تلاش کی، مگر انگوٹھی نہ ملی، اور حضورؐ کی مبارک انگشتری کے گم ہو جانے کا سب کو غم ہوا، مگر جو مقدر تھا، وہ پورا ہو کر رہا ! جب صحابہ کرام جو اولیاء اللہ کے سردار ہیں، کنوئیں میں گری ہوئی انگوٹھی کو تلاش نہ کر سکے تو ہم اس صورت میں کسی ولی اور غوث و قطب کے بارے میں یہ عقیدہ رکھیں کہ وہ سارے جہان کی مشکل کشائی اور دستگیری کرتا ہے اور کائنات کا کوئی گوشہ اس کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں ہے ۔

تمام صحابہ کرام میں ہر ایک کو نہ تو پورا قرآن حفظ تھا اور نہ ہر صحابی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام احادیث کا علم تھا، جب صورتِ حال یہ ہو تو اولیاء اللہ کے بارے میں یہ عقیدہ رکھنا کتنی غلط اور خلافِ واقعہ بات ہے کہ وہ دلوں کے حالات جانتے ہیں اور ساری کائنات کا علم اور خبر رکھتے ہیں ! محدثین اور فقہا بھی اولیاء اللہ ہیں مگر اس لئے کہ وہ " علمِ غیب " نہیں جانتے تھے، اُن کے درمیان مسائل اور معاملوں کے اختلافات پائے جاتے ہیں یہاں تک کہ ایک راوی پر ایک محدث جرح کرتا ہے اور دوسرا محدث اُس کی تعدیل کرتا ہے، ایک بات ایک امام فقہ کے نزدیک جائز ہے اور دوسرے امام کے یہاں ناجائز ہے ۔

صحابہ کرام، تابعین اور فقہا و محدثین کے یہاں اس قسم کی باتوں کا نہ پایا جانا، خدانخواستہ ان کی منقصت کی دلیل نہیں ہے، اس لئے کہ کتاب و سنت نے کسی نبی، رسول، صحابی یا ولی کا یہ منصب کب بتایا تھا کہ وہ " عالم الغیب " اور کائنات کا مالک و مختار، سمیع و خبیر اور علیم بذات الصدور ہے ۔ نیز اسی صفت کی یہ صفت کتاب و سنت میں کہیں نہیں بتائی گئی کہ انبیاء اور اولیاء دنیا کو رزق اور اولاد عطا کیا کرتے ہیں اور ان کو جو کوئی بھی دور و نزدیک سے پکارتا ہے، اُس کی پکار سن لیتے ہیں جو کوئی انبیاء اور اولیاء کے بارے میں اس قسم کے عقائد رکھتا ہے اُسے اپنے ان عقائد سے توبہ کر کے " توحید " پر جم جانا چاہئے ! اور " شرک " وہ گناہ ہے جو معاف نہیں کیا جاتا ۔ اور " شرک " کے بعد کوئی عمل خیر فائدہ نہیں پہونچاتا ۔

انبیاء کرام کے معجزات اور اولیاء اللہ کی کرامات حق ہیں، جب اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا ہے اُن سے " خرقِ عادت " کا ظہور ہو جاتا ہے مثلاً عیسیٰ علیہ السلام

مادرزاد اندھوں اور کوڑھیوں تک کو اچھا اور بھلا چنگا کر دیا کرتے تھے، مگر اس معجزہ سے یہ نتیجہ نکالنا قیاس مع الفارق ہے کہ اِس زمانے میں سارے دنیا کے مریضوں کی حالت کی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خبر رہتی تھی اور تمام جہان کے مریضوں کو شفا آپ ہی عطا فرماتے تھے! حضرت عیسیٰؑ کا یہ معجزہ حق ہے مگر کیا کسی مسلمان نے آج تک حضرت عیسیٰ کو مرض میں شفا دینے کے لئے پکارا ہے، اور کیا اُس کا ایسا کرنا شریعت کی رو سے جائز سمجھا جائے گا۔

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ حیات میں صحابہ کرام کا یہ عقیدہ نہیں تھا کہ جو صحابی جہاں بھی ہے حضور اُس کی حالت سے باخبر ہیں اور نہ کسی صحابی نے سفر و حضر میں مشکل کے وقت حضورؐ کے نام کی دہائی دی! اگر سب کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اختیار و تصرف میں ہوتا تو وہ اللہ تعالیٰ سے حضور کے ہوتے ہوئے دعا کاہے کو کرتے بھلا! وہ بعض اوقات حضورؐ سے دعا کرنے کی درخواست کرتے تھے، کہ اجابت و قبولیت تو دعاءِ رسولؐ کی منتظر رہتی تھی ـــــ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص بیمار ہے اُس کا باپ اُس کے سرہانے بیٹھا ہوا ہے۔ اُس مریض کو پیاس لگتی ہے وہ جانتا ہے کہ پانی گھر میں موجود ہے اور اس کا باپ پانی پلانے پر قادر بھی ہے تو وہ شخص اپنے باپ سے پانی پلانے کی درخواست کرے گا، اللہ تعالیٰ سے دعا نہیں کرے گا کہ یا اللہ! مجھے پانی پلا دے! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کی درخواست یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہوتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے بلاواسطہ دعا، یہ بات بتاتی ہے کہ حضور کے تصرف و قدرت اور اختیار و امکان میں سب کچھ ہوتا تو صحابہ آپ ہی سے ہر مصیبت اور خوف و احتیاج کے وقت درخواست، التجا اور استغاثہ کرتے یہ جانتے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو سب کچھ عطا کرنے اور ہر مصیبت اور بلا دور کر دینے کا اختیار دیا ہے! لیکن واقعات اس کی تصدیق و تائید نہیں کرتے!

حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ جن کو اہلِ تصوف اپنا امام مانتے ہیں اور تصوف کے تین خانوادے اُنہی سے منسوب ہیں، اور جن کو اہلِ بدعت نے "مشکل کشا" کا لقب دے رکھا ہے، اُن کی زندگی سب کے سامنے موجود ہے، امیر معاویہ رضی اللہ عنہ پر غلبہ اور قابو حاصل کرنے کے لئے حضرت علیؓ نے کیا کچھ نہیں کیا، دُعا بھی اور ہر ممکنہ تدبیر اور جدوجہد بھی، لیکن قضا و قدر کے آگے وہ مجبور نظر آتے ہیں، حضرت علی کی تمناؤں اور دعاؤں کے باوجود امیر معاویہ کی امارت باقی رہتی ہے رفتہ رفتہ ایک صدی تک بنو اُمیہ کی امارت اور حکومت کے جھنڈے فضائے عالم میں لہراتے نظر آتے ہیں یہاں تک کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا دردناک واقعہ بھی اموی حکومت کے جاہ و جلال میں کوئی انقلاب اور تغیر پیدا نہ کر سکا اللہ تعالیٰ کی حکمتیں وہی خوب جانتا ہے کہ انبیاء کرام تک کو ظالم قتل کر دیتے ہیں مگر فوراً ظلم کے ہاتھ اُن پر عذاب نازل نہیں ہوتا۔

یہ صفت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے کہ تمام انسانوں کے دلوں کا حال جانتا ہے اور زمین کا کوئی ذرہ، درختوں کا کوئی پتہ اور آسمان کا کوئی ستارہ اُس سے پوشیدہ اور چھپا ہوا نہیں ہے، کائنات میں جو کوئی دعا بھی ہوتی ہے اُسے اللہ تعالیٰ سنتا ہے اور ہر کسی کی مصیبت بھی وہی دور کرتا ہے، وہی رازق ہے، وہی شافی ہے، وہی کارساز اور مشکل کشا ہے، وہی دنیا کے کارخانے کو کسی کی شرکت اور مدد کے بغیر سنبھالے ہوئے ہے ـــــ یہ تمام کی تمام قدرتیں اللہ تعالیٰ نے کائنات میں کسی کو بھی عطا نہیں کیں! اور کسی کا تو ذکر ہی کیا ہے، خود انبیاء کرام اور مرسلین عظام کی مقدس زندگیاں ان اختیارات اور قدرتوں کی نفی کرتی ہیں!

قرآن کریم میں حضرت خاتم الانبیاء سید المرسلین امام الاولین والآخرین نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جو منصب بتایا گیا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی آیتوں کی تلاوت، اُن کی تعلیم اور تزکیۂ نفوس ہے! یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ رزق دینے صحت اور اولاد عطا کرنے، سارے جہان کے مصیبت زدوں کی فریاد سننے اور ان کی مصیبت دور کرنے پر حضور کو مامور کیا گیا ہے! حضور کا سب سے بڑا شرف اور منصب نبوت کا شرف ہے اور یہ بھی اس شان کا تھا کہ نبوت کا آپ کی ذات پر اتمام کر دیا گیا، اب قیامت تک جس کسی کو بھی ہدایت و سعادت ملے گی حضور کے نقشِ قدم پر چل کر ملے گی، حضور کا اسوۂ حسنہ انسانیت کے لئے قطعی اور آخری معیار ہے! شرعِ رسول کے علاوہ نجات اور مغفرت کا اور کوئی ذریعہ اور راستہ نہیں! حضور کی ذات عالمین کے لئے رحمت ہے حضور اخلاق و نیکی کے سراج منیر اور صاحبِ خُلقِ عظیم تھے، آپ جیسا کوئی دوسرا ہوا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ "انسانِ کامل" کا لقب بس آپ ہی کو زیب دیتا ہے، قیامت کے دن اللہ تعالیٰ آپؐ کو لواءِ حمد عطا فرمائے گا اور مقامِ محمود بھی! اُس دن تمام انبیاء اور رسولوں میں گنہگاروں کی شفاعت کا اذن صرف حضورؐ ہی کو عطا کیا جائے گا۔ قیامت کے دن حضور

کی بزرگی اور عظمت اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں آپ کی محبوبیت کا پوری طرح اظہار ہوگا اور تمام انسانوں میں حضورؐ ہی سب سے بلند و بالا اور معزز و مکرم نظر آئیں گے (فداہ ابی و امی)

میلاد اور قیام

مشکلات رسوم و عقائد اور بدعات کی نوعیت ہے کہ ان میں کسی ایک مسئلہ کی بھی تحقیق کر لی جائے تو دوسرے تمام مسئلوں کی گتھیاں کھلتی اور سلجھتی چلی جاتی ہیں کہ ہر بدعت دوسری بدعت سے ربط و تعلق رکھتی ہے!

مثلاً "مولود" یا میلاد ہی کو لے لیجئے اس کی کوئی اصل دورِ رسالت اور عہدِ صحابہ میں نہیں ملتی! کسی کی پیدائش اور وفات کے دن منانے کا دستور اسلام میں نہیں رہا، سال کے سال سالگرہ منانا یہ تو خالص عجمی بدعت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور کسی صحابی نے اپنی سالگرہ نہیں منائی!

خلفاء راشدین کے مقدس دور میں اسلامی حکومت کے حدود کو کتنی وسعت اور مال و دولت کی کس قدر فراوانی نصیب ہوئی، مگر کسی خلیفہ راشد کے عہدِ خلافت میں حضورؐ کا "یوم میلاد" نہیں منایا گیا، نہ اس دن چراغاں ہوا، نہ رنگ برنگی جھنڈیاں نصب کی گئیں اور نہ کوئی جلوس نکلا، کسی ضعیف سے ضعیف روایت میں یہ تک نہیں ملتا کہ اس دن صحابہ کرام نے کسی جگہ جمع ہو کر قرآن خوانی کی ہو یا حضورؐ کے نام کی دیگیں پکا کر کھانا تقسیم کیا ہو! یوم میلاد یعنی BIRTH DAY اور جنم دن "منانے کی بدعتیں اور اس دن طرح طرح کے کھیل تماشے، جلوس اور مظاہرے یہ تو ہندوؤں، عیسائیوں، یہودیوں اور مجوسیوں کا شعار رہے ہیں! مسلمانوں کے تہوار صرف دو ہیں، عید الفطر اور عید الاضحیٰ! ان کے علاوہ مسلمانوں نے جن تقریبوں کو اپنا تہوار قرار دیا ہے، وہ ان کی شوخئ طبع اور جدت طرازیاں ہیں!

صحابہ کرام سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عقیدت اور محبت کس کو ہو سکتی ہے، اگر حضورؐ کی پیدائش کے دن جلوس نکالنا، چراغاں کرنا اور جھنڈیاں لگانا، حضورؐ کی محبت و عقیدت کا ذریعہ اظہار رہتا۔ تو صحابہ کرام ایسا ضرور کرتے، مگر ان کے یہاں اس قسم کے مظاہروں کا نام و نشان بھی نہیں ملتا! اس اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس طرح کے مظاہروں اور جلوسوں کی دین میں کوئی حیثیت نہیں ہے! ماہِ ربیع الاول کو جو جلوس نکلتے ہیں وہ کھیل تماشہ بن کر رہ گئے ہیں اور جس کی مثالیں ہمارے سامنے ہے کئی سال سے "یوم میلاد" کے ان جلوسوں میں غنڈہ گردی اور فحاشی کو خاصہ فروغ حاصل ہوا ہے! بدعت کی یہ خاصیت ہے کہ جہاں بھی اس کو نشوونما پانے کا موقع ملتا ہے، وہاں کسی نہ کسی طرح برائیاں اور بے عنوانیاں ظہور میں آ کر رہتی ہیں۔

"یوم پیدائش" یا "یوم وفات" تو لیڈروں، شاعروں اور ادیبوں کو زیب دیتے ہیں، یہ "یوم اقبال" ہے، یہ "یوم حسرت" ہے، یہ "گاندھی جینتی" اور TILAK DAY ہے! کہ سال میں ایک بار جمع ہوتے، ان بڑے آدمیوں کی زندگیوں پر تقریریں کیں، اور اس طرح ان کی محبت و عقیدت کا حق ادا کر دیا، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس سیرت سے تو مسلمانوں کا ایک دن یا چند دن کا نہیں بلکہ زندگی کے ہر لمحہ اور ہر منظر کا تعلق ہے! اس لیڈروں کے "یوم پیدائش" کی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا "یوم میلاد" منا کر حضورؐ کی محبت و عقیدت کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔

یہ کوئی نہیں کہتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے دن حضورؐ کا ذکر کرنا ممنوع ہے، صاحبانِ فکر و بصیرت کا کہنا یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر تو ہمیشہ ہی ہوتے رہنا چاہئے، اس کے لئے کسی خاص مہینہ اور دن کی قید نہیں ہے کہ ایک دن یا چند دن ذکرِ رسولؐ کر کے مسلمان مطمئن ہو جائیں! ذکرِ رسولؐ سے تو مسلمان کی سیری ہو ہی نہیں سکتی، یہ تو اس کی روح کی غذا اور ایمان کا تقاضا ہے، اسوۂ رسولؐ تو ہر وقت پیش نظر رہنا چاہئے!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدسہ کے مبارک ذکر سے کوئی شقی القلب کا منافق ہی روک سکتا ہے، ذکرِ رسولؐ تو سعادت و برکت اور فوز و فلاح کا ضامن ہے! اس مقدس ذکر سے آئینۂ دل کی جلا ہوتی ہے! نہ صرف اجتماعی جلسوں میں بلکہ مسلمانوں کے گھروں میں اس کا چرچا ہوتے رہنا چاہئے، ہر مسلمان بچے کی گھٹی میں ذکرِ رسولؐ کا شامل ہونا ضروری ہے! ماہِ ربیع الاول ہی نہیں ہر مہینہ ذکرِ رسولؐ کا مہینہ ہے کیونکہ امت کا ہر فرد ہر وقت اسوۂ رسولؐ جاننے اور اس پر عمل کرنے کی آرزو اور احتیاج رکھتا ہے! اعتراضات کھٹکتی ہے، وہ یہ ہے کہ لیڈروں کے "یوم" جس طرح منائے جاتے ہیں، ذکرِ رسول کو

نوعیت " DAY " کی نہیں ہونی چاہئیے۔

سیرۃ رسولؐ کے جلسے کا نام "مولود" یا "میلاد" رکھنا صحیح نہیں ہے اور نہ یہ طریقہ درست اور پسندیدہ ہے کہ سیرت کے ہر اجتماع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے ذکر کو اس طرح لازمی سمجھا جائے کہ جب تک ذکر ولادت نہ ہو گویا کہ اس اجتماع کا مقصد ہی پورا نہیں ہوا، ہم نے سیرۃ النبیؐ کے متعدد اجتماع میں دیکھا ہے کہ سیرت پر بڑی کامیاب اور پر مغز تقریریں ہو چکی ہیں، اتنے میں ایک مولوی صاحب جلسے کے منتظمین سے کچھ دیر سرگوشی کے بعد اسٹیج پر تشریف لاتے ہیں اور تقریر فرمانے لگتے ہیں کہ جس دن حضرت عبداللہ کا نکاح حضرت آمنہ سے ہوا قریش کی دو سو عورتیں رشک و حسد سے مر گئیں .... اور حضورؐ جب شکم مادر میں تھے تو یہ واقعات پیش آئے ...... اس کے بعد :-

نکل جائے محفل سے جو بے ادب ہو
اُٹھو تاکہ تعظیم محبوب رب ہو

پڑھتے ہوئے کھڑے ہو جاتے ہیں اور اردو کے نعتیہ اشعار "بصورت سلام" گانے لگتے ہیں !

اول تو اس قسم کی روایتیں کہ حضورؐ کے والد بزرگوار کا عقد جب آمنہ سے ہوا تو قریش کی دو سو عورتیں رشک و حسد سے ہلاک ہو گئیں بے سند بلکہ خلاف واقعہ اور بعید از قیاس ہیں پھر شاید اس کو کوئی شخص مشکل ہی سے پسند اور گوارا کرے گا کہ اس کی ماں، بہن یا دادی اور نانی کے حمل اور زچگی کے واقعات کا ذکر تفصیل کے ساتھ محفلوں میں بیان کیا جائے، یہ تفصیل غیرت مند طبیعت پر گراں گزرتی ہے۔

فقہ کا مسئلہ یہ ہے کہ مباح کو مستحب کا، مستحب کو سنت کا اور سنت کو فرض کا درجہ دے دینا دین میں سخت ناپسندیدہ بات ہے اس قاعدہ کی رو سے ذکر ولادت کو سیرۃ النبیؐ کے ہر جلسے میں ضروری اور لازمی سمجھنا ناپسندیدہ فعل ہے، بلکہ اس پر "بدعت" کا اطلاق ہوتا ہے !

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس سیرت کے بیان میں مناسب عنوان سے کبھی کبھار حضورؐ کی ولادت کا ذکر بھی کیا جا سکتا ہے، بلکہ کوئی علمی مجلس ہو تو حضورؐ کے آباؤ اجداد مُضر، قصی، کلاب، عدنان، نزار، قریش اور ہاشم تک کے حالات بھی بیان کئے جا سکتے ہیں اور قریش کی قدیم شہری اور بدوی زندگی اور ان کے تمدن و تہذیب کا بھی بیان ہو سکتا ہے، مگر ذکر رسولؐ کی محفل کا "میلاد" نام رکھنا اور محفل میں "ذکر ولادت" اور "ذکر ولادت" کے بعد صلوٰۃ و سلام کے لئے کھڑے ہو جانا، یہ "بدعات" ہیں۔

مسلمانوں کے عقائد بگاڑنے میں "میلاد" کی محفلوں کا بہت کچھ حصہ رہا ہے، میلاد کی جو کتابیں ان محفلوں میں پڑھی جاتی ہیں اُن میں ضعیف ہی نہیں موضوع اور جعلی حدیثیں تک ملتی ہیں، اکبر وارثی میرٹھی کا "میلاد" اٹھا کر دیکھ لیجئے، اس میں کیسی کیسی بے سند روایتیں اور پست اور سطحی باتیں ملتی ہیں جو دل و دماغ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے "میلاد اکبر" کے ذریعہ واقف ہوئے ہوں، سمجھ لیجئے کہ یہ دل و دماغ سیرت رسولؐ کا کتنا عجیب و غریب تصور رکھتے ہیں !

"میلاد شہیدی کی نسبتاً" میلاد اکبر سے بلند ہے مگر اس میں بھی اس قسم کی روایتیں ملتی ہیں کہ شب معراج جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم براق پر سوار ہونے لگے تو براق شوخیاں کرنے لگا، یہ حالت دیکھ کر حضرت غوث الاعظم کی روح وہاں حاضر ہوئی اور آپ کے سہارے حضورؐ براق پر سوار ہوئے (مفہوم کی ترجمانی)

یہ تو میلاد کی کتابوں کا عالم ہے اب رہے محفل میلاد میں تقریر کرنے والے واعظ! اُن کا رنگ تقریر بھی ان کتابوں کے رنگ سے ملتا جلتا ہے، سیرت رسولؐ یہ لوگ بھی بس برائے نام بیان کرتے ہیں اُن کو زیادہ دلچسپی ایسی باتوں سے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سایہ نہ تھا، آپ کے بدن پر مکھی نہیں بیٹھتی تھی، آپ چونکہ اللہ تعالیٰ کے محبوب ہیں اس لئے :-

میں تو مالک ہی کہوں گا کہ ہو مالک کے حبیب
یعنی محبوب و محب میں نہیں میرا تیرا

جو واعظ عربی داں ہوا اس نے مواہب لدنیہ کے عربی اقتباسات پڑھنے شروع کر دئے، سننے والے مرعوب اور متاثر ہو رہے ہیں کہ ہمارے مولوی

صاحب قبلہ کتنے بڑے علامہ ہیں مگر انہیں عربی سمجھ نہیں آتی۔ "منہ زبانی" (؟) یاد ہیں اور جوابات فرماتے ہیں دلیل کے ساتھ فرماتے ہیں۔ اشتقاق انجان کو دائیوں اور دیوبندیوں کا کفر ثابت کرنے کے لئے مامور کیا ہے! ان بے چاروں کو کیا خبر کہ عربی زبان کا ہر جملہ قرآن اور حدیث نہیں ہوتا۔ مواہب لدنیہ بڑی مشہور و مقبول کتاب ہے لیکن اس میں بہت سی موضوع اور جعلی روایتیں بھی ملتی ہیں۔ ایسی موضوع روایتیں محفل میلاد کے مقررین اور واعظوں کی تقریر و وعظ کو رنگین اور دلچسپ بناتی ہیں اور بے چارے عوام کو حضور کی سیرت کے صحیح واقعات سے بے خبر رکھتی ہیں اور وہ ساری عمر اس چکر سے نہیں نکل سکتے۔

محفل میلاد میں صلوٰۃ وسلام کے لئے کھڑے ہو جانا اس کی سند اور نظیر نہ کتاب وسنت میں ملتی ہے نہ آثار صحابہ میں نہ باقیات تابعین میں ــــ اور نہ فقہ وحدیث اور تفسیر کا کوئی امام اس رسم سے واقف تھا! یہ خالص "بدعت" ہے، جو عہد رسالت سے صدیوں بعد ایجاد کی گئی ہے، اور "بدعت" صاحب بدعت کو گمراہی کی طرف ہی لے جاتی ہے!

اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ولادت کرنے کے بعد کھڑے ہو کر صلوٰۃ وسلام پڑھنا موجب برکت، باعث ثواب اور عقیدت ومحبت رسول کے اظہار کا بہترین ذریعہ ہوتا تو صحابہ کرام اور تابعین عظام کو ایسا کرنا چاہئے تھا! مگر ان نفوس قدسیہ کے یہاں اس رسم کا کوئی ذکر تک نہیں ملتا! پھر سوچنے کی بات یہ ہے کہ کھڑے ہو کر درود وسلام پڑھنا زیادہ ثواب وبرکت کا باعث سمجھا جاتا تو نماز میں "قیام" کی حالت میں صلوٰۃ وسلام کے پڑھنے کا حکم دیا جاتا، حالانکہ درود نماز میں بیٹھ کر پڑھا جاتا ہے! ایک اور دلیل ــــ قرآن پاک میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کا ذکر تفصیل سے کیا گیا ہے: اگر نبی کریم کا ذکر ولادت کرتے ہوئے صلوٰۃ وسلام کے لئے کھڑے ہونا مستحب ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان آیات قرآنی کی تلاوت کے وقت کھڑے ہو جایا کرتے یا کم سے کم صحابہ کرام ہی ولادت مسیح کے وقت کھڑے ہو ہو کر نبی کی تعظیم کا فرض ادا کرتے۔

میلاد کی بدعت شاہان سلجوقی کی نکالی ہوئی ہے، مقام افسوس ہے کہ بادشاہوں کی "ایجاد واحداث" کو مسلمانوں نے اپنا دین بنا لیا ہے اور اس "بدعت" کی حفاظت اور ترویج واشاعت کو دین وایمان کی علامت اور عشق رسول کا بہت ضروری تقاضا سمجھے ہوئے ہیں۔

ہندوستان میں "میلاد وقیام" کی بدعت تقریباً چار سو سال سے رائج ہے، ہندوستان کے بعض شہروں میں جب اس کا چرچا ہونے لگا تو حضرت سید احمد سرہندی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مکتوب میں اس بدعت پر نکیر کی ــــ مگر اس بدنصیبی اور غلط اندیشی کو کیا کہیے کہ بہت سے مجدد کو اس "بدعت" کی مخالفت اور تردید کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں اور انہیں اس کی قباحت دکھائی نہیں دیتی۔ وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ "میلاد وقیام" سے وہابیت اور دیوبندیت کا رد ہوتا ہے اور اہل سنت کے مسلک کو فروغ نصیب ہوتا ہے! اس سانحے کی یہ عجیب وغریب ٹریجیڈی ہے کہ "اہل بدعت" خود کو "اہل سنت" سمجھتے ہیں۔

برعکس نہند نام زنگی کافور

"میلاد وقیام" پر نکیر خدا نخواستہ ذکر رسول اور صلوٰۃ وسلام کی مخالفت نہیں ہے "میلاد وقیام" کے بارے میں ایک شخص کہتا ہے کہ کتاب وسنت وآثار صحابہ سے دلیل لاؤ، دوسرا شخص کتاب وسنت اور اسوۂ صحابہ سے دلیل لانے کی بجائے جواب دیتا ہے کہ فلاں شاہ صاحب ایسا کیا کرتے تھے اور میلاد شریف کی فلاں کتاب میں یوں لکھا ہے ... خدا کے لئے انصاف سے بتائیے، ان دونوں میں کس کا موقف اقرب الی الحق ہے! جو کتاب وسنت اور آثار صحابہ سے دلیل مانگتا ہے یا اس کا جو "شاہ صاحبوں" کے عمل کو دلیل کے طور پر پیش کرتا ہے اور میلاد کی کتابیں جس کی تحقیق ومطالعہ کا معیار ہیں۔

جہاں "بدعت" آتی ہے، وہاں سے "سنت رسول" اٹھ جاتی ہے یہی سبب ہے کہ "بدعات" کی ترویج واشاعت نے مسلمانوں کو سنت رسول اور اسوۂ حسنہ سے بہت دور کر دیا ہے، اور وہ سچ مچ اقبال کے اس شعر کا مصداق بن کر رہ گئے ہیں:

حقیقت خرافات میں کھو گئی　　　یہ امت روایات میں کھو گئی

مسجد کی طرح نہ جانے کتنی رسمیں بادشاہوں اور امیروں کی نکالی ہوئی ہیں، قبروں پر گنبد اور عمارتیں بادشاہوں نے بنوائی ہیں اور پھر ان پر کٹھی، ندرو نیاز، عود و گل، اور سجادہ نشین و خدام کے لئے ہزاروں لاکھوں روپیہ سالانہ کی جاگیریں وقف کی ہیں، اس طرح "عرس و فاتحہ" اور بزرگوں کی عقیدت و احترام کے نام پر "قبر پرستی" کا پورا "اسٹیج" بادشاہوں اور امیروں کی داد و دہش نے قائم کر دیا ہے۔

علم غیب

قرآن کریم اس کا شاہد ہے کہ علم غیب صرف اللہ تعالیٰ کی صفت ہے، اور اللہ تعالیٰ ہی نے اپنے لئے "عالم الغیب والشہادۃ" فرمایا ہے، علم غیب کی تعریف یہ ہے کہ وہ ذاتی ہوتا ہے۔ اور کل ہوتا ہے! اللہ تعالیٰ نے بیشک نبیوں کو غیب کی اطلاع دی ہے مگر یہ "اطلاع و خبر" ہے "غیب" نہیں ہے کہ یہ صرف اللہ تعالیٰ کی صفت ہے: خبر و اطلاع کے بعد غیب غیب کہاں رہتا ہے! اگر غیب کی اطلاع و خبر کا نام "غیب" ہو تو ساری امت "عالم الغیب" قرار پائے گی، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غیب کی باتوں سے امت کو بھی مطلع فرمایا ہے:

—— غیب "کل" ہو اور "ذاتی" ہو تو وہ "غیب" نہیں، اطلاع غیب ہے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس سیرت میں ایسے واقعات بھی ملتے ہیں کہ حضور کی پیش گوئیاں صحیح ثابت ہوئی ہیں جو بات جس طرح آپ نے فرمائی ہے مستقبل میں جا کر وہ ٹھیک اسی طرح ظہور میں آیا ہے —— مگر سینکڑوں واقعات ایسے بھی سیرت رسول میں پائے جاتے ہیں جن سے "عدم علم غیب" کی حقیقت کھل کر سامنے آتی ہیں؛ مثلاً مشکوٰۃ شریف میں حضور کا یہ ارشاد ملتا ہے!۔

لو استقبلت من امری ما استدبرت لم اسق الھدی۔	یعنی اگر پہلے سے اس امر کی خبر ہوتی جو اب بعد میں ہوئی تو میں اپنی قربانی ساتھ نہ لاتا۔

شیخ عبد الحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اشعۃ اللمعات میں اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

اگر من پیش ازیں می دانستم ہمہ آنچہ از احرام بر شما شاق خواہد شد من نیز سوق ہدی نمی کردم و من نمی دانستم کہ حکم الہٰی چنیں خواہد بود	اگر اس سے پہلے میں جانتا کہ تم کو احرام سے تکلیف ہوگی تو میں بھی قربانی ساتھ نہ لاتا اور میں نہیں جانتا تھا کہ حکم الٰہی اس طرح واقع ہو جائے گا۔

قرآن شریف میں "وعلمک ما لم تکن تعلم" کی آیت سے اہل بدعت یہ استدلال کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے "ما کان وما یکون" کا علم عطا فرما دیا تھا، حالانکہ یہاں "علم" سے احکام شرعیہ اور علم دین مراد ہے! خود قرآن شریف میں آیا ہے۔ جس نے نبی کو "تعلیم" نہیں سکھی، پس اس سے یہ مطلب ہے کہ دنیا کے اگلے پچھلے تمام بشروں کے تمام دعاوی کا حضور کو علم نہ تھا، اس صورت میں سوچئے "ما کان وما یکون" کے علم کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے! حضرت شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ نے تحفہ اثنا عشریہ میں تصریح فرمایا ہے۔

احکام شرعیہ بدون وحی ایشاں را علم حاصل نمی شود۔ و ہمیں معنی مراد است قولہ تعالیٰ وعلمک ما لم تکن تعلم	شریعت کے احکام میں وحی کے نزول کے بغیر ان (یعنی انبیاء علیہم السلام) کو علم حاصل نہیں ہوتا، اور اسی بارے میں حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے تجھ کو علم دیا جو نہیں جانتا تھا۔

حضرت شاہ صاحب "علم" سے "علم ما کان وما یکون" نہیں بلکہ علم دین مراد لیتے ہیں، اگر "علمک ما لم تکن تعلم" سے غیب کا "کل" علم مراد لیا جائے پھر تمام امت محمدیہ بلکہ ہر انسان کو "عالم الغیب" قرار دینا جائے گا، کیونکہ قرآن کہتا ہے۔

ویعلمکم ما لم تکونوا تعلمون	اور (اے مسلمانو) تم کو سکھاتا ہے تمہارا رسول، جو تم نہ جانتے تھے۔

—— اور ——

علم الانسان ما لم یعلم	سکھایا آدمی کو جو وہ نہیں جانتا تھا۔

فتاویٰ ہمادیہ فقہ حنفی کی مشہور و معروف اور نہایت مستند کتاب ہے، اس میں "غیب" کی تعریف یوں کی گئی ہے :-

الا ما علم اللہ تعالیٰ لخیاص عبادہ بالوحی او الالہام لمعین بعد الا علام فیہا

جو علم اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو بذریعہ وحی یا الہام عطا فرماتا ہے، بعد اطلاع کے اُس پر غیب کا اطلاق نہیں ہوتا۔

قرآن کریم کہتا ہے :-

قل لا اقول لکم عندی خزائن اللہ ولا اعلم الغیب

تو کہہ (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) میں نہیں کہتا کہ میرے پاس خزانے ہیں اللہ کے اور نہ میں غیب جانتا ہوں۔

یہ جو اہل بدعت کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے دین و دنیا کے خزانے عطا فرما دئے ہیں، اس آیت سے اس عقیدہ کی تردید ہوتی ہے اور "ذاتی" اور "عطائی" "قدرت و اختیار" کی جو دھوکہ میں ڈالنے والی بحث چھیڑی جاتی ہے، یہ آیت اس خزانہ و بحث کا بھی فیصلہ کر دیتی ہے۔ آیت مذکورہ میں، اللہ تعالیٰ خود زبان رسول اور نطق نبی سے کہلوا رہا ہے کہ "میں غیب نہیں جانتا" (یعنی وہ غیب جس کی تعریف یہ ہے کہ وہ ذاتی ہوتا ہے، کسی کا بتایا ہوا نہیں ہوتا، اور وہ "کلی" ہوتا ہے جزئی نہیں ہوتا) اور میرے پاس اللہ تعالیٰ کے دئے ہوئے خزانے بھی نہیں ہیں۔

قیامت قطعی طور پر کس ساعت میں آئے گی، اس علم کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

یسئلک الناس عن الساعۃ قل انما علمہا عند اللہ وما یدریک لعل الساعۃ تکون قریباً

لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں قیامت کے بارے میں، تو کہہ کہ اس کی خبر اللہ کے پاس ہے اور تو کیا جانے شاید وہ قریب ہی ہو۔

کیا اس محکم و واضح آیت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے "عالم الغیب" ہونے کی نفی نہیں ہوتی، بیشک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی الٰہی سے مطلع ہو کر قیامت کے آثار کی تفصیل بتائی ہے، اور وہ حق ہے یعنی حضور نے جو کچھ فرمایا ہے، ہو بہو اُسی طرح واقع ہو کر رہے گا، مگر اس آیت میں اللہ تعالیٰ اس کا اظہار فرما رہا ہے کہ قیامت بالکل ٹھیک کس ساعت میں آئے گی، اس کا علم رسول خدا کو بھی نہیں دیا گیا۔

کفار بار بار قیامت کے بارے میں حضور سے سوال کرتے تھے، اس کے جواب میں فرمایا گیا :-

قال انما العلم عند اللہ ــــــ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار کے پوچھنے پر کہ قیامت کب آئے گی، جواب دیا کہ اس کی خبر تو اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔

اور مسلم کی روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعض صحابہ بھی حضور سے قیامت کے بارے میں کبھی کبھار دریافت فرماتے تھے۔

عن جابر قال سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول قبل ان یموت بشہر تسألونی عن الساعۃ وانما علمہا عند اللہ (مشکوٰۃ)

حضرت جابرؓ سے روایت ہے، میں نے سنا کہ وفات سے ایک مہینہ قبل نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ تم لوگ مجھ سے قیامت کے بارے میں دریافت کرتے ہو حالانکہ اس کا علم تو اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔

اس سے اہل بدعت کے اس قول کی نفی ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو علم غیب وفات سے قبل اللہ تعالیٰ نے عطا کر دیا تھا ــــ ایک دوسری حدیث کا ایک ٹکڑا ہے :-

" فاقول یا رب اصحابی فیقول انک لا تدری ما احدثوا بعدک فاقول سحقاً سحقاً لمن غیر بعدی "

۔۔۔ تو میں کہوں گا اے میرے رب، یہ میرے امتی ہیں، اللہ تعالیٰ فرمائے گا تجھے نہیں معلوم کہ تیرے بعد انہوں نے کیا کیا نئی باتیں نکالی تھیں، (اس پر میں کہوں گا دور ہو، دور ہو، جس

کہ جس نے میرے بعد دین کو متغیر کر دیا ۔

یہ حدیث قیامت میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عالم الغیب ہونے کی نفی کر رہی ہے ۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی تفسیر مظہری میں لکھتے ہیں :۔

ما کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم عالماً — نبی صلی اللہ علیہ وسلم جمیع لغات کے عالم نہیں تھے ۔

: جمیع اللغات ۔

ایک طرف قرآن کریم کی آیتیں ہیں ، دوسری طرف احادیث اور صحابہ کے آثار و بیانات ہیں ، یہ سب کی سب رسول اللہ صلی اللہ کے " علم غیب " کا انکار کرتے ہیں ۔

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ شرح فقہ اکبر امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ میں فرماتے ہیں :۔

ثم اعلم ان الانبیاء لم یعلموا المغیبات من الاشیاء الاما اعلمهم الله تعالیٰ احیاناً وذکر الحنفیہ تصریحاً بالتکفیر باعتقاد ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یعلم الغیب لمعارضة قوله تعالیٰ قل لا یعلم من فی السموات والارض الغیب الا اللہ — کذا فی المسائرۃ

پھر تو جان لے کہ انبیاء کرام غیب نہیں جانتے تھے غیب کی کسی چیز کو مگر جتنا اللہ تعالیٰ نے ان کو جب کبھی بتایا ، اور حنفیہ نے تصریح کی ہے کافر ہو جانے کی اس اعتقاد کے ساتھ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم علم غیب جانتے تھے اس لیے عقیدہ حق تعالیٰ کے اس ارشاد کے مخالف ہے کہ (کہہ دے اے محمدؐ) نہیں جانتا کوئی آسمانوں میں اور زمینوں میں غیب کو سوائے اللہ تعالیٰ کے ! اسی طرح مسائرہ میں بھی ہے ۔

اس ظلم و ستم اور ضلالت کو تو دیکھئے کہ احناف کے ائمہ جس عقیدہ کو " کفر " بتاتے ہیں ، اہل بدعت اُس کفریہ عقیدہ کی تبلیغ ہی کو دین سمجھ بیٹھے ہیں اور جو ایسا عقیدہ نہیں رکھتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عالم الغیب تھے ـــــ اُس کو گستاخ ملعون ٹھیراتے ہیں کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تنقیص اور حضورؐ کے کمالات کی نفی کرتے ہو !

صحیح بخاری (پارہ ۲۰ صفحہ ۱۳۴ اور پارہ ۳۰ صفحہ ۱۳۳) میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے ۔

قالت ومن حدثک انه یعلم ما فی غد فقد کذب ثم قرأت وما تدری نفس ماذا تکسب غداً ومن حدثک انه یعلم الغیب فقد کذب وهو یقول لا یعلم الغیب الا اللہ

(حضرت عائشہ نے) فرمایا اور جس نے تجھ سے بیان کیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کل ہونے والی بات جانتے ہیں تو تحقیق اُس نے جھوٹ بولا ، پھر (حضرت عائشہ نے) یہ آیت پڑھی ـــ یعنی کوئی نفس نہیں جانتا کہ کل کیا کرے گا ـــ اور جس نے تجھ سے بیان کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غیب جانتے تھے ، اُس نے جھوٹ کہا ، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کوئی نہیں جانتا غیب کو سوائے اللہ تعالیٰ کے !

کیا حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر " وہابیت " اور کمالات و فضائل نبوت کی نفی و اہانت کی پھبتی چست کرنے کی کوئی اہل ایمان جرأت کر سکتا ہے !

ترمذی شریف (کتاب التفسیر) میں روایت ہے ۔

ومن زعم انہ یعلم ما فی غد فقد اعظم الفریۃ علی اللہ واللہ یقول لا یعلم من فی السموات والارض الغیب الا اللہ

جس نے گمان کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کل ہونے والی بات کو جانتے ہیں، تو تحقیق اُس نے بڑا بھاری بہتان باندھا اللہ، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کوئی نہیں جانتا آسمان و زمین میں غیب کو سوائے اللہ تعالیٰ کے!

اس روایت کی اگر کوئی یوں تاویل کرے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "کل ہونے والی بات" کو بیشک بالذات نہیں جانتے تھے، مگر اللہ کے عطا کئے ہوئے علم کی بنا پر جانتے تھے ___ تو یہ انتہائی فاسد اور گمراہ کن مغالطہ ہے۔ اصل یہ ہے کہ کتاب و سنت، آثار صحابہ اور حدیث و فقہ کے ائمہ سب یہی بتاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نبی، رسول، ولی اور فرشتہ "عالم الغیب" نہیں ہے، علم غیب من جملہ خاصہ صفات باری تعالیٰ ہے جس میں اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں! جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے "علم غیب" ثابت کرتے ہیں، وہ کتاب و سنت کی مخالفت کا گناہ اپنے سر لیتے ہیں! اسی "عشق رسول" پہ جو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی مخالفت پر فخر و ناز کرتا ہے اور گمراہی کو ہدایت اور سعادت سمجھتا ہے۔

قبر اور عرس

قبر اور عرس کے بارے میں اہل بدعت نے جو غلو کیا ہے اور جیسی جیسی مشرکانہ رسمیں اور بدعتیں نکالی ہیں اُن کے سبب مسلمانوں کی خاصی تعداد اپنی جہالت کے سبب توحید و سنت کی راہ سے ہٹ گئی ہے،

ملا علی قاری شرح عین العلم میں فرماتے ہیں:-

لا یمس ای القبر ولا التابوت ولا الجدار فورد النہی من مثل ذلک بقبرہ علیہ السلام، فکیف بقبور سائر الانام ولا یقبل ناسہ زیارۃ علی المس فہو اولی والصلوٰۃ،

نہ چھوئے قبر کو، نہ تابوت کو اور نہ دیوار کو کیونکہ ان کا موں کی ممانعت وارد ہوئی ہے قبر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے پس کس طرح دوسروں کی قبروں کے لئے جائز ہو اور نہ بوسہ دیوے قبر کو یہ اس سے زیادہ برا ہے چھونے سے!

حنفی فقہ کی مشہور کتاب "تاتارخانیہ" میں ہے:-

ولا یقبل القبر لانہ من عادۃ النصاریٰ

یعنی قبر والے کو بوسہ نہ دیوے کیونکہ یہ نصاریٰ کی عادت ہے!

یہ ہے فقہ حنفی کا فیصلہ، اصول، فتویٰ اور مسلک! مگر راقم الحروف نے ان آنکھوں سے نہ صرف عوام بلکہ بعض بدعتی علماء کو قبریں چومتے دیکھا ہے اور ان کی دیکھا دیکھی اُن کے معتقدین بھی اس ضلالت میں مبتلا ہو گئے۔

حضرت امام مالک رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ سے والہانہ عشق و عقیدت رکھتے تھے، مدینہ منورہ کی مقدس سرزمین میں جوتا پہننا بھی گوارا نہ تھا، اس اندیشہ سے کہ مدینہ کے باہر موت نہ آجائے۔ سفر حج کے علاوہ، انہوں نے باہر آنا جانا بھی ترک کر دیا تھا، مگر حضرت مسعر بن مدوان رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں ___

رایت انس بن مالک یسلم علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم یسند ظہرہ الی جدار القبر ثم یدعو ونص علی ذلک الائمۃ الاربعۃ ان یستقبل القبلۃ وقت الدعاء حتی لا یدعو عند القبر فان الدعاء عبادۃ

میں نے دیکھا کہ انس بن مالک نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام عرض کرتے، پھر اپنی پشت قبر کی دیوار کی جانب پھیر کر دعا مانگتے اور چاروں ائمہ (فقہ) نے تصریح کی ہے کہ دعا کے وقت قبلہ رُخ ہو تا کہ دعا مانگنا قبر کی طرف نہ ہو اس لئے کہ دعا عبادت ہے۔

حضرت انس بن مالک رحمۃ اللہ علیہ کی احتیاط اور توحید شناسی کا یہ عالم ہے روضہ رسولؐ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض و معروض

اور استغاثہ و فریاد لوگ ، صلوٰۃ و سلام کے بعد دعا کا وقت آتا ہے تو بیٹھے منہ کر قبلہ رخ ہو جاتے ہیں اور اپنے رب اور معبود سے دعا کرتے ہیں اور آج مسلمانوں کا یہ عالم ہے کہ کسی " ترتیب شاہ اللہ کلہ اثاثہ " کی قبر پر بھی جاتے ہیں تو صاحب قبر کو مشکل کشا اور حاجت روا جان کر استغاثہ کرتے اور مزار کے دروازوں اور جالیوں پر عرضیاں لکھ لکھ کر لٹکاتے ہیں ۔

" مولوی نعیم الدین مراد آبادی فرائد النور صفحہ ۲ میں " حضرت مولانا شاہ " کے ساتھ ذکر کرتے ہیں ، موصوف تصحیح المسائل صفحہ ۲۷ میں بطور سند کے ناقل ہیں ۔

" میں نے (یعنی شاہ عبدالحق محدث دہلوی نے) اپنے شیخ علی متقی رحمۃ اللہ سے عرض کیا تعیین روز برائے عرس ، چہ حکم است (تو تھوڑے توقف فرما کر) سر مبارک نمانے فرود افگندند و برآوردند و فرمودند این از درمیان سلف نبود " — یعنی دن کے تعیین کا عرس کے لئے کیا حکم ہے ! تو سر مبارک جھکا کر اٹھایا اور فرمایا کہ اس کا معمول سلف میں نہ تھا " (اکمل البیان صفحہ ۱۲۲ - ۱۲۳)

دین کے معاملہ میں قابل تقلید روش " اسلاف " کی ہے ، یا " اخلاف " کی ! پس " عرس " جس کا سلف میں معمول نہ تھا اس کا معمول نہ ہونا ہی صحیح روش ہے !

شاہ حمزہ مارہروی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۱۹۸ھ) بریلوی حضرات کے " پیران پیر " ہیں وہ تک اپنی وصیت " فص الوصایا " (مطبوعہ صدیقی بریلی) میں لکھتے ہیں ۔

در فاتحہ ہیچ نہ ہرگز بہ تکلف نکنند ، بلکہ نہ نماید کہ حکم چنین است ۔ ۔ ۔

فاتحہ میں کسی کے تکلفات ہرگز نہ کریں ، بلکہ دیا نکل ہی نہ کریں کہ حکم اسی طرح ہے ۔

در مختار (جلد ۱ صفحہ ۶۶) کی مندرجہ ذیل عبارت غور سے پڑھیے اور سمجھیے کہ فقہا نے بدعات سے کس قدر اجتناب کیا ہے ۔

وفی البزازیہ یکرہ اتخاذ الطعام فی الیوم الاول والثالث وبعد الاسبوع ونقل الطعام الی القبر فی المواسم واتخاذ الدعوۃ لقرأۃ القرآن وجمع الصلحاء والقراء للختم والقرأۃ سورۃ الانعام والاخلاص والحاصل ان اتخاذ الطعام عند قرأۃ القرآن لاجل الاکل یکرہ ۔

فتاویٰ بزازیہ میں ہے کہ مکروہ ہے تیجہ کرنا کھانے کا پہلے دن اور تیسرے دن اور ہفتہ کے بعد اور لے جانا کھانے کا قبر پر کسی موسم میں اور تیار کرنا دعوت کا قرآن پڑھنے والوں کے لئے اور جمع ہونا صلحا اور قاریوں کا ختم کے لئے یا پڑھنے سورہ انعام یا سورہ قل ہو اللہ کے لئے حاصل رکھنا کھانے کا قرآن پڑھنے والوں کے سامنے کھانے کے لئے مکروہ ہے ۔

یہ جو مسلمانوں میں " پنج آیت " " قل " اور ختم شریف کا رواج ہو گیا ہے اس رسم اور رواج تک کو جو بہ ظاہر بے ضرر معلوم ہوتا ہے ، فقہ حنفی کی کتابوں میں " مکروہ " لکھا ہے ۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی شرح سفر السعادت میں فرماتے ہیں ـــــ

" اور عادت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نہ تھی کہ میت کے لئے سوائے وقت نماز جنازہ کے جمع ہوں اور قرآن پڑھیں نہ قبر پر ، نہ قبر کے علاوہ اور یہ جمع ہونا بدعت ہے اور مکروہ ، البتہ تعزیت اہل میت کو تسلی اور صبر دلانا سنت و مستحب ہے لیکن یہ اجتماع مخصوص تیسرے دن کا اور دوسرے تکلفات کا مرتکب ہونا اور یتیموں کا مال بے وصیت کے خرچ کرنا یہ جملہ امور بدعت اور حرام ہیں " (اشعۃ ترجمہ)

اس عبارت کی روشنی میں معمولی عقل کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ تیجا ، دسواں ، چالیسواں اور برسی ان کی دین میں کوئی اصل نہیں ہے اور یہ امور و رسوم بدعت میں

داخل ہیں، جن کے کرنے سے ثواب کی بجائے الٹا عذاب ملنے کا امکان ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام سے تو میت کے ایصالِ ثواب کے لئے اجتماعی صورت میں قرآن خوانی بھی ثابت نہیں ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ نے اس فعل کو گناہ کبیرہ سے بھی زیادہ شدید بتایا ہے کہ مسلمان اپنی حاجت مانگنے کے لئے اجمیر شریف کا سفر کرتے ہیں یا سالار مسعود غازی رحمتہ اللہ علیہ کی قبر پر جاتے ہیں! کوئی شک نہیں، شرک ہر بڑے سے بڑے گناہ سے زیادہ بڑا گناہ ہے!

مسلمانوں کو کتاب و سنت یا آثار و اقوالِ صحابہ میں اس کا کہیں حکم نہیں دیا گیا، کہ تم بزرگانِ دین کی قبروں کی زیارت اُن سے حاجتیں اور مرادیں مانگنے کے لئے کیا کرو۔ ایسا کرنا شریعت کی رو سے قطعاً ناجائز ہے اور دین و دنیا کے خسران اور وبال کا باعث ہے۔

شاہ ولی اللہ قدس سرہ "بلاغ المبین" (ص۲۳) میں لکھتے ہیں :-

چنانکہ بت پرستاں خود لباس ابریشمی و کمخوابی می پوشانند
پیر پرستاں نیز مرگورہا بزرگان خود راہم چنیں می پوشانند

جیسا کہ بت پرست لوگ اپنے بتوں کو ریشم و کمخواب کا لباس پہناتے ہیں اور پیر پرست لوگ بھی خاص اپنے بزرگوں کی قبروں کو اسی طرح پہناتے ہیں۔

مولانا شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ تحفہ اثنا عشریہ (ص۲۳۴) میں فرماتے ہیں :-

واز مثل بہت ہنود لیس دراایام عاشورا چیزے کہ ہنود با
بتان خود کنند ایں ہا با صورت قبور ائمہ نمایند و غسل دہند

اور ہندوؤں سے مشابہت نمایاں جاتی ہے کہ جس طرح ایام عاشورا میں چیزیں کہ ہندو اپنے بتوں کے لئے کرتے ہیں یہ لوگ بھی اپنے پیشواؤں کی قبروں کے لئے کرتے ہیں اور غسل دیتے ہیں۔

کتنے بہت سے "عرس" ہیں جن میں ایک دن قبر کے "غسل" کے لئے مقرر کیا جاتا ہے اور یہ کھلی ہوئی بت پرستی کو خیر و ثواب کی بات اور سعادت و برکت کا سبب سمجھا جاتا ہے!

مجمع البحار (ص۲۳۲، ج ۱) میں ہے :-

ومنھم من قصد لزیارۃ قبور الانبیاء والصلحاء ان یصلی عند قبورھم ویدعو عندھم ویسألھم الحوائج فھذا لا یجوز عند احد من علماء المسلمین فان العبادۃ وطلب الحوائج والاستغاثۃ حق اللہ وحدہ ۔۔۔

بعض ایسے ہیں جو اس لئے قصد کرتے ہیں انبیاء و صلحاء کی زیارت کا کہ ان کی قبروں کے پاس نماز پڑھیں اور قبروں کے پاس دعا اور حاجت کا سوال کریں، یہ کسی مسلمان عالم کے نزدیک (یہ طریقہ) جائز نہیں، کیونکہ عبادت اور طلبِ حاجات اور مدد مانگنا صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے۔

کبیری شرح منیۃ المصلی (ص۵۶۳) میں مرقوم ہے :-

وقال شمس الائمۃ وضع الید علی المقابر بدعۃ وعن جار اللہ العلامۃ مشائخ مکۃ ینکرون ذلک ویقولون انہ عادۃ اھل الکتاب وفی احیاء

فرمایا شمس الائمہ نے ہاتھ رکھنا قبر پر بدعت ہے اور مروی ہے مشائخ مکہ مکرمہ سے کہ اس کا انکار فرماتے تھے، اور کہتے تھے کہ یہ عادت اہل کتاب کی ہے اور احیاء العلوم میں ہے کہ

علم الدين انه من عادة النصارى ولا شك انه بدعة لا سنة فيه ولا اثر عن صحابي ولا عن امام من يعتمد عليه فيكره ولم يعهد الاستلام في السنة الا للحجر الاسود والركن اليماني خاصة

یہ عادت نصاریٰ کی ہے اور اس میں شک نہیں کہ یہ بدعت ہے اس میں سنت سے کچھ ثابت نہیں اور نہ کسی ایک بھی صحابی کے اثر سے ثابت اور نہ کسی قابل اعتماد امام سے ثابت بس یہ کہ مکروہ ہے اور سنت نہیں ہے، چومنا حجر اسود اور رکن یمانی کے لئے مخصوص ہے۔

———— ؤ ————

قال العلامة الزعفراني وضع اليد على القبر ومسه وتقبيله من البدع التي تنكر شرعاً وروي عن انس بن مالك رأى رجلاً وضع يده على قبر النبي صلى الله عليه وسلم فنهاه وقال كنا نعرف هذا على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم وقد انكره مالك والشافعي واحمد اشد الانكار

اور علامہ زعفرانی نے فرمایا ہاتھ رکھنا قبر پر اور بوسہ دینا بدعت ہے جس پر شرع میں انکار کیا گیا ہے اور انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کی گئی ہے کہ آپ نے ایک شخص کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک پر ہاتھ رکھے ہوئے دیکھا تو اس کو منع کیا اور فرمایا کہ ہم اس فعل کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں جانتے بھی نہ تھے، اور تحقیق اس فعل کا امام مالک اور امام شافعی اور امام احمد نے بہت سختی سے انکار کیا ہے۔

(صواعق صفحہ ۱۳۳ و فتاویٰ [illegible] ج ۲)

حضرت مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ "البلاغ المبین" میں مجالس الابرار سے نقل فرماتے ہیں۔

و از آن جملہ است سجدہ گاہ ساختن قبور را و چراغان نمودن بر آنہا و اعتکاف نمودن آنجا و آویختن پردہ ہا و مقرر نمودن خدمت کہ جاروب کشی و عود سوزی در آنجا نمایند و مردم را بسوی گور پرستی دعوت میکنند تا آنکہ جاہلان قبور ترجیح میدہند مجاورت قبور را بر مجاورت مسجد الحرام و یقین می کنند کہ خدمت این آستانہ ہا افضل از خدمت مساجد است ــــ مترجم گوید واقعی راست گفتہ است بچشم خود دیدہ باشد، و مقولہ این گروہ بگوش خود شنیدہ۔

اور من جملہ ان افعال گور پرستوں کے قبروں کو سجدہ گاہ بنانا اور ان پر چراغ روشن کرنا اور ان کے نزدیک اعتکاف کرنا اور پردے لٹکانا اور خدمت جاروب کشی مقرر کرنا اور خوشبو اگربتی، لوبان سلگانا، اور آدمیوں کو گور پرستی کی دعوت دینا یہاں تک کہ قبروں کی پوجا کرنے والے ترجیح دیتے ہیں، مجاورت قبور کو مجاورت مسجد الحرام بیت اللہ العظام پر اور یقین کرتے ہیں کہ خدمت اس آستانہ قبر کی افضل ہے خدمت کرنے مساجد سے مترجم کہتا ہے واقعی سچ فرمایا میں نے بچشم خود دیکھا ہے اور ان باتوں کو اس گروہ کی اپنے کانوں سے سنا ہے۔

ان تمام اقتباسات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ بزرگان دین کی قبروں پر احترام و عقیدت کے نام سے جو باتیں ہو رہی ہیں وہ نہ صرف یہ کہ بے سند اور بے اصل ہیں بلکہ بہت سی رسمیں مشرکانہ ہیں اور قبر پرستی کے اس پورے انسٹی ٹیوشن کا "بدعات" احاطہ کئے ہوئے ہیں اور بدعت کو نطق رسولؐ نے ضلالت کہا ہے۔

میت کی نذر

ردالمحتار جلد ۲ میں مرقوم ہے۔

اعلم ان النذر الذی یقع للاموات من اکثر العوام وما یؤخذ من الدراہم والشمع والزیت ونحوہا الی ضرائح الاولیاء الکرام تقربا الیہم فہو بالاجماع باطل وحرام، کان یقول یا سیدی فلان ان رد غائبی او عوفی مریضی او قضیت حاجتی فلک من الذہب او الفضۃ او من الطعام او الشمع او الزیت کذا فی بحر الرائق لوجوہ منہا انہ نذر المخلوق والنذر للمخلوق لا یجوز لانہ عبادۃ والعبادۃ لا تکون لمخلوق ومنہا ان المنذور لہ میت والمیت لا یملک ومنہا انہ ظن ان المیت یتصرف فی الامور دون اللہ تعالیٰ واعتقادہ ذلک کفر۔

جان لو کہ وہ نذر جو اموات کے لئے اکثر عوام کرتے ہیں اور روپیہ پیسہ، موم بتی اور تیل وغیرہ جو ان کے اولیاء کرام کے مزارات پر تقرب کے لئے جاتے ہیں وہ بالاجماع باطل و حرام ہے۔ کہتے ہیں کہ اے میرے سید فلاں میرا غائب شدہ اگر واپس آجائے یا میرا مریض اچھا ہو جائے یا میری حاجت پوری ہو جاوے تو تمہارے لئے اتنا سونا اتنی چاندی اور اتنا کھانا اور چراغ اور اتنا تیل میرے ذمہ ہے اسی طرح بحر الرائق میں ہے، پس یہ کئی وجہ سے باطل ہے کیونکہ یہ نذر مخلوق کے لئے ہے اور نذر مخلوق کے لئے جائز نہیں ہوتی۔ دوسرے اور جس کے لئے یہ نذر کی گئی ہے وہ میت ہے اور میت کسی چیز کی مالک نہیں اور نذر کرنے والے کا گمان ہے کہ میت کو اللہ تعالیٰ کے کاموں میں تصرف اور اختیار حاصل ہے اور اس کا یہ اعتقاد کفر ہے۔

فقہ حنفی کی مستند کتابوں میں جن افعال کو باطل و حرام لکھا ہوا اور جس عقیدہ کو کفر کہا گیا ہو، اہل بدعت انہی باطل و حرام افعال و رسوم اور کفریہ عقائد کے جواز کے لئے فضول کی منطقیں چھانٹتے ہیں اور دین و شریعت کی صحیح بات بتانے والوں کو مطعون ٹھہراتے ہیں کہ یہ لوگ وہابی ہیں جو بزرگوں کا ادب و احترام نہیں کرتے۔

حضرت مجدد الف ثانی سرہندی رحمۃ اللہ علیہ (جلد سوم صفحہ ۴۱ مطبوعہ نولکشور پریس) اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:-

"...... وحیوانات را نذر مشائخ کنند، و بر سر قبرہا رفتہ آں حیوانات را ذبح می نمایند در روایات فقہ ایں عمل را داخل شرک ساختہ ......"

اور حیوانات کو نذر مشائخ کرتے ہیں اور قبروں پر مشائخ کی جا کر حیوانات کو ذبح کرتے ہیں، روایات فقہ نے اس عمل کو شرک میں داخل کیا ہے۔

فتاویٰ عالمگیری (کتاب الصوم) میں جو کچھ ہے اس کا اردو ترجمہ درج ذیل کیا جاتا ہے:-

- اکثر عوام جو نذر مانتے ہیں، اس کی صورت یہ ہے کہ بعض بزرگوں کی قبر کے پاس جاتے ہیں اور تبرک پردہ اٹھا کر مثلاً یہ کہتے ہیں کہ اے سید فلاں! اگر میری حاجت روائی ہو جائے تو آپ کے لئے اس قدر روپیہ اپنی طرف سے نذر مانتا ہوں، تو ایسی نذر بالاجماع باطل ہے ......"

فتاویٰ عزیزی (جلد ا صفحہ ۹۲) میں شاہ عبد العزیز دہلوی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:-

"...... خوردن آں قرب بحرام است بشرطیکہ نذر غیر اللہ باشد مانند گوسفند شیخ سدو و ستی بو علی قلندر وغیرہ"

بشرطیکہ نذر غیر اللہ کی ہو جس طرح گائے شیخ سدو کے اور ستی بو علی قلندر وغیرہ کی اس کا کھانا حرام کے قریب ہے۔

دُعا "بحق فلاں" کیساتھ

مسلمانوں میں یہ رسم بھی چل پڑی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے دُعا "بحق فلاں . . ." کہہ کر مانگتے ہیں اور ایسا کرنے سے اُن کا عقیدہ یہ ہے کہ دُعا زیادہ پُر تاثیر ہو جاتی ہے ——— حالانکہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ شرح فقہ اکبر میں فرماتے ہیں :—

قال ابو حنیفۃ وصاحباہ یکرہ ان یقول الرجل اسئلک بحق فلان او بحق انبیائک ورسلک او بحق البیت الحرام والمشعر الحرام ونحو ذلک اذ لیس لاحد علی اللہ حق ۔

امام ابوحنیفہ نے اور اُن کے صاحبین نے فرمایا کہ مکروہ ہے آدمی کا یہ کہنا کہ میں تجھ سے بحق فلاں یا بحق تیرے نبیوں اور رسولوں کے یا بحق بیت الحرام و مشعر الحرام اور مانند ان کے سوال کرتا ہوں اس لئے کہ کسی کا اللہ تعالیٰ کے ذمہ کوئی حق نہیں ۔

فقہ کی مشہور کتاب دُرِّ مختار میں ہے :—

وکرہ قولہ بحق رسلک وانبیائک واولیائک او بحق البیت لانہ لا حق للخلق علی الخالق تعالیٰ

یعنی مکروہ ہے کہنا بحق تیرے رسولوں، نبیوں اور اولیاء کے یا بحق البیت، کیونکہ کسی مخلوق کا اللہ تعالیٰ پر کوئی حق نہیں ۔

فتاویٰ عالمگیری (جلد پنجم) میں "بحق رسول اور بحق فلاں ولی اللہ" کہنے کو "مکروہ" بتایا گیا ہے ۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ ارشاد الطالبین میں صراحت کے ساتھ فرماتے ہیں :—

"آنچہ جہال میگویند یا شیخ عبدالقادر جیلانی شیئاً للہ یا خواجہ شمس الدین ترک پانی پتی شیئاً للہ جائز نیست، بلکہ شرک و کفر است، حق تعالیٰ فرماید والذین تدعون من دون اللہ عباد امثالکم . . . . ."

(ترجمہ ——— یہ جو جاہل کہتے ہیں کہ یا شیخ عبدالقادر جیلانی شیئاً للہ یا خواجہ شمس الدین ترک پانی پتی شیئاً للہ جائز نہیں ہے (بلکہ) شرک و کفر ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے والذین . . . ."

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں فرماتے ہیں :—

ان الامۃ ای جمیع الخلق من خاصۃ والعامۃ والانبیاء والاولیاء وسائر الامۃ لو اجتمعت ای اتفقت فرضا وتقدیرا علی ان ینفعوک بشیٔ فی امر دینک او دنیاک لم ینفعوک ای لم یقدروا ان ینفعوک بشیٔ امر دینک او دنیاک لم ینفعوک ای لم یقدروا وان ینفعوک الا بشیٔ قد کتبہ اللہ لک ای قدرہ واثبتہ

اگر تمام امت یعنی جمیع خلق خاص و عام اور انبیاء اور اولیاء اور تمام امت جمع ہو جائیں، بالفرض و التقدیر اس امر پر کہ نفع پہونچا دیں کسی شے کا امر دین اور دنیا میں تیرے لئے تو نہیں نفع پہونچا سکتے، تجھ کو یعنی نفع پہونچانے کی قدرت نہیں رکھتے، مگر جتنا اللہ تعالیٰ نے لکھ دیا ہے تیرے لئے ۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی ارشاد الطالبین میں تحریر کرتے ہیں :—

وذکر محمد صلی اللہ علیہ وسلم بر وجہے کہ در شرع وارد نشدہ است، چنانچہ کسے بطور وظیفہ یا محمد یا محمد یا محمد گفتہ باشد، ممنوع باشد ۔

ذکر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اس طریقہ پر جو شرع میں وارد نہیں ہوا ہے جیسے کوئی شخص بطور وظیفہ کے یا محمد یا محمد کہتا ہو ممنوع ہوگا ۔

"عبد" اور اسماء

عربی میں "عبد" کے معنی "بندہ" کے بھی ہیں اور غلام کے بھی ہیں! اگرچہ عبداللہ اور عبدالرحمٰن وغیرہ ناموں میں "عبد" سے "بندہ" ہی مراد ہے، اس لئے اس حیثیت اور لحاظ سے کوئی ایسا نام ہرگز ہرگز وضع نہیں کرنا چاہئے جس میں "عبد" کی نسبت غیر اللہ سے کی جائے، چاہے نام رکھنے والوں کی نیت اور مفہوم "عبد" سے خادم اور فدائی ہی کیوں نہ ہو! صحابہ کرام اور تابعین سے بڑھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فدائی، عقیدت مند اور قربان ہونے والا کون ہو سکتا ہے، ان نفوس قدسیہ نے اپنی اولاد کا نام ——— عبدالنبی، عبدالمصطفیٰ یا عبدالرسول ——— نہیں رکھا! اور صدیوں تک مسلمانوں میں اس قسم کے کسی نام کا وجود نہیں پایا جاتا! ہندوستان میں مغلیہ بادشاہ اکبر کے دور میں البتہ ایک عالم کا نام "عبدالنبی" ملتا ہے۔ اس قسم کے اسماء نہ صرف یہ کہ احتیاط کے خلاف ہیں بلکہ توحید کے تقاضوں کی ضد میں۔ بریلی کے مشہور عالم مولوی احمد رضا خان صاحب نے جو ایسی اور ایسی بدعتوں کی ضد میں، اور انہیں مزید مستحکم قدم جمانے اور پھیلانے کے لئے اپنے نام میں ——— "عبدالمصطفیٰ" کا اضافہ کیا اور اپنے نام کی مہر میں اس نام ——— عبدالمصطفیٰ ——— کو کندہ کرایا۔ اس سلسلہ میں شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور تفسیر "فتح العزیز" کا ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے۔

مثل آنکہ کسانیکہ در نام نہادن خود را بندہ فلاں و عبد فلاں می گویند ایں شرک در تسمیہ است	یعنی من جملہ ان کے وہ آدمی کہ نام رکھنے میں بندہ فلاں اور عبد فلاں کہتے ہیں، ایسے شرک ناموں میں ہے،

حضرت شاہ صاحب نے اس فعل کو "شرک فی الاسماء" بتایا ہے اور کوئی مسلمان "شرک" کے پاس بھی نہیں پھٹک سکتا! بدعات سے شغف رکھنے کا یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ "مشرکانہ رسوم" اور شرک آمیز باتوں سے طبیعت کو ایک قسم کا لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔

جو اللہ تعالیٰ چاہے!!

اہل بدعت کا یہ عقیدہ بھی ہے کہ وفات پانے کے بعد بزرگان دین کائنات میں تصرف کی قدرت رکھتے ہیں، یہ ان کا عقیدہ کوئی سند اور دلیل نہیں رکھتا۔

کما قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا مات الانسان انقطع عنہ عملہ الا بثلثۃ العلم ینتفع بہ والولد الصالح یدعو لہ والصدقۃ الجاریۃ (صحیح مسلم)	جیسا کہ فرمایا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب انتقال کرتا ہے انسان منقطع ہو جاتے ہیں اس کے عمل، مگر تین چیزیں: علم نفع دینے والا، اور صالح بیٹا جو اس کے لئے دعا کرے اور صدقہ جاریہ۔

حضرت شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی سنہ ۷۸۲ھ) جو بہت بڑے شیخ اور صوفی گزرے ہیں اپنے مکتوب پنجاہ و ششم میں تحریر فرماتے ہیں:—

انبیاء و اولیاء و سلاطین و امراء و ملوک چندیں چیز خواہند کہ شود و نشود و چندیں چیز نخواہند کہ نشود و شود پس بہ آنچہ حکم کردہ است رضا باید داد، و تسلیم باید شد و بندگی پیش باید گرفت بندہ را از مرگ چارہ نیست از بندگی چارہ نیست، شود آنچہ خواست اوست جل جلالہ	انبیاء، اولیاء اور سلاطین و امراء اور بادشاہ کتنی ہی چیزیں چاہتے ہیں کہ ہو جائیں مگر وہ نہیں ہوتیں اور کتنی ہی چیزیں نہیں چاہتے ہیں کہ نہ ہوں مگر وہ ہو جاتی ہیں، پس جو کچھ حکم کر دیا گیا ہے اس پر راضی ہو جانا چاہئے اور سر تسلیم خم کر دینا چاہئے اور بندگی کا طریقہ اختیار کرنا چاہئے۔ کیونکہ بندہ کو موت کے سوا چارہ نہیں ہے اور وہی ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے، جل جلالہ۔

کیا کوئی صاحب فہم اور سمجھدار آدمی حضرت شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری جیسے عظیم بزرگ کی اس تحریر پر نبیوں، رسولوں اور اولیاء اللہ کی اہانت

م لگا سکتا ہے! حضرت موصوف نے بے شک وہی بات کہی ہے، جو کتاب و سنت سے ثابت ہے اور جس کی طرف راقم الحروف برسوں سے مسلمانوں کو کر رہا ہے کہ قضا و قدر کے آگے انبیاء اور اولیاء اللہ بھی اپنی تمام محبوبیت اور جلالت شان کے باوجود، مجبور محض ہیں، بعض اوقات جب تعالیٰ نے نہیں چاہا تو برسوں اور مہینوں تک کی دعائیں قبول اور تمنائیں پوری نہیں ہوتیں۔

حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنے مکتوب (۱۹۵) میں یہی بات فرمائی ہے کہ عالم قضا و قدر میں، انبیا اور اولیا تک۔

"بسا چیز خواہند، نشود" بہت سی چیزیں چاہتے ہیں، مگر نہیں ہوتیں۔

بے سند رسمیں

مسلمانوں میں جو مشرکانہ رسمیں پائی گئی ہیں، اُن میں ایک رسم "امام ضامن" باندھنے کی بھی ہے، اس عقیدہ کے ساتھ کہ فلاں امام، سفر پر جانے والے کی حفاظت کے ضامن ہیں! حالانکہ دنیا میں کروڑوں لوگ جو روزانہ سفر کرتے ہیں اُن ہے جانے کی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی نبی یا ولی کو خبر نہیں ہوتی اور مسافر کی حفاظت اور نگہبانی اللہ تعالیٰ کے علاوہ اور کوئی نہیں کرتا اور سفر میں جو کچھ تا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے پیش آتا ہے ــــــ اور تو اور مولوی احمد رضا خاں صاحب تک (ملفوظات حصہ سوم مطبوعہ حسنی پریس بریلی صفحہ ۳۸) کا یہ فتویٰ ہے:ــــ

"عرض ــــ امام ضامن کا جو پیسہ باندھا جاتا ہے، اُس کی کوئی اصل ہے ــــ ارشاد ــــ کچھ نہیں"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نامی اور اسم گرامی سن کر انگوٹھے چوم کر آنکھوں سے لگانے کو عقیدت رسول کی نشانی سمجھا جاتا ہے مگر نے کا نہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی حکم دیا اور نہ صحابہ کرام اور تابعین عظام کا معمول رہا، فقہ حنفی کی مشہور کتاب ردالمحتار ہے:ــــ

"نہیں صحیح ہے کوئی بھی روایت مرفوع انگوٹھوں کو چوم کر آنکھوں سے لگانے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مبارک اذان میں سُن کر۔" (اُردو ترجمہ)

مسلمانوں نے عقیدت و محبت کی بہت سی رسمیں اور بدعتیں اپنے دل سے گھڑلی ہیں، جن کی کتاب و سنت، آثار صحابہ اور اقوال ائمہ میں کوئی دلیل نظیر نہیں ملتی! پھر اس پر ستم یہ ہے کہ جو ان بے اصل و بے سند باتوں کو نہیں کرتا اُس کو اُلٹا مطعون کیا جاتا ہے!!

صحابہ کرام کا یہ معمول نہیں رہا کہ وہ روضۂ رسول پر جا کر فریاد و استغاثہ اور عرض احوال کرتے ہوں، نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے کہ تم پر جب کوئی مصیبت پڑے تو میری قبر پر آ کر عرض معروض کرنا! مگر مسلمان بزرگان دین کی قبروں سے مرادیں مانگتے ہیں اور قبروں کی جالیوں پر عرضیاں اور درخواستیں لکھ لکھ کر لٹکاتے ہیں!

حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ فتاویٰ عزیزیہ میں تحریر فرماتے ہیں:ــــ

بعد موت شاں استمداد بہ ایں طور کہ فلاں از حق تبارک و تعالیٰ حاجت مرا نجواہ و شفیع من شود و دعائے من نخواہ درست است یا نیست؟ جواب:ــــ استمداد از اموات خواہ نزدیک قبر باشد یا غائبانہ بے شبہ بدعت است در زمان صحابہ و تابعین نہ بود۔	یعنی بعد وفات اولیاء و شہداء و صلحاء سے اس طرح سے استمداد کہ اے فلاں! حق تبارک و تعالیٰ سے میری حاجت روائی کے لئے عرض کریں، میرے شفیع ہو دیں اور میرے لئے دعا کریں، درست ہے یا نہیں ''الجواب'' (شاہ عبدالعزیز صاحب کی طرف سے) استمداد اموات سے خواہ قبروں کے پاس کی جاوے یا غائبانہ بلاشبہ بدعت ہے، زمانہ صحابہ اور تابعین رضی اللہ عنہم میں یہ (شعار) نہ تھا۔

فقہ حنفی کی مشہور کتابوں ـــــ درمختار، فتاویٰ عالمگیری ـــ وغیرہ میں بھی اس طرح دعا کرنے کو مکروہ بتایا گیا ہے (یعنی بہ حق فلاں کے ساتھ)

یہ نکتہ آفرینیاں

ہم نے اوپر جو کچھ کہا ہے وہ سند، دلیل، نظیر اور حوالہ کے ساتھ کہا ہے، کتاب و سنت اور آثارِ صحابہ کے علاوہ فقہ کی کتابوں اور مشہور اکابر علماء اور بزرگانِ دین کے اقوال کو سند میں پیش کیا ہے اور کسی آیت، حدیث اور قول و روایت سے کوئی نکتہ نہیں تراشا اور نہ عقل کے تیر تکے لڑائے ہیں۔

اہلِ بدعت نے بزرگانِ دین کے لئے کچھ القاب و آداب اور مناصب اپنے جی سے گھڑ لئے ہیں اور جو کوئی ان سے اس بارے میں کتاب و سنت سے سند نہ ملنے کے سبب، خلاف کرتا ہے، اُسے وہ بدعقیدہ گمراہ وہابی، دیوبندی اور نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں، اسی طرح ان لوگوں نے کچھ نقشے بھی اور رسمیں نکال لی ہیں، جن کو وہ بزرگانِ دین کی عقیدت و محبت کا لازمی تقاضا سمجھے ہوئے ہیں ان کے نزدیک جو کوئی ان توہمات کو پورا نہیں کرتا وہ بدعقیدہ ہے اور بزرگانِ دین کی توہین کرنے والا ہے۔

اس مضمون میں کتابوں سے جو حوالے دیئے گئے ہیں اُن سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کھلی ہوئی بدعات اور کفر و شرک کی باتوں کو اہلِ بدعت نے دین و شریعت سمجھ لیا ہے اور جن امور کے لئے کتاب و سنت اور شریعت میں کوئی سند اور نظیر نہیں ملتی ان کو یہ لوگ جزو جان و ایمان بنائے ہوئے ہیں۔ کیا غضب ہے کہ گمراہی و بے ہدایتی کا اور بے دینی پر دین کا ٹھپہ لگا دیا گیا ہے ـ یہ کیسے عاشقانِ رسولؐ ہیں کہ خلافِ سنت افعال کا ارتکاب کرتے ہیں اور عشقِ رسول کے مدعی اور علمبردار ہیں۔

اس مسلک و روش کے علماء اپنے عقیدت مندوں کے ہجوم میں اس قسم کی غلط فہمیاں پھیلاتے رہتے ہیں کہ یہ وہابی اور دیوبندی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور بزرگانِ دین کے اختیارات و کمالات کی نفی کرتے ہیں ـــ مگر وہ یہ نہیں بتاتے کہ اللہ تعالیٰ نے ان نفوسِ قدسیہ کو آخر وہ کون سے اختیارات دیئے ہیں، جن کی نفی اور تردید کی جاتی ہے!

اس گروہ کے علماء اور اہلِ تصنیف کتاب و سنت، آثارِ صحابہ اور اقوالِ آئمہ سے سند اور دلیل لانے کی بجائے "جذباتی نکتے" تراشتے ہیں کہ ـــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے محبوب ہیں، رحمۃ للعالمین ہیں، سراجِ منیر ہیں، شفیع المذنبین، افضل البشر بلکہ افضل الرسل ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے حکم و اذن سے حضور کو کائنات کا مالک و مختار بنا دیا ہے۔ . . . . . . !

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جتنے فضائل بیان کئے گئے ہیں وہ سب حق ہیں ان میں جو کوئی کلام یا تشکیک پیدا کرے وہ زندیق۔ لیکن عبارتِ مذکورہ بالا کا آخری جزو ـــــ "اللہ تعالیٰ نے اپنے حکم و اذن سے حضور کو کائنات کا مالک و مختار بنایا ہے" ـــــ محلِ طلب ہے، اس کے لئے کتاب و سنت سے دلیل چاہئے۔

کتاب اللہ میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں ملتا جس میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کائنات منتقل ہو گئی اور کارخانۂ عالم کے چلانے کے اختیارات سونپ دیئے ہیں اور جس کو دنیا میں جو کچھ ملتا ہے وہ آپ کے ہاتھوں سے ملتا ہے، جو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے رسول کو عطا فرما دیا ہے ـــ یہ عقائد اور اس قسم کے تصاوف مسلمانوں کے غلوِ عقیدت نے تراشے ہیں، کتاب و سنت سے ان عقائد کی تائید نہیں ہوتی، اس لئے اس قسم کے عقائد نہ تو قابلِ قبول ہیں اور نہ لائقِ تحسین ہیں، بلکہ ان عقائد کی تردید میں قرآنِ کریم کی وہ آیت اوپر بیان کی جا چکی ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان وحی ترجمان سے کہلوایا گیا ہے کہ میرے پاس اللہ کے دیئے ہوئے خزانے نہیں ہیں! اور خود سیرتِ رسولؐ کے بے شمار واقعات ان عقائد کی تائید نہیں کرتے۔

جو کوئی اللہ تعالیٰ کا جتنا محبوب ہے اتنا ہی وہ اللہ تعالیٰ کا فرمانبردار اور اطاعت گزار ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو انبیاء و رسل میں جو سب سے زیادہ محبوبیت ملی ہے اس کا سبب حضور کا ـ کمالِ عبدیت ہے، یہ کہ حضور اللہ تعالیٰ کے حکم و فرمان کے مقابلہ میں بال برابر بھی

اُدھر نہیں ہوتے، پوری زندگی "تسلیم و رضا" میں بسر ہوتی ــــــ "محبوبیت" کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ جس طرح کائنات کا مالک و مختار
اُسی طرح اپنے اذن سے اپنے محبوبوں کو بھی مالک و مختار بنا دیتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے یہ محبوب بندے دنیا میں دور و نزدیک سے سب
کی آوازیں سنتے ہیں، لوگوں کی مصیبتیں دور کرتے ہیں، مریضوں کو شفا دیتے اور بے اولادوں کو اولاد بخشتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اور ان بندوں
اختیارات و تصرفات میں بس "ذاتی" اور "عطائی" کا فرق ہے ــــــ اس قسم کے تمام عقائد بے سند اور بے دلیل ہیں، اور ان عقائد کی بنیاد پر جو
تہ خیال" وجود میں آیا ہے وہ بھی غلط اور فاسد ہے! اللہ تعالیٰ نے اپنے اختیارات کسی کو منتقل نہیں فرمائے، وہ بلا شرکتِ غیر کائنات کا رب حافظ
ان اور رازق، مالک اور مختار ہے۔ کتاب و سنت میں کہیں بھی نبوت و رسالت، ولایت اور اللہ تعالیٰ کی محبوبیت اور اس کی بارگاہ میں تقرب
صفت بیان نہیں کی گئی کہ نبیوں، رسولوں، ولیوں اور ذاتِ اللہ تعالیٰ اپنے محبوبوں کو کائنات کا مالک و مختار بنا دیتا ہے۔

قرآن کریم میں انبیاء کرام کے جو حالات بیان کئے گئے ہیں اُن میں انبیاء کی عزت و تکریم کے ساتھ یہ بھی ملتا ہے کہ قضا و قدر کے آگے انبیاء و رسل
بھی راضی برضا ہیں! صرف ایک مثال!

حضرت سیدنا یعقوب علیہ السلام اپنے پیارے بیٹے حضرت یوسفؑ کا اتنا غم کرتے ہیں کہ روتے روتے آنکھیں سفید ہو جاتی ہیں، اس زمانہ میں حضرت
نے اللہ تعالیٰ کے حضور کیا کیا دعائیں نہیں کی ہوں گی، مگر برسوں تک وہ حضرت یوسفؑ کے حالات سے بے خبر رہتے ہیں اور جب تک اللہ تعالیٰ کو منظور
ہوا، اُن کی پلیٹ ٹی دور نہیں ہوتی، جب انبیاء کرام تک کا قضا و قدر کے معاملات میں یہ حال ہو تو ہم کس کھاتے، ولی اور غوث و قطب کو مشکل کشا اور
بس مانیں اور اُن کے بارے میں یہ عقیدہ رکھیں کہ ہم جب بھی اُن کو پکاریں گے، وہ ہماری پکار کو سن کر ہمارا دکھ درد دور کر دیں گے! کوئی ضعیف سے
نہ بلکہ موضوع اور جعلی روایت بھی ایسی نہیں ملتی جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ انبیاء اور اولیاء قبر و برزخ سے دنیا والوں کی مشکل کشائی کرتے ہیں! اور
وسنت، آثار صحابہ اور مستند کتابوں میں کوئی ایسا قول بلکہ اشارہ اور کنایہ تک نہیں پایا جاتا کہ انبیاء کرام اور اولیاء عظام سے استغاثہ کیا کرو وہ تمہاری
لات کو دور کر دیں گے!

ان تمام مسائل میں جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، تو حید شناس مسلمان جن کو اہلِ بدعت "وہابی" کہتے ہیں اُنہیں کا مسلک کتاب و سنت کے موافق ہے
جو بات کہتے ہیں سند و دلیل کے ساتھ کہتے ہیں! اس کے برخلاف اہلِ بدعت کے یہاں نکتے اور لطیفے علم ہیں اور اُن کا مسلک نہایت ہی ضعیف و
طرب روایتوں اور مضحکہ خیز تاویلوں پر قائم ہے! اپنی تقریروں اور وعظوں میں وہ قرآن کی آیتیں پڑھ کر، جو جی میں آتا ہے، کہتے چلے جاتے ہیں
قرآنی کے مفہوم سے اُن کی شرح و تفسیر کا کوئی علاقہ نہیں ہوتا، عوام بے چارے یہی سمجھتے ہیں کہ مولانا صاحب قبلہ آیات کی جو تفسیر فرما رہے ہیں، یہی اُن
کا حقیقی منشا ہے ــــــ مثلاً وہ "وما ارسلنٰک الا رحمۃ للعالمین" کو بیان کرتے ہیں کہ رحمت کرنے والے رحم (کرنے) کے لئے اُس شخص کے حالات
فروری ہے، جس پر رحمت کی جائے! اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ عالمین کے لئے رحمت ہیں اس لئے تمام عالمین کے حالات سے حضورؐ باخبر
اور حاضر و ناظر ہیں،

اس قسم کے نکتے اور اس طرح کی تاویلیں قرآن کریم کے نظم و مفہوم اور دین کے مزاج کے خلاف ہیں! قرآن کریم کو بھی "رحمت" کہا گیا ہے ــــــ تو کیا
ن "صفت رحمت" کے سبب ہر اُس مسلمان کے احوال کی خبر رکھتا ہے جو قرآن کی تلاوت اور اُس کے احکام پر عمل پیرا ہونے کی وجہ سے لائقِ رحمت
پر و برکت کا مستحق ہوتا ہے!

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معجزہ عطا فرمایا تھا کہ حضورؐ کی دعا اور برکت سے جب اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا، قلیل مقدار کی
میں فراوانی ہو جاتی، ایک بار حضورؐ نے کھجور یا کھانے کی قلیل مقدار پر "تکثیر" کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کی اور وہ تھوڑی مقدار بہت زیادہ ہو گئی! اس
سے اہلِ بدعت کھانے پینے کی چیزیں سامنے رکھ کر اُن کا ثواب ارواح کو پہنچانے پر دلیل لاتے ہیں، حالانکہ اس روایت سے ایصالِ ثواب کے مروجہ

طریقہ کو کسی کا واسطہ بھی نہیں ہے! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کھانے کا ثواب آخر کس میت کی روح کو پہونچایا تھا۔ ایصالِ ثواب سے اس روایت کا کوئی تعلق ہم کسی قسم کی کوئی نسبت؟ حدیث کچھ بتاتی ہے اور یہ اہلِ بدعت اُس سے کچھ اور استدلال کرتے ہیں!

اسی طرح ایک روایت ہے کہ حضور کہیں سے گزر رہے تھے، دو قبروں پر آپ نے ہری شاخیں گاڑ دیں اور فرمایا ان قبروں پر عذاب ہو رہا تھا۔ یہ شاخیں جب تک ہری رہیں گی اہلِ قبر کے لئے دعاءِ مغفرت کرتی رہیں گی ——— اس حدیث سے اہلِ بدعت استدلال کرتے ہیں کہ قبروں پر پھول چڑھانا جائز ہے حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن قبروں پر اظہارِ عقیدت و محبت کے لئے پھول نہیں چڑھائے تھے، بلکہ تخفیفِ عذاب کے لئے درخت کی ہری شاخیں قبروں پر نصب فرمادی تھیں ——— بدعتی مسلمان بزرگوں کی قبروں پر جو پھول چڑھاتے ہیں تو اُن کا یہ تصور اور عقیدہ کب ہوتا ہے کہ یہ پھول جب تک تر و تازہ رہیں گے صاحبِ قبر کے لئے دعاءِ مغفرت کرتے رہیں گے اور صاحبِ قبر پر جو عذاب ہوتا ہے اُس کی تخفیف کے لئے یہ پھول چڑھائے جاتے ہیں ——— اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ احادیث سے استدلال کرنے میں یہ لوگ کتنی غلط بیانی سے کام لیتے ہیں بلکہ جان کر عوام کو دھوکا دیتے ہیں!

پوری حدیث یہ ہے! ———

من یرد اللہ بہ خیراً یفقہہ فی الدین وانما انا قاسمٌ واللہ یعطی

(جس کے ساتھ اللہ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے، اُس کو دین کی سمجھ عطا فرماتا ہے اور میں تو بانٹنے والا ہوں اور اللہ دینے والا ہے)

حدیث کے الفاظ بول رہے ہیں اور عبارت کا سیاق و سباق بتا رہا ہے کہ یہاں "یعطی" سے مال اور رزق و دولت نہیں بلکہ احکامِ دین و شریعت کی عطا مراد ہے، علامہ توربشتی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے ——— "عطا و تقسیم" سے علم و حکمت اور تفقہ فی الدین ہی مراد لیا ہے ——— مگر اہلِ بدعت، اس حدیث کا صرف یہ ٹکڑا ———

وانما انا قاسمٌ واللہ یعطی

پڑھ کر کس زور شور سے اعلان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کے تمام خزانے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کر دئے ہیں، حقیقی معطی تو اللہ تعالیٰ ہی ہے رسول، صرف اس عطا کے قاسم (بانٹنے والے) ہیں!

——— اگر ———

اس حدیث کا یہی مفہوم ہے، تو یہ حدیث قرآن کی اس آیت ———

"قل لا اقول لکم عندی خزائن اللہ"

سے ٹکراتی ہے ——— صحیح حدیث قرآن کی مخالف نہیں ہو سکتی۔ اور ہو گی تو وہ غلط اور وضعی ہو گی جسے رد کر دیا جائے گا۔ یہ حدیث صحیح ہے اس کا مفہوم بھی صحیح ہے مگر اہلِ بدعت نے اس سے جو مفہوم و معانی پیدا کئے ہیں، وہ سراسر غلط ہیں اور آیتِ قرآنی کے مخالف ہیں۔

غیر اللہ سے استعانت کے جواز میں اہلِ بدعت قرآنِ کریم کی اس آیت ———

"استعینوا بالصبر والصلوٰۃ"

سے استدلال کرتے ہیں! کیا اس آیتِ قرآنی کے حکم کی تعمیل میں کوئی مسلمان "صبر و صلوٰۃ" سے استغاثہ کرتا ہے کہ اے "صبر و صلوٰۃ" تم میری دستگیری اور مدد فرماؤ! اگر بالفرض کوئی ایسا کرتا ہے، تو اس سے بیہودہ کوئی اور احمق کوئی نہیں ہے! اس آیت کا سیدھا سادہ مفہوم یہ ہے کہ صبر اختیار کرو گے اور نماز پڑھو گے تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت نازل فرمائے گا اور اس سے حلِ مقصد کشود کار اور کشائشِ مشکلات ہوگی،

یہ ہے اہلِ بدعت کا قرآن اور احادیث کے ساتھ سلوک! اور ان کی قرآن فہمی اور حدیث دانی کے چند نادر نمونے!!

اہلِ بدعت کا یہ خاصہ بلکہ اُن کی خاص "ٹیکنک" ہے کہ کتاب و سنت کے واضح احکام و شواہد کی موجودگی میں یہ لوگ کسی ایسی روایت سے استدلال کرتے ہیں جو یا تو قرآن کی آیت کی طرح "حدیثِ متشابہ" ہوتی ہے یا پھر اُس میں شذوذ، نکارت اور ضعف پایا جاتا ہے! اور وہ معلل روایت یا تو قرآنِ کریم سے ٹکراتی ہے یا دوسری صحیح حدیثوں کے خلاف جا پڑتی ہے۔ مثلاً طبرانی کی اس حدیث ـــ

ان اراد عونا فلیقل یا عباد اللہ اعینونی، یا عباد اللہ اعینونی

میں انقطاع و نکارت کی علتیں پائی جاتی ہیں اور اس حدیث کا ایک راوی عتبہ بن غزوان مجہول الحال ہے ـــ دوسری حدیث یہ ہے کہ ـــ

"ابدال شام میں رہتے ہیں، یہ چالیس مرد ہیں جب ان میں سے کسی کا وصال ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ دوسرے کو اس کا بدل اور قائم مقام فرما دیتا ہے ان ابدال کی برکت سے ابر کو سیرابی دی جاتی ہے اور دشمنوں پر غلبہ حاصل ہوتا ہے اور اہلِ شام سے عذاب دفع کیا جاتا ہے"

اول تو اس حدیث میں اس کا حکم نہیں دیا گیا اور نہ اس طرف اشارہ کیا گیا کہ شام میں جو ابدال ہیں، اُن سے استغاثہ کیا کرو اور وہ تمہاری مشکل کشائی کیا کریں گے کہا یہ گیا ہے کہ اُن کی برکت سے ایسا ہوتا ہے......! پھر حافظ سخاوی نے ان تمام طرق کو "المقاصد الحسنہ" میں ضعیف بتایا ہے جو حضرت انس رضی اللہ عنہ تک پہنچتے ہیں اور ملا علی قاری نے "موضوعات کبیر" میں امام ابن تیمیہ سے ان روایات کا باطل ہونا نقل کیا ہے!

جائزہ مسلمانوں میں بدعات اور مشرکانہ رسوم کا جو رواج ہوا ہے، وہ درحقیقت اثر و نتیجہ ہے "عجمی تہذیب و تمدن" سے میل جول کا! ایران کی مجوسیت، ہندو رہبانیت، بدھ مت کی ویدانت اور بت پرستی اور اسی طرح دوسرے ملکوں کی بدعات و خرافات کا مسلمانوں نے اثر قبول کیا اور جو باتیں ابتداء شروع میں سادہ اور بے ضرر دکھائی دیتی تھیں، وہ آگے چل کر ضلالت بن گئیں! ہندو راجاؤں اور مہاراجاؤں نے مندروں کے اخراجات اور انتظامات کے لیے جاگیروں کا دان دیا، ان کی دیکھا دیکھی مسلمان بادشاہوں اور امیروں نے مقابر اور درگاہوں کو منصب، یومیہ، وظائف، کہیں اوقاف ہوگئے خدام اور متولیوں اور سجادہ نشینوں کے لیے روزینے مقرر کیے گئے! اس طرح "قبر پرستی" کا انسٹی ٹیوشن وجود میں آیا۔

بعض صوفیائے کرام کے ملفوظات نے عقائد و اعمال میں خاصہ خلل و اضطراب پیدا کیا، نہ جانے ان بزرگوں نے کیا بات کس طرح فرمائی تھی اور عقیدت مندوں نے کن لفظوں کا جامہ پہنایا! مگر ان ملفوظات کو "تصوف" کا منشور سمجھا گیا اور بعد والوں نے مرعوب ہو کر ان "شطحیات" کو دفتر عرفان کا حکیمانہ حقیقت سمجھ لیا پھر اسرار و رموز کے نام پر نکتہ آفرینیوں کی دوڑ چل پڑی۔

جن اکابر کے اقوال سے ہم نے اپنے مضمون میں استدلال کیا ہے، ان کی تحریروں میں بعض ایسی باتیں بھی پائی جاتی ہیں جن سے اہلِ بدعات کو اپنے مسلک کے جواز کے لیے دلیلیں ملتی ہیں! اس کا سبب یہ ہے کہ یہ حضرات تصوف سے بہت متاثر تھے اور اسی تاثر نے اُن کے ذہنوں سے ایسی باتیں بھی نکلوا دی ہیں جو حد درجہ تشویش اور اضطراب انگیز ہیں ـــ حلاج، منصور اور سرمد جس تصوف کے سرا سر مست ہوں، سمجھ لیجئے کہ وہ تصوف کیا ہوگا؟ اور اس کے تقاضے کیا نتائج پیدا کریں گے! لہٰذا ان اکابر کی وہ باتیں قبول نہیں کی جاتیں جن کی تائید کتاب و سنت اور آثارِ صحابہ سے نہیں ہوتی۔

شعر و شاعری کا معاملہ یہ ہے کہ اُس میں سنجیدہ سے سنجیدہ شاعر سے بے احتیاطی ہو جاتی ہے ایسی بے احتیاطیاں "شوخیاں" اور شاعرانہ مبالغہ آرائیاں اہلِ بدعت کے یہاں سند و حجت سمجھی جاتی ہیں۔

مردوں کے مقابلے میں عورتیں بہت زیادہ انفعال و تاثر قبول کرتی ہیں، بدعات اور مشرکانہ رسوم کی ترویج میں مردوں سے زیادہ عورتوں نے نمایاں پارٹ ادا کیا ہے، ہم ایسے گھرانوں کو جانتے ہیں جن کے مرد عورتوں کی دلجوئی کے لیے بعض بدعات کو گوارا کئے ہوئے ہیں حالانکہ وہ خود ان رسوم کو پسند نہیں کرتے۔

عوام کو کھیل تماشوں سے دلچسپی ہوتی ہے، لہذا جہاں "دین" کے نام پر راگ رنگ ہو، سماع و رقص ہو، مردوزن کا اختلاط ہو، حلوہ پھول بتاشے، کھانے کھانے کی رنگینی، منقا تبرک کے طباق، نجوگ صندل اور چادروں کے جلوس ہوں ——— وہاں عوام کو دلچسپی ہونی چاہئے! اس عامیانہ ذوق کی بدولت ان خرافات کا بازار گرم ہے!

——— پھر ———

بدعتی علماء اپنے مسلک کی کھل کر ڈنکے کی چوٹ تبلیغ کرتے ہیں مگر جو علماء اور واعظین اس مسلک کے مخالف ہیں، وہ کچھ تو رواداری اور احتیاط کے خوف سے اور کچھ اس وجہ سے کہ عوام مسلمانوں میں ان کی ہر دلعزیزی اور مقبولیت کو ٹھیس لگے گی، ان بدعات و خرافات کی، اپنے مواعظ اور تقریروں میں تردید نہیں کرتے!

——— لیکن ———

یہ ہمارا ذاتی تجربہ ہے کہ جب بھی عوام کے سامنے ان قسم کے مسائل کو صحیح طور پر پیش کیا گیا ہے اور ان کے دلوں میں یہ بات اتار دی گئی ہے کہ ان بدعات سے اللہ اور رسول اور بزرگان دین کی خوشنودی حاصل ہونے کی بجائے ان کی ناراضگی اور عتاب و خفگی حاصل ہوتی ہے تو وہ چونک پڑے ہیں اور بعض کے عقائد میں تبدیلی پیدا ہو گئی ہے!

توحید و سنت کی اشاعت و تبلیغ اور بدعت و شرک کی تردید کی ذمہ داری ہر اہل ایمان پر عائد ہوتی ہے جس سے جو کچھ ہو سکتا ہے وہ اسے کرنا چاہئے، ورنہ ان مسائل میں سکوت و گریز صرف نظر اور چشم پوشی کی اللہ تعالیٰ کے یہاں جواب دہی کرنی ہوگی!

مولانا محمد حسام اللہ شریفی

تاثرات

سر چھپانے کی جگہ بھی ضروریات زندگی ہی میں شامل ہے۔ ذرا بتایئے تو سہی جس مکان میں آپ رہائش رکھتے ہیں اس کی صفائی، ستھرائی، نگہداشت اور حفاظت اور اس کی دیکھ بھال کیا دوسرا آدمی کرے گا؟ اس عمارت کا کوئی حصہ کمزور ہو جائے تو کیا آپ اسے یوں ہی کمزور رہنے دیں گے؟ کڑیاں ٹوٹ جائیں یا شہتیروں کو دیمک نے چاٹ چاٹ کر کھوکھلا کر دیا ہو اور اس کمزور اور بوسیدہ کڑیوں اور شہتیروں پر مبنی اس چھت کے کسی وقت بھی گر جانے کا امکان ہو۔ تو کیا پھر بھی آپ اس کی طرف سے یونہی بے توجہی برتیں گے؟

ظاہر بات ہے اگر آپ اس مکان کی صفائی، ستھرائی، دیکھ بھال اور نگہداشت کی طرف توجہ نہیں کریں گے اس عمارت کی کمزوری اور شکستگی کو دور کرنے کی سعی نہیں فرمائیں گے تو یقیناً ایک نہ ایک دن وہ مکان گر جائے گا۔ اس کی چھت بیٹھ جائے گی اور بہت ممکن ہے کہ وہ اپنے ساتھ ان لوگوں کو بھی لے بیٹھے جو اس میں رہائش رکھتے ہیں اور اگر کسی طرح وہ لوگ زندہ سلامت بچ بھی گئے تب بھی ان کا سامان نقصان سے محفوظ نہیں رہ سکے گا بلکہ اس میں سے بہت سا سامان ضائع ہو جانے تو کچھ بعید بھی نہیں ـــــــ اور ایسے شخص کو، جو اس مکان کی خامیوں سے واقف ہوتے ہوئے بھی انہیں دور کرنے کی کوشش نہیں کرتا اور اس کی رہائش ترک کرتا ہے، آپ کیا کہیں گے، کیا دوسرے لوگ اس کو دانشور تسلیم کریں گے یا اس کی عقل و دانش کی تعزیت کے لئے محفل ماتم منعقد کریں گے۔

بہت سی عمارتیں آپ کو ایسی بھی نظر آئیں گی جن کی تعمیر کا مقصد رہائش نہیں بلکہ ان سے دوسرے فوائد حاصل کرنا مقصود ہوں گے، اور ان سے کئی دوسری اغراض وابستہ ہوں گی۔ ایسی عمارتوں سے ان کے مقصد تعمیر کو نظر انداز کر کے رہائش وغیرہ کا کام لینا کسی طرح بھی درست نہ ہوگا بلکہ ایسے کرنا قومی دولت کے ضیاع کا سبب اور ایسا کرنے والے افراد ملی مفاد سے غداری کے مرتکب ہوں گے۔ ان عمارتوں سے وہی کام لینا ان کا جائز استعمال ہوگا جن کے لئے انہیں تعمیر کیا گیا ہے لیکن دفاتر، تعلیمی ادارے، کارخانوں یا دکانوں وغیرہ کے استعمال میں لانا یقیناً ان عمارتوں کا جائز اور صحیح استعمال ہوگا ـــــ پھر زندگی کے ان شعبہ ہائے مختلفہ سے وابستہ افراد کو ان عمارتوں کی بھی اسی طرح دیکھ بھال کرنا ہوگی جس طرح وہ اپنی رہائش گاہوں کی دیکھ بھال اور نگہداشت کرتے ہیں ـــــــــــــــــــــ اور اگر ان لوگوں نے ان عمارتوں کی دیکھ بھال، صفائی ستھرائی، نگرانی اور حفاظت کی فریضہ انجام نہ دیا اور اس سے غفلت برتی تو یہ لوگ بھی اس خطرے سے محفوظ نہیں رہ سکیں گے جس خطرے میں گھر والے مبتلا تھے، اور ہر لمحے ان کے سر پر خوف کی یہ تلوار لٹکی ہوئی نظر آتی رہے گی کہ کہیں کوئی حادثہ پیش نہ آ جائے اور انہدام عمارت سے کوئی جانی یا مالی نقصان نہ پہونچ جائے اور اس خوف سے انہیں کبھی چھٹکارا نہیں مل سکے گا۔

جس دیس میں آپ بستے ہیں اور جس ملک کو آپ اپنا وطن شمار کرتے ہیں اس کی حیثیت بھی وہی ہے جو آپ کے مکان کی ہے۔ البتہ اتنا فرق ضرور ہے کہ اس مکان میں آپ تنہا رہتے ہیں اور اس دوسرے مکان میں آپ کے افراد خانہ کے ساتھ ہی ساتھ آپ کی برادری اور خاندان، مذہب اور قوم کے دوسرے افراد

بھی آپ کے ساتھ رہائش رکھتے ہیں اور اس طرح یہ وطن ایک وسیع خاندان کو اپنے اندر جگہ دئے ہوئے ہے۔ اور اسی سبب سے اس کی صفائی ستھرائی، دیکھ بھال اور نگہداشت کا فرض بھی کسی ایک فرد کی ذمہ داری نہیں بلکہ مساوی حیثیت میں ان سب لوگوں کا مشترکہ فریضہ ہے جنہوں نے اس مکان کی چار دیواری میں پناہ لے رکھی ہے۔

ایک بات اور ——— کبھی ایسا بھی ہوا ہے۔ آپ نے گھریلو معاملات کو یکسر نظر انداز کر دیا ہو اور ان سے بالکل بے تعلقی اختیار کر لی ہو، کبھی کسی چور کی آہٹ پر آنکھ کھل جانے کے باوجود آپ نے اُسے مال و اسباب سمیٹ کر لے جانے کی اجازت دیدی ہو اور اس سے کوئی باز پرس نہ کی ہو۔ آپ نے اپنے گھر میں کسی چور کو نقب لگاتے دیکھ کر اس کے اس فعل سے چشم پوشی کی ہو؟ خدانخواستہ آپ کے مکان یا دکان میں کسی طرح آگ لگ گئی ہو تو آپ محض ایک تماشائی بن کر سے دیکھتے رہے ہوں اور آگے بڑھ کر اس آگ کو بجھانے کے لئے کوئی عملی قدم نہ اٹھایا ہو؟

یقیناً ان باتوں کے جواب میں یہی کہا جائے گا کہ گھریلو معاملات سے بے تعلقی اختیار کر لینا کسی عقلمند کا شیوہ نہیں یا کسی چور اور لٹیرے کو کسی قسم کی سزا دئے بغیر چھوڑ دینا دانشمندی سے بعید ہے۔ اسی طرح آگ بھڑکتی دیکھ کر اسے بجھانے کے لئے عملی کوشش نہ کرنا سفاہت کی علامت ہے۔

اگر واقعتہً آپ کا بھی یہی خیال ہے اور یقیناً ایسا ہونا چاہئے تو آپ نے اپنے اس وطن عزیز کو کیوں فراموش کر رکھا ہے اور اس کے معاملات سے کیوں بے تعلقی اختیار کر رکھی ہے اپنی تہذیب و ثقافت کو کیوں مغربی تخریب کاروں کے حوالے کر دیا ہے جو آپ کا معاشرہ مغربیت کی آگ میں جل رہا ہے اور یہ آگ روز بروز تیز سے تیز ہوتی چلی جا رہی ہے اور آپ کی اخلاقی اور اعلیٰ قدروں کو خشک لکڑیوں کی طرح جلائے دے رہی ہے۔ مگر آپ اس آگ کو بجھانے کے متعلق فکر نہیں کرتے ——— کیا اس سے بڑا کوئی المیہ ہو سکتا ہے۔

آپ اپنی تمام اشیاء، گھر بار، مکان دکان اور اس میں موجود مال و اسباب وغیرہ کی حفاظت کو سب چیزوں پر مقدم سمجھتے ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ آپ اپنے اس وطن عزیز کی کسی شے کا خیال نہیں رکھتے۔ اس کی تہذیب و ثقافت، اس کے آئین واخلاق اور تعلیم و معاشرت کو اپنی توجہ کا مرکز نہیں بناتے اور انہیں اپنے دین و مذہب کے مطابق ڈھالنے کی کوشش نہیں کرتے۔

اس حقیقت سے کون شخص انکار کر سکتا ہے کہ اس دیس کے حصول کے لئے جسے پاکستان کے نام سے شہرت حاصل ہے اور جس کے بسنے والے اپنے آپ کو مسلمان کہلاتے اور نبی آخر الزمان جناب محمد مصطفےٰ علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی محبت کا دم بھرتے ہیں، اپنے آبائی وطن کو چھوڑنا محض اس لئے گوارا کیا تھا اور جان و مال کی قربانیاں صرف اسی لئے پیش کی تھیں کہ وہ کسی طرح ایک ایسے خطۂ ارض کے مالک بن جائیں جہاں وہ آزادی سے اپنے معبود حقیقی کے سامنے سر نیاز خم کر سکیں اور اپنے ضابطۂ حیات کو اُس کے لائے ہوئے آئین کے مطابق ڈھال سکیں۔

اب اس دیس میں بسنے والے ہر فرد کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی ذمہ داری کو محسوس کرے اور اس مکان میں رہائش رکھنے والے شخص کی طرح اس مملکت کی دیکھ بھال، نگہداشت اور نگرانی کے فریضے سے حسن و خوبی کے ساتھ عہدہ برآ ہو۔

مقصد تعمیر سے ہٹ کر عمارت سے استفادہ کو ایک غلط اقدام سے تعبیر کیا جاتا ہے تو اس دیس کے مقصد بنا کو نظر انداز کر دینا قومی مفاد سے غداری کے مترادف نہ ہوگا؟

سر گشتان وطن کی جن لوگوں نے اپنے خون سے آبیاری کی ہے اور جس ارفع مقصد کے لئے انہوں نے جانی و مالی قربانیاں پیش کی ہیں اور جس غرض کے لئے اپنے آبائی وطن کو ترک کیا ہے ان اغراض و مقاصد کو کسی صورت میں بھی نظر انداز کرنا مناسب نہ ہوگا۔ ان کی ہجرت اور ان کی شہادت کو رائیگاں جانے دیا جائے؟

آپ اپنے افراد خانہ کو اتنی آزادی دے دیں گے کہ وہ ان اقدار سے انحراف کر جائیں اور ان بنیادوں کو درہم برہم کر ڈالیں جن پر آپ کا گھریلو نظم قائم ہے ؟ اپنی اولاد سے آپ اپنی عزت و توقیر کی توقع رکھتے ہیں لیکن اگر وہی آپ کی عزت و آبرو کے درپے ہو جائے اور آپ سے مقابلے کے لئے نکل کھڑی ہو اور اس کا ہاتھ آپ کی پگڑی پر آئے تب آپ کا اس کے ساتھ کیا رویہ ہو گا ؟ آپ زجر و توبیخ سے کام نہیں لیں گے اور اسے لعنت ملامت نہیں کریں گے ؟ آپ کے اہل محلہ میں سے بھی جو شخص سنے گا وہ بھی آپ کی اولاد ہی کو برا بھلا کہے گا اور اسے ناخلف شمار کرے گا ——— اس سے قطع نظر اگر کسی بھری محفل میں کوئی شخص آپ کے والدین کو برا بھلا کہنے لگے اور لعنت ملامت کرنے لگے تو آپ کی غیرت و حمیت اسے برداشت کرے گی۔ ان کی زبان سے اپنے والدین کی برائیاں سننے کے باوجود پھر بھی آپ خاموشی اختیار کئے رکھیں گے ؟

اگر ایسا نہیں تو کیا وجہ ہے کہ دین کے معاملے میں لوگوں کی اس آزادی کو برداشت کر لیا جاتا ہے اور اسلام کی بنیادی قدروں سے انحراف کرنے والوں کو معاشرے میں آبرومندانہ مقام حاصل رہتا ہے ——— آپ اپنے والدین کی برائی تو نہیں سن سکتے لیکن آپ کے سامنے رسول اللہ اور ان کے احکام و فرامین کا [illegible] کھلے بندوں مذاق اڑایا جاتا اور تحقیر کی جاتی ہے اور پھر بھی آپ کی غیرت و حمیت کو جوش نہیں آتا۔ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام آپ کی نظر میں اتنا بھی نہیں جتنا آپ کے والدین کا ہے۔

میرا ذہن ایسے چند دوسرے سوالوں میں بھی الجھا ہوا ہے اور ان کے جوابات تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش میں مصروف ہے۔ آپ بھی اس مشکل کو حل کرنے میں میری مدد کیجئے ——— کیا کبھی آپ اس بات کو گوارا کر سکتے ہیں کہ آپ کی مملکت میں کسی دوسرے کا قانون نافذ ہو یعنی گھر آپ کا ہو اور حکم کسی باہر کے آدمی کا چلے کیا آپ اس کا تصور کر سکتے ہیں کہ آپ کی اچھی بھلی اور صحیح سالم زبان کاٹ دی جائے اور اس کے بجائے کسی دوسرے شخص کی زبان کا پیوند لگا دیا جائے ؟ کیا آپ اس چیز کو برداشت کر لیں گے کہ آپ کی حیثیت محض ایک چابی بھری چلتی مشین کی ہو جائے ؟

اگر آپ ان باتوں کو برداشت کرنے کی اپنے میں ہمت نہیں پاتے بلکہ ان کے تصور سے بھی دور بھاگتے ہیں تو پھر ایسا کیوں ہے کہ اپنا وطن ہوتے ہوئے بھی غیروں کے آئین کے نفاذ اور اس پر عمل کرنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کی جاتی۔ کیا اسلامی دستور ہمارے مسائل کو حل کرنے کے لئے کافی نہیں ؟ ——— یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ ایک ذہن رسا کے مالک ہوتے ہوئے بھی آپ اس پر اپنا اعتماد نہیں رکھتے اس میں بھی دوسروں کے خیالات بھرے ہوئے ہیں ۔۔ اور اب اتنی گنجائش ملنی ہی مشکل ہے کہ اس میں آپ کے ذاتی رجحانات اور خیالات سما سکیں ——— کیا یہ زندگی کی یہی علامت ہے کہ اچھی بھلی زبان کو معطل بنانے پر بھی کسی قسم کا کوئی احتجاج بھی نہ کیا جائے بلکہ دوسروں کی زبان کے پیوند پر فخر کیا جائے کیا آپ کی زبان اس قابل نہیں کہ وہ اظہار مطلب کے کام آ سکے اور اس سے کاروبار زندگی میں فائدہ اٹھایا جا سکے یا وہ محض زینت کا ایک ذریعہ ہے جسے نمائشی الماری میں سجا دینا ہی کافی ہے ——— اپنی زبان کو محض فرنگیوں کی بولی کے لئے استعمال کرنا اور اس سے ان کے خیالات و احساسات کی ترجمانی کا کام لینا غیرتِ ملی کے منہ پر طمانچے سے کچھ کم ہے ؟ فکر و تدبر سے کام لے کر مجھے ان سوالات کے جواب دیجئے۔

اس دیس سے اپنی الفت اور وطن سے اپنی محبت کے اظہار کا یہی ایک طریقہ ہے کہ اس وطن عزیز میں بسنے والا ہر فرد اسلام کا دامن ہر حالت میں تھامے رکھے۔ اپنی تہذیبی اور ثقافتی قدروں کو کسی صورت میں بھی فراموش نہ کرے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے زبانی دعوے سے ایک قدم آگے بڑھ کر اس کا عملی ثبوت بھی پیش کرے وہ اپنے مذہب اسلام کے فروغ اور اپنی قومی زبان اردو کی ترویج کے لئے اپنی پوری زندگی وقف کر دے ان لوگوں پر کڑی نظر رکھے جو اس کے بنیادی اغراض و مقاصد میں ترمیم و تحریف کے مرتکب ہوں ——— اور اگر ایسا نہیں تو پھر اقبال کی زبان میں یہی کہنا پڑے گا۔

وہ چیز نام ہے جس کا تڑپ محبت کی
مرے وطن میں نہیں ہے ابھی کہیں پیدا

اللہ تعالیٰ کو کسی نے دیکھا نہیں بلکہ اُس ذات برحق کو اُس کی نشانیوں سے پہچانا ہے ایمان چونکہ ایک قلبی کیفیت کا نام ہے اس لئے کسی شخص کی ایمانیات کا فیصلہ کسی محسوس معیار کے سامنے رکھ کر نہیں کیا جا سکتا۔ مگر یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ اللہ تعالیٰ سے قلبی لگاؤ اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سچی محبت اس کی تعلیم سے وابستگی اور اُن کی اطاعت کا جذبۂ صادق یہ سب ایمانی کیفیات ہیں ان کے طرزِ فکر اور اس کے طرزِ عمل میں ضرور منعکس ہوتی ہیں اور یہ ناممکن ہے کہ کسی شخص کو اللہ کے دین سے گہری محبت بھی ہو اور وہ جان بوجھ کر ایک طے شدہ منصوبے کے تحت ایسی تدابیر اختیار کرے جن سے دین کی تخریب کا خطرہ ہو یا وہ اسلام دشمن قوتوں کا محاسبہ کرنے اور ان کا راستہ روکنے کے بجائے الٹی ان کی تائید کرنے لگے۔

ہمارے ہاں اس وقت اسلام کے بارے میں حکومت نے جو رویہ اختیار کر رکھا ہے وہ کسی ایسی حکومت کو زیب نہیں دیتا جس نے اسلام کو اپنے دستور اور آئین کا بنیادی پتھر قرار دیا ہو۔ ارباب اختیار کے اپنے بارے میں تو جذبات اس قدر نازک ہیں کہ جہاں کسی نے اُن کی کسی پالیسی یا طرزِ فکر سے اختلاف کیا وہیں جبینیں شکن آلود ہو گئیں اور تنقید کرنے والے کو اُن کی اس بے جا جسارت کی سزا دینے کے لئے پوری سرکاری مشینری حرکت میں آ گئی مگر اسلام کے خلاف یہاں جس کا جو جی چاہے کہتا رہے اُس سے کوئی مواخذہ نہیں کیا جاتا۔ اسلام کے بارے میں حکومت کی بے حسی کا حال یہ ہے کہ وہ اگر خود بھی کوئی قدم صحیح سمت میں اٹھاتی ہے تو اس پر اس کا دل نہیں جمتا اور اپنے کئے ہوئے فیصلے کو نہ تو موثر طریق سے عملی جامہ پہناتی ہے اور نہ اس کے حق میں شرح اور واضح دلائل دے کر مخالفین کو خاموش کرنے کی سعی کرتی ہے یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ بعض اوقات عوامی دباؤ سے مجبور ہو کر کوئی ایسا اعلان جاری کر دیتی ہے جس سے لوگوں کو قدرے اطمینان ہوتا ہے اور وہ اسے ایک مفید قدم سمجھ کر اس کی پذیرائی کرنے لگتے ہیں لیکن یہ اعلان یا تو اخبارات کی زینت بنتا ہے یا گشتی مراسلوں کی صورت میں دفتری فائلوں میں دب کر رہ جاتا ہے۔ عملی زندگی میں اس کے مطابق قطعاً کوئی تبدیلی نہیں کی جاتی۔ زندگی کی جو ڈگر ہے وہ جوں کی توں جاری رہتی ہے۔ تجدد پسند اور بے دین طبقے اس کے خلاف کھل کر بے سروپا باتیں کرتے ہیں مگر حکومت ٹس سے مس نہیں ہوتی۔ اور وہ ان ساری باتوں کو اس خاموشی کے ساتھ برداشت کرتی ہے جیسے کہ وہ اس سارے ڈرامے کی خاموش تماشائی ہے اور اس کا خود اپنے اس فیصلے سے کوئی دور کا تعلق بھی نہیں ہے۔ ابھی چند ہی روز کا واقعہ ہے کہ حکومت مغربی پاکستان نے تعلیمی اداروں میں ناچ گانے کی ممانعت پر پابندی عائد کی اور ملک بھر میں حکومت کے اس اقدام کا خیر مقدم کیا گیا۔ اس اعلان کو سنتے ہی تجدد پسند اور ثقافت گزیدہ عناصر سخت برہم ہوئے اور انہوں نے اس کے خلاف اخبارات میں باقاعدہ ایک مہم شروع کر دی جس میں پیش پیش خود حکومت کے اپنے منظورِ نظر اخبارات ہیں ان کے کالموں میں کبھی کسی بگڑے ہوئے مسلمان بادشاہ کو بطور مثال پیش کر کے رقص و سرود کی حمایت میں مضامین لکھے گئے اور کبھی یہ بھونڈی دلیل دی جانے لگی کہ اگر مغربی پاکستان کے اسکولوں اور کالجوں میں ناچ گانے کا پرچم سرنگوں ہو گیا تو مشرقی پاکستان سے قومی وحدت کے رشتے کمزور ہو جائیں گے گویا مغربی اور مشرقی پاکستان میں اگر کوئی مشترک شے ہے تو وہ ناچ گانے کا جنون ہے۔ اس کے سوا ان میں اخوت کا کوئی دوسرا رشتہ موجود نہیں۔ سوال یہ ہے کہ جب حکومت نے اس معاملے میں ایک مستحسن قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا اور اس کے فیصلے کو پوری قوم کی تائید بھی حاصل ہے تو کیا اس کا یہ فرض نہ تھا کہ وہ اسے جلد از جلد نافذ کرنے کی کوشش کرتی اور نشر و اشاعت کے سارے ذرائع استعمال کر کے کم سے کم اُن چند لوگوں کو مسکت جواب دیتی جو اس معاملے میں انتشار پیدا کر رہے ہیں لیکن یہاں حال یہ ہے کہ نیشنل پریس ٹرسٹ کے اخبارات میں جن پر حکومت کا براہ راست قبضہ ہے اس فیصلے کے خلاف بڑے دل آزار خطوط اور مضامین شائع ہو رہے ہیں۔ اور ان میں سے کوئی

(باقی ص ۲۶ پر)

ہماری نظر میں

تحریک جماعت اسلامی ایک تحقیقی مطالعہ

از ڈاکٹر اسرار احمد ایم۔ اے، ضخامت ۲۴۰ صفحات (مجلد، رنگین گردپوش) قیمت چار روپے، ملنے کا پتہ :- دارالاشاعت الاسلامیہ، بالمقابل ڈاک خانہ کرشن نگر لاہور۔

جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کی مخالفت میں متعدد کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہی رہتا ہے! ان ناقدین کا مقصد جماعت اسلامی کو عوام مسلمانوں میں نامقبول اور حقیر و رسوا بنانا ہے، بعض کتابوں پر وافر رقمیں خرچ کی گئی ہیں، اور نہ جانے کس مصنف اور ناقد کی اس "محنت و خدمت" کی کس کس عنوان سے پذیرائی ہوئی ہے۔

مصر کی مثال ہمارے سامنے ہے، جمال ناصر اپنے اقتدار اور آمریت کے لئے سب سے زیادہ خطرناک "اخوان المسلمون" کو سمجھتا تھا، اس جذبہ کے تحت اس نے "اخوان" کو جس بے رحمی اور سفاکی کے ساتھ ظلم و ستم کا نشانہ بنا کر اپنے اقتدار کے لئے سب سے بڑے خطرے کو دور کیا ہے، وہ انسانیت کی بہت بڑی ٹریجڈی ہے اتنی دردانگیز کہ ؎

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں

پاکستان میں جماعت اسلامی "اقامت دین" کی تحریک کی تبلیغ اور علمبردار ہے، اپنی بساط کے مطابق انتہائی ناسازگار ماحول میں اس عظیم و مقدس تحریک کے لئے وہ ہر ممکن اور امکانی جد و جہد کرتی رہی ہے! اس لئے ہر دور حکومت میں "جماعت اسلامی" کی سرگرمیاں ارباب بست و کشاد کو کھٹکتی رہی ہیں اور اس تحریک کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں۔ یہ سلسلہ بند گاڑی معیادات کی تنگی اور قید و بند کی صعوبتوں سے لیکر قلم و قرطاس کے محاذ تک پہونچتا ہے، ہمیں اللہ تعالیٰ کو ایک دن منہ دکھانا ہے۔ جناب ڈاکٹر اسرار احمد کے بارے میں ہم اس قسم کی سوء ظن اور بدگمانی نہیں رکھتے کہ صاحب موصوف نے جماعت اسلامی کے بعض دوسرے ناقدین کی طرح سرکار دربار میں رسوخ اور اسی قسم کی منفعت حاصل کرنے کی غرض سے یہ کتاب لکھی ہے ان کا معاملہ دوسرے مصنفین اور ناقدین سے مختلف ہے، ڈاکٹر صاحب نے جماعت اسلامی کے بیان کی اصلاح کی نیت سے یہ کتاب تصنیف کی ہے اور بڑی دیدہ ریزی کے ساتھ جماعت اسلامی کے سابق اور حالیہ موقف کا جائزہ لیا ہے۔"

مگر

"اخلاص و نیک نیتی کے باوجود ان کی یہ کتاب بھی دوسری کتابوں کی طرح قریب قریب یہی کام انجام دے گی کہ جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کی طرف سے عوام مسلمان بدگمان ہوں، جماعت کے بارے میں یہ خیال قائم کریں کہ یہ بھی دوسری سیاسی جماعتوں کی طرح ایک سیاسی پارٹی ہے اور اس پر دنیا داری اور وقتی مصلحتوں کا غلبہ ہے، جماعت اسلامی اس طرح مسلمانوں میں نامعتبر، ناقابل اعتبار ہوگی اور اقامت دین کی راہوں میں بدگمانیاں اور رخنے پیدا ہوں گی! دوستوں، ہمدردوں اور ساتھیوں کا اٹھے وہ اخلاص جو دشمنوں اور بدخواہوں کی مخالفت اور بدخواہی کے مقصد کو تقویت

اور غذا ہضم نہ ہوتا ہو۔

جہاں تک جماعت اسلامی کے ارکان کا تعلق ہے، وہ پورے شعور، اخلاص اور بے نفسی کے ساتھ جماعت سے وابستہ ہیں اور کسی تذبذب میں مبتلا نہیں ہیں ان کی غالب اکثریت نے جماعت کے پورے لٹریچر کو حرفاً حرفاً پڑھا ہے، آخرت کی جس جواب دہی سے بچنے کے لیے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے یہ کتاب لکھ کر، دینی خیر خواہی اور احقاقِ حق کا حق ادا کیا ہے، اسی جذبہ کے تحت جماعت اسلامی کے ارکان بھی جماعت سے وابستہ ہیں اور ان کا مقصود بھی اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول اور آخرت کی سرخروئی ہے! اس کتاب کو پڑھ کر جماعت کے ارکان "اقامت دین" کی تحریک سے علیحدگی اختیار نہیں کر سکتے! ڈاکٹر صاحب کی طرح وہ بھی اللہ تعالیٰ کے فضل سے دینی بصیرت رکھتے ہیں اور جماعت اسلامی کے ماضی و حال سے اچھی طرح باخبر ہیں! ہاں! یہ ہو سکتا ہے کہ اس کتاب کو پڑھ کر، دو چار ارکان ڈاکٹر صاحب کی طرح جماعت سے علیحدگی اختیار کر لیں! مگر نشر ماشاء اللہ العزیز، ان کی اور دوسرے ناصحین کی یہ تمنا پوری نہیں ہو سکتی کہ اس قسم کی کتابوں کا مطالعہ جماعت اسلامی کی صفوں میں عام انتشار پیدا کر دے گا اور اس کے بیشتر ارکان "اصلاح" کے نام پر سرکشی اور بغاوت پر اتر آئیں گے جیسے ایسے ہیں جو کسی کی بھی یہ تمنا ہو انشاء اللہ پوری نہ ہوگی!

ڈاکٹر صاحب موصوف نے ۱۹۴۷ء یعنی تقسیم ہند سے پہلے تک کی "جماعت اسلامی" کی بہت کچھ تعریف و توصیف کی ہے کہ وہ اپنے مقصد وجود اور اساس تکوین پر قائم تھی یہاں تک کہ اس کے ارکان میں صحابہ کرام کے دینی جذبہ کی جھلک پیدا ہو گئی تھی ——— مگر ڈاکٹر صاحب کو اس کا علم بھی ہے کہ اس دور میں بھی ناقدین نے جماعت اسلامی کو ہدف طنز و ملامت بنایا ہے، اس کے ارکان پر "خوارج" کی پھبتی چست کی ہے، مولانا مودودی پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ "مہدویت" کے دعوے دار ہیں! بعض صاحبان رشد و تصوف نے "کشف" کے ذریعے یہ معلوم کر لیا کہ جماعت اسلامی سے خیر کی امید نہیں رکھنی چاہیے! اس قسم کی تنقید و طنز کو ڈاکٹر صاحب یقیناً غلط سمجھتے ہوں گے! جماعت کے بعض بعض ناقدین تو ڈاکٹر اسرار احمد سے علم و تقویٰ اور اخلاص و دینداری میں بہت بلند تھے، مگر ان کے اخلاص و دینداری نے کام کیا انجام دیا: یہ حضرات جماعت اسلامی پر طنز و تنقید دین کی بہت بڑی ضرورت سمجھتے تھے، اور اپنی جگہ مطمئن تھے کہ وہ اس طرح دین کی بڑی خدمت کر رہے ہیں ——— ۱۹۴۷ء کے بعد جماعت اسلامی کے موقف کا ڈاکٹر صاحب نے جو تجزیہ فرمایا ہے اور تحریک جماعت اسلامی کا تحقیقی مطالعہ کیا ہے اگر اس کی بابت یہ گمان "طنز و تنقید" کا کوئی گمان کرنے لگے، تو ایسا کرنے کا اُسے حق تو حاصل ہے۔ اور کیا عجب ہے کہ جس طرح جماعت اسلامی نے ۱۹۴۷ء سے پہلے کے موقف کو جماعت کے ناقدین نے غلط سمجھنے کی غلطی کی تھی، ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے ۱۹۴۷ء کے بعد کے موقف کا تجزیہ کرنے میں غلطی کی ہو۔

ڈاکٹر صاحب کے اس تجزیہ اور تحقیقی مطالعہ کا خلاصہ انہی کے لفظوں میں یہ ہے :-

> "بعینہٖ یہی کیفیت جماعت اسلامی پاکستان کے ساتھ پیش آئی وہ ایک خالص اصولی اور بین الاقوامی بلکہ
> انسانی بنیادوں پر دعوت کی علمبردار بن کر کھڑی ہوئی اور ابتداء میں اس نے نسلی، لسانی، وطنی اور علاقائی
> قومیتوں تو ایک طرف خود "مسلم قوم پرستی" جو ایک قومیت ہونے کے باوجود بین الاقوامیت کا رنگ بہرحال رکھتی تھی،
> کی شدت کے ساتھ مخالفت کی، لیکن اس کی یہ شان زیادہ سے زیادہ پانچ سات سال قائم رہ سکی، اس کے
> بعد اس نے بھی پاکستان میں آکر مسلم قوم پرستی کا لبادہ اوڑھ لیا، وائے!
>
> خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود (صفحہ ۱۱۱)

اس کتاب میں جماعت کے لٹریچر اور خاص طور سے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریروں کے اقتباسات درج کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ ان میں تضاد پایا جاتا ہے، یہاں تک کہ ــ

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا

مولانا مودودی ہوں یا جماعت اسلامی ان میں سے کوئی بھی معصوم نہیں ہے، اس لئے فکر ورائے اور عمل کی غلطی کا صدور کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے۔ افراد اور جماعتوں کے سیرت وکردار اور قول وعمل میں دیکھنے کی بات یہ ہے کہ غلبہ کس چیز کا ہے، خیر کا یا شر کا؟ اور اسی غالب کے پیش نظر اُن کے اچھے اور بُرے ہونے کا حکم لگایا جاتا ہے۔

انگریز کے دور میں متحدہ ہندوستان میں اقامتِ دین کے لئے جماعت نے جو طریق کار انتخاب کیا تھا وہ درست تھا، اس وقت یعنی ۱۹۴۱ء اور ۱۹۴۶ء میں کسی کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہ آتی تھی کہ انگریز کسی مزاحمت کے بغیر اپنا بوریہ بستر باندھ کر ہندوستان سے چلا جائے گا اور اُس کا جانا اور ہندوستان کا تقسیم ہو کر پاکستان کا بن جانا، ایک ہی ساتھ وقوع میں آئے گا! پاکستان بن جانے کے بعد جماعت اسلامی کو بالکل نئے حالات کا سامنا کرنا پڑا، یہاں سب سے پہلا سوال یہ سامنے آیا کہ پاکستان کا دستور کیسا ہونا چاہئے؟ اس صورت میں جماعت اسلامی دستور کے مسئلہ کو نظر انداز کر کے (کہ چاہے وہ دینی ہو یا لادینی) صرف معاشرے کی اصلاح میں لگی رہتی کہ جب پاکستان کا معاشرہ خالص اسلامی ہو جائے گا، اور خود ارکان جماعت تزکیہ نفس کی مطلوبہ کیفیت کو حاصل کر لیں گے، اُس وقت دستوری مسائل اور حکومت وسیاست کے معاملات پر توجہ کی جائے گی! اگر جماعت ایسا کرتی تو وہ اپنی اس غفلت وتساہل اور غلط اندیشی پر اللہ تعالیٰ کے یہاں جواب دہ ہوتی!

متحدہ ہندوستان میں جماعت نے انگریزی حکومت کو خطاب نہیں کیا، اسمبلی کے انتخابات میں حصہ نہیں لیا، کوئی جلوس نہیں نکالا، پریس کانفرنسیں منعقد نہیں کیں، مگر پاکستان میں اُسے ان تمام مرحلوں سے گزرنا پڑا! جو حضرات اپنی سادہ لوحی کے سبب شئون واحوال کی تبدیلی اور اُن کے تقاضوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں اُنہیں ۱۹۴۶ء کے بعد کی اور بعد کی جماعت اسلامی (پاکستان) کے قول وعمل میں تضاد نظر آتا ہے! اسی قسم کے "تضاد" کو اساس بحث وگفتگو بنا کر یہ کتاب لکھی گئی ہے! کوئی شک نہیں اس کتاب میں بعض دلیلیں بھی خاصی قوی ہیں، جماعت کے ماضی وحال کا تجزیہ بھی بڑے سلیقہ سے کیا گیا ہے، لکھنے کا انداز بھی خوب ہے، مگر مجموعی طور پر یہ کتاب ذہن وفکر پر یہ نقوش چھوڑتی ہے ــــ کہ

(۱) لکھنے والا جماعت اسلامی سے علیحدہ ہونے کے بعد شدید نفسیاتی کشمکش میں مبتلا ہے اور اُس کا ضمیر اپنی علیحدگی کو سندِ جواز دینے کے لئے بے چین ہے، یہ کتاب لکھ کر اُس نے اپنے زعم میں اس منظم دینی تنظیم سے علیحدہ ہونے کا "جواز" تلاش کر لیا۔

(۲) فاضل ناقد جب، سندی جمعیۃ طلبہ کے رکن تھے، اُسی وقت اُن کے رفقاء نے اُن کے مزاج کی کیفیت معلوم کر لی تھی کہ وہ کسی تنظیم میں گمنام رکن کی حیثیت سے کام کرنا، اپنی "خودی" کی توہین سمجھتے ہیں اور جس تنظیم میں بھی نوجوان کی شخصیت کو خاص اہمیت نہیں دی جائے گی، اس تنظیم سے وہ زیادہ دنوں تک وابستہ نہیں رہ سکتے، اُن کی ذہانت اپنا اظہار اور نمود وجلوہ گری چاہتی ہے۔

(۳) صاحب موصوف کسی مقصد کے حصول کے لئے اُس کے ایک ہی بندھے ٹکے "طریق کار" پر نگاہ رکھتے ہیں اور حالات کی تبدیلی کے سبب طریق کار کو جن مختلف مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے انہیں نظر انداز فرما دیتے ہیں! اس کی تو انہیں مشق ہے کہ ہر مسئلہ کی منطقی چیر پھاڑ کر کے رکھ دیں اور جہاں تک تحریر وگفتگو کا تعلق ہے تجزیہ وتشریح کا حق ادا کر دیں مگر مسائل کے عملاً برتنے والوں کو واقعات کی دنیا میں جن مختلف حالات سے سابقہ پڑتا ہے ان شئون واحوال کے تقاضے ڈاکٹر صاحب کی نگاہ سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔

"اقامتِ دین" کا کام ہر ملک اور خطہ میں ایک ہی انداز پر کیسے ہو سکتا ہے کوئی احمق ہی ہوگا جو امریکہ میں جا کر تبلیغ اسلام کا آغاز "حکومت الٰہیہ" کے مطالبہ سے کرے گا! مگر انڈونیشیا، سوڈان، اور مصر وپاکستان میں "حکومت الٰہیہ" کے لئے جدوجہد نہ کرنا، دینی نقطہ نگاہ سے بہت بڑی غفلت ہوگی! مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے متحدہ ہندوستان میں حالات کے لحاظ سے "اقامتِ دین" کے طریق کار سے بحث کی تھی، پاکستان بن جانے کے بعد حالات ہی بدل گئے، اس لئے اُن کی تقریر وتحریر کا بالکل وہ انداز کیسے رہ سکتا تھا۔ حالات کی تبدیلی پر نگاہ نہ رکھنے کے سبب مولانا موصوف کی تحریروں میں ناقدین کو "تضاد" نظر آتا ہے، بلاشبہ بعض اوقات حالات کے لحاظ سے دینی احکام میں تغیر واقع ہو جاتا ہے۔ پھر

مولانا مودودی کی تحریروں میں کہیں کہیں لفظی تضاد کا ثبوت بھی مل جاتے تو اس سے اُن کی وہ اصل دعوت تو مجروح نہیں ہو جاتی جس کو وہ ۴۸ سال سے پیش کر رہے ہیں اور کوئی بڑی سے بڑی مصیبت اور آزمائش اُن کی عزیمت و استقامت میں لچک پیدا نہیں کر سکی، اور اقامتِ دین کے بارے میں اُن کا ٹھیک وہی موقف ہے جو اس تحریک کے روزِ آغاز میں تھا۔ اُن کی دعوت و تحریک کی اصل متاع "تضاد" نہیں استقامت ہے۔ کسی پھولوں سے بھرے ہوئے باغ میں کہیں کہیں، خار و خس بھی اُگ آئیں تو اُس باغ کو "خارزار" کہنا کیا واقعہ کی غلط ترجمانی نہ ہوگی۔

اس سلسلہ میں ہم جن چند واقعات کا ذکر کر رہے ہیں، اُن سے تشبیہ و مماثلت ہرگز مقصود نہیں ہے ——— بلاتشبیہ عرض ہے کہ مکہ اور مدینہ میں دعوتِ حق اور اُس کے طریق کار اور لوازم بالکل ایک ہی جیسے نہیں ہیں، بعض مستشرقین نے اپنی کم فہمی کے سبب مدنی دور میں صلح و جنگ، سفارت، صلحنامے، تعزیری حدود کے اجراء وغیرہ کو دیکھ کر یہ حکم لگا دیا کہ ہجرت کے بعد پیغمبرِ اسلام کی زندگی بدل گئی تھی، اور آپ کے یہاں بادشاہت کا رنگ آگیا تھا (معاذ اللہ) جو کوئی شئون و احوال کی تبدیلی کو نظر انداز کر دے گا، وہ نقد و تبصرہ میں مستشرقین جیسی غلطی کا ارتکاب کرے گا!

مکی زندگی میں معاشرتی مقاطعہ تک کو شعب ابی طالب میں گوارا کیا گیا۔ مگر مدینہ میں بنو نضیر اور بنو قریظہ کے ساتھ جلاوطنی اور قتل کا معاملہ کیا گیا، مکہ میں یہ حکم کہ ——— اصبروا یاآل یاسر ——— (اے آلِ یاسر صبر کرو) مگر مدینہ میں تلوار کا جواب تلوار سے دیا گیا، مکہ اور مدینہ میں جو طریق کار کی تبدیلی ملتی ہے، اُس میں ذرہ برابر تضاد نہیں ہے، حالات کے تحت وہ طریقے اللہ تعالیٰ کے حکم اور دین کو غالب کرنے کے لئے ہی اختیار کئے گئے تھے۔

ہاں! نیک مقصد کے حصول کے لئے وہ "طریق کار" ناجائز ہے، جس پر "بدعت" کا اطلاق ہوتا ہو یا اُس کے سبب کوئی اخلاقی مضرت و قباحت وجود میں آتی ہو اور دین کا اصول ٹوٹتا ہو۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اور اُن کے بعض رفقاء جماعتِ اسلامی سے علیحدہ ہونے کے بعد جس "مزاج و فکر" کو اپنانا چاہتے ہیں ——— اُس کی بس ایک مثال یہاں پیش کی جاتی ہے اور حقیقتِ حال کے سمجھنے کے لئے بس ایک مثال ہی کافی ہے ——— انگریز کی حکومت آئی تو دیسی سیاہ روشنائی کی جگہ طرح طرح کی "روشنائیاں" جو اُس زمانہ کے جدید سائنٹفک انداز پر بنائی جاتی تھیں، عوام میں رواج پا گئیں، اور سرکنڈے اور واسطی قلم کی بجائے "ہولڈر" استعمال ہونے لگے ——— مگر بعض علماء اور مشائخ نے ہولڈر اور انک کے استعمال کو مکروہ سمجھا اور واسطی قلم اور دیسی سیاہ روشنائی استعمال کرنے کو اپنا معمول بنا لیا ——— مگر اس "معمول" پر خود اُن کے معتقدین عمل پیرا نہ رہ سکے اور آج ہولڈر، فاؤنٹین پین اور ولایت کی بنی ہوئی روشنائیاں (انک) ہر عالم و صوفی کسی دینی و شرعی قباحت کے بغیر استعمال کرتا ہے! یہی وہ مزاج اور فکر ہے جسے دینی مقصد کے حصول کے لئے اُن طریقوں میں جو حالات کے لحاظ سے اختیار کئے جاتے ہیں، "دنیا داری" نظر آتی ہے۔

جماعتِ اسلامی پاکستان نے "اقامتِ دین" کے لئے جن طریقوں کو استعمال کیا اُس کے سمجھنے کے لئے ایک مثال درج ذیل کی جاتی ہے:-

دو مسلمان ہیں دونوں کے دونوں صوم و صلوٰۃ کے پابند، گناہوں سے مجتنب اور دیندار ہیں اُن میں سے ایک زیادہ وقت مسجد میں گزارتا ہے، فرض اور مسنون نمازوں کے علاوہ نوافل کثرت سے پڑھتا ہے! اس مسجد کے قریب شراب کی دکان ہے یہ دیندار مسلمان انتہائی جذبۂ نفرت کے ساتھ اس دُکان کے پاس سے گزر جاتا ہے اور مسجد میں جا کر صلوٰۃ و اوراد اور تلاوتِ قرآن میں مشغول ہو جاتا ہے ——— دوسرا شخص پہلے شخص کے مقابلے میں نوافل بہت کم پڑھتا ہے مگر وہ محلہ میں وعظ و تقریر اور انفرادی ملاقاتوں کے ذریعہ شراب کی نفرت لوگوں کے دلوں میں پیدا کرنے کی جدوجہد کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے مسلمانوں کو ڈراتا ہے۔ انہی دنوں یہ مرحلہ بھی آجاتا ہے کہ محلہ میں جو کوئی "پنچ" ووٹوں کے ذریعہ چنا جائے گا اُسے اختیار حاصل ہوگا کہ محلہ میں کسی دکان، ادارے یا کاروبار کو معاشرے کے لئے مضرت رساں پائے تو اُسے اپنے اختیار سے بند کر دے! وہی شخص جو شراب کے خلاف جدوجہد کر رہا تھا وہ ایک خدا ترس مسلمان سے اس بات کا حلف لیتا ہے کہ اگر وہ ووٹوں کے ذریعہ "پنچ" بن گیا، تو شراب کی دکان کو بند کر دے گا۔

اس شخص کے وقت کا اب خاصہ حصہ "پنج" کے انتخابات کی جد و جہد میں صرف ہوتا ہے، اس کے لئے وہ جلوس نکالتا ہے، اشتہارات اور پمفلٹ شائع کرتا ہے پریس میں اپنے بیانات چھپواتا ہے، چندہ جمع کرنے کے لئے اُسے اپنے گماشتے بھی مقرر کرنے پڑتے ہیں، پولیس والے اس کے کسی مظاہرہ کا فوٹو بھی اخبارات میں چھاپ دیتے ہیں، اس مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے محلہ کے بعض ناپسندیدہ لوگوں تک سے تعاون کرنا پڑتا ہے۔ لاؤڈ اسپیکروں پر انتخابات کے اعلانات بھی ہوتے ہیں، ان جلسوں میں تقریروں کا موضوع "صوم و صلوٰۃ" نہیں "انتخابات" ہی ہوتے ہیں۔ جن کو کوئی چاہے تو خالص سیاسی تقریریں کہہ سکتا ہے۔

انتخابات سے ایک دن پہلے تک حالات بہت سازگار تھے، مگر دونوں مات سرمایہ داروں نے ووٹ خریدنے اور انتخابات میں "دینی طبقہ کا نمائندہ" ہار گیا ——— یا یہ ہوا کہ وہ شخص کامیاب تو ہو گیا، مگر کامیاب ہو جانے کے بعد، اس نے "شراب خانہ" بند کرانے کا جو وعدہ اٹھایا تھا، اس سے پھر گیا اور اپنے حلف اور وعدے کی غریب کارانہ تاویلیں اور توجیہیں کرنے لگا!

اس شخص نے "پنج" کے انتخابات کی جس مہم میں حصہ لیا تھا اس کا مقصد "شراب کی بندش" تھی۔ — یہی نیک مقصد کے لئے اس سب نے یہ پاپڑ بیلے تھے اور اس کام میں اپنا وقت، پیسہ اور توانائیاں خرچ کی تھیں ——— "تبلیغی جماعت" کے نقطۂ نظر سے، اور شاید ہمارے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا بھی نقطۂ نظر یہی ہو، وہ شخص جس نے "انتخابات" کی اس مہم سے کوئی سروکار نہیں رکھا اور اپنا زیادہ وقت صوم و وظائف و اوراد میں صرف کیا، صحیح معنی میں دیندار ہے ——— مگر وہ اسلام جس کا معاشرہ "نہی عن المنکر" اور "امر بالمعروف" کی اساس پر قائم ہوتا ہے، اس کے اعتبار کی نقطۂ نگاہ سے دوسرا شخص زیادہ "دیندار" ہے کہ اس نے "نہی عن المنکر" کے لئے جد و جہد کی، اور اس کی اس جد و جہد میں جو وقت صرف کیا وہ عبادت ہی میں گیا، اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لئے ہی اس نے یہ مشقت اٹھائی، اس کے اپنے نفس کی لذت اور کوئی ذاتی منفعت اس جد و جہد میں شریک نہ تھی، اس بڑے مقصد کے حصول کے لئے اسے بعض ایسی باتیں بھی گوارا کرنی پڑیں، جو اباحت سے زیادہ کراہت کا درجہ رکھتی ہیں۔

اس پہلے شخص کے یہاں جو معاشرتی مسائل اور "نہی عن المنکر" اور "امر بالمعروف" سے متعلق کوئی سروکار نہیں رکھتا، فکر و خیال کی یک رنگی نظر آتی ہے اس کے معمولات میں کتنی یکسانی پائی جاتی ہے، زندگی کی ایک نہج ہے کسی منکر کے مقابلہ میں کوئی تصادم اور مزاحمت نہیں، ٹھاٹ باٹ اور شان کی بجائے کبوتر و قمری جیسی صاف ستھری اور بے نفس زندگی جس میں عزیمت کی خاصی کمی محسوس ہوتی ہے۔

دوسرے شخص کے یہاں دین کا ایک مخصوص و محدود نقطۂ نگاہ رکھنے والوں کو سیاست اور دنیا داری نظر آئے گی اور شاید وہ یہی کہیں گے کہ اس شخص نے تو اپنی تقریر میں یہ کہا تھا کہ فساق و فجار سے صالح اور دیندار لوگوں کی دوستی اور مفاہمت ہو ہی نہیں سکتی مگر اس انتخاب میں اس شخص نے نا معقول اور فاجروں سے ووٹ حاصل کرنے کے لئے رابطہ قائم کیا، اس کے بیانات اخبار میں شائع ہوتے اور فوٹو بھی، نیک کام کی شہرت دل میں ریا پیدا کرتی ہے اور اخلاص کی کیفیت ضائع ہو جاتی ہے ——— انتخابات کی مہم کے بعد اس شخص کا پہلا سا دینی رنگ نہیں رہا، خشیت و انابت کی جگہ سیاست اور مصلحت نے لے لی ہے! یہ شخص صوم و صلوٰۃ کا تو اب تک بیشک پابند ہے، مگر ان فرائض کی ادائیگی بس "قانونی" اور "رواجی" ہی رہ گئی ہے ......!

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اپنی کتاب میں جماعت اسلامی پر تصوف، خشیت و انابت کی کمی، نو مسلمانہ احساس کے خاتمہ، سیرت و کردار کے انحطاط کے جو الزامات لگائے ہیں، ان سب کے جوابات اس مثال میں موجود ہیں، جو ہم نے ابھی ابھی آپ سے کہی ہے!

مولانا مودودی کی تحریروں میں "نو مسلمانہ زندگی اور نسلی مسلمان" وغیرہ کی جو اصطلاحیں پائی جاتی ہیں، ان کے ڈاکٹر صاحب نے بحیثیت لفظی معنی لئے ہیں، حالانکہ بعض الفاظ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے خالص "لغوی معنی" نہیں بلکہ حسن و قبح کے اظہار کی شدت مراد ہوتی ہے۔ قرآن کریم کی اس آیت :-

"من یقرض اللّٰہ قرضاً حسناً"

میں کہ "قرض" کے لفظ سے واقعی وہی معروف "قرض" مراد ہوگا، جو ایک ضرورت مند کو دیا جاتا ہے؟ کیا اس آیت کی بنا پر ہم اللہ تعالیٰ کو "مقروض" کہہ سکتے ہیں (معاذ اللہ) اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے "انفاق فی سبیل اللہ" کی کمال درجہ کی تعریف فرمائی ہے کہ اُسے "قرض" سے تعبیر کیا ہے، اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی راہ میں مال و دولت خرچ کرنے والوں کی انتہائی قدردانی کی ہے (ا) حدیث شریف میں جیسا آیا ہے کہ ـــــ جس کے پاس امانت نہیں، اُس کے پاس ایمان نہیں ـــــ تو جو کوئی امانت میں خیانت کرتا ہے کیا اس فعل کے سبب وہ غیر مومن یا کافر ہو جاتا ہے؛ اس حدیث میں "خیانت" کی شدت مضرت کو اس پیرایہ میں بیان کیا گیا۔ (۲) ایسے ہی . . . . . کہ جب وقت مسلمان خیانت کا ارتکاب کرتا ہے تو اس وقت اس کی حالت ایسی ہوتی ہے جیسے اس کے اندر ایمان کی صفت ہی باقی نہیں رہی، اگر اس کا اللہ تعالیٰ پر ایمان ہوتا تو وہ امانت میں خیانت نہ کرتا۔

مولانا مودودی نے "نسلی مسلمانوں" کو "کافر" کب بتایا تھا، اور جب انہوں نے جماعت اسلامی کے قیام کے وقت "کلمۂ شہادت" پڑھ کر تجدید ایمان کی تھی، تو اس وقت انہوں نے یہ کب کہا تھا کہ آج سے پہلے میں غیر مومن تھا اور کفر کی زندگی بسر کر رہا تھا؟ افسوس ہے کہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی ذہانت لفظ و معانی کے اس انتساب میں "عجیب" نظر آتی ہے، جیسے انہوں نے بصد جی جذبہ کیف تھر "اعتراض برائے اعتراض" کی ٹھیک ٹھیک کرنا چنے اور سمونے کی کوشش فرمائی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے "قرارداد مقاصد" کی تسوید، تشکیل اور دستور سازی وغیرہ مسائل و مراحل میں جماعت اسلامی کے بارے میں یہ تاثر اور تصور دینے کی کوشش کی ہے کہ وہ دوسری جماعتوں کی سعی اور جدوجہد کا کریڈٹ بھی خود ہی لینا چاہتی ہے اُس کے بہت اندازے غلط ثابت ہیں اور اپنے نقطۂ نظر کے بارے میں مبالغہ آمیز رائے رکھتی ہے ہم ان اعتراضات کے ہر جزو پر تفصیل سے بحث کریں گے تو بات بہت لمبی اور یہ تنقید خاصی طولانی ہو جائے گی، ہم اس سلسلہ میں صرف اتنا عرض کرنا چاہتے ہیں کہ پاکستان میں اسلام اور جمہوریت کے قیام کی جدوجہد میں جماعت اسلامی رہی ہے، دوسرے افراد اور جماعتوں کی مساعی بھی اپنی جگہ ثابت اور مسلّم ہیں، مگر جماعت اسلامی کا حصہ اس عظیم مہم میں سب سے بڑھ چڑھ کر رہا ہے اور ملک کے دانشوروں کا خاصہ بڑا طبقہ یہ محسوس کرتا ہے . . . . کہ جماعت اسلامی، پاکستان میں اقامت دین کی اصل داعی ہے؛ اور اس حقیقت سے کوئی منصف مزاج شخص انکار نہیں کر سکتا کہ آج کی اسلامی دنیا میں ہر طرف سے یہ جو نعرہ بلند ہو رہا ہے کہ اسلام ایک مذہب نہیں بلکہ ایک مکمل دستورِ حیات ہے، جس سے زندگی کے کسی گوشہ اور شعبہ کو مستثنیٰ نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام کے اس بھولے ہوئے سبق کو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اُمت کو یاد دلایا ہے اور ان کے صریر خامہ کی بازگشت علم و فضل کے ایوان اور دانشگاہوں سے آرہی ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کو کاش! اس انداز پر سوچنے کی بھی توفیق نصیب ہوتی ـــــ کہ خود وہ آپ کے رفقاء اور تبلیغی جماعت سے جو حضرات وابستگی رکھتے ہیں، جس طرح صوم و صلوٰۃ اور دوسرے فرائض و سنن کی پابندی کرتے ہیں اور برائیوں سے مجتنب رہتے ہیں اسی طرح جماعت اسلامی کے ارکان بھی دینی احکام کو بجا لاتے ہیں اور منکرات میں مبتلا نہیں ہیں! رہا اخلاص فی العمل اور کسی فریضہ کو حسن و خوبی کے ساتھ بجا لانا، تو اس کی کوئی حد و انتہا نہیں، اور کوئی شخص اس کا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اُس نے دینی فریضہ کی ادائیگی کا ایسا حق ادا کر دیا کہ اُس میں حسن و خوبی اور کمال کی کوئی گنجائش ہی نہ رہی ـــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر عبادت گزار اور کون ہو سکتا ہے، مگر نطق پر مستہ وحی و الہام سے یہ الفاظ سُنے گئے:-

"ما عبدناک حق عبادتک"

دلوں کا حال تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے، جو شخص نماز پڑھ رہے ہیں اور ظاہری ارکان کو سنت کے مطابق ادا کر رہے ہیں ــــ تو اس کا فیصلہ کرنا اور اس قسم کا حکم لگانا بہت دشوار ہے کہ کس کی نماز میں اخلاص کی کتنی کمی پائی جاتی ہے! اس طرح کا احتساب دینی نقطۂ نظر سے پسندیدہ نہیں ہے! ہاں اُس شخص کو غیر مخلص اور منافق کہا جائے گا، جو ایک طرف نماز بھی پڑھتا ہے اور دوسری طرف منکر و فحش میں مبتلا ہے۔

جماعتِ اسلامی والوں نے جلوس بھی نکالے ہیں، پولیس کا نقشہ نسیں بھی کی ہیں اور اشتعال انگیز باتیں بھی کرتے ہیں ــــ مگر ان تمام مصروفیات میں وہ نماز سے غافل نہیں رہے، ڈاکٹر صاحب یہ نہیں کہہ سکتے کہ گزشتہ کے بعد جماعتِ اسلامی خدانخواستہ کسی رکن دین کی منکر ہوگئی ہے یا جماعت کے ارکان نماز سے بے پرواہ ہوگئے یا روزہ رکھنے کے لئے رخصتیں ڈھونڈتے ہیں ــــ اور اُن کے اندر حلال و حرام کی تمیز نہیں رہی! ایسی کوئی کوتاہی اور غفلت ارکان جماعت میں نہیں پائی جاتی، اگر ہوتی تو ڈاکٹر صاحب اپنی اس کتاب میں اس کی نشاندہی لازماً فرماتے اور اس کا ذکر ضرور کرتے! جماعت اسلامی کے ارکان اور معروف دیندار اور مذہبی لوگوں کی دینی زندگی قریب قریب ایک ہی جیسی ہے، اس زندگی میں جو اتنی بات اُن کے یہاں زیادہ ہے کہ وہ اللہ کے دین کو قائم کرنے کے لئے "سیاست و حکومت" کے مسائل سے بھی سروکار رکھتے ہیں! اور یہ امور ایسے نہیں ہیں، جن پر "منکر" کا حکم لگایا جا سکے، بادشاہوں، مطلق العنان حاکموں اور طالبانِ جاہ و دولت نے سیاست و حکومت کے معاملات کو بہت کچھ گندہ اور بدنام کر دیا ہے، مگر "اقامتِ دین" کے لئے ان شعبوں سے بہت کچھ کام لیا جا سکتا ہے اور حدود اللہ حکومت کے بغیر جاری ہو ہی نہیں سکتے! اگر "حکومت" کوئی بری یا لایعنی بات یا دینی ترقی کی راہ میں رکاوٹ کا سبب ہوتی، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام اس سے اجتناب فرماتے، حالانکہ یہ بات "تحصیلِ حاصل" ہونے کی حد تک روشن اور واضح ہے کہ حضورؐ نے اسلامی ریاست کی بنا ڈالی اور اس مقدس کام کو تکمیل تک پہنچایا اور خلافت راشدہ کا پورا دور اس کا ضمیمہ اور تتمہ ہے! دین کو پھر اس زمانہ جیسا عروج کبھی نصیب نہیں ہوا اس کا سبب اخلاص و صداقت اور للّٰہیت کے علاوہ حکومت کے نظامِ زندگی کے ان شعبوں پر قبضہ و اختیار ہے، جن سے معروف قائم ہوتا ہے اور منکرات پر پابندیاں لگائی جاتی ہیں۔

جماعت اسلامی نے ملک میں دینی انقلاب لانے کے لئے ہر امکانی جدوجہد کی ہے! اسمبلیوں کا "انتخاب" کس قدر گندی سیاست ہے، مگر جماعت نے اس کی "تطہیر" کی، اُس نے دنیا کو دکھا دیا کہ دل میں خوفِ خدا اور نیت نیک ہو، تو پھر "انتخابات" کو پاکیزہ بنایا جا سکتا ہے! جماعت کو اگر صحیح اطلاع ملی ہے کہ جماعت کے کسی کارکن یا متعلق نے "انتخابات" میں کوئی بے عنوانی کی ہے تو اس پر سخت تادیبی احتساب کیا ہے، کراچی کے انتخابات میں یہاں کے عوام نے اس حقیقت کا مشاہدہ کیا ہے کہ جماعت نے اپنے امیدوار کی شکست گوارا کر لی ہے، مگر بوگس ووٹوں کی پیشکش کو ٹھکرا دیا! یہ احتیاطیں اور اخلاقی پابندیاں، کیا خوفِ خدا اور خشیتِ الٰہی سے خالی ہیں۔

مزدور ہوں یا طلباء، عوام ہوں یا خواص جو بھی جماعت کے لٹریچر اور اس کے ارکان سے متاثر ہوا ہے اُس کی زندگی میں دینی انقلاب پیدا ہوا ہے، ہم نے بی اے اور ایم اے کے نوجوان طلباء کو جو جماعت سے متاثر ہیں، رمضان کے مہینہ میں اعتکاف کرتے دیکھا ہے! جماعت کا لٹریچر کردار سازی میں اپنی مثال آپ ہے! کتنے ملحد، کمیونسٹ، مغرب زدہ، مذبذبین اور فسق و بدعت کے مارے ہوئے تھے، جن کو جماعت اسلامی کی کتابیں پڑھ کر توبہ کی توفیق نصیب ہوئی اور اُن کی تاریک زندگیاں، ایمان و اخلاق سے روشن ہوگئیں۔

"جماعت" کے شعبۂ خدمتِ خلق نے لاکھوں مریضوں اور ہزاروں ضرورت مندوں کی خدمت کی ہے! جماعتِ اسلامی کے جلسوں میں جیسا سلیقہ اور خوش انتظامی پائی جاتی ہے وہ "مغرب زدوں" کی اس طنز کا بھرپور جواب ہے کہ دیندار لوگ بے سلیقہ ہوتے ہیں اور کسی تنظیم کو نہیں چلا سکتے!

جماعتِ اسلامی کے ارکان کی قربانی اور استقامت کی شہادت پاکستان کے جیل خانے دیں گے، ان خیر پسند لوگوں نے صعب و شدید مشکلات

کا مقابلہ جس صبر و تحمل کے ساتھ کیا ہے وہ کس قدر ایمان افروز اور جرأت آموز ہے! ۱۹۶۳ء میں جماعت اسلامی کا جو سالانہ اجلاس لاہور میں ہوا تھا اور اس میں قتل و اقدام قتل اور لوٹ مار کے جو دردناک واقعات پیش آئے تھے، اُس وقت جماعت نے جس اعلیٰ کردار کا مظاہرہ کیا تھا، اس نے پاکستان کی تاریخ میں زرّین اوراق کا اضافہ کیا ہے اور دنیا کے سامنے ایک ایسی مثال قائم کی ہے جو ہر جہت سے غیر معمولی اور عظیم ہے۔

دستور سازی ہو، عائلی قوانین ہوں، فیملی پلاننگ ہو، فتنۂ انکارِ حدیث ہو، کمیونزم، مغرب زدگی، وطن پرستی اور شرک و بدعات ہوں، غرض ہر محاذ پر جماعت اسلامی کے اکابر اہل علم اور ارباب قلم نبرد آزما نظر آتے ہیں!

دین کے خلاف جب بھی پاکستان میں کوئی فتنہ اٹھتا ہے، جماعت اسلامی اس کے خلاف آواز اٹھاتی ہے، ملک کی تمام پارٹیوں اور گروہوں سے آگے رہتی ہے۔ اور فعال تر نظر آتی ہے ـــــ اُس کے موقف پر یہ شعر صادق آتا ہے ـــ

آ گئے تھے بجلیوں کی زد میں سب اہل چمن
میں نے اپنے آشیانے کو مقابل کر دیا

حیرت ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو مولانا مودودی کی تحریروں میں لفظی تضاد تو نظر آگیا مگر جماعت اسلامی کی اتنی نمایاں خوبیاں اور روشن اچھائیاں دکھائی نہ دیں! جب کسی فرد اور جماعت سے کسی کو کد ہو جاتی ہے، تو پھر دل و نگاہ عیب جُو اور عیب بیں ہو جاتے ہیں! محاسن اور خوبیوں سے صرف نظر اور کمزوریوں کی تلاش و جستجو!

۱۹۴۷ء تک جماعت اسلامی کا متحدہ ہندوستان میں جو دینی رول رہا ہے، ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اُس کے بہت مداح ہیں، اُنہیں شکایت پاکستان کی جماعت اسلامی سے ہے کہ وہ اپنی بنیادی پالیسی سے ہٹ گئی ہے! حالانکہ جماعت اسلامی جس مقصد کے لئے وجود میں آئی تھی، وہی مقصد آج بھی جماعت کے فکر و عمل کا محور ہے! ڈاکٹر صاحب کو خدا کا واسطہ دے کر ہم عرض کرتے ہیں، وہ بتائیں ـــ کہ جماعت اسلامی نے تقسیم ہند کے بعد آخر کس دینی قدر کو بدل دیا ہے اور کس منکر میں مبتلا ہو گئی ہے، ہمارا یقین ہے کہ وہ کسی ایسی برائی، غلط کاری اور بے عنوانی کی نشاندہی نہیں کر سکتے! اب رہا "انتخابات" اور دوسرے سیاسی مسائل سے جماعت کا عملی تعلق تو اُس کی حیثیت اصل مقصود کی نہیں، تدبیر اور وسیلہ کی ہے! جماعت نے یہ تمام استدیریں اقامتِ دین ہی کے کیلئے اختیار کی ہیں، اُس سے تدبیر اور اندازے کی غلطی ہو سکتی ہے، مگر اُس سے کوئی ایسی غلطی سرزد نہیں ہوئی، جس نے معاشرے میں گمراہی پھیلائی ہو یا اُس کے سبب ذہن و فکر کسی بے دینی اور ضلالت کے عقیدے پر جم ہو گئے ہوں صدارتی انتخاب کے سلسلہ میں جماعت نے "اہون البلیتین" کے اصول کے تحت "عورت" کی حمایت کی تھی، اور دو ٹوک الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ ناگزیر حالات کے تحت اس ناپسندیدہ صورت کو گوارا کیا گیا ہے، اسلامی حکومت کا سربراہ مرد ہی کو ہونا چاہیے!

پاکستان کے شہروں، قصبوں اور بستیوں میں اس حقیقت کا واضح طور پر شاہدہ کیا جا سکتا ہے کہ جو لوگ جماعت سے متاثر ہیں، وہ دینی فکر اور اسلامی کردار کے حامل ہیں۔ جماعت سے قربت و نزدیکی، آدمی کو دین سے قریب کرتی ہے! ضعفِ ایمان و عمل کے اس دور میں جماعت اسلامی حقیقت میں دین و اخلاق کا مدرسہ بنا رہ ہے! جو لوگ اس کوشش میں لگے ہوتے ہیں کہ یہ "کشتی" کسی طرح "اندھیرا" ثابت ہو جائے وہ دین و اخلاق کی کوئی مفید خدمت انجام نہیں دے رہے ہیں!

مولینا مودودی کا بڑے سے بڑا مخالف بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ دین و اخلاق کے مسائل میں مولانا موصوف کا اسلوبِ نگارش اور طرزِ استدلال انتہائی دلکش اور سلامت روی کا سا گھنگ اور عصر حاضر کے دل و دماغ کو مطمئن کرنے والا ہے ـــــ

— مگر یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا ہے کہ جس عظیم مفکر اسلام کی تحریروں سے تبلیغ دین میں بہت مفید کام لیا جا سکتا تھا، اس کو جان کر نظر انداز اور DIS - CREDIT کیا جا رہا ہے جیسے مولانا مودودی کے معاملے میں اس بات پر ان حضرات نے ایکا کر لیا ہو کہ اپنے رسائل، اخباروں، درسگاہوں میں مودودی صاحب کی تفسیر کا کوئی اقتباس نہ آنے دیں گے، مولانا علی میاں کے "البعث الاسلامی" سے لے کر "المنبر" اور لاہور کے "میثاق" تک میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی تفسیروں سے یہی سلوک کیا جا رہا ہے — جب اپنے وجوہ کے دینداروں میں "تخریب" کی یہ صورت پیدا ہو جاتی، تو پھر گراں ہو رہا۔ ڈاکٹر اسرار احمد بھی اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں، اس گروہ میں بعض ایسے حضرات بھی ہیں جن کے دل کی سب سے بڑی تسکین جماعت اور مولانا مودودی کی خامیاں تلاش کرنا ہوتی ہے اور جماعت کی مخالفت کو جنہوں نے اپنا مشن بنا لیا ہے، جماعت کی ترقی کی خبر سے جن کو تکلیف اور جماعت کی پریشانی اور معصیت کی اطلاع سے جن کو خوشی ہوتی ہے۔

جماعت اسلامی کا لٹریچر پڑھ کر جو نوجوان دین سے قریب ہو رہے ہیں ڈاکٹر اسرار احمد کی یہ کتاب اُن کو کیا عجب ہے تذبذب میں مبتلا کر دے، اور جو نوجوان دین سے قریب ہو سکتے تھے وہ دین کی طرف آنے سے رک جائیں — یہ کارنامہ یہ کتاب انجام دے گی!

جماعت اسلامی اور مولانا مودودی پر قصور والیان کے علاوہ بعض دینی حلقوں سے جو بے بنیاد الزام تراشے گئے ہیں اور جس عنوان سے بدنام کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس نے جماعت اور مودودی صاحب کو "مظلوم" بنا دیا ہے، ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی یہ کتاب اس مظلومیت میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہی کر کے رہے گی۔

صبح الہام

از: خیام الہند سید جمال الدین حمید دہلوی — مرتب — الحمد دہلوی، ضخامت ۱۶۰ صفحات، قیمت چالیس روپے پچاس پیسے (علاوہ محصول ڈاک) ملنے کا پتہ: مکتبہ حمید ۵ - ای ۱/۲۳ ناظم آباد، کراچی

حضرت حمید دہلوی (۱۹۰۶ء - ۱۹۵۸ء) کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے، تقسیم ہند سے پہلے ہی موصوف ہندوستان گیر شہرت رکھتے تھے، اور اپنی مفکرانہ اور حکمت سے لبریز رباعیوں کے سبب خیام الہند کہلاتے تھے، حمید دہلوی کی ذات شعر و ادب کا مستقل انسٹیٹیوشن تھی، سینکڑوں نوجوان شاعروں نے ان سے استفادہ کیا، جن میں مندرجہ ذیل تلامذہ خاصے معروف ہیں۔

نازش حیدری، حکیم ہاشم جان کیف دہلوی، حکیم حبیب اشعر دہلوی، نیش جھنجانوی، الحمد دہلوی، شہاب دہلوی، کرار نوری، نور لدھیانوی، فقس دہلوی، اکبر ورانی، فرید جامعی، رشید الخیراتی، شبنم رضوی . . . . . .

یہ بھی واقعہ ہے کہ مولانا سیماب اکبر آبادی کی طرح حمید دہلوی کی شعری توانائیاں بہت کچھ دوسروں کے کام آئیں! انتہائی زود گو اساتذہ کے ساتھ اکثر و بیشتر یہی معاملہ پیش آتا ہے، مصحفی کو بھی تنگی معاش کے سبب اس مرحلہ سے گزرنا پڑا۔

حضرت حمید دہلوی مشاعروں کے شاعر نہ تھے، ان کی شہرت رسالوں میں چھپے ہوئے کلام سے ہوئی، یہ شہرت بہت پائیدار ہوئی ہے دہلی میں سر سید رضا علی جیسے اکابر ان سے ملنے کے لئے جایا کرتے تھے، مگر اس کمال فن کے باوجود حمید صاحب پریشان روزگار ہی رہے معاشی فراغت انہیں شاید کسی دور میں بھی میسر نہیں آئی — اپنے وطن میں اُن کا کیا حال تھا، اس شعر سے ان کی پریشانی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ؎

بہت ہی تنگ ہوں حمید فضائے دہلی سے — خدا پناہ میں رکھے بس اب یہاں سے چلے!

۱۹۳۱ء میں حمید دہلوی حیدرآباد پہنچے، وہاں ایک ۱۰ کے قریب قیام کیا مگر ان کی قسمت نے کہیں بھی یاوری نہ کی۔ پاکستان بننے کے بعد مشرقی پاکستان چلے گئے، وہاں کئی سال رہنے کے بعد کراچی تشریف لائے۔ دو بیویاں اور اُن کے بچوں کا پورا کنبہ ساتھ تھا، یہاں کی زندگی پریشانی ہی میں گذری، اپنی پوری زندگی کی داستان انہوں نے ایک شعر میں بیان کر دی ہے ؎ ہم نے تمام عمر حوادث میں کی بسر — کم ظرف تھے جو دامن ساحل میں آ گئے۔

حمید دہلوی کے کلام میں بڑی زندگی، توانائی اور رجائیت پائی جاتی ہے۔ کس اعتماد کے ساتھ فرماتے ہیں:—

ابھی ماحولِ عرفانِ ہنر میں پست ہے حمید
یکایک ہر بلند آواز پہچانی نہیں جاتی

یہ واقعہ ہے کہ اُن کی شاعری کی آواز بلند اور بہت بلند ہے، شعر گوئی میں اُن کا اپنا خاص آہنگ ہے، جس میں انفرادیت جگہ جگہ جھلکتی ہے! حمید نے ہمیشہ بلند فضا میں مشق پرواز کی ہے! اُن کے کلام کا مجموعہ اُن کے شاگرد جناب الکؔ دہلوی نے ترتیب دے کر شائع کیا ہے، جس پر ڈاکٹر اسلم فرخی نے دیباچہ لکھا ہے!

منتخب اشعار:—

تمہاری گرمیٔ محفل کے رنگ نے اُڑ کر — کہیں پناہ نہ پائی تو آفتاب بنا

وہ ڈھال کر شراب ذرا مسکرا دیئے — تو اور بھی نکھار دیا رنگ جام کا

یہ سوزِ غم ہے اس کو بڑا ظرف چاہیے — لاکھوں میں کوئی دل نظر آئے گا کام کا

جس قدر درد کی صورت میں سزا دے کم ہے — واقعی بے ادبی کی کہ ترا نام لیا

تمہاری راہ میں مٹ تو رہے ہیں — ثبوتِ زندگی دیں اور ہم کیا

اندازِ بہار بھی وحشت میں چاہیے — کتنے ہیں چاک میرے گریباں میں دیکھنا

جا تجھے مژدۂ وصال دیا — ہائے کیا بات کہہ کے ٹال دیا

اللہ رے یاد ایک سراپا جمال کی — صورت بھی اپنی بھول گیا ہوں میں نام کیا

چمن میں تو ہے جب تک کوئی غنچہ کھل نہیں سکتا — تری موجودگی میں کس کو دعویٰ لب کشائی کا

اس قدر لطف ہمہ رنگ کہ نیت نہ بھرے — ایک ہی جلوہ اگر کیجئے سو بار طلب

آشیاں اس شبِ تاریک میں ملنا مشکل — ہاں! اگر برق چمک جائے گلستاں کے قریب

کبھی جمع کر لیں گے پھر چار تنکے — اگر ہم سلامت نشیمن سلامت

حساب تذکرۂ شاہد و مئے کچھ بھی نہیں — کیا فرشتوں کو تعلق بھی ہیں الف لوی پر

نہ اذنِ شکوہ، نہ تابِ نظر، نہ قصدِ وفا — یہی ہے بندہ نوازی تو واہ بندہ نواز

یہ وقتِ شام، یہ پیمانۂ شرابِ طلوع — اک آفتابِ غروب، ایک آفتابِ طلوع

خلافِ وقت یہ تشریف آوری کیسی — طلوعِ صبح سے پہلے ہی آفتاب طلوع[1]

اک کُن نے دیا ترتیب اجزائے پریشاں کو — اک ہُو سے ہوئی آخر تکوینِ بشر برہم

یہی ہوتا ہے اشکِ خوں گرا کرتے ہیں آنکھوں سے — شبِ غم اور کیا تارے فلک کے ٹوٹتے ہیں

کہیں ہے دام، کہیں باغباں، کہیں صیاد — قفس کی طرح مقید ہوں آشیانے میں

میرے اسلوبِ بیاں سے کوئی انجمن میں نہیں — پھول ہی پھول ہیں کانٹے مرے دامن میں نہیں

---

[1] اس شعر نے فارسی کا ایک شعر یاد دلا دیا۔

یارم بہ خانہ آمد و جام شراب نیست — در حیرتم کہ صبح دمید آفتاب نیست

اب کے اس ڈھنگ سے ترتیب دئے ہیں تنکے
کوئی دیکھے تو یہ سمجھے میں نشیمن میں نہیں

لاکھ اسباب سکوں سینکڑوں جینے کے اصول
ایک ناموسِ محبت کا اگر پاس نہ ہو

حرم کی طرف پر اس درجہ جگت بھی نہیں اچھی
جادۂ ہم سے کوئی لغزشِ مستانہ ہو جائے

کچھ اور ہی آثار نظر آتے ہیں اب کے
کیفیتِ دل وہ ہے جو دیکھی نہ سنی تھی

بہت روز گلشن نشینی رہی
بس اب مستقل عزمِ پرواز ہے

ہزار اُن کے جلووں سے چشمک رہی ہے
نظر پھر بھی آمادۂ شک رہی ہے

پھر بھی چھٹکارا نہیں خوفِ اسیری سے مجھے
آشیاں ہوں میں جہاں تک طاقتِ پرواز ہے

ملتے ہی نظریں لبوں پر کھینچ کے دم آنے لگا
اُس کا کیا انجام ہوگا جس کا یہ آغاز ہے

میں درماندۂ تپشِ دوست کے بھی اب نہیں قابل
فلک نے گردشیں بھی چھین لیں میرے مقدر سے

سورج ہے، محرابِ کعبہ، ماہِ نو، قوسِ قزح
سو طرح سے یاد ہے اک تیری انگڑائی مجھے

ختم کر ہم پہ ہی اک ایک بلا اے شبِ ہجر
پھر نہ اس طرف کے پیدا کبھی اسباب ہوں گے

دُنیا جسے کہتی ہے بہارِ گل و لالہ
وہ مستی رنگیں مرے ساغر سے اڑی ہے

وہ حسن شگفتہ ہے بہر حال شگفتہ
جب دیکھئے ہونٹوں پہ ہنسی آئی ہوئی ہے

چمن والوں سے مجھ صحرا نشیں کی بود و باش اچھی
بہار آ کر چلی جاتی ہے ویرانی نہیں جاتی

یہ کیسی زندگی ہے کہ تیری طلب میں
کہیں دن گزارا، کہیں رات کاٹی

تصور میں گیسو تھے، آنکھوں میں آنسو
شبِ ہجر کاٹی کہ برسات کاٹی

"فقیر و شاعر" جس نظم کا عنوان ہے اُس کا یہ آخری شعر کس قدر اثر آفریں ہے۔

شعر از اپنی فطرت کے خلاف
تجھ پہ تحسین و ستائش بھی معاف

تمام غزلوں کے منتخب اشعار :-

یہ اشک بدامانی ہر وقت نہیں اچھی
کچھ دیر تصور بھی اے چشمِ تر آب اُن کا

نبض بیمار تھی نظر سوئے فلک، مہر بہ لب
چارہ گر خیر تو ہے، کچھ تو بتا کیا دیکھا

جو مستی میں گردش ترے مے آشام لیتے ہیں
ملائک عرش و کرسی کی طنابیں تھام لیتے ہیں

لوحِ فطرت پہ عجب چیز ہے "دیوانہ" بھی
یہی اک لفظ ہے عنوان بھی افسانہ بھی

تجھ سے مایوس کس طرح ہو جاؤں
زندگی ہے تو آسرا بھی ہے

چلتے بادل تھے، دن جوانی کے
بس ادھر آئے اور ادھر گزرے

پہلے یہی دو لفظ تھے دنیا کی حکایت
اب عشق و وفا کا کوئی مفہوم نہیں ہے

دوسرا رخ :-

طبع خاموش رہی اور سرِ بزمِ نشاط
آگ ...

"خاک میں پروانہ ملا" یہ ٹکڑا اس شعر میں کمزور ہے۔ "پروانہ خاک ہوگیا" یہاں اس مفہوم کی ترجمانی کا محل تھا۔

کیوں نہ وہ غیرتِ خورشید نمایاں ہوتا — صبح کے مشورے سے چاک گریباں ہوتا

"صبح کے مشورے" نے شعر میں ابہام پیدا کر دیا، "مشورے" کی "ی" نہ دبتی تو شعر میں شستگی پیدا ہو جاتی۔

اے اثرِ عیش کوئی حسن کوئی معاملہ — میں وہ بدبخت کہ میں نے دلِ ناکام لیا (ص ۲۹)

ممکن ہے یہ کتابت کی غلطی ہو کہ "عشق" کی بجائے "عیش" چھپ گیا!

مرکزِ ہستی عاشقانہ سے مطلب — تو اپنے تجاہل کی تعریف فرما (ص ۳۳)

مفہوم واضح نہیں ہوا، اس قسم کی "اشاریت" سے طبیعت میں گھٹن سی پیدا ہوتی ہے۔

ترے منہ سے احوالِ حسینہ کی تکذیب — وہ دلیل ہے اُس کی تعریف فرما

شعر کے اصل مفہوم ہی میں، قول تو کوئی لطف نہیں ہے، پھر یہ کہ محبوب احوالِ عاشق کی "تکذیب" کرتا ہے، عجیب اندازِ بیان ہے۔ اس کے علاوہ عروض کے اعتبار سے "تکذیب" صحیح استعمال ہوا ہے، مگر صوت و نغمگی ...... !!

مجھے بھی دیکھنا ہے میری ناکامی کہاں تک ہے — خدائے دوست! اب تو بھی طرفدارِ عدم ہو جا (ص ۳۶)

ایسے سطحی شعر انتخاب میں چھانٹ دینے چاہئے تھے!

گوشہ اُلٹ کے چہرے سے تم نے نقاب کا — دامن جلا دیا، نگہِ انتخاب کا (ص ۴۱)

"نگہِ انتخاب" کا دامن اور پھر اس کا "جلا دینا" —— تکلف ہی تکلف اور آورد ہی آورد!

ہم اشتیاقِ دید میں مبہوت سے رہے — حق چھین کر وہ لے گئے آنکھوں سے خواب کا

"مبہوت" سے آخر یہاں کس کیفیت اور احوال کی ترجمانی مقصود ہے! لہٰذا شعر بے لطف ہے!

نکل آئی وصال کی صورت — ور دقی الجمد نیک فال دیا (ص ۴۲)

جس غزل کا مطلع بے پناہ ہو —— فرماتے ہیں:—

جا تجھے مژدۂ وصال دیا
ہائے کیا بات کہہ کے ٹال دیا

اُس میں اتنا کمزور شعر پایا جائے!! —— ور دقی الجمد نیک فال دیا —— نومشقوں کا اندازِ بیان ہے۔

بہت قلیل تھی سرگرمیاں عناصر کی — مرکبات کا اک جوش تھا شباب نہ تھا (ص ۴۶)

"عناصر" "مرکبات" "بحران میں" "جوش آنا" یہ تو "فن طب" اور کیمسٹری کی اصطلاحیں ہیں! "قلیل" کے استعمال نے شعر کو اور بھی زیادہ کمزور کر دیا! "شباب" کی جو تعریف اس شعر میں کی گئی ہے، اس میں کوئی کیف نہیں! پھر شعر میں اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ "عناصر کی سرگرمیاں قلیل" کس طرح تھیں! اور تھیں، تو اس کا زندگی اور شباب نے کیا اثر قبول کیا۔

اک حشر آشنا دلِ انجام بیں میں تھا — گاہے جہاں میں محو، میں گاہے جنیں میں تھا (ص ۵۱)

مصرعۂ ثانی میں "شعریت" کا فقدان ہے۔

تیرے جلوؤں کو اس انداز سے مستور کیا — ہر فرشتے نے طوافِ دلِ رنجور کیا (ص ۵۳)

جلوؤں کو مستور کرنے کے بعد دل "رنجور" کیوں ہونے لگا، وہ تو "پرنور" ہو گیا، "رنجور" شعر میں لانے کی کیا تک تھی! "پرنور" کہنا چاہئے تھا۔

منظرِ عام سے جب وہ کسی صورت نہ ہٹے — چارہ ناچار نہیں حُسن پہ مغرور کیا

اس شعر میں "ابہام" کے سوا کیا رکھا ہے !

شب سے یہ صبح تک اس طرح گلستاں میں رہا — آنکھ غنچوں پہ رہی، ہاتھ گریباں میں رہا (ص ۵۵)

شب کی جگہ "شام" لاتے تو شعر زیادہ چست ہو جاتا ! پھر اس شعر میں وحشت کی جس کیفیت کا اظہار کیا گیا ہے وہ "فطری" سے زیادہ "مصنوعی" معلوم ہوتی ہے۔

بیکاں ستم سے آج ترا اک مقابل ٹوٹ گیا — دل ٹوٹنے ہی کے قابل تھا اچھا ہی ہوا دل ٹوٹ گیا (ص ۵۶)

"ترا اک مقابل ٹوٹ گیا" یہ ٹکڑا بہت کمزور ہے ! پھر یہ کیا کوئی مسلمہ ہے کہ "دل" محبوب کا مقابل ہوتا ہے، ایسے موقع پر "آئینۂ دل" لاتے تو بات بنتی !

مزہ دے جائے شاید ناشناسانِ محبت کو — کوئی چلتا ہوا فقرہ بھی افسانے میں رکھ دینا (ص ۶۲)

یعنی ایک آدھ چلتے ہوئے فقرے کے علاوہ باقی افسانہ کو "سپاٹ" اور "بے مزہ" ہی رہنے دینا ——— !! جناب سیماب اکبرآبادی کی مشہور غزل پر حمید دہلوی نے یہ غزل کہی ہے۔ سیماب فرماتے ہیں :-

وہ جس سے سمجھ جائیں رُوداد مرے غم کی
ایسا بھی کوئی ٹکڑا افسانے میں رکھ دینا

یہ قرینہ اور لطف کی بات ہوتی !

اک شعلۂ مشتعل جو سرِ کوہ طور تھا — وہ تو نہیں تھا، تیرا نزولِ غرور تھا (ص ۶۷)

مصرعہ ثانی وجدان کے لئے تکلیف دہ !

دیکھ چکا، سمجھ چکا دونوں میں یہ معاملہ — تیری ادا ادا فریب میری نظر نظر حجاب (ص ۶۹)

"معاملہ" تو تجارت اور لین دین کی اصطلاح ہے، یا اس صورت میں اس کا استعمال برمحل ہوتا کہ محبوب کے وعدے وعید اور عاشق کے عہد وفا کا ذکر آتا ——— !

حلقہ بگوش اُس آنکھ کے مومن بھی گبر بھی — دستِ مژہ میں قسمت دنیا و دیں ہے آج (ص ۷۱)

"دستِ مژہ" کی ترکیب بھلی نہیں لگتی ـــ پھر جب "مومن و گبر" لائے تھے تو "کفر و دیں" کہنا تھا۔

تھا یہ بھر بھی لوث تجسس میں مٹ گیا — اور دھو کے پاک ہو گئی چشم پُر آب آ ج

مصرعہ اولیٰ . . . . !؟ وجدان تلملا کے رہ گیا۔

تمہاری انگڑائی کا یہ عالم خدا تم اپنی نظر سے دیکھو
چمن میں موجِ شمیم صدقے تو چرخ پہ کہکشاں تصدق (ص ۱۰۴)

"انگڑائی" کے مقابلہ میں "موجِ شمیم" کی بجائے "شاخِ گل" لانا تھا، اور "کہکشاں" کی جگہ "قوسِ قزح" !! کیونکہ انگڑائی کی صفت "خوشبو" اور روشنی نہیں بلکہ سرمستی کے علاوہ وہ ہیئت ہو سکتی ہے جو قوس قزح اور شاخ گل کی لچک میں پائی جاتی ہے۔ تشبیہ میں "وجہ شبہ" کی مناسبت ضروری ہے !

صدمات سے دل نالاں، نالوں سے اثر برہم — کچھ عشق اُدھر برہم، کچھ حُسن اُدھر برہم (ص ۱۱۰)

"صدمہ" کی جمع "صدمات" درست ہے مگر یہ بول چال کی زبان نہیں ہے اور شعر میں بھی اس طرح "صدمات" بھلا نہیں لگتا ۔

"صدموں سے ہے دل نالاں"

ہوسکتا تھا ـــــــ

قیامت بن گئیں انگڑائیاں عہدِ جوانی کی ۔۔۔ تصدق دو عالم کے دلوں پہ چھائے جاتے ہیں (ص ۱۱۹)

مصرعِ ثانی حیدر رضوی جیسے مشاق شاعر کو کسی طرح زیب نہیں دیتا۔

وہ اس ادا سے تباہی پہ دل کی خوش ہیں چھپ ۔۔۔ کہ جیسے دل کوئی پہلو میں اور رکھتا ہوں (ص ۱۳۱)

شعر میں فن اور زبان کی کوئی غلطی نہیں، مگر مفہوم اور پیرویہ جسے "لطفِ شاعری" کہتے ہیں .... !؟

مرقع بھی گل تو بس ہی مجمدِ رنج و راحت کا ۔۔۔ کہ شب کو آنکھ کھولے، صبح کو افسانہ ہو جائے (ص ۱۴۸)

"مجمدِ رنج و راحت" یہ الفاظ وجدان کو کھٹکتے ہیں، اول تو "مجمد" اس شعر میں نہیں آنا چاہیے پھر "رنج و راحت" کی بجائے "موت و زیست" یا "فنا و بقا" اور "ہستی و نیستی" جیسے الفاظ لانے چاہیے تھے !

کوئی شفق کوئی تو بس قوسِ قزح سمجھتا ہے ۔۔۔ تری طرف سے جو موجِ صبا نکلتی ہے (ص ۱۶۱)

شفق اور قوسِ قزح یعنی رنگ و نور سے "موجِ صبا" کو کیا نسبت ؟ خوشبو اور اندازِ خرام کا ذکر کرنا تھا۔

احساس انہیں آئندہ ملاقات کا کب ہے ۔۔۔ یہ رات تو کٹ جائے گی اس رات کا کب ہے (ص ۱۶۵)

"احساس" کے استعمال سے اس شعر میں آخر کیا فائدہ اٹھایا گیا ہے ؟ اور کس مفہوم کی ترجمانی کی گئی ہے ۔

کیوں نرگسِ مخمور سے مے ڈھال رہے ہو ۔۔۔ غلطیدہ ابھی گیسوئے شب تا بہ کمر ہے (ص ۱۶۸)

شراب تو رات ہی میں عام طور پر پی جاتی ہے اس صورت میں رات کے وقت نرگسِ مخمور سے مے ڈھالنے میں آخر کیا قباحت ہے !

توطور کا بھڑکا ہوا شعلہ رمِ رفتار ۔۔۔ لہرائی ہوئی برق تری راہگزر ہے (ص ۱۶۸)

"توطور" پڑھنے میں زبان "تنافر" سا محسوس کرتی ہے ! پھر محبوب کی رفتار کو شعلۂ طور سے تشبیہ دینا بھی "تکلف" سے خالی نہیں !

ہر نفس میں لے رہی ہے کروٹیں حقانیت ۔۔۔ ہر طرف بکھرا ہوا شیرازۂ منصور ہے (ص ۱۷۲)

"شیرازۂ منصور" کی ترکیب کتنی نامانوس ہے ! شعر میں مجموعی طور پر بھی معانی اور پختگی کی خامی کمی محسوس ہوتی ہے ۔

آپ کے نقشِ قدم پہ ہاتھ پڑ کر رہ گیا ۔۔۔ اے دریغا ! دستِ دامن گیر بھی خاک ہے (ص ۲۰۱)

"دستِ دامن گیر" سے اس شعر میں کس مفہوم کو ادا کیا گیا ہے ؟ کیا "نقشِ قدم" کے دامن بھی ہوتا ہے !! پھر محبوب کے نقشِ قدم کی "خاک" کا اس مصرعہ میں ذکر بھدے الفاظ میں کیا گیا ہے ! حالانکہ محبوب کے قدم یا نقشِ قدم کی خاک کا مل جانا بہت بڑی بات ہے ۔

وہ ستم کیا، جو توجہ سے نہ بر سرِ آ سکے ۔۔۔ وہ نظر کیا جو غلط انداز ہو کر رہ گئی (ص ۲۰۷)

"بر سرِ آ سکے" سے نہ جانے کیا مراد ہے ! اور اس زبان کا اب کہاں چلن ہے ؟

حریفِ تسکین و مستقر ہوں، بلندیوں سے بلند تر ہوں

میں آج کل جس مقام پر ہوں، ضرورتِ بال و پر نہیں ہے (ص ۲۲۳)

"حریفِ مستقر" کی تو یہ تاویل کی جاسکتی ہے کہ میرا اب کوئی خاص "مستقر" یعنی نشیمن اور مقام پرواز نہیں ہے مگر "حریفِ تسکین" کی ترکیب سمجھ میں نہیں آتی ! پھر "ضرورتِ بال و پر" کی جگہ "ضرورتِ پرواز" کہنا تھا، یعنی میں اب اس بلندی پر فائز ہوں کہ پرواز کے لئے کسی مزید بلندی کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی !

عقیدہ یہ قدم اور اٹھیں جانب دنیا — دنیا انہی قدموں کی ہے ٹھکرائی ہوئی سی (ص ۲۲۳)

"سی" زائد ہے اور اس کا سبب ردیف کی پابندی اور مجبوری ہے۔

لب نالہ نرسا اگر نے نہیں ہے — تو پھر ضابطے میں کوئی لے نہیں ہے (ص ۲۲۴)

یہ شعر کیا ہے، "پہیلی" ہے ؟

پس صحرا نوردی ہڈیوں کا ڈھیر ہی عقیدہ — کہ میلا ہو گیا تھا جامۂ ہستی اُتار آئے (ص ۲۲۷)

اس شعر کو پڑھ کر وجدان وحشت محسوس کرتا ہے۔

اشجار سجدہ ریز صمد کے حضور میں — نکہت گل احد کی ثنا ئے طیور میں (ص ۲۴۰)

طائروں کی نواؤں میں خوشبو کا ہونا عجیب و غریب مشاہدہ اور تجربہ ہے ۔ اسا بیہ کہا جائے کہ "نوا" میں سالس بھی شامل ہوتا ہے، اور بڑے اتفاق بھی ملتے جلتے ہیں۔ مگر یہ تاویل خاصی تکلف آمیز ہے۔

دنیا کے دروں ہے دولتِ دیں سے اٹی ہوئی — باطل پرستیوں کی فضائیں پٹی ہوئی
بادل کی طرح کفر کی ظلمت چھٹی ہوئی — آسودہ نورِ علم، جہالت پٹی ہوئی (ص ۲۴۳)

تیسرا مصرعہ تو خاصہ ہے ۔ باقی تینوں مصرعے کمزور ہیں، جن سے شاعر کی "نظم گوئی" کا کوئی اچھا تعارف نہیں ہوتا ——— مصرعہ اولیٰ میں زبان کی غلطی ہے ——— "اٹی" اگرچہ وہ غبار کے لئے بولتے ہیں۔ دولت کیساتھ "اٹی ہوئی" "آنا" چاہیے تھا، مصرعہ ثانی میں "فضائیں" جمع ہے اس لئے "پٹی ہوئی" محلِ غور ہے! تیسرا مصرعہ ذرا بچکانہ ہے!

اس طرح زمانہ ہے تابی کا پیہم چاہیے — مجرئی! دستِ مژہ معروفِ ماتم چاہیے (ص ۲۳۳)

"دستِ مژہ" کا معروفِ ماتم ہونا ——— بس کوئی کیسے بھی تو کیا کہے!

آج بھی ہے چہرۂ شب تاب پہ زریں نقاب — خوش یہ ہو گیا انگشتِ احمد کا عتاب (ص ۲۴۴)

"انگشتِ احمد کے عتاب" سے شاید "معجزۂ شق القمر" مراد ہے ——— مگر یہ پیرایہ بیان کیا ہے!

غالب پر جو نظم ہے اُس کا ایک شعر ہے ———

تیرے اندازِ بیاں نے کھوئی رسمِ ابتذال — شاہدِ معنیٰ کے رُخ سے صاف کی گردِ ملال (ص ۲۳۹)

رسمِ ابتذال کو ختم کر دیا، یا اُس کا استیصال کر دیا ——— اس طرح اظہارِ خیال کرنا تھا "کھوئی رسمِ ابتذال" یہ کہاں کی زبان ہے! پھر دوسرے مصرعہ میں "ملال" زیادہ ہے، "گرد" کہہ کر بات پوری ہو جاتی ہے۔

نثر میں بھی نظم میں بھی داد کا طالب ہے تو — دونوں صنفوں میں بہ یک نوکِ قلم غالب ہے تو

یہ کیا شاعری ہے !!

مستجاب ملک و ملت تیری ہر تصنیف ہے — بیش قیمت، بے بدل، مستغنیِ تعریف ہے

یہ نظم ڈپٹی نذیر احمد کی مدح میں ہے، "مقبول" وزن میں نہ آسکا تو "مستجاب" باندھ دیا، "مستجاب" "دعا" کے ساتھ استعمال ہوتا ہے "مستجاب الدعوات" مشہور و معروف ترکیب ہے۔

تو مقرر ہی نہیں تھا ناشر و شاعر بھی تھا — مرتبہ عالی ترا باطن بھی تھا، ظاہر بھی تھا

یہ نظم عقیدہ دہلوی مرحوم کی لوشتی کے زمانہ کی کہی ہوئی معلوم ہوتی ہے ——— دوسرا مصرعہ کس قدر کمزور ہے۔

یہ جو سر گرمیٔ دنیا بھی ہے   اس میں عرضِ مدعا بھی ہے   (ص ۲۷)

یعنی ـــــــــ !!؟

جناب القدوسی اگر اپنے قبلِ فخر استاد کے کلام میں انتخاب کی جرأت کر سکتے، تو اس گلستانِ معانی و بیان میں جھاڑ جھنکار باقی نہ رہتے ــــ موجودہ صورت میں بھی "صحیح الہام" شعر و سخن کی قابلِ قدر پیشکش ہے، جو حسین بھی ہے اور باوقار بھی!

(ص ۴۶ کا بقیہ)

بازپرس نہیں کی جاتی۔ حالانکہ حکومت کی مرضی کے خلاف ایک لفظ لکھنے کی بھی وہ جرأت نہیں کر سکتے۔ اگر یہ اخبارات غیر متوازن اور غیر حقیقت پسندانہ بیانات کے حق میں حکومت کے ایما پر لمبے لمبے اداریے لکھ سکتے ہیں تو ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ آخر اس صحیح فیصلے کے حق میں لکھنے کے لئے ان اخبارات کے صفحات میں کیوں گنجائش نہیں نکلتی اور اس کے خلاف طعن و تشنیع سے بھرا ہوا مواد وہ کیسے شائع کرتے ہیں۔ ممکن ہے بعض لوگ اسے حکومت کی رواداری اور وسیع المشربی سمجھیں۔ لیکن یہ بات کسی طرح بھی صحیح نہیں اگر حکومت یہ سب کچھ اپنی وسیع الظرفی کی وجہ سے گوارا کر رہی ہے تو پھر اسے اپنے سیاسی حریفوں اور اپنے طرزِ عمل سے انحراف کرنے کے ساتھ بھی ایسی فیاضی اور بردباری کا ثبوت دینا چاہئے۔ اسلام کے معاملے میں تو وہ اتنی روادار ہے۔ مگر خود اپنے معاملہ میں اس کا حال یہ ہے کہ کوئی معمولی سی تنقید بھی برداشت نہیں کر سکتی اور اُن لوگوں کی آزادی سلب کرنے کی کوشش کرتی ہے جو اس کے قول یا فعل پر گرفت کرنے کی جسارت کرتے ہیں۔

(عبدالحمید صدیقی ایم اے)

آدم جی کاٹن ملز لانڈھی کراچی
ACM

ماہنامہ

فاران کراچی

ستمبر ۱۹۶۶ء

جلد :- ۱۸

شمارہ :- ۶

ایڈیٹر ـــــــ ماہر القادری

ترتیب

عنوان	مصنف	صفحہ
نقشِ اول	ماہر القادری	۳
تحریکِ جماعتِ اسلامی کا ایک تحقیقی جائزہ	محمد نواز ایم اے	۲۲
دعا کیوں کی جائے	مولانا محمد تقی عثمانی	۳۸
حضرت اورنگ زیب عالمگیر کی رواداری	محمد حنیف اللہ پھلواری	۴۴
تضمین بر غزل ماہر القادری	ڈاکٹر انعام احسن	۵۹
درج انتخاب	ماہنامہ "ثقافت" لاہور	۶۰
ہماری نظر میں	....	۶۱

چندہ سالانہ :- سات روپے	پبلشر :- سرور حسین	قیمت فی پرچہ :- ۶۲ پیسے

مقامِ اشاعت

دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی

سرور حسین پبلشر نے انٹرنیشنل پریس کراچی میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ "فاران" کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقش اول

——— امام الاولین والآخرین، افضل المرسلین، خاتم النبیین سیدنا محمد عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات گرامی پر نبوت و رسالت کو ختم کر دیا گیا، اور اب قیامت تک کوئی نیا نبی نہیں آئے گا ——— یہ وہ بنیادی عقیدہ ہے جس پر عہد رسالت سے آج تک تمام امت مسلمہ کا متفقہ طور پر اجماع رہا ہے، دین کا یہ وہ اساسی عقیدہ ہے، جس کی نفی "کفر" ہے! خلافت راشدہ کے عہد میں جن لوگوں نے نبوت کا دعویٰ کیا، اُن سے صحابہ کرام نے نبوت کا ثبوت نہیں مانگا۔ اور ان کے دعوئ نبوت کی نہ اس انداز پر تاویل کی کہ ممکن ہے یہ لوگ بروزی اور ظلی نبی ہوں بلکہ اس کے برعکس اور علی الرغم ان کا ذب مدعیان نبوت سے جدال و قتال کا سلوک کیا۔ کتاب و سنت کی واضح ہدایت اور صحابہ کرام کے اس اسوہ کو پیش نظر رکھ کر حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کتنی سچی اور اچھی بات کہی کہ جو مسلمان کسی مدعی نبوت سے اُس کے نبی ہونے کی دلیل اور ثبوت طلب کرے تو ایسا کرنے سے وہ "کافر" ہو جاتا ہے ——— اس گفتگو کا خلاصہ اور لب لباب یہ ہے کہ ختم نبوت کے عقیدے کے ساتھ "امکانِ نبوت" کا عقیدہ "کفر" ہے! یہ دونوں "تضاد" ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے کہ کوئی شخص "امکانِ نبوت" کا بھی قائل ہو اور ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتا ہو کہ ختم نبوت کے عقیدہ پر میرا ایمان ہے تو ایسا شخص فریبِ نفس اور خبطِ شیطان میں مبتلا ہے، "امکانِ نبوت" کا عقیدہ رکھنے کے بعد "ختم نبوت" کا عقیدہ کہاں باقی رہ سکتا ہے، آگ اور پانی شاید ایک جگہ جمع ہو جائیں مگر "امکانِ نبوت" اور "ختم نبوت" یہ دونوں عقیدے جمع نہیں ہو سکتے!

قادیانیوں کی یہ منطق سو فیصدی غلط، لغو، جھوٹی، بے اصل بلکہ کفر آمیز منطق ہے کہ وہ مرزا غلام احمد کی نبوت کو بھی مانتے ہیں اور وہاں سے یہ بھی کہتے جاتے ہیں کہ "ختم نبوت" پر ہمارا ایمان ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "خاتم النبیین" ہیں! یہ نہیں ہے کہ وہ ناواقفیت طور پر کسی مغالطے یا غلط اندیشی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ وہ جان بوجھ کر اس دجل و فریب اور نفاق و دورنگی سے کام لیتے ہیں۔

لاہوری جماعت کے شعبہ دعوت و ارشاد سے "خرافات" کا ہمارے یہاں آنا بند ہو گیا ہے، اس عذاب سے نجات ملی، تو ضلالت و کفر کے مرکز ربوہ سے تین رسالے ہمارے نام بھیجے گئے ہیں ——— ماہنامہ "انصار اللہ" (ایڈیٹر مسعود احمد دہلوی) کے دو شمارے اور ماہنامہ "الفرقان" (ایڈیٹر ابوالعطا جالندھری) کا ایک پرچہ ——— ان رسالوں کو پڑھ کر جو کوفت ہوتی ہے، اس کا اظہار لفظوں میں کہاں ہو سکتا ہے، غضب خدا کا - جھوٹی نبوت کو صحیح اور حق ثابت کرنے کے لئے کیسے کیسے گمراہ کن نکتے تراشے گئے ہیں اور قرآن کریم کی آیات محکم کے مفہوم میں کس بے باکی بلکہ بے شرمی کے ساتھ تحریف کی گئی ہے!

۵۰ جولائی کے "فاران" میں جو اداریہ (نقش اول) فتنہ قادیانیت کی تردید میں شائع ہوا تھا، ربوہ کے مجلہ "الفرقان" (اگست ۱۹۶۲ء) میں حسب ذیل اقتباس کو ———

"سید المرسلین، خاتم النبیین، فخر الاولین والآخرین حضرت سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حریف

اور مد مقابل مدعی نبوت کے لئے اکرام و تعظیم کا کوئی لفظ ہماری زبان و قلم سے نہیں نکل سکتا :
درج کرنے کے بعد حسب عادت یہ مغالطہ دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ :-

"یہ بنیادی سراسر جھوٹ پر مبنی ہے۔ حضرت بانی سلسلہ احمدیہ علیہ السلام (نقل کفر کفر نباشد —
لعنۃ اللہ علی الکاذبین) کا کبھی دعویٰ ہو، وہ مجدد ہوں، مسیح ہوں، مہدی ہوں، امتی نبی ہوں، بہر حال
وہ کسی مرحلہ میں بھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حریف اور مد مقابل نہیں بلکہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے
غلام، تابع اور خادم ہیں، حریف اور مد مقابل ہونے کا الزام محض بہتان عظیم ہے :"

اس کے بعد مرزائے قادیان کی کتاب "حقیقۃ الوحی" کا ایک اقتباس دیا گیا ہے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح اور نعت و منقبت سے لبریز ہے۔
قادیانیوں کے آرگن "الفرقان" نے "فاران" کا جو اقتباس نقل کیا ہے اور جس الزام کو "بہتان عظیم" بتایا ہے اس پر ہم ماہ جون ۱۹۷۰ء کے
شمارے میں تفصیل کے ساتھ گفتگو کر چکے ہیں۔ ہم نے نہ کسی پر بہتان لگایا ہے اور نہ غلط فہم کا کوئی الزام تراشا ہے۔ "فاران" کے سینکڑوں نہیں ہزاروں
صفحے اس کی شہادت دیتے ہیں کہ ہم نے آج تک کسی بڑے سے بڑے مخالف و معاند دین پر بھی کوئی تہمت نہیں لگائی اور نہ کسی کو دلیل کے بغیر ملزم ٹھہرایا
ہے، ہم نے جو بات کہی ہے کسی ثبوت اور حوالہ کے ساتھ کہی ہے۔

اول تو "ظلی اور بروزی نبی" کوئی منصوص یا ماثور دینی اصطلاح نہیں ہے۔ مرزا غلام احمد کا مجددیت اور مہدویت کے بعد یہ دعویٰ کہ
میں "ظلی اور بروزی نبی ہوں" ذاتِ خاتم النبیین کے مقابلہ میں ایک عجیب و غریب قسم کی نبوت کا اعلان نہیں تو اور کیا ہے! یہ گویا "ظلی نبوت" اور
"بروزی نبوت" سے آگے بڑھ کر، نبی کا نسب کے زبان و قلم سے اس حد تک پہنچ جاتی ہے۔

"چونکہ میری تعلیم میں امر بھی ہے اور نہی بھی، اور شریعت کے ضروری احکام کی تجدید ہے — اس لئے
خدا تعالیٰ نے میری تعلیم کو اور اس وحی کو جو میرے اوپر ہوتی، فلک یعنی کشتی کے نام سے موسوم کیا ..."
(حاشیہ اربعین نمبر ۴ صفحہ ۶، مصنفہ مرزا غلام احمد قادیانی)

جس "بروزی اور ظلی" نبی کی تعلیم میں امر و نہی بھی ہو، اور اس نے فریضۂ جہاد کی تنسیخ کا اعلان کیا ہو :—
"آج سے انسانی جہاد جو تلوار سے کیا جاتا تھا، خدا کے حکم کے ساتھ بند کیا گیا ...."

اب چھوڑ دو جہاد کا اے دوستو خیال — دیں کے لئے حرام ہے اب جنگ اور قتال
دشمن ہے وہ خدا کا جو کرتا ہے اب جہاد — منکر نبی کا ہے جو یہ رکھتا ہے اعتقاد

(اعلان مرزا غلام احمد قادیانی، مندرجہ تبلیغ رسالت جلد نہم)

ایسے "نبی" (؟) کو صاحب ختم نبوت کا حریف اور مد مقابل کہنا الزام و بہتان ہے یا واقعہ کی صحیح ترجمانی ہے ؟

اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ پر "جہاد" کو فرض ٹھہرایا ہے، خود ذات رسالت مآب نے کافروں کے خلاف جہاد کیا ہے یہاں تک کہ اس
مقدس فریضہ کو ادا کرتے ہوئے، حضور کو زخم کھانے پڑے ہیں۔ مگر مرزا غلام احمد قادیانی نے "جہاد" کی تنسیخ کا اعلان کر دیا اور اُسے
"حرام" تک ٹھہرا دیا !

پھر یہ شخص اپنے ماننے والوں کو "میری امت" کہتا ہے، یعنی امت محمدیہ کے مقابلہ میں ایک جدید امت کا اعلان :-
"میری امت کے دو حصے ہوں گے، ایک وہ جو مسیحیت کا رنگ اختیار کریں گے اور یہ تباہ ہو جائیں گے اور دوسرے
جو مہدویت کا رنگ اختیار کریں گے ....."
(ارشاد مرزا غلام احمد قادیانی مندرجہ اخبار الفضل ۲۶ جنوری ۱۹۱۶ء)

اور سنئے

● ـــ "۔۔۔۔ چنانچہ وہ مکالمات الٰہیہ جو براہین احمدیہ میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ وحی اللہ ہے۔ هو الذی ارسل رسوله بالهدیٰ ودین الحق لیظهره علی الدین کله (براہین احمدیہ ص ۴۹۸) اس میں صاف طور پر اس عاجز کو رسول کرکے پکارا گیا ہے۔۔۔۔ پھر۔۔۔۔ اسی کتاب میں اس مکالمہ کے قریب یہ وحی اللہ ہے محمد رسول اللہ والذین معه اشداء علی الکفار رحماء بینهم اس وحی الٰہی میں میرا نام محمد رکھا گیا۔ (ایک غلطی کا ازالہ از مرزا غلام احمد)

● ـــ "وما ینطق عن الهویٰ ان هو الا وحی یوحیٰ ـــ اسے (مرزا) اپنی طرف سے نہیں بولتا بلکہ جو کچھ تم سنتے ہو یہ خدا کی وحی ہے (اربعین نمبر ۳ ص ۳۶ از مرزا غلام احمد)

● ـــ "اللہ نے مجھے رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا ہے۔ (حقیقۃ الوحی ص ۱۰۷)

● ـــ "اللہ نے مجھے کوثر عطا کیا ہے" (ضمیمہ انجام آتھم ص ۸۵)

ـــــــ اور ـــــــ

● ـــ "اس کے (یعنی نبی کریم کے لئے صرف) چاند گرہن کا نشان ظاہر ہوا، اور میرے لئے چاند اور سورج دونوں (کے گرہن) کا، اب کیا تو انکار کرے گا۔ (اعجاز احمدی ص ۷۱ مصنفہ مرزا غلام احمد قادیانی)

● ـــ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت اس کے تمام احکام کی تکمیل ہوئی اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے وقت میں اس کے ہر ایک پہلو کی اشاعت کی تکمیل ہوئی اور مسیح موعود کے وقت میں اس کے روحانی فضائل و اسرار کے ظہور کی تکمیل ہوئی" (براہین احمدیہ حصہ پنجم حاشیہ مرزا غلام احمد قادیانی)

● ـــ "ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانیت نے پانچویں ہزار میں اجمالی صفات کے ساتھ ظہور فرمایا اور وہ زمانہ[201] اس روحانیت کی ترقیات کی انتہا کا نہ تھا بلکہ اس کے کمالات کے معراج کے لئے پہلا قدم تھا، پھر اس روحانیت نے چھٹے ہزار کے آخر میں یعنی اس وقت پوری طرح تجلی فرمائی۔"
(خطبہ الہامیہ ص ۱۷۷ مصنفہ مرزا غلام احمد قادیانی)

مرزائے قادیان کے ان اقتباسات سے کیا حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے مقابلہ میں مرزا کی افضلیت کا پہلو نمایاں طور پر سامنے نہیں آتا؟

حضور خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی ذات گرامی تمام انبیاء کرام کے کمالات و فضائل کی جامع تھی، حضور کے اس شرف کے مقابلہ میں مرزائے قادیان کا دعویٰ ملاحظہ ہو۔

انبیاء گرچہ بودہ اند بسے — من بعرفاں نہ کمترم زکسے
آنچہ داداست ہر نبی را جام — داد آں جام را مرا بہ تمام
کم نیم زاں ہمہ بروئے یقین — ہر کہ گوید دروغ ہست لعین

(درثمین ص ۲۸۷-۲۸۸ از مرزا غلام احمد قادیانی)

---

[201] حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ کو "بہترین زمانہ" فرمایا ہے!

مرزا غلام احمد قادیانی نے دوسرے انبیاء کرام کی مانند مستقل نبوت کا اعلان کیا، ایسی نبوت کا جس میں امر و نہی بھی پایا جاتا ہے، اس نے فریضہ جہاد کو حرام قرار دیا ——— قرآن کریم میں جو آیات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں نازل ہوئی ہیں، اُن کا مصداق مرزا نے قادیانی نے اپنی ذات کو ٹھہرایا ——— اپنے ماننے والوں کو "میری امت" کہا ——— یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں اپنی افضلیت کو نمایاں کیا ——— اور تمام انبیاء کرام (جن میں حضور خاتم النبیین بھی بہرحال شامل ہیں) پر اپنی ذات کو فضیلت دی ———

آنچہ داد است ہر نبی را جام   داد آں جام را مرا بہ تمام

ان "کفریات" کے بعد "نئی نبوت" کا باقاعدہ انسٹی ٹیوشن قائم ہوتا ہے، جس میں مرزا غلام احمد کو "علیہ السلام" کہا جاتا ہے اس کے ساتھی صحابہ کرام کے ٹولے پر "رضی اللہ عنہم" ہیں اور مرزا کی بیوی "ام المومنین" ہے! ان واضح اور نمایاں آثار و شواہد اور واقعات کی موجودگی میں، مرزا غلام احمد قادیانی کی ذات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حریف اور مد مقابل ہی ٹھہرتی ہے! اس واقعہ کو الزام یا بہتان کہنا، اپنی جگہ خود بہت بڑا بہتان ہے۔

مرزا غلام احمد قادیانی کی تحریروں کے جو اقتباسات اوپر دئے گئے ہیں اُن کے ہوتے ہوئے مرزا کا یہ کہنا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا غلام اور متبع ہوں اور حضور ہی کے واسطہ سے مجھے سب کچھ ملا ہے ——— دجل و فریب کے سوا اور کیا ہے! ایک غلام جو خود "آقا" بن بیٹھا ہو، اور جس نے "آقائیت" کے تمام لوازم اپنے سے منسوب کر لئے ہوں اُس کا یہ کہنا کہ میں تو اپنے آقا کا ادنیٰ غلام اور تابعدار ہوں اور انہی کے طفیل مجھے یہ منصب و شرف ملا ہے کھلا ہوا فریب ہے!

قادیانیوں کے اس ضلالت آمیز مغالطہ کی قلعی کھولنے کے لئے ہم ایک سامنے کی مثال یہاں درج کرتے ہیں ——— کسی بادشاہ کی رعایا کا ایک فرد اعلان کرتا ہے کہ میں "بروزی بادشاہ" اور ظلّی فرماں روا" ہوں، اس کے بعد وہ حکومت کے بعض ٹیکسوں کے منسوخ کئے جانے کا اعلان بھی فرما دیتا ہے، ملک کے ایک مقام میں وہ "بروزی بادشاہ" اپنا دارالخلافہ بھی قائم کر لیتا ہے، اس "ظلّی بادشاہ" کو کچھ ماننے والے بھی میسر آ جاتے ہیں جو اُس کے نام کے ساتھ "جلالۃ الملک" لکھتے اور بولتے ہیں اور اُس کی بیوی کو "ملکہ معظمہ" کہتے ہیں، اس "بروزی بادشاہ" بلکہ یوں کہنا چاہئے جعلی بادشاہ کے کچھ حالی موالی بھی ہیں، جن کو اصلی اور حقیقی بادشاہ کے وزیروں کے ٹولے پر "عزت مآب" کہا جاتا ہے! ان دعووں کے ساتھ یہ "بروزی بادشاہ" اصلی بادشاہ کی مدح و ستائش بھی کئے جاتا ہے کہ میں تو حضور کا غلام اور تابعدار ہوں، مجھے جو کچھ شرف و عزت ملی ہے وہ سرکار عالی تبار کی غلامی اور نیاز مندی کے طفیل میں ملی ہے، خداوند نعمت نے اس خاکسار کو جو نسبت غلامی عطا کی ہے، اُس نے مجھ کو اس مرتبہ تک پہونچایا ہے ——— انصاف سے بتائیے کہ ایسا باغی اور خود سر فرد رعایا جو خود "بادشاہ" بن بیٹھا ہے، اُس کو بادشاہ کا غلام اور نیاز مند سمجھا جائے گا یا بادشاہ کا حریف اور مد مقابل! اور اس جعلی اور بروزی بادشاہ نے اصلی بادشاہ کی جو مدح سرائی کی ہے وہ نرا مضحکہ اور کھلا ہوا مذاق نہیں تو اور کیا ہے۔ کیا کوئی اصلی بادشاہ اپنے اس قسم کے فرد رعایا کو جو خود کو "بروزی بادشاہ" کہتا ہو، گوارا کر سکتا ہے! اور اس کی قصیدہ خوانی اور مدح سرائی سے خوش ہو سکتا ہے! یہ مثال ٹھیک طور پر مرزا غلام احمد قادیانی کی حرکت ختم نبوت پر صادق آتی ہے! انہی شواہد کی بنیاد پر ہم نے ماہ جون کے "فاران" میں یہ کہا تھا کہ مرزا غلام احمد قادیانی کا نام سن کر ہمارے دل میں جتنی نفرت پیدا ہوتی ہے، اُتنی نفرت ابوجہل اور ابولہب کا نام سن کر بھی نہیں ہوتی، کیونکہ یہ دونوں کافر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شدید مخالف و معاند تھے مگر حضور کے "حریف" اور مد مقابل نبی نہ تھے، مرزا غلام احمد کافر و مرتد ہونے کے ساتھ حضور ختمی نبوت کا حریف اور مد مقابل بھی ہے۔

ماہنامہ الفرقان (ربوہ) کا جو اقتباس اوپر دیا گیا ہے اس میں "اُمتی نبی" کی اصطلاح بھی نظر آتی، احمدیانیوں کا یہ وہ علم کلام ہے جس میں سرفی صدی جہالت وحماقت اور خبث و فساد پایا جاتا ہے، کیا کسی آسمانی صحیفہ اور حکمت و اخلاق کی کتاب میں ایسی کوئی اصطلاح ملتی ہے کہ ایک شخص کسی نبی کا اُمتی بھی ہو اور ساتھ ہی خود بھی نبی ہو! ایک شخص کسی گھرانے کا غلام ہو اور ساتھ ہی اس گھرانے کا "آقا" بھی ہو، نماز کی حالت میں ایک شخص مقتدی بھی ہو اور امام بھی ہو، کیا کسی ملک کا بادشاہ، صدر، فرمانروا اور حاکم اعلیٰ اس کو گوارا کرسکتا ہے کہ اس ملک کا کوئی ذہین اور لکھا پڑھا چپراسی اس کا اعلان کرے کہ میں "چپراسی حاکم" یا "چپراسی فرمانروا" اور Servant President یا peon King ہوں! اس قسم کی منطق چھانٹنے اور دعویٰ کرنے والے کو یا تو پاگل خانہ بھیج دیا جائے گا، یا پھر اس کا صحیح مقام جیل خانہ ہوگا! اسلامی حکومت اور مسلم معاشرے میں کفر کو گوارا کیا جاسکتا ہے، مگر "جھوٹی نبوت" کو گوارا نہیں کیا جاسکتا، سعودی عرب میں کوئی اس قسم کی باتیں کرکے تو دیکھے، وہ اپنا حشر اسی دنیا میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا!

مفہوم قرآنی کی تحریف

قرآن کریم کے مفہوم میں پوری بے شرمی اور بے باکی کے ساتھ ——— کہ نہ خدا کا خوف اور نہ بندوں کی شرم ——— تحریف و تصرف کی بنا مرزا غلام احمد قادیانی نے ڈالی تھی کہ جو آیات قرآنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں نازل ہوئی ہیں، ان کا مصداق مرزا صاحب اپنی ذات کو قرار دیا، یہاں تک کہ "واتخذوا من مقام ابراہیم مصلیٰ" کی یہ تاویل و تحریف کی ——— کہ (یہ آیت) اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ جب امت محمدیہ میں بہت فرقے ہو جائیں گے، تب آخر زمانہ میں ایک ابراہیم پیدا ہوگا اور ان سب فرقوں میں وہ نجات پائے گا جو اس ابراہیم کا پیرو ہوگا۔ (اربعین نمبر ۳ ص $\frac{۳۵}{۶۵}$ مصنفہ مرزا غلام احمد قادیانی)

اپنے پیشوا کی اس سنت ——— تحریف مفہوم قرآن ——— کی قادیانی پورے جوش عقیدت کے ساتھ طابق النعل بالنعل پیروی کر رہے ہیں! ماہ فروری کا ماہنامہ "الفرقان" جو قادیانیت کے مرکز ربوہ سے نکلتا ہے ہمارے سامنے ہے اس میں "انا اعطینٰک الکوثر" کی تفسیر اس طرح کی گئی ہے! ———

"یعنی اے رسول! ہم نے آپ کو کوثر عطا کیا ہے، امام راغب اصفہانی اپنی کتاب "المفردات فی غریب القرآن" میں عربی کوثر کے اور معانی کے یہ بھی لکھے ہیں کہ

وقد یقال للرجل السخی الکوثر

یعنی کوثر سخی آدمی کو بھی کہا جاتا ہے

اسی طرح لغت کی مشہور کتاب اقرب الموارد میں کوثر کے دوسرے معانی کے علاوہ یہ معنی بھی درج ہیں ———

السید الکثیر الخیر یعنی ایسا سردار جو خیر کثیر والا ہو، اس صورت میں آیت قرآنی کے یہ معنی ہوں گے انا اعطینٰک رجلاً کثیر العطاء والخیر، ہم تجھے ایک ایسا آدمی دیں گے جس میں عطا اور خیر کثرت سے پائی جائیگی، لازماً ایسا شخص جو آپ کو دیا جائے گا وہ آپ کا روحانی فرزند اور غلام ہوگا، کیونکہ جو شخص کسی کو بخشا جاتا ہے وہ اس کا غلام ہوتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام احمد بھی ہے، قرآنی آیت میں "ک" کی ضمیر کی جگہ "احمد" رکھ دیں اور کوثر کی جگہ غلام، تو آیت کے یہ معنی بن جائیں گے کہ ہم احمد (صلی اللہ علیہ وسلم کو) ایک غلام دیں گے

---

* حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے وہ نبی بن کر دنیا میں آچکے ہیں اور جب دوبارہ تشریف لائیں گے تو شریعت محمدی کے مطابق عمل فرمائیں گے، اس لئے ان کا آنا "ختم نبوت" کے منافی نہیں ہے، مرزا غلام احمد کی خود ساختہ نبوت "جدید نبوت" ہے جو "ختم نبوت" کے منصوص عقیدہ کی نفی کرتی ہے۔

خیر کثیر والا) غلام احمد عطا کریں گے، جو آپ کا روحانی فرزند ہوگا . . . . . . "

یہ ہے وہ معنوی تحریف، مذاق، دل لگی اور ظلم جو قرآن کے ساتھ یہ قادیانی کرتے رہتے ہیں، مفہوم قرآنی میں تحریف کی راہ مرزا غلام احمد ہی نے ان کو دکھائی ہے : امام راغب اصفہانی نے " الکوثر" کے ایک معنی " مرد سخی" کے بھی لکھے ہیں اس سے اُن کی مراد صرف یہ ہے کہ جس طرح سخی آدمی سے لوگوں کو فیض پہونچتا ہے اسی طرح لفظ " الکوثر" میں " خیر کثیر" کی صفت پائی جاتی ہے! کسی مفسر نے " الکوثر" سے امت مسلمہ کے کسی خاص " فرد" کی ذات مراد نہیں لی !

قرآن کی تفسیر کا جو طریقہ ندامانہ قادیانیوں نے اختیار کیا ہے، اُس کا اصول واساس بنا کر کوئی شخص جس کا نام " کوثر، علی کوثر، یا کوثر حسین" ہو یہ کہہ سکتا ہے " انا اعطینٰک الکوثر" سے مجھ " کوثر" نام کے شخص کی ذات مراد ہے! قرآن پاک میں میرے ظہور کی خوشخبری دی گئی ہے وہ جس کسی کا نام " قمر" ہوگا وہ یہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ اللہ میاں نے " والقمر" میں میرے نام کی قسم کھائی ہے، یا اس پیرایہ میں میرے وجود کی شہادت دی گئی ہے یا یہ کہ میں دُنیا میں " شاہد" بنا کر بھیجا گیا ہوں، کیونکہ " والقمر" کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ " قمر گواہی دیتا ہے"! اسی طرح موسیٰ جو بنی اسرائیل کے مشہور نبی کا نام ہے، اس کے ایک معنی " اُسترے" کے بھی لغت میں دئے گئے ہیں، تو کیا اس لغوی نام کی آڑ لے کر حجام اپنے پیشہ کی تقدیس کا ڈھنڈورا پیٹنے لگیں —

" لغات القرآن میں " الکوثر" کی تشریح یوں کی گئی ہے :—

" جنت کی ایک نہر اور حوض کا نام، جو اللہ نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خصوصی طور پر عطا فرمائی —
(عن انس مرفوعاً — مسلم) حضرت ابن عمر کی مرفوع روایت سے ثابت ہے کہ جنت کے ایک حوض کا نام ہے،
(معالم) . . . . یا عام خیر کثیر (سعید ابن جبیر از ابن عباس)
اہل لغت نے لکھا ہے کہ کوثر کثرۃ سے بنا ہے، جیسے نوفل نفل سے، جو چیز تعداد میں کثیر اور مرتبے میں باعظمت ہو اُس کو عرب " کوثر" کہتے ہیں، صاحب معجم القرآن نے حضرت ابن عباس کے قول کو راجح قرار دیا ہے "

علامہ شبیر احمد عثمانی رحمتہ اللہ علیہ نے اس لفظ کی شرح میں لکھا ہے :—

" کوثر کے معنی " خیر کثیر" کے ہیں، یعنی بہت زیادہ بھلائی اور بہتری — یہاں اس سے کیا چیز مراد ہے؟ البحر المحیط میں اس کے متعلق پچیس اقوال ذکر کئے ہیں اور آخر میں اس کو ترجیح دی ہے کہ اس لفظ کے تحت میں ہر قسم کی دینی اور دنیوی دولتیں اور حسّی و معنوی نعمتیں داخل ہیں، جو آپ کو یا آپ کے طفیل میں امت مرحومہ کو ملنے والی تھیں ان نعمتوں میں سے ایک بہت بڑی نعمت وہ " حوض کوثر" بھی ہے جو اسی نام سے مسلمانوں میں مشہور ہے اور جس کے پانی سے آپ اپنی امت کو محشر میں سیراب فرمائیں گے "

اگر " کوثر" سے امت کا کوئی مخصوص اور متعین فرد مراد ہوتا، تو امام زین العابدین، حسن بصری، نفس زکیہ، عمر ابن عبدالعزیز، امام ابوحنیفہ، امام بخاری، امام غزالی، شیخ عبدالقادر جیلانی، سید احمد شہید (رحمہم اللہ تعالیٰ) جیسی مقدس شخصیتوں میں سے کوئی ایک شخصیت ہوسکتی تھی، انگریزوں کا نیازمند، کاسہ لیس، مراق، دق، سل اور ضعف باہ کا مریض اور نبی کاذب " مرزا غلام احمد" ہرگز مراد اور مصداق نہیں ہوسکتا !

اسی رسالہ (انصار اللہ ربوہ — فروری ۱۹۶۶ء) میں :—

تبارک الذی جعل فی السماء بروجاً وجعل فیھا سراجاً وقمراً منیرا کی تفسیر کرتے ہوئے جو نتیجہ نکالا ہے وہ یہ ہے کہ :—

" . . . . . یعنی بارہ مجددین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئی حدیث مجددین کے تحت امت کے افق پر

طلوع پذیر ہوئے، آخر میں اپنے روحانی سورج سے کسب ضیا کرکے دنیا میں چاندنی بکھیرنے والا، ایک بدر کامل دنیا میں آیا......."

گویا اس "بدر کامل" سے مراد قادیانیوں کے مزعومہ مسیح موعود کی ذات ہے! حالانکہ اس آیت اور اس سے بعد والی متصل آیت میں اللہ تعالیٰ نظام فلکی اور لیل ونہار کے تغیر کا ذکر فرما کر بندوں کو ذکر وشکر اور حق معرفت کی تعلیم دے رہا ہے (لمن اراد ان یذکر او اراد شکورا) اس آیت میں شمس و بروج اور سراجاً و قمراً سے انسان مراد نہیں ہیں، مگر قادیانی جنہوں نے قرآنی مفہوم کی تحریف کا ٹھیکہ لے رکھا ہے، اس آیت کو بھی ان کی نبی امی سے منسوب کرکے چھوڑا، اور اس کے معانی کی ضلالت آمیز تاویلیں کرکے اس کا جوڑ مرزا غلام احمد کی ذات سے ملا دیا۔

ہذیانات وکفریات

ولایت اور فنا فی الرسول کا دعویٰ کوئی دینی اور شرعی حیثیت نہیں رکھتا، مرزا غلام احمد قادیانی کا یہ پیش موقف ہی غلط، مشتبہ اور اضطراب انگیز ہے: جو کوئی یہ کہے مجھے ولی، فنا فی اللہ، فنا فی الرسول کا جو رتبہ مجھے حاصل ہوگیا ہے، اس کا اعتراف اور احترام کرو ——— ایسا کہنے والا اصل ذہنی اور فکری طور پر اصابت و صحت کی بجائے خلجان و اضطراب میں مبتلا ہے! مرزا مذکور مجدد بھی نہیں مانا جا سکتا کہ اس نے کسی قسم کا کوئی تجدیدی کارنامہ انجام نہیں دیا، مجدد اور مصلح کو تو بڑا اور جری عزیمت اور اعلان حق کے معاملے میں بے باک وجری ہونا چاہئے مگر اس کے برعکس مرزائے قادیان نے انگریزوں کی استبداد و جابرانہ حکومت کی نیازمندی پر فخر کیا ہے اور اسے اسلام کے لئے چشمہ فیض بتایا ہے اور خود اپنے بارے میں کہا ہے ——— "میں گورنمنٹ کے لئے بمنزلہ حرز سلطنت کے ہوں" انگریزوں کی نیازمندی، وفاداری، محبت اور خیر خواہی جس شخص کا شعار رہا ہو اور انگریزوں کی خوشنودی کے لئے جس نے "فریضہ جہاد" کو منسوخ کردیا ہو وہ مجدد دین نہیں "مخرب دین" ہے!

مہدی اور مسیح کے ظہور کی جو علامات روایتوں میں پائی جاتی ہیں اور جس دور میں ان شخصیتوں کا ظہور ہونا چاہئے نہ تو وہ مرزا غلام احمد میں پائی گئیں اور نہ وہ دور ان روایتوں سے مطابقت رکھتا تھا، جس دور میں ان شخصیتوں کا ظہور ہونا چاہئے! مہدی سے اگر امت مسلمہ کا صاحب عزیمت لیڈر مراد لی جائے تو بھی مرزا غلام احمد "مہدی سوڈانی" کے درجہ کا آدمی بھی نہیں ہے!

حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام کا جس شان کے ساتھ دنیا میں نزول ہوگا اور جو انقلابی کارنامے وہ انجام دیں گے جو نشانیاں اور علامتیں ان کے بارے میں روایتوں میں ملتی ہیں، مرزا غلام احمد کی ذات وشخصیت میں اس طرح کی کوئی ایک دھندلی علامت بھی نہیں پائی گئی! حضرت عیسیٰ کے نزول کا ساری دنیا میں شہرہ ہو جائے گا اور دھوم مچ جائے گی، امت مسلمہ کی غالب اکثریت ان کی عظمت اور شان مسیحیت کا اعتراف کرے گی۔ مگر اس کے برخلاف مرزا غلام احمد قادیانی کی عجیب وغریب "مسیحیت موعود" ہے کہ خود اس کے زمانے میں چند ہزار سے زیادہ ماننے والے اسے میسر نہ آسکے اور قریب قریب تمام اسلامی دنیا اس کے نام اور کام سے بے خبر رہی! یہ کیسی نامقبول، غیر ہر دلعزیز اور تنگ وتاریک "مسیحیت موعود" ہے کہ ساٹھ سال کی مدت گزرنے کے بعد بھی مرزا کے ماننے والوں کی تعداد تین چار لاکھ سے زیادہ نہ ہو سکی! اس پر ممکن ہے حضرت نوح علیہ السلام کو مثال میں پیش کیا جائے کہ حضرت نوح کی سالہا سال کی تبلیغ کے بعد بھی اہل ایمان کی تعداد بہت قلیل رہی مگر یہ ایسی مثال ہے جو قیاس مع الفارق کی مصداق ہے، حضرت نوح جس ماحول میں مبعوث ہوئے تھے وہ زیادہ تر کافروں کا ماحول اور معاشرہ تھا، مرزا غلام احمد کو وہ زمانہ ملا جب دنیا میں مسلمان کروڑوں کی تعداد میں موجود تھے، اس صورت میں اس کی "مسیحیت" کو قبول عام حاصل ہونا چاہئے تھا، اس لئے کہ حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام جب دنیا میں نزول فرمائیں گے تو امت مسلمہ کی جانب سے ان کی مسیحیت اور تقدیس وعظمت کا عام اعتراف کیا جائے گا۔ ——— مرزا غلام احمد کی "مسیحیت" کو امت مسلمہ نے رد کردیا، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ مرزا کسی جہت سے "بھی" [illegible] ۔ پھر مسیح موعود کا جب ظہور ہوگا تو امت میں ان کے ظہور کے سبب کسی نئی امت، جدید جماعت، یا سلسلہ کے قائم ہونے کی ضرورت پیش نہ آئے گی مگر مرزا

غلام احمد کی مزعومہ مسیحیت موعود نے امت میں افتراق و اختلاف پیدا کر دیا۔ اس کے سبب ایک ایسی جداگانہ امت وجود میں آگئی جو اپنے سوا تمام دوسرے مسلمانوں کو کافر سمجھتی ہے اور تمام امت مسلمہ اس جماعت کو کافر جانتی ہے۔

اب رہا مرزا کا "دعوائے نبوت" تو اس بارے میں مرزا کا کیا عقیدہ ہے اُسے پہلے پڑھ لیا جائے:۔

"ان تمام امور میں میرا وہی مذہب ہے جو دیگر اہل سنت وجماعت کا مذہب ہے ...... اب میں مفصلہ ذیل امور کا مسلمانوں کے سامنے صاف صاف اقرار کرتا ہوں، اس خانہ خدا (جامع مسجد دہلی) میں کہ میں جناب خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت کا قائل ہوں اور جو شخص ختم نبوت کا منکر ہو اس کو بے دین اور دائرہ اسلام سے خارج سمجھتا ہوں۔" (مرزا غلام احمد کا تحریری بیان مندرجہ تبلیغ رسالت جلد دوم صفحہ ۴۴)

اور

"...... ظاہر ہے کہ اگرچہ ایک ہی دفعہ وحی کا نزول فرض کیا جائے اور صرف ایک ہی فقرہ حضرت جبرئیلؑ دیں اور چپ ہو جاویں یہ امر بھی ختم نبوت کے منافی ہے" (ازالہ اوہام صفحہ ۵۷۷ مرزا غلام احمد قادیانی)

اس عقیدہ کے بعد مرزا کے قول وعمل کا تضاد ملاحظہ ہو:۔

"میں کوئی نیا نبی نہیں ہوں، پہلے بھی کئی نبی گزرے ہیں، جنہیں تم لوگ سچا نبی مانتے ہو"

(مرزا غلام احمد قادیانی مندرجہ اخبار بدر مورخہ ۱۹ اپریل ۱۹۰۸ء)

اس دعوے کے بعد اپنے ہی قول کے مطابق کیا مرزا غلام احمد نبوت کا دعویٰ کر کے دائرۂ اسلام سے خارج نہیں ہو گیا۔

اور

"چونکہ میری تعلیم میں امر بھی ہے اور نہی بھی اور شریعت کے ضروری احکام کی تجدید ہے اس لئے خدا تعالیٰ نے میری تعلیم کو اور اُس وحی کو جو مجھ پر ہوتی ہے، فُلک یعنی کشتی کے نام سے موسوم کیا ......"

(حاشیہ اربعین نمبر ۴ صفحہ ۸۳ مصنفہ مرزا غلام احمد قادیانی)

"ازالہ اوہام" سے مرزا کی تحریر کا جو اقتباس چند سطر پہلے دیا گیا ہے اس کی بنا پر مرزا کا یہ دعویٰ کہ مجھ پر "وحی" آتی ہے کیا "ختم نبوت" کے منافی نہیں ہے؟ مرزا غلام احمد کی تحریروں میں جو شدید قسم کا تناقض اور کھلا ہوا تضاد پایا جاتا ہے وہ کسی معمولی شریف آدمی کے لئے بھی باعث ننگ اور عار ہے، چہ جائیکہ ایسے کاذب اور فلط گو سے ولایت، مجددیت یا نبوت منسوب کی جائے (استغفر اللہ)

مرزا غلام احمد سب سے پہلے اپنی ولایت اور فنافی الرسول ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، پھر مجددیت، مہدویت، اور مسیحیت موعود کا! اس کے بعد بروزی اور ظلی نبی ہونے کا۔ اور ضلالت کی یہ سطح پھر اتنی نیچی ہو جاتی ہے کہ وہ دوسرے نبیوں کی طرح (جو نہ بروزی تھے اور نہ ظلی) اپنے نبی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے ایسی نبوت کا اعلان جس میں امر و نہی بھی پائے جاتے ہیں اور وحی بھی! اس کے ہذیانات کا یہ عالم ہے، کبھی کہتا ہے آسمان پر میرا نام محمد اور احمد ہے' اور محمد کی نبوت آخر نبوت ہی کو ملی ـــــــــ کبھی یہ کہ میں اس امت کا یوسفؑ ہوں، ابراہیم ہوں اور کرشن بھی ہوں! یہاں تک کہ اس کے دعوؤں کی حد "الوہیت" سے جا کر مل جاتی ہے! شروع ہی سے اس کے دعوے کی بنیاد خبث نفس اور فساد باطن پر ہے اس لئے اس کے جھوٹ، ہذیان، آوارہ دماغی کذب و افترا اور ضلالت میں درجہ بدرجہ ترقی اور پھیلاؤ پیدا ہوتا جاتا ہے' اُسے کچھ یاد نہیں رہتا کہ پہلے اُس نے کیا کہا تھا

ملہ ایک دوسرے قادیانی بندہ چن (دھشیشور) نے بھی "مثیل یوسف" کا دعویٰ کیا تھا! یہ وہ کفر و ضلالت ہے جو بروز، ظل، مثیل اور اسی قسم کی دوسری اصطلاحات کا سہارا لے کر اپنی نمود چاہتی ہے۔

اور اب کیا کہہ رہا ہے!

مسیح موعود کا دعویٰ کرنے کے ساتھ اُسے خیال آتا ہے کہ وہ تو ابن مریم ہوں گے، اس حرف و خصوصیت کو اپنی ذات سے منسوب کرنے کے لئے مرزا یہ تاویل گھڑتا ہے!

"مریم کی طرح عیسیٰ کی روح مجھ میں نفخ کی گئی اور استعارہ کے رنگ میں مجھے حاملہ ٹھیرایا گیا اور آخر کئی مہینہ کے بعد جو دس مہینہ سے زیادہ نہیں، بذریعہ الہام کے مجھے مریم سے عیسیٰ بنایا گیا اس طور سے میں ابن مریم ٹھیرا"
(کشتی نوح صفحہ ۴۷)

حدیث شریف میں آیا ہے کہ حضرت مسیح دمشق کے مینارۂ سفید کے پاس نازل ہوں گے، نزول مسیح کی اس علامت کی مرزا نے جو تاویل کی ہے وہ پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے:-

"........ واضح ہو کہ دمشق کے لفظ کی تعبیر میں میرے پر من جانب اللہ یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ اس جگہ ایک قصبہ کا نام رکھا گیا ہے جس میں ایسے لوگ رہتے ہیں جو یزیدی الطبع اور یزید پلید کے عادات اور خیالات کے پیرو ہیں...... خدا تعالیٰ نے مجھ پر یہ ظاہر فرمایا کہ قصبہ قادیان بوجہ اس کے کہ اکثر یزیدی الطبع لوگ اس میں سکونت رکھتے ہیں، دمشق سے ایک مناسبت اور مشابہت رکھتا ہے" (حاشیہ ازالہ اوہام ص ۶۳ تا ۷۳)

یہ ہے خود ساختہ جھوٹی نبوت کا وہ "علم کلام" جس نے قرآن اور احادیث کا "مثلہ" کر کے رکھ دیا ہے! جو لوگ "یتخبطہ الشیطان" کا مصداق ہیں اور جن کا مت ماری گئی ہے وہی اس قسم کی لغو تاویلوں کو "وحی و الہام" سمجھ کر قبول کر سکتے ہیں، ورنہ جس کسی کے پاس ذرہ برابر بھی عقل و فہم ہے اور جو کوئی حق و انصاف کی ذرہ اسی مقدار بھی رکھتا ہے وہ اس قسم کی تاویلوں اور نکتہ آفرینیوں کو "فریب شیطان" ہی کہے گا!

قادیان میں مسلمان بستے تھے، جنہوں نے مرزا کی خود ساختہ نبوت کو تسلیم نہیں کیا، اس جرم میں مرزا نے ان کو "یزیدی الطبع" اور "یزید پلید کا پیرو" کہا ہے بعض دوسری تحریروں میں بھی قادیانی مرزا نے مسلمانوں کو کنجری کی اولاد اور اسی قسم کی شدید گالیوں سے یاد کیا ہے! اس کی بعض تحریروں میں انبیاء کرام کی منقصت بھی کی گئی ہے، مرزا کی ان تحریروں سے سادہ کرو ڑ مسلمانوں کی دل آزاری ہوتی ہے ---- ہم اگر اس مزاج و فکر اور سیرت و کردار کے آدمی کے لئے وہی الفاظ استعمال کرتے ہیں، جس کا وہ مستحق ہے، تو قادیانی کیمپ میں اضطراب پیدا ہو جاتا ہے! مگر قادیانیوں کو اس کی چھوٹ ملی ہوئی ہے کہ وہ ایسی کتابوں اور تحریروں کو دھڑلے کے ساتھ چھاپتے رہیں، جن میں قرآن و حدیث کی معنوی تحریف کی گئی ہے، جن سے انبیاء کرام کی منقصت ہوتی ہے، جن میں مسلمانوں کو گالیاں دی گئی ہیں! اور ہم جھوٹے کو جھوٹا کہہ دیں اور نبی کاذب کے نام کے ساتھ "حضرت" اور "جناب" کے القاب استعمال نہ کریں اور اس کے نام اور ذکر کے ساتھ تعظیم و احترام کے القاب و آداب نہ لائیں تو ہماری تحریروں کو "مغلظات" اور "دل آزارانہ" کہا جاتا ہے! ----- کیا مسیلمہ کذاب کا ذکر اس طرح کیا جا سکتا ہے:-

"جناب مسیلمہ نے جب نبوت کا دعویٰ فرمایا"

اور اسود عنسی کے بارے میں اس انداز نگارش کو کوئی مسلمان اختیار کر سکتا ہے:-

"حضرت اسود عنسی ایک ایسے عرب قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے"

ہم ڈنکے کی چوٹ اعلان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی بھی "مدعی نبوت" (خاص طور سے مرزا غلام احمد) کے لئے ہمارے دل میں ذرہ برابر بھی عزت و احترام نہیں پایا جاتا بلکہ ان کی دشمنی اور نفرت سے ہمارا دل لبریز ہے، اور ان کی عداوت و نفرت اور حقارت و بیزاری پر ہم اپنے ایمان کا خاتمہ چاہتے ہیں! اور اپنے اس قول و عمل پر اللہ تعالیٰ سے اجر و جزا کی امید رکھتے ہیں!

مرزا غلام احمد اگر بہاء اللہ ایرانی کی طرح نئے مذہب اور جدید شریعت کا اعلان کر دیتا تو اسے اور اس کے معتقدین کو قرآن و حدیث کے مفہوم میں تحریف کی مشقت گوارا نہ کرنی پڑتی، مگر مرزا غلام احمد نے مسلمانوں کو گمراہ کرنے اور دھوکا دینے کے لئے قرآن و حدیث کے اتباع ہی کے نام پہ قرآن و حدیث کے مفہوم و معنی کو بگاڑ کر رکھ دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف و منقبت کی آڑ لے کر حضورؐ کی نبوت کے مقابلہ میں اپنی نبوت کا ڈھونگ کھڑا کر دیا۔

بعض ارباب فکر کا خیال ہے کہ مرزا غلام احمد کی شخصیت کے پس پردہ حکیم نور الدین کی ذہانت کام کرتی تھی، یہ شخص بعض صوفیوں کی غیر محتاط نکتہ آفرینیوں اور شطحیات کی بنیاد پر مرزا کو طرح طرح کے دعووں کے لئے ابھارتا رہتا تھا، اس نبوت کی بے مائیگی اور بے بضاعتی کو کیا کہئے جو اپنے ثبوت کے لئے صوفیاء کے غلبہ حال اور شطحیات کے سہارے کی محتاج ہو۔

قادیانی علم کلام میں ــــــ "خاتم النبیین" ــــــ کی یہ شرح و تفسیر کہ ۔

"...... نبیوں کی مہر ہے (یعنی انہیں افاضہ فیضان کی مہر عطا کی گئی ہے، یہ مہر اپنے اور بھی نقوش اپنی طرح کے پیدا کرے گی)"

(الفضل اخبار قادیان، فروری ۱۹۶۶ء)

کس قدر لغو اور فریب آمیز ہے ! مرزا غلام احمد نے دعویٰ کیا تھا ۔

● ــــ "وحی الٰہی میں میرا نام محمد رکھا گیا اور رسول بھی ...."

● ــــ "... اگر کوئی شخص اسی خاتم النبیین میں ایسا گم ہو کہ بباعث نہایت اتحاد اور نفی غیریت اسی کا نام پا لیا ہو، اور صاف آئینہ کی طرح محمدی چہرہ کا اس میں انعکاس ہو گیا ہو تو وہ بغیر مہر توڑنے کے نبی کہلائے گا کیونکہ وہ محمد ہے ظلی طور پر ...."

ــــــــــ اور ــــــــــ

● ــــ "محمدؐ کی نبوت آخر محمد ہی کو ملی گو بروزی طور پر ...."

مرزا کے ان لغو دعاوی کو سند جواز عطا کرنے کے لئے قادیانی حضرات "خاتم النبیین" کی اس قسم کی شرح و تفسیر کیا کرتے ہیں جس کا نمونہ اوپر دیا گیا ہے حالانکہ اس لفظ کے سیدھے سچے اور صاف و واضح معنی یہ ہیں ۔ــــ

"خاتم ــــ مہر، ختم کرنے والا، "خواتم" اور "ختم" جمع، چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی تھے اور آپ پر نبوت ختم ہو گئی اور آپ کے بعد کوئی (نیا) نبی نہیں آنے والا، اس لئے قرآن مجید نے آپ کو "خاتم النبیین" (مہر سب نبیوں پر) فرمایا یعنی تمام نبیوں کا ختم کرنے والا، کیونکہ سب کے اخیر میں مہر لگائی جاتی ہے"

(لغات القرآن ــــ جلد دوم ــــ مولانا عبد الرشید نعمانی)

کسی مفسر اور شارح نے "خاتم النبیین" کے یہ معنی بیان نہیں کئے کہ حضور کو اللہ تعالیٰ نے افاضہ فیضان کی مہر عطا فرمائی تھی ۔ اور یہ مہر اپنے اور بھی نقش و نگار اپنی طرح کے پیدا کیا کرے گی، سامنے کی بات یہ ہے کہ ہدایت و ایمان ہو یا ولایت و مجددیت یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کی جاتی ہیں ۔ سی ئے قرآن پاک میں "اولیاء اللہ" آیا ہے "اولیاء الرسول" نہیں آیا ۔ اور قرآن اس پر شاہد ہے کہ عطاء نبوت کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف کی ہے ، وہ کسی نبی نے اپنا جیسا "ظل" اور "بروز" "نبی مبعوث نہیں کیا ــــ پھر اللہ تعالیٰ نے انبیاء کے ناموں کی لکھی ہوئی فہرست کے کاغذ پہ یا کسی بوتل پر سونے، چاندی یا کسی اور دھات کی بنی ہوئی "مہر" نہیں لگا دی تھی، بلکہ یہ قرآن کا اسلوب بیان ہے جو فطرت اور ثبت بدہ کے عین مطابق ہے، یہ کہ بادشاہوں کے فرمان کے آخر میں مہر لگائی جاتی ہے، جس کے بعد کسی لفظ کا اضافہ نہیں ہوتا۔ اسی طرح "خاتم النبیین" سے یہ مراد ہے کہ حضورؐ

فہرست انبیاء اور گوشوارۂ رسل کی مہر ہیں کہ اب آپ کے بعد اس فہرست میں کسی نئے نبی کے نام کا اضافہ نہیں ہوسکتا، نبوت آپ کی ذات گرامی پر ختم کر دی گئی۔

قادیانیوں کی یہ لغو منطق کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو افاضۂ فیضان کی مہر عطا کی گئی ہے اور وہ مہر اور بھی نقوش اپنی طرح کے پیدا کرے گی، اس سے کیا یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہی جیسے انبیاء اور رسل پیدا کرتے رہیں گے۔ اس عقیدہ کی ضرب نبوت و رسالت کی اہمیت پر جا کر پڑتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء کی بعثت کی غرض وغایت اور عظمت و تقدس اس سے مجروح ہوتا ہے۔ سوال فیضانِ نبوت کی یہ مہر کیا آپ ہی آپ اپنے نقوش پیدا کر رہی ہے؟ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم و اطلاع سے ایسا ہوتا ہے؟ یہ مہر خود بخود اپنی طرح کے نقوش پیدا کر رہی ہے تو ایسی مہر کو (بلا تشبیہ) چھاپہ خانہ کی مشین جیسا سمجھنا چاہیے جو ایک بار حرکت دینے کے بعد آٹومیٹک طور پر چلتی رہتی ہے اور کاغذوں کو چھاپے جاتی ہے! اگر "خاتم النبیین" کے بارے میں یہ عقیدہ، یہ تصور اور اس لفظ کی ایسی تشریح عقل ونقل دونوں کے خلاف ہے! اب رہا "فیضانِ نبوت" تو وہ دنیا میں کتاب و سنت کے ذریعہ جاری ہے، حضورؐ نے دنیوی حیات میں صحابہ کرام کا تزکیہ نفس اپنی تعلیمات اور فیضِ صحبت سے فرمایا اور خزف ریزوں کو لعل و گہر بنا دیا، دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد اب فیضانِ نبوت کتاب و سنت اور حضورؐ کے خلقِ عظیم کے چھوڑے ہوئے نقوش کے ذریعہ جاری ہے، اور قیامت تک جاری رہے گا، صراطِ مستقیم اور راہِ نجات اسی شاہراہ کا نام ہے جس میں حضورؐ کے نقشِ قدم نظر آتے ہیں۔

به مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

یہ خیال سو فیصدی غیر اسلامی ہے کہ عالم برزخ میں روحانیت کا کوئی محکمہ قائم ہے جہاں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولایت مجددیت، قطبیت یا اپنے بروز، عکس اور ظل کے مناصب اور عہدے عطا فرماتے رہتے ہیں! ولایت و مجددیت ہو یا مجددیت ان کی عطا اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے! ہاں! یہ ضرور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے بغیر یہ "عطا" کسی کو نہیں مل سکتی۔ "اطاعتِ رسولؐ" جو تمام مکارم و فضائل کا ذریعہ اور اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کا واسطہ ہے اسی کا نام "فیضانِ نبوت" ہے!

قادیانیوں نے جھوٹی نبوت کو سندِ جواز دینے کے لئے دراصل یہ لغو نظریہ گھڑا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے، افاضۂ فیضان کی مہر کے ذریعہ بروزی اور ظلی قسم کے انبیاء ظہور میں آتے رہیں گے! بعض لوگ اس سے دھوکے میں پڑ جاتے ہیں کہ اس عقیدہ سے تو ہمارے رسولؐ کی شان اور زیادہ عظیم و برتر نظر آتی ہے، حالانکہ یہ عقیدہ "شرک فی النبوت" کا مظہر و ترجمان ہے اور اس سے "ختم نبوت" کی کھلے طور پر نفی ہوتی ہے۔

دین میں حجت کتاب و سنت ہیں اور ان کے بعد اجماعِ صحابہ دین میں مستند نظیر کی حیثیت رکھتا ہے، ایسی نظیر جس کی پیروی میں اُمت کے لئے خیر و فلاح ہے! کتاب و سنت اور اجماعِ صحابہ کے بعد کسی بزرگ، شیخ، صوفی یا امام کا جو کوئی قول، عمل یا رسم و طریقہ ہمارے سامنے آئے گا، اسے کتاب و سنت کی کسوٹی پر جانچا جائے گا، اور آثارِ صحابہ سے اُس کی مطابقت کی جائے گی!

اسلامی ادب دکھوں بلکہ کروڑوں صفحات پر پھیلا ہوا ہے، اس میں ہر طرح کی باتیں موجود ہیں، خاص طور سے صوفیاء کے مکاشفات و ملفوظات کا معاملہ خاصہ غور طلب ہے، نہ جانے انہوں نے کیا فرمایا اور سننے والوں نے کن لفظوں میں اُسے مکتوب و محفوظ کیا۔ جو بات یہ بزرگ کہنا چاہتے تھے، الفاظ اُس کے پورے طور پر متحمل ہوتے بھی یا نہیں! اس کے ساتھ فنِ تصوف ہی میں سکر، غلبۂ حال اور شطح کی اصطلاحیں بھی ملتی ہیں۔ اس لئے دینی مباحث میں صوفیاء کرام کے اقوال و مکاشفات اور احوال و مقامات سے سند لینا اور انہیں دینی حجت سمجھنا خطرناک قسم کی غلطی ہے!

"فاران" میں اس قسم کے مباحث آچکے ہیں مثلاً ایک بہت بڑے عالم اور صاحب ارشاد و تصوف شیخ کی اس تحریر پر کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مستقل بالذات نبی ہیں، دوسرے انبیاء کو آپ کے فیض سے نبوت ملی ہے" (مفہوم کی ترجمانی) ہم نے سخت تنقید کی تھی کہ ہر نبی اپنی جگہ مستقل بالذات نبی تھا اور اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا تھا، کسی نبی کو نبوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ یا فیض سے نہیں ملی! اور قرآن شریف تو یہ تک بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض رسولوں کے حالات بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں بتائے! ہماری اس تنقید کو ان بزرگ کے حلقے کے علماء اور ارباب نظر نے پسند کیا اور ہماری تائید فرمائی!

ایک صاحب بزرگ کے حالات کا تذکرہ "فاران" میں تبصرے کے لئے آیا، تو اس میں اس قسم کی عبارت نگاہ سے گزری کہ سیدہ فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا نے ان بزرگ کی تربیت فرمائی تھی، یا روحانیت کا کوئی عہدہ دیا تھا (الفاظ ذہن میں نہیں ہیں) ہم نے اس عبارت پر تنقید کرتے ہوئے لکھا کہ حضرت فاطمہ ہوں یا حضرت عائشہ صدیقہ یا کوئی دوسرا صحابی ان میں سے کوئی بھی قبر و برزخ یا علیین سے نہ تو کسی کی تربیت فرما رہا ہے اور نہ روحانیت کے عہدے تقسیم کرنا یہ روحانیت کا نظم ہے یا بادشاہی کا، یہ خدا تعالیٰ کی قدرت و مشیت سے چل رہا ہے۔ انسانی کی ربوبیت نشو و نما اور تربیت و ترقی کا کام سر انجام دے رہا ہے۔

اسلامی ادب ہی کی کتابوں میں "انا الحق" ـــــ سبحانی ما اعظم شانی ـــــ الفقرا فاتم ہوالشایان است اور "من تو شدم تو من شدی" جیسی بہت سی مثالیں اور تحریریں ملتی ہیں ـــــ کوئی احمق اپنے "خدا" ہونے کا دعویٰ کرتے ہوئے، ان مثالوں کو سند و حجت کے طور پر پیش کرے تو کیا یہ مثالیں کسی معقول آدمی کے نزدیک قابل توجہ ہو سکتی ہیں۔

اسی طرح نبوت کے فیضان اور حقیقت محمدیہ کے بیان میں بھی بعض ایسی نکتہ آفرینیاں کتابوں میں ملتی ہیں، جو "احمد بے میم" اور "عرب بے عین" کا مزاج رکھتی ہیں، ان میں ولایت و مجددیت کے لئے نبوت کے ظل و عکس کی اصطلاحیں بھی استعمال کی گئی ہیں، مگر آج تک کسی ولی اور مجدد نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ میں "بروزی" اور "ظلی نبی" ہوں، اور اس دعوے کے ساتھ نبوت کا پورا نسبتی ٹریکشن اپنے لوازم کے ساتھ وجود میں آگیا ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ساڑھے تیرہ سو سال کی طویل مدت میں صرف مرزا غلام احمد قادیانی کی ایک مثال ایسی ملتی ہے کہ اس نے "بروز" و "ظل" کی آڑ لے کر اپنی مستقل نبوت کا اعلان کر دیا، اور اس کی جداگانہ امت بن گئی! جن مجددین اکرام و شیوخ نے اپنی مجددیت اور ولایت کو نبوت و رسالت کا عکس و ظل کہا یا سمجھا، کیا انہوں نے نبوت کا دعویٰ کیا! اور یہ کہا کہ ہم پر وحی آتی ہے اور جو ہم کو نہیں مانتا وہ مسلمان نہیں کافر ہے! ان بزرگوں میں بہت سوں کے نام "غلام احمد" نہیں "محمد" اور "احمد" بھی تھے اور بعض تو خانوادۂ اہلبیت سے نسبی تعلق رکھتے تھے۔ کوئی مسلمان ہی نہیں غیر مسلم مستشرق بھی علم و فضل اور تزکیہ و تقویٰ میں حسن بصری، امام ابو حنیفہ، سفیان ثوری، عبد اللہ ابن مبارک، امام بخاری، شیخ عبد القادر جیلانی، امام ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ رحمہم اللہ تعالیٰ جیسے اکابر کے مقابلہ میں مرزا غلام احمد قادیانی کو کوئی درجہ نہیں دے سکتا، بلکہ یہ شخص تو ان بزرگوں کی جوتیوں میں بیٹھنے کی بھی اہلیت نہیں رکھتا! جب امت مسلمہ کے سامنے ہزاروں ایسے بزرگ ہوں جو مرزا غلام احمد قادیانی سے علم و فضل اور تقویٰ میں کروڑ گنا بڑھے ہوئے ہیں تو امت مسلمہ ان نفوس قدسیہ کے ہوتے ہوئے مرزائے قادیان کو مسیح موعود یا نبی کس طرح مان سکتی ہے!

ہو سکتا ہے کہ کسی صوفی نے یہ کہہ دیا ہو کہ میری ولایت اور قطبیت نبوت کا ظل و عکس ہے اور میں الہام کے بغیر کوئی بات زبان سے نہیں نکالتا اور جب چاہتا ہوں اللہ تعالیٰ سے براہ راست کسی فرشتے کے واسطہ کے بغیر ہم کلام ہو جاتا ہوں اور میں قرب کے ان مقامات کی سیر کرتا ہوں، جہاں اولوالعزم انبیاء بھی نہیں پہونچ سکے! فیضان نبوت کی بدولت زمین و آسمان کی کوئی شے مجھ سے چھپی ہوئی نہیں ہے، میں حرف کن بھی ہوں اور نقطۂ الست بھی! ـــــ ان میں بعض باتیں بہت زیادہ قابل گرفت شطحیات۔

لہ ورسلا قد قصصنهم علیک من قبل ورسلا لم نقصصهم علیک ہم یہاں بر سبیل تنزل کہہ رہے ہیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ کفر یات مادے کے بعد کوئی [illegible]

ہیں اور بعض مجذوب کی بڑ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتیں، مگر اس صوفی کے مقابلہ میں دوسرا شخص اس قسم کی شطحیات کے ساتھ اپنے "نبی" ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اُس کے نام کے ساتھ علیہ السلام اور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم لکھا جاتا ہے' وہ کہتا ہے کہ مجھ پر وحی آتی ہے' جو میری نبوت اور مسیحیت کو نہیں مانتا وہ کافر ہے' اس کے دوست اور ساتھی صحابہ کہے جاتے ہیں اور اس کے نبوت کے دعوے کی بنیاد پر ایک جماعت وجود میں آ جاتی ہے، یہ مدعیٔ نبوت اور اس کے اُمتی اسی صوفی کے اقوال کو سند و حجت میں پیش کرتے ہیں کہ یہ بات فلاں صوفی بھی تو فرما چکے ہیں! حالانکہ اوّل تو دین و شریعت میں صوفی کا قول و عمل حجت نہیں، پھر اُس صوفی کی شطحیات کو اہل نظر اور کتاب و سنت کے جاننے والوں نے اہمیت کب دی تھی، پھر اُس صوفی نے کچھ عجیب و غریب باتیں کہہ دی تھیں، مگر اُس نے نبوت کا دعویٰ تو نہیں کیا تھا، اُس کے ماننے والوں نے اس صوفی کو مامور من اللہ جان کر کوئی امت تو نہیں بنائی تھی۔

تصوف کی طرح شعر و ادب میں "خدائے سخن" اور "پیغمبر سخن" کے القاب و خطابات ملتے ہیں، مولیٰنا گرامی نے علامہ اقبال کو شاعرانہ زبان میں اس طرح خراج عقیدت پیش کیا۔

دیدۂ صاحب نظراں حضرت اقبال — پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت

یہ مشہور مصرعہ ضرب المثل بن گیا ہے ؎

شاعری جزویست از پیغمبری

ایک شاعر نے تو یہاں تک کہہ دیا ؎

ایک ایک حرف مجھ پہ اترتا ہے عرش سے — میری بیاضِ شعر خدا کی کتاب ہے

اور

مثنوی مولوی معنوی — ہست قرآں در زبان پہلوی

کیا شعر و تصوف کے یہ "لطائف" دین و شریعت کے معاملات و مسائل میں حجت و سند و نظیر کے طور پر پیش کئے جا سکتے ہیں! اور نبوت کتنی ہلکی، بے وقعت، کھوکھلی اور سفلی ہے جو شعر و تصوف کی ایسی شوخیوں سے اپنے لئے دلیلیں لاتی ہے۔

فقہ کے فروعی مسائل کی طرح دین کے بنیادی ارکان و عقائد میں اختلاف نہیں پایا جاتا "ختم نبوت" کا عقیدہ فرعی نہیں دین کا بنیادی عقیدہ ہے، منصوص عقیدہ! یہ عقیدہ فقہ و حدیث کے ائمہ نے کتاب و سنت سے مستخرج بھی نہیں کیا، یعنی یہ کہ کتاب و سنت میں درک و صریح الفاظ تو نہ ملتے ہوں، بلکہ نص کے ایماء، اشارے یا اقتضاء کی بنیاد پر علماء امت نے اس عقیدۂ نظریہ یا مسئلہ کا استنباط اور استخراج کیا ہو، "ختم نبوت" کے لئے کتاب و سنت میں واضح اور محکم الفاظ ملتے ہیں، جن میں کسی قسم کا کوئی شبہ نہیں پایا جاتا، قرآنی عقیدہ "خاتم النبیین" کی شرح و تفسیر خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "لا نبی بعدی" جیسے واضح الفاظ سے بتکرار فرمائی ہے! ہم جو کلمہ پڑھتے ہیں جس کا پہلا جز "لا الٰہ الا اللہ" ہے تو اس سے اللہ تعالیٰ کے سوا ہر کسی کے "الٰہ" ہونے کی قطعی نفی ہوتی ہے، کوئی بدبخت یہ دعویٰ کرے کہ حقیقی الٰہ تو اللہ تعالیٰ ہی ہے، میں تو "بروزی الٰہ" ہوں، اور اس اعلان کے بعد وہ اپنی طرف سے کسی شخص کے "نبی" ہونے کا اعلان بھی کر دے کہ یہ بھی مجھ "بروزی الٰہ" کا "بعدی نبی" ہے، اور میں جو اپنے "بروزی نبی" کو وحی کرتا ہوں، یہ بھی "بروزی وحی" ہے! جن اپنے کفر و الحاد اور شرک و ضلالت کے لئے وہ دلیل یہ لاتے کہ بادشاہوں کو "ظل اللہ" کہا ہی جاتا ہے اور فلاں صوفی نے یہ کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کا میں مظہر کامل ہوں اور وحدت الوجود کے نظریہ کی بنا پر غیر کا وجود تو کائنات میں پایا ہی نہیں جاتا، کائنات کی عینیت واجب الوجود کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

؎ خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ

کبیر داس جن کی ذات دیانت اور تصوف کا سنگم تھی فرماتے ہیں :-

؎ آپ ہی مسجد، آپ ہی ملّا، آپ ہی بانگ پکارا
کہیں کبیر، سنو بھئی سادھو! ہر جیسے کو ویسا

اور ایک صوفی شاعر نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ ـــــ

من خدایم من خدایم، من خدا

جس طرح "بروزی اور ظلی الٰہ" کا یہ دعویٰ اور یہ دلیلیں سراسر کفر و ضلالت ہیں، اسی طرح "خاتم النبیین" کی نص قطعی اور "لا نبی بعدی" کی نبوی شرح و تفسیر کے بعد، کسی کا یہ دعویٰ کرنا کہ میں "بروزی یا ظلی نبی" ہوں، سراسر گمراہی اور کفر و الحاد ہے؛ کتاب و سنت کے قطعی نصوص کے مقابلہ میں امام غزالی، شیخ محی الدین عربی یا مولانا قاسم نانوتوی کی کسی مبہم تحریر کا کوئی صوفیانہ اشارہ ذرہ برابر کوئی وزن نہیں رکھتا، نص کے مقابلہ میں نص ہی کو لایا جا سکتا ہے۔ ان بزرگوں یا کسی دوسرے صوفی اور عالم کے یہاں اس قسم کی عبارتیں یا اشارے ملتے بھی ہیں کہ مجددیت اور ولایت نبوت کا ظل ہوتی ہیں اور مجددین اپنی شان کے لحاظ سے گویا "نبیِ وقت" ہوتے ہیں (وعلیٰ ہذا) ـــــ تو یہ دراصل ولایت و مجددیت کے منصب اور فضیلت و تکریم کے اعتراف و اظہار کا پیرایۂ بیان ہے ورنہ ان بزرگوں کے زمانہ میں کوئی شخص بروزی اور ظلی نبی ہونے کا دعویٰ کرتا، اور یہ کہتا کہ مجھ پر وحی آتی ہے اور اس دعوے کی بنیاد پر اُس کے "امتیوں" کی جماعت اور نبوت کا پورا انسٹی ٹیوشن وجود میں آ جاتا، تو یہ بزرگ بلاشبہ اُس مدعیِ نبوت کو مرتد اور کافر قرار دیتے جس طرح مرزا غلام احمد کے زمانہ کے علماء نے بالاتفاق مرزا کی تکفیر کی؛ مرزا کے زمانہ میں متحدہ ہندوستان میں جہاں کروڑوں اہلِ ایمان کی آبادی تھی، تھوڑے سے بہت اولیاء اللہ تو ضرور رہے ہوں گے، حیرت ہے کہ کسی ولی کو بھی اس کا کشف و الہام نہیں ہوا کہ مرزا غلام احمد اپنے دعوے میں صادق ہے، لوگ اس کی تکفیر و تضلیل کا وبال اپنے سر لے رہے ہیں۔

یہ بات بالکل صحیح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت و ظہور کے بعد نبوت کے عہدے ہی کو اللہ تعالیٰ نے ختم کر دیا، اب دین کا احیاء اور تجدید، مجددین کے ذریعہ ہوگی اور یہ مجددین مزاج شناسِ رسول ہوں گے، مگر اپنے تمام فضائل و کمالات اور عظمت و توقیر کے باوجود ان میں کسی کو یہ منصب حاصل نہ ہوگا کہ کوئی مسلمان کسی مجدد کی مجددیت کو نہ مانے، تو اس انکار کے بعد وہ کافر ہو جائے، انسانی شخصیتوں میں صرف "نبی" کا انکار کفر ہے! ان مجددین کی غالب اکثریت نے کسی دعوے کے بغیر اپنا فرض انجام دیا ہے! مرزا غلام احمد کو تو دعووں کا ہیضہ بلکہ مراق ہو گیا تھا، اُس کا مراق بڑھتا ہی چلا گیا یہاں تک کہ اُس نے ایسی "مستقل نبوت" کا دعویٰ کر دیا، جس میں حج بھی ہے، امر و نہی بھی ہے اور دین کے منصوص رکن اور فریضہ (جہاد) کی تنسیخ بھی شامل ہے، ساڑھے تیرہ سو سال کی مدت میں تنہا یہی ایسا نرالا "ولی" (؟) اور عجیب و غریب "مجدد" (؟) پیدا ہوا ہے، جس کی ولایت اور مجددیت بالآخر "نبوت" کا روپ دھار لیتی ہے۔

بالکل سامنے کی بات یہ ہے کہ "نبوت" میں منصب و عہدہ کی تدریج نہیں ہے، کسی نبی اور رسول کے احوال میں یہ نہیں ملتا کہ اُس نے پہلے ولایت کا دعویٰ کیا ہو، پھر مجددیت کا، اُس کے بعد مہدویت کا، یہاں تک کہ آخر میں اُس نے کہا ہو کہ میں اب "نبی" ہو گیا، دعووں کی یہ تدریج سنتِ انبیاء کے منافی اور مخالف ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت، زندگی اور کردار، روزِ روشن کی طرح دنیا کے سامنے ہے، حضورؐ نے نبوت سے پہلے کسی دینی منصب کا دعویٰ نہیں فرمایا۔

صحابہ کرام کے زمانے میں جن لوگوں نے نبوت کا دعویٰ کیا، اُن کے ساتھ جدال و قتال کا معاملہ کیا گیا، اور اس دور کے بعد جب بھی کسی مسلمان حکومت میں کوئی شخص نبوت کا دعویٰ کرتا رہا ہے، تو اُس کو سخت سزائیں دی گئی ہیں۔ اور اس کے ساتھ ایسا سلوک کیا گیا ہے کہ اس نبی کاذب کی جھوٹی نبوت کو اُبھرنے کا موقعہ نہ مل سکا، ایران میں قاچاریہ دور میں بہائیوں کا یہ فتنہ ابھرا وہ کوئی قصہ یا افسانہ نہیں تاریخ کا مستند واقعہ ہے۔ مرزا غلام احمد نے انگریزی دورِ حکومت میں اپنی خود ساختہ نبوت کا اعلان کیا اور انگریزوں کو اپنی نیازمندی اور وفاداری کا یقین دلا کر ان کا PROTECTION حاصل کر چکا تھا۔ اس کی جھوٹی نبوت کو گورنمنٹ برطانیہ کی سرپرستی اور حمایت حاصل رہی اور ان تثلیث نوازوں اور اسلام کے دشمنوں کے سایۂ عاطفت میں قادیانیت کا شجرِ خبیث نشوونما پاتا رہا۔

پاکستان بن جانے کے بعد یہاں کے معاشرے میں افسوس ہے کہ کوئی دینی انقلاب پیدا نہیں ہوا۔ انگریزوں کے بنائے ہوئے غلط طریقہ قانون رواں دواں ہے۔ یہاں جب اسلامی حکومت قائم ہوگی اُس وقت قادیانیوں کی حیثیت متعین کی جائے گی کہ ان کا کفر و ارتداد کس سلوک کا مستحق ہے؟ اور اسلامی حکومت میں ان کا شہری موقف کیا ہے؟

نبی کی ضرورت!

گزشتہ اُمتوں کے دور میں ایسا ہوا ہے کہ طویل مدت گزر جانے کے بعد اللہ کی کتابوں اور آسمانی صحیفوں میں اُمتوں نے تحریف کی اور انبیاء کی تعلیمات، زندگی اور سنت کو اُمت نے محفوظ نہیں رکھا، اس طرح دنیا کے سامنے حق و باطل میں تمیز کرنے کی کسوٹی ہی باقی نہ رہی اور معیارِ حق بھی غائب ہو گیا، ان حالات میں انبیاء کرام مبعوث ہوتے، مگر امتِ محمدیہ کے پاس اللہ کی کتاب اس طرح محفوظ ہے کہ اس کے ایک شوشہ میں بھی دنیا کا کوئی انقلاب اور زمانہ کا طول اور مدت کی درازی تبدیلی پیدا نہ کر سکی، اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری پوری زندگی کتابوں میں موجود اور محفوظ ہے، یہاں تک کہ حضور کے صحابہ کے حالات اس تفصیل کے ساتھ پائے جاتے ہیں کہ نبیوں اور رسولوں کے مقدس حالات بھی اُن کے اُمتیوں نے اس ذمہ داری اور خلوص و صداقت کے ساتھ ضبط و محفوظ نہیں کئے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب (قرآن کریم) کی حفاظت کا وعدہ فرمایا اور اُمت نے سنت رسول اور سیرت نبوی کی حفاظت کا حق ادا کر دیا، ائمہ فقہ نے دین و دنیا کی ان کی حقیقت سے حقیقت جزئیہ کو تشکیل دے کر ہر طرح کی آسانیاں اور سہولتیں مہیا کر دیں، اخلاق اور تزکیۂ نفس پر صلحائے امت اور علمائے امت کے ہزاروں لاکھوں صفحے موجود ہیں، پھر نئے مسائل کے لئے اجتہاد کا دروازہ کھلا ہوا ہے، اس اُمت کا کوئی دور بھی ایسا نہیں گزرا جو علماءِ حق صلحاء اور ارباب اجتہاد سے خالی رہا ہو، جب یہ حالات ہوں امتِ محمدیہ کے لئے کسی جدید نبی یا کسی دوسرے قسم کے بروزی اور ظلی نبی کی ضرورت ہی کہاں باقی رہی! آخر دین و شریعت میں وہ کیا کوتاہی اور کمی رہ گئی تھی، جس کے پورا کرنے کے لئے مرزائے قادیان کی "بعثت" (؟) کی ضرورت پیش آئی، اُس کی کتابیں موجود ہیں، اُن میں تزکیۂ نفس اور اخلاق کا کون سا جدید فلسفہ بیان کیا گیا ہے، جس کے بغیر اُمت کی دینی زندگی ناقص رہتی ہے! عیسائیوں سے جو مناظرے مرزا نے کئے ہیں، اس دور کی کتابوں میں کام کی باتیں نظر آتی ہیں، مگر جب سے دعووں کا دورہ اُن پر پڑنا شروع ہوا ہے، اس وقت سے اُن کی تحریروں میں زیادہ تر اپنے دعووں کے جواز کے لئے دلیلیں، توجیہات اور تاویلیں ملتی ہیں۔

ساری دنیا جانتی ہے کہ کفارِ قریش سے عہدِ رسالت میں مسلمانوں کی پہلی جنگ بدر کے میدان میں ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس غزوے میں اسلحہ اور رسد کی کمی اور مجاہدین کی قلتِ تعداد کے باوجود فتح و نصرت عطا فرمائی اس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ان لفظوں میں فرمایا۔

"لقد نصرکم اللہ ببدر"

اس محکم آیت اور سیدھے سیدھے واقعہ کی تفسیر مرزا غلام احمد نے یوں کی ہے۔

"اسلام ہلال کی طرح شروع ہوا اور مقدر تھا کہ انجام کار زمانہ میں بدر ہو جائے ۔۔ خدا تعالیٰ کی حکمت نے چاہا کہ اسلام اس صدی میں بدر کی شکل اختیار کرے، جو شمار کی رو سے بدر کے مشابہ ہو (یعنی چودھویں صدی)

پس ان ہی معنوں کی طرف اشارہ ہے، خدا تعالیٰ کے اس قول میں کہ نعس کم اللہ مید ھر"

صرف اپنی نفضیلت جتانے کے لئے جو شخص قرآن کریم کی آیتوں کے مفہوم و معنی میں اس بے باکی اور بے حیائی سے تحریف کرتا ہو، غضب خدا کا اُس کی ذات اور تعلیمات کی طرف اہل ایمان کو آنے اور اس پر ایمان لانے کی دعوت دی جاتی ہے اس ظلم، نا انصافی، غلط اندیشی اور مجرمانہ جسارت کو دیکھئے کہ کفر و ارتداد، ایمان و یقین کو اپنی طرف بلاتے ہیں اور ظلمت نور کو اپنا جیسا بن جانے کی دعوت دیتی ہے اور جہالت علم و خبر پر طنز کرتی ہے۔

سوچیئے! مرزا غلام احمد قادیانی نے جب نبوت کا دعویٰ کیا ہے، تو اُمت مسلمہ کا حال عیسائیوں اور یہودیوں جیسا نہیں تھا کہ ان امتوں نے اللہ کی کتابوں میں تحریف کرڈالی تھی اور اپنے نبیوں کے اسوۂ حسنہ کو گم کردیا تھا اب ساڑھے تیرہ سال پہلے اُمت محمدیہ کے پاس کتاب اللہ اور احادیث رسول پوری کی پوری ہی موجود تھیں! اس بات کو عقل کس طرح باور کرسکتی ہے کہ وہ اُمت جو کتاب و سنت کے ہر حکم کو حق مانتی ہے اُس نے اس بات پر ایکا کرلیا تھا کہ ہم اللہ اور رسول کے ہر حکم کو حق مانیں گے، بس مرزا غلام احمد کی مسیحیت موعود اور اس کی نبوت کا انکار کریں گے اور چند لاکھ قادیانیوں کو چھوڑ کر پوری کی پوری امت آج تک مرزا کی موعود مسیحیت اور نبوت کا انکار کئے جارہی ہے، نہ صرف انکار بلکہ ہزاروں صفحات کا لٹریچر جھوٹی نبوت کی تردید میں مرتب کردیا ہے۔ یہ کروڑوں مسلمان جن کے پاس حق و باطل میں امتیاز کرنے کی کسوٹی اصل حالت اور حقیقی حیثیت میں موجود ہے، ان کو چند لاکھ قادیانیوں کے مقابلہ میں کافر و گمراہ آخر کس دلیل کی بنا پر مان لیں۔ امت مسلمہ کے پاس کتاب اللہ اور سنت رسول ہے، وہ اچھی طرح جانتی ہے کہ نبیوں اور رسولوں کا کیا کردار اور کیسی سیرت ہوتی ہے، وہ کس لہجہ میں خطاب فرماتے ہیں، نبوت کی کیا خصوصیات اور لوازم ہیں! امت مسلمہ کی جانب سے مرزا کی امامت، مسیحیت اور نبوت کا انکار مرزا کے جھوٹے ہونے کی دلیل ہے۔

آج تک کسی ایسے نبی کا وجود دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتا کہ اُس کی وفات کے بعد ہی اُس کے ماننے والوں میں دو گروہ ہو جائیں ایک گروہ کہے وہ مجدد تھا نبی نہیں تھا، دوسرا گروہ اُس کی نبوت پر جما ہوا ہو، جھوٹے نبی کی گمراہ امت کا خود نبوت کے بارے میں اس قسم کا اختلاف اس نبوت کے جعلی اور خود ساختہ ہونے کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

مسلمانوں میں خال خال ایسے حضرات بھی پائے جاتے ہیں جو قادیانیوں کو گمراہ اور راہ حق سے بھٹکا ہوا تو مانتے ہیں مگر اس خوف سے کہ امت مسلمہ کی آبادی اور تعداد میں کمی واقع ہو جائے گی، قادیانیوں کو کافر اور دین و ملت سے خارج نہیں سمجھتے اور اُن کا شمار مسلمانوں کے گمراہ فرقوں میں کرتے ہیں! اور اس مسئلہ میں ہمیشہ رواداری اور اسلامی اخوت کی تلقین فرماتے رہتے ہیں! ہم ان حضرات کی خدمت میں عرض کرتے ہیں کہ کوئی شخص جو مسلمانوں کی نسل میں پیدا ہوگیا ہو، کیا دین کے کسی بھی منصوص رکن اور بنیادی عقیدہ کا انکار کردے اور کیسے ہی غلیظ و صریح کفر کا ارتکاب اُس سے ہو جائے وہ نہ تو دین و ملت سے خارج ہوتا ہے اور نہ اُسے کافر کہا جاسکتا ہے! یہ عقیدہ اور رواداری اپنی جگہ ذہن و فکر کے شدید فساد بلکہ گمراہی کی علامت ہے جس سے سوء خاتمہ کا خطرہ ہے، مرزا غلام احمد نہ تو کوئی صوفی تھا جس پر غلبہ حال طاری ہوگیا تھا اور نہ وہ مجذوب تھا جس پر تمام عمر جذب طاری رہا، اُس کی کتابیں اس کی شاہد ہیں کہ اُس نے پوری ہوشیاری اور چالاکی کے ساتھ اپنے جھوٹے دعوؤں کی تبلیغ کی ہے اور بہ صحت ہوش و حواس ہوائے نفس کے سہارے کفر و ارتداد کی اس پستی تک پہونچا ہے اُس کے ماننے والے بھی کسی فلسفیانہ مغالطہ میں مبتلا نہیں ہیں اور نہ محض تعبیر کی غلطی کا شکار ہیں! وہ تو پوری طرح جان بوجھ کر "جھوٹی نبوت" پر ایمان رکھتے ہیں اور اپنے سوا ساری دنیا کے مسلمانوں کو کافر جانتے ہیں!

فتنہ و انتشار! اس ضلالت اور کفر و ارتداد پر قادیانی جماعت کے دعوے اور خود ستائی ملاحظہ کیجئے:-
"آج روئے زمین پر جماعت احمدیہ وہ واحد جماعت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے خلافت کی عظیم الشان نعمت سے سرفراز فرمایا ہے جو امام وقت کی اطاعت کی اہمیت کو خوب سمجھتی ہے، اسی لئے اسے اول دن سے صحیح معنوں میں اعمال صالحہ

بجا لانے کی توفیق ملتی چلی آرہی ہے، یہ ایک ایسا شرف و امتیاز ہے، جو بجز جماعت احمدیہ کے اور کسی جماعت کو حاصل نہیں۔" (ماہنامہ "انصار اللہ" ربوہ ماہ جون ۱۹۶۷ء)

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے
دیوانہ کستی، ایں کوتہ آستیاں ہیں

ہمارے پاس اطلاعیں پہونچی ہیں کہ تقریباً دو سال سے قادیانی اپنے مشن کی تبلیغ میں بڑی سرگرمی دکھا رہے ہیں، مسلمانوں کے پاس ڈاک کے ذریعہ اپنا لٹریچر بھیجتے ہیں اور انفرادی ملاقاتوں کے ذریعہ بھی مسلک قادیانیت کی تبلیغ اور اپنی کتابوں کی اشاعت کرتے ہیں! مسلمانوں کو قادیانیوں کے دام تزویر سے بچانے کے لئے ہم نے صراحت کے ساتھ تین شماروں میں قادیانیت کو بے نقاب کیا ہے قادیانیت کی جب بھی تردید ہوگی اُن کے مسلک کو کفر و ارتداد سے نسبت دی جائے گی اور مرزا غلام احمد قادیانی کی ذات اور اس کے دعوے کو جھٹلایا ہی کیا جائے گا، خود مرزا نے غیر قادیانیوں یعنی تمام مسلمانوں کو مغلظ گالیاں دی ہیں اور انبیاء کرام تک کی منقصت کی ہے! کلوخ انداز را پاداش سنگ است!

"ختم نبوت" کا مسئلہ نہ تو نزاعی مسئلہ ہے اور نہ کوئی تحقیق طلب نظریہ ہے یہ دین و شریعت کا متفقہ مسئلہ ہے اس باب میں دو رائیں ہو ہی نہیں سکتیں، اس لئے قادیانیوں کا لٹریچر ڈاک کے ذریعہ کسی مسلمان کے یہاں آئے تو اُسے بے دریغ چاک کردیں، اور جہاں سے آئے وہاں درشت الفاظ میں خط بھیج دیں کہ آئندہ ان خرافات کا بھیجنا بند کردیا جائے، دست بدست کوئی قادیانی اپنا کتابچہ یا پمفلٹ دے یا اپنے مسلک کی تبلیغ کرے تو اُسے سختی کے ساتھ وارننگ دے دی جائے تاکہ وہ آئندہ ایسی جرأت نہ کرسکے!

قادیانیت کا وجود ملت مسلمہ کے لئے سب سے بڑا انتشار ہے اس کی ہر کتاب فتنہ و فساد کی جڑ ہے اور اس مسلک ضلال کی تبلیغ و اشاعت ملت کو انتشار کی دعوت دیتی ہے، کاش! حکومت تدبیر و حکمت کے ساتھ اس فتنہ کی روک تھام کرسکتی!

ماہر القادری
۲۳ / ستمبر ۱۹۷۶ء

فتنۂ قادیانیت

ماہ جولائی کے "فاران" میں جو اداریہ (نقش اول) فتنۂ قادیانیت کی تردید میں لکھا گیا ہے اُسے عام طور پر پسند کیا گیا، راقم الحروف کے پاس متعدد خطوط آئے ہیں جن میں اس مضمون کو کتابی صورت میں چھاپنے کا مشورہ دیا گیا ہے، ایک خط لاہ کینٹ سے آیا ہے جس میں لکھا ہے کہ ایک صاحب جو قادیانیوں کی لاہوری جماعت سے متاثر تھے، وہ ردِ قادیانیت کے سلسلہ میں "فاران" کے موقف سے متفق اور مطمئن ہو گئے !

یہ محض اللہ تعالیٰ کا احسان وکرم ہے کہ مجھ ہیچمدان اور گنہگار کے قلم سے اتنا مدلل قادیانیت شکن مضمون معرضِ تحریر میں آگیا، الحمدللہ علیٰ احسانہٖ !

اس زمانے میں جب کہ قادیانیت کے مسلک کفر وضلالت کی کھلے بندوں تبلیغ کی جا رہی ہے اس قسم کے مضامین کی عام اشاعت کی بیش از بیش ضرورت ہے، میں افادۂ عام کی خاطر اپنے اس مقالہ کی اشاعت کی اجازت دیتا ہوں۔ بس اتنی گزارش ہے کہ مقالہ کو حذف نظر انداز میں شائع کیا جائے۔ کتابت کی غلطیاں کم سے کم رہیں بلکہ نہ رہیں، اور اس کتابچہ کا ایک نسخہ مجھے بھیج دیا جائے۔

ماہر القادری　مدیر "فاران"

ختمِ نبوت زندہ باد

جھوٹی نبوت مردہ باد
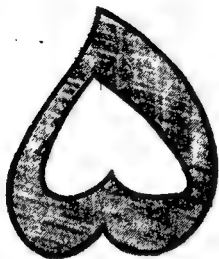
۵
آزمودہ دواؤں کا مرکب
انلجین
سر درد ۔ کمر کا درد ۔ دانت کا درد
ایام ۔ انفلوئنزا اور ہر قسم کے دوسرے درد کے لئے
یقینی زود اثر اور بے ضرر علاج ہے
Opal

محمد نواز۔ ایم اے

تحریک جماعت اسلامی کا ایک تحقیقی جائزہ
"تبصرہ پر تبصرہ فاران"

محترم المقام ماہر صاحب! السلام علیکم ورحمتہ اللہ

آپ نے ڈاکٹر اسرار صاحب کی کتاب پر جو تبصرہ فرمایا ہے وہ خوب ہے اس تبصرہ میں آپ نے جس رواداری اور ظرف کی وسعت سے کام لیا ہے وہ فی الواقع آپ ہی کا حق ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کے لئے جزائے خیر عطا فرمائیں ـــ مولانا مودودی کی نیکی اور مبنی برحق دعوت کو بایۂ اعتبار سے گرانے کی جو کوششیں جن محرکات کے تحت کی جا رہی ہیں یہ کتاب انہی کوششوں اور محرکات ہی کی ایک کڑی ہے۔ لیکن اس کے باوجود آپ نے منافقت اور غیر جذباتی انسانیں جو غیر جانبدارانہ تبصرہ فرمایا ہے وہ واقعۃً قابل ستائش ہے مگر آپ کا یہ اندیشہ کہ "ان ایہ ہوسکتا ہے کہ اس کتاب کو پڑھ کر وہ جلد امکان ڈاکٹر صاحب کی طرح جماعت سے علیحدگی اختیار کرلیں" اور آپ کا یہ اعتراف کہ "کوئی شک نہیں اس کتاب میں بعض دلیلیں بھی خاصی قوی ہیں" ـــــ محل نظر ہے۔ جماعت سے اگر کسی نے کو علیحدہ ہونا ہی ہے تو وہ کتاب پڑھے یا نہ پڑھے بہر صورت الگ ہو جائے گا۔ ہاں البتہ یہ بات آپ کہہ سکتے ہیں کہ اب وہ بجائے اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کا اعتراف کرنے کے الگ ہونے کے مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کی بعض "مستند" خرابیوں اور خامیوں کو اپنے فرار ہونے کے جواز میں پیش کر سکے گا۔

جہاں تک کتاب میں بعض دلیلوں کے "قوی" ہونے کا تعلق ہے۔ کتاب مجھ ایسے کم علم متعدد احباب نے پڑھی ہے۔ لیکن ہمیں تو اس میں کوئی ایسی بات نظر نہیں آئی جسے "دلیل" کہا جا سکے۔ ممکن ہے کہ اس میں ہماری کوتاہ فہمی اور کم علمی کو دخل ہو لیکن یہ بات بہرحال واقعہ ہے کہ کتاب کے مصنف نے جس طرح مولانا مودودی اور جماعت اسلامی پاکستان کے بارے میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس میں اب ہرگز کوئی خوبی نہیں یہ اپنے سابقہ نظریات سے جو عین حق و صواب تھے، منحرف ہو گئے ہیں۔ انہوں نے خدا پرستی اور اصول پرستی کے بجائے عوام پرستی اور قوم پرستی اختیار کرلی ہے اور اقامت دین کے نصب العین کو چھوڑ کر "انقلاب قیادت" جیسے مقصد کے پیچھے پڑ گئے ہیں اور جماعت اسلامی جو پہلے اصولی بین الاقوامی بلکہ انسانی بنیادوں پر دعوت کی علمبردار بن کر کھڑی ہوئی تھی پاکستان بن جانے کے بعد اس نے "مسلم قوم پرستی" کا لبادہ اوڑھ لیا ہے ـــــ اس میں ہم باوجود کوتاہ فہمی اور کم علمی کے اعتراف کے کوئی ایسی بات نہیں دیکھ سکے جسے "دلیل" کہا جا سکے۔

مصنف موصوف نے تحریک اسلامی کو قومی اور دنیا دارانہ تحریک ثابت کرنے کے لئے یہ تحریر لکھی تھی، اس تحریر کو ماچھی گوٹھ کے کل پاکستان اجتماع ارکان میں بھی پڑھا گیا تھا۔ لیکن ارکان نے اس پر کچھ زیادہ توجہ نہ دی۔ اب دس سال بعد بڑے اہتمام کے ساتھ نئے عزائم اور نئے محرکات کے ساتھ ڈاکٹر صاحب اپنی اس مایۂ ناز تحقیق کو اس حال میں منظر عام پر لائے ہیں جبکہ اس تحریر میں اٹھائے گئے ایک ایک اعتراض کا جواب خود مولانا مودودی اجتماع ماچھی گوٹھ کی تقریر میں بھی دے چکے ہیں اور اب وہ کتابی شکل میں بھی موجود ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس بات کی

ضرورت محسوس نہیں کی کہ آپ اس دس سالہ پرانی تحریر پر نظر ثانی کر کے مولانا مودودی کے جوابات کی مفصل تردید فرما دیں کیونکہ مولانا کی تحریر "الفاظ کے گورکھ دھندوں اور منطقی استدلال کی پیچیدگیوں" کا مجموعہ تھی اور ــــــــــــــ وہ تمام باتیں جو مولانا موصوف کے "استدلال میں بیان ہوئی ہیں ــــــــ سوائے ایک کے جو بظاہر کسی قدر وقیع معلوم ہوتی ہے ــــــ بقیہ تو اس قدر بودی ہیں کہ ان پر کلام کرنے کو جی نہیں چاہتا" (صفحہ ۳)۔ حالانکہ اگر ڈاکٹر صاحب "بودا" کہ کے اس پر مفصل تبصرہ فرما دیتے اور اس میں اٹھائے ہوئے نکات کی تردید کر دیتے تو مجھ ایسے عام قاری پر بھی مولانا مودودی کے "استدلال" کا بودا پن واضح ہو جاتا اور اس کے الفاظ کے "گورکھ دھندوں" اور "منطقی استدلال" کی پیچیدگیوں سے نجات ملتی !!

آپ کی "قوی دلیل والی بات بھی کچھ عجیب سی ہے۔ ایک شخص شاہی مسجد کے مینار کے بارے میں یہ خبر سناتا ہے کہ اس کی ساری رفعت و بلندی بالکل ملت گھٹ کر چند گز ہو گئی ہے اور اس کی دلیل یہ دیتا ہے کہ جب اس نے مینار پر چڑھ کر نیچے دیکھا تو زرگ بالشتئے نظر آتے تھے اور موٹریں اور بسیں بچوں کے کھلونوں کی مانند دکھائی دیتی تھیں۔ یہ شخص اپنی بات کے ثبوت میں جو کچھ کہتا ہے کیا اس واقعہ ہونے سے انکار کیا جا سکتا ہے؟ کیا اس بات کے تسلیم کرنے کے لازماً یہ معنی بھی ہوں گے کہ شاہی مسجد کا مینار چھوٹا ہو گیا ــــــــــــ اگر ایک شخص جسے اللہ تعالیٰ نے نورِ بصارت سے محروم کیا ہو، ہاتھی کی ٹانگ کو ہاتھ لگا کر بڑے زور سے یہ دعویٰ کرے کہ ہاتھی ستون کی مانند ہے۔ بلاشبہ وہ خود تو ایسا دعویٰ کرنے میں حق بجانب ہو گا لیکن کیا یہ دعویٰ ان لوگوں کے لئے بھی قابلِ تسلیم ہو گا جنہیں خدا نے دیکھنے اور مشاہدہ کرنے کی قوت سے نوازا ہے ــــ اب جس شخص کا علم و مطالعہ یہ ہو کہ دعوتِ حق کے پیش کرنے کا طریقہ ہر حال میں ایک ہی رہتا ہے۔ حالات میں خواہ کتنا بڑا انقلاب آ جائے لیکن داعیِ حق کو "نہیں جنبد نہ جنبد گل محمد" ہی بن کر رہنا چاہئے اور حالات کے بدلنے کے ساتھ ساتھ اقدامات، تدابیر اور عملی پالیسیوں میں بھی کسی قسم کی تبدیلی نہیں کرنی چاہئے۔ اگر اس شخص کے سامنے مولانا مودودی کتاب و سنت کی حدود کے اندر رہتے ہوئے انبیاء ہی کے اسوہ کے مطابق پالیسی میں تبدیلی پیدا کریں۔ کانگریس کی اکثریت سے جو خطرہ کانگریس کا نشانہ رکھا گیا تھا وہ مسلمانوں کی سو فیصدی اکثریت کے سامنے اختیار نہ کریں بلکہ اس کے اندر مناسب تبدیلی پیدا کریں، نسلی مسلمانوں کو "اسلام" کا واسطہ دے کر انہیں خدا کی بندگی کی طرف بلائیں اور خدا کی حاکمیت کی طرف دعوت دیکر سیاست کو مسلمان بنانے کی کوشش کریں اور ملک کے دستور اور آئین کو اسلام کے رنگ میں رنگنے کی جدوجہد کریں اور اس راہ کی مزاحم قوتوں سے کشمکش کریں .... تو یہ گویا ان کی سابقہ پالیسی اور طریق کار سے صریح انحراف ہی نہیں ہو گا بلکہ یہ جدوجہد قوم پرستی اور عوام پرستی کی خالص دنیا دارانہ اور سیاسی جدوجہد ہو گی جو شخص اپنے علم و مطالعہ کے لحاظ سے پوری طرح خام ہو اسے تو نظر انداز کیا جا سکتا ہے لیکن آپ جیسے پختہ کار رہنما سے یہ کیسے ممکن ہو گیا کہ آپ اس طرح کی ناقص آراء میں بعض کو "قوی دلیلیں" تصور فرمائیں

فرض کیجئے کہ آپ سے کوئی شخص یہ سوال کرتا ہے کہ آپ کی قمیص کا کپڑا کس طرح تیار ہوتا ہے؟ آپ اس کے جواب میں تحریر کرتے ہیں کہ :

"اس کپڑے کے تیار کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ایک خاص قسم کا بیج ایک قطعہ آراضی میں بویا جائے اس سے ایک خاص مدت پودا اُگے گا اور اس میں سے ایک سفید رنگ ریشہ دار شے نمودار ہو گی، اس سفید ریشہ دار چیز کو پودے سے الگ کر کے اس میں سے اس کا بیج الگ کر لیا جائے تو یہ روئی کہلائے گی۔ اس روئی کو پھر چرخے پر لے جا کر اس کا سوت بنا لیا جائے۔ آخر میں اس سوت سے کھڈیوں کے ذریعے کپڑا تیار کر کے اور پھر سی کر قمیص بنائی جائے":

یہ آپ نے کپڑا تیار کرنے کا اصول اور فلسفہ تحریر تو فرما دیا لیکن جب آپ کو پہننے کے لئے کپڑوں کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو بجائے اس اصول و فلسفہ پر عمل کرنے کے سیدھے بازار جا کر کپڑا خرید کر لیتے ہیں۔ اب اگر وہی سائل صاحب آپ کو بازار سے کپڑا خریدتے ہوئے دیکھ لیں تو کیا وہ یہ بات کہنے میں حق بجانب نہ ہوں گے کہ :-

"ڈاکٹر صاحب! آپ بھی کیسے بزرگ ہیں کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ، آپ کپڑوں کے تیار کرنے کا "فلسفہ" تو بتاتے ہیں اور جب آپ کو کپڑوں کی ضرورت پڑتی ہے تو سیدھے بازار میں جا کر خرید لیتے ہیں۔ یہ آپ کے قول و فعل کا حیرت انگیز تضاد ہے

آپ نے کھیت میں جا کر ہل چلایا ہوتا، کپاس چنی ہوتی، چرخہ کاتا ہوتا، کھڈی پر تانا تنا ہوتا اور کپڑا سل کر خود سیا ہوتا
———— اب یہ کیا بات ہے کہ آپ نے اپنے بتائے ہوئے اصول و فلسفے سے "استمداد" اختیار کر لی ہے"

فرمایئے! آپ کے ذہین سائل کی یہ گرفت کتنی سخت اور یہ دلیل کتنی مسکت ہے!

مولانا مودودی کے ناقدین بھی آپ کے اس سائل سے کچھ زیادہ مختلف نہیں، ان کی خواہش یہ ہے کہ حکومت الٰہیہ کے قیام کا جو فلسفہ مولانا نے پیش کیا تھا اس پر اسی طرح من وعن عمل ہونا چاہئے اور وہ بھی اس طرح کہ:-

فرض کریں کہ دنیا میں سوائے ان کے اور کہیں حق نہیں سارے لوگ گمراہ ہیں نسلی مسلمان بھی اسلام کا ہرگز کوئی سرمایہ نہیں اس لئے سب لوگوں کو از سر نو مسلمان بنانا چاہئے جتنے لوگ زیادہ مسلمان بنتے چلے جائیں گے معاشرے کی اصلاح ہوتی چلی جائے گی اور جب معاشرے کی اصلاح ہو جائے گی تو حکومت خود بخود اسلامی ہو جائے گی۔ جب تک معاشرے کی اصلاح نہ ہو اس وقت تک حکومت کی اصلاح یا قیادت کی تبدیلی گویا جرم ہے اور اصولوں کی خلاف ورزی ہے۔ کیونکہ اسلامی انقلاب کا یہ طریقہ قرآن کی آیت کی طرح ناقابل تغییر ہے۔ تدبیر اور عمل کے لحاظ سے آپ اس میں کہیں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتے۔ پالیسی کے لحاظ سے اور اقدامات میں تقدیم و تاخیر کے پہلو سے بھی غور نہیں کر سکتے۔ ایسا کرنا گویا قطعی حرام ہے حالانکہ بات یہ نہیں۔ یہ معاملہ بھی کم و بیش ویسا ہے جیسا آپ نے اپنے نسفی مزاج سائل کے سامنے بیان فرمایا تھا یعنی جہاں تک کپڑا تیار کرنے کے اصول اور فلسفے کا تعلق ہے وہ بنیادی طور پر وہی رہیگا لیکن جب کسی شخص کو کپڑا حاصل کرنے کی ضرورت لاحق ہوگی تو وہ اپنی اس ضرورت کو اپنے معاشی اور علاقائی حالات کی روشنی میں ہی پورا کرے گا۔ بالکل اسی طرح اسلامی نظام حکومت کے قیام کا بنیادی نظریہ تو وہی رہے گا جو مولانا مودودی نے اپنی علمی تحریروں میں بیان کیا ہے لیکن اس کے لئے عملی اقدامات کا فیصلہ ہر ملک اور ہر قوم کے مختلف سیاسی، سماجی، معاشی اور مذہبی معتقدات اور تاریخی حالات ہی کی روشنی میں کیا جائے گا۔

ہاں البتہ اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ طریق کار کی یہ تبدیلی قرآن وسنت کی واضح نصوص کے خلاف ہے یا اس کا ثبوت اسوۂ انبیاء میں نہیں ملتا یا اس میں بدعت شامل ہو گئی ہے تو پھر بلاشبہ یہ بات خاصی وزنی ہو جاتی ہے لیکن مولانا مودودی کے ناقدین آج تک کوئی ایسی بات ثابت نہیں کر سکے!!

چلئے تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کئے لیتے ہیں کہ اس کتاب میں بعض دلیلیں قوی بھی ہیں، جن کی روشنی میں مولانا مودودی کو گم کردہ راہ، قوم پرست، سیاست باز اور نجانے کیا کیا کچھ تسلیم کیا جا سکتا ہے اور یہ بھی ثابت کیا جا سکتا ہے کہ جماعت اسلامی نے اپنے نظریات سے "استمداد" اختیار کر لیا ہے۔ اب ذرا انہی ڈاکٹر صاحب سے دیانت فرمایئے کہ آپ کے نزدیک جب تقسیم ہند سے قبل کی جماعت اسلامی کا مقصد بھی درست تھا۔ اس کا طریق کار اور اس کی تنظیم بھی عین حق تھی، آپ نے خود کو حاضر و ناظر جان کر اس کا صدقاً اقرار اور اعلان بھی کیا تھا تو فرمایئے آپ نے اس دس سال کے عرصہ میں اپنے حلف کے تقاضوں کو پورا کرنے کی کتنی کوشش کی، آپ نے یا آپ کے ساتھیوں نے جماعت اسلامی قبل از تقسیم کے خطوط پر کیوں منظم نہیں کی، کیوں اقامتِ دین کا کام نہیں کیا۔ اور کیوں جماعتی زندگی پر انفرادی زندگی کو اور دعوتی زندگی پر کاروباری زندگی کو عملاً ترجیح دی۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر، اقامتِ دین اور شہادتِ حق کا وہ فریضہ جسے آپ نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کی طرح فرض عین سمجھتے اور کہتے ہیں اس کے تقاضے کہاں تک پورے کئے۔ ملک کے اندر فحاشی کا سیلاب بڑھتا رہا۔ اسلامی قدروں کو پامال کیا جاتا رہا، خدا کے دین کے اندر تحریف کی تحریک زور پکڑتی رہی۔ عائلی قانون اور خاندانی منصوبہ بندی جیسے قوانین بشکل آرڈیننس پاس ہوتے اور نافذ ہوتے رہے اور سود کا سیلاب اس تندی اور تیزی سے بہتا رہا کہ اس کی نجس اور ناپاک چھینٹوں سے ملک کا کوئی شخص بھی محفوظ نہیں اور وہ دین جس کے بارے میں آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ "بڑی شان سے جزیرہ نمائے عرب سے نکلا تھا لیکن آج الیٰ غریب الغرباء بن گیا ہے کہ اس پر رونے والا کوئی نہ رہا" اور جب اس کے اپنوں کی خفگی کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنے قومی، ملکی اور ملی مسائل میں ایسے گم ہیں کہ انہیں اس کی ہمدردی تک کا وقت نہیں ملتا۔ ———— آپ کو تو دس سال کا ایک طویل عرصہ عطا فرمایا ہے اس مظلوم دین کی مدد اور نصرت کے لئے آپ نے بجز اس کے اور کیا کارنامہ سرانجام دیا ہے کہ مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کی "گمراہیوں" کی ایک طویل فہرست سلیقے سے مرتب کر کے شائع فرما دی ہے۔ کیا اقامت دین کے

طریق کار کا یہی وہ سبق ہے جو آپ نے انبیاء کرام کے اسوہ سے بعد از محنت بلیغ اخذ کیا ہے کہ خدا پرستوں اور خادمان دین کے خدمت گزاروں کی چند واقعی یا غیر واقعی بشری کمزوریوں کو بنیاد بنا کر ان پر قوم پرستی، عوام پرستی اور ابن الوقتی کی پھبتیاں نہایت ہوشیاری سے چسپاں کر دی ہیں۔ وہ خدمت دین کا عظیم کارنامہ ہے جو آپ نے ۱۹۴۱ء سے لے کر مارچ ۱۹۶۶ء تک انجام دینے کی ناروا کوشش فرمائی ہے اگر صورت حال یہی ہے تو پھر تسلیم کرنا پڑے گا کہ شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم !!

کیا مولانا مودودی اور جماعت اسلامی پر اپنے نظریات سے انحراف کرنے کا الزام لگانے والی اور ان کے ماضی و حال میں تضاد تلاش کرنے والی یہ مقدس اور محترم ہستیاں اپنے فکر و عمل کے تضادات پر بھی نگاہ ڈالیں گی ؟

زیر تبصرہ کتاب کے مصنف نے لکھنا تو نہیں کیا ہے لیکن ان کی اس تبرک سوانح حیات کے اوراق میں اس روداد کا نشان نہیں ملتا جو اسلامی جمعیت طلبہ کے طلباء انتشار سے متعلق ہے جس کا سبب ان کی ذات ہی تھی اور جس کے نتیجہ میں ایک درجن سے زائد ارکان جمعیت کو رکنیت ترک کر دینی پڑی تھی۔ اور جس میں اپنے کردار کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے انہوں نے ایک طویل مقالہ بھی تصنیف فرمایا تھا۔ یہ واقعہ بھی جماعت کی رکنیت اختیار کرنے سے غالباً ایک سال قبل کا ہے کاش ڈاکٹر صاحب اپنے تعارف میں اس پر بھی روشنی ڈال دیتے تو مجھ ایسے دیہاتی قسم کے قارئین کو ان کی شخصیت کے سمجھنے میں کچھ مدد مل جاتی !

آپ کی رواداری اور عالی ظرفی سے ڈاکٹر صاحب کی قسم کے لوگوں کے علمی پندار کو ناروا شہ ملتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب ایم بی بی ایس ہیں، حال ہی میں انہوں نے ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی ہے۔ بلاشبہ وہ ایک ذہین انسان ہیں لیکن ان کا دینی علم مولانا مودودی اور اکابرین جماعت اور امت کے دوسرے سرکردہ بزرگوں کی تصانیف تک ہی محدود ہے۔ ان کے فکر و نظر کو بنانے اور ان کی شخصیت کو ابھارنے اور نکھارنے میں خود مولانا مودودی، جمعیت اور جماعت کو بہت بڑا دخل حاصل ہے۔ مولانا مودودی بھی بلاشبہ ایک غیر معصوم انسان ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں شخصیت سازی قسم کی جن بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا ہے اس سے بھی کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ مولانا محترم ڈاکٹر صاحب موصوف کے لئے ایک مشفق مربی اور مہربان استاد کا درجہ رکھتے ہیں، زندگی کا اور زندگی کے مقصد کا شعور انہیں ابتداً مولانا موصوف ہی کے واسطے سے نصیب ہوا ہے لیکن ڈاکٹر صاحب اپنے اس قابل احترام مربی، شفیق اور محسن بزرگ کے بارے میں جو انداز گفتگو اور جس طرح کا لب و لہجہ استعمال کرتے ہیں اور جس مقام بلند سے انہیں خطاب فرماتے ہیں وہ بھی ملاحظہ فرمائیں:۔

> "یہاں مولانا نے اصل بات سے کنی کترا کر بات بنانے کی کوشش فرمائی ہے اور اس مفروضے کے دامن میں پناہ لی ہے جو خط کشیدہ الفاظ میں بیان کیا گیا ہے" صفحہ ۳۵

ایک اور مقام پر مولانا محترم کو "علمی بزدلی" کے مہذب خطاب سے نوازتے ہیں:

> "چنانچہ تملیک کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے سلسلے میں جماعت اسلامی کی سب سے بڑی اہل علم اور اہل قلم ہستی نے "علمی بزدلی" کا بین ثبوت فراہم کیا۔ اول اول جب یہ مسئلہ چھڑا تو جواب دینے میں مولانا مودودی صاحب تشریف لائے اور ایچ پیچ کے ذریعے جواب دینے کی کوشش کی" صفحہ ۱۹۵

اختلاف کرنا ہرگز جرم نہیں لیکن اگر مدعیان علم و تقویٰ بھی "بازی بازی با ریش بابا ہم بازی" کا وطیرہ اختیار کر لیں تو پھر کہ بخت "تانبے سے زنگ کھانے کا کیا گلہ" جب سونا خود ہی زنگ قبول کرنا شروع کر دے۔ علم کی ناپختگی کے ساتھ ہمہ دانی کے پندار کا جب جوڑ لگ جائے تو ہوش و خرد کی بے بصری ہی گل کھلاتی ہے !!

اگرچہ میری معروضات خاصی طویل ہو گئی ہیں تاہم اگر میں زیر بحث کتاب کی چند فکری خامیوں کی نشاندہی نہ کروں تو بات نامکمل رہ جائے گی

اس لئے مندرجہ ذیل چند بنیادی باتوں کا ذکر کرکے اپنے اس خط کو ختم کرتا ہوں۔

۱۔ جماعت اسلامی کی پالیسی اور طریق کار پر اعتراض کرنے والوں کی یہ مشترک خامی ہے کہ وہ اس بات پر غور نہیں کرتے کہ کیا مختلف حالات میں اقامت دین کے لئے طریق کار ایک ہی ہے یا حالات کی رعایت سے مختلف بھی ہوسکتا ہے؟ کیا سو فیصد کے غیر مسلم معاشرہ میں جہاں جمہوری حکومت ہو وہاں اقامت دین کا طریق کار یا دعوت و تبلیغ کا طریق عمل وہی ہوگا جو روس جیسی مستبد کمیونسٹ ریاست میں ہوگا؟ اسی طرح جب کسی مسلمان ملک پر غیر اسلامی مطلق العنان طاقت مسلط ہوجائے تو کیا اس میں بھی طریق جدوجہد وہی ہوگا جو کسی ایسے ملک میں اختیار کیا جائے گا جس نے دستور کی زبان میں اسلام کا اقرار بھی کرلیا ہو، جس کی حکومت کا ڈھانچہ بھی جمہوری ہو، لیکن اس کے ارباب حل و عقد عملاً دین سے انحراف کی فکر میں ہوں اور انہیں انحراف اور ارتداد کی راہ سے روکنے کے لئے بجز رائے عامہ کے اور کوئی طاقت نہ ہو۔۔۔؟ ان مختلف حالات میں اقامت دین کے لئے طریق کار اور عملی تدابیر ایک ہی رہیں گی یا حالات کے تغیر کے ساتھ ان میں بھی تبدیلی کا امکان موجود ہے؟ اس سلسلے میں انبیاء علیہم السلام کا اسوہ کیا ہے؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہدایات دی ہیں؟ اور صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین رحمہم اللہ نے کیا عملی نظائر قائم کئے ہیں؟ ان مختلف سوالات کے بارے میں مصنف موصوف کے ذہن میں ہرگز صحیح جواب موجود نہیں۔ ان کی کتاب کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان کے نزدیک اقامت دین کا وہ طریق کار جو قبل از تقسیم تجویز کیا گیا تھا بس وہی حرف آخر تھا اس میں تبدیلی اور حالات کے مطابق اس میں تغیر، ان کے نزدیک اصولی انحراف کے مترادف ہے حالانکہ اگر وہ غور کرتے تو یقیناً اس بات سے اتفاق کرلیتے کہ اقامت دین کی عملی جدوجہد کے خطوط متعین کرنے میں حالات کا فیکٹر بہت اہم رول ادا کرتا ہے جس طرح ایک مکان کی تعمیر میں موسمی حالات اور آب و ہوا وغیرہ کا خیال رکھنا پڑتا ہے بعینہ اسی طرح اقامت دین کی سعی و جہد کی عملی راہ متعین کرنے کے لئے بھی کسی ملک کے سیاسی، معاشی، معاشرتی اور تاریخی عوامل کا بہت حد تک لحاظ کرنا پڑتا ہے بعض اوقات یہ عوامل اقامت دین کی تحریک کو ایک ایسی مہمیز لگاتے ہیں کہ ایک داعی حق کو اپنے کام کے آغاز ہی میں آخری اور انتہائی قدم اٹھانا پڑتا ہے اور بعض اوقات یہ عوامل ایسے سنگ راہ ثابت ہوتے ہیں کہ داعی حق کو مدت العمر تک ابتدائی منزل سے آگے بڑھنے نہیں دیتے۔ اس بات کو انبیاء علیہم السلام بالخصوص حضرت یوسف، حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ علیہم السلام اور حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک زندگیوں میں بآسانی دیکھا جاسکتا ہے۔ بلاشبہ اقامت دین کے عملی طریقوں میں حالات کی رعایت سے تفاوت رہا ہے اور یہی انبیاء علیہم السلام کا اسوہ ہے ——— لیکن چند اصولی اور بنیادی باتیں ایسی بھی ہیں جو کسی صورت میں تبدیل نہیں ہوسکتیں۔ خواہ حالات میں کتنا ہی بڑا انقلاب کیوں نہ آجائے اور عملی تدابیر میں خواہ کتنی بڑی تبدیلی کیوں نہ واقع ہو، مندرجہ ذیل چند بنیادی باتوں کی بہرحال پابندی کرنی پڑے گی۔

۲۔ (الف) انبیاء علیہم السلام جب اپنے ماحول کے منکرات سے ٹکراتے ہیں تو منکرات کے قبیلے کے ہر چھوٹے بڑے فرد سے نہیں ٹکراتے، بلکہ وہ یہ دیکھتے ہیں کہ ان کے دور کا منکر اعظم کیا ہے ——— ؟ آیا وہ وقت کا سیاسی نظام ہے یا بگڑا ہوا مذہبی طبقہ، قبیلے اور برادریوں کی عصبیت ہے یا علوم و افکار وغیرہ۔ وقت کا جو بھی طاغوت مشخص ہوجائے وہ سب سے پہلے اسی سے نبرد آزمائی کرتے ہیں۔ منکرات کے خاندان کے ہر فرد سے تعارض کرنا چونکہ حکمت عملی کے خلاف ہوتا ہے اس لئے انبیاء علیہم السلام اپنے دور کے سب سے بڑے منکر، انکر المنکرات ——— یعنی برائیوں کے عظیم تر سرچشمے کو ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

(ب) ——— منکر اعظم کو شاکی یا مغلوب کرکے دین حق کو قائم کرنے کے لئے وہ ہرگز اس بات کا انتظار نہیں کرتے کہ جب تک معاشرے کی اصلاح نہ ہو جائے اس وقت تک "طاغوت" کے خلاف کوئی عملی اقدام نہ کیا جائے۔ وہ تنہا ہوں تو بھی وہی کام کرتے ہیں اور اگر ان کے ساتھ "صحابہ کرام" کی چھوٹی یا بڑی جماعت ہو تو بھی وہ اسی کام کو سرانجام دیتے ہیں اور بغیر کسی توقف اور تاخیر کے ایک لمحہ بھی ضائع کئے وہ اپنا کام کئے چلے جاتے ہیں۔ کسی وقت وہ اپنے کام کا آغاز اصلاح معاشرہ کی راہ سے کرتے ہیں، کبھی سیاسی طاقت کو دین کی تقویت اور معاشرے کی اصلاح کا ذریعہ بناتے ہیں اور کبھی اصلاح معاشرہ، انقلاب قیادت اور اصلاح حکومت کے کام بیک وقت ایک حسن توازن کے ساتھ کرتے چلے جاتے ہیں اور مقصود صرف حق کا قیام اور منکر اعظم کو ختم کرنا ہوتا ہے۔

(ج) — انبیاء علیہم السلام شر کے عظیم منبع کو بند کرنے کی جب کبھی کوشش کرتے ہیں تو وہ برائی کا جواب برائی سے ہرگز نہیں دیتے بلکہ منکرات کا مقابلہ کرنے کے لئے ہتھیار "حسنات" ہی کے اسلحہ خانہ سے حاصل کرتے ہیں اور وہ ایسے طریقے اختیار کرتے ہیں جن سے خدا کی زمین میں امن تو قائم نہ ہو لیکن وہ فساد سے بھر جائے۔

(د) — وہ اپنے نصب العین کو کسی بڑی سے بڑی قیمت پر ہرگز قربان نہیں کرتے جدوجہد کے ہر مرحلے میں آخری مقصود ان کی نگاہوں کے سامنے رہتا ہے

یہ اور اس طرح کی چند بنیادی باتوں کے علاوہ تمام دوسری تفصیلات میں اقامت دین کا طریق کار حالات کے اعتبار سے بدلتا رہا ہے اور آئندہ بھی مختلف حالات کی رعایت سے بدلتا رہے گا اور یہی انبیاء کی سنت ہے۔ اسی لئے امت کے جلیل القدر مجددین کے تجدیدی کارناموں میں بھی چند اصولی باتوں کے ماسوا عملی طریقوں اور تفصیلی تدابیر میں کافی تفاوت موجود ہے۔ حضرت حسین، نفس زکیہ، امام ابو حنیفہ، حضرت عمر بن عبدالعزیز، امام غزالی، امام ابن تیمیہ، محمد بن عبدالوہاب، مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ، سید احمد بریلوی رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین کی جدوجہد کے عملی طریقوں اور تدبیروں میں نمایاں فرق کی بڑی وجہ بھی ان بزرگانِ دین وملت کے اپنے اپنے وقتوں کے سیاسی، مذہبی اور معاشی حالات کا اختلاف ہے۔

جماعت اسلامی کی تدابیر اور پالیسیوں میں بھی انبیاء کی یہی سنت ایک رہنما اصول کا درجہ رکھتی ہے اب اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ جماعت اسلامی نے انبیاء کے طریقے کو چھوڑ دیا ہے تو اس کے ساتھ اس شخص پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ یہ بھی بتائے کہ جماعت اسلامی انبیاء کے طریقوں میں سے کس طریقے کو چھوڑ چکی ہے کیا اس نے اپنے وقت کے "منکر اعظم" سے مصالحت کرلی ہے اور اسے اس بات کا یقین دلا دیا ہے کہ وہ نکتہ چینی نہ کرے گی یہ بات تو مختلف فیہ ہو سکتی ہے کہ جماعت اپنے ملک اور اپنے دور کے منکر اعظم کے پہچاننے میں غلطی کر جائے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ جس کو منکر اعظم قرار دے رہی ہے وہ فی الحقیقت "منکر اصغر" ہو — اس اختلاف کی گنجائش ہر وقت موجود ہے اگر اقامت دین کا کام کرنے والوں کے درمیان صرف منکر اعظم کے تعین کرنے میں اختلاف ہو بھی تو کئی لحاظ سے یہ باعث رحمت وبرکت ہے لیکن اس اختلاف کو بنیاد بنا کر کسی شخص کو اس بات کے کہنے کا ہرگز حق نہیں پہونچتا کہ جماعت انبیاء کی راہ سے بھٹک گئی ہے۔ اگر جماعت نے منکرات کے سرچشمہ کے خلاف کام کرنا بند کردیا ہو، یا کام تو کر رہی ہو لیکن اس کشمکش میں وہ برے اور مخالف شریعت ذرائع استعمال کرکے فساد فی الارض کے جرم کی مرتکب ہو رہی ہو، یا اس سے ایسی بدعتوں اور ضلالت دین کا ظہور ہو رہا ہو۔ جس سے اس کی بنیادی دعوت اور پیغام کے مجروح ہونے کا احتمال پیدا ہو گیا ہو تو واقعۃً جماعت اسلامی کے معاملے میں یہ ایک تشویش کی صورت حال ہوگی۔ لیکن اس بات کے ثابت کرنے کے لئے نہایت قوی دلیل درکار ہے صرف یہ کہنا ہرگز کافی نہیں کہ غیر منقسم ہندوستان میں جو طریق کار اختیار کیا گیا تھا پاکستان بن جانے کے بعد اگر اختیار نہیں کیا گیا تو یہ بات جماعت کی ضلالت اور گمراہی کی دلیل ہے۔ حالات کے اتنے بڑے تغیر کے بعد جماعت اگر اپنے طریق کار میں تبدیلی نہ کرتی تو نہ صرف اس کا یہ اقدام شریعت کی واضح نصوص کے خلاف ہوتا بلکہ حکمت ودانائی کے بھی خلاف ہوتا۔ آخر وہ پالیسی جو ہم کروڑ غیر مسلم اکثریت کے ملک میں ایک کافرانہ نظام حکومت کے سائے میں اور قوم پرستی کی لادینی تحریکوں کے مقابلے میں تقسیم سے قبل طے کی گئی تھی وہ تقسیم کے بعد مجموعی طور پر سو فیصدی مسلم معاشرہ اور اسلام کے نعرے اور بنیاد پر قائم ہونے والی ریاست میں مختلف کیوں نہ ہوتی، حالات کے اتنے بڑے انقلاب کے باوجود پالیسی یا جدوجہد کے عملی خطوط میں تبدیلی نہ کرنا بے دانشی کی دلیل ہوتا! جو لوگ جماعت سے ناراض ہیں انہیں اس بات کی شکایت ہے کہ جماعت نے قرآن وسنت کی عطا کردہ بصیرت کی روشنی میں طریق کار کے نئے خطوط آخر کیوں متعین کئے ہیں اور اس نے "تک تک دیدم دم نہ کشیدم" والی پالیسی آخر کیوں اختیار نہیں کیا ________ ؟

۴ — کتاب زیر تبصرہ کے مصنف کے ذہن میں دوسرا بڑا مغالطہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے غیر شعوری طور پر مولانا مودودی کو محض "ریسرچ اسکالر" اور جماعت اسلامی کو صرف "ریسرچ اکیڈمی" فرض کر لیا ہے اور وہ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ مولانا محترم اور جماعت دونوں معاشرہ اور اس کے حالات سے، اور ملکی اور بین الاقوامی تغیرات اور انقلابات کے اثرات سے بالکل بے نیاز ہو کر تحقیق اور ریسرچ کا کام کر رہے ہیں اور وقتاً فوقتاً اپنا تحقیقی مواد پبلک میں تنقید کیلئے لاتے رہتے ہیں۔

مولانا مودودی کے فکر میں تضاد و تناقض کرنے والے ڈاکٹر صاحب موصوف ہوں یا ان کی طرح سوچنے والے دوسرے بزرگان دین، اس بات کو فراموش کر دیتے ہیں کہ مولانا مودودی نہ نرے مصنف ہیں اور نہ جماعت اسلامی محض مذہبی "انجمن" ہے بلکہ یہ دین کو قائم کرنے والی ایک تحریک کی علمبردار ہے اور اس تحریک کی رہنمائی کی عملاً ذمہ داری بھی مولانا موصوف پر ہی ہے۔ انہیں نہ صرف جماعت کے اندرونی مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے بلکہ ان کے دل و دماغ پر ملک اور بیرون ملک میں برپا ہونے والے تغیرات اور انقلابات بھی اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ پھر نہ سارے دور ایک سے ہوتے ہیں اور نہ ان کے تقاضے یکساں ہوتے ہیں۔ اس رواں دواں سوسائٹی میں ہر لحظہ نیا تغیر اور ہر لحظہ نیا انقلاب اور ہر آن نئی تبدیلی پیدا ہوتی رہتی ہے۔ اب انگریزوں کی حکومت ہے تو کل ہندو سامراج کا خطرہ۔ آج کانگریس اور لیگ کا جھگڑا ہے تو کل تقسیم ملک کا مسئلہ، کبھی اشتراکیت کی یلغار ہے تو کبھی مغرب کی لادینیت کا خوف۔ آج اگر دستور بنتا ہے تو کچھ دن بعد اسے منسوخ کر دیا جاتا ہے۔ ایک وقت اسمبلی وجود میں آتی ہے تو دوسری دفعہ مارشل لاء کے ایک ہی وار سے اسے ختم کر دیا جاتا ہے۔ آج اگر ملک کی موجودہ حکومت کی مخالفت ہے تو کل ہندوستان کے جارحانہ حملے کی صورت میں اسی حکومت کے ساتھ تعاون اور اس کی اطاعت بھی کرنا پڑتی ہے۔ ان حالات میں اگر کوئی یہ توقع کرے کہ جماعت اسلامی حالات کے مطابق فیصلہ نہ کرے۔ نئی پالیسیاں نہ بنائے پچھلے طے کئے ہوئے فیصلوں اور پالیسیوں کو حالات کے مطابق نہ ڈھالے اور زمانے کے تغیرات کی روشنی میں اپنی تدابیر نہ سوچے اور اپنی سابقہ تدبیروں پر نظرثانی نہ کرے تو اس کی یہ توقع کوئی "درسگاہ" یا تحقیقات کا کوئی علمی ادارہ تو پوری کر سکتا ہے لیکن جماعت اسلامی جیسے زندگی کے عملی میدان میں رہ کر حالات کو اپنے نظریات کے مطابق تبدیل کرتا ہے ان حضرات کی اس طرح کی توقعات پر ہرگز پوری نہیں اتر سکتی۔

۳۔ — ڈاکٹر صاحب موصوف اور ان کی طرح "تضاد" تلاش کرنے والوں کی ایک کمزوری یہ بھی ہے کہ وہ اس حقیقت کو بھی نظرانداز کر دیتے ہیں کہ ہر مصنف جب کہ وہ ایک دعوت کا علمبردار بھی ہو — کے فکر کی ایک بنیادی "لڑی" ہوتی ہے جس سے وہ اپنے فکر کی مختلف جزئیات کو اس طرح پرونے کی کوشش کرتا ہے جس طرح تسبیح کے دھاگے میں دانوں کو پرو دیا جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس مصنف کی بنیادی فکر کو نہیں سمجھتا جو اس کے مختلف افکار کو منظم اور مرتب کئے ہوئے ہے تو اسے اس کے فکر کے بیشتر اجزاء میں ہم آہنگی اور توافق ہرگز نظر نہیں آئے گا جس طرح رنگا رنگ کے پھولوں کو ترتیب دے کر گلدستہ تیار کیا جاتا ہے بالکل اسی طرح ایک مصنف کے مختلف افکار اور نظریات کی ایک خاص ترتیب سے اس کے نظام فکر کا ایک گلدستہ تیار ہوتا ہے۔ جب تک اس کے اس پورے نظام فکر پر نگاہ نہ ڈالیں اور جب تک اس کے اس نظام فکر کی حقیقی روح — اور وہ بنیادی "لڑی" معلوم نہ کریں جو اس کے افکار کے ایک ایک جز کو موتیوں کی طرح پروئے ہوئے ہوتی ہے اس وقت تک اس مصنف پر تنقید کا حق ادا نہیں ہو سکتا اور نہ کوئی ناقد یہ تنقید شخص کے افکار و نظریات کے اچھے اور برے پہلوؤں کے بارے میں صحیح رائے دے سکتا ہے۔ کیونکہ اس کے سارے نظام فکر کے حسن و قبح کا دارومدار فی الحقیقت اس کے افکار کی اسی بنیادی روح یا "لڑی" کے ہی حسن و قبح ہی پر ہوتا ہے۔ دنیا کا بڑے سے بڑا انسان خواہ وہ انسانیت کے کتنے ہی اونچے مقام پر کیوں نہ ہو اور دنیا خواہ اسے کتنا ہی بڑے سے بڑا مصلح، پیشوا کیوں نہ تسلیم کرتی ہو مگر ایک مسلمان کے نزدیک وہ "شر البریۃ" کی تعریف ہی میں آئے گا۔ کیونکہ اس کے معتقدات کی بنیادی "لڑی" توحید، رسالت، اور آخرت کے حسین موتیوں سے خالی ہے۔ اس کے مقابلے میں اسلامی معاشرہ کا معمولی سے معمولی فرد ہمارے نزدیک معزز اور محترم ہوگا۔ کیونکہ اس کے اعتقادات کی بنیادی روح خدا، رسول، اور آخرت کے تصورات سے مزین ہے۔ آپ مرزائیوں کو کیوں برا کہتے ہیں حالانکہ ان کے لٹریچر میں بعض بڑا حسن، دیانت کی تحریروں میں غضب کی شوخی ہے اور دلآویز و رنگین ہوتا ہے۔؟

۔ وجہ ظاہر ہے کہ ان کی ساری انشاء پردازی "انکار سنت" جیسے گمراہ کن عقیدے کے گرد گھومتی ہے۔ قادیانیوں میں بھی بڑے نہایت تہجد گذار اور عبادت پیشہ لوگوں کی کمی نہ ہوگی مگر اس کے باوجود یہ ملت کے لئے خطرناک فتنہ خیال کئے جاتے ہیں — کیونکہ ان کے فکر کی بنیادی "لڑی" ختم نبوت، حیات مسیح اور جہاد جیسے متفق علیہ معتقدات سے خالی ہے۔ کسی شخص کے بارے میں صحیح رائے قائم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی بنیادی فکر اور اس کے مختلف مقاصد میں سے — آخری مقصود کا صحیح شعور حاصل کیا جائے۔ اس کے بغیر اس شخص کے بارے میں، بالخصوص تنقید کے میدان میں

ہرگز انصاف نہیں کیا جا سکتا۔ فرض کیجئے کسی ملک میں جابرانہ آمریت مسلط ہے، اس نے اقامتِ دین کی ساری آئینی راہیں بجبر بند کر دی ہیں اور اس جابرانہ ماحول میں دین کی اقامت کی راہ صرف ایک باقی رہ گئی ہے اور وہ ہے خانقاہی طرز کے تصوف کی۔ اب اگر کوئی خدا کا بندہ تصوف کے اس خانقاہی طریقے کو اس احتیاط کے ساتھ اختیار کرتا ہے کہ اس کا کوئی عمل خدا اور رسول کی نصوص کے خلاف بھی نہ ہو، وہ بدعت کی مروجہ خرافات سے بھی پاک ہو اور وہ اسے اقامتِ دین جیسے آخری مقصد حصول کے لئے ایک ذریعہ ہی کی حیثیت سے اختیار کرے تو اس پر رہبانیت کا حکم لگانا یا اس کی بلا دلیل مخالفت کرنا نامناسب ہو گا۔ یہ رہبانیت کے قبیلے کا فرد اس وقت ہے گا جب اس کے پیشِ نظر اقامتِ دین یعنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ پر خدا کے دین کے غلبہ کا ——— سرے سے کوئی تصور ہی نہ ہو ——— اسی طرح اس کے برعکس ایک ایسے ملک کا تصور کیجئے جس میں جمہوریت کے اصولوں کی حکمرانی ہے اور جس میں انقلاب احوال کی ساری آئینی راہیں کھلی ہوئی ہیں۔ ایسے ملک میں اگر کوئی شخص جماعت بناتا ہے ـ رائے عامہ کی فکری اور سیاسی تربیت کے لئے اخبارات نکالتا ہے، حکومت کے غلط اقدامات پر تنقید کرتا ہے اور غلط کار حکومت کو تبدیل کر کے ایسے لوگوں کو برسرِ اقتدار لانے کی کوشش کرتا ہے جن کے ذریعے دین کو سربلندی اور سرفرازی نصیب ہونے کی توقع ہوتی ہے تو اس کے سارے کام جو بظاہر دنیاداری کے کام ہیں، اگر ایک ناقدانہ تنظیم کے آخری مقصود ——— یعنی اقامتِ دین ——— کو سامنے نہ رکھے ——— تو اس پر اقتدار طلبی اور شہرت پسندی کا حکم لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص یہ سارے کام کرتا ہے اور اس کے سامنے صرف اور صرف دین ہی کی اقامت کا نصب العین ہے تو آخر ایسا کون ہے جو یہ فتویٰ دے کہ ان کاموں کا دین میں کوئی حصہ نہیں۔

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ سارے مباح کاموں میں سے جب کسی کام پر عمل کرنا واجب ہو جاتا ہے اور اسے عملاً وہی اہمیت حاصل ہو جاتی ہے جو نماز کی تکمیل میں "وضو" کو یا کپڑوں اور جگہ کے پاک ہونے کو حاصل ہوتی ہے اس صورت میں بغیر کسی شرعی دلیل کے اس کی مخالفت کرنا اہلِ ایمان کا ہرگز کوئی معقول شیوہ نہیں ہوتا۔

اسی طرح یہ بات بھی واضح رہے کہ جب اقامتِ دین کے نقطۂ نگاہ سے مختلف مباح کاموں میں سے کوئی ایک کام ناگزیر حد تک ضروری ذریعے کی حیثیت اختیار کر لے تو اس کے مقابلے میں دوسرے غیر ضروری یا کم ضروری کاموں کو اختیار کرنا یا ان کی اہمیت کو ضرورت سے زیادہ بڑھانا ایسے ہے جیسے فرض نماز کے مقابلے میں نوافل کی اہمیت کو بڑھایا جائے ——— جو بہرحال غلط ہے ——— !!

اگر حالات کا تقاضا یہ ہو کہ آخری مقصود تک پہونچنے کے لئے مدرسوں، کالجوں اور دارالعلوموں کا قیام ضروری ہو اور اس کے ساتھ ساتھ حکومت کی اصلاح کے بغیر معاشرہ کی اصلاح کرنے سے ہی اقامتِ دین کی تحریک کو فائدہ پہونچتا ہے تو بلاشبہ یہ کام نہایت پاکیزہ ہو گا اور اس کے مقابلے میں سیاست بازی اور انتخابات وغیرہ کو زیادہ اہمیت دینا یقیناً غلط ہو گا ——— اور اگر حالات اس بات کا تقاضا کریں کہ آخری مقصود تک پہونچنے کے لئے پہلے جمہوریت کی بحالی ضروری ہے تاکہ کام کے تمام راستے کھلے رہیں، اور اس کے ساتھ ساتھ رائے عامہ کی تربیت کے لئے اور حکومت کی اصلاح اور تبدیلی کے لئے انتخابات ایک مؤثر ذریعہ ہیں تو پھر اقامتِ دین کی خاطر ان دونوں کاموں میں حصہ لینا نہایت ضروری ہو گا۔ اور ان "ذرائع" کی بلا دلیل مخالفت کرنا یا انہیں بدعت و رہبانیت جیسا نامناسب نام دینا ہو گا اور پھر اس کے مقابلے میں دوسرے کاموں کو فی الواقع زیادہ اہمیت حاصل ہو گی ——— اگر اس راہ پر چلنے سے کچھ لوگوں سے بتقاضائے بشریت اگر کچھ غلطیاں سرزد ہو بھی جائیں تو ان انفرادی غلطیوں کو آخری مقصود تک پہونچانے والے ان پاکیزہ ذرائع کے ناپاک اور نجس ہونے کی ہرگز دلیل نہیں بنایا جا سکتا۔

زیرِ بحث کتاب کے مصنف کے ذہن میں بھی فکر و نظر کی یہی کمزوری کارفرما ہے کہ وہ مولانا مودودی کے فکر کے مختلف اجزاء کو الگ الگ کر کے مطالعہ کرتے ہیں انہیں اس مطالعہ کے دوران مولانا مودودی کے فکر کا گلدستہ تو نظر نہیں آتا البتہ رنگارنگ کے پھول دکھائی دیتے ہیں۔ پھولوں کے ان مختلف النوع رنگوں کو دیکھ کر انہیں دھوکا ہوتا ہے کہ مولانا کے فکر میں "تضاد" ہے۔ وہ جب مولانا کے لٹریچر میں اس طرح کے الفاظ

پڑھتے ہیں کہ "لوگو! خدا کی بندگی اختیار کرو" تو انہیں اس میں اقامتِ دین کا صحیح تصور نظر آتا ہے لیکن جب "نسلی مسلمانوں" کی حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ "قرآن و سنت کی حاکمیت کے مقابلے میں اپنی حاکمیت سے دستبردار ہو جاؤ" تو ارشاد ہوتا ہے کہ یہ تو "مسلم قوم پرستی" ہے جب انہیں مولانا مودودی کا قبل از تقسیم کی تحریروں میں یہ الفاظ ملتے ہیں کہ :-

> "بندگی کا جو نظام آج باطل پرستوں اور فساق و فجار کی رہنمائی اور سیادت و فرمانروائی میں چل رہا ہے اور معاملات دنیا کی زمام کار جن خدا کے باغیوں کے ہاتھوں میں آگئی ہے ہم دعوت دیتے ہیں کہ اسے بدلا جائے اور رہنمائی اور امامت نظری اور عملی دونوں حیثیتوں سے مومنین اور صالحین کے ہاتھ میں منتقل ہو" [1]
>
> (دعوت اسلامی اور اس کے مطالبات صفحہ ۱۳)

تو انہیں انبیاء علیہم السلام کی دعوت قرار دیتے ہیں۔ لیکن جب پاکستان میں خدا کے دین کو قائم کرنے اور نیک لوگوں کو برسر اقتدار لانے اور مغربیت کی دلدادہ قیادت کو جمہوری تبدیل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو فرمایا جاتا ہے کہ جماعت اسلامی "عوام پرستی" کا شکار ہو گئی ہے۔

مولانا مودودی جب متحدہ ہندوستان میں غیر مسلم اکثریت کی رعایت سے اپنے خطاب کے لب و لہجہ کو عام رکھتے ہیں اور نسلی مسلمانوں کو دین کے کام کا علمبردار بنانے کے لئے ان سے کہتے ہیں کہ تم دنیا میں حزب اللہ یا خدا کے دین کی شہادت دینے والی پارٹی یا ایک امت کی حیثیت رکھتے ہو ـــــ تو مصنف مذکور جوش ایمانی میں جھوم جھوم جاتے ہیں لیکن مولانا موصوف جب پاکستان کے مسلمانوں کو اسلام کا واسطہ دیکر اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو خدا کی حاکمیت اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کی بالاتری کے سپرد کر دینے کا مطالبہ کرتے ہیں تو انہیں طعنہ دیا جاتا ہے کہ تم "قوم پرست" ہو گئے ہو کیونکہ تم نے "قومی مسائل" کا نام لے کر اور "قوم" کا لفظ استعمال کر کے اپنی دعوت کے اصل زور (EMPHASIS) میں تبدیلی پیدا کر لی ہے حالانکہ مسلمانوں کے لئے "قوم" کے لفظ کا استعمال ہرگز ممنوع نہیں تھا!

یہ ہیں وہ تین اصولی باتیں جنہیں ڈاکٹر صاحب موصوف نے نظر انداز کر دیا ہے اس لئے ان کی تنقید میں حق و انصاف کا عنصر کم اور انتہا پسندی اور ہمہ دانی کا شوق بہت زیادہ نظر آتا ہے۔ اگر ان تینوں باتوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو دنیا کے جس مصنف کی چاہیں خبر لے سکتے ہیں۔ رائی کو پربت اور پربت کو رائی میں تبدیل کر سکتے ہیں اور دنیا کا بہت سارا علمی ذخیرہ بے حقیقت پہیلیوں میں تبدیل کر سکتے ہیں اور اگر آپ حالات ظروف اور زمان و مکان کی اہمیت کو نظر انداز کر دیں تو پھر آپ کو اپنی فقہ کے بہت سارے احکام منسوخ سمجھنے پڑیں گے۔

جیسے "بکلام جناب ڈاکٹر صاحب یا ان کی طرح سوچنے والے تصنیف فرما رہے ہیں اگر اسے قرآن و حدیث کے سمجھنے کا ذریعہ بنایا جائے تو شاید مجدد الیا لعجبی الف ان ایک آیت بھی نہ سمجھ سکے کیونکہ قرآن کو سمجھنے اور آیات کا صحیح مفہوم متعین کرنے کے لئے شان نزول اور اس وقت کے حالات اور کوائف سے آگاہی ضروری ہے اگر اس عجیب اور حیرت انگیز علم کلام کا سہارا لیا جائے تو قرآن حکیم کی بے عیب اصولی، بین الاقوامی بلکہ انسانی دعوت اور انبیاء علیہم السلام کی بے داغ، پاک اور ہر اعتبار سے مقدس سیرت اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کامل، اکمل اور ہر لحاظ سے اکمل اسوۂ حسنہ معاذ اللہ خاکم بدہن ـــــ ناقابل فہم ہو جائے اور ان سے پیدا ہونے والے اشکالات اور تضادات کو دور کرنا دشوار گذار مرحلہ بن جائے ـــ

---

[1] یہاں یہ بات پیش نظر رہے کہ یہ مولانا کی تین نکاتی دعوت کا تیسرا نکتہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی کتاب کے ص ۵۰ اور ۵۱ پر ان نکات کا ذکر کیا ہے لیکن ساری کتاب میں اس نکتے کو گول کر گئے ہیں حالانکہ مولانا کی دعوت اور طریق کار کے سمجھنے کے لئے اس نکتے کو بنیادی اہمیت حاصل تھی۔ اگر ڈاکٹر صاحب اس کا ذکر کر دیتے تو ان کے استدلال کی ساری بنیاد ہی ڈھے جاتی۔ ڈاکٹر صاحب نے خاص طور پر ان میں اس کا ذکر نہ کر کے کتاب کو لوگوں کے پڑھنے کے قابل بنا دیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب موصوف کا علم کلام سامنے رکھیں اور ذیل کے اشکالات کے بارے میں میری رہنمائی فرمائیں :-

● قرآن سے زیادہ اصولی، بین الاقوامی اور انسانی دعوت کا علمبردار اور کوئی نہیں ہو سکتا ۔ بلکہ اس دعوت کا اصل منبع اور ماخذ ہی قرآن ہے۔ مگر اس میں ایک طرف یہ حکم ملتا ہے کہ لا اکراہ فی الدین یعنی دین کے معاملے میں کوئی جبر نہیں اور دوسری طرف ارشاد ہے کہ

وقاتلوھم حتیٰ لاتکون فتنۃ ویکون الدین للّٰہ [1]

ان دونوں احکام میں بظاہر تضاد نہیں ــــــ ؟ اسی طرح یہ حکم سامنے رکھیں کہ

ادع الیٰ سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ وجادلھم بالتی ھی احسن [2]

اور دوسری طرف فرمان ہے کہ جاھد الکفار والمنافقین واغلظ علیھم ۔ [3]

کیا ڈاکٹر صاحب کے علم کلام سے ان دو مختلف احکام میں تطبیق پیدا کی جا سکتی ہے ؟

● نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ اور کون انسانی شرف اور مجد کا ساز داں ہو سکتا ہے اور آپ سے بڑھ کر اور کون انسانی دعوت کا علمبردار ہو سکتا ہے . . . .

تو کیا ڈاکٹر صاحب، اپنے علم کلام کی روشنی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذیل مختلف ارشادات میں موافقت پیدا کر سکتے ہیں۔ مثلاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک طرف یہ فرمان ہے کہ

"اے لوگو! تم سب ایک ہی ہو . . . . اللہ کے نزدیک تم میں سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ تقویٰ رکھنے والا ہے . . . عربی کو عجمی کے مقابلے میں کوئی برتری حاصل نہیں اور نہ کسی عجمی کے لئے عربی کے مقابلے میں برتری ہے ــــــ کوئی برتری ہے تو تقویٰ کی بنا پر"

اور دوسری طرف حکم ہوتا ہے "الائمۃ من القریش" ایک طرف یہ تعلیم ہے کہ سارے انسان برابر ہیں رنگ و نسل اور وطن وغیرہ کی بنا پر کسی کو کسی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں اور دوسری طرف یہ ہدایت ہے کہ :-

". . . . . . عرب سے بغض رکھو گے تو مجھ سے بھی بغض رکھنے والے ہو گے" (ترجمان السنہ)

کیا ڈاکٹر صاحب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات گرامی کو جو عین حق ہیں اور جن میں ہرگز کوئی "تضاد" نہیں، عالمگیریت اور بین الاقوامیت کے منافی قرار دیں گے ــــــ ؟

● اہل کتاب کے کافر اور مشرک ہونے سے کس کو مجال انکار ہے قرآن میں واضح طور پر حکم موجود ہے کہ نہ تو مشرک سے نکاح کرو اور نہ کسی مشرک کے ہاتھ کا کوئی ذبیحہ حلال ہے لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابیہ سے نکاح بھی جائز قرار دیا ہے اور اہل کتاب کا ذبیحہ بھی حلال فرمایا ہے ۔ کیا اس میں بھی معاذ اللہ "تضاد" ہے ۔

● حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جلیل القدر پیغمبر اور اصولی اور انسانی دعوت کے علمبردار ہونے میں کس کافر کو انکار ہو سکتا ہے لیکن کیا ڈاکٹر صاحب بتا سکتے ہیں کہ انہوں نے فرعون سے جو یہ مطالبہ کیا تھا کہ "ارسل معنا بنی اسرائیل" تو کیا وہ بھی معاذ اللہ نیشلسٹ تھے اسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے وقت کے اقتدار سے بغیر معاشرہ کی اصلاح کا کام کئے جو یہ مطالبہ کیا تھا کہ

---

[1] اور ان (کفار) سے قتال کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لئے ہو جائے ۔

[2] اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت اور موعظت حسنہ کے ساتھ دعوت دیجئے اور منکرین سے بہتر طریقہ سے جھگڑا کیجئے ۔

[3] کافروں اور منافقین کے خلاف جہاد اور ان سے سختی سے پیش آؤ ۔

قال اجعلنی علیٰ خزائن الارض انی حفیظ علیم۔ - کیا مجھے اس ملک کے خزانوں پر مقرر کر دیجئے کیوں کہ میں حفاظت بھی کر سکتا ہوں اور (اس کام سے) واقف ہوں۔

کیا وہ بھی ملکی، قومی اور ملی مسائل میں پڑ کر (نعوذ باللہ) منصبِ نبوت کو بھول گئے تھے ــــــ ؟

یہ اور اس طرح کے متعدد "اشکالات" ڈاکٹر صاحب کے سامنے رکھے جا سکتے ہیں انہوں نے جس نئے علم کلام کی مدد سے مولانا مودودی کا مجتہد داعی حق کو یہ، عقیدے سے گرانے کی ناسعا کوشش کی ہے کیا اسی علم کلام کی مدد سے کسی ملک اور وقت کے مذہبی، معاشی، معاشرتی حالات وکیفیات کا علم حاصل کئے بغیر اور قرآن اور انبیاء، قرآن علیہم السلام کے آخری مقصود کو سمجھے بغیر ان مختلف آیات اور احکام اور ان جلیل القدر انبیاء کے مختلف اقدامات اور رویّے جدوجہد میں توافق اور ہم آہنگی پیدا کر دکھائیں گے ؟

ان مسلمہ بنیادی باتوں کو نظر انداز کر کے کسی صاحب علم بزرگ کو اس طرح ہدف تنقید بنانا ذمہ داری، سنجیدگی اور بردباری کی اصلی روایات کے یکسر منافی ہے۔

ان خامیوں کے علاوہ اس کتاب کے مصنف میں ایک اور کمزوری بھی ہے اور اس کمزوری میں مجھ ایسا ہیچمدان بھی ان کے ساتھ برابر کا شریک ہے ــــــ اور وہ یہ ہے کہ ہم لوگ دین کے علوم اور فنون اور ان کی مخصوص اصطلاحات سے کما حقہٗ واقفیت نہیں رکھتے۔ یہ علوم عربی میں ہیں اور ہمیں عربی زبان تک مکمل رسائی حاصل نہیں اور ہم دین و شریعت کی بعض مخصوص اصطلاحات کے سمجھنے اور ان کے استعمال کرنے میں سخت ٹھوکر کھا جاتے ہیں اب اگر اس پہلو سے کتاب زیر بحث کا جائزہ لیں گے تو اسے کئی لحاظ سے نہ صرف ناقص پائیں گے بلکہ "بچگانہ" بھی محسوس کریں گے مثال کے طور پر اس کتاب کے صفحہ ۱۲ پر "نسلی" اور "اصلی" "متاخر" اور "حقیقی" اسلام کی تمیز ترک کرنے کا جو طعنہ دیا گیا ہے اور اس کا ایک جواب "آپ نے" فاروقی ہی بھی دیا ہے۔ کیا اسی نقطہ پر سنجیدہ علمی فضا میں گفتگو کرنا مناسب ہوگا۔ بالخصوص اس صورت میں جبکہ یہ طعنہ دینے والا اپنے آپ کو علمیت کی ایک مسند "بالاگدی" پر بٹھائے ہوئے ہو ــــــ !!

اس کے علاوہ مصنف نے زور بیان میں جا بجا اصطلاحات کے فرق کو بھی ملحوظ نہیں رکھا۔ مثلاً اسی کتاب کے صفحہ ۱۴ پر قضیۂ فلسطین سے متعلق مولانا مودودی کی تحریر سے ایک اقتباس دے کر یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ جماعت نے دوسرے قومی مسائل سے بھی "تعلق" صرف نظر کیا تھا ــــــ مگر پاکستان بن جانے کے بعد "مسلم قوم پرستی" کا لبادہ اوڑھ لیا۔ اور صفحہ ۱۱۶ پر اس کے ثبوت میں مولانا کی تحریروں سے کئی اقتباسات ایسے دئے ہیں جن میں مسلمانوں کے لئے لفظ "قوم" استعمال کیا گیا ہے۔ اس ساری بحث میں "قضیۂ فلسطین" سے متعلق مولانا کی عبارتوں سے ان فقروں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے جو مصنف موصوف کے موقف کے خلاف پڑتے تھے۔ اگر مولانا کی پوری تحریر سامنے آجاتی تو ڈاکٹر صاحب کو اس کتاب کے صفحہ ۱۳۶ سے کر صفحہ ۱۴۴ تک کی ساری بحث کو یا تو حذف کرنا پڑتا، اور یا پھر اس اقتباس کو سرے سے "گول" ہی کرنا پڑتا۔ مگر نہ معلوم موصوف نے کس "احتیاط" کی بنا پر ایک طویل تحریر سے صرف اپنے مطلب کے جملے منتخب فرمائے اور بقیہ کو نظر انداز کر دیا ہے۔

اس کے علاوہ انہوں نے قومیت (NATIONALITY) اور قوم پرستی (NATIONALISM) کے فرق کو بھی ملحوظ نہیں رکھا۔ جہاں تک قوم پرستی کا تعلق ہے مولانا مودودی تقسیم سے پہلے بھی اس کے مخالف تھے، اور اب بھی اس کے اتنے ہی مخالف ہیں یہ جیسے کل حرام تھی ویسے ہی اب بھی حرام ہے اگر ڈاکٹر صاحب کوئی تحریر اس بات کے ثبوت میں پیش کر سکتے ہوں تو ضرور پیش فرمائیں کہ جس "قوم پرستی" کو مولانا نے امت، پاسلامی، جماعت اور حزب اللہ اور ملت اسلامی جیسی اصطلاحات کی عین ضد قرار دیا تھا اب اسی کے داعی اور علمبردار ہیں۔ رہی "قومیت" یعنی (NATIONALITY) تو

۱۔ ہم دی یار ... کا اعتراض ... مولانا کے اصل ... سے مقابلہ کر کے دیکھ لیں۔

یہ عوام ہے اور نہ مذکورہ اصطلاحات کی ضد۔ اس معنی میں لفظ "قوم" کا استعمال بھی ہرگز ممنوع نہیں۔ ان معنوں میں اس لفظ کو مولانا نے تقسیم سے قبل بھی استعمال کیا ہے۔ آپ بھی استعمال کرتے ہیں اور آئندہ بھی ہوتا رہے گا اس کے استعمال میں ہرگز کوئی قباحت نہیں قرآن اور حدیث میں یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے

اگر اقتباسات کی بات چل نکلی ہے تو اس سلسلے میں کچھ آخری گزارشات بھی سن لیجئے :-

● اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے مولانا مودودی کو "قوم پرست" ثابت کرنے کے لئے جہاں اور بہت سے اقتباسات دئے ہیں وہاں "قضیۂ فلسطین" والا مذکورہ اقتباس بھی نقل کیا ہے لیکن اس طرح کہ مولانا محترم کا صحیح نقطۂ نظر ہرگز واضح نہ ہونے پائے۔ اگر یہ صحیح نقل کیا جاتا تو ڈاکٹر صاحب کو اپنی کتاب کے کئی صفحے تبدیل کرنے پڑتے۔ اس کے تفصیلی ذکر کے لئے چونکہ دو تین صفحے مزید لکھنے پڑتے ہیں لہٰذا اتنا اشارہ کافی ہے۔ جسے تحقیق کرنی ہو وہ اصل سے موازنہ کرکے خود دیکھ لے۔

● اس سلسلے کی دوسری بات یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے مولانا مودودی کی پیش کردہ دعوت کے تین نکات میں سے دو کا ذکر صراحتاً اور اشارۃً تو ضرور کیا ہے لیکن اس دعوت کے تیسرے نکتے کی کتاب کو ہوا تک لگنے نہیں دی حالانکہ یہ "نکتہ" بھی قبل از تقسیم دعوت ہی کا اہم ترین جز تھا۔ ایسا کیوں نہیں کیا گیا؟ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب موصوف مولانا محترم اور جماعت اسلامی کی پالیسی "انقلاب قیادت" اور "اصلاح حکومت" کو زیر بحث لاکر جماعت کے ماضی و حال میں "تضاد" ثابت کرنے کے جوش میں تھے۔ اور یہ بحث اس کتاب کی "جان" ہے اگر دعوت کا یہ تیسرا نکتہ شامل کرلیا جاتا تو اس کتاب کی ساری "جان" ہی نکل جاتی۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب نے سرے سے اس کا ذکر کرنا ہرگز مناسب ہی نہیں سمجھا حالانکہ انصاف کی رو سے انہیں اس نکتے پر بھی گفتگو کرنی چاہیے تھی۔

● اس سلسلے کی تیسری اور اہم ترین بات یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے مولانا موصوف کی ایک ہی عبارت کو اپنی کتاب کے تین مختلف مقامات پر نقل فرمایا ہے اور یہ تو آپ کو معلوم ہے ہی کہ صاحب موصوف نے یہ کتاب "دو قسطوں" میں تصنیف فرمائی ہے یعنی اس کا ایک حصہ تو وہ ہے جو دس سال قبل لکھا گیا تھا اور دوسرا حصہ جو صفحہ ۲۰۷ سے شروع ہوتا ہے غالباً پہلے حصہ کے دس سال بعد تحریر کیا گیا ہے۔ جن اقتباسات کا میں ذکر کرنے والا ہوں ان میں سے دو انہوں نے پہلے حصہ میں درج فرمائے ہیں جو انتہائی ناقص، صد درجہ نامکمل اور حیرت انگیز حد تک مغالطہ آمیز ہیں۔ مولانا موصوف کی اسی تحریر کا تیسرا اقتباس موصوف نے اپنی کتاب کے دس سال بعد والی تحریر کے صفحہ ۲۱۰ پر دیا ہے جو ناقص اور نامکمل تو نہیں البتہ اسے سیاق و سباق سے الگ کرکے اس کے اندر معنوی تحریف کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اب اس کی تفصیل ملاحظہ ہو :-

● ڈاکٹر صاحب موصوف اپنی کتاب کے صفحہ ۱۳۳ پر مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے "طریق کار" میں تضاد ثابت کرنے کیلئے فرماتے ہیں :-

"لیکن اب سے اپنے آپ کو اصولاً تحریک پاکستان میں فٹ کرلیا گیا اور امید یہ باندھی گئی کہ قیام پاکستان کے ذریعے ... (آگے مولانا کا اقتباس نقل کرتے ہیں)

"اسلامی نظام کے نصب العین تک پہونچنے کے لئے ایک سہل ترین اور قریب ترین راستہ ہمارے ہاتھ آگیا ہے"

(ملاحظہ ہو قیام نظام اسلامی کی صحیح ترتیب)

اس اقتباس میں پہلی بات تو یہ ہے کہ مولانا کی ذات سے جو فقرے منسوب کئے گئے ہیں وہ سیاق و سباق سے بری طرح الگ کرکے پیش کئے گئے ہیں اگر اصل اقتباس مطالعہ کریں تو پاکستان کی قیادت سے کسی قسم کی "امید باندھنے" کا سرے سے کوئی نشان ہی نہیں ملتا۔ اس میں دوسری بات قابل غور یہ بھی ہے کہ موصوف نے اس اقتباس کا جو حوالہ دیا ہے وہ سخت مغالطہ آمیز ہے کیونکہ "قیام نظام اسلامی کی صحیح ترتیب" نام کی کوئی کتاب جماعت اسلامی کے لٹریچر میں سرے سے موجود ہی نہیں

اب اصل اقتباس ملاحظہ فرمائیں ۔۔۔

مولانا فرماتے ہیں :۔۔۔

"ہم اس وقت پہلے طریقے کو آزما رہے ہیں اگر اس میں ہم کامیاب ہو گئے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ پاکستان کے قیام کے لئے ہماری قوم نے جو جدوجہد کی تھی وہ لاحاصل نہ تھی بلکہ اس کی بدولت اسلامی نظام کے نصب العین تک پہنچنے کے لئے ایک سہل ترین راستہ ہمارے ہاتھ آگیا ہے لیکن خدانخواستہ ہمیں اس میں ناکامی ہوئی اور اس میں غیر اسلامی ریاست قائم کر دی گئی تو یہ مسلمانوں کی ان تمام محنتوں اور قربانیوں کا صریح ضیاع ہو گا۔ جو قیام پاکستان کی راہ میں انہوں نے کیں اور اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم پاکستان بننے کے بعد بھی اسلامی نقطۂ نظر سے اسی مقام پر ہیں جہاں پہلے تھے، اس صورت میں ہم پھر دوسرے طریقے پر کام شروع کر دیں گے جس طرح پاکستان بننے سے پہلے کر رہے تھے۔"

اصل اقتباس دیکھئے اور ڈاکٹر صاحب والا اقتباس بھی پڑھئے اور اندازہ کیجئے کہ کس مہارت کے ساتھ درمیانی جملے کو الگ کر کے اس سے کتنا غلط مفہوم اخذ کیا گیا ہے۔

● — اسی طرح کتاب کے اسی صفحہ پر مولانا موصوف کی دو مزید تحریروں کے اقتباسات درج کر کے ان میں باہم تضاد ظاہر کیا گیا ہے ایک اقتباس میں تو یہ بات بیان کی گئی ہے کہ وہ قومی حکومت جس پر اسلام کا نمائشی لیبل لگا ہوا ہو وہ اسلامی انقلاب کا راستہ روکنے کے لئے بڑی جری اور بے باک ہوتی ہے ۔۔۔۔۔ اس کے بعد اس بات سے "تضاد" نمایاں کرنے کے لئے ڈاکٹر صاحب نے مولانا محترم کی یہ تحریر نقل کی ہے :۔

"۔۔۔ لیکن اب امیدیں باندھی گئیں کہ :

"جن لوگوں کے ہاتھ میں اس وقت نظام کار ہے وہ اسلام کے معاملے میں اتنے مخلص اور وعدوں کے بارے میں جو انہوں نے اپنی قوم سے کئے تھے اتنے صادق ہوں کہ اسلامی حکومت قائم کرنے کی جو اہلیت ان کے اندر مفقود رہی ہے خود محسوس کر لیں اور ایمانداری کے ساتھ مان لیں کہ پاکستان حاصل کرنے کے بعد ان کا کام ختم ہو گیا ہے اور اب یہاں اسلامی نظام تعمیر کرنا ان لوگوں کا کام ہے جو اس کے اہل ہوں" (مودودی)

اس کے بعد اس پر ڈاکٹر اسرار صاحب ان الفاظ میں تبصرہ فرماتے ہیں :

"اگر یہ تضاد نہیں تو فرمایا جائے کہ تضاد اور کس چیز کا نام ہے" صـ ۱۳۳

مولانا موصوف کی تحریر کا یہ اقتباس صریحاً ناقص اور اپنے سابق و لاحق سے بری طرح الگ کیا گیا ہے اور اگر اصل اقتباس سے موازنہ کیا جائے تو اس سے "امیدیں باندھی" کا مفہوم ظاہر ہوتا ہے اور نہ اس میں کہیں "تضاد" کا نشان ملتا ہے۔ پھر یہاں قابل غور بات یہ بھی ہے کہ مولانا کی تحریر کا اقتباس تو دیا گیا ہے لیکن حوالہ نہیں کہ کہاں سے لیا گیا ہے اس سے پہلے حوالے میں بھی آپ دیکھ چکے ہیں کہ وہاں ایک مغالطہ آمیز حوالہ درج کیا گیا تھا۔ ایسا کیوں کیا گیا ہے؟ کیا اس میں "سہو" کو دخل ہے یا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اس پر آپ خود ہی غور فرمالیں !

مولانا ایک سائل کے جواب میں فرماتے ہیں کہ :۔۔

"صحیح طور پر سمجھ لیجئے کہ یہاں اسلامی نظام کا قیام صرف دو طریقوں سے ممکن ہے :۔

ایک یہ کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں اس وقت نظام کار ہے وہ اسلام کے معاملے میں اتنے مخلص اور اپنے وعدوں کے بارے میں جو انہوں نے اپنی قوم سے کئے تھے اتنے صادق ہوں کہ اسلامی حکومت قائم کرنے کی جو اہلیت ان کے اندر مفقود رہی ہے اسے خود محسوس کر لیں اور ایمانداری کے ساتھ یہ مان لیں کہ پاکستان حاصل کرنے کے بعد ان کا کام ختم ہو گیا ہے اور یہ کہ اب یہاں اسلامی نظام تعمیر کرنا ان لوگوں کا کام ہے جو اس کے اہل ہوں اس صورت میں معقول طریق کار یہ ہے

کہ پہلے ہماری دستور ساز اسمبلی ان بنیادی امور کا اعلان کر دے جو ایک غیر اسلامی نظام کو اسلامی نظام میں تبدیل کرنے کے لئے اصولاً ضروری ہیں۔ ...... اسی طرح صحیح جمہوری طریق پر اختیارات اہل لوگوں کے ہاتھوں میں بسہولت منتقل ہو جائیں گے۔ اور وہ حکومت کی طاقت اور وسائل سے کام لے کر پورے نظام زندگی کی تعمیر جدید اسلامی طرز پر کر سکیں گے[1] ——— دوسرا طریقہ یہ ہے کہ معاشرے کو جڑ سے ٹھیک کرنے کی کوشش کی جائے۔ اور ایک عمومی تحریک اصلاح کے ذریعے اس خالص صحت مند مادہ کو بتدریج اس حد تک نشوونما دیا جائے کہ جب وہ اپنی پختگی کو پہنچے تو خود بخود اس سے ایک مکمل اسلامی نظام وجود میں آ جائے۔"

(ترجمان القرآن جلد ۳۱ - عدد ۵)

مولانا نے یہ بات اپنے سائل کے اس مطالبہ کے جواب میں فرمائی تھی کہ

"آپ اور دوسرے اہل علم اسلامی حکومت کا دستور کیوں نہیں مرتب کرتے تاکہ اسے آئین ساز اسمبلی میں پیش کر کے منظور کر دیا جائے"

لیکن ڈاکٹر صاحب اسے "برسر اقتدار طبقہ سے امیدیں باندھنے" کے ثبوت میں لا رہے ہیں حالانکہ اسی جواب کے بالکل آغاز ہی میں مولانا مودودی نے تحریر فرمایا ہے :—

"ہم یہ سمجھنے سے بالکل قاصر ہیں کہ جہاں نہ معاشرہ صحیح معنوں میں اسلامی ہو، نہ اخلاق اسلامی، جہاں کا سیاسی و معاشی اور تعلیمی نظام بھی اب تک غیر اسلامی خطوط پر ترقی کر رہا ہو اور جہاں ایک عمومی دینی و سیاسی تحریک کی بدولت ایک زد سیاست بننے کی نوبت آ گئی ہو کہ ہم ایک دستور مرتب کر کے پیش کریں اور برسر اقتدار اسے نافذ کر دیں یہ تو بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص یہ گمان کرے کہ مدرسے یا بنک کو ہسپتال بنا دینے میں بس اتنی کسر ہے کہ چند ڈاکٹر لا کر ایک اچھے خاصے ہسپتال کا نقشہ مرتب کر دیں اور مدرسے کے معلمین یا بنک کے اسٹاف کو دے دیا جائے تاکہ وہ اسے دیکھ دیکھ کر سارا کام کرتے چلے جائیں" (بحوالہ ترجمان القرآن جلد ۳۱ - عدد ۵ اسلامی نظام کے قیام کی صحیح ترتیب)

ان اقتباسات کا باہم موازنہ کر کے دیکھیں کہ ڈاکٹر صاحب اصل بات کا اپنے حق میں موڑنے، دوسروں کی عبارتوں میں اپنا خود ساختہ مفہوم پیدا کرنے اور صرف اپنے مطلب کے فقرے چن کر "تضادات" ثابت کرنے میں کس قدر حیرت انگیز ملکہ رکھتے ہیں۔

ان اقتباسات کے باہمی موازنہ سے آپ یہ اندازہ بھی با آسانی لگا سکتے ہیں کہ جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کے فکر و کردار کے نکتہ چیں حضرات علم و دیانت کے کتنے اونچے ثریا پر براجمان ہیں۔

اس کتاب کے آخری حصہ میں جو دس سال بعد تحریر کیا گیا تھا۔ مذکورہ اقتباس مکمل طور پر درج کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ :—

"یہاں آپ "اسلامی دستور" اور "انقلاب قیادت" کے لئے لازمی PRI-REQUISITE کے طور پر جس چیز کو بیان کرتے ہیں کہ برسر اقتدار گروہ کے لوگ اتنے مخلص ہوں کہ خود محسوس کر لیں کہ اب ہمارا کام ختم ہوا اور آئندہ کے کام کے لئے ہم ناکارہ ہیں اور از خود پیچھے ہٹ کر کار آمد اور باصلاحیت لوگوں کے لئے جگہ خالی کر دیں" ص۱۱۱

اب گویا "برسر اقتدار سے امیدیں باندھنے" والی بات دس سال میں ترقی کر کے لازمی PRE-REQUISITE میں ——— تبدیل ہو گئی۔ ڈاکٹر صاحب کے اخاذ ذہن کی داد دیجئے کہ جس اقتباس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا رہا ہے اس سے پہلے کی تحریریں بھی

---

[1] یہ مکمل اقتباس کتاب کے صفحہ ۱۰۲ پر موجود ہے اور اس کا حوالہ بھی درست ہے۔ لیکن یہ واضح رہے کہ کتاب کا یہ حصہ دس سال بعد کی تحریر پر مشتمل ہے۔

PRE - REQUISITE) کی تردید بھی موجود ہے۔ انہوں نے خود بھی اپنی کتاب کے متعدد مقامات پر اس بات کی شکایت کی ہے کہ برسرِ اقتدار طبقے پر جو تنقید جماعت کی طرف سے کی جاتی رہی ہے وہ سخت اور حدِ اعتدال سے متجاوز تھی۔ اور پھر یہ نتیجہ بھی مولانا کی ذیل کی اس تحریر کے رد کرنے کی غرض سے اخذ فرمایا جا رہا ہے جس میں مولانا فرماتے ہیں :-

"۱۹۴۷ء کا سیاسی انقلاب ہماری نگاہ میں مصنوعی انقلاب تھا —— اور پھر اختیارات ہاتھ میں لیتے ہی ہماری قوم کے قائدوں نے جو اب قائد ہی نہیں حاکم بھی تھے ملک کے آئندہ نظام کے متعلق جیسی الجھی الجھی باتیں کرنی شروع کیں اور قوم جس طرح ابتدائی چند مہینوں میں خوشی خوشی دل سے سنتی رہی اسے دیکھ کر تو صاف معلوم ہو گیا کہ اس وقت ایک بے شعور قوم کی باگیں ایک بے فکر گروہ کے ہاتھوں میں ہیں اور یہ وقت خاموش بیٹھ کر تعمیری کام میں لگے رہنے کا نہیں ہے اب اگر ایک لمحہ بھی ضائع کیا گیا تو بعید نہیں کہ جو لوگ منزل کا تعین کئے بغیر بے سوچے سمجھے چل پڑے تھے، وہ یکا یک کسی غلط نظریئے کو اس ملک کی بنیاد قرار دے بیٹھیں اور پھر اس نظریے کو بدلوانا موجودہ حالت کی بہ نسبت ہزار گنا زیادہ قربانیوں کے بغیر ممکن نہ رہے" ص ۲۰۵

یہ تو تھی "امیدیں باندھنے" اور "لازمی PREREQUISITE کی حیثیت" لیکن مولانا نے جو بات اس اقتباس میں کہی ہے اس کے جواب میں ڈاکٹر صاحب تحریر کرتے ہیں :-

"ایک غیر اسلامی دستور کے نفاذ کی صورت میں سمجھ میں نہیں آتا کہ اب کون سا پہاڑ تھا جو فوراً ٹوٹ پڑنے کو تیار کھڑا تھا۔ اس صورت میں ہماری پوزیشن انگریزی دورِ حکومت میں متحدہ جماعت اسلامی اور ہندوستان میں آج کی جماعت اسلامی کی پوزیشن سے آخر کس درجہ میں مختلف ہوتی۔ آپ اس غیر اسلامی دستور کو اسی طرح قبول کرتے جس طرح انگریزی حکومت آپ کو تسلیم تھی اور ہندوستان کا سیکولر دستور جماعت اسلامی ہند نے قبول کیا ہے۔ . . ." ص ۲۱۴

کتنا خوبصورت استدلال ہے اور ذہانت کا کس قدر حسین شاہکار ہے ؟! مولانا مودودی کے استدلال کا کیا اچھا رد ہے —— !!

اس کتاب کے صفحہ ۲۰۷ اور ۲۱۴ کی ساری بحث پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے اگر کسی صاحب کو اس بحث سے دلچسپی ہو اور وہ حقیقت حال سے واقف ہونا چاہتے ہوں تو وہ ضرور ان مقامات کا مطالعہ کریں۔ اس میں انہیں بڑی دلچسپ باتیں پڑھنے کا اتفاق ہو گا، کہیں بنیادی دعوت اور نصب العین کو طریق کار کے مترادف سمجھا گیا ہے، کسی مقام پر تدبیر اور عملی اقدامات کو "اصولوں" کے ہم معنی فرض کر لیا گیا ہے کسی جگہ "راہ" کو "ملاوٹ پرچینے" کے مترادف خیال کیا گیا ہے، کہیں اس طرح کا انداز فکر ملے گا کہ اصلاح معاشرہ کے کام کے دوران اگر گھر کو آگ لگ جائے تو اس کے بجھانے کی سعی کرنا تضاد اور اصولوں سے انحراف کے ہم معنی ہو گا، اور مسجد کو شراب گھر میں تبدیل کرنے والوں کی راہ میں رکاوٹ بننے کی کوشش کرنا گیا قوم پرستی، عوام پرستی، اور جمعیت پسندی جیسی شیطانی تحریکوں کا نتیجہ ہو گا اور جہاں کہیں استدلال کی بے چارگی محسوس ہوئی ہے تو وہاں یہ کہہ کر بات ٹال دی ہے کہ لقیہ تمام کی تمام (دلیلیں) اس قدر بھونڈی ہیں کہ ان پر کلام کرنے کو جی نہیں چاہتا ؟ !!

ڈاکٹر صاحب بڑے ذہین انسان ہیں۔ ان کی ذہانت سے ان کے دوستوں کو اچھی توقعات تھیں لیکن ان کے منفی انداز فکر نے انہیں ایک ایسی راہ پر ڈال دیا ہے اور وقت سے پہلے بڑا بننے کی خواہش نے انہیں ایک ایسے چکر میں پھنسا دیا ہے کہ جس کی وجہ سے دس سال کا ایک طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود بھی وہ دین و ملت کے لئے کوئی قابل ذکر کام نہیں کر سکے اور اب جماعت اسلامی کے غیر معصوم رہنماؤں کے فکر و کردار میں "تضاد" تلاش کرنے کا انہوں نے جو بیڑا اٹھایا ہے وہ انہیں کسی بھی کام کے قابل نہیں چھوڑے گا۔ یہ مصرعہ حقیقتاً انہی پر صادق آتا ہے :

؎ خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود

کاش انہیں اس بات کے جانچنے لینے کی توفیق ہوتی کہ "عجلت پسندی" کے جس عیب کی نشاندہی انہوں نے جماعت اسلامی میں کی ہے۔ کہیں اس کا ظہور ان سے تو نہیں ہوا فکر کی پختگی سے قبل اور علم و مطالعہ کی کمی کے باوجود اقامتِ دین کے طریق کار کی صحیح نوعیت کا شعور حاصل کئے بغیر اور وقت سے پہلے اپنے آپ کو مفکر اور مجتہد کے ایک مقام بلند پر بٹھا کر جماعت اسلامی پر تنقید کرنے اور اسے چھیڑنے میں ان سے کہیں "عجلت" تو نہیں ہوئی ——————— !!

میری گذارشات اندازہ اور توقع سے زیادہ طویل ہو گئی ہیں اس لئے اب انہیں ختم کرتا ہوں۔ اگرچہ یہ آپ کے لئے ہیں لیکن قارئین فاران کو ان کے مطالعہ میں شریک فرمالیں تو ممنون بھی رہوں گا۔ اور سمجھوں گا کہ میری محنت رائیگاں نہیں گئی ——————— !! والسلام

(بقیہ "روحِ انتخاب") ڈکٹر میکاریوس کی مسلسل بدعہدیاں اور اسلام اور مسلمانوں سے اس کی کھلی ہوئی دشمنی کے بعد کوئی چارہ باقی نہیں رہا، سوائے اس کے کہ قبرص کے مسلمان اپنی قسمت کے خود مالک بنیں۔ اور جہاں ان کی اکثریت ہے وہاں کا نظم و نسق ان کے اپنے ہاتھ میں ہو۔

ترکی مسلمان اس اقدام پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔ حکومت ترکیہ بھی مبارکباد کی مستحق ہے کیونکہ اس نے برادران دین کی عملی امداد کا حق ادا سمجھا اور محض تقریروں اور بیانوں ہی سے ان کا پیٹ بھرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ وہ عملاً ان کی امداد کو پہونچی اور اس کے بعد قبرصی مسلمان اس قابل ہوئے کہ وہ میکاریوس کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہیں۔

کاش کہ مسلمان ہر جگہ اپنے مظلوم بھائیوں کی اسی طرح امداد و اعانت کریں۔ اسی صورت میں فلسطین و کشمیر جیسے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔

(بہ شکریہ ماہنامہ "ثقافت" لاہور)

ترجمہ و پیشکش :-
مولانا محمد تقی عثمانی
(مدرس دارالعلوم کراچی نمبر ۱۴)

دُعا کیوں کی جائے؟

امام رازیؒ کی تفسیرِ کبیر سے ایک اقتباس

امام فخرالدین رازی رحمہ کی تفسیر کبیر علوم و معارف کا ایک خزانہ ہے، اس میں دین کے اسرار و حکم، قرآن حکیم کے معارف و لطائف، اور عقائد و کلام سے متعلق نہایت قیمتی مضامین ملتے ہیں، خاص طور سے عقل پرستوں کی تسکین و تشفی کا اس میں بڑا مواد ہے اس کے مطالعہ کے دوران بسا اوقات ایسی بحثیں نظر سے گذرتی ہیں جنہیں دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ امام رازیؒ بیسویں صدی کے تشکیک زدہ ذہن کو پیش نظر رکھ کر یہ سب کچھ لکھ رہے ہیں، ایسے مواقع پر ہمیشہ دل یہ چاہتا ہے کہ ان مضامین کا اردو میں ترجمہ کر دیا جائے، مگر پھر ہمیشہ ہی یہ خواہش مصروفیات کے انبار میں دفن ہو جاتی ہے، اتفاق سے حال ہی میں جب محترم جناب مدیر فاران نے فاران کے لئے کوئی مضمون بھیجنے کے لئے فرمایا تو میں "دعا" سے متعلق امام رازیؒ کی ایک بحث پڑھ کر فارغ ہوا تھا، دل چاہا کہ آج اپنی دیرینہ خواہش کی ایک قسط پوری کر دی جائے، اس طرح یہ مضمون آپ کے سامنے ہے۔

اس مضمون کا پورا مفہوم امام رازیؒ ہی کا ہے، البتہ اسے عام فہم بنانے کے لئے میں نے نہ صرف یہ کہ اس کے اسلوب بیان کو بدلا ہے، بلکہ اس کی ترتیب میں بھی بہت تبدیلیاں کی ہیں، اس لئے کہ اس کے بغیر اسے اردو کے موجودہ مزاج میں ڈھالنا ممکن نہ تھا۔ تقی

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :—

أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ (البقرہ) — جب کوئی پکارنے والا مجھ سے دعا کرتا ہے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں۔

دعا کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ اپنے پروردگار سے عنایت اور مدد کا طلبگار ہو، بعض جاہل یہ سمجھتے ہیں کہ دعا ایک بے فائدہ چیز ہے اس سلسلے میں ان کے دل میں جو شبہات پیدا ہوتے ہیں، ہم یہاں ان کا جواب ذکر کرتے ہیں۔

(۱) دعا کے بارے میں پہلا شبہ تو بعض عقل پرستوں کو یہ ہوتا ہے کہ جو بات دعا میں طلب کی جا رہی ہے یا تو تقدیر میں اس کا واقع ہونا لکھا جا چکا ہے یا واقع نہ ہونا، اگر تقدیر میں یہ لکھا ہے کہ وہ ضرور واقع ہوگی، تب تو دعا کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اس لئے کہ اس کو تو واقع ہونا ہی ہے

اور اگر تقدیر میں یہ لکھا جا چکا ہے کہ وہ واقع نہیں ہوگی، تو انسان خواہ کتنی دعا کرے وہ ہرگز واقع نہیں ہوسکتی، اس صورت میں بھی دعا سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

جن عقل پرستوں کے دل میں یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے، ان کا جواب دو طریقے سے دیا جاسکتا ہے، ایک طریقہ تو یہ ہے کہ خود ان سے پلٹ کر یہ سوال کرلیا جائے کہ جن لوگوں کے بارے میں تقدیر میں یہ لکھا جا چکا ہے کہ یہ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے فرور دعا کریں گے، وہ تو ضرور دعا کرکے رہیں گے، خواہ آپ اُن کے سامنے دعا کے بیکار ہونے کی کتنی ہی دلیلیں پیش کرتے رہیں پھر آپ دعا کے خلاف یہ دلیل کیوں پیش کرتے ہیں؟ اور جن لوگوں کے بارے میں تقدیر میں یہ لکھا جا چکا ہے کہ وہ اپنے مقصد برآوری کے لئے دعا نہیں کریں گے، وہ تو پہلے ہی دعا نہیں کرسکے ان کے سامنے بھی آپ کی یہ دلیل بے فائدہ ہوگی۔

یہ تو الزامی جواب تھا، مسئلہ کی حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ قیامت تک پیش آنے والے ہر واقعہ سے واقف ہے اور جو بات تقدیر الٰہی میں لکھی جا چکی ہے اس کے خلاف کوئی واقعہ پیش نہیں آسکتا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی اس تقدیر کو علم و فہم سے پوشیدہ رکھا ہے اس لئے کہ حکمت کا تقاضہ ہی یہ ہے کہ بندہ آمید اور خوف کے ملے جلے جذبات کے ساتھ زندگی گذارے، اگر تقدیر الٰہی کو ہر خاص و عام پر ظاہر کر دیا جائے تو ہر شخص کو اپنا انجام پہلے ہی معلوم ہو جائے گا اور اس کی وجہ سے جہد و عمل کی تمام راہیں بند ہو جائیں گی، ہر شخص یہ سمجھے گا کہ جب مجھے جنت میں پہونچنا ہی ہے تو عمل و عبادت کی زحمت سے کیا فائدہ؟ یا خواہ ان عبادتوں کی زحمت سے کیا فائدہ ؟

درحقیقت اللہ تعالیٰ نے بندوں کو امید اور خوف کے درمیان قائم رکھنے کے لئے اپنی تقدیر کو ہماری نگاہوں سے پوشیدہ رکھا ہے کہ اسی امید اور خوف کی کشاکش پر نظام عالم کا یہ پورا کارخانہ قائم ہے اور اس دنیا میں انسان کی ساری سرگرمیاں "امید" کو حاصل کرنے اور "خوف" سے بچنے کے لئے ہوتی ہیں، چونکہ انسان کو یہ امید ہوتی ہے کہ اس کا مقصد حاصل ہو جائے گا۔ اس لئے وہ اسے حاصل کرنے کی تگ و دو کرتا ہے، اور چونکہ اسے یہ خوف ہوتا ہے کہ کہیں اس مقصد سے میں محروم نہ ہو جاؤں اس لئے وہ ان رکاوٹوں کو دور کرتا ہے جو مقصد کے راستے میں پیش آسکتی ہیں۔

لہٰذا جس طرح تقدیر کے معین ہونے کے باوجود ایک شخص کا اپنی روزی کے حصول کی کوشش کرنا بے فائدہ نہیں ہے اسی طرح روزی کے حصول کے لئے دعا کرنا بھی بے فائدہ نہیں۔

صحابہ کرامؓ نے بھی ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی قسم کا ایک سوال کیا تھا کہ یا رسول اللہ! ہم دنیا میں جو عمل کرتے ہیں کیا ان کا فیصلہ پہلے ہی ہو چکا ہے؟ یا ہمارے عمل کرنے کے بعد ہوتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ تمام اعمال کا فیصلہ پہلے ہی ہو چکا ہے، صحابہؓ نے عرض کیا کہ پھر ہمارے عمل سے کیا فائدہ؟ تو آپؐ نے فرمایا :-

اعملوا فکلٌّ میسّرٌ لما خلق لہ　　عمل کرتے رہو، اس لئے کہ ہر شخص کے لئے وہ کام آسان کر دیا جائے گا جس کے لئے وہ پیدا ہوا ہے۔

اس حدیث کے لطافت پر غور کیجئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں یہ بھی بتا دیا کہ تمام اعمال کا فیصلہ پہلے ہی ہو چکا ہے۔ لیکن ساتھ ہی عمل کی تاکید بھی فرمائی اور واضح فرما دیا کہ انسان کے جہد و عمل کا فائدہ یہ ہے کہ وہ تقدیر الٰہی کے لئے ظاہری سبب بنتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ تمام واقعات کے مقدر ہونے کے باوجود ہمیں عمل کرنے کی اس لئے تاکید کی گئی ہے کہ ہمیں تقدیر کے فیصلوں کا علم نہیں ہے اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہے کہ تقدیر کے تمام فیصلے ہمارے عمل کے ظاہری اسباب ہی کے واسطے سے روبہ عمل ہوں گے، اس لئے ہر فرد کو چاہیے کہ وہ ایسے اعمال اختیار کرے جو اس مقصد کے حصول کا ذریعہ بن سکتے ہوں، ہوسکتا ہے کہ تقدیر میں اس کے انہی اعمال کی وجہ سے مقصد حاصل کرنا مقدر کیا

جا چکا ہے ۔

اس دنیا میں مختلف مقاصد کے حصول کے لئے ہماری تمام دوڑ دھوپ اسی لئے ہے اور اسی وجہ سے ہم اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے دعائیں بھی کرتے ہیں ۔

(۲) بعض لوگ دعا پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تو ہر انسان کی ہر ڈھکی چھپی چیز سے واقف ہے وہ یہ بھی جانتا ہے کہ انسان کو کیا حاجت درپیش ہے ؟ اور اس کے دل میں کون سی خواہش پیدا ہو رہی ہے ؟ پھر دعا کے ذریعہ اسے اپنی حاجت یا خواہش ظاہر کرنے سے کیا فائدہ ؟

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ دعا کا مقصد یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی حاجت اور خواہش سے واقف کرایا جائے، بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ بندہ اپنی حاجت کو حاصل کرنے کے لئے اپنے پروردگار کے سامنے عبودیت اور مسکنت کا اظہار کرے اور اپنے عمل سے یہ واضح کر دے کہ وہ ہر معاملہ میں اپنے آپ کو خدا کا محتاج سمجھتا ہے اور اس بات پر ایمان رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی تمام حاجتوں کو پورا کرنے پر قادر ہے اور وہی اس لائق ہے کہ اپنی ہر ضرورت کے لئے اس کی طرف رجوع کیا جائے ۔

(۳) بعض لوگ دعا کے اوپر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تو اپنے بندے پر بہت مہربان ہے لہذا جس چیز کو بندہ طلب کر رہا ہے اگر اس میں بندے کی مصلحت ہے تب تو اللہ تعالیٰ دعا کے بغیر ہی اپنی مہربانی سے اُسے عطا فرما دے گا ۔ اور اگر وہ بندے کے لئے خلاف مصلحت ہے تو اُسے طلب کرنا فضول ہے ۔

اس اعتراض کا جواب ذرا قبل کی تصریحات کے علاوہ یہ بھی دیا جا سکتا ہے کہ یہ عین ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ دعا کے ذریعہ ایک خلاف مصلحت چیز کو بندے کے لئے مصلحت بنا دے اس لئے دعا فائدے سے خالی نہیں ۔

(۴) بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ بندگی کا اعلیٰ مقام تو یہ ہے کہ انسان راضی برضا ہو جائے اور اللہ تعالیٰ جو کچھ اس کے بارے میں فیصلہ فرما دے اسے ہنسی خوشی قبول کرے ۔ اس کے برعکس دعا سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بندہ خدا کے فیصلوں پر راضی ہونے کے بجائے اپنی خواہشات کی تکمیل چاہتا ہے ۔

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ بندہ ابتداءً دعا و مناجات اور الحاح و زاری کے ذریعہ خدا کے سامنے اپنی احتیاج ظاہر کرے اپنے عمل سے اپنی بے چارگی کو تسلیم کر لے، اور یہ واضح کر دے کہ وہ اپنے آپ کو اللہ کی رحمت سے بے نیاز نہیں سمجھتا، پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ اس کے لئے جو فیصلہ فرما دے اُس پر راضی ہو جائے، تو یہ بندگی کا زیادہ بلند مقام ہے، اس کے برخلاف اگر شروع سے دعا ہی نہ کرے تو اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ بندہ اپنے آپ کو بے نیاز سمجھتا ہے ۔

نقلی دلائل مندرجہ بالا بحث تو خالص عقلی تھی، لیکن دعا کے فائدہ مند ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ قرآن و حدیث میں اس کی بڑی فضیلتیں وارد ہوئی ہیں، قرآن کریم میں ارشاد ہے :-

ادعونی اَستجب لکم	تم مجھ سے دعا کرو میں قبول کروں گا ۔

اور صرف یہی نہیں ! بلکہ ایک دوسری جگہ یہ بھی واضح فرما دیا گیا کہ دعا سے اعراض اور بے پروائی اللہ کے غضب کا موجب ہو سکتی ہے، بعض قوموں پر عذاب نازل کیا گیا اُن کے بارے میں ارشاد ہے :-

فلولا إذ جاء هم بأسنا تضرعوا ولكن قست قلوبهم وزين لهم الشيطان ما كانوا يعملون	جب ان پر ہمارا عذاب آیا تھا تو وہ کیوں نہ گڑگڑائے ؟ بلکہ ان کے دل سخت ہو گئے اور شیطان نے ان کی نگاہوں میں ان کے اعمال کو مزین بنا دیا ۔

ایک اور جگہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے :

ادعوا ربکم تضرعا وخفیۃ — اپنے پروردگار سے دعا کرو، گڑگڑا کر اور چپکے چپکے۔

خود ہماری زیر بحث آیت میں ارشاد ہے :[1]

واذا سألک عبادی عنی فانی قریب اجیب دعوۃ الداع اذا دعان فلیستجیبوا لی ولیؤمنوا بی لعلھم یرشدون۔ (بقرہ)

اور جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں سوال کریں تو میں قریب ہوں جب کوئی دعا کرنے والا مجھ سے دعا کرتا ہے تو میں اسے قبول کرتا ہوں، لہٰذا بندوں کو چاہئے کہ وہ میری باتوں کو قبول کریں، اور مجھ پر ایمان لائیں تاکہ انہیں ہدایت حاصل ہو۔

اس آیت کے شانِ نزول میں مختلف روایات بیان کی گئی ہیں، حضرت قتادہؓ وغیرہ سے روایت ہے کہ بعض صحابہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کیا تھا کہ یا رسول اللہ! ہم اپنے پروردگار سے کس طرح دعا کریں؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی تھی۔

ایک لطیف نکتہ اس آیت میں ایک لطیف نکتہ خاص طور سے قابل غور ہے اور وہ یہ کہ جس طرح اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے پہلے صحابہؓ کا سوال ذکر فرمایا ہے (واذا سألک عبادی عنی) اور پھر اس کا جواب دیا ہے، اسی طرح اور بہت سی آیات میں مختلف احکام کے بارے میں پہلے صحابہؓ کا سوال ذکر کیا گیا ہے اور اس کے بعد اس کا جواب، جتنی آیتیں "یسئلونک" سے شروع ہوتی ہیں ان میں یہی صورت ہے، یسئلونک عن الروح[2]، یسئلونک عن الجبال[3]، یسئلونک عن الساعۃ[4]، یسئلونک ماذا ینفقون[5]، یسئلونک عن الشھر الحرام[6]، یسئلونک عن الخمر والمیسر[7]، یسئلونک عن الیتامیٰ[8]، یسئلونک عن المحیض[9]، یسئلونک عن الانفال[10]، یسئلونک عن ذی القرنین[11]، ویستنبئونک احق ھو[12]؟ یستفتونک قل اللہ یفتیکم فی الکلالۃ[13]،

ان تمام آیتوں میں صحابہؓ اور دوسرے لوگوں کے سوالات اور ان کے جواب مذکور ہیں، مگر ان تمام آیتوں میں آپ کو یہ بات مشترک نظر آئیگی کہ ہر جگہ سوال کو ذکر کر کے اس کا جواب "قل" کے ذریعہ دیا گیا ہے، یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ فرمایا گیا ہے کہ آپ ان کو یہ جواب دے دیجئے۔

لیکن ہماری زیر بحث آیت میں یہ صورت نہیں ہے، باوجودیکہ وہ بھی صحابہؓ کے ایک سوال کا جواب دے رہی ہے اور اس کی ابتداء واذا سألک عبادی کے الفاظ سے ہوتی ہے لیکن یہاں عام عادت کے خلاف لفظ قل کا استعمال نہیں کیا گیا، بلکہ فرمایا گیا کہ

واذا سألک عبادی عنی فانی قریب — اور جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں سوال کریں تو میں قریب ہوں۔

حالانکہ اگر یہاں بھی وہی اسلوب اختیار کیا جاتا جو دوسری آیتوں میں اختیار کیا گیا ہے تو آیت کچھ اس طرح ہونی چاہئے تھی :

واذا سألک عبادی عنی فقل انی قریب — اور جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں سوال کریں تو آپ کہہ دیجئے کہ میں قریب ہوں۔

لیکن یہاں ایسا نہیں کیا گیا اس میں بظاہر اس بات کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ بندہ اگر مجھ سے کوئی چیز مانگنا چاہے، مجھ سے درخواست کرے

---

[1] امام رازیؒ نے یہ پوری بحث اسی آیت کی تفسیر کے ذیل میں ذکر فرمائی ہے۔ ملاحظہ ہو تفسیر کبیر ص ۱۲۸ تا ص ۱۳۳ ج ۲، (تقی)

[2] بنی اسرائیل [3] طٰہٰ [4] النازعات [5] ، [6] ، [7] ، [8] بقرہ [9] ، [10] الانفال [11] کہف [12] ، [13] نساء

اس کی دعا قبول کرنے کے لئے مجھے کسی واسطے کی ضرورت نہیں، بالفاظ دیگر بندہ مقام دعا کے علاوہ دوسرے مقامات پر باری تعالیٰ سے ہمکلام ہونے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے کا محتاج ہے لیکن جب دعا کا مقام آتا ہے تو وہاں اللہ اور بندے کے درمیان کوئی واسطہ نہیں ۔ ... وہ براہ راست خدا سے ہمکلام ہو سکتا ہے اور خدا براہ راست اس کی دعا سنتا اور قبول کرتا ہے ۔

اس سے دعا کی فضیلت اور اس کی عظمت پر روشنی پڑتی ہے ۔ اس کے علاوہ اسی آیت میں دعا کی عظمتوں کی طرف ایک اور اشارہ ملتا ہے وہ یہ کہ باری تعالیٰ نے یہاں یہ فرمایا کہ "میں بندے سے قریب ہوں" یہ نہیں فرمایا کہ "بندہ مجھ سے قریب ہے" وجہ ظاہر ہے کہ بندہ اپنی تمام موتی آلائشوں کے ساتھ اس لائق نہیں ہے کہ وہ پروردگار سے قرب کا مقام حاصل کر سکے ۔ اس کے برعکس باری تعالیٰ کی فضل و رحمت کا بندے سے قریب ہونا بالکل ممکن ہے ۔

ان آیات کے علاوہ احادیث میں بھی دعا کے احکام اور فضائل بکثرت وارد ہوئے ہیں ، ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :—

الدعاء مخ العبادة	دعا عبادت کا مغز ہے ۔

حضرت نعمان بن بشیرؓ کی روایت میں یہ الفاظ مروی ہیں :

الدعاء هو العبادة	دعا ہی عبادت ہے ۔

مطلب یہ ہے کہ دعا افضل ترین عبادتوں میں سے ہے ۔

قبولیت دعا کے بارے میں ایک مشہور اشکال ؟

دعا کی قبولیت کے بارے میں ایک شبہ عام طور سے لوگوں کے ذہن میں پیدا ہوا کرتا ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ :

ادعونی أستجب لکم	تم مجھ سے دعا کرو، میں قبول کروں گا ۔

ایک آیت میں بھی ارشاد ہے کہ :

أجيبُ دعوة الداع إذا دعان	جب دعا کرنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں ۔

قرآن کریم کی اور بھی بعض آیتوں میں یہ مضمون بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ دعا قبول فرماتا ہے —— مگر ہم بکثرت دیکھتے ہیں کہ ایک شخص بعض مرتبہ بہت عاجزی اور انکساری کے ساتھ دعائیں کرتا ہے، مگر دعا قبول نہیں ہوتی ، اس کی کیا وجہ ہے ؟

اس اعتراض کا اصولی جواب تو یہ ہے کہ یہاں اگرچہ اللہ تعالیٰ نے قبولیت دعا کا وعدہ علی الاطلاق ذکر فرمایا ہے ، مگر دوسری جگہ اس وعدے کے ساتھ ایک قید لگی ہوئی ہے ، ارشاد ہے :

بل إياه تدعون فيكشف ما تدعون إليه إن شاء	تم اسی سے دعا کرتے ہو پھر اگر وہ چاہتا ہے تو اس چیز کو کھول دیتا ہے جس کی تم دعا کرتے ہو ۔

لہ واضح رہے کہ یہاں امام رازیؒ صرف اس صورت سے بحث کر رہے ہیں جس میں دعا کرنے والے نے دعا کے تمام آداب و شرائط کا لحاظ کر کے دعا کی ہو اور پھر قبول نہ ہوئی ہو اور اگر کسی نے ان آداب کی رعایت نہیں رکھی جن کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم دی ہے تو دعا کے قبول نہ ہونے کی وجہ اس صورت میں بالکل ظاہر ہے رہا یہ کہ دعا کے آداب و شرائط کیا ہیں ؟ اگر اس سوال کا تفصیلی جواب مطلوب ہو تو والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم کا رسالہ احکام دعا ملاحظہ فرمایا جائے ۔ تقی

لہٰذا اصول فقہ کے قاعدے کی رُو سے مطلق کو مقید پر محمول کیا جانا چاہیئے[1]

اصولی اعتبار سے اگرچہ یہ جواب کافی ہے لیکن اطمینان قلب کے لئے اتنی بات کافی نہیں، اس کے لئے مسئلے کی پوری حقیقت کو سمجھنا ہوگا، درحقیقت اس اعتراض کے جواب کے لئے کئی طریقے اختیار کئے جا سکتے ہیں:

(۱) واقعہ یہ ہے کہ دعا کرنے والے کو اپنی دعا کا عوض کسی نہ کسی صورت میں ضرور مل جاتا ہے، بعض اوقات تو اس طرح کہ اس کی وہی ضرورت پوری ہو جاتی ہے جس کی وہ دعا کر رہا تھا، لیکن اگر اس کی دعا کسی انفرادی یا اجتماعی مصلحت کے خلاف ہوتی ہے، تو اس کی درخواست جوں کی توں تو قبول نہیں ہوتی، جس سے وہ یہ سمجھتا ہے کہ میری درخواست کو رد کر دیا گیا لیکن درحقیقت اس کی دعا سے اُسے یہ فائدہ حاصل ہوتا ہے کہ اس کے دل میں انشراح اور سکون و طمینان پیدا ہو جاتا ہے، اور اگر اس کے مقدر میں کوئی تکلیف یا مصیبت ہے تو اس کی پر خلوص دعاؤں کی بدولت تکلیفوں پر صبر کرنے کی توفیق ہوتی ہے اور وہ مصیبتوں کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرنے کے قابل ہو جاتا ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ چیز بھی قبولیت ہی کی ایک شکل ہے۔

(۲) علامہ تفتازانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں حضرت ابو سعید خدریؓ سے ایک حدیث نقل فرمائی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

دعوۃ المسلم لا ترد الا لاحدی ثلاث مالم یدع باثم او قطیعۃ رحم اما ان یعجل لہ فی الدنیا و اما ان یدخر لہ فی الآخرۃ و اما ان یخفف عنہ من السوء بقدر ما دعا۔

مسلمان کی دعا کبھی رد نہیں ہوتی، بلکہ تین صورتوں میں سے کوئی صورت پیدا کرتی ہے، بشرطیکہ اس نے کسی گناہ یا قطع رحم کی دعا نہ کی ہو، یا تو دنیا ہی میں اس کی حاجت پوری ہو جاتی ہے یا اس کی وہ دعا اس کے لئے آخرت کا ذخیرہ بن جاتی ہے، یا جس قدر اس نے دعا کی ہے اسی قدر اس سے کسی تکلیف کو دور کر دیا جاتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد اس سوال کا پورا پورا جواب ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے یہی تو فرمایا ہے کہ "میں تمہاری دعا قبول کروں گا" یہ تو نہیں فرمایا کہ "فوراً قبول کروں گا" لہٰذا اگر اس کی دعا کی بدولت دنیا کے بجائے آخرت میں فائدہ پہنچے تب بھی یہ وعدہ بالکل سچا ہے۔

(۳) تیسرے یہ بات بھی قابل غور ہے کہ قرآن کریم میں مسلمان کی دعا کے قبول ہونے کا وعدہ کیا گیا ہے اور مسلمان اس بات پر ایمان رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی فعل حکمت و مصلحت سے خالی نہیں، وہ جانتا ہے کہ میرے سامنے صرف اپنی ضرورت اور مصلحت ہے اور باری تعالیٰ جو پوری کائنات کا خالق و مالک ہے اس کے سامنے اس عالم کے ہر ہر ذرے کی مصلحتیں ہیں، عین ممکن ہے کہ جس چیز کو میں مفید اور بہتر سمجھ رہا ہوں وہ میرے لئے مفید ہی نہ ہو یا میرے لئے تو مفید ہو مگر پوری کائنات کی اجتماعی مصلحتوں کے خلاف ہو، لہٰذا اگر دعا کرنے والا مسلمان ہے اور ان حقائق پر ایمان رکھتا ہے تو اس کی دعا اور درخواست کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ اس درخواست کو ہر حال میں قبول کیا جائے خواہ وہ معقول ہو یا نہ ہو اس لئے درحقیقت ہر مسلمان کی دعا کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ اگر میری یہ درخواست آپ کی قضا و قدر اور حکمتوں کے مطابق ہے تو اسے قبول کر لیجئے اگرچہ ہر شخص یہ الفاظ استعمال نہیں کرتا مگر ہر مسلمان کے دل کو ٹٹول کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اس کے دل میں یہی بات ہوتی ہے، اور جب خود دعا کرنے والے نے اپنی دعا کو مصلحت و حکمت ہونے کی شرط کے ساتھ مشروط کر دیا تو اب اگر اس کی درخواست نامعقول یا خلاف مصلحت ہونے کی بنا پر رد کر دی جائے تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی دعا قبول نہیں ہوئی کیونکہ اس نے خود ہی کہہ دیا تھا کہ یہ درخواست اس وقت قبول کی جائے جب وہ حکمت و مصلحت کے مطابق ہو۔

---

[1] امام طحاوی تو شافعی ہیں، اس لئے ان کے نزدیک مطلق کو مقید پر محمول ہونا ہی چاہیئے، حنفیہ کے نزدیک بھی جب واقعہ ایک ہی ہو تو مطلق مقید پر محمول ہوتا ہے، اس لئے یہ جواب حنفی اصول فقہ کی رو سے بھی درست ہے۔　تقی

محمد حفیظ اللہ پھلواری

حضرت اورنگ زیب عالمگیر
کی
رواداری

شہنشاہ ابوالمظفر محی الدین محمد اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ نے ہندوستان میں پچاس سال تک حکمرانی کی اور امن وامان اور عدل و انصاف کی مثال قائم کر دی۔ اُن کے خلاف جتنی سازشیں اور بغاوتیں اٹھیں، اس نے اپنی جنگی قابلیت سے ختم کر دیں۔

اورنگ زیب کا دورِ حکومت آمدنی اور خوش حالی کے اعتبار سے بھی اکبر اور شاہجہان کے دورِ حکومت سے بہتر تھا۔ عالمگیر کے عہدِ حکومت میں ساٹھ کروڑ روپے سالانہ مالیہ وصول ہوتا تھا اور صنعت اور تجارت نے بھی بڑی ترقی کی تھی۔ بقول الگزینڈر ہیملٹن اس کے زمانہ میں ہندوستان کی تجارت کا مقابلہ یورپ کے بڑے بڑے ممالک بھی نہیں کر سکتے تھے، یہاں کا ایک تاجر سالانہ بیس بیس جہاز غیر ممالک کو بھیج دیتا تھا۔ ہر جہاز میں دس ہزار پونڈ سے لے کر پچیس ہزار پونڈ تک کی مالیت کا سامان ہوتا تھا ہزاروں پونڈ سالانہ چھیاں مالابار سے یورپ روانہ کی جاتی تھیں اور سینکڑوں جہاز ہندوستان کے مال کی برآمد کے لئے ہندوستان کی بندرگاہوں میں مال سے لدے ہوئے کھڑے رہتے تھے، دارالخلافت دہلی بقول ڈاکٹر برنیر اپنی عظمت وشان میں روئے زمین کے دارالخلافتوں سے عہد عالمگیری میں گوئے سبقت لے گیا تھا۔

ہندوستان کا مشہور مؤرخ سر جدو ناتھ سرکار اپنی کتاب "تاریخ اورنگ زیب" میں لکھتا ہے:۔

"اورنگ زیب کی تاریخ عملاً ہندوستان کی ساٹھ سالہ تاریخ ہے۔ خود اس کا عہدِ حکومت (۱۶۵۸-۱۷۰۷ء) سترھویں صدی کے نصف آخری پر حاوی ہے اور ہمارے ملک کا اہم ترین تاریخی زمانہ ہے یہ اسی بادشاہ کا دور تھا جب کہ حکومت مغلیہ اپنے انتہائی دورِ عروج کو پہونچی اور ابتدائے عہد تاریخ سے برطانوی حکومت کے قیام تک کے زمانہ میں شاید ہی حکومت تھی جس نے اتنی وسعت حاصل کی۔

"غزنی سے لے کر چاٹگام اور کشمیر سے لے کر کرناٹک تک تمام ملک ایک ہی فرماں روا کے زیرِ نگیں تھا اور لداک مالابار کے دور دراز مقامات پر بھی اسی بادشاہ کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔ اسلام کی آخری سب سے بڑی ترقی کا یہی زمانہ تھا۔

"اسی طرح جو حکومت قائم ہوئی تھی، ایک سیاسی وحدت تھی۔ اس کے مختلف قطعات پر ماتحت حکمرانوں کا تسلط نہ تھا، بلکہ بلاواسطہ بادشاہ کے ماتحت تھے اور اس حیثیت سے اورنگ زیب کی ہندوستانی حکومت اشوک، چندر گپت یا ہرش وردھن کی حکومت سے وسیع تر تھی۔ اس وقت تک کسی صوبہ کے گورنر نے سر نہ اٹھایا تھا۔ اگرچہ کہیں کہیں علمِ بغاوت بلند ہوتا تھا، لیکن اس عرصہ میں کوئی شخص ایسا پیدا نہیں ہوا جو شہنشاہِ دہلی کے حکم سے سرتابی کر سکتا۔"

مسلم شاہان ہند میں اورنگ زیب عالمگیر کو جس طرح بدنام کیا گیا ہے اور اس پر طرح طرح کے جھوٹے الزامات عائد کئے گئے ہیں۔ اورنگ زیب کٹر مسلمان بادشاہ تو ضرور تھا لیکن اس نے کبھی کسی ہندو کو بالجبر مسلمان نہیں بنایا اور نہ امن کی حالت میں کسی ہندو کو مارا۔ اس کے خلاف اس قدر زہر افشانی کی گئی ہے کہ وہ ظلم و استبداد کا پتلا معلوم ہوتا ہے۔ اورنگ زیب کی صحیح پوزیشن مشہور ہندو مورخ ایشوری پرشاد کی زبانی ملاحظہ فرمائیں۔ مورخ موصوف اپنی مشہور کتاب "تاریخ ہند" میں لکھتے ہیں:۔

"پرماتما کی شان ہے کہ اورنگ زیب جتنا اپنی رعایا کا خیر خواہ تھا اتنا ہی قدرت نے اُسے بدنام کیا، کوئی اُسے ظالم کہتا ہے، کوئی اُسے خونی کہتا ہے، لیکن حقیقت میں وہ "عالمگیر" کے لقب کا مستحق ہے۔

"اس کے ہمعصر ہندو وقائع نگاروں کا بیان ہے کہ:۔ اورنگ زیب ایک نیک انسان تھا۔ اس کا یہ معمول تھا کہ صبح صادق سے پہلے خواب شیریں سے بیدار ہوتا، غسل کرتا، پھر اپنے مالک کی عبادت کرتا۔ اس کے بعد ناشتہ سے فارغ ہو کر حکومت گاہ میں جاتا۔ جہاں امراء خاص حاضر ہوتے، دربار کے نقیب داد خواہوں کو ایک ایک کر کے بادشاہ کی خدمت میں حاضر کرتے ان میں سے زیادہ تعداد ان کی ہوتی جو دور دراز مقامات سے آئے ہوئے ہوتے وہ خود ان کی درخواستیں پڑھتا، اور ان پر حکم صادر کرتا۔ اس کے حضور میں کسی کی سفارش کامیاب نہیں ہوتی تھی۔ وہ غریبوں کی فریاد بھی اسی طرح سنتا تھا جس طرح امیروں کی درخواستیں۔ اکثر معاملات کی وہ خود تحقیقات کرتا تھا اور مجرموں کو سزائیں دیتا تھا۔ اس کے دربار میں کوئی روک ٹوک نہیں تھی، جو چاہتا حاضر ہو سکتا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ عالمگیر ایک انصاف پسند مگر امن و عدل کے معاملہ میں ایک سخت مزاج حکمران تھا۔ اس کا طرز عمل سب کے ساتھ ایک طرح کا تھا، اس کے عہد کا ایک ہندو مورخ لکھتا ہے:۔

"اورنگ زیب ایک سخت مزاج آدمی تھا۔ لیکن اس کا قہر و جلال صرف ہندوؤں کے لئے مخصوص نہیں تھا۔ اس نے اگر ہندوؤں کے ساتھ کبھی سختی بھی کی تو سیاسی وجوہ کی بنا پر اور اس معاملہ میں وہ مسلمانوں پر بھی سختی کرتا تھا۔ سیاسی معاملات سے قطع نظر وہ ہندوؤں کے ساتھ انصاف کرتا تھا، اس کے عہد میں ہندو شاہی ملازمتوں میں شامل ہوتے۔ اس نے ہندوؤں کو فارسی زبان کی تعلیم حاصل کرنے کی ترغیب دی، اور محکمۂ مال میں ان کو داخل کیا، اسی کے زمانہ میں ہندو ادب کی کتابوں کے فارسی میں ترجمے ہوتے۔ علاوہ ازیں کاشی، پریاگ اور دوسرے ہندوؤں کیلئے اس نے جاگیریں دی ہیں اور ہندو پیشواؤں کے ساتھ جو رعایتیں کی ہیں اُن سے اس کی انصاف پسندی ظاہر ہوتی ہے" (تاریخ ہند [illegible])

پروفیسر گھوش کے قول کے مطابق عدل اورنگ زیب اپنے بزرگوں سے سبقت لے گیا اور مشہور انگریز مورخ اسٹینلی لین پول (جس نے اورنگ زیب کی حمایت کے رنگ میں اسے بدنام کرنے کی کوشش کی ہے) کے بیان کے مطابق پچاس برس کی مدت دراز میں ایک بھی ظلم اس کا ثابت نہیں ہوا، اور سب کو تسلیم ہے کہ کوئی قتل یا جسمانی تکلیف رسانی پیش نہیں آئی۔

لیکن پول عالمگیر کے عدل و انصاف کے بارے میں لکھتا ہے:۔

"مغل اعظم کا عدل دریائے اعظم ہے، نپے تلے انصاف سے وہ عموماً تجویز کرتا ہے کیونکہ شہنشاہ کے حضور میں سفارت، امارت اور منصب کی کچھ نہیں چلتی، بلکہ ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی کی اورنگ زیب اس مستعدی سے بات سنتا ہے جس طرح بڑے بڑے امیر کی۔ سیاحوں کی مخالفانہ نکتہ چینی اورنگ زیب کی چال چلن پر اسی زمانہ تک کی ہے جب تک کہ وہ شہزادہ تھا، لیکن وہ سیاح جس وقت اس کے زمانہ شہنشاہی کا حال لکھتے ہیں تو سوائے کلمات تحسین کے اور کچھ نہیں لکھتے۔"

ڈاکٹر جیملی کریری جس نے ۹۰ برس کی عمر میں اورنگ زیب کو دیکھا تھا بیان کرتا ہے :

"وہ صرف ململ کی پوشاک پہنے ہوئے سفید پگڑی کے سہارے امیروں کے جھرمٹ میں کھڑا ہوا تھا وہ داد خواہوں کی عرضیاں لیتا جاتا تھا اور بلا عینک پڑھ کر اپنے ہاتھ سے دستخط کرتا جاتا تھا اور اس کے ہشاش بشاش چہرے سے صاف مترشح تھا کہ وہ اپنی مصروفیت سے نہایت شادمان و فرحاں ہے " (تاریخ الفنسٹن ص۳۲۲)

اورنگ زیب کا بہنوئی کوتوال تھا۔ اس کے بیٹے نے ایک ہندو دلہن کا ڈولا بارات جاتے ہوئے اپنے آدمیوں سے اٹھوا منگایا۔ خفیہ پرچہ نویسوں نے بادشاہ کو اس کی اطلاع دی تو اس نے فوراً اپنے بھانجے کو گرفتار کر کے قید خانے میں ڈال دیا۔ اورنگ زیب کی بہن نے بھائی کی خدمت میں حاضر ہونا چاہا تو اس نے ملنے سے انکار کر دیا۔ بہن نے عرضی بھیجی کہ "آپ میرے بھائی ہیں، آپ نے میرا کوئی خیال نہیں کیا، اور آپ نے اپنے بھانجے کو قید میں ڈال دیا میں اپنے لڑکے کی جدائی برداشت نہیں کر سکوں گی، اورنگ زیب نے اپنی بہن کی گریہ زاری اور منت والتجا کا کوئی خیال نہیں کیا اور عرضی پر اپنے قلم سے لکھا۔

"اگر مجرم کی ماں اپنے بیٹے کی جدائی برداشت نہیں کر سکتی تو اسے بھی بیٹے کے پاس قید خانے میں بھیج دیا جائے "

۱۰۸۰ھ میں شہنشاہ اورنگ زیب نے یہ فرمان جاری کیا کہ ہر ضلع میں سرکاری وکیل مقرر کیا جائے کہ جس کسی کو بادشاہ پر کوئی دعویٰ پیش کرنا ہو تو سرکاری وکیل اس کی جواب دہی کرے گا اور اس کا کافی ثبوت ہو تو سرکاری وکیل سے مطالبہ وصول کرے، چنانچہ وکیل شرع مقرر کئے گئے جو رعایا کی طرف سے قانون کے مطابق بادشاہ کی ناانصافیوں کا تدارک کرتے تھے۔

ایک غیر مسلم قاتل اسلام قبول کر کے موت سے بچنا چاہتا تھا، مگر اورنگ زیب نے اسلامی جذبہ کی شدت کے باوجود قاضی کے فیصلہ کو نیا فیصلہ قرار دیا اورنگ زیب عالمگیر کے ایک دیندار مسلمان بادشاہ ہونے کے باوجود اس کے عہد کی ایسی مثال پیش نہیں کی جا سکتی کہ اس نے کسی ہندو کو زبردستی مسلمان بنایا ہو، یا مذہبی معاملات میں کسی پر سختی کی ہو۔

الگزنڈر ماؤ اپنی کتاب "تاریخ ہند" میں لکھتا ہے :۔

"اورنگ زیب نے ترقی دین کے جوش میں نومسلموں کے ساتھ فیاضی کی لیکن اس نے غیر مذہب کے لوگوں پر مذہبی معاملات میں سختیاں نہیں کیں "

مورخ الفنسٹن کا بیان ہے :۔

"اورنگ زیب کے پورے دور حکومت پر نظر ڈالنے کے بعد یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس نے کبھی کسی ایک ہندو کو بھی محض اختلاف مذہب کی بنا پر قید کیا ہو یا اس کی جائداد پر ٹیکس لگایا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نے اپنی ساری زندگی میں کسی فرد سے بھی کبھی اس کے آبائی طرز عبادت کے بارے میں باز پرس نہیں کی، بلکہ ہر شخص اپنے مذہب کے معاملہ میں آزاد تھا "

پروفیسر آرنلڈ اپنی کتاب "پریچنگ آف اسلام" میں اورنگ زیب کی حکمت عملی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے :۔

"اورنگ زیب کے عہد کی کتب کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس نے کبھی کسی غیر مسلم کو بالجبر مسلمان نہیں کیا بلکہ اس نے غیر مسلموں کی دلداری کی انتہائی کوشش کی ہے تاکہ اس کے مذہبی جوش کی بنا پر کوئی غلط فہمی غیر مسلموں میں اس کے بارے میں نہ پیدا ہو سکے "

ڈاکٹر راجندر پرشاد (سابق صدر حکومت بھارت) لکھتے ہیں:-

"عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ اورنگ زیب نے زبردستی ہندوؤں کو مسلمان بنایا، لیکن یہاں ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا جاتا ہے جس سے اس کی طبیعت کا رنگ ظاہر ہو سکتا ہے۔ شاہجہاں نے بندھیرا کے راجہ اندرمان کو متواتر حکم عدولیاں کرنے کے الزام میں قید کر دیا تھا۔ جب اورنگ زیب دکن کا صوبہ دار ہو کر گیا تو اس نے شاہجہاں سے اندرمان کی رہائی کے لئے بہت زور کے ساتھ سفارش کی تھی، لیکن شاہجہاں کچھ ایسا ناراض تھا کہ اس نے اورنگ زیب کی سفارش واپس کر دی اور لکھ بھیجا کہ اندرمان نے مہاراجہ کو سخت ناراض کیا ہے تاہم اگر وہ مسلمان ہو جائے تو اسے رہائی مل سکتی ہے: اورنگ زیب نے اس حکم کے خلاف بہت سختی کے ساتھ احتجاج کیا اور شاہجہاں کو لکھا کہ اس شرط پر عملدرآمد نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ اخلاق کے بالکل خلاف اور تنگ نظری پر مبنی ہے اور پھر لکھا اگر اسے رہائی دینی ہے تو بس ان ہی شرطوں پر رہائی دی جائے جو کہ خود اس نے پیش کی ہیں۔" (ہندوستان کا مستقبل)

بمبئی گزیٹیر کی جلد ۲۲ میں تحریر ہے:-

"خاندان مغلیہ میں اورنگ زیب پر اور جنوبی ہند میں حیدر علی اور ٹیپو سلطان پر مذہبی سختی اور ہندوؤں کو جبراً مسلمان کرنے کے الزامات لگائے جاتے ہیں۔ پروفیسر آرنلڈ نے اپنی کتاب "پریچنگ آف اسلام" میں اس کے متعلق تین چار مقامی روایتیں بیان کر کے لکھا ہے کہ "ان باتوں کے پڑھنے کے وقت یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ان کی شہادت میں صرف مقامی اور خاندانی روایتیں ہیں، لیکن اورنگ زیب کے عہد کی کتب تواریخ میں جہاں تک مجھ کو پتہ چلا ہے بہ جبر مسلمان کرنے کا کہیں ذکر نہیں اور قرین قیاس یہ ہے کہ چونکہ اورنگ زیب کی طبیعت میں مذہب کا بڑا جوش تھا اس لئے شمالی ہند کی نسبت ہندوؤں کو اس بات کا موقع تھا کہ وہ ہندوؤں کے مسلمان ہونے کی وجہ اس کا ظلم قرار دیں اور یہ وجہ ایسی ہے جس کے بتانے میں کچھ دقت نہیں ہوتی۔"

متعصب اور تنگ دل غیر مسلم مورخین اور اہل قلم نے اورنگ زیب عالمگیر کو نہایت متعصب، ظالم اور ہندوؤں کا بہت بڑا دشمن مشہور کر رکھا ہے، عام طور سے یہ مشہور ہے کہ اس نے لاکھوں ہندوؤں کو زبردستی مسلمان کر لیا اور ہزاروں ہندوؤں کو محض ہندو ہونے کی وجہ سے تہ تیغ کر دیا۔ ہندوؤں کے ساتھ نہایت سختی کا برتاؤ کرتا اور انہیں اعلیٰ عہدوں پر فائز نہ کرتا۔ یہ الزامات اس کے سر صرف اس لئے تھوپ دیئے گئے کہ وہ ایک مذہبی آدمی تھا۔

لیکن سر سی۔ پی راما سوامی ائیر کے بیان کے مطابق شہنشاہ اورنگ زیب کے عہد میں ہندوؤں کو حکومت میں بڑے بڑے عہدے تفویض کئے اور پروفیسر آرنلڈ کے بیان کے مطابق اورنگ زیب کے عہد میں ہندو کثرت سے بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے، اور اس کے دربار میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے حقوق میں کسی طرح کا فرق نہ تھا۔

اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اور عالمگیر کے عہد کے ہندو امراء کی فہرست دیکھی جائے تو عالمگیر کے دور حکومت کے مقابلے میں ہندو امراء کی تعداد نمایاں نظر آئیگی ان امراء میں مہاراجہ سنبھاجی بھونسلہ کا بیٹا ساہو، سیواجی کا پوتا ساہوجی، سیواجی کے داماد ارجن جی اور متھو، اور دوسرے رشتہ دار بھی تھے۔

اورنگ زیب کا مدار المہام ایک ہندو راجہ رگھوناتھ نامی تھا۔ سر جادوناتھ سرکار کے بیان کے مطابق ۱۵ رجون ۱۶۶۳ء کو دیوان رگھوناتھ کو راجہ کا خطاب دے کر مہاسبھا کے امیروں میں شامل کر لیا۔

اسی طرح پنڈت صفدر صاحب کا افسر اعلیٰ یعنی اکاؤنٹنٹ جنرل تھا۔

پنڈت کب رائے نامی ایک برہمن اورنگ زیب کا معتمد خاص تھا۔

اورنگ زیب کو اپنے ہندو سپہ سالار راجہ جے سنگھ پر اپنے بیٹوں سے بھی زیادہ اعتماد تھا۔ سیواجی کے مقابلے کے لئے اورنگ زیب نے جو فوج بھیجی تھی اس کا سپہ سالار اسی کو بنایا تھا۔

راجہ جے سنگھ نے وفات پائی تو اورنگ زیب نے اس کے فرزند کنور رام سنگھ کو جو ان دنوں معتوب تھا، قصور معاف فرما کر راجہ کا خطاب عطا فرمایا اور اس پر بے حد نوازش فرمائی۔

جے سنگھ کے بیٹے مان سنگھ، بہا سنگھ، اوپ سنگھ اپنے باپ کی وفات کے بعد آستانہ شاہی پر حاضر ہوتے تو ہر ایک شخص کو خلعت مرحمت ہوا۔
(مآثر عالمگیری)

کابل میں اگرچہ صرف مسلمانوں کی آبادی تھی، مگر اورنگ زیب نے وہاں ایک ہندو گورنر مقرر کیا اس کا نام جسونت سنگھ تھا۔ کون جسونت سنگھ؟ وہ جس نے دارا شکوہ کی حمایت میں اورنگ زیب کا مقابلہ کیا تھا جو چودہ ہزار راجپوت لے کر شجاع کے مقابلے کے لئے گیا لیکن عین لڑائی کی شب میں اپنی ساری فوج کے ساتھ شاہی خزانہ پر حملہ کرکے ہوتے شجاع سے جا ملا اور جس نے سیواجی کے مقابلے میں اورنگ زیب کے ساتھ غداری کی۔ راجہ جسونت سنگھ بار بار اورنگ زیب سے بدعہدی اور غداری کرتا لیکن اورنگ زیب ہر بار اسے معاف کر دیتا۔ اور اس کے عہدے پر مقرر کر دیتا۔

اورنگ زیب کی اس فراخدلی اور رواداری پر کون انصاف پسند ہوگا جو مرحبا نہ کہے!

مہاراجہ اودے پور نے دوسرے راجاؤں کے ساتھ مل کر اورنگ زیب کے خلاف بغاوت کی، لیکن شکست کھانے کے بعد اورنگ زیب سے معافی مانگی تو اورنگ زیب نے اُسے گلے لگا لیا۔ سنہ ۱۶۸۱ء میں مہارانا دربار شاہی میں حاضر ہوا تو اورنگ زیب نے اُسے بیش بہا خلعت، خطاب اور پنج ہزاری منصب عطا کیا۔

۱۶۸۱ء میں اودے پور کے شہزادہ اندر سنگھ کو دو ہزاری اور بہادر سنگھ کو ایک ہزاری و پانصدی کا منصب عطا کیا۔

سوبھان قلعہ ستارہ کا نگہبان تھا۔ قلعہ ستارہ کی فتح کے بعد شہزادہ محمد اعظم نے اس کے ہاتھ اور گردن باندھ کر اورنگ زیب کی خدمت میں پیش کیا تو حکم ہوا کہ اس کے بند کھول دئے جائیں۔ سوبھان کو منصب پنج ہزاری، دو ہزار سوار اور خلعت و کمر، اسپ و فیل، علم و طوغ و نقارہ اور بیس ہزار نقد عطا فرما کر سربلند و ممتاز فرمایا۔ سوبھان نے بکمال عقیدت اپنی زبان سے عرض کیا۔

ببالش بخت بخندید ازیں ترانہ شکر
کہ نقش سجدہ ام آخر بکوئے شاہ نشست (مآثر عالمگیری)

ان آزاد بادشاہوں کے حیرت انگیز اعتماد کا دنیا ہمیشہ تعجب اور حیرت سے مشاہدہ کرتی رہی، سخت سے سخت دشمن گرفتار کرکے لایا گیا، جس پر قابو پانے کے لئے کروڑوں روپے اور لاکھوں جانیں ضائع کی جا چکی تھیں، لیکن جب وہ مغلوب ہو کر سامنے آیا تو فاتح کا مستانہ نعرہ یہ ہوتا تھا:—

ع در عفو لذتے ست کہ در انتقام نیست

اگر وہ دوبارہ بغاوت کرتا اور پھر شاہی لشکر کے قہر سے مغلوب ہو کر ندامت کا اظہار کرتا تو فاتح طرز میں نہایت تمکنت سے کہہ دیا جاتا۔

ایں درگہ ما درگہ نا امیدی نیست

جیسا کہ جب شیواجی نے دوسری مرتبہ عالمگیر کے سامنے ندامت کا اظہار کیا تو عالمگیر نے یہی جواب دیا تھا۔
(علمائے ہند کا شاندار ماضی)

پدم جی شاہانہ دار پر جو پانچ گاؤں کا سیوا جی کا چچا زاد بھائی، دو ہزاری پانصدی، دو پانصد سوار کا امیر تھا، پانصدی اضافہ سے ہم چشموں میں سربلند کیا۔ (ماثر عالمگیری)

۱۰۸۰ھ میں عالمگیر نے شاہزادہ معظم شاہ کو راجہ جسونت سنگھ کے ہمراہ دکن کی صوبہ داری پر مامور کیا تو سیوا جی نے جسونت سنگھ کے پاس پیغام بھیجا کہ میں اپنے بیٹے سنبھا کو بھیجتا ہوں اس کو فوج میں کوئی عہدہ عنایت کیا جائے۔

جسونت سنگھ نے یہ درخواست منظور کی سیوا جی نے سنبھا کو ایک ہزار فوج کے ساتھ شہزادہ معظم کی خدمت میں بھیجا۔

باوجودیکہ سنبھا جی پہلے پنج ہزاری منصب پر دربار عالمگیری میں فائز تھا اور پھر باپ کے ساتھ خود بھی فرار ہو کر باپ کی شورش و سرکشی میں شریک ہو گیا تھا مگر شاہان لطف و کرم کا تو نظریہ یہی تھا کہ

این درگہ ما درگہ نومیدی نیست

چنانچہ سنبھا جی کو پنج ہزاری منصب راجگی کا خطاب اور صوبہ برار بطور جاگیر عطا ہوا۔

سیوا جی کے انتقال کے بعد سنبھا جی اس کا جانشین ہوا لیکن وہ اپنی آرام طلبی اور عیاشی کے باعث اپنی قوم کو خوش نہیں رکھ سکا اور وہ زمین اس کے ہاتھ سے نکل گئی جو اس نے حاصل کی تھی ہر طرف پر یکایک حملہ کر کے نہایت سفاکی اور بیدردی سے لوٹ اور آگ لگا دی ... عالمگیر نے ۱۱۰۰ھ میں مقرب خاں کو سنبھا کی سرکوبی پر مامور کیا جس نے سنبھا جی کو مع اہل و عیال گرفتار کر لیا۔ جب وہ پابہ زنجیر عالمگیر کے دربار میں حاضر کیا گیا تو اس نے ملامت کے بجائے عالمگیر کو گندی گندی گالیاں دیں۔ اس صورت میں عفو اور درگذر سے کام لینا تو سلطنت کو برباد کر دینا تھا ــ مجبوراً عالمگیر کو وہ معاملہ کرنا پڑا جو اس نے اپنے پچاس سالہ دور حکومت میں کبھی بھی کسی کے ساتھ نہ کیا تھا یعنی زبان اور آنکھیں نکلوا کر اس کو قتل کروا دیا لیکن پھر فوراً لطف و کرم کے فطری جذبہ نے عالمگیر کو مغلوب کیا اور اس مغلوبیت میں اس نے وہ کیا جو حزم و احتیاط کے قطعاً مخالف تھا (عہد رفتہ کا شاندار ماضی) یعنی سنبھا کی ماں (اورنگ زیب کے سب سے بڑے دشمن کی بیوی) اور دوسرے متعلقین کے متعلق حکم صادر ہوا کہ ان کے لئے ضرورت کے لحاظ سے خیمے لگا کر ان اسیروں کو عزت و احترام کے ساتھ اتارا جائے۔ عمدۃ الملک کے ڈیرے کے قریب رانی کے بازار کا ڈیرا بھی نصب کیا گیا تاکہ اس مکان میں ان کے خادم اور اسباب وغیرہ مقیم ہوں اور اس نوازش کے بعد ہر ایک کے لئے حسب ضرورت مشاہرہ مقرر کیا گیا جس کی تفصیل حسب ذیل ہے ــ

ساہو جی پسر سنبھا کا نواسہ فرزند اکبر، ہفت ہزاری، ہفت ہزار سوار کا منصب خطاب راجگی و خلعت و جواہر مرصع مادہ فیل تا اسپ دیں ذوالفقار و علم، حاصل کر کے حسن ناجگان کے زمرے میں داخل ہوا۔

مدن سنگھ اور اودھ سنگھ ساہو جی کے چھوٹے بھائی، حسب لیاقت منصب و عطیات سے بہرہ مند ہوئے اور ان کے لئے حکم ہوا کہ اپنی ماں اور دادی کے پاس رہیں۔

ان میں سے ہر ایک کے علاقہ کے لئے بادشاہی عمال و کارپرداز مقرر ہوئے تاکہ ان کے امور خانگی انجام دیتے رہیں۔

(عہد رفتہ کا شاندار ماضی اور مآثر عالمگیری)

اورنگ زیب عالمگیر کا سلوک ساہو جی کے ساتھ ہمیشہ مہربانہ رہا۔ اورنگ زیب نے اس کی شادی ۱۱۱۵ھ میں بہادر جی مرہٹہ کی لڑکی سے کر دی۔ سات سال کی عمر سے سیوا جی کا یہ پوتا اورنگ زیب عالمگیر کی زیر نگرانی میں رہتا تھا۔ اس کی شادی بھی کرتا ہے، لیکن کبھی مسلمان ہونے کیلئے نہیں کہتا ہے ــــ یہ تو ہندوؤں کے بہت بڑے دشمن کا بیٹا کردار ہے!!! کیا تاریخ عالم ایسی عالی حوصلگی اور فیاضی کی مثال پیش کر سکتی ہے؟

مہاراجہ جسونت سنگھ نے دارا شکوہ کی حمایت میں اورنگ زیب کا سخت مقابلہ کیا ہے۔ دارا کو شکست ہوتی ہے جسونت سنگھ ندامت کا اظہار

کرتا ہے۔ عالمگیر نہایت فراخدلی سے معاف کرتا ہے۔

شجاع الہ آباد پر حملہ کرنے کے لئے آتا ہے۔ جسونت سنگھ عالمگیر کی حمایت میں چودہ ہزار راجپوت فوج لے کر پہونچتا ہے۔ ابھی جنگ شروع نہیں ہوئی ہے کہ شب کو جبکہ عالمگیر تہجد کی نماز میں مشغول ہے، خبر ملتی ہے کہ جسونت سنگھ اپنی کل راجپوت فوج کے ساتھ شاہی فوج کو تباہ کرتا ہوا شجاع سے ملا۔ شجاع کو شکست ہوتی ہے اور جسونت سنگھ اپنے وطن کو واپس جاتا ہے، وہاں سے عالمگیر کی خدمت میں درخواست بھیجتا ہے۔ وہ نہ صرف معاف ہی نہیں کرتا ہے بلکہ منصب شاہی اعزازات وغیرہ بحال کر کے گورنر بنا کر احمد آباد بھیجتا ہے۔

شیواجی کے مقابلہ کے لئے جسونت سنگھ دکن بھیجا جاتا ہے، یہاں بھی غداری کرتا ہے اور شیواجی سے مل جاتا ہے، ریاست بوندی کا راجہ راؤ بھاؤ سنگھ کو جو اس مہم میں جسونت سنگھ کے ساتھ تھا بغاوت پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتا ہے جس میں اسے کامیابی نہیں ہوتی ہے۔

بھیم سین کالستھ شاہی ملازمت میں بندیلہ کے حاکم کیا تھ منسلک تھا۔ دکن کی لڑائیوں میں بہت ہی کارآمد ثابت ہوا تو عالمگیر نے "رائے" کے خطاب کے ساتھ تین ہزار فوج کا افسر بنایا پھر نالدرگ کا قلعہ دار ہوا۔ "دلکشا" کے نام سے عہد عالمگیری کی ایک تاریخ لکھی جو بہت اہم سمجھی جاتی ہے۔ (نزہۃ تیموریہ)

مہاراجہ دھیرج نرائن آف پڑرونہ نے ۲۰ مارچ ۱۹۲۹ء کے جھنڈی جلسے میں ایک تقریر کی تھی جو رسالہ "فوق" میں "تاریخ کا ایک پہلو" کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔ انہوں نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ میرے بزرگ مغلوں کے ہاں توپ خانہ میں دو ہزاری منصب پر تھے، لیکن شہنشاہ اورنگ زیب نے میرے بزرگوں کی بے حد عزت و ہمت افزائی کی۔ چنانچہ رائے امر تھ رائے شیوجی کی خدمات سے خوش ہو کر ۲۴ مواضعات کی جاگیر عطا فرمائی۔ دارا شکوہ کو شکست دینے کے بعد شہنشاہ عالمگیر نے دلیر خاں اور بہادر خاں جیسے سپہ سالاروں کو مات کرانے کے بعد مکند رائے کو گورنر رہ بیکھنٹ مقرر کیا تھا جسے بعد میں گورنر بنگال بنایا گیا۔ فرخ آباد ضلع کے قنوج کے پاس مکن نگر ان ہی کا بسایا ہوا ہے۔ جس کے بارے میں پنڈت دیبی پرشاد مصنف تاریخ فرخ آباد نے صفحہ ۴۸ پر لکھا ہے۔

"بھرت پور اور ڈیگ کے مشہور قلعے جو بالترتیب چورامن جاٹ اور اس کے لڑکے بدن سنگھ نے بنوائے تھے، شہنشاہ عالمگیر نے ۱۶۸۸ء میں ان کا منتظم اعلیٰ ایک مرہٹہ سردار تماجی جی کو مقرر کیا تھا۔ شہنشاہ نے ویلی نگر چند کی خدمات سے خوش ہو کر بہت بڑی جاگیر اجین کے قریب ۱۶۹۲ء میں عطا کی تھی۔"

یہ ہے اس شہنشاہ اورنگ زیب کی وسیع نظری کا عالم جسے سب سے بڑا متعصب کہا جاتا ہے۔

عہد عالمگیر کے چند خاص خاص ہندو امراء اور منصب داروں کے نام لکھ کر عوام کو یہ بتانا مقصود ہے کہ عالمگیری عہد میں قومی اتحاد بعید مضبوط اور قابل تعریف تھا۔ ان افسروں اور عہدہ داروں کے نام یہ ہیں :-

سیواجی ۱۲ جلوس میں پانچ ہزاری اور پانچ ہزار سواروں کا افسر تھا۔

مہی رائے ۱۳ جلوس میں پانچ ہزاری سواروں کا افسر تھا۔

بھاگو مل پانچ ہزاری اور چار ہزار سواروں کا افسر تھا۔

اسی طرح اچلا جی مرہٹہ، جسونت راؤ دکنی، برہاجی، راجہ بھیم، درگا داس راٹھور، مکت رائے، راجہ اودت سنگھ، البشر جی دکنی، بکرم سنگھ، منکوجی، دلپت رائے، راجہ کلیان داس بھدوریہ، راگھو داس جھالا، پرتھی سنگھ چھپترس، راجہ عالم سنگھ، گردھر سنگھ بھدوریہ، رائے لال چند، رائے مکند رائے، راجہ مان سنگھ، مرلیدھر مربرائے، کنور رام سنگھ، راجہ کشن سنگھ، بشن سنگھ، جے سنگھ سوائی، بجے سنگھ، رائے سنگھ، انرودھ سنگھ،

جگت سنگھ ہاڑا، راجہ کرن سنگھ، راؤ سروپ سنگھ، شبھ کرن سنگھ، وغیرہ سینکڑوں کی تعداد میں تھے۔

(ماخوذ از دین دنیا جولائی ۱۹۶۴ء)

"۔۔۔ اور جب ۱۰۷۲ھ کے ایک عالمگیری فرمان میں پالیتانہ (جس کو شترنجے بھی کہتے ہیں) کے مندر گاؤں اور بہت بڑی پر احمد آباد کے شانتی داس جوہری کے قبضہ کی تصدیق کی گئی ہے۔ اور جوناگڑھ کے مندر گرنارس کی پہاڑیوں اور سروہی کے آبو جی بھی اسی پرورت کو عطا کر دئے گئے ہیں۔ گوہاٹی (آسام) میں امانند کے مقام پر شیو جی کا مندر ہے، جس کے دلاتی (یعنی گدی نشین) کے نام عطائے اراضی کی ایک سند بھی اورنگ زیب کی عطا کی ہوئی ہے ۱۰۹۰ھ اور ۱۰۹۸ھ میں بھگونت اور رام جیون گسائیں کے مقبوضات وقف کی تصدیق کی گئی اور انہیں ہر قسم کی مداخلت سے محفوظ قرار دیا گیا ہے۔ یہ فرمان بھی عالمگیر ہی کے ہیں۔"

(آر کالج آف دی مغل ایمپائر باب چہارم بحوالہ ثقافت اسلام ص ۲۸۳)

ڈاکٹر راجندر پرشاد تحریر فرماتے ہیں:۔

"اورنگ زیب نے بہت سے قابل ہندوؤں کی سفارش شاہ جہاں اور اس کے وزراء سے ملازمت کیلئے کی مثال کے طور پر یہ واقعہ ملاحظہ ہو کہ جب ایلچپور میں دیوانی کی جگہ خالی ہوئی، اورنگ زیب نے ایک با جہت اندر مانے کرن کی پرزور سفارش کی، لیکن کسی وہم سے شاہ جہاں نے وہ سفارش قبول نہ کی۔ اورنگ زیب نے دوبارہ لکھا کہ اس سے بہتر آدمی نہیں مل سکتا ہے (رواقعات عالمگیر جلد اول ص ۱۱۳) اسی قسم کی بہت سی مثالیں عالمگیری اور آداب عالمگیری میں موجود ہیں (ہندوستان کا مستقبل)

(انڈیا ڈیوائیڈڈ مطبوعہ ۱۹۵۹ء ص ۲۸)

بنگال کا ایک اہل قلم جناب بنسلا چندرائے لکھتا ہے کہ:۔

"شہنشاہ اورنگ زیب کے عہد میں بھی سلطنت کے اندر بڑی بڑی ذمہ داری کے عہدے ہندو تل کرتے ہوئے تھے۔ بنگال میں مرشد قلی خاں اورنگ زیب کا والسرائے تھا۔ چنانچہ مرشد قلی خاں کے ماتحت محکمہ دیوانی کے تمام بڑے بڑے عہدے صرف ہندوؤں ہی کے ہاتھوں میں تھے۔ ہندوؤں کا ان پر کامل قبضہ تھا۔ بڑے بڑے فوجی عہدے بھی ہندوؤں کو ملے ہوئے تھے۔ اگر مغل شہنشاہ کے دل و دماغ میں ہندو کے خلاف نفرت ہوتی تو وہ اپنے وائسرائے کو اس سے روک دیتا بلکہ ایسا کرنے پر اس سے جواب طلب کر لیتا لیکن کبھی ایسا نہیں کیا"

(دین دنیا دہلی)

عالمگیر کے عہد کا ہندو مورخ منشی سجان رائے "خلاصۃ التواریخ" میں لکھتا ہے کہ:۔

"دیپا پتیرالی جو کلانور کے پاس واقع ہے شاہ شمس دین دریائی کا مزار ہے، ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو ان سے عقیدت تھی، لیکن ایک ہندو کی عقیدت ان سے اتنی تھی کہ ان کی وفات کے بعد اسی ہندو کو مسلمانوں اور ہندوؤں نے مل کر ان کے مزار کا متولی بنایا۔ چند سال کے بعد کچھ مسلمانوں نے شورش کر کے مذہبی بہانے سے ہندو کو تولیت سے محروم کر دینا چاہا لیکن عالمگیر کی حکومت نے اس شورش کو کامیاب نہ ہونے دیا اور جب یہ کتاب "خلاصۃ التواریخ" لکھی جا رہی ہے، عالمگیر کی حکومت کا تیسواں سال ہے لیکن اس مزار کی تولیت بدستور ہندو کے ہاتھ میں ہے۔"

اورنگ زیب کے عہدِ حکومت میں، جودھپور، اودے پور، کوچ بہار وغیرہ کی ہندو ریاستیں تھیں۔ اورنگ زیب نے کبھی انہیں اپنی حکومت میں شامل کرنے کا خیال بھی نہیں کیا، حالانکہ بیجاپور اور گولکنڈہ مسلمان حکومتیں تھیں، مگر انہیں جب تک اورنگ زیب نے اپنی حکومت میں شامل نہیں کر لیا، دم نہیں لیا۔

دکن میں جہاں اورنگ زیب پچیس برس تک رہا، ہزاروں مندر تھے، الورا میں سینکڑوں بت تھے، اس نے کسی بت کو نہیں توڑا۔ یہ مندر اور بت آج تک موجود ہیں، خود اورنگ زیب کی قبر بھی اسی قرب و جوار میں ہے۔

اس کے علاوہ ہندوستان میں بے شمار مندر تھے۔ اگر واقعی اورنگ زیب عالمگیر مندروں کا دشمن ہوتا تو ان مندروں کو ایک ایک کرکے مسمار کر دیتا مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ ہاں وہ مندر ضرور مسمار کئے گئے جہاں اس کے خلاف سازشیں کی جاتی تھیں۔

ڈاکٹر پرماتما سرن نے ہسٹری کانگریس کے اجلاس پٹنہ (بہار) منعقدہ دسمبر ۱۹۴۶ء میں جو خطبہ دیا تھا، اس میں کہا تھا:—

"بعض اس قسم کی طرف سے چند حقیقتیں ابھی روشنی میں لائی گئی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ چند اہم مراکز جیسے بنارس کے مندر تھے، ہندوؤں کی طرف سے مفسدانہ سازشوں کے اڈوں کے طور پر استعمال کئے جاتے تھے، جن کے خلاف شہنشاہ نے اشتعال میں عملی اقدام کیا اور اس کو اب اس کے تعصب کی شہادت میں پیش کیا جاتا ہے۔"

ایسی مثالیں موجود ہیں کہ "بت شکن" اورنگ زیب عالمگیر نے مٹھوں اور مندروں کو جاگیریں عطا کیں۔ اور پنڈت سندر لال (الہ آباد) کے بیان کے مطابق آج تک متعدد مندروں کے پجاریوں کے پاس اورنگ زیب کے دستخطی فرمان موجود ہیں جن میں خیرات اور جاگیروں کے عطا کئے جانے کا تذکرہ ہے۔

شری ابونرائن، سابق منیجر ریاست رام نگر دھیرٹی، ضلع بارہ بنکی (بھارت)، نے شہنشاہ اورنگ زیب کی بے تعصبی کے متعلق عرصہ ہوا ایک مضمون شائع کیا تھا، جس میں لکھتے ہیں کہ سلطان محی الدین اورنگ زیب عالمگیر غازی بادشاہ کو عام طور پر متعصب کا خطاب دیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ انہوں نے ہندو مت کے مندر تباہ و برباد کئے اور طرح طرح سے ہندوؤں کو تکلیف پہنچائی، مگر یہ امر تحقیق طلب ہے کہ یہ افواہیں کس حد تک صحیح اور درست ہیں اور کس حد تک تاریخی آمیزش ہے، جس کا وجود محض قیاسات یا بازاری افواہوں پر پایا جاتا ہے۔ میری سمجھ میں ہندو مندروں کی تباہی یا بربادی مذہبی تعصب پر نہیں بلکہ اگر کوئی ایسا واقعہ ہوا بھی تو وہ پالیٹکل مصالح اور اس وقت کے واقعات سے متعلق ہیں۔ بادشاہ ممدوح الشان کے غیر متعصب ہونے یا عموماً بت شکن نہ ہونے کے وجوہ حسب ذیل ہیں:—

(۱) ضلع سیتاپور مصرکھ ہندوؤں کا ایک مشہور معبد ہے۔ مصرکھ کے مہنت کے پاس بادشاہ عالمگیر کی عطا کی ہوئی شاہی سند موجود ہے جس کے ذریعہ بہت سے مواضعات مہنت موصوف کو مصارف مذہبی کے لئے عطا کئے گئے تھے، از آں جملہ مواضعات اب تک مہنت موصوف کے قبضہ میں موجود ہیں۔

(۲) مضافات متھرا کے چند میل کے فاصلہ پر ایک مقام بلابہار ہے یہاں بلدیوجی کا مندر ہے اور اس مندر کے مصارف کے لئے بادشاہ اورنگ زیب نے بہت سے مواضعات عطا کئے، جو اب تک مندر مذکورہ کے قبضہ میں ہیں۔

(۳) دریائے جمنا الہ آباد کا قلعہ شہنشاہ اکبر کے زمانہ میں تعمیر ہوا تھا۔ اس قلعہ کے اندر ہندوؤں کی ایک عبادت گاہ ایک وسیع تہ خانے کے اندر اب تک موجود ہے، ایک برگد کا درخت ہے اور ہزاروں کی تعداد میں ہندوؤں کی مورتیاں ہیں، ہندو پنڈت اور پجاری اس کے اندر اپنے عقائد اور پوجا کے مراسم ادا کرتے ہیں۔"

چودھری چھوٹو رام سابق وزیر حکومت متحدہ پنجاب تحریر فرماتے ہیں:—

"اورنگ زیب کا دستخطی فرمان جاگیرداری جو دھیا کے متعلق ایک نہایت مشہور مندر کے پجاریوں کے پاس اب تک دیکھا جا سکتا ہے۔ اورنگ زیب کا فرمان جس کی رو سے اس نے بنارس کے مندروں کے پجاریوں کے حقوق محفوظ کئے، فارسی میں اب تک لندن میوزیم میں موجود ہے۔"

جناب ڈاکٹر راجندر پرشاد تحریر فرماتے ہیں :-

"اورنگ زیب نے گردھر ولد جگ جیون ساکن موضع بستی ضلع بنارس اور جدو مصر ساکن مہیش پور پرگنہ گوپی کو اور پنڈت بال مکند مصر کو جو تینوں مہنت تھے، جاگیریں دیں۔"

"اورنگ زیب نے بصورت نقد مصر کلیان داس کو ملتان کے شوالے کے لئے سو روپیہ کا عطیہ دیا تھا، جو اس وقت تک جاری ہے (حوالہ ضلع ملتان کے بندوبست کی رپورٹ تیار کردہ مکھ چند، اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر)

(ہندوستان کا مستقبل)

ترچنا پلی میں کئی ہزار سال کا ایک مندر ہے اس کو ۳۰۳ مواضعات سلاطین اسلام نے دئے تھے ان میں سات اورنگ زیب کے عطا کردہ تھے، یہ علاقہ سلطان ٹیپو کے زیر حکم رہا۔ مندر کو کوئی نقصان نہیں پہونچایا گیا۔

۱۵ رجب رجب الثانی ۱۰۶۹ھ کو اورنگ زیب عالمگیر نے بنارس کے ناظم ابوالحسن کے نام حسب ذیل فرمان جاری کیا تھا :-

"شریعت غرا کے مقدس قانون کے مطابق نئے مندر نہیں بنائے جا سکتے۔ مگر پرانے مندروں کو توڑا بھی نہیں جا سکتا ہمارے گوش گذار یہ خبر ہوئی ہے کہ بعض عمال از راہ جبر و تعدی قصبہ بنارس اور اس کے آس پاس کے دوسرے مقامات کے ہندوؤں اور برہمنوں پر جو قدیم بت خانوں کے پروہت ہیں، تشدد کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ برہمنوں کو ان کی پروہتی سے علیحدہ کر دیں، جس کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ یہ بے چارے پریشان ہو کر مصیبت میں مبتلا ہو جائیں۔ اس لئے تم (ابوالحسن) کو حکم دیا جاتا ہے کہ اس فرمان کے پہونچتے ہی ایسا انتظام کرو کہ کوئی شخص تمہارے علاقے کے برہمنوں اور دوسرے ہندوؤں کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہ کرے اور ان کی تشویش کا باعث نہ ہو تاکہ یہ جماعت بدستور سابق اپنی اپنی جگہ اور اپنے منصبوں پر قائم رہ کر اطمینان قلب کے ساتھ ہماری دولت خداداد کے حق میں مصروف دعا رہے۔ اس باب میں تاکید مزید جانو۔"

یہ فرمان ہے ہندوؤں کے سب سے بڑے دشمن کا جس پر بہت سے الزامات تھوپے جاتے ہیں۔

مشہور ہندو مصنف جناب پنڈت سندر لال الٰہ آبادی تحریر فرماتے ہیں کہ :-

"..... ہر بادشاہ کی طرف سے بے شمار ہندو مندروں کو جاگیریں اور معافیاں دی گئیں۔ آج تک ہندوستان میں متعدد ہندو مندروں کے پجاریوں کے پاس اورنگ زیب کے دستخطی فرمان موجود ہیں، جن میں خیرات اور جاگیروں کے عطا کئے جانے کا تذکرہ ہے۔

"اسی قسم کے دو فرمان اب تک الٰہ آباد میں موجود ہیں، جن میں سے ایک اس وقت مصر میشور ناتھ کے مشہور مندر کے پجاری کے پاس ہے۔" (ماخوذ از اخبار استقلال دیوبند مورخہ ۱۴ مارچ ۱۹۳۶ء)

حال ہی میں ایک تازہ انکشاف اس سلسلہ میں ہوا ہے۔ یہ انکشاف شجیرے کے ایک کانگرسی لیڈر شری دیا شنکر مصرا ۔۔۔ پی صدر کانگریس کمیٹی کے ایک مراسلہ سے ہوا ہے جو لکھنؤ کے ہندی روزنامہ "سوتنتر بھارت" کی ایک اشاعت میں شائع ہوا ہے، مصرا جی کے اس مراسلہ کا اردو ترجمہ درج ذیل ہے۔

"مغل شہنشاہ اورنگ زیب کے بارے میں اس ہوضع میں خصوصی تحقیق کے نتیجہ میں ایک نیا واقعہ روشنی میں آیا ہے۔ فتح پور ضلع کی تحصیل فتحپور کے جورا تواں کے قریب ایک گاؤں کے پنڈت کاشی پرشاد کے بزرگوں کو مغل شہنشاہ اورنگ زیب نے پچاس بیگھہ زمین کھیتی کے لئے اپنے شاہی فرمان کے ذریعہ اس غرض سے دی تھی کہ وہ اس سے گذر بسر کریں اور خدا کی عبادت اور ریاضت اپنے دھرم کے مطابق کریں۔ آج بھی شری کاشی پرشاد کے پاس اورنگ زیب کا وہ شاہی فرمان موجود ہے جو فارسی زبان میں ان کے بزرگوں کو ملا تھا اور جس کے ذریعہ پچاس بیگھہ رقبہ کی زمین مفت دی گئی تھی۔ اس فرمان کا عنوان ہے "برائے ذکر گردن خدا" — " شری دیا مصرا نے یہاں تک واقعہ بیان کرنے کے بعد اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ "یہ شاہی فرمان شہنشاہ اورنگ زیب کے بارے میں اب تک کی تاریخ اور غلط فہمیوں کا رخ موڑ دیتا ہے، یہ ثابت نہیں تھا بلکہ وہ ہندو دیوی دیوتاؤں اور ان کے دھرم کا احترام کرتا تھا۔ مورخوں نے اس کے متعلق حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے ——— کہا جاتا ہے کہ جوسی (الہ آباد) کے ایک قدیم مندر میں پوجا پاٹ کے کاموں کے لئے اورنگ زیب نے ایک جائداد وقف کردی تھی۔ اورنگ زیب اپنے مذہب اسلام کا سچا پیرو تھا۔ وہ ایماندار، محنتی، سادگی پسند اور بلند اخلاق وسیرت رکھنے والا تھا۔ فضول خرچ اور عیاش نہیں تھا"

(روزنامہ ساتھی پٹنہ (بہار) مورخہ ۲ مارچ ۱۹۶۴ء)

گرو گوبند سنگھ جی نے شہنشاہ اورنگ زیب کی رواداری کی بڑی تعریف کی ہے جس کا ذکر دسم گرنتھ ص۲۵۵ میں ملتا ہے۔ گرو ھررائے صاحب سخت مخالف ہونے کے باوجود اورنگ زیب کی بڑی عزت کرتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے بیٹے گرو رام رائے کو عالمگیر کے پاس بھیجا تھا جس کی شہنشاہ نے بڑی عزت کی تھی اور جاگیر دی تھی۔

(تاریخ خالصہ ص۱۹۲ ص۲۵۵)

ڈاکٹر پرماتما سرن ہسٹری کانگریس کے اجلاس پٹنہ (بہار) میں اپنے خطبہ میں کہا تھا:-

"ایسے فرامین کی ایک خاص تعداد منظر عام پر لائی گئی ہے جس میں عالمگیر نے برہمنوں کو وظیفے دئے اور مندروں پر جاگیریں وقف کی ہیں"

ہسٹری کانگریس کے پٹنہ (بہار) کے اس اجلاس میں اورنگ زیب عالمگیر کے ہاتھ کی لکھی ہوئی وہ سند بھی نمائش میں تھی جس کی رو سے بودھ گیا (بہار) کے مندر کو لاکھوں کی مالیت کی جاگیر عطا کی تھی۔ یہ سند اس مسلمان بادشاہ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھی جو ہندوؤں اور مندر کا دشمن سمجھا جاتا ہے۔ اس فرمان کی اصل بودھ گیا کے مہنت کے پاس محفوظ ہے۔ اورنگ زیب کی عطا کردہ جاگیر آج بھی اسی معبد کے قبضہ میں ہے۔

اورنگ زیب کے عہد حکومت کا انگریز سیاح کپتان ہملٹن کا بیان ہے:-

"ریاست کا مسلمہ مذہب اسلام ہے لیکن تعداد میں اگر دس ہندو ہیں تو ایک مسلمان ہے، ہندوؤں کیساتھ مذہبی رواداری پورے طور پر برتی جاتی ہے وہ اپنے برت رکھتے ہیں اور اسی طرح تہوار مناتے ہیں جیسے اگلے زمانہ میں مناتے تھے جب کہ حکومت ہندوؤں کی تھی"

سورت کے حالات کے سلسلہ میں سیاح موصوف لکھتا ہے:-

"اس شہر میں مختلف مذاہب کے لوگ رہتے ہیں لیکن اعتقادات اور طریق عبادت کے بارے میں ان میں کبھی کوئی جھگڑا

نہیں ہوتا ہر ایک کو یہاں کی آزادی ہے کہ جس طرح چاہے اپنے طریقہ سے اپنے معبود کی پرستش کرے۔ صرف
اختلاف مذہب کی بنیاد پر کسی کو تکلیف دینا اور آزار پہنچانا ان لوگوں میں بالکل مفقود ہے۔"

پارسیوں اور عیسائیوں کے متعلق لکھتا ہے:۔

"پارسی بھی ہیں، اور وہ اپنے رسوم مذہب زردشت کے بموجب کرتے ہیں۔ عیسائیوں کو یہاں کی اجازت ہے کہ اپنے
گرجے بنائیں اور اپنے مذہب کی تبلیغ کریں۔"

ہمیلٹن شہر ٹھٹھہ کے متعلق لکھتا ہے:۔

"ہندوؤں کے ساتھ رواداری پورے طور سے برتی جاتی ہے۔ وہ اپنے مندر رکھتے ہیں اور تہواروں کو اسی
طرح مناتے ہیں جیسے اگلے زمانہ میں منایا کرتے تھے، جب کہ بادشاہت خود ہندوؤں کی تھی۔ وہ اپنے مردوں کو جلاتے
ہیں، لیکن ان کی بیویوں کو اجازت نہیں ہے کہ وہ شوہر کے مردے کے ساتھ ستی ہوں۔"

موسیو تھیونو فرانسیسی سیاح جس نے ۱۶۵۵ء، ۱۶۶۶ء تک ہندوستان کی سیاحت کی اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے:۔

"اکثر بستیوں میں مندر بنے ہوتے تھے، ہندو گاڑیوں میں جاتے ہوئے ملتے تھے، جو ان مندروں میں پوجا
کے واسطے آتے تھے۔"

ان اقتباسات سے بہت آسانی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اورنگ زیب کے دور حکومت میں غیر مسلم رعایا نہایت آزادی سے اپنی مذہبی
رسوم ادا کرتی تھی۔

۲۵ جلوس مطابق ۱۰۹۲ھ (۱۶۸۱ء) میں عالمگیر دکن کو روانہ ہوا اور اخیر عمر تک انہیں اطراف میں مرہٹوں سے لڑتا بھڑتا رہا۔
راجپوت بھی اس کی فوج میں راجپوت اسی طرح نظر آتے ہیں جس طرح مسلمان قومیں۔ چنانچہ تاریخوں میں جہاں فوجوں کا ذکر آتا ہے راجپوتوں
کا بھی خاص طور پر آتا ہے۔ رانا جے سنگھ بیٹا بھیم سنگھ صلح ہونے کے بعد اپنے باپ کے مرنے کے بعد عالمگیر کے پاس چلا گیا۔ بادشاہ نے اس کو
لاکھ روپیہ سالانہ کی جاگیر دی جس میں سے ایک پرگنہ بیدا میں ملا۔ تخت باقی رہ گیا۔ بھیم سنگھ دکن میں مرا تو اس کا منصب پنج ہزاری تھا جو دنا کرنا
نہ کے جانے کو دی۔ بھیم اور اس کے بیٹے راجہ جے سنگھ والیان ریاست اودے پور کے سوا کسی کو نہیں ملا۔ (تاریخ راجگان ہند)

اسٹینلی لین پول مشہور مورخ کا بیان ہے کہ اس ملک کے بعض بعض راجہ بیس بیس ہزار کا لشکر لے کر اورنگ زیب کی رفاقت میں لڑنے کو
نکلے تھے، اور ایسے راجاؤں کا شمار سو سے متجاوز تھا۔

دہلی میں عموماً قلعہ میں پچاس ہزار سوار رہتے تھے، علاوہ ازیں اتنی ہی تعداد پیدل جو بری وقتاً فوقتاً جاتی رہتی تھی۔ بیس ہزار پیادہ فوج جس میں
... ہزار توپ خانہ کا چارج سنبھالے۔ یہ تمام ادباقی شاہی محل کی رکھوالی اور سنتری وغیرہ کے فرائض انجام دیتی تھی۔ (منوچی حصہ سوم ص۱۱۱)

مہاراجہ جسونت سنگھ راٹھور والی جودھپور کو .... راؤ ستر سالہ کی بہن بیاہی تھی۔ جسونت سنگھ نے جب
اورنگ زیب سے بغاوت کرنا چاہی تو اس نے رانی کو بلا کر اس کے بھائی پر بہت دباؤ ڈالا کہ وہ بھی بادشاہ کے خلاف بغاوت میں اس کا ساتھ دے لیکن
راؤ سنگھ نے خاندانی تعلقات پر حق نمک کو مقدم سمجھا اور صاف انکار کر کے کہہ دیا کہ میں بادشاہ کا نمک حلال جاں نثار ہوں نمک حرامی کا داغ لے کر دنیا سے
نہ جانا چاہتا۔ (امرائے ہنود ص۱۱۱)

ڈاکٹر تارا چند صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"بعض لوگوں کے نزدیک اورنگ زیب کی مذہبی پالیسی اس کی ناکامیابی کا سبب ہوئی۔ بالعموم یہ خیال غلط ہے۔

ہندوؤں کی بغاوتیں ناکام رہیں اور ان کا کوئی مذہب یا سیاسی مقصد نہ تھا اورنگ زیب نے انہیں ہندوؤں ہی کی مدد سے فرو کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مرہٹوں کے خلاف جنگ مغلیہ سلطنت کے لئے ایک بڑا بوجھ ثابت ہوئی۔ لیکن ان کی بغاوت نہ ملکی تھی اور نہ مذہبی، بلکہ فقط ایک قبیلے کی بغاوت تھی۔ راجپوت ہندو بیلے اور سیواجی کے اپنے رشتہ دار اورنگ زیب کی خاطر سیواجی اور اس کے جانشینوں کے خلاف لڑے، اور پھر مرہٹوں نے ہندوؤں کے خلاف بھی حملے کئے اور ان کے لشکروں میں مسلمان بھی موجود تھے۔"

ڈاکٹر راجندر پرشاد لکھتے ہیں:—

"یہ ایک مشہور بات ہے کہ اورنگ زیب نے دکن میں بیجاپور اور گولکنڈہ کی مسلمان سلطنتوں کے فتح کرنے میں کئی سال صرف کئے اور اس نے یہیں وفات پائی۔ دہلی کے بادشاہوں کی طرف سے ان میں اکثر ہندوؤں اور جنگوں کی سپہ سالاری ہندو کیا کرتے تھے، جیسے کہ اکبر کے زمانے میں مان سنگھ اور جگن ناتھ داس اور اورنگ زیب کے عہد میں جسونت سنگھ۔"

(ہندوستان کا مستقبل)

غرض بے شمار راجپوتوں نے مرہٹوں کے مغلوب کرنے میں اورنگ زیب عالمگیر کا ساتھ دیا اور جانبازی دکھائی اور یہ الزام کہ راجپوتوں نے عالمگیر کی حمایت میں انگلی نہیں ہلائی، سراسر غلط ہے۔ مآثر الامراء کے صفحات ایسے بے شمار جانباز راجپوتوں کے ناموں اور حالات سے بھرے پڑے ہیں۔ بنگال کے مشہور مورخ اور سیاستداں سری۔ پی رائے نے ۱۹۳۱ء میں بنگال کے مسلم ایجوکیشن کے جلسہ میں اپنی صدارتی تقریر میں کہا تھا:—

"شہنشاہ اورنگ زیب پر آج کل بڑی نکتہ چینیاں ہوتی ہیں بطانوی مصنفوں نے ان تاریخوں میں جو ہندوستان کے کالجوں اور اسکولوں میں پڑھائی جاتی ہیں متعصب اور ہندوؤں سے نفرت کرنے والا دکھایا ہے یہ کس قدر شرم کی بات ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی مصلحت آمیز سیاسیات کے ماتحت اسی جھوٹ اور افتراپردازی کو سچ سمجھنے کے لئے مجبور کیا گیا۔

میں سر جادو ناتھ، ڈاکٹر سمبار پروفیسر تاریخ ڈھاکہ اور بہت سے دیگر اشخاص جنہیں تاریخ ہند میں ماہر مانا جاتا ہے، پوچھتا ہوں کہ کیا ایک مثال بھی دکھا سکتے ہیں کہ شہنشاہ اورنگ زیب نے بنگال کے ہندوؤں سے جزیہ وصول کیا؟

"شہنشاہ اورنگ زیب نے بنگال کی حکومت مرشد قلی خاں کو جو ایک برہمن نومسلم تھا اس غرض سے سپرد کی کہ وہ یہاں کی مالیات درست کرے، چنانچہ یہاں کے ہندو اور مسلمان افسروں کے تعاون باہمی کا نتیجہ تھا کہ اس کے زیر نگیں بنگال کے ساتھ نہایت منصفانہ برتاؤ کیا گیا۔ اورنگ زیب کے عہد میں بنگال کے ہندوؤں کو منصب دیئے گئے اور بڑی بڑی جاگیریں عطا کی گئیں اور وہ بڑے بڑے زمیندار بنا دیئے گئے۔

"اورنگ زیب نے ہندوؤں کو گورنر بنایا، وائسرائے بنایا، جنرل کمانڈر انچیف بھی بنایا یہاں تک کہ اس نے خالص اسلامی صوبہ افغانستان پر بھی جو نائب السلطنت مقرر کیا وہ ہندو راجپوت ہی تھا۔

"میرا یہی کہ آج کل تاریخوں میں ہندو مذہب کا ایک زبردست بیری بنا دیا گیا ہے، مگر ایسا کہنا قطعی سیاست ہے تاریخ نہیں۔ کوئی تاریخ داں اس من گھڑت افسانہ کو تسلیم نہیں کر سکتا سیواجی کے مقابلہ پر راجہ جے سنگھ تھے، جنہیں ایک ہندو سردار کی بغاوت کا قلع قمع کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ جہاں راجہ جے سنگھ نے شہنشاہ اورنگ زیب

سے اس کی بار بار شکایت کی تھی کہ اس مہم میں دکن کے مسلمان کمانڈر اور مسلمان سرداران (راجہ جے سنگھ) کی امداد نہیں کرتے :

کیا کوئی سلیم العقل ایک لمحہ کے لئے بھی تسلیم کر سکتا ہے کہ سیواجی کے ساتھ لڑائیاں مذہبی یا فرقہ وارانہ معرکہ آرائی تھی ؟ یہ محض سیاسی جنگ تھی اور منجملہ اور بغاوتوں کے ایک بغاوت تھی "

ڈاکٹر راجندر پرشاد تحریر فرماتے ہیں :—

"اگر اورنگ زیب نے اپنی فوج میں ہندو سپہ سالار رکھے تھے تو ادھر سیواجی نے بھی مسلمان سرداروں کے زیر حکم اپنی فوج دے رکھی تھی۔ ان میں بعض بہت ذمہ داری کے عہدوں پر مامور تھے۔ مثلاً سیدی ہلال اور نور خاں سیواجی کی بحری فوج میں بھی کم سے کم تین مسلمان ایڈمرل موجود تھے، سید تبل، سید مصری اور دولت خاں "

(ہندوستان کا مستقبل)

۲۰ مارچ سنہ ۱۹۶۵ء کو صوبہ بہار (بھارت) کے دارالسلطنت پٹنہ میں بہار اسٹیٹ اردو کنونشن منعقد ہوئی تھی۔ اس کی صدارت الہ آباد کے مشہور مصنف پنڈت سندر لال نے کی تھی۔ اس خطبہ میں ایک جگہ پنڈت جی تحریر فرماتے ہیں :—

"اورنگ زیب کے زمانے میں آم کی بڑھیا قلمیں لگائی گئیں قلم لگانے والے مالی نے اورنگ زیب سے درخواست کی کہ ان دونوں طرح کے آموں کے لئے نام تجویز کر دے۔ اورنگ زیب نے ذرا سوچ کر ایک قسم کے آم کا نام "رسنا ولاس" اور دوسری کا نام "سدھا رس" تجویز کیا۔ اورنگ زیب نے اپنی کچھ توپوں کے نام "اگنی بان"، "کڑک ممال"، "گنج مال" اور "دام جنگی" رکھ رکھے تھے۔"

اورنگ زیب عالمگیر کو ایک بار خبر ملی کہ کسی راجہ نے کوئی مسجد شہید کرا دی۔ اورنگ زیب نے راجہ کو اپنے یہاں بلایا۔ راجہ شہر کے باہر ہی تھا کہ شہنشاہ اپنی فوج کے ساتھ پہونچا اور راجہ کو اپنے ساتھ شکار کو چلنے کے لئے کہا۔ اورنگ زیب اور راجہ دونوں بہت دور نکل گئے اور بادشاہ کی فوج پیچھے رہ گئی۔ گرمی کا زمانہ تھا، دھوپ تیز تھی۔ دونوں بہت تھک گئے اور ایک درخت کے سایہ میں آرام کرنے کی غرض سے ٹھہر گئے۔ اورنگ زیب نے اپنے اچکن کی گھنڈی کو خوب کس کر باندھ رکھا تھا۔ گھنڈی کھلی نہیں تو اورنگ زیب نے راجہ کو اپنی تلوار دی کہ اس سے گھنڈی کاٹ دے۔ راجہ نے تلوار ہاتھ میں لے کر گھنڈی کاٹنے کے لئے ہاتھ بڑھایا اور اورنگ زیب کا رعب راجہ پر اس قدر طاری تھا کہ اس کا ہاتھ کانپنے لگا۔ اورنگ زیب نے راجہ کے ہاتھ سے ایکدم تلوار لے لیا اور کہا کہ جب تم میں اتنی بھی ہمت نہیں کہ میرے سامنے تلوار اٹھا سکو تو تم نے مسجد کو شہید کرنے کی کس طرح ہمت کی۔

اس درمیان میں فوج اور دوسرے لوگ پہونچ گئے اور جب وزراء کو واقعہ کی خبر ہوئی تو انہوں نے راجہ پر ملامت کی۔

اورنگ زیب نے کہا میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ میرا بخت یاور ہے یا نہیں۔ اگر بخت یاور ہے تو مجھے کوئی خطرہ نہیں تھا اور بخت یاور نہیں ہے تو یہی زندگی بے کار ہے۔

اورنگ زیب اگر واقعی ہندوؤں کا دشمن ہوتا تو راجہ کو نہایت آسانی سے قتل کر دیتا لیکن اس نے صرف تنبیہ کر کے چھوڑ دیا۔

یہ تھا اورنگ زیب کا سلوک ایک ہندو راجہ کے ساتھ جس نے مسجد شہید کر ڈالی تھی۔

(تاریخ اشاعت اسلام)

ناانصاف معترضین کا شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر پر کس قدر بے جا الزام ہے کہ وہ ہندوؤں اور ان کے مذہب اور کلچر کا دشمن تھا، اور انہیں انتظام سلطنت میں شریک نہیں کرتا تھا۔ اس عادل اور رعایا پرور بادشاہ نے غیر مسلموں کے ساتھ ہمیشہ رواداری برتی اور مسلمان اور ہندوؤں کے حقوق میں کسی طرح کا فرق روا نہیں رکھا۔ افسوس ایسا منصف اور پابند شرع شہنشاہ آج غلط فہمیوں کا شکار ہو رہا ہے —

اور اس پر طرح طرح کے جھوٹے الزامات عائد کئے جا رہے ہیں ۔

مندرجہ بالا واقعات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کا کردار کس قدر بلند تھا اور اس نے دوستوں ہی کے ساتھ نہیں بلکہ دشمنوں کے ساتھ بھی کیسا شریفانہ سلوک کیا۔ اس کے باوجود اگر اورنگ زیب کو مورد الزام قرار دیا جاتا ہے تو یہ کھلی ہوئی تاریخی بددیانتی نہیں تو اور کیا ہے ۔

مرہٹے سرزمین مہاراشٹر سے خروج کر کے صرف دکن تک پہنچنے میں جو سب کچھ کر دکھاتے ہیں جو دنیا میں ایک ظالم ترین قوم کر سکتی ہے لیکن اورنگ زیب عالمگیر جیسا انصاف پسند، رحم دل اور نیک بادشاہ آج متعصب اور تنگدل مصنفین کی بدولت بدنام ہے ۔ اور اس کی "ہندو دشمنی اور بت شکنی" کے افسانے ہر بچے کی زبان پر ہیں اور مسلمان عورتوں کی وہ آبرو ریزیاں جو مرہٹوں کے ہاتھوں سرزد ہوئیں اور جن کی یاد دکن کی تقریباً ہر بستی کی تاریخ کے ساتھ وابستہ ہے، کسی کو نہیں معلوم !

اورنگ زیب کوئی شک نہیں سخت دیندار مسلمان تھا مگر ساتھ ہی معاملات انسان دوست فرمانروا تھا، اُس کی حکومت میں عدل و انصاف کے تقاضوں کو ملحوظ رکھا جاتا تھا ۔ اور عدل و انصاف کی نگاہ میں ہندو مسلم میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا ۔

اعلان

"سیماب اور دبستانِ سیماب پر تحقیق"

میں پونہ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لئے علامہ سیماب اکبر آبادی مرحوم پر "سیماب اور دبستانِ سیماب" کے عنوان سے کام کر رہا ہوں اساتذہ متاخرین میں علامہ مرحوم کے تلامذہ کی فہرست بہت طول طویل ہے جن میں عصر حاضر کے بہت سے مشہور ادیب اور شاعر بھی شامل ہیں میرا موضوع چونکہ بہت وسیع اور اہم ہے، اس لئے بغیر دوستوں اور خصوصاً علامہ سیماب کے تلامذہ کی مدد کے یہ کام پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔ بنا بریں ہندوستان اور پاکستان کے تمام تلامذہ سیماب اور ارباب ذوق دوستوں سے تعاون کی درخواست ہے ۔ (۱) ہندوستان اور پاکستان کے موجودہ تلامذہ سیماب اپنے مختصر حالات زندگی (مع تاریخ تلمذ) غزلوں کے بہترین منتخب اشعار، دو بہترین نظمیں اپنی تصانیف و تالیفات کی فہرست اور اپنے ادبی مقام سے متعلق حالات اور دوسروں کی آراء سے مطلع فرمائیں ۔

(۲) اپنی ایک غزل پر استاد کی اصلاح کی نقل (اپنی اصل غزل کے ہمراہ)

(۳) مرحوم تلامذہ سیماب کے متعلق جن حضرات کو علم ہو وہ ان کا تذکرہ اور کلام عنایت فرمائیں ۔

(۴) اپنی تازہ ترین تصویر بھی بھیجیں علاوہ ازیں مولانا سے متعلق ہر قسم کا مواد اور معلومات میرے لئے ممد و معاون ثابت ہو سکتی ہے ۔ قارئین اور ادب نواز حضرات سے استعانت کی بے حد امید ہے ۔

پروفیسر افتخار احمد فخر ڈھولیوی ایم اے
(شعبۂ اردو و فارسی) ایم جے کالج جلگاؤں مشرقی خاندیس
(مہاراشٹر)
Bharat

ڈاکٹر انعام الحق

طنز و مزاح

تضمین
بر غزلِ ماہر القادری

(۱)
ہائے رے ارتقا، کیا سے کیا بن گیا
ایک ٹھوکر پڑی، ٹھیکرا بن گیا
پھر کسی کی چلم کا توا بن گیا
حسن اور عشق میں واسطا بن گیا
ٹوٹ کر دل بڑے کام کا بن گیا

(۲)
خود ستا، خودنگر، خودنما بن گیا
ماہوش، مہ جبیں، مہ لقا بن گیا
دل نشیں، دل ستاں، دلربا بن گیا
خوش نفس، خوش نظر، خوش ادا بن گیا
کیا خبر عشق میں کون کیا بن گیا

(۳)
یوں ہی کھاتا ہوا آم گزرا تھا میں
جھومتا صورتِ جام گزرا تھا میں
چھوڑ کر شاہرۂ عام گزرا تھا میں
اُن کے کوچے سے اک شام گزرا تھا میں
پھر یہی روز کا مشغلا بن گیا

(۴)
آگے بڑھتے ہوئے، سجدہ کرتے رہے
سجدہ کرتے ہوئے گھاس چرتے رہے
گھاس چرتے ہوئے گل کترتے رہے
لوگ چلتے رہے، نقش اُبھرتے رہے
بس اسی طرح اک راستا بن گیا

(۵)
یہ نیا سانحہ، تازہ اُفتاد ہے
وصل کی شب کا ہر لمحہ برباد ہے
دل پہ خوفِ سحر کی جو بیداد ہے
اے مرے مہرباں دوست فریاد ہے
قرب تو اور بھی فاصلا بن گیا

(۶)
میں نے دیکھی ہے دنیائے دیر و حرم
اس طرف اُلجھنیں، اُس طرف پیچ و خم
پھر بھی اتنا تو ہر اک گیا کم سے کم
میں تو گمراہ تھا، میرا نقشِ قدم
دوسروں کے لئے رہنما بن گیا

(۷)
نیچی نیچی، جھکتی ہوئی مختصر
یعنی، عندیہ تغافل سے بوجھل نظر
تازیانہ سا ہے توسنِ شوق پر
حسن والوں کے لطف و کرم دیکھ کر
سوچتا ہوں میں کیوں پارسا بن گیا

(۸)
اس تعلق کے پردے میں اک راز ہے
جس پہ حیراں حریفِ نظر باز ہے
یہ تعلق محبت کا اعجاز ہے
اس تعلق پہ ماہر کو ناز ہے
اُن کا انکار بھی آسرا بن گیا

روحِ انتخاب

قبرص کے آشفتہ بخت مسلمان

قبرص کی سرزمین قبرصی مسلمانوں کے واسطے اپنے اندر آئے دن نئی سے نئی مصیبت کا سامان لئے ہوئے ہے۔ صدر میکاریوس کی شکل میں ایک ظالم و سفاک دشمن انہیں صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کرنے پر تلا بیٹھا ہے۔ ملک کے اندر لاقانونیت، تشدد اور خونریزی روزمرہ کی بات بن چکی ہے۔ یونان کی حکومت اس پادری صدر کی پشت پناہی کر رہی ہے (اگرچہ یونان خود اس وقت خانہ جنگی کے دہانے پر کھڑا ہے) اور جزیرے کی اقلیت پر مظالم کے پہاڑ توڑے جا رہے ہیں۔ گذشتہ معاہدات کو گلدستۂ طاق نسیاں بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ آئین میں من مانی تبدیلیاں کی جاتی ہیں خواہ مسلمان اقلیت کتنا ہی احتجاج کرے اس کی شنوائی نہیں ہوتی۔

حال ہی میں صدر نے ایک نئی طرز ستم ایجاد کی ہے اس نے ایک حکم کے ذریعے ان مسلمان طلبا کو جو غیر ممالک میں تعلیم پا رہے ہیں موسم گرما کی تعطیلات میں قبرص آکر اپنے والدین کے پاس چھٹیاں گزارنے پر پابندی لگا دی ہے۔ چنگیز خانی حکم، آئین، قانون، اخلاق، انسانیت غرضیکہ کسی بنیاد پر بھی پورا نہیں اترتا۔ ملک کا آئین کسی باشندے پر یہ پابندی عائد نہیں کرتا کہ اسے نہ صرف ملک سے باہر نکال دیا جائے یا باہر سے اس کی آمد روک دی جائے لیکن میکاریوس کو تو قبرصی ترکوں کے ستانے میں مزا آتا ہے اور وہ ہر ممکن طریقے سے انہیں تنگ کرنا چاہتا ہے۔

اس حکم کا نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ وہ طلبا جن جن ممالک میں زیر تعلیم ہیں وہاں انہیں ہاسٹل اور طعام کا خاص انتظام کرنا پڑے گا تعطیلات میں یونیورسٹیاں اور کالجوں کے ہوسٹل تو بند ہو جاتے ہیں۔ جو طلبا گھروں کو واپس نہ جانا چاہیں انہیں کھانے اور رہنے کا پرائیویٹ بندوبست کرنا ہوگا جو خاصا مہنگا ہوگا۔ ادھر ان کے والدین جو اپنے بچوں کی صورتیں دیکھنے کی توقع لگائے بیٹھے تھے ان کی ملاقات سے محروم رہ جائیں گے۔

اس ظالمانہ حکم کی وجہ میکاریوس نے یہ بتائی ہے کہ ترک طلبا ترکی میں فوجی تربیت حاصل کرتے ہیں۔ وہ قبرص آکر بغاوت پھیلائیں گے۔ حیرت ہے کہ یہ بات اس شخص کی زبان سے نکل رہی ہے جس کے ہم قوم دہشت پسند تنظیمیں بنا کر ملک میں دندناتے پھر رہے ہیں ان مسلح یونانیوں سے تو ملک کو کوئی خطرہ نہیں لیکن چند بے ہتھیار طلبا سے خدشہ ہے کہ وہ بغاوت پھیلائیں گے۔ درحقیقت میکاریوس کی فوج کے یہ بہانے ہیں اور بس۔

دنیا اس کی اس قسم کی کارروائیوں پر حیران ہوتی ہے۔ یو۔ این۔ او کے نمائندوں نے جب قبرص کے وزیر داخلہ کو توجہ دلائی کہ عالمی رائے عامہ ان کی ایسی کارروائیوں کو پسند نہیں کرتی تو اس نے کمال بے اعتنائی سے جواب دیا کہ ہماری حکومت اس حکم کو منسوخ کروانے کے لئے کافی مضبوط ہے۔

میکاریوس حکومت کا ایک اور کارنامہ یہ ہے کہ اس نے یونانی ممبران اسمبلی کی اکثریت کے بل پر ایک فیصلہ کیا ہے جس کی رو سے صدر میکاریوس کا عہدہ اور ایوان نمائندگان میں یونانی ممبروں کی رکنیت کی میعاد ایک سال تک بڑھا دی گئی ہے۔

اسمبلی کے اس اجلاس کا ترک ممبران نے بائیکاٹ کیا تھا۔ انہوں نے اپنی علیحدہ اسمبلی بلائی اور اس میں انہوں نے ملک کے اندر ایک متوازی حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا جو ان علاقوں کا نظم و نسق چلائے گی جہاں ترک آباد ہیں۔ ترکوں کی اس اسمبلی نے جو میکاریوس کی حکومت کے بعد ملک کا سب سے بڑا با اقتدار ادارہ ہوگی، دو قرار دادیں جاری کی ہیں ایک کے ذریعے قبرص کے انتخابات کے قواعد بیان کئے گئے ہیں اور دوسرے کے ذریعے ایوان نمائندگان میں ترک قبرصی ارکان کی رکنیت اور نائب صدر ڈاکٹر فاضل کوچک کے عہدے کی میعاد بڑھا دی گئی ہے۔

قبرصی ترکوں کی جانب سے یہ اعلان بڑا جراءت مندانہ ہے اور اس سے ان کی بہت سی مشکلات آسان ہو جائیں گی (بقیہ صفحہ ۳۲ پر)

والکن ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ
منگھا پیر روڈ
کراچی
ہر قسم کا
سوتی اور
اونی کپڑا
کورا اور دھلا ہوا اور
ہر قسم کا
دھاگہ
تیار ہوتا ہے
باوانی والکن ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ کا تیار شدہ کپڑا
ہر اعتبار سے قابل اعتماد ہے پاکستان کی صنعت کی قدر اور حوصلہ افزائی
آپ کا قومی فریضہ ھے

آدم جی کاٹن ملز لانڈھی - کراچی

ماہنامہ

فاران

کراچی

اکتوبر ۱۹۶۶ء

جلد :- ۱۸

شمارہ :- ۷

ایڈیٹر ——— ماہر القادری

ترتیب

عنوان	مصنف	صفحہ
نقشِ اوّل	ماہر القادری	۳
جھوٹی نبوت کا جھوٹا علم کلام	ماہر القادری	۱۵
حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ	محمد اکرم طاہر	۲۹
مسلمانوں کا علمی فضل	محمد حفیظ اللہ پھلواری	۳۳
ایک "قادیانی" کا قبولِ اسلام	....	۳۸
یادِ رفتگاں	ماہر القادری	۳۹
غزلیں	مختلف شعراء	۴۵
ہماری نظر میں	....	۴۷

چندہ سالانہ سات روپے | پبلشر :- مسرور حسین | قیمت فی پرچہ ۶۲ پیسے

مقامِ اشاعت

دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱

مسرور حسین پبلشر نے انٹرنیشنل پریس کراچی میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

نیرو، ہلاکو، ابن ہبیرہ، چنگیز اور حجاج ابن یوسف انسانی تاریخ کی انتہائی بدنام اور مشہور (NOTORIOUS) شخصیتیں ہیں، مگر جب ان ناصر کے ظلم و ستم اور شقاوت و درندگی کے مقابلہ میں ان ظالموں کے ظلم و ستم کے کارنامے گرد ہو کر رہ گئے ہیں! دُنیائے عرب کی سب سے زیادہ مخلص اور منظم دینی تنظیم ــــــ اخوان المسلمون ــــــ کو تباہ کرنے اور دنیا کے پردے سے اُس کا نام و نشان مٹانے کے لئے اس ظالم نے جو تیاستیں توڑی ہیں، جو ظلم ڈھائے ہیں اور "اخوان" کی تعذیب کے جو طریقے اختیار کئے ہیں، اُن کے بارے میں دنیائے اسلام کی عظیم شخصیت ــــــ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ــــــ کے تاثرات بلکہ مستند شہادت کی ایک جھلک ملاحظہ فرمائیے :-

"اور یہ تعذیب کے وہ طریقے ہیں، جن کو سنگدل سے سنگدل انسان بھی آسانی سے سُننے کی تاب لا نہیں سکتا"

(ندائے ملت، لکھنؤ ۲ ستمبر ۱۹۶۶ء)

مصر کے جیل خانوں میں بے گناہ، مظلوم اور سیدھے سچے "اخوان" کو اعترافِ جرم کرانے کے سلسلہ میں جو اذیتیں دی گئی ہیں، اور جیسی عجیب و غریب تعذیبوں کا اُنہیں نشانہ بنایا گیا ہے، جب وہ پوری تفصیل کے ساتھ کتابوں میں آجائیں گی تو آئندہ نسلیں حیرت کریں گی اور افسوس و ماتم بھی ــــــ کہ اس متمدن اور جمہوریت پسند دنیا میں ایک ایسا فرمانروا بھی گزرا ہے جس کی درندگی اور خونخواری کو دیکھ کر بھیڑیے بھی دانتوں میں اُنگلی دبانے لگیں اور ظلم و شقاوت اور بہیمیت و درندگی کے تمام اگلے پچھلے ریکارڈ جس نے توڑ دئے ہوں اور جس کی شخصیت تمام ظالموں میں سب سے زیادہ ممتاز بلکہ منفرد ہو!

ہمیں ایک دن خدا کو منہ دکھانا ہے اور زبان و قلم سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ کا جواب دینا ہے، ہم نے اوپر جو کچھ لکھا ہے اُس میں ذرہ برابر مبالغہ نہیں کیا، جمال ناصر کے مظالم پر ملامت کرنے کے لئے افسوس ہے کہ لغت میں ایسے الفاظ نہیں ملتے، جن سے واقعی طور پر احساس کی شدت کا ٹھیک ٹھیک طور پر اظہار ہو سکے! ظالم، شقی، درندہ، ستمگر، جفاکار ...... اس قسم کے تمام الفاظ جمال ناصر کی ظالمانہ شخصیت کے مقابلہ میں نرم، ہلکے اور بے وزن سے نظر آتے ہیں، تھوڑی دیر کے لئے سینہ پر پتھر رکھ کر اور اگر ممکن ہو سکے تو سنگدل بن کر اس "تعذیب" کی چند جھلکیاں دیکھنے کی کوشش کیجئے!

سوڈان، مراکش اور جدہ کے اخبارات میں یہ تفصیلات شائع ہو چکی ہیں، یہ سُنی سنائی باتیں نہیں، آپ بیتی اور عینی شہادتیں ہیں ــــ

- ــــ تین اخوان کا ایک گروپ لایا گیا، انہیں تین حصوں میں تقسیم کر دیا گیا، ہر ایک کی ٹانگ دوسرے کے بازو سے باندھ دی گئی اور زمین پر چت لٹا دیا گیا، اس کے بعد دس کرین (جو ثقیل) منگائے گئے پہلے شخص کے دونوں بازو نمبرا کرین کے ساتھ جکڑ دئے گئے تیسرے شخص کی دونوں پنڈلیوں کو نمبر ۲ کرین کے ساتھ باندھ دیا

گیا ، اس طرح دس کرینوں نے ۳۰ افراد کو فضا میں معلق کردیا ، یہ کرین پانچ قطاروں میں تھے ، اس کے بعد دوسرے نظربندوں کو لاکر کرینوں سے کچھ فاصلے پر کھڑا کردیا گیا اور ام کلثوم کے گانوں کے ریکارڈ لگا دئے گئے ، جن میں یہ گانا خاص طور پر دُہرایا گیا ۔

"یا جمال ! یا مثال الوطنیہ"

اخوان کو حکم دیا گیا ، وہ بھی اس گانے کو دہرائیں ، ایک گھنٹہ تک یہ گانا دہرایا جاتا رہا ۔ اس کے بعد دو دفعہ جیل لیسیونی اور اس کے اسسٹنٹ حسین عرفہ اور دوسرے فوجی افسر آئے ۔ آن کے آگے حسن الہضیبی اور سید قطب کو اسٹریچر پر ڈال کر لایا گیا یہ دونوں نیم مردہ حالت میں تھے اور چل نہیں سکتے تھے ، کرینوں پر لٹکے ہوئے اخوان سے پوچھا ۔۔۔ "کیا تجھے اپنا بیان یاد ہے" اس نے جواب دیا ہاں ، پھر پوچھ جو باتیں تجھے لکھ کر دی گئی ہیں وہ اچھی طرح یاد ہیں ، ساتھی نے کہا ۔ ہاں خوب یاد ہے ' ہر شخص سے یہی سوالات کئے گئے ، پھر پوچھ گیا ، "کیا تم عدالت میں ان بیانات کو بدل دوگے" ؟ ساتھیوں نے جواب دیا "نہیں" سوال ہوا "جیل میں تمہارے ساتھ کیسا برتاؤ کیا گیا ہے" جواب ملا "بڑا شریفانہ اور مشفقانہ برتاؤ ہوا ہے" فوجی افسر نے حسن الہضیبی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا ، یہ کون ہے ! ساتھی نے کہا ، جناب مرشد ہیں (اخوان اپنی تنظیم کے صدر کو مرشد کہتے ہیں) فوجی افسر نے کہا "مرشد کفر" کہو ، ساتھی نے کہا "مرشد کفر" سید قطب کی طرف اشارہ کرکے فرمایا گیا "یہ کون ہے" رفیق نے جواب دیا "سید قطب" حکم دیا گیا ، اسے مخاطب کرکے یوں کہو "تو بڑا ظالم اور احمق ہے" ساتھی نے ان الفاظ کو دہرادیا ، یہ سوال جواب کرینوں سے بندھے ہوتے ، ہوا میں معلق ہر ساتھی سے کئے گئے ، ایسا بھی ہوا ایک ساتھی نے جواب نہ دیا اور خاموشی اختیار کرلی ، مگر فوجی افسر نے جلتا سگریٹ اس کے نازک اعضاء پر لگایا اور وہ بے اختیار پکار اُٹھا "یہ مرشد کفر ہے اور وہ ظالم و نادان ہے"

"اس کارروائی کے بعد داروغہ جیل حمزہ لیسیونی نے تقریر شروع کی اور کہا ہم پہلے سبق دیتے ہیں اور جو شخص سبق یاد نہ کرے یا یاد کرکے اس کو بھلا دے اس کو کرینوں سے چیر ڈالا جائے گا اور ہم اس کے ذمہ دار نہیں ہوں گے ، یہ کرین کھڑے ہیں ' جو چوں وچرا کرے گا ، اس کو دونوں کرینوں کے ساتھ باندھ دیں گے اور مخالف سمتوں میں حرکت دیں گے ، اس طرح اس کی ٹانگیں الگ الگ کردیں گے ، ہم تمہیں مرنے نہیں دیں گے ، ہم جانتے ہیں کہ تمہیں مرنے کی بڑی تمنا ہے لیکن ہم اس آرزو کو پورا نہیں کریں گے ۔ (۱۴ دسمبر ۱۹۶۵ء کے واقعات)

● ۔۔۔ "اس جیل میں پانچ خواتین دماغی حادثہ کا شکار ہوگئیں ۔ تقریباً ایک ہفتہ سے وہ حواس باختہ ہیں ۔ ایک فوجی افسر آیا اور ان خواتین سے کہنے لگا ۔۔۔ کیا تمہارا دماغی حالت خراب ہوگئی ہے میں اسے باور نہیں کرتا ، ابھی تمہاری دماغی خرابی دور کئے دیتا ہوں ، یہ کہہ کر وہ ان بے چاریوں کو شدید اذیت دینے لگا اور انہیں اس تشدد کرب کی کہ وہ آج تک حواس باختہ ہیں (واقعہ یکم رمضان مطابق ۲۳ دسمبر ۱۹۶۵ء)

● ۔۔۔ "ایک خاتون جو بڑی صاحب علم وفضل ہیں اور تبلیغ کے میدان میں بڑی سرگرم رہی ہیں ، ان کے بھائی کو اس جیل میں لایا گیا ہے اور دو روز تک مسلسل انہیں اذیت دی گئی ہے اور انہیں مجبور کیا گیا ہے کہ وہ یہ تحریر لکھ دیں کہ ان کی بہن جو اس وقت نظربند ہے ، بدکار عورت ہے اور پیشہ کرتی ہے مگر وہ یہ تحریر لکھنے سے انکار کر رہے ہیں ان کی حالت ابتر ہو

چکی ہے، ان کی بہن رضا اُسے سمجھانے کے لئے کئی مرتبہ ان سے درخواست کر چکی ہے کہ آپ یہ تحریر لکھ دیں اور عذاب سے اپنی جان چھڑا لیں، مگر وہ نہیں مانتے اور بہن سے کہتے ہیں کہ تم میرے لئے بہترین نمونہ بنی ہوئیں ان شاء اللہ تمہارے لئے نمونہ بنوں گا۔"

● — "فوجی قید خانے میں نظر بند خواتین کی تعداد ۳۰۰ تک پہنچ گئی ہے۔ احاطہ نمبر ۵ میں مختلف اوقات میں ان کی چیخیں سنائی دیتی رہتی ہیں۔"

● — "شوقی عبدالعظیم کو ٹھڑی ۵ کی چھت میں یکم رمضان سے سر کے بل معلق لٹکائے جا رہے ہیں، بالکل برہنہ جسم ہیں، چھت پر ایک ٹونٹی لگی ہوئی ہے جس سے پیٹرول کے قطرے ٹپکتے ہیں اور شوقی کے سر پر گرتے ہیں اس سے ان کا سانس گھٹتا رہتا ہے، یہ عمل روزانہ ۵ گھنٹے جاری رہتا ہے، داسعد جبل باسباسا آکر ان سے پوچھتا ہے، "کیا تم ابھی تک پکے مومن ہو،" شوقی جواب میں کہتا ہے "یا اللہ، اگر تو مجھ سے ناراض نہیں تو پھر ان مصائب کی مجھے پروا نہیں" یہ سن کر دارو جیں نکلیں آکر ان کے جسم میں سگریٹ بجھاتا ہے، اور انہیں کوڑے مارتا ہے، ایک رفیق نے موقع پر شوقی سے کہا "کم از کم خاموش ہی رہا کریں" مگر شوقی نے جواب دیا "لا حول ولا قوۃ الا باللہ"

● — "۵ دسمبر ۱۹۶۵ء کو حسب معمول تعذیب کے لئے پیشی ہوئی، جیسے جیل کی اصطلاح میں "BRAIN WASHING" کہتے ہیں، آج تین تعلیم یافتہ خواتین کو بھی لایا گیا، ہر خاتون ایک چوبی ٹکٹکی سے کسی ہوئی تھی، تینوں خواتین نیم عریاں حالت میں تھیں اور لہو لہو ہیں جسم لت پت تھا، صف میں سے ایک جوان اخوانی انجینئر محمود عزت اپنی قمیص اتار کر تیزی سے آگے بڑھے اور خاتون کی ستر پوشی کرنا چاہی، مگر یکایک ایک فائر ہوا اور محمود عزت زمین پر ڈھیر ہو گئے"

● — "نظر بندوں کو ننگا کرنا، انہیں لوہے کی زنجیروں سے باندھ کر ان پر کتے چھوڑنا، جلتی ہوئی آگ میں انہیں پھینکنا، بھائیوں کے سامنے بہنوں کو برہنہ کر دینا، مسلسل بھوکا رکھنا، بجلی کے جھٹکے دینا، نیند سے محروم رکھنا"

یہ اذیت کے عام طریقے ہیں، جو نظر بندوں پر استعمال کئے گئے ہیں۔" (عرب کے مختلف اخبارات سے ماخوذ ترجمہ ــــ سید خلیل حامدی)

کیا آج تک کسی حکومت نے اُن مجرموں اور سازشیوں کے ساتھ جو واقعی قتل و غارت گری کے مجرم ہوں، اس قسم کا بہیمانہ سلوک کیا ہے!

"تعذیب" کے یہ الم ناک طریقے دنیا کے کسی بڑے سے بڑے ظالم کو بھی نہیں سوجھے! پھر عدالتوں میں جو کارروائیاں ہوتی ہیں، وہ عدل و انصاف کے ساتھ کھلا ہوا مذاق ہے، ملک کی عام عدالتوں کے مجسٹریٹ اور جج جمال ناصر کی پالیسی اور مرضی کے مطابق چن چن کر رکھے گئے، مگر اخوان کے معاملے میں بسا اوقات ان پر بھی اعتماد نہیں کیا جاتا، فوجی افسران پر مشتمل ٹریبونل بنائے جاتے ہیں ان فوجی عدالتوں میں نام نہاد ملزمین کو صفائی اور داد رسی کی معروف سہولتیں بھی نہیں دی جاتیں، بند کمرے میں مقدمات کی سماعتیں ہوتی ہیں، جن میں نہ عوام جا سکتے ہیں اور نہ اخبارات کے نمائندے؛ سوڈان کے وکلاء نے ملزمین کی وکالت کرنے کی اجازت چاہی تو انہیں اس کی اجازت نہیں دی گئی! اس عدالتی ڈرامہ کے بعد پھر تختہ دار ہے، پھانسیاں ہیں، کوڑے اور زنجیریں اور طرح طرح کی تعذیبیں ہیں۔

"اخوان المسلمون" عرب دنیا کی سب سے زیادہ مخلص، دیندار اور فعال جماعت ہے! مصر میں جب فوجی انقلاب آیا ہے اور شاہ فاروق کو ملک سے جلا وطن ہونا پڑا ہے تو بڑی حد تک مصر کی زمام قیادت "اخوان المسلمون" کے ہاتھوں میں تھی، خود جمال ناصر مصر میں اخوان کے اثر و نفوذ کو محسوس کرتا تھا، اور "اخوان" کے صف ــــ مرشد عام ــــ سے نیاز مندانہ انداز میں ملتا جلتا تھا، مگر وہ درپردہ "اخوان" کو بے اثر کر دینے کی فکر میں تھا۔ اُسے اچھی طرح اندازہ تھا کہ اس کی آمریت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی جماعت ہے! چنانچہ ۱۹۵۴ء میں "سازش قتل" کی آڑ میں...

اخوان المسلمون کو ظلم وستم کا نشانہ بنایا گیا، یہاں تک کہ اس تنظیم کے دفتر کی عمارت کو ٹینکوں سے تباہ کر دیا گیا، ہزاروں اخوان گرفتار کر لیے گئے، اور اخوان کے چھ اکابر بینِ پھانسی پر لٹکا دیے گئے۔ ان میں علامہ عبدالقادر عودہ بھی شامل تھے، علم وفضل اور ذاتی سیرت وکردار کے اعتبار سے عبدالقادر عودہ کی شخصیت اس دور میں مثالی شخصیت تھی، یہ عظیم کردار اپنی ذات سے جامعیت کے لحاظ سے فردِ واحد نہیں بلکہ ایک "اُمت" تھا۔ اتنے اونچے درجے کے مفکر اور صاحبِ عزیمت تقویٰ شعار اشخاص، صدیوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں، عبدالقادر عودہ شہید نے مصر کی عدالت کو کس عزیمت اور مومنانہ تدبر وفراست کے ساتھ خطاب کیا :-

"کیا ــــ ایک جج کے لیے ممکن ہے کہ وہ ایسی دنیا میں بے تعلق ہو کر رہ سکے، جہاں قانون ختم کر دیا گیا ہو اور جس کی لاٹھی، اس کی بھینس کا اصول کارفرما ہو، جہاں قانون لوٹ کھسوٹ اور مظالم کے جواز کا آلہ کار بن کر رہ گیا ہو اور جہاں حکومت کے مناصب اور ہر طرح کے فوائد سے صرف وہ لوگ متمتع ہو سکتے ہوں جو حکمرانوں کی ہاں میں ہاں ملانے والے ہوں اور جہاں نفاق کامیابی کا واحد ذریعہ خیال کیا جاتا ہو اور اباحیت وبداخلاقی کو جاہ ومنزلت کی اولین شرط سمجھا جاتا ہو۔"

"کیا ــــ ایک جج اس بات کو ٹھنڈے دل سے برداشت کر سکتا ہے کہ اس کے وطن میں عہدِ جاہلیت کے سے حالات کا دور دورہ ہو، زبردست اپنا خون پسینہ ایک کر کے کمائیں اور زبردست اسے چین اور مزے سے بیٹھ کر کھائیں کمزور کو اپنے جسم اور روح کا رابطہ قائم رکھنے کے لیے دو سوکھے نوالے اور میلا چیتھڑا بھی میسر نہ ہو اور طاقت ور سونے اور چاندی سے کھیل رہا ہو ــــ اور اگر کمزور شکایت کرے، تو قانون اس کے خلاف حرکت میں آ جائے۔"

"پھر ــــ کیا ایک جج اس بات کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت کر سکتا ہے کہ ایک ملک کے دستور میں تو یہ دفعہ درج ہو، کہ ریاست کا دین اسلام ہے، لیکن اس کی حکومت اور حکمران اسلام کی کھلم کھلا خلاف ورزیاں کریں اور خادمانِ اسلام کے خون کے پیاسے بن جائیں، تعاون علی البر والتقویٰ کی خواہش رکھنے والوں کو نشانہ ستم بنالیں اور "تعاون علی الاثم والعدوان" کے مرتکبین کی سرپرستی کریں۔"

"تب کیا ایک جج ایسے حالات میں ناظرِ خاموش رہ سکتا ہے، جب کہ پورا ملک اخلاقی فضائل ومحاسن سے عاری ہوتا جا رہا ہو، دیانت اور حسنِ اخلاق کا نام ونشان مٹ رہا ہو اور لوگ موجودہ لیڈروں کو اپنے لئے اسوہ اور نمونہ قرار دینے لگے ہوں ......"

ــــ اور پھر ــــ

چشمِ فلک نے یہ منظر بھی دیکھ لیا کہ یہ مردِ مجاہد والہانہ انداز میں رقص کرتا ہوا، تختہ دار کی طرف روانہ ہوا اور اس طرح اس نے اللہ کی راہ میں شہادت پاکر، حضرت خبیب انصاری رضی اللہ عنہ کے واقعہ شہادت کی یاد تازہ کر دی۔

اس کے بعد سے اب تک "اخوان" ظلم وستم کے شکنجوں میں کسے جا رہے ہیں۔ کون سا ظلم وستم ہے جس سے اُن کو دو چار ہونا نہیں پڑا، مصر کے بے آب وگیاہ ریگستانوں کی ہولناک اذیتوں سے لے کر شہری قید خانوں اور پھانسی کے تختوں تک، ہر روزناک مرحلے سے اُنہیں گزرنا پڑا ہے ہزاروں "اخوان" ان اذیتوں اور تعذیبوں کی تاب نہ لاکر جاں بحق ہو گئے، جو زندہ رہے ان پر معاش اور روزی کی راہیں بند کی گئیں حکومت کے دفاتر میں اُن کی ملازمت ممنوع، تجارت وصناعت کے کاروبار میں اُن کے لئے قدم قدم پر رکاوٹیں، مشکلیں اور پریشانیاں! ذہنی منصوبہ یہ کہ پیٹ کی مار بڑی ہوتی ہے، فقر وفاقہ میں مبتلا ہو کر یہ لوگ اپنے مسلک کو خیرباد کہہ کر جمال ناصر کی آمریت کا کلمہ پڑھنے لگیں گے، مگر

"اخوان" کو سزائیں ملیں، اُن کے سرپر تیامتیں ٹوٹ گئیں، مگر اُن کی استقامت میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا، ان خدا شناسوں اور حق پرستوں کا یہی نصب العین رہا کہ :-

اللہ غایتنا	اللہ ہمارا مقصود ہے
والرسول زعیمنا	رسول اللہ ہمارے قائد ہیں
	اور
والقرآن دستورنا	قرآن ہمارا دستور ہے

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے وہ آج تک اسی مسلکِ حق اور جادۂ عزیمت و استقامت پر گامزن ہیں۔

حد ہوگئی سنگدلی اور بے رحمی کی کہ مصر کے وہ لوگ جنہوں نے "اخوان" کی تنگ حالی اور معاشی مشکلات سے متاثر ہو کر اُن کی مدد کی، وہ بے چارے تک حکومت کے احتساب سے نہ بچ سکے! "اخوان" کے ہمدردوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ستایا اور پریشان کیا گیا۔

دسمبر ۱۹۶۵ء تک جو اطلاعات ملی ہیں اُن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ چالیس ہزار سے زیادہ "اخوان" گرفتار کئے گئے ہیں، جو طرح طرح کی صعوبتوں میں مبتلا ہیں ان میں مرد ہی نہیں عورتیں بھی ہیں، دنیا میں شاید ہی کسی تنظیم اور جماعت کی اتنی عورتیں گرفتار کی گئی ہوں، متحدہ ہندوستان میں انگریزی استبداد کی مثال ہمارے سامنے ہے، آزادی کے لئے جدوجہد کرنے والوں میں، جن کو قید و بند میں رکھا گیا، وہ سب کے سب مرد تھے، عورتوں سے کسی قسم کی پوچھ گچھ تک نہیں کی گئی، ہزاروں اور لاکھوں گرفتار ہونے والوں میں بس دو چار عورتیں نظر آئیں، جن کا تناسب بیس ہزار میں ایک سے ہوتا ہے! مگر جمال ناصر کے دورِ آمریت میں عورتوں پر بھی مظالم ڈھائے گئے، سید قطب کی بہن امینہ قطب تعذیب کی شدت سے شہادت پا چکیں، سید قطب شہید کے بڑے بھائی محمد قطب بھی تعذیب کی سختیوں کی تاب نہ لا کر اللہ کو پیارے ہوگئے!

حسن اسمٰعیل الہضیبی جو اخوان کے صدر و مرشدِ عام ہیں، اُن کو ۱۹۵۴ء میں گرفتار کیا گیا اور انہیں موت کی سزا سنائی گئی پھر اس سزا کو عمر قید میں تبدیل کر دیا گیا، قید خانہ میں اُن پر ایسی بے رحمانہ سختیاں کی گئیں کہ ۷۰ برس کے اس بوڑھے دینی قائد کی صحت بالکل جواب دے گئی، حکومت نے اُن کو مرتا دیکھ کر، رہا کر دیا وہ برسوں سے اپنے گھر میں نظر بندی کے دن گزار رہے تھے، اب انہیں دوبارہ پکڑ کر قید خانہ میں ڈال دیا گیا، اور تین سال قید با مشقت کی سزا دی گئی!

"اخوان" کے بعض اکابر کی بیویاں اور بہنیں قید خانوں میں مصائب و آلام کا شکار ہیں۔ ان کا جرم اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ یہ نیک بیبیاں اللہ تعالیٰ کے دین اور کلمہ کا غلبہ چاہتی ہیں اور اس بے حیائی کے دور میں ان کی زندگیاں عصمت و عفت کا قابل قدر نمونہ ہیں فالہم کثر ہشاہن!

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ جو عربی زبان و ادب میں درجہ اجتہاد رکھتے ہیں اور عرب ممالک میں جن کی عربی انشا پردازی کی دھوم مچی ہوئی ہے انہوں نے اعتراف کیا ہے کہ :-

> یہ سید قطب نہ صرف مصر کے، نہ صرف عالم عربی کے بلکہ دنیائے اسلام کے اُن چیدہ و برگزیدہ، اہلِ فکر، اہل قلم اور صاحب طرز انشا پردازوں کی صف اول میں ہیں، جو طویل عرصہ کے بعد پیدا ہوا کرتے ہیں، اُن کا دین کی دعوت اور اسلام کی وکالت و ترجمانی کرنے والوں کی صف میں شامل ہونا، اسلامی فتوحات کی ایک کڑی اور اسلام کے لئے ایک قابل قدر تحفہ اور ایک وقیع اضافہ تھا ـــــ وہ مصر کے اس مشہور ادبی و تنقیدی حلقہ کے اہم رکن اور وکیل تھے، جو عباس محمود العقاد کا مدرسہ یا دبستان کہلاتا ہے، اُن کا سارا نشو و نما اسی ادبی ماحول، جدید اسلوب اور فن تنقید کی آغوش میں ہوا۔ ان کی تنقیدی کتابیں ـــ النقد الادبی ـــ وغیرہ تنقید و تحقیق کی نظر سے دیکھی جاتی

تھیں، وزارتِ تعلیم سے وابستہ رہ کر انہوں نے اپنی صلاحیتوں سے ملک کی خدمت کی اور اسی سلسلہ میں وہ حکومت کی طرف سے امریکہ بھیجے گئے وہاں انہوں نے مغربی تہذیب اور مغربی معاشرہ کو اپنی صحیح نمو اور اپنے نقطۂ عروج پر دیکھا اور اس سے اُن کے اندر ایک گھٹن کی کیفیت پیدا ہوئی، وہ مصر آتے تو بدل چکے تھے، ان کی دو کتابیں ______

التصویر الفنی فی القرآن

اور

مشاہدات القیامت فی القرآن

اس رجحان اور ذہن کی نشاندہی کرتی ہیں۔

"ان دو کتابوں نے خالص ادبی اور منکر دین حلقوں سے بھی قرآن کریم کے اعجاز و بلاغت کا اعتراف کروا لیا ...... بعد میں یہ رجحان "العدالۃ الاجتماعیت فی الاسلام" اور "الاسلام والسلام العالمی" کی شکل میں بالکل کھل کر سامنے آ گیا، اور اب وہ اپنی پوری ذہنی، ادبی صلاحیتوں اور توانائیوں کے ساتھ اسلامی کیمپ میں شامل ہو گئے" "العدالۃ الاجتماعیہ" کو عالم عربی میں وہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ جو عصر جدید کی کم تصنیفات کو حاصل ہوئی، اس کا متعدد زبانوں میں ترجمہ بھی ہوا اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے، کسی تعلیم یافتہ اسلامی ذہن رکھنے والے کے لئے یہ نقص اور ناواقفیت کی بات سمجھی جاتی ہے کہ اس نے "العدالۃ الاجتماعیہ" نہ پڑھی ہو" ...... سید قطب اپنی کتابوں میں اسلام کو ایک ایسی زندہ طاقت کے طور پر پیش کرتے ہیں جو زندگی اور معاشرہ کی تعمیر اور قانون و دستور کی تشکیل میں حصہ لے سکتی ہے، وہ احتساب کائنات کو بھی دین کا ایک تقاضہ اور فریضہ سمجھتے ہیں" یہ بات ان حکمرانوں کے لئے ناقابل برداشت ہے، جو ایک مانع، ایک ادارہ اور ایک شخصیت کے سوا کسی کا وجود تسلیم کرتے ہیں اور نہ کسی کو زندہ رہنے کا حق دیتے ہیں، یہ وہ بدترین عسکری اور آمرانہ حکومت ہے جس کے سامنے حجاج بن یوسف کے واقعات اور چنگیز و ہلاکو کے مظالم گرد ہیں۔

"...... ان ملکوں اور حکومتوں نے خود اپنے قابل فخر فرزندوں کے ساتھ وہ سلوک کیا، جو کوئی دشمن کسی دشمن کے ساتھ نہیں کرتا اور ان کو ذرا بھی ندامت اور شرم ہوا بھی ور نہیں، ابھی تک حضرات وجہ القادر عودہ کو رو رہا ہے، لیکن اگر خدانخواستہ سید قطب کیساتھ پیش آ گیا، یہ اس سے بڑا المیہ اور سانحہ ہوگا۔

(ندائے ملت۔ لکھنؤ ـــــ ۲ر ستمبر ۱۹۶۶ء)

ــــــ اور ــــــ

یہ سانحہ پیش آ کر رہا، یہ المیہ واقع ہو کر رہا، دنیائے اسلام کے اس نامور فرزند کو پھانسی دے دی گئی ـــ

ست آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں

تمام عالم اسلام نے احتجاج کیا، جمال ناصر کو برقیے بھیجے، مصری سفارتوں کو یاد داشتیں دیں، شرق اردن سے لیکر مشرق اقصیٰ پاکستان تک اضطراب انگیز ہے ہیں، مگر جس طرح پتھر میں جونک نہیں لگتی، اسی طرح جمال ناصر پر کسی احتجاج اور داد فریاد کا کوئی اثر نہیں ہوا؟ وہ ارسطو نے کہا تھا کہ ایک ارسطو چاہے تو ہزار اسکندر پیدا کر سکتا ہے، مگر ایک ہزار اسکندر مل جائیں تو ایک ارسطو کو پیدا نہیں کر سکتے، سید قطب ا

جمال ناصر پر یہ مثل پوری اترتی ہے ۔ ایک ہزار لاکھ جمال ناصر کی جانیں بھی سید قطب کی عظیم شخصیت کی تلافی نہیں کرسکتیں ! سید قطب جیسے صاحب عزیمت دینی مفکر اور صاحب کردار انسان کے سامنے جمال ناصر جیسے حاکم اور فرمانروا حشرات الارض سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے ! اس قسم کے دردناک واقعات میں ایک مسلمان کے لئے سب سے زیادہ تسلی روز جزا اور آخرت کے عقیدے سے ہوتی ہے کہ اس دن ظالموں کو ان کے کرتوتوں کی پوری پوری سزا ملے گی ، اور جن کی عظمت و سطوت اور کبریائی کے جھنڈے آج فضا میں اڑ رہے ہیں ، قیامت کے دن وہ ذلیل مجرموں کی طرح ساری دنیا کے روبرو گھسیٹے جائیں گے ! جور و استبداد اور طاقت کے ذریعہ جس نے اس دنیا میں جھوٹی عزت حاصل کی ، قیامت کے دن اس کو ذلت کے سوا اور کچھ ہاتھ نہ آئے گا !

آمریت نے کیا کیا ؟

شاہ فاروق کو اگرچہ فوجی طاقت کے زور سے ہٹایا گیا ، مگر اہل مصر خوش تھے کہ انہیں ملوکیت سے نجات ملی ! ملوکیت ہو یا آمریت ، عوام ان دونوں میں سے کسی ایک قسم کی حکومت کو بھی پسند نہیں کرتے ، کیونکہ یہ دونوں جمہوریت اور عوام کے حقوق کو پامال کر کے اپنے اقتدار و کبریائی کے تخت بچھاتی ہیں ۔ جنرل نجیب کو برطرف اور نظربند کر دینے کے بعد مصر میں انتخابات کا جو ڈرامہ کھیلا گیا ، اور جمہوریت کے نام پر جس طرز کی حکومت قائم کی گئی ، اس نے مصری عوام کو بالکل بے دست و پا بنا کر رکھ دیا ، اس قسم کے جابرانہ قوانین وضع کئے گئے جو آمریت یعنی " ایک شخص کی مطلق العنان حکومت " کی جڑیں مضبوط کرتے ہوں مثلاً یہ کہ صدر مملکت کسی شخص کو بھی سیاسی وجوہ کی بنا پر مقدمہ چلائے بغیر گرفتار کرسکتا ہے اور کسی عدالت میں اس گرفتاری کے خلاف مرافعہ نہیں ہو سکتا ! ــــ یہ تو مشتے از خروارے ہے ، ان قوانین کی فہرست خاصی طویل ہے !

جمال ناصر کی حکومت نے مصر کے پریس پر قبضہ کیا ۔ جو اہل قلم اور صحافی حریت فکر رکھتے تھے انہیں نظر بند اور صحافتی دنیا میں گمنام اور بے اثر کر کے رکھ دیا ۔ مصر میں شاید ایک بھی ایسا اخبار باقی نہیں رہا بلکہ نہیں رہنے دیا گیا جو عوام کی صحیح طور پر ترجمانی کرتا ہو ! آج کی مصری صحافت جمال ناصر کی قصیدہ خوانی میں مصروف ہے کسی ظلم اور زیادتی کے خلاف کوئی احتجاج اور حرف تنقید نہیں ! اشتہارات کے ذریعہ اس قسم کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ جمال ناصر مصر کا نجات دہندہ اور مصر کے وجود و بقا کا امین ہے ، اس کے ہاتھ مضبوط کرنے ہی سے مصر قائم رہ سکتا ہے ، تنہا اسی کی ذات اس سفینہ کی ناخدا ہے ، جمال ناصر کی پالیسی اور طرز حکومت پر تنقید کرنے والا دراصل مصر کا دشمن ہے اور مصر کی دشمنی کو کسی قیمت پر برداشت نہیں کیا جا سکتا ۔

آج مصر کی صحافت پر کمیونسٹوں کا قبضہ اور تسلط ہے ۔ انہی کے اخبارات اور رسالوں کو ملک کے طول و عرض میں پھیلنے کے مواقع دئے جا رہے ہیں ، " اسلام " کی جگہ " سوشلزم " کو نظریہ حیات کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے ۔ قاہرہ کا ریڈیو سوشلزم کے پروپیگنڈے کے لئے وقف ہے ، کوشش کی جا رہی ہے کہ مصری عوام کے ذہن و فکر پر " اسلام " کی بجائے سوشلزم کا رنگ چڑھ جائے ۔ اسلام کی طرف دعوت دینے والے مصری حکومت کے نزدیک " رجعت پسند " ہیں اور ان رجعت پسندوں کو تباہ کرنے کے لئے صدر ناصر کی قتل کی سازش کے شگوفے آئے دن مصری اخبار میں چھوڑتے رہتے ہیں ۔

وہ مصر جو اسلامی تمدن و تہذیب کا گہوارہ رہ چکا ہے آج وہاں فرعونی تہذیب کو زندہ کرنے کی پورے زور شور سے کوششیں جاری ہیں ! " نحن ابناء الفراعنة " (ہم فرعون کی اولاد ہیں) کے نعرہ کی گونج قاہرہ میں سنائی دے رہی ہے ، رعمسیس اول کا مجسمہ بڑے فخر کے ساتھ نصب کر دیا گیا ہے ، مصر کے ہر امیسری نوٹوں اور ڈاک کے ٹکٹوں پر فرعون کی تصویر نظر آتی ہے ! اسلام کے خلاف اتنی بڑی سازش شاید کسی بڑے سے بڑے منافق نے بھی نہیں کی ! اسکیم یہ ہے کہ مصر کی پوری نسل کو اسلامی روایات اور دینی اقدار سے بیگانہ بنا دیا جائے ، تاکہ ان کی نگاہ میں قیادت کے لئے معیاری نمونے ابوبکر صدیق ، عمر فاروق ، عثمان ذی النورین ، علی مرتضیٰ ، سعد ابن وقاص ، خالد بن ولید اور عمر ابن عبدالعزیز (رضی اللہ عنہم) جیسی شخصیتیں نہ رہیں کیونکہ جب تک یہ مقدس ہستیاں مسلمانوں کی نگاہ میں محترم اور نمونہ بنی ہوئی رہیں گی ، ارباب اقتدار کی غلطیوں اور غیر اسلامی

زندگیوں پر احتساب کیا جائے گا، یا کم سے کم دلوں میں انہیں ناپسندیدہ سمجھا جائے گا، ان اعلیٰ نمونوں پر فراعنہ کی شخصیتیں غالب آ گئیں تو پھر بیسویں صدی کے فرعونوں کو قوم، بطل جلیل اور ملک و ملت کے زعیم و قائد کی حیثیت سے قبول کرے گی! تاہم تین سال تک صدر ناصر کی آمریت و قیادت کے تلے کراہتا رہا، آخر کار جیسے تیسے وہاں کے عوام نے اس بلا کو ٹالا اور اس پھندے سے نجات حاصل کی! یمن میں جمال ناصر نے خون کی جو ہولی کھیلی ہے اُس پر ملامت کے لئے لغت میں الفاظ نہیں مل سکتے "عرب اتحاد" کا نعرہ لگا کر، بے شمار عربوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا، یمن کی تباہی پر مصری حکومت نے جو اربوں روپیہ صرف کیا ہے اور جتنے مصری سپاہیوں کی جانوں کی بھینٹ دی ہے اگر اس یلغار کا رخ اسرائیل کی طرف موڑ دیا جاتا، تو صیہونیت کی جان کے لالے پڑ جاتے!

اریٹیریا اور سومالیہ کے مسلمانوں پر جو مظالم کئے جا رہے ہیں، وہ اب ڈھکے چھپے نہیں ہیں مگر جمال ناصر نے اُن مصیبت زدہ اہل ایمان سے ہمدردی کرنے کی بجائے دشمنِ اسلام ہیلا سلاسی شاہ حبشہ سے دوستی کی پینگیں بڑھائی ہیں! قبرص میں ترک مسلمانوں کے قاتل میکاریوس کو جمال ناصر کی حکومت نے مالی امداد دی ہے، اور اس اذیت و غم کا تو لفظوں میں اظہار ہو ہی نہیں سکتا کہ اس شخص نے سعودی حکومت کو جاز پر جس میں مکہ اور مدینہ بھی شامل ہے، حملہ کرنے اور بم برسانے کی دھمکی دی! نہ جانے اس قسم کا چیلنج دیتے وقت جمال ناصر کا ایمان کس فضا میں معلق تھا۔ کشمیر کے مظلوم مسلمانوں کی ہمدردی میں ایک لفظ بھی نام نہاد جمہوریہ عرب کے اس صدر کی زبان سے نہیں نکلا۔

شاہ فیصل نے کس جوش، اخلاص کے ساتھ مسلم حکومتوں کو اتحاد کی دعوت دی ہے مگر اس دعوتِ اتحاد کے مقابلہ میں جمال ناصر نے جو معاندانہ روش اختیار کی ہے، وہ رئیس المنافقین عبداللہ ابن اُبی کی روح کو کتنی عظیم الشان مژدہ اور کس قدر مسرت خیز نوید و تہنیت ہے!

اسرائیلی حکومت میدانِ جنگ میں اخوان المسلمون کے جوشِ جہاد، ایمانی قوت اور عزیمت و استقامت کا تجربہ کر چکی تھی، اور اخوان سے بہت خائف تھی، جمال ناصر نے "اخوان" کو تباہ کر کے، یہودیوں کو فکر و خوف سے آزاد کر دیا، مصر میں اخوان کی تباہی و بربادی ٹھیک اسرائیلیوں کی مرضی، تمنا اور پلاننگ کے مطابق ہوئی ہے!

جمال ناصر کی نگاہ میں اسرائیلی حکومت کا مسئلہ کوئی ایسا شدید مسئلہ (GRAVE PROBLEM) نہیں ہے جس کے لئے کوئی تگ و دو کی جائے، عبدالحکیم عامر نے جب فرانس کا دورہ کیا تو اُس نے واضح لفظوں میں کہہ دیا۔

"جمہوریہ عرب اسرائیل سے نہ جنگ کی خواہش رکھتی ہے اور نہ ارادہ"

یہ اعلان درحقیقت جمال ناصر کی حکومت کی پالیسی کا اعلان ہے ——— جب تک جمال ناصر کی آمریت باقی اور سلامت ہے، یہودیوں کو اطمینان رہے کہ اُن سے چھیڑ چھاڑ نہیں ہو سکتی، عرب ممالک کے مسائل کے مبصر جناب خلیل حامدی کے مضمون کا ایک اقتباس درج ذیل کیا جاتا ہے:-

"مصری حکومت اُن ممالک سے دوستانہ تعلقات قائم کئے ہوئے ہے، جو نہ صرف اسرائیل کو تسلیم کرتے ہیں بلکہ اسرائیل کو مستحکم مضبوط کر رہے ہیں۔ دوسری طرف جو ملک اسرائیل کو کچلنے کے لئے مدد دے سکتے تھے، اُن سب سے مصری حکام نے سرد مہری کا رویہ اختیار کر رکھا ہے بلکہ کھلی کھلی مخاصمت تک نوبت پہنچا دی ہے۔ مسئلہ فلسطین کے بارے میں مصری سیاست کی نمایاں غلطیاں یہ ہیں کہ اُس نے غزہ پر بین الاقوامی ایمرجنسی فورس کا تسلط تسلیم کر کے اس علاقہ کو عملاً اسرائیل کی ترکتازی کے لئے کھول دیا ہے، یہی وہ علاقہ تھا، جہاں سے عرب رضا کار اسرائیل میں گھس کر گوریلا جنگ جاری رکھ سکتے تھے، اب بین الاقوامی پولیس عرب رضا کاروں کو اس علاقہ میں داخل نہیں ہونے دیتی اور اسرائیل اطمینان کے ساتھ اس علاقہ میں اپنے اقتصادی منصوبے پورے کر رہا ہے اسی طرح خلیج عقبہ پر بھی بین الاقوامی کنٹرول سے پہلے یہودیوں کو اس خلیج میں گھسنے کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی مگر اب اُس نے ایلات کے مقام پر عظیم الشان بندرگاہ تعمیر کر لی ہے اور اس کے

جو زبردست طنطنہ کے ساتھ افریقی ممالک میں آ جا رہے ہیں، اس خلیج کے کھل جانے سے وہ ناکہ بندی ختم ہو گئی ہے جس کی وجہ سے اسرائیل سخت پریشانی میں مبتلا تھا، اور اس کی اقتصادی حالت شدید بحران کا شکار ہو رہی تھی، اب وہ بے کھٹکے افریقی ممالک میں اپنی تجارتی منڈیاں قائم کر رہا ہے اور افریقی ممالک کی کثیر تعداد بھی اس کے دام فریب میں مبتلا ہوتی جا رہی ہے۔"

اس صورت حال سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ صدر ناصر کی پالیسی سے اسرائیل کو کس قدر فائدہ پہونچ رہا ہے! اور اسرائیلی حکومت کی کیسی کیسی مشکلوں کے بند ھن کھلتے جا رہے ہیں۔

شاہ فاروق بادشاہ تھا اور برا بادشاہ تھا، اس کی جلاوطنی پر مصری عوام نے خوشیاں منائیں کہ ملوکیت کی نیرنگیوں اور برائیوں سے انہیں نجات ملی، مگر صدر ناصر کی جابرانہ آمریت کا انہیں جو تجربہ ہوا ہے، تو وہ شاہ فاروق کے دور ملوکیت کو یاد کرتے ہیں! اقتصادی اور اخلاقی اعتبار سے بھی شاہ فاروق کا زمانہ ناصر کا دور سے بہتر تھا۔

روس اور امریکہ نظریہ اور عمل کے لحاظ سے ایک دوسرے کے کتنے مخالف ہیں اور ان کے درمیان کس قدر شدید دشمنی ہے، مگر جہاں تک اخوان المسلمون کی مخالفت اور تباہی و بربادی کا تعلق ہے روس اور امریکہ ہی نہیں انگلستان، اسرائیل اور دوسری مغربی طاقتیں بھی جمال ناصر کی ہم نوا اور مؤید ہیں کہ اس طرح اسلامی اخلاق اور دینی تمدن اور نظریات کو نقصان پہونچ رہا ہے! اسلام کے خلاف منافق مسلمانوں کے ساتھ تمام کافرانہ طاقتیں متحد ہو جاتی ہیں اور ان کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہتی جب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ جو کام انہیں کرنا تھا اسے خود بعض مسلمان "تجدد و ترقی" کے نام پر انجام دے رہے ہیں۔

آمریت

آزاد جمہوریت میں اصل طاقت عوام کے ہاتھ میں ہوتی ہے، وہ چاہیں تو آئینی جد و جہد کے ذریعہ ملک میں انقلاب لا سکتے ہیں۔ جمہوری حکومتوں میں ارباب اقتدار کو اس کا خوف لگا رہتا ہے کہ عوام ان سے بددل ہو گئے تو ان کو کرسیوں سے بے دخل کیا جا سکتا ہے، اس لئے وہ عوام کے جذبات، احساسات اور مطالبات کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھتے ہیں، اور عوام کے احتجاج کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ جمہوری اور آئینی انقلاب میں خون خرابہ کی نوبت نہیں آنے پاتی۔ وہاں حکومت اور دستور "بالفعل نہیں" "بالفاظ" اور اصول اپنا کام انجام دیتے ہیں۔ جمہوری حکومتوں میں وہی شخص اقتدار کی کرسی پر فائز رہ سکتا ہے جس سے عوام مطمئن ہوں، وہاں کوئی بڑے سے بڑا آدمی بھی قانون سے بلند و بالا اور مستثنیٰ نہیں ہوتا! جمہوری حکومت میں حکومت کی بڑی سے بڑی شخصیت کی ذاتی زندگی پر بھی عوام تنقید و احتساب کا حق رکھتے ہیں، وہاں فرد واحد کی مرضی سے نہیں، بلکہ باہمی مشورت سے امور مملکت طے ہوتے ہیں۔ جمہوری سیاست میں حاکموں کو عالی ظرف، صاحب صبر و تحمل اور بردبار بن کے رہنا پڑتا ہے، یہاں تک کہ بعض نازک اور اہم معاملات میں "سازش" "غداری" اور "بدیانتی" جیسے الزامات بھی عوام کی زبان سے سننے پڑتے ہیں! اسلام جس شورائیت کا قائل ہے اس کے لئے جمہوریت کی فضا زیادہ سازگار آتی ہے۔

بادشاہت میں حکومت کے امور اور معاملات فرد واحد کے اردگرد گھومتے ہیں، وہاں بادشاہ کو بدلنے کے لئے انقلاب لانے کی جد و جہد قانوناً جرم ہوتی ہے، حکومت کے خزانہ سے بادشاہ اور اس کے خاندان والے اور متعلقین جس طرح چاہتے ہیں فائدہ اٹھاتے ہیں، درباریوں اور خوشامدیوں کا ایک ہجوم بادشاہ کو گھیرے رہتا ہے اور جہاں پناہ کو یہ تک باور کرا دیا جاتا ہے کہ آپ "ظل اللہ" ہیں! ایک بادشاہ مرتا ہے تو اس کی جگہ اسی خاندان کا کوئی فرد اس کی بجائے بادشاہ بنتا ہے! سب بادشاہ ایک ہی جیسے نہیں ہوتے، تاریخ شاہد ہے کہ بعض نیک نفس اور خدا ترس بادشاہوں کو عوام نے پسند کیا ہے! ان کی ذات کو برکت و رحمت سمجھا ہے! برے سے برے بادشاہ نے بھی جمہوریت، اور عوامی حکومت کا نام لے کر لوگوں کو دھوکا نہیں دیا، بادشاہ جمہوریت اور شورائیت کے دعویدار ہی نہیں ہوتے۔ ان کی پالیسی واضح : کہتے ہیں کہ ہمیں قسمت کی طرف سے لوگوں پر بادشاہت کرنے کا حق ملا ہے، مسجدوں میں ان کے نام کے خطبے پڑھے جاتے ہیں، جن میں بادشاہوں کو

"قسمہ قدرت" اور "مالک رقاب اُمم" تک کہا جاتا ہے۔

"آمریت" اسی بیسویں صدی کی مشہور و معروف اصطلاح ہے۔ اس سے پہلے کی تاریخ میں قدیم زمانہ کو شاہ کرتے ہوئے "خلفاء والی، سلاطین، ملوک، راجے، مہاراجے اور شہنشاہ ہوا کرتے تھے! فغفور چین، زار روس، فرعون مصر، کسرائے ایران، قیصر روم، ملوک حیرہ و غسان، تیغ یمن، سلطان ترکی، اور بھارت کے مہاراج ادھراج کے لقب بہت مشہور تھے!

جس طرح بادشاہ اپنے کو بادشاہ کہتا ہے اسی طرح دنیا کا کوئی ڈکٹیٹر و آمر اپنی ذات سے اس لقب کو منسوب کرنا پسند نہیں کرتا۔ جمال ناصر کی زندہ مثال ہمارے سامنے ہے، وہ مصر کا مطلق العنان حاکم ہے، اُس کے حکم اور مرضی کے بغیر مصر کے حدود مملکت میں کوئی دم نہیں مار سکتا اور چوں نہیں کرسکتا، مگر اُس نے اپنا لقب "صدر جمہوریہ عرب" تجویز کیا ہے! اُس نے انتخابات کا ڈھونگ رچایا اور پھر رفتہ رفتہ عوام کی آزادی اور حقوق کے دائرے کو تنگ کرتا گیا، اُس نے ملک میں ایسے قانون بنائے جو اُس کی اپنی مرضی اور پسند کے تھے۔ اور اپنی ذات کو وہ مت زعیثیت دے دی جو قانون کی گرفت سے بالاتر ہے، فوج سے لے کر عدلیہ اور انتظامیہ تک حکومت کے تمام شعبے جمال ناصر کے ہوا خواہ ہیں بلکہ اُس کے چشم و ابرو کے اشارے پر گردش کرتے ہیں! ریڈیو، سینما اور تھیٹر، کالج، حکومت کی طاقت کا دیا ہوا غرض جو کوئی جس حربہ سے بھی شکار کیا جاسکتا تھا! اُسے جمال ناصر کی ڈپلومیسی نے نخچیر بنا کر چھوڑا۔ وہاں کے پریس پر حکومت کا پوری طرح قبضہ ہے، عوام کی آزادی کو اس طرح شکنجے میں کسا گیا ہے کہ حکومت کی کسی بڑی سی بڑی زیادتی کے خلاف کوئی آواز بلند نہیں ہوسکتی! مصر کے پریس، ریڈیو اور دانشمند طبقہ سے اس کا پروپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ جمال ناصر صاحب مصر کے نجات دہندہ اور عرب قوم کے زعیم کبیر ہیں۔

جامعۃ الازہر کی تقدیس کو ایک ہزار سال کے بعد وہ ناصری میں اس حادثہ سے دوچار ہونا پڑا کہ وہاں کی تعلیم کو "مخلوط" کر دیا گیا! آج کا مصر اپنے دینی شہ پارے اور عمارات کی بجائے عبدالوہاب موسیقار اور مشہور مغنیہ اُم کلثوم پر فخر کرتا ہے، مصر کے بڑے بڑے شہروں میں فسق و فجور کی گرم بازاری ہے، دینی اخلاق و اقدار کے نشانات دھندلے پڑتے بلکہ مٹتے اور معدوم ہوتے چلے جا رہے ہیں! حکومت کو بعض ایسے جاہ پرست اور زمانہ ساز علماء بھی ہاتھ لگ گئے ہیں، جو اسلام کی بجائے سوشلزم کی تلقین و تبلیغ کرتے ہیں! جمال ناصر نے اپنی تقریر میں فرمایا تھا:-

"اے محترم! ذرہ رمسیس کے فرزند! ...... دو ہزار سال کے بعد آج مصر پر پہلی مرتبہ خود اہل مصر کو حکومت کرنے کا موقعہ ملا ہے"

اس ذہن و فکر کے سایہ میں جو معاشرہ تشکیل پائے گا اور جو نسل اُبھرے گی اُس میں اسلام و اخلاق کی کوئی خصوصیت بھلا باقی رہ سکتی ہے! دنیا کے جس ملک میں بھی چھوٹے یا بڑے پیمانے پر "ناصری آمریت" کو فروغ ہوا ہے، وہ اسلام اور جمہوریت کا دردناک انگیز المیہ ہے!

اللہ تعالیٰ ہم سب کو، چاہے وہ خواص ہوں یا عوام، دین پر چلنے، دین کو سربلند کرنے اور دین کے لئے مرنے اور جینے کی توفیق عطا فرمائے (آمین)

جائزہ سید قطب اور اُن کے ساتھیوں کے پھانسی پانے اور شہید ہونے پر ہم نے پاکستان اور ہندوستان کے دینی حلقوں کی روش کا بھی تجربہ کرکے دیکھ لیا، اگر کس نے ظلم کے خلاف احتجاج، مظلوموں کے ساتھ ہمدردی اور اعلان حق کا فریضہ انجام دیا، کون خاموش رہا، اور کن حلقوں میں مسرت کے انداز میں سرگوشیاں ہوتی رہیں! مسرت اس بات کی کہ اُن "اخوان" کے ساتھ یہ معاملہ پیش آیا ہے جن کی سب سے زیادہ ہم عصر و قدر شناس جماعت، اسلامی ہے اور اُن کی دینی فکر و دعوت کو حق سمجھتی ہے کسی کسی نے دبی زبان سے دینی اخوت کے اس عام مسئلہ کو "مصر کے داخلی معاملات" سے تعبیر کیا، سرگودھا کے روزنامہ "وفاق" نے اس انتہائی صدمناک سانحہ کی خبر و اطلاع پر جو "ہیڈلائن" قائم کی، اُسے پڑھ کر دل لہو لہو ہو کر رہ گیا۔ اس روزنامہ کی وہ اشاعت سامنے نہیں ہے مگر جلی سرخی کا یہ مفہوم تھا۔

"مصر کی خلافِ قانون جماعت کے لیڈروں کو سزائے موت"

مذکورہ بالا عنوان نے اس المیہ اور حزنیہ کی اہمیت کو بُری طرح مجروح کر دیا۔ مقصود یہ کہ پڑھنے والے یہ تاثر قبول کریں کہ یہ تنظیم ـــــ اخوان المسلمون ـــــ اپنی غیر آئینی حرکتوں کے سبب مصر میں پہلے ہی سے خلافِ قانون قرار دی جا چکی تھی، ایسی سرکش جماعت کے لیڈروں کو یوں ہی سزائے موت نہیں دے دی گئی، بلکہ ....!

مولانا عبد الماجد دریابادی مدیر "صدقِ جدید" جنہوں نے کئی سال پہلے اپنے اخبار میں "اخوان" کی مظلومیت پر طنز فرمائی تھی، جس کے بارے میں مولانا سید ابو الحسن علی ندوی مدظلہ نے لکھا تھا کہ کاش (مولانا دریابادی کے لکھے ہوئے ان لفظوں کو میں اپنے خونِ دل سے مٹا سکتا!) انہی نے سید قطب کی شہادت پر "وفات" کا عنوان قائم کیا ہے! شاید مولانا موصوف کا یہ عقیدہ ہو کہ شہادت کا فروں کے ہاتھ سے مارے جانے ہی سے نصیب ہوتی ہے، مسلمان حکومتیں اور اُن کے فرمانروا کسی مسلمان کو ظالمانہ طور پر قتل کر دیں، تو وہ قتل "وفات" ہوتی ہے، شہادت نہیں ہوتی، اس صورت میں حضرت امام حسین اور حضرت عبد اللہ بن زبیر کی "شہادتیں" محلِ غور ہو جاتی ہیں! حالانکہ یہ نفوسِ قدسیہ "شہید" ہوئے ہیں اور ان کے قتل کرنے والے اگرچہ مسلمان تھے مگر ظالم تھے! اپنے اس شذرہ میں مولانا دریابادی نے سید قطب شہید کی، مدح و ستائش کی ہے، مگر جمال ناصر کے بارے میں ایک حرف نہیں لکھا، مظلوم کی تعریف و ستائش اور ظالم کے خلاف احتجاج اور اظہارِ رنج و ملال سے گریز اور سکوت یہ "تعزیت" کی آخر کون سی قسم ہے؟ مولانا موصوف کے اس شذرہ کو پڑھ کر قاری یہ اثر قبول کرے گا کہ سید قطب طبعی موت سے مرے ہیں، یا کسی ناگہانی بلائے آسمانی کا شکار ہوئے ہیں، اس صورت میں ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ پر تو حرف گیری نہیں کی جا سکتی کیونکہ "وفات" اور "موت" تو ہر جان کے ساتھ لگی ہوئی ہے، ایک نہ ایک دن ہر جاندار کو مرنا ہے!

اللہ تعالیٰ کے یہاں ہر متنفس کا ریکارڈ محفوظ ہے، اور اللہ تعالیٰ سب کی نیتوں کا حال بھی جانتا ہے قیامت کے دن یہ ریکارڈ ہر شخص کے سامنے کھلی کتاب کی طرح آئے گا، اللہ تعالیٰ اُس دن کی رسوائی سے ہمیں محفوظ رکھے ہم اللہ تعالیٰ کی رحمت و مغفرت اور حضور شفیع المذنبین کی شفاعت کے آرزومند ہیں (آمین)

ماہر القادری ۲۰ ستمبر ۱۹۶۶ء

۵
آزمودہ دواؤں کا مرکب
انالجین
سردرد۔ کمر کا درد۔ دانت کا درد
ایام۔ انفلوئنزا اور ہر قسم کے دوسرے درد کے لئے
Opal
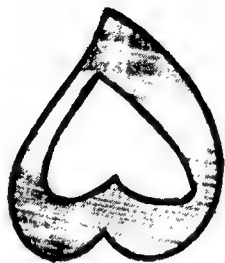
ماہر القادری

جھوٹی نبوت کا جھوٹا علمِ کلام

فتنہ قادیانیت کی تردید و تکذیب اور اُس کے بُطلان کی ضرورت ہم نے اس لئے محسوس کی کہ قادیانی اپنے اس مسلک ضلالت و کفر کی تبلیغ کے لئے ہمارے پاس لٹریچر بھجوایا گیا، دوسرے ذرائع سے بھی ہمیں اطلاع ملی کہ مسلمانوں کو گمراہ کرنے کے لئے قادیانی بڑی سرگرمی کے ساتھ اپنے سو فی صدی غلط عقیدہ اور سراپا کفر و باطل مسلک کی تبلیغ کر رہے ہیں ! اس صورت میں ہمارا کیا فریضہ تھا ؟ یہ کہ ہم چپ سادھ لیتے اور خاموش بیٹھے رہتے، اگر ہم رواداری کے اس وہم میں مبتلا ہوتے، تو قیامت کے دن ہم سے شدید باز پرس ہوتی کہ تمہیں اللہ تعالیٰ نے ختم نبوت اور اسلام کے دفاع اور جھوٹی نبوت کی تردید کی قوت و استطاعت دی تھی تو تم نے اس سے کام کیوں نہیں لیا، اور رواداری کا جو وہم شیطان نے پیدا کیا تھا، اُس میں تم کیسے مبتلا ہو گئے !

آخرت کی اس جواب دہی سے بچنے کے لئے، حق کی حمایت اور باطل کی تردید میں، ہم نے "فاران" کے تین شماروں میں "قادیانیت" کا مسلک کا پوسٹ مارٹم کر کے دکھا دیا کہ یہ مسلک کفر و ضلالت کا مسلک ہے، اس مذہب کی بنیاد کذب و افترا اور دجل و فریب پر ہے، اسلام کے خلاف یہ سب سے بڑی سازش ہے، اس مسلک کو قبول کرنے کے بعد آدمی ایمان و اسلام سے عاری اور محروم ہو جاتا ہے ! قادیانیت انگریزوں کا لگایا ہوا پودا ہے، اس کے پیشوا —— مرزا غلام احمد —— کی زندگی کا بہت بڑا حصہ انگریز کی وفاداری اپنا مندی اور کاسہ لیسی میں بسر ہوا ہے، جس شخص نے انگریزی حکومت کی وفاداری اور نیاز مندی کی لوگوں کو تلقین کی ہو اور جس نے انگریزوں کی خوشنودی کے لئے فریضہ جہاد کی تنسیخ کا اعلان کیا ہو اُس کی ذات سے ولایت، مجددیت، مہدویت، مسیحیت اور کسی قسم کی بھی نبوت منسوب کی جا سکتی ہے ؟ کیا کسی دل الشک دیکھ فراست ایسی ہو سکتی ہے کہ انگریزوں کی کافر حکومت کو قرآن کریم کے "اولوالامر" کا مصداق ٹھیرایا جائے ؟ اللہ اور رسول کی اطاعت کے بعد جس "اولوالامر" کی اطاعت کا قرآن کریم میں حکم دیا گیا ہے، کیا وہ "اولوالامر" کافر بھی ہو سکتا ہے ؟ صرف یہی ایک چیز یہ بتانے کے لئے کافی ہے کہ مرزا غلام احمد کس غلط فکر و مزاج اور کس پست سیرت و کردار کا انسان تھا !

"تفریق پیدا کرو اور حکومت کرو" (DIVIDE AND RULE) یہ انگریزی حکومت کی پالیسی تھی، مرزا غلام احمد کی جھوٹی نبوت کے دعوے نے امت مسلمہ میں کھلی ہوئی تفریق پیدا کر دی اور یہ "تفریق" انگریز کو مطلوب اور محبوب تھی، اسی لئے انگریز کے ظلِ عاطفت میں یہ خانہ ساز "ظلی نبوت" پروان چڑھی ! —— "امت کے اندر ایک امت" یا "امت کے مقابلہ میں دوسری امت" اور "نبوت کے مدمقابل جدید نبوت" —— اس افتراق کی مذمت کے لئے جتنے سخت سے سخت الفاظ بھی استعمال کئے جائیں، وہ حقیقت کی واقعی ترجمانی کے لئے کم ہی ٹھیریں گے !

امتِ مسلمہ کا یہ "افتراق" انگریزوں کی پالیسی کے عین مطابق تھا، اسی لئے تو مرزا غلام احمد نے کہا تھا :-

"میں اپنے کام کو نہ مکہ میں اچھی طرح چلا سکتا ہوں، نہ مدینہ میں نہ روم" "میں نہ شام میں، نہ ایران میں نہ کابل میں، مگر اس گورنمنٹ میں جس کے اقبال کے لئے اللہ سے دعا کرتا ہوں ....."

خدا کے لئے انصاف سے بتاؤ کہ امتِ مسلمہ مرزا غلام احمد کو کس دلیل کی بنا پر ظلی اور بروزی نبی مان لیتی، جب کہ کتاب و سنت، آثارِ صحابہ

اور ائمہ حدیث و فقہ کے اقوال میں نبوت کی کوئی ایسی قسم ہی سرے سے نہیں ملتی! نبوت کے اقرار و انکار کا مسئلہ کفر و ایمان کا مسئلہ ہے، کتاب سنت سے محکم اور واضح طور پر یہ عقیدہ ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی پر نبوت کو ختم کر دیا گیا، اس منصوص عقیدے کے ہوتے ہوئے اُمت کسی بروزی، ظلی، طفیلی اور صاحب امر و نہی نبی کی نبوت کو کس طرح سے تسلیم کر لیتی! امت محمدیہ نے مرزا غلام احمد کو نبی نہ مان کر آخر کیا قصور کیا ہے؟ اور یہ بات کس طرح عقل میں آسکتی ہے کہ وہ اُمت جس کے پاس اللہ کی کتاب اور رسول اللہ کی سیرت تیرہ سو برس تک ہی کی پوری محفوظ ہو، وہ مرزا غلام احمد کی نبوت اور موعود مسیحیت کے مسئلہ میں گمراہ ہو گئی ہے! اور اللہ و رسول اور قرآن پر ایمان لانے کے باوجود وہ مومن نہیں ہے، امت مسلمہ کا ایمان، و اسلام اُس وقت معتبر ہو گا، جب وہ مرزائے قادیان کی نبوت اور موعود مسیحیت پر ایمان لے آئے گی ——— یہ کیسی نادانی اور جہالت و بے خبری کی باتیں ہیں، اُمت مسلمہ سے اس بات کی کیوں توقع کی جاتی ہے کہ وہ قادیانیوں کے ہاتھ اپنے دین و ایمان کو بیچ دے گی۔

جس زمانہ میں مرزائے قادیان نے دعووں کا سلسلہ شروع کیا ہے، امتِ مسلمہ میں ہزاروں افراد ایسے موجود تھے، جن کے علم و تقوی کے مقابلہ میں مرزا کی زندگی کو قابلِ التفات نہیں سمجھا گیا، خود پنجاب میں تونسہ شریف اور گولڑہ شریف کے مشائخ طریقت تھے، اور یو۔پی کے حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت کے سامنے مرزا غلام احمد کی ذات آفتاب اور ذرہ کی برابر بھی نسبت نہیں رکھتی! حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اور حضرت مولانا قاسم نانوتوی علم و فضل کے سمندر تھے! تحریر و تحقیق اور شعر و ادب کی خوبی و کمال میں علامہ شبلی نعمانی کے مقابلہ میں مرزا غلام احمد طفلِ مکتب نظر آتا ہے، ان بلند و بالا اور ممتاز شخصیتوں کے ہوتے ہوئے مرزائے قادیان کی طرف کسی مسلمان کی نگاہ کس طرح جا سکتی تھی! مرزائے قادیان کے مقابلہ میں سینکڑوں گنا زیادہ کشش تو سر سید احمد خاں کی شخصیت میں تھی۔

ایک وہ شخص جو انگریزی حکومت کی نیازمندی اور وفاداری کا دم بھرتا ہو اور اپنی وفاداری کا یقین دلانے کے لئے جس نے انگریزی گورنمنٹ کے حضور درخواستیں بھیجی ہوں، اُس کی ذات اور شخصیت سے مسلمانوں کو لگاؤ کس طرح ہو سکتا تھا ——— انگریز سے وفاداری، نیازمندی اور اطاعت فرمانبرداری کا اظہار کرتے ہی مرزائے قادیان نے اپنی شخصیت کو مشتبہ بنا دیا، مرزا کی یہی مشتبہ شخصیت، فنافی الرسول اور ولایت کا دعویٰ کرتی ہے، مراق، دق، سل اور ضعفِ باہ کی جسمانی کمزوریوں کے ساتھ! یہ عجیب و غریب قسم کا "فنافی الرسول امتی" اُمت کے سامنے آتا ہے، جو ذات خاتم النبیین میں اس طرح گم ہونے کا دعویٰ کرتا ہے کہ ذات رسالت مآب اور اُس "فنافی الرسول امتی" کے مابین نہایت اتحاد کے باعث مغیریت[1] ہی باقی نہیں رہتی ہے ——— یہاں تک کہ :-

"محمد کی نبوت آخر محمد ہی کو ملی، گو بروزی طور پر ....."

مرزا کا نام تو اُس کے ماں باپ نے غلام احمد رکھا تھا، پھر یہ "محمد" کی نسبت کیسے؟ اس کی تاویل اُس نے یوں کی :-

"وحی الٰہی میں میرا نام محمد رکھا گیا، اور رسول بھی ...."

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی پر نبوت اور وحی کا سلسلہ ختم ہو گیا، اس عقیدہ اور واقعیت و حقیقت کی موجودگی میں اُمت مسلمہ مرزا غلام احمد کے اس دعوے کو کس طرح درست مان لیتی کہ اُس پر "وحی" بھی آتی تھی!

اُمت کے سامنے انبیاء کی مبارک زندگیاں اور خاص طور سے حضور ختمی مرتبت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مقدس سیرت ہے، وہاں نبوت سے پہلے کسی قسم کا کوئی دعویٰ نہیں ہے، اس لئے کہ نبوت میں تدریج نہیں ہوتی، مگر اس کے برخلاف مرزا کے دعووں کا سلسلہ ولایت سے جو چلتا ہے، تو مجددیت مہدویت، موعود مسیحیت، بروزی و ظلی نبوت اور امر و نہی کی حامل نبوت پر جس میں وحی بھی شامل ہے، جا کر ختم ہوتا ہے، بلکہ جھوٹے دعووں کی یہ تان الوہیت کی حد تک پہونچ جاتی ہے۔ جھوٹ کا یہ خاصہ ہے کہ اُس پر اصرار کرتے کرتے جھوٹا آدمی ذمامت و رذالت کے پاتال تک پہونچ کر رہتا ہے!

اُمتِ مسلمہ کے سامنے اس نبی کاذب کی پیش گوئیاں بھی تھیں :-

---

[1] مرزا غلام احمد کی تحریر کا اقتباس!

- "مولوی ثناء اللہ میری زندگی میں فوت نہ ہوا تو میں دجال اور کذاب ہوں"

(اشتہار مرزا ۱۵ اپریل ۱۹۰۷ء)

- "ڈاکٹر عبد الحکیم میری آنکھوں کے روبرو اصحاب فیل کی طرح نیست و نابود ہو جائے گا"

(تبصرہ مورخہ ۱۶ نومبر ۱۹۰۷ء)

- "دو تین خاتون مبارکہ تیرے نکاح میں آئیں گی جن کو تو نصرت جہاں کے بعد پائے گا، اور ان سے تیری نسل بکثرت ہوگی"

(اشتہار مرزا مورخہ ۲۰ فروری ۱۹۰۶ء)

مگر

ان پیشین گوئیوں کے وقوع میں آنے سے قبل ۲۶ مئی ۱۹۰۸ء کو مرزا غلام احمد مرگیا! ـــــ جھوٹے نبی کی جھوٹی پیش گوئیوں کا یہی حشر ہونا تھا، لیکن وہ لوگ جن کے دلوں میں شیطان نے اس جھوٹی نبوت کی عقیدت کا بیج بو دیا ہے، وہ کذب و افترا کی ان کھلی ہوئی نشانیوں کو دیکھتے ہیں مگر ان کی عقیدت میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا! یہ بھی اللہ تعالیٰ کی مشیت ہے، آخر دوزخ کے لئے انسانوں کا ایندھن بھی تو چاہئے!

اُمتِ مسلمہ کے سامنے "قصائد احمدیہ" بھی تھے، جن میں ـــــ اہل سنت والجماعت کے علماء کو اس قسم کی گالیاں دی ہیں۔

"خبیث، شیطان، مُفسد، کذاب، ناری، غوی، اجہل، احمق، شقی، ذیب، ملاعین، اشرار الناس، نقال،

دجال مفتری، اوباش، بے ایمان، بے حیا، کلب ۔۔۔۔۔۔"

یہ ہے قادیانی قصیدہ نگاری کا اسلوب اس کی زبان اور ادب! جس کا ایمان بگڑتا ہے اُس کی زبان بھی بگڑ جاتی ہے اور اس کا قلم بھی ہذیانات کے اظہار میں لگا چلا جاتا ہے اور جھوٹے نبی کے اُمتی اس قسم کے "ہذیانات" کو "وحی" سمجھتے ہیں! (استغفر اللہ)

لوگوں کو خبیث اور بے ایمان بھی کہا جا سکتا ہے، ان القاب کے لئے کوئی سبب ہونا چاہئے، مگر علماء ملت اسلامیہ آخر کس جرم میں ان القاب کے سزاوار ٹھیرائے گئے؟ انہوں نے کسی منصوص عقیدہ کو بدل دیا تھا، دین کے کسی رُکن کو منسوخ کر دیا تھا، کتاب و سنت سے ثابت شدہ کسی مُسلّمہ کو نہیں مانا تھا؟ ان بے چاروں کا اس کے سوا اور کیا قصور تھا کہ نبی کاذب کے دعویٰ نبوت کی انہوں نے پوری جرأت کے ساتھ تکذیب و تردید کی! اور اس طرح امت کو کفر و ضلالت سے بچا لیا! علماء کا یہ کارنامہ تو اُن کے اعمال نامہ کا سب سے زیادہ روشن و تابناک ورق ہے، اس پر وہ جتنا بھی ناز کریں کم ہے!

مرزائے قادیان کی تحریر کا اقتباس اوپر دیا جا چکا ہے، جس سے واضح ہوتا ہے کہ مرزا اس بات کو اچھی طرح جانتا تھا کہ مسلمانوں کے کسی ملک میں "نبوت" کے دعوے کو انگیز اور گوارا نہیں کیا جا سکتا، اُس کے سامنے خلافت راشدہ کے "مدعیان نبوت" کا حشر تھا! اسی لئے اس نے انگریزی حکومت کو اپنے کام کے لئے منتخب کیا! ایسا "دعویٰ" اور اس قسم کا مشن جس سے اُمتِ اسلامیہ میں پھوٹ پیدا ہوتی ہو، انگریز کی مرضی کے عین مطابق تھا، انگریز کو اور کیا چاہئے تھا ایک دُعاگو، نیاز مند، وفادار "نبی" اس کو ہاتھ آ گیا، اور ایک ایسی امت مل گئی، جو انگریز کی کافرانہ حکومت کو "اولی الامر" جانتی تھی اور جس امت کے نبی کی عمر کا زیادہ حصہ انگریز کی خیر خواہی اور دعا گوئی میں بسر ہوا تھا۔

"جہاد" کا مفہوم بہت وسیع ہے اور اس میں جہاد نفس سے لے کر جہاد بالسیف تک شامل ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس دور کے غزوات، وہ سب یا اُس جنگ سے تعلق رکھتے ہیں، جو جنگیں میدانوں میں تلوار سے لڑی گئی ہیں، "جہاد بالسیف" منسوخ نہیں ہو گیا، یہ حکم اور فریضہ علیٰ حالہٖ باقی ہے، مسلمانوں کی تاریخ بتاتی ہے کہ کافروں سے وقتاً فوقتاً "جہاد بالسیف" ہوتا رہا ہے، صلیبی محاربات میں مسلمانوں کا کردار "مجاہدین" کا کردار رہا ہے اور صلاح الدین ایوبی کے کارنامے مقدس جہاد کے عملی نمونے ہیں! معرکہ بالاکوٹ بھی "جاہدوا" کی عملی تفسیر ہے اور اس معرکہ میں جو مسلمان

اور ائمہ حدیث و فقہ کے اقوال میں نبوت کی کوئی ایسی قسم بھی سرے سے نہیں ملتی! نبوت کے اقرار و انکار کا مسئلہ کفر و ایمان کا مسئلہ ہے، کتاب سنت سے محکم اور واضح طور پر یہ عقیدہ ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر نبوت کو ختم کر دیا گیا، اس منصوص عقیدے کے ہوتے ہوئے اُمت کسی بروزی، ظلی، طفیلی اور صاحب امر و نہی نبی کی نبوت کو کس طرح سچا تسلیم کر لیتی! امت محمدیہ نے مرزا غلام احمد کو نبی نہ مان کر آخر کیا قصور کیا ہے؟ اور یہ بات کس طرح عقل میں آسکتی ہے کہ وہ اُمت جس کے پاس اللہ کی کتاب اور رسول اللہ کی سیرت پوری کی پوری محفوظ ہو، وہ مرزا غلام احمد کی نبوت اور موعود مسیحیت کے مسئلہ میں گمراہ ہو گئی ہے! اور اللہ، رسول اور قرآن پر ایمان لانے کے باوجود، وہ مومن نہیں ہے، امت مسلمہ ایمان اور اسلام اُس وقت معتبر ہوگا، جب وہ مرزائے قادیان کی نبوت اور موعود مسیحیت پر ایمان لے آئے گی ——— یہ کیسی نادانی اور جہالت بے خبری کی باتیں ہیں، اُمت مسلمہ سے اس بات کی کیوں توقع کی جاتی ہے کہ وہ قادیانیوں کے ہاتھ اپنے دین و ایمان کو بیچ دے گی۔

جس زمانہ میں مرزائے قادیان نے دعووں کا سلسلہ شروع کیا ہے، امت مسلمہ میں ہزار اعلیٰ افراد ایسے موجود تھے، جن کے علم و تقویٰ کے مقابلہ میں مرزا کی زندگی کو قابل التفات نہیں سمجھا گیا، خود پنجاب میں تونسہ شریف اور گولڑہ شریف کے مشائخ طریقت تھے، اور یو۔ پی کے حضرت مولانا فضل گنج مراد آبادی رحمتہ اللہ علیہ کی شخصیت کے سامنے مرزا غلام احمد کی عظمت آفتاب اور ذرہ کی برابر بھی نسبت نہیں رکھتی! حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، اور حضرت مولانا قاسم نانوتوی علم و فضل کے سمندر تھے! تحریر و تحقیق اور شعر و ادب کی خوبی و کمال میں علامہ شبلی نعمانی کے مقابلہ میں مرزا غلام احمد طفل مکتب نظر آتا ہے، ان بلند و بالا اور ممتاز شخصیتوں کے ہوتے ہوئے مرزائے قادیان کی طرف کسی مسلمان کی نگاہ کس طرح جا سکتی تھی! مرزائے قادیان کے مقابلہ میں سینکڑوں گنا زیادہ کشش تو سرسید احمد خاں کی شخصیت میں تھی۔

ایک وہ شخص جو انگریزی حکومت کی نیازمندی اور وفاداری کا دم بھرتا ہو اور اپنی وفاداری کا یقین دلانے کے لئے جس نے انگریز حاکم کے حضور درخواستیں بھی بھیجی ہوں، اُس کی ذات اور شخصیت سے مسلمانوں کو لگاؤ کس طرح ہو سکتا تھا — انگریز سے وفاداری، نیازمندی اور اطاعت فرمانبرداری کا اظہار کرتے ہی مرزائے قادیان نے اپنی شخصیت کو مشتبہ بنا دیا، مرزا کی یہی مشتبہ شخصیت، فنافی الرسول اور ولایت کا دعویٰ کرتی ہے، مراق، دق، سِل اور ضعف باہ کی جسمانی کمزوریوں کے ساتھ! یہ عجیب و غریب قسم کا "فنافی الرسول اُمتی" اُمت کے سامنے آتا ہے، جو ذات خاتم النبیین میں اس طرح گم ہونے کا دعویٰ کرتا ہے کہ ذات رسالت مآب اور اُس "فنافی الرسول اُمتی" کے مابین نہایت اتحاد کے باعث "غیریت" باقی نہیں رہتی ہے ——— یہاں تک کہ:—

"محمد کی نبوت آخر محمد ہی کو ملی، گو بروزی طور پر....."

مرزا کا نام تو اُس کے ماں باپ نے غلام احمد رکھا تھا، پھر یہ "محمد" کی نسبت کیسے؟ اس کی تاویل اُس نے یوں کی:—

"وحی الٰہی میں میرا نام محمد رکھا گیا، اور رسول بھی......"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی پر نبوت اور وحی کا سلسلہ ختم ہو گیا، اس عقیدہ اور واقعیت وحقیقت کی موجودگی میں اُمت مسلمہ مرزا غلام احمد کے اس دعوے کو کس طرح درست مان لیتی کہ اُس پر "وحی" بھی آتی تھی!

اُمت کے سامنے انبیاء کی مبارک زندگیاں اور خاص طور سے حضور ختمی مرتبت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مقدس سیرت ہے، وہاں نبوت پہلے کسی قسم کا کوئی دعویٰ نہیں ہے، اس لئے کہ نبوت میں تدریج نہیں ہوتی، مگر اس کے برخلاف مرزا کے دعووں کا سلسلہ ولایت سے جو چلتا ہے، تو مجدد، مہدویت، موعود مسیحیت، بروزی و ظلی نبوت اور امر و نہی کی حامل نبوت پر جس میں وحی بھی شامل ہے، جا کر ختم ہوتا ہے، بلکہ جھوٹے دعووں کی الوہیت کی حد تک پہونچ جاتی ہے۔ جھوٹ کا یہ خاصہ ہے کہ اُس پر اصرار کرتے کرتے جھوٹا ذہنی و ذہانت و رذالت کے پاتال تک پہونچ کر رہتا ہے!

اُمت مسلمہ کے سامنے اس نبی کاذب کی پیش گوئیاں بھی تھیں:—

● — "مولوی ثناء اللہ میری زندگی میں فوت نہ ہوا تو میں دجال اور کاذب ہوں"
(اشتہار مرزا ۱۵ر اپریل ۱۹۰۷ء)

● — "ڈاکٹر عبدالحکیم میری آنکھوں کے روبرو اصحاب فیل کی طرح نیست و نابود ہو جائے گا"
(تبصرہ مورخہ ۱۶ر نومبر ۱۹۰۶ء)

● — "دو تین خاتون مبارکہ تیرے نکاح میں آئیں گی جن کو تو نصرت جہاں کے بعد پائے گا، اور ان سے تیری نسل بکثرت ہوگی"
(اشتہار مرزا مورخہ ۲۰ر فروری ۱۹۰۶ء)

مگر

ان پیشین گوئیوں کے وقوع میں آنے سے قبل ۲۶ر مئی ۱۹۰۸ء کو مرزا غلام احمد مرگئے! ——— جھوٹے نبی کی جھوٹی پیش گوئیوں کا یہی حشر ہونا تھا لیکن وہ لوگ جن کے دلوں میں شیطان نے اس جھوٹی نبوت کی عقیدت کا بیج بو دیا ہے، وہ کذب و افتراء کی ان کھلی ہوئی نشانیوں کو دیکھتے ہیں مگر ان کی عقیدت میں کوئی تغییر واقع نہیں ہوتا، یہ بھی اللہ تعالیٰ کی مشیت ہے، آخر دوزخ کے لئے انسانوں کا ایندھن بھی تو چاہیئے!

اُمتِ مسلمہ کے سامنے "قصائد احمدیہ" بھی ہیں، جن میں ——— اہل سنت والجماعت کے علماء کو اس قسم کی گالیاں دی ہیں
"خبیث، شیطان، ملعون، کذاب، ناری، غوی، اجہل، احمق، شقی، ذیب، طاعین، شرار الانام، نقان،
دجال مفتری، اوباش، بے ایمان، بے حیا، کلب ......"

یہ ہے قادیانی تصیدہ نگاری کا اسلوب، اس کی زبان اور ادب! جس کا ایمان بگڑ جاتا ہے اس کی زبان بھی بگڑ جاتی ہے اور اس کا قلم بھی ہذیان کے اظہار سے لگا چلا جاتا ہے اور جھوٹے نبی کے اُمتی اس قسم کے "ہذیانات" کو "وحی" سمجھتے ہیں! (استغفراللہ)

ان لوگوں کو خبیث اور بے ایمان بھی کہا جاسکتا ہے، ان القاب کے لئے کوئی سبب ہونا چاہیئے، مگر علماء ملت اسلامیہ آخر کس جرم میں ان القاب کے سزاوار ٹھیرائے گئے! انہوں نے کسی منصوص عقیدہ کو بدل دیا تھا، دین کے کسی رُکن کو منسوخ کر دیا تھا، کتاب و سنت سے ثابت شدہ کسی مسئلہ کو نہیں مانا تھا؟ ان بے چاروں کا اس کے سوا اور کیا قصور تھا کہ نبی کاذب کے دعویٰ نبوت کی انہوں نے پوری جرأت کے ساتھ تکذیب و تردید کی! اور اس طرح امت کو کفر و ضلالت سے بچا لیا! علماء کا یہ کارنامہ قرآن کے احکام کا سب سے زیادہ روشن و تابناک ورق ہے، اس پر جتنا بھی ناز کریں کم ہے!

مرزائے قادیان کی تحریر کا اقتباس اوپر دیا جا چکا ہے، جس سے واضح ہوتا ہے کہ مرزا اس بات کو اچھی طرح جانتا تھا کہ مسلمانوں کے کسی ملک میں نبوت کے دعوے کو انگیز اور گوارا نہیں کیا جاسکتا، اُس کے سامنے خلافتِ راشدہ کے "مدعیانِ نبوت" کا حشر تھا! اسی لئے اُس نے انگریزی حکومت اپنے کام کے لئے منتخب کیا! ایسا "دعویٰ" اور اس قسم کا مشن جس سے اُمتِ اسلامیہ میں پھوٹ پیدا ہوتی ہو، انگریز کی مرضی کے عین مطابق تھا، انگریز اور کیا چاہتے تھا، ایک دُعاگو، نیاز مند، وفادار "نبی" اس کو ہاتھ آگیا، اور ایک ایسی امت مل گئی، جو انگریز کی کافرانہ حکومت کو "اولوالامر" جانتی تھی، جس امت کے نبی کی عمر کا زیادہ حصہ انگریز کی خیر خواہی اور دعاگوئی میں بسر ہوا تھا۔

"جہاد" کا مفہوم بیشک وسیع ہے، اور اس میں جہاد نفس سے لے کر جہاد بالسیف تک شامل ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس وہ غزوات اور سرایا اُس جنگ سے تعلق رکھتے ہیں، جو جنگیں میدانوں میں تلوار سے لڑی گئی ہیں، "جہاد بالسیف" منسوخ نہیں ہوگیا، یہ حکم اور فرد عمل حالہ باقی ہے، مسلمانوں کی تاریخ بتاتی ہے کہ کافروں سے وقتاً فوقتاً "جہاد بالسیف" ہوتا رہا ہے، صلیبی محاربات میں مسلمانوں کا کردار "مجاہدین" کردار رہا ہے اور صلاح الدین ایوبی کے کارنامے مقدس جہاد کے عملی نمونے ہیں! معرکہ بالاکوٹ بھی "جاہدوا" کی عملی تفسیر ہے اور اس معرکہ میں جو

کام آئے ہیں وہ شہید ہیں :

بنا کردند خوش رسمے بہ خاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

عیسائی دنیا — صلاح الدین ایوبی کی زیر قیادت مسلمانوں کے جوش جہاد کا تجربہ کر چکی تھی ، مجاہدین نے نصرانی سورماؤں کو ہر محاذ پر رگید ڈالا تھا ، جہاد کی اس اسپرٹ سے عیسائی دنیا خوف کھاتی تھی ، مرزا غلام احمد قادیانی نے انگریز کے اس خوف اور اندیشہ کو دور کرنے کے لئے فریضہ جہاد کی تنسیخ کا اعلان کر دیا ۔

"یہ وہ فرقہ ہے جو احمدیہ کے نام سے مشہور ہے اور پنجاب اور ہندوستان اور دیگر متفرق مقامات پر پھیلا ہوا ہے، یہی وہ فرقہ ہے جو دن رات کوشش کر رہا ہے کہ مسلمانوں کے خیالات سے جہاد کی بیہودہ رسم کو اُٹھا دے ۔"

جہاد کے مقدس و منصوص فریضہ کو جو شخص "بیہودہ رسم" کہتا ہو کیا وہ ولی ، مجدد اور مسیح موعود ہو سکتا ہے ؟ غلام احمد قادیانی نے آخر کس منصب کی بنا پر فریضہ "جہاد" کی تنسیخ کا اعلان کیا ، جو احکام و فرائض نصِ قطعی سے ثابت ہیں ان کو نص قطعی ہی منسوخ کر سکتی ہے ،

اگر

اُن کے خبط و زعم کے مطابق اُن پر ایسی وحی آتی تھی ، جس میں "امر و نہی" بھی ہوتا تھا ، تو اس صورت میں وہ بروزی اور ظلی ہی نہیں "مستقل بالذات" نبی قرار پاتا ہے ، اور اس قول و عمل اور اعلان کے بعد اُس کا زبان سے یہ کہے جانا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میں "خاتم النبیین" مانتا ہوں ، ذرہ برابر صدق نہیں رکھتا ، یہ کھلا ہوا دھوکا اور واضح دجل و فریب ہے !

مرزا غلام احمد قادیانی کے تمام "دعوے" ایک جگہ جمع کر دیے جائیں تو وہ اُس کو کاذب دجال اور مفتری ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں ، اتنا کھلا ہوا تضاد تو بازاری لوگوں کے قول و عمل میں بھی نہیں پایا جاتا ، ایک لپاڑیا اور یاوہ گو ہے ، کہ جو جی میں آتا ہے بکے چلا جاتا ہے ، اُسے کچھ یاد نہیں رہتا کہ اس سے پہلے کیا کہا تھا ؟

مرزا نے دو ٹوک لفظوں میں اعلان کیا :-

"آج سے انسانی جہاد ، جو تلوار سے کیا جاتا تھا خدا کے حکم کے ساتھ بند کیا گیا ۔"

سوال یہ ہے کہ خدا کا حکم یہ ہے کہ جہاد بالسیف کو بند کیا جائے ، مرزائے قادیان کو اس کا کس طرح علم ہو گیا ، کیا اُس پر وحی آتی تھی ؟ اور یہ بھی ایسی وحی نہیں جس طرح شہد کی مکھی کو اللہ تعالیٰ ایک بات سمجھاتا ہے یا اُمِ موسیٰ کو وحی کی گئی تھی ، یہ وحی تو نبوت کی وحی ہے "خدا کا حکم" کہہ کر منصوص فریضہ اور حکم کو منسوخ کرنے کا اعلان "مستقل بالذات نبی" کا منصب ہے ، اس صورت میں مرزا غلام احمد کے قول کے مطابق کہ :-

"...... ہم بھی نبوت کے مدعی پر لعنت بھیجتے ہیں ......"

خود مرزا کی کیا پوزیشن ہو جاتی ہے ، نبوت کے آخر اور کیا خصائص و وظائف ہیں ، یہی کہ ایک شخص اس کا اعلان کرتا ہے کہ مجھ پر وحی آتی ہے ، پھر وہ کہتا ہے میں دوسرے نبیوں اور رسولوں کی طرح نبی اور رسول ہوں ، پھر وہ یہ حکم خداوندی منصوص حکم (فریضہ جہاد) کی تنسیخ کا اعلان کرتا ہے ، اُس کے نام کے ساتھ "علیہ السلام" لکھا جاتا ہے ، اس کے ساتھی صحابہ کہلاتے ہیں اور اُن کا نام "رضی اللہ عنہم" کے ساتھ لیا جاتا ہے ، وہ مدعی نبوت ، اپنے ماننے والوں کو "میری امت" کہتا ہے ، کیا اس "مستقل بالذات اور حامل امر و نہی نبوت" کے دعوے اور اعلان کے بعد بھی "ختم نبوت" نہیں ٹوٹتی ! ان چمکتی ہوئی دھوپ سے زیادہ روشن حقائق و شواہد کے ہوتے ہوئے مسلمانوں کو دھوکا دینے کے لئے اس خطابات کی رٹ لگانا کہ مرزا "ختم نبوت" کا قائل تھا ، کتنا خوفناک کذب

اور صاف جھوٹ ہے۔

کذب و افترا کے سیاہ نامے

قادیانیوں کی دو کتابیں، ایک پمفلٹ اور ماہنامہ "الفرقان" کا جہاد نمبر ــــ یہ لٹریچر ہمارے پاس بھیجا گیا ہے قادیانیوں کے ہر قول، ہر پمفلٹ اور ہر کتاب کی ہم تردید کریں تو اس کے لئے برسوں کی فرصت چاہئے، ہزاروں صفحات بھی اس کی تردید کے لئے شاید کافی نہ ہوں گے، کیونکہ اس گمراہ جماعت کا حرف حرف تردید و تکذیب کا مستحق ہے!

ان کی کتابوں پر ہم تنقید کریں بھی تو کیا کریں جب کہ ہمارا ایمان ہے کہ قادیان میں جھوٹی نبوت کا دعویدار پیدا ہوا تھا، اور پاکستان میں ربوہ جھوٹے نبی کی جھوٹی خلافت کا مرکز ہے۔ جھوٹی نبوت اور مفروضہ اور خود ساختہ "مسیح موعودیت" کی تائید میں جو مضمون اور کتاب بھی لکھی جائے گی وہ کذب و افترا کا دفتر بے معنی ہوگی، اب ہے دلائل، تو جو لوگ خدا کا انکار کرتے ہیں وہ بھی اپنے مسلک دہریت کی تائید میں دو چار دلیلیں ایسی لے آتے ہیں جو بظاہر قابل غور و توجہ معلوم ہوتی ہیں! مگر کیا ان کی بنا پر انکار خدا اور نفی وجود باری تعالیٰ کے مسلک کو کوئی صاحب ایمان اور اہل عقل ذرہ برابر اہمیت دے سکتا ہے۔ کھلے ہوئے کفر و شرک کی جانب بھی لوگ ظاہری طور پر کچھ نہ کچھ معقولیت دیکھ کر ہی رجوع ہوتے ہیں! شیطان نے بھی آدم کو سجدہ کرنے سے انکار، دلیل ہی کی بنا پر کیا تھا اور فضیلت کے درجات کو اپنی دلیل کی بنیاد بنایا تھا۔ کوئی شخص شیطان کے اس باطل مسلک کی تائید کرنے کا بیڑا اٹھائے تو وہ روایت و درایت اور عقل و نقل کے ہیر پھیر سے کچھ ایسی باتیں کہہ سکتا ہے جو بظاہر معقول نظر آئیں گی! اور اس موضوع پر سیکڑوں صفحوں کی کتاب مرتب کر کے دنیا کے سامنے پیش کر سکتا ہے۔ لفظ و معنی کی تاویلات میں بڑی پیچیدگیاں، نزاکتیں اور ظاہر فریبیاں پائی جاتی ہیں، زبان کی تیزی و طراری اور قلم کی شوخی کذب و افترا اور ضلالت کو کسی نہ کسی حد تک حسین بنا کر منظر عام پر لا سکتی ہے! نمرود نے اپنی خدائی کے ثبوت کے لئے عقلی دلیل ہی کو بنیاد بنایا تھا اور وہ دلیل ظاہری طور پر فریب آمیز تھی! حضرت ابراہیمؑ نے اس کے جواب میں، استدلال کا رُخ ہی بدل دیا اور اللہ کے سچے رسول کی دلیل سُن کر کفر حیران رہ گیا!

"القول المبین" میں ابوالعطاء جالندھری نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے مشہور رسالہ "ختم نبوت" کا جواب دیا ہے اور فریب آمیز تاویلات کا انبار لگا دیا ہے! مولانا مودودی نے اس مسئلہ میں اُسی عقیدہ کو بیان کیا ہے جس عقیدہ پر امت مسلمہ کا اجماع رہا ہے، جھوٹی نبوت کے خلاف مولانا مودودی کا یہ رسالہ "قول فیصل" کی حیثیت رکھتا ہے! مولانا موصوف سو فیصدی حق پر ہیں اس لئے اُن کی حق بات کی تردید کے لئے مصنف کو "کذب و باطل" کی ترجمانی کا پورا حق ادا کرنا پڑا ہے، روزنامہ "الفضل" کا ایڈیٹر اس دفتر خرافات اور نامہ سیاہ کو "انسائیکلوپیڈیا اور "حرف آخر" کہہ دے تو یہ دراصل اس کتاب کی ضلالت کا مستند سارٹیفکیٹ ہے!

دوسری کتاب کا نام ہے "نبیوں کا چاند" (مولفہ فضل الرحمٰن نعیم) اس میں مرزا غلام احمد کے بیٹے اور جانشین مرزا بشیر احمد کی زندگی کے حالات بیان کئے گئے ہیں، مرزا کے نام کے ساتھ "حضرت" اور "علیہ السلام" اور بشیر احمد کے نام کے ساتھ "رضی اللہ عنہ" پڑھ کر جو دلی کوفت اور روحانی اذیت ہوتی ہے اس کا اظہار لفظوں میں نہیں ہو سکتا! باپ بھی گمراہ اور بیٹا بھی گمراہ، ان گمراہوں کی زندگی کیا، اور سیرت کیا؟ اہل ایمان کو ان کی زندگیاں برا نمونہ ہیں، جن کی پرچھائیں سے بھی مسلمانوں کو دور رہنا چاہئے! مرزا غلام احمد ہو یا اس کے جانشین، یہ قادیانی اہل قلم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کو ان کی ذات سے منسوب کر کے اہل ایمان کو دھوکا دیتے ہیں (لعنۃ اللہ علی الکاذبین) حضورؐ ختمی مرتبت کی نبوت کے مقابلہ میں جھوٹی نبوت کا طلسم قائم کرنے کے بعد حضورؐ کی ذات گرامی سے عشق و محبت کا دعویٰ کتنا بڑا "فراڈ" ہے!

جواب میں

چوتھا رسالہ محمد اجمل شاہد (ایم اے) کا لکھا ہوا ہے جس کا عنوان اور سرنامہ ہے:—

"ماہر القادری صاحب مدیر ماہنامہ "فاران" کراچی

سے پانچ سوالات

اس کتابچہ میں مسلمانوں کو حسب عادت اور حسب مسلک دھوکا دینے کی پوری پوری کوشش کی گئی ہے کہ قادیانی جماعت "ختم نبوت" کے عقیدہ میں عام مسلمانوں جیسا عقیدہ رکھتی ہے! ــــــــ اگر قادیانیوں کا یہ "جھوٹ" سچ ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ پوری امت مسلمہ اس مسئلہ میں پاگل اور عقل و ہوش سے یکسر عاری ہو گئی ہے کہ قادیانیوں پر "نفی ختم نبوت" کی تہمت لگاتی ہے اور اپنے ہم عقیدہ لوگوں سے غلط الزام منسوب کرتی ہے! آخر کس کے موقف اور روش کو صحیح جانیں اور درست مانیں؟

حقیقت وہ نہیں ہے جسے قادیانی بیان کرتے ہیں، حقیقت واقعہ اور اصلیت یہ ہے کہ امت مسلمہ قادیانیوں کو اس بنیاد پر کافر مرتد اور اسلام سے خارج سمجھتی ہے کہ مرزا غلام احمد نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا اس دعوے کی بنا پر وہ مرتد و کافر ہو گیا، اس کی جھوٹی نبوت کو جو کوئی بھی درست مانتا ہے، یا نبی کاذب کو مسیح، مجدد، مہدی یا مسیح موعود مانتا ہے وہ بھی کافر ہے، اور جھوٹی نبوت اور خود ساختہ "مسیحیت موعود" کی تائید میں جو کچھ اب تک لکھا گیا ہے، وہ کفر و ارتداد اور کذب و افترا کا دفتر بے معنی ہے! اس صورت میں قادیانیوں کی یہ رٹ لگائے جانا کہ "ختم نبوت کا جو عقیدہ تمام مسلمانوں کا ہے، وہی ہمارا عقیدہ ہے" کتنی بے حیائی کی بات اور کس قدر شرمناک جھوٹ ہے۔

قادیانی "خاتم النبیین" کے جو مفہوم و معنیٰ اپنے ذہن و خیال میں رکھتے ہیں اور اس لفظ کی جس طرح کی پُرفریب تاویل کرتے ہیں، اُسے امت مسلمہ نے رد کر دیا، قبول نہیں کیا، اور اس باب میں امت مسلمہ کا فیصلہ ہی صحیح ہے، اُمّت مسلمہ کی ایمانی فراست اس دھوکے کا شکار نہ ہو سکی اُس نے قادیانیوں کی جھوٹی منطق کو اُسی طرح جانا اور سمجھا، جس طرح وہ واقع ہوئی ہے۔

اس کتابچہ کا پہلا سوال یہ ہے:ــ

(۱) کیا وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر زندہ ہونے کو از روئے قرآن و سنت ثابت کر سکتے ہیں، کیونکہ جب تک وہ حضرت مسیح کی حیات کو دلائل کے ساتھ ثابت نہ کر سکیں، تو یقیناً ان کا مادی جسم کے ساتھ نزول محض اُمید موہوم ہے، آج سے چند سال قبل قادری صاحب کے پیر و مرشد مولوی مودودی صاحب کو تحریری طور پر وفات و حیات مسیح علیہ السلام پر تبادلہ افکار کی دعوت دی گئی تھی، مگر آج تک وہ اس کے لئے تیار نہیں ہوئے، کیا قادری صاحب میں یہ ہمت ہے کہ اس علمی دعوت کو قبول فرمائیں!

اس سوال کے جواب میں عرض ہے کہ، قرآن کہتا ہے۔

وقولہم انا قتلنا المسیح عیسیٰ ابن مریم رسول اللّٰہ وما قتلوہ وما صلبوہ ولکن شبہ لہم ط وان الذین اختلفوا فیہ لفی شک منہ ط مالہم بہ من علم الا اتباع الظن وما قتلوہ یقیناً، بل رفعہ اللّٰہ الیہ، وکان اللّٰہ عزیزاً حکیما ○ وان من اھل الکتاب الا لیؤمنن بہ قبل موتہ، ویوم القیمۃ یکون علیہم شہیدا ○ (پارہ ششم۔ سورہ النساء، رکوع ۲۲)

(اور اُن کے اس کہنے پر کہ ہم نے قتل کیا مسیح عیسیٰ ابن مریم کو جو رسول تھا اللّٰہ کا، اور انہوں نے نہ اس کو قتل کیا اور نہ سولی پر چڑھایا، و لیکن وہی صورت بن گئی اُن کے آگے اور جو لوگ اس میں مختلف باتیں کرتے ہیں تو وہ لوگ اس جگہ اس شبہ میں پڑے ہوئے ہیں، کچھ نہیں اُن کو اس کی خبر، صرف اٹکل پر چل رہے ہیں اور اس کو قتل نہیں کیا، بیشک بلکہ اُس کو اُٹھا لیا اللّٰہ نے اپنی طرف، اور اللّٰہ ہے زبردست حکمت والا، اور جتنے فرقے ہیں اہل کتاب کے سو عیسیٰ پر یقین لائیں گے، اس کی موت سے پہلے اور قیامت کے دن ہوگا اُن پر گواہ)

علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللّٰہ نے ان آیتوں کی تفسیر یوں کی ہے:ــ

"اللّٰہ تعالیٰ اُن کے قول کی تکذیب فرماتا ہے کہ ہم یہودیوں نے نہ عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کیا، نہ سُولی پر چڑھایا، یہود جو

مختلف باتیں اس بارے میں کہتے ہیں، اپنی اپنی اٹکل سے کہتے ہیں اللہ نے انہیں شبہ میں ڈال دیا، خبر کسی کو بھی نہیں، اصلی بات یہ ہے اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اٹھا لیا، اور اللہ سب چیزوں پر قادر ہے اور اس کے ہر کام میں حکمت ہے، قصہ یہ ہوا کہ جب یہودیوں نے حضرت مسیح کے قتل کا عزم کیا تو پہلے ایک آدمی اُن کے گھر میں داخل ہوا، حق تعالیٰ نے اُن کو تو آسمان پر اٹھا لیا اور اس شخص کی صورت حضرت مسیح علیہ السلام کی صورت کے مشابہ کر دی، جب باقی لوگ گھر میں گھسے، تو اس کو مسیح سمجھ کر قتل کر دیا، پھر خیال آیا تو کہنے لگے کہ اس کا چہرہ تو مسیح کے چہرے کے مشابہ ہے اور باقی بدن ہمارے ساتھی کا معلوم ہوتا ہے کسی نے کہا یہ مقتول مسیح ہے اور ہمارا آدمی کہاں گیا اور یہ ہمارا آدمی ہے تو مسیح کہاں ہے؟ صرف اٹکل سے کسی نے کچھ کہا کسی نے کچھ کہا، علم کسی کو بھی نہیں، حق یہی ہے کہ حضرت عیسیٰ ہرگز مقتول نہیں ہوئے بلکہ آسمان پر اللہ نے اُٹھا لیا اور یہود کو شبہ میں ڈال دیا۔

"حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ موجود ہیں، آسمان پر جب دجال پیدا ہوگا، تب اس جہان میں تشریف لاکر اُسے قتل کریں گے اور یہود و نصاریٰ اُن پر ایمان لائیں گے۔ کہ بیشک عیسیٰ زندہ ہیں، مرے نہ تھے اور قیامت کے دن حضرت عیسیٰ علیہ السلام اُن کے حالات اور اعمال کو ظاہر کریں گے کہ یہود نے میری تکذیب کی اور نصاریٰ نے مجھے خدا کا بیٹا کہا۔"

حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی نے ان آیات کی جو تفسیر چند سطروں میں کی ہے تفسیر ابن کثیر میں وہ کئی صفحوں میں چھپی ہوئی ہے، علامہ عثمانی نے اس سند میں مستند تفاسیر کا خلاصہ اور لب لباب پیش کر دیا ہے اور ان تفاسیر کی اساس در اصل احادیث اور آثار صحابہ ہیں! میں نے اپنے کسی مضمون میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر زندہ ہونے کی بحث ہی کو نہیں چھیڑا، اس لئے مجھ سے اس کے ثبوت کا مطالبہ کرنا ہی درست نہیں ہے۔

مگر

علماء کرام اور مفسرین عظام نے اس مسئلہ کو اپنی کتابوں میں تحقیق کے ساتھ لکھا ہے اُسے ہر کوئی دیکھ سکتا ہے، اب رہا قادیانیوں سے ہر قسم کے مسائل پر مناظرہ تو اس کے لئے اہل ایمان ہر وقت تیار ہیں! مگر نہ جانے کتنے مقامات پر قادیانی مناظروں میں شکست کھا چکے ہیں، اس شکست کے بعد بھی وہ بہ سلسلہ کفر و استمداد پر جمے رہے، اُن کا حال عیب تیوں اور آریاؤں جیسا ہے، جنہوں نے مسلمانوں سے ہر مناظرہ میں شکست کھا کر دوبارہ مناظرے کے لئے چیلنج دیا ہے! اور اپنی ہار کو جیت ہی بتاتے رہے ہیں! قادیانیوں میں اگر ذرہ برابر حق پسندی کا مادہ ہوتا اور اُن کے دلوں پر مہر نہ لگی ہوتی اور اُن کی آنکھوں پر جہالت و بے خبری کے پردے نہ پڑے ہوتے تو پروفیسر محمد الیاس برنی مرحوم کی تالیف "قادیانی مذہب" کے مطالعہ سے اُن کو ہدایت مل سکتی تھی، اس کتاب میں خود مرزا غلام احمد اپنے ہی اقوال سے ایک عامی اور سطحی آدمی اور پرلے درجہ کا یاوہ گو اور لپاڑیہ ثابت ہوتا ہے۔

تفسیر ابن کثیر میں حضرت عبداللہ ابن عباس کی ایک روایت (سعید بن منصور نسائی ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ کے حوالہ کے ساتھ) درج ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے:-

"جس وقت اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کو آسمان پر اُٹھانے کا ارادہ فرمایا تو ایک شخص کو حضرت عیسیٰ کے مشابہ بنا دیا، یہود نے اس کو حضرت عیسیٰ سمجھ کر قتل کر دیا ——— اور حق تعالیٰ نے:-

رفع عیسیٰ من روزنۃ فی البیت الی السماء

(حضرت عیسیٰ کو مکان کی روشن دان سے آسمان کی طرف اُٹھا لیا)

اس روایت کے سب راوی علیٰ شرط البخاری ہیں اور یہ روایت حدیث کی متعدد کتابوں میں موجود ہے۔

امام قرطبی نے بھی حضرت عبداللہ ابن عباس کے قول کے مطابق یہی کہا ہے کہ حق تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کو موت اور نیند کے بغیر زندہ آسمان پر اٹھا لیا ـــــ حضرت امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے بھی مرسلاً یہی روایت آئی ہے، حضور نے ارشاد فرمایا کہ حضرت عیسیٰ ابھی نہیں مرے اور قیامت کے قریب ضرور لوٹ کر آئیں گے۔

رہی حضرت ابن عباس کی وہ روایت جس میں "توفی" کی تفسیر "موت" سے کی گئی ہے' نہایت ضعیف روایت ہے اگر اس روایت کو درست تسلیم کر لیا جائے تو اس کی تفسیر یوں ہو گی ـــــ

الی ممیتک بعد النزول

یعنی اس وقت تو آسمان پر (زندہ) اٹھا لوں گا اور پھر قیامت کے قریب نازل کروں گا اور پھر تجھ کو وفات دوں گا۔ چنانچہ معالم التنزیل میں یہی توجیہہ کی گئی ہے ـــ

والاخر ما قال ضحاک ان فی الآیہ تقدیما و تاخیراً والمعنیٰ الی متوفیک بعد انزالک من السماء

ضحاک کہتے ہیں کہ آیت میں تقدیم و تاخیر ہے اور مراد یہ ہے کہ آسمان سے نازل کرنے کے بعد وفات دوں گا۔

"رفع" اور "توفی" کی تفسیر میں راسخون فی العلم کی اکثریت کا یہی قول ہے کہ حضرت عیسیٰ جسم و روح کے ساتھ آسمان پر اٹھا لئے گئے اور قیامت کے قریب وہ دوبارہ دنیا میں آئیں گے! "مسیح موعود" کوئی دوسرا شخص نہیں ہو گا یہی عیسیٰ ابن مریم (علیہ السلام) ہوں گے! حدیث میں یہ نہیں کہا گیا کہ "مسیح مثیل" کا دنیا میں ظہور ہو گا۔ "مثیل" کا اضافہ قادیانیوں کی کارستانی ہے!

احادیث میں نزولِ مسیح کی جو علامتیں اور اس زمانہ کی' جو نزولِ مسیح کا زمانہ ہے' نشانیاں بیان کی گئی ہیں، مرزا غلام احمد کی ذات اور اس کے زمانہ پر ان علائم و آثار اور نشانیوں کا کسی عنوان انطباق نہیں ہوتا اسی لئے امت مسلمہ نے مرزا کی "مسیحیت موعود" کے دعوے کو رد کر دیا، ٹھکرا دیا بلکہ اس کے منہ پر مار دیا۔

بر سبیل تنزل ایک مفروضہ کے طور پر تھوڑی دیر کے لئے اس بات کو مان لیا جائے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام وفات پا گئے اور اب جو مسیح دنیا میں آئے گا وہ عیسیٰ ابن مریم نہیں بلکہ کوئی دوسرا شخص ان سے ملتا جلتا (مثیل مسیح) ہو گا ـــــ اس مفروضہ کے بعد بھی مرزا غلام احمد قادیانی کی جو زندگی ہمارے سامنے آتی ہے' وہ مسیح کے مثیل کی زندگی ہرگز ہرگز نہیں ہے! حضرت مسیح کے خصائص و فضائل سے مرزا کو دور کا بھی واسطہ نہیں!

ع چہ نسبت خاک را با عالم پاک

مرزا غلام احمد کسی جہت سے بھی حضرت مسیح سے کوئی مناسبت، مشابہت اور مماثلت نہیں رکھتا۔

سوال ۲ :- کیا وجہ ہے کہ بنی اسرائیل کا ایک مستقل نبی جسے قرآن میں واضح طور پر رسولاً الیٰ بنی اسرائیل کہا گیا ہے، اس کے راستہ میں آیت خاتم النبیین روک نہیں بنتی۔ لیکن سیدنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک خادم اور غلام آپ کے ہی زندہ روحانی فیضان سے ایک مقام حاصل کر لے' تو یہ آیت اس کے راستہ میں روک ہے۔

جواب :- بنی اسرائیل کا نبی دنیا میں آیا اور دنیا سے چلا گیا وہ دوبارہ دنیا میں "جدید نبی" کی حیثیت سے نہیں آئے گا اس لئے اس کا نزول آیتِ خاتم النبیین کی عایت اور مفہوم کو مجروح نہیں کرتا اور نہ یہ آیت اس کی راہ میں روک بنتی ہے' پھر وہ نبی شریعت محمدی کے مطابق عمل کریگا

(باقی)

مرزا غلام احمد (علیہ ما علیہ) نے "نئے نبی" کی حیثیت سے دعویٰ کیا ہے، اس لئے اس کی نبوت کا دعویٰ ختم نبوت کے عین منافی ہے ؛ حضرت عیسیٰ ابن مریم "صاحب امر و نہی" بن کر نہیں آئیں گے ، لیکن مرزا کی نبوت میں "امر و نہی" کی خصوصیت کا دعویٰ بھی پایا جاتا ہے۔ اس صورت میں اس کی جھوٹی نبوت "خاتم النبیین" کے مقابلہ میں حریف نبوت کا اعلان ہے، چاہے وہ زبان سے یہی کہے جاتے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ادنیٰ غلام اور نیاز مند ہوں ۔

سوال ۳ :- آپ نے لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس لئے امت محمدیہ میں آسکتے ہیں، وہ "نئے" نبی نہیں ہیں، یہ نئے نبی کی تخصیص قرآن پاک کی کس آیت کی روشنی میں کی گئی ہے ؛ کیونکہ اگر خاتم النبیین کے معنی یہ ہیں کہ آپ ہر قسم کے نبیوں کو ختم کرنے والے ہیں اور آپ آخری نبی ہیں تو لازمی طور پر ماننا پڑے گا کہ آپ کے بعد نہ کوئی نبی آسکتا ہے اور نہ ہی پرانا نبی ؟

جواب :- میں نہیں کہتا بلکہ کتاب و سنت سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دنیا میں دوبارہ نزول فرمائیں گے ؛ درحقیقت علمی کا یہ فیصلہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کیونکہ "جدید نبی" نہیں ہیں، اس لئے آپ کے نزول سے "ختم نبوت" کی نفی نہیں ہوتی ، مفسرین نے اسی انداز پر مسئلہ کی تشریح کی ہے ۔

ایک مثال ــــــ

ایک بادشاہ کی سلطنت میں کوئی فرد رعایا اس کا دعویٰ کرے کہ میں بروزی بادشاہ اور ظلی فرماں روا ہوں اور بادشاہت کے تمام لوازم وہ بروزی بادشاہ اپنے سے منسوب کرے ، مگر زبان سے یہی کہے جائے کہ میں تو بادشاہ سلامت کا ادنیٰ غلام ہوں اور حضور جلالت الملک کے فیض ہی سے مجھے یہ مرتبہ ملا ہے ــــــ تو ایسے بروزی بادشاہ کو ہرگز برداشت نہیں کیا جائے گا اور ایسے مدعیٔ بادشاہت کے ساتھ اصلی اور حقیقی بادشاہ کے حریف اور مد مقابل کی حیثیت سے سخت سے سخت سلوک کیا جائے گا ــــــ مگر فرض کیجئے اس ملک کا ایک بادشاہ جو فوت ہو چکا ہے، زندہ ہو کر آ جائے اور وہ ایک فرد رعایا کی حیثیت سے ملک کی اصلاح کا کام انجام دے اور ملک کے مقاصد کو زندہ اور تقویت پہنچائے تو اس "قدیم بادشاہ" کے ظہور سے دور حاضر و موجود بادشاہت ہرگز متاثر نہیں ہوگی ۔ اور خود بادشاہ اور اس کی رعایا اس "قدیم بادشاہ" کو موجود بادشاہ کا حریف یا مد مقابل نہیں سمجھے گی ۔

سوال ۴ :- آپ ان بزرگان امت محمدیہ کے متعلق کیا فتویٰ دیں گے، جنہوں نے خاتم النبیین اور لانبی بعدی سے مراد یہ لی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی ایسا نبی نہیں آئے گا جو نئی شریعت لائے اور امت محمدیہ سے نہ ہو، مثلاً فقہ حنفیہ کے جلیل القدر بزرگ حضرت امام ملا علی القاری نے اپنی کتاب "موضوعات کبیر" میں خاتم النبیین کے یہی معنیٰ بیان فرمائے ہیں کہ آپ کے بعد کوئی ایسا نبی نہیں آسکتا جو آپ کی ملت کو منسوخ کرے اور آپ کی امت سے نہ ہو اور اسی طرح آپ نے لانبی بعدی کے متعلق فرمایا ہے کہ اس کے معنیٰ علماء کے نزدیک یہ ہیں کہ آپ کے بعد ایسا نبی کوئی نہیں آئے گا جو آپ کی شریعت کو منسوخ کرے اور یہی معنیٰ دیگر ائمہ نے بھی کئے ہیں جن میں شیخ اکبر حضرت محی الدین عربی ، حضرت امام عبدالوہاب شعرانی ، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور مولانا محمد قاسم نانوتوی مشہور ہیں ۔

جواب :- ان بزرگوں کے اقوال اگر بلا کم و کاست درج کر دئے جاتے تو اس پر گفتگو کی جا سکتی تھی ، سچی بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی "نیا نبی" نہیں آئے گا ، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دنیا میں جب دوبارہ نزول ہوگا ، تو وہ کوئی نئی شریعت نہیں لائیں گے ، آپ شریعت محمدیہ کے مطابق عمل کریں گے ، جس طرح امت محمدیہ کے دوسرے افراد شریعت محمدیہ پر عمل کرتے ہیں ۔

"مجددین نبیوں جیسے کام انجام دیں گے" ــــــ "ولایت پر نبوت کا فیضان ہوتا ہے" ــــــ "دین کی تجدید اب صلحاء اور مجددین کے ذریعہ ہوگی ، گویا کہ وہ اپنے وقت کے نبی ہوں گے" ــــــ اس قسم کے الفاظ سے مراد صرف مجددیت اور ولایت کے شرف کا اظہار ہے ؛ صوفیاء کے ان اقوال کو سند و حجت بنا کر کوئی شخص نبوت کے تمام لوازم کے ساتھ "مجددی نبی" ہونے کا دعویٰ کرے،

احساس کے دعوے کی بنیاد پر ایک جداگانہ امت اور جدید نبوت کا باقاعدہ انسٹی ٹیوشن وجود میں آجائے تو یہ کفر و ارتداد ہے، خدا و رسول سے بغاوت ہے، کھلی ہوئی ضلالت ہے! ان تہذگانہ دین کے زمانہ میں مرزا غلام احمد کی طرح کوئی مدعی نبوت پیدا ہوتا تو یہ بزرگ مدعی نبوت کی اُسی طرح تکفیر کرتے، جس طرح غلام احمد کے زمانہ کے علماء، صلحا اور صوفیاء نے اس کی تکفیر کی ہے اور تمام اُمّت کا اس پر اجماع ہے۔

سوال ۵ :۔ ماہر القادری صاحب ــــــ حضرت بانی جماعت احمدیہ کے کتب و اشتہارات میں سے کوئی ایسا حوالہ پیش کریں، جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے سے انکار کیا گیا ہو یا لکھا ہو کہ ہم آپ کو خاتم النبیین نہیں مانتے، مگر ماہر القادری ہرگز کوئی ایسا حوالہ پیش نہیں کریں گے، اور ان کے عجز سے یہ ثابت ہو جائے گا کہ انہوں نے جماعت احمدیہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین کے منکر ہونے کا الزام محض اپنے پیر و مرشد مولوی مودودی صاحب کے اس سلسلہ نظریہ کے ماتحت لگایا ہے کہ ــ

"جھوٹ کا استعمال بعض اوقات شرعاً واجب ہو جاتا ہے"

جواب :۔ میں نے اپنے تمام مضامین میں جو قادیانیت کے رد میں لکھے ہیں، مولانا سید ابوالاعلیٰ کی کسی تحریر کا کوئی حوالہ نہیں دیا اور نہ مودودی صاحب کا کہیں نام تک آیا پھر اس بحث میں مولانا مودودی پر طعن و طنز کی آخر کیا تک تھی! قادیانیت کی تکفیر و ارتداد امت مسلمہ کا متفقہ طور پر عقیدہ ہے وہی عقیدہ مولانا مودودی کا ہے! مولانا موصوف نے مرزا غلام احمد سے کوئی ایسی بات منسوب نہیں کی ! جسے "جھوٹ" کہا جا سکے! مرزا غلام احمد کی گمراہ امت مولانا مودودی سے اس لئے خفا ہے کہ اپنے رسالہ "قادیانی مسئلہ" میں انہوں نے قادیانیت کو پوری طرح بے نقاب و عریاں کر دیا ہے، اس غضب و غصہ کی آگ میں قادیانی دنیا میں بھی جلتے رہیں گے اور آخرت میں بھی جہنم کے شعلے ان کی پذیرائی اور تواضع کرتے رہیں گے! اب رہا جھوٹ کا بعض اوقات شرعاً واجب ہونا، تو وہ ایک فقہی مسئلہ ہے۔ مثلاً۔

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ جاری ہے، پاکستانی فوج کا ایک دستہ پہاڑ کے کسی ٹیلہ کے پیچھے چھپا ہوا ہے، پاک ہند کی سرحد پر پاکستانی فوج کا کوئی سپاہی جسے اپنے لشکر کی کمین گاہ کا علم ہے، ہندوستانی فوج کے ہاتھ آ جاتا ہے، ہندوستانی فوج اس سے پاکستانی لشکر کے بارے میں پوچھ گچھ کرتی ہے۔ اس صورت میں اُس پاکستانی سپاہی پر کیا واجب ہے، سچ بولنا یا جھوٹ بولنا! اسی ایک مثال سے مولانا مودودی کے قول کی شرعی حیثیت سمجھ میں آ سکتی ہے! بہتان طرازی تو یہ قادیانی ہیں کہ شریعت کے صحیح مسئلہ کو طنز و تعریض کے اس انداز میں پیش کیا ہے کہ لوگ اس دھوکے میں پڑ جائیں کہ مولانا مودودی جیسے "جھوٹ بولنے" کو مسئلہ جانتے ہیں!

راقم الحروف نے اپنی کسی تحریر میں مرزا غلام احمد یا کسی دوسرے قادیانی لیڈر کا کوئی ایسا قول پیش نہیں کیا جس میں یہ لکھا ہو کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین نہ تھے، یا ختم نبوت کا عقیدہ غلط ہے" ــــــ اس قسم کے الفاظ بیشک قادیانی لٹریچر میں نہیں ملتے! مگر میں نے جو بات بہ تکرار کہی ہے، اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ قادیانی اور اُن کا پیشوا، قلم و زبان سے تو یہی کہے جاتے ہیں کہ رسول اللہ خاتم النبیین تھے، مگر جو اُن کا عمل ہے اُس عمل سے "ختم نبوت" کی پوری طرح نفی ہوتی ہے، بلکہ مرزا غلام احمد قادیانی کی ذات، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حریف اور مدمقابل قرار پاتی ہے!

مرزا غلام احمد نے اتباع رسول اور خاتم النبیین کے عقیدہ کو آڑ بنا کر اپنی "نبوت" کا اعلان کیا ہے، جس سے بلاشبہ "ختم نبوت" کی نفی ہوتی ہے، وہ کہتا ہے ــــ

"میرا منکر کافر ہے" ــــــ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۶۳)

کسی صحابی، مجدد اور ولی کا انکار کفر نہیں ہے، مگر "نبی" کا انکار ہے، اس صورت میں مرزا غلام احمد کیا اپنے "نبی" ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا

، جس کے انکار سے کفر لازم آتا ہے ۔ اس دعوے کے بعد "ختم نبوت" کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے ۔ پھر مرزا کے اس دعوے کی بنا پر تمام غیر قادیانی جو اس کی نبوت کے منکر ہیں کافر قرار پاتے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا اقرار ان بے چاروں کے کچھ کام نہیں آتا ـــــ

"میری امت کے دو حصے ہوں گے ، ایک وہ جو مسیحیت کا رنگ اختیار کریں گے اور تباہ ہو جائیں گے دوسرے وہ جو مہدویت کا رنگ اختیار کریں گے" . . . . (ارشاد مرزا غلام احمد قادیانی مندرجہ اخبار الفضل ۲۶ جنوری ۱۹۱۶ء)

"امت" کس کی ہوتی ہے "نبی" کی ! مرزائے قادیان کا "میری امت" کہنا ، کیا اپنی مستقل نبوت کا دعویٰ نہیں ہے ! اور مرزا کی امت ـــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے مقابلہ میں کیا حریف اور مقابل نہیں قرار پاتی ؟

"آج سے انسانی جہاد جو تلوار سے کیا جاتا تھا ، خدا کے حکم کے ساتھ بند کیا گیا . . . . ـــ"

اب چھوڑ دو جہاد کا اے دوستو! خیال ــ دیں کے لئے حرام ہے اب جنگ اور قتال

دشمن ہے وہ خدا کا جو کرتا ہے اب جہاد ــ منکر نبی کا ہے جو یہ رکھتا ہے اعتقاد

(اعلان مرزا غلام احمد قادیانی ، مندرجہ تبلیغ رسالت جلد نہم)

فریضۂ جہاد کو جو منصوص ہے ، مستقل بالذات نبی ہی منسوخ کر سکتا ہے ، اس موقف کے بعد مرزا کا یہ کہے جانا کہ میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا غلام اور تابع ہوں ، کس قدر غلط اور جھوٹ بات ہے ! کیا حضور کی نبوت کے مقابلہ میں یہ مستقل جدید نبوت کا اعلان نہیں ہے ! جس شخص پر اس قسم کی "وحی" آتی ہو ، جو دین کے منصوص رکن کی تنسیخ کا اعلان کر دے ، وہ شخص "مستقل نبی" نہیں ہے تو اور کیا ہے ؟

ـــــــــ اور سنئے ـــــــــ

"سچا خدا وہی ہے جس نے قادیان میں اپنا رسول بھیجا" (دافع البلاء ، صفحہ ۱۱)

ـــــــــ اور ـــــــــ

"میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں ان الہامات پر اسی طرح ایمان لاتا ہوں جیسا کہ قرآن شریف پر اور خدا کی دوسری کتابوں پر اور جس طرح میں قرآن کریم کو یقینی اور قطعی طور پر خدا کا کلام جانتا ہوں اسی طرح اس کلام کو بھی جو میرے پر نازل ہوتا ہے" (حقیقۃ الوحی صفحہ ۲۱۱)

اس اعلان کے بعد "خاتم النبیین" کے عقیدہ کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے !

"ظاہر ہے کہ اگرچہ ایک ہی دفعہ وحی کا نزول فرض کیا جائے اور صرف ایک ہی فقرہ حضرت جبریل لاویں اور چپ ہو جاویں یہ امر بھی ختم نبوت کے منافی ہے" (ازالہ اوہام ص۵۷۷ مرزا غلام احمد قادیانی)

مرزا کی اس عبارت کے بعد ، اس کی تحریروں کے وہ اقتباس پڑھو جو اوپر دیئے گئے ہیں ، جن میں اس نے وحی کا اور ایسے الہام کا دعویٰ کیا ہے ، جو بالکل قرآن کی طرح ہے ! یہ اعلان خود اسی کی تحریر کے مطابق ، کیا "ختم نبوت" کے منافی نہیں ہے ۔

مرزا غلام احمد قادیانی کا عام مسلمانوں کی طرح یہ عقیدہ تھا ـــ

"میں جناب خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت کا قائل ہوں اور جو شخص ختم نبوت کا منکر ہو اس کو بے دین اور دائرہ اسلام سے خارج سمجھتا ہوں" (مرزا غلام احمد کا تحریری بیان مندرجہ تبلیغ رسالت جلد دوم ص۴۴)

ـــــــــ مگر ـــــــــ

پھر وہ اس قسم کے دعوے کر کے کہ ۔۔

"میں کوئی نیا نبی نہیں ہوں، پہلے بھی کئی ہو گزرے ہیں جنہیں تم لوگ سچا نبی مانتے ہو"

—— اور ——

"میرا منکر کافر ہے"

اپنے ہی قول و عقیدہ کے مطابق دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے ۔

سہ جادو وہ جو سر پہ چڑھ کر بولے

کا ذبوں اور افترا پردازوں کی رسوائی کے سامان اس دنیا میں بھی ہو جاتے ہیں ۔

مرزا غلام احمد قادیانی نے بعد ازاں افضل نبی کے بعد اپنی مستقل نبوت کا اعلان کیا انبیاء کرام کی نبوت کے مانند! یعنی ایسی نبوت جس میں امر و نہی بھی پایا جاتا ہے، مرزا نے (بزعم خود) اللہ کے حکم سے فریضۂ جہاد کو حرام قرار دیا —— قرآن کریم میں جو آیتیں حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی شان میں نازل ہوئی ہیں، ان کا مصداق مرزا غلام احمد نے اپنی ذات کو ٹھیرایا —— اپنے ماننے والوں کو "میری امت" کہا —— تمام انبیاء پر اپنی ذات کو ترجیح دی، یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں اپنی فضیلت کا اظہار کیا —— اور پھر یہ ضلالت اس پستی تک پہنچ گئی ۔

"میں نے خواب میں دیکھا کہ میں ہو بہو اللہ ہو گیا ہوں، اور میں نے یقین کر لیا کہ میں اللہ ہی ہوں اور پھر میں نے زمین و آسمان کو پیدا کیا" (آئینہ کمالات اسلام)

مرزا غلام احمد قادیانی کی نبوت کا باقاعدہ الگ پوزیشن قائم ہے، مرزا کو نبی نہ ماننے کے سبب قادیانی تمام غیر قادیانی مسلمانوں کو کافر سمجھتے ہیں اسی عقیدہ کی بنا پر سر ظفر اللہ خاں نے قائد اعظم کے جنازے کی نماز نہیں پڑھی! ان واقعات و شواہد کی موجودگی میں مسلمانوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کرنا اور "ختم نبوت" اور "خاتم النبیین" کے لفظوں کو دہرائے جانا کتنا بڑا دھوکا ہے !

مرزا کے قادیوں کی "جھوٹی نبوت" کا تانا بانا جھوٹی تاویلات ہیں، یہ پورا کارخانہ دجل و فریب کے سہارے قائم ہے! قرآن کریم کی آیتوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں میں مرزا نے کس بے حیائی کے ساتھ تحریف کی ہے! تضاد بیانی، جھوٹی تاویلات، آیات و احادیث کے مفہوم و معنی میں تحریف اور بے سروپا دعوے، یہ کردار کسی شریف آدمی کا نہیں ہو سکتا! مرزا غلام احمد کو مجدد، مسیح موعود اور نبی ماننا تو ایک طرف رہا جو کوئی اس سیرت و کردار کے آدمی کو شریف آدمی تسلیم کرتا ہے وہ خود رذیل اور کمینہ ہے —— اور یہ بات ہم اس بنیاد پر کہہ رہے ہیں کہ مرزا غلام احمد نے انبیاء کرام کی تنقیص کی ہے، حضرت مسیح ابن مریم علیہ السلام کے بارے میں وہ لکھتا ہے ۔

"خدا نے اس امت میں مسیح موعود کو بھیجا، جو اس پہلے مسیح سے اپنی تمام شان میں بڑھ کر ہے، مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اگر مسیح ابن مریم میرے زمانے میں ہوتا تو وہ کام جو میں کر سکتا ہوں وہ ہرگز نہیں کر سکتا اور وہ نشان جو مجھ سے ظاہر ہو رہے ہیں ہرگز نہ دکھلا سکتا۔ (حقیقۃ الوحی ص ۱۴۸)

اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے نبی کے مقابلہ میں اپنی فضیلت کے اعلان کے بعد گستاخی اس حد تک پہنچ جاتی ہے ۔

"آپ کا (یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا) خاندان بھی نہایت پاک اور مطہر ہے، تین دادیاں اور نانیاں آپ کی زنا کار اور کسبی عورتیں تھیں، جن کے خون سے آپ کا وجود ظہور پذیر ہوا" (حاشیہ ضمیمہ انجام آتھم)

جس شخص نے غیر قادیانی مسلمانوں کو "یزید پلید" سے تشبیہ دی ہو، علماء ملت کو ظالمین، اشرار، اوباش اور ناسک کہا ہو، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دادیوں اور نانیوں کو کسبی اور زنا کار بتایا ہو (معاذ اللہ) خود اس کی سفاہت اور ضلالت میں کون شک کر سکتا ہے ۔

جس شخص کی یاوہ گوئی کا یہ عالم ہو ـــــ

"خدا تعالیٰ اس عاجز سے بہت قریب ہو جاتا ہے اور کسی قدر پردہ اپنے چہرہ روشن سے اتار دیتا ہے اور میں اپنے تئیں ایسا پاتا ہوں گویا مجھ سے کوئی مشتا کرتا ہے۔" (ضرورۃ الاسلام صفحہ ۴۴)

اُسے کس نام اور لقب سے یاد کیا جائے۔

قرآن، حدیث، مسیحیت، نبوت یہاں تک کہ احدیت و ربوبیت مرزائے قادیان کے غلط دعووں، تحریف، تاویل اور افترا پردازیوں سے محفوظ نہ رہ سکیں۔ حضرت امام حسین علیہ السلام سب کے نزدیک محبوب ہیں لہذا اُن کے مقابلہ میں بھی دعویٰ برتری کرنے سے یہ شخص کس طرح باز رہ سکتا تھا۔

کربلائیست سیر ہر آنم صد حسین است در گریبانم

"خلافت راشدہ" پر اس طرح ہاتھ صاف کیا:۔

"پرانی خلافت کا جھگڑا چھوڑو، اب نئی خلافت لو، ایک زندہ علی تم میں موجود ہے، اس کو چھوڑتے ہو اور مُردہ علی کی تلاش کرتے ہو" (اخبار الحکم ۵ جلد ۴، ۱۰ ازنومبر ۱۹۰۱ء)

غرض کہ

؎ ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں

ایک غیر ذمہ دار آسیب زدہ شخص ہے کہ جو منہ میں آتا ہے بکتا چلا جاتا ہے، نہ اُسے خدا کا خوف ہے اور نہ بندوں کی شرم ہے اُسے یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ میں نے پہلے کیا کہا تھا اور اب کیا کہہ رہا ہوں!

قادیانی لٹریچر کے ذریعہ مسلمانوں کو گمراہ کرنے اور اپنے دام تزویر میں پھانسنے کی کوشش کر رہے ہیں، اس لئے ہمارا دینی فریضہ تھا کہ اس فرقہ ضالہ کی اصلیت اہل ایمان پر ظاہر کر دیں! اگر ہم ایسا نہ کرتے تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اپنے اس سکوت اور غفلت پر سخت باز پرس بلکہ عقوبت کے مستحق ہوتے! غیرت نبوت اور حضور خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والسلام کی محبت کا یہی تقاضا ہے کہ جھوٹی نبوت کی سختی کے ساتھ تردید کی جائے! اور اس چھیڑ کا آغاز قادیانیوں کی طرف سے ہوا ہے کہ اپنے مسلک باطلہ کی تبلیغ و اشاعت کے لئے انہوں نے اپنی کتابیں ہمارے پاس بھیجی ہیں! یہ کتابیں کذب و افترا اور دجل و فریب کا دفتر بے معنیٰ ہیں۔ ان کتابوں سے جو عقائد ثابت ہوتے ہیں ان کی کھلی کھلی تردید کی تھی اور قادیانیوں کے مسلک کفر و ارتداد کو خاص و عام پر واضح کرنا ہمارا فرض تھا! اس فرض کو ادا کرتے ہوئے ہم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اُس نے باطل کی تردید اور حق کی تائید کی توفیق بخشی۔

محمد اکرم طاہر

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ

سلامی تہذیب و ثقافت نے عالمی ثقافتی ورثہ میں جو اضافہ کیا ہے وہ کسی صاحب نظر سے پوشیدہ نہیں۔ اگر ہم تہذیب انسانی میں "دین مبین" کے واقعی کردار کو مشخص کرنا چاہیں تو بلا شبہ ان نفوس قدسیہ کو اسلام کے ثقافتی پیکر کی حیثیت سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ جنہوں نے اپنی شخصیتوں میں، اسلامی اصولوں کو متشکل کر کے دکھا دیا۔ گویا اسلامی تہذیب کے مظاہر خدوخال کو ملاحظہ کرنے کے لئے ہمیں ان عظیم شخصیتوں کے سیرت و کردار کا مطالعہ کرنا ہوگا جو ہماری درخشاں و تاباں تاریخ کے امین ہیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ ہمارے ایک ایسے ہی معمار تہذیب ہیں بلکہ اسلام کے اجتماعی ذہن کی ایک ایسی تخلیقی پیشکش ہیں جن کے افعال و کردار اور اقوال و ارشادات سے اسلامی اصول اخلاق، اصول حکومت اور اصول معاشرت متعین کئے جا سکتے ہیں۔ چند جھلکیاں :۔

● ایک دفعہ مرکزی بیت المال میں مال غنیمت کے ساتھ کچھ مشک بھی آیا۔ آپ اس کے معائنہ کے لئے تشریف لے گئے اور ناک پر رومال چڑھا لیا، خدام نے تعجب سے اس کی وجہ پوچھی۔ آپؓ نے فرمایا کہ مشک کا انتفاع یہی تو ہے کہ اس کی مہک کو ناک سونگھتی ہے۔ اس لئے میں ایسے استعمال کو مسلمانوں کے اس مال میں خیانت سمجھتا ہوں جس کا مجھے محافظ بنایا گیا ہے۔ آپ کے اس طرز عمل میں اس حدیث قدسی کے آثار نظر آتے ہیں۔ کہ "تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک متقین کے بلند مقام پر فائز نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ ناجائز میں مبتلا ہونے کے خوف سے بہت سی جائز باتوں کو بھی نہ چھوڑ دے" (ابن ماجہ)

● جب سلیمان بن عبدالملک کی وصیت پر خلافت کے لئے آپ کا نام لیا گیا تو بے اختیار آپ نے انا للہ و انا الیہ راجعون پڑھا اور گریہ زاری کرتے ہوئے تشریف لائے، اہلیہ نے اس اضطراب کی وجہ پوچھی تو فرمایا "مشرق سے مغرب میں امت محمدیہ کا ایک شخص بھی ایسا نہیں جس کا حق میرے ذمہ نہ ہو کہ بغیر اس کے مطالبہ کئے اس کا حق دلانا میرا فرض نہ ہو" ایک موقعہ پر یہاں تک فرمایا کہ "اگر دریائے فرات کے کنارے ایک کتا پیاس سے مر جائے تو عمر کو اس کا بھی حساب دینا ہوگا" ان اقوال میں اس حدیث پاک کی معنوی جھلک ملتی ہے۔ جس میں حکام کے احساس ذمہ داری کو ابھارا گیا ہے "کوئی حاکم جو مسلمانوں کی حکومت کا کوئی منصب سنبھالے، پھر اس کی ذمہ داریاں ادا کرنے کے لئے جان نہ لڑائے اور خلوص کے ساتھ کام نہ کرے تو وہ مسلمانوں کے ساتھ جنت میں داخل نہ ہوگا"

(مسلم۔ کتاب الامارۃ)

● سعید بن سوید کا بیان ہے کہ خلیفہ وقت نماز پڑھانے کے لئے آئے۔ آپ کی قمیص میں جا بجا پیوند لگے ہوئے تھے یہ دیکھ کر ایک شخص نے کہا "اے امیرالمومنین! اللہ نے آپ کو سب کچھ دیا ہے۔ آپ لباس تیار کرا لیجئے" یہ سن کر آپ

کافی دیر تک سر نگوں بیٹھے رہے اور پھر سر اُٹھا کر فرمایا: "مالداری و تونگری کے وقت میانہ روی اور تنگدستی و قوت کے وقت معاف کر دینا زیادہ افضل ہے"۔ شاہانہ امارت کے اس عہدے پر فائز ہونے کے باوجود دینار و درہم سے آپ کا استغنا اُس حدیث کے انتہائی تاثر کا نتیجہ تھا کہ:۔
"میں جس بات سے تم پر اپنے بعد ڈرتا ہوں وہ دنیا کی سرسبزی و شادابی اور آسائش کے دروازوں کا تم پر کھل جانا ہے"۔

● خلیفہ ہونے پر آپ نے اُن اموال کی بازیافت کی طرف توجہ کی جو خلفاء بنی اُمیہ نے ناجائز طور پر غصب کر رکھے تھے یا حقداروں کو نہیں پہونچے تھے، اس ہمہ گیر تطہیر کا آغاز آپ نے پہلے اپنے گھر سے کیا کہ گئی ہزار سالانہ کی جائداد میں سے صرف چار سو دینار کی جائداد اپنے پاس رکھی جو جائز طور پر آپ کی ملکیت تھی آپ کی اطاعت شعار بیوی نے آپ ہی کی ایماء پر اپنے قیمتی زیورات وغیرہ بیت المال میں داخل کرا دئے۔ شام کے علاوہ دوسرے صوبوں کے گورنروں کے پاس آپ نے غصب شدہ مال کی واپسی کے لئے شاہی احکام جاری کئے، چنانچہ عراق میں اس کثرت سے مال واپس کیا گیا کہ صوبہ کی حکومت کا خزانہ خالی ہو گیا اور عمر بن عبد العزیزؒ کو وہاں کے اخراجات کے لئے دمشق سے بھیجنا پڑا۔ سب سے بڑی دقت باغ فدک کے معاملے میں پیش آئی جو اہل بیت کی اقتصادی کفالت کے لئے مخصوص تھا مگر مروان بن الحکم (خلیفہ بنو امیہ) نے اسے اپنے حق میں ناجائز طور پر محفوظ کر رکھا تھا یہ اصلاحی اور تطہیری اقدامات کتاب اللہ کے اس حکم کی پیروی کا نتیجہ تھے کہ ان اللہ یامرکم ان تؤدوا الامانات الی اھلھا واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل۔ (سورۃ نساء ۵) اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہل امانت کے سپرد کرو جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔"

● حجاج بن یوسف کے خلاف شریعت کاافعال میں اُس کا یہ فعل بھی شامل تھا کہ وہ بیت المال کی آمدنی بڑھانے کے لئے نومسلموں سے بھی جزیہ کا ٹیکس وصول کرتا تھا۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے حکم دیا کہ جو لوگ مسلمان ہو جائیں اُن کا جزیہ موقوف کر دیا جائے اس حکم پر اتنے آدمی مسلمان ہوئے کہ خزانہ کی آمدنی میں معتدبہ کمی واقع ہو گئی اور جب ایک عامل نے اس کمی کی شکایت کی تو آپ نے فرمایا "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہادی بنا کر بھیجے گئے تھے، محصل خراج بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے"۔ ایک اور عہدہ دار کو لکھا کہ مجھے اس سے بڑی خوشی ہوگی کہ سب غیر مسلم مسلمان ہو جائیں اور جزیہ کی آمدنی بند ہو جانے کی وجہ سے ہم تم دونوں کھیتی کر کے اور ہل چلا کر اپنا پیٹ بھریں" اس اقدام کے پس منظر میں یہ حدیث "مسلمان پر جزیہ عائد نہیں کیا جا سکتا"۔

ان چند شواہد کی روشنی میں بخوبی دیکھا جا سکتا ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ اسلامی احکام کی بجا آوری میں کتنے سرگرم و منہمک رہتے تھے۔ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ جب اموی امراء نے آپ کے ہاتھوں پے در پے اپنے طبقاتی مفادات فاسد ہوتے دیکھے اور آپ کو ان منصفانہ اور بے باک اقدامات کا مزا چکھانے کے لئے آپ کے غلام کو رشوت دے کر کھانے میں زہر ملا دینے پر آمادہ کر لیا تو اسلامی اصولوں پر آپ کے دوامی تعامل ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ بوقتِ نزع آپ کی زبان پر قرآن حکیم کی یہ آیت کریمہ جاری تھی: تلک الدار الاٰخرۃ نجعلھا للذین لا یریدون علوا فی الارض ولا فسادا۔ والعاقبۃ للمتقین[1]

---

[1]

سعودی مملکت میں اجتماعی ڈھانچے کو صحیح بنیادوں پر استوار کرنے کے لئے آپ نے جو جرأت مندانہ اقدامات کئے اس سے ایک بار پھر معلوم ہو گیا کہ ایک اسلامی حکومت سماجی اور معاشی ناہمواریوں کو دور کرنے کے لئے کیا کر سکتی ہے؟ ہر قسم کے شاہی امتیازات ختم کر دئے گئے، اہل سلطنت کو تجارت کرنے سے حکماً روک دیا گیا اور بیگار کو قانوناً ممنوع ٹھیرا دیا۔ آپ نے بیت المال سے نہ صرف مقروض کا قرض ادا کرنے کے لئے علیحدہ مدیں قائم فرمائیں بلکہ غیر شادی شدہ غریب افراد کی شادی کے لئے مالی امداد کی فراہمی کا حکم بھی دیا۔ معذور اور اپاہج افراد کے نام رجسٹر میں درج کئے گئے، جنہیں سرکاری خزانہ سے وظیفہ دیا جاتا تھا۔ حکام کو تحفے تحائف قبول کرنے کی سختی سے ممانعت کر دی اور اعلان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تحائف کی حیثیت ہدیہ کی تھی لیکن اب ہمارے لئے یہ رشوت میں شمار ہوں گے۔

اپنی پہلی تقریر میں لوگوں کو مخاطب کیا کہ میں اپنی جانب سے کسی معاملے میں کوئی فیصلہ کرنے والا نہیں ہوں بلکہ محض احکام الٰہی کو نافذ کرنے والا ہوں، میں تو ایک پیروی کرنے والا ہوں جو خود کوئی نئی بات شروع کرنے کا داعیہ نہیں رکھتا اور اگر مجھ میں ایسے آثار پائے جائیں تو جان لو کہ کسی فرد کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ خدا کی نافرمانی میں اس کی اطاعت کی جائے، میں تم میں سے بہتر آدمی بھی نہیں ہوں البتہ خدا نے مجھے تم سب کے مقابلہ میں زیادہ گرانبار کر دیا ہے۔

ایک عامل کو لکھا: مسلمانوں کی حقیقی برتری اُن کا خدا کی تقویٰ ہے، اگر ہم دشمن پر اپنی اخلاقی عظمت کی بنا پر غالب نہیں آ سکتے، تو مادی برتری کوئی ایسی ہتھیار بنیاد نہیں جو ہمارے لئے فتح و نصرت کی ضمانت ہو۔ نیز ـــــ دشمن کو اس بنا پر کمزور سمجھنا کہ اگرچہ ہم گنہگار ہیں لیکن ہمارا دشمن بدتر ہے، اس لئے اُن پر ہمارا حتمی غلبہ ایک مسلمہ امر ہے، انتہائی خطرناک ہے کیونکہ بہت سی قومیں ایسی ہیں جن پر اُن کے گناہوں کی پاداش میں اُن سے بدتر لوگوں کو مسلط کر دیا گیا۔

مرض الموت میں آپ کی توجہ اس بات کی طرف دلائی گئی کہ آپ نے اولاد کو ہمیشہ دنیاوی مال و دولت سے محروم رکھا ہے۔ مرنے سے پہلے اُن کے متعلق کچھ وصیت کر دیجئے۔ فرمایا میرا ولی صرف خدا ہے، میرے لڑکے اگر خدا سے ڈریں گے تو خدا اُن کے لئے کوئی صورت پیدا کر دے گا اور اگر وہ گنہگار ہوں گے تو میں اُن کو گناہ کرنے کے لئے قوی نہیں بناؤں گا۔

یہ ہیں اسلام کے مایہ ناز بطل جلیل ــــــ عمر بن عبدالعزیز ــ مسلمانوں کے پانچویں خلیفۂ راشد تقویٰ فرمایا تھا ... ـــــــــ آپ کے خلیفہ ہونے کے بعد بکریوں کے گلہ بان کہا کرتے تھے، ہم پر ایسا شخص حکومت کرتا ہے کہ بھیڑئیے بھی بکریوں کو نقصان پہنچانا بھول گئے، اور یہ کوئی شاعرانہ تعلّی نہیں ہے۔ موسیٰ ابن اعین کا بیان ہے کہ عمر بن عبدالعزیزؒ کے عہد خلافت میں جس مقام پر ہم بکریاں چرایا کرتے وہاں پر ہماری بکریاں اور بھیڑیا ایک ساتھ رہا کرتے تھے، ایک رات بھیڑیا میری بکری کو اٹھا لے گیا تو میں نے سوچا! شاید خلیفہ وفات پا گئے ہیں، چنانچہ دوسرے دن دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ اُس رات خلیفۂ صالح ــــ حضرت عمر ابن عبدالعزیز کا انتقال ہو چکا تھا۔

نیا ولز فلٹر ٹپ سگریٹ
WILLS
NAVY CUT
FILTER TIPPED
PAKISTAN TOBACCO COMPANY LIMITED, SUCCESSORS TO W.D. & H.O. WILLS, BRISTOL & LONDON

محمد حنیف اللہ پھلواری

مسلمانوں کا علمی شغف

پروفیسر محمد شفیع ایم اے سابق ناظم کتب خانہ سابق ریاست بھوپال کے الفاظ میں "مسلمانان سلف میں عام علمی ذوق کا اندازہ ان تاریخی
واقعات سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ بڑے بڑے اساتذہ کی مجالس املا میں چالیس بلکہ ستر ستر ہزار اساتذہ کبھی سوا لاکھ طلبا کا ہجوم ہوتا تھا۔ تیسری صدی کا ذکر ہے
مسلمانوں کو اقوال و اعمال جمع کرنے کے شوق کا یہ عالم تھا کہ ایک ایک مجلس میں دس دس ہزار دواتیں رکھی جاتی تھیں۔ علی ابن عاصم واسطی کے حلقۂ درس
میں تیس تیس ہزار آدمی جمع ہوتے تھے۔ خلیفہ متوکل نے حدیث کے درس کے لئے ابوبکر بن شیبہؒ کو جامع رصافہ میں اور ان کے بھائی عثمانؒ کو جامع منصوری میں مقرر
کیا ان کے درس میں روزانہ تیس تیس ہزار آدمی جمع ہوتے تھے۔ امام ابن تیمیم جوزیؒ کے درس میں ایک ایک لاکھ کا مجمع ہوتا تھا۔ ابو حامد الاسفرائینیؒ سات سات سو طالب
علموں کو ہر روز اصول فقہ کے کسی نہ کسی مسئلہ پر درس دیا کرتے تھے۔ ایک بار ابو مسلمؒ نے بغداد میں حدیث کا املا کیا۔ سات مستملی کھڑے ہوئے جو ایک دوسرے
کی روایت پہنچاتے تھے، جو لوگ کھڑے کھڑے حدیث لکھنے میں مصروف تھے انہیں شمار کیا گیا تو پتہ چلا کہ چالیس ہزار سے زیادہ دواتیں تھیں ـــــ فریابیؒ نے
بغداد میں املائے حدیث کیا تو حاضرین کی تعداد تقریباً تیس ہزار تھی، یزید بن ہارونؒ نے جب بغداد میں درس حدیث کی مجلس منعقد کی تو حاضرین مجلس کا
تخمینہ ستر ہزار لگایا گیا، ایک مرتبہ سلیمان ابن حرب بصریؒ نے املائے حدیث کی تو ان کی مجلس میں خلیفہ مامون الرشید اور تمام امرائے خلافت حاضر تھے،
جو لفظ امام ممدوح کی زبان سے نکلتا تھا اس کو خود خلیفہ اپنے قلم سے لکھتا جاتا تھا۔ جب کل حاضرین کی تعداد کا تخمینہ کیا گیا تو تقریباً چالیس ہزار نفوس
وہاں موجود تھے جب امام عاصمؒ ابن علی املائے حدیث کے واسطے بغداد سے باہر نخلستان میں ایک بلند چبوترے پر بیٹھتے تھے، معتصم باللہ نے ایک بار اپنا ایک
معتمد شرکائے مجلس کا اندازہ کرنے کے لئے بھیجا تو معتمد نے حاضرین کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار بتائی۔ حضرت امام بخاری جب تقریر کرتے تو اس مجمع میں
دس دس ہزار محدثین، فقہا، حفاظ اور اہل مناظرہ موجود ہوتے تھے۔ بغداد میں محدثین کی کثرت کا یہ عالم تھا کہ مسلم بن ابراہیم فرماتے ہیں کہ میں نے آٹھ سو
مشیوخ سے فن حدیث حاصل کیا۔ حالانکہ میں دجلہ کے پل سے اتر کر نہیں گیا۔ امام بخاری کے شاگرد فربریؒ سے نوے ہزار آدمیوں نے صحیح بخاری کی اجازت
حاصل کی۔ عوام میں تعلیم کا یہ عالم تھا کہ مشہور سیاح و مورخ ابن حوقل جب خوزستان کے شہروں سے گزرتا تھا تو وہ مزدوروں کے علمی بحث کرتے ہوئے
سنا وہ لکھتا ہے کہ "میں نے ایک حمال (مزدور) کو گزرتے ہوئے دیکھا کہ اس کے سر پر بھاری بوجھ لدا ہوا تھا اور دوسرا حمال بھی اس کے ساتھ تھا جو سات
اسماء و صفات الٰہی اور دینی قرآنی آیات کی تفسیر اور علم کلام کے حقائق و مسائل پر جھگڑتے جا رہے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان دونوں پر جو بوجھ لدے
ہوئے تھے، اپنے خیالات کے مقابلہ میں ان کو کوئی پرواہ نہیں تھی۔"

کتب بینی کا شوق۔

آخر زمانے میں عربوں کے ذوق و شوق علم اور علمی جوش کی کیفیت درحقیقت یہ ہے کہ اس وقت تمام عربی ممالک میں کتابوں کا شوق پہنچتے

جنون کے درجہ تک پہونچ گیا تھا ۔ دفان کرمرم ابن رشد کی کتب بینی کا یہ عالم تھا کہ اس کی صرف دو راتیں ایسی گذریں جن میں وہ مطالعہ نہ کرسکا ایک
شادی کی رات اور دوسری جس رات اس کے والد کا انتقال ہوا ۔ جاحظ مطالعہ میں مصروف تھا کہ کتابیں اس پر گر پڑیں اور سبب کر اس دنیا سے رخصت ہوا
فتح ابن خاقان تربیت الخلا میں بھی مطالعہ کیا کرتا تھا ۔ امام زہریؒ کے مطالعہ کا یہ عالم تھا کہ ان کی بیوی کہا کرتی کہ یہ کتابیں تین سوکنوں سے زیادہ بھاری ہیں

تصنیف وتالیف

تصنیف وتالیف کا سلسلہ اُس زمانے میں نہایت عام تھا متفرق علوم وفنون کی کتابیں بکثرت تصنیف وتالیف کی جاتی تھیں ۔ مسلمانوں نے علم و ادب، صرف ونحو، علم فصاحت، تفاسیر، احادیث، تاریخ، جغرافیہ، ریاضی، علم ہیئت، طب، کیمیا، صنعت وحرفت اور دوسرے علوم وفنون پر بے شمار کتابیں تصنیف کیں اور سوانح عمریاں اور سفرنامے حوالہ قلم کئے اور دنیا کو اپنے کلام اور قلم سے مالا مال کیا ۔ علم وفن کی ہر شاخ میں تصنیف وتالیف کا انبار لگا دیا ۔ اکثر علماء کی تصانیف سو سے تجاوز کر جاتی تھیں ۔ چنانچہ ابوبکر رازی نے ۲۲۱ کتابیں لکھیں ۔ حضرت امام شافعی کی تصنیفات کی تعداد ۳۴۰ تک پہونچی ہے ۔ زکریا رازی اور ابو عبیدہ ابن تیمیہ دو دو سو کتابوں کے مصنف تھے، کندی نے ۲۴۲ کتابیں لکھیں ۔ ابن شاہینؒ نے تین سو کتابیں تصنیف کیں ۔ (ان میں ایک ہزار جزو میں تفسیر کبیر تھی اور ایک ہزار پانچ سو جزو میں مسند تھی) جلال الدین سیوطیؒ، ابو محمد ابن حزمؒ اندلسی، شیخ محی الدینؒ ابن العربی، ابو محمد ابن ہانی، احمد بن عمر، محمد بن عیسیٰ البغدادی نے چار چار سو کتابیں لکھیں ۔ امام ابن تیمیہؒ نے پانچ سو کتابیں لکھیں ۔ امام بیہقیؒ، محمد بن ابجاعہ، ابن حبیب السلمیؒ قاضی یحییٰؒ، ابو مرواق، اور عبد الملک نے ہزار ہزار کتابیں لکھیں ۔ ابن خطیب قرطبی نے گیارہ سو کتابیں تصنیف کیں ۔ جمال الدینؒ حافظ کی تصانیف کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ان کی عمر کے دنوں کے حساب سے روزانہ نو تختے اوسط پڑتا ہے ۔ ابو موسیٰ جابر بن حیان نے مختلف علوم وفنون پر ۱۰۰۳ کتابیں لکھیں ۔ امام ابن قیم جوزی نے دو ہزار کتابیں لکھیں ۔ احمد بن عبد الدائم (استاد علامہ تیمیہ) نے مختلف علوم کے دو ہزار مجلدات لکھے ۔ ابن الاعرابی نے اتنا لکھا کہ کئی اونٹوں کے بوجھ کے برابر تھا ۔ کتابیں چھوٹی چھوٹی نہیں ہوتی تھیں بلکہ بلند پایہ ضخیم تصانیف ہوتی تھیں اکثر کتابیں متعدد جلدوں میں منقسم ہوتی تھیں ۔ امام جوزی کی کتاب "المنتظم" دس جلدوں میں ہے ابن حیان نے اندلس کی تاریخ دس جلدوں میں اور دوسری ساٹھ جلدوں میں لکھی ۔ تاریخ الامم گیارہ جلدوں میں، تاریخ ابن اثیر بارہ جلدوں میں، اغانی بیس جلدوں میں، جامع البیان تاویل القرآن پچیس جلدوں میں ۔ الحاوی تیس جلدوں میں ۔ قوت التاویل چالیس جلدوں میں، المظفری پچاس جلدوں میں، المتین اور النبانات ساٹھ ساٹھ جلدوں میں جامع البیان فی تفسیر القرآن، مجمع الفوائد، تاریخ دمشق اسی اسی جلدوں میں ۔ امام محمد نے ہدایات حضرت امام ابوحنیفہ کے قلم صاف کرکے اس قدر روشنائی جمع کرلی کہ اسی سے تفسیر کی ایک ضخیم کتاب لکھی ۔ ابو الفضل کے والد شیخ مبارک ناگوری نے اپنے ہاتھ سے پانچ سو ضخیم کتابیں لکھی تھیں
تصنیف وتالیف کے شوق کا یہ عالم تھا قید خانوں میں بھی علماء نے اپنا کام جاری رکھا ۔ چنانچہ مشہور حنفی فقیہہ امام سرخسیؒ (متوفی ۴۸۳ھ) کو حکمران وقت نے قید کر دیا تو قید ہی میں طلبہ کو درس دیتے اور املا کراتے رہے ۔ ڈاکٹر حمید اللہ حیدرآبادی نے ترکی کا ایک خط انقرہ سے اخبارات میں شائع ہوا تھا اس میں املا کی تفصیل لکھی تھی جو حسب ذیل ہے :۔
کتاب المبسوط تیس جلد (سات ہزار بڑی تقطیع کے صفحے) شرح السیر الکبیر چار جلد (ڈیڑھ ہزار صفحے) اصول الفقہ دو جلد (ایک ہزار صفحے)

سیر وسیاحت ۔ علماء کرام، صوفیائے عظام اور ماہرین علم وفن سیکھنے، اسلام کی اشاعت اور کتابوں کی جستجو میں ایک ملک سے دوسرے ملک میں جانا ضروری خیال کرتے تھے، تدوین احادیث کا جوش اس قدر غالب تھا کہ ایک ایک حدیث کو سننے اور تصدیق کرنے کی غرض سے علماء ہزاروں میل کا سفر کیا کرتے تھے، اُس زمانے میں سفر میں جو دشواریاں تھیں وہ پوشیدہ نہیں، لیکن علم کے حاصل کرنے کے ذوق وشوق میں وہ نہایت خندہ پیشانی سے جوق جوق دور دراز ممالک کے سفر کی تکلیف برداشت کرتے ۔ ایک انگریز مصنف لکھتا ہے کہ اسلام کی ذہنی قابلیت علمی روشنی کا

ایک ایسا زبردست مخزن تھی کہ اس سے تمام دنیا مستفید ہوگئی اور ہمارے پاس اس امر کی کافی شہادت موجود ہے کہ بہت سے مسلمان علماء نے علم کی تلاش میں ایک ایسے زمانہ کے اندر طویل سفر کی صعوبتیں برداشت کیں جبکہ سیاحت پُر خطر تھی ـــــ مسلمان تاجر بھی سیر و سیاحت کرتے، ان کے ذریعہ بھی بڑی حد تک اسلام کی اشاعت ہوئی۔ جرمنی مستشرق ڈاکٹر جوزیف ہیل لکھتا ہے کہ "علمائے دینیات اصحاب رسول کی اولاد سے حدیثوں کو حاصل کرنے کے لئے سلطنت کا ایک ایک گوشہ چھان مارتے تھے۔ علماء لسانیات بڑا خطرات کے درمیان وسط عرب کے بدوؤں سے قرآن اور قدیم شعراء کی زبان کا علم حاصل کرتے تھے۔ اسی طرح جس شخص کو جس شعبہ سے دلچسپی تھی وہ اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھتا تھا جب تک کہ وہ اس موضوع پر مشہور و معروف فضلاء اور ماہرین فن کے خطبات کو سن نہ لیتا اگرچہ وہ عالم اسلامی کے دوسرے گوشے ہی میں کیوں نہ بستے ہوں"

امام بخاریؒ نے چودہ برس کی عمر میں سیر و سیاحت شروع کی احادیث کی ترتیب کے سلسلے میں اٹھارہ برس صرف کئے اور خراسان، حجاز، مصر و شام و جزیرہ کا سفر کیا۔ دو مرتبہ شام، چار مرتبہ بصرہ، اور چھ مرتبہ حجاز گئے۔ امام مسلمؒ نے حجاز، شام، رے، یمن اور بغداد کا سفر کیا۔ امام ابی داؤدؒ خراسان، بصرہ، کوفہ، شام، مصر اور جزیرہ بلاد اسلامیہ کا زمانہ تک سفر کرتے رہے۔ امام دارمیؒ نے طلب حدیث میں حرمین، خراسان، عراق، شام اور مصر کا طویل سفر کیا۔ امام ابو حاتم رازیؒ نے تین ہزار فرسخ سے زیادہ مسافت پاپیادہ طے کی (ایک فرسخ تین میل کا ہوتا ہے) امام نسویؒ نے مثل بشّار کے نے اٹھائیس سال سفر میں گزارے۔ شیخ الاسلام بقیؒ بن مخلد نے دو سو اسی شیوخ سے حدیث روایت کی۔ جس شیخ کے پاس گئے پاپیادہ گئے۔ ابن حیونؒ محدث اندلس، عراق اور حجاز کے شیوخ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ابن المسفریؒ نے چار مرتبہ ممالک ایشیاء، افریقہ، اور اسپین کا سفر کیا۔ دس بار بیت المقدس گئے۔ صرف ایک نسخہ ردمن فضالہ کے حاصل کرنے کے لئے ستر منزل کا سفر کیا۔ امام خزیں شبل نے چالیس برس مختلف قبائل کی زبانوں کی تحقیقات کے لئے صحرائے عرب میں بسر کئے۔ ابن رومیہ (طبیب اندلس) نے نباتات کے حالات دریافت کرنے کے لئے مصر، شام و عراق کا سفر کیا۔ ضیاء الدین ابن بیطار نے نباتات کی تحقیقات کے لئے یونان اور اسپین کے ملکوں کا سفر کیا۔ محمد اسماعیل تنوخیؒ نے ہیئت و نجوم سیکھنے کے لئے ہندوستان کا سفر کیا اور برسوں یہاں قیام پذیر رہے۔ البیرونی نے بھی ہندوستان کا سفر کیا، یہاں رہ کر سنسکرت زبان سیکھی اور ہندوستان کے علوم و فنون کا برسوں مطالعہ کرکے "کتاب الہند" کے نام سے ایک بے نظیر تصنیف یادگار چھوڑی۔ المقدسی سیاح نے تقریباً تمام ممالک اسلامیہ کا سفر کیا اور اپنی مشہور کتاب "احسن التقاسیم فی الاقالیم" لکھی۔ یاقوت ابن عبداللہ الحموی نے ممالک اسلامیہ کا سفر کیا۔ اور معجم البلدان و معجم الادباء لکھی۔ حافظ الحدیث ابو العباس بلاذری نے جو مادرزاد نابینا تھے، بلخ، بخارا، نیشاپور، اور بغداد کا سفر کیا امام ابو زکریا نے بخارا سے سفر شروع کیا اور قیروان (افریقہ) میں انتقال کیا۔ حافظ ابن طاہر مقدسی نے طلب حدیث کے لئے کتابیں وغیرہ پیٹھ پر لادے ہوئے پاپیادہ مکہ مکرمہ، دمشق، حلب، اصفہان، نیشاپور، بصرہ، وغیرہ کا سفر کیا۔ حافظ ابو عبداللہ اصفہانی نے حدیث حاصل کرنے کے لئے ہرات، بلخ، بخارا، سمرقند، کرمان، نیشاپور وغیرہ ایسے سو میں مقامات کا سفر کیا۔ مکحولؒ ایک مصری غلام نے تمام حجاز، عراق اور شام کا سفر صرف اس لئے کیا کہ مال غنیمت کی تقسیم کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی صحیح حدیث معلوم کریں۔ اور آخرکار زیاد بن جاریہ التمیمی سے انہیں ایک حدیث ایسی دستیاب ہوئی جو حبیب بن مسلمہ الفہری ہی سے روایت کی گئی تھی۔ حافظ ابو الخطاب اندلس نے تحصیل علم کے سلسلے میں سب سے پہلے اندلس کا سفر کیا، پھر مراقش، حبش، مصر، شام، عراق، خراسان کی سیاحت کی۔ یحییٰ بن یحییٰ اللیثی (متوفی ۲۳۴ھ) قرطبہ سے روانہ ہوکر مدینہ میں امام مالکؒ، مکہ میں سفیان بن عیینہ اور مصر میں لیث بن سعد، عبداللہ وہب، عبدالرحمٰن بن قاسم سے مستفیض ہوکر قرطبہ واپس گئے۔ سہل بن عبداللہ تستریؒ تیرہ سال کی عمر میں بصرہ گئے پھر آبادان، جہاں حمزہ بن ابی عبداللہ سے عرصہ دراز علم حاصل کرتے رہے۔ حنین بن اسحاق نے طب کی کتابیں جمع کرنے اور علم طب میں اضافے کے خیال سے مختلف مقامات کے بارہا سفر کئے یہاں تک کہ وہ سلطنت بزنطینی کے سرحدی شہروں تک جا پہنچے۔ پروفیسر نکلسن کا بیان ہے کہ "علم کے متلاشی تین براعظموں میں گھوم کر اپنے وطن کو اس طرح لوٹتے جیسے شہد کی مکھیاں شہد سے

اہوتی اپنے حصے میں آتی ہیں اور علم کی بیش بہا دولت جو وہ جمع کر کے لاتے تھے اپنے بے شمار شاگردوں میں تقسیم کردی اور حیرت انگیز محنت و مشقت برداشت کر کے قاموس جیسی کتابیں تصنیف کرڈالیں ان ہی تصانیف سے علوم جدیدہ نے بے حد بے حساب استفادہ کیا۔

(LITERARY HISTORY OF THE ARAB.

مصنفین کی شاہانہ سرپرستی ۔ شاہانِ اسلام اور امراء کی علم دوستی احسان کی فیاضی کا یہ عالم تھا کہ جاحظ المتوفی ۲۵۵ھ نے اپنی کتاب "الحیوان" عبدالملک الزیات کی خدمت میں پیش کی تو اسے پانچ ہزار اشرفیاں عطا کی گئیں۔ اسی طرح "البیان والتبیین" احمد بن داؤد کی خدمت میں اور "الزرع والنخل" ابراہیم بن عباس الصولی کی خدمت میں بھیجی تو دونوں جگہوں سے اُسے پانچ پانچ ہزار اشرفیاں ملیں۔ ابوالفرج اصفہانی ۳۵۶ھ نے اپنی مشہور کتاب "الاغانی" مرتب کی تو سیف الدولہ الحمدانی حاکم حلب اور اسپین کے بادشاہ الحکم ثانی نے ہزار ہزار دینار اسے بطور انعام بھیجے۔ ابن زکریا رازی نے سلطان منصور بن اسمٰعیل سامانی کے نام سے فن کیمیا پر ایک کتاب پیش کی تو اسے منصور نے ایک ہزار دینار انعام دیئے۔ ابو عبیدہ قاسم بن سلام کی کتاب "غریب المصنف" کو دیکھ کر عبداللہ بن ذوالیمین نے دس ہزار درہم ماہانہ مقرر کر دیا۔ مجدالدین فیروز آبادی بڑے سیاح عالم تھے اونٹوں پر کتابیں لاد کر ایک اسلامی ملک سے دوسرے اسلامی ملک میں آتے جاتے تھے۔ تیمور لنگ نے پانچ ہزار دینار نذر کیں۔ یمن کے بادشاہ الملک الاشرف کے پاس اپنی ایک کتاب ایک طباق میں رکھ کر پیش کی تو اس نے اس کو چاندی بھر کر واپس کیا۔ نصر بن احمد سامانی کی خواہش پر فارسی کے مشہور شاعر رودکی نے "کلیلہ دمنہ" کا منظوم ترجمہ کیا تو اس کے صلے میں اس کو چالیس ہزار درہم عطا کئے گئے۔ ظہوری نے ایک ساقی نامہ لکھا اس کے صلے میں مرزا عبدالرحیم خان خاناں نے اس کو دس ہزار روپے اور ہاتھی گھوڑے عطا کئے۔

علماء اور امراء کی علم دوستی ۔ جب مذاق و شغل کے حکمران ہوتے ہیں، اسی مذاق کے ارکان حکومت اور اعیان بھی ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ سلاطین اسلام کی طرح خلفاء اور امراء اسلام نے بھی علوم و فنون کی سرپرستی میں خوب خوب فیاضیاں دکھائیں اور ہر امیر علمی فیاضی میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتا۔ ان کے سائے میں ارباب کمال بھی پرورش پاتے اور علوم و فنون بھی سرسبز ہوتے رہے۔ مورخ گبن لکھتا ہے مسلمان گورنر اور وزیر علم اور ماہرین علم کی قدردانی میں خلفائے اسلام کے ساتھ ہمسری کرنے کے بڑے شائق تھے۔ اعزاز مدارس اور مدارس کے طلباء نہایت فیاضی سے کام لیتے تھے۔ امکانات کا بیان ہے کہ "چونکہ خلفاء خود علم و فن کے قدردان ہوتے تھے۔ اس لئے اپنے آقاؤں کو دیکھ کر امراء و حکام بھی اس صفت میں ایک دوسرے سے مسابقت کرتے تھے، مدارس اور دارالعلوم قائم کرتے تھے، ایجادات اور معلومات پر انعامات دیتے تھے"

خلفاء اور امراء کے مکانوں پر اکثر علمی و ادبی مجلسیں ہوتی تھیں جن میں علماء فضلاء اور شعراء مختلف علمی مسائل پر بحث و مباحثہ کرتے تھے، تصنیف و تالیف اور ترجمے کے کاموں میں حد درجہ دلچسپی لیا کرتے اور بے کھٹک روپیہ خرچ کرتے۔ برامکہ اور موسیٰ بن شاکر کے خاندان علم کے لئے بہت ممتاز ہیں۔ برامکہ کا خاندان ہارون الرشید کے زمانے میں انتہائی عروج کو پہونچ گیا تھا۔ اور علوم و فنون کی سرپرستی میں بڑا حصہ لیا۔ ان کے زمانے میں علماء و فضلاء اور ارباب کمال پر زر و جواہر کی بارش ہوتی تھی۔ بنوشاکر (یعنی محمد احمد الحسن) وہ لوگ تھے جنہوں نے علوم کی جستجو میں انتہائی کوششیں کیں ان کے لئے مال و دولت کو صرف کیا، اپنی جانوں کو ہلاکت میں ڈالا اور روم کے شہروں میں ایسے لوگ روانہ کئے جو دور دراز مقامات سے کتابیں نکال کر اُن کے پاس لائے۔ ان لوگوں نے ان کے نقل و ترجمہ کے لئے دور دور سے گرانقدر معاوضہ پر مترجمین بلوائے اور حکمت کے عجائبات کو ظاہر کیا۔ حنین بن اسحاق، ثابت بن قرۃ اور حبیش بن الحسن وغیرہ جیسے ممتاز اہل علم یہاں ترجمہ کے لئے ملازم تھے۔ ان کی تنخواہوں کا ماہوار خرچ پانچ سو دینار تھا۔

سلطان الپ ارسلان کے مشہور و معروف علم دوست وزیر نظام الملک طوسی کی علمی فیاضیاں بہت مشہور ہیں، مدرسہ نظامیہ بغداد کے علاوہ اس نے بہت سے مدارس اور کتب خانے قائم کئے جن پر لاکھوں روپے سالانہ خرچ کرتا تھا۔

خلیفہ مستنصر باللہ فاطمی کا وزیر اعظم یمقیانی بڑا علم دوست تھا علماء اور اصحابِ فن کی سرپرستی کرتا شعر کا بھی ذوق تھا۔ اس کے دربار سے بڑے بڑے شعراء وابستہ تھے۔ امرائے دربار میں وزیر محمد بن عبدالملک الزیات کا نام بھی بہت مشہور ہے، مترجموں اور کاتبوں پر جو روپیہ خرچ کرتا تھا اس کا اندازہ دو ہزار اشرفی ماہانہ تھا۔ اس کے عنوان سے بہت سی کتابیں ترجمہ کی گئیں وہ ان لوگوں میں محسوب ہوتا جن کے واسطے یونانی زبان کی کتابیں عربی میں ترجمہ ہوئیں۔ اس کے نام سے اکابر اطباء کی ایک جماعت مثلاً یوحنا ابن ماسویہ اور جبریل بن بخت شوع نے کتابیں ترجمہ کیں۔

علامہ رشید الدین فضل اللہ بادشاہ غازان تبریزی کا وزیر تھا۔ علامہ نے علماء فضلاء اور حکماء کی قدردانی اور ہمت افزائی کی۔ آپ کے جود کرم نے دور دور کے علماء، فضلاء اور شعراء کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ ہر فن کے استاد کامل اس کے محفل ادب میں جمع ہو گئے تھے، اُس زمانہ کے اکثر اہل قلم اور مصنفین نے علامہ کے نام سے بڑی بڑی کتابیں لکھیں۔ سلطان غیاث الدین بلبن کے دربار کے ایک علم نواز امیر ملک الامراء فخرالدین کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ اس کے یہاں بارہ ہزار وظیفہ خوار کلام پاک پڑھنے کے لئے مقرر تھے، جو ہر مہینہ ایک ہزار بار کلام پاک ختم کرتے تھے۔ سلطان بلبن کے بھتیجے کے علاء الدین کشلی خان کے متعلق ضیاء الدین برنی کا بیان ہے کہ وہ سخاوت میں اپنے وقت کا حاتم تھا۔ فرشتہ لکھتا ہے کہ مصر، شام، روم، بغداد، خراسان، ترکستان، ماوراء النہر وغیرہ مشہور مقامات سے علماء اور شعراء اس کی بخشش کا حال سن کر اس کے یہاں آتے اور انعام و اکرام سے مالا مال ہو کر اپنے وطن واپس جاتے۔ اپنی بخشش اور سخاوت کی وجہ سے وہ ہر شہر اور ہر ملک میں مشہور تھا۔ خواجہ شمس معین نے ایک بار کشلی خاں کی شان میں مدح پڑھی تو اس نے خواجہ کو اپنے یہاں بلا کر مجلس نو مسند کا تمام قیمتی سامان اس کو دے دیا۔ فرشتہ لکھتا ہے اکثر ایسا ہوا کہ کشلی خاں اپنا کل سامان، انعام و اکرام میں لٹا دیتا تھا، یہاں تک کہ اس کے پاس بدن کے کپڑے کے سوا کچھ نہ رہتا۔ سلطان سکندر لودھی کے عہد حکومت میں ایک امیر مسند علی خان کی فیاضی کا یہ عالم تھا کہ جب کوئی صاحب علم جو اس امیر کا وظیفہ یاب ہوتا، انتقال کر جاتا تو وظیفہ اس کے پس ماندگان کی طرف منتقل کر دیا جاتا اور اگر وہ صرف بیوی چھوڑ جاتا تو اس خاتون سے کہا جاتا کہ کسی کو متبنیٰ کرے پھر اس متبنے کو اپنے خرچ سے تعلیم دلاتا۔ نواب مرشد قلی خاں صوبہ دار بنگال کے ہاں ڈھائی ہزار قاری ملازم تھے۔

حافظ الملک کے عہد میں روہیل کھنڈ میں پانچ ہزار علماء اور فضلاء مساجد اور سرکاری مدارس میں درس و تدریس میں مشغول تھے۔ ہر ایک عالم اور فاضل کی اس کے علم و فضل کے مطابق تنخواہ مقرر تھی۔

گاہے گاہے باز خواں ایں قصہ پارینہ را

ایک "قادیانی" کا قبول اسلام
اندھیرے سے روشنی کی طرف

مورخہ ۱۵ ستمبر ۱۹۶۶ء

(انجمن خدام الاسلام ہیرآباد حیدرآباد (مغربی پاکستان)

بخدمت جناب مکرمی مدیر صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ بعد سلام کے واضح ہو کہ ایک اعلان ارسالِ خدمت کر رہا ہوں براہِ کرم اس کو اپنے موقر جریدہ میں مناسب جگہ عنایت فرمادیں، راقم الحروف نے آپ کا مقالہ قادیانیت کے متعلق ملاحظہ کیا انشاءاللہ انجمن کے تحت شائع کرنے کی کوشش کروں گا۔

آپ حضرات کو یہ پڑھ کر مسرت حاصل ہوگی کہ حیدرآباد میں جناب مسعود احمد صاحب نے مولانا عبدالمہیمن صاحب اوکاڑوی کے ہاتھ پر برضا و رغبت اسلام قبول کیا۔ موصوف بڑی تحقیق و جستجو کے بعد اسلام کے دائرے میں داخل ہوئے ہیں، موصوف کا یہ اعلان ہے کہ مجھے آئندہ سے احمدی نہ کہا جائے بلکہ مجھے اہلِ حدیث کہا جائے اور میں آج سے اہلحدیث ہوں، موصوف کی تحریر راقم الحروف کے پاس موجود ہے، انشاءاللہ دوسرے خط میں مکمل تفصیل سے آگاہ کرونگا۔ یہ اعلان کو آپ جلد از جلد شائع فرمادیں۔ فقط والسلام

خورشید احمد السلفی، ناظم اعلیٰ

"فاران" کے مضامین جو قادیانیت کی تردید میں شائع ہوتے رہے ہیں غالباً انہوں نے قادیانیوں کی صفوں میں ہلچل پیدا کردی ہے یہی سبب ہے کہ ماہنامہ الفرقان (ربوہ) کا پورا شمارہ "فاران" کے مضمون کی تردید کے لئے وقف ہے! اور دجل وفریب سے لبریز ہے!

قادیانیوں کو دلائل کے ساتھ سمجھایا جائے، تو ان میں نہ جانے کتنے ایسے لوگ ہوں گے جو مسعود احمد صاحب کی طرح بالقوہ حق پسند ہیں، مگر وہ حق سے بے خبر ہیں، حق واضح ہونے کے بعد وہ قادیانیت کے کیمپ میں نہیں رہ سکتے، ان کو توبہ کی توفیق انشاءاللہ میسر آئے گی۔ اور ایمان و اسلام سے بہرہ ور ہوجائیں گے۔

ماہر القادری

ماہرالقادری

یادِ رفتگاں

علامہ محمد خلیل عرب مرحوم۔

علامہ محمد خلیل عرب کا نام تو سنا تھا مگر انہیں دیکھنے کا اتفاق سیرت النبیؐ کے ایک جلسہ میں ہوا، یہ اب سے کوئی تیرہ چودہ سال پہلے کی بات ہے، اس جلسہ میں علامہ کی تقریر بھی سُنی، مگر گفتگو کا موقعہ نہ مل سکا، میں اپنی نعتیہ نظم پڑھنے کے بعد چلا آیا۔ اس کے بعد دو تین بار اُن سے تعارف و ملاقات کا شرف حاصل ہوا، ایک ملاقات میں درس نظامی سے ہٹ کر نئے انداز پر عربی پڑھنے پڑھانے کا ذکر آیا اور اس کے بعد علامہ خود غریب خانہ پر تشریف لے آئے، عربی نصاب کی کتاب بھی اُن کے ساتھ تھی، ہاتھ کے ہاتھ پڑھائی شروع ہو گئی! چند دن کے بعد جناب ظفر احمد انصاری صاحب کے مکان پر صاحب موصوف، سید حسن ریاض صاحب اور راقم الحروف کا جماؤ ہونے لگا، ہلکہ یوں سمجھئے چھوٹا سا "مکتب" قائم ہو گیا، علامہ بڑی شفقت کے ساتھ درس دیتے، اس فن میں اُن کی پوری عمر گزری تھی، طلباء میں عربی زبان و ادب کی استعداد پیدا کرنے کا انہیں بڑا ملکہ اور تجربہ تھا، طب کی کمزوریوں سے بھی وہ باخبر تھے، تقریباً ڈیڑھ سال یہ سلسلہ جاری رہا، جو آموختہ نفحۃ الیمن، کلیلہ دمنہ، مقدمہ ابن خلدون اور ریاض الصالحین تک پہونچ گیا، پھر وہ اپنی پیرانہ سالی کے باعث آنے جانے میں بڑی زحمت محسوس کرنے لگے، بڑھاپا اور اُس کے ساتھ بہت سے امراض، اس حالت میں کراچی کی بسوں میں سفر، یہ مرحلہ بڑا سخت تھا، ہر ہفتہ ناغہ کی نوبت آنے لگی، یہاں تک کہ یہ سلسلہ بند ہو گیا، ان کے سجادہ کو مولانا سید اشرف صاحب ندوی نے سنبھالا، مگر علامہ مرحوم کا وہ عالم صحو اور مولانا کا یہ سکر اور نیم مجذوبیت! تقریباً ایک سال ان سے بھی استفادہ کا موقعہ ملا۔ اور مقامات بدیع الزماں ہمدانی اور عربی کے قصائد درس میں رہے۔

کراچی کی زندگی مشینی زندگی بنتی جا رہی ہے اور بقول علامہ اقبالؔ :—

؎ احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

ہر شخص اپنے معاملات میں الجھا ہوا ہے، گھر دکان کے فاصلے، کام زیادہ، فرصت کم! راقم الحروف ہی کی بدتوفیقی ہے کہ علامہ کی خدمت میں بہت دنوں سے حاضر نہ ہو سکا، اُن کی علالت کی خبریں ملتی رہیں، اور ساتھ ہی یہ مژدہ بھی کہ وہ اب اچھے ہیں۔

ایک دن جمعہ کی نماز کے بعد گھر آیا، تو ٹیلی فون پر آیا ہوا یہ پیام ملا کہ علامہ خلیل عرب کا انتقال ہو گیا، پیر الٰہی بخش کالونی کی نوانی مسجد میں ایک بجے نماز جنازہ ہوگی، میں جب گھر پہونچا ہوں تو تین بج چکے تھے، اور اس وقت علامہ آسودۂ لحد ہو چکے تھے!

علامہ مرحوم یمن کے علمی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے، متحدہ ہندوستان میں ریاست بھوپال علامہ کے بزرگوں کا دارالاقامہ رہا ہے، علامہ خلیل عرب نے ندوہ (لکھنؤ) کی مشہور درسگاہ میں بھی معلمی کے فرائض انجام دئے ہیں، مولانا سید ابوالحسن ندوی مدظلہ کا اسم گرامی بھی اُن کے شاگردوں کی فہرست میں آتا ہے! لکھنؤ یونیورسٹی میں بھی علامہ شعبۂ عربی کے صدر رہے ہیں۔

علامہ خلیل عرب عربی زبان و ادب کے مستند عالم تھے، جن کی لسان دانی پر اعتماد کیا جا سکتا ہے، اُن کی بڑی صاحبزادی رقیہ بیگم نہ صرف عالم دین ہیں بلکہ فن حدیث میں "اختصاص" کا درجہ رکھتی ہیں، چھوٹی لڑکی عطیہ بیگم بھی عربی داں ہیں اور اُردو کی اچھی مضمون نگار ہیں، علامہ سلفی المذہب تھے

توحید کے معاملہ میں بڑے غیرت مند! افسوس ہے کہ پاکستان میں ان کی قدر نہیں ہوئی، معاشی حالات ایسے تھے کہ تنگی ترشی سے گزر ہوتی تھی، مگر اس کشمکش کے باوجود مزاج میں خشونت پیدا نہیں ہوئی، اُن کی زندہ دلی کو دیکھ کر راقم الحروف "مزاح" کی جرأت بھی کر بیٹھتا، اور وہ اس میں لطف لیتے ان کے ساتھ مشرقی وضعداری، عربی شرافت اور علمی و دینی وجاہت کا ایک دور ختم ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے (آمین)

نواب ناظر یار جنگ بہادر مرحوم۔

نواب ناظر یار جنگ بہادر، مولوی نظام الدین حسن کے فرزند تھے، مولوی صاحب مرحوم ریاست بھوپال میں مشیر المہام اور حیدرآباد دکن میں رکن عدالت العالیہ (ہائی کورٹ کے جج) رہ چکے تھے، فنِ تقویم میں ید طولیٰ حاصل تھا، اُن کی مرتب کی ہوئی مدرسی تقویم حیدرآباد دکن میں راقم الحروف کی نگاہ سے گزری ہے، مولوی نظام الدین حسن بڑے وضعدار، با اصول اور وقت کے انتہائی پابند تھے، اُن کی پابندیِ وقت، اصول پرستی اور وضعداری کے بہت سے لطیفے مشہور ہیں، مثلاً یہ کہ جب وہ لکھنؤ میں آنریری مجسٹریٹ تھے، راستہ اگر میں بیٹھ کر گھر آتے تھے، تو تانگہ والے کو کرایہ کی منظوری کے بعد درخواست دینی پڑتی تھی! اس چکر میں تانگہ والے کا خاصہ وقت صرف ہو جاتا، اس لئے تانگہ والے انہیں بیٹھا تے جلد دیکھ کر کتراتے اور کنّی کاٹنے کی کوشش کرتے، ایک بار لکھنؤ کی کسی انجمن کے کارکن مولوی صاحب کے پاس اُس انجمن کے اشتہارات کرآئے اور اشتہار وں کی گڈیاں رکھ کر جانے لگے، کوئی دس ہزار اشتہارات ہیں، مولوی صاحب نے جو اس انجمن کے غالباً سکریٹری تھے فرمایا کہ یہ قوم کا معاملہ ہے، اشتہارات گنے بغیر آپ کو نہیں جانے دونگا، چنانچہ اُس غریب کو مولوی صاحب کے ساتھ دس ہزار اشتہارات گننے پڑے!

یہ لطیفے طاز ساز بھی ہو سکتے ہیں اور مبالغہ آمیز بھی، مگر یہ بھی واقعہ ہے ــــ

تانہ باشد چیزکے، مردم نہ گویند چیزہا[1]

مولوی صاحب کی اصول پرستی اور پابندیِ وقت، ضرورت سے زیادہ ہی محسوس کی جاتی تھی، انہی کے صاحبزادے نواب ناظر یار جنگ بہادر تھے!

نواب صاحب مرحوم نے جوانی کے زمانہ میں قومی کاموں میں بھی حصہ لیا، چودھری خلیق الزماں کی طرح قومی تحریکوں میں ہو لگے رہتے، تو یقیناً آن کا شمار بڑے لیڈروں میں ہوتا! متحدہ ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ولایت گئے اور وہاں سے قانون کی سب سے بڑی ڈگری حاصل کی، ریاست حیدرآباد دکن کے محکمہ عدالت میں ملازمت کا آغاز ہوا، برسوں سشن جج رہے پھر ہائی کورٹ کے جج ہو گئے، پچپن سالہ مدت ملازمت کے بعد کئی سال توسیع بھی ہوئی۔

مرحوم کی پوری ملازمت کا زمانہ نیک نامی میں گزرا، کسی کی رو رعایت نہیں، کوئی دباؤ اور سفارش اُن کو متاثر نہیں کر سکتی تھی، اُن کے علم و فضل اور قانون دانی کی کوئی خاص شہرت نہ تھی مگر ان کی دیانتداری، فرض شناسی اور انصاف پسندی کا عام شہرہ تھا، انگلستان کے ایل۔ ایل۔ ڈی، لیکن چہرے پر ڈاڑھی، صوم و صلوٰۃ کے انتہائی پابند! محتاط اور پاکیزہ زندگی کے سبب بڑھاپے میں بھی کمر تیر کی طرح سیدھی رہتی، بلدہ حیدرآباد میں دو آدمیوں کے "ٹہلنے" کی بڑی شہرت تھی، ایک سراج الحسن ترمذی وکیل اور دوسرے نواب ناظر یار جنگ مرحوم! کیسی ہی مصروفیت کیوں نہ ہو، گرمی ہو، جاڑا ہو، آندھی چل رہی ہو، بوندا باندی ہو رہی ہو یہ دونوں صاحبان روزانہ پابندی کے ساتھ پانچ چھ میل ٹہل کر دم لیتے!

عدالت عالیہ میں مولانا عبد القدیر بدایونی مرحوم کا مفتی کے عہدہ پر شاہی فرمان کے ذریعہ تقرر ہوا، تو دفتر افتاء کا اہل کار یعنی صیغہ دار اور پیشکار، راقم الحروف ہی تھا، نواب ناظر یار جنگ بہادر مرحوم کے حکم اور ایماء سے عدالت عالیہ کے کتب خانہ کی تنظیم و تہذیب کا فریضہ بھی، مولانا عبد الباسط صاحب مددگار معتمد عدالت عالیہ (اسسٹنٹ رجسٹرار ہائی کورٹ) کی نگرانی اور ماتحتی میں انجام دینا پڑا۔ مولانا عبد الباسط صاحب

---

[1] مگر یہ کلام ادھورا رہ گیا!

حیدرآباد دکن کے مشہور حریت پسند مفکر، ملّا عبدالقیوم صاحب کے فرزند تھے، بطلِ حریت علامہ جمال الدین افغانی نے حیدرآباد میں انہی کے یہاں قیام فرمایا تھا، سروجنی نائیڈو کے والد پروفیسر اگھورناتھ مالی مشکلات میں مبتلا ہوئے تو ملّا عبدالقیوم صاحب نے بڑی فراخدلی کے ساتھ اُن کی مالی امداد کی!

نواب ناظر یار جنگ سے ہائی کورٹ میں دعوتوں اور جلسوں میں ملاقاتیں ہوتی رہتیں، کہاں ہائی کورٹ کا جج اور کہاں دفتر کا ایک اہل کار، مگر ملاقات، گفتگو اور ملنے جلنے میں اتنی مساوات اور بے تکلفی کہ عہدے کی بلندی اور پستی کا احساس ہی پیدا نہیں ہوا! میرے ایک عزیز میرٹھ میں وکالت کرتے تھے، اُسی زمانہ میں نواب صاحب مرحوم کے بہنوئی خان بہادر اکبر حسین وہاں کے سشن جج تھے، خان بہادر صاحب کی انصاف پسندی اور اصول دوستی ضرب المثل تھی، میرے اُن عزیز نے مجھے لکھا کہ عدالتوں میں صداقت ناموں کی تصدیق وغیرہ کا کام سیشن جج صاحب کے حکم سے مل سکتا ہے آپ ان کے برادرِ نسبتی نواب ناظر یار جنگ سے سفارشی خط بھجوا دیں!

میں نے بعض احباب سے ذکر کیا تو وہ کانوں پر ہاتھ دھرنے لگے کہ ہم میں سے تو کوئی ایسی جرأت کر ہی نہیں سکتا، نواب صاحب بڑے بااصول آدمی ہیں اور اُن کے بہنوئی ان سے بھی زیادہ سخت ہیں! ایک دن میں ہمت کر کے نواب ناظر یار جنگ مرحوم کے چیمبر میں پہونچا، حسبِ عادت بڑے تپاک سے ملے، کچھ دیر ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں، پھر میں نے اس تمہید کے ساتھ کہ کسی کا حق متاثر نہ ہوتا ہو، تو جائز سفارش کا روا ہے اپنی غرض کا اظہار کیا، نواب صاحب نے کچھ دیر سوچا اور اس کے بعد سفارشی خط لکھ کر میرے حوالے کر دیا، احباب کو معلوم ہوا تو انہوں نے بڑی حیرت کا اظہار کیا، کہنے لگے نواب ناظر یار جنگ سے سفارشی خط حاصل کر لینا بس تمہارا ہی کام تھا۔

نواب صاحب مرحوم کے بات کرنے کا خاص انداز تھا، رک رک کر بلکہ چبا چبا کر الفاظ ادا کرتے اور ہاتھ کی حرکت سے طلاقتِ لسانی کی کمی کو پورا کرنے کی کوشش فرماتے، ہم اپنی بے تکلف صحبتوں میں کبھی کبھار اُن کی گفتگو کی نقل کر کے لطف لیا کرتے تھے۔

زوالِ حیدرآباد کے بعد وہاں کے مسلمانوں کو بڑے سخت دور سے گزرنا پڑا، کتنے بہت سے کرسی نشین، خاک نشین ہو گئے، مسلمانوں کی اقبالمندی کی بساط ہی الٹ گئی، —— حیدرآباد، آہ! مرحوم حیدرآباد! —

همیں است دیدهٔ سرائے فریب
گہے بر فراز و گہے بر نشیب

کی مجسم تصویر!

حیدرآباد نے جانے والوں کی زبانی سننے میں آیا کہ اس خونیں و دردناک انقلاب کے بعد بھی نواب ناظر یار جنگ مرحوم کی روش میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی اور اُن کی دینداری اور اسلام دوستی نے کسی دباؤ اور اثر کو قبول نہیں کیا، نئے حاکموں نے بھی اُن کے ساتھ احترام کا سلوک کیا! مولانا عبدالماجد دریابادی مدیر "صدقِ جدید" جو نواب صاحب کے ہم زلف ہیں اُن کے جریدہ میں نواب صاحب کے انتقال کی خبر چھپی بلکہ حیدرآباد کے اخبارات میں ضرور تعزیتی اداریئے لکھے گئے ہوں گے، کراچی کے صحافی، ہندوستان کیا پاکستان کی بھی بعض قابلِ ذکر شخصیتوں کے بارے میں بے خبر اور انجان نکلے! مرنے والے کو اللہ تعالیٰ کی مغفرت نصیب ہو (آمین)

خان بہادر بدرالدین مرحوم۔

شاید چھ سال ہوتے ہوں گے، انجمن ترقی اردو کے ایک جلسہ میں ایک نہایت ہی دُبلے پتلے شخص نے ملنے میں خود ہی پہل کی اور اپنا تعارف کرایا، کہ میرا نام بدرالدین ہے! آپ کے "فاران" کو بڑے شوق و دلچسپی سے پڑھتا ہوں، پھر انہوں نے کراچی سے دس میل دور ملیر کالونی کے قریب علاقے میں ہونے پر بلایا، مجھے کوئی ضروری کام نکل آیا، اُن کی دعوت میں نہ جا سکا، دوبارہ ملاقات ہوئی تو اس انداز میں لے کر مجھے معذرت

کا موقعہ ہی نہیں دیا، اُن کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو شکوہ و شکایات کا دفتر کھول دیتا اس کے بعد پھر دعوت کا دن مقرر ہوا، اُن کے صاحبزادے پاس ہاؤس پاکستان فضائیہ میں اُن دنوں فلائٹ لفٹننٹ تھے، اُن کے فلیٹ میں شام کو چائے نوشی ہوئی اور ڈیڑھ دو گھنٹہ خان بہادر صاحب مرحوم سے تبادلۂ خیال کا موقعہ ملا۔

وہ اکثر بیمار رہتے تھے، اپنی نوازش اور محبت سے "فاران" کے دفتر میں بھی دو تین بار تشریف لائے اور سہ منزلہ عمارت پر چڑھنے کی زحمت برداشت کی سات آٹھ برس سے وہ اپنے ذاتی مکان واقع ناظم آباد میں منتقل ہو گئے تھے، مکان کا نام "المصحف" رکھا تھا، وہاں بھی کئی بار گیا، ایک بار بیمار کی خبر پاکر مزاج پرسی کے لئے پہونچا، تو اس حالت میں دیکھا کہ مسہری پر نیم بیہوشی کی حالت میں لیٹے تھے اور ڈاکٹر انجکشن لگانے کے لئے رگ تلاش کر رہا تھا پھر وہ اچھے ہو گئے!

اُردو زبان کے شیدائی تھے، دینداری میں اپنی آپ مثال! توحید کے معاملہ میں بڑے حساس اور غیرت مند! فرماتے تھے، کہ علماء دیوبند! شرک و بدعت کے مٹانے والے ہیں، اُن کے یہاں بھی غلبہ تصوف کے سبب توحید بے غبار نہیں رہی! "تصوف" کے بہت مخالف تھے! ناموں کے ساتھ چشتی قادری اور سہروردی کی نسبتیں بھی اُنہیں پسند نہ تھیں! میں تصوف کی کسی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے نرمی سے کام لیتا، تو سخت احتساب کرتے اور کئی کئی صفحے کے خط لکھتے! اکثر فرمایا کرتے تھے کہ مولانا مودودی کی تحریروں میں بے غبار توحید ملتی ہے، مگر ان کے نام پر اعتراض تھا، میں نے صفائی پیش کرتے ہوئے عرض کیا کہ جس طرح مولانا آزاد کا نام تو محی الدین تھا "ابوالکلام" اپنی کنیت انہوں نے خود رکھی ہے، یہ معاملہ "ابی الاعلیٰ" کا نہیں ہے یہ ان کے والد کا رکھا ہوا نام ہے، مولانا مودودی کے دو بھائیوں کے نام ابو محمد اور ابوالخیر ہیں۔

"فاران" کے بڑے قدردان تھے، اپنے کسی عزیز کو جو ڈھاکہ ہائی کورٹ کے جج تھے "فاران" کا خریدار بنایا، اور اپنے داماد حبیب احمد صدیقی صاحب کو جو یوپی میں کمشنر تھے، "فاران" کے پرچے بھجواتے!

خان بہادر بہاالدین صاحب انگریزی دور کے بنگال میں محکمہ تعلیم کے انسپکٹر تھے، پھر وہ ڈھاکہ ہائی کورٹ کے رجسٹرار ہو گئے! ان کی کارکردگی، قابلیت، ایمانداری اور فرض شناسی کے انگریز حکام تک معترف تھے، اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں کے اچھے انشاء پرداز تھے، ۱۹۱۲ء میں ایک کتاب "فتح قسطنطنیہ" لکھی، جس پر شہیر بڑے بڑے اچھے تبصرے کئے، اور اکبر الٰہ آبادی، علامہ اقبال، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خان، مولانا عبدالحق مولف تفسیر حقانی اور مولانا شبلی جیسی نامور شخصیتوں نے پسندیدگی کا اظہار فرمایا اور تعریف و تحسین کی!

مجھے یاد پڑتا ہے کہ مرحوم سے ٹیلی فون پر آخری بار بات چیت اب سے سال سوا سال پہلے ہوئی تھی، اس کے بعد اُن کی کوئی خیر خبر نہیں ملی، قومی زبان کے "ماہنامہ اُردو نمبر" (جولائی ۱۹۷۶ء) میں اُن پر ایک مضمون پڑھ کر اُن کے انتقال کا علم ہوا، یہاں کے اخبارات میں ایک سطر بھی اُن کے بارے میں میری نظر سے نہیں گزری، حالانکہ وہ اس کے مستحق تھے کہ اُن پر چند سطری کسی شذرہ سے نہیں مضامین اور مقالے لکھے جاتے! ہماری صحافت بھی زیادہ تر "فسلم زدہ" ہو کر رہ گئی ہے!

خان بہادر بہاالدین جیسے بزرگوں کو دیکھنے کے لئے، آئندہ نسلوں کی آنکھیں ترسا کریں گی! اللہ تعالیٰ اُن کی قبر کو منور اور آخرت کو فوز و فلاح سے ہمکنار بنائے (آمین)

درد سعیدی مرحوم۔

صابر دہلوی مرحوم سے راقم الحروف کی انتہائی بے تکلفی کی دوستی تھی، یہ شخص بڑا باغ و بہار تھا، صابر کے ساتھ زیادہ وقت ہنسنے ہنسانے اور لطیفوں اور چٹکلوں ہی میں گزرتا، میں جن دنوں دلی میں رہتا تھا، اُسی زمانے میں (غالباً ۱۹۳۸ء تھا) صابر نے مجھ سے کہا کہ آغا شاعر دہلوی کے فرزند آغا مرغوش کی کتابوں کی دکان (نگارستان) پر ٹونک کا ایک نوجوان نیا نیا ملازم ہوا ہے، یہ اس کا حلیہ ہے، شعر کہتا ہے جس انداز میں وہ داد دیتا

ہے، بس وہ دیکھنے اور سننے سے تعلق رکھتی ہے، انہیں لطف آجائے گا! چنانچہ ہم دونوں "نگارستان" پہنچے، وہاں شعرخوانی ہوئی، نند صاحب کی والہانہ انداز میں داد سے خوب لطف لیا۔ اُن سے میرا پہلا تعارف تھا، دکی میں وہ جب تک ہے اُن کی زبان سے اُن کا کوئی شعر نہیں سُنا، غالباً نند صاحب اپنی مسکینی اور انکسار کے سبب شعر سنانے سے جھجکتے رہے۔

۱۹۴۱ء میں ٹونک کے مشہور شاعر جناب بسمل سعیدی کے زیر اہتمام خاصے بڑے پیمانے پر مشاعرہ ہوا، جناب شعری بھوپالی کی وہ جو مشہور غزل ہے۔

کہ وہ ساحل پہ ہوتے اور کشتی ڈوبتی اپنی

یہی مصرعہ طرح قرار پایا! بڑی سخت سردی پڑ رہی تھی، مگر مشاعرہ گاہ میں حاضرین کی کثرت نے سردی کے علی الرغم خاصی گرمی پیدا کردی، رات کو نو بجے جو مشاعرہ شروع ہوا ہے تو دن میں دس بجے تک یہ سلسلہ چلتا رہا! صبح کے وقت میں ہز ہائی نس نواب سعادت علی خاں مرحوم والئ ٹونک بھی تشریف لائے!

اس مشاعرے میں اس نفسیاتی حقیقت کا احساس ہوا کہ شاعر اپنی مشہور اور منتخب غزل پر دوسری غزل کہے تو وہ اُس کے جوڑ کی نہیں ہوگی، شعری صاحب کو اپنی وہی مشہور غزل مشاعرے میں پڑھنی تھی، مگر انہوں نے دوسری نئی غزل کہی، جو اُن کی مشہور و مقبول پرانی غزل کے مقابلہ میں بہت پھیکی رہی!

بسمل سعیدی صاحب سے میرے بڑے مخلصانہ تعلقات تھے اور اب بھی ہیں۔ اگرچہ تقسیم ہند نے سینکڑوں میل کا بعد مکانی پیدا کردیا ہے! مشاعرے کے بعد دعوتوں اور شعری نشستوں کا سلسلہ شروع ہوگیا! بسمل صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ ریاست کے مفتی صاحب نے میری ایک نظم پر کفر کا فتویٰ دیا ہے وہ تمہیں اپنے یہاں دعوت میں بلائیں، تو وہاں نہ جانا! چنانچہ ایک صاحب ٹونک کے مفتی اعظم کی دعوت کا پیغام لے کر آئے، مگر میں ٹال گیا انہوں نے بہت اصرار کیا، لیکن میں نے مفتی صاحب کے یہاں جانے کی حامی نہیں بھری، جب وہ مایوس ہو گئے تو فرمانے لگے رات کے مشاعرے میں آپ کی غزل کا مطلع ——

یہی ہے زندگی اپنی یہی ہے بندگی اپنی
کہ تیرا نام آیا اور گردن جھک گئی اپنی

کچھ تھا نہیں، مگر مشاعرے کے لئے "بم کا گولہ" ثابت ہوا، میں اُن صاحب کی اس طنز پر مسکرا کر رہ گیا۔ جو داد بھی تھی اور بیداد بھی!

ہاں! تو اسی مشاعرے میں نند سعیدی صاحب کی غزل پہلی بار اُن کی زبان سے سُنی، ان کی غزل کے تین چار شعر مشاعرے میں خاصے پسند کئے گئے، اور بسمل صاحب کے اشارہ کرنے پر نند صاحب جلدی سے مقطع پڑھ کر اسٹیج سے اُتر آئے! پھر —— کراچی میں پاکستان بننے کے بعد ان سے ملاقات ہوئی!

نند سعیدی نے پاکستان آنے کے بعد سندھ کے ایک معروف قصبہ ٹنڈو آدم کو اپنا مستقر بنایا، اس نام کو سُن کر پہلے ہنسی آیا کرتی تھی۔ مگر رفتہ رفتہ [illegible] ہوگیا، مجید لاہوری مرحوم نے کیا خوب کہا۔

ع جانے والے! ٹنڈو آدم بھی اک منزل میں ہے

مگر جب ایک ریلوے اسٹیشن پر "اللہ دینو ساند" کا بورڈ نظر سے گزرا تو "ٹنڈو آدم" بہت غنیمت معلوم ہونے لگا۔

ٹنڈو آدم خاصہ بڑا قصبہ اور اس نواح میں تجارتی مرکز ہے، آبادی چالیس ہزار سے کچھ زیادہ ہی ہوگی، نند سعیدی مرحوم کی بدولت وہاں شعر و ادب کا ذوق پیدا ہوا، خاصے بڑے پیمانے پر وہاں مشاعرے ہوتے رہے ہیں، جن کے کرتا دھرتا نند مرحوم ہی ہوتے تھے، ایک مشاعرے میں حضرت جگر مراد آبادی، [illegible] لکھنوی اور [illegible] صدیقی نے بھی شرکت فرمائی، نند صاحب خاکسار کو بڑے اصرار کے ساتھ مشاعروں میں بلاتے، دعوت نامہ میں اکثر لکھتے کہ بے زبان رستم آپ کو رنگ جا رہا ہے، وہاں کے حالات کے لحاظ سے [illegible] گا!

ٹنڈو آدم میں سب سے بڑا آخری مشاعرہ اب سے چند سال پہلے قمر صاحب ہی کے زیرِ اہتمام منعقد ہوا، قابل اجمیری مرحوم اُس وقت زندہ تھے، وہ بھی شریک ہوئے تھے، اس مشاعرے میں ایک صاحب کی غزل کا یہ مطلع ۔

شہر بھی جا دیں ساقی پہ وہ گھڑی کے لئے
تمام عمر پڑی ہے رہا روی کے لئے

حاصل مشاعرہ رہا ۔۔۔

قمر سعیدی کے بارے میں دو سال پہلے سننے میں آیا کہ وہ بیمار ہیں اس کی اطلاع کرو وہ کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا ہیں! ڈاکٹر اختر صاحب کے خط سے ملی، انہوں نے لکھا کہ قمر صاحب کی حالت اچھی نہیں ہے کراچی میں آ کر علاج کرانا چاہتے ہیں مگر علاج کے لئے اتنے سرمایہ درکار ہوگا میں نے اختر صاحب کو بھی لکھا اور قمر سعیدی کو بھی کہ آپ اللہ کا نام لے کر کراچی آ جائیے یہاں انشاءاللہ سب کچھ بندوبست ہو جائے گا۔

گزشتہ رمضان میں وہ کراچی آئے، دو دن ایک ہوٹل میں ٹھہرے، پھر دفتر "فاران" میں آ گئے، اور بیس پچیس دن قیام کیا میں انہیں لے کر جناح سنٹرل ہسپتال کے ناظم اعلیٰ لفٹننٹ کرنل خواجہ عبدالرشید صاحب کے پاس گیا انہوں نے فرمایا کہ کینسر کے شعبہ کے جو ڈاکٹر صاحب انچارج ہیں، وہ ولایت گئے ہوئے ہیں آٹھ دس دن میں آ جائیں گے اُن سے رجوع کرنا ضروری ہے پھر وہ ڈاکٹر صاحب تشریف لے آئے، قمر سعیدی کو انہوں نے دیکھا، اور بجلی لگانے کا مشورہ دیا، مگر قمر صاحب نے فرمایا کہ بجلی لگ نہیں بڑی تکلیف ہوگی، میری صحت اس تکلیف کو برداشت نہ کر سکے گی، اس عرصہ میں انہوں نے ہومیو پیتھک علاج بھی شروع کر دیا تھا، اور کہتے تھے کہ میں فائدہ محسوس کر رہا ہوں، اس کے بعد وہ اپنے معالج سے دو ہفتہ کی دوائیں لے کر ٹنڈو آدم چلے گئے، فرماتے تھے کہ کراچی کی آب و ہوا مجھے موافق نہیں آتا، یہاں کی آب و ہوا میں سانس کی تکلیف پیدا ہو گئی ۔

ٹنڈو آدم سے اُن کے خط آتے رہتے، کسی خط میں لکھتے کہ پہلے کے مقابلے میں فائدہ ہے، کسی میں یہ کہ تکلیف بڑھتی جا رہی ہے، اسی دوران میں سانگھڑ جو ضلع کا مستقر ہے، میرا جانا ہوا وہاں مشاعرہ تھا، روزنامہ "جنگ" کے نمائندے نے مجھ سے کہا کہ ڈپٹی کمشنر صاحب سے آپ قمر صاحب کی مالی امداد کے لئے کہیں مشاعرہ ابھی شروع نہیں ہوا تھا میں نے ڈپٹی کمشنر صاحب سے کہا کہ قمر سعیدی صاحب آپ کے ضلع کے نامور شاعر ہیں، کینسر میں مبتلا ہیں، شاعرہ فنڈ سے اُن کی امداد فرمائیں، صاحب موصوف نے وعدہ فرمایا، مشاعرہ ختم ہو جانے کے بعد میں نے پھر کہا، معاملات میں تکرار اصرار میری عادت ہے، ڈپٹی کمشنر صاحب بڑے علم دوست، باذوق اور قول کے پکے نکلے چند روز کے بعد انہوں نے خود ٹنڈو آدم جا کر قمر سعیدی کی مزاج پرسی کی اور معقول رقم عنایت فرمائی ۔

قمر سعیدی کے مرض میں کبھی شدت پیدا ہو جاتی، کبھی افاقہ اور کبھی زیادتی! کئی مہینے تک یہی اتار چڑھاؤ رہا، وہ دوبارہ کراچی تشریف لائے اور تقریباً ایک مہینہ اپنے ہم وطن شاعر جوہر سعیدی کے یہاں کورنگی کے کوارٹر میں قیام فرمایا اور پھر ٹنڈو آدم واپس چلے گئے وہاں پہنچ کر مرض کے ساتھ کمزوری بھی بڑھتی رہی، لکھنا پڑھنا تک موقوف ہو گیا، دوسروں سے خط لکھواتے یہاں تک کہ ایک دن صبح سویرے اخبار "جنگ" میں ان کے انتقال کی خبر پڑھی ۔

قمر سعیدی شعر و سخن میں بسمل سعیدی کے شاگرد تھے، شاعری میں بتدریج ترقی کی، خوش گو اور صاحب فن شاعر! مطالعہ بھی خاصا وسیع تھا، دفتر "فاران" میں جب ان کا قیام تھا تو میں نے فلسفہ کی کتابیں انہیں پڑھتے دیکھا، بال بچوں کے بکھیڑے سے آزاد تھے، ضعیف ماں کی بہت خدمت کی پھر وہ بھی دنیا سے سدھار گئیں، شروع شروع میں ٹنڈو آدم کے کسی پرائمری اسکول میں مدرسی کی، پھر وہاں پبلک لائبریری میں منتظم ہو گئے، ان کی خوش ذوقی اور محنت نے اس لائبریری کو چار چاند لگا دئے، قصبہ کے خاص و عام میں اُن کی بڑی عزت تھی، جماعتِ اسلامی کے ہمدرد اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے عقیدت مند تھے، شاعری میں ایک دیوان یادگار چھوڑا! اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے ۔ (آمین)

غزلیں

شفا گوالیاری :

صبح کا نشاں نہیں رات بھی گزر گئی
ظلمتوں کی آڑ سے روشنی گزر گئی

زخمِ دل نئے ہوئے، آنکھ تر کئے ہوئے
بے کھلے بہار سے ہر کلی گزر گئی

ذکرِ رفتہ چھوڑیئے، سازِ غم نہ چھیڑیئے
جو گھڑی گزر گئی، وہ گھڑی گزر گئی

کچھ پتہ نہ مل سکا، راز کچھ نہ کھل سکا
زندگی کی کھوج میں زندگی گزر گئی

وہ جلوہ گاہ میں بات تھی نگاہ کی
جو رکی رکی رہی جو بڑھی گزر گئی

آج پھر تھا امتحاں شعلہ زارِ عشق میں
پھر خودی جھجک گئی بے خودی گزر گئی

دار کی حدود پہ بھی جذبِ دل نہ رک سکا
موت دیکھتی رہی، زندگی گزر گئی

کیا تلاشِ آستاں، کیا غمِ جبیں شفا
رسمِ بندگی سے اب بندگی گزر گئی

خانزادہ سمیع الوری :

صحنِ چمن میں آج نہ جانے کون ہے یہ دیوانے سے
موسمِ گل میں بھی یہ گلشن لگتے ہیں ویرانے سے

کس کس کے غم دور کریں ہم کس کس کے غم خوار بنیں
سب کے چہرے ہیں بے رونق سب کے دل غم خانے سے

کون ہے اپنا کون پرایا یہ کہنا آسان نہیں
یوں تو ہیں سب لوگ ہمارے جانے اور پہچانے سے

ہوش و خرد کی بات نہ کرنا واعظ یہ میخانہ ہے
اور بگڑ جاتے ہیں اکثر لوگ یہاں سمجھانے سے

بیگانوں کی اس بستی میں کس کو ہم اپنا کہہ دیں
کل جن کو اپنا سمجھا تھا آج ہیں وہ بیگانے سے

ماہر القادری :

حسن کے جورِ تغافل کا گلہ ہوتا ہے
کیا یہی شیوۂ اربابِ وفا ہوتا ہے

ان کے اب لطفِ تبسم سے بھی کیا ہوتا ہے
ایسی باتوں سے تو غم اور سوا ہوتا ہے

ہر نفس معرکۂ کرب و بلا ہوتا ہے
عشق ہر حال میں راضی بہ رضا ہوتا ہے

آہِ مظلوم سے ڈر ظلم پہ مغرور نہ ہو
یہ وہ ناوک ہے جو شاید ہی خطا ہوتا ہے

ایک افسانہ کو دہرائے چلے جاتے ہیں
صرف ہر دور میں عنوان نیا ہوتا ہے

بزمِ ساقی میں گزاری ہیں بہت سی راتیں
اسی امید میں اب جام عطا ہوتا ہے

نہ کوئی جلوہ نہ پردہ نہ حقیقت نہ مجاز
آدمی اپنے تصور میں گھرا ہوتا ہے

اپنے گلشن میں کہاں فصلِ بہار اے ماہر
چند کلیوں کے چٹک جانے سے کیا ہوتا ہے

PIA

ہماری نظر میں

تاریخ ابن خلدون (حصہ اول)

ترجمہ:- حکیم احمد حسین الٰہ آبادی، ترتیب و تبویب :- شبیر حسین قریشی (ایم اے)
ضخامت ۶۷۰ صفحات (مجلد، رنگین گردپوش، بڑا سائز) قیمت پندرہ روپے
ملنے کا پتہ :- نفیس اکیڈمی، بلاسس اسٹریٹ، کراچی ۱

علامہ عبدالرحمٰن بن خلدون (۷۳۲ھ — ۸۰۸ھ) کی شخصیت شہرۂ آفاق ہے۔ اور ان کی تاریخ عالمگیر شہرت رکھتی ہے ان کی تاریخ[1] کے پہلے حصہ کا ترجمہ نفیس اکیڈمی نے خاص اہتمام سے شائع کیا ہے اس جلد میں قبل ولادت باسعادت نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) سے لے کر سنہ ۴۰ھ تک کے واقعات آگئے ہیں۔ یہ کتاب سیرت نبوی اور خلفائے راشدین کے مبارک حالات پر مشتمل ہے کتاب کا اختتام امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت پر ہوتا ہے۔

فاضل مترجم نے اصل ترجمہ کے علاوہ بعض واقعات کو تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے اور اس سلسلہ میں انہوں نے زاد المعاد فی ہدی خیر العباد، تالیف ابن قیم جوزی دمشقی، سیرۃ ابن ہشام، کامل ابن اثیر، ابو الفداء اور فتوح البلدان وغیرہ مستند کتب سے استفادہ کیا ہے! مولوی شبیر حسین قریشی صاحب نے اردو ترجمہ کی نظر ثانی فرمائی ہے اور ذیلی عنوانات کی تبویب کی ہے۔ اس کتاب پر مولانا عبدالقدوس ہاشمی نے عالمانہ پیش لفظ لکھا ہے، ان کے اس پیش لفظ سے لفظ "خلدون" کے اصل ماخذ کا پتہ لگا۔

"اہل مغرب یعنی تونس و مراکش کے لوگ اپنے لب و لہجہ میں زید کو زیدون اور عبدہ کو عبدون کر دیتے ہیں اسی طرح انہوں نے خالد کو بھی "خلدون" کر دیا۔ انہی خالد بن عثمان کی اولاد "ابن خلدون" کے نام سے مشہور ہے۔
(خالد بن عثمان حضرت وائل صحابی رسول اللہ کے پوتے تھے۔ جو حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں مجاہدین کی ایک جماعت کے ساتھ بہ نیت جہاد تونس آئے اور یہیں رہ پڑے)

کتاب کا ترجمہ سلیس رواں اور عام فہم ہے، حسن تبویب نے ترجمہ کو متن سے بھی زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے، حیرت ہے کہ دو تین مقامات پر "بے نیل مرام" کو "بے نیل و مرام" چھپنا پڑا، عربی دانوں کے یہاں اور ایسی فاحش غلطی! ممکن ہے کہ یہ کاتب اور پروف ریڈر کی کارستانی ہو۔

"اور نصیحتانہ باتیں کرنے لگے" (صفحہ ۴۹) اردو میں "نصیحتانہ" کون بولتا ہے۔ "اہل قلعہ تیر و پتھر برساتے تھے" (صفحہ ۱۸۱)

"واز عطف" کا دیوان کے لئے تکلیف دہ حد تک غلط استعمال ۔۔۔ "ناقہ کا پہلا منقر بن الحرث کے ہاتھ میں تھا" (صفحہ ۵۰۵) "پہلا" تو

---

[1] ابن خلدون کی اس تاریخ کا نام ۔ کتاب العبر و دیوان المبتدا و الخبر فی ایام العرب والعجم والبربر و من عاصرہم من ملوک الترک ۔۔۔ ہے!

بالاتفاق مؤنث ہے "

" دیباچے نیز اور جبل مقطم " (صفحہ ۳۶۸) پر کتابت کی غلطی ہے۔ جبل مقطم " (ع کے بغیر) صحیح املا ہے۔ اسی طرح صفحہ ۴۰۴ پر "سبذہ" کی جگہ "زبدہ" چھپ گیا۔ "تشتر" پڑھ کر بھی دل میں کھٹک پیدا ہوئی کہ یہ غالباً "تستر" ہوگا!

تاریخ ابن خلدون کے اس ترجمے کو کوئی شک نہیں اُردو ادب میں قابلِ قدر اضافہ کہا ہے۔

علم جدید کا چیلنج از جناب وحید الدین خاں رکن مجلس تحقیقات و نشریاتِ اسلام ندوۃ العلماء لکھنؤ۔ ضخامت ۲۴۰ صفحات، کتابت و طباعت دیدہ زیب۔ ملنے کا پتہ :- مجلس تحقیقات و نشریاتِ اسلام، ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

اس کتاب کے ابواب کی فہرست حسبِ ذیل ہے۔

مخالفین مذہب کا مقدمہ —— تبصرہ —— استدلال کا طریقہ —— کائنات خدا کی گواہی دیتی ہے —— دلیل آخرت —— اثباتِ رسالت —— قرآن، خدا کی آواز —— مذاہب اور تمدنی مسائل —— جس زندگی کی ہمیں تلاش ہے —— آخری بات۔

محترم وحید الدین خاں صاحب بلند پایہ دینی مفکر ہیں، اُن کا مطالعہ بھی بہت وسیع ہے اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے علم و مطالعہ کے ساتھ اُن کی زندگی بھی دینی ہے جو خشیت و انابت سے لبریز ہے۔ اس کتاب کی تمہید میں انہوں نے لکھا ہے۔

> "یہ عجیب حسنِ اتفاق ہے کہ اس کتاب کے ساتھ دو ایسی شخصیتوں کے نام وابستہ ہیں جو پچھلی چوتھائی صدی سے ہندوپاک میں دین کا نمایاں ترین نشان سمجھی جاتی رہی ہیں، میری مراد مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے ہے! یہ بالواسطہ طور پر مولانا مودودی ہی کا فیض ہے کہ چند سال پہلے، اپنی زندگی کے ایک نازک ترین مرحلے میں، میرے دل میں اس احساس نے غلبہ پایا کہ میں اپنی زندگی کو خدمتِ دین کے لئے وقف کردوں، جس کا ایک قاعدہ مظہر یہ کتاب ہے —— اور محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ اس آغاز کا حسنِ انجام ہیں، کیونکہ یہ انہی کی ذات والا صفات کا فیض ہے جس کی وجہ سے یہ کام اپنی موجودہ شکل میں تکمیل کو پہونچا۔"

اس قدر صراحت کے ساتھ واضح طور پر اعتراف، یہ دلیل ہے لکھنے والے کی شرافتِ نفس اور خلوص و حق پسندی کی! ورنہ آج کی دنیا میں تو شاگرد اپنے اساتذہ سے انحراف کرتے ہیں اور اپنے محسنوں اور تربیت کرنے والوں کو کوئی کریڈٹ دینا نہیں چاہتے۔

مقدمہ کتاب میں فاضل مصنف لکھتے ہیں :-

> "موجودہ دور میں فکر و استدلال کا انداز بالکل بدل گیا ہے اس لئے موجودہ دور کا علم کلام بھی پچھلے کے مقابلہ میں بہت کچھ مختلف ہوگا، اگر یہ بات ذہن میں ہو تو کتاب کے مباحث کے بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہو سکتی۔"

اس کتاب کا آغاز مذہب کے خلاف مخالفین مذہب کے مقدمہ سے ہوتا ہے، یعنی وہ مذہب کے بارے میں کیا بدگمانیاں، اوہام، شکوک اور اعتراضات رکھتے ہیں؛ اس کے بعد لائق مصنف نے مخالفین مذہب کے اس "مقدمہ" پر تبصرہ فرمایا ہے اور اُن کے ایک ایک اعتراض کا جواب دیا ہے۔

فاضل مصنف نے دلائل کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ سائنس دانوں اور فلسفیوں کے استدلال کے طریقہ میں کیا نقص پایا جاتا ہے اور یہ لوگ بے شعوری طور پر فطرت اور دین سے قریب تر ہوتے ہوتے کس طرح بہک جاتے ہیں! اس کتاب میں عقلی و نقلی دلائل کے ساتھ ثابت کیا گیا ہے کہ کائنات خدا کی گواہی دیتی ہے اور بتاتی ہے کہ میں اتفاقیہ طور پر وجود میں نہیں آگئی میرا کوئی خالق اور بنانے والا ہے جو مجھے بنا کر مجھ سے غیر متعلق نہیں ہو گیا بلکہ اس کی ربوبیت نظامِ کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے!

"آخرت" کا موضوع خالص مابعد الطبیعاتی ہے، اور مادہ پرست ذہن اس موضوع کو سن کر سخت خلجان میں مبتلا ہو جاتا ہے مگر جس کتاب میں "آخرت" پر ایسی ذہنی، معقول اور فطری دلیلیں لائی گئی ہیں کہ طبیعت میں ذرا سا بھی حق پسندی کا جوہر ہو، تو اُسے قائل اور مطمئن ہو جانا ہی چاہئے۔ اس کے بعد منطقی دلائل سے اثباتِ رسالت کیا ہے، آٹھویں باب میں بتایا ہے کہ قرآن کریم خدا کی آواز ہے! مذہب اور تمدنی مسائل کی تفصیل پیش کرتے ہوئے اس حقیقت کو ثابت کیا گیا ہے کہ خدا کا قانون ہی ان مسائل کا صحیح اور فطری حل ہے۔

"آخری بات" کتنی حقیقت آفرین اور دماغ افروز ہے:۔

"لاکھوں ایسے لوگ جو خدا کو نہیں مانتے اور پرستش کو بے معنی چیز سمجھتے ہیں وہ اپنے خود ساختہ بتوں کے آگے جھک کر اپنے اندرونی جذبۂ عبودیت کو تسکین دیتے ہیں یہ حقیقت ہے کہ "الٰہ" انسان کی ایک فطری ضرورت ہے، اور یہی اس کا ثبوت ہے کہ وہ حقیقی ہے، انسان اگر خدا کے سامنے نہ جھکے تو اس کو دوسرے اہنوں کے سامنے جھکنا پڑے گا، کیونکہ "الٰہ" کے بغیر اس کی فطرت اپنے خلا کو پُر نہیں کر سکتی۔" (ص ۲۴۸)

اور

"مگر بات صرف اتنی نہیں ہے، اس سے آگے بڑھ کر میں کہتا ہوں کہ جو لوگ خدا کے سوا کسی اور کو اپنا معبود بناتے ہیں، وہ ٹھیک اسی طرح حقیقی سکون سے محروم رہتے ہیں جیسے کوئی بے بچہ کی ماں پلاسٹک کی گڑیا خرید کر بغل میں دبائے، اور اس سے تسکین حاصل کرنا چاہے، ایک ملحد انسان خواہ وہ کتنا ہی کامیاب کیوں نہ ہو اس کی زندگی میں ایسے لمحات آتے ہیں، جب وہ سوچنے پر مجبور ہوتا ہے کہ حقیقت اس کے سوا کچھ اور ہے جو ابھی پائی ہے۔"

فکر و تحقیق کے اس قسم کے لعل و گہر اور جواہر سے یہ خریطہ دین و دانش روشن و تابناک ہے! کتاب ان جملوں پر ختم ہوتی ہے:۔

"انسان! آج ہی سن لے، کیونکہ کل تو سنے گا، مگر اس وقت تیرا سننا بے کار ہوگا، آج ہی سوچ لے کیوں کہ موت کے بعد تو ... پچھتائے گا، مگر اس وقت کا سوچنا تجھے کام نہ آئے گا، خدا کا راستہ تیرے سامنے کھلا ہوا ہے، خدا کی کتاب کو اپنی زندگی کا دستور بنا، آخرت کے دن کے لئے تیاری کر، یہی تیری کامیابی کا راستہ ہے اسی میں وہ زندگی چھپی ہوئی ہے جس کی تجھے تلاش ہے۔"

ڈارونزم ہو یا مارکسزم و یا سائنس دانوں اور فلسفیوں کے دوسرے مکاتیبِ فکر، اس کتاب میں ان غلط اندیش دانشوروں کے افکار کی بنیادی غلطیوں کا تجزیہ کر کے بتایا گیا ہے کہ ان کی گمراہی کا اصل سبب کیا ہے؟ یہ عظیم کتاب مثبت انداز میں خدا، رسالت اور آخرت کی تائید اور منفی انداز میں مادہ پرستی اور بے خدا فکر کی تردید کرتی ہے، مسائل کی تجزیہ و تحلیل کا انداز کس قدر عالمانہ ہے، کتنے بڑے بڑے ملحد اور خدا ناشناس اہل فکر اس کتاب کے دلائل کی روشنی میں غلط اندیش نظر آتے ہیں!

فاضل مصنف نے جو بات کہی ہے عقل و استدلال کی پوری قوت کے ساتھ کہی ہے، خدا ناشناس منکرین کے نظریوں اور دلیلوں کو کس قدر مطمئن کرنے والے انداز میں توڑا ہے، سائنسی ذہن میں کیا خرابی ہے اس کا حال مصنف کی زبان سے سنئے:۔

"اگر یہ استدلال نظریہ ارتقاء کو حقیقت قرار دینے کے لئے کافی ہے تو یہی استدلال بدرجہا زیادہ شدت کے ساتھ مذہب کے حق میں موجود ہے، ایسی حالت میں نظریہ ارتقاء کو سائنسی حقیقت قرار دینا اور مذہب کو سائنسی ذہن کے لئے ناقابلِ قبول ٹھیرانا صرف اس بات کا مظاہرہ ہے کہ آپ کا مقدمہ اصلاً "طریق استدلال" کا مقدمہ نہیں ہے بلکہ وہ نتیجہ سے متعلق ہے، ایک ہی طریق استدلال سے اگر کوئی خاص طبیعاتی نوعیت کا واقعہ ثابت ہو تو آپ فوراً اُسے

جبرئیل نے اعداد گردی الٰہیاتی (وحیت کی چیز ثابت ہو تو آپ اسے رد کر دیں گے، کیونکہ یہ نتیجہ آپکو پسند نہیں"

اور

- اوپر کی بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ کہنا صحیح نہیں کہ مذہب ایمان بالغیب کا نام ہے اور سائنس ایمان بالشہود کا۔ حقیقت یہ ہے کہ مذہب اور سائنس دونوں ہی ایمان بالغیب پر عمل کرتے ہیں، مذہب دراصل اشیاء کی اصل اور آخری حقیقت متعین کرنے کا دائرہ ہے۔ سائنس اسی وقت تک مشاہداتی علم ہے، جب تک وہ ابتدائی اور خارجی مظاہر پر کلام کر رہی ہو جہاں وہ اشیاء کی آخری اور حقیقی حیثیت متعین کرنے کے میدان میں آتی ہے، جو مذہب کا اصلی میدان ہے تو وہ بھی ٹھیک اسی طرح "ایمان بالغیب" کا طریقہ اختیار کرتی ہے جس کا مذہب کو الزام دیا جاتا ہے۔"

یہ کتاب بتاتی ہے بلکہ اس کی شہادت دیتی ہے کہ فاضل مصنف کا مطالعہ بہت وسیع ہے اور انہوں نے سائنسدانوں اور فلسفیوں کی اصل کتابوں کو پڑھا ہے ـــــ کتاب کی زبان منجھی ہوئی اور اسلوب نگارش سادہ و پُر کار ہے، نازک سے نازک مباحث سلجھا کر پیش کیے ہیں۔ ایک دو جگہ زبان کی لغزش محسوس ہوتی ہے۔ مثلاً صفحہ ۳۰ اور ۳۱ پر "سپننگ" کو مؤنث لکھا ہے اور صفحہ ۲۹۰ کے اس جملے میں ـــ

- "اس وقت کا سوچنا تجھے کچھ کام نہ آئے گا"

"تجھے" کی جگہ "تیرے" لکھنا چاہئے تھا۔

- "علم جدید کا چیلنج" بلند پایہ کتاب اور اُردو ادب کا قابل قدر سرمایہ ہے، اس کے مطالعہ سے ایک طرف معلومات میں اضافہ ہوتا ہے، اور دوسری طرف ملحد مفکرین کا فکری اور عقلی مقابلہ کرنے کے لئے اس کے مطالعہ سے دلیلیں ہاتھ آتی ہیں! یہ کتاب زیادہ سے زیادہ اشاعت کی مستحق ہے دوسری زبانوں میں بھی اس کا ترجمہ ہونا چاہئے!

مقام غالب

محمد موسیٰ خاں کلیم، پرنسپل گورنمنٹ کالج نوشہرہ، ضخامت ۲۵۶ صفحات (خوشنما جلد) قیمت چھ روپیہ پچاس پیسے، ملنے کا پتہ "سلسلہ نئی تحریریں" بیرون مشت نگری گیٹ پشاور۔

غالب پر سب سے پہلی کتاب (یادگار غالب) مولانا الطاف حسین حالی نے لکھی اور اُس کے بعد سے غالب پر جو کتابوں کا سلسلہ شروع ہوا ہے تو وہ آج تک جاری ہے! اردو دنیا غالب کی ذات اور اُس کے فن سے جو محبت کرتی ہے اس محبت اور تعلق خاطر کی بدولت غالب پر ہر کتاب شوق و دلچسپی کے ساتھ پڑھی جاتی ہے! مولانا محمد حسین آزاد نے آب حیات میں غالب کو وہ مقام نہیں دیا جس کا وہ مستحق تھا یادگار غالب کے بعد غالب کی شرح پر سب سے بلند کتاب ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کا مقدمہ ہے، جس کا یہ پہلا جملہ ہی ضرب المثل بن کر رہ گیا کہ ـــ

"ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں، وید مقدس اور دیوان غالب"

گزشتہ ربع صدی میں دو شخصیتیں غالب پرستند کہی گئی ہیں، جنہوں نے غالب سے متعلق بلند پایہ کتابیں لکھی ہیں ریسرچ کی ہیں، یہ دو شخصیتیں (مالک رام ایم۔اے اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی رامپوری) "غالبیات" پر "گائڈ" کا درجہ رکھتی ہیں!

اب غالب کی شخصیت کی تعمیر اور اُس کے فکر و فن پر جناب محمد موسیٰ خاں کلیم کی یہ کتاب منظر عام پر آئی ہے جو اپنی جگہ اس موضوع پر کوئی شک نہیں ایک منفرد کتاب ہے! فاضل ناقد نے انتہائی دل نشین انداز میں غالب کے آرٹ کی تشریح کی ہے اور ایسے ایسے شاعرانہ نکتے بیان کئے ہیں جو وجدان کو چونکانے کے ساتھ، ذوق و طبیعت کو فرحت و انبساط بخشتے ہیں! پوری کتاب انتہائی دلچسپ ہے جسے پڑھ کر ـــ

محسوس یہ ہوا کہ گلستاں میں آگئے

صرف ایک اقتباس :—

"اگر غور سے دیکھا جائے تو غالب کا نظریۂ عبادت ایک مجموعۂ اضداد ہے، اس میں خود سپردگی اور خودداری دونوں کی آمیزش ہے، وہ خصائص الٰہی کو اپنے اندر جذب تو کرنا چاہتا ہے مگر اپنے بشری خصائص کو کھو دینا گوارا نہیں کرتا۔ اسے قوت حاصل کرنے کا جنون ہے اور متاثر ہونے کا عشق! وہ جانتا ہے کہ خصائص الٰہی قوت کا خزانہ ہیں، انہیں اپنا کر وہ قوت کی انتہائی بلندیوں تک پہونچ سکتا ہے اور پہونچنا چاہتا ہے، لیکن وہ اس بات سے ڈرتا ہے کہ اس کی قوت کے حصول میں کہیں اپنے وجود سے دستبردار نہ ہونا پڑے۔ چنانچہ وہ کعبہ وا نہ ہو تو وہ الٹا پھر آنے کو تیار ہے۔"

ان چند جملوں سے فاضل ناقد کی رفعتِ فکر اور دیدہ وری کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

کتاب کی زبان خوب نہیں، بہت خوب ہے اور طرز نگارش خوب تر، یہ ایک جملہ :—

"ایسے جواہر پارے لعل سے اٹے پڑے ہیں" (صفحہ ۲۶)

کھٹکا "پٹے پڑے ہیں" لکھنا تھا، "اٹنا" گرد و غبار کے لئے بولا جاتا ہے، اسی طرح :—

"میز اور کرسیاں گرد سے اٹ گئیں"

صفحہ ۵۲ پر غالب کے جن ہم عصر شعراء کا ذکر کیا ہے اُن میں مولانا صہبائی کا نام آنے سے رہ گیا۔

"اگرچہ مولانا فضل حق خیرآبادی کے اصرار پر غالب نے اس تحریک کے خلاف ایک مثنوی بھی لکھ ڈالی تھی، لیکن واقعات اس امر کے شاہد ہیں کہ خود غالب کا مسلک وہی تھا جس کی اس تحریک میں تلقین کی گئی تھی۔ یعنی تقلید کے خلاف جہاد"

شاہ اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک دراصل "شرک و بدعت" کے خلاف جہاد تھا، اس تحریک سے غالب کے افکار و عقائد نے کوئی اثر قبول کیا ہو اُس کی زندگی اور تحریروں سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، جو شخص یہ کہتا ہو —

مشغولِ حق ہوں بندگیٔ بوتراب میں

اُس کے بارے میں یہ بات کیسے مانی جا سکتی ہے کہ وہ شاہ اسمٰعیل شہید کی غیر مقلدیت اور "توحیدی افکار" سے متاثر تھا!

مرزا غالب پر تفضیلیت بلکہ ایک حد تک "شیعیت" کا آخر تک غلبہ رہا، شیعیت کا مسلک بہرحال تقلید کا مسلک ہے اور جب مرزا غالب یہ کہتے ہیں :—

سہ شیعی کیونکر ہو ماوراء النہری

تو وہ "تقلید جامد" کا اعلان کرتے ہیں، کیونکہ علماء ماوراء النہر تو حنفی مذہب کی تقلید میں بہت متشدد تھے۔

مولانا فضل حق کا اس کتاب میں کئی جگہ ذکر آیا ہے، حیرت ہے کہ لائق مصنف نے اُن کی اصل شخصیت یعنی اُن کے "منطقی" ہونے کا ذکر نہیں کیا!

"معاصرینِ غالب میں سب سے بڑی شخصیت سرسید احمد خاں کی ہے مگر یہ وہ بھی اس ماحول کی پیداوار ہے جس نے غالب اور اُس کے رفقاء کی تربیت کی" (ص ۶۸)

سرسید احمد خاں مرزا غالب سے کم از کم بائیس سال چھوٹے تھے۔ اُن کا شمار غالب کے کمسن ہم عصروں اور خوردوں میں کیا جا سکتا ہے —

"غالباً یہ عمر کا پہلا موقع تھا، جب کہ غالب کو ادبی مخاصمت کے باعث اس قدر تلخ کام ہونا پڑا، اس تلخی کر [illegible]

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں — اک تیر میرے سینہ میں مارا کہ ہائے ہائے (صفحہ ۱۰۲)

یہ وہ قطعہ ہے جو غالب نے کلکتہ کی سیر و تفریح اور وہاں کی رنگین صحبتوں کی یاد میں کہا ہے اس میں کسی تلمیح کا ہرگز ذکر نہیں ہے۔ افسوس نہ تو اس قطعہ کے پہلے شعر کو دوسرے اشعار سے جو مسلسل ہیں، علیحدہ کر کے پڑھا اور اس کے بارے میں غلط رائے قائم کی۔

"غالب نہ تخیل کی سحرکاریوں میں کھو جاتا ہے اور نہ عقل کی رعنائیوں پر مرمٹتا ہے" (ص ۲۵۶)

یہ جملہ لفظی طور پر تو دلکش ہے مگر معنوی لحاظ سے الجھی ہوئی سی ہے۔ پھر "عقل کی رعنائی" خاص طور سے محل نظر ہے کہ "رعنائی" عقل کی صفت نہیں ہے
"مطلب" کی بجائے "مرتب دیالیس" (ص ۶۷) — "فصوص الحکم" کی جگہ "خصوص الحکم" پڑھ کر طبیعت نے وحشت محسوس کی یہ کتابت کی غلطیاں معلوم ہوتی ہیں —— کوئی شک نہیں "مقام غالب" اونچے درجہ کی تنقیدی کتاب ہے!

حضرت اکبر کے شب و روز

مرتبہ: محمد رحیم دہلوی۔ ضخامت ۲۷۶ صفحات (مجلد رنگین گردپوش) قیمت پانچ روپے
ملنے کا پتہ: مکتبہ رضیہ، جناح ہاؤس اللس روڈ، کراچی ۳

جناب محمد رحیم دہلوی اٹھارہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ سال دو سال میں اُن کی ایک نہ ایک کتاب آتی رہتی ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے حضرت اکبر الٰہ آبادی کی تحریروں کے اقتباسات سے اُن کے شب و روز بلکہ یوں کہیے اُن کی "سیرت" کو مرتب فرمایا ہے۔

اس کتاب سے حضرت اکبر ہی کی زبانی معلوم ہوا کہ "لسان العصر" کا خطاب میر غلام بھیک نیرنگ نے اکبر کے لئے تجویز کیا، جسے عوام و خواص کی تائید اور قبولیت حاصل ہوئی۔ سر سید احمد خاں کے بارے میں اکبر لکھتے ہیں ——

"معلوم نہیں پرانی نظموں کو تہذیب نسواں صاحب کیوں لے بیٹھے، سب کو معلوم ہے کہ سر سید احمد خاں صاحب مرحوم نہ صرف پردے کے حامی تھے، بلکہ لڑکیوں کو سرکاری اسکول میں جانے اور جدید کورس پڑھنے کے مخالف تھے، اور اپنے نظام سے مذہبی تعلیم ہی کو مناسب سمجھتے تھے۔"

کاش! ہمارے جدید تعلیم یافتہ نوجوان اور خاص طور سے ان کے سرپرست اور ارباب حل و عقد اس حقیقت پر غور کرتے کہ اسکولوں اور کالجوں کی تعلیم و تربیت نے مسلمان لڑکیوں کی سیرت و کردار پر کتنا غلط اثر ڈالا ہے! اور یہ "مخلوط تعلیم" تو اخلاق و شرافت اور عصمت و پاکبازی کے لئے شیشہ خطرناک سے لبریز ہے! سر سید احمد خاں اب سے ستر اسی (۷۰ — ۸۰) سال پہلے ان خطروں کو محسوس فرما چکے تھے۔

اُن کے صاحبزادے عشرت حسین مرحوم کی زبان سے اکبر الٰہ آبادی کے آخری لمحات میں موصوف کے دینی شغف کی کیفیت ملاحظہ فرمائیے۔

"خواجہ صاحب کے پہونچنے سے دو دن پہلے غشی طاری ہو گئی تھی، لیکن جمعرات اور جمعہ کی درمیانی شب میں یکایک ہوش آگیا، بیٹھ گئے اور کہا قرآن شریف اور عینک لاؤ، بتایا گیا رات ہے، نگاہ پر زحمت ڈالئے، بولے تلاوت اور تہجد ناغہ کر دوں، یہ جملہ ختم کرتے ہی بے ہوش ہو گئے۔"

اس زمانہ میں تو ایسی باتیں کرامت معلوم ہوتی ہیں! یہ ہمارے وہ اسلاف اور مشاہیر ہیں، جن کی زندگیوں میں ہمارے لئے اچھا نمونہ ہے۔

طبیعت اس قصہ سے بہت مایوس ہوتی ہے — کہ بے یاد خدا بھی زندگی محسوس ہوتی ہے

سچ کہا اکبر الٰہ آبادی نے، جس زندگی میں "یاد خدا" نہ ہو وہ موت سے بدتر ہے۔

؎ کتابت میں "کلکتہ" لکھا ہے بہتر یہی ہے کہ "مدینہ" "مکہ" "کلکتہ" "مانسہرہ" "دوآبہ" یعنی PROPER NOUNS (اسماء معرفہ) میں اصل نام کے املا میں چاہئے وہ کسی حالت میں واقع ہو، تبدیلی نہ کی جائے مگر تلفظ "ے" کے صوتی اظہار کیا تو کہا جائے!

"حضرت اکبر معمولی حیثیت سے سشن جج بلکہ کہنا چاہیئے ، ہائی کورٹ کے جج تک ہو گئے تھے" (صفحہ ۱۲)

یہ بات غلط ہے اکبر ہائی کورٹ کے جج نہیں ہوئے ۔ سیشن جج ہی سے اُن کی پنشن ہوئی اور اُس زمانہ میں ایک ہندوستانی کے لئے یہ بہت بڑا عہدہ تھا ۔

"ہز آنر کو سلام کرنے اگر گیا تو بڑی خوشی ہوگی"

فٹ نوٹ میں فاضل مرتب نے "ہز آنر" کو ـــــ آنریبل مسٹر آر برن سی ، ایس ، آئی ، چیف سکریٹری صوبہ متحدہ ـــــ بتایا ہے ؛ حالانکہ اس زمانہ میں "ہز آنر" کا لقب لفٹنٹ گورنر کے نام اور عہدے کے ساتھ استعمال ہوتا تھا ۔

اس کتاب کے چند منتخب اشعار :ـــ

ہر اک کو موت کا اک دن پیام آئے گا
خدا کا نام لئے جاؤ ، کام آئے گا

اگرچہ تلخ ملا جام ، ظرف ہی کا
مگر گلہ نہیں ساقی سے بد رنگ نی کا

اب جو کفر سے معروف ہیں سرگوشی میں
ہوش آئے گا انہیں موت کی بے ہوشی میں

جب یہ دیکھا کہ جہاں میں کوئی میرا نہ رہا
شکستِ یاس سے میں آپ بھی اپنا نہ رہا

گھر کو چھوڑے ہوئے مدت ہوئی صیاد مجھے
کس چمن میں تھا نشیمن یہ نہیں یاد مجھے

انہی کی مطلب کی کہہ رہا ہوں زبان میری ہے بات اُن کی
انہی کی محفل سنوارتا ہوں چراغ میرا ہے رات اُن کی

خدا کی پاک پکارتا ہوں ہوا کرے ناخوشی بتوں کو
مری غرض کچھ نہیں کسی سے تو پھر مرا کوئی کیا کرے گا

چل بسے اسبابِ غفلت ، چشمِ عبرت رہ چکی
میری ہستی تھی بھی کیا اور تھی جو کچھ وہ ہو چکی

اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبر الٰہ آبادی کے اپنے دور کی کن شخصیتوں سے کیسے تعلقات تھے ، اُن کی خانگی زندگی کے بعض معمولات کیا تھے ! حضرت اکبر کے سوانح حیات پر یہ بالکل نئے انداز کی کتاب منظر عام پر آئی ہے ۔

دیوار ابد

پروفیسر منظور حسین شور ، ضخامت ۱۷۶ صفحات (مجلد ، رنگین سرورق) قیمت ۵ روپے پچاس پیسے ۔
ملنے کا پتہ :ـــ مکتبہ عم ، بجوانہ بازار ، لائل پور

پروفیسر منظور حسین شور تقسیم ہند سے قبل بھی معروف اور مقبول تھے ، احباب تو اُن کی شہرت اسکندریہ میں موج دریا کی طرح رواں دواں ہے شروع شروع میں شور صاحب کا تعارف ناگپور ، جبل پور ، امراؤتی ، رائے پور ... یعنی یوں کہئے کہ سی ۔ پی تک محدود تھا ، مگر وہ پھر چند برس میں ہندوستان کے ہر خطے میں متعارف ہو گئے ، ان کی شہرت میں کسی پروپیگنڈے کا ہاتھ نہیں ہے ، اپنے فن کی قوت کے سہارے وہ مشہور ہوئے ہیں !

اپنے اس مجموعہ کلام پر انہوں نے خود مقدمہ لکھا ہے جس میں بتایا ہے کہ آرٹ کیا ہے ! اس کے کیا لوازم اور محرکات ہوتے ہیں اور ہونے چاہئیں ۔ یہ ایک فکر انگیز مقالہ ہے !

پروفیسر شور کے کلام میں بڑا تنوع پایا جاتا ہے ، غزل کے علاوہ انہوں نے مختلف موضوعات پر بڑی معرکہ کی نظمیں کہی ہیں ، اظہار خیال کے لئے وہ اردو کی جن ترکیبوں سے کام لیتے ہیں ، اور ابلاغ کے لئے جو اسلوب اختیار کرتے ہیں اُس نے اُن کی شاعری میں انفرادی آہنگ پیدا کر دیا ہے ۔ اُن کی شاعری میں وقری کی چہکار بھی ہے اور تلوار کی جھنکار بھی ہے ۔

منتخب اشعار :ـــ

کتنے بیگانے فضا میں جذب ہو کر رہ گئے
کتنے دریا اپنے طوفانوں میں کھو کر رہ گئے

وقت کا طوفان اسی صورت سے بڑھتا جائے گا
یہ طلسم ساحلوں کی سمت بڑھتا جائے گا

عمر کی دھوپ سے رکھے تجھے خدا محفوظ
غبار وقت سے میلا تمہارا شباب نہ ہو

ہونٹوں کے اک تبسم لطیف کی موج سے
بے لفظ و صوت نغمے سناتی چلی گئی

موجوں کے پیچ و تاب کو میں سوچتا رہا
وہ ساحلوں کے خواب دکھاتی چلی گئی

اک بحر بے کنار تمنا میں ڈوب کر
مجھ کو بھی اپنے ساتھ بہاتی چلی گئی

میرا نالہ بھی تیری رسوائی
میرا نغمہ بھی درد کا غماز

کارواں ہنستے چلیں، یا قافلے ہوں اشکبار
تپتے صحراؤں کے سینوں سے تو اٹھیں گے غبار

زمزموں سے جو دیپ جل نہ سکے
آنسوؤں سے جلائیں گے ہم تم

افق کا منہ اجالا دھو رہا تھا
خلا میں چاند کرنیں بو رہا تھا

سیاہی خاک پہ بنتی ہوئی جال
خوشی وقت کو دیتی ہوئی تال

بجھے کتنے چمن پھولوں کی لو سے
بڑھی کیا تیرگی سورج کی ضو سے

فلک پہ میکدے پر تولتے ہیں
فرشتے کھڑکیاں سی کھولتے ہیں

بادل آئے کلیاں چٹکیں، پھول کھلے مرجھائے
تیری گلی سے ہم جو نکلے پھر نہ پلٹ کر آئے

ڈگر ڈگر سب ساتھی چھوٹے کوئی سنگ نہ آئے
اس جیون میں جو بھی جس کے سنگ چلے پچھتائے

برکھا رت پپیہا چھیڑ رہی ہے بھولے بسرے راگ
من مندر میں آگ لگی ہے جاگ پجاری! جاگ

رواں دواں تھی زمیں پر مسرتوں کی برات
سجی ہوئی تھی دلہن، رویت ہلال کی رات

"تضاد آدم" ایک نظم کا عنوان ہے، اس کے چند بند کتنے اچھے ہیں:—

کھاتا ہے ہر جلوس میں ملک و وطن کا غم
چلتا ہے لے کے دین و مساوات کا علم
لیکن جلا کے دین و مساوات کا چراغ
گھر خود بھی آدمی کا جلاتا ہے آدمی

گرداب سے بھی ربط ہوا سے بھی ہے ستیز
کشتی سے بھی لگاؤ ہے ساحل سے بھی گریز
کشتی کا ناخدا ہے مگر اس کے باوجود
طوفاں بھی ساحلوں سے اٹھاتا ہے آدمی

مریخ زیر دام قمر پر بھی ہے کمند
رفعت میں کہکشاں کی بلندی سے بھی بلند
لیکن جہاں دکھاتا ہے پستی ضمیر کی
تحت الثریٰ میں ڈوب بھی جاتا ہے آدمی

نظم "بہمات"* کے دو شعر:—

گھرے ہوئے ہیں شہر میں سیہ پوش گھٹائیں — یا بر سرِ پرواز ہیں شاعر کے خیالات
لہراتی ہے اس طرح شبِ تار میں بجلی — جیسے کسی چلمن سے نکلتا ہو کوئی ہات

(خونیں سہاگ) یہ کون دشت ہے جس کے سیاہ مست غزال — خنک ہوا ہے مجھی میں دل فگار اے ساقی
خبر بھی ہے کہ ترے میکدے سے کتنی بار — گذر چکا ہوں میں بیگانہ وار اے ساقی

(ورقت. بنام ایشیا) حال میرا نقشِ پا، ماضی مرے صحرا کی خاک — آخرت میری قبا دنیا مرے دامن کا چاک
میں کلیسا کی نوا میں نغمۂ دیر و حرم — میں مسیحا کی شریعت میں ہوں گوتم کا دھرم
قدسیوں کی بندگی خلوت نشینوں کا درود — جبہ و دستار کے آنسو، تقدس کے سجود
میرا اک پرتو اندھیرا، ایک پرتو آفتاب — میری اک کروٹ بڑھاپا میری اک کروٹ شباب
انتقامِ حسن چہروں سے جہاں لیتا ہوں میں — زنگیوں کے ہاتھ میں آئینہ دیتا ہوں میں

(صبح بہار) پردے رُخِ جاگیر و معاشت سے اٹھا کر — گرداب ندو نسیم کے بالوں کو بدل دیں
یا بچۂ کنجشک و کبوتر بھی ہو آزاد — یا وحشتِ تمدن کے عقابوں کو بدل دیں

(یقین محکم) اگر دو چار غنچوں کو ہنسی آئی تو کیا آئی — ہم اس گلشن کے ہر غنچے کو خنداں کر کے چھوڑیں گے
گہر کا ذکر کیا، اس بحرِ پایاں کے سینے میں — خزف ریزوں کو بھی لعلِ بدخشاں کر کے چھوڑیں گے

(ایک دور افتادہ دوست کے نام)

جوشِ جنوں میں عالمِ سود و زیاں نہ دیکھ — دامن ہو چاک چاک تو پھر دھجیاں نہ دیکھ
منزل ہو سامنے تو کڑی دھوپ سے نہ ڈر — رستے میں چل تو سایۂ ابرِ رواں نہ دیکھ
طوفاں بجسم ہو تو کسی موج کو پکار — ساحل پہ ڈوبتی ہیں کہاں کشتیاں نہ دیکھ
طوفاں سے کر کلام، ہوا کا مزاج پوچھ — اُڑتے ہوئے پروں میں فقط بادباں نہ دیکھ
جلوے میں آفتاب سے کچھ تو بھی کم نہیں — تاریک ہو زمیں تو سوئے آسماں نہ دیکھ
رُک جا کسی حبیب کی دیوار کے قریب — گلیوں کا سوگ، شہر کی ویرانیاں نہ دیکھ

(زبانِ دل) یہ بجلیوں کے نشیمن، ہوا کے گہوارے — یہ آسماں یہ دنیائے نیل کے دھارے
سروں پہ بارِ مہ و کہکشاں اٹھائے ہوئے — دلوں میں برق و شرر کی چمک چھپائے ہوئے
یہ کہہ رہے ہیں ترے صبح و شام کچھ بھی نہیں — کہ ملتوں میں مقامِ غلام کچھ بھی نہیں
اسیر ہوں تو امیر و امام کچھ بھی نہیں
جہاں میں حلقہ بگوشوں کا نام کچھ بھی نہیں

---

* "فضا" لانا تھا، تاکہ "ہوا" کی تکرار نہ ہونے پاتی۔

(نورجہاں)

عدم میں جس کے ستاروں نے غسلِ نور کیا — زمیں کو جس کی جبیں نے سوادِ طور کیا
یہ بے چراغ تری قبر، یہ فضا سنسان — یہ تیرے سینۂ نازک پہ ظلمتوں کی چٹان
کسی کنیز کو بستر سے اٹھ کے دے آواز — کہ اک چراغ تو ہو تیری رات کا دم ساز

ابھی تو خود ہی اندھیرا ہے رہگزاروں پر
ابھی تو "نور" کا دھوکا ہے چاند تاروں پر

(ایک ہم نشیں سے)

اگر خیال ہو آزاد تو قفس بھی چمن — چمن سے تا بہ قفس ایک ہی خیال کی جست
حلیفِ برق بھی ہیں، خالقِ بہار بھی ہیں — کہ ہیں اسیرِ نشیمن، نہ ہیں بہار پرست
یہ دہر جس کو سمجھتا ہے ظلمتوں کا غبار — اسی غبار میں سورج بھی ہیں چراغ بدست

(ملکۂ زمان)

زلف کا سایہ جبیں کی صبح پہ تلتا ہوا — مرمریں سینہ شفق کی موج میں دھلتا ہوا
وہ بھرے بازو وہ تنگی قبائے زرنگار — جیسے اٹھتا درد، جیسے بند کلیوں کا نکھار
جو گھٹا میں ڈوب جائے وہ بدرِ منیر — آہ! وہ آہو جو کھا جائے حرم میں آ کے تیر

(فاروقِ معظم)

آنسوؤں سے دیدۂ جمہور جب ہوتا ہے نم — خون سے ڈھلتا ہے اکثر پرچمِ منصور و مجسم

زندہ باد! اے ابرِ نیساں! اے بہاروں کے رسول
اور کچھ تھوڑی سی شبنم اور کچھ تھوڑے سے پھول

(عظمتِ آدم)

سرنگوں ہو کے نہ کر عظمتِ آدم کو ذلیل — جس کو سجدہ ہو سزاوار وہ سر پیدا کر

(شکستِ پندار)

ظلمتوں کے جگر چاک ہونے لگے — بحر و بر منہ اجالے سے دھونے لگے
کہ سمجھے ہمیں مظہرِ نور ہیں — دشت بولے ہمیں وادیِ طور ہیں
دھوپ ڈھلتی رہی یہ چلتا رہا — وقت کروٹ پہ کروٹ بدلتا رہا

(نگاہ و ماہتاب)

شبنم بھی ہے آواز، شگوفہ بھی صدا ہے — بے ساز بھی بیدار ہے نغمہ مرے آگے
ہر شام سیہ پوش ہے پیغمبرِ انوار — ہر شب ہے تجلی کا صحیفہ مرے آگے
خود میری نگاہوں سے تو روشن ہیں مہتاب — زہرہ ہے نہ پرویں نہ ثریا مرے آگے
جس سے نہ ڈھلے سینۂ آدم کی سیاہی — توہینِ عبادت ہے وہ سجدہ مرے آگے

(خفاش)

کسی عارض پہ تابانی نہیں ہے — منور کوئی پیشانی نہیں ہے
تجلی ہے کہ طغیانِ شبِ تار — ہے آئینہ کہ آئینے کا زنگار

(خورشید)

خطا میری تجلی کی نہیں ہے — نظر تیری ہی ظلمت آفریں ہے
جہاں نغموں پہ بہرے خندہ زن ہوں — جہاں گونگے کلیمِ انجمن ہوں
جہاں سینوں میں ہو قبروں کی تنگی — جہاں ہنستے ہوں آئینوں پہ زنگی
جہاں شبنم کو دریا کا ہو پندار — جہاں تنکوں سے شرمندہ ہوں کہسار

(عرفانِ ذات)

میرا طرزِ سخن میرا اندازِ فن — نغمہ بار پہ تیشۂ کوہکن

میری آواز، آوازِ کون و مکاں   تیرا نغمہ، فقط نغمۂ انجمن
تجھ کو نالے کا دکھ مجھ کو نغمہ کا غم   تو ہلاکِ قفس، میں ہلاکِ چمن

پردہ چہ کشم ز رخِ معنیٔ ادراک   با تیرہ شباں، نیر تاباں چہ فروشم
نغمہ چہ سرایم بہ حریفانِ گراں گوش   نو در سرِ خورشید بکیساں چہ فروشم
با تیرہ نہاداں چہ کنم غالب گفتار   با بیگ رساں گوہرِ غلطاں چہ فروشم

ہر نظر اک سرودِ بے آواز   ہر نفس چنگ و تار کا عالم

ہر تجلی کے لئے ظرفِ نظر ہے درکار   جلوہ اندازی ہے مگر اس قدر ارزاں بھی نہیں
آنکھ ایسے میں جھپک جائے تو پھر کیا ہوگا   اس کا داماں بھی نہیں پا گریباں بھی نہیں
قافلے ہیں کہ گزرتے ہی چلے جاتے ہیں   منزلیں ہیں کہ کسی سمت نمایاں بھی نہیں
گل کا کیا ذکر کہ اے دوست مرے دامن پر   ایک مدت سے کسی خار کا احساں بھی نہیں

تو نے مرے درد کا درماں کیا   اور بھی کچھ درد سوا ہو گیا
دل کو اپنی تباہی کا کچھ غم نہ تھا   اس کی آنکھوں کا ارشاد مبہم نہ تھا
اس سے پہلے بھی سو بار دھڑکا تھا دل   دل دھڑکنے کا لیکن یہ عالم نہ تھا
غنچہ اپنے تبسم پہ مجبور تھا   غنچہ کب محرمِ رازِ شبنم نہ تھا
خون ٹپکا تھا نا بہ مری آنکھ سے   موجِ کوثر نہ تھی آبِ زمزم نہ تھا
چلتے چلتے جب اس شوخ ہم تک گئے
اپنا رخ حادثوں کو بدلنا پڑا

دوسرا رخ :—

نغمے کیا کیا وادیٔ ایام میں روپوش ہیں   کتنے جلوے گردِ صبح و شام میں روپوش ہیں   (ص ۱۵)

نغمے سازمیں پوشیدہ یا خوابیدہ ہیں۔ اس طرح تو بولتے، لکھتے اور شعر میں بھی نظم کرتے ہیں، مگر وادیٔ ایام میں نغموں کا روپوش ہونا اس میں تو بالکل پایا جاتا ہے!

یہ بادلوں کا تنفس یہ سرد سرد ہوا   یہ سنسناتی ہوائیں یہ بولتے ہوئے ساز   (ص ۱۷)

"بادلوں کا تنفس" نئی ترکیب ہے کہیں کہئے نئی دریافت ہے، مگر جی کو نہیں لگتی! پھر بادل نہ ہوں تو بھی سرد ہوا چلتی ہے مگر اس شعر میں سرد ہوا کو بادلوں کا تنفس کہا گیا ہے، اگر بادلوں کے تنفس سے بادلوں کی گرج مراد ہے تو بھی بات کچھ بنی نہیں ——— پھر ایک ہی مصرعہ میں "ہوا" اور دوسرے مصرعہ میں "ہوائیں" کی تکرار ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !!

کسے خبر تھی کہ تجھ کو پکارتے اے دوست ۔۔۔ انھی فضاؤں میں کھو جائے گی مری آواز

شعر میں کوئی خاص لطف نہیں !

تھپک کے جن کو سلائے گی رات بھر شبنم ۔۔۔ وہ غنچے صبح کی لو سے بھی کپکپائیں گے

"تھپکنے" کے فعل کی ہواؤں سے تو مناسب درست ہے مگر "شبنم" سے یہ نسبت کہ وہ غنچوں کو رات بھر تھپک تھپک کر سلائے گی، مشاہدہ اور قرینہ کے خلاف ہے! "صبح کی لو" بھی محل نظر ہے۔

تجھے بھی یاد ہے ان بدلیوں کے سائے میں ۔۔۔ تری نگاہ نے توڑے ہیں کتنے پیمانے ۔۔۔ (ص ۱۸)

"پیمانوں" سے غالباً "دل کے پیمانے" مراد ہیں۔ ایسے موقعوں پر محذوفات (جس طرح اس شعر میں "دل کے" محذوف ہے) وجدان کو کھٹکتے ہیں! اگر شراب کے پیمانے مراد ہوں تو ان کو وہ نگاہ توڑ سکتی ہے، جس نے سحر یزم کی مشق کی ہو کہ کسی کانچ یا شیشہ کی بنی ہوئی چیز پر نظر ڈالی اور اسے چھن سے توڑ دیا۔

مری نگاہ میں رقصاں ہیں سینکڑوں طوفاں ۔۔۔ مگر خدا کرے کوئی موج تجھ کو جگا ئے ۔۔۔ (ص ۱۹)

کس چیز کے طوفان؟ ارمانوں کے، امید و شوق کے۔ اس کی طرف اشارہ کرنا ضروری تھا! پھر ان طوفانوں کی موج محبوب کو جگا کس طرح سکتی ہے!

غمازئ نگاہ سے دل کو اچھال کر ۔۔۔ طوفان ساحلوں سے اٹھاتی چلی گئی ۔۔۔ (ص ۲۲)

"غمازئ نگاہ" سے اس شعر میں شاعر نے کس مفہوم کی ترجمانی کی ہے؟ پھر "غمازئ نگاہ" سے دل کا اچھلنا اس پر مستزاد! "ساحلوں" سے شاید دل مراد ہیں جو پہلے خاموش تھے، محبوب کی "غمازئ نگاہ" سے وہ حرکت و جوش میں آگئے!

دہکا کے ہر نفس میں غم آرزو کی آگ ۔۔۔ پھولوں سے گلکدے کو جلاتی چلی گئی

"پھولوں" سے شاعر کی کیا مراد ہے؟ یہ پھول، جن کو انگریزی میں "FLOWER" اور فارسی میں "گل" کہتے ہیں! اگر یہ معنی لے جائیں تو پھر "پھولوں" میں شدید ابہام پایا جاتا ہے! شاید "پھولوں" سے شرارے اور پتنگے مراد ہوں! اس صورت میں "پھول" کی جمع "پھولوں" نامانوس سی لگتی ہے۔ اس کے علاوہ "گلکدے" سے آخر کس طرف اشارہ ہے!

ناکردہ کاریٔ نگہ التفات سے ۔۔۔ پردہ مرے جنوں کا اٹھاتی چلی گئی

نگہ التفات کی "ناکردہ کاری" کیا بات ہوئی؟ "ناکردہ کاری" سے شاید "ناتجربہ کاری" مراد ہو! پھر "جنوں کا پردہ اٹھانا" اور زیادہ مبہم بات ہے۔

جن کی شراب تند میں گھلتا رہا سرور ۔۔۔ ان زمزموں سے مجھ کو رلاتی چلی گئی

شعر میں کس قدر آورد اور تکلف پایا جاتا ہے!

روشن فطرت پہ ہے جبیں زرد ماہ ۔۔۔ یا سلگتا ہے خیمہ شب بانہ ۔۔۔ (ص ۲۶)

"خیمہ شب بانہ" ممکن ہے فارسی کی کوئی خاص ترکیب ہو۔ مگر فطرت کے دوش پر "جبیں زرد ماہ" ہے، تو "خیمہ شب بانہ" کے سلگنے کی کیا تک ہے!

نیت مر مر سے تھراتی رہے شمع حیات ۔۔۔ شب کی وادی سے تو گزرے گی آجا تو نکلی برات ۔۔۔ (صفحہ ۲۹)

"نیت مر مر" کی ترکیب اکھڑی اکھڑی سی لگتی ہے۔ پھر جب "شمع حیات" کہا تھا، تو اس کے ساتھ "مر مر فنا" یا "مر مر حوادث" لانا ضروری تھا!

"کرفیو" بڑی اچھی نظم ہے جس کا پہلا شعر ہے:—

بت کدے ساکت و مبہوت، خرابات خموش ۔۔۔ نہ ہجوم سر بازار نہ کوچوں کا خروش

— مگر —

افسوس ہے کہ نظم جس شعر پر ختم ہوتی ہے وہ دوسرے شعروں کے مقابلہ میں کمزور ہے، حالانکہ اس شعر کو سب سے زیادہ بلند اور جاندار ہونا چاہئے:

شہر کی مات پہ الزام نہ آنے پائے
کوئی رستوں میں سرِ شام نہ آنے پائے (ص ۴۴)

"بہتے جزیرے" میں خاص تاثر پایا جاتا ہے، مگر یہ شعر ـــ

جنوں کو آئینہ دکھلا رہے ہیں — مری آنکھوں میں آنسو آ رہے ہیں

کھٹکتا ہے! آنکھوں میں آنسو آنے اور جنوں کو آئینہ دکھلانے کے مابین آخر کیا ربط اور مناسبت ہے۔

پھر اندھیروں کے اڑتے ہوئے شہر میں — ابر بجلی کے دیپک جلانے لگے (ص ۴۴)

"ابر" اردو میں عام طور پر جمع نہیں بولا جاتا! "ابپارہ" کی جمع البتہ آتی ہے۔

کچھ برہمن ہوئے شہر کے کینہ ساز — کچھ مسلماں خدا سے ڈرانے لگے

"کینہ ساز" کی جگہ کوئی اور لفظ لانا چاہئے تھا!

کالے کالے بادل ہیں یا جیون کا بیراگ — من کہتا ہے یت نہیں تو سارے جگ کو تیاگ (ص ۴۹)

"بیراگ" خلوت نشینی، ترکِ لذات، نفس کشی اور جوگ اور فقیری لینے کو کہتے ہیں! یہاں اس شعر میں اس لفظ سے کوئی کام لیا گیا ہے۔ شاعر شاید یہ کہنا چاہتا ہو کہ کالے بادل کیا ہیں گویا کہ زندگی نے فقیری کا بھیس بدل لیا ہے۔

زہرہ کا ترنم انساں تھا سورج کا تبسم ست تھا — تو ہنستی تھی میں ہنستا تھا جب رستا اپنا رستہ تھا (ص ۵۰)

"جب رستہ اپنا رستہ تھا" اس ٹکڑے نے شعر کا سارا لطف غارت کر دیا۔

طوفاں میں سفینہ آ ہی گیا ظلمت کا اجالا کوئی نہیں — کس راہ میں ٹھوکر کھاتا ہوں یہ پوچھنے والا کوئی نہیں (ص ۵۱)

"ظلمت کا اجالا" سمجھ میں نہیں آیا!

وقت کے ماتھے پہ ہے صدیوں کی دھول — مل رہا ہے چاند چہرے پہ بھبول (ص ۶۱)

"بھبول" کس زبان کا لفظ ہے جو بھبھوت یا بھبوت کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

اونگھتے سائے، شجر سوتے ہوئے — قصر سوئے، بام و در سوئے ہوئے

دوسرا مصرعہ یوں ہوتا ـــ

"قصر و ایوان بام و در سوئے ہوئے"

تو "سوئے" کی تکرار کا عیب باقی نہ رہتا!

صبح کی کرنوں سے بھر کر اپنا جیب — سی رہا ہے وہ اندھیرے کا غریب (ص ۶۴)

اندھیرے کا گریبان تو نہیں ہو سکتا، ہاں! صبح کے ساتھ گریبان کو مناسبت ہے، اس شعر میں "جیب" گریبان نہیں بلکہ "پاکٹ" کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور ہونا چاہئے، اس صورت میں "جیب" کو مونث نظم کرنا تھا! مصرعہ ثانی میں خاصہ تکلف پایا جاتا ہے۔

یوں ٹوٹ کے گرتی ہے کسی پیڑ پہ بجلی — جیسے کسی بھوکے کی سزا مرگِ مفاجات

بھوکے کی سزا "مرگِ مفاجات" بے جوڑ سی بات ہے ہاں! غلامی اور کمزوری کی سزا مرگِ مفاجات ہوتی ہے! ـــ

سست شعروں کو چست کر دیا جاتا! مجموعی طور پر "دیوار ابد" لائق مطالعہ ہے، قابل ذکر ہے اور داد و ستائش کی مستحق ہے!

پندرہ روزہ "ساغر" کا "شمشیر ایڈیشن" اور "آزادی ایڈیشن"

مدیر:- نسیم ساقی

"شمشیر ایڈیشن" کی قیمت تیس پیسے، اور "آزادی ایڈیشن" کی قیمت بھی تیس پیسے،

ملنے کا پتہ:- "ساغر" پوسٹ بکس ۱۱۲۴، کراچی۔

پندرہ روزہ "ساغر" برسوں سے پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے اس کے مضامین عام طور پر دینی و اخلاقی کے ترجمان اور ملک و ملت کے لئے مفید ہوتے ہیں۔ اس کی یہ دونوں خاص اشاعتیں "آزادی ایڈیشن" اور "شمشیر ایڈیشن" مضامین کی تنوع اور ترتیب کے اعتبار سے خوب ہیں، جن کے مطالعہ سے طبیعت کو جوش اور ولولہ ملتا ہے اور ساتھ ہی دعوت غور و فکر بھی!

توقع ہے کہ "ساغر" کے خصوصی شمارے قبول عام حاصل کریں گے، جناب ساقی کی کوششیں تحسین و ستائش کے لائق ہیں۔

والن ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ
منگھا پیر روڈ
کراچی
باوانی
ہر قسم کا
سوتی اور
اونی کپڑا
کورا اور دھلا لٹھا اور
ہر قسم کا
دھاگا
تیار ہوتا ہے
باوانی والن ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ کا تیار شدہ کپڑا
ہر اعتبار سے قابل اعتماد ہے پاکستان کی صنعت کی قدر اور حوصلہ افزائی
آپ کا قومی فریضہ ہے

آدم جی کے پارچہ جات
ACM
آدم جی کاٹن ملز لانڈھی۔ کراچی

نومبر ۱۹۶۶ء

ماھنامہ فاران کراچی
جلد: ۱۸
شمارہ: ۸

ایڈیٹر ــــــ ماہر القادری

ترتیب

نقشِ اوّل	ماہر القادری	۳
تفسیر	مولانا محمد مصطفیٰ (علی گڑھ)	۱۰
قرآن مجید کی خصوصیات	سید معروف شاہ (ایم۔اے)	۱۴
صحابہ کرام اور مولانا مودودی	ماہر القادری	۲۰
عالمگیر اور انگریز مورخین	مولانا شمس تبریز خاں آرزی	۲۷
روح انتخاب	سید احتشام ندوی	۴۴
سوز و ساز	مختلف شعراء	۴۶
ہماری نظر میں	. . . .	۴۸

چندہ سالانہ: سات روپے | پبلشر: مسرور حسین | قیمت فی پرچہ: ۶۲ پیسے

مقامِ اشاعت
دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی

مسرور حسین پبلشر نے انٹرنیشنل پریس کراچی میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ "فاران" کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اول

پاکستان ایک آزاد مملکت اور خود مختار حکومت ہے۔ وہ اپنے داخلی معاملات ہی میں نہیں خارجی پالیسی میں بھی آزاد ہے۔ یہ اس کی اپنی صوابدید پر منحصر ہے کہ پاکستان دوسری حکومتوں سے کس طور کے روابط اور تعلقات رکھتا ہے، خارجی مسائل میں غیر حکومتوں سے دوستی و دشمنی کا فیصلہ پاکستان کی اپنی مرضی اور حالات پر ہے، اس پر کسی دوسری حکومت کا دباؤ نہیں اور کوئی ایسا "حق" اور "فریضہ" نہیں جس کا ادا کرنا پاکستان پر واجب ہو!

پاکستان ایک نظریاتی ریاست ہے، جو اسلام کے نام اور اسلام کے نام پر وجود میں آئی ہے۔ اس لئے اس کی داخلی اور خارجی پالیسی کو اسلام (الدین) و اخلاق کا مظہر اور عکاس ہونا ضروری ہے، اسلامی تمدن کو نظر انداز کر کے اگر پاکستان کو کوئی مادی نفع حاصل ہوتا ہے، تو ہے۔

بے اصولی تجارت میں مسلمان کا خسارہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی حکومت کے سربراہ کی حیثیت سے کافر قوموں سے بھی معاہدے کئے ہیں اور ان کو حلیف بنایا ہے، اسی سنت پالیسی کے تحت پاکستان بھی غیر اسلامی حکومتوں اور لادینی ریاستوں سے روابط قائم رکھ سکتا ہے! یوں بھی آج کی دنیا میں کوئی حکومت بالکل الگ تھلگ اور راہبوں کی طرح دنیا سے کٹ کر اور بے تعلق ہو کر نہیں رہ سکتی۔

حکومتیں ضرورت کے وقت ایک دوسرے سے قرض اور مالی امداد بھی لیا کرتی ہیں، مگر قرض و امداد کا مسئلہ بڑا نازک اور دور رس نتائج کا حامل ہے! اول تو کسی سے قرض وام لینا کوئی تعریف کی بات نہیں ہے۔ کوشش اس بات کی کرنی چاہئے کہ کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے کی نوبت ہی نہ آئے کیونکہ تمام تر خودداری و تمکین کے باوجود دستِ سوال بہرحال دستِ عطا سے نیچا ہوتا ہے! اس پستی سے جہاں تک ممکن ہو سکے بچنے کی کوشش کرنی چاہئے! اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ذمہ دار افراد میں اپنی ذات اور خاندان کی منفعت کے لئے کوئی لالچ نہ ہو اور مالی استغنا ہو اور حکومت سے منفعت کے باب میں ان کا معاملہ بالکل صاف ہو، اس بے غرضی اور بے نفسی کی صورت میں حکومت کی اقتصادی پالیسی تمام تر اخلاص جذبہ ایثار پر مبنی ہوگی، حکومت کے ہر شعبہ میں کفایت شعاری اور جزرسی کا لحاظ رکھا جائے گا۔ تجارت اور صنعت و حرفت کی ہر پالیسی کسی خریدار تجارتی ادارہ کے نفع و نقصان کے تصور سے بے نیاز ہو کر مرتب ہوگی اور اس طرح مالی معاملات میں توازن قائم ہو جائے گا!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین اپنی ذات پر کم سے کم خرچ کرتے تھے، حکومت کی ظاہری شان و شوکت (POMP AND SHOW) اسراف و تبذیر کی کوئی مد ہی سرے سے موجود نہ تھی، پھر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ حکومت کی آمدنی کے ذرائع حلال تھے، جس کی بدولت رعایا کے نفس و ضمیر ہی نہیں گوشت پوست میں پاکیزگی رچ گئی تھی، اسی لئے وہاں کے غریب اور نادار عوام کے زوالِ نعمت کی آرزو نہیں رکھتے تھے اور مالداروں میں

اور صورت حال کا صحیح تجزیہ یہ ہے :

ہندوستان کی تقسیم بڑی ناسازگار فضا میں ہوئی، کانگریسی لیڈروں نے بادلِ ناخواستہ اس تقسیم کو ایک "حادثہ" کے طور پر گوارا کیا ہندوؤں کی اکثر ہندو جماعتیں اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ پاکستان کی تقسیم عارضی ہے، یہ نئی حکومت چل نہیں سکتی ، بھارت کو بہرحال ایک نہ ایک دن "اکھنڈ" بن کر رہنا ہے ! انگریز چلتے چلتے کشمیر کا قضیہ کھڑا کر گیا، جس نے دونوں ملکوں کے درمیان مستقل دشمنی کی طرح ڈال دی ! جب تک مسئلہ کشمیر کا منصفانہ فیصلہ نہیں ہو جاتا پاکستان اور ہندوستان کے تعلقات خوش گوار نہیں ہو سکتے !

امریکہ اور روس چاہتے تو کشمیر کا مسئلہ طے ہو سکتا تھا مگر ان کے اپنے مصالح کا یہی تقاضا ہے کہ مسئلہ کشمیر کھٹائی میں پڑا رہے اور پاکستان اور ہندوستان میں تناتنی رہے بلکہ ہمیشہ ٹھنی رہے ! اور روس کا یہ موقف رہا ہے کہ اس نے کئی بار سیکورٹی کونسل میں "ویٹو" کا حق استعمال کر کے مسئلہ کشمیر پر مذاکرہ ہی نہیں ہونے دیا ، روس کی اس روش کے نتیجہ میں ہندوستان استصواب رائے عامہ کے وعدے سے پھر گیا، اسے یہ کہنے کا حوصلہ پیدا ہوا کہ کشمیر کا مسئلہ تو بھارت کا داخلی مسئلہ ہے ـــ اور پھر یہ لے "اٹوٹ انگ" تک جا پہونچی، یعنی یہ کہ ہندوستان کے دوسرے علاقوں اور صوبوں کی طرح کشمیر بھی بھارت کا ایک حصہ ہے، جسے بھارت سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا !

روس کی اس روش کے بعد اس سے کیا توقع ہو سکتی تھی کہ معاہدہ تاشقند کی جدوجہد کے سلسلہ میں اس کی ہمدردیاں پاکستان کے ساتھ ہوں گی ـ

من جرب المجرب حلت به الندامه

کی ضرب المثل پوری ہو کر رہی ، آئینی اور دستوری جدوجہد کو پاکستان نے آزما کر دیکھ لیا، اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا اس مسئلہ کے تصفیہ کی آخری صورت جنگ ہی ہو سکتی تھی، جنگ کر کے بھی دیکھ لی، جس "فتح مبین" کے شور سے در و دیوار گونج رہے تھے، اس کا پھل "معاہدہ تاشقند" کی صورت میں ملا ـ

سہ تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

تاویلوں اور تعبیروں سے ہوئی بات ان ہوئی نہیں ہو سکتی ، اس معاہدہ کے بعد ہندوستان اس مسئلہ پر بات چیت کرنے کے لئے بھی تیار نہیں ہے ! بھارت کے وزیر ... نے دو ٹوک لفظوں میں کہہ دیا کہ معاہدہ تاشقند کے بعد کشمیر کا مسئلہ ہی سرے سے باقی نہیں رہا ـ

پاکستان اور ہندوستان کی جنگ میں روس کی ہمدردیاں پوری طرح ہندوستان کے ساتھ رہیں، وہ جنگ کے زمانہ سے اب تک ہندوستان کو اسلحہ دے رہا ہے !

امریکہ نے پاکستان کو قیامِ پاکستان کے بعد کسے مالی امداد بھی دی ہے اور سودی قرضہ بھی ، مگر اس کی سیاست اور چشم توجہ کا زیادہ جھکاؤ ہندوستان کی طرف رہا ہے جنگ کے زمانہ میں اس کا دستِ تعاون درپردہ بھارت کے لئے کھلا ہوا رہا ! بین الاقوامی دنیا میں امریکہ کا سب سے زیادہ قریبی دوست اور حلیف بھارت ہے ـ

چین کے ہم شکر گزار ہیں کہ اس کی دوستی، عزائم اور سیاسی موقف کا اندازہ کرنے کے بعد بھارت مشرقی پاکستان میں محاذ جنگ کھولنے کی ہمت نہ کر سکا، چین کی تمام تر ہمدردیاں پاکستان کے ساتھ تھیں

ہم اوپر تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں کہ امریکہ ہو یا روس، چین ہو یا کوئی دوسری حکومت ان سے تعلقات اور روابط قائم کئے جا سکتے ہیں، ان سے سیاسی اور تجارتی معاہدے بھی ہو سکتے ہیں ، مگر ان روابط و تعلقات اور معاہدوں میں ملک کی سالمیت ، وقار اور سب سے بڑھ کر اس نظریہ کی حفاظت لازم ہے جس کی بنا پر پاکستان وجود میں آیا ہے ـــــــ خاص طور سے چین اور روس سے تعلقات کا معاملہ بڑا ہی نازک، بلکہ یوں کہئے بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے اور اس سلسلہ میں کمال درجہ کی فراست اور احتیاط کی ضرورت ہے ـ اس کا سبب یہ ہے کہ یہ دونوں حکومتیں عقیدہ و عمل کے اعتبار سے کمیونسٹ ہیں اور کمیونزم کی اولین شرط خدا کا انکار ہے ! اور پاکستان کے وجود و بقا کا سارا دار و مدار خدا کے اقرار پر ہے، کمیونزم ایک ہی وقت میں بادشاہ کو

تحت مصادرہ من دالدئہ خدا کو عرش سے اُتار دینا چاہتا ہے۔ دین و اخلاق اور خدا اور رسول سے بیزاری اور کشش کمیونزم کے خمیر میں شامل ہے سو شخص دنیا کو اور خود اپنی ذات کو فریب دیتا ہے جو یہ کہتا ہے کہ میں کمیونسٹ بھی ہوں اور دیندار بھی ہوں!

بین الاقوامی دنیا میں کمیونزم کا اصل مد مقابل عیسائیت، ہندومت اور دوسرے روایتی مذاہب نہیں، بلکہ اسلام ہے! کمیونزم کا سب سے بڑا حریف اسلام ہے: اس کا سبب یہ ہے کہ دوسرے مذاہب تو چار بات کی چند رسوم اور عقائد سے اور زندگی کے بعض گوشوں سے تعلق رکھتے ہیں! اسلام مکمل ترین ضابطۂ حیات ہے جو زندگی کے ہر گوشے کو روشنی دیتا ہے، اسلام ہی تنہا وہ دین اور دستورِ حیات ہے جو ہر محاذ پر کمیونزم کا مقابلہ کر سکتا ہے، اسلام دینِ فطرت ہے اُس کے ہر نظریہ، قانون، ضابطہ اور عمل میں توازن پایا جاتا ہے، وہ توازن جو فطرت کے عین مطابق ہے، کمیونزم کا حال اس کے برعکس ہے وہاں انتہا پسندی اور عدم توازن کے سبب قدم قدم پر فطرت سے جنگ کرنی پڑتی ہے۔ کمیونسٹوں کی جہالت اور بے خبری کا یہ عالم ہے کہ روس کا جو بازُ جب چاند کے قریب پہنچ کر زمین پر واپس آتا ہے تو طنزیہ انداز میں کہتا ہے کہ مجھے تو چاند کی فضا میں کہیں خدا نظر نہیں آیا، اس مسخرے سے کوئی پوچھے کہ مذہب کی طرف سے کب اس کا دعویٰ کیا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ چاند یا سورج میں بیٹھا ہوا ہے اور جو کوئی چاند اور سورج میں پہنچ جائے گا وہ خدا کو دیکھ لے گا!

کسی ملک میں کیسا ہی اچھا نظام حکومت کیوں نہ پایا جاتا ہو، یہاں تک کہ وہاں مزدوروں کی حکومت قائم ہو، کمیونسٹ وہاں بھی چین سے نہیں بیٹھ سکتے ان کا مطمح نظر تو کمیونسٹ حکومت قائم کرنا ہے اور اس کے لئے وہ ہر حربے سے کام لے سکتے ہیں، مثلاً کسی ملک میں انتشار پھیلانے کے لئے مسافروں سے بھری ہوئی ریل گاڑی کو وہ پٹری سے اُتار سکتے ہیں اور بم سے اُڑا سکتے ہیں! زبان، رنگ، نسل اور قومیت غرض جس ذریعہ سے بھی کسی ملک کی وحدت اور سالمیت کو نقصان پہنچ سکتا ہے اور طبقاتی عصبیت کو شہ مل سکتی ہے اُسے ابھار نے اور بھڑکانے کا گُر کمیونسٹوں کو آتا ہے۔

پاکستان میں حکومتوں اور عوام کے درمیان خاصی کشمکش رہی ہے بعض مواقع پر عوام کے احتجاج نے بڑی شدت اختیار کر لی تھی اور یہ لے اتنی بڑھی کہ حکومت کے حکم سے گولی بھی چلی، عوام زخمی اور ہلاک بھی ہوئے! مگر پاکستان کی اُنیس سالہ تاریخ میں یہ امتیاز صرف کمیونسٹوں کو حاصل رہا ہے کہ شہید ملت لیاقت علی خاں مرحوم کے دورِ حکومت میں کمیونسٹوں نے مسلح طاقت کے ذریعہ حکومت کا تختہ اُلٹنے کا منصوبہ بنایا وہ تو اللہ تعالیٰ کا کرم ہوا کہ اس سازش کا بروقت علم ہو گیا ورنہ یہ سازش کہیں کامیاب ہو جاتی تو نہ جانے پاکستان کا کیا حشر ہوتا!

کمیونسٹ جس مقام پر بھی ہوتا ہے، اپنے مشن کے لئے کام کرتا رہتا ہے وہ کسی حال میں بھی اپنے مقصد اور مشن سے غافل نہیں رہتا، اُسے اپنے مقصد سے بڑی لگن ہوتی ہے!

واقعات و حقائق

برسوں سے ہم نے "فاران" میں کمیونسٹوں کی نقل و حرکت اور ان کی سرگرمیوں پر کوئی تنقید نہیں کی، ہاں، مشرقی پاکستان کے حالات کا جب تجزیہ کیا گیا ہے تو کبھی کبھار سرسری طور پر ان کا ذکر آ گیا ہے! ہم خیالی اندیشوں اور وہم و اشتباہ کی بنیاد پر کسی موضوع پر گفتگو کو پسند نہیں کرتے اور کوئی فرد یا گروہ چاہے وہ ہمارا مخالف ہی کیوں نہ ہو اُس سے بلاوجہ کی چھیڑ چھاڑ، ہم شرافت و انسانیت کی توہین سمجھتے ہیں! آج جس موضوع پر ہم گفتگو کر رہے ہیں اور جس بحث پر ہم نے قلم اُٹھایا ہے وہ کوئی خیالی مفروضہ اور وہم و اندیشہ کی بات نہیں ہے بلکہ کچھ واقعات ہمارے علم میں آئے ہیں جو اس تحریر و نگارش کا سبب بنے ہیں۔

بائیں بازو کے بعض ... [illegible] ... تھے اُن کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، یہ صورت حال خاصی تشویش کی ہے، ایک طرف اشتراکیوں کے معاملہ میں ڈھیل اور اغماض و چشم پوشی بلکہ کہیں کہیں حوصلہ افزائی بھی، دوسری طرف اُن کی ... [illegible] ... کا اثر و نفوذ! یہ اگر کاروان ... [illegible] ... قاعدے کے مطابق ... [illegible] ... ہوتے چلے گئے، تو اُس کے نتائج کتنے دوررس اور خطرناک ہوں گے!

پاکستان میں کمیونسٹ کیا کر رہے ہیں! اس کی ایک مثال، پی آئی اے ایمپلائز یونین کا آرگن "منشور" ہے جس کے سرنامہ پر —

"حیات و کائنات کا ترجمان"

مرقوم ہے۔

"منشور" کی جو اشاعتیں ہمارے سامنے ہیں، ان میں نومبر اور دسمبر ۱۹۶۵ء کے مشترکہ شمارے میں انڈونیشیا پر جو مضمون ہے، اس کا عنوان ہے۔

"امریکی محکمہ سازش کا نیا شکار ـــــ انڈونیشیا"

قائم کیا گیا ہے، یہ پورے کا پورا مضمون کیمونسٹ افکار کا ترجمان ہے، ایک دو اقتباسات :۔

● ـــ "بری فوج کی کمان سامراج دوست ناسوشن کے سپرد کی گئی اور پھر آہستہ آہستہ انہیں وزیر دفاع بھی بنا دیا گیا۔ سامراج دوست ناسوشن اور سامراج دشمن ایڈٹ کی سوئیکارنو کی مجلس مشاورت میں شمولیت ......"

● ـــ "یہ بات بالکل طے شدہ ہے کہ اول اول بری فوج کے سامراج نواز اور کیمونسٹ دشمن حلقوں نے کیمونسٹ پارٹی کی روز بروز کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے پیش نظر، فوجی بغاوت کرنے اور صدر سوئیکارنو کی حکومت کا تختہ الٹنے کی ناپاک سازش کی تھی"

کیمونسٹ خون ریزی کے ذریعہ انقلاب لانے کی کوشش کریں تو وہ پاک اور مقدس انقلاب ہوتا ہے مگر کیمونسٹوں کے خلاف جو تحریک چلائی جاتی ہے وہ "ناپاک سازش" ہوتی ہے! دنیا میں کیمونسٹوں کے علاوہ ہر حکومت کا تختہ الٹا جا سکتا ہے اور اسے الٹ جانا بھی چاہیے، جو کوئی کیمونسٹوں کا تختہ الٹنا چاہتا ہے وہ سامراج دوست ہے اور گردن زدنی ہے۔

● ـــ "ملائیشیا کے خلاف قائم شدہ محاذ کو کمزور کرنے والا، سامراج دشمن محاذ کی متحدہ طاقت کو کمزور و منتشر کرنے والا سامراج دوست ـــ انڈونیشی وزیر دفاع ناسوشن زندہ بچ جاتا ـــ یہ امریکی پٹھو بچ گیا اور اس نے ساری صورت حال بدل ڈالی ...."

مئی ۱۹۶۶ء کے "منشور" میں دنیائے عرب کی سب سے زیادہ فعال دینی تنظیم "اخوان المسلمون" کو "رجعت پسند" کا خطاب دیا گیا ہے :۔

● ـــ "مصر کے رجعت پسند عناصر کی جماعت اخوان المسلمون کی نظر میں ناصر مشرک اور کیمونسٹ ہے (اور تعریف یہ ہے کہ کیمونسٹوں کی نظر میں وہ بڑا انقلابی ہے) ــ اور اس کے لئے مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اس کا تختہ الٹ دیں۔ دراصل یہ رجعت پسند عناصر اپنے گھناؤنے مقاصد کو پورا کرنے کے لئے مذہب کا مقدس نام استعمال کرنے سے بھی نہیں شرماتے، حالانکہ وہ "اسلام" کے نام پہ وہی گھسا پٹا نظام واپس لانا چاہتے ہیں، جس میں زمینداروں کو کسانوں پر ظلم کی آزادی ہو ......" (صفحہ ۱۲)

اول تو یہ بات سو فیصدی غلط ہے کہ جمال ناصر کو اخوان "مشرک" سمجھتے ہیں، جمال ناصر اپنے تمام مظالم کے باوجود مشرک اور کافر نہیں ہے، اور پھر مظلوم "اخوان" پر گھناؤنے مقاصد پورا کرنے کا جو الزام لگایا گیا ہے وہ ثبوت کا محتاج ہے، کیا "اخوان" مصر میں شراب، زنا کاری، سود خواری، رشوت اور اسی قسم کی دوسری برائیوں کو رواج دینا چاہتے ہیں؟ حالانکہ وہ تو ان برائیوں کو مٹانے کے درپے ہیں۔ "اخوان" جیسی معقول، سنجیدہ اور انسان دوست مظلوم جماعت پر کیمونسٹوں کی طنز و ملامت دراصل ان "سرخوں" کے سنگدل ہونے اور اسلام و اخلاق سے کھلی ہوئی دشمنی کی دلیل ہے، اور عجیب "توارد" ہے کہ امریکہ کے مشہور جریدہ "ٹائم" اور "نیوز ویک" نے بھی کیمونسٹوں کی لے میں لے ملا دی ہے اور "اخوان" کو رجعت پسند قرار دیا ہے! جہاں تک اسلام دشمنی کا تعلق ہے روس اور امریکہ ایک ہی سطح پر آ جاتے ہیں جیسے اسلام ان طاقتوں کا "مشترک دشمن" ہے۔

● ـــ "جب تک مزدوروں اور کسانوں کی حکومت قائم نہیں ہوگی اس وقت تک معاشی استحصال، صوبائی تعصب، قومی امتیاز، لسانی جھگڑوں اور تہذیبی مسائل کا صحیح اطمینان بخش اور منطقی حل ناممکن ہے" (منشور ماہ جون ۱۹۶۶ء صفحہ ۰)

کیمونسٹ جب "مزدوروں اور کسانوں کی حکومت" بولتے ہیں تو اس سے ان کی مراد کیمونسٹ حکومت ہوتی ہے ؛ انہوں نے کھل کر پنے عزائم کا اظہار کیا ہے وہ پاکستان کے جس شعبہ، محکمہ اور ادارہ سے بھی تعلق رکھتے ہیں، وہاں وہ لا محالہ "کیمونسٹ نظام حکومت" قائم کرنے کے لئے یقین ہو کر یں گے !

● — "ہمارے روحانی فرمانروا جو ہمارے قیاس کے مطابق، چین کے بے دین لوگوں کو کلمہ پڑھانے گئے تھے، خود بھی بے دین لوگوں کا کلمہ پڑھتے ہوئے واپس لوٹے۔"

● — "چین کے خلاف امریکہ میں جتنا لٹریچر چھپتا ہے، محکمہ امور مذہبی کی جانب سے منگوا کر فری بانٹا جائے، نماز پڑھنے والوں کو بونس دیا جائے، پاکستانی عوام کے ایمان کو تازہ رکھنے کے لئے، سال میں کم از کم دو بار پا سبان حرمین کو بلوایا جائے، اسلامی بلاک بنانے کی عملی تیاریاں شروع کر دی جائیں، عالم اسلام کی مشترکہ فوج بنائی جائے، خلافت کو دوبارہ واپس لیا جائے، پاکستان کی جماعت صالحین کے تبلیغی مشن چین بھیجے جائیں اور چین اور سوشلزم کے خلاف پروپیگنڈا کرنے والے سیدوست موعلوں کو پنج ہزاری شش ہزاری منصب عطا کی جائیں، اور ملکی زبان عربی قرار دی جائے" (منشور — ۸ اگست ۱۹۶۹ء صفحہ ۴۹)

جلالۃ الملک شاہ فیصل نے اسلامی اتحاد کا جو نعرہ بلند کیا ہے، یہ اس نعرے کے خلاف دل کی بھڑاس نکالی گئی ہے، اسلامی اتحاد کی تحریک کے کیونسٹ کس طرح برداشت کر سکتے ہیں، وہ تو مسلمانوں کی صفوں میں انتشار اور پھوٹ ڈالنا چاہتے ہیں، مسلمانوں کے طبقہ میں ان کا نمائندہ "سجاد باقر" ہے جس نے اسلامی اتحاد کے نعرے کو سامراجی سازش قرار دیا ہے۔

سونظر کی ناتسلائی سے فریاد

کیمونسٹوں کی جرأتیں رفتہ رفتہ اتنی بڑھ گئی ہیں کہ وہ پاکستان میں رہ کر خدا کا مذاق اڑاتے ہیں، اسی رسالہ "منشور" کی مئی ۱۹۶۹ء کی اشاعت میں صفحہ ۲۶ پر یہ عبارت نظر آتی ہے ؛ —

"قیدی (چلاتا ہے) عوام تقدیر ہیں، عوام بے خطا ہیں۔
پہرہ دار — آدمی بے خطا ہے
قیدی — خدا مجرم ہے
صدائے بازگشت (بہت دور سے) مجرم، مجرم، مجرم
پہرے دار — خدا تم میں ہے
قیدی — اس خدا پر ہم قدرت حاصل کریں گے
پہرے دار — کیڑے، تم خدا کے خلاف کفر بکتے ہو
قیدی — کیا خدا کے خلاف میں کفر بک رہا ہوں، یا خدا انسان کے خلاف کفر بکتا ہے،
یہ قانون، یہ بھیانک قہر، یہ ناگزیر جرم، آدمی کو آدمی سے لڑانے والا، خدا کو انصاف کی عدالت میں پیش کرو، میں اُسے ملزم قرار دیتا ہوں . . . ."

پی، آئی، اے کے افسران اعلیٰ اور سٹاف کے کارکن دعوتاً الثقبال کے فضل سے مسلمان ہیں، اور کوئی مسلمان کسی حالت میں بھی اللہ تعالیٰ کی توہین برداشت نہیں کر سکتا، کیا یہ مضمون پی آئی اے کے ارباب حل وعقد کی نگاہ سے نہیں گزرا، اگر نہیں گزرا تو اس بے خبری کو آخر کیا نام دیا جائے، اگر گزرا ہے تو پھر اس مضمون پر شدید ترین ایکشن لینا چاہئے تھا، کوئی شریف آدمی اپنے ماں باپ کے بارے میں کوئی ہلکا لفظ بھی سننا گوارا نہیں کر سکتا، اللہ تعالیٰ کی شان میں

مولانا محمد مصطفیٰ (علی گڑھ)

یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ اِنَّا اَرْسَلْنٰکَ شَاھِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا وَّدَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا

اس پیاری آیت میں ہمارے پیارے رسول کے پیارے اوصاف نہایت جامعیت کے ساتھ بیان فرمائے گئے ہیں، حق سبحانہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:- اے نبی گرامی ہم نے آپ کو بھیجا اس حال میں کہ آپ ہیں گواہ اور خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے اور اللہ کی طرف اس کے حکم و قدرت سے بلانے والے اور ایک چراغ اُجالا کرنے والے۔

ایمان کی تو یہ ہے کہ یہ آیت حضور پُرنور کے لئے خداوند عالم کی جانب سے ایک منشورِ انعام ہے جس میں آپ کے فضائل و محامد پر ذاتی اوصاف اور صفاتِ پر بارگاہ قضا و قدر سے مہر صداقت ثبت فرمادی گئی ہے تاکہ جہاں آنحضرت علیہ السلام اس نعمت خاص کے شکریہ میں فریضۂ تبلیغ و ارشاد کی ادائیگی میں اور زیادہ سرگرم رہیں وہاں اہل عالم کو بھی بتا دیا جائے کہ آپ ایک رسول برحق اور نبی صادق ہیں، اب آپ ہی سے اسلام کا بول بالا رہے گا اور آپ ہی سے رہتی دنیا تک تمام میں اُجالا رہے گا۔

پس جن ہو یا انسان، عرب ہو یا عجم، جو بھی آپ کی دعوتِ توحید پر لبیک نہ کہے گا اور آپ کے ارشادات کو سمع قبول سے نہ سنے گا، وہ یقیناً گمراہی میں رہے گا اور مآل اس کے حصہ میں حیرانی و سرگردانی ہے ذلت و خواری اور رسوائی ہے۔

حق سبحانہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے نبی ہم نے آپ کو بھیجا، ہمارے سوا دوسرا کون ہے جو کسی کو رسول و نبی بنا سکے، پس آپ نبی صادق ہیں، نبی مصدق ہیں، آپ کی سیرت حمیدہ، آپ کے اخلاق محمودہ اور اُمّی و یتیم ہوتے ہوئے آپ کا یہ علم کثیر آپ کی صداقت نبوت پر شاہد عادل ہیں، پھر قرآن جو آپ کو عطا فرمایا گیا ہے وہ آپ کے دعوئے نبوت کی صحت پر ایک برہان قاطع ہے، ہاں ہاں وہ ایک دائمی معجزہ ہے اس لحاظ سے بھی کہ اس کے چیلنج (دعوۂ تحدی) نے شعرائے عرب اور بلغائے زمان میدان فصاحت و بلاغت کو ہمیشہ کے لئے ساکت و مبہوت کر دیا اور اس جہت سے بھی کہ علوم حقانی، معارف ربانی، اور تزکیۂ روحانی کے معاقد و مقاصد بہت سہل ممتنع طور پر ایسی مجازت، اس قدر جامعیت اور ایجاز السہام کے ساتھ اس میں بیان ہوئے ہیں کہ باوجود شاید اور کسی حیثیت سے بھی کہ اس کی پیش گوئیاں اور پیش گوئیاں ہمیشہ اخبار متواترہ، تجربات صادقہ اور حواس سلیمہ کی شہادت سے صحیح ثابت ہوتی رہی ہیں۔

ما حوربت قط الا عاد من حرب	اعدی الاعادی الیھا ملقی السلم
لھا معان کموج البحر فی مدد	وفوق جوھرہ فی الحسن والقیم

(قصیدہ بردہ)

یعنی قرآن پاک کے مقابلہ میں آکر بڑے سے بڑا دشمن بھی صلح کا طالب ہو گیا، مضامین قرآنی میں ایسا تقاضہ اور انبساط ہے جیسا سمندر کی موجوں میں ہوتا ہے اور اس کے معانی حسن و قیمت میں جواہر پر فوقیت رکھتے ہیں۔

مزید برآں علویات و سفلیات اور عالم جمادات و نباتات و حیوانات میں بھی بہت سے خارق و معجزات آپ کو عطا فرمائے گئے ہیں۔

اوّل یہ کہ آپ کی ذات بابرکات، آپ کا وجود باجود خود ایک معجزہ ہے، ایک نور ہے، اس لئے فرمایا:-

سِرَاجًا مُّنِيرًا ایک روشن کرنے والا چراغ۔

الفاظ۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب چراغ مستنیر ہی نہیں بلکہ منیر بھی ہو تو اپنے ماحول کو روشن کرے گا، اس کا ظل و سایہ بھی نہ ہوگا، روایات میں بھی ہے کہ کان لاظل لشخصہ فی الشمس ولا قمر لانہ کان نوراً (الشفا بتعریف حقوق المصطفیٰ للعیاض)

یعنی حضور کا سایہ نہ تھا نہ آفتاب میں نہ ماہتاب میں، آپ نور تھے، اس سے ذوقی طور پر مستنبط ہوا کہ نبوت میں بھی آپ کا کوئی ظل نہیں ہو سکتا وہ تو لطیف سے لطیف تر ہے۔

دوئم، شب معراج میں خانہ کعبہ سے مسجد اقصیٰ اور وہاں سے سمٰوات اور فوق سمٰوات تک سیر قلیل میں آپ کے گشت علی الارض، معراج جسمانی اور بعد از روحانی کی بین دلیل نہیں تو کیا ہے۔

سوم، آپ کے ایک اشارے سے قمر شق ہو گیا اور چونکہ قمر کا مزاج بارد رطب یعنی سرد تر ہے اس لئے اس احتمال کی بھی گنجائش کسی مخالف کو نہ رہی کہ وہ خود بخود شق ہو گیا ہوگا کیونکہ سرد تر چیز بغیر قسر قاسر کے شق نہیں ہو سکتی، آفتاب پر جو گرم و خشک ہے اگر یہ معجزہ واقع ہوتا تو خشک و مائی ایسا وہم پیدا کر سکتی تھی

بخاری میں حضرت جابر سے روایت ہے کہ نبی کریم خطبہ پڑھتے وقت درخت خرما کے ایک تنے سے تکیہ لگا لیتے تھے جو مسجد نبوی کے ستونوں میں سے ایک ستون تھا۔ جب حضور کے لئے منبر تیار ہو گیا تو اس پر جلوہ افروز ہونے اب کیا تھا، لگا وہ کھجور کا ستون فریاد کرنے اور قریب تھا کہ شق ہو جائے کہ حضور منبر سے اتر آئے اور اس کو چمٹا لیا، پس وہ اس بچے کی طرح جس کو رونے سے خاموش کیا جاتا ہے سسکیاں بھرنے لگا یہاں تک کہ اس کو قرار آ گیا، مراہب لدنیہ میں اس حدیث کو متواتر اور فتح الباری میں اسے مفید یقین کہا ہے اور صاحب شارق نے اس کے تواتر کا اقرار کیا ہے۔

لہ وحن لہ الجزع القدیم تحسرنا   فان فراق الحب ادھی المصائب

(قصیدہ ہائیہ انشاء ولی اللّٰہ دہلوی)

نال تو آپ شاہد ہیں خدائے قدوس کی وحدانیت کی، اس کی عظمت و جبروت کی، اس کی صفات کاملہ کی، اس کی قدرت وسیع اور علم کامل کی شہادت دیتے ہیں اور اپنی عبدیت و رسالت کا اقرار کرتے ہیں اشہد ان لا الٰہ الا اللّٰہ واشہد ان محمداً عبدہٗ ورسولہٗ

اور یہی نہیں کہ آپ محض شاہد ہوں، آپ مُبشّر بھی ہیں یعنی خدائے رحیم و کریم کی نعمتوں کی بشارت دیتے ہیں کہ جو اس کی اطاعت کرے گا اس کو یہاں بھی حیات طیبہ برکت و نصرت، نور و نشرح، سکون و طمانیت اور وہاں بھی جنت اور جنت میں دائمی عزت کے ساتھ رفیق اعلیٰ کی قربت۔

اور نذیر بھی ہیں یعنی خدائے ذوالجلال کے قہر و غضب اور اس کے عذاب دنیوی و اخروی سے ڈرانے والے کہ جو اس کی شریعت کے احکام کو خاطر میں نہ لائے گا اور اس کی محبت کو دل میں جگہ نہ دے گا وہ یہاں بھی ذلیل اور وہاں بھی خوار۔ خسر الدنیا والآخرۃ ہے۔

خلاصہ یہ کہ آپ خالق کائنات کے وعدے اور وعید اس کے بندوں کو سمجھا دیتے ہیں تاکہ جلب منفعت اور دفع مضرت کا مستحکم داعیہ لوگوں کو برائی سے روکے اور نیکی پر آمادہ کرے اور آہستہ آہستہ سب اپنے منعم حقیقی کی رضا اور دیدار کے طالب ہو جائیں۔

بظاہر نذیر کو مبشر پر مقدم ہونا چاہئے کیونکہ دفع مضرت اہم ہے جلب منفعت سے لیکن چونکہ رحمت الٰہی غضب الٰہی پر سبقت لے گئی ہے اس لئے مبشر کو مقدم کیا تاکہ معلوم ہو جائے کہ الوہیت کا تقاضا اعطائے نعمت و رحمت ہے۔ اور یہ محبوب حقیقی کی جانب سے محبت ہے۔ رہی سزا و عقاب، وہ بتقاضائے حکمت ہے

ہر چہ ہست از قامت ناساز بے اندام ماست   ورنہ تشریف تو بر بالائے کس کوتاہ نیست

لہ اور آپ کی رحمت سے ستون کہنہ بہت سی روایات میں ہے کہ محبوب کا فراق سب سے بڑی مصیبت ہے۔ (مصنف)

پھر اس کا بھی لحاظ ہے کہ یہاں بشیر نہیں کہا مبشر فرمایا، جس سے بہ نسبت بشیر کے رحمت کثیرہ و نعمت مزید کی طرف اشارہ ہے کیونکہ باب تفعیل میں بہ نسبت ثلاثی مجرد کے تکثیر ہوتی ہے، قربان جائیے اس دلربائی کے، نثار ہو جائیے اس لطف و کرم پر۔

پس تبشیر کے ذیل میں تمام اوامر و معروفات شامل اور انذار کے تحت میں تمام نواہی و منکرات داخل، حاصل یہ کہ آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام باری تعالیٰ کی ذات و صفات و افعال پر شہادت دیتے ہیں اور اس کے احکام (اوامر و نواہی) اور ثواب و عقاب بیان فرماتے ہیں۔

مقصود اس تبشیر و انذار سے یہ ہے کہ داعیاً الی اللہ آپ دلالت الی اللہ دیتے ہیں، رہ نا شناسوں کو اور بادیہ ہدایت اور گم شدگان بادیہ ضلالت کو مجلس انس و محفل قدس میں پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ مشکل مرحلہ چونکہ طے ہوتے ہیں باذنہٖ یعنی نہ محض اپنی انسانی طاقت و قوت سے بلکہ اللہ کے حکم اور اسی کی قدرت سے،

پس کیا کہنا اس شمع نبوت کا جس کی ضیا پاشی سے تاریک دل روشن ہو جاتے ہیں اور کیا کہنا اس سراج منیر کا جس کے نور سے ظلمات کفر و جہالت میں اُجالا ہو جاتا ہے

بلغ العلیٰ بکمالہ ، کشف الدجیٰ بجمالہ
حسنت جمیع خصالہ ، صلوا علیہ وآلہ
(شیخ سعدی)

(فائدہ) مبشراً ونذیراً میں یتلو علیہم آیاتہ اور داعیاً الی اللہ میں یعلمہم الکتاب والحکمۃ اور سراجاً منیراً میں ویزکیہم کی طرف بہت لطیف اشارے ہیں۔

اے جہاں‌بانی و شاہی راست برِ بالائے تو
زینت تاج و نگیں از گوہر والائے تو
اے حدیث شرع و حکمت با ہزاراں اختلاف
نکتۂ ہر گفتنہ شفقت از دل دانائے تو
آب حیوان از منقار بلاغت می چکد
طوطی خوش لہجہ یعنی کلک شکر خائے تو
(حافظ)

وانت لما ولدت اشرقت الارض وضاءت بنورک الافق
فنحن فی ذالک الضیاء وفی النور سبل الرشاد نخترق
(حضرت عباسؓ)

جب آپ پیدا ہوئے تو آپ کے نور سے زمین روشن ہو گئی اور افق جگمگا اٹھا، پس ہم اسی روشنی میں ہدایت کی منزلیں طے کرتے ہیں۔

فامسیٰ سراجاً منیراً وھادیاً
یلوح کما لاح الصقیل المھند
(حضرت حسانؓ)

آپ ایک روشن چراغ ہیں اور راہ نما ہیں اور سیف ہندی کی طرح چمکتا ہے

(انتباہ) حضرت عباس کے نعتیہ شعر میں حضور کو آفتاب سے استعارہ بالکنایہ کیا ہے اور جس بات کو حضرت حسان نے فامسیٰ سراجاً منیراً وھادیاً میں ادا فرمایا ہے قرآن کی بلاغت نے اسے سراجاً منیرا کے دو مختصر لفظوں میں بیان کر دیا۔

سراجاً منیرا

حضور کو سراج منیر سے استعارہ بالتصریح کیا ہے تشبیہ نہیں دی کیونکہ تشبیہ میں مشبہ بہ مشبہ سے وجہ شبہ میں افضل یا اقویٰ یا اظہر و اشہر ہوتا ہے اور سراجاً منیراً میں تنکیر تعظیمی ہے جس کے معنی یہ ہوتے کہ ایک غیر معمولی سراج منیر، سبحان اللہ کیا شان ہے اس سراج منیر کی، پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ وجہ جامع ضیا پاشی اور ازالۂ ظلمت ہے اور حضور بے شک جہل و ظلم، شرک و کفر، عقائد فاسدہ اور رسوم باطلہ کی تاریکی دور کرنے والے ہیں اسی واسطے تشبیہ نہیں فرمایا

---

[1] داعیاً الی اللہ باذنہٖ وسراجاً منیراً میں چونکہ واؤ عاطفہ ہے اور عطف تغایر پر دلالت کرتا ہے خواہ وہ اعتباری ہی کیوں نہ ہو اس لئے جائز ہے کہ داعی الی اللہ میں دعوت زبانی قالی مراد ہو اور سراج منیر میں زبان حالی، اور زبان حال زبان قال سے زیادہ فصیح ہوتی ہے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جن امور کی آپ دعوت دیتے ہیں اُن پر نہایت واضح دلیلیں پیش کرتے ہیں اور دلیل کا روشنی سے استعارہ بلاغت میں داخل ہے۔ (مصنف)

سید معروف شاہ (ایم اے)

قرآن مجید کی خصوصیات

اسلام اگر تفسیر کائنات ہے تو قرآن اس کا منشور ہے اور یہ وہ منشور ہے جس نے امت مسلمہ کے ذریعہ انسانیت کو خداوند تعالیٰ کا آخری پیغام اور آخری پسندیدہ نظام حیات عطا کیا، امت مسلمہ کو اسی پیغام کا حامل بنا کر ابدی زندگی اور سرفرازی عطا کی وہ یہ کتاب ہے جس نے تاریخ کے دھاروں کو موڑا اور اقوام وملل کی تقدیریں بدل ڈالیں۔

۱۔ قرآن کی تعلیمات آفاقی ہیں۔ قرآن کریم کی سب سے اولین خصوصیت یہ ہے کہ اس کی تعلیمات آفاقی ہیں ان میں کسی ایک رنگ، کسی مخصوص نسل کسی متعین گروہ اور کسی ایک گروہ یا کسی خاص قومیت کو ملحوظ نہیں رکھا گیا بلکہ تمام انسانیت اور ناس کے فلاح و بہبود کے لئے ہدایات دی گئی ہیں قرآن مجید میں بار بار یا ایہا الناس - ملک الناس، الٰہ الناس - کافۃ للناس وغیرہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ مثلاً کافۃ للناس بشیراً و نذیراً (تمام لوگوں کے لئے خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا) ھدی للناس (تمام لوگوں کے لئے ہدایت ہے) ایسے ہی الفاظ اور طرز خطاب سے تمام انسانیت کو یہ کتاب ہدایات دیتی ہے اور کسی آیت کا شان نزول کسی مخصوص واقعہ سے متعلق ہے تو اس میں بھی عمومیت کا رنگ جھلکتا ہے۔

قرآن کریم کی تمام تعلیمات خواہ وہ اصولی ہوں یا فروعی، کلیات ہوں یا جزئیات، اعمال ہوں یا عقائد، ایسے ہیں کہ وہ تمام انسانوں کے لئے بیک وقت تمام زمانوں کے لئے یکساں اور ہر ملک و قوم کے لئے ایک ہی طرح مناسب مفید اور قابل عمل ہیں۔ انسانی علم کے حدود جس قدر وسیع ہوتے جائیں گے اور انسانی معاشرہ جس قدر ترقی کرتا جائے گا اور انسانی زندگی کے دائرے جس قدر وسیع ہوتے جائیں گے قرآنی تعلیمات کی افادیت اور کلیت اور واضح ہوتی جائے گی۔ قرآن کریم ہر دور اور ہر زمانہ کی طلب ترقی کے لیے مشعل راہ اور چراغ ہدایت ہے۔

بعض نادان، معاندین اور مستشرقین قرآن مجید کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ محض عربوں کے لئے راہ ہدایت تو ہو سکتا ہے لیکن پوری کائنات کے لئے اس کو کتاب ہدایت قرار دینا محض تکلف ہے یہ اعتراض اس لئے اٹھایا جاتا ہے کہ قرآن کریم میں متعدد ایسے مسائل، عقائد اور اعمال زیر بحث آئے ہیں جن کا تعلق زیادہ تر عرب قوم ہی سے تھا مثلاً شرک اور اس کے متعلق استدلال۔ پھر وہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید کے اندر جو وجدانی طرز استدلال ہے وہ بھی عرب ذوق کی نمائندگی کرتا ہے۔ جنت اور جہنم کا تصور بھی عرب خیالات اور عرب معاشرے کے مطابق ہے مثلاً جنت کے باغات اور جہنم کا عذاب صحرائی ذوق کی عکاسی ہے۔

یہ اعتراض اس لئے درست نہیں ہے کہ قرآن کریم نے جو تعلیمات دی ہیں جن مسائل پر بحث کی ہے وہ یا ان کے مماثل مسائل اور حالات آج بھی موجود ہیں اس نے توحید کے اثبات اور شرک کی تردید کے لئے جو دلائل دیئے آج بھی ہر معاشرے اور شرک کے خلاف وہی دلائل دیئے جا سکتے ہیں۔ اس کے باوجود قرآن مجید نے جو اسلوب بیان اور طرز استدلال اختیار کیا ہے۔ اس کے اندر اگر عربیت کا رنگ ہے تو وہ اس لئے ہے کہ وہ قرآن کے اولین مخاطب عرب تھے سوال یہ ہے کہ قرآن مجید نے اظہار کا جو اسلوب اختیار کیا ہے اس کے سوا کوئی اور طرز بیان عرب کی سرزمین کے لئے کس طرح موزوں ہو سکتا تھا۔ حکمت خداوندی کا تقاضا یہ تھا کہ اسلامی تحریک کی ابتدا عرب ہو، وہاں اسی کو کامیابی اور غلبہ حاصل ہو اور اسی سے پوری دنیا میں پھیلے یہ حکمت خداوندی کا تقاضا یہ بھی تھا کہ قرآن مجید جو خود اپنے لئے دلیل اور معجزہ ہے

مستقل دین مقرر کر دیا ہے "تبیاناً لکل شیئ" یہ زندگی کی ہر ضرورت کی چیز کا بیان (یعنی حل) پیش کرتا ہے" مقصد یہ ہے کہ دین اسلام کو ایک مکمل نظام فکر و عمل کے طور پر بھیجا گیا ہے اور اس کی تعلیمات کے بعد انسان کسی دوسری تعلیم کا محتاج نہیں ہے یا یہ ہے کہ قرآن کریم نے اپنے دامن میں صحف اولین کی وہ بنیادی تعلیمات بھی محفوظ کر لی ہیں جن کی انسانیت کو ہمیشہ ضرورت رہے گی۔ اس نکتہ کی تفصیل بھی مناسب مقام پر آئے گی۔

۳۔ اس کی تعلیمات ٹھوس حقائق ہیں

قرآنی تعلیمات نہایت ٹھوس اور پائیدار ہیں اور ایسے اٹل حقائق ہیں، جن کو چودہ صدیوں میں کوئی فلسفہ رد نہیں کر سکا اور نہ اور وسائل کی گردشوں کے ساتھ کوئی نقطۂ نظر ان کو کمزور اور ناقابل عمل ثابت کر سکا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "ان ھذا القرآن یھدی للتی ھی اقوم" "یہ کتاب ایسی باتوں کی طرف راہنمائی کرتی ہے جو نہایت ہی مضبوط اور ٹھوس ہیں" یہ ایسے حقائق پر مشتمل ہے کہ زمانہ کی کروٹیں، علوم طبعی کے انکشافات، ذہنی ارتقاء اور معاشرتی تبدیلیاں غرض کوئی بھی عنصر ان تعلیمات کو کسی پہلو سے کمزور نہیں ثابت کر سکتا بلکہ ہوا یہ ہے کہ علم میں جس قدر اضافہ ہوگا اور ذہنی افق میں جس قدر وسعت پیدا ہوگی اس قدر قرآن مجید کی تعلیمات کی حقانیت اور پائیداری ہم پر واضح ہوتی چلی جائے گی "لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ" باطل نہ اس کے سامنے سے اور نہ اس کے پیچھے سے آ سکتا" یعنی قرآن کے اندر جو کچھ ہے وہ حق ہے اور اس کے خلاف جو کچھ ہے وہ باطل ہے لہٰذا وہ اس پر حملہ آور نہیں ہو سکتا۔ اگر "بین یدیہ" سے زمانۂ مستقبل لیا جائے اور "من خلفہ" سے زمانۂ ماضی لیا جائے تو یہ نکتہ اور زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔

یہاں یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ قرآنی تعلیمات کو اقوم ثابت کرنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ان کو کھینچ تان کر سائنسی انکشافات کے مطابق ثابت کیا جائے؟ وجہ یہ ہے کہ طبیعی انکشافات یا ان انکشافات کے فوائد، انسانی خواص اور مشاہدات یہ سب چیزیں ابدیت اور قطعیت کی حامل نہیں ہیں یہ ہو سکتا ہے کہ جس انکشاف کو دائمی حقیقت سمجھ کر قرآن سے اس کی مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہو، وہ اپنے اندر کوئی حقیقت ہی نہ رکھتا ہو اور مستقبل کے تجربات اس کو باطل ٹھہرا دیں گذشتہ ایک صدی میں سائنس، اسپیات اور دوسرے علوم کے بعض ایسے نظریوں کو قرآن کے مطابق قرار دینے کی کوششیں کی گئیں، جن کو مقبول عام ہونا نظر آیا، مگر کچھ مدت کے بعد وہی نظریئے کھوٹے سکے ثابت ہوئے اور قرآنی حقائق کی درخشانی اور بڑھ گئی، اس لئے ضروری ہے حق و باطل کا معیار قرآن کو قرار دیا جائے، اور جو نظریہ اس معیار پر پورا اترے اسے کسی جھجک کے بغیر رد کر دیا جائے۔

اس کا ایک پہلو یہ بھی قابل توجہ ہے کہ اگر ہم قرآن کی صداقت کو ثابت کرتے وقت اس کو جدید نظریات کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش کریں گے تو پھر قرآن تو معیار صداقت نہ رہے گا، معیار صداقت وہ نظریات ہوں گے انہی کو "اقوم" ماننا پڑے گا۔ حالانکہ یہ بات درست نہیں ہے۔

۴۔ آخری ہدایت

قرآن مجید اللہ کی آخری کتاب ہے، نزول کتب کے سلسلہ کو ختم کرنے کا شرف بھی قرآن مجید ہی کو حاصل ہے۔ جس کتاب کو اللہ کی آخری کتاب اور حضور سرور کائنات کو اللہ کا آخری نبی ماننے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انسانیت کو ہدایت پورے طور پر حاصل ہو گئی ہے اور اب اسے کسی نئی ہدایت کی ضرورت نہیں رہتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین" "لیکن وہ اللہ کے رسول اور نبیوں کے سلسلے کو ختم کرنے والے ہیں" ختم نبوت کا مسئلہ اس کا منصوص، اور اجماعی اور متفقہ مسئلہ ہے قرآن و سنت کی بے شمار نصوص اس کی نصاحت کرتی ہیں، دین اسلام کی تعلیمات کا مزاج کسی دوسرے نئے نبی یا کسی دوسری کتاب کے آنے کے امکان کا دروازہ قطعی طور پر بند کر دیتا ہے۔ اس بارے میں ہمیں کہیں کوئی اشارہ تک نہیں ملتا بلکہ بے شمار صریح ہدایات نقل میں ملتی ہیں۔ ترمذی شریف کی حدیث ہے "ان الرسالۃ والنبوۃ قد انقطعت فلا رسول بعدی ولا نبی" "رسالت اور نبوت کا دروازہ بند ہو چکا ہے لہٰذا میرے بعد کوئی نبی ہوگا اور نہ کوئی رسول ہوگا"

۵۔ قرآن کریم ناسخ کتب و شرائع

قرآن مجید دوسری آسمانی شریعتوں اور کتابوں کا ناسخ ہے چونکہ اس کی تعلیمات تمام انسانوں کے لئے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہیں اور زندگی کے ہر شعبے کے لئے ہیں۔ اس لئے اب کسی موقع پر کسی ایسی آسمانی تعلیم پر عمل کرنا درست نہ ہوگا جو کسی گذشتہ زمانے کے لئے مخصوص طور پر یا کسی خاص علاقہ کے لئے محدود طور پر اتاری گئی تھی، قرآن مجید اس سے پہلی آسمانی کتابوں کی اس حیثیت سے

تصدیق کرتا ہے کہ وہ ایک خاص وقت کے لئے نازل کی گئی تھیں ایمان کی اس حیثیت پر ایمان لانا تو اسلام کی شرط ہے لیکن ان کے نہ جانے کتنے فقہی احکام ہمارے لئے واجب العمل نہیں ہیں مسلمانوں کا یہ اجتماعی عقیدہ ہے کہ قرآن کریم اور نبی آخر الزماں کی شریعت کے ہوتے ہوئے سابقہ انبیاء سابقہ کی شریعت پر عمل کرنا موجب نجات نہیں ہے قرآن و حدیث کے صریح نصوص کے خلاف ہوگا اگر ہم اس معاملہ میں مداہنت کرکے نام نہاد وسیع المشربی کا ثبوت دیں۔ قرآن کریم انسانیت کا آخری منشور ہے، یہ تمام صحف سماوی کی مرکزی اور اصلی بنیادی تعلیمات کا جامع ہے، قرآن کے ہوتے ہوئے ابکسی صحیفہ کی ضرورت نہیں رہی۔

۶۔ تحریف سے محفوظ رہا

سابق کتب سماوی میں مسلسل تحریف ہوتی رہی انسان کی تعلیمات کو بدل کر رکھ دیا گیا نہ صرف معنوی تحریف پر اکتفا کیا گیا بلکہ لفظی تحریف بھی کی گئی۔ سابقہ امتوں نے تعلیمات الٰہی کے اس تمام حصے کو بھلا دیا جو انہیں بار بار یاد دلایا گیا تھا و نسوا حظاً مما ذکروا بہ اور انہوں نے ان تمام تعلیمات کو بھلا دیا جن کی انہیں یاد دہانی کی گئی تھی اور جو باقی رہ گیا تھا اس میں انہوں نے لفظی اور معنوی تحریف کی۔ یحرفون الکلم عن مواضعہ (وہ بات کو اپنی جگہ سے بدل دیتے ہیں) خود پچھلی امتوں کے علماء اور فضلاء کو اس سے انکار نہیں ہے کہ ان کے پاس آسمانی کتابیں اپنی اصل شکل میں موجود نہیں ہیں ان میں بہت کچھ کتر بیونت کی گئی ہے۔

لیکن اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن جو انسانیت کا آخری منشور ہے اس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لیا۔ اس کا ایک ایک حرف، اس کے بھیجنے والے کے حکم وعدہ کے مطابق محفوظ ہے۔ حروف و آیات اور سورہ و کلمات، سب کی تعداد منضبط ہے آج تک قرآن کریم کے ہزاروں ایڈیشن طبع ہو چکے ہیں اور چودہ سو سال کے طویل عرصہ میں لاکھوں ہاتھوں نے اس کی کاپیاں تیار کی ہیں لیکن اس کے ایک زیر زبر میں بھی فرق نہیں آنے پایا۔ کاغذی پیکر کے علاوہ قرآن کریم ایک روشن قندیل کی طرح ہر دور میں ان گنت حفاظ کے سینوں میں محفوظ رہا، اور آج روزانہ کروڑوں انسان اس کی تلاوت کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔

۷۔ قرآن الفرقان ہے

قرآن کریم حق و صداقت کا معیار ہے، کیونکہ وہ حق تعالیٰ کا کلام ہے اس کے مقابلہ میں آنے والی اس سے ٹکرانے والی تمام چیزیں باطل ہیں، اگرچہ وہ انسانوں کو مدلل اور حقیقت پسندانہ معلوم ہوں، اس لئے ہم اپنے افکار و نظریات اور طبعی علوم و مشاہدات کو اور قرآن سے پہلے نازل ہونے والی کتابوں کو بھی قرآن کی محکم کسوٹی پر پرکھیں گے، ہم اپنے افکار کی قرآن کے مطابق تشکیل کریں گے، قرآنی تعلیمات کو طبعی انکشافات کے مطابق ثابت کرنے کے بجائے طبعی علوم کی ایسی توجیہ کریں گے جو قرآن کے مزاج اور مقصد کے مطابق ہو، ہمیں اس کا بھی جائزہ لینا ہوگا کہ طبعی علوم کے ماخذ کیا ہیں، کس حد تک وہ قابل اعتماد ہیں اور کس حد تک غلطی کا امکان ہے۔ تاریخ سے قرآن کو مطابق کرنے کے بجائے ہمارا رویہ یہ ہونا چاہئے کہ ہم تاریخ انسانی کا جائزہ لے کر اسے قرآن کی روشنی میں مرتب کریں قرآن کو کتب سماوی کے مطابق ثابت کرنے کے بجائے کتب سماوی کو قرآن کی روشنی میں جانچیں۔ کیونکہ ہماری محدود عقل اور ناقص حواس کوئی حتمی معیار نہیں ہیں، تاریخ انسانی قرآن کی طرح مستند نہیں ہے، ہمارے افکار و نظریات قرآن کی طرح ازلی و ابدی اور ناقابل تغیر نہیں ہیں اور کتب سماوی اور قرآن کا تو کوئی مقابلہ ہی نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو "قول فیصل" کہا ہے۔ انہ لقول فصل وما ہو بالہزل "بیشک یہ حق و باطل کے درمیان فیصلہ کر دینے والا کلام ہے کوئی لغو چیز نہیں ہے" (۸۶: ۱۳، ۱۴) اسی کے ساتھ ساتھ قرآن مجید کو سابقہ کتب کا نگہبان کہا گیا ہے مطلب یہ ہے کہ اس نے ان کی تعلیمات کے جوہر کو محفوظ کر لیا ہے جسے امم سابقہ نے گم کر دیا تھا، وانزلنا الیک الکتٰب بالحق مصدقاً لما بین یدیہ من الکتٰب ومہیمناً علیہ "اور ہم نے تیری جانب حقائق پر مشتمل ایک کتاب اتاری، جو سابقہ کتب کی تصدیق کرتی ہے اور ان پر نگہبان ہے" (۵: ۴۸)

۸۔ قرآن مجید ایک معجزہ

قرآن مجید کی ایک نہایت امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ خود اپنی دلیل آپ ہے۔ یہ قرآن کریم کا بہت بڑا معجزہ ہے۔ متعدد مقامات پر قرآن مجید نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے، اولم یکفہم انا انزلنا علیک الکتٰب یتلیٰ علیہم "کیا ان لوگوں کے لئے یہ کافی نہیں ہے کہ ہم نے آپ پر کتاب نازل کی جو ان پر پڑھی جاتی ہے" (عنکبوت) بے شمار جگہ قرآن کریم کو معجزہ بنایا گیا اور مخالفین کو چیلنج دیا گیا ہے کہ اگر وہ اسے کلام الٰہی اور کتاب حق نہیں تسلیم کرتے تو وہ اس جیسی کوئی کتاب لے آئیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کے اس پہلو واضح طرح واضح کیا ہے:

ما من الانبیاء نبی الا اعطی من الآیات ما مثلہ آمن او آمن علیہ البشر وانما کان الذی اوتیت وحیا اوحاہ اللہ الی فارجو ان اکون اکثرھم تابعاً یوم القیامۃ

دنیا میں ہر نبی کو کچھ نہ کچھ معجزات دیئے گئے جن کی وجہ سے لوگ ان پر ایمان لائے لیکن مجھے اللہ تعالیٰ نے جو معجزہ دیا وہ وحی ہے جو اللہ تعالیٰ نے مجھ پر اتاری۔ لہٰذا مجھے امید ہے کہ تمام انبیاء سے قیامت کے دن میرے متبعین زیادہ ہوں گے۔

(صحیح بخاری باب الاعتصام)

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن مجید خود معجزہ ہے قرآن مجید نے یہ تحدی کی کہ کوئی اس جیسی کتاب لائے فاتوا بسورۃ من مثلہ "اس جیسی کوئی سورت لاؤ" (۲۳:۲) نیز فاتوا بسورۃ مثلہ وادعوا من استطعتم من دون اللہ "قرآن جیسی کوئی سورت لاؤ اور اللہ کے سوا اس کام کے لئے تم جس کو بھی بلا سکتے ہو بلاؤ" (۱۰:۳۸) آج تک کوئی اس چیلنج کا جواب نہ دے سکا اور نہ دے سکے گا۔ اسلام اللہ کا آخری اور مکمل ترین پسندیدہ نظام ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کائنات میں اللہ تعالیٰ نے آخری نبی اور رسول بنا کر بھیجا ہے۔ آپ کی اس حیثیت کا تقاضا یہی تھا کہ آپ کے اہم ترین معجزے اور مثالی کارناموں انسانوں کے تغیرات سے بلند و برتر اور محفوظ رہیں اور وہ معجزے ہیں قرآن حکیم اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ۔

۹۔ قرآن راز فطرت ہے۔

اس سے پہلے یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ قرآن کریم نے دین کامل پیش کیا ہے جو تمام زمانوں کے لئے اور تمام اقوام کے لئے پسندیدہ دین ہے اس کے اصول ناقابل تغیر ہیں وہ "اقوم" ہے اور "معجز" ہے، وہ ایسے معانی اور ایسی عبارت پر مشتمل ہے کہ اس جیسی کوئی کتاب پیش نہیں کی جا سکتی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن قرآنی تعلیمات کا ایک معجزانہ پہلو یہ بھی ہے کہ وہ فطرت انسانی کے عین مطابق ہیں۔ کوئی اصول ایسا نہیں ہے جو ناقابل عمل ہو، قرآن کا دعویٰ ہے کہ اس نے فطری تعلیمات پیش کی ہیں۔ اس نے جو احکامات دیئے ہیں وہ نہایت متوازن، قابل عمل اور عام انسانوں کی صلاحیتوں کے مطابق ہیں لا یکلف اللہ نفساً الا وسعھا "اللہ تعالیٰ ہر نفس کو اس کی استطاعت اور بساط کے مطابق ہی تکلیف دیتا ہے" جیسے جیسے انسان غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ قرآن مجید کا کوئی حکم ایسا نہیں جو معقول نہ ہو یا حکمت سے خالی ہو۔ انسانی علم و تجربہ کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ، قرآنی احکام کی حکمت، گہرائی اور انسانی معاشرے کے لئے ان کی افادیت واضح تر ہوتی جاتی ہے۔

آزمودہ دواؤں کا مرکب
انلجین
سر درد ۔ کمر کا درد ۔ دانت کا درد
ایام ۔ انفلوئنزا اور ہر قسم کے دوسرے درد کے لئے
یقینی زود اثر اور بے ضرر علاج ہے
Opal

ماہر القادری

صحابہ کرامؓ
اور
مولانا مودودی

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے مقالہ :۔

"خلافت راشدہ سے ملوکیت تک"

پر حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی نے "براءتِ عثمانؓ" کے عنوان سے تنقید فرمائی تھی، یہ کتاب جب "فاران" میں تبصرے کے لئے آئی تو اس پر راقم الحروف نے تبصرہ کیا، جسے ملتان کے دینی ادارے "فرینڈز پبلیکیشنز" نے کتابی صورت میں چھاپا اور ایک دو جریدوں میں بھی اس کو نقل کیا گیا، اس طرح اس تبصرے کی خاصی اشاعت ہوئی اور معقول علمی و دینی حلقوں میں اسے دلچسپی کے ساتھ پڑھا گیا۔

"فاران" کے ہزاروں صفحات اس کے گواہ ہیں کہ ہم نے نقد و تبصرہ میں اپنی دانست اور ذوق و معلومات کی حد تک کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کی، کتابوں کے محاسن و ان کی کمزوریاں یہ دونوں رخ ہم پیش کر دیتے ہیں، وہ جو کسی شاعر نے کہا ہے:۔

؎ آئینہ اپنی صفائی کی سزا پاتا ہے

تو اپنے ذوق تنقید کی بدولت ہمیں بھی بعض اہل قلم اور شاعروں کے عتاب و غضب کا نشانہ بننا پڑا ہے، مگر ہمیں اپنے کسی ناقد سے شکایت نہیں ہے، جب ہم دوسروں پر تنقید کرتے ہیں، تو خود ہماری تحریر تنقید و احتساب سے کس طرح محفوظ رہ سکتی ہے۔

"براءتِ عثمانؓ" پر "فاران" میں جو خاصہ طویل تبصرہ ہوا تھا اس پر اس کتاب کے فاضل مصنف (مولانا ظفر احمد عثمانی) کے صاحبزادے جناب قمر احمد عثمانی نے تنقید فرمائی جو ہفت روزہ "شہاب" کی تین اشاعتوں (۲۹ اگست، ۵ ستمبر، ۱۲ ستمبر ۱۹۷۱ء) میں چھپ کر منظر عام پر آئی ہے۔

قمر احمد عثمانی صاحب کی شخصیت کا اس اعتبار سے تعارف ضروری ہے کہ صاحب موصوف نے عائلی قوانین کی تائید میں سرکاری نقطۂ نگاہ کی ترجمانی اور وکالت کرتے ہوئے، ایک کتاب لکھی جسے اُن کی ایک خاتون عزیزہ کے نام سے چھپوایا گیا، قمر صاحب کے بڑے بھائی عمر احمد صاحب عثمانی برسوں سے پرویز کا دست و بازو بنے ہوئے ہیں! تقریباً تین سال ہوئے حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی نے خاکسار کو لکھا تھا کہ... "مولوی عمر احمد عثمانی کا غلام احمد پرویز سے اختلاف ہو گیا ہے اب اُن کے وہ خیالات نہیں رہے ہیں" آپ اپنے رسالہ میں اس واقعہ کا ذکر فرما دیں ـــــ میں نے مولانا موصوف کی خدمت میں عرض کیا کہ اس اختلاف کی مجھے بھی اطلاع ملی ہے، مگر سنا گیا ہے کہ یہ اختلاف انتظامی اور مالی معاملات سے تعلق رکھتا ہے، اگر عمر احمد صاحب کے عقائد و خیالات میں تبدیلی ہو گئی ہے تو اُن کی تحریر بھجوا دیجئے، "فاران" میں اسے شائع کر دیا جائے گا، اُس کے جواب میں مولانا محترم نے سکوت اختیار فرمایا۔

قمر احمد عثمانی صاحب کی تنقید کا تیسرا پیراگراف مندرجہ ذیل ہے:۔

"کچھ دن ہوئے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے ماہنامہ ترجمان القرآن میں ایک طویل مقالہ خلافت سے ملوکیت تک لکھا تھا جس پر دینی حلقوں میں کافی لے دے ہوئی۔ اس مضمون کے انداز تحریر اور طرزِ بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ موصوف بھی دوسرے غیر ذمہ دار اہلِ قلم کی طرح مشاجرات صحابہ کے موضوع کی طہارت کو برقرار نہیں رکھ سکے اور ان کے رشحاتِ قلم سے ان نفوسِ قدسیہ کے دامنوں پر تنقید و ملامت کے ایسے چھینٹے پڑ گئے ہیں جنہیں دکھا دکھا کر سیاہ داغ بنا کر بھی دکھا سکتے ہیں۔"

مولانا مودودی نے اس موضوع پر جو مضامین لکھے ہیں ان سے یہ بات واضح طور پر اہلِ قلم حضرات کے سامنے پیش کیا جا سکتا ہے، غالباً ان میں کوئی شخص یہ نہ کہہ سکے گا کہ مولانا موصوف اس موضوع کی طہارت کو برقرار نہیں رکھ سکے یا انہوں نے صحابہ کرامؓ پر (معاذ اللہ) ملامت کی ہے۔ اب یہ بدباطن لوگ جو ہمیں ہیں ان چھینٹوں کو سیاہ داغ بنا کر دنیا کے سامنے پیش کر سکتے ہیں سو ایسے لوگوں کی بدباطنی اور حق ناپسندی کے خوف سے حقائق کو تو نہیں چھپایا جا سکتا۔ اس مزاج و ذہنیت کے افراد نے تو کتاب اللہ اور احادیثِ نبوی تک سے اپنے ناپاک مقاصد کی اشاعت کا کام لیا ہے۔

مولانا مودودی نے حضرت سیدنا عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت کے بعض انتظامات کو ٹھیک موضوعِ گفتگو بنایا ہے، مگر ان کے جذبۂ احترام کا یہ حال ہے، لکھتے ہیں:—

"سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اپنے اقربا کے معاملے میں جو طرزِ عمل اختیار فرمایا، اس کے متعلق یہ وہم گمان میں بھی یہ شبہ نہیں آیا کہ معاذ اللہ وہ کسی بدنیتی پر مبنی تھا۔ ایمان لانے سے ان کی شہادت تک ان کی پوری زندگی اس کی گواہی دیتی ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخلص ترین صحابیوں میں سے تھے۔ دینِ حق کے لئے ان کی قربانیاں، ان کے نہایت پاکیزہ اخلاق اور ان کے تقویٰ و طہارت کو دیکھ کر آخر کون صاحبِ عقل یہ گمان کر سکتا ہے کہ اس سیرت و کردار کا انسان بدنیتی کے ساتھ وہ طرزِ عمل اختیار کر سکتا ہے جسے آج کل کی سیاسی اصطلاح میں "خویش نوازی" (NEPOTISM) کہا جاتا ہے۔ دراصل ان کے طرزِ عمل کی بنیاد وہی تھی جو انہوں نے خود بیان فرمائی ہے، وہ یہ کہ انہیں صلہ رحمی کا حکم دیا گیا ہے، اس کا تقاضا اسی طرح پورا ہو سکتا ہے کہ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ بھلائی کرنا بھی آدمی کے اختیار میں ہو، وہ اس سے دریغ نہ کرے۔ یہ نیت کی نہیں رائے کی غلطی ہے، یا بالفاظ دیگر اجتہادی غلطی تھی۔"

مولانا مودودی کی تحریر کا یہ اقتباس پڑھ کر جو کوئی ان پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اہانت یا ان کو مجروح کرنے کا الزام لگاتا ہے، وہ یا تو پرلے درجہ کا کور دل ہے یا مولانا مودودی کی ذات سے شدید کد رکھتا ہے اور انہیں بدنام کرنے کے لئے اس قسم کی غلط فہمیاں لوگوں میں پھیلاتا ہے۔

کسی صحابی بلکہ خلیفہ راشد تک کی رائے اور مشورہ کی غلطی کا اظہار اور اس کی نشان دہی، دینی نقطۂ نگاہ سے بے دینی یا گناہ کی بات نہیں ہے، کوئی اہلِ قلم حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ تک کے بارے میں اس انداز میں اظہارِ رائے کر سکتا ہے کہ کبھی کبھار حضرت علی مرتضیٰ شیرِ خدا کی حق پسندی حکمت و مصلحت اور تدبیر و دانش کے کاروباری پہلو پر غالب آ جاتی تھی! اس قسم کی محتاط رائے بیجا اپنی تائید میں تاریخی حقائق و شواہد رکھتی ہے "اہانت" کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔

یہ تو ناصبیوں، خارجیوں اور رافضیوں کا عقیدہ اور مسلک ہے کہ وہ بزرگ صحابہ کرام کی لغزشوں اور غلطیوں سے کفر و ضلالت منسوب کرتے ہیں مولانا مودودی ان سب سے کسی گروہ سے دور کا بھی کوئی تعلق اور مناسبت نہیں رکھتے، انہوں نے اپنی کتابوں میں متعدد صحابہ کرامؓ کے مسلک اور اقوال سے استناد کیا ہے اور ان کی تصنیفات اور تحریریں پڑھ کر کوئی شخص صحابہ کرامؓ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے بدگمان نہیں ہو سکتا، بلکہ ان کی کتابیں صحابہ کرامؓ کے بارے میں عقیدت و محبت اور حسنِ ظن کا جذبہ پیدا کرتی ہیں۔

فاضل ناقد نے مولانا مودودی کی تحریر کا اقتباس درج کر کے لکھا ہے :۔

"نہ معلوم آج بیس سال کے بعد کیا انقلاب ہو گیا کہ خود مولانا موصوف کا قلم تاریخ کی اسی سیاہی سے حضرت عثمانؓ جیسے اصحاب کبار کی سیرت کو داغدار بنانے کے لئے بے باک ہو گیا ہے اور میں قلم اسی مسلک کی تائید و ہمنوائی میں ایک مدت سے زور و تسلسل صرف کر رہے ہیں ۔۔۔۔ "

مولانا مودودی پر یہ تہمت ہے کہ حضرت عثمانؓ کی سیرت کو داغدار بنانے کے لئے اُن کا قلم بے باک ہو گیا ہے ۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت کے چند اضطرابات کے ذکر کر دینے کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ ان کی سیرت ہی سرے سے داغدار ہو گئی ۔ مولانا مودودی نے بیس سال پہلے تاریخی روایتوں کے ضمن میں صحابہ کرام کے بارے میں جو اصولی بات بیان کی ہے وہ اُس پر آج بھی عمل پیرا ہیں یعنی دورِ عثمانی کے بعض اضطرابات کی واقعیت تسلیم کر لینے کے بعد بھی اُنہوں نے محض مورخ اور تذکرہ نگار کی حیثیت سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی نیت پر کسی شبہ تک کا اظہار نہیں کیا ، بلکہ آپ کی سیرت اور زندگی میں تقویٰ و طہارت کا اعتراف کیا ہے ۔

مولانا مودودی نے عہدِ عثمانی کی بعض تاریخی روایات کو نقل کر دینے کے بعد بھی بے باک مورخین کی طرح حضرت عثمانؓ کی نیت اور سیرت و کردار پر جرح تک نہیں کی ، بلکہ ان سے طہارت و تقویٰ کو منسوب کیا ہے ۔ یہ دلیل ہے اُس احترام و عقیدت کی جو مولانا مودودی تمام صحابہ کرام سے اور خاص طور سے کبار صحابہ سے رکھتے ہیں ۔ مولانا کی تحریر کا جو اقتباس قمر احمد صاحب نے اپنے مقالہ میں درج فرمایا ہے اُس کی یہ حیثیت ہے جیسے کوئی کہے کہ تفسیر و حدیث میں بعض انبیاء کرام کے بارے میں جو غلط سلط ذخیرہ روایات ملتا ہے صرف اس کو سامنے رکھ کر انبیاء کرام کی مقدس سیرتوں کے باب میں کوئی رائے قائم نہیں کرنی چاہئے ۔

"صحابہ سے اظہارِ اختلاف اور اُن پر حرف گیری کا حق صرف حضرات صحابہ کو حاصل ہے کسی غیر صحابی کو یہ جسارت نہیں کرنی چاہیئے"

قمر احمد عثمانی صاحب نے یہ بات ٹھیک کہی ہے ، ہم تو یہاں تک عرض کرتے ہیں کہ صحابہ کرام پر حرف گیری اور اُن کی رائے سے خواہ مخواہ اختلاف ، یہ مزاج ہی کسی مسلمان کا نہیں ہونا چاہئے ، مگر جس مسئلہ میں خود صحابہ کرام کے درمیان اختلاف ہو ، اس صورت میں غیر صحابی بھی محاکمہ اور موازنہ کر کے کسی ایک یا چند صحابی کے اقرب الی الحق قول کو لے سکتا ہے اور دوسرے یا چند صحابہ کے قول کو ترک کیا جا سکتا ہے اور ہم "صحابیت" کے موضوع پر آگے چل کر گفتگو کریں گے ۔

"حسامی میں ہے :۔

"اگر راوی عدالت اور حفظ و ضبط میں مشہور ہو ، لیکن فقہ میں نہ ہو جیسے ابوہریرہ اور انس بن مالک ، تو اب اگر ان کی حدیث قیاس کے مطابق ہو تو تب اُس پر عمل کیا جائے گا اور اگر مخالف ہو تو ضرورتاً (حدیث) چھوڑ دی جائیگی ۔"

اب اگر کوئی اس پر اعتراض وارد کرے کہ غیر صحابی کو صحابی کے بارے میں یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ فلاں صحابی "فقہ" میں شہرت یا دوسرے کبار صحابہ کی طرح تفقہ نہیں رکھتا ۔۔۔ تو یہ اعتراض برائے اعتراض ہے ۔ صحابہ کرام کے کیا درجات ہیں ؟ اس کا تعین کتاب و سنت اور خود اقوالِ صحابہ کی روشنی میں غیر صحابی اہل فکر اور ارباب دانش نے کیا ہے ، اور ایسا کرنا صحابہ کے مقابلہ میں نا روا جسارت نہیں ہے ۔

مالِ غنیمت کی تقسیم کے وقت بعض انصار نے کہا " رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کو انعام دیا اور ہم کو محروم رکھا ، حالانکہ ہماری تلواروں سے اب تک قریش کے خون کے قطرے ٹپکتے ہیں ، بعض بڑے مشکلات میں ہماری یاد ہوتی ہے اور غنیمت اوروں کو ملتی ہے " (سیرت النبی جلد اول)

انصار جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ تھے ، اُن کے اس فعل پر غیر صحابی بھی اپنی رائے کا اظہار کر سکتا ہے اور کہنا چاہئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں اُن کا یہ اعتراض کسی طرح درست نہ تھا اور اس میں ہوائے نفس شامل تھی اور یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ عفو تھی ، کہ اُن کو معاف کر دیا گیا ورنہ یہ الفاظ غضبِ الٰہی کا سبب بن سکتے تھے ۔

واقعہ افک میں حضرت سیدتنا عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر منافقین نے جو تہمت لگائی تھی ، اور اس میں بعض صحابی تک مبتلا ہوگئے تھے ، ان کے اس خاص فعل کو ہر غیر صحابی ناپسندیدہ ہی سمجھے گا ! یہ تو اہل بدعت کا "علم کلام" ہے کہ مثلاً قرآن پاک میں حضرت آدم علیہ السلام کے سہو و لغزش کا جو ذکر آیا ہے اس کے بارے میں اہل بدعت نے "عصمت و عظمت انبیاء" کا یہ عقیدہ تراشا ہے کہ اللہ تعالیٰ تو کہہ سکتا ہے کہ حضرت آدم سے لغزش ہوئی ، مگر ہم ایسا نہیں کہہ سکتے ! یا اللہ تعالیٰ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ جتا سکتا ہے کہ اے نبی ! ان تمام منافقین کا پورا علم ہم رکھتے ہیں تم نہیں رکھتے ، مگر یہ بات امتی نہیں کہہ سکتے کہ منافقین کا ایسا پورا علم اللہ تعالیٰ کو تھا ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ تھا ۔

راقم الحروف نے اپنے مضمون میں لکھا تھا :۔

"حضرت سیدنا ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سب کے نزدیک محترم و مکرم ہیں ، آپ کے قدموں کی دھول بھی ہم جیسوں پر پڑ جائے تو ہم پاک ہو جائیں ، لیکن جب ان کی سیرت کا ذکر ہوگا تو مال و اسباب اور دنیوی وسائل کے بارے میں جو وہ نظریہ رکھتے تھے ، اس پر ضرور تنقید کی جائے گی کہ اس مسئلہ میں وہ بہت زیادہ شدت پسند تھے اور ان کے اس نظریہ کے ساتھ دنیا کا معیار چلنا مشکل ہے"

سید محمد احمد عثمانی صاحب نقد و جرح فرماتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"دراصل ابوذر غفاری چاہتے تھے کہ عام مسلمان بالخصوص حضرات صحابہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سی زندگی اختیار کریں کہ زکوٰۃ فرض ہونے کی نوبت ہی نہ آئے اور ضرورت سے زیادہ جو بھی ہو اللہ کی راہ میں خرچ کر دیں ، ان کے برخلاف دوسرے صحابہ کا خیال تھا کہ زکوٰۃ ادا کرتے ہوئے مال جمع کرنے میں کوئی قباحت نہیں ! جمہور امت نے اس فتویٰ کو اختیار کیا مگر صوفیاء نے حضرت ابوذر غفاریؓ کے مسلک کو اپنایا اور جن صحابہ نے مسلک ابوذر کو اختیار نہیں کیا وہ بھی ان کی عظمت کے قائل تھے"۔

حالانکہ صوفیائے کرام میں خاصی تعداد ایسے حضرات کی گزری ہے جو ترفہ کی زندگی بسر کرتے تھے مثلاً پیروں کے پیر حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ تعالیٰ قیمتی لباس زیب تن فرماتے تھے !

اس سلسلہ میں ہم تحفہ اثنا عشریہ (ص ۵۰) کا اقتباس ذیل میں درج کرتے ہیں :۔

"اسی اثناء میں عبدالرحمٰن بن عوف نے رحلت فرمائی ، جو عشرہ مبشرہ میں سے تھے ، اور بہت سا مال ترکہ میں چھوڑا ، یہاں تک کہ قرض دینے میں وصیتیں جاری کرنے کے بعد جب ان کا ترکہ تقسیم ہوا تو ان کے مال کا آٹھواں حصہ ان چار عورتوں کو پہنچا تو ان میں ایک عورت کے حصے میں ، ۸۰ ہزار درہم آئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بعض لوگوں نے ابوذرؓ سے ان عبدالرحمٰن کا حال بیان کیا ، ان کے مزاج میں اس معاملہ میں چونکہ سختی گھر کر چکی تھی ، اس لئے پیغمبر علیہ السلام کی بشارت سے غفلت برتتے ہوئے ان کے دوزخی ہونے کا حکم لگا بیٹھے ، جو نص کے صاف مخالف تھا ۔ کعبؓ احبار ۔ ۔ ۔ ان سے کہنے لگے کہ اے ابوذرؓ ! بالاجماع ثابت ہے کہ ملت حنیفیہ آسان ترین اور کشادہ ترین مذہب ہے اور سب مال خرچ کر دینا مذہب یہود میں بھی واجب نہیں ہے ، جو سب سے زیادہ تنگ اور سخت مذہب ہے ۔ تو ملت حنیفیہ میں کس طرح واجب ہوگا ، یہ بات سن کر ابوذرؓ اپنی حدت مزاج کے باعث غصہ سے لال پیلے ہو گئے ، اور بولے اے یہودی ! تجھ کو ان مسائل سے کیا واسطہ ! اور عصا اٹھائی اور کعب احبار کو مارنا چاہا ، کعب یہاں سے بھاگ نکلے یہاں تک کہ عثمانؓ کی بیٹھک تک پہونچے اور کعب احبار نے حضرت عثمانؓ کی پیٹھ کے پیچھے پناہ لی ۔ ابوذر نے کوئی پرواہ نہ کی اور دیوانہ وار لاٹھی

چھوڑدی، لکھتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ کے پاؤں میں بھی داشتوں کی چوٹ آئی، جب حضرت عثمانؓ نے یہ حالت دیکھی تو اپنے
غلاموں کو حکم دیا کہ کعب کو ابوذر سے بچاتیں، کیونکہ وہ بوڑھے اور بے خود ہو گئے ہیں، مبادا بے جگہ ضرب لگائیں
اور وہ آپ کی موت کا سبب بن جائے۔" (تاریخ ابن خلدون ترجمہ صفحہ ۴۴۴)

وہ جواقسم الحروف نے عرض کیا تھا کہ اس مسئلہ میں حضرت ابوذر غفاری ——— رضی اللہ عنہ بہت زیادہ شدید اور انتہا پسند تھے ——— اس
کی پوری تائید مندرجہ بالا اقتباس سے ہوتی ہے، ہماری بالکل بےضرر اور ٹھوس حقیقت کی بات پر بھی، قمر احمد صاحب نے تنقید کر ہی ڈالی۔
تحفۂ اثنا عشریہ میں حضرت ابوذر غفاری رحمۃ اللہ علیہ کی اس خاص مسئلہ میں شدت مزاج پر تنقید بھی کی گئی ہے اور حضرت ابوذر نے جو الفاظ
کعب احبار اور حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف کے بارے میں استعمال کئے ہیں اس کا سبب وہ بشری کمزوری ہے جس میں کبھی کبھار کوئی صحابی رسول بھی مبتلا
ہو جاتا تھا لیکن اس کے باوجود صحابہ کرام قابل احترام ہیں اور ہمارے مخدوم ہیں۔

راقم الحروف نے حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی مدظلہ کی کتاب "برأۃ عثمان" پر جو تبصرہ کیا تھا اس میں لکھا تھا کہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ
نے حضرات شیخین (صدیق و فاروق رضی اللہ عنہما) سے بیعت نہیں کی۔ .... !

اس پر قمر احمد عثمانی صاحب نے جن کے نام کے ساتھ "شہاب" میں "مولانا" لکھا گیا ہے، گرفت فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:—

"میرے ناقص معلومات کے لئے عرض ہے کہ یہاں حضرت عمرؓ سے بیعت نہ کرنے کا ذکر سراسر غلط ہے، کیونکہ حضرت سعد
نے حضرت عمرؓ کا عہد خلافت پایا ہی نہیں، وہ تو صدیق اکبرؓ کی خلافت ہی میں انتقال فرما گئے تھے۔ اگر جو معلومات
آئندہ تبصروں کے ذریعہ حاصل کئے جاتے ہیں، ان کے نتائج بھی ہوا کرتے ہیں۔ ......"

حیرت ہے کہ قمر صاحب نے عربی دانی کے زعم کے باوجود ایسی غلط بات کس طرح کہہ دی، انہیں اس کا خیال بھی نہیں آیا کہ ان کی تنقید کے بعد لوگ عربی
کی اصل تاریخیں اس واقعہ کو دیکھیں گے تو ان کی تنقید کی قلعی کھل جائے گی، پھر اصل بحث یہ تھی کہ حضرت سعد ابن عبادہ نے تنہا حضرت صدیق اکبرؓ کی
بیعت نہیں کی یا حضرت صدیق یا حضرت عمر فاروق دونوں کی بیعت سے اعراض کیا، بہرحال ان کا یہ فعل ناپسندیدہ سمجھا گیا۔

سب سے پہلے "الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب" کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے:—

"وتخلف سعد ابن عبادۃ عن بیعۃ ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ وخرج من المدینۃ ولم
ینصرف الیہا الی ان مات بحوران من ارض الشام لسنتین ونصف مضتا من خلافۃ عمر
وذلک سنۃ خمس عشرۃ وقیل سنۃ اربع عشرۃ، وقیل بل مات سعد ابن عبادۃ فی خلافۃ
ابی بکر رضی اللہ عنہ سنۃ احدی عشرۃ (صفحہ ۵۹۹، جلد دوم)

ترجمہ:— اور سعد ابن عبادہ نے حضرت ابوبکر صدیق سے بیعت نہیں کی اور وہ مدینہ سے چلے گئے اور پھر مدینہ واپس نہیں آئے یہاں تک کہ حوران میں جو ارض شام
میں واقع ہے وفات پا گئے یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ڈھائی سال گزرنے کے بعد اور یہ ۱۵ھ کا واقعہ ہے اور بعض نے کہا ہے کہ ۱۴ ہجری کا واقعہ
ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ سعد بن عبادہ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانے میں ۱۱ھ میں وفات پائی۔ اس کے بعد "اسد الغابہ" کا اقتباس پڑھیے:—

"فلم یبایع سعد ابابکر ولا عمر وسار الی الشام فاقام بحوران الی ان مات سنۃ خمس
عشرۃ وقیل سنۃ اربعۃ عشرۃ وقیل مات سنۃ احدی عشرۃ (جلد دوم صفحہ ۲۸۴)

ترجمہ:— اور سعد ابن عبادہ نے ابوبکر کی بیعت نہیں کی اور نہ عمر کی بیعت کی اور وہ شام کی طرف چلے گئے اور حوران میں قیام کیا یہاں تک کہ ۱۵ھ میں
وفات پائی اور کہا جاتا ہے ۱۴ھ میں اور کہا جاتا ہے کہ ۱۱ھ میں۔"

تاریخ کی دونوں کتابیں یہ بتاتی ہیں کہ حضرت سعد بن عبادہ نے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر دونوں سے بیعت نہیں کی، استدلال یہ کہ مصنف نے تاریخی روایتوں سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ "فلم یبایع سعد ابابکر ولا عمر" یعنی سعد نے نہ ابوبکر کی بیعت کی اور نہ عمر کی ؟! دونوں نے حضرت سعد کی وفات کا سنہ ۱۵ ہجری لکھا ہے، البتہ قیل کے ساتھ سنہ ۱۴ ہجری جو لکھا گیا ہے وہ بھی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا عہد خلافت ہے، ہاں! آخر میں "قیل" کے ساتھ البتہ سنہ ۱۱ھ لکھا ہوا ملتا ہے! قمر احمد عثمانی صاحب کی دیانت کا یہ عالم ہے کہ انہوں نے "قیل" کے مجہول اور کمزور اندازبیان کا اپنی تنقید پر سہارا لیا ہے۔ ہر مضمون نگار کو تحقیق کے ساتھ ہی بات لکھنی چاہیے، کسی مضمون نگار سے کسی ناقص حوالہ یا سہو حافظہ کے سبب لکھنے میں کوتاہی بھی ہو سکتی ہے مگر جب اس پر کوئی شخص نقد و احتساب کرے گا اسے ہر کیے گا، نفس واقعہ مضمون نگار نے غلط لکھا ہے تو اس تنقید کو ہر اعتبار سے مستند اور وزنی ہونا چاہیے افسوس ہے کہ قمر احمد عثمانی صاحب نے غیر مستند اور بے وزن بات کہی اُن کو چاہیے کہ آئندہ اپنی ذمہ داری اور تحقیق کے ساتھ بات کہا کریں ورنہ اہل علم اُن کی تحریروں کو ہلکا اور بے وزن سمجھیں گے۔

خاکسار نے تبصرے میں لکھا تھا:۔

"تحکیم کے مسئلہ میں حضرت ابوموسیٰ اشعری کے ساتھ حضرت عمرو بن العاص نے جو معاملہ کیا، اس کی جو کوئی تردید کرے گا صریح غلطی کا ارتکاب کرے گا؟"

قمر احمد عثمانی صاحب اس پر تنقید کرتے ہوئے رقمطراز ہیں :۔

"..... اس تمام واقعہ میں قابل غور بات یہ ہے کہ عمرو بن العاص نے حضرت ابوموسیٰ اشعری سے وعدہ نہیں کیا تھا اگر وہ حضرت علی کو معزول کر دیں گے تو جواب میں وہ بھی امیر معاویہؓ کو برطرف کرنے پر آمادہ ہیں اس کے علاوہ دونوں کی معزولی کا مشورہ بھی انہوں نے پیش نہیں کیا تھا، یہ تجویز ابوموسیٰ اشعری کی طرف سے پیش کی گئی تھی اور انہوں نے عمرو بن العاص کے محض یہ کہہ دینے سے تو پھر آپ اس کا اعلان کر دیں" از خود یہ یاد کر لیا کہ عمرو بن العاص بھی حضرت معاویہؓ کو معزول کرنے پر آمادہ ہیں، ان کی اس غلط فہمی یا سادہ لوحی کا الزام عمرو بن العاص پر عائد نہیں کیا جا سکتا"

ناقد کی اس تحریر میں سب سے زیادہ قابل غور بات یہ ہے کہ انہوں نے صحابی رسول حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے "سادہ لوحی اور غلط فہمی" منسوب کی ہے حالانکہ وہ خود پہ یہ اصول اور عقیدہ بیان کر چکے ہیں کہ غیر صحابی، صحابی رسول پر تنقید کرنے کا مجاز نہیں ہے۔

واقعہ تحکیم کے سلسلہ میں "الکامل ابن اثیر" (جلد دوم صفحہ ۱۳۳) کے متن کا اردو ترجمہ درج ذیل کیا جاتا ہے:۔

"پھر عمرو بن العاصؓ نے ابوموسیٰ اشعری سے پوچھا تو تمہاری کیا رائے ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ ہم ان دونوں کو معزول کر دیں اور پھر اس بات کو مشورہ پر رکھیں کہ مسلمان جس کو چاہیں گے خود اپنا خلیفہ منتخب کر لیں گے، تو عمرو بن العاص نے کہا جو تمہاری رائے ہے وہی میری رائے ہے، تم ان دونوں کو لوگوں کے سامنے پیش کرو جو اس وقت جمع ہیں، پھر عمرو بن العاص نے کہا اے ابوموسیٰ ان لوگوں کو بتا دو کہ ہمارا اس بات پر اتفاق ہو چکا ہے تو ابوموسیٰ نے لوگوں کو بتایا کہ ہماری رائے اس پر متفق ہے اور ہم خدا سے امید رکھتے ہیں کہ وہ اس میں امت کے لئے بہتری کی صورت نکالے، اس کی عمرو نے بھی تصدیق کر دی اور پھر کہا ابوموسیٰ اپنی بات شروع کرو، ابوموسیٰ آگے بڑھے تو عبداللہ ابن عباسؓ نے ان سے کہا، ارے! مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ تمہیں دھوکہ دیا گیا ہے، کیونکہ اگر تم دونوں کا اس بات پر اتفاق ہو چکا ہے تو پھر عمرو کو تم مقدم کرو کہ وہ تم سے پہلے (معزول کرنے کے سلسلہ میں) اعلان کریں، ان کے بعد پھر تم اعلان کرو، کیونکہ وہ دھوکہ باز آدمی ہے اور مجھے یقین نہیں ہے کہ وہ رضامند ہو جائے کیونکہ جب تم کھڑے

ہوگئے (اور اعلان کردو گے) تو وہ تمہاری مخالفت کرے گا۔ اور ابوموسیٰ سادہ لوح (مغفل) تھے ـــــ اس پر ابوموسیٰ نے کہا کہ ہم نے اس پر اتفاق رائے کرلیا ہے ـــــ اور پھر لوگوں کے سامنے اعلان کردیا کہ لوگو! ہم نے امت کے اس مسئلہ میں بہت غور وفکر کیا، اس امت کے لئے سب سے زیادہ بہتر و مفید اور اس امت کی پراگندگی کا سبب ختم ہونا یہی ہے جس پر میری اور عمرو کی رائے متفق ہوئی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم علی اور معاویہ دونوں کو معزول کردیں اور پھر عوام جس کو چاہیں اپنی پسند سے خلیفہ منتخب کرلیں۔ چنانچہ میں علی اور معاویہ دونوں کو معزول کرتا ہوں اور تم اپنے اس مسئلہ کو خود سنبھالو اور جس کو بھی اہل سمجھو اُسے اپنا خلیفہ بنالو ـــــ اس کے بعد ابوموسیٰ پیچھے ہٹ گئے، اور عمرو آئے اور کھڑے ہوکر فرمایا، انہوں نے جو کچھ کہا آپ لوگوں نے سُنا انہوں نے اپنے آدمی (یعنی علی) کو معزول کردیا ہے اور میں بھی اُن کے آدمی کو معزول کرتا ہوں جیسا کہ انہوں نے معزول کیا ہے اور اب میں اپنے آدمی معاویہ کو برقرار رکھتا ہوں، اس لئے کہ ابن عفان عثمان کو والی بنایا تھا اور وہ اُن کے خون کے وارث اور اُن کے سب سے زیادہ حقدار قائم مقام ہیں ـــــ اس پر سعد نے کہا ہے ابوموسیٰ ! تم عمرو کے فریب میں کیسے آگئے، اور اُس کے مقابلہ میں کمزور کیسے پڑ گئے، ابوموسیٰ نے (جواب میں) کہا میں کیا کرتا انہوں نے ایک بات پر مجھ سے اتفاق کیا اور پھر اُس سے پھر گئے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

قمر احمد صاحب نے واقعہ تحکیم کے سلسلہ میں حضرت عمرو ابن العاص کی تعریف و مدافعت کی جو کوشش کی تھی وہ کتنی بے اصل ثابت ہوئی اسلئے راقم الحروف نے اس سلسلہ میں جو کچھ عرض کیا تھا اس کی تصدیق ہوگئی۔

میں نے اپنے تبصرے میں لکھا تھا:ـــ

" حضرت عثمان کے موقف کی تعریف کرتے کرتے خود فاضل مصنف (مولانا ظفر احمد عثمانی) ان روایتوں کو درج کر گئے ہیں جن سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا موقف مجروح ہوتا ہے "

اس کے جواب میں عثمانی صاحب نے " برأۃ عثمان " کی یہ عبارت نقل کی ہے :ـــ

" اگر حضرت علی ان بلوائیوں کی پوزیشن کو مضبوط نہ کرتے جو فتنہ قتل عثمان کے بانی تھے، بلکہ خلافت کا منصب سنبھالتے ہی " مسلمانوں سے اپیل کرتے کہ ان بلوائیوں کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے ؟ مجھے کیا کرنا چاہئے تو حضرت طلحہؓ و زبیرؓ اور حضرت معاویہؓ کو مطالبہ دم عثمان کے لئے سخت اقدام کی نوبت نہ آتی "

یہ عبارت کو درج کرنے کے بعد صاحب موصوف لکھتے ہیں کہ :ـــ

" ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس پوری عبارت میں کون سی بات غلط ہے اور کس جگہ سے حضرت علی کی تنقیص کا پہلو نکلتا ہے "

(مولانا ظفر احمد عثمانی کے اس جملہ سے ـــــ

" اگر حضرت علی، ان بلوائیوں کی پوزیشن مضبوط نہ کرتے، جو فتنہ قتل عثمان کے بانی تھے ۔ ۔ ۔ "

حضرت علی کے " موقف " پر کوئی حرف نہیں آتا !

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی نے اپنی کتاب (برأۃ عثمان) میں یہ لکھا تھا :ـــ

ابن عساکر وغیرہ نے حضرت شعبی (رحمۃ اللہ علیہ) سے روایت کیا ہے حضرت عمر کی وفات اُس وقت تک نہیں ہوئی

جب تک قریش اُن سے اُکتا نہ گئے، انہوں نے قریش کے (مہاجرین) کو مدینہ میں محصور کر دیا تھا۔"

اس کی تعدیل، مدافعت یا تاویل کی جرأت قمر احمد صاحب نہیں کر سکے۔ ہم نے اپنے تبصرے میں یہ لکھا تھا کہ :-

"حضرت عثمان غنی کے دورِ خلافت کے سلسلے میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے بھی روایتوں کو نقل کیا ہے، اور حضرت عمر اور حضرت علی کے بارے میں مولانا ظفر احمد عثمانی نے بھی روایتوں کو دُہرایا ہے۔ اس صورت میں روایات کے نقل و اعادہ سے "نقد و جرح" کی جو صورت پیش آتی ہے، اس میں دونوں بزرگوں کا ایک ہی موقف ہے"

"یہ بات اپنی جگہ ثابت ہے کہ مولانا ظفر احمد عثمانی نے بھی ایسی روایتوں کو اپنی کتاب میں دُہرایا ہے جو حضرت عمر اور حضرت علی کے موقف کے بارے میں "نقد و جرح" کی کیفیت پیدا کرتی ہیں۔ اگر ایسا کرنا گناہ ہے، تو :-

> ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند — اگر یہ جرم ہے ——

تو اس طرح حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ایک ہی جیسے جرم کے مجرم ثابت ہوتے ہیں!

حق و باطل

قمر احمد عثمانی صاحب کی تنقید ان جملوں پر ختم ہوتی ہے :-

"مضمون خاصہ طویل ہو گیا ہے، اب ہم اس کو اس دُعا پر ختم کرتے ہیں کہ کاش مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، جناب ماہر القادری اور ان کے ہم خیال حضرات اس مضمون کے مطالعہ سے اس حقیقت کو سمجھ سکیں کہ حضرت علی اور حضرت معاویہ کے درمیان پیش آنے والے واقعات و اختلافات میں نسبت حق و باطل کی نہیں راجح و مرجوح کی ہے، اور یہ کہ مشاجرات صحابہؓ کا موضوع جرح کے بجائے تعدیل کا مستحق ہے"

یہ تو عجیب و غریب انکشاف ہے کہ جمل و صفین کی جنگیں "راجح و مرجوح" پر منحصر ہوئی تھیں! ان جنگوں میں صواب و خطا یا غلط اور صحیح اور حق و باطل کی سرے سے کوئی نسبت ہی نہ تھی! حالانکہ اہل سنت والجماعت کے جمہور کا مسلک یہ ہے کہ جمل و صفین اور علی و معاویہ (رضی اللہ عنہم) کے درمیان آویزش میں "حق" علی کرم اللہ وجہہ کے ساتھ تھا۔ اور اپنے مضامین میں یہی موقف مولانا مودودی نے اختیار کیا ہے۔

فقہ حنفی کی معروف ترین کتاب "ہدایہ" میں واضح طور پر لکھا ہے :-

> "ویجوز التقلد من السلطان الجائر، کما یجوز من العادل، لان الصحابۃ تقلدوا من معاویۃ والحق کان بید علی فی نوبتہ"

(اور جائز ہے، قاضی بننا سلطان جائر کی طرف سے، جس طرح جائز ہے، عادل کی طرف سے، کیونکہ صحابہ معاویہ کی طرف سے قاضی مقرر ہوتے اور حق حضرت علی کے ہاتھ میں تھا)

علامہ مرغینانی صاحب ہدایہ نے اس عبارت میں حضرت امیر معاویہ کو "سلطان جائر" کہا ہے اور حضرت علی کو "حق" پر، اور ظاہر ہے کہ علیؓ حق پر تھے تو ان کا مخالف "ناحق" پر تھا۔ ہماری نظر سے آج تک کوئی ایسی تحریر نظر سے نہیں گزری جس میں صاحب ہدایہ پر توہین صحابہ کا الزام لگایا گیا ہو۔ یہ کتاب (ہدایہ) مرتب مدت کے ساتھ صدیوں سے عربی مدارس کے درس میں پڑھائی جا رہی ہے۔ اگر صحابی رسول کے کسی فعل پر تنقید گناہ ہوتی تو فقہ حنفی کے متبحر امام ہمیں معاف نہ ہو جاتے۔ وہ اگر ان سے یہ فعل سرزد ہو گیا تھا تو دوسرے علماء ان پر تنقید اور احتساب ضرور کرتے۔

قمر احمد عثمانی صاحب نے اپنی تنقید میں صاحب ہدایہ کے قول سے اختلاف کرتے ہوئے مبہم سی بات لکھی ہے کہ امیر معاویہ کے بارے میں امام اعظم کا یہ مسلک نہ تھا، انہیں امام موصوف کا قول نقل کرنا تھا، پھر انہوں نے اس سے زیادہ مبہم بحث "ارجاء" کی چھیڑ دی ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اعمال صالحہ کو اسلام کی روح سمجھتے ہیں مگر عمل کو ایمان کی لازمی شرط قرار نہیں دیتے۔ اس عقیدے کی بناء پر لوگ ان کو "مرجئہ" مسلک رکھتے تھے، حالانکہ فقہ حنفی

اور یہی اس مسلک کی تردید کی گئی ہے۔ مرجئین کا مسلک تو فسق و فجور پر آدمی کو دلیر بناتا ہے۔ حضرت علی اور امیر معاویہ کے مابین جدال و نزاع کے سلسلہ "ارجاء" کی بحث کا ذکر سمجھ میں نہیں آیا۔ کاش، فاضل تنقید نگار صحیح طور پر اظہار خیال فرماتے۔

صاحب ہدایہ کے قول کے بعد "المسامرہ شرح المسایرہ" (ص [illegible]) کی عبارت ملاحظہ فرمائیے:-

"واعلم انہ قد اتفق اھل الحق وھم اھل السنۃ والجماعۃ رضی اللہ عنہم علی ان معاویۃ (ما کان) امام (فی) خلافۃ (علی) رضی اللہ عنہ (بل من الملوک لا) من الخلفاء واختلف مشائخنا فی امامۃ (ای امامۃ معاویۃ (بعد وفاۃ علی) رضی اللہ عنہ (فقیل صار اماماً) انعقدت لہ البیعۃ (وقیل لا) ای لم یصر اماماً (لقولہ علیہ الصلوٰۃ والسلام) الخلافۃ بعدی ثلاثون ثم یصیر ملکاً عضوضاً"

(اور جان لو کہ اہل حق یعنی اہل سنت والجماعت نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ معاویہ حضرت علی کی خلافت کے زمانہ میں بادشاہوں میں سے تھے، خلفاء میں سے نہیں تھے اور ہمارے مشائخ نے ان کی امامت کے بارے میں اختلاف کیا ہے (حضرت علی کی وفات کے بعد) بعض لوگ کہتے ہیں کہ امام بن گئے تھے اور ان سے بیعت لی گئی تھی اور بعض کہتے ہیں نہیں وہ امام نہیں تھے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ میرے بعد تیس سال خلافت رہے گی، پھر ملوک عضوض آ جائیں گے)

اس پوری عبارت میں حضرت امیر معاویہ پر تنقید وجرح ہی کا پہلو نکلتا ہے اور اس عبارت کی بنا پر صاحب "المسامرہ" پر صحابہ کرام کی اہانت یا ... کا الزام نہیں لگایا گیا!

عثمانی صاحب نے اپنی تنقید میں کسی حوالہ کے بغیر قتل حضرت عمار کے بارے میں ایک عبارت لکھ دی ہے حالانکہ جامع ترمذی کے صحیح الفاظ یہ ہیں:-

"عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابشر یا عمار تقتلک الفئۃ الباغیۃ"

(بین السطور میں لکھا ہے "مشتمل اصحاب معاویہ")

ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنے مقالہ میں یہ بات حق لکھی ہے کہ قتل عمار کے بعد حق پوری طرح واضح ہو گیا تھا، یعنی یہ کہ حضرت علی سے جنگ کرنے والے باغی تھے اور الاستاذ مولانا احمد علی محدث سہارنپوری اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں کہ "الفئۃ الباغیۃ" سے مراد معاویہ اور ان کی جماعت ہے۔

فیض الباری میں حضرت مولانا انور شاہ صاحب اس حدیث پر طویل تبصرہ فرماتے ہوئے آخر میں لکھتے ہیں کہ:-

"علماء نے کہا ہے کہ یہ حدیث بالکل کھلم کھلا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ علی حق و صواب پر تھے، اور دوسرا گروہ باغیوں کا تھا، لیکن وہ مجتہد تھے اس لئے ان پر کوئی گناہ نہیں ..."

حیرت ہے کہ خلیفہ راشد کے مقابلہ میں بغاوت کو اور حق و باطل کے موقف کو محمد عثمانی صاحب فقہی جزئیات کی طرح راجح و مرجوح جیسی ہلکی چیز سمجھتے ہیں! اور ان کی رائے کو اگر درست مان لیا جائے تو صحابہ کرام پر یہ الزام آتا ہے کہ وہ راجح و مرجوح مسائل میں ایک دوسرے سے خونریز جنگیں کیا کرتے تھے۔

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبدالرحمٰن بن غنم، حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت ابوالدرداء کے مابین ایک مکالمہ کو نقل فرمایا ہے جس کے آخری الفاظ یہ ہیں:-

"معاویہ کا شوریٰ میں کیا دخل، معاویہ تو طلقاء میں سے ہیں، جن کے لئے خلافت ہو ہی نہیں سکتی، وہ اور ان کے والد سرداران احزاب میں سے تھے" (مقصد دوم ص [illegible] - ۲۴۹)

جمع الفوائد من جامع الاصول و مجمع الزوائد امام محدثین محمد سلیمان (ص ...) میں ہے کہ جنگ صفین میں حضرت عمار نے خود اپنی زبان سے یہ حدیث

حضرت عمرو بن العاص سے بیان کی، تو انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا، جب حضرت عمارؓ شہید ہو گئے تو :—

"عمرو بن العاص (رضی اللہ عنہ) نے معاویہ (رضی اللہ عنہ) سے کہا، کیا آپ نے نہیں سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ (وسلم) مسجد بنا رہے تھے تو عمار سے آپ نے فرمایا تھا، تم جہاد پر حریص ہو، تم جنتی ہو، تمہیں باغی گروہ قتل کرے گا، معاویہ نے کہا ہاں، میں نے سنا ہے تو عمرو بن العاص نے کہا آپ لوگوں نے انہیں قتل کیوں کر ڈالا (اس کے جواب میں) معاویہ نے کہا "ہم نے کہاں قتل کیا ہے، انہیں تو اس نے قتل کیا ہے جو انہیں (میدانِ جنگ) میں لے آیا"

حضرت معاویہ کے اس عجیب و غریب جواب پر شیخ عبدالحق محدث دہلوی تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اگر معاویہ کی یہ دلیل درست مان لی جائے تو پھر اس کے یہ معنی ہوں گے کہ غزوہ احد میں امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کو معاذ اللہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قتل کرایا تھا۔

اس سلسلہ میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کیا فرماتے ہیں! :—

باجملہ اصلح ہمین است کہ وے (یعنی معاویہ) را مرتکب کبیرہ باید دانست و زبان از لعن و طعن بند باید نمود۔ واما یقال فی من زنی ومن زنی ومن شرب من الصحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین وو ہر جائے خطائے اجتہادی را دخل دادن خالی از سماحت نیست۔

(فتاوی عزیزی صفحہ ۱۲۳)

الغرض درست یہی ہے کہ انہیں (یعنی معاویہ کو) کبیرہ کا مرتکب جاننا چاہیے اور زبان لعن و طعن بند رکھنی چاہیے ورنہ ان صحابہ کے بارے میں کیا کہا جائے گا جن سے زنا، اور شراب نوشی سرزد ہوئی اور ہر جگہ خطائے اجتہادی کو دخل دینا کوئی تعریف کی بات نہیں ہے۔

اس کتاب (فتاوی عزیزی صفحہ ۱۲۲) میں یہ تک ملتا ہے :—

"ایں حکایت از حال او شائبہ نفسانی نہ بود" — اُن کی (یعنی امیر معاویہ کی) حرکتیں شائبہ نفسانی سے خالی نہ تھیں۔

ازالۃ الخفا میں شاہ ولی اللہ دہلوی نے المستدرک کی بعض روایتیں نقل کی ہیں، جن میں بنو امیہ کی مذمت وارد ہوتی ہے مگر ہم اُن حدیثوں اور روایتوں کو یہاں جان کر نقل نہیں کرتے کہ صاحب المستدرک (حاکم) پر تشیع کی جانب خاص میلان کا الزام لگایا گیا ہے :—

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ جو خدانخواستہ رفض و خروج کی طرف مائل نہیں ہیں، وہ مدارج النبوۃ میں لکھتے ہیں :—

"گفتہ اند محدثان کہ ثابت نشدہ است در فضل معاویہ ہیچ حدیثے (صفحہ ۵۴۱)

"محدثین نے کہا ہے کہ فضائل معاویہ میں ایک حدیث بھی ثابت نہیں ہوئی"

علامہ ابن عبد البر نے "الاستیعاب" میں جس حدیث کو نقل کیا ہے اُس کا ترجمہ درج ذیل کیا جاتا ہے :—

"ابو داؤد طیالسی ہشام سے اور ابو عوانہ حمزہ سے روایت کرتے ہیں کہ ابن عباس نے فرمایا . . . کہ وہ کچھ لکھیں اس نے آکر کہا کہ وہ کھانا کھا رہے ہیں، پھر بھیجا، تو پھر بھی (حضرت معاویہ کی طرف سے) یہی جواب آیا کہ وہ کھانا کھا رہے ہیں، اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ نے فرمایا "لا اشبع اللہ بطنہ" اللہ اس کا پیٹ کبھی نہ بھرے"

شیخ عبدالحق محدث دہلوی اپنی کتاب "اشعۃ اللمعات" میں امام نسائی کے واقعہ کو یوں بیان کرتے ہیں :—

"از مصر بدمشق آمد۔ واہل ناحیہ ازوے در مسجد یا او گفتند چہ می گوئی در حق معاویہ وچہ چیز در فضل او وارد شدہ الخ جواب سائل گفت :—

اما یرضی معاویہ ان یخرج راسا براس حتی یفضل

حسد علیتے آنکہ گفت نمی شناسم ہیچ فضیلتے بلا لا اشبع اللہ بطنہ " پس مردم بر وے جستند و در وے پیچیدند،
و بے حرمتیہا کردند و چنداں زدند تا از مسجد بیروں آوردند و او را بہ رملہ بردند و علت آں جہت بیمار
شدہ و در آں بیماری رحلت از دنیا (صفحہ ۱۰)

" مصر سے دمشق آئے اور دمشق والوں نے ایک بار مسجد میں امام نسائی سے دریافت کیا کہ آپ معاویہ کے بارے میں کیا
کہتے ہیں اور اُن کی فضیلت میں کون سی بات آئی ہے۔ انہوں نے سائل کے جواب میں کہا کہ معاویہ اس پر راضی نہیں کہ برابر
سرابر ہی چھوٹ جائیں چہ جائیکہ اُن کی فضیلت میں کوئی چیز وارد ہوئی ہو اور ایک روایت میں ہے کہ میں اُن کی فضیلت
میں اس حدیث کے سوا اور کوئی حدیث نہیں جانتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اللہ اُس کا پیٹ کبھی نہ
بھرے" پس اس پر لوگ بھڑک اٹھے اور اُن پر پلٹ گئے اور اُن کی بڑی بے حرمتی کی اور اُن کو مارنا شروع کر دیا،
پھر انہیں مسجد سے باہر کر دیا گیا اور رملہ پہنچا دیا گیا وہ اسی (صدمہ) سے بیمار ہو گئے اور اسی بیماری میں دنیا سے
کوچ کر گئے "

امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ کے اس واقعہ کو پڑھنے کے بعد، ہم نے احادیث کے بعض اصل مجموعوں کو دیکھا، اُن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی
زبان مبارک سے چند دعائیں امیر معاویہؓ کے حق میں ملیں ـــــ یہ کہ اے اللہ انہیں حساب و کتاب (یا الکتاب والحساب) سکھا ـــــ اور عذاب سے
بچا، حیرت ہے کہ کنز العمال میں وہ روایت نہیں ملی، جس میں امیر معاویہ کے "ہادی و مہدی بنائے جانے" کی دعا کی گئی ہے! زبانِ رسالت سے کسی کے لئے
دعا یہ بھی فضیلت و شرف کا باعث ہے، مگر "دعائیہ روایتوں" کے علاوہ دوسرے صحابہ کے فضائل والی احادیث کی طرح کوئی حدیث امیر معاویہ کی
شان میں نہیں ملی ـــــ جس طرح حضرت زبیرؓ ابن العوام کو حضور نے اپنا "حواری" کہا ہے یا خلفائے راشدینؓ کی فضیلت میں صرف دعائیں نہیں
احادیث بھی وارد ہوئی ہیں، البتہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے امیر معاویہ کے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر انہیں "کسرائے عرب" کہا تھا۔
دینی خدمات میں زہد و ورع میں، علم و فضل میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شرف قربت و صحبت میں حضرت علی اور حضرت معاویہؓ کا کیا
مقابلہ! دینی جذبہ کے تحت ہی جمہور علماء نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی تعدیل اور موافقت کی ہے!
کوئی شک نہیں حضرت سیدتنا عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی "ندامت" نے انہیں رجوع کا موقعہ دیا اور ان کا معاملہ صاف ہو گیا مگر امیر
معاویہ رضی اللہ عنہ کا معاملہ اس کے برعکس ہے، خلیفہ راشد علی کرم اللہ وجہہ نے انہیں گورنری سے برخاست کیا، امیر معاویہ نے اس حکم کی تعمیل نہیں کی
اور خلافت راشدہ کے معاملہ میں اپنی امامت کو برقرار رکھا، خلیفہ راشد سے جنگوں میں امیر معاویہؓ کی حیثیت "باغی" کی تھی! انہوں نے اپنے بیٹے
یزید کی ولیعہدی کے لئے بیعت لے کر اسلام میں "ملوکیت" کی بنا ڈال دی! ان کھلے ہوئے واقعات کی روشنی میں نرم سے نرم الفاظ میں یہی طور پر کہا جا سکتا
ہے کہ امیر معاویہ کو حکومت اور اس کی لذتوں سے ذاتی طور پر دلچسپی تھی! ان غلطیوں کے باوجود حضرت امیر معاویہؓ کا شرفِ صحابیت اپنی جگہ ثابت ہے [1]
ہم ان کے نام کے ساتھ "رضی اللہ عنہ" لکھتے ہیں اور بولتے ہیں۔

---

[1] ہم نے، اپنے اس مضمون میں جناب محمد نواز (ایم اے) کے مسودے سے بھی استفادہ کیا ہے ـــ اس مسودے کی بعض روایتوں کا اصل کتابوں سے
ہم نے مقابلہ بھی کر کے دیکھا ہے، کتنی ہی روایتیں اصل کتابوں میں مل گئیں۔ مگر بعض کتابیں دستیاب نہ ہونے کے سبب، بعض روایتوں
کا مقابلہ نہ ہو سکا۔ لیکن صاحب موصوف پر ہمیں اعتماد ہے کہ خود انہوں نے اور اُن کے رفیق و معاون اہل علم نے اصل کتاب یا اس کا
عکس (یا اقتباس) دیکھے بغیر کوئی روایت نقل نہیں کی ہوگی۔ الا یہ کہ کسی کتاب ہی میں کسی شریر نے تحریف کر دی ہو۔
(م۔ ق م)

امیر معاویہ کے چہیتے بیٹے یزید کے بارے میں ہم خود کیا کہیں، اُس کی ناپسندیدگی پر ساری امت کا اجماع ہے اُس کے مبغوض، مکروہ اور ناپسندیدہ ہونے کا معاملہ اس حد تک پہنچا ہے کہ امام احمد حنبل نے تو اُسے کافر تک کہہ دیا ہے۔ (المسامرہ ص۱۷۸) اور شرح عقائد نسفی میں بھی اسی خیال کی تصویب کی گئی ہے!

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:-

۱ "علامہ نووی کی اس عبارت کے مطالعہ کے بعد مقدمات گزشتہ کی تصدیق ہو جاتی ہے، پس اہل سنت کے اصول پر یزید کی سابق حالت بدل گئی، بعض کے نزدیک کافر ہو گیا اور بعض لوگوں کے نزدیک اس کا کفر ثابت نہیں ہوا، بلکہ سابق اسلام، فسق سے مخلوط ہو گیا، اگر امام موصوف نے یزید کو کافر سمجھا تو اس پر خروج کر نہیں کیا غلطی فرمائی، امام احمد کو یہی بات پسند آئی (بحوالہ مکتوبات مولانا حسین احمد مدنی مرحوم)

مگر بجز یہ شبہ ہے کہ یزید کی تکفیر کا فتویٰ عقیدہ اہل سنت درست نہیں ہے ہاں! وہ امت کے لئے بد نمونہ ہے! اُن علماء کو کیا کہئے جو دیوبند سے شرف نسبت رکھتے ہوئے یزید کو حضرت اور رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، اور اس طرح ظالم حاکموں کی ہمت افزائی کا سبب بنتے ہیں!

امیر معاویہ کو حضرت مغیرہ ابن شعبہ نے یزید کی ولی عہدی کا جو مشورہ دیا تھا اور یہ بات انہیں سجھائی تھی، اس کو بھی پسندیدہ نہیں سمجھا گیا، اور امیر معاویہ کے دست راست حضرت عمرو بن العاص کی سیاسی حکمت عملی پر جو امیر معاویہ کی حمایت میں تھی، گفتگو ہی کی جائے گی۔

مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کا ان واقعات و معاملات میں وہی موقف رہا ہے جو جمہور اہل سنت کا موقف ہے اس لئے ان پر توہین صحابہ اور رفض و خارجیت کی طعن زنی عدل و انصاف کے خلاف ہے!

خلافت عثمانؓ حضرت سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی نیک نیتی، زہد و ورع، بے نفسی و پاکبازی اور بارگاہ رسالت میں آپ کو جو محبوبیت اور تقرب حاصل تھا اس کا اعتراف مولانا مودودی نے اپنے مضمون میں کسی تشابہ و ابہام کے بغیر واضح لفظوں میں کیا ہے ——— اس کے ساتھ وہ اس کے بھی قائل ہیں کہ حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں بعض ایسے اضطرابات نمایاں ہوئے، جن کا خلافت شیخین میں وجود نہیں ملتا اور حضرات شیخین کے دور خلافت کا طرز عمل پوری شان تمکین کے ساتھ خلافت عثمانی میں اس طرح منعکس نہ ہو سکا کہ کوئی انگلی اٹھانے کی جرأت نہ کر سکے۔ مثلاً تاریخ الخلفاء (ص۱۰۶) میں لکھا ہے:-

وکان کثیراً ما یولی بنی امیہ لمن لم یکن لہ مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فکان یجیئ من امرائہ ما ینکر اصحاب محمد وکان عثمان یستعتب فیہم فلا یغیرہم وذلک فی سنۃ خمس وثلاثین فلما کان فی الست الاواخر استاثر بنی عمہ فولاھم وما اشرک معھم وامر بتقوی اللہ۔

(اور حضرت عثمان اکثر بنی امیہ میں سے والی بنایا کرتے تھے جنہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت نہ اٹھائی تھی، وہ امراء ایسے کام کرتے تھے جو اصحاب محمد کو پسند نہ تھے، اور عثمان سے اُن کے بارے میں مواخذہ ہوتا تھا تو بھی آپ اُن کو معزول نہ فرماتے تھے یہ ۳۵ سنہ ہجری کا واقعہ ہے لیکن آخری چھ سال میں عثمانؓ نے اپنے بنی عم کو ترجیح دینا شروع کر دی اور اپنے بنی عم کو والی بنایا اور اُن کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک نہ کیا، اور اُن کو تقویٰ کا حکم دیا ....)

مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں:-

"مگر اس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ آپ (یعنی حضرت عثمانؓ) کی اسی نرم مزاجی اور شرمیلی طبیعت نے لوگوں کی ہمتیں بلند کر دی تھیں گو اپنی حد تک پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی خدمت کے متعلق جو کچھ وہ کر سکتے تھے، کرتے رہے، لیکن

عنقریب معلوم ہوگا کہ "حدیث" میں فتنہ کی ابتداء جن لوگوں کی راہ سے ہوئی، یہ وہی تھے جن کے لئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی نرم حکومت نے بدبختانہ جسارتوں کے ارتکاب کے مواقع فراہم کردئے (تدوین حدیث صفحہ ۴۱۲)

دیوبند سے مجلہ دارالعلوم حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کی نگرانی اور سرپرستی میں شائع ہوتا ہے حضرت مولانا انورشاہ صاحب کے صاحبزادے اس کے ایڈیٹر ہیں، دسمبر ۱۹۶۵ء میں ایک مضمون مولانا محمد میاں — حرف مولانا منصور انصاری صاحب مرحوم کا شائع ہوا ہے اُس میں وہ لکھتے ہیں، —

"یہ سانحہ بھی ہم کو تاریخ صحیح کے صفحات پر چھپا ہوا ملتا ہے کہ حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کی مضبوط قیادت کے بعد عالم اسلام کے مشہور سفیہ مروان اموی نے حضرت ذی النورین رضی اللہ عنہ کے ضعف پیری اور حیا سے استفادہ کرکے مہمات دولتی پر دست تصرف پاکر، اپنی قوم بنی اُمیہ کے احساس قومی کو ضربہ کہ جگایا بلکہ اس کو بنی ہاشم سے دست وگریباں کرنے کے لئے میدان میں بھی لے آیا۔"

اسی مضمون میں چند سطروں کے بعد مولانا محمد میاں نے جو دیوبند کے اکابر میں شمار کئے جاتے ہیں اور حضرت شیخ الہند کے تربیت یافتہ تھے دورِ خلافت عثمانی کو "عہد ضعیف عثمانی" ممکن ہے، کیا خلافت عثمانی پر تنقید کے اس جرم میں مولانا مودودی کی طرح ان بزرگوں کو بھی مورد لعن وطعن قرار دیا جائے گا!

یہی وہ مروان ہے جس کی قصیدہ خوانی، مولانا ظفر احمد عثمانی نے اپنی کتاب (براءۃ عثمان) میں کی ہے۔ مگر مولانا محمد میاں منصور انصاری اُسے "مشہور مفسد" کا لقب دیتے ہیں، لیکن مولانا ظفر احمد عثمانی کے صحیفہ عقیدت میں وہ حضرت اور رضی اللہ عنہ ہے۔

رہا مروان کی صحابیت کا معاملہ تو اس کے بارے میں حافظ ابن عبدالبر نے الاستیعاب میں مروان کے صحابی ہونے سے انکار کیا ہے اور علامہ ابن خلدون تک مروان کو صحابہ میں نہیں تابعین کے طبقہ اول میں شمار کرتے ہیں — کیونکہ — توفی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وھو ابن ثمان سنین او نحوھا ولم یرہ لانہ خرج الی الطائف طفلاً لا یعقل (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب رحلت فرمائی ہے تو اس وقت مروان آٹھ سال یا اس کے قریب تھا اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیکھا۔ کیونکہ جب وہ لایعقل بچہ تھا تو طائف کو چلا گیا تھا)

مروان کے بارے میں شاہ عبدالعزیزؒ کیا فرماتے ہیں؟ —

مروان علیہ اللعنۃ را بدگفتن وبدل از وبیزار بودن خصوصاً وسلوکے کہ با حضرت حسین واہل بیت می نمودند وعداوت مستقرہ آنچہ آن بدبخت در دل داشت از لوازم سنت ومحبت اہل بیت است۔۔۔۔ (فتاوی عزیزی صفحہ ۲۱۰)	مروان علیہ اللعنۃ کو بُرا کہنا اور دل سے اُس سے بیزار ہونا خاص طور سے اس سلوک کی وجہ سے جو اُس نے حضرت امام حسین اور اہل بیت کے ساتھ روا رکھا اور اُس پختہ دشمنی کی وجہ سے جو وہ ان بزرگوں سے دل میں رکھتا تھا سنت اور محبت اہل بیت کے لوازم میں سے ہے۔۔۔"

حاکم اس کے بارے میں "المستدرک" میں ایک روایت درج کرتے ہیں —

"عن عبداللہ ابن الزبیر رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لعن الحکم وولدہ"	حضرت عبداللہ ابن زبیر سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم اور اس کے بیٹے پر لعنت کی ہے۔

یہ حدیث (المستدرک، جلد دوم صفحہ ۴۸۱) صحیح الاسناد ہے اور علامہ ذہبی نے اس کو صحیح قرار دیا ہے!

مروان کو مدینہ میں "ابن الطرید" یعنی ہمیشہ کا مسترد شخص کا بیٹا بھی کہتے تھے، کیونکہ اُس کے باپ حکم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ سے نکال

دیا تھا، حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق کے دور خلافت میں اس شخص کو مدینہ میں آنے کی اجازت نہ مل سکی یا اس نے جرأت نہ کی مگر حضرت عثمان کے زمانہ خلافت میں وہ مدینہ میں آگیا۔

اب رہا مروان سے احادیث کی روایت کا مسئلہ، تو اس کی یہ کیفیت ہے کہ :-

"۱۲ مرجئی، ۷ ناصبی، ۲۵ شیعی، ۲۲ قدری، ۱ جہمی، ۲ معتزلی اور خارجی —— ان سے روایات بخاری اور مسلم نے قبول کی ہیں (تہذیب الراوی)"

اسی مروان پر جو حضرت عثمان کا پرائیویٹ سیکرٹری (کاتب السر) تھا، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے جرح کی ہے اور ایسا کر کے انہوں نے کوئی گناہ کیا ہے اور بے انصافی کی ہے!

ولید کی شراب نوشی کا اپنے مضمون میں مولانا مودودی نے جو ذکر کیا ہے وہ بھی تاریخ و سیر کی کتابوں سے ثابت ہے، مولانا مودودی نے :-

"خلافت سے ملوکیت تک"

میں کوئی ایسی بات نہیں کہی، جس کی اصل کسی کتاب میں نہ ملتی ہو، جن خیالات کا اپنے اس مضمون میں انہوں نے اظہار کیا ہے، اسی قسم کے خیالات دوسرے اکابر علماء اور مشاہیر ارباب فکر نے بھی ظاہر کئے ہیں اور ان پر کسی نے "اہانت صحابہ" "تنقیص عثمان" یا رفض اور خارجیت کا الزام نہیں لگایا۔

مولانا مودودی نے تو اپنے مقالہ میں حضرت عثمان کے احترام و عقیدت کو مستحکم کرنے کی خدمت انجام دی ہے کہ دور عثمانی کے اضطرابات کو نقل کر کے پڑھنے والوں پر یہ بات نہیں چھوڑی کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی نیت اور سیرت کے بارے میں خود فیصلہ صادر کریں یا تاریخ کی کتابوں میں ان واقعات کو پڑھ کر لوگ حضرت عثمان ذی النورین خلیفہ ثالث کو مطعون کرنے لگیں، مولانا مودودی نے ان اضطرابات کے باوجود حضرت عثمان کی نیت، سیرت اور زندگی سے خیر و سعادت، زہد و ورع اور بھلائی منسوب کی ہے، اور ذہن و فکر کو ان کی طرف بدگمانی اور سوء ظن سے بچایا ہے۔

صحابیت کوئی شک نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحابیت کا شرف نبوت کے بعد سب سے زیادہ ممتاز شرف ہے کوئی بڑے سے بڑا ولی بھی ادنیٰ درجہ کے صحابی کی برابری نہیں کر سکتا۔ واقعی اللہ تعالیٰ صحابہ کرام سے راضی تھا اور وہ اللہ تعالیٰ سے راضی تھے۔ (رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ) اور ہم گنہگاروں کے نزدیک صحابہ کرام کے جوتوں کی خاک بھی مقدس اور قابل احترام ہے۔ یہ انہی کی بے لوث اور مخلصانہ کوششوں، بے مثال قربانیوں اور جدوجہد سے اللہ تعالیٰ کے دین اور کلمہ کو غلبہ اور فروغ حاصل ہوا ہے۔

اگر کوئی شخص کے ایمان میں کجی ہے، جو صحابہ کرام پر زبان طعن دراز کرنے کا داعیہ اور جذبہ اپنے اندر رکھتا ہے، رافضی، خارجی اور ناصبی یہ گمراہ فرقے ہیں جنہوں نے صحابہ کرام کو خاک بدہن گستاخ، کافر، فاسق اور گمراہ ٹھیرایا ہے (معاذ اللہ) ہم ان عقائد اور تصورات سے بیزاری کا اعلان کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگتے ہیں۔

کوئی شک نہیں صحابہ کرام کی غالب ترین اکثریت بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ عہد صحابہ کا پورا معاشرہ "اولئک ھم المفلحون" کا مصداق تھا، اس قدر خیر والی سوسائٹی پھر دیکھنے میں نہیں آتی۔ دنیا میں کسی نبی اور رسول کو اتنے اچھے ساتھی (صحابہ) میسر نہیں آئے۔

تمام کے تمام صحابہ کرام "عدول" تھے۔ مگر ان تمام اوصاف حمیدہ کے باوجود وہ معصوم نہ تھے، مولانا عبدالسلام ندوی "اسوۂ صحابہ" میں لکھتے ہیں،

"لیکن یہ کسی محدث کا دعویٰ نہیں ہے کہ صحابہ کوئی کام انصاف کے خلاف نہیں کر سکتے۔ ان سے کوئی فعل تقویٰ و طہارت کے خلاف صادر نہیں ہو سکتا، وہ انبیاء کی طرح معصوم ہیں، وہ تمام گناہوں سے محفوظ ہیں لیکن ان کا مقصد صرف یہ ہے کہ کوئی صحابی روایت کرتے ہیں وہ غلط بیانی سے کام نہیں لے سکتا، چنانچہ ابن الانباری کا قول ہے کہ :-

"صحابہ کی عدالت سے یہ مراد نہیں کہ صحابہ بالکل معصوم ہیں اور ان سے گناہوں کا سرزد ہونا محال ہے بلکہ یہ مراد ہے کہ

ان کی روایتوں کو اسباب عدالت و ثقاہت کی چھان بین کے بغیر قبول کر لینا چاہیئے بجز اس صورت کے جب وہ

ایسے امر کا ارتکاب کریں، جو روایات میں قادح ہو اور یہ ثابت نہیں ہے"

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ صحابہ کرام غیر معصوم تھے، تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ صحابہ کرام خطا کار اور غلط اندیش تھے (معاذ اللہ)

صحابی کی صحیح تعریف کیا ہے؟ اس بارے میں، اختلاف آراء ہے، پھر تمام صحابہ کرام ایک جیسے نہیں ہیں، ان کے درجات ہیں یہ سابقون الاولون

یہ بدری ہیں، یہ فتح مکہ سے پہلے کے صحابی ہیں اور یہ بعد کے ہیں۔ یہ فقہاء ہیں اور یہ وہ ہیں جن کی تالیف قلب کی گئی ہے۔

کوئی شک نہیں ایسے مسائل جن میں صحابہ کرام کا اجماع پایا جاتا ہے یا خلفاء راشدین متفق ہیں وہ دین میں حجت و استناد کا درجہ رکھتے ہیں لیکن اختلاف

کی صورت میں ارباب فہم کو یہ معلوم کرنے کا حق رکھتے ہیں کہ کس صحابی کا قول اقرب الی الحق ہے —— امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں:-

"جب مجھے کتاب و سنت میں حکم نہیں ملتا تو میں اجماع صحابہ کی پیروی کرتا ہوں، اختلاف کی صورت میں جس صحابی کا قول

چاہتا ہوں قبول کرتا ہوں اور جس کا قول چاہتا ہوں چھوڑ دیتا ہوں"

امام موصوف کا ایک قول یہ بھی ہے:-

"جب صحابہ میں اختلاف ہو تو قیاس کرتا ہوں"

فقہاء نے عام طور پر منفرد صحابی کے قول کو دین میں حجت نہیں مانا، شمس الائمہ سرخسی فرماتے ہیں:-

"صحابہ سے رائے کی بنا پر فتوے صادر ہوتے ہیں، یہ ایسی کھلی ہوئی بات ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور رائے کبھی

غلط بھی ہوتی ہے .... پس صحابہ کے انفرادی فتوے میں صواب و خطا دونوں کا احتمال ہے اس طرح کے فتوے کے

مقابلہ میں رائے کو ترک کرنا جائز نہیں، جس طرح قیاس کو تابعی کے قول کے مقابلہ میں ترک کرنا جائز نہیں (الاصول جلد دوم ص)

امام شافعی کا اس بارے میں کیا مسلک ہے؟ اس کا جواب امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی زبان سے سنئے:-

"لا یقلد العالم صحابیا" کما لا یقلد عالما —— عالم کسی صحابی کی تقلید نہ کرے، جس طرح وہ کسی دوسرے عالم کی تقلید نہیں کرتا —— مگر

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ انفرادی طور پر بھی ہر صحابی کی رائے بہر حال دینی معاملات میں وزن رکھتی ہے۔

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے امت کو حسن ظن اور عقیدت ہی رکھنی چاہیئے، دین انہی کے ذریعہ سے ہم تک پہونچا ہے اور دین کے پہونچانے میں

کسی ایک صحابی نے بھی خیانت نہیں کی، اسی اعتبار سے صحابہ کرام کو "عدول" کہا جاتا ہے۔ مولانا مودودی نے اس کا اعتراف کیا ہے:-

"ہم بلا استثناء تمام صحابہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے میں قطعی قابل اعتماد پاتے ہیں اور ہر ایک کی روایت

بسر و چشم قبول کرتے ہیں"

ان تمام محامد و فضائل اور اوصاف و محاسن کے باوجود، انبیاء کرام کی طرح وہ معصوم نہ تھے، ان سے کبھی کبھار غلطیاں بھی ہو جاتی تھیں، مسلمان مورخین

اور محدثین کی یہ انتہائی دیانت ہے کہ صحابہ کرام کی طہارت و تقویٰ کی زندگی اور پاکبازانہ سیرت کے ساتھ حضرت ماعز، حضرت حاطب ابن بلتعہ اور حضرت

ابو محجن ثقفی کے واقعات بھی جس طرح اُن کو پہونچے ہیں، ہو بہو نقل کرتے ہیں! اس قسم کے چند واقعات سے صحابہ کرام کے معاشرہ پر کوئی حرف

نہیں آتا، بلکہ اس معاشرہ کی عفت و پاکبازی اور سچائی ثابت ہوتی ہے۔

صحابہ کرام نے غزوات میں انتہائی عزیمت، شجاعت اور کمال درجہ کی اطاعت اور جانفروشی کا ثبوت دیا ہے مگر غزوۂ احد میں ایسی صورت بھی پیش آگئی

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے مطابق عمل نہ کرنے کے سبب جنگ کا پانسہ ہی پلٹ گیا۔ اس واقعہ پر ان لفظوں میں تنقید کہ بعض صحابہ سے غزوۂ احد میں

لغزش اور کوتاہی ہو گئی، جائز تنقید ہے!

اسی مضمون میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ جیسے بڑے درجہ کے صحابی کے متعلق ایک روایت درج کی جا چکی ہے، جس میں حضرت ابوذر نے حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف اور حضرت کعب احبار کے بارے میں جو الفاظ استعمال کئے ہیں، وہ پسندیدہ نہیں ہیں، اسی طرح حضرت عباس نے ایک بار حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے متعلق جو الفاظ کہے، ان پر "ناپسندیدہ" کی تنقید کو جو کوئی "اہانت صحابہ" سے تعبیر کرتا ہے وہ دینی فراست نہیں رکھتا، اس قسم کا بشری ذہول کبھی کبھار ان نفوس قدسیہ پر بھی طاری ہو جاتا تھا، جس کی نشاندہی اور اس پر نقد و تبصرہ کرنے پر "شرف صحابیت کو مجروح کرنے" کی حضرت اپنی جگہ بے جا اور غیر عادلانہ طنز ہے۔

عادات میں صحابہ کرام ایک دوسرے کے فریق بھی ہوتے تھے، اور ان میں طرفین میں ایک حق پر ہوتا تھا، اس قسم کے بعض واقعات کے بیان و تبصرہ سے اہانت صحابہ منسوب نہیں کی جا سکتی، حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے حضرات شیخین کی بیعت سے جو گریز کیا اس پر بعض ارباب نظر نے سخت تنقید کی ہے مال غنیمت کے سلسلہ میں انصار نے جو اعتراض وارد کیا تھا، جس کی زد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر پڑتی تھی، اس فعل کی مذمت ہی کی جائے گی۔

حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں آپ کی پوری نیک نیتی اور بے نفسی کے باوجود جو بعض اضطرابات ملتے ہیں، ان کا اظہار یا یہ کہنا کہ حضرت عثمان کے دور میں خلافت کی مشنری میں کچھ ڈھیل پیدا ہو گئی تھی یا بنی امیہ کو غلبہ حاصل ہو گیا تھا ــــ اس قسم کی تنقید کو "تنقیص" سمجھنا، فہم و فراست کی کوتاہی ہے! اس سلسلہ میں ولید مروان اور حکم کی شخصیتوں کا ذکر آئے گا تو مورخ مدح و منقبت کا رنگ تو قائم نہیں رکھ سکتا!

حضرت علی و معاویہ رضی اللہ عنہما کے باہمی نزاع میں امیر معاویہ پر تنقید دینی، اخلاقی اور علمی و تاریخی اعتبار سے ناجائز اور نامناسب بات نہیں ہے! دونوں میں سے ایک کو حق پر ماننا پڑے گا، جو حضرات امیر معاویہ کی مدافعت کرتے ہیں ان کے قلم سے حضرت علی کی شخصیت تنقید سے محفوظ نہیں رہ سکی مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اس سلسلہ میں جو باتیں کہی ہیں دوسرے اکابر امت کے یہاں بھی اسی انداز کے اقوال اور نقد و احتساب ملتا ہے۔ اگر یہ کوئی جرم ہے تو مودودی صاحب ہی کو نہیں، تمام ارباب فکر کو مجرم ٹھہرائیے، یہ کہاں کا انصاف ہے کہ دوسرے لوگ وہی بات کہتے ہیں تو ان پر کوئی گرفت نہیں ہوتی، مولانا مودودی کو ہدف ملامت بنایا جاتا ہے اور ہزارہ کے ایک مولوی صاحب نے تو مولانا مودودی پر کفر کا فتویٰ تک داغ دیا، اس ظلم پر جو حضرات خوش ہوتے ہیں وہ بھی اس ظلم میں شریک ہیں۔

بعض حضرات کو یہ کہنے بھی سنا گیا ہے کہ ساڑھے تیرہ سو سال بعد ان مباحث کو اس زمانہ میں چھیڑنے کی کیا ضرورت تھی! ان حضرات کی خدمت میں عرض ہے کہ نہیں، اس قسم کی بات حضرت شاہ ولی اللہ اور حضرت شاہ عبدالعزیز کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے کہ انہوں نے بارہ سو سال کے بعد اپنی کتابوں میں ان مباحث کو کیوں ذکر فرمایا، اگر ان سے اس قسم کے سوالات کئے گئے ہوتے، تو وہ یہ فرما سکتے تھے کہ اے سوال کرنے والو! ان بحثوں سے تمہاری کون سی دینی اور تاریخی ضرورت وابستہ ہے! پھر اسی ہمارے دور میں مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا محمد میاں، منصور انصاری اور دوسرے اکابر نے اپنے مضامین میں ان مباحث کو چھیڑا ہے۔

پھر یہ موضوعات و مباحث ایسے نہیں ہیں جو تاریخی طلبہ میں دبے پڑے ہوں اور لوگوں کے کانوں میں بھنک تک نہ پڑی ہو، اسلامی تاریخ کی کوئی کتاب بھی جس میں خلافت راشدہ کا ذکر ہے ان بحثوں سے خالی نہیں ہے اسی صدی کے مورخ مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی ہوں یا دارالمصنفین کے اہل قلم یا دوسرے تاریخ والے تاریخ رقم حضرات ان سب نے ان مباحث میں حصہ لیا ہے! پھر اسلامی تاریخ کے طالب علموں کے ذہنوں میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ خلافت راشدہ ملوکیت میں کس طرح تبدیل ہو گئی، یہ سانحہ کیوں اور کس طرح پیش آیا، مولانا مودودی نے اپنے مقالہ میں اس کی نشاندہی کی ہے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا ان مباحث میں وہی مسلک ہے جو اہل سنت کے اکابر کا ہے، قابل احتساب تو اُن لوگوں کی روش ہے جو بنو امیہ کے وکیل، قصیدہ خواں اور نقیب بنے ہوئے ہیں۔ اور یہ حضرات مروان ہی نہیں یزید تک کی تعدیل و توصیف کرتے ہیں۔ امت کے

ضمیاد، ذوق مزاج نے اس کا فیصلہ کر دیا ہے کہ اب حضرت عمر ابن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے دورِ حکومت کے واپس آنے کی تمنا کرتی ہے مگر ملوکیتِ معاویہ کی واپسی کے لئے زنّار رکھتی ہے اور نہ دعا کرتی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو حق پسندی، حق شناسی اور حق گوئی کی توفیق عطا فرمائے اور ہم کو اس کام میں لگا دے جو اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کا سبب بن سکے۔ ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم۔

مولانا شمس تبریز خان آفریدی

عالمگیرؒ اور انگریز مورخین

تمہیں لے دے کے ساری داستاں میں یاد ہے اتنا   کہ عالمگیرؒ ہندو کش تھا، ظالم تھا ستمگر تھا   (شبلیؒ)

عالمگیرؒ کی عظمت کی گواہ خود اس کی شاندار زندگی اور اس کے دور حکومت ہے۔ اکبر نے سازگار حالات اور خوشگوار ماحول میں اگر پچاس سال حکومت کی تو کوئی تعجب کی بات نہیں، عالمگیرؒ کا وہ حیرتناک ہے جس نے مخالفتوں کے طوفان میں منزل کی طرف مسلسل پیش رفت کی، اور اندھیروں میں اپنا چراغ جلاتا رہا ہے

نہ ہر درخت تحمل کند جفائے خزاں   غلام ہمت سروم کہ ایں قدم دارد

خدمت کے بعد عظمت ہو سکتے ہیں میرے معیار عظمت پہ وہ اس طرح پورا اترتا ہے کہ اس کے قول و فعل میں تضاد نہ تھا۔ اسلام کی عظمت بھی تھی اور جس دین پر اس کا ایمان ناحق نہ تھا اُسے حکومت کے جھمیلوں اور فرمانروائی کے مشغلوں میں بھی فراموش نہیں کیا۔ اُس نے حکومت کو امانت اللہ کی خلافت سمجھا نہ کہ اپنے آپ کو اللہ کی زمین پر خلیفہ سمجھا وہ آمر مطلق (DICTATOR) یا سلطان جابر نہیں تھا ایک مرد باخدا اسلامی حاکم وقت تھا، وہ احتساب نفس، عبدیت، انابت، خشیت، خوف خدا، فکر آخرت، رعایا پروری، امن و انصاف کا راستہ اختیار کر کے عمر بن عبدالعزیزؒ، نورالدین زنگیؒ، صلاح الدین ایوبیؒ کی صف میں جا کھڑا ہوا اور اپنے عہد میں شوکت اسلامی کا نشان اور شریعت اسلامیہ کا پاسبان بن گیا۔ اس کی یہی اہمیت تھی جس نے علامہ اسلامی شاعر اقبالؒ سے خراج عقیدت وصول کیا۔

شاہ عالمگیرؒ گردوں آستاں   اعتبار دودمان گورگاں
پایۂ اسلامیاں برتر ازو   احترام شرع پیغمبر ازو
درمیان کارزار کفر و دیں   ترکش ما را خدنگ آخریں
تخم الحادے کہ اکبر پرورید   باز اندر فطرت دارا دمید
شمع دل در سینہ ہا روشن نبود   ملت ما از فساد ایمن نبود
حق گزید از ہند عالمگیر را   آں فقیر صاحب شمشیر را
از پئے احیائے دیں مامور کرد   بہر تجدید یقیں مامور کرد
برق تیغش خرمن الحاد سوخت   شمع دیں در محفل ما برفروخت
کور ذوقاں داستانہا ساختند   وسعت ادراک او نشناختند

جانم از ظلمی او می تپید　　اشک خوں از دیدۂ دل می چکید
شعلۂ توحید را پروانہ بود　　چوں براہیم اندریں بتخانہ بود
در صف شاہنشہاں یکتاستے　　فقر او از ترکشش پیداستے
(رموز بیخودی)

انگریز مورخین نے کچھ تو سیاسی مصالح کے ماتحت عقیدت منوچی کی غلط بیانیوں پر اعتماد کر کے اور کچھ اپنے فطری تعصب اور مسلم دشمنی کی وجہ سے عالمگیرؒ اور دوسرے مسلم بادشاہوں کو بدنام کرنے کی تاریخی مہم شروع کی، اور جیسے آج کے "مورخین" ہندو مورخین کی تحقیق قبول کر لیتے ہیں ہم سرسری طور پر انگریز مورخین کی تاریخی غلط بیانیوں کی وجہ بتاتے ہیں (۱) "صلیبی جہاد" کی اس ابدی شکست کا انتقامی جذبہ جو اب تک یورپ میں موجود ہے، فرنچ جنرل کاسترو نے کہ دمشق کے انقلاب کے موقع پر کہا ہے۔

"ہم صلیبی مجاہدین کے بیٹے ہیں جسے ہماری حکومت ناپسند ہو وہ یہاں سے نکل جائے" (اسلام کا نظام عدل، سید قطب شہید مصری ص ۲۴۴)

اسی طرح گذشتہ جنگ عظیم میں ایک انگریز کمانڈر "ALLENBY" نے بیت المقدس میں داخل ہوتے ہوئے کہا :-

"صلیبی جنگیں درحقیقت آج ختم ہوئی ہیں" (ص ۲۴۴) معرکۂ صلیب و ہلال کی بازگشت صدیاں گذر جانے پر بھی یورپ میں سنائی دیتی رہتی ہے۔ پھر عثمانی ترکوں کے ہاتھوں یورپ کی مسلسل پسپائی اور سلطان محمد فاتح کی فتح قسطنطنیہ کی کامیابی بھی ان کے دل میں برابر کھٹکتی رہی۔ (۲) مغل بادشاہوں میں عالمگیرؒ پہلا بادشاہ ہے جس نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ناجائز اور ظالمانہ طریقوں پر سختی سے ٹوکا۔ حتیٰ کہ اس کا وفد مشکیں باندھ کر اور طعیبہ پشت اس کے دربار میں حاضر کیا گیا مگر اس نے اپنی عالی حوصلگی اور شاہانہ فیاضی سے انہیں معاف کر کے فورٹ ولیم کالج کا علاقہ بخش دیا۔ پھر انگریزوں اور دوسرے مغربی غارتگروں نے بحر ہند کو اپنی جولانگاہ بنا لیا۔ عالمگیرؒ کا بحری بیڑہ اس پر بھی گاہ گاہ حملہ آور ہوتا جو انہیں سخت ناگوار تھا (۳) "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کی پالیسی جس نے ہندو مسلم منافرت پھیلانے میں زبردست حصہ لیا اور اب یہ کام لکھی ہوئی تاریخیں کر رہی ہیں۔

(۴) ایک بڑا سبب ان کی سہل انگاری اور زود اعتمادی ہے، انگریز رائے قائم کرنے اور تبصرہ کرنے میں بہت جلد باز ہوتے ہیں اور "پندار تفوق" میں مبتلا ہو کر بہت سی افواہوں اور ہوائی باتوں پر معتبر خبروں کی طرح یقین کر لیتے ہیں اور پھر انہیں تاریخ کا ماخذ بنا لیتے ہیں، ان کی تاریخ دانی کا یہ عالم ہے کہ آنحضورؐ کے اسم گرامی کا صحیح املا آج تک وہ نہیں لکھ سکے اور حضورؐ کے مافوق العادت اور حیرت انگیز پیغمبرانہ کارناموں کو فرماں روائی اور کشمکش ہی سمجھتے رہے۔ اور مسلمانوں کے متعلق ان کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ محمدؐ کے بت کو مسجدوں میں پوجتے ہیں! (نعوذ باللہ) یہ چند سرسری وجوہ ہیں جن سے شعوری اور غیر شعوری طور پر انگریز مورخین نے عالمگیرؒ پر تاریخی ظلم کیا۔ وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون۔ اب ہم چند انگریز مورخین کے وہ اعترافات لکھتے ہیں جو "الفضل ما شهدت به الاعداء" کا نمونہ ہیں۔

الگزنڈر ہیملٹن ۱۶۸۸ء میں عہد عالمگیری ہندوستان کی سیر کے لئے آیا اور ۳۵ سال رہ کر واپس گیا ایک بار اُسے دربار عالمگیری میں بھی باریابی نصیب ہوئی تھی، ایسٹ انڈیا کمپنی سے وہ متعلق نہ تھا اس لئے اس نے بیوپاریوں پر گرفت بھی کی ہے، اس کے سفرنامے کا دوسرا ایڈیشن ۱۷۴۴ء میں چھپا تھا جس کا انتخاب جرنل ہسٹری الشمیگ جینیٹ حیدرآباد نے ۱۹۳۴ء میں کیا تھا ہم اس سے جستہ جستہ انتخاب پیش کرتے ہیں :-

"ٹھٹھہ (سندھ) علوم فقہ و فلسفہ و سیاسیات کے لئے مشہور ہے ان علوم میں لڑکوں کو تعلیم دینے کے لئے تقریباً ۴۰۰ کالج یہاں ہیں" (سفرنامہ ہملٹن ۱/۱۲۶)

مذہبی رواداری کے متعلق لکھتا ہے "ریاست کا مسلمہ مذہب اسلام ہے لیکن تعداد میں ۱۰ ہندو میں تو ایک مسلمان ہے۔ ہندوؤں کے ساتھ مذہبی رواداری اس طور سے برتی جاتی ہے وہ اپنے بت رکھتے ہیں اور تہوار اسی طرح سے مناتے ہیں جیسے اگلے زمانے میں وہ اپنے مردوں کو جلاتے ہیں لیکن عورتوں کو ستی ہونے کی اجازت نہیں" (۱/۱۲۷-۱۲۸)

• صرف جینیوں میں وہ فرقے ہیں اور گو ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کھانا نہیں کھاتے لیکن آپس میں مل کر رہتے ہیں، برہمن بیٹیاؤں کے لئے بچی یا نامالو کو وقف کرتے ہیں۔

• پارسی اپنے رسوم مذہب زرتشت کے مطابق ادا کرتے ہیں، عیسائیوں کو پوری اجازت ہے کہ اپنے گرجے بنائیں اور اپنے مذہب کی تبلیغ کریں اور بعض مرتبہ اس میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں لیکن جو لوگ عیسائی ہو جاتے ہیں ان کے اخلاق شہر کے تمام لوگوں کے اخلاق سے عموماً بدتر ہوتے ہیں۔

• اس شہر (سورت) میں تخمیناً سو مذاہب کے لوگ رہتے ہیں لیکن ان میں کبھی کوئی سخت جھگڑا ان کے اعتقادات و عادات کے متعلق نہیں ہوتا اختلاف مذہب پر تکلیف دینا اور ستانا بالکل ان لوگوں میں مفقود ہے" (۱/۱۶۲)

تجارت اور خوشحالی

• عبدالغفور نامی ایک سوداگر سورت میں رہتا ہے جس کا تجارتی سرمایہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے کل سرمایہ کے برابر ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ ایک سال میں اس کے تقریباً ۲۰ جہاز وہ بھر کر بھیجتا ہے ہر ایک جہاز ۳۰۰ سے ۸۰۰ ٹن کا تھا اور ہر ایک میں صرف انکا مال، اور ان میں ہر ایک میں پچیس ہزار کا ہوتا اور جب یہ مال باہر روانہ ہو چکتا تب بھی اس سے زیادہ مال اس کے پاس رہتا" (۱/۱۴۵)

• ہندوستانیوں کے پاس بڑے بڑے سو سو ٹن کے جہاز ہیں یہ ہندوستانی انگریز ملاحوں کو بڑی بڑی تنخواہیں دے کر بحیثیت کپتان اور میٹ ملازم رکھتے ہیں" (۱/۲۲۳)

• مالابار کے لوگ یورپ کو مچھلیاں بھیجتے، رال، چاول اور قیمتی جواہرات بھی باہر جاتے، ہندوستان کا کپڑا اس قدر ہوتا تھا کہ اس کی کھپت ولایت پیگو، سماٹرا وغیرہ میں بھی تھی" (۱/۲۵۰)

• گائے کا گوشت ۳ فارسنگ یعنی کچھ کوڑیوں میں نصف سیر ملتا تھا" (۱/۲۱۱)

• ایک ٹن نمک بنگال میں فروخت ہوتا تھا جو ۲۲½ روپیہ کے برابر تھا" (۱/۲۵۵)

• شہر اٹک میں مکھن ایک آنہ میں ایک پونڈ (نصف سیر) ملتا تھا" (۱/۳۹۲)

• ڈھاکہ میں ۸۰ پونڈ چاول ایک روپیہ میں ملتا ہے" (۲/۲۵)

انصاف اور امن

• عالمگیر کے زمانہ میں ڈاک کا انتظام اس حد تک کیا گیا تھا کہ ہندوستان کے دور دراز مقام سے دہلی تک خط پہنچنے میں صرف ۸ دن صرف ہوتے تھے اور ہر دو میل پر ہرکارے بدل دئے جاتے تھے" (۱/۱۴۹)

"سیاہ فام ہندوستانیوں میں رشوت اتنی نہیں جتنی گورنمنٹ میں ہے" (۱/۱۸)

"اس ملک کی رعایا قوانین کی اس قدر پابندی کرتی ہے کہ ڈاکہ اور قتل کی خبریں بہت کم سنی جاتی ہیں ایک غیر ملک کا باشندہ اس ملک میں جا ہے جہاں چلا جائے کوئی یہ بھی تو نہیں پوچھتا کہ وہ کہاں جاتا ہے اور کیوں جاتا ہے؟" (۱/۲۶۹)

صنعت و حرفت

• ہندوستان میں عمدہ سے عمدہ کپڑا بکثرت ملتا تھا جس کی مثال یورپ میں ملنی دشوار تھی، یہاں سوتی کا کپڑا بہت باریک و ملائم ہوتا ہے اور اس قسم کا کپڑا میں نے اپنی زندگی میں نہیں پایا" (۱/۱۲۵)

مرزا صاحب لکھتے ہیں " غالباً یہ ڈھاکہ کی مشہور ململ ہوگی، اس کے علاوہ کمخواب، چھینٹ اور سادے کپڑے بنانے والے اس کثرت سے تھے کہ صرف بنگال میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے پچاس ہزار کپڑا بننے والے جولاہے ملازم رکھے تھے لوگ پوچھیں گے کہ یہ صنعت کیسے غائب ہو گئی ؛

جن لوگوں کو اس کی جستجو ہو وہ رمیش چندر دت آئی سی ایس، سی آئی ای کی کتاب "INDIAN ACONOMIC HISTORY"

سکتا ہے استخارہ پڑھتا ہے اور علماء کی جماعت میں قرآن مجید کی تلاوت کرتا ہے جن کے ساتھ کبھی تو وہ چھ گھنٹے اور کبھی نو گھنٹے شب میں بیٹھتا ہے اور صوم و صیام کے آخر عشرہ میں وہ مسجد میں معتکف ہوتا ہے اور اگرچہ بوجہ چند در چند وہ حج کو نہیں جا سکتا ہے لیکن حاجیوں کی آسائش کے لئے وہ جس قدر اہتمام کرتا ہے ثواب حج کے برابر ہے۔ وہ کبھی خلاف شرع لباس نہیں پہنتا اور کبھی سونے چاندی کے برتنوں میں کھاتا ہے نہ اس کے دربار میں کسی قسم کی گفتگو نا شائستہ غیبت اور کذب کی اجازت نہیں۔ وہ ہر روز دو یا تین مرتبہ خندہ پیشانی اور حلیمانہ وضع سے فریادیوں کا انصاف کرنے کو دربار میں آتا ہے یہ فریادی بلا روک ٹوک بکثرت جمع ہوتے ہیں اور چونکہ وہ بڑی توجہ سے ان کی باتیں سنتا ہے وہ بے خوف و ہراس اپنا حال عرض کرتے ہیں اور بادشاہ کی معدلت گستری سے بہرہ مند ہوتے ہیں اگر کوئی شخص اتنی زیادہ باتیں کرتا ہے جتنی نہ کرنی چاہئے تو وہ کبھی ناخوش نہیں ہوتا اور نہ چیں بہ جبیں ہوتا ہے۔

وہ نہایت اعلیٰ درجہ کا نثر نویس ہے اور اچھی عبارت کا ناظم ہے لیکن حکم خدا عزوجل کی تعمیل میں کہ — (تنزل علیٰ کل افاک اثیم لا یلقون السمع واکثرھم کٰذبون ط والشعراء یتبعھم الغاوٗن) کبھی شاعری کی توجہ نہیں کرتا وہ ایسے اشعار سننے سے بھی بچتا ہے جن میں کوئی نتیجہ اخلاق نہ ہو۔ رضامندی پروردگار کی جستجو میں اس نے کبھی خوشامد کی باتوں پر کان لگایا اور شرع کے مضمون پر توجہ کی۔" (صفحہ ۶۳)

بے لاگ انصاف بمبئی اور سورت کے تاجروں نے اوونگٹن سے کہا تھا کہ مغل اعظم عدل کا بحر اعظم ہے نیچے تک انصاف سے کام لیتا ہے اس کے حضور سفارش، منصب اور امارت کی کچھ پیش نہیں جاتی بلکہ ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی کی بات اس مستعدی سے سنتا ہے جس طرح بڑے سے بڑے امیر کی، امراء اپنی حرکات کے بارہ میں چوکنا رہتے ہیں اور وقت مقررہ پر نماز بھی ادا کر دیتے ہیں۔" (صفحہ ۹۶)

الفنسٹن جس کے بارہ میں مولانا شبلی لکھتے ہیں کہ اس سے بڑھ کر عالمگیر کا کوئی دشمن نہیں گذرا وہ بھی یہ کہے بغیر نہ رہ سکے کہ "وہ خود تن تنہا اپنی حکومت کی ہر شاخ کی کارگذاری کرتا رہا۔ لشکر کشیوں کے نقشے سوچتا اور ہدایت جاری کرتا اس کے رقعوں میں پٹھانوں کے ناہموار ملک میں سڑکوں کے جاری کرانے اور ملتان آگرے کے خاندانوں کو ڈھانے بلکہ قندھار کو دوبارہ حاصل کرنے کی تدبیریں مندرج پائی جاتی ہیں۔ سارے کارندوں کی نگرانی جاسوسوں اور مسافروں سے کرتا تھا اس سے طبیعت کی آمادگی اور نہایت گرم جوشی ایسی معلوم ہوتی ہے جو ہر زمانہ میں بڑی عجیب و غریب سمجھی جاتی ہے" (تاریخ ہند الفنسٹن صفحہ ۱۱۳ بحوالہ مضامین عالمگیر صفحہ ۲۵)

ڈاکٹر جیمی کیری نے ۷۰ سال کی عمر کے عالمگیر کو دیکھا تھا وہ بیان کرتا ہے کہ :—

"وہ صاف سفید ململ کی پوشاک پہنے عصا کے سہارے امیروں کے جھرمٹ میں کھڑا تھا اور اس کی پگڑی میں ٹنا ہوا ایک بڑا زمرد کا منکا ہوا تھا داد خواہوں کی عرضیاں لیتا جاتا تھا اور بلا عینک پڑھ کر خاص اپنے ہاتھ سے دستخط کرتا جاتا تھا اور اس کے ہشاش بشاش چہرے سے صاف مترشح تھا کہ وہ اپنی مصروفیت سے نہایت شادمان و فرحان ہے" (الفنسٹن ۳۰۰ بحوالہ مضامین عالمگیر صفحہ ۳۷)

علامہ شبلی رقمطراز ہیں کہ :

"الفنسٹن صاحب کی زبان سے عالمگیر کی تعریف میں ایک لفظ عالمگیر کی قسمت کا یاوری ہے تاہم صاحب موصوف نے عالمگیر کے استقلال کا ایک بہا معیار قائم کیا ہے جن کی تفصیل سے واقعات لکھے ہیں اور ان پر سخت حیرت ظاہر کی ہے" (مضامین صفحہ ۱۱)

ایک عجیب ستم ظریفی انگریزی اور ہندو مؤرخین کے ہاں یہ دیکھنے میں آتی ہے کہ وہ عالمگیر کے بعض ایسے خطوط کو جن میں کسر نفسی اور تواضع سے کام لیا گیا ہے اور جن میں عبودیت انابت اور حسرت و ندامت کا اظہار کیا گیا ہے اُسے حقیقت پر محمول کر لیا جاتا ہے اور اس سے استدلال کیا جاتا ہے کہ دیکھو عالمگیر خود اپنے ظلم و ستم کا اور ناکامی کا اعتراف کرتا ہے! چنانچہ لین پول نے بھی شاہزادہ اعظم کے نام کا یہ خط نقل کیا ہے اور یہ نتیجہ نکالا ہے :—

عالمگیر نے لکھا تھا: "میں بہت بڈھا اور ناتوان ہو گیا ہوں، جب میں پیدا ہوا تھا میرے گرد بہت سے لوگ جمع تھے، لیکن اب میں تنہا جا رہا ہوں، میں نہیں جانتا کہ میں کیوں زندہ ہوں اور دنیا میں کس غرض سے آیا تھا مجھے ان گھڑیوں کا صدمہ ہے جو میں نے یاد خدا میں نہیں گزاریں میں نے ملک اور رعایا کے ساتھ کوئی بھلائی نہیں کی میری زندگی بیکار ضائع ہوئی...... آخرت میں مجھے کوئی امید نہیں ،... جب میں دنیا میں آیا تھا تو خالی ہاتھ تھا لیکن اب جاتا ہوں تو گناہوں کا بوجھ لے جاتا ہوں میں نہیں جانتا کہ کس عذاب میں مبتلا ہونا پڑے گا، لیکن خدا کے فضل پر مجھے بھروسہ ہے گو اپنے گناہوں پر سخت پشیمانی ہے جب مجھے خود اپنے سے مایوسی ہو گئی تو دوسروں سے کیا توقع ہو سکتی ہے۔

ہر چہ بادا باد ما کشتی بآب انداختیم : الوداع ، الوداع ، الوداع ! الوداع !!! (ص ۱۹۹)

کام بخش کو لکھتا ہے:

روح و روانم ہر میں تم سے رخصت کرتا ہوں...... جدھر نگاہ اٹھا کر دیکھتا ہوں خدا ہی خدا نظر آتا ہے میں نے بڑے بڑے گناہ کئے ہیں اور نہ معلوم کیسے عذاب میں مبتلا ہوں گا ایسا نہ ہو کہ مسلمانوں کا خون ہو اور اس کا عذاب میری گردن پر ہو...... (ص [illegible])

ای، مارسڈن کوئی بڑا مورخ نہیں مگر اس کی کتاب "حکایات ہند" سالہا اسکولوں میں داخل رہی ہے اور نگزیب پر اس نے تمام الزامات دہرائے ہیں جو ہم وطن لگاتے ہیں مگر وہ بھی اتنا لکھتا ہے:

"اور نگزیب ہر طرح سے عالمگیر ایک عادل فرماں روا تھا، نہ شراب یا لہو و لعب کے شغل کا ہرگز شوقین نہ تھا، اس نے جو کچھ درست سمجھا اس کو [illegible] لوگوں پر عمدگی سے حکومت کرنے کی کوشش کی، اس نے اپنی ذات کے لئے کوئی روپیہ برباد نہیں کیا، وہ اپنی روزی فی الحقیقت ٹوپیاں بنا کر اور قرآن شریف کی کتابت کر کے کماتا تھا...... وہ عالم فاضل آدمی تھا اگر دوسرے مذاہب کے ساتھ بھی نرمی برتتا تو لوگ اسے اکبر کی طرح عزیز سمجھتے" (ص [illegible])

ناظرین سے معذرت خواہ ہوں کہ مضمون خاطر خواہ نہ ہو سکا کیونکہ مشہور انگریز مورخین ہند - ٹڈ، اسکاٹ، الیٹ، اورمے، کین، ڈیو ...... اسمتھ، ولیم ارون، اریکسن وغیرہ کی تواریخ پیش نظر نہ تھیں، اس کی تلافی کسی دوسری صحبت میں ہو سکے گی۔ یہ ایں رشتہ بانگشت نہ پیچی کہ ہے ماست! مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مضمون کا خاتمہ علامہ شبلی کے الفاظ پر کروں آپ فرماتے ہیں:

"عالم اسلامی دنیا میں اس کے بعد آج تک کوئی اس کے برابر کا شخص بھی نہیں پیدا ہوا" (مضامین عالمگیر ص ۱۴۱)

مولانا مرحوم کے اس خیال پر کوئی چاہے تو گفتگو بھی کر سکتا ہے میری ترتیب میں شاہان مغل کا درجہ اس طرح ہو گا۔

(۱) سلطان محی الدین اورنگ زیب علیہ الرحمۃ (۲) شاہجہان (۳) [illegible] (۴) ہمایوں (۵) جہانگیر (۶) اکبر

متنبی کی خوبیوں کی مدافعت کرتے ہوئے جرجانی رقمطراز ہیں کہ شاعری علوم عرب میں ایک ایسا علم ہے جس میں انسانی فطرت، روایت اور ذہانت کو یکساں حیثیت حاصل ہے، مشق و ممارست اس کا ایک خاص عنصر و مادہ ہے جس سے قوت پیدا ہوتی ہے، جس شاعر میں یہ تینوں بالا صفات موجود ہوں، وہ یقیناً ایک عظیم اور ممتاز شاعر ہوتا ہے ان ہی صفات کے لحاظ سے شاعری کی عظمت کا تعین بھی ہوتا ہے، میں جاہلی، مخضرمی، جدید و قدیم، اعرابی اور مولد کے مسائل سے قطع نظر کر کے کہتا ہوں کہ محدث کو روایت کی ضرورت نسبتاً زیادہ شدید ہے اسی طرح اس کو حفظ کرنے کی بھی زیادہ احتیاج ہے جب اس معاملہ میں ہم تحقیق کریں گے تو معلوم ہوگا کہ فطری اور ذہین شاعر کے لئے بھی یہ ممکن نہیں کہ وہ بغیر روایت کے عربی کے الفاظ پر قادر ہو سکے عرب زمانۂ قدیم سے روایت اور حفظ کے قائل رہے ہیں۔ اور ایک شاعر دوسرے کا راوی ہوتا آیا ہے، عربی کی زبان تو مشترک تھی۔ مگر ان میں فصاحت کی بلند اہمیت تھی اور عرب میں ایک شاعر کو دوسرے شاعر پر اور ایک خطیب کو دوسرے خطیب پر فصاحت کی وجہ سے فضیلت دی جاتی تھی۔

زبان اور شاعرانہ ذوق کی تبدیلی پر جرجانی بڑی گہرائی سے بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ عرب زمانۂ قدیم سے الفاظ کی شوکت کے قائل تھے، اور حسن کلام کے ایسے شائق تھے، کہ دوسروں کے یہاں شاید اس کی مثال نہ مل سکے وہ اپنے اشعار پر خاص توجہ دیتے اور اس کی پوری کوشش کرتے کہ زبان میں حسن پیدا ہو یہاں تک کہ چست ترکیبیں اور پرشکوہ الفاظ ان کی زبان کے خاص امتیازات ہو گئے۔ فطری رجحان اور شعوری کوشش نے زبان کے مسئلہ میں ان کو دوسروں پر برتری عطا کی "بدویت" کی وجہ سے مشکل الفاظ و تراکیب ظہور پذیر ہوتیں، جن کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے بدویت کا اظہار کیا اس نے زیادتی کی، عدی کے اشعار جو جاہلی تھا فرزدق سے زیادہ سلیس ہیں، رقت ہمیشہ ایسے شعراء کے اشعار میں پائی جاتی ہے جو عاشق اور صاحب دل ہوتے یا ان کی طبیعت میں شاعرانہ جذبہ بھرا ہو تو رقت اور کشش بغیر شعوری طور پر پیدا ہو جاتی ہے۔

جب اسلام کا ظہور ہوا اور دیہاتوں کے لوگ شہروں کی جانب آنے لگے تو لوگوں نے عام اور آسان زبان کو زیادہ پسند کیا جن اشیاء کے بہت سے اسماء تھے، ان میں آسان اور خوب صورت ناموں کو چن لیا، مثلاً "طویل" ایک لفظ ہے اس کے لئے ۶۰ الفاظ اور بھی عربوں کی زبان میں تھے، مگر انہوں نے اس لفظ کے اچھے ہونے کی وجہ سے باقی الفاظ کو متروک قرار دیا اور ایسے معانی و الفاظ اختیار کئے جو حسین اور آسان ہوں، جن شعراء نے بعد میں قدماء کے مشکل اسالیب و الفاظ کی پیروی کرنی چاہی وہ بہت جگہ پھسل گئے اور جادۂ صواب سے ہٹ گئے جیسے کہ ابو تمام[1]۔

یہ تجزیہ جرجانی نے اچھا کیا ہے، ابو تمام کے بعض عیوب کا ذکر بھی انہوں نے اس انداز سے کیا ہے کہ ابو تمام نے بھی غلطیاں کی تھیں اور متنبی نے بھی ان کا ارتکاب کیا، اس نے متنبی ہی پر کیوں الزام رکھا ہے۔

قاضی جرجانی کہتے ہیں کہ اگر تم کو لفظ کا صحیح استعمال معلوم کرنا ہو اور عمدہ شاعری کا نمونہ دیکھنا ہو تو قدماء میں جریر اور ذو الرمہ کا کلام دیکھو اور متاخرین میں بحتری کا، تغزل میں اہل حجاز کا کلام قابل مطالعہ ہے، مثلاً کثیر، جمیل بثینہ اور نصیب کا، قصیدہ کا طریقہ یہ ہے کہ وہ شعر بہتر ہے جس میں فطری شاعرانہ کیفیت نمایاں ہو اور تکلف و تعقید کا نام بھی نہ ہو جو انہوں نے بتایا کہ الفاظ کا حسن پہلے متاثر کرتا ہے اور معانی بعد میں، فطری شاعری کی زیادہ مثالیں ہم کو بحتری کے یہاں ملتی ہیں[2]۔

---

[1] الوساطہ ص ۳۳ [2] الوساطہ ۱۶-۳۳

عربوں کے نزدیک شعراء میں مفاضلت کے اصول مجملاً یہ تھے کہ معانی عمدہ اور دلکش ہوں اور صحت پر دلالت کریں، اسی طرح الفاظ اچھے ہوں، صحیح ہوں، وصف عمدہ اور موثر ہو، تشبیہ حسن کو واضح کرتی ہو، جس کو شعر والا مقبولیت عطا ہوئی اور جس کے اشعار کثرت سے ضرب الامثال بن گئے، وہ مطابقت، تجنیس، استعارہ اور بدیع کے چکر میں نہیں پڑا، محدثین نے دیکھا کہ تشبیہ، استعارہ اور مطابقت وغیرہ سے حسن پیدا ہوتا ہے تو انہوں نے تکلف سے شعوری طور پر اشعار میں ان اشیاء کو برتنا شروع کر دیا، اس صنعت کا نام "البدیع" رکھا، بعض تو واقعی اس کوشش میں کامیاب اور بعض بالکل ناکام رہے یا ایک ہی شاعر کہیں کامیاب اور کہیں ناکام رہا۔

ابو تمام کی طرح متنبی پر بے دینی کا الزام تھا۔ جرجانی کہتے ہیں کہ دین الگ ہے اور شاعری الگ، دونوں میں کوئی تعلق نہیں اور نہ کوئی تضاد ہے، حضور نے خود بھی شعر کو مستحسن قرار دیا ہے۔

سرقات کے مسئلہ پر جرجانی نے صاف الفاظ میں لکھا ہے کہ مشترک معانی میں سرقہ کا سوال پیدا نہیں ہوتا اور جو لوگ مشترک معانی میں کسی شاعر کو سارق کہتے ہیں وہ نافہم ہیں۔

یہ بات ظاہر ہے کہ متنبی کی شاعری میں بہت سے عیوب ہیں، جن کی موافقت جرجانی نے کی ہے، مگر تنقید کے نقطۂ نظر سے ان کی تمام بحثوں سے عربی تنقید کو بہت فائدہ پہنچا اور عملی تنقید میں آمدی کے بعد ایک دوسری مثال قائم ہو گئی، ان کی ناقدانہ بحثیں فکر و نظر کا سرمایہ فراہم کرتی ہیں اور احساس لطافت۔ الوساطہ عربی تنقید کی ایک اہم کتاب ہے۔

(سید احتشام ندوی)

سوز و ساز

نازش پرتاب گڈھی :

یہ ظلمتیں کہاں، وہ نگاہِ سحر کہاں
کیا جانے گم ہوا ہے مذاقِ نظر کہاں

پہلی کرن کے ساتھ اٹھو اور بڑھے چلو
شبنم کے واسطے ہے غم و بال و پر کہاں

وہ تو مری طرف سے تھا نذرانۂ بہار
صحنِ چمن میں میں نے بنایا تھا گھر کہاں

ہر عیب بھی ہنر ہے سلیقے سے ہو اگر
رسوا ہوا ہے پھول کا چاکِ جگر کہاں

اس قتل گاہِ عشق میں بخشی ہے زندگی
پھیلائے ہاتھ آئی ہے اے رتِ دھر کہاں

زکی زاکانی :

دل سراپا غمِ الفت کے سوا کچھ بھی نہیں
زندگی تیری عنایت کے سوا کچھ بھی نہیں

نام تیرا ہی مرے وردِ زباں رہتا ہے
ترا غم تیری عبادت کے سوا کچھ بھی نہیں

فیضِ ساقی سے کبھی شکر سراپا تھی زباں
اب یہ اک حرفِ شکایت کے سوا کچھ بھی نہیں

حسن کو رہتی ہے خود دیدۂ بینا کی تلاش
یہ حقیقت ہی حقیقت کے سوا کچھ بھی نہیں

میں سمجھتا ہوں کہ محفل کا یہ اندازِ نشاط
چشمِ ساقی کی کرامت کے سوا کچھ بھی نہیں

دل میں اک آگ سی ہر لحظہ لگی رہتی ہے
اور یہ جذبِ محبت کے سوا کچھ بھی نہیں

حسن ہی حسن جو ہر چیز میں آتا ہے نظر
یہ مرے حسنِ عقیدت کے سوا کچھ بھی نہیں

چھوٹ گیا دل سے مرے عیشِ فراغت کا خیال
اب یہاں فکر کی دولت کے سوا کچھ بھی نہیں

میرے اشعار میں بے سود ہے لذت کی تلاش
سخنِ حق میں صداقت کے سوا کچھ بھی نہیں

وفا عزیزی :

خود بخود اٹھتے ہیں اسرار کے پردے جیسے
جب مچلتے ہیں عزائم دلِ انساں کے قریب

اب بہر راہ حقیقت سے ہوئی ہے واقف
اب خزاں آ نہیں سکتی گلِ خنداں کے قریب

جب بھی رکھی ہے بنا میں نے نشیمن کی کبھی
بجلیاں ٹوٹ پڑیں صحنِ گلستاں کے قریب

اٹھ گئے وحدت و کثرت کے حجاباتِ لطیف
تیرے دیوانے ہیں اب منزلِ عرفاں کے قریب

نور و ظلمت میں کوئی فرق ہی باقی نہ رہے
اس قدر آؤ نہ تم دیدۂ حیراں کے قریب

جذبۂ عشق نے خود ڈھونڈ لی اپنی منزل
رک گئے خود ہی قدم منزلِ جاناں کے قریب

ان حوادث میں بھی کر حسن و محبت کی تلاش
غمِ جاناں بھی ہے اے دل غمِ دوراں کے قریب

اے وفا رحمتِ یزداں پہ بھروسہ ہے جنہیں
حشر میں ہوں گے وہی رحمتِ یزداں کے قریب

ماہر القادری :

چلتے چلتے بھی وہ دیتے گئے الفت کا فریب
جاتے جاتے بھی مجھے ایک نظر دیکھ لیا

باوانی
وائلن ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ
منگھا پیر روڈ
کراچی
ہر قسم کا
سوتی اور
اونی کپڑا
کورا اور دھلا لٹھا اور
ہر قسم کا
دھاگہ
تیار ہوتا ہے
باوانی وائلن ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ کا تیار شدہ کپڑا
ہر اعتبار سے قابل اعتماد ہے پاکستان کی صنعت کی قدر اور حوصلہ افزائی
آپ کا قومی فریضہ ہے

مرزا غلام احمد اپنی جوانی میں ہسٹیریا کا مریض تھا اور اُس پر بعض اوقات ایسے شدید دورے پڑتے تھے کہ وہ بے ہوش ہو جاتا تھا۔ وہ ذیابیطس کا مریض تھا مرزا نے خود اپنے حالات میں لکھا ہے کہ ہمیشہ درد سر، دوران سر، بے خوابی اور دل کی دھڑکن کے دورے پڑتے تھے اور ذیابیطس کے سبب میرے جسم کا اسفل حصہ متاثر ہو گیا تھا، دن رات میں اکثر و بیشتر سو سو بار پیشاب کرنے کی نوبت آتی ۔

مرزا غلام احمد کی زندگی کا آغاز معمولی حالات و وسائل کے ساتھ ہوا، یہ تنگی اور غربت کی زندگی تھی، لیکن جیسے جیسے اُس کا مشن پھیلتا گیا اور ایک مذہبی گروہ کی پیشوائی اُسے حاصل ہو گئی تو وہ خوشحال بن گیا اور آرام و آسودگی کی زندگی گزارنے لگا۔ اُسے اپنی زندگی کے اس تغیر و انقلاب کا خود بھی اچھی طرح احساس تھا۔ ۱۹۰۷ء میں اُس نے خود اعتراف کیا۔

"ہماری گزر بسر والد کی حقیر سی آمدنی پر موقوف تھی، باہر کے لوگوں میں کوئی مجھے جانتا تک نہ تھا!..... اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی کے مطابق ساری دنیا کو میری طرف متوجہ کر دیا اور مجھے اس قدر مسلسل فتوحات ہوئیں کہ میرے پاس شکر ادا کرنے کے لئے الفاظ نہیں ہیں۔ اپنی حالت کو دیکھتے ہوئے یہ امید کبھی نہیں کرتا تھا کہ مجھے ایک مہینے میں دس روپیہ بھی مل سکتے ہیں....... لیکن اللہ تعالیٰ نے میری اس قدر مدد کی کہ اب تک تین لاکھ ہو سکتا ہے اس سے بھی کچھ زیادہ روپیہ مجھے مل چکے ہیں!" (حقیقۃ الوحی)

مرزا غلام احمد نے ۱۸۹۱ء میں "مسیح موعود" کا دعویٰ کیا۔ اور اس کے بعد اس نے دعویٰ کیا کہ میں خدا کا نبی ہوں۔ مسلمان علماء نے اُس کے ان دعووں کی تردید و مخالفت کی۔ ان مخالفت کرنے والے علماء دین میں سب سے زیادہ مشہور و ممتاز عالم مولانا ثناء اللہ امرتسری ایڈیٹر "اہلحدیث" تھے۔ ۱۵ر اپریل ۱۹۰۷ء کو مرزا غلام احمد نے ایک اعلان شائع کیا جس میں مولانا موصوف کو خطاب کرتے ہوئے لکھا۔

"اگر میں ایسا ہی کذاب اور مفتری ہوں، جیسا آپ اپنے پرچہ کی ہر اشاعت میں ظاہر کرتے رہتے ہیں تو میں آپ کی زندگی میں ہی مر جاؤں گا اور اگر میں کاذب اور مفتری نہیں ہوں اور مجھے خدا کے مکالمہ اور مخاطبہ الٰہی سے سرفراز کیا گیا ہے اور --- میں مسیح موعود ہوں، تو میں امید کرتا ہوں کہ بفضل الٰہی اور اللہ تعالیٰ کی سنت کے مطابق آپ منکرین حق کی سزا (عذاب) سے نہیں بچ سکتے اور وہ عذاب، آدمی کے ہاتھ میں نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے ید قدرت میں ہے --- یہ کہ اگر میری زندگی میں آپ طاعون یا ہیضہ جیسے امراض میں مبتلا نہ ہوئے تو میں مامور من اللہ نہیں۔" (تبلیغ رسالت)

اعلان کی اشاعت کے ایک سال بعد ۲۵ مئی ۱۹۰۸ء کو مرزا غلام احمد لاہور میں اسہال کے مرض میں مبتلا ہوا، دستوں کے علاوہ قے بھی ہونے لگی اُس کا علاج معالجہ کیا گیا، مگر تکلیف بڑھتی چلی گئی، اور اُس کی حالت نازک ہو گئی۔ یہاں تک کہ دوسرے دن ۲۶ مئی کو دوپہر کے بعد وہ مر گیا۔ اُس کی موت سے پہلے اُس کے خسر میر ناصر نواب نے بیان کیا۔ مرزا نے مجھ سے کہا کہ میر صاحب! مجھے ہیضہ ہو گیا ہے!

براہین احمدیہ کی تیسری اور چوتھی جلد میں مرزا غلام احمد نے برطانوی حکومت کی کھل کر تعریف اور مدح سرائی کی ہے اُس نے اُن خدمات کا بھی ذکر کیا ہے جو اُس کے خاندان نے انگریزی سرکار کے لئے انجام دی ہیں!

مرزا نے ۱۸۸۰ء سے ۱۸۸۴ء تک اس کتاب پر کام کیا، مگر چوتھی جلد کے بعد اس کی اشاعت کا کام رُک گیا، پانچویں (۵) یعنی آخری جلد ۱۹۰۵ء میں منظر عام پر آئی۔ یعنی کام شروع کرنے کے پورے پچیس سال کے بعد! اس مدت میں جن لوگوں نے پانچوں جلدوں کی پیشگی قیمت ادا کی تھی انہیں صرف چار جلدیں ملیں، مر کھپ گئے، دوسرے لوگ بھی جو پیشگی رقم دے چکے تھے، اس وقت پر خاصے خفا اور کبیدہ خاطر ہوئے، جس کے لئے مرزا نے پچاس جلدیں معافی ۔ اس جلد میں اُس نے اس کا بھی اعلان کیا کہ اس نے اسلام کی حقانیت ثابت کرنے کے لئے تین سو دلیلیں دینے کا ارادہ کیا تھا، مگر پھر اس خیال کو ترک کر دیا اور اسی طرح پچاس جلدوں کی بجائے اب صرف پانچ جلدیں آئیں گی۔ وعدہ کی اس تبدیلی کی مرزا نے عجیب و غریب بلکہ مضحکہ خیز توجیہ کی کہ ان دونوں

مرزا بشیر الدین محمود نے اسے تکمیل کو پہنچایا۔

جن تین کتابوں کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے وہ مرزا غلام احمد کی بد مزاجی کی غمازی کرتی ہیں، ان کتابوں میں مرزا نے اپنے مخالفین پر جو طعن و طنز کی ہے اور گالیاں سنائی ہیں وہ کسی سنجیدہ مشن کی کتابوں میں شمار ہونے کے قابل نہیں ہیں! ان کتابوں میں جو انداز بیان اور اسلوب اظہار اختیار کیا گیا ہے وہ کسی با وقار اہل قلم کے بھی شایان شان نہیں ہے، چہ جائیکہ اُسے نبیوں اور دینی مصلحین سے منسوب کیا جائے!

حدیث شریف میں جو آیا ہے کہ حضرت مسیح خنزیر کو قتل کریں گے، اس کا مرزا غلام احمد ان لفظوں میں مذاق اُڑاتا ہے:۔

"مسیح نازل کے بعد جو سب سے بڑا کارنامہ انجام دیں گے وہ صرف یہ ہے کہ کتوں کا غول ساتھ لے کر سوروں کا شکار کرنے کے لئے روانہ ہوں گے! اگر یہ بات صحیح ہے تو سکھوں، چماروں، سانسیوں ... کے لئے فخر و مسرت کا مقام ہے، جو شوقیہ شکار کو پسند کرتے ہیں ......"

اس زمانہ میں مرزا غلام احمد نے جو کتابیں لکھی ہیں، اُن سے واضح ہوتا ہے کہ سائنس کی ترقیوں سے وہ بہت زیادہ متاثر تھا، اگرچہ مرزا کا علم سائنس کے مسائل میں بہت زیادہ سطحی اور سیکنڈ ہینڈ تھا، یہی وجہ ہے کہ بعثت مسیح کا عقیدہ چونکہ اُس کو سائنس سے ٹکراتا ہے اُس سے مرزا نے اُسے رد کر دیا، اُس کا خیال تھا کہ اس قسم کا عقیدہ تعلیم یافتہ لوگوں کی نگاہ میں دین کو مضحکہ خیز کر کے رکھ دے گا، چنانچہ ازالہ اوہام میں مرزا نے لکھا ہے کہ اس قسم کی تعلیمات کی ہم اشاعت نہیں کر سکتے، جو دلیل و عقل، تجربہ اور نیچرل سائنس اور فلسفہ کے بالکل برخلاف ہیں ......!

اس قسم کی عبارت پڑھ کر کوئی شخص مشکل ہی سے یقین کر سکتا ہے کہ یہ عبارتیں اُس مصنف کی لکھی ہوئی ہیں جس نے "سُرمہ چشم آریہ" جیسی کتاب تصنیف کی ہے، جس میں مصنف نے بڑی قوت کے ساتھ معجزات کے وقوع کے امکانات پر دلیلیں دی ہیں اور اس بات کی تردید کی ہے کہ مابعد الطبیعاتی تصورات اور نظریوں کو انسانی محدود تجربہ اور عقلی دلیل کی بنا پر رد کر دیا جائے۔

اس زمانہ میں مرزا واضح طور پر تو نبوت کا دعویٰ نہیں کرتا مگر اپنی تحریروں میں نبوت کے لوازم و خواص سے بحث کرتا ہے اور اس بات کو ثابت کرنے کی بھی کوشش کرتا ہے کہ نبی کے کسی کامل اُمتی کو اتباع نبی کے طفیل میں نبوت کے یہ خواص عطا کئے جا سکتے ہیں! اس زمانے میں وہ دعوائے نبوت کے لئے زمین ہموار کر رہا تھا اور اس بات کا پتہ لگا رہا تھا کہ اُس کے متبعین کی عقیدت اس درجہ تک پہنچ چکی ہے کہ اگر اُس نے ایسا دعویٰ کر دیا، تو وہ کسی چوں چرا کے بغیر اُسے مان لیں گے، جس طرح کہ اب تک کے تمام دعووں پر وہ آمنّا و صدقنا کہتے چلے آئے ہیں۔

آخر کار یہ سانحہ وقوع پذیر ہو ہی گیا، ۱۹۰۰ء میں مولوی عبدالکریم کو جمعہ کا خطبہ دینا تھا اُس نے خطبہ دیا جس میں مرزا کے لئے نبی اور رسول کے القاب استعمال کئے، اس چیز نے مولوی سید محمد احسن امروہوی کے جذبات میں بڑا اشتعال پیدا کر دیا، مولوی عبدالکریم کو جب اس کا علم ہوا تو اُس نے دوسرے جمعہ کے خطبہ میں مرزا غلام احمد کو مخاطب کر کے اس سے درخواست کی کہ مجھ سے آپ کے نبی اور منزل من اللہ ہونے کا عقیدہ بیان کرنے میں غلطی ہوئی ہے تو آپ اس غلطی کو درست کر دیں! جمعہ کی نماز کے بعد مولوی عبدالکریم نے مرزا کے کرتے کا دامن پکڑ کر کہا کہ اگر میرے عقائد غلط ہیں تو آپ ان کی اصلاح فرما دی جائے، اس پر مرزا نے پلٹ کر کہا کہ میرا بھی یہی عقیدہ ہے" مرزا کی زبان سے یہ بات سُن کر مولوی محمد احسن امروہوی غصہ کے مارے لال بھبوکا ہو گیا اور غصہ کی حالت میں مسجد میں ٹہلنے لگا اور مولوی عبدالکریم کمانے پر اُس سے لڑنے لگا جب دونوں کی آوازیں بہت بلند ہو گئیں اور شور و شر ہونے لگا تو مرزا اپنے مکان سے نکل کر آیا اور قرآن کی یہ آیت پڑھی:۔

" لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی ...."

۱۹۰۱ء میں مرزا غلام احمد نے کھل کر اپنے اس دعوے کا اعلان کیا، تحفۃ الندوہ میں وہ لکھتا ہے:۔

"میں نے یہ بات بار بار بتلا دی ہے کہ جو کچھ میں تمہارے سامنے تلاوت کرتا ہوں وہ قطعی طور پر اللہ کا کلام ہے اسی طرح

۔ اس طرح قرآن اور توریت اللہ تعالیٰ کے کلمات ہیں میں خدا کا ظلی اور بروزی نبی ہوں اور ہر مسلمان کے لئے لازم
ہے کہ دینی معاملات میں میرا اتباع کرے ۔ اور جس کسی تک بھی میرے بارے میں اطلاع پہنچ جائے، چاہے وہ مسلمان
ہی کیوں نہ ہو، اگر وہ مجھے اپنے معاملات میں حکم نہیں مانتا نہ مجھے مسیح موعود تسلیم کرتا ہے اور نہ میرے الہامات کو
من جانب اللہ سمجھتا ہے اس کو آخرت میں اس انکار کی سزا ملے گی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں صرف یہ بھی نہیں کہتا کہ اگر میں جھوٹا
ہوں تو مجھے موت آ جائے بلکہ یہ بھی کہتا ہوں کہ موسیٰ، عیسیٰ اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جس طرح صادق تھے،
انہی کی طرح میں بھی صادق ہوں ۔ اور اللہ تعالیٰ نے دس ہزار سے زیادہ نشانیاں میری تصدیق کے لئے ظاہر کی ہیں۔
انبیاء سابق نے میرے ظہور کے زمانہ کو بتایا ہے، اور وہ یہی زمانہ ہے، قرآن نے بھی میرے ظہور کے زمانہ کی نشان
دہی کی ہے، اور وہ یہی زمانہ ہے ۔ آسمان و زمین نے میرے ظہور کی تصدیق کی ہے اور کوئی نبی ایسا نہیں ہے جس نے
میرے ظہور کی تصدیق نہ کی ہو۔"

مرزا غلام احمد کی تحریروں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وہ خود کو مستقل بالذات نبی اور صاحب شریعت سمجھتا تھا، اپنی تصنیف اربعین میں اس نے خود کو ایسا نبی کہا ہے جو شریعت لے کر آیا ہے ـــــــــ اس نے یہ بھی کہا کہ مجھ پر وحی آئی ہے کہ جو تیرا اتباع نہیں کرے گا اور تیرے حلقہ ارادت میں داخل نہیں ہوگا ـــــــ تو اللہ اور رسول کا یہ نافرمان دوزخ میں رہے گا۔"

مرزا کی تحریر کا ایک اور اقتباس ہے ـــــ

" اللہ تعالیٰ نے مجھے اطلاع دی ہے کہ جس کسی تک میرا پیغام پہنچا اور اس نے اس کو قبول نہیں کیا تو وہ مسلمان نہیں ہے۔"

غلام احمد قادیانی کے بیٹے مرزا بشیر الدین محمود نے اپنی ایک تقریر میں کہا ـــــ کہ کوئی احمدی اپنی لڑکی غیر احمدی کے نکاح میں نہ دے ۔

"انوار خلافت" میں ہے کہ ایک شخص نے مرزا غلام احمد قادیانی سے بار بار دریافت کیا۔ اپنی لڑکی کے نکاح کے سلسلہ میں بہت سی دشواریوں کا ذکر کیا اس پر مرزا نے اس کو ہدایت کی، کہ چاہے کچھ ہو جائے، اس (احمدی) کو اپنی لڑکی خواہ ساری عمر گھر ہی میں رکھنی پڑے مگر غیر احمدی کے نکاح میں ہرگز نہ دی جائے۔ جب مرزا کے مرنے کے بعد، اس شخص نے اپنی لڑکی کا نکاح غیر احمدی سے کر دیا تو مرزا کے خلیفہ اول حکیم نور الدین نے احمدیوں کی امامت کے عہدے سے اس کو ہٹا دیا اور احمدیوں کی جماعت تک سے خارج کر دیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !

قادیانیوں کے آرگن اور ترجمان الفضل کے بیان کے مطابق مرزا غلام احمد نے اپنے بیٹے فضل احمد کے جنازے کی نماز نہیں پڑھی کیونکہ وہ احمدی نہیں تھا ـــــ

ہم مرزا غلام احمد قادیانی کے حالات زندگی کا جائزہ لیتے ہیں تو واضح طور پر یہ حقیقت سامنے آتی ہے ـــــ کہ اس کی زندگی کے دو رخ ہیں پہلا رخ اس کی ابتدائی زندگی کا افلاس اور غربت کا دور ہے، اور بعد کا رخ اور دور یہ ہے کہ اس کے ماننے والوں کی عقیدت اسے حاصل ہو گئی، اور انہوں نے اسے مالا مال کر دیا ۔ مرزا کی زندگی میں صوفیوں، خدا پرستوں اور دینداروں کی زندگیوں سے مشابہت کی بجائے دنیا پرست سیاسی لیڈروں، اور غیر مذہبی تحریکوں کے بانیوں کی زندگیوں سے مشابہت نظر آتی ہے ۔ اس مسئلہ نے اس قدر اہمیت اختیار کر لی کہ خود مرزا کے حلقہ عقیدت مندوں میں بے چینی پیدا ہو گئی۔

مرزا غلام احمد کے گھر والے جس طرح کی عیش و ترفہ کی زندگی گزارتے تھے، اس کے بارے میں مرزا کے ماننے والوں میں خاص طور سے خواجہ کمال الدین سب سے زیادہ غیر مطمئن اور متشکک تھا ۔ خواجہ نے اپنے احباب سے اس کا اظہار بھی کر دیا کہ اس کے خاندان کی عورتیں یہ دیکھ کر کہ مرزا کے گھرانے کی عورتوں کا معیار زندگی بہت اونچا ہے؟ سادہ طور پر زندگی بسر کرنے اور تحریک کے لئے روپیہ پیسہ انداز کرنے کے لئے رضامند نظر نہیں آتیں ۔

خواجہ کمال الدین نے ایک بار مولوی محمد علی (امیر جماعت احمدیہ لاہور) اور مولوی سرور شاہ قادیانی سے جو قادیانیوں کا قابل ذکر عالم تھا، کہا کہ [illegible]

مرزا نے اس بات کا اعلان کیا ــــ کہ میرا مذہب جس کو میں بار بار ظاہر کرچکا ہوں یہ ہے کہ اسلام کے دو اجزاء ہیں ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور دوسرا اس حکومت کی اطاعت جس نے امن قائم کیا ہو اور ظالموں کے ظلم سے بچانے کے لئے پوری حفاظت دی ہو۔ اور یہ حکومت ــــ برطانوی حکومت ــــ ہے۔

مرزا نے دوسری بات جو کہی وہ یہ تھی کہ میں اپنی زندگی کے آغاز سے جبکہ اب تک میں ساٹھ سال کا ہوں اپنی زبان و قلم کو ایک عظیم مقصد میں صرف کررہا ہوں اور وہ مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کے قلوب کو برطانوی حکومت کی محبت، خیر خواہی اور ہمدردی کی طرف پھیر دوں، اور ان کے دلوں سے جہاد کے تصور کو مٹا دوں ــــ اور میں یہ ظاہر کردینا چاہتا ہوں کہ میری تحریروں نے مسلمانوں کے دلوں پر بہت بڑا اثر ڈالا ہے اور لاکھوں آدمی تبدیل ہوگئے ہیں۔ مرزا نے دعویٰ کیا کہ اس کی ذات برطانوی حکومت کی حفاظت کے لئے قلعہ اور تعویذ کی حیثیت رکھتی ہے۔

مرزا عبداللطیف نامی ایک پرجوش قادیانی مبلغ نے افغانستان میں جاکر فلسفہ جہاد کے خلاف تلقین و تعلیم کا آغاز کیا، غیور افغان جو جذبہ جہاد کی قوت سے اپنی آزادی کو سنبھالے ہوئے تھے اور برطانوی حکومت کے سخت دشمن بنے ہوئے تھے، عبداللطیف قادیانی کی اس تعلیم نے ان کے اندر اس شخص کے خلاف اس قدر نفرت اور برہمی پیدا کردی، حکومت افغانستان نے اسے پھانسی پر لٹکا دیا۔

ملا عبدالحلیم اور ملا نور علی دو قادیانی کے ساتھ بھی افغانستان میں یہی صورت پیش آئی، ان کے خلاف اس بات کا ثبوت مل گیا کہ وہ حکومت افغانستان کے وفادار نہیں ہیں اور برطانوی حکومت کے ایجنٹ اور جاسوس ہیں اور قادیانی عقائد پھیلا کر لوگوں کو گمراہ کر رہے ہیں۔

مرزا بشیر الدین محمود نے پرنس آف ویلز کی خدمت میں ۱۹ جنوری ۱۹۲۲ء کو جو سپاسنامہ خیر مقدم پیش کیا تھا اس میں ان واقعات کا بڑے فخر کے ساتھ ذکر کیا گیا اور اس بات کو واضح کیا گیا کہ یہ قربانیاں اس امر کو ثابت کرتی ہیں کہ وہ (یعنی قادیانی) برطانیہ حکومت کے وفادار ہیں۔

مرزا کے مزاج و سیرت کا اس سے بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس نے اپنی تحریروں میں گالیاں بکی ہیں اور مولانا ثناء اللہ امرتسری کے لئے بار بار اور مکرر "لعنت" کا لفظ استعمال کیا ہے۔

محمدی بیگم سے شادی کا مسئلہ اور اس کے سلسلہ میں مرزا غلام احمد کی پیش گوئیوں نے اس کی نبوت کی پوری طرح قلعی کھول دی۔ مرزا نے کہا کہ ہماری پیش گوئیوں کی صداقت و کذب کے جانچنے کا سب سے بڑا معیار (اس لڑکی سے شادی کا مسئلہ) ہے۔ مرزا کی یہ عادت تھی کہ وہ بڑی آن بان کے ساتھ پیش گوئیاں کیا کرتا تھا۔ محمدی بیگم سے اپنے نکاح کو اپنی صداقت کی نشانی یعنی آیت اللہ قرار دیا اور اس نے اس پیش گوئی کو صرف اپنی صداقت ہی تک محدود نہیں رکھا بلکہ یہاں تک کہہ دیا کہ یہ دراصل اسلام کی شکست اور فتح کا معاملہ ہے۔ مرزا نے کہا کہ محمدی بیگم کے ساتھ اس کی شادی طے شدہ مسئلہ ہے اور یہ کہ آسمان پر یہ بات طے کر دی گئی ہے اور اس پیش گوئی میں تبدیلی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

مرزا غلام احمد نے ایک طرف تو اس جزم و یقین کے ساتھ پیمبرانہ انداز میں شادی کی پیش گوئی کی، تو دوسری طرف اس نے لڑکی کے باپ مرزا احمد بیگ کو خط لکھا:-

"جو کچھ میں کہتا ہوں، اگر آپ نے اسے قبول فرمالیا تو میرے حق میں یہ مہربانی اور کرم النفسی کا سلوک ہوگا اور میں خدائے کریم و رحیم کی بارگاہ میں آپ کی درازی عمر کے لئے دعا کروں گا اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں اپنی جائداد اور املاک کا تہائی حصہ آپ کو پیش کردوں گا، میں ایمانداری کے ساتھ اس کا اعلان کرتا ہوں کہ جو چیز بھی آپ طلب فرمائیں گے اُسے میں آپ کو دے دوں گا۔"

لیکن اس پیش گوئی کا یہ انجام ہوا کہ محمدی بیگم کی شادی مرزا سلطان محمد کے ساتھ ۷ اپریل ۱۸۹۲ء کو ہوگئی اس پر بھی مرزا غلام احمد نا امید نہیں ہوا۔ اس نے یہ کہنا شروع کیا کہ بالآخر لڑکی اس کے حبالۂ عقد میں آکر رہے گی۔ اس نے حلف شرعی کے ساتھ اس کا اعلان کیا ــــ کہ ــــ

"یہ بات سچ ہے کہ اس خاتون کی میرے ساتھ شادی نہیں ہوئی لیکن جس طرح کہ پیش گوئی میں واضح کردیا گیا ہے اس کی

شادی میرے ساتھ ضرور ہوگی . . . . اور حیرت انگیز طور پر ایسا واقعہ پیش آئے گا کہ سب کے سر ندامت سے جھک جائیں گے ، وہ عورت ابھی تک زندہ ہے ۔ اس کا میرے حبالۂ عقد میں آنا تقدیر ہے . . . .
یہ آسمانی فیصلے ہیں ، جن کو ماننا اور پورا ہونا ہی چاہیئے !

مرزا نے ، پنے اعلان میں پیش گوئی کی تھی ، کہ جس شخص سے محمدی بیگم کی شادی ہوگی ، وہ شادی کے دو ڈھائی سال بعد فوت ہو جائے گا یہ مدت گزر گئی مگر مرزا سلطان محمد اپنی بیوی کے ساتھ خوشی و اطمینان کی زندگی گزارتے ہوئے زندہ رہا ۔ اس پر مرزا نے کہا کہ عذاب الٰہی مشروط طور پر مقدر پاگیا ہے . . . . ۔ مگر جہاں تک اس خاتون سے میری شادی کا تعلق ہے یہ یقینی طور پر پہلے سے مقدر کر دی گئی ہے جس سے دست کشی نہیں ہو سکتی ، وجہ یہ ہے کہ اللہ کے کلمات تبدیل نہیں ہوا کرتے کیونکہ اگر یہ تبدیل ہو جائیں تو اللہ کے کلمات غلط اور بیچ ہو کر رہ جائیں !

مرزا نے پھر لکھا :—

" میں پھر کہتا ہوں کہ بڑا نسبتی احمد بیگ (یعنی سلطان محمد) کے بارے میں پیش گوئی پہلے سے مقدر کر دی گئی ہے اس کے انتظار کرو ، اگر میں جھوٹا ہوں تو یہ پیش گوئی پوری نہیں ہوگی اور مجھے موت آ جائے گی : "

مگر مرزا کی ان پیش گوئیوں کے علی الرغم مرزا سلطان احمد نے خاصی طویل عمر پائی اس نے پہلی جنگ عظیم میں حصہ لیا اور زخمی ہوا مگر زندہ بچ گیا اور مرزا غلام احمد کے مرنے کے بعد کافی عرصہ تک زندہ رہا ۔

قادیانیت کا مطالعہ غور و فکر کے ساتھ کیا جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ قادیانیت اسلام اور امت مسلمہ کے متوازی ایک جداگانہ مذہب ہے اور اس کے ماننے والے جداگانہ امت ہیں ! مرزا محمود نے جمعہ کے خطبہ (بحوالہ الفضل مورخہ جولائی ۱۹۳۱ء) میں اس کا اعلان کیا کہ :—

" مسیح موعود کی زبان سے جو الفاظ نکلے ہیں وہ اب تک میرے کانوں میں گونج رہے ہیں ! انہوں نے کہا کہ یہ کہنا غلط ہے کہ ہمارا دوسروں سے اختلاف صرف وفات مسیح یا اسی قسم کے دوسرے مسائل میں ہے ، خدا ، قرآن رسول ، نماز ، روزہ ، حج ، مختصراً یہ کہ دین کے ہر جز میں ہمارا اختلاف ہے : "

مرزا محمود نے یہ بھی کہا کہ مرزا غلام احمد کے خلیفہ اول نے اعلان کر دیا تھا کہ ان کا اسلام (یعنی غیر احمدیوں کا اسلام) ہمارے اسلام سے مختلف ہے !

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے متوازی قادیانیت نے عقائد و اعمال کا ایک نیا گھروندا تعمیر کیا ہے ، قادیانیت دینی زندگی کا اپنی تعلیمات مطابق ایک نیا رخ متعین کرتی ہے ، قادیانیت اپنے متقدانیوں کو ایک نیا نبی ، عقیدت و وفاداری کا نیا نقطہ ماسکہ ، نیا مذہبی مشن ، نیا مذہبی مرکز مقدمات مقدسہ ، نئے مذہبی آداب و رسوم اور نئے رہنما اور مشاہیر دیتی ہے اور قادیانیت جدید مذہبی تعلیمات کی اساس پر ایک جدید امت کی تشکیل کرتی ہے ۔

مرزا بشیر الدین محمود نے اپنی ایک تقریر میں کہا :—

" جب ہم مدینہ کی تعظیم کرتے ہیں تو اس طرح کعبۃ اللہ کی توہین نہیں کرتے اسی طرح جب ہم قادیان کی عظمت کرتے ہیں تو مکہ اور مدینہ کی اہانت نہیں کرتے . . . . خدائے قادر و برتر نے ان تینوں مقامات کو تقدیس عطا کی ہے اور ان مقامات کو اپنے انوار کے ظہور کے لئے منتخب فرمایا ہے "

غلام احمد نے اپنی کتاب میں بھی اس کا اعلان کیا تھا کہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ قرآن کریم میں قادیان کا حوالہ موجود ہے ——— مرزا بشیر الدین لکھتے ہیں :—

... رہا ہے وہ اسلام " احمدیت " کے بغیر یعنی وہ اسلام جو حضرت مرزا صاحب کے بغیر ہے، وہ سوکھا چھلکا (DRY) اسلام ہے، پس اسی طرح مکہ کا حج بھی اس حج (یعنی زیارت قادیان) کے بغیر سوکھا حج ہے کیونکہ حج کے جو اغراض و مقاصد ہیں وہ اس زمانے میں یہاں (قادیان میں) پورے ہو جاتے ہیں "

قادیانیت نے مذہب کا جو نیا رخ متعین کیا ہے اس کا ہندوستان کے قوم پرستوں نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ خیر مقدم کیا، ایک ہندو ایم اے ڈاکٹر شنکر پرشاد مہرا نے بڑی قابلیت کے ساتھ اس نقطہ نگاہ کی ترجمانی کی ہے، ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں :—

" ملک کے سامنے سب سے زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں کس طرح قومی جذبات پیدا کئے جائیں، مسلمانوں کے ساتھ حکومت بعض اوقات معاہدہ کرتی ہے کبھی ہم ان کے ساتھ سودے بازی کرتے ہیں اور کبھی ان کو اتحاد کی دعوت دی جاتی ہے مگر یہ تمام حربے بے نتیجہ ثابت ہوتے، مسلمان اب بھی اپنے کو جداگانہ قوم سمجھتے ہیں اور دن رات عرب کے گیت گاتے ہیں اگر ان کا بس چلے تو وہ ہندوستان کو " عرب " بنا دیں، اس اندھیرے اور نا امیدی کی فضا میں — ہندوستان کے قوم پرستوں اور وطن دوستوں کو امید کی صرف ایک ہی شعاع نظر آتی ہے اور یہ امید کی شعاع احمدیوں کی تحریک ہے، مسلمان جس قدر تعداد میں بھی احمدیت کی طرف مائل اور راغب ہوں گے وہ قادیان کو اپنا مکہ سمجھیں گے اور انجام کار وہ ہندوستان سے محبت کرنے والے اور سچے نیشنلسٹ بن جائیں گے "
" مسلمانوں میں احمدیت کی اشاعت و ترقی ہی پان اسلامزم اور عربی ثقافت پر کاری ضرب لگا سکتی ہے ہمیں قومی نقطہ نگاہ سے احمدیت کا مطالعہ کرنا چاہئے "

ڈاکٹر شنکر پرشاد مہرا نے یہ بھی لکھا :—

" یہی وجہ ہے کہ مسلمان احمدی تحریک کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، (اس لئے کہ) وہ جانتے ہیں کہ احمدیت عربی تمدن و ثقافت اور اسلام کی مخالف ہے! تحریک خلافت میں احمدیوں نے مسلمانوں کے ساتھ تعاون نہیں کیا، ترکی اور عرب کی بجائے وہ (یعنی احمدی) قادیان میں خلافت قائم کرنا چاہتے ہیں یہ چیز عوام مسلمانوں کے لئے جو ہمیشہ پان اسلامزم اور عربی وحدت کے خواب دیکھتے رہتے ہیں خواہ کتنی ہی مایوس کرنے والی کیوں نہ ہو، مگر نیشنلسٹوں کے لئے تو نوید مسرت ہے "

جس زمانہ مرزا غلام احمد کے ظہور (؟) کا ہے اس زمانہ میں مسلمانوں کے اندر جوش جہاد ابھارنے کی خاص طور سے ضرورت تھی، کیونکہ مغربی حکومتیں جنگی طاقت کے زور سے مسلمانوں کی حکومتوں کو دباتی اور ان پر غالب ہوتی چلی جاتی تھیں ——— دوسری چیز مسلمانوں میں قابل اصلاح یہ تھی کہ غلط قسم کی توہمات اور قبر پرستی کہ میں وہ مبتلا ہو گئے تھے، اور کثرت اللہ اور مشرکانہ بدعت و رسوم کا فلسفہ ان پر اثر انداز ہو رہا تھا، یہ وقت ایک مجدد اور مصلح کے لئے " توحید و سنت " کی اشاعت کے فریضہ کو ادا کرنے کا تھا۔

انیسویں صدی کے بعد وہ بیرونی اقوام اور مادہ پرستانہ تمدن سے جو مسلمانوں کا واسطہ پڑا، تو ان میں معاشرتی اور اخلاقی طور پر بڑی پستی پیدا ہو گئی اور یہ اخلاقی پستی اس حد تک پہونچ گئی کہ گناہ پر ندامت کا احساس دلوں سے نکل گیا، عیش و عشرت کی زندگی سے محبت ہو گئی، ذہنی طور پر بیرونی حکمرانوں کی غلامی نے خود داری کے جذبہ کو فنا کر دیا، اور مغربی تمدن کی نقالی اور برطانوی آقاؤں کے طرز زندگی کی تقلید کو جو اسلامی تعلیمات کی مخالف تھی وجہ فخر اور ترقی کی نشانی سمجھا گیا ... یہ موقف واضح طور پر اس کا مطالبہ کرتا تھا کہ مسلمانوں میں ایک ایسا " مجاہد " پیدا ہو، جو اس سیلاب کا مقابلہ کر سکے۔

اس کے علاوہ مسلمانوں میں دین کے بارے میں بے خبری پائی جاتی تھی، جس کا سبب یہ تھا کہ انگریزی دور میں عوام کی جدید طرز پر تعلیم و تربیت ہو رہی تھی۔ مسلمان اسلام کی روایات، تاریخ اور مقصد سے بیگانہ ہوتے جا رہے تھے۔ یہ صورتِ حال اس کی متقاضی تھی کہ مسلم سوسائٹی میں دینی تعلیمات کی بہت طاقتور تبلیغ کی جائے جس کے نتیجے میں مسلمانوں میں اسلام سے گہری عقیدت اور وابستگی پیدا ہو جائے۔

ایسا اہم تر ضرورت اُس زمانہ کی مسلم دنیا کی یہ تھی کہ انبیاء کرام کے طرز اور ضع پر مسلمانوں کو ایسی زندگی بسر کرنے کی دعوت دی جائے جو اپنی پشت پر ایمان و یقین اور اعمالِ خیر کی قوت رکھتی ہو۔ یہ واقعہ ہے کہ مسلمانوں کو نہ اُس زمانے میں اور نہ کسی اور زمانے میں کسی نئے مذہب اور نئے نبی کی ضرورت نہیں رہی، بلکہ ضرورت اس کی تھی کہ مسلمانوں کے یقین و ایمان کو تازگی دی جائے، اور ان کی صلاحیتوں کے لئے تازہ جوش پیدا کیا جائے، اور حضور خاتم الانبیاء محمد عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر اللہ تعالیٰ نے جس ہدایت اور تعلیمات کو نازل فرمایا تھا، اُن کو تازہ کیا جائے!

مسلم دنیا کی جن ضرورتوں کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، اُن کو پورا کرنے کے لئے ایسے متعدد مردانِ خدا پرست اور رجالِ کار پیدا ہوتے جنہوں نے بڑے بڑے دعووں کے ساتھ نہ تو کوئی نئی امت بنائی، نہ انہوں نے کسی نئے نبی کی طرف مسلمانوں کو دعوت دی اور نہ مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پیدا کیا! ایسی شخصیتیں اور ان کی جد و جہد مسلم دنیا کے لئے رحمت و برکت ثابت ہوئیں، اُن کا مشن اور کام ہر قسم کے شبہ سے بالا تھا اس کا کوئی خطرہ اور اندیشہ ہی نہیں کہ ان کے کسی عمل، علامت اور اسلام کو کوئی نقصان پہنچ سکتا ہے یا کسی چیز کو ضائع کئے بغیر مسلمانوں نے ان سے فائدہ اٹھایا مسلمان ان کے احسان مند اور شکر گزار ہیں!

ایسے نازک زمانہ میں جو مسلم دنیا کے لئے بڑا ہی اہم زمانہ تھا، ہندوستان جو مذہبی اور سیاسی کشمکش کا اکھاڑہ بنا ہوا تھا! وہاں مرزا غلام احمد صاحب ایک نئی تحریک کا آغاز کرتا ہے! اس زمانہ میں مسلمانوں کے سامنے کچھ بہت اہم اور نازک مسائل تھے مگر سب کو نظر انداز کر کے مرزا غلام احمد نے وفاتِ مسیح کے مسئلہ کو اٹھایا اور اس کا دعویٰ کیا کہ میں مسیح موعود ہوں۔ جو کچھ قوت اور توانائی اور وقت اس دعوے کی تائید میں صرف ہوا وہ باقی بچ رہا وہ اسی امر کی اشاعت میں صرف کیا گیا کہ جہاد ممنوع ہے اور برطانوی حکومت کی اطاعت دینی فریضہ ہے! تقریباً نصف صدی تک انہی مسائل پر گفتگو اور بحث ہوتی رہی۔

مرزا غلام احمد نے "مسیح" کے موضوع پر جو کچھ لکھا ہے، اگر اسے اُس کی کتابوں سے خارج کر دیا جائے تو پھر ان کتابوں میں مشکل ہی سے کوئی قابلِ ذکر چیز رہ سکے گی!

سب سے زیادہ دیکھنے اور غور کرنے کی بات یہ ہے کہ مرزا نے اپنی نبوت کا ایک معیار قائم کر دیا کہ جو اس پر ایمان نہیں لاتے اور اسے تسلیم نہیں کرتے وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہیں! اس طرح مسلم دنیا کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کی تدبیر کی! ایسا کرنے سے مرزا غلام احمد نے اپنے اور مسلمانوں کے درمیان ایک آہنی دیوار کھڑی کر دی اور عجیب صورتِ حال پیدا ہو گئی، اس دیوار کے ایک جانب مرزا کے چند ہزار ماننے والے تھے اور دوسری طرف دنیا کے باقی مسلمان تھے، جو مشرق سے مغرب تک پھیلے ہوئے تھے، جن کے یہاں عظیم شخصیتیں تھیں، بہت سی مفید تحریکیں اور بہت سے علمی و دینی ادارے تھے اور علم و اخلاق کی تبلیغ کا مرکز تھے۔ اس طرح مرزا غلام احمد نے بلا وجہ اور کسی ضرورت کے بغیر مسلمانوں کی مشکلات میں بیٹھے بٹھائے اضافہ کر دیا اور جن مسائل سے وہ پہلے چار ہو رہے تھے ان میں اس نئی الجھن کو بڑھا دیا۔

مرزا غلام احمد نے مسلمانوں کے مذہبی ترکہ میں کسی ایسے مفید چیز کا اضافہ نہیں کیا، جس کی بنا پر اُس کی شخصیت کا اعتراف کیا جائے اور جس کے لئے مسلمانوں کی موجودہ نسل اُس کا احسان مانے۔ مرزائے قادیان نے نہ تو کوئی ایسی تحریک شروع کی جس سے اسلام کا احیاء ہو سکے اور جس سے مسلمانوں کو فائدہ پہنچ سکتا تھا! اُس نے مسلمانوں کے عظیم اور اہم مسائل میں کسی مسئلہ کے حل کرنے میں کوئی مدد کی، اور نہ اُس کی تحریک ہم عصر تمدن کیلئے جو موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہے اور اُس کو ہندوستان یا یورپ میں اسلام کی اشاعت کے لئے ذرا سا بھی کریڈٹ دیا جا سکتا ہے

- یہ نعتیہ نظم ۱۷ جنوری ۱۹۱۹ء کے اخبار "ندیم" میں چھپ کر عام ہوئی، اس کو پڑھ کر حضرت علامہ مچل گئے اور فوراً اس کا محققانہ فی البدیہہ جواب نظم فرمادیا، اور اسی وقت اسی اخبار کو بھیج دیا:

یہ دلیل ہے علامہ سید سلیمان ندوی کی پرگوئی کی، غیرت ایمانی نے اس میں اور زیادہ توانائی اور تقدیس پیدا کر دی۔

علامہ مرحوم کی شاعرانہ طبیعت کے جوہر غزل کے مقابلہ میں نظم میں زیادہ کھلتے ہیں، علامہ شبلی نعمانی پر فارسی میں جو نظم کہی ہے اس کے چند بند پڑھئے اور محظوظ ہو جئے۔

بیا اے قصہ خوان جاہ و افریدون و کیخسرو — ببیں این جاہ کہ درویشے کند در فقر سلطانی
نہ ایمانے نہ دیبائے نہ دیہیمے ۔ نہ اورنگے — نی خامہ پرستش ریخ اصحاب جہانبانی
رشاتش سجدہ گاہ قیصر و ایران شہنشاہی — بساطش بوسہ گاہ دانش آموزان یونانی

ان شعروں سے شبلی نعمانی کی شاعری کا آہنگ سنائی دیتا ہے۔

فارسی قصیدہ کے اس شعر میں۔۔

کہن دستور او بالا تر از اکلیل سلطانی — حصیر کلبہ اش بہتر ز اورنگ سلیمانی

"اورنگ سلیمانی" کھٹکا، غالب بلند شاعر تھا اس نے تو بے پروائی کے ساتھ کہہ دیا۔۔

اک کھیل ہے اورنگ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے

مگر "اورنگ سلیمانی" کو چونکہ اللہ کے مقدس نبی حضرت سلیمان علیہ السلام سے نسبت ہے اس لئے مولانا سید سلیمان ندوی کو عام شعراء کی تقلید میں یہ تشبیہ نہیں دینی چاہئے تھی۔

کتاب کے دوسرے حصہ کے منتخب اشعار۔۔

طول غم کے لئے منظور مجھے عمر دراز — یار کی زلف کا قصہ ہے یہ کوتاہ نہ ہو
بات ہے سہل اور مشکل بھی — صاف کھل کر کہا نہیں جاتا
بت پرستی بھی کروں اور بت شکن بھی میں بنوں — کیش ابراہیم رکھ کر پیشۂ آذر کروں
آنکھ میں توبہ کے آنسو دل میں اس بت کی ہوس — ہائے گنگا جمن کو کیسے زمزم و کوثر کروں
شکست رونق بت خانہ ہو نہیں سکتی — جبیں خود ہی اگر بت تراش ہو جائے

مولانا نے اپنی پہلی اہلیہ کی وفات پر مرثیہ کہا ہے جس کا یہ شعر کس قدر اثر انگیز ہے۔

تیرے جانے پہ گماں تھا کہ ہو محشر برپا — تو گیا اور بپا دہر میں محشر نہ ہوا

نظموں میں - تاج محل ..... ؟ اور "درس مساوات" بلند پایہ نظمیں ہیں۔

دوسرا رخ :۔۔

آتا ہے خدا بھی ترے صدقے میں مجھے یاد — گویا کہ تب ہجر میں خدا بھول گیا ہوں (ص ۱۵)

مگر مولانا صوفی ہی تھا، [illegible] خدا کو بھول گیا ہوں؟

ہر عبادت فطرت خانہ ہوئی — دل میں گر بیٹھا بت خودکام ہے (ص ۱۸)

ہزار بار مجھے لے گیا ہے مقتل میں　　　وہ ایک قطرۂ خوں جو رگِ گلو میں ہے

ڈاکٹر اقبال نے ان لفظوں میں داد دی :-

”آپ کی یہ غزل لاجواب ہے بالخصوص یہ شعر مجھے بڑا پسند آیا“

علامہ سید سلیمان ندوی کے لئے شعر گوئی ثانوی چیز تھی ، اگر اُن کو علمی کاموں سے فرصت ملتی اور وہ شاعری پر پوری توجہ دیتے ، تو اُن کا شمار نابغۂ عصروں میں ہوتا ، شعر گوئی کا جوہر بالقوہ اُن میں موجود تھا مگر اس پر بالفعل کی پوری طرح صیقل نہ ہو سکی ! مرنے سے پہلے اپنے لائق احترام شیخ کی عقیدت کا اس طرح حق ادا کر دیا -

ذکر اللہ

از — مولانا مفتی محمد شفیع مدظلہ

ضخامت ۸۰ صفحات ، سرورق خوشنما ، قیمت ۵۰ پیسے

اللہ درود و سلام کے فضائل و مسائل

ملنے کا پتہ :- دارالعلوم کراچی ۱۴

اس کتاب میں حضرت مولانا محمد شفیع نے ذکر الٰہی کے طریقے ، مسائل ، فضائل اور مسنون دعائیں بڑے سلیقے سے سلیس اُردو میں جمع کر کے مرتب کی ہیں ، اور دوسرے باب میں درود شریف کے فضائل و مسائل درج فرمائے ہیں : درود شریف کے ضمن میں یہ بھی لکھنا چاہئے تھا کہ مسلمانوں نے میلاد اور سیرت النبی کی محفلوں میں کھڑے ہو کر صلوٰۃ و سلام پڑھنے کا جو طریقہ ایجاد کیا ہے اُس کے لئے کوئی سند کتاب و سنت و آثارِ صحابہ و اقوالِ ائمہ تک میں نہیں ملتی ، لہٰذا یہ ” بدعت “ ہے ! شرک و بدعت کی تردید میں عوام الجہلاء کی ناراضگی کا خوف نہیں کرنا چاہئے !

” عالمِ بیداری میں زیارت “ —— اس عنوان کے لئے صحابہ کرام کے حالات یا تابعین کے واقعات سے سند لانی ضروری تھی ، شیخ عبدالوہاب شعرانی اور علامہ سیوطی کی اسناد اس باب میں حجت نہیں ہیں ! اس قسم کی روایتوں سے ذہنوں میں خلجان پیدا ہو سکتا ہے اور ان روایتوں سے اہلِ بدعت فائدہ اُٹھا لیتے ہیں -

اپنے موضوع پر یہ کتاب خوب نہیں ، بہت خوب ہے ، ذکر اللہ اور درود شریف سے زبان کا تر رہنا ، بہت بڑی سعادت اور شرف و کرامت ہے !

آدم جی کاٹن ملز۔ لانڈھی۔ کراچی

آپ وقت سے پہلے کیوں مرجھائیں!
ماء اللحم
ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان

جلد ۱۸　　شمارہ ۹

ماہنامہ فاران کراچی

ماہ دسمبر ۱۹۶۶ء

ایڈیٹر ــــــ ماہرالقادری

ترتیب

نقش اول	ماہرالقادری	۳
ذہنی الحاد اور سطحی تفکر	انور عالم	۱۵
عالم اسلام میں علماء و شیوخ کی حالتِ زار	محمد اقبال سہیل مرحوم	۲۱
جگر مرادآبادی فن شخصیت اور شاعری	پروفیسر افتخار احمد فخر دھولیوی (ایم اے)	۲۶
جمال ناصر کی حکومت سے بیزاری کیوں	مولانا عبداللہ عباس ندوی	۳۳
رد و انتخاب	وحید الدین خاں	۴۰
ہماری نظر میں	. . . .	۴۱

پبلشر : ــــــ مسرور حسین

مقام اشاعت

دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱

قیمت فی پرچہ ۶۲ پیسے

چندہ سالانہ سات روپے

مسرور حسین پبلشر نے انٹرنیشنل پریس کراچی میں طبع کرا کر دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

مسلمات آٹھ مہینے سے یہ اطلاعیں ہم تک تواتر کے ساتھ پہونچ رہی ہیں کہ قادیانی اپنے لٹریچر اور شخصی ملاقاتوں کے ذریعہ مسلک قادیانیت کی دعوت دے رہے ہیں، اُن کی سرگرمیاں روز بروز بڑھتی جارہی ہیں، اسی عرصہ میں خود ہمارے پاس قادیانیوں کی لاہوری جماعت کے دفتر سے اور پھر قادیانیوں کے مرکز ربوہ سے اُن کی کتابیں آئیں۔ اس طرح ان اطلاعوں کی پوری طرح ... ... تصدیق ہوگئی، حیرت ہے انگریز کے دور میں تو قادیانی اپنے کفر یہ مشن کی تبلیغ کرتے ہوئے جھجک محسوس کرتے تھے، مگر پاکستان میں اُن کی جرأتیں اتنی بڑھ گئی ہیں کہ وہ اہلِ ایمان کو گمراہ کرنے اور انہیں بے ایمان بنانے کے لئے کھلے بندوں قادیانیت کی تبلیغ کر رہے ہیں۔ اور اس فتنہ کے عواقب سے بالکل بے پرواہ ہیں۔

قادیانیوں کی تردید میں بیسیوں کتابیں متعدد زبانوں میں لکھی گئی ہیں، لیکن وہ ہر کسی کو آسانی سے نہیں مل سکتیں، پروفیسر محمد الیاس برنی مرحوم کی تالیف "قادیانی مذہب" تک بازار میں نایاب ہے، اس صورتِ حال کا اندازہ کرنے کے بعد ہم نے اس کی شدید ضرورت محسوس کی کہ عوام مسلمانوں کو اس فتنہ سے بچانے کے لئے قادیانیت کی تردید میں ایسے دلائل و شواہد اور ساتھ ہی خود انہی کی کتابوں کے منقولات جمع کردیئے جائیں، جن کے مطالعہ کے بعد جھوٹی نبوت سے مسلمانوں کی نفرت و بیزاری اور بھی زیادہ شدید ہو جائے، اور وہ اس مسلک ضلالت کے مبلغین اور داعیوں کو سختی بلکہ درشتی کے ساتھ دھتکار دیں، تاکہ وہ پھر ایسا کرنے کی ہمت نہ کرسکیں اور انہیں اچھی طرح اس بات کا احساس ہو جائے کہ کسی جدید نبوت اور مفروضہ مسیحیت موعود کے بارے میں ایک حرف بھی سننے کے لئے تیار نہیں ہیں اور قادیانیت سے نفرت و بیزاری کو مسلم اسلام و ایمان کا تقاضا اور دلیل سمجھتے ہیں۔

جب پاکستان میں فتنۂ قادیانیت کی تبلیغ پر کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔ تو مسلمانوں کو اس گمراہ مسلک کی تردید کا بھی حق حاصل ہے۔ فتنۂ قادیانیت کی تردید کو جو کوئی "فرقہ واریت" سمجھتا ہے وہ رواداری کے اس وہم میں مبتلا ہے جس کا نام دینی بے غیرتی اور بے حمیتی ہے شخص دین کے معاملہ میں بالکل کورا اور اسلام و ایمان سے قطعاً بے خبر ہے، جو قادیانی مذہب کو مسلمانوں کا ایک فرقہ سمجھتا ہے، قادیانیوں کا اسلام اور مسلمانوں سے کوئی تعلق نہیں ہے یہ گروہ امتِ محمدیہ کی مخالف جدید امت (یعنی مرزا غلام احمد قادیانی کی امت) میں شامل ہے قادیانی امتِ محمدیہ سے بالکل جداگانہ، جدید اور مختلف اُمت ہیں، اور یہ گروہ مسلمان فرقوں میں شامل نہیں ہے، مسلمانوں سے اس کا کسی قسم کا کوئی دینی رشتہ نہیں ہے، اپنے اس موقف کا خود قادیانیوں کو بھی احساس ہے، اس کے لئے بالکل سامنے کا ثبوت یہ ہے کہ ہندوستان میں ہندوستان گیر پیمانے پر مسلمانوں کی جو تحریکیں اُٹھی ہیں چاہے وہ خدام کعبہ کی تنظیم ہو، تحریکِ خلافت ہو یا قیامِ پاکستان کے لئے جدوجہد

قادیانیوں کا ان سے کوئی واسطہ اور کسی قسم کا ربط و تعلق نہیں رہا، مسلمانوں کی ان تحریکوں اور تنظیموں میں نہ تو خود قادیانیوں نے شامل ہونے کی جرأت اور خواہش کی اور نہ مسلمانوں نے ان کو دعوتِ شرکت دی ! دنیا کے دوسرے مسلم ممالک پر کیسے کیسے نازک اور سخت وقت آئے مگر قادیانیوں نے ان کے مسائل اور مشکلات و مصائب سے کسی قسم کا کوئی تعلق اور واسطہ نہیں رکھا !

مرزا غلام احمد قادیانی کو خود بھی اس کا احساس تھا کہ وہ ممالک جہاں مسلمانوں کی حکومتیں ہیں وہاں اُس کے پیش کئے ہوئے مذہب کا کاروبار نہیں چل سکتا، اُس نے خود اس کا اعتراف کیا ہے۔

"کیونکہ میرے اعلیٰ مقاصد جو جناب قیصرہ ہند کی حکومت کے سایہ کے نیچے انجام پذیر ہو رہے ہیں، ہرگز ممکن نہ تھا کہ وہ کسی اور گورنمنٹ کے زیر سایہ انجام پذیر ہو سکتے، اگرچہ وہ کوئی اسلامی گورنمنٹ ہی ہوتی"

(تحفہ قیصریہ ـــ مصنفہ مرزا غلام احمد ۱۸۹۷ء)

دل کا چور اندر ہی اندر کہہ رہا تھا کہ مسلمان حکومتیں نئے نبی اور جدید نبوت کی تبلیغ کی اجازت کس طرح دے سکتی ہیں اور وہ کسی سیاسی مصلحت کی بنا پر چشم پوشی بھی کر جاتیں تو ان ملکوں کے مسلمان عوام اس بے حمیتی اور بے غیرتی کو کس طرح گوارا کر سکتے ہیں۔ چنانچہ افغانستان میں قادیانی مبلغین کا جو حشر ہوا وہ سب کو معلوم ہے ! ارض مقدس حجاز میں قادیانیوں کا داخلہ آج تک ممنوع ہے، اگر کبھی کسی قادیانی کے حج میں موجود ہونے کی اطلاع مل گئی ہے تو اُسے گرفتار کر کے بہ یک بینی و دو گوش ملک بدر کر دیا گیا ہے ! اور یہ سب کچھ اس عقیدہ کی بنا پر ہوا ہے اور ہونا چاہئے کہ قادیانی امت محمدیہ میں شامل نہیں ہیں، نہ یہ مسلمانوں کا کوئی فرقہ ہے اور نہ ایمان و اسلام سے اس گروہ کا کوئی تعلق ہے !

مسلمانوں کے تمام فرقے اللہ، رسول، کتاب اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، اس لئے وہ مومن اور مسلم ہیں ! نبوت کا دروازہ بند کر دیا گیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب نہ کسی شخصیت پر قیامت تک کوئی آسمانی صحیفہ نازل ہوگا اور نہ کتاب اُترے گی، وحیِ نبوت کا بھی کوئی امکان باقی نہیں رہا، اس صورت میں مسلمان کسی ایسی شخصیت کو سچا اور صادق القول کس طرح سمجھ سکتے ہیں جو اپنے منکر کو کافر کہتا ہو اور خود اسی کے قول کے مطابق دوسرے نبیوں کی طرح اُس کا ماننا ایمان کی لازمی شرط اور جس کے انکار کو کفر سمجھا جاتا ہے !

اللہ تعالیٰ کی کتاب حرف بہ حرف موجود اور محفوظ ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور ارشادات کے ایک ایک لفظ کو امت نے حرزِ جان بنا کر رکھا ہے صحابہ کرام کے آثار بھی کتابوں میں لکھ لئے گئے ہیں، اُس کے بعد صلحاء اُمت اور راسخون فی العلم کے لاکھوں صحیفے اُمت کو روشنی دے رہے ہیں، حکمت و موعظت، طہارت و تقویٰ اور ہدایت و نجات کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جو تشنہ اور ادھورا رہ گیا ہو، اُمت نے کسی دور میں بھی بعثت خاتم النبیین کے بعد وحیِ نبوت اور حامل وحیِ نبوت کی ضرورت محسوس نہیں کی، اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اسوۂ رسول کو انسانوں کی ہدایت کے لئے ہر اعتبار اور ہر جہت سے کافی و وافی سمجھا گیا، اللہ تعالیٰ نے ختم نبوت کے ساتھ دین کا اتمام بھی فرما دیا، اس میں اب کوئی اضافہ نہیں کر سکتا ! پھر اُمت کا کوئی دور صلحاء اور اہل علم و تقویٰ سے خالی نہیں رہا، دین کی تجدید و احیاء کے لئے عظیم شخصیتیں پیدا ہوتی رہی ہیں، مگر انہیں سے کسی شخصیت کو بھی دینی عظمت اور تصرف و کرامت کے باوجود نبی کے مماثل و ہمسر یا اُس کا ایک ظل و بروز نہیں مانا گیا، جس کا ماننا ایمان کی لازمی شرط ہو، اور جس کے انکار سے مسلمان کافر ہو جاتے ! ان میں سے کسی عظیم و مقدس شخصیت نے بھی امت مسلمہ سے کٹ کر نہ تو کوئی جماعت بنائی نہ کوئی منفرد سلسلہ قائم کیا، ایسا سلسلہ کہ جو اس میں داخل نہیں ہے وہ کافر ہے ! اور نہ کسی مجدد نے صرف اپنی طرف دعوت دی اور نہ کسی معتقد نے کسی مجدد کو معیارِ حق اور ایسے منصب پر فائز سمجھا جس کا انکار کفر کے مُرادف ہو !

دُنیا میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے ساٹھ کروڑ مسلمان موجود ہیں، وہ سب کے سب اللہ، رسول، کتاب اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں، اس قبول و اعتراف کے بعد اُن کے ایمان و اسلام میں آخر کیا کمی رہ جاتی ہے اور وہ آخر کس دلیل کی بنا پر اس بات کو درست و صحیح مان سکتے ہیں کہ خدا، رسول، الکتاب ...

اور آخرت پر ایمان لانا کوئی وقعت اور حقیقت نہیں رکھتا جب تک کہ مرزا غلام احمد قادیانی کی نبوت اور مسیحیت موعود پر ایمان نہ لایا جائے۔ یہ کیسا مسخرہ پن اور حماقت و جہالت ہے کہ قادیانی ساٹھ کروڑ مسلمانوں کو کافر سمجھ کر اپنے مسلک کی طرف اُن کو دعوت دیتے ہیں اور مرزا کے قادیان پر ایمان لائے بغیران سب چیزوں کا نہ کوئی عمل خیر مقبول ہے اور نہ کوئی عقیدہ معتبر ہے! یہ کیسی دھاندلی، سفاہت اور ہٹ دھرمی ہے کہ کفر والحاد، ایمان و اسلام کا مذاق اڑاتے ہیں، نجاست، طہارت کو اپنی طرف بلاتی ہے اور ظلمت نور و تجلی پر طنز کرتی ہے آخر کس دلیل کی بنا پر اس بات کو حق مان لیا جائے کہ ساٹھ کروڑ مسلمان مرزا غلام احمد قادیانی کی نبوت اور مسیحیت موعود پر ایمان نہ لانے کے سبب دخاک بدہن گستاخ) کافر ہیں! اور دین و دنیا کی سعادت "کمرا" مرزا کے قادیان کی اطاعت سے وابستہ ہے! مسلمانوں کے کرب و اذیت! غم و غصہ کی کوئی انتہا ہی نہیں رہتی جب اُن کو زبان و قلم کے ذریعے قادیانیت کی دعوت دی جاتی ہے اور اس سو فیصدی غیر دانشمندانہ اور کافرانہ مسلک کی طرف اُن کو بلایا جاتا ہے:

یہ کردار؟

حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی قبر پر اللہ تعالیٰ کی شبنم رحمت سدا برستی رہے، کتنی معقول بات آپ نے فرمائی ہے کہ جو کوئی کسی مدعی نبوت سے دلیل ثبوت طلب کرے تو ایسا کرنے سے وہ کافر ہو جاتا ہے! امام اعظمؒ کے اس ارشاد کا منشا یہ ہے کہ ختم نبوت ایمان و اسلام کا بنیادی مسئلہ ہے، جو کوئی مدعی نبوت سے دلیل مانگتا ہے وہ "ختم نبوت" پر یقین نہیں رکھتا یا اس قطعی مسئلہ میں مذبذب ہے! مدعی نبوت تو اسلامی معاشرے میں زندہ رہنے کا حق ہی نہیں رکھتا، اس دعوے کے بعد اُس کی شہریت بلکہ عام انسانی حقوق بھی کالعدم ہو جاتے ہیں، خلافت راشدہ کی مثال ہمارے سامنے ہے، نبوت کا دعویٰ لے کر جو لوگ اٹھے اُن سے قتال کیا گیا:

"ختم نبوت" کے عقیدے کا یہ تقاضا تھا کہ بہ فرض محال مرزا غلام احمد قادیانی کی ایک ایک پیش گوئی صحیح ثابت ہوتی، اس کی سیرت و زندگی، جہاد و تقویٰ اور صدق و امانت کے سوا اور کوئی چیز نہ پائی جاتی، اُس کے اشارے سے ڈوبا ہوا سورج پلٹ آتا، وہ زمین پر چلتا تو شجر و حجر تعظیم بجا لاتے، ان تمام کمالات کے باوجود اُس کے دعوائے نبوت کی تردید کی جاتی اس کو کاذب، مفتری، جادوگر اور شعبدہ باز سمجھا جاتا، وہ نبوت کا دعویٰ کرتے ہی اُمت کو زندیق اور مرتد قرار دیا جاتا، اس لئے کہ نبوت کا دعویٰ دین و دنیا کا سب سے بڑا افتراء ہے، جس کے بعد مدعی نبوت کی کسی نیکی میں کوئی وزن باقی رہتا ہے اور نہ اُس کا کوئی کمال اور ہنر لائق اعتنا سمجھا جاتا ہے، کسی شخص کو نبوت کا مدعی بن کر کھڑا کر دینا یہ شیطان کا شاہکار ہے، اس لعین عقیدہ اور مسلک سے اللہ تعالیٰ کی پناہ استغفر اللہ ونعوذ باللہ من کید الشیطان۔

——— اور یہاں تو ———

اس مدعی نبوت کی زندگی اور کردار میں، جگہ جگہ ناہمواری نظر آتی ہے۔

برطانوی حکومت کا نمائندہ حکومت بھی، مسلم ریاستوں کو کمزور کرنے اور اُن کو غلام و محکوم بنانے کا جو کارنامہ برطانیہ نے انجام دیا ہے وہ سب پر روشن اور ظاہر ہے، ۱۸۵۷ء میں انگریز نے مسلمانوں کے جان و مال اور عزت و آبرو کو جس طرح حلال سمجھا، وہ بھی تاریخ کے شواہد ہیں: اس مسلم دشمن حکومت کی جو خدمت مرزا غلام احمد نے انجام دی ہے، اُس کی کیفیت خود اُسی کی زبان سے سنئے:—

- اب گورنمنٹ خود فرما سکتی ہے کہ جس حالت میں میرا باپ گورنمنٹ کا ایسا سچا خیر خواہ تھا اور میرا بھائی بھی اُسی کے قدم پر چلا تھا اور میں بھی اُنیس برس سے یہی خدمت اپنے قلم کے ذریعہ سے بجا لاتا ہوں تو پھر میرے حالات کیونکر مشتبہ ہو سکتے ہیں میری تمام جوانی اسی راہ میں گزری" (کشف الغطاء — از مرزا غلام احمد قادیانی)

جس شخص کی پوری جوانی انگریز کی وفاداری، خیر خواہی اور ایسا زندگی میں بسر ہوئی ہو، اُس کے کردار کے بارے میں کیا کوئی اچھی رائے قائم کی جا سکتی ہے وہ جو مشہور شعر ہے —

خشت اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

تو مرزا غلام احمد جس کی جوانی کا آغاز مسلم دشمن حکومت برطانیہ کی وفاداری اور نیاز مندی سے ہوا ہے، اس کے بارے میں تو شروع ہی سے کرامت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور سنئے :-

"اے قیصرہ و ملکہ معظمہ! ہمارے دل تیرے لئے دعا کرتے ہوئے جناب الٰہی میں جھکتے ہیں اور ہماری روحیں تیرے اقبال و سلامتی کے لئے حضرت احدیت میں سجدہ کرتی ہیں (تحفۂ قیصریہ ۱۸۹۷ء)

دیکھا آپ نے مسیح موعود اور نبی ملکہ وکٹوریہ کی اقبال و سلامتی کے لئے بارگاہِ خداوندی میں روح و دل کے ساتھ سجدہ ریز ہے!

——— اور ———

"دیکھو میں ایک حکم لے کر آپ لوگوں کے پاس آیا ہوں، وہ یہ ہے اب سے تلوار کے جہاد کا خاتمہ ہے مگر اپنے نفسوں کے پاک کرنے کا جہاد باقی ہے" (گورنمنٹ انگریزی اور جہاد از مرزا غلام احمد ۱۹۰۰ء)

مرزا غلام احمد نے صرف انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے "جہاد بالسیف" کے خاتمہ کا اعلان کر کے، قرآنی حکم اور دینی فریضہ پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا اور اپنے اس کارنامے کی انگریزی حکومت سے داد چاہی :-

"میں مناسب نہیں دیکھتا کہ اس عریضۂ نیاز کو طول دوں گو میں جانتا ہوں کہ جس میرے دل میں یہ جوش تھا کہ میں اپنے اخلاص و اطاعت اور شکر گزاری کو حضور قیصرہ ہند دام ملکہا میں عرض کروں، پورے طور پر میں اس جوش کو ادا نہیں کر سکا، ناچار دعا پر ختم کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ جو زمین و آسمان کا مالک اور نیک کاموں کی جزا دیتا ہے وہ آسمان پر سے اس محسنہ قیصرہ ہند دام ملکہا کو ہماری طرف سے نیک جزا دے اور وہ فضل اس کے شاملِ حال کرے، جو نہ صرف دنیا تک محدود ہو، بلکہ سچی اور دائمی خوش حالی جو آخرت کو ہو گی وہ بھی عطا فرمائے۔"

(ستارہ قیصرہ از مرزا غلام احمد ۱۸۹۹ء)

کوئی مسلمان جو دین و شریعت کا ذرا سا بھی علم رکھتا ہے کیا کسی عیسائی کے لئے آخرت میں ابدی مسرت اور دائمی خوشی دئے جانے کی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کر سکتا ہے!

"اسیر مولف ——— تاج عزت جناب ملکہ معظمہ قیصرہ ہند دام اقبالہا کا واسطہ ڈال کر بخدمت گورنمنٹ عالیہ انگلشیہ کے اعلیٰ افسروں اور معزز احکام کے باادب گزارش کرتا ہے کہ براہ غریب پروری اور کرم گستری اس رسالہ کو اول سے آخر تک پڑھا جائے یا سن لیا جائے (کشف الغطاء — از مرزا غلام احمد قادیانی ۱۸۹۹ء)

"براہ غریب پروری" یہ پیاروں اور چاپلوسیوں کی زبان اور اسلوب و لہجہ ہے! کیا اس مزاج و ذہنیت رکھنے والے کو کوئی صاحب عقل، مجدد، مسیح موعود یا نبی مان سکتا ہے! یہ تمنا، درخواست اور عرض و معروض تو دیکھئے کہ کسی طرح مرزا غلام احمد کی تحریریں انگریزی حاکموں کی نگاہ سے گزر جائیں، صاحب بہادروں کو پڑھنے کی فرصت نہ ہو تو ان تحریروں کا خلاصہ ہی ان کے گوش گزار کر دیا جاتے اور سرکار دربار سے خوشنودی کا پروانہ مرزا کو مل جائے!

مرزا غلام احمد قادیانی برطانوی حکومت کی نیاز مندی، خیر خواہی اور وفاداری پر جس انداز میں فخر کرتا ہے اور بار بار جتاتا ہے کہ میں تو انگریزی گورنمنٹ کا پشتینی نیاز مند اور فرمانبردار اور دعا گو ہوں، اور میری تو ساری جوانی انگریز کی نیاز مندی اور خیر خواہی میں بسر ہوئی ہے ——— اگر اس کی زندگی

---

[1] انگریزی حکومت کی نیاز مندی اور وفاداری کا یہ ورثہ اور ترکہ مرزا کے بیٹے بشیر الدین محمود کو ملتا ہے ۱۹۲۲ء میں پرنس آف ویلز کے حضور بشیر الدین محمود سپاس نامہ مع تحفہ پیش کر کے ——— قادیانیوں کی وفاداری کا یقین دلاتا ہے۔

اور سیرت و کردار میں کوئی دوسری خرابی نہ ہوتی، تو تنہا یہی عیب (انگریز کی دریوزہ گری اور دنیا پرستی) اُس کے دعوے کے باطل ہونے کی دلیل ہے۔

مرزائے قادیان کا پہلا تعارف مذہبی جوش و خروش و مناظرہ بازی کی نیاز مندی سے ملتا ہے کہ جس سے شکوک اور سوء ظن میں مبتلا کرنے والا ہے۔ اُس کے بعد دوسرا تعارف مرزا کی صحت جسمانی کا مسئلہ ہے کہ وہ ہسٹیریا، مراق، ضعف باہ اور کثرت بول جیسے امراض میں مبتلا رہا ہے، جس کا اظہار اُس نے اپنی تحریروں میں بارہا کیا ہے۔ ان امراض کی شدت انسان کا طرز فکر ایک آدمی کو اس قابل کہاں رکھتا ہے کہ وہ کوئی کارِ نمایاں انجام دے سکے، ہاں! وسوسوں کا اُس پر غلبہ ہو سکتا ہے اور انسان وساوس کو اگر اپنے ضعف دماغی کے سبب وہ شخص من جانب اللہ اور وحی و الہام سمجھ لے، تو پھر اُس سے اسی قسم کے مضحکہ خیز دعوے اور تضاد بیانیاں سرزد ہوں گی۔ جس قسم کی تضاد بیانی اور دعوے مرزا کے یہاں ملتے ہیں۔

وحی کے بارے میں مرزا غلام احمد کا پہلے یہ عقیدہ تھا ـــ

"ظاہر ہے کہ اگرچہ ایک ہی دفعہ نزول فرض کیا جائے اور صرف ایک ہی فقرہ جبرئیل لاویں اور چپ ہو جاویں، یہ امر بھی ختم نبوت کے منافی ہے۔" (ازالہ اوہام ص ۵۷۷، مرزا غلام احمد)

مگر پھر وہ یہ کہتا ہے ـــ

"چونکہ میری تعلیم میں امر بھی ہے اور نہی بھی ہے اور شریعت کے ضروری احکام کی تجدید ہے اس لئے خدا تعالیٰ نے میری تعلیم کو اور اُس وحی کو جو مجھ پر ہوتی ہے، فلک یعنی کشتی کے نام سے موسوم کیا ہے" (حاشیہ اربعین)

ختم نبوت کے بارے میں مرزا کا پہلے یہ عقیدہ تھا ـــ

"ان تمام امور میں میرا وہی مذہب ہے جو دیگر اہل سنت و جماعت کا مذہب ہے ـــ اب میں مفصلہ ذیل امور کا مسلمانوں کے سامنے صاف صاف اقرار کرتا ہوں، اس خانہ خدا (جامع مسجد دہلی) میں کہ میں جناب خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت کا قائل ہوں اور جو شخص ختم نبوت کا منکر ہو اُس کو بے دین اور دائرہ اسلام سے خارج سمجھتا ہوں"

(مرزا غلام احمد کا تحریری بیان ـــ مندرجہ تبلیغ رسالت جلد دوم ص ۴۴)

"ختم نبوت" کے معنیٰ اس کے سوا دوسرے ہو ہی نہیں سکتے کہ نبوت کا سلسلہ توڑ دیا گیا، اور انبیاء کرام کے سلسلہ پر آخری مہر لگا دی گئی کہ اب قیامت تک کسی نئے نبی کا ظہور اور نزول نہیں ہو گا مگر اس اپنے پہلے عقیدہ کے علی الرغم مرزا غلام احمد نے اعلان کیا ـــ

"میں کوئی نیا نبی نہیں ہوں، پہلے بھی کئی نبی گزرے ہیں، جنہیں تم سچا مانتے ہو"

خود اپنے ہی قول اور سابقہ عقیدہ کی ضد سے، اپنی نبوت کا دعویٰ کر کے کیا مرزا غلام احمد دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہو جاتا، اس دعوے کے بعد کبھی اعلان ہوتا ہے کہ وحی الٰہی میں میرا نام محمد اور احمد رکھا گیا ہے، کبھی یہ دعویٰ کہ میں ابراہیم اور یوسف بھی ہوں اور کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ میں کرشن بھی ہوں!

قرآن کریم میں جو آیتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اور مدح و فضیلت میں نازل ہوئی ہیں اور جن کے بارے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں، اُن کا مصداق مرزائے قادیان نے اپنی ذات کو ٹھیرایا ہے، اور اس انطباق کے لئے مرزا کا قلم قرآنی آیات کی کھلی ہوئی معنوی تحریف کا کارنامہ انجام دیتا ہے۔

قادیانی اہل علم، مسلمان علماء کو تو کسی مسئلہ میں حَکَم ماننے سے رہے، مستشرقین جو عربی زبان و ادب میں مہارت تامہ اور عبور رکھتے ہیں اُن سے یہ دریافت کیا جا سکتا ہے کہ قرآن کریم کی فلاں فلاں آیات میں کیا مرزا غلام احمد قادیانی نام کے کسی شخص کی مدح و فضیلت کا کوئی پہلو نکلتا ہے۔

مرزا غلام احمد قادیانی کی ابتدائی زندگی افلاس و غربت کی زندگی تھی مگر جب اُسے مذہبی پیشوائی حاصل ہوئی تو مرزا کی زندگی میں امیرانہ

ترفہ پیدا ہو گیا۔ اُس کے گھر کے لوگوں کو ہر قسم کا عیش اور آسودگی میسر تھی، مرزا کے معتقد خاص خواجہ کمال الدین تک نے صاف کہہ دیا کہ ہماری عورتیں، مرزا کے گھر کی عورتوں کے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر بدگمان ہو گئی ہیں، اور وہ قادیان بھیجے جانے کے لئے ایک حبہ بھی دینے کے لئے تیار نہیں ہیں ـــ خاص طور سے مرزا کے باورچی خانہ کے مصارف خاصے امیرانہ تھے۔

مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ کی موت اور محمدی بیگم کی شادی کے بارے میں مرزا غلام احمد نے جو پیش گوئیاں کی تھیں وہ بالکل غلط اور خلافِ واقعہ ثابت ہوئیں۔ ان غلط پیش گوئیوں کی مرزا اور اس کے معتقدین نے جو تاویلیں کی ہیں اُن کی رکاکت کی کوئی حد و انتہا نہیں۔

مرزا غلام احمد قادیانی کے پیش کئے ہوئے مذہب نے کیا کارنامہ انجام دیا، اس کا جواب ایک ہندو اہل قلم ڈاکٹر شنکر پرشاد دیہرا کی تحریر میں ملیگا۔

"ہندوستان کے قوم پرستوں اور وطن دوستوں کو امید کی صرف ایک ہی شعاع نظر آتی ہے، اور یہ امید کی شعاع "احمدیوں" کی تحریک ہے۔ مسلمان جس قدر زیادہ تعداد میں احمدیت کی طرف مائل اور راغب ہوں گے، وہ قادیان کو اپنا مکہ سمجھیں گے اور انجام کار وہ ہندوستان سے محبت کرنے والے اور سچے نیشنلسٹ بن جائیں گے" "مسلمانوں میں احمدیت کی اشاعت و ترقی ہی پان اسلامزم اور عربی ثقافت پر موت کی ضرب لگا سکتی ہے، ہمیں قومی نقطۂ نگاہ سے احمدیت کا مطالعہ کرنا چاہئے"۔

"یہی وجہ ہے کہ مسلمان احمدی تحریک کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں (اس لئے کہ) وہ جانتے ہیں کہ احمدیت عربی تمدن و ثقافت اور اسلام کی مخالف ہے، تحریک خلافت میں احمدیوں نے مسلمانوں کے ساتھ تعاون نہیں کیا، ترکی اور عرب کی بجائے قادیان میں خلافت قائم کرنا چاہتے ہیں یہ چیز عوام مسلمانوں کیلئے جو ہمیشہ پان اسلامزم اور عربی وحدت کا خواب دیکھتے رہتے ہیں، خواہ کتنی ہی مایوس کرنے والی کیوں نہ ہو مگر نیشنلسٹوں کے لئے نوید مسرت ہے" (قادیانیت ـــ ایک مطالعہ ـــ از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

ڈاکٹر شنکر پرشاد دیہرا نے قادیانیت کا صحیح تجزیہ کیا ہے، یہ تحریک اسلامی اتحاد اور ملت اسلامیہ کی وحدت و سالمیت کو پارہ پارہ کرنے والی ہے!

مرزا غلام احمد قادیانی نے انبیاء کرام پر اپنی ذات کو فضیلت دی ـــ

آنچہ داداست ہر نبی را جام   داد آں جام را مرا بہ تمام

ـــ اور ـــ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے جو مجد و شرف عطا فرمایا تھا اُس کو اس طرح ہتھیا لینے کی کوشش کی ـــ

"اللہ نے مجھے رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا ہے" (حقیقۃ الوحی ص ۱۰۴)

"اللہ نے مجھے کوثر عطا کیا" (ضمیمہ انجام آتھم ص ۸۵)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس ہمسری کے بعد برتری کا دعویٰ بھی کر دیا ـــ

- ـــ "اس کے (یعنی نبی کریم کے) لئے (صرف) چاند گرہن کا نشان ظاہر ہوا اور میرے لئے چاند اور سورج دونوں کے گرہن۔ کیا اب کیا تو انکار کرے گا" (اعجاز احمدی ص ۷۱)
- ـــ "ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانیت نے پانچویں ہزار میں اجمالی صفات کے ساتھ ظہور فرمایا اور وہ زمانہ اس روحانیت کی ترقیات کی انتہا کا نہ تھا بلکہ اس کے کمالات کے معراج کے لئے پہلا قدم تھا

پھر اس روحانیت نے چھٹے ہزار کے آخر میں، یعنی اس وقت (مرزا غلام احمد کے زمانہ میں) پوری طرح تجلی فرمائی"

حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کو مردہ علی اور اپنے کو مرزائے قادیان نے زندہ علی کہا، حضرت سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ پر اس طرح طنز کی :-

صد حسین است در گریبانم

اور

"میں خدا کا کشتہ ہوں، لیکن تمہارا حسین دشمنوں کا کشتہ ہے پس فرق کھلا کھلا اور ظاہر ہے" (اعجاز احمدی ص ۱۴۶)

اس شاعرانہ خیال کو مرزا نے حضرت ابوسعید ابوالخیر کی رباعی کے ایک مصرعہ سے اخذ کیا ہے :-

؎ او کشتہ دشمن است وایں کشتہ دوست

یہ لے بڑھتے بڑھتے اس حد تک پہونچ گئی کہ مرزا غلام احمد نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خاندان کی تنقیص کی اور خاک بدہن گستاخ آپ کی دادیوں نانیوں کو زنا کار، اور کسبی کہا (حاشیہ ضمیمہ انجام آتھم)

یہ ہے مرزا غلام احمد قادیانی کی زندگی، سیرت و کردار اور اس کی تعلیمات اور دعووں کا اجمالی خلاصہ! اس غلط اندیشی کی بھلا کوئی انتہا ہے کہ ایسی ناپسندیدہ شخصیت پر ایمان لانے کی مسلمانوں کو دعوت دی جاتی ہے، اور جو کوئی مرزا غلام احمد کو مسیح موعود اور نبی نہیں مانتا اُس کو گمراہ اور کافر سمجھا جاتا ہے! جس شخص کی مت ماری گئی ہوگی، وہی اس جھوٹی نبوت کو مان کر اپنے دین و ایمان اور اسلام کی تباہی کو گوارا کرسکتا ہے، کوئی ہوشمند مسلمان تو دین و ایمان کی اس خودکشی کے لئے کسی قیمت پر آمادہ نہیں ہوسکتا۔

دجل و فریب "فاران" میں جو مضامین ردِ قادیانیت کے سلسلہ میں شائع ہوتے ہیں اُن کے بارے میں قادیانیوں کے رسالوں نے یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، جیسے ہم نے مرزا غلام احمد سے بے سروپا باتیں منسوب کردی ہیں اور مسلک قادیانیت پر غلط قسم کے الزام لگائے ہیں حالانکہ ہم نے ہر بات ثبوت، دلیل اور کتابوں کے حوالوں کے ساتھ کہی ہے، اور کوئی بے اصل بات قادیانیت اور اس کے موجد سے منسوب نہیں کی!

مرزا غلام احمد اور قادیانیت کے بارے میں ہم نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے عرب و عجم کے تمام مسلمانوں کے یہی خیالات ہیں، مرزا کے دعویٰ نبوت کے کذب پر تمام عالم اسلام متفق ہے! متعدد زبانوں میں درجنوں کتابیں ردِ قادیانیت کے موضوع پر لکھی گئی ہیں، اور اس تعداد میں ہمیشہ اضافہ ہوتا رہتا ہے، مسلمانوں کے اخبارات اور رسالوں میں ایسے مضامین جن میں قادیانیت کی تردید کی جاتی ہے، آتے رہتے ہیں! اگر ردِ قادیانیت جرم ہے تو پوری ملت اسلامیہ اس جرم میں شریک ہے!

مسلمانوں کے کسی عالم، اہل قلم، مفکر اور ناقد نے (راقم الحروف نے بھی) قادیانیوں کے ساتھ ذرہ برابر ناانصافی نہیں کی، انہوں نے قادیانیت کے بارے میں وہی باتیں کہی ہیں جو قادیانیوں کی کتابوں میں لکھی ہوئی ملتی ہیں، مگر قادیانیوں کے رسالے حقائق کو مسخ کرکے اور واقعیت کو توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہیں، مثلاً ہم نے "فاران" میں یہ لکھا تھا کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے یہ تو نہیں کہا کہ میں ختم نبوت کے عقیدہ کا منکر ہوں، مگر اُس کی دوسری تحریروں اور اقوال و اعمال سے ختم نبوت کی پوری طرح نفی ہوتی ہے ـــــ قادیانیوں کے آرگن ماہنامہ "الفرقان" (ربوہ) نے ہمارے قول کا ایک جز تو نقل کردیا مگر دوسرے حصہ کو جو اس بحث کا مرکزی نقطہ ہے، دانستہ نقل نہیں کیا!

مسلمانوں کو یہی دھوکا تو دیا جاتا ہے کہ مرزا غلام احمد "ختم نبوت" کا قائل تھا اور حضور کو "خاتم النبیین" مانتا تھا، بیشک اُس نے یہ الفاظ کہے ہیں، اور یہ نہیں کہا کہ "نبوت ختم نہیں ہوئی" ـــــ مگر اُس کا قول و عمل کیا ہے یہ کہ ـــــ "میرا منکر کافر ہے" ـــــ "میری تعلیم میں امر بھی ہے اور نہی بھی ہے اور شریعت کے ضروری احکام کی تجدید ہے، اس لئے خدا تعالیٰ نے میری تعلیم کو اور اُس وحی کو جو میرے اوپر ہوتی، فلک یعنی کشتی کے نام سے

موسوم کیا" ـــــــ

انبیاء گرچہ بودہ اند بسے | من بعرفاں نہ کمترم ز کسے
آنچہ داداست ہر نبی را جام | داد آں جام را مرا بہ تمام
کم نیم زاں ہمہ بروئے یقیں | ہر کہ گوید دروغ ہست لعیں

ـــــــ اور ـــــــ

"میری اُمت کے دو حصے ہوں گے، ایک وہ جو مسیحیت کا رنگ اختیار کریں گے اور یہ تباہ ہو جائیں گے اور دوسرے جو مہدویت کا رنگ اختیار کریں گے، میں کوئی نیا نبی نہیں ہوں، پہلے بھی کئی نبی گزرے ہیں جنہیں تم لوگ سچا نبی مانتے ہو"

مرزا کے ان دعووں کے ساتھ ایک جداگانہ امت اور نبوت کے تمام لوازم لئے ہوئے ایک الگ انسٹی ٹیوشن وجود میں آتا ہے جس میں مرزا غلام احمد کے نام کے ساتھ "علیہ السلام" لکھا جاتا ہے اور اس کے ساتھیوں کو "رضی اللہ عنہم" کہا جاتا ہے، غیر قادیانی مسلمانوں سے بیاہ شادی کرنے اور ان کے جنازے کی نماز تک پڑھنے کی ممانعت کی جاتی ہے، مرزا غلام احمد اپنے منکر کو کافر قرار دیتا ہے، خدا کے لئے انصاف سے بتایئے کہ یہ صورت حال اور امر واقعہ کیا "ختم نبوت" کی مکمل طور پر نفی نہیں کرتے!

"ازالہ اوہام" میں "ختم نبوت" کی خود مرزا غلام احمد قادیانی نے یہ تعریف کی تھی ـــ

"ظاہر ہے کہ اگرچہ ایک ہی دفعہ وحی کا نزول فرض کیا جائے اور صرف ایک ہی فقرہ حضرت جبریل لاویں اور چپ ہو جاویں، یہ امر بھی ختم نبوت کے منافی ہے"

لیکن "حاشیہ اربعین" میں مرزا نے اعلان کیا ـــ

"چونکہ میری تعلیم میں امر بھی ہے اور نہی بھی اور شریعت کے ضروری احکام کی تجدید ہے، اس لئے خدا تعالیٰ نے میری تعلیم کو اور اس وحی کو جو مجھ پر ہوتی ہے فلک یعنی کشتی کے نام سے موسوم کیا . . ."

مرزائے قادیان کا یہ اعلان کیا عقیدہ "ختم نبوت" کے منافی نہیں ہے، مرزا غلام احمد کا خود وجود اس دعوے کے ساتھ کہ میں نبی ہوں، میرا منکر کافر ہے، میری ایک امت ہے، مجھ پر وحی آتی ہے، اپنی جگہ "خاتم النبیین" کے عقیدے کی تردید، نفی اور تکذیب ہے۔

ربوہ کے "الفرقان" نے راقم الحروف کو "حیات مسیح" پر مناظرہ کی دعوت بلکہ چیلنج دیا تھا، میں نے اس کے جواب میں لکھا کہ میں نے رد قادیانیت کے سلسلہ میں اس بحث ہی کو نہیں چھیڑا، لہٰذا مجھ سے اس مسئلہ پر بحث و مناظرہ کرنے کا مطالبہ کیوں کیا جاتا ہے! اس میری تحریر کو "الفرقان" میں اس انداز سے پیش کیا گیا کہ جیسے میں نے اس مسئلہ میں شکست مان لی ہے۔ حالانکہ میں نے اس عبارت کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر اٹھائے جانے سے متعلق قرآنی آیات اور تفسیری اقتباسات بھی درج کر دیئے تھے۔

حیات مسیح اور نزول مسیح کے مسئلہ میں میرے یا کسی دوسرے عالم کے بحث و مناظرہ نہ کرنے سے یہ مطلب تو اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ نفس مسئلہ ہی کالعدم ہو گیا، مسلم ارباب فکر، اہل علم اور دانشوروں نے اس مسئلہ پر ہزار ہا صفحات لکھے ہیں اور حیات مسیح کے منکرین کے ایک ایک اعتراض کا جواب دیا ہے، ـــــ کلام الفصیح فی تحقیق المسیح ـــــ کلمۃ اللہ فی حیات روح اللہ ـــــ القول المحکم فی نزول عیسیٰ ابن مریم ـــــ نزول عیسیٰ ـــــ التصریح بما تواتر فی نزول المسیح ـــــ یہ وہ چند معرکۃ الآرا کتابیں ہیں جو حضرت مسیح کی حیات اور نزول پر سکت دلیلیں پیش کرتی ہیں ـــــ

ایک مفروضہ کے طور پر بسبیل تنزل یہ مان لیا جائے کہ حضرت عیسیٰ مسیح وفات پا چکے مگر اس سے مرزا غلام احمد قادیانی کی "موعود مسیحیت" تو کسی عنوان بھی ثابت نہیں ہوتی، نزول مسیح کی جو واضح علامتیں احادیث میں ملتی ہیں، اُن میں سے ایک علامت بھی مرزا میں نہیں پائی گئی؛ اور امت مسلمہ نے متفقہ طور پر مرزا کے اس دعوے کو رد کر دیا۔

جس طرح دوسرے مسلمانوں کی طرح مرزا غلام احمد کا یہی عقیدہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں، اب نہ کسی پر وحی آئے گی اور نہ کوئی نیا نبی مبعوث ہوگا مگر پھر اس نے اس عقیدہ کے برخلاف اپنی نبوت کا دعویٰ بھی کیا، اور یہ بھی کہا کہ مجھ پر وحی آتی ہے، اسی طرح "مسیح موعود" کے سلسلہ میں بھی وہ امت مسلمہ کا ہم عقیدہ تھا، مگر پھر اپنے اس عقیدہ کی خود ہی نفی اور تردید کر ڈالی، مرزا نے قادیان لکھتا ہے :-

"میں تقریباً بارہ برس تک جو ایک زمانہ دراز ہے، بالکل اس سے بے خبر اور غافل رہا کہ خدا نے مجھے بڑی شدومد سے براہین میں مسیح موعود قرار دیا ہے اور میں حضرت عیسیٰ کی آمد ثانی کے رسمی عقیدہ پر جما رہا، جب بارہ برس گزر گئے وہ وقت آگیا کہ میرے پر اصل حقیقت کھول دی جائے، تب تواتر سے اس بارے میں الہامات شروع ہوئے کہ میں مسیح موعود ہوں" (اعجاز احمدی)

مرزا غلام احمد کے قول و فعل میں اس قسم کے تضاد کے متعدد نمونے ملتے ہیں :-

؎ چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

اس سلسلہ میں انجیل کے دو اقتباسات ملاحظہ فرمائیے :-

● "اور جب وہ زیتون کے پہاڑ پر بیٹھا تھا، اُس کے شاگردوں نے اس کی خدمت میں آکر کہا کہ یہ کب ہوگا، اور تیرے آنے کا اور زمانہ کے آخر ہونے کا کیا نشان ہے؟ تب یسوع نے جواب میں اُن سے کہا خبردار کوئی تمہیں گمراہ نہ کرے کیونکہ بہتیرے میرے نام پر آئیں گے، اور کہیں گے میں مسیح ہوں اور کتنوں کو گمراہ کریں گے" (انجیل متی باب ۲۴ آیت ۳)

اور

● "اس وقت اگر کوئی تم سے کہے کہ دیکھو مسیح یہاں ہے یا وہاں ہے، تو یقین نہ کرنا کیونکہ جھوٹے مسیح اور جھوٹے نبی اٹھ کھڑے ہوں گے، اور عجیب کام دکھائیں گے اگر ممکن ہو تو برگزیدوں کو بھی گمراہ کر لیں" (انجیل متی باب ۲۴ - ۲۳-۲۴)

انجیل مقدس کی یہ پیش گوئی وہ جامہ موزوں ہے، جو مرزا غلام احمد کی شخصیت پر ٹھیک آتا ہے۔

"ابن عطیہ لکھتے ہیں کہ تمام امت مسلمہ کا اس پر اجماع ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اس وقت آسمان پر زندہ موجود ہیں اور اور آپ جسم عنصری پھر تشریف لانے والے ہیں، جیسا کہ متواتر حدیثوں سے ثابت ہے" (بحر محیط)

احادیث میں "عیسیٰ ابن مریم" اور "مسیح ابن مریم" کے نزول کا ذکر آیا ہے، مرزا غلام احمد کے نزول کا ذکر نہیں آیا اور ابن مریم کی تصریح و تشخص کے بعد تو کسی اشتباہ و تذبذب کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی! دنیا میں عیسیٰ اور مسیح ابن مریم ایک ہی شخصیت کا نام ہے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کئی سو سال قبل پیدا ہو چکی، اور اسی کے پھر نزول کی احادیث میں خبر دی گئی ہے اور پیش گوئی فرمائی گئی ہے۔

پھر احادیث کے الفاظ واضح طور پر بتاتے ہیں کہ عیسیٰ ابن مریم عالم بالا سے نازل ہوں گے، زمین کے کسی خطہ میں پیدا نہیں ہوں گے۔ امت مسلمہ اس عیسیٰ اور مسیح کو جانتی ہے جو معجزہ کے طور پر بغیر باپ کے پیدا ہوا تھا (علیہ السلام) کسی ایسے عیسیٰ اور مسیح کو نہیں جانتی، جس کے ماں باپ دونوں ہوں اور مرد و زن کا وصل و قربت جس کی پیدائش کا سبب بنا ہو ــــــ اس لئے امت مسلمہ نے مرزا غلام احمد قادیانی کے مسیح موعود ہونے کے دعویٰ کو ٹھکرا دیا اور اسے تنکا کی برابر بھی وقعت اور اہمیت نہیں دی۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ حضرت مسیح دمشق کے منارہ سفید کے پاس نازل ہوں گے، نزول مسیح کے اس مقام اور علامت کی تاویل مرزائے قادیانی

ہی زبان سے سنیئے :—

"خدا تعالیٰ نے مجھ پر یہ ظاہر فرمایا کہ قصبہ قادیان بوجہ اس کے کہ اکثر یزیدی الطبع لوگ اس میں سکونت رکھتے ہیں، دمشق سے ایک مناسبت اور مشابہت رکھتا ہے۔" (حاشیہ ازالہ اوہام)

اور

"مریم کی طرح عیسیٰ کی روح مجھ میں نفخ کی گئی، استعارہ کے رنگ میں مجھے حاملہ ٹھیرایا گیا اور آخر کئی مہینے کے بعد جو دس مہینے سے زیادہ نہیں، بذریعہ الہام مجھے مریم سے عیسیٰ بنایا گیا، اس طور سے میں ابن مریم ٹھیرا۔" (کشتی نوح ص۴۶)

مرزا غلام احمد نے "تاویل" کے فن کو جس انداز میں "تحریف" سے ملایا ہے، اس کی اور کہیں مثال نہیں ملتی۔ امت مسلمہ ایسے شخص کو مسیح موعود، مہدی یا نبی کس طرح تسلیم کر سکتی ہے جسے استعارے کے رنگ میں حاملہ ٹھیرایا گیا اور جسے بذریعہ الہام مریم سے عیسیٰ بنا دیا گیا۔

ع ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے

نومبر کے "الفرقان" (ربوہ) میں "مدیر فاران لاجواب ہو گئے" کے عنوان کے تحت یہ نوٹ درج کیا گیا ہے :—

"ماہنامہ الفرقان (ستمبر ۱۹۵۳ء) کا خاص نمبر رسالہ "فاران" کراچی کے اعتراضات کا ایسا مسکت جواب ہے کہ مدیر "فاران" کو اس کے جواب میں اب تک ایک بات لکھنے کی بھی جرأت نہیں ہوئی۔ جاء الحق و زہق الباطل ان الباطل کان زہوقا۔ ہمارے خاص نمبر کو پڑھ کر گنور ضلع بدایوں (بھارت) سے مدیر "فاران" ماہر القادری صاحب کے ایک گہرے دوست نے جو ایک خط لکھا ہے جسے ہم قارئین کے ازدیاد علم کے لئے درج کرتے ہیں"

حالانکہ "فاران" میں "رد قادیانیت" کے موضوع پر مسلسل لکھا جا رہا ہے اب رہا "گنور" کا خط، تو یہ صاحب اسلام ترک کرکے "بہائی" ہو چکے ہیں۔ اس صورت میں جہاں تک دینی مباحث و معتقدات کا تعلق ہے، ان کی رائے کیا وزن رکھتی ہے! بہائیت "قادیانیت" سے فکر و مزاج میں بہرحال کسی نہ کسی حد تک مماثلت اور مشابہت رکھتی ہے۔

آخری بات ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ امت مسلمہ نے مرزا غلام احمد قادیانی کے مجدد، مسیح موعود اور نبی ہونے کے دعووں کو نہ مان کر اور انہیں ٹھکرا کر ذرہ برابر کسی قسم کی غلطی نہیں کی۔ اور مرزا کے ان دعووں کی تردید و تکذیب نے مسلمانوں کے اسلام اور ایمان کو کوئی نقصان نہیں پہونچایا، اپنے اس موقف کو وہ سولہ آنے صحیح سمجھتے ہیں بلکہ اس پر فخر کرتے ہیں۔

گزارش آخر میں ہمیں حکومت کی خدمت میں یہ عرض کرنا ہے کہ حجاز اور افغانستان اور بعض دوسرے اسلامی ملکوں میں قادیانیت کی تبلیغ کی اجازت نہیں ہے، پاکستان جو اسلام کے نام پر بنا ہے اس ملک میں فتنۂ قادیانیت کی نشر و اشاعت کی اجازت کے حدود قابل غور اور محل نظر ہیں! خاص طور سے قادیانی رسالوں میں قرآن کریم کی پوری بے باکی کے ساتھ جو معنوی تحریف کی جا رہی ہے اس کا احتساب ضروری ہے۔

رد قادیانیت کوئی نیا مسئلہ نہیں ہے جسے راقم الحروف نے پہلی بار چھیڑا ہو، کم و بیش ۶۵ سال سے، جب سے مرزا غلام احمد قادیانی نے مسیح موعود اور اس کے بعد اپنے نبی ہونے کا دعویٰ کیا ہے مسلمان اہل قلم، ارباب فکر اور دانشور زبان و قلم کے ذریعہ مرزا مذکور کے دعوے اور اس جدید مذہب کی تردید کرتے رہے ہیں!

"فاران" میں اس موضوع پر لکھنے کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ قادیانیوں کا تبلیغی لٹریچر دفتر "فاران" میں موصول ہوا، اس کے علاوہ بھی بعض حضرات کی زبانی یہ اطلاع ملی کہ قادیانی اپنے مشن کی تبلیغ بڑی سرگرمی کے ساتھ کر رہے ہیں، اس صورت میں مسلمانوں کو گمراہی سے بچانے کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار ہی نہیں ہے کہ زبان و قلم سے مسلک قادیانیت کی تردید کی جائے اور مسلمانوں کو بتایا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے نبوت کو ختم کر دیا، آخری کتاب

ہمارا نبوی رسولؐ آ چکا، اب کسی ایسی شخصیت کی ضرورت باقی نہیں رہی جس کا ماننا ایمان کی لازمی شرط ہو۔

مسلک قادیانیت کی تردید جب بھی کی جائے گی، مرزا غلام احمد کو جھوٹا نبی اور اس کے دعووں کو کذب و افترا ہی کہا جائے گا اور مسلمانوں کے سامنے مرزا کی زندگی پیش کر کے انہیں بتایا جائے گا کہ کسی نبی یا مجدد کا کیا ایسا کردار ہو سکتا ہے!

قادیانیوں کو جب ان کے مسلک کی تبلیغ و اشاعت کی آزادی حاصل ہے تو ہم مسلمان بھی مسلک قادیانیت کی تردید کا حق رکھتے ہیں۔ کوئی شخص نبوت کا دعویٰ کرتا ہے تو اس کی دو ہی صورتیں ہیں کہ یا تو اس کی نبوت کی تصدیق کی جائے اور سچا نبی مانا جائے یا پھر اس کی نبوت کی تکذیب کی جائے اور اسے کاذب کہا جائے! مسلمان مرزا غلام احمد کو "سچا نبی" نہیں مانتے! "فاران" میں مسلمانوں کے اسی عقیدہ کی ترجمانی کرتے ہوئے "کذب و افترا" جیسے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جن کا استعمال رد قادیانیت کے سلسلہ میں ناگزیر ہے۔

حضرات کے قابل تو قادیانی رسالے اور اخبار ہیں جو اس فتنہ کو ہمیشہ ہوا دیتے رہتے ہیں اور اس بحث کو چھیڑتے ہیں جو واقعی "غیر ضروری" ہے اور جس سے کروڑوں مسلمانوں کو اذیت ہوتی ہے۔

"ختم نبوت" کا مسئلہ اسلام و ایمان کا بنیادی مسئلہ ہے، اس کا مجروح ہونا کوئی مسلمان گوارا اور برداشت کر ہی نہیں سکتا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ——————

چھٹ جائے اگر دامن کونین تو کیا غم
لیکن نہ چھٹے ہاتھ سے دامان محمدؐ

ماہر القادری
۱۲، نومبر ۱۹۷۶ء

ہم اپنے مضامین میں مسلک قادیانیت کے قریب قریب تمام گوشوں کو بے نقاب کر چکے ہیں اور ان کے تمام بنیادی اور اہم دعووں اور دلیلوں کی تردید کر چکے ہیں، ان مضامین کو جو کوئی مسلمان پڑھے گا، پھر وہ فتنہ قادیانیت سے نفرت اور گریز ہی میں اپنے ایمان کی خیر سمجھے گا! اس لئے اب اس سلسلہ کو مزید جاری رکھنے کی ضرورت نہیں ہے!

جہاں تک قادیانیوں کے رسالوں اور اخباروں کا تعلق ہے ان میں جو خرافات ہوتی ہیں ان کی کہاں تک تردید کی جائے! یہ رنگ تو پیروں اور جو سمجھ کے یہاں نظر نہیں آیا ——— قادیانیت کی تردید میں درجنوں کتابیں مستقل موجود ہیں جو حضرات مزید تحقیق و معلومات کے خواہش مند ہوں وہ ان کا مطالعہ فرما سکتے ہیں۔ پروفیسر الیاس برنی مرحوم کی تالیف "قادیانی مذہب" ہی کا تنہا مطالعہ قادیانیت کے پس منظر اور اس کے داعیات و محرکات اور تعلیمات کو بے نقاب کرنے کے لئے کافی ہے۔
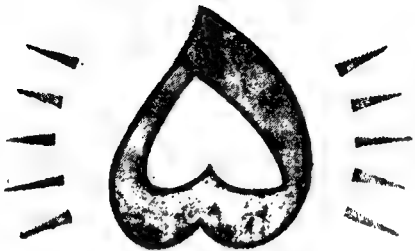
انوار عالم

ذہنی الجھاؤ اور سلبی تفکر

محمود احمد عباسی صاحب کی کئی کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں جن کے مطالعہ کے بعد اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ ان کا مفصل جواب دیا جائے لیکن کسی موضوع پر تنقیدی بحث کے لئے چند امور کا تصفیہ ناگزیر ہوتا ہے خصوصاً موضوع کا احاطۂ بحث و نقد، صحیح ماخذ کا تعین اور معتبر و نتیجہ خیز اسلوب تحقیق۔ اسی نقطۂ نظر کے پیشِ نظر عباسی صاحب کو میں نے چند سوالات پر مشتمل ایک خط مع جوابی لفافہ کے بھیجا تھا مگر خدا جانے کن مصلحتوں کے پیشِ نظر عباسی صاحب نے ان کا جواب دینا گوارا نہ کیا کم از کم جواب سے عباسی صاحب کی نگارشات کا جائزہ لینے کے لئے مندرجہ ذیل بنیادی نکات کا تعین ہو سکتا تھا۔

(۱) عباسی صاحب کے نزدیک تاریخ کا موضوع بحث (SUBJECT MATTER) کیا ہے؟

(۲) عباسی صاحب کے نزدیک تاریخ کے مستند ماخذ کون کون سے ہیں اور کیا ہیں؟

(۳) عباسی صاحب کے نزدیک کسی تاریخی واقعہ کی صحت و عدم صحت معلوم کرنے کے لئے کونسا اسلوب تحقیق (METHOD OF RESEARCH) معتبر ہے۔

اس تصفیہ سے ہٹ کر جس بات نے مجھے یہ سطور لکھنے پر مجبور کیا۔ عباسی صاحب کے وہ غیر واضح اور مبہم تصورات تھے جو صاحب موصوف اسلامی ریاست و معاشرہ کے متعلق رکھتے ہیں۔ عباسی صاحب نے بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ اسلام کے متعدد واضح تصورات کو ابہام اور پیچیدگی کا شکار بنانے کی کوشش کی ہے حالانکہ ان تصورات کی قرآن اور سنت میں نمایاں اور واضح بنیادیں موجود ہیں بلکہ ان کے متعلق اس صدی میں اسلامی مفکرین نے اس قدر تحقیقی مواد فراہم کر دیا ہے کہ ظن و تشکیک کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی۔

عباسی صاحب کا عجیب اسلوب تحقیق ہے کہ وہ اسلام کے سیاسی تصورات پر نقد و بحث فرماتے ہوئے سلبی انداز (NEGATIVE) اختیار فرماتے ہیں چنانچہ مندرجہ ذیل عبارت ملاحظہ ہو جو کتاب موسومہ تبصرہ محمودی بر منفعات مودودی سے ماخوذ ہے۔

> ۔ اللہ نے مسلمانوں سے جس خلافت کا وعدہ کیا تھا اس میں یہ نہیں کہا کہ اس کا دستور اساسی کیا ہوگا۔ وہاں الفاظ یہ ہیں استخلف الذین من قبلہم۔ دنیا میں حکومت کی جتنی اور جیسی صورتیں رائج چلی آرہی تھیں ویسی ہی مسلمانوں کی بھی حکومت ہوگی " (ص۱۰)

متذکرہ بالا عبارت کو بالکل غیر جانبدارانہ انداز میں بار بار پڑھئے۔ ایک اسلامی مورخ صاحب اپنی دو قطعی رائے کا کیا اظہار کرتے ہیں۔

(۱) اسلامی حکومت کا قرآن اور سنت کی بنیاد پر کوئی دستورِ اساسی نہیں ہے۔

(۲) استخلف الذین سے مراد عہدِ ماضی کی تمام حکومتیں تھیں بلا تخصیص۔

گویا مورخ صاحب کے نزدیک ہر گذشتہ حکومت آیت مبارکہ کی مظہر تھی خواہ وہ فرعون کی ہو یا نمرود اور شداد کی۔ حالانکہ آیت استخلاف کے جس ٹکڑے سے سید صاحب ...... استدلال فرما رہے ہیں اگر اس کو سیاق و سباق کے ساتھ پڑھا جائے تو اس آیت میں یہ وعید ملتی ہے کہ خدا اچھے عمل کرنے والے اصحاب ایمان کو بطور صلہ یا عطیہ خلافت سے سرفراز کرے گا جس طرح عہد گذشتہ میں نیک عمل کرنے والے اصحاب ایمان کو سرفراز کیا تھا آیت مبارکہ یہ ہے۔

وعد اللّٰہ الذین آمنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم۔ (المائدہ)	اللہ کا وعدہ ہے اُن لوگوں کے لئے جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے کہ وہ ان کو زمین پر خلافت دے گا جس طرح اُس نے پہلے والوں کو دی تھی۔

تین اہم امور آیت بالا سے واضح ہوتے ہیں۔

(۱) ایمان اور نیک عمل کی شرط

(۲) شرط متذکرہ اول کا صلہ خلافت

(۳) اصحاب ایمان کی پچھلی خلافتوں کی مثال نہ کہ ہر حکومت کی۔

آیت کے مطالعہ کے بعد جو چیز سامنے آتی ہے وہ یہ کہ خدا خلافت دینے کا وعدہ کر رہا ہے نہ کہ حکومت کا ہر ذی علم یہ اچھی طرح جانتا ہے کہ خلافت اور حکومت میں لوگی اور معنوی ہر اعتبار سے فرق ہے اس کو آپ اس طرح سمجھیں۔

خلافت	حکومت
(۱) خلافت کا معنوی مفہوم نیابت یا نمائندگی ہوتا ہے۔ جو پابند ہے اصل حاکم کی۔	(۱) حکومت کا معنوی مفہوم حکم چلانا ہوتا ہے کسی کی کوئی پابندی موجود نہیں ہوتی۔
(۲) خلافت میں اقتدار اعلیٰ (SOVEREIGNITY) صرف خدا کے لئے ہوتا ہے۔	(۲) حکومت میں اقتدار اعلیٰ (SOVEREIGNITY) کا سرچشمہ فرد یا افراد ہوتے ہیں۔
(۳) خلافت میں سپرد کردہ اختیارات (DELEGATED POWER) ہوتے ہیں۔	(۳) حکومت میں غیر سپرد کردہ مطلق اختیارات OBSOLUTE POWER ہوتے ہیں۔

خلافت اور حکومت کے اس جوہری فرق (SUBESTANTIAL DIFFERENCE) کو نظر انداز کر کے یہ کہہ دینا کہ حکومت کی جتنی اور جیسی بھی قسمیں تاریخ میں پائی جاتی ہیں وہ سب ہی مسلمانوں کی حکومتوں کی ہوں گی۔ اس بات کی غمازی ہے کہ اسلام کے مورخ اعظم صاحب نے نہ تو دنیا کی سیاسی تاریخ کے مختلف عوامل (FACTORS) و محرکات کو سمجھا ہے اور نہ یہ کہ ہر حکومت کی تشکیلی نوعیت میں بڑا ہاتھ مقاصد و نصب العین کا ہوا کرتا ہے اور اسی اعتبار سے طرز حکومت یا سیاسی و اجتماعی ہیئت صرف ایک تحفظانہ بندوبست ہوتا ہے اصل مقاصد و منشا کے قیام و استقلال کا جس پر ہم آئندہ سطور میں مختلف سیاسی و اجتماعی نظاموں کے تذکرہ و تقابل میں بحث کریں گے، سردست ہم کو عباسی صاحب کے اس جملہ کا بھی جائزہ لینا ہے کہ۔

"لیکن کتاب اور سنت نے اُمت کو کوئی دستور اساسی نہیں دیا اور نہ ایک بڑھنے والی ترقی پذیر بین الاقوامی اُمت کو کسی دستور کا پابند کیا جا سکتا ہے۔"

عبارت بالا پر بحث سے قبل یہ سمجھ لینا چاہیے کہ دستور اساسی ہے کیا چیز؟ دستور اساسی انگریزی لفظ کانسٹی ٹیوشن (CONSTITUTIONS) کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے جس کا مطلب یہ ہے۔

آکسفورڈ ڈکشنری میں اس کی یوں تشریح ہے۔

FORM IN WHICH A GOVERNMENT IS GOVERNED — وہ خاکہ جس کے تحت یا مطابق حکومت چلائی جاتی ہے۔

پروگریسو انگلش ڈکشنری

LAWS AND PRINCIPLES TO WHICH A STATE IS GOVERNED — وہ قوانین یا اصول جن پر کسی ریاست کی حکومت چلائی جائے

یہاں یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ دستور اساسی سے مراد کسی حکومت کی پالیسی کی وہ بنیادی باتیں ہوتی ہیں جن کی ہر حکومت اپنے سیاسی انتظامی معاملات میں پابندی کرتی ہے چنانچہ ذیل کے نکات ہر دستور کو طے کرنے ہوتے ہیں اور انہی پر حکومت کی تمام پالیسیوں کا انحصار ہوتا ہے۔

(۱) ملک کا اقتدار اعلیٰ یا حاکمیت (SOVERIGNITY)
(۲) ریاست کا مقصد وجود۔
(۳) حکومت کے لئے قانون سازی کا دائرہ عمل۔
(۴) انتظامیہ و عدلیہ کے حدود اور طریق کار (LIMITS AND PROCEDURE)
(۵) حکومت کی ذمہ داریاں۔
(۶) شہریوں کے حقوق
(۷) حق شہریت
(۸) سربراہ مملکت کا انتخاب اور اس کی شرائط (CONDITIONS)

دستور اساسی کے ان ہی بنیادی نکات پر ہر سیاسی و اجتماعی نظام بنتا ہے اگر ایک اسلامی حکومت کے پاس کوئی دستور اساسی موجود نہیں ہے تو وہ ان سوالات کو کیونکر حل کرے گی، رکیا عباسی صاحب اس ضمن میں ہماری راہ نمائی فرمائیں گے، ممکن ہے جواباً کہا جائے کہ ہم قرآن و سنت کی بنیاد پر ان نکات کو حل کریں گے تو یہ بھی خوب رہی ایک طرف تو محققانہ ادعا یہ کہ قرآن اور سنت نے امت کو کوئی دستور اساسی دیا ہی نہیں اور پھر بھی دستور کے لئے قرآن و سنت ہی بنیاد!

یہاں یہ بھی غور طلب ہے کہ قرآن اور سنت کی دستوری حیثیت سے انکار کے بعد ایک مسلم ریاست کو خدا کے اقتدار اعلیٰ و حاکمیت تسلیم کرنے کے لئے مجبور نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وہ تو یہ جواب دے گی کہ چونکہ قرآن و سنت نے ہم کو کوئی دستور اساسی نہیں دیا ہے اس لئے کیوں نہ اقتدار اعلیٰ کا سرچشمہ عوام ہی کو قرار دیا جائے جیسا کہ آج کل کے حالات میں تمام حکومتوں میں متداول ہے آپ کس بنیاد پر ایک مسلم ریاست سے یہ کہہ سکیں گے کہ اس کا سربراہ مسلمان ہی ہونا چاہئے وہاں تو جواب ہوگا کہ جب قرآن اور سنت میں ہمارے لئے کسی دستور اساسی کا وجود ہی نہیں تو آخر ہم روش عام سے ہٹ کر سربراہی کے لئے مسلمان کی قید کیوں رکھیں اسی طرح قانون سازی (LEGISLATION) میں قرآن اور سنت کے بیان کردہ حلال و حرام کی کیوں پابندی کریں جبکہ وہ دستور اساسی کے لحاظ سے کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتا۔

قرآن اور سنت کی دستوری اہمیت و حیثیت کو ختم کر کے آپ آخر کن اصول اور بنیادوں پر اسلامی و غیر اسلامی کا تفاوت و فرق قائم رکھ سکیں گے غالباً اس صورت حال سے متأثر ہو کر علامہ اقبال نے کہا تھا۔

ہے کس کی یہ جرأت کہ مسلمان کو ٹوکے　　حریتِ افکار کی نعمت ہے خداداد
چاہے تو کرے کعبہ کو آتش کدۂ پارس　　چاہے تو کرے اس میں فرنگی صنم آباد
قرآن کو بازیچۂ تاویل بنا کر　　چاہے تو خود اک تازہ شریعت کرے ایجاد

ممکن ہے اس مرحلہ پر عباسی صاحب یہ ارشاد فرمائیں کہ میں نے اپنی عبارت میں یہ بھی تو کہا تھا کہ -

"فرق صرف اتنا ہوگا کہ اس حکومت کا مقصد دین سے پیدا شدہ اخلاص کے قوانین ایسے جگمگا رہے ہوں گے کہ دنیا کی ہر قوم ان کے تحت زندگی بسر کر سکے"

بجا ارشاد مگر جناب ہر حکومت اپنے امور و معاملات میں صرف کسی دستور اساسی کی ہی پابند ہوا کرتی ہے تا آپ کسی دستور کی واضح اور اختیار سے ہٹ کر اس پر کوئی دوسری پابندی نہیں ٹھونس سکتے ہیں چنانچہ ہر حکومت میں آئے دن سیاسی مطالبات کی جتنی تحریکیں چلتی ہیں یا حکومتوں کے کسی اقدام کو عدالت میں چیلنج کیا جاتا ہے تو وہ صرف دستور اساسی کی بنیاد ہی پر ہوتا ہے کیونکہ دستور صحیح معنوں میں حکومت اور عوام کے درمیان ایک معاہدہ کی حیثیت رکھتا ہے جس میں فریقین کے حقوق اور ذمہ داریوں کی بنا پر ان کی تسمید کا تعین کیا جاتا ہے اس لحاظ سے آپ بتائیں کہ وہ حکومت جس کا دستور اساسی قرآن اور سنت کے علاوہ ہوگا اس کے آفریدہ دینی تصریحات پر ہوگا وہ کیوں اور کس بنیاد پر دین کی ذمہ داریوں کی مکلف ہوگی۔

اس مقدمہ بحث کے بعد اب ہم قرآن اور سنت کا ایک اجمالی مطالعہ کرتے ہیں تاکہ ہم یہ تجسس کر سکیں کہ واقعی قرآن اور سنت امت مسلمہ کو کوئی دستور اساسی دیتا ہے یا نہیں۔ قرآن اس معاملہ میں بہت صاف کہتا ہے۔

لقد ارسلنا رسلنا بالبینٰت وانزلنا معھم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط (الحدید)

ہم نے رسولوں کو واضح ہدایات کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب و میزان اتاری تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔

قرآن کا یہ دعویٰ ہے۔

(۱) رسول کھلی ہوئی ہدایات کے ساتھ آئے۔

(۲) وہ ساتھ ہی ان کے لئے کتاب و میزان بھی لائے۔

(۳) تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔

اس آیت میں لوگ، زمانہ اور معاملات کی کوئی تخصیص نہیں کی گئی کیونکہ یہ دائمی ہدایت ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہوا۔

ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولٰئک ھم الکافرون (المائدہ)

جو خدا کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں۔

آیت مبارکہ واضح طور پر یہ بتا رہی ہے کہ احکام خداوندی (INSTRUCTIONS) زندگی کے ہر معاملہ کے لئے نازل ہوئے ہیں ان کے اندر سیاسی، معاشی، اخلاقی، تمدنی اور ثقافتی معاملات کی کوئی تحدید قائم نہیں کی گئی ہے اور نہ ان کا امتیاز رکھا گیا ہے۔

اس صورت میں جب قرآن زندگی کے جملہ معاملات میں فیصلوں کو احکام الٰہیہ کے مطابق انجام دینے کا قطعی حکم دے رہا ہو اس قدر جسارت کے ساتھ یہ کہہ دینا کہ قرآن اور سنت نے امت مسلمہ کو سیاسی معاملات میں کوئی دستور اساسی نہیں دیا ہے یا تو فہم کا قصور ہے یا سیاسی امور میں قرآن کی برتری (SUPREMACY) کا انکار ہے۔

قرآن نے اس بات کی اپنی مقدس آیات میں سخت ترین مذمت کی ہے کہ لوگ اس پر زبانی ایمان لا کر پھر زندگی کے معاملات میں فیصلوں کے لئے دوسری طرف رجوع ہوں اور قرآن کے علاوہ کسی اور کو آخری سند (FINAL AUTHORITY) تصور کریں۔

الم تر الی الذین یزعمون انھم اٰمنوا بما انزل الیک وما انزل من قبلک یریدون ان یتحاکموا الی الطاغوت وقد امروا ان

کیا تم نے ان کو نہیں دیکھا جو دعویٰ ایمان میں اس پر جو تیری طرف نازل کی گئی ہے اور تجھ سے پہلے۔ وہ ارادہ رکھتے ہیں کہ اپنے فیصلے طاغوت سے کرائیں حالانکہ ان کو حکم

يكفر به ويريد الشيطان ان يضلهم ضلالاً بعيداً

دیا گیا ہے کہ وہ اس کا انکار کریں اور شیطان چاہتا ہے کہ گمراہ کر کے ان کو دور بھٹکا دے۔

قرآن کی ان کھلی ہوئی تصریحات کے بعد یہ تصور باطل ہو جاتا ہے کہ قرآن اور سنت سیاسی معاملات میں ہماری کوئی راہ نمائی نہیں کرتے یا ہم کو کوئی دستور اساسی نہیں دیتے۔ ممکن ہے یہ کہا جاتے کہ ایسے دستور کا تحریری مجموعہ کہاں ہے؟ لیکن اگر دستور کے لئے تحریری مجموعہ شرط ہے تو کیا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ برطانیہ کا کوئی دستور اساسی موجود نہیں ہے حالانکہ برطانیہ کا پورا سیاسی اور قانونی نظام ایک دستور اساسی کا پابند ہے مگر نہ تو وہ تحریری صورت میں ہے اور نہ یکجا صورت میں چند اور متفرق منشور اعظم (MAGNA CHARTA) ۱۲۱۵ء کا قانون بندوبست (LAW OF SETTLEMENT) ۱۹۱۱ء کا قانون پارلیمنٹ یعنی (PARLIMENTARY ACT) ۱۹۲۸ء کا مساوی حق بالغ رائے دہی (EQUAL FRENCHISE ACT) اور چند ایسی دستاویزات کو چھوڑ کر اس کا نہ تو تحریری وجود ہے اور نہ مجموعی شکل لیکن پھر بھی برطانیہ کا مستحکم و پائیدار دستور اساسی ہے جو برطانوی قوم کی صدیوں پرانی رسوم و روایات پر انحصار کرتا ہے۔ بعینہ قرآن و سنت کا دیا ہوا دستور اساسی گو یکجا تحریری صورت میں قابل حصول نہیں مگر زندگی کے تمام معاملات میں توحید، رسالت، آخرت اور ایمان وغیرہ کی بنیاد و روایات پر اس کا وجود مسلم ہے۔

محمد اقبال سہیل (جدہ)

عالم اسلام میں علماء و مشائخ کی حالت زار
ایک عبرتناک مطالعہ و مشاہدہ

("فاران" کے شمارے وقتاً فوقتاً ملتے رہتے ہیں۔ آپ جس دردمندی اور قلب و روح کی گہرائیوں سے "نقش اول" تحریر فرماتے ہیں، بے اختیار بیت اللہ میں آپ کے لئے ہاتھ اٹھتے ہیں اور دل سے اس فرشتہ صفت انسان کے لئے دعا ہوتی ہے، اللہ زندگی و برکت دے آپ کو جزائے عظیم سے نوازے۔ "فاران" کے ذریعے حق و صداقت اور اخلاص و بے لوثی کی شمعیں روشن کئے ہوئے ہیں۔ مصر میں اخوان المسلمون پر ظلم و تعذیب اور وحشت و بربریت کا جو تیرہ دور چل رہا ہے اس سے عالم اسلام سخت مضطرب ہے۔ فرعونیت اور آمریت اس وقت اپنی پوری سیاہ کاریوں کے ساتھ ابھری ہے۔ مصر میں ان بزرگ بھائیوں اور بہنوں کو مسرت بھرا سلام جنہوں نے عزیمت و استقامت اور صبر و عزم کی آہنی راہوں کو اپنا کر اسلاف کی عظمت کی تابانیوں کو اس سیاہ دور میں از سر نو جلا دی۔ دل اشکبار ہے اور سخت بے چین ہے، اسی ضمن میں مصر کے فرعون جدید کے مظالم بیان کرنے کی بجائے ایک نہایت الم ناک اور عبرت خیز پہلو کی طرف توجہ دلانے کے لئے چند ٹوٹے پھوٹے سطور فاران کے لئے لکھ رہا ہوں۔ کاش، لوگ اس سے عبرت حاصل کریں!

(محمد اقبال سہیل - مکۃ المکرمہ)

واقعہ یہ ہے کہ اس قوم پر اس سے زیادہ دردناک عذاب نہیں ہو سکتا، جس قوم کے علماء اور دانشور اپنے عقیدہ و ایمان کی بنیاد کو [illegible] اور دین و تاریخ کے حرکت آفریں تسلسل سے اپنے آپ کو کاٹ لیں اور ذہنی و اخلاقی اعتبار سے ان کھائیوں میں جا گریں، جس سے کسی قوم پر اس سے زیادہ الم انگیز اور دردناک صورت نہیں ہو سکتی، جس قوم کے علماء و دانشور، علم و اخلاص کی اخلاقی بلندیوں سے گر کر انانیت، خود مرکزیت، گروہی عصبیت اور اجتماعی افتراق و انشقاق کی پستیوں میں جا گریں۔ قوموں کی زندگی میں یہ بڑے سخت دور ہوتے ہیں اور ایسے ہی موقعوں پر آفات و آلام کا نزول ہوتا ہے۔ ہماری اپنی تاریخ شاہد ہے کہ تاریخ کے جس مرحلے اور جس موڑ پر بھی ہمارے علماء نے اپنی ذمہ داریوں کی بلندیوں کو چھوڑ کر خود مرکزیت، گروہی عناد، حق ناشناسی اور بے ظرفی کا ثبوت دیا۔ وہیں وہ پامال ہی ہو گئے اور ملت بدنصیبی کے دھکوں سے چور ہوتی رہی۔

اجتماعیات کے نقطہ نظر سے انسانی سوسائٹی میں تمام سماجی و اجتماعی سرگرمیاں اور الجھنیں، آسودہ حالی اور خستہ حالی کے ذمہ دار علماء و دانشور ہیں اور فلسفہ تاریخ کے اعتبار سے قوموں کے عروج و زوال میں علماء و دانشوروں کا غالب حصہ ہے اس طبقے کی فکری بلندی، وسعت نظری اور اخلاق

مصر میں جمال عبدالناصر کی قیادت میں اباحیت، الحاد، آوارہ دماغی، شوریدہ فکری، اشتراکیت و قومیت اور دجل و فریب کے مرکب نام نہاد سازش یافتہ انقلاب کا حقیقی پس منظر، اس کے تدریجی مراحل اور اس کے پیچھے بین الاقوامی عوامل و مضمرات کے تجزیہ و تحلیل اور تفصیلی بیان کا یہ موقع نہیں ہے اور نہ اس سب کچھ کے نتیجہ میں مصر کی حیات انگیز تحریک، اخوان المسلمون پر تعذیب و ظلم اور جباریت کے نہایت المناک واقعات کا بیان کرنا مقصود ہے۔ لیکن جہاں یہ حقیقت ہے کہ اخوان المسلمون پر مظالم و بربریت کے سلسلے میں بین الاقوامی قوتوں کی عالمی اسلام دشمن سازشوں اور مصری آمریت کا پورا اشتراک رہا ہے، وہاں یہ بھی نہایت ہی تکلیف دہ امر واقعہ ہے کہ اس استبداد و وحشت اور مظالم کو مذہبی، علمی اور صوفیانہ گوارا [illegible] کرنے میں مصر کے بعض شیوخ، علماء، پیرانِ طریقت اور دانشوروں کا ایک خاص طبقہ بھی پیش پیش رہا۔ ان حضرات نے نہ صرف فتووں کے ذریعے ناصر کے استبداد و فرعونیت کو "جہاد" قرار دیا بلکہ اس انتہائی فاسد و بدترین حکومت کو خلافتِ راشدہ کے مماثل قرار دے ڈالا۔ اور بعض تو یہاں تک پہنچے کہ اس فرعونِ جدید کو خلفائے راشدین کے بعد خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا "اصل ہیرو" قرار دیا۔

ان بندگانِ شکم ——— علماء ——— نے ناصر کی فرعونیت کو اپنی روش سے جو غذا مہیا کی ہے وہ بڑی ہی تلخ حقیقت ہے۔ غضب خدا کا جن کا کام ظلم کی مخالفت تھا وہ ظلم کے دست و بازو بن گئے!

مصر میں اخوان المسلمون کی تحریک کو ان مولویوں اور پیروں کے ذریعے کچلنے کے بعد، ناصر اور اس کی حکومت نے آوارہ دماغ مفکروں، مغرب زدہ ادیبوں اور شوریدہ قلم لکھنے والوں کے ذریعے اسلام کی کتر بیونت شروع کر دی۔ من مانی تفاسیر اور خواہشات کے مطابق اسلام کے ہر اصول کا حلیہ بگاڑا گیا بگڑے ہوئے ادیبوں کے ذریعے اسلامی تاریخ کی بزرگ ترین اور محترم شخصیات کا شرمناک مذاق اڑایا گیا۔ سیدنا عمرؓ، سیدنا عثمانؓ، اور سیدنا علیؓ پر اشتراکیت اور قومیت کے نقطۂ نظر سے دلخراش حملے کئے گئے۔ شعائرِ دینی کا مذاق ایک مہم کے طور پر شروع کیا گیا۔ جب یہ فضا پیدا ہوئی تو اخوان المسلمون کے خلاف فتویٰ دینے والوں کی آنکھیں کھلیں۔ چونکہ تو علم و دانشوری کی گدی سرکتی نظر آئی۔ عوام میں شدید ردِ عمل ہوا، مزارعین اور خادمین گہری نفرت کا اظہار کرنے لگے، منہ بسورتے۔ ان علماء حق کی غیرت کو پکارا گیا۔ جب یہ حضرات کچھ بولے، بعض نے احتجاج کیا۔ اور دبے لہجے میں شکوہ و شکایت کا آغاز کیا، تو فوراً ہی اخبارات و رسائل میں ان شیوخ و علماء کے خلاف پروپیگنڈہ کیا گیا۔ انہیں برطانوی سامراج کا ایجنٹ قرار دیا گیا شیوخ و علماء کا خوب مذاق اڑایا گیا۔ یہ مرحلہ طے کرنے کے بعد مصری حکومت نے ان ہی میں سے بعض کو پکڑ کر جیل میں بند کر دیا۔ بعضوں کو گھروں میں پابند کر دیا۔ بعضوں کو وظائف دے کر لالچ کے طور پر باہر بھیج دیا۔ ان میں سے کچھ نے زیادہ سرکار یافتہ مصری ادیبوں اور صحافیوں کے خلاف بولا تو ان میں سے ایک صاحب کو دارالموت کے قید خانے میں قیام کے دوران ہی قاہرہ سے کچھ فاصلے پر بدترین جیل "طرہ" میں طرح طرح کے عذاب دے کر ختم کیا گیا۔ ان صاحب کے متعلقین نے جب ناصر کے پاس فریاد کی تو انہیں بھی خوفناک دھمکیاں دے کر خاموش کر دیا گیا۔ یہ معلوم ہونا چاہئے کہ یہ سب اب بڑے کام بڑی تدبیر اور منظم طریقہ کے ساتھ انجام پا رہا۔ ایک طرف مصری عوام پر خوف و دہشت طاری، باشعور سیاسی طبقہ پس زنداں اور تیسری طرف ملک کی سب سے بڑی تحریک اخوان المسلمون سپردِ دار، ایسے میں ان علمائے کرام اور مفتیانِ کرام کو ختم کرنا بہت آسان تھا۔ ان لوگوں کو اپنے مقصد و دعوت و رقابت و انانیت اور گروہ بازی کا خاطر خواہ پھل مل گیا۔ اس کے بعد جامعۃ الازہر پر حملہ کرنے کا راستہ ہموار ہو گیا۔ اس کی تطہیر کے نام پر خوب مرمت کی گئی۔ اس کی تاریخی اور بین الاقوامی حیثیت کا خاتمہ ہوا۔ اس کے تمام تعلیمی پروگراموں کو ناصری اشتراکیت کا لبادہ اوڑھا دیا گیا۔ اس کے علماء کا بار بار خاکہ اڑایا گیا۔

اور جمہوریت، اشتراکیت و قومیت کے نام پر اسلام کے خلاف، اسلامی تاریخ کے خلاف، اسلامی شخصیات کے خلاف ڈرامے کئے گئے۔ کہانیاں لکھی گئیں، ناول لکھے گئے، تصویری کارٹون شائع ہوتے رہے۔ ٹیلیویژن پر مذاق اڑایا گیا۔ مختلف ادارے اور انجمنیں بنا کر مصری اور غیر مصری نوجوان طلبہ کو رحلات پر لے جا کر لڑکیوں اور فاحشہ عورتوں سے ملایا گیا، ان عورتوں سے اخلاقی مزاج اور اسلامی روایات کے خلاف مذاق اڑانے کا کام لیا گیا۔

مجھے یاد آیا، ایک عالم دین جنہوں نے اخوان المسلمون کے خلاف فتویٰ دیا تھا خانقاہی مزاج رکھتے تھے، اور جو بظاہر بے حد نیک بزرگ تھے

اور اسی "نیکی" کی زیادتی کی بنا پر ہی اخوان کی دعوتِ اسلامی کے خلاف ہو گئے تھے۔ انہوں نے جب اخوان المسلمین کے ختم کئے جانے کے بعد مصری حکومت اور فرعونِ جدید کے "زہد دست کارنامے" دیکھے تو انہوں نے اپنی رائے بدل لی۔ اور عرفات نجی مجلسوں میں حکومت کی پالیسی "الاتحاد الاشتراکی العربی" کے سلسلے میں شکایت کے طور پر کچھ باتیں کیں۔ اس کے دوسرے روز انہیں اُن کے مکان سے گرفتار کیا گیا اور اس کے بعد ایک دُور دراز مقام پر پھینک دیا گیا جہاں اُن سے ایک پروجیکٹ میں بیگار کا کام لیا جاتا ہے۔ کچھ عرصہ متعلقہ جیل خانہ کے پاخانوں کو صاف کرنے کا کام بھی اُن سے لیا جاتا رہا۔ ان صاحب کے عزیز و رشتہ دار قاہرہ میں موجود ہیں اور اُن پر بھی کڑی نگرانی ہے۔ اخوان المسلمین کے خاتمہ پر مصر کے علماء و مشائخ پر کیا بیتی اور کیا بیت رہی ہے۔ کاش! ہمارے ملک کے لوگ اس سے سبق لے سکیں۔ کاش! یہ لوگ یہ حقیقت جان سکیں کہ اباحیت اور دین دشمنی کے اس نہایت ہی الجھے ہوئے دور میں خود علماء و مشائخ اور اُن کے اداروں کے لئے تحریکِ اسلامی دفاع کا کام دیتی ہے۔

اب شام میں سنیئے۔ شام میں حزب البعث کا زندقہ و الحاد کوئی چھپی بات نہیں ہے۔ حزب البعث کی اسلام دشمنی کی اس سے زیادہ اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ حزب البعث کے تحت حال ہی میں "ابولہب اکیڈیمی" قائم کی گئی ہے۔ جس کا کام قومیتِ عربیہ کے نقطۂ نظر سے عربی تاریخ کی نئے سرے سے تدوین ہے اور جس میں ابولہب کو قومیتِ عربیہ کا بطل قرار دیا گیا ہے۔ حزب البعث وہی حزب فاسدہ ہے جس میں مشہور مستشرقین بھی ہیں اور گویہ گرد اور آشفتہ سر قومی و اشتراکی ادیب بھی۔ یہ لوگ بیروت کے تمام سوشل پلیٹ فارموں کو اسلام کے خلاف پوری قوت سے استعمال کرتے ہیں ان کی زہر چکانیوں کا مرکز بیروت کا معروف اسلام دشمن ادارہ (INSTITUTE OF SOCIO POLITICAL STUDIES ON MIDDLE EAST) (المعہد الدراسات الاجتماعیۃ والسیاسیۃ عن الشرق الاوسط) ہے اس ادارے کا کام نہ صرف اسلامی تاریخ کو مسخ کر کے پیش کرنا ہے بلکہ اسلامی تعلیمات کا کھلم کھلا مذاق اُڑانا بھی ہے۔ عربی زبان کو اسلام کے اثر سے نکال کر بیروت کے اُن ادیبوں کے ذریعہ WHITE WASH کیا جا رہا ہے جو نہایت آزاد نکار اور بے مہار ہیں:

شام کی حزب البعث دراصل کارل مارکس کی روح خبیثہ اور وال سٹریٹ امریکہ کے ناجائز ملاپ کی پیداوار ہے اس پارٹی کی ہیئتِ ترکیبی اخلاقی زوال، آوارہ ذہنی، تشدد، سازش اور BACK DOOR گھناؤنی سیاست سے ہے۔ حزب البعث کا اعلیٰ طبقہ ... بعثی لوگوں پر مشتمل ہے یہ لوگ الحاد، کمیونزم اور آمریت پسند قومیت اور گروہ پرستی کے حامل ہیں اور اسلام کے سخت ترین دشمن۔ فرانسیسی استعمار نے شام میں مسلمانوں کے جن مرتد اور گمراہ ترین فرقوں کی سرپرستی کی تھی۔ اُن میں لبنان و شام کے دروزی اور فرقہ نصیریہ کے لوگ ہیں یہ دونوں فرقے حسن بن صباح کی باطنی کارروائیوں کے وارث ہیں اب انہی فرقوں میں سے ایسے عناصر بھی برآمد ہوتے ہیں۔ جو ایک وقت میں ملحد بھی ہیں، کمیونسٹ بھی ہیں اور امریکی بین الاقوامی یہودی و نوازانہ سیاست کے ایجنٹ بھی! مصر کے ناصر کی طرح ان کے ہاں بھی نعروں کا ڈھول اور الفاظ اور CATCH WORDS کا سراب ملتا ہے۔ یہ لوگ بیانات، خطابات اور نعروں پر جیتے ہیں اس تحریک کا ہدف شام میں درحقیقت یہ رہا ہے کہ شامی مسلمانوں کی دینی روح و مزاج کو کچل دیا جائے اگر اس سازشوں کا ایک خوفناک چکر چلا کر شام کو مستقل اضطراب سے دوچار رکھا جائے۔ تاکہ وہاں کے عوام کی طاقت اور دینی روح ... کا کسی طرح خاتمہ ہو۔ اور لبنان میں عیسائیوں کے جو اثرات ہیں اسے بڑھا کر شام کو بھی بین الاقوامی طاقتوں کی مدد سے نیم استعماری ریاست بنا دیا جائے اور اس طرح شام مسلمانوں کے ہاتھ میں نہ رہے۔

دوسری طرف شام کی دو اسلامی تحریکات "اخوان المسلمین" اور "شباب محمد" کو دراصل میدان سے ہٹانے کا راستہ یہی ہو سکتا تھا۔ چنانچہ دونوں بلاکوں کے مشترکہ عزائم سے فائدہ اٹھا کر "حزب البعث" کو تسلط و غلبہ حاصل ہوا اور اخوان و شباب محمد کی تحریکات کو خلافِ قانون قرار دے کر اُن پر ظلم و تعذیب کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ وہی ڈرامہ جس کے مناظر ہم مصر میں دیکھ چکے ہیں اور دیکھ رہے ہیں، ڈرامہ کے کردار دوسرے بہروپ میں جلوہ گر ہوتے سب کو جیلوں میں ڈالنے کے بعد سب سے پہلے شام کے سابق مفتی اعظم کو نکالا گیا اس کے بعد وزارت الاوقاف سے تمام اسلام پسند عناصر کو خارج

کیا گیا، جنہوں نے کچھ احتجاج کیا اُن کو جیل تاسیرون کے عارضی جیل میں بند کر دیا گیا۔ اس کے خلاف جب شام میں شدید ردِ عمل ہوا اور حمص و حماۃ و حلب میں مظاہرے ہوئے اور عوام نے شدید نفرت کا برملا اظہار کیا اور جمعہ کی نمازوں میں احتجاجی تقاریر ہونے لگیں تو حزب البعث کی "ترقی پسند قیادت" نے حمص و حماۃ کی مساجد پر بمباری کی۔ بے شمار لوگوں کو بے دریغ شہید کیا گیا۔ اس سارے دردناک واقعات کے دوران شام کے عام علماء و پیرانِ طریقت نہ صرف خاموش رہے بلکہ ایک بہت بڑے طبقے نے آگے بڑھ کر حزب البعث کا ساتھ دیا۔ اور اس طائفہ کے سرخیل شیخ کفتارو نے "اخوان المسلمون" اور "شباب محمد" جیسی دینی تحریکوں کے خلاف ان اقدامات کو عین اسلامی قرار دیا اور اخوان المسلمون کو اخوان الشیاطین لکھا۔ [illegible] اور خود حزب البعث کے انتہا پسند طبقہ نے بغاوت کی۔ یہ یاد رہے کہ اوپر کی ساری تخریب و بربریت حزب البعث کے معتدل پسند طبقہ کی سیاہ کاریاں تھیں۔ انتہا پسند طبقہ کے انقلاب کے بعد ہی کچھ علماء و مشائخ کے ساتھ شروع ہوا جو صرف کہ اُن علماء و مشائخ کے خلاف ہوا جو اسلامی دعوت و تحریک کی مخالفت کر رہے تھے، شیخ کفتارو اس وقت بے حال ہیں۔ اُن کے مخصوص حواریوں کی آنکھیں کھلیں تو انہوں نے دبے الفاظ میں احتجاج کیا اور ان سب کو گرفتار کر کے بند کر دیا گیا۔ شام اب کھلم کھلا الحاد و اشتراکیت کا پرچار کر رہا ہے۔ تحریک اسلامی کے مخالف مشائخ و علماء کے دن نہایت تنگی کے ساتھ گزر رہے ہیں۔

کتنے عبرت خیز اور سبق آموز ہیں یہ واقعات! کاش! علماء کرام سوچ سکتے۔ وہ گروہی تعصب اور نفسانی منفعت اور لالچ کی بنا پر کس طرح آسانی کے ساتھ حکومتوں کے آلہ کار بن کر دینی تنظیموں اور اسلامی تحریکوں کو کس قدر شدید نقصان پہنچاتے ہیں اور جب یہ تنظیمیں فنا ہو چکتی ہیں تو بعد میں یہ علماء بھی صاحبانِ تخت و تاج کی دارو گیر سے نہیں بچتے اور ان کو بھی معاف نہیں کیا جاتا!

پروفیسر افتخار احمد فخر دھولپوری (ایم اے)

جگر مُرادآبادی
فن، شخصیت اور شاعری

جگر ۱۸۹۰ء میں متوسط طبقہ کے ایک شاعر خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم بھی پرانی طرز پر ہوئی اگرچہ انہوں نے ہائی اسکول [illegible] انگریزی بھی سیکھی۔ فارسی یوسف زلیخا اور سکندر نامہ تک پڑھی، عربی سے ناواقف تھے۔ ایسے ماحول کا پروردہ ابتدائی شاعری جیسی ایک نو عمر [illegible] ہنے کی، سیدھی سادی حسن و عشق کی باتیں، جن میں نئے زمانے، نئے ذہن یا نفسیاتی الجھنوں کا گذر نہیں [illegible] کے صرف دو اشعار [illegible] کے [illegible] میں سوچنے کا جو انداز تھا اس کا پتہ چلانے کے لئے کافی ہیں ؎

کیا چیز تھی کیا چیز تھی ظالم کی نظر بھی — اُف کر کے وہیں بیٹھ گیا درد جگر بھی

جا بھی اے ناصح ناداں! نہ کر ان کو بدنام — ان جفاؤں سے تو خوشبوئے وفا آتی ہے

[illegible] نے کچھ غزلیں داغ دہلوی مرحوم کو اصلاح کے لئے بھیجیں جن کا شہرہ ہندوستان بھر میں بول رہا تھا۔ پھر زیادہ تر تسلیم مرحوم کے شاگرد رسا [illegible] کو اپنا کلام دکھایا۔ حضرت مرزا [illegible] امیر اللہ تسلیم سے بھی استفادہ کیا، اصغر سب کا اثر بھی انہوں نے قبول کیا۔ تاہم آہستہ آہستہ ان کا اپنا والہانہ انداز اور رنگ ابھرنے لگتا ہے، اظہار میں بھی سلیقہ آجاتا ہے اگر سطحیت باقی رہتی ہے [illegible] لب گئے، دامن بچا گئے۔ ؎

ساقی کی ہر نگاہ پہ بل کھا کے پی گیا — ان کو پیار آئے نہ آئے مجھ کو پیار آ ہی گیا۔

صاف ظاہر ہے کہ جذبہ کی شدت نے یہاں داغ کے رنگ میں نیا نکھار پیدا کر دیا ہے۔ [illegible] سرشاری، رندی اور لبوندگی کی وجہ [illegible] انفرادیت جھلکنے لگتی ہے اور اب ان کی آواز ہر کوئی پہچان سکتا ہے ؎

شیشے سے نہ رکھ مطلب اے ساقی میخانہ! — ان مست نگاہوں سے بھر دے مرا پیمانہ

جھک گیا ایک ایک میکش اس نگاہِ مست سے — تم ادھر دیکھا کئے اور لُٹ گیا میخانہ آج

شیشہ مست و بادہ مست و حسن مست و عشق مست

آج پینے کا مزہ پی کر بہک جانے میں ہے

سچ تو یہ ہے بزمِ ناؤ نوش جگر ہی کے دم سے قائم نظر آتی ہے ؎

مدتوں سے بے جگر سونا پڑا تھا میکدہ — پھر وہ دریا نوش رندِ تشنہ کام آ ہی گیا

فانی بہت پسند کرتے تھے ؎

یوں بسر کی زندگی ہم نے اسیری میں جگر
ہر طریقہ داخل آدابِ زنداں ہو گیا

فانی کے کلام سے جگر کے متاثر ہونے اور ان کے رنگ میں شعر کہنے کی مثال جگر کے درج ذیل شعر سے بخوبی نمایاں ہو سکتی ہے ؎

دن کٹ گیا ذکرِ تیرہ بختوں میں
ایک رات آئی ایک رات گئی

اور بھی اشعار کلام جگر سے فانی کے رنگ کے پیش کئے جا سکتے ہیں مگر یہ ایک شعر ہی کافی ثبوت ہے۔

مرحوم اصغر گونڈوی نے یوں تو داغ کے عہد کو ختم ہوتے دیکھا تھا تسلیم، مہدی مجروح، حسرت، صفی، عزیز، ریاض، فانی، یگانہ اقبال اور جوش کو بھی مگر جگر نے ان کے علاوہ اختر شیرانی، فراق، فیض احمد فیض، کو بھی اپنے سامنے ابھرتے دیکھا۔ چنانچہ نئے سلسلے نے ان کی شاعری کو نیا انداز اور نئے عنوان بھی عطا کئے۔ ترقی پسند تحریک بھی ان کے سامنے ہی ابھری اور بیٹھ بھی گئی۔ اس سے قطع نظر غالب کی طرح جگر نے ایک خونفشاں انقلاب اور خونی سیاست کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ۱۸۵۷ء نے جس طرح غالب کے کلام میں گہرے تاثرات نمایاں کر دئے تھے ۱۹۴۷ء کے انقلاب خونیں نے بھی جگر کی غزل کو رنگین تر بنا دیا۔ انہوں نے غزل ہی کے ذریعہ اپنے دور کی ترجمانی کی اور عوام کے دلوں پر گہرے نقوش مرتسم کئے جبکہ دوسرے شعراء کو اس کے لئے بڑی بڑی اور طویل تر نظمیں لکھنی پڑیں۔ اگرچہ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے چند نظمیں جگر نے بھی نظم کے حسن اور ضرورت کے پیش نظر کہیں مگر یہ ایک زندہ حقیقت ہے کہ غزلوں میں غالب کے بعد کوئی شاعر اس گہرائی تک نہ پہنچ سکا جہاں تک جگر کی دوربین نظر پہنچی، صرف اتنا ہی نہیں ان کی غزل کو میر کی سادگی و پرکاری، درد کا تصوف، مومن کی نقاب پوشیدہ خیال آرائی، داغ کی شوخی اور سوز و گداز قلب، اور اقبال کا تفکر بھی انہیں متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکا۔

جگر مرحوم کے ہاں اساتذہ سخن کے علاوہ نئے شعراء کی جھلکیاں بھی نمایاں ہیں۔ شراب سے توبہ کرنے کے بعد مومن و داغ کا رنگ تغزل تو کم ہو گیا مگر رندی و سرمستی اور ساقی کے تلازمے نے اس کی جگہ لے لی۔ کلام جگر میں شوخی اور تغزل کی چند جھلکیاں ملاحظہ ہوں ؎

حضورِ دوست یہی جرم زندگی ٹھہرا
جناب شیخ کو تھا زعم پاکیٔ داماں

ریاض اور داغ کی شوخی بھی ہے اور اپنا رنگ بھی ؎

رندوں نے جو چھیڑا زاہد کو ساقی نے کہا کس طنز سے آج
اوروں کی وہ عظمت کیا جانیں ؟ کم ظرف جو انساں ہوتے ہیں

اور وہ تغزل جس نے انہیں رئیس المتغزلین بنایا ملاحظہ فرمائیں کہ واقعتاً وہ رئیس المتغزلین کہلائے جانے کے حقدار بھی تھے ؎

تو مرے حال پریشاں پہ بہت طنز نہ کر
اپنے گیسو بھی ذرا دیکھ کہاں تک پہنچے !

لے کے خط ان کا، کیا ضبط بہت کچھ لیکن
تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں نے بھرم کھول دیا

ہم نے سینہ سے لگایا دل نہ اپنا ہو سکا
مسکرا کر تم نے دیکھا، دل تمہارا ہو گیا

کیا خبر تھی وہ بھی نکلیں گے برابر کے شریک
دل کی دھڑکن ہی کو اپنا رازداں سمجھا تھا میں

نازک کو توجہ میں اشارات کی وسعت
پلکوں سے تبسم میں کنایات کا عالم

ہشیار اے نگاہِ ستم آشنائے دوست
دل بھی ہے اک لطیف سا نشتر لئے ہوئے

کیا معلوم کہ میں اپنا پتہ، آپ بتاؤں؟
کیجئے کوئی بھول ہوئی خاص اپنی ادا دیکھ

شاعر نہ صرف اپنے ماحول کی پیداوار ہوتا ہے بلکہ وہ اپنے ماحول کا نمائندہ بھی، اپنے ماحول سے وہ آنکھیں بند کئے ہوئے گذر بھی نہیں سکتا۔

مولانا عبداللہ عباس ندوی

جمال ناصر کی حکومت سے بیزاری کیوں؟

یہ ایک سوال ہے جو ہم سے بار بار کیا جاتا ہے اور اس ضمن میں یہ باتیں بھی کہی جاتی ہیں۔

۱:- کیا صرف اس لئے کہ مصری حکومت نے الاخوان المسلمون کی تحریک کو کچل دیا اور چند اخوانی لیڈروں کو پھانسی دے دی — آپ مصری حکومت کے عظیم کارناموں کو فراموش کر دیتے ہیں۔

۲:- آپ یہ نہیں دیکھتے کہ سوئز کے قومیانے اور مغربی طاقت کے حملوں کا کس طرح پامردی سے مصر نے مقابلہ کیا اور بہ یک وقت انگریز، فرانس اور اسرائیلی طاقتوں کو شکست دی!

۳:- کیا آپ یہ نہیں دیکھتے کہ مصر نے اشتراکی نظام رائج کر کے کس طرح غریبی کو ختم کیا، لوگوں کا معیار زندگی بلند ہوا، عوامی بہبود کا کام کس درجہ تندہی و شوق سے وہاں جاری ہے!

۴:- کیا آپ کو یہ نہیں معلوم کہ مصری حکومت نے اسلام کی کتنی خدمت کی ہے، الازہر کا معیار بلند کیا۔ قرآن مجید کی تلاوت کے لئے ریڈیو کا ایک شعبہ کھول دیا جہاں دن رات تلاوتیں نشر کرتا ہے، قرآن پاک کے پلاسٹک ریکارڈ تیار کر کے دنیا بھر میں تقسیم کئے، الازہر اور وزارۃ الاوقاف کی متحدہ کوششوں اور سرمایہ سے تمام دنیا کے مختلف علماء بلائے جاتے ہیں تاکہ مسلمانوں کے مسائل پر غور و فکر کریں۔

۵:- آپ مصری حکمراں کو برا کہتے ہیں حالانکہ وہ اپنی ذاتی حیثیت سے ایک معیاری حکمراں ہے جو اب تک اس بنگلہ میں رہتا ہے جس میں لفٹنٹ کرنل کی حیثیت سے رہا کرتا تھا، اس کے لڑکے سائیکلوں پر اسکول جاتے ہیں اس نے جو کچھ کیا ہے وہ ملک و ملت کے لئے کیا ہے اس کا اپنا نہ کوئی سرمایہ ہے، نہ وہ اپنا بینک بیلنس رکھتا ہے۔

مذکورہ بالا باتیں بڑے تشدد کے ساتھ اور مختلف انداز سے بار بار دہرائی گئی ہیں جو لوگ حسن نیت سے ان باتوں پر یقین رکھتے ہیں ان کی خدمت میں قدرے تفصیل سے ان باتوں کا جواب پیش کرنا چاہتا ہوں۔

گفتگو شروع کرنے سے پہلے اس حقیقت کو ذہن میں تازہ کر لینا ضروری ہے کہ مصری حکومت یا حکمران سے ہمیں یا آپ کو اگر محبت ہو سکتی ہے تو صرف اس لئے کہ اسلام اور مسلمانوں کی خدمت میں وہ پیش پیش ہیں یا کم از کم اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کو ان سے نقصان نہیں پہنچ رہا ہے اور اگر نفرت ہے تو اس کا سبب بھی یہی ہو گا کہ ہمارے علم و اندازہ کے مطابق وہ اسلام دشمنی اور مسلم بیزاری کی راہ پر گامزن ہیں ——— اور اگر یہ نہ ہو یعنی "اسلامی اخوت" کا رشتہ تو ہمارے لئے مصر و شام ہو یا تھائی لینڈ اور پولینڈ سب برابر ہیں، جہاں

سے میری بلا سے بوم بسے یا ہما رہے

اس کے ساتھ اس حقیقت کو بھی سامنے رکھنا چاہئے کہ ہم دین کو انسان کا پرائیویٹ معاملہ نہیں تصور کرتے، ہمارے دین کا مطالبہ ہے کہ اپنے علاوہ

دوسروں کے دین کی بھی فکر کریں اگر اس راہ میں رکاوٹیں ہوں تو اس کو دور کرنے کی کوشش کریں رکاوٹوں کو دور کرنے کے لئے تمام جائز وسائل اور معروف طریقے اختیار کرتے رہے ہیں اگر اس کے لئے ضرورت پڑتی ہے تو ہم سیاست میں بھی حصہ لیتے ہیں سیاست ناپسندیدہ ہے اگر اس کے لئے عوامی سطح پر اترنا پڑے اور حرام ہے اگر دنیا طلبی اور شخصی اقتدار کے لئے ہو، لیکن اگر دین کی راہ میں رکاوٹیں دور کرنے کے لئے ہو تو بقول مفتی محمد عبدہ "شر لابد منہ" ایک ایسی برائی ہے جس سے چارۂ کار نہیں ہے۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد سے مغربی سیاست دانوں نے مذہب اور سیاست کے درمیان تفریق کا نعرہ لگایا، کلیسا کا حق کلیسا کو دو اور حکومت کا حکومت کو، یہ بنیادی طور پر مغربی طرز فکر تھی، یہی اصول مسلمانوں میں رائج کرنے کی کوشش کی گئی اور آل عثمان کے زوال و دولت کے بعد یہ مہم کافی تیز ہو گئی، مرحوم امیر شکیب ارسلان نے حاضر العالم اسلامی کے حواشی میں فصل الدین عن السیاسۃ کے عنوان سے اس نظریہ کی تاریخ بیان کی ہے۔

تیسری بات جو سمجھ لینا چاہئے وہ یہ ہے کہ آج روئے زمین پر کوئی حکومت ایسی نہیں ہے جو کسی کو پوجا پاٹ کرنے سے یا اپنے طریقہ پر اپنے معبود کی عبادت سے روکتی ہو یہاں تک کہ اگر آپ چیکوسلاویہ، یوگوسلاویہ، چین کا لٹریچر، اخبارات اور دستور پڑھیں تو آپ کو معلوم ہوگا وہاں گرجے، مسجدیں ہیں اور لوگوں کو اپنی عبادتیں اپنے طریقوں پر ادا کرنے کا حق ہے اختلاف جہاں بھی ہے اس امر میں ہے کہ مسلمان صرف اپنی عبادت پر اکتفا نہیں کرنا چاہتے دوسروں کو بھی عبادت پر مائل کرنا چاہتے ہیں۔ اپنی آئندہ نسل کے لئے بھی یہی خواہش رکھتے ہیں کہ وہ عبادت کرنے والی رہے، اس کی خاطر ان کو تبلیغ و تعلیم کا کام بھی کرنا پڑتا ہے، مدرسے کھولنا پڑتے ہیں، دعوت کا کام منظم کرنا پڑتا ہے پھر وہ (یعنی مسلمان) اپنی زندگی کا ہر کام عبادت سمجھتے ہیں، دوسروں کی مدد کرنا، انسانوں کی بہبود کی فکر رکھنا بھی اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ ان کے سامنے ان کے رسول کی حدیث ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے لئے ایک جسم کی مانند ہے جس کا کوئی عضو بھی درد والم کا شکار ہے تو جسم کے تمام اعضاء بے چین رہتے ہیں، لہٰذا جو حکومتیں اسلام کی کھل کر مخالفت کرتی یا در پردہ ان پر زندگی دشوار کرتی ہیں اس کا سبب صرف یہی ہے کہ مسلمان مذہب کو "پرائیویٹ معاملہ" کی سطح پر رکھنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

ان بنیادی باتوں کو سامنے رکھنے کے بعد آئیے مصری حکومت اور عوام کے فوجی حکمرانوں کے سلسلہ میں جو باتیں کہی جاتی ہیں ان کا جائزہ لیں۔

سوالات کو پھر سے دہرا لیجئے تاکہ جواب سمجھنے میں آسانی ہو۔

کیا صرف اس لئے کہ مصری حکمرانوں نے الاخوان المسلمون کی تحریک کو کچل دیا اور چند اخوانی لیڈروں کو پھانسی دے دی۔ آپ مصری حکومت کے عظیم کارناموں کو فراموش کر دیتے ہیں۔

ہم مصری حکومت کے "عظیم کارناموں" کو ہرگز فراموش نہیں کرتے ان "عظیم کارناموں" کی حقیقت تو ابھی آپ کے سامنے آئے گی، سردست یہ عرض ہے کہ آپ یہ کہنا کہ کیا "صرف" اس لئے ...... یہ بڑا ظالمانہ "صرف" ہے، یہ بات بالکل اس طرح کی ہے جیسے آپ ہندوستان کے مسلم دشمن عناصر کے بارے میں کہا جائے کہ کیا آپ کو ان سے "صرف" اس لئے شکایت ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کی بستیاں جلا کر خاک کر دیں، عورتوں کا اغوا کیا مردوں کو قتل کیا، ماؤں کی گود سے ان کے بچے چھین کر ان کے سامنے ذبح کر دئے ......!

• الاخوان المسلمون کی تحریک پورے مشرق اسلام کے لئے اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے آخری سرمایہ تھی، مصر کو اسلامی ثقافت و شرافت (جامعہ الازہر کی وجہ سے) جو مرکزی حیثیت حاصل ہے وہاں یہ ایک ایسی تحریک تھی جس نے گنتی کے چند برسوں میں فکری انقلاب برپا کیا، جہاں کبھی لوگ مسجدوں میں جانے سے شرماتے تھے، وہاں اخوان کے افراد ان کی تبلیغ کی بدولت کھیل کے میدانوں اور پبلک مقامات پر نماز باجماعت ہونے لگی، جہاں کی عریانیت مغرب کی عریانیت سے بازی لے گئی وہاں حیا اور عفت کا چلن شروع ہو گیا ہو، جہاں مسجد و خانقاہ کے واعظین بھی جنت کی نعمتوں کا ذکر کرنے سے شرماتے ہوں اور جنت و دوزخ کے ذکر میں ان کو غیر منطقی بات نظر آتی ہو، اس کی تاویلیں کر کے اپنی قابلیت اور روشن خیالی کا سکہ بٹھانا چاہتے ہوں وہاں کالج کے طلبہ کا پایا جانا جو شوق جہاد سے بے تاب ہوں اور فلسطین کی جنگ میں جاتے ہوئے یہ کہہ رہے ہوں کہ ہم کسی شئی کی خاطر اس لئے جا رہا ہوں کہ جو اس نے پیدا کی میری منتظر ہیں وہ مصر جس کی

انت خدا ہی کی زبانی صحافتہ الانخاذ ہ والمنصود دحدت کے ہجوم میں گردش کرنے والی صحافت ، لفظی ترجمہ چونکہ شرمناک اور خلاف تہذیب ہے اس
ہے نہیں دیا گیا) ہو رہا تھا اور عریاں رسائل کی فروخت کم ہو جائے اور مذہبی رسائل بکنے لگیں ، جہاں جنسی ناول لکھنے والے مجبور ہوں کہ وہ خلفائے راشدین اور
بدین اسلام کی سیرتیں لکھیں ، کیوں کہ بازار کی مانگ یہی ہو گئی تھی ، جب تحریک پر اوین حسد برطانوی اور امریکی حکومت نے نا سدق بن احمد فواد سابق والیٔ مصر
ذریعہ کرایا ہو ، کیونکہ ان کی پانچ سو سالہ کاوشوں پر پانی پھیر رہا تھا ، جس جماعت نے شہنشاہیت کے خلاف جہاد کی تیاری کی ہو ، اس جماعت کو کچل دینا " صرف "
معمولی بات ہے ؟ وہ بھی ایک مسلمان کے نزدیک ؟ یہ پورے مشرق وسطی اور تمام عرب ممالک کی دینی نشاۃ ثانیہ کو پھانسی دینے کے مترادف ہے ۔

خوانی شہداء ـــــ جن کی صحیح تعداد صرف اللہ کو معلوم ہے مگر جن کو علانیہ اور ایک عدالتی ڈرامہ کر کے تہ تیغ کیا گیا ، وہ صرف مصر کے نہیں
لم پورے عالم اسلام کی امانت تھے ، شیخ عبد القادر عودہ جیسا فاضل قانون دان صدیوں نہیں پیدا ہوتا ، شیخ فرغلی وہ تھے جن کو برطانوی سفارتخانہ زندہ
مردہ لانے والے کے لئے پچاس ہزار پونڈ مصری کا انعام دے رہا تھا ، سید قطب ، محمد قطب اور ان کی دو بہنیں ، ایسا خاندان کیوں بیدردی سے قتل کیا
یا ، سید قطب جن کی تحریروں نے بعینہ وہی جوش اور ایمانی زندگی لوگوں کے اندر پیدا کی تھی جو کبھی مولانا آزاد نے الہلال اور البلاغ کے زمانہ میں پیدا کی
نے بے شک یہ تھا کہ دس سال کی مسلسل قید بامشقت کے باوجود ان کے نقطۂ نظر میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ، تین سال کے لئے ان کو قید بامشقت سے قید
حض میں رکھ کر تصنیف و تالیف کا بھی موقع دیا گیا مگر وہ ان مراحم خسروانہ کے باوجود وہ اشتراکی نظام حیات کو اسلام پر ترجیح دینے اور صدر جمال
عبد الناصر کی مدح خوانی کے لئے تیار نہیں ہوئے ، اس کے بعد تقریباً ایک سال تک وہ عبد السلام عارف مرحوم کی سفارش پر جیل سے باہر بھی رکھے گئے ، جب کہ
و بیماری کی وجہ سے نقل و حرکت سے مجبور تھے مگر پھر بھی ان کی تحریریں ان کے عقیدے کی ترجمان رہیں ، یہ کیا بغاوت کم تھی کہ ان کی تحریر سے ایسا ذہن تیار
ہوتا ہے جو اسلام کو اشتراکیت پر ترجیح دیتا ہے ، آج ہندوستان میں شیخ عبد اللہ کے بارے میں متعدد بار ہندوستانی حکام کا یہ جملہ سنا گیا ہے کہ ان کے فکر
میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے اس لئے ان کو چھوڑا نہیں جا سکتا ، ان حکام کی منطق سراسر غلط ہے لیکن یہ حکام پھر بھی جمہوری قدروں پر ایمان رکھتے ہیں ، وہ
ن جرم میں شیخ عبد اللہ کو پھانسی نہیں دے رہے ہیں ، قید بھی سیاسی قسم کی ہے جس میں جسمانی تعذیب نہیں ہوتی ، پھر بھی آپ اس کو غلط اور جابرانہ کہتے
ہیں اس سے موازنہ کر لیجئے ، متحدہ عرب جمہوریت کے استبدادی نظام کو اگر مزید جمہوری اصول پر پرکھنا ہو تو میں سفارش کروں گا کہ آپ پی پی کے فاضل قانون
دان قاضی عدیل عباسی کا وہ مضمون پڑھیں جو اکتوبر سنہ ۱۹۶۶ء کی ۸ یا ۹ کو قومی آواز لکھنؤ میں شائع ہوا ہے اور یہ واضح رہے کہ قاضی صاحب موصوف صدر
جمال عبد الناصر کے نیک نیت مداح ہیں) ، دوسرا دل نہر سویز کو قومیانے اور سہ طرفی حملوں کو شکست دینے کے بارے میں کہا جاتا ہے اور جس کو
عظیم کارناموں میں سب سے زیادہ بڑا کارنامہ (عظیم تر) بتایا جاتا ہے ۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اگر یہ کوئی کارنامہ ہے تو اس کا " کریڈٹ " مصری حکمران کو
نہیں بلکہ روس کو جاتا ہے جس کی وارننگ نے برطانیہ کو گھنٹہ دکھا دیا تھا ، یہ بات محض پروپیگنڈہ اور سفید جھوٹ ہے کہ مصری فوج نے کہیں بھی برطانوی فوج کا مقابلہ
کیا تھا ، برطانوی فوج اپنی جیپ کاروں ، خیموں ، اور اسلحوں سمیت چھتریوں کے ذریعہ پورٹ سعید پر اتری اور کافی دن تک قابض رہی مصری فوج ان کو خراش تک
نہ پہنچا سکی ، سلامتی کونسل کی تجویز اور عالمی رائے عامہ کے دباؤ سے وہ واپس گئے ، اسرائیل کو اس حملہ سے تین بڑے فائدے ہوئے ۔

۱ ۔ خلیج عقبہ پر اسرائیل کا قبضہ ہو گیا جس سے اقتصادی ناکہ بندی ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی اور عربوں کے ہاتھ سے نہر سویز کے بعد دوسرے درجہ کی سب سے
اہم آبی شاہراہ نکل گئی ۔

۔ غزہ میں اسرائیل کی حفاظت کے لئے بین الاقوامی فوج تعینات کر دی گئی کہ اگر آئندہ بھی کبھی مصر میں ایسی حکومت قائم ہو جو واقعی اسرائیل کی دشمنی پر آمادہ
ہو تو حملہ نہ کر سکے ۔

۳ ۔ نہر سویز سے ہر ملک کے جہاز گزر سکتے ہیں جس میں اسرائیل بھی شامل ہے یہ ایک بین الاقوامی معاہدہ ہے جو مصر نے اقوام متحدہ سے کیا ہے ۔
برطانیہ ، فرانس اور اسرائیل کا مقصد اس حملہ سے مصر پر قبضہ کرنا نہیں تھا بلکہ اسرائیل کے لئے زیست کا کچھ سامان فراہم کرنا تھا ، اور اس مقصد میں وہ کامیاب رہے ،

تیسرا سوال :—

مصر میں اشتراکی نظام کے فوائد ، غریبی کا دور ہونا ، معیار زندگی بلند ہونا ، قومی بہبود کا کام ہونا۔

پروپیگنڈے سے ذرا الگ ہو کر واقعات کا جائزہ لیجئے یا ان سے دریافت کیجئے جنہیں واقفیت ہے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ :—

۱۔ مصر میں غریبی دور نہیں ہوتی ہے بلکہ بڑھ گئی ہے پندرہ سال پہلے وہاں کی فی کس آمدنی ۹، قرش سالانہ تھی جبکہ مصری پونڈ کی قیمت ایک شلنگ
ک پونڈ اسٹرلنگ ، ایک شلنگ) تھی اب ۱۹۶۵ء کی رپورٹ کے مطابق فی کس آمدنی ۷۸ قرش ہے جبکہ بین الاقوامی مارکیٹ میں مصری پونڈ کی قیمت
رف ۸ شلنگ رہ گئی ہے ، عام بازاروں میں آج کل مصری پونڈ کی جو قیمت ہے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ بیروت میں ۲ لیرے کا ایک مصری پونڈ فروخت
تا ہے اور سعودی عرب میں آٹھ ریال کا۔ یعنی ہندوستانی سکے میں پانچ روپے کا۔ جبکہ بنک میں اس کا نرخ ۱۳-۷ پاکستانی روپے ہے۔

آپ نے کئی سال پہلے یہ اخبارات میں پڑھا ہوگا کہ مصر نے اپنا احتیاطی سونا فروخت کر دیا۔ اقوام متحدہ کے مانیٹری فنڈ کی رپورٹ بابت شرق اوسط
سنہ ۱۹۶۵ء پڑھئے تو معلوم ہوگا کہ مصر کی اقتصادیات اس حال میں نہیں ہے کہ اس کو امداد کے علاوہ قرض کے نام پر کوئی رقم دی جا سکے۔ چودہ سال کی
ئی کی کاشت پیشگی فروخت ہو چکی ہے ، عرب ممالک نے مصر کے سامان کا عملاً بائیکاٹ کر رکھا ہے ، مصر کے تعلیم یافتہ مدرسین ، ڈاکٹر ، نرسیں ، انجینئر جن کی
پت عرب ممالک میں ہوتی تھی اب صرف خلیج فارس کے پسماندہ علاقوں تک محدود ہے ، سعودی عرب ، عراق ، اردن ، شام اور لیبیا تک نے ان سے
ماہدے کرنا بند کر دیئے ہیں ، الجزائر سے بن بلا کی حکومت ختم ہوتے ہی یہ لوگ اس طرح نکالے گئے جس طرح سقوط حیدرآباد کے بعد حضرمی عرب ایک جہاز میں
جا کر روانہ کئے گئے تھے۔ مصر کے بڑے بڑے شفا خانے جو سابق زمانوں میں انگریزوں کی مدد سے قائم ہوئے تھے کھوکھلے ہو گئے ہیں ان میں دوائیں تک نہیں
تیں ، یہ تفصیلات خود مصر کے رہنے والے بتاتے ہیں جبکہ انہیں اطمینان ہو جاتا ہے کہ کوئی دوسرا مصری ان کی بات نہیں سن رہا ہے۔

اب یہ سوال کہ آخر مصر کی دولت جاتی کہاں ہے ؟ کیا اسوان ڈیم کی تعمیر میں یا کارخانوں کے بنانے میں ، جواب یہ ہے کہ اسوان ڈیم کی تعمیر میں مصر
ایک قرش خرچ نہیں ہو رہا ہے بلکہ مصر کے مزدوروں کے لئے اب روزگار کا سامان ہو گیا ہے ، کارخانے ضرور بنائے گئے۔ جن میں سب سے بڑا کارخانہ موٹر سازی
تھا جو ناکام ہو گیا۔ روئی کے ۱۲ مل پہلے تھے اس پندرہ سال میں ۸ نئے مل کھلے ہیں۔ مگر دولت اس میں صرف نہیں ہوتی ہے ، دولت عرب ممالک کے اندر
زیر زمین سرگرمیوں میں صرف ہوتی ہے۔ صدر جمال عبدالناصر کے ذاتی پروپیگنڈے میں خرچ ہوتی ہے ایک مصری نوجوان نے مجھ سے بتایا کہ حکومت نے ٹیلی ویژن
سٹ چیکوسلاواکیہ سے خرید کر نصف قیمت پر (وہ بھی مصر کے کم قیمت سکے میں) اقساط پر لوگوں کو دیئے کہ صدر ناصر کی تقریریں سنی جا سکیں۔
حالانکہ اس وقت لوگوں کو ٹی وی سٹ کی نہیں بلکہ روٹیوں کی ضرورت تھی ، آج ہندوستان نے دو سال سے امریکی گیہوں لینا شروع کیا تو دنیا بھر میں
س کا شہرہ ہے اور ملک کی مختلف پارٹیاں اس میں عار محسوس کر رہی ہیں مگر آپ کو شاید معلوم ہو کہ آج ۶ سال سے امریکی گیہوں سے مصری عوام کی
پرورش ہو رہی ہے مصر کی آبادی میں سے ۸ آدمی امریکی گیہوں پر زندہ ہے یہ ہے اس معیار زندگی کی بلندی کا حال جس کا شہرہ آپ سنا کرتے تھے۔

مگر اس سلسلہ میں آپ ایک بات اور یاد رکھئے کہ دنیا میں "قانون ارتقاء"..... تسلیم شدہ حقیقت ہے ، اس گزشتہ پندرہ سال میں دنیا
کوئی ملک ایسا نہیں ہے جس نے ترقی نہیں کی ہو (ہندوستان نے تین پنج سالہ منصوبوں کے ذریعہ جو کام کیا ہے وہ آپ کے سامنے ہے) پاکستان میں
سینکڑوں مل بنے مگر مصر ہی پر کیا منحصر ہے ، سیلون میں ۱۲ ، برما میں ۱۲۵ ، ملیشیا میں ۱۸ نئے کارخانے بنے ہر ملک میں متعدد نئی یونیورسٹیاں
بنیں ، آباد کاری کا انتظام ہوا ، زراعت میں نئے آلات کے ذریعہ ترقی ہوئی ان میں اگر موازنہ کیجئے تو سب سے کم ترقی مصر میں ہوئی ہے۔ حالانکہ اگر
ترقی واقعی مناسب رفتار سے ہوتی بھی تو تعجب کی بات نہ تھی ، افغانستان ، سعودی عرب جہاں کی اقتصادیات کے بارے میں اب تک یہ کہا جاتا تھا
غیر ترقی یافتہ ، جامد اور ناہموار ہے وہاں بھی بے شمار اصلاحات ہوئی ہیں۔

اب آپ چوتھے سوال کا جائزہ لیں ، مصر کی اسلامی خدمات ، الازہر کا معیار بلند ہوا ، دنیا کا سب سے بڑا دار الاقامہ قاہرہ میں (مدینۃ ناصر)

قائم ہوا، قرآن کا ریڈیو گھر قائم کیا گیا۔ قرآنی تلاوت کے پلاسٹک ریکارڈ تقسیم کئے گئے" موتمر البحوث الاسلامیہ اور موتمر اسلامی کے جلسے کئے گئے۔

اگر معیار بلند ہونے کا مطلب در و دیوار کی بلندی نہیں بلکہ اسلامی تعلیمات اور اس کی روح کو سمجھنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کے امکانات کی بلندی ہے تو اس لحاظ سے الازہر پہلے سے کہیں زیادہ پست ہو گیا ہے، مخلوط تعلیم نے رہا سہا وقار بھی ختم کر دیا، الازہر کے علمائے کرام کا کام اب مدحیہ قصائد پیش کرنا، اسباب گاہ ناصری میں سیرت و تقدس کا تذکرہ کرنے کے علاوہ کچھ نہیں رہ گیا ہے آج وہ اشتراکیت کے عین اسلام ہونے کا فتویٰ دے رہے ہیں، کل یہی علماء تھے جو فاروق کی حمد و ثنا میں رطب اللسان تھے، ان کو مطلب اپنے گریڈ اور تنخواہ سے ہے، کبھی ان میں دینی حمیت وغیرت اُبھری تو منکرات پر کبھی انہوں نے احتساب زبانی بھی کرنے کی ہمت کی؟ کھلے بندوں توہین کا جواب بھی کبھی دے سکے جب کہ صدر جمال عبدالناصر نے برسر عام ۱۹۵۹ء میں اسکندریہ میں تقریر کرتے ہوئے ..... علمائے دین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے۔

" مجھے ان رجال الدین (علماء) سے کیا امید ہو سکتی ہے ان کے لئے ایک دیگ مدمس (مرغ روغن) کافی ہے"

سانامریاد فسفنیہ، حرم کا قیام، اگر عمارات اسلامی خدمت کا معیار ہے تو واشنگٹن کی مسجد المرکز الاسلامی بھی تو قابل ذکر ہے جس کا افتتاح آئزن ہاور نے کیا تھا۔ ۱۹۵۳ء میں اسرائیل نے اعلان کیا تھا کہ حکومت اپنے خرچ پر تل ابیب کی مسجد کی توسیع کر رہی ہے برطانوی حکومت نے اسلامک سنٹر کی مسجد بنانے کے لئے پانچ ہزار پونڈ دئے ہیں۔

یہی حال تلاوت نشر کرنے کا ہے، آپ کو معلوم ہے کہ بی بی سی لندن سے و گھنٹوں کا عربی پروگرام ہوتا ہے اس کے پروگرام کا افتتاح قرآن مجید سے ہوتا ہے، دنیا میں جہاں جہاں ریڈیو سے عربی پروگرام ہوتا ہے خواہ ماسکو ہو یا واشنگٹن ہو یا پیکن ہر جگہ سے تلاوتیں نشر ہوتی ہیں، اگر مقصد دعوت اور ترویج دین پیش نظر نہیں ہے تو ایسی تلاوت سے فائدہ؟ حدیث نبوی میں آیا ہے رب تال یتلو القرآن والقرآن یلعنہ قرآن کی تلاوت کرنے والوں میں کچھ ایسے بھی ہیں کہ وہ قرآن پڑھتے ہیں اور قرآن ان پر لعنت کرتا ہے۔

موتمر اسلامی اور موتمر البحوث الاسلامیہ کے بارے میں پہلے تو یہ سنئے کہ اول الذکر شاہ سعود، مرحوم غلام محمد اور [illegible] مصر کے اشتراک اور سعود بن عبد العزیز کی تحریک سے حجاز میں قائم ہوئی تھی اور اس کے سیکرٹری انور السادات بنائے گئے تھے، سعودیہ نے ایک ملین ریال دس لاکھ کا ابتدائی چندہ دیا تھا، اس کا مرکز قاہرہ بنایا گیا، یہ موتمر ۲ سال تک جاری رہی۔ موتمر کی طرف سے چند طلبہ کو وظائف دئے اور چند مدرسین ازہر کو بیرونی ممالک میں عربی پڑھانے کے لئے بھیجا گیا اب جبکہ رابطہ عالم اسلامی کا قیام عمل میں آیا تو اس کی ضد میں اس کا احیاء کیا گیا ہے۔ جس کی حیثیت مسجد ضرار سے زیادہ نہیں ہے۔ وزارۃ الاوقاف نے ایک مجمع البحوث الاسلامیہ قائم کیا تھا کہ موجودہ حالات میں فقہی مسائل پر از سر نو غور کیا جائے۔ مثلاً الکحل کا استعمال، ہوائی جہاز پر نماز، مردے کی آنکھوں کا استعمال، انشورنس وغیرہ وغیرہ جس مقصد کے لئے مجلس تحقیقات شرعیہ کا قیام ہندوستان میں اس کانفرنس سے دو سال پہلے عمل میں آ چکا تھا۔ اس کانفرنس کی کارروائیاں مصری علماء کی تحقیقات پر مشتمل تھیں، علمائے کرام کی ضیافتیں خوب خوب کی گئیں، انہیں سیر کرائی گئی اور صدر جمال عبدالناصر کے تجویز کردہ الایک ملادی، کا تجربہ کیا گیا۔ اس کانفرنس کا یا موتمر اسلامی کی کانفرنس کا مسلمانوں کے اجتماعی مسائل سے بالکل تعلق نہ تھا اس کو سیاسیات اور دوسرے ملکوں کے اندرونی معاملات، کہ کر بے دخل کر دیا گیا، بہرحال اگر یہ کام کچھ وزن رکھتا ہے تو ہمیں اس سے انکار نہیں، مگر اس طرح کی اور اس سے مفید تر مخلصانہ کوششیں افلاس اور ہر طرح کی تنگی و ترشی کے باوجود ہندوستان تک میں ہو رہی ہیں، پاکستان میں آئے دن بین الاقوامی کانفرنسیں احتفال العلماء ہوتے رہتے جن سے دین کی جو خدمت ہوتی وہ معلوم ہے!

آخری سوال یہ ہے کہ مصری حکمران کی زندگی میں جو سادگی پائی جاتی ہے وہ قابل ستائش ہے۔

جی ہاں ضرور ہے، اس حد تک ہم بھی تسلیم کرتے ہیں مگر یہ بھی جانتے ہیں کہ السید الرئیس کا سابقہ بنگلہ اب قصر جنت نشان ہو چکا ہے اور

اس روڈ کے تمام بنگلے بحق سرکار ضبط ہو چکے ہیں تاکہ الیہ الرئیس کی حفاظت کا انتظام ہو سکے۔

رہا یہ کہ بنک بیلنس نہیں ہے اور اپنے لئے کچھ نہیں کیا ہے تو اس کا حال ابھی کس کو معلوم جب تک کہ وہاں فوجی حکومت ہے کس کے جبڑے میں طاقت ہے جو آواز نکال سکے، ممکن ہے اس کی حقیقت بعد میں سامنے آجائے۔

یہ تو وہ باتیں ہو تیں جو آئے دن مصری حکمران کے ہوا خواہ کہا کرتے ہیں۔ اب سنئے مصر کی موجودہ حکومت سے نفرت کا اصلی سبب جو اخوان کے قتل سے زیادہ گہرا ہے اور جس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

موجودہ مصری حکومت نے اپنی سیاست کی بنیاد عرب نیشنلزم پر رکھی ہے۔ جس نیشنلزم نے عربوں کو مسلمانوں سے اور مسلمانوں کو عربوں سے کاٹ دیا، القومیة الفاصلة بين العرب والمسلمين، وہ قومیت جس کا نعرہ خالص جاہلی ہے اللہ اکبر و العزة للعرب اللہ بڑا ہے اور عزت صرف عربوں کے لئے ہے۔

اور یہ کہ

لا نعرف غير العربي۔
ہم غیر عرب کو جانتے ہی نہیں،

اور جس کی اصطلاحیں یہ ہیں۔

عرب لیگ کا ہیڈ کوارٹر	حرم العرب المقدس	عرب کا حرم مقدس
قومیت کو ماننے والے	مومن بالقومیہ	قومیت کے مومن
قومیت کے منکر	کافر عن القومیہ	کافر قومیت
قومیت کے نظریے سے پھر جانے والے	المرتد	مرتد
عرب لیگ کا چارٹر	مصحف القومیہ	صحیفۂ قومیت
صدر جمال عبدالناصر	{ نبي القومية	پیغمبر قومیت
	{ رسول السلام	پیغمبر امن
آپس کا سلام دعا	تحية العروبة	"عربیت کی جے"
افتتاح کے لئے	باسم القومية العربيه	شروع کرتا ہوں قومیت کے نام سے

چنانچہ عربوں اور مسلمانوں کے درمیان قومیت کی خلیج نے کس حد تک اثر ڈالا اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ آج عرب قومیت والوں کی دوستی کسی مسلم ملک سے نہیں ہے بلکہ اکثر بیشتر ان ملکوں سے ہے جہاں اسلام کی بیخ کنی ہو رہی ہے، قبرص میں ترک مسلمانوں کے مقابلہ میں عیسائیوں کا ساتھ دیا گیا، نائجیریا میں اسرائیل اور امریکہ کی ہمنوائی میں احمد بن بیلو کے خلاف سازش کی گئی، تیونس میں فرانس کی ہمنوائی کرتے ہوئے حبیب بورقیبہ سے دشمنی کی گئی۔ اسی طرح کسی اسلامی ملک یا مسلم آبادی کی کوئی حمایت کبھی کی گئی ہو تو بتا یئے، برخلاف اس کے لومبا کے قتل پر معلوم ہوتا تھا قاہرہ پر آسمان ٹوٹ پڑا ہے لیکن احمد بیلو کی شہادت پر صرف تین سطری خبر کہ فلاں شخص کا انتقال بندوقیہ قتل ہو گیا ——— نفرت کا سبب یہ ہے کہ مصر جو صدیوں سے اسلامی ثقافت کا مرکز چلا آرہا تھا آج مسلم بیزاری کا مرکز بنا دیا گیا ہے اور اس سے توقع تھی کہ وہ ہمارا ماہر تا مگر وہ دشمنوں کے اشارے پر کام کر رہا ہے اس لئے کہ ایک عرب شاعر کے ایک شعر پر ختم کرتا ہوں جس کا ترجمہ یہ ہے۔

ہم نے تمہیں اپنی ڈھال سمجھا تھا
مگر تم دشمن کے ہاتھوں میں پہونچ گئے اور اس سے ہمیں پر وار کر رہے ہو۔

غزل کی صحت مند قدروں کا آئینہ دار
ذوقِ جمال
از :۔ عنوان چشتی
جس کی غزلوں میں زخموں سے چمن کھلانے اور اشکوں سے چراغاں کرنے کا انداز ملتا ہے ۔
کتابت و طباعت معیاری ـــــــ کاغذ عمدہ ، مجلد
مع رنگین گردپوش ۔ قیمت صرف ۳ روپے
ملنے کا پتہ
سیدہ اختر ۔ اردو سماج ۔ جامعہ نگر ۔ نئی دہلی ۲۵
ماہنامہ نگار ، پاکستان کا سالنامہ ۱۹۶۶ء
اصنافِ ادب نمبر
دسمبر ۶۶ء میں شائع ہو رہا ہے جس میں داستان ، ناول ، افسانہ ، ڈرامہ ، سوانح نگاری ، تنقید ، انشائیہ ، سفرنامہ ، خطوط نویسی ، طنز و مزاح اور خاکہ نگاری کے فنی و عصری ارتقا پر اہلِ قلم کے مقالات ہوں گے ۔
صفحات تقریباً ۲۵۰ ـــــ قیمت تین روپے
تصانیف علامہ نیاز فتح پوری
قریبی بک سٹال یا مندرجہ ذیل پتہ سے طلب کریں ۔
ماہنامہ نگار پاکستان
۳۲ گارڈن مارکیٹ ۔ کراچی ۳
مسجد نبوی کے کبوتروں سے باتیں ، مدینہ کے پاک قالین سے التجائیں ، مدینہ کی بلیوں سے گفتگو ، مارزنگی کی یہ بھی کہانی کہتے ہوئے مصنف بھی روتا ہے قارئین کو بھی رلاتا ہے ۔
سفرِ حج
الفاظ کا جادو نہیں ، دل کی دھڑکنیں ہیں ، عازمین حج کے لئے رہبر ، حاجی صاحبان کے دل کی آواز ، نبی اللہ کے روضۂ پرنور فیوض و برکات اور کعبۃ اللہ پر انوار و تجلیات کے بے پایاں سمندر کی سچی عکاسی ۔
ہدیہ تین روپے
ملنے کا پتہ
الحاج غلام فرید قمر چشتی نظامی ، شیر شاہ کالونی کراچی ۲۸

رُوحِ انتخاب

مارکسی نظریۂ تاریخ اور زیادہ لغو ہے۔ یہ نظریہ اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ اقتصادی حالات ہی وہ اصل عامل ہیں جو انسان کی تعمیر و تشکیل کرتے ہیں۔ مذہب جس زمانے میں پیدا ہوا وہ جاگیرداری اور سرمایہ داری نظام کا زمانہ تھا، یہ چونکہ جاگیرداری اور سرمایہ داری نظام استحصالی اور لوٹ کھسوٹ کا نظام ہے۔ اس لئے اس کے درمیان پیدا ہونے والے اخلاقی و مذہبی تصورات بھی یقینی طور پر اپنے ماحول ہی کا عکس ہوں گے وہ لوٹ کھسوٹ کے نظریات ہوں گے۔ مگر یہ نظریہ علمی حیثیت سے کوئی وزن نہیں رکھتا ہے اور نہ تجربہ سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

یہ نظریہ انسانی ارادہ کی بالکلیہ نفی کر دیتا ہے اور اس کو صرف معاشی حالات کی پیداوار قرار دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کی کوئی مستقل حیثیت نہیں جس طرح صابن کے کارخانے میں صابن ڈھلتے ہیں اسی طرح آدمی بھی اپنے ماحول کے کارخانے میں ڈھلتا ہے وہ الگ سے سوچ کر کوئی کام نہیں کرتا بلکہ جو کچھ کرتا ہے اسی کے مطابق سوچنے لگتا ہے۔ اگر یہ واقعہ ہے تو مارکس، جو خود بھی سرمایہ دارانہ نظام کے اندر پیدا ہوا تھا، اس کے لئے کس طرح ممکن ہوا کہ وہ اپنے وقت کے حالات کے خلاف سوچ سکے۔ کیا اس نے زمین کا مطالعہ چاند پر جا کر کیا تھا۔ اگر مذہب کو پیدا کرنے والی چیز وقت کا اقتصادی نظام ہے تو آخر مارکسزم بھی وقت کے اقتصادی نظام کی پیداوار کیوں نہیں ہے۔ مذہب کی جو حیثیت مارکسزم کو تسلیم نہیں ہے، وہی حیثیت اس کے اپنے لئے کس طرح جائز ہوگی ——— حقیقت یہ ہے کہ یہ نظریہ اشتعال انگیز حد تک لغو ہے، اس کے پیچھے کوئی بھی علمی اور عقلی دلیل موجود نہیں۔

تجربہ سے بھی اس نظریے کی غلطی واضح ہو چکی ہے۔ روس کی مثال اس کو سمجھنے کے لئے کافی ہے جہاں تقریباً آدھی صدی سے اس نظریہ کو مکمل غلبہ حاصل ہے۔ طویل ترین مدت سے زبردست پروپیگنڈہ ہو رہا ہے کہ روس کے مادی حالات بدل گئے ہیں، وہاں کا نظام پیداوار، نظام تبادلہ، اور نظام تقسیم دولت سب غیر سرمایہ دارانہ ہو چکا ہے مگر اسٹالن کے مرنے کے بعد خود روسی لیڈروں کی طرف سے تسلیم کیا گیا ہے کہ اسٹالن کے زمانہ حکومت میں روس کے اندر جبر و ظلم کا نظام رائج تھا اور عوام کا اسی طرح استحصال کیا جا رہا تھا جیسے سرمایہ دارانہ ڈکٹیٹرشپ میں ہوتا ہے۔ اور اگر اس حقیقت کو سامنے رکھا جائے کہ روس میں پریس پر حکومت کا مکمل کنٹرول ہونے کی وجہ سے اسٹالن کے لئے یہ ممکن ہو سکا کہ وہ اپنے ظلم اور استحصال کو دنیا کے سامنے عدل و انصاف کے نام سے مشہور کرے اور پریس کا یہی کنٹرول اب بھی وہاں جاری ہے تو یہ بات بہ آسانی سمجھ میں آ جاتی ہے کہ آج بھی خوبصورت پروپیگنڈے کے پس منظر میں روس کے اندر وہی سب کچھ ہو رہا ہے جو اسٹالن کے زمانے میں ہوتا تھا۔ روسی کمیونسٹ پارٹی کی بیسویں کانگرس (فروری ۱۹۵۶ء) نے اسٹالن کے مظالم کا انکشاف کیا تھا۔ اس کے بعد اگر پارٹی کی چالیسویں کانگرس خروشچیف کی زندگی کا راز فاش کرے تو اس میں ہرگز اچنبھے کی کوئی بات نہ ہوگی [1] ——— آدھی صدی کے اس تجربہ سے جو نتیجہ نکلا ہے، اس کا مطلب صاف طور پر یہ ہے کہ پیداوار اور تبادلہ کی نام نہاد تبدیلی سے انسان نہیں بدل جاتے۔ اگر انسانی ذہن نظام پیداوار کا تابع ہوتا اور اسی کے مطابق خیالات پیدا ہوا کرتے تو اشتراکی حکومت میں ظلم اور استحصال کی ذہنیت بھی یقینی طور پر پیدا نہیں ہونی چاہئے تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ مذہب کے خلاف دور جدید کا پورا استدلال ایک قسم کا علمی مغالطہ (SCIENTIFIC SOPHISM) ہے اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ ان مذاہب و علمی مباحث کی حقیقت صرف یہ ہے کہ ——— "کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا بھان متی نے کنبہ جوڑا" یہ صحیح ہے کہ واقعات کے مطالعہ کے لئے، علمی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے مگر علمی طریقہ محض ایک طریقہ ہونے کی وجہ سے صحیح نتائج تک نہیں پہنچا سکتا، اس کے ساتھ ضروری ہے کہ بہت سی چیزوں کو ملحوظ رکھا گیا ہو، مثلاً اور صحیح اور مکمل معلومات، پھر اگر علمی طریقہ کو ترک کر دیا جائے تو وہ بظاہر علمی ہونے کے باوجود ناقص اور غلط نتیجہ ہی تک پہنچائے گا (علم جدید کا چیلنج ——— مولانا وحیدالدین خاں)

---

[1] اکتوبر ۱۹۶۴ء میں خروشچیف کی برطرفی اور اس کے بعد کے واقعات سے اس کی تصدیق ہو چکی ہے۔

ہماری نظر میں

مکتوب مدنی از حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ، ترجمہ : مولانا محمد حنیف ندوی، ضخامت ۶۴ صفحات، خوش نما ٹائپ، سبز کاغذ، قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے، ملنے کا پتہ :- ادارہ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور

آفندی اسمٰعیل بن عبداللہ الرومی ثم المدنی کوئی صاحب ہوں گے، جن کو حضرت شاہ ولی اللہ سے عقیدت اور اُن کے علم و تفقہ پر اعتماد تھا، انہی صاحب نے وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے بارے میں شاہ صاحب سے دریافت کیا، شاہ صاحب نے اس کے جواب میں ایک طویل خط لکھا جسے مولانا محمد حنیف ندوی صاحب نے اردو میں منتقل فرما دیا۔ یہ مباحث بڑے نازک اور دقیق ہیں، مولانا ندوی کے تبحر علمی اور فن کاری کا کرشمہ ہے کہ جو کتابچہ اس قدر فلسفیانہ و دقیق مضامین کا حامل ہے اسے اردو کا ایسا موزوں لباس پہنا دیا، جس میں کہیں جھول نظر نہیں آتا۔

حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ کی ذات شریعت و طریقت کے علوم کا گنجینہ ہے، اللہ تعالیٰ نے انہیں غیر معمولی ذہانت اور بصیرت عطا فرمائی تھی، یہی سبب ہے کہ جس موضوع پر قلم اُٹھاتے ہیں اُس کا حق ادا کر دیتے ہیں! ان تمام محاسن کے ساتھ اُن کی کتابیں معلومات و افکار، ودنکات و لطائف کا ذخیرہ بھی ہیں اور مشکل بھی ہیں، جن میں گل و لالہ اور جھاڑ جھنکار سبھی کچھ ملتا ہے۔

حضرت شاہ صاحب نے اگر صوفی خاندان میں پرورش اور تعلیم و تربیت نہ پائی ہوتی تو اُن کی ذہانت، جودت فکر اور تفقہ فی الدین کی صلاحیت و بصیرت سے بجا طور پر توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ شیخ محی الدین ابن عربی پر تنقید کرنے والوں میں سب سے پیش پیش ہوں گے، مگر ماحول اور خاندان کے عوامل کا یہ اثر تھا کہ وہ شیخ اکبر کے فلسفہ وحدت الوجود کے پیرو اور شارح کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں!

عجیب بات ہے کہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ شیخ اکبر کے فلسفہ "وحدت الوجود" کو غلط قرار دے کر اس کے مقابلے میں "وحدت الشہود" کو پیش کرتے ہیں، مگر حضرت شاہ ولی اللہ نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ شیخ اکبر اور حضرت مجدد صاحب نے ایک ہی جیسی بات کہی ہے، اُن دونوں کے نظریوں میں اختلاف اور تکراؤ نہیں ہے! وہ فرماتے ہیں :-

"خلاصہ بحث یہ ہے کہ یہ کہنا کہ حقائق ممکنات در اصل عکوس و ظلال ہیں، جو اعدام متقابلہ میں ارتسام پذیر ہوتے ہیں، کسی طرح بھی شیخ ابن العربی کی تصریحات کے خلاف نہیں" (ص ۳۴)

کوئی شک نہیں اپنے اس مکتوب میں حضرت شاہ صاحب نے وحدت الوجود اور وحدت الشہود کو متحد المعنیٰ ثابت کرنے میں کمال درجہ کی ذہانت اور باریک بینی کا ثبوت دیا ہے، مگر اس سعی بلیغ کے باوجود اُن کے ذہن میں یہ کھٹک باقی رہتی ہے کہ :-

"باقی رہی یہ بات کہ حضرت مجدد نے شیخ العربی اور اُس کے بعض اتباع کے اقوال کو اپنے وجدان کے خلاف محسوس کیا ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، یہ ایک ایسی لغزش ہے جس کا کشف کی لغزش سے کوئی تعلق نہیں"

(ص ۴۱)

قرآن پاک مخلوق اور خالق کے درمیان نسبتِ خلق، معبود و عبد کے مابین نسبتِ عبدیت، اسباب و مرتب کے درمیان صفتِ ربوبیت کا پتہ دیتا ہے، فکر و نظر اور عقیدے کی اس سادگی میں کوئی الجھاؤ نہیں! اعیان، حقائقِ ممکنہ، اعیانِ انتزاعی، تنزلات و ماہیات . . . ان اصطلاحات میں بڑی پیچیدگیاں اور تکلفات ہیں!

؎ ایں رشتہ بہ انگشت نہ پیچی کہ دراز است

یہ کتاب کوئی شک نہیں اپنے موضوع پر بڑے معرکہ کی کتاب ہے جس نے اردو ادب کی علمی ثروت میں قابلِ ذکر اضافہ کیا ہے، کتاب کا نام "مکتوب مدنی" پڑھ کر ایسا محسوس ہوا جیسے مولانا حسین احمد مدنی مرحوم کا لکھا ہوا کوئی خط کتابی صورت میں مرتب کیا گیا ہے، ہماری ناقص رائے میں اس کتاب کا نام "وجود و شہود" ہونا چاہئے!

اَدب منزل بہ منزل

از: سیدہ انیس فاطمہ بریلوی، ضخامت ۲۴۴ صفحات (مجلد) قیمت چھ روپے۔
ملنے کا پتہ:- اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس ناظم آباد، کراچی

محترمہ سیدہ انیس فاطمہ بریلوی مشہور ماہرِ تعلیم اور مصنف و مورخ جناب سید الطاف علی بریلوی کی شریکِ حیات ہیں، میاں بیوی دونوں خوش ذوق، اہلِ قلم، سنجیدہ نگار اور علم و ادب کے شیدائی واقع ہوئے ہیں، سیدہ انیس فاطمہ کی کئی کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں اُن کی اس کتاب "ادب منزل بہ منزل" پر ڈاکٹر محمد احسن فاروقی نے عالمانہ مقدمہ لکھا ہے جو کتاب کے شایانِ شان ہے۔

"ادب منزل بہ منزل" ——— سترہ ابواب پر مشتمل ہے جن کے عنوانات حسبِ ذیل ہیں:—

کشفی اور روحانی ادب ——— لافانی ادب ——— دلی میں اردو ——— لکھنؤ میں اردو ——— اردو پر انقلابِ ۱۸۵۷ء کا اثر ——— پنجاب میں اردو ——— علی گڑھ تحریک ——— ڈپٹی نذیر احمد ——— مولانا حالی ——— علامہ شبلی ——— اکبر الہ آبادی ——— مولانا محمد علی جوہر ——— مولانا ظفر علی خاں ——— مولانا ابوالکلام آزاد ——— علامہ اقبال ——— مولانا طفیل احمد منگلوری ——— ترقی پسند ادب۔

اس کتاب کے بیشتر ابواب نقد و تبصرہ اور ادب و انشاء کے اعلیٰ نمونے ہیں، ان مضامین کے مطالعہ کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اُردو ادب کی پوری تاریخ ذہن و فکر کے سامنے مجسم ہو گئی، تحریر میں کس قدر روانی اور شگفتگی پائی جاتی ہے، کتنے سلیقہ کے ساتھ مفہوم و مافی الضمیر کو ادا کیا ہے طنز میں کہیں کہیں شوخی بھی آگئی ہے مگر متانت و سنجیدگی کے حدود میں رہ کر!

سیدہ انیس فاطمہ غور و فکر اور مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہونچی ہیں کہ دنیا میں ادب کا آغاز اشعار سے ہوا اس واقعہ کو کس قدر شاعرانہ انداز میں بیان فرماتی ہیں:———

"ادب کی یہ پہلی اکائی تھی جو اشعار کی صورت میں دنیا کے سامنے نمودار ہوئی"

زندگی حسین کب ہوتی ہے؟ اس کا جواب لائق مصنفہ کی زبان سے سنئے:—

"زندگی صحیح معنیٰ میں اُس وقت حسین کہلائے جانے کی مستحق ہوتی ہے، جب کہ وہ کسی مثبت مقصد کے لئے معروفِ تگ و تاز ہو"

۱۸۵۷ء کے بعد دلی کا کیا حال ہوا اور مسلمانوں پر کیا بیتی؟ اس کی اس درجہ اثر انگیز تشریح، صرف چند لفظوں میں:—

". . . دعا کی قبولیت کا وقت گزر چکا تھا اور در توبہ پر پہرے بیٹھے ہوئے تھے،

اور ——— پھر

"خدا اس تنزلی دور کا تصور کیجئے، جہانبانی اور جہانداری کا آفتاب لبِ بام آچکا ہے، سارے قدریں ایک

ایک کرکے دم توڑ رہی ہیں، رنجیدی اور مجبوری کے اضطرابی لمحات میں "زہرِ عشق" — فسانۂ آزاد اور "طلسمِ ہوشربا" نہ لکھتے تو کیا لکھتے" — (لکھنؤ میں اُردو)

مرزا رسوا کو خراجِ عقیدت کس شان کے ساتھ پیش کیا ہے :—

"دبستانِ لکھنؤ نے ادب کے نام پر جو بے ادبیاں کی ہیں، وہ مرزا رسوا کی اس ادبی تخلیق کے صدقہ اور طفیل میں یقیناً اس قابل ہیں کہ انہیں معاف کر دیا جائے۔"

علامہ شبلی پر جو مضمون لکھا ہے، اُس کا یہ "ادب پارہ" دراصل "شہ پارہ" ہے :—

"انہوں (شبلی) نے اپنی تحریروں اور شاعری کے ذریعے مسلمانوں کو یقین دلایا کہ تمہاری عظمتوں کے چراغ ابھی گل نہیں ہوئے ہیں، صرف روشنی مدھم پڑ گئی ہے، ذرا اپنے دلوں کو دوبارہ دولتِ ایمان سے گرماکے دیکھو دنیا کے منصبِ امامت کا تمہارے سوا اور کون مستحق ہو سکتا ہے۔"

——— اور ———

"شبلی ان تمام مقاموں سے اونچے ہیں، جو وقت اور زمانہ نے اُن کے لئے تجویز کئے تھے" مولانا ظفر علی خاں پر صرف یہ ایک جملہ، اُن کے "شعور ادب" کی خصوصیات کا عکاس و ترجمان ہے :—

"انہوں نے ہمیشہ کوہ آتش فشاں کے دہانے پر بیٹھ کر اپنے افکار و آلام کو قلمبند کیا"

دوسرا رُخ :—

"بھائی چارگی کے سارے بندھن ایک ایک کرکے ٹوٹ جاتے ہیں" (ص ۴۴) "بھائی چارے" لکھنا چاہیے تھا "بیچارہ" سے جس طرح "بیچارگی" بنا ہے، اس قاعدہ کے تحت "بھائی چارے سے" "بھائی چارگی" اُردو میں مستعمل اور مروج نہیں ہے — "نتائج سے بے پرواہ ہو کر" (ص ۴۱) کتاب میں کئی جگہ "پرواہ" پڑھنا پڑا، "پروا" اور "بے پروا" املا درست ہے ! "پروا" کے ساتھ اُردو میں "ہ" (پرواہ) کا اب چلن نہیں رہا۔

"یہ ایک ایسی تصنیف یا تخلیق ہے، جس نے اپنے عہد کے متنوع نظریات سے ٹکرا کر اپنا مقام پیدا کیا" (ص ۵۸) محمد حسین آزاد کی "آبِ حیات" کی یہ تعریف عجیب ہے کہ اُس نے اپنے عہد کے گوناگوں نظریات سے ٹکر لی تھی — "اور عرقِ انفعال سے پانی پانی ہو جاتے" (ص ۵۸) یہ تو "شب سیلۂ الفقد" والی بات ہوئی، اس جملہ میں "عرق" زاید ہے — "تیغ گھونٹوں کو زبردستی نگلنا ہی پڑتا ہے" (ص ۶۶) گھونٹوں کے ساتھ "نگلنا" محلِ نظر ہے "اُتارنا" لکھنا تھا، — "ایک نئی زبان کی اساس پڑی" (ص ۱۰۰) "بنیاد پڑی" کا محل تھا، "اساس پڑنا" معناً صحیح ہے، مگر وجدان کو کھٹکتا ہے —

"ریاض خیرآبادی کا شعر ہے :—

وہ سامنے ہیں نظام حواس برہم ہے
یہ آدھی رات کو اُن کا پیام آیا ہے
ہم آ نہیں سکتے اب انتظار نہ ہو (ص ۲۱۲)

یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے، پہلا مصرعہ تو اصغر گونڈوی کا ہے، پورا شعر یوں ہے —

وہ سامنے ہیں نظام حواس برہم ہے — نہ آرزو میں سکت ہے نہ عشق میں دم ہے

کتاب کا آخری مقالہ "ترقی پسند ادب" ہے، جس میں نام نہاد "ترقی پسند ادب" کا بڑی دیدہ وری کے ساتھ تجزیہ کیا گیا ہے! یہ اللہ تعالیٰ

کا فضل ہے کہ سیدہ امیں فاطمہ نے عصمت چغتائی اور قرۃ العین کی راہ اختیار نہیں کی اور اُن کا قلم ادب و اخلاق کی ترجمانی کے لئے وقف ہے۔

عرفات

مجلس ادارت:۔ قاضی عبدالقادر، عشرت حسین، ظہیر احمد نیازی، محمد اسحٰق صدیقی۔ ضخامت ۲۰۰ صفحات (سرورق خوشنما آرٹ پیپر)

کتابت وطباعت انتہائی دیدہ زیب ملنے کا پتہ:۔ سیرت کمیٹی پاکستان نیشنل آٹو لمیٹڈ، کانڈھا والا بلڈنگ، گارڈن روڈ، کراچی

پاکستان نیشنل آٹو لمیٹڈ کی سیرت کمیٹی نے دوسری سیرت کانفرنس پر یہ کتاب پیش کی ہے جو سیرت پر اردو انگریزی مضامین و مقالات سے مزین ہے، ہر مضمون اپنی جگہ خوب سے خوب تر ہے، مضامین میں تنوع کے ساتھ اس گراں قدر اخلاقی و ادبی پیشکش کا حسن ترتیب بھی قابل تعریف ہے، مجلس ادارت جس کے لئے تبریک و تحسین کی مستحق ہے!

پاکستان میں کتنے ادارے ہیں جو رقص و سرود کی محفلیں برپا کر کے اپنے شوق کی پذیرائی کے اسباب مہیا کرتے ہیں! پاکستان نیشنل آٹو لمیٹڈ کو آفریں و مرحبا کہ وہ سال کے سال انسانیت کے محسن اعظم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سیرت کانفرنس کا اہتمام کرتی ہے، یہ سعادت ہر کسی کو کہاں میسر آتی ہے۔

مولانا محمد احسن نانوتوی

از:۔ محمد ایوب قادری (ایم۔ اے) ضخامت ۲۰۸ صفحات، قیمت چار روپے

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ عثمانیہ ۲۳۵۔ پیر الٰہی بخش کالونی کراچی ۵

جناب محمد ایوب قادری (ایم۔ اے) تذکرہ نگاری میں خاص شہرت رکھتے ہیں، اس فن سے اُن کو طبعی مناسبت ہے اور اس میں انہوں نے بڑا نام پیدا کیا ہے! زیر تنقید کتاب میں صاحب موصوف نے مولانا محمد احسن نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ (ولادت تقریباً ۱۸۲۵ء ۔۔۔ وفات ۱۸۹۴ء) کے سوانح حالات بڑی محنت اور تحقیق کے ساتھ مدون کئے ہیں!

کہنے کو تو یہ ایک فرد واحد کی سوانح عمری ہے مگر اس تذکرے میں اُس دور کی علمی تاریخ کی جھلکیاں جگہ جگہ ملتی ہیں، ضمیمہ میں بیش بہا معلومات درج ہیں ۔۔۔

"مطبع مجتبائی دہلی" اور اس کے مالک مولوی عبدالاحد کا نام علمی و مذہبی حلقوں میں خاصہ مشہور ہے، اس کتاب سے پہلی بار اس کا علم ہوا کہ مولوی عبدالاحد مرحوم، مولانا محمد احسن نانوتوی کے ربیب تھے!

مولانا محمد احسن نانوتوی کے مطبع صدیقی بریلی میں جو کتابیں چھپی ہیں، اُن کی تفصیلات نے اس کتاب کو خاصہ وقیع اور معلومات آفریں بنا دیا ہے

یہ بات ہم نے بارہا ثقہ و معتبر لوگوں اور کتابوں میں پڑھی بھی ہے کہ سر سید احمد خاں مولانا مملوک علی کے شاگرد اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کے ہم سبق تھے، مگر اس کتاب میں اس واقعہ کی تردید کی گئی ہے ۔۔۔

"مولانا عبید اللہ سندھی نے مولانا مملوک علی کے تلامذہ میں سر سید احمد خاں، ڈپٹی نذیر احمد اور مولوی ذکاء اللہ کو بھی شامل کیا ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا سندھی نے کوئی حوالہ نہیں دیا ہے، غالباً آخرالذکر حضرات کو تو اس لئے فہرست میں شامل کر لیا ہے کہ یہ حضرات دہلی کالج کے تعلیم یافتہ ہیں مگر معلوم نہیں سر سید کو کس طرح ان کا شاگرد لکھ دیا، سر سید احمد خاں تو دہلی کالج کے طالب علم بھی نہیں رہے، سر سید احمد خاں نے آثار الصنادید ۱۸۴۶ء میں مرتب کی اور اس وقت مولانا مملوک علی زندہ تھے انہوں نے اس میں کہیں تلمذ کا ذکر نہیں کیا۔۔۔"

ایک دوسری غلطی کی تصحیح ۔۔۔

"مولانا امداد صابری صاحب نے مولانا محمد یعقوب نانوتوی کی تاریخ وفات ۲۹ ذی قعدہ ۱۲۸۳ھ لکھی ہے اور ایک قطعہ تاریخ بھی نقل کیا ہے، صابری صاحب کا یہ بیان درست نہیں ہے، مولانا امداد صابری صاحب کو تسامح ہوا ہے ذیقعدہ ۱۲۸۶ھ

میں شاہ محمد اسحٰق نبیرہ شاہ عبدالعزیز کے چھوٹے بھائی شاہ محمد یعقوب (دہلوی) مہاجر مکی فوت ہوتے تھے :

——— اور ———

محمد طاہر برقی میاں نور مولانا مناظر احسن گیلانی نے شاہ مت شاہ آبادی (وفات ۱۰۰۸ھ) کی اولاد لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے:

ان اقتباسات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ فاضل تذکرہ نگار کسی سنین وواقعات سے کس قدر باخبر ہیں اور آن کا مطالعہ کتنا وسیع ہے :

یہ کتاب تذکرہ نگاری کا اچھا نمونہ ہے۔ محترم محمد ایوب قادری صاحب نے تذکرہ نگاری کی صنف میں اپنا مقام پیدا کر لیا ہے :

امیر خسرو بہ حیثیت ہندی شاعر

از :- ڈاکٹر صفدر آہ ، ضخامت ۲۰۰ صفحات (مجلد) قیمت دو روپے

ملنے کا پتہ :- علوی بک ڈپو محمد علی روڈ ، بمبئی ۳

جناب ڈاکٹر صفدر آہ اردو زبان کے خاصے مشہور شاعر اور تذکرہ نگار ہیں اُن کی اس کتاب کا موضوع حضرت امیر خسروؒ کی ہندی شاعری ہے : کتاب کے بعض اہم عنوانات :-

خسرو کا ہندی کلام کیوں ضائع ہوا ؟ ——— خسرو کے کلام میں تضادات ——— خالق باری ——— محمود شیرانی اور خالق باری ——— شیرانی صاحب کے غلط اعتراضات ——— خسرو کے ہندی کلام کے متعلق تصنیفات -

کوئی شک نہیں اپنے موضوع پر یہ کتاب خوب ہے اور عالمی تحقیق کے ساتھ مرتب کی گئی ہے ! ڈاکٹر صفدر آہ نے لکھا ہے :-

" خسرو کی مادری زبان کو دہلوی ہندی کہنا چاہئے "

امیر خسرو کے بعض دوہے اور پہیلیاں جو اُن سے منسوب ہو گئی ہیں ، فاضل تذکرہ نگار نے اس غلط انتساب کی تصحیح فرمائی ہے ، مثلاً :-

نیکھا ہو کر میں ذلی ساتی تیرا چاؤ
منجھ ٹلے جنم گیا تیرے لیکھن چاؤ

ڈاکٹر صاحب اس دوہے کا خسرو سے انتساب صحیح نہیں سمجھتے ،

امیر خسرو کے اس مشہور دوہے ———

گوری سووے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے سانجھ بھئی چودیس

کے بارے میں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ " کاتب نے اسے ناقص اور ناموزوں بنا دیا ہے " اس کا سبب یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے نہ جانے کس کتاب میں " سیج " کی جگہ " پینگ " پڑھ لیا ، جس کی وجہ سے مصرعہ اولیٰ ناموزوں ہو گیا ! دوسرے مصرعہ میں " سانجھ بھئی " کی بجائے ڈاکٹر صاحب نے " سانجھ ٹیک " لکھ ہے ،

شمس اللہ قادری نے اُردوئے قدیم میں یہ غزل :-

خواہش دم نار شدم لٹ گیا
دو غم ہجر تو کمر ٹوٹ ہے
یار نہیں دیکھتا ہے سوئے من
بے گناہ ہم ساتھ عجب روٹھ ہے

سنہ کہیں کہیں کتابت کی غلطی کے سبب سنین لکھنے میں تسامح ہو گیا ہے مثلاً ۱۲۶۳ھ کی جگہ ۱۱۶۳ھ چھپ گیا (ص ۵۵)

خسرو سے منسوب کی ہے، ڈاکٹر صفدر آہ نے اس پر سخت گرفت کی، فرماتے ہیں :-

"یہ غزل کاہے کو سخن پن ہے"

خالق باری کو ڈاکٹر صاحب موصوف امیر خسرو کی کتاب تسلیم کرتے ہیں، اور پروفیسر شیرانی کی رائے کو بے وزن سمجھتے ہیں -

"مرحوم پروفیسر شیرانی نے بڑی کوشش اور کاوش سے ایک کتاب خالق باری پر لکھی ہے جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مشہور و معروف ہندی نظم خالق باری امیر خسرو کی تصنیف نہیں ہے، میں شیرانی صاحب کی نکتہ رسی کا بدل مدح ہوں، لیکن اُن کی اس تصنیف میں محققانہ نکتہ سنجی سے زیادہ اپنے مفروضہ نظریے کے لئے توجیہہ تراشی گئی ہے ......"

اور

"حیرت ہے کہ ایسے مجہول الحیثیت نسخے کو اپنے نظریے کی بنیاد بنا کر شیرانی صاحب نے خالق باری کو ۱۰۳۱ھ کی تصنیف قرار دیا ہے اور اس کے مصنف کا نام ضیاء الدین خسرو مان کر ارشاد فرمایا ہے کہ تجانس اسمی کی وجہ سے یہ کتاب امیر خسرو کے نام سے مشہور ہو گئی ہے"

"سات سو سال کی تخریب کاری" (ص ۵) "تخریب" کے ساتھ "کاری" زائد معلوم ہوتا ہے ---- "خسرو کی ہندی شاعری تو ایک طرف، ان کی فارسی شاعری پر ابھی تک کوئی فاضلانہ مضمون اردو میں نہیں لکھا گیا" (ص ۸۹) ڈاکٹر صفدر آہ کے قلم سے اس عبارت کو پڑھ کر بڑی حیرت ہوئی کیا "شعر العجم" ان کی نگاہ سے نہیں گزری، علامہ شبلی نعمانی نے امیر خسرو کی فارسی شاعری پر جو مضمون لکھا ہے وہ زبان و ادب کا شاہکار ہے -
"پٹیالی دہلی سے زیادہ دور نہیں" (ص ۸) قصبہ پٹیالی، دہلی سے کم از کم سو میل فاصلے پر ہے جسے "زیادہ دور نہیں" تو کسی طرح نہیں کہا جا سکتا، زیادہ سے زیادہ بلند شہر اور میرٹھ کو کہہ سکتے ہیں کہ دہلی سے زیادہ دور نہیں ہیں -
ڈاکٹر صفدر آہ اس کتاب پر علمی دنیا کی طرف سے تبریک و تحسین کے مستحق ہیں، اپنی استطاعت کی حد تک انہوں نے تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے

آدابِ اُردو

از :- حکیم گلچیں کرنالی، ضخامت ۲۰۸ صفحات،
ملنے کا پتہ :- اُردو مشن، گلی تیراں والی، ملتان -

اس کتاب کے چند ابواب :-
تلفظ کا معیار ---- اُردو املا ---- تلفظ کی غلطیاں ---- مخلوط ترکیبیں ---- سند مروا اور مرسلہ ---- کہاوتیں -
تلمیحیں ---- مذکر و مونث ---- بعض لفظوں کی نئی تحقیق ---- اصلاح سازی -
جناب حکیم گلچیں کرنالی نے بڑی محنت اور کاوش و تحقیق کے ساتھ اپنی اس کتاب کو مرتب فرمایا ہے، اُن کی یہ تصنیف اس کی شہادت دیتی ہے کہ حکیم صاحب موصوف زبان و ادب میں کتنی بصیرت رکھتے ہیں، اُن کی نگاہ کس قدر تیز بین اور دور رس ہے اور اُردو زبان کا انہوں نے ہر رخ سے مطالعہ کیا ہے -

"ان واقعات سے لوگوں کو عبرت حاصل کرنی چاہئے جو کبھی اُردو کا نام اور کبھی اُس کا خط بدلنے کا شوشہ چھوڑتے رہتے ہیں :"

حکیم صاحب کی یہ رائے کتنی صائب اور معقول ہے!
کسی صاحب نے "لاپتہ" کی بجائے "بے پتہ" تجویز کیا، گلچیں صاحب نے اس رائے کی غلطی واضح کی کہ :-

"حالانکہ دونوں میں بڑا فرق ہے" "بے پتہ خط" کے معنی ہیں "جس خط پر پتہ نہ ہو" اور "لاپتہ خط" کا مطلب ہے "جو خط گم ہو گیا ہو"۔

نیاز فتحپوری نے "نیار" کے مقابلہ میں "طیارہ" کو ترجیح دی اور اسے صحیح بتایا، فاضل مصنف "نیارہ" کے حق میں ہیں، اور اُن کی رائے درست ہے ـــــ

جوش ملیح آبادی نے اپنی نظم "خبردار" کے اس شعر پر ـــــ

> تلوار سے بھی تیز ہے یہ راہ پُرخطر
> یعنی وہ ٹھاہوا نہ گزر پُل صراط سے

نوٹ لکھا ـــــ "میرے نزدیک ترکیب اضافت کے ساتھ صحیح ہے جیسے صاحب دل وغیرہ" ـــــ اس پر گلچیں صاحب نے گرفت فرمائی ـــــ

"حیرت ہے کہ پُل صراط تو بلا اضافت ہی متعمل ہے، پھر ترکیب اضافت (پُلِ صراط) کے کیا معنی؟ ہم نے آج تک پُلِ صراط بہ اضافت لام نہ سنا نہ پڑھا"

لائق مصنف کی رائے میں دوسری زبانوں کے مشہور ناموں میں تصرف جائز نہیں، مثلاً اکیڈیمی کو اکادمی، ڈانٹے کو دانتے، نیٹشے کو نیٹشے یا نطشے، اٹلانٹک کو اطلانتک اور ویٹ نام کو ویت نام بنا دینے سے یہ الفاظ غریب اور بدآہنگ ہو جاتے ہیں۔

حکیم گلچیں نے اردو زبان کے بعض مشاہیر اہل قلم کی تحریروں کے نمونے دے کر بتایا ہے کہ اُن سے بھی غلطیاں سرزد ہوئی ہیں، مثلاً علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں ـــــ

"ادائے مطلب میں عظیم الشان غلطیاں پیدا ہو جاتی ہیں"۔

گلچیں صاحب اس غلطی کی نشان دہی فرماتے ہیں ـــــ

"عظیم الشان ہمیشہ اچھے معنی اور اچھے کام کے لئے آتا ہے "عظیم الشان کامیابی" تو کہہ سکتے ہیں عظیم الشان ناکامی نہیں کہہ سکتے بلکہ زبردست یا سخت ناکامی کہیں گے نیز "پیدا" کا لفظ بھی "حشو" ہے۔

"ناہموار زبان" کی مثال دیتے ہوئے، لکھتے ہیں ـــــ

جوش ملیح آبادی کی نظم ـــــ

"جس کا وجود فخر مشیت تھا وہ حسین"

کا مصرعہ ہے ـــــ

> جس سورما کا اسم گرامی حسین ہے

"جس سورما کا اسم گرامی" بہت ناہموار زبان ہے "سورما" تو ہو سادھوؤں کے لئے مناسب اور مسلمان مجاہدوں کے لئے نامناسب ہے، "اسم گرامی" کا ہم مزاج "تیغ زن" وغیرہ ہو سکتا تھا ـــــ یوں ـــــ

> اُس تیغ زن کا اسم گرامی حسین ہے"

اس نوع کی تمام تنقیدوں میں گلچیں صاحب نے بڑی خوش ذوقی کا ثبوت دیا ہے، مگر اُن کے ذوق شعری میں یہ شتر گربگی بھی نظر آئی کہ دبیر اور انیس کے ان مصرعوں میں ـــــ

> فرمایا میں حسین علیہ السلام ہوں (دبیر)
> مولا نے سر جھکا کے کہا میں حسین ہوں (انیس)

انہیں دبیر کا مصرعہ بہتر معلوم ہوتا ہے! حالانکہ نہ صرف علامہ شبلی بلکہ تمام ارباب ذوق کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ انیس کے مصرعہ یا پورے شعر کے مقابلہ

میں دبیر کا مصرعہ یا شعر انتہائی پست ہے! انیس کا یہ شعر :—

یہ تو نہیں کہا کہ مشرقین ہوں
مولا نے سر جھکا کے کہا میں حسین ہوں

شاعری کی معراج ہے :

دبیر :— رویا میں بھی حسین کو رویا ہی کرتے ہیں
انیس :— حسرت ہے کہ خواب میں بھی رویا کیجئے

"دبیر کا مصرعہ واضح اور پست ہے" یہ گلچیں صاحب کی رائے ہے، حالانکہ "رویا میں رونا" یہ اُردو زبان ہی نہیں ہے "خواب میں رونا" صحیح زبان ہے، اس طرح اُردو میں کون بولتا ہے —— کہ میں نے تعبیا دیکھا تھا —— یا " میں کل رات رویا میں رو تا رہا "؟

انیس :— آنکھوں میں یوں پھرے کہ مژہ کو خبر نہ ہو
دبیر :— آنکھوں میں پھرے اور نہ مردم کو خبر ہو

"ان میں دبیر کا مصرعہ بہتر ہے "مردم" آنکھ کا جزو ہوتی ہے، اُس کو خبر نہ ہونا "پھرنے" کا کمال ہے "مژہ" تو بہت دور کی چیز ہے" اُسے خبر نہ ہونا کوئی کمال نہیں، دبیر کے مصرعے کے تیور بھی "مردانہ" ہیں، جیسے میر کے شعر سے

سرہانے میر کے آہستہ بولو　　ابھی ٹک روتے روتے سوگیا ہے

کے مقابلہ میں سودا کے شعر —— سودا کے جو بالیں سے گیا شورِ قیامت　　خدام ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے

کے تیور مردانہ ہیں ——"

گلچیں کرنالی کی یہ گرفت تو صحیح ہے کہ "مردم آنکھ کا جزو ہوتی ہے اور مژہ بہت دور کی چیز ہے" (اس میں "بہت" مبالغہ ہے، دور کی چیز لکھ دیتا) مگر تیل کے بیتے "مردم" اُردو میں کون بولتا ہے، دبیر کے شعر میں "مردم" کس قدر کھڑا کھڑا لگتا ہے، پھر شعر کی یہ تعریف کہ اُس کے تیور "مردانہ" ہونے چاہئیں، عجیب اور نئی قسم کی تعریف ہے! کہنا یہ چاہیے تھا کہ سودا کے شعر میں میر کے شعر کے مقابلہ میں لفظی شکوہ پایا جاتا ہے، مگر جہاں تک اثر انگیزی اور والہیت کا تعلق ہے میر کا شعر سودا کے شعر سے بلند تر ہے، سودا کے شعر میں "خدام ادب" سے کون مراد ہیں، فرشتے یا تیماردار؟ انیس کے شعر میں "مژہ" نے کتنی نغمگی پیدا کردی، جو دبیر کے شعر میں "مردم" لانے کے سبب غارت ہوگئی!

علامہ شبلی پر گلچیں صاحب کا یہ اعتراض :—

"انیس و دبیر کے کلام کا مقابلہ کرنے میں دقتِ نظر سے کام نہیں لیا، یا نہیں لیا جاسکا"

اہلِ ذوق اور اربابِ نظر کے نزدیک کوئی وزن نہیں رکھتا! شبلی کو شعر کی جیسی پرکھ تھی، ایسی پرکھ تو دنیا کے شاید چند ناقدین ہی کو نصیب ہوتی ہوگی۔

"اگر ماضی میں شہد، شہد کا خاصہ رکھتا آیا ہے اور سنکھیا کی تاثیر سنکھیا ہی رہی تو مستقبل میں شہد شہد ہی رہے گا اور سنکھیا کی تاثیر سنکھیا ہی رہے گی" (ام الکتاب — مولانا ابوالکلام آزاد)

اس پر گلچیں صاحب اعتراض کرتے ہیں :—

"چاروں جگہ "سنکھیا" غلط ہے "سنکھیے" ہونا چاہئے"

. . . .

. . . .

یہ اعتراض صحیح نہیں ہے، مولانا آزاد نے چاروں جگہ "سنگھیا" کا املا صحیح اور درست لکھا ہے! یہ چیز قواعد سے نہیں ذوق و وجدان سے تعلق رکھتی ہے، وہ شخص بے ذوق ہے جو "سنکھیا" کو "جملہ" کی کسی حالت میں بھی "سنکھیے" لکھتا اور بولتا ہے۔ مثلاً یوں تو بولتے اور لکھتے ہیں :—

"پنکھا خراب ہو گیا —— اور پنکھے کی قیمت سو روپیہ ہے"

—— لیکن ——

یوں نہیں بولیں گے کہ "انگیے کی قیمت دو روپیے ہے" "انگیا" کو جملہ کی ہر حالت میں "انگیا" ہی لکھا اور بولا جائے گا "یا" ذیہ کی ذلت مسرغوب ہے، اسی کا قیاس "سنکھیا" پر بھی کیا جا سکتا ہے۔

فاضل ناقد نے — عوام الناس، اظہر من الشمس، نزولِ القرآن، مالہ و ماعلیہ، نصف النہار، لیلۃ القدر، مافی الضمیر، ساقط الاعتبار، ماہ التنزاع —— جیسے لفظوں کو ترک کرنے کی جو رائے دی ہے وہ بدنصیبی کی غلط رائے ہے! یہ الفاظ اردو زبان کا جزو بن چکے ہیں، ان کو آخر کس لئے ترک کیا جائے! لیلۃ القدر اور شب قدر، ماہ النزاع اور نزاع کی دونوں قسم کی ترکیبیں اردو میں رائج ہیں اور رائج رہنی چاہئیں !

یہ جو انجمن ترقی اردو کی کتابوں میں مولوی عبدالحق کے مشورے سے "گاؤں" کو "گانو"، اور "چھاؤں" کو "چھانو" لکھا ہوا ملتا ہے اس سے کلیمی صاحب نے اختلاف کیا ہے اور ان کا اختلاف صحت پر مبنی ہے !

کلیمی صاحب نے "تقابلی مطالعہ" کے عنوان سے انگریزی اور اردو کی بعض مرادف اصطلاحیں درج فرما کر بتایا ہے کہ ان میں کون اصطلاح بہتر ہے! مثلاً، ان کی رائے میں :—

"کترن، کٹنگ اور تراشے سے بہتر ہے" (ص ۱۸۹)

اردو میں عام طور پر کترن — "وہ چھوٹا کا غذ یا کپڑے کا ٹکڑا، جو کترنے سے بیکار نکلے" (نور اللغات جلد سوم) کو کہتے ہیں اس لئے کٹنگ کے معنی میں "تراشے" کے مقابلہ میں "کترن" کو بلکہ اس سے بہتر سمجھنا، بڑی بے ذوقی ہے، کوئی یوں بولے :—

"میں فلاں حضرت کی کترن آپ کو بھیج رہا ہوں، اس سے استفادہ کیجئے اور پھر مجھے واپس فرما دیجئے"

تو اہل ذوق "کترن" سن کر ہنسی کو مشکل ہی سے ضبط کر سکیں گے !

"لاپتہ" کے بجائے "بےپتہ" "تجویز لینا" (ص ۵۹) اردو میں "تجویز سے" "تجویزنا" کوئی مصدر نہیں ہے نہ اس کا کہیں چلن ہے! ہاں! "سمجھ" سے "برتانا" دکن میں بنایا گیا اور بعض شعراء نے اسے استعمال کیا، اور اس کا چلن عام ہو جانے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

"ماہر القادری صاحب فرماتے ہیں —— اردو تحریر میں عام طور پر اعراب لگانے کی ضرورت پیش نہیں آتی، اگر کہیں پڑ جائے تو صحیح اعراب لگنے چاہئیں، اعراب لگانے میں اس کا خیال نہیں رکھا جائے گا کہ وہ لفظ اردو میں کس طرح بولا جاتا ہے۔"

کلیمی صاحب اس مشورے کو بہت گمراہ کن اور لسانیات کے اصول کی بالکل ضد بتاتے ہیں، حالانکہ خاکسار کی یہ رائے درست ہے! مثلاً "جدہ" کو اردو بولنے والے "ج" کے "زیر" کے ساتھ بولتے ہیں اور ان کی بولی ٹھولی پر کوئی اہل ذوق اعتراض نہیں کر سکتا مگر اس پر اعراب لگائے جائیں گے تو "جدہ" کے "ج" پر "زبر" لکھنا ہوگا! کیونکہ عرب "جدہ" بولتے ہیں — "مقابلہ" کو اردو میں "ب" کے ساکن یا سکون و حرکت کی درمیانی آواز کے ساتھ بولا جاتا ہے مگر اعراب میں "ب" پر زبر لگانا چاہئے کیونکہ عربی کے اصل لفظ میں "ب بالفتح" ہی ہے۔

"آداب اردو" ان غلطیوں کے باوجود کام کی کتاب ہے اس کے مطالعہ سے زبان و ادب کے بہت سے گوشے نگاہ کے سامنے آتے ہیں۔

مختصر تاریخ غزل اردو　از :— ڈاکٹر محمد اسلم، ضخامت ۔۔ صفحات، قیمت دو روپے،
ملنے کا پتہ :— نسیم بک ڈپو، لاٹوش روڈ، لکھنؤ

اس کتاب میں ... [illegible]

ہے تو خوبی یہ ہے حاضر کہ بعض شاعروں کے تو صرف نام و تخلص اور صفحہ پیدائش ہی درج پر اکتفا کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر اسلم صاحب نے اُردو کا پہلا غزل گو شاعر حضرت امیر خسرو کو اور پہلا صاحب دیوان غزل گو شاعر سلطان محمد قلی قطب شاہ کو تسلیم کیا ہے۔ اس کتاب کے منتخب اشعار۔ ــــــــــ

ملنا کہیں کا غیر سے، کوئی جھوٹ کوئی سچ کہے
کس کس کا منہ بند کیجیے، کوئی کچھ کہے کوئی کچھ کہے (رسا)

عشق نے منت میں کیا بدنام — مجھ سے آن سے نہ تھی ملاقات مدام (حاتم)
دامن تلک بھی بس کہ نہ پہنچا مرا غبار — مشہور ہے زمیں کہاں اور آسماں کہاں (")
عرض غصہ میں کبھی اہل وفا کی نہ سنئے — ہٹ پہ آ جائے وہ کافر تو خدا کی نہ سنئے (حسرت کرانچی)
جس روز کبھی اس پہ بیداد کرو گے — یہ یاد رہے ہم کو بہت یاد کرو گے (سودا)
مجھ کو پامال کر گیا ہے ابھی — یہ جو دامن اُٹھا کے جاتا ہے (مصحفی)
دیکھ مجھ کو اپنے در پہ یوں کہا منہ پھیر کے — یہ دوانہ کس لئے بیٹھا ہے رستہ گھیر کے (جرأت)
میرا دل کس نے لیا نام بتاؤں کس کا — میں ہوں یا آپ ہیں گھر میں کوئی آیا نہ گیا (مجرم)
پھڑک کے بھی نہ دیتا تو آہ کیا کرتا — قفس سے اور نکلنے کی راہ کیا کرتا (ظفر)
حضرت دل آپ ہیں جس دھیان میں — مر گئے لاکھوں اسی ارمان میں (داغ)
کچھ کہو جھوٹ سچ کہ تو جی بندے کا ہے — تھا وہ نہ آسرا دلِ امیدوار کا (امیر اللہ تسلیم)
کیوں بڑھ جاتے ہیں اختلاط بہت — ہم میں طاقت نہیں جدائی کی (حالی)
ہوتی نہیں قبول دعا ترکِ عشق کی — دل چاہتا نہ ہو تو زباں میں اثر کہاں (")
ممکن نہیں کہ عشق ہو اور دل حزیں نہ ہو — میرا ہی حال دیکھ لے جس کو یقیں نہ ہو (اکبر الہٰ آبادی)
جب کہا اس نے مدعا کہیے — سوچتے رہ گئے کہ کیا کہیے (جعفر علی خاں اثر)
بھولنے والے کو شاید یاد وعدہ آ گیا — مجھ کو دیکھا مسکرایا اور پھر شرما گیا (")
غرض کہ کاٹ دیے زندگی کے دن اے دوست — وہ تیری یاد میں ہوں یا ترے بھلانے میں (فراق)
مدتیں گزریں تری یاد بھی آئی نہ ہمیں — اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں (")
ذرا وصال کے بعد آئنہ تو دیکھ اے دوست — ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی (")
پھانس ہو تو نکال لیں احباب — خلش دل کو کیا کرے کوئی (عزیز لکھنوی)

صفحہ ۱۰۹ پر جگر مراد آبادی کو جو مرزا داغ کے تلامذہ میں شامل کیا ہے یہ نسبت مجھے نہیں معلوم ہوتی، جب داغ کا انتقال ہوا ہے تو جگر دو پندرہ برس کے تھے، اُس زمانے میں پندرہ سال کی عمر کے نوجوان کا داغ کی خدمت میں اصلاح کے لئے مراد آباد سے غزلوں کا، دکن ڈاک کے لیے بھیجنا جی کو نہیں لگتا۔

شعرائے کرام کے گنے چنے اشعار جب انتخاب میں دئے تھے، تو ہر شعر کو منتخب روزگار ہونا چاہیے تھا، اشعار کے انتخاب میں تذکرہ نگار نے خوش ذوقی کا ثبوت نہیں دیا، نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل کے اشعار پڑھ کر یہ بات خاص طور سے کھٹکی۔

سرورالجادفی بیان المیلاد

از:- مولانا فیض محمد شاہ [illegible]، ضخامت [illegible] صفحات، قیمت ایک روپیہ دس آنے۔
ملنے کا پتہ :- کتب خانہ حبیبیہ، بکری بازار، ملتان۔

اس کتاب کی روایتوں کا زیادہ تر ماخذ مواہب لدنیہ اور شرف المصطفیٰ جیسی کمزور کتابیں ہیں۔ شرف المصطفیٰ کے بارے میں اردو زبان کے سب سے بڑے سیرت نگار اور محقق علامہ شبلی نعمانی کی یہ رائے ہے :-

"حافظ ابو سعید عبدالملک نیشا پوری کی تصنیف ہے آٹھ جلدوں میں ہے حافظ ابن حجر اصابہ میں اکثر حوالہ دیتے ہیں لیکن جو روایتیں حافظ موصوف نے نقل کی ہیں، ان میں نہایت مہمل اور لغو روایتیں ہیں جن سے قیاس ہوتا ہے کہ مصنف نے رطب و یابس کی کوئی تمیز نہیں رکھی ہے۔"

اور مواہب لدنیہ کے متعلق علامہ شبلی فرماتے ہیں :-

"مشہور کتاب ہے اور متاخرین کا یہی ماخذ ہے، اس کے مصنف قسطلانی ہو بخاری کے مشہور شارح ہیں، حافظ ابن حجر کے ہم عصر تھے، یہ کتاب اگرچہ نہایت مفصل ہے لیکن ہزاروں غلط اور موضوع روایتیں بھی موجود ہیں۔"

مصنف کو جب سرے سے اسی کا پتہ نہ ہو کہ حدیث و سیر میں کتابوں کا کیا درجہ ہے، کن کتابوں کے بارے میں مستند علماء کی کیا رائے ہے؟ تو اس کی نقل کی ہوئی روایتیں کتنی کمزور ہوں گی، اس پوری کتاب کا یہی رنگ ہے کہ چھانٹ چھانٹ کر کمزور، ضعیف بلکہ موضوع روایتیں درج کی گئی ہیں!

صفحہ ۲۰ پر شرح بہجۃ المحافل کے حوالہ سے لکھا ہے "اور توسل اور استغاثہ اور تشفع اور تضرع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے، یا آپ کے علاوہ کسی نبی یا ولی سے یہ سب جائز ہے" ———— ! حالانکہ جس روایت سے استناد کیا ہے، قطع نظر اس کے وہ روایت کس درجہ کی ہے اس میں توسل کا ذکر ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے استغاثہ کا ذکر نہیں ہے! یہ عقیدہ کہ انبیاء اور اولیاء ہر کسی کی فریاد کو ہر جگہ سے ہر وقت سن کر، فریاد کرنے والے کی حاجت پوری کر دیتے ہیں، قطعاً غلط اور بے سند ہے، صحابہ کرام نے کسی مشکل کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے استغاثہ نہیں کیا بلکہ اللہ تعالیٰ کو پکارا کہ وہی سمیع و بصیر اور حلّال مشکلات ہے:

کتاب و سنت، آثار صحابہ، اقوال تابعین اور ائمہ فقہ و حدیث کی کسی کتاب سے یہ ثابت نہیں ہے کہ سیرت کی ہر محفل میں حضور کی ولادت کا ذکر لازمی طور پر کیا جائے اور تعظیم کے لئے کھڑے ہو کر صلوٰۃ و سلام پڑھا جائے ———— یہ "بدعت" شان رسالتؐ کی زوال ہوتی ہے جس پر اہل بدعت اس سختی کے ساتھ جمے ہوتے ہیں کہ جو اس کا قائل و عامل نہیں ہے اس کو طرح طرح سے مطعون کرتے ہیں! منقبی اکبر میرٹھی کے میلاد میں "سلام" کے طرز پر جو نظم ہے وہ دین و شریعت میں کیا درجہ رکھتی ہے؟! اس سلام کے سلسلہ میں یہ مصرعے :-

سلام صدقہ خیر النسا کا
سلام صدقہ امام اعظم
سلام وہ دم رسول کیسی کے رنج و غم

حد اعتدال سے خارج ہیں!

"اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اور اللہ تبارک و تعالیٰ کی بے ادبی میں فرق یہ ہے کہ جس شخص نے اللہ تعالیٰ کی بے ادبی کی تو اس کی توبہ قبول ہوگی، جس شخص نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بے ادبی کی اس کی توبہ قبول نہ ہوگی۔"
(خلاصۃ الفتاویٰ از طاہر بن احمد بخاری)

یہ فتویٰ بھی بالکل غلط ہے، بے ادبی نہ اللہ تعالیٰ کی کرنی چاہئے اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی، یہ دونوں بے ادبیاں کفر ہیں! مگر اس

نقرہ کی رُو سے اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ عظمت وعزت والے ٹھیرتے ہیں۔ یہ عقیدہ ضلالت کے سوا اور کیا ہے اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں ہر شخصیت پست اور ہیچ ہے اللہ اصغر نہ کا جا ہے وہ نبی ہی کیوں نہ ہو کوئی مقابلہ اور مماثلت نہیں۔ اس ذہنیت سے اللہ تعالیٰ کی پناہ جو نبیوں کو اللہ تعالیٰ سے بڑھاتی یعنی اللہ کا ہمسر ٹھیراتی ہے اور ولیوں کو نبیوں پر فضیلت دیتی ہے! سے گر فرق مراتب نہ کنی زندیقی ـــــــ

شیعہ محسن کاغذ :- سید عشرت حسین جعفری ایڈوکیٹ (حیدرآباد) ضخامت ۸۰ صفحات، قیمت ایک روپیہ۔
ملنے کا پتہ :- شفیق اکیڈمی، گاڑی کھاتہ، حیدرآباد

اس کتاب پر مولانا مصطفیٰ حسن صاحب جے پوری نے تقریظ لکھی ہے اور مصنف کے لئے دعا کی ہے کہ "خداوند عالم موصوف کو قلمی جہاد کرنے کی توفیق کرامت فرمائے۔"

"پیش لفظ" میں فاضل مصنف رقمطراز ہیں :-

"تحفۂ اثنا عشریہ، آیات بینات اور نصیحۃ الشیعہ جیسی پرانی کتابیں نہایت آب و تاب سے شائع کی جا کر، سوادِ اعظم کے دلوں میں اہل تشیع کی طرف سے جذباتِ منافرت اُبھارے جا رہے ہیں۔" (ص ۵)

ان کتابوں میں شیعہ کے عقائد پر بے شک نقد و تبصرہ ہے، مگر شیعہ حضرات کی کسی مقدس و محبوب شخصیت کی شان میں ایک لفظ بھی بے ادبی اور اہانت کا نہیں پایا جاتا۔

ـــــــ لیکن ـــــــ

شیعہ حضرات کی کتابیں جن میں صحابہ کرام کو گالیاں دی گئی ہیں، وہ ـ برابر چھپ رہی ہیں ـ فاضل مصنف کے نقطۂ نگاہ سے تو اصل میں قابلِ احتساب وہ کتابیں ہیں، جن کا موضوع و مقصد نفوسِ قدسیہ کی اہانت و تنقیص ہے۔ مولوی مقبول احمد کا ترجمۂ قرآن خود فاضل مصنف کے پاس بھی ہوگا ـــ اُس کے بارے میں کیا رائے ہے!

"قبولِ اسلام کی دوڑ میں بازی لے جانے میں پہل حضرت علی علیہ السلام نے کی ہے، اس لئے وہ اس گروہ سابقین اولین کے سرخیل قرار پاتے ہیں اور اسی اولیت سبقت کا لازمی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ بعد رحلت ختمی مرتبت علیہ الصلوٰۃ والسلام اختلافی مسائل کی صورت میں آپ ہی پوری امت مسلمہ کے لئے قابلِ اتباع ہیں! یعنی پوری امت کو اُن کے طریقہ پر چلنا چاہئے اور اسی کے معنی میں پوری امت "شیعہ علی" قرار پاتی ہے۔" (ص ۲۸)

سب سے پہلے اسلام کس صحابی نے قبول کیا، اس میں اختلاف ہے اور اس اختلاف کی اسباب فکر و نظر نے اس طرح رفع کیا ہے کہ بالغ مردوں میں حضرت ابوبکر صدیق، کم سنوں میں حضرت علی مرتضیٰ، عورتوں میں حضرت خدیجہ اور غلاموں میں حضرت زید سب سے پہلے ایمان لائے! پھر جہاں تک بلوغ فکر و عقل کا تعلق ہے کمسن کے مقابلہ میں بالغ مرد کا کسی عقیدہ کو قبول کرنا زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

بیشک حضرت علی کرم اللہ وجہہ صحابہ میں "اقضیٰ" یعنی سب سے بڑے قاضی تھے، مگر اس کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سارے صحابہ شرعی مسائل میں تنہا حضرت علی کی پیروی نہیں کرتے تھے، اور نہ حضرت علی اس کے دعویدار تھے کہ صرف میرا اتباع تمام مسلمانوں کو کرنا چاہئے شرعی مسائل میں جن اجل صحابہ کے فتاویٰ پر جو تفقہ فی الدین میں شہرت رکھتے ہیں، اُمت عمل کرتی ہے اور ان میں ایک حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ بھی ہیں ـــ!

حضرت علی اور امیر معاویہ کے درمیان جب نزاع برپا ہوئی، تو جو لوگ حضرت علی کے ساتھ تھے وہ "شیعانِ علیؓ" اور جو امیر معاویہ کے

معاون و مددگار رہتے شیعان معاویہ کہلاتے تھے، یہ تقسیم کسی دینی عقیدہ کی بنا پر ہرگز نہیں تھی۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے اُمت محمدی کا نام "مسلم" رکھا ہے، اگر کوئی اور نسبت اُمت کے لئے قابل قبول ہوتی تو "محمدی" نسبت ہونی چاہیے تھی۔ مگر اس نسبت کے لئے بھی کوئی قول رسولؐ نہیں ملتا، اس لئے امت محمدیہ کا نام جماعت اور فرد کی حیثیت سے "مسلم" ہی کتاب و سنت کے عین مطابق ہے: "شیعہ" چونکہ مسلمانوں کے ایک مخصوص فرقہ کا نام ہے اس لئے امت کے تمام فرقے اپنا نام "شیعہ" یا "شیعانِ علی" کس طرح رکھ سکتے ہیں، کہ اس طرح ایک نئی الجھن پیدا ہو جائے۔ سبط حشمت علی صاحب نے ہاتھ کھول کر نماز پڑھنے کی جو بحث فرمائی ہے تو اُس کے بارے میں یہ عرض ہے کہ یہ بات کسی مستند کتاب میں نہیں ملتی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں ہمیشہ ارسال یدین فرماتے تھے۔

رہا حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا نماز میں ارسال یدین تو امام مالکؒ نے خود مؤطا میں ـــــ وضع الیدین احداھما ... فی الصلوٰۃ کا باب باندھا ہے اور ارسال کا ذکر نہیں کیا، امام ابن عبدالبر، جو فقہ مالکی کے ستون ہیں، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام سے کوئی حدیث "وضع یدین" (نماز میں ہاتھ باندھنے) کے خلاف نہیں آتی، اور جمہور صحابہ اور تابعین کا یہی قول ہے!

اب رہی اس اتحاد اور یک رنگی کی دعوت کہ تمام مسلمان نماز ہاتھ کھول کر نماز پڑھیں اور اپنا نام "شیعہ علی" رکھ لیں ـــــ وہ نزاع و بحث کی دعوت ہے، جسے کسی طرح معقول و مستحسن قرار نہیں دیا جا سکتا!

میرا بھائی

از:- پریم ناتھ دت، ضخامت ۲۰۰ صفحات (مجلد گرد پوش کے ساتھ) قیمت چار روپے۔
ملنے کا پتہ:- ۲۱ کرشنا مارکیٹ امرتسر

جناب پریم ناتھ دت اُردو زبان و ادب کے شیدائی، اُردو کے اچھے ادیب، اور انسانی بھائی چارے کے داعی ہیں۔ اُن کی نصف درجن کتابیں اب تک منظر عام پر آچکی ہیں اور کئی کتابیں زیر طبع ہیں، ان کی بے تعصبی کی دلیل ہے کہ اپنی اس کتاب کو ڈاکٹر سید محمود صاحب کے نام معنون کیا ہے!

بھارت کے صدر جناب رادھا کرشنن اور نائب صدر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب، نیاز فتحپوری، ڈاکٹر تارا چند، مولانا محمد حسین عرشی، ڈاکٹر وارث سرہندی اور پروفیسر رشید احمد صدیقی کی تحریریں، اس کتاب کی زینت ہیں۔ ان تمام نامور شخصیتوں نے "میرا بھائی" کو سراہا ہے، رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں: ـــــ

"اس کتاب میں مصنف نے تخلیق کا بھی کمال دکھایا ہے۔ کتاب میں کہیں صناعی اور تکلف نہ ملے گا ... گاؤں کی زندگی کا نقشہ اس کتاب میں جس سادگی، سچائی اور شرافت سے کھینچا گیا ہے اس سے اس زوال علوم کس پرسِس طبقے کی منزلت ہمارے دلوں میں راسخ و روشن ہو جاتی ہے، جن کو ہم نے قابل اعتنا نہیں سمجھا۔"

"میرا بھائی" بڑی دلچسپ کتاب ہے یہ آپ بیتی بھی ہے اور جگ بیتی بھی، کردار نگاری میں نفسیاتی نکتوں کو جس سلیقہ کے ساتھ سمویا گیا ہے اور ماحول کی جس انداز میں حکاسی اور ترجمانی کی گئی ہے اس نے اس کتاب کو واقعی قابل ذکر بنا دیا ہے!

لائق مصنف کو اظہار مطلب پر پوری قدرت بلکہ ید طولیٰ حاصل ہے، کسی قسم کا کوئی الجھن اور ابہام نہیں، سامنے کی باتیں مگر کس انداز میں کہی ہیں زبان کتنی منجھی ہوئی ہے، مکالمے خاص طور سے لطف انگیز ہیں۔

"جھگڑا مول نہ لیتے، اگر پیچھے پڑ جاتا" (ص ۱۴) "اگر پیچھے پڑ جاتا" کی جگہ "آن پڑتا" لکھنا چاہیے تھا ـــــ "عیسائی فقیر نے تو ہم پر ترس کھا کر ہمیں بچنے کے لئے زمین پر بیٹھ گئے" (ص ۲۰) "زمین پر بیٹھ گئے" کا محل تھا، "بولئے" کا استعمال یوں ہوتا ہے ـــــ "وہ راستہ میرے ساتھ ہو لئے" ـــــ "اسی سال مجھے ماہوار وظیفہ لگ گیا تھا" (ص ۵۱) "وظیفہ مقرر ہو گیا تھا" کہنا تھا ـــــ جو اُس کا

اور انہیں کتابی صورت میں پیش فرمایا۔ یہ حضرات توجہ اور محنت و جستجو نہ کرتے تو فاخر کی عزلت نشینی، گوشہ گیری اور طویل خاموشی کی بدولت اُن کا کلام گمنامی کی نذر ہو کر رہ جاتا۔

جناب فاخر ہریانوی کی نظموں میں تنوع کے ساتھ فطرت کی عکاسی اور محاکات نگاری کی خوبیاں نظر آتی ہیں! اُن کی شاعری بڑی جاندار اور جدید اصطلاح میں "پہلودار" ہے! پہلی نظم کا عنوان "خدا" ہے، فرماتے ہیں:—

اُسی کے حکم سے بہتی ہے چاندی آبشاروں میں | حسین فطرت نے بخشی ہے ہر بط کوہساروں میں
اُسی کے حکم سے دن رات گردش ہے بگولوں میں | چراغاں کر رہے ہیں کرمک شب تاب جھولوں میں
حسین کرنیں، اُسی کا دلربا پیغام دیتی ہیں | زمانے میں سنہری خدمتیں انجام دیتی ہیں
اُمیدوں کی دعائیں اس سے عرض حال کرتی ہیں | گناہوں کا زبانِ اشک سے اقبال کرتی ہیں

اتنے اچھے شعروں کے ساتھ بھرتی کے ایک دو شعر بھی نظم میں شامل ہو گئے ہیں، مثلاً:—

جب اُس کے رحم کی کرنیں دلوں کو جگمگاتی ہیں
مسرت سے غریبوں کی نگاہیں مسکراتی ہیں

"رحم کی کرنیں" ہی اول تو "عجیب ترکیب" ہے، پھر نگاہوں کی مسکراہٹ میں بھی تکلف پایا جاتا ہے۔

"میرے لئے" خاصی مترنم نظم ہے، مگر اُس کا یہ شعر:—

گھورتے ہیں آسماں کو دیو پیکر کوہسار | دے رہی ہیں پہرہ اُن کی چوٹیاں میرے لئے

دوسرے شعروں کے مقابلہ میں خاصہ پست ہے! جنگل یا کوہسار کو "دیو پیکر" کہنا اول تو ناقص و کمزور تشبیہ ہے، پھر یہ منظر کہ کوہسار آسماں کو گھور کر دیکھ رہے ہیں عجیب ہے، اور اُن کی چوٹیوں کا پہرہ دینا اس پر مستزاد! علامہ اقبال نے ہمالیہ کو جو "سنتری" یا پاسبان کہا ہے اُس کا محل اور ہے فاخر صاحب نے "کوہسار" کی بجائے صرف اُن کی چوٹیوں کا "پہرہ دار" بنانا پڑھا دیا ہے! یہ چیز بھی محل نظر ہے کہ چوٹیاں "پہاڑ" کی ہوتی ہیں یا "کوہساروں" کی!

"کونل" خاصی اچھی نظم ہے، یہ بند کتنے سہل، سلیس، سادہ اور مترنم ہیں:—

ہیں! یہ یکایک کیا ہوا | کیوں گاتے گاتے رُک گئی
وہ اُڑ چلی پر تول کر | وہ شاخ دب کر جھک گئی

اور

سوئے فضائے نیلگوں | اب مائل پرواز ہے
دلکش ہوا پر یا کوئی | اُڑتی ہوئی آواز ہے

اس بند میں ا———

تقسیم غم کے واسطے | ہر وقت آمادہ ہے تو
او دل گرفتہ نازنیں | کہ کس کی دلدادہ ہے تو

سوال پیدا ہوتی۔ "تقسیم غم" سے آخر کیا مراد ہے؟ اشعار غالباً یہ کہنا چاہتا ہے کہ کوئل اپنے گیتوں سے گویا سننے والوں کو درد و غم تقسیم کرتی ہے۔

"شام" جس نظم کا عنوان ہے، اُس کا پہلا شعر کتنا اچھا ہے:—

شفق کے رنگ میں سورج غروب ہوتا ہے
وہاں یہ شام کا منظر بھی خوب ہوتا ہے

"نغمہ" کا یہ شعر خوب ہے: —

کہکشاں تاروں کا بکھرا ہوا گلدستہ ہے ۔۔۔ دل سمجھتا ہے کہ جنت کا یہی رستہ ہے

—— مگر ——

جنت دیدۂ بینا میں بسائے سارے ۔۔۔ روح افروز ہیں قدرت کے نظارے سارے

میں "روح افروز" کی بجائے "نظر افروز" لانا تھا۔

"تاروں بھری رات" میں شاعر نے خاصی اچھی مشاہدہ نگاری کی ہے مگر اس کا آخری بند کتنا گرا ہوا بلکہ غیر شاعرانہ ہے: —

ایسی حالت میں نقاب جسم اُٹھا دیتے ہیں ہم
موت بھی آئے تو اس کا منہ چڑا دیتے ہیں ہم

نظم "برہانہ" میں ایسے اچھے اشعار بھی ہیں: —

اس جگہ حرص و ہوس کی گرم بازاری نہیں ۔۔۔ مفلسوں کو بھی یہاں احساسِ ناداری نہیں

—— لیکن ——

یہ شعر: —

ہے یہاں برہا بننے کے مونڈھ پہ تکیہ کوئی ۔۔۔ دور سے آتا ہے کھیتوں میں نظر تکیہ کوئی

کتنا کمزور ہے!

"جنگل کی شہزادی" کے یہ دو شعر کس قیامت کے ہیں: —

چہرے پہ اس ادا سے ہر نقش اُبھر رہا ہے ۔۔۔ گویا تمام چہرہ کچھ عذر کر رہا ہے
مہکا ہوا ہے جنگل گیسو سے مشکبو سے ۔۔۔ اُٹھا اُٹھ کے دیکھتا ہے سبزہ کنارِ جُو سے

"محبت اور جوگی" میں یہ شعر کتنا پست اور بھرتی کا ہے: —

منعمات جہاں سے بیگانہ ۔۔۔ معنیٔ این و آں سے بیگانہ

"منعمات" نے ساری شعریت کو غارت کر دیا۔ "منعم" تو دولت مند متمول اور نعمت دینے والے کو کہتے ہیں اور شاعر نے یہاں "نعمتوں" کے معنی میں "منعمات" نظم کیا ہے۔ اور معنوی اعتبار سے غلط قسم کی جمع بنائی ہے۔ "منعمات" کو "ع" کے زبر کے ساتھ پڑھا جائے تو بھی شعریت کہاں پیدا ہوتی ہے۔

"بیٹے کی ولادت پر" کتنی دلکش نظم ہے: —

میرے گھر میں آسماں کی روشنی لایا ہے تو
زندگی لایا ہے تو
اے خوشی کے ننھے پیغمبر! خوشی لایا ہے تو
کس قدر بے کیف تھے یہ بام و در تیرے بغیر
اے پسر! تیرے بغیر

---

* بے رنگ [illegible]

سچ تو یہ ہے گھر نہ تھا، پہلے یہ گھر تیرے بغیر
تیرے چہرے پہ درخشاں ہے تجلی طور کی
روشنی ہے وجود کی
ایک پاکیزہ کرن ہے تو خدا کے نور کی

"معصوموں کی دنیا" کے یہ شعر خوب ہیں :-

حسن کی معصوم تصویریں ہیں یکسر ابھی — بچپنے کی نیند میں کھوئے ہیں ان کے دل ابھی
کس قدر بشاش ہیں آزاد ہیں، دلشاد ہیں — کچھ فرشتے ہیں کہ باغ خلد میں آباد ہیں
میرے بس میں ہو تو میں ان کو جواں ہونے نہ دوں
پائمالِ انقلابِ آسماں ہونے نہ دوں

بعض نظموں کے منتخب اشعار :-

(انسان) خواہشوں کی ایک کل ہے آج کل کے ہاتھ میں — ایک مٹی کا کھلونا ہے اجل کے ہاتھ میں
(شباب) میری خدمت کے لئے حاضر تھا عہد شباب — علم نے بھی پیش کی اپنی گراں مایہ کتاب
عشق آیا تخم حسرت دل میں بو کر چل دیا — ناخدا اچھا ملا کشتی ڈبو کر چل دیا
حسن نے سادہ تمناؤں کو زخمی کر دیا — پھول مانگے تھے مگر کانٹوں سے دامن بھر دیا

بڑھاپے کی یہ تعریف :-

یہ آتا ہے تو پھر قامت میں رعنائی نہیں رہتی — یہ آتا ہے تو پھر چہرے میں زیبائی نہیں رہتی (ص ۱۰۹)

اصل محل غور ہے — کیونکہ "قامت" کی صفت "رشاقت" ہے، اور بڑھاپے کا جب ذکر ہو۔ تو پھر لازمی طور پہ یہی کہنا چاہئے کہ بڑھاپا آتا ہے تو قد و قامت میں جھکاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔

"میں" جس نظم کا عنوان ہے وہ پوری کی پوری شاہکار نظم ہے!

"دیار محبت" کے اس شعر میں :-

آنکھ دیکھے تو مست ہو جائے — شیخ بھی بت پرست ہو جائے

"آنکھ" کی بجائے "حور" کہنا چاہئے تھا! اس نظم کا یہ شعر :-

خاک چنگیز ہے خمیر ان کا
شب تاریک ہے ضمیر ان کا

دنیا کے تمام ظالموں اور جھوٹے خداؤں کی فطرت اور سیرت کو آئینہ دکھاتا ہے۔

خدا یہاں سے سدا تاہوا جا رہا ہوں میں — نالوں سے تیرے عشق کو بہلا رہا ہوں میں (ص ۱۴۳)

"آخری ملاقات" کا اس اوپر کے شعر سے آغاز ہوتا ہے، یہ شعر کس قدر سطحی بلکہ بچکانہ ہے۔

(دعا) یا مرے نام محبت کا پیام آ جائے — کی ہے نیکی کوئی دنیا میں تو کام آ جائے
(وصال) تاروں میں بھر رہا ہے کچھ ایسے سفید چاند — جیسے براتیوں میں ہو دولہا برات کا

(کسان)

ہے آج عیش کا دار و مدار دولت پہ
نہیں خوشی کا مگر انحصار دولت پہ
قریب خاتمہ افسونِ شہر یار کا ہے
ہر ایک گوشہ میں اک انقلاب جاری ہے

پھریں گے تیرے موافق بھی صبح و شام ترے
کبھی تو آئے گی گردشِ جہاں میں کام ترے

"نظم" دیہاتی کا ایک شعر ہے :—

پھر بھی یہ حالت ہے مشکل ہے نجات افکار سے
مانگتے ہیں روز جا کر بھیک ساہو کار سے

"ساہو کار" بھیک کسانوں اور دیہاتیوں کو کہاں دیتا ہے! ہاں! سود پہ قرض دیتا ہے نظم میں "قرض" یا "قرض کی بھیک" لانا تھا۔

"باپ کی وفات" پہ جو نظم کہی ہے اس میں باپ کے غم کا تاثر تو صرف آخری شعر سے ظاہر ہوتا ہے۔ باقی پوری نظم میں فلسفۂ غم اور اسرار مرگ و زیست بیان کی گئی ہے!

"سلطان شہید ٹیپو کے مزار" — کا یہ ایک شعر اپنی جگہ مکمل نظم ہے :—

یہ مٹی قیمتی ہے بادشاہوں کے خزینے سے
ابھی تک مالا مال اسلام ہے ایسے دفینوں سے

چند اور منتخب اشعار :—

میں شاعر ہوں مری تقدیر میں رونا ہی لکھا ہے
ملی ہے باغ میں شبنم کو خدمت اشکباری کی

جمہوریت کا چرچا اب عام ہو رہا ہے
شاید جہاں کا مذہب اسلام ہو رہا ہے

مٹ رہی ہے شان و عظمت مصر کے اہرام کی
آفتاب کا پتہ دیتی ہے سرخی شام کی

"مزدور کی صدا" کا ابتدائی بند ہے —

مزدور کی آواز جو پہونچی
جب مغرب کے ایوانوں میں
تو ایک ہلچل سی ہوئی پیدا
سب اصلاحی دیوانوں میں

"اصلاحی دیوانوں" — کسے کہتے ہیں! پھر مزدوروں کی آواز مغرب ہی کے ایوانوں میں کیسے پہونچی، مشرق کے ایوان اس سے کیوں محروم رہے — کوئی ثبوت؟ کوئی قرینہ؟ کسی خاص واقعہ کی طرف اشارہ؟؟

(غریبوں کو حقارت سے نہ دیکھو)

غریبوں کو حقارت سے نہ دیکھو
کہ ان کو بھی بنایا ہے خدا نے
انہی کے خون کی سرخی چرا کر
بھرا ہے رنگ پھولوں میں ہوا نے

(جینے کا مقصد)

اس جینے کا مقصد کیا ہے
الفت

الفت ایک دیا ہے
جس کے چاروں سمت ہوا ہے

اس جینے کا مقصد کیا ہے

عشرت

یہ رس امرت کا ہے
لیکن اس میں زہر ملا ہے
اس جینے کا مقصد کیا ہے

شہرت

شہرت ایک صدا ہے
باقی کس کا نام رہا ہے
اس جینے کا مقصد کیا ہے

دولت

دولت رنج فسانہ ہے
یہ جنگل کی تیز ہوا ہے
اس جینے کا مقصد کیا ہے

جینا

جینا ایک سزا ہے
جس کو انسان کاٹ رہا ہے

"موجِ صبا" کے مطالعہ سے کوئی شک نہیں بعض مقامات پر دل کی کلیاں کھلتی ہیں اور وجدان آسودگی محسوس کرتا ہے، امید ہے کہ شعر و سخن کی محفلوں اور علم و ادب کے حلقوں میں اس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی ۔

بسمل سعیدی اپنے وطن میں

از :۔ سید منظور الحسن برکاتی ، ضخامت ۴۸ صفحات ،
ملنے کا پتہ :۔ مصنف سے، دارالعلوم خلیلیہ نظامیہ، ٹونک راجستھان ۔

ٹونک کی سرزمین شعر پرور بھی ہے اور شاعر نواز بھی ہے، دو سال قبل راقم الحروف کا ایک شاعرے کے سلسلہ میں ٹونک جانا ہوا تو وہاں خلوص محبت اور خیر مقدم و پذیرائی کے جن نظاروں کو دیکھا، اُن کو میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا ۔

حضرت بسمل سعیدی کئی سال کے بعد اپنے وطن تشریف لے گئے، وہاں اُن کی جس جوشِ خلوص اور محبت و عقیدت کیساتھ آؤ بھگت ہوئی اُس کی تفصیل بسمل صاحب کے تلمیذ رشید مولانا سید منظور الحسن برکاتی نے دلچسپ انداز میں مرتب فرمائی ہے :

بسمل سعیدی اس وقت ہندوستان کے نامور شاعر ہیں، اُن کی ذات شعر و سخن کا مستقل دبستان ہے، اُن کے اہل وطن نے اپنے یہاں کے قابل فخر شاعر کی پذیرائی کر کے، وطن دوستی ہی نہیں علم دوستی اور صحیح قدر شناسی کا بھی ثبوت دیا ۔

ظرفِ غزل

از :۔ نصرت قریشی ، ضخامت ۹۲ صفحات ، قیمت تین روپے ۔
ملنے کا پتہ :۔ فالیم پبلیکیشنز ۱۲۹ ۔ انارکلی ، لاہور

جناب نصرت قریشی کے دو مجموعے ــــ سوز و سرود ــــ اور شکستِ خاطر ـــ شائع ہو چکے ہیں ان مجموعوں کو پسند کیا گیا اب اُن کی

تیسری کتاب منظرِ عام پر آئی ہے، توقع ہے کہ یہ اور زیادہ پسند کی جائے گی، کیونکہ
نقاش نقشِ ثانی بہتر کشد ز اول

اور یہ تو "نقشِ ثالث" ہے!

نصرت ترشی کی نظموں میں پریم امرت گھولے لیتا ہے اُن کے آہنگ میں خاص دلکشی ہے، اُن کا وجدان تغزل کا مزاج شناس ہے!

منتخب اشعار : ——

اسیری ہی قسمت میں جب تھی تو یارب
ضروری نہ تھا ذوقِ پرواز دینا

وہ جانا ہمارا چمن سے قفس میں
گل کا چٹک کر وہ آواز دینا

اس اندھیرے میں جلاتے کیوں نہیں دل کے چراغ
عشق والے کیا زمانے کی ہوا سے ڈر گئے

خدا شناس بھی ہو جائے گی نظر اک دن
ابھی تو خود نگری کا زمانہ آیا ہے

چلو جلد تلاش کریں ہم بھی دل کے ٹکڑوں کو
سنا ہے شیشہ گری کا زمانہ آیا ہے

غم کی پیاس بجھ نہیں سکتی
عمر بھر تشنگی سی رہتی ہے

عمر فانی کیا حیاتِ دائمی اُس پر نثار
ہائے وہ لمحہ کسی کی یاد میں گزرا ہوا!

رات بھی زلفِ معنبر کی بلائیں لے گی
صدقے اس حسنِ تبسم کے سحر بھی ہوگی

کچھ سعی جستجو بھی تو کر منکرِ خدا
آجائے گی یقین کی منزل گماں کے بعد

کیوں جنوں مجھ کو بیاباں میں لئے جاتا ہے
جب بھی خانہ خرابی مرے گھر بھی ہوگی

نقشِ اول ہی سہی، صورتِ انساں لیکن
صفحہ دہر پہ اس کا کوئی ثانی تو نہیں

یوں منائی ہم صفیروں نے قفس والوں کی یاد
باغ میں اک آشیاں اُجڑا ہوا رہنے دیا

جب ہوا ہے کوئی ستم ایجاد
آگئی اک نگاہِ لطف کی یاد

دنیا کی نگاہوں سے چھپ کر یہ تجھے پہروں رو لینا
کچھ دل کو جلا دے جاتا ہے کچھ گردِ الم دھو جاتا ہے

کوئی کسی کی لگی میں یہاں نہیں جلتا
پرائی آگ میں جلتا ہے صرف پروانہ

کچھ بعد میں ہنس لیں گے تو کچھ منہ پہ ہنسیں گے
ہاتھ آئے گا کیا غم کے فسانے کو سنا کے

مجھے کیا خبر بت کدہ کیوں بنا ہے، زمیں پر بنائے حرم کس لئے ہے
میں کیوں کفر و ایماں کے جھگڑوں میں الجھوں محبت کا نقشِ قدم کس لئے ہے

اُس نے پوچھا حال ہم گھبرا گئے
لب پہ کچھ بے ربط جملے آگئے

جاں نذر ہے لے لے کہ یہی پاس ہے اپنے
ورنہ ترے قابل کوئی نذرانہ نہیں ہے

کہتے ہیں جس کو دشمنِ ایمان و آگہی
رکھتے ہیں ربطِ دیدہ و دل بھی اُسی سے لوگ

آمادۂ پرواز ہے وہ شمع کی جانب
محفل میں تم آکر رخِ پروانہ بدل دو

محبت نے وہ استغناء مجھے بخشا ہے نصرت
میں پیاسا ہوں مگر پھر بھی لبِ دریا نہیں جاتا

دوسرا رُخ : ——

ہم پہ جب تک نہ حادثے گزریں　　زندگی میں کمی سی رہتی ہے (ص ۴۶)

"ہم" لانے کی ضرورت نہ تھی، یہ شعر تخصیص نہیں تعمیم چاہتا تھا۔

میرے سینہ میں دل نہیں ٹوٹا　　عشق کا آفتاب ٹوٹ گیا (ص ۵۱)

دل کو عشق کا آفتاب کہنا، عجیب سی تشبیہ ہے!

غم حیات کی تلخی ارے معاذ اللہ　　غم فراق کا اُس نے سرور توڑ دیا (ص ۵۲)

"سرور ٹوٹنا" "سرور توڑنا" یا "سرور توڑ دیا" یہ کہاں کی زبان ہے!

اک پل جو اسیری میں اے باز گزاری ہے　　کیا تو نے بھی اب خوئے پرواز گنوائی ہے (ص ۶۰)

یہ کیا شاعری ہے! "خوئے پرواز کا گنوانا" غلط زبان اور نامانوس روزمرہ!

ظلمتِ عالم میں کچھ تو ہو اُجالے کا وجود　　سنگِ دل کو اس لئے ہم نے جلا رہنے دیا (ص ۸۶)

مصرعہ ثانی میں تعقید۔ کا وہ عیب جو وجدانِ ذوق کے لئے باعثِ اذیت ہوتا ہے۔

بھروسہ کیجئے کس پر عجب عالم ہے دنیا کا　　گھڑی بھر میں یہاں اپنوں کو بیری ہوتے دیکھا ہے (ص ۹۴)

"بیری" نے شعر کا لطف غارت کر دیا۔

مرے سینے سے چمن تک جو نظر اُٹھی تو دیکھا　　کہیں آفتابِ دل ہے کہیں گل بکھر رہے ہیں (ص ۱۵۸)

اس قسم کے پست اشعار، شاعر کا بُرا تعارف ہیں۔

بے دلی سے سنتے ہیں وہ، آخر تو کیا غم ہے　　رنگ لے ہی آئے گی میری داستاں اپنا (ص ۱۶۱)

بھرتی کا شعر کوئی لطف نہیں!!

شہیدِ عشق رقصاں بود بر خاک　　سرِ دار و رسن منصور باشد۔
گرا پامال گردد از گدایاں　　یقیناً آں سرِ فغفور باشد (ص ۱۷۱)

نصرت صاحب کو ہم مشورہ دیں گے کہ وہ فارسی میں شعر نہ کہیں تو اچھا ہے!

جلنے کی اُن کے فکر ہے نصرت عبث نہیں　　خوش بھی کبھی ہوئے ہیں جہاں میں جلے لوگ

پہلے مصرعہ سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ جلنا رشک و حسد کا جلنا ہے، بلکہ مصرعہ سنتے اور پڑھتے ہی آگ میں جلنے کی طرف ذہن منتقل ہو جاتا ہے۔

ناوک احباب کے بے خطا کیوں نہ ہوں　　ہم ہی دانستہ جب گھاٹ پہ آ گئے (ص ۱۹۰)

زبان و روزمرہ یوں ہے ـــــ "دشمن میری گھات میں ہے یا گھات میں بیٹھا ہے"۔ "گھات پر آنا" سننے میں نہیں آیا، اسی ٹکڑے نے شعر کو مبہم بلکہ مہمل بنا دیا۔

- "ظرفِ غزل" میں شگفتہ اور صاف شعروں کی کمی نہیں ہے، بعض غزلیں شاعر کی طبعزاد معلوم ہوتی ہیں! توقع ہے کہ نصرت قریشی کی غزلوں کے مجموعہ کو اہلِ ذوق دلچسپی کے ساتھ پڑھیں گے۔

ماہنامہ

فاران

کراچی

جلد:- ۱۸

شمارہ:- ۱۰

ماہ جنوری ۱۹۶۷ء

ایڈیٹر ← ماہر القادری

ترتیب

عنوان	مصنف	صفحہ
نقشِ اوّل	ماہر القادری	۳
ذہین المجاہد اور سلجھی فکر	الف عالم	۱۱
مسلم بادشاہ اور امراء و مسلمان عوام	محمد حنیف پھلواروی	۲۲
قول فیصل - ایک	ماہر القادری	۳۲
انجیل برنا باس	مولانا محمد تقی عثمانی (مدرس دار العلوم کراچی)	۳۸
یادِ رفتگاں	ماہر القادری	۵۳
مرحبا! ماہِ صیام	ماہر القادری	۵۹
نغمہ و فریاد	مختلف شعراء	۶۰
ہماری نظر میں	....	۶۲

قیمت فی پرچہ

پبلشر:- مسرور حسین

دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی

چندہ سالانہ سات روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

وہ روس ہو، چین ہو، یوگوسلاویہ ہو، یا کوئی اور دوسرا ملک یا خطۂ زمین ہو، کمیونسٹوں کو جہاں بھی موقعہ ملا ہے اور اُن کو اقتدار و غلبہ میسر آیا ہے انہوں نے اشتراکیت کا نظام عملاً قائم و برپا کر دیا ہے، کمیونسٹ جس نظامِ حیات اور مسلک پر یقین رکھتے ہیں اُس کے صرف زبانی مداح اور لفظی عقیدت مند اور قصیدہ خواں نہیں ہیں ——— کہ بس "کمیونزم" کی تعریفیں کئے جائیں اور کمیونزم کی کسی قدر و قیمت اور نظریہ کو عملاً اجاگر کرنے کے لئے کچھ نہ کریں!

اس کے برخلاف مسلمانوں کو کئی ملکوں میں اقتدار اور غلبہ حاصل ہے مگر انہوں نے کسی ایک ملک[1] میں بھی اسلامی نظام کو قائم کرنے کی کوشش نہیں کی! جہاں تک تحریر و تقریر کا تعلق ہے، اسلام کی تعریف، مدح سرائی اور قصیدہ خوانی سے تقریروں اور [illegible] گونج رہے ہیں اور در و بام سے اس کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے، لیکن جہاں تک عمل و کردار کا تعلق ہے، اس باب میں حالی

ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

پڑھ کر خاموش ہو جاتا ہے۔

مسلمان ملکوں پر آزادی سے قبل یورپ کی جن طاقتوں کا بھی غلبہ اور تسلط تھا، وہ طاقتیں تو رخصت ہو گئیں مگر ایسا نظر آتا ہے کہ وہ اپنے جانشین اور شاگرد چھوڑ گئی ہیں، جو اُن طاقتوں کی ایک ایک روایت کو سینوں سے لگائے ہوئے ہیں اور اپنے سفید فام آقاؤں کے نقشِ قدم پر بدستور چل رہے ہیں، کلب، گھوڑوں کے رقص، رقص و نوش سے لے کر ریس کورس کی قمار بازی تک یورپ کی لائی ہوئی ہر برائی اُسی طرح پروان چڑھ رہی ہے اور ہر شئے کو پہلے سے بھی بڑھ چڑھ کر فروغ حاصل ہو رہا ہے۔

فرانس ہو، ہالینڈ ہو، انگلستان ہو یا اٹلی، غرض یورپ کے ان سابق حکمرانوں کے بعد مسلمانوں کے جو آزاد شدہ ملک ہیں کرسیاں تو ضرور بدل گئی ہیں، مگر وہ اسپرٹ نہیں بدلی، جو دورِ غلامی میں جاری و ساری تھی، خطۂ ملک، رقبہ اور حدود اربعہ بیشک آزاد ہو گئے لیکن فکر و نگاہ اور دل و دماغ بدستور غلام ہیں، حالانکہ آزادی دل و دماغ، افکار و خیالات، اسلوبیات و اقتدار کی آزادی کا نام ہے۔

ایک طرف وہ مژدہ اور نوید مسرت کہ بدیسی حکمرانوں کی غلامی سے نجات ملی، دوسری طرف یہ سانحہ اور المیہ کہ اجسام رخصت ہو گئے مگر ارواح بدستور دل و دماغ پر حکمران اور اعصاب پر سوار ہیں! لبوں پر مسکراہٹ آتے ہی آنکھوں میں آنسو بھی آ جاتے ہیں! لبوں پر مسرت کے نغمے اُبھرتے ہی آہ و فریاد کا —

---

[1] سعودی عرب میں ملوکیت ہے مگر اللہ تعالیٰ کے فضل سے وہاں حدود اللہ کی حفاظت کی جاتی ہے!

جلدی جلدی ٹکریں مار کر، صلوٰۃ عصر کے فریضہ سے اپنی دانست میں سبکدوش ہو گئے، ایسی نمازیں کیا ہمارے منہ پر نہیں مار دی جائیں گی!

ایک شخص نماز پڑھنے کے لئے گھر سے نکلتا ہے، راستے میں قدم قدم پر بے حجاب عورتوں کا سامنا ہوتا ہے، لباس عریاں تو سنگھار بیک چلنے کے انداز میں نگاہ کو دعوت ہوس اور پیغام توبہ شکنی، نگاہ بچاتے بچاتے ہوسناکی اپنا کام کر جاتی ہے، اس کے بعد سینما ہاؤس کے سامنے سے گزرنا ہوا، جہاں ایکٹرسیوں کی قد آدم رنگین و شوخ تصویریں آویزاں ہیں، مصور نے ان تصویروں کو جاذب نظر اور پرکشش بنانے میں اپنے آرٹ کی تمام قوت اور فن کی ساری نزاکت کو صرف کر دیا ہے، اس فتنہ کے بعد مسجد کے قریب ہوٹل سے فلمی ریکارڈوں کی آوازیں آرہی ہیں ——— کہ

انکھیاں ملا کے، جیا برما کے چلے نہیں جانا

اور

کرکے توبہ توڑ ڈالی جائے گی

اس ہنگامہ ہوا و ہوس، طوفان معصیت اور ان تقویٰ شکن مناظر اور فتنوں سے گزر کر مسجد میں جو نماز ادا کی جائے گی اس میں کتنی پراگندگی ہوگی اور وساوس نفسانی کا کس قدر ہجوم ہوگا؟ ہم یہ نہیں کہتے کہ تنہا حکومتیں ہی ان برائیوں کی ذمہ دار ہیں، جن میں راقم الحروف بھی شامل ہے اس ہوس پرور ماحول کے ذمہ دار نہیں ہیں مگر مسلم حکومتیں اگر اپنے ذرائع استعمال کرتیں تو معاشرے کی بہت کچھ اصلاح ہو سکتی تھی!

دفاتر میں ملازمتوں کی جو درخواستیں دی جاتی ہیں ان میں کھیل کود کے سارٹیفکیٹ پیش کئے جاتے ہیں، نوکریوں کے لئے انٹرویو میں متعلقہ عہدیدار خود بھی امید وار سے دریافت کرتے ہیں کہ طالب علمی کے زمانہ میں کن کھیلوں سے دلچسپی رہی ہے مگر "نماز" کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا جاتا نہ اس بات کا پتہ لگانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ملازمت کا امیدوار نماز کا کس حد تک پابند ہے! حضرت شیخ سعدی علیہ الرحمۃ جو شعر و ادب کی صحت اور نفسیات نگاری میں اپنا جواب نہیں رکھتے، فرماتے ہیں ———

وامش مدہ آں کہ بے نماز است

یعنی جو کوئی نماز ادا نہیں کرتا اُسے قرض نہیں دینا چاہئے ——— کیونکہ بے نماز ہونا اس کی دلیل ہے کہ وہ شخص فرض شناس نہیں ہے، جو شخص اللہ تعالیٰ کا فرض ادا نہیں کرتا وہ قرض کیا ادا کرے گا!

حکومتوں کے قومی ترانے جن کی دین میں کوئی اصل نہیں ہے اُن کے احترام پر حکومتیں عوام کو مجبور کرتی ہیں کہ جب وہ بجائے جائیں تو سننے والے کھڑے ہو جائیں لیکن فریضہ نماز کی اہمیت اور فرضیت نگاہوں سے اوجھل ہو گئی ہے۔

"صلوٰۃ" جیسے اہم ترین فرض سے جب غفلت کا یہ عالم ہے تو دوسرے فرائض و ارکان سے اعتنا کی کیا توقع کی جا سکتی ہے یہ تو جب مسلم حکومتوں کا "معروف" کے ساتھ برتاؤ ہے! اس کے مقابلہ میں "منکرات" پر کوئی تدغن نہیں، بلکہ بعض منکرات و فواحش کی تو علی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کی جاتی ہے شراب، سود، قمار اور اس قسم کے دوسرے "منکرات" کو کھلی ہوئی چھوٹ ملی ہوئی ہے، کافر ریاستوں اور غیر مسلم حکومتوں میں ان "منکرات" کی مقبولیت اور معاشرے میں رواج کا جو رنگ ہے، مسلم ممالک میں بھی وہی رنگ نظر آتا ہے بلکہ پہلے کے مقابلے میں یہ رنگ اور زیادہ گہرا اور تیز ہو گیا ہے۔

اسلام نے حلال و حرام کا جو نظام مقرر کیا ہے، جن چیزوں کو حرام ٹھیرایا ہے اور جن باتوں کو حلال قرار دیا ہے اس پر غور کرنے تک کی زحمت ہی برداشت نہیں کی گئی اس بات کی طرف دھیان ہی نہیں گیا کہ اسلام نے روزی کمانے کے لئے حلال اور پاک ذریعے کی تاکید کی ہے۔ ناجائز ذرائع سے جو دولت حاصل ہوتی ہے وہ اسلام کی نگاہ میں نجس اور ناپاک ہے، یہ نجاست جب معاشرے میں گھل مل جاتی ہے تو زندگیوں کی پاکی اور طہارت باقی نہیں رہتی! اور جس زندگی میں طہارت نہ ہو وہ انسانی سوسائٹی کے لئے وبال ہے ——— جس جسم کی پرورش حرام کمائی اور ناجائز روزی سے ہوتی ہے، حدیث شریف میں اُس جسم کے لئے بڑی شدید وعید آئی ہے۔

مسلم حکومتیں اگر اپنے دینی فرائض کو پہچانتیں اور اللہ تعالیٰ کے کلمہ کو بلند و غالب کرنے کا انہیں احساس ہوتا تو "ربٰوا" کو منکر سمجھ کر اس پر پابندی لگاتیں اور دنیا پر ثابت کر دیتیں کہ ربٰوا کی حرمت پر قرآن کا فیصلہ حق ہے:- تجارت بے سود بھی چل سکتی ہے اور معاشی کاروبار اور تجارتی لین دین کے لئے "سود" کوئی ناگزیر ضرورت نہیں ہے، یہ بلائی تو سرمایہ دارانہ ذہنیت کی پیداکی ہوئی ہے اور یہودیوں، بنیوں، مہاجنوں اور ساہوکاروں نے "سود" کی لعنت کو رواج دیا ہے، تجارت میں نفع و نقصان اور سرمایہ کے تحفظ کی ضمانت کے ایسے ذرائع اور بدل بھی موجود ہیں، جن کا "ربٰوا" سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

یہ کیا ہو رہا ہے؟

یورپ میں مرد و زن کے آزادانہ اور بیباکانہ اختلاط اور عورتوں کی فتنہ بے حجابی نے وہاں کے معاشرے کو پستی کی جس حد تک پہونچا دیا ہے وہ کسی ثبوت کا محتاج نہیں ہے، اس معاملہ میں اُن کی زندگیاں سچ مچ حیوانوں جیسی ہو گئی ہیں بلکہ وہ وقت یورپ پر آچکا ہے کہ "دوشیزگی اور عصمت" کے الفاظ بس لغات اور کتابوں میں لکھے ہوئے ملتے ہیں، واقعہ اور وجود اور معنویت کے لحاظ سے یہ الفاظ اب شاید نہیں پائے جاتے۔ مسلم ممالک میں بھی اس فتنہ کو پروان چڑھنے کے مواقع مل رہے ہیں، یہاں کے معاشرے میں وہی رنگ پیدا ہو چلا ہے، اخلاق کی تباہی اور معاشرے کے بگاڑ کا کسی کو احساس تک نہیں، ہماری جن بہو بیٹیوں اور ماؤں اور بہنوں میں سیدہ فاطمہ اور حضرت عائشہ کے مقدس کردار کی جھلک اور خوبو پیدا ہونی چاہئے تھی وہ "گریٹا گاربو" اور دلیلہ کا ثانی بنتی جارہی ہیں، گراوٹ کی حد ہو گئی کہ بعض مسلمان عورتیں "شراب" تک پینے لگی ہیں۔

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھئے

مسلم ممالک کے آزاد ہو جانے کے بعد مرد و زن کے بیباکانہ اختلاط اور عورتوں کے فتنہ بے حجابی کا جو بُت ٹوٹا ہے اور جس تیزی کے ساتھ اخلاق و شرافت کے بند ڈھیلے ہونے بلکہ ٹوٹتے چلے جا رہے ہیں یہ اتنا شدید المیہ ہے جس پر غم و افسوس کے اظہار کے لئے الفاظ نہیں ملتے! یہ خرابی اسی حد پر پہونچ کر ختم نہیں ہو جاتی مسلمان لڑکیوں کو رقص و سرود کے مظاہروں کے لئے اسٹیج پر لایا جا رہا ہے، مسلم ممالک میں "کلچرل شو" کے نام پر ان فواحش کا کھلے بندوں ارتکاب ہوتا ہے اور فخر کے ساتھ اخبارات میں ان شرمناک مناظر کی تصویریں چھپ رہی ہیں! اسلام نے عورت کی عزت و عصمت کی حفاظت کے لئے جو فطری حصار قائم کئے تھے ان کو توڑ کر مسلمانوں کو دین و دنیا کی رسوائی کے سوا اور کیا حاصل ہو سکتا ہے! مسلمان عورتیں اور رقص و سرود کے مظاہرے! خدا کی پناہ! دنیا کے سامنے اسلامی تہذیب و ثقافت کا یہ کتنا بڑا تعارف اور اسلام کے ساتھ کیسا افسوسناک مذاق ہے۔ طوائفوں کے نسبتی پیشہ کو اس طرح کلچر کے نام پر "گھریلو" اور "مہذب و شریف" بنا دینا، یہ اگر کارنامہ ہے تو بہت بڑا کارنامہ ہے!

ان برائیوں کے ساتھ جن مسلم ممالک میں اسلام کی ریسرچ ہو رہی ہے اور دین کی علمی تشریح و تحقیق کا کام جاری ہے وہاں اسلام کو ماڈرن بنانے کی کوشش کی جا رہی ہیں، دینِ فطرت کسی جدید تحقیق اور نئی ریسرچ کا متقاضی نہیں ہے، اللہ اور رسول کے بتائے ہوئے احکام ہر جہت سے درست، صحیح، حق اور انسانیت کے لئے مفید ہیں، جس کو حلال قرار دیا گیا ہے اُسے کوئی حرام نہیں کر سکتا اور جسے حرام ٹھیرا دیا گیا ہے اس پر حلت کا فتویٰ نہیں لگایا جاسکتا، دین کی بنیادی قدریں ازلی و ابدی ہیں فرض، واجب، سنت، مستحب، مباح ان تمام درجات کی تفصیل اسلامی لٹریچر میں ملتی ہے، دین کی کسی قدر پر نہ اضافہ ممکن ہے اور نہ اس میں کمی کی جا سکتی ہے! ہاں تحقیق اور ریسرچ دین کے احکام، قدروں، روایتوں اور نظریوں کی عملی تشکیل کی خاطر اور ان کی افادیت و اہمیت پر نفسیات، فلسفہ، سائنس، عمرانیات اور دوسرے علوم سے دلیل و سند لانے کی غرض سے ہو سکتی ہے اور ہونی چاہئے! مگر ہو یہ رہا ہے کہ اللہ اور رسول کے احکام میں ریسرچ اور تحقیق کے نام پر قطع و برید کی جا رہی ہے وہ سود ہو، بے پردگی ہو، یا رقص و موسیقی ہو ان مکروہات کے جواز کے لئے دین میں گنجائشیں نکالی جا رہی ہیں۔ خوب و ناخوب کا معیار یورپ کا ذہن و فکر بن کر رہ گیا ہے، اسی معیار پر مسائل و اشیاء کو پرکھا جاتا ہے۔ حالانکہ امت مسلمہ کو اللہ تعالیٰ نے چیزوں کے پرکھنے کے لئے کتاب و سنت کی کسوٹی دی ہے جو چیز اس کسوٹی پر پوری نہیں اترتی وہ کھوٹی اور ناقص ہے اسے

رد کر دینا چاہئے اور یہ کسوٹی جسے کھرا بتاتی ہے وہ قابل قبول، لائق عمل اور مستحق احترام ہے۔

اللہ تعالیٰ نے دین کو کامل فرمادیا، اس میں خدانخواستہ کسی قسم کی کوئی کور کسر باقی نہیں رکھی اور کسی کوتاہی اور کمی کو نہیں رہنے دیا گیا دین کا اتمام و تکمیل کیا تھا آخری کتاب اور آخری نبی کو بھیج دیا گیا، اب قیامت تک کوئی شخصیت یہ دعویٰ نہیں کرسکتی کہ مجھ پر "وحی" آتی ہے جس کا ماننا اُمت پر فرض ہے! اسلام کا نظام ہر جہت سے مکمل ترین نظام ہے جو زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہے، سیاست و معیشت، تجارت و اقتصادیات، تہذیب و تمدن غرض زندگی کی ہر منزل میں اسلام ہدایت دیتا ہے: ——— مگر اس احساس کمتری کو کیا کہئے کہ اس مکمل نظام حیات اور تحریک دین کا سوشلزم اور کمیونزم سے پیوند جوڑا جارہا ہے! اسلام کے ساتھ کسی دوسرے "ازم" (ISM) یا مکتب فکر اور نظام حیات کا جوڑ لگانا دراصل دین کے نامکمل اور افکار غیر کے محتاج ہونے کا اعلان ہے، جو کسی مسلمان کو زیب نہیں دیتا۔ کہنا یہ چاہئے کہ ہمیں اسلام اور صرف اسلام چاہئے وہ دین کامل جو حکومت، تجارت، سیاست اور معیشت، تعلیمات صلح اور جنگ غرض زندگی کے تمام شعبوں میں آزمایا جاچکا ہے اور کسی دور میں بھی اس کے اندر ذرہ برابر کمی اور تشنگی محسوس نہیں کی گئی اسی دین کو لے کر عرب کے صحراء سے جو لوگ تدریسیہ اُٹھے تھے انہوں نے قیصر و کسریٰ کے محلوں میں اللہ تعالیٰ کے کلمہ کو بلند کیا اور اسلامی تہذیب و تمدن کی بنا قائم کردی ان سے بہتر فاتح ان سے اچھے حاکم دنیا آج تک پیدا نہیں کرسکی تنہا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی بلند و بالا شخصیت کے سامنے ساری دنیا کے حکمراں اور فرمانروا پست قامت اور بونے نظر آتے ہیں!

ان حالات کے ساتھ مسلمان ملکوں میں یہ بھی ہورہا ہے کہ جو خدا کے نیک بندے اللہ تعالیٰ کے دین کا غلبہ اور نظام اسلام کو برپا کرنا چاہتے ہیں اُن کے میدانِ عمل کو تنگ سے تنگ تر کیا جارہا ہے اُن کی راہ میں مشکلات پیدا کی جارہی ہیں وہ بے چارے عتاب و ستم کا ہدف بنے ہوتے ہیں ان کے احتجاج کو دبا دیا جاتا ہے ان کی بات پبلک تک پہونچنے نہیں دی جاتی، ان پر طرح طرح کے الزامات لگاکر عوام میں ان کو بدنام، بے وقار اور مشتبہ بنانے کی کوشش کی جاتی ہے سب سے بڑی مثال جمال ناصر کی حکومت کا وہ ظالمانہ کارنامہ ہے جس نے "اخوان المسلمون" جیسی عظیم دینی تنظیم کو تباہ کردیا!

مسلمان ملکوں میں ایسے قوانین بنتے اور ایسے فرمان نافذ ہوتے رہتے ہیں، جن کے ذریعہ شورائیت اور جمہوریت جو اسلامی سیاست کا طرۂ امتیاز ہے بے اثر بلکہ مفلوج ہوتی چلی جارہی ہے تاکہ عوام جن کو "کالانعام" کہا جاتا ہے، وہ بھیڑ بکریوں کا گلہ بن کر رہ جائیں جن کی تادیب کے لئے گلہ بان کی چھڑی کی وہ جنبش ہی بہت کافی ہیں بلکہ بسا اوقات تو چھڑی کی جنبش ہی تلوار کی فصل و حرکت کا رخ بدل دیتی ہے۔

مسلمان ملکوں کے اخبارات، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور نشر و اشاعت کے دوسرے ذرائع اس کی شہادت دے رہے ہیں کہ وہاں ارباب اقتدار کا اس حکمت اور ہوشیاری کے ساتھ پروپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ کوئی دوسری آواز سنائی ہی نہیں دیتی، نہ ملک میں کوئی قیادت اُبھرتی نظر آتی ہے! پھر لطف یہ ہے کہ مطلق العنانی کے اس نظام ہی کو انسانیت اور ملک و ملت کے لئے مفید بتایا جاتا ہے کہ یہی طرزِ حکومت ملک کی سالمیت ترقی اور بقاء کا ضامن ہے جو لوگ اس نظام حکومت سے خوش نہیں ہیں وہ ملک کے دشمن اور امن شکن ہیں! اس منطق کی رو سے انتشار پسند اس بات کے مستحق قرار پاتے ہیں کہ تادیب و تعزیر ہی کے مستحق قرار پاتے ہیں۔

دنیا میں ہر حکومت کو خوشامدی اور جی حضوری میسر آجاتے ہیں سرکار دربار میں تقریب کی تمنا، مالی فتوحات کا لالچ اور اسی قسم کی تمام طمع کی صفتیں آدمی کو بے ضمیر بنا دیتی ہیں اور وہ بڑی سے بڑی زیادتی اور ظلم و تعدی کو عین انصاف کہہ کر انعام و اکرام کی امید رکھتا ہے یہاں تک کہ بعض جاہ پسند علماء دین تک ارباب اقتدار کے ہوا خواہ بن جاتے ہیں، نفس یہ چکمہ دیتا ہے کہ بڑے آدمیوں سے قریب ہو کر تم انہیں دین سے قریب لانے کا کام سر انجام دے سکتے ہو، احتجاج، نکتہ چینی اور علیحدگی کے مقابلہ میں تعاون، نرمی اور قربت مفید ہے مگر ہوتا یہ ہے کہ اس قربت کی بدولت اُن کے پاس گرو کی جو کچھ تھوڑی بہت دینی متاع ہوتی ہے وہ بھی صحیح سلامت نہیں رہتی۔ جس نے بھی کہا خوب کہا کہ ———

— پُس الفقیر علیٰ باب الامیر

مغلیہ سلطنت کے مشہور بادشاہ جلال الدین اکبر کے دربار میں جہاں کاسہ لیس اور ہر طرح کی قسم کے علماء تھے، وہاں ملا عبدالقادر بدایونی کی شخصیت

بھی تو نظر آتی ہے جس نے مطلق العنان شہنشاہ کے عتاب کی پرواہ نہ کرتے ہوئے کلمۂ حق بلند کیا اور فرمان شاہی کی ذرا بھی پروا نہیں کی! امویوں کے دور کے ایک باضمیر عالم نے خلیفہ کے فرمان اور حکمنامہ کو جس میں خلاف شرع بات کی تائید کا فتویٰ طلب کیا گیا تھا، اپنی بکری کے سامنے ڈال دیا، بکری چارے کے ساتھ شاہی فرمان کے کاغذ کو بھی چر گئی! حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ تعالیٰ کی زندگی میں، خلیفہ ہارون الرشید کو خط لکھ کر دینی خیر خواہی کا حق ادا کیا، اس خط میں حضرت ثوری رحمۃ اللہ نے خلیفہ کی زندگی پر، بیت المال کے اسراف پر اور دوسری زیادتیوں پر سختی کے ساتھ تنقید کی، ہارون الرشید کو مرحبا اور صد آفرین کہ اس نے عتاب و برہمی کی بجائے اس خط کو صحیفہ ہدایت سمجھا اور سوتے وقت خط کو پڑھتا تھا اور روتا تھا۔ جہانگیر کی شاہانہ ہیبت کو حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی عزیمت، استقامت اور حق گوئی کے آگے جھکنا پڑا اور آخر کار بیعت ارادت و عقیدت قبول کرنی ہی پڑی!

سلطان علاؤ الدین خلجی کا واقعہ ہے، ایک عالم کو جو خوش الحان قاری بھی تھے، قصر شاہی میں بلایا، گفتگو کے دوران نماز کا وقت ہو گیا۔ بادشاہ نے اس عالم دین کی اقتدا میں نماز ادا کی، نماز ختم ہو چکی تو سلطان نے مودبانہ لہجہ میں کہا کہ حضرت! نماز کا لطف آج آپ کی امامت میں آیا ہے، میری درخواست ہے کہ اب آپ محل میں نماز پڑھانے کی زحمت گوارا فرمایا کریں۔ اس عالم دین نے اس کے جواب میں کہا، سلطان! دین کی بھلائیوں میں سے اس فقیر کے پاس لے دے کے صرف نماز رہ گئی ہے تو آپ اسے بھی چھین لینا چاہتے ہیں۔

پیران پیر حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ سلطان وقت کو جب کبھی خط لکھتے تھے تو اس کا آغاز اس طرح فرماتے تھے "عبد القادر تجھے حکم دیتا ہے" سلطان حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر ہوتا تو آنے کی اطلاع پا کر اندر چلے جاتے، سلطان آکر بیٹھ جاتا تو باہر تشریف لاتے اور سلطان کھڑے ہو کر آپ کا استقبال کرتا۔

ایک بادشاہ ایک درویش کی پاکبازی اور شرافت و کرامت کا شہرہ سن کر ان سے ملنے کے لئے گیا، درویش نے بادشاہ کے سامنے جہاں وہ بیٹھا تھا، بے پروائی کے ساتھ پاؤں پھیلا دیا، جب بادشاہ درویش سے مل کر واپس چلا گیا تو اس کے بعض ہم نشینوں نے عرض کیا کہ حضرت! بادشاہ آپ کو یہاں بلانے کی بجائے خود آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا، آپ اس کی تکریم و تعظیم نہ فرماتے مگر آپ نے تو اس کے آگے پائے مبارک کو دراز فرما دیا۔ درویش نے جواب دیا، لوگوں سے ملنے جلنے اور تعظیم و استقبال کے اصول میں جانتا ہوں، مگر حدیث شریف ہے ——— التکبر مع المتکبر صدقۃ ——— تکبر کرنے والے کے ساتھ تکبر سے پیش آنا نیکی کا کام ہے، ایک تو اس حکم کی تعمیل مقصود تھی، دوسرے بادشاہ اور دوسرے دیکھنے والوں کو یہ جتانا منظور تھا کہ دنیا سے جو شخص ہاتھ کھینچ لیتا ہے وہ بادشاہ وقت کے آگے پاؤں پھیلا سکتا ہے!

عباسیوں کے عہد خلافت میں ایک خلیفہ جو علماء اور مفتیوں کو تحفے اور ہدیئے بھیجا کرتا تھا، اسے ایک مسئلہ میں علماء دین سے فتویٰ کی ضرورت واقع ہوئی، وزیر متعلقہ بادشاہ کی مرضی کے مطابق فتویٰ مرتب کر کے علماء کے یہاں پہنچا۔ بہت سوں نے اس فتویٰ کی تصویب کرتے ہوئے دستخط کر دئے مگر ایک عالم نے انکار کر دیا، وزیر نے اصرار کیا اور بات بڑھنے لگی تو وہ عالم دین گھر کے اندر گیا اور سلطان کے بھیجے ہوئے تحائف اور ہدیئے وزیر کے سامنے ڈالتے ہوئے کہا کہ میں نے سلطان کی بھیجی ہوئی کسی ایک چیز کو بھی ہاتھ نہیں لگایا، مجھے معلوم تھا کہ ایک نہ ایک دن ایسا وقت آنے والا ہے، آپ ان شاہی ہدیوں کو واپس لے جائیں، میں شرع کے خلاف فتویٰ نہیں دے سکتا۔

یہی وہ علماء حق تھے، جن سے اسلامی تاریخ تابناک ہے انہی کی حق پرستی کی بدولت سچائی کے نقوش آج تک روشن و منور ہیں، حضرت سیدنا امام ابو حنیفہؒ نے "چیف جج" (قاضی القضاۃ) کے منصب جلیلہ کی پیشکش کو ٹھکرا کر اس کی پاداش میں عتاب شاہی کا نشانہ بننا گوارا کیا، امت ان نفوس قدسیہ کے کارناموں پر فخر کر سکتی ہے (رحمہم اللہ کثر اللہ امثالہم)

مسلمان ملکوں کے جن حالات کی تفصیل پیش کی گئی ہے وہ واقعات اور حقائق ہیں۔ جن میں نہ کسی مبالغہ سے کام لیا گیا ہے اور نہ مفروضہ طور پر کوئی بات زیب داستان کی خاطر بیان کی گئی ہے، جن حضرات نے ان ملکوں کی سیر و سیاحت کی ہے اور وہاں کے حالات کا پتہ لگایا ہے وہ

۵
آزمودہ دواؤں کا مرکب
اناجین
سردرد - کمر کا درد - دانت کا درد
ایام - انفلوئنزا اور ہر قسم کے دوسرے درد کے لئے
یقینی زود اثر اور بے ضرر علاج ہے
Opal

انور عالم

ذہنی اُلجھاؤ اور سلبی تفکر

(۲)

دنیا کے تمام دساتیر کا پہلا نکتہ حاکمیت یا اقتدار اعلیٰ (SOVEREIGNTY) کا تعین ہوتا ہے سیاسی اصلاح میں حاکمیت کا مفہوم ہے اس کی وضاحت کے لئے چند سیاسی مفکرین کی آراء و نقطہ ہائے نظر نقل کرنا مناسب ہوگا۔

اقتدار اعلیٰ یا حاکمیت جس کو انگریزی میں ساورنٹی کہتے ہیں لاطینی لفظ SUPERANUS سے ماخوذ ہے جس کے معنی اعلیٰ و برتر کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ بوڈین (BODIN) نے اقتدار اعلیٰ کی تعریف یہ کی ہے کہ "شہریوں اور رعایا پر سیاست کا ایک حق جو قانونی حد بندیوں سے آزاد ہو" دوسرے مفکر گلکرائیسٹ (GILLCHRIST) کے نزدیک تعریف یہ ہے "یہ وہ ذی اختیار ہے جس کو اور قانون قطعی اور آخری حکم نافذ کرنے کا اختیار ہو" روسو (ROUSSOU) کے نزدیک اقتدار اعلیٰ ناقابل انتقال۔ ناقابل تقسیم ناقابل خطا اور مطلق العنان ہوتا ہے۔

اقتدار اعلیٰ کی اس تشریح کے بعد یہ بات قطعی ہو جاتی ہے کہ اسلام میں نہ تو کوئی شخص یا ادارہ قانون سے بالاتر ہو سکتا ہے اور نہ ناقابل خطا اور مطلق کیونکہ اگر کسی کی نسبت یہ تمام حقوق تسلیم کر لئے جائیں تو پھر قرآن کی قائم کردہ حدود حلت و حرمت کا اس کو پابند نہیں کیا جا سکتا، اسی لئے اسلام میں یہ حق صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لئے مختص ہے۔

الذی لہ ملک السموات والارض ولم یتخذ ولداً ولم یکن لہ شریک فی الملک۔

(الفرقان ۲)

وہ جو زمین اور آسمان کی بادشاہی کا مالک ہے جس نے کسی کو بیٹا نہیں بنایا ہے اور جس کی بادشاہی میں کوئی شریک نہیں۔

ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولٰئک ھم الکافرون

(المائدہ ۲)

اور جو اللہ کے نازل کئے ہوئے قانون کے مطابق فیصلے نہ کریں وہی کافر ہیں۔

ان آیات مقدسہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ زمین کی فرماں روائی اور حاکمیت صرف خدا کے لئے ہی ہے اور چونکہ وہ ہی مقتدر اعلیٰ ہے اس لئے اس کے نازل کردہ احکام اور حد بندیاں جن کا ذکر قرآن اور سنت میں موجود ہے قطعی اور آخری حیثیت رکھتی ہیں جن میں کوئی بھی تبدیلی کا مجاز نہیں ہو سکتا۔

جو لوگ فخر اور ناز کے ساتھ یہ دعویٰ فرما رہے ہیں کہ اسلام امت مسلمہ کو کوئی دستور اساسی نہیں دیتا وہ بتائیں کہ قرآن کے اس فیصلہ پر ان کی ملتہ کیا ہے اور قرآن کا فیصل کردہ یہ نکتہ ایک دستوری معاملہ ہے یا نہیں؟

دستور کے ضمن میں دوسری بات جو ہر حکومت کو طے کرنی ہوتی ہے وہ یہ کہ ریاست کا مقصد وجود کیا ہے۔ بادشاہی نظام میں یہ مقصد شخص واحد کی سطوت و عظمت کی برتری رعب و جلال کا تفوق عیش و نشاط کی فراوانی کا ذاتی حصول اور خزانہ کو مال و زر سے معمور کرنے کی فکر ہے، مغربی جمہوریت میں حریت و مساوات کا حصول سیاسی حقوق و فرائض کی منصفانہ تقسیم اور رائے عامہ کی برتری ہے۔ اشتراکیت میں معاشی مساوات کا جبری نظام اور پرولتاریہ کی سیاسی فوقیت کا تصور ہے مگر اسلام ان سب کے بالمقابل ایک ہمہ گیر پاکیزہ نظریہ دیتا ہے۔

الذین ان مکنٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ	وہ لوگ جن کو اگر ہم نے زمین پر غلبہ و تمکن دیا تو یہ نماز
و اٰتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر	قائم کریں گے زکوٰۃ ادا کریں گے اور اچھائیوں کا حکم دیں گے برائیوں سے روکیں گے۔

اسلامی ریاست کے مقصد وجود کو چار جامع الفاظ قیام صلوٰۃ، ادائے زکوٰۃ، حکم نیکو کاری اور امتناع بدی میں ادا کیا گیا ہے۔ زیادہ طوالت کا یہ موقع نہیں ہے مگر یہ چار باتیں انسانیت کو ایسے پاکیزہ اور تعمیری معاشرہ سے روشناس کرا سکتی ہیں جس کی آج اس کو سب سے زیادہ تلاش ہے۔ پہلی بات نماز انسان میں عجز اور بندگی کا احساس پیدا کرتی ہے اور یہ احساس مجموعی حیثیت سے ایک ایسی سوسائٹی معرض وجود میں لاتا ہے جس میں حاکم و محکوم، سطیع و مطاع، آقا و بندہ اور بلند و پست کے فرضی امتیازات کی کوئی گنجائش نہیں ہو سکتی اور جس کے اندر ہر فرد اپنی ذمہ داریوں کو حصول رضائے الٰہی کے جذبہ کے تحت انجام دیتا ہے اور اس طرح ذاتی اقتدار کی ہوس رنگ و نسل کے تعصبات جیسی ننگ انسانیت برائیوں کا قلع قمع ہو جاتا ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ کی بنیاد پر جو مالیاتی نظام وجود میں آتا ہے وہ ریاست کے ہر فرد کو کفالت و تکمیل احتیاجات کی ضمانت فراہم کر کے معاشرہ کو معاشی ناہمواری سے بچاتا ہے۔

انسانی سوسائٹی اس وقت تک تعمیری استحکام حاصل نہیں کر سکتی جب تک اس کو مسلسل برائیوں سے بچا کر نیکی کی مسلسل اقدار سے بہرہ ور نہ کیا جائے، جس سوسائٹی میں برائیوں کو فروغ حاصل ہوتا ہے اس کی زندگی بھی نقش بر آب سے زیادہ نہیں ہوا کرتی اس لئے اسلامی ریاست کا یہ اولین فرض ہوتا ہے کہ وہ برائیوں کا خاتمہ کرے اور اچھائیوں کو فروغ دے۔

کسی دستور کا تیسرا نکتہ حکومت کے قانون سازی کا دائرہ عمل (LEGISLATIVE JURISDICTION) ہوتا ہے، اس ضمن میں اسلامی حکومت اُن تمام قیود اور حدود کی پابند ہوگی جن کی وضاحت قرآن اور سنت میں موجود ہے مثلاً زنا، شراب نوشی اور جوا وغیرہ قابل تعزیر اور ممنوع تصور ہوں گے ان کے جواز کے لئے کوئی قانون بنانا ریاست کے دائرہ اختیار سے باہر تصور ہوگا کیونکہ اسلامی ریاست بذات خود مقتدر اعلیٰ (SOVEREIGN POWER) نہیں ہے بلکہ اقتدار الٰہی کی نیابت کی مظہر ہوتی ہے اور یہ ظاہر بات ہے کہ کسی اعلیٰ (SUPREME) کا حکم ادنیٰ یا ماتحت (SUBORDINATE) منسوخ نہیں کر سکتا۔

وما کان لمومن ولا مومنۃ اذا قضی اللہ ورسولہ	کسی مومن یا مومنہ کا یہ کام نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا
امراً ان یکون لھم الخیرۃ من امرھم	رسول کسی بات کا فیصلہ کر دیں تو ان کے لئے کوئی اختیار یا پسند
(الاحزاب م)	کا موقع رہ جائے۔

البتہ ریاست اسلامی کسی دستوری بات کی تفصیل و تعبیر (DEFINATION) یا اس کے طریقہ کار نفاذ (PROCEDURE OF IMPLIMENT) یا معاملات نظم و نسق کے لئے انتظامی قانون (ADMINISTRATIVE LAW) وغیرہ بنانے کی مجاز ہوگی مگر اس کا کوئی قانون قرآن یا سنت کے کسی حکم کے منافی و مخالف (REPUGNANT) ہوا تو اس قانون کو قطعی غیر موثر (INVALID) تصور کیا جائے گا۔

کسی دستور میں یہ بات بھی طے کرنی جاتی ہے کہ انتظامیہ اور عدلیہ کا دائرہ عمل کیا ہوگا۔ اسلامی حکومت میں انتظامیہ حدود اللہ کے نفاذ و تحفظ اور

معاشرہ کی اسلامی تربیت و عادلانہ نظم ونسق کی ذمہ دار ہوگی وہ کوئی ایسا حکم دینے کی مجاز نہ ہوگی جس کے تحت حدود الٰہیہ کی خلاف ورزی ہو۔

ولا تطیعوا امر المسرفین الذین یفسدون فی الارض ولا یصلحون (الشعراء)	اور ان حد سے گذر جانے والوں کے حکم کی اطاعت نہ کرو جو زمین میں بگاڑ پیدا کرتے ہیں اصلاح نہیں کرتے۔

مجلس عدالت کا کام بھی یہ ہی ہوگا کہ وہ انفرادی و اجتماعی معاملات یا کسی نزاعی معاملہ جس کے تحت فرد اور انتظامیہ (EXECUTIVE) میں اختلاف ہو قرآن اور سنت کی بنیاد پر اپنے فیصلوں کو صادر کرے۔

فاحکم بینھم بما انزل اللہ ولا تتبع اھواءھم عما جاءک من الحق۔	پس تم لوگوں کے درمیان اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ کرو اور حق کو چھوڑ کر جو تمہارے پاس آیا ہے لوگوں کی خواہشات کی پیروی مت کرو۔

شہریوں کے حقوق اور ان کی ذمہ داریوں کا تعین بھی ایک دستوری مسئلہ ہے اس معاملہ میں بھی قرآن اور سنت کا مسلک بالکل واضح ہے۔
اسلامی سیاست چونکہ ایک نظریاتی (IDEALOGICAL) یا اصولی بنیاد پر اپنا اجتماعی نظام تعمیر کرتی ہے اس لئے وہ سیاسی حقوق (POLITICAL RIGHTS) میں مسلم اور غیر مسلم کا امتیاز رکھتی ہے۔ آخر ایک نظریاتی نظام میں مملکت کے کلیدی مناصب اُن لوگوں کو کیوں کر دئے جا سکتے ہیں جو اُس نظام کی بنیادی باتوں پر ایمان اور یقین نہ رکھتے ہوں ہر نظریاتی نظام اپنے اصولوں کے تحفظ اور بقا کے لئے یہ اقدامات کرتا ہے آج بھی اشتراکی اور سوشلسٹ حکومتیں اس سلسلہ میں بطور نظیر پیش کی جا سکتی ہیں۔ بہرحال اسلامی ریاست میں کلیدی عہدوں پر اُن لوگوں کو فائز نہیں کیا جا سکتا جو اسلام کو اپنا دین نہ تسلیم کرتے ہوں۔ اس کے علاوہ تمام شہری حقوق (CIVIL RIGHTS) میں اسلام مسلم اور غیر مسلم کے درمیان مکمل مساوات قائم کرتا ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے شہریوں کے مندرجہ ذیل حقوق ہیں۔

(ا) شہریوں کا یہ حق ہے کہ ان کے جان، مال اور عزت کا تحفظ کیا جائے اور بغیر کسی قانونی جواز و چارہ جوئی کے ان کو اس حق سے محروم نہ کیا جائے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

ان دماءکم واموالکم واعراضکم حرام کحرمۃ یومکم ھذا	تمہاری جانیں تمہارے مال اور تمہاری عزتیں ویسی ہی حرمت رکھتی ہیں جیسے حج کے اس دن کی حرمت۔

(ب) شخصی آزادی کا تحفظ اور احترام نفس۔ اسلامی معاشرہ میں ہر شخص جائز حدود میں حریت اور احترام کا مساوی حقدار ہے۔ کسی فرد کو اس حق سے بجز قانونی چارہ جوئی اور عدل و انصاف کے مسلمہ تقاضوں کی تکمیل کے بغیر محروم نہیں کیا جا سکتا بغیر اس کے ہر تعزیری یا امتناعی اقدام ایک غیر عادلانہ فعل ہوگا جو قرآن کے قیام عدل کے حکم سے متصادم ہوتا ہے۔

ان اللہ یامر بالعدل والاحسان (النحل)	اللہ حکم دیتا ہے عدل اور نیکی کا

یہ ہی وجہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا ہے کہ

لا یوسر رجل فی الاسلام بغیر عدل	اسلام میں بغیر انصاف کے کسی فرد کو قید نہیں کیا جا سکتا۔

(موطا۔ باب شرط الشاہد)

(ج) اسلامی ریاست میں ہر فرد کو ذمہ داران نظم ونسق کی غلطیوں اور بے راہ رویوں پر تنقید و اعتراض کا پورا پورا حق حاصل ہوتا ہے کیونکہ اظہار خیال کی آزادی ہر فرد کا مساوی بنیادی حق ہے جس کو ختم کر کے کسی مخصوص طبقہ کو گرفت احتساب و نقد سے بالاتر قرار دینا نہ صرف فرد کے فطری حق کی نفی بلکہ قومی ہلاکت کو کھلی دعوت دینا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

ما من قوم یعمل بالمعاصی وفیھم من یقدر
ان یغیر علیھم فلم یغیر الا یوشک ان یعمھم
اللہ بعذاب من عندہ

جس قوم کے اندر بھی برائیوں کا ارتکاب کیا جاتے اور اُن
میں ایسے لوگ بھی موجود ہوں جو برائیوں پر ٹوک سکیں مگر وہ
تبدیلہ کریں تو جلد اللہ اُن سب کو عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے

(۳) اسلامی ریاست ہر شہری بنیادی ضروریات زندگی کی ضمانت کا حصہ ہے۔ کوئی شخص حالات اور گردش کا شکار ہو جاتے تو اس کی کفالت کی ریاست پر ذمہ داری ہوگی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

السلطان ولی من لا ولی لہ
من ترک کلا فالینا

حکومت ہر اُس شخص کی ذمہ دار ہے جس کا کوئی ذمہ دار نہ ہو
جس مرنے والے نے ذمہ داریاں کا کوئی بوجھ چھوڑا وہ ہمارے ذمہ ہے

چنانچہ خلافت راشدہ میں معذور اور اطفال وغیرہ کے وظائف کا تعین اس کی مثال ہے۔

حق شہریت کا مسئلہ بھی ایک دستوری موضوع ہے اسلام اس حق کے لئے محض وطنی (Jus - Soli) یا نسلی بنیاد (Jus - Sanguinis) کو تسلیم نہیں کرتا چونکہ وہ ایک ہمہ گیر نظریاتی نظام کا دعوار ہے اس لئے حق شہریت کی بنیاد وہ نظریہ کو قرار دیتا ہے ملک، نسل یا خاندان کو نہیں تفصیل کے لئے سورہ الانفال - ۷۲ کا مطالعہ کیا جائے۔

سربراہ مملکت کے طریقہ کار، تعین اور اس کی شرائط ہر دستور کا ایک بنیادی مسئلہ ہے اسلامی نقطہ نگاہ کو سمجھنے کے لئے یہ تصفیہ ناگزیر ہے کہ اسلام میں اجتماعی نظام کی نوعیت اور حقیقت کیا ہے۔ انسانی تصورات نے حکومت کی آج تک جتنی اور جیسی صورتیں جنم دی ہیں اُن سب کے اندر یہ قدر مشترک موجود ہے کہ وہ کسی نہ کسی سطح پر سارے اختیارات حکمرانی کسی طبقہ، کسی نسل یا خاندان اور گروہ تک محدود کر دیتے ہیں جس کے نتیجہ میں انسانی معاشرہ کی عظیم کثرت ایک تنیں طبقہ کی بندگی پر مجبور ہو جاتی ہے۔ اسلام بنی نوع انسانیت میں شخصی یا طبقاتی تفریق کو تسلیم نہیں کرتا بلکہ پوری بنی نوع انسانیت کو روئے ارض پر خدا کی نیابت کا حقدار قرار دیتا ہے۔ انی جاعل فی الارض خلیفہ۔

ہر وہ شخص جو اس ذمہ داری سے تمرد اور سرکشی اختیار نہیں کرتا، خدا اور اس کی وحی و رسول پر ایمان لا کر اور اس کے نازل کردہ قوانین کے اتباع عملاً نیکی کی زندگی اختیار کر کے اپنے نائب ہونے کا اقراری عہد (Affirmation) کر لیتا ہے وہ خدا کی عطا کردہ خلافت میں مساوی شریک کار ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن کی وعید خلافت میں مخاطب واحد یا فردی نہیں بلکہ مخاطب جمع و افرادی ہے۔

وعد اللہ الذین امنوا منکم وعملوا الصلحت
لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین
من قبلھم۔

وعدہ کیا ہے اللہ نے اُن لوگوں سے جو ایمان لائے ہیں
تم میں سے اور اچھے عمل کئے ہیں کہ خلیفہ بنائے گا ان کو
زمین پر جیسا کہ خلیفہ بنایا اُن لوگوں کو جو اس سے پہلے تھے۔

اس معنی میں خلافت چونکہ ایک مشترکہ حق ہے پوری امت کا اس لئے امت ہی اس بات کی حقدار بھی ثابت ہوتی ہے کہ وہ اپنے ایما پر خلافت کے نظم ونسق کے لئے سربراہ منتخب کرے اگر کوئی شخص بغیر انتخاب ومشاورت اُمت کے محض فرد واحد کی ذاتی پسند و ایما پر سربراہ بنا دیا جائے تو یقیناً خلافت کے اس مشترکہ حق کی نفی ہو جائے گی جس کے تحت خلافت محدود صرف فرد واحد کا نہیں بلکہ پوری اُمت کا حق ثابت ہوتی ہے۔

اب اگر یہ تسلیم اور ثابت شدہ بات ہے کہ خلافت اُمت کا مجموعی حق ہے، فرد واحد کی ملکیت نہیں تو پھر محمود احمد عباسی صاحب کی یہ منطق کم از کم ہماری فہم سے بالاتر ہے کہ ایک طرف وہ خود بھی خلافت کو اُمت کا مشترکہ حق تسلیم کریں اور دوسری طرف سربراہ خلافت کو اپنے جانشین کی نامزدگی کا بغیر اُمت کی رضامندی کے سپرد فرما کر خلافت کو فرد واحد تک محدود فرما دیں۔ یہ عجیب چیز ہے کہ خلافت کے نظم ونسق کی ذمہ داری کسی شخص کو بطور امانت تفویض کی جائے مگر وہ شخص اُمت کی اس امانت کو بھی ذاتی ملکیت کی طرح جس کو چاہے منتقل کر دے۔ جن لوگوں نے اسلامی

خلافت کی نوعیت کو نہیں سمجھا ہے وہ اسلامی نظام کے متعلق اس قسم کے مہمل تصورات رکھتے ہوں تو کوئی تعجب نہ ہونا چاہئے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اسلام کا تصور حکومت شورائی ہے۔ اس شورائیت کے تحت سربراہ مملکت قطعی طور پر تمام معاملات و مہمات میں مشورہ کا پابند ہے۔ خود قرآن حکیم نے یہ حکم دیا ہے۔

وشاورھم فی الامر فاذا عزمت فتوکل علی اللہ — اور معاملات میں مشورہ کرو پھر جب تم عزم کر لو تو اللہ کے بھروسے پر عمل کرو۔
(آل عمران ۴)

ممکن ہے یہ خیال پیدا ہو کہ مشورہ ایک رسمی بات ہوگی۔ اگر صرف مشورہ ایک دکھاوے کا تماشا ہوتا تو کبھی قرآن حکیم اس کو تاکیدی انداز میں بیان نہ کرتا دوسرے یہ کہ وہ شوریٰ کو اسلامی نظام کی نمایاں خاصیت CHARACTERIST قرار نہ دیتا۔

وامرھم شوریٰ بینھم — وہ تمام معاملات باہمی مشورہ سے طے کرتے ہیں۔

اس لئے شوریٰ کے متعلق یہ غلط فہمی نہ رہنی چاہئے کہ یہ ایک رسمی عمل ہے جس کی نمائش کے بعد سربراہ مملکت کو اقدام کے لئے محض ذاتی رائے پر اعتماد کر لینا چاہئے۔ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شوریٰ کی حقیقت اور عمل کی تشریح فرما دی ہے چنانچہ جب بعض صحابہ کرام نے حضور سے آیت شاورہم میں فاذا عزمت فتوکل علی اللہ کی تصریح چاہی تو حضور اکرم نے ارشاد فرمایا کہ

مشاورۃ اہل الرای ثم اتباعھم — اصحاب رائے سے مشورہ اور اس کی پابندی
(تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۴۲۰)

سربراہ خلافت کی رائے کوئی شک نہیں وقعت رکھتی ہے، مگر رائے عامہ پر اُسے مقدم نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے تقرر کے معاملے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شوریٰ سے خطاب فرمایا اس میں صاف صاف کہہ دیا کہ

مالی فیما لم یوح الی کاحدکم — جن امور میں وحی نازل نہیں ہوئی ہے اس میں میری رائے تم لوگوں کی ایک رائے کے برابر ہے۔
(مجمع الزوائد ج ۱ ص ۱۲۶، مکتاب المناقب ج ۹ ص ۱۷۸)

اسی بنیاد پر ہمیشہ اسلامی مفکرین نے تمام امور و معاملات میں شوریٰ کے تقدم کو تسلیم کیا ہے۔ ابوبکر الجصاص نے شوریٰ کے متعلق کہا کہ

وفی ذکرہ العزیمۃ عقیب المشاورۃ دلالۃ انھا صدرت عن المشورۃ — قرآن میں عزم کا ذکر جو شوریٰ کے بعد ہے اس بات کی دلیل ہے کہ عزم یا فیصلہ وہی معتبر ہوگا جو شوریٰ کے فیصلہ کا نتیجہ ہو
(احکام القرآن ج ۲ ص ۵۰)

چھٹی ہجری کے معروف اسلامی قانون دان ابن عطیہ کی رائے ملاحظہ ہو۔

ان الشوریٰ ھی من قواعد الشریعۃ وعزائم الاحکام — شوریٰ شریعت کے قانون میں ایک اساسی قانون ہے اور حکومت کے فیصلوں کی بنیاد۔
(بحر المحیط ج ۳ ص ۱۹)

آٹھویں ہجری کے عظیم مفکر علامہ ابن تیمیہؒ کی رائے کس قدر فیصلہ کن اور جامع ہے۔

"اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اہم معاملات میں شوریٰ کے لئے مامور تھے اور معاملات حکومت میں شوریٰ کے فیصلوں پر عمل فرماتے تھے تو دنیا میں کبھی وہ شخص پیدا نہیں ہو سکتا جو شوریٰ کی پابندی سے آزاد ہو" (السیاست الشرعیہ ص ۵۰)

شوریٰ کی اس صراحت اور اہمیت کے بعد کیا محمود احمد صاحب عباسی کے نامزدگی کے فارمولے کو درست تسلیم کیا جا سکتا ہے؟ کیا خاکم بدہن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے محض اپنی ذاتی رائے اور مرضی پر اپنا جانشین نامزد کر کے قرآن اور سنت کی صراحت کو نظر انداز کر دیا ہوگا؟

سربراہ کے تعین کا سوال معاملات اجتماعیہ میں ایک اہم مسئلہ ہوتا ہے اور جب کہ قرآن اور سنت تمام معاملات میں شوریٰ کی پابندی کی تاکید

کرتے ہوں تو یہ کیونکر باور کیا جاسکتا ہے کہ صحابہ کرام ان سے بے نیازی برتتے ہوں گے۔

سچ تو یہ ہے کہ واقعات کے اقتضا اور غلط تاویلات سے اسلامی نظام زندگی کے تصور کو مسخ نہیں کیا جاسکتا ہے کیونکہ ایک صاحب ایمان کے لئے بہرصورت قرآن اور سنت کی تعلیم رہنمائے اصول (DIRECTIVE PRINCIPLES) کا درجہ رکھتی ہے۔

یا ایہا الذین آمنوا استجیبوا للّٰہ وللرسول اذا دعاکم لما یحییکم (الانفال ۲۴)	اے اصحاب ایمان! لبیک کہو اللہ اور رسول کو جب وہ تمہیں بلائیں اس شے کی طرف جو تمہیں زندگی بخشتی ہے۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد مسلمانوں کے سامنے سربراہ کا مسئلہ آیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا کوئی جانشین نامزد نہیں فرمایا تھا حالانکہ اگر نامزدگی اتنی اہم بات ہوتی کہ وہ انتخاب امت پر تقدم رکھتی تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ حضور قولاً و عملاً اس کی وضاحت نہ فرماتے مگر ایسا نہ ہونا اس بات کی محکم دلیل ہے کہ حضور چونکہ خلافت کو اُمت کا کلی حق تصور فرماتے تھے اس لئے آپ نے سربراہ خلافت کے تعین میں اُمت کے عمومی احساس کو روبہ عمل دیکھنا ہی پسند فرمایا۔

یہ بات بالکل بے اصل اور غلط ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا انتخاب محض چند افراد کی پسند کا نتیجہ تھا۔ ابوبکرؓ کی زندگی کا ہر پہلو اور آپ کی خدمات کا علم تمام لوگوں کو اچھی طرح تھا اسی بنا پر امت میں جو مقبولیت اور بارگاہ رسالت میں جو قربت آپ کو حاصل تھی وہ بھی کوئی مخفی بات نہ تھی خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی معروف تھا کہ

وزیرای من اھل الارض ابوبکر وعمر	روئے زمین پر ابوبکر و عمر میرے وزیر ہیں۔

(اسد الغابہ ۔ ابن اثیر ج ۳ ص ۲۱۳)

عوامی تاثرات بھی پوری طرح ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ذات کے ہی موید تھے۔ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول عوامی تاثرات کے اُن کے حق میں ہونے کی بڑی دلیل ہے۔

کنا نتحدث ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم خیر ھذہ الامۃ ثم ابوبکر وعمر ۔	ہم آپس میں اس بات کا اظہار کرتے تھے کہ حضور امت میں اعلیٰ ترین فرد ہیں اس کے بعد ابوبکر و عمر۔

(اسد الغابہ ج ۳ ص ۲۱۴)

دوسری جگہ آتا ہے کہ

کنا نقول فی عھد رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم من یکون اولی الناس بعدہ الا مر فنقول ابوبکرؓ	ہم عہد رسالت میں یہ بحث کرتے تھے کہ آپ کے بعد ریاست کی ذمہ داری کے لئے کون مناسب ہوگا تو سب کی زبان پر ہوتا تھا کہ ابوبکرؓ۔

یہ مقبولیت اور رجحان عام کے اس جھکاؤ کے بعد کون یہ کہہ سکتا ہے کہ ابوبکرؓ کا انتخاب صرف چند اشخاص کی پسند کا نتیجہ تھا اور اس میں اُمت کی رائے و احساس کو کوئی دخل نہ تھا۔ درحقیقت ابوبکرؓ کا انتخاب مسلمانوں کی رائے عامہ ہی کا نتیجہ تھا اس رائے کے حصول کے ذرائع اور وسائل میں اختلاف تو ہو سکتا ہے یعنی یہ کہ کن ذرائع اور وسائل سے عام رجحانات کو معلوم کیا جائے مگر جو شخص اس معاملہ میں سواد امت کی رائے کی برتری کو نظر انداز کر کے شخصی رائے کے تقدم کا جواز نکالتا ہے وہ قرآن اور سنت کی تعلیم و تاریخی حقائق سے یقیناً لاعلم ہے۔

بحث کے اس مرحلہ پر مزید توضیحات سے پہلے چند سوالوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

(۱) خلافت امت کا حق ہے یا کسی فرد واحد کا ؟

(۲) اگر خلافت اُمت کا مجموعی حق ہے تو خلافت میں سربراہ کی حیثیت کیا ہوگی؟

(۳) اگر خلافت میں سربراہ کی حیثیت محض نظم و نسق امور خلافت کے نگران اور محافظ کی ہے تو آخر اس کو کس بنیاد پر یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ اُمت کے مجموعی حق خلافت کو صرف اپنی ذاتی مرضی پر جس کو چاہے منتقل کر دے؟

(۴) اگر سربراہ کے لئے حق خلافت کے انتقال کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو پھر لامحالہ یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ خلافت اُمت کا مجموعی حق نہیں ہے کیونکہ حق تو اُمت کا ہو اور اختیار انتقال حق سربراہ کو یہ ایک متضاد عمل ہوگا؟

(۵) خلافت میں اگر سربراہ کو جانشین کے لئے نامزدگی کا حق حاصل ہے تو وہ کون سے دستوری تحفظات (Constitutional Safeguards) ہیں جن کے ذریعہ خلافت کو صرف ایک یا چند خاندانوں میں محصور ہونے سے روکا جا سکتا ہے؟

(۶) نظری Theoretical حد تک تو یہ دعویٰ ہو کہ خلافت نہ کسی فرد کی ملکیت ہے اور نہ کسی خاندان کی مگر نامزدگی کی بنیاد پر خاندانی استحقاق کی گنجائش پیدا کر دینا کیا نظری اور عملی اعتبار سے ایک متضاد بات نہ ہوگی؟

(۷) دنیا کے ہر قانون کا یہ تسلیم شدہ کلیہ ہے کہ جو مجاز تقرر ہوتا ہے وہی مجاز عزل (Dismissing Authority) بھی ہوتا ہے کیونکہ اگر نصب اور عزل کے جدا جدا مجاز ہوں تو پھر قانون میں یکسانیت عمل کے بجائے دو عملی کا خطرہ ہوتا ہے۔ پس اگر اسلام میں پیشرو سربراہ بعد کے سربراہ کے تعین کا مجاز ہے تو پھر لازماً وہی مجاز عزل بھی ہوگا۔ اُمت کو عزل کا کوئی اختیار نہ ہوگا کیونکہ معزول تو آپ اسی کو کر سکتے ہیں جس کا آپ نے تقرر کیا ہو؟

(۸) اس معینہ اصول کے تحت فرض کیجئے "الف" اپنا جانشین "ب" کو مقرر کرتا ہے اور "ب" صریحاً غیر اسلامی اقدامات کا مرتکب ہوتا ہے تو اس صورت میں امت کے لئے کیا چارہ کار رہ جاتا ہے کیا "ب" کو عہدہ پر برقرار رہنے دے۔ اگر نہیں تو کس بنیاد پر امت اس کے عزل کی مجاز ہوگی!

ان ساری باتوں کو پیش نظر رکھ کر ذرا محمود احمد عباسی صاحب کے نامزدگی کے فارمولے پر ایک گہری نظر ڈالئے اور بتائیے ان تمام باتوں کا کیا جواب ہوگا۔ ہمارے نزدیک نامزدگی کا فارمولا شاہنشاہیت و سلطانیت کے اس نظریہ سے بالکل مماثلت رکھتا ہے جس میں بادشاہ کو عام انسانوں سے بالا و مقدس سمجھ کر اس کو عام احتساب سے محفوظ کیا جاتا تھا اور بیچارے عوام کو اس کی سرمدی بندگی کے لئے مستعد رکھنے کی خاطر اسی نظریہ کی صدائے بازگشت کو ہم آج پھر بے جان استدلال کے ساتھ دوبارہ سن رہے ہیں مگر امت مسلمہ کا بیدار شعور اس راز کو خوب اچھی طرح سمجھ چکا ہے کہ

نقشہ ملت بیضا ہے امامت اس کی — جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے

جناب یہ منطق بھی خوب دلچسپ ہے کہ اگر شیعہ صاحبان خلافت کو خاندان علوی کا حق قرار دیکر اس کو خاندان علوی تک محصور کریں تو ہم ان کو یہ جواب دیں کہ خلافت کسی خاندان یا نسل کا سرمدی حق نہیں ہے مگر جب ہم خود نامزدگی کے اصول کو تسلیم کر کے خلافت کو خاندانی حصار و توریث کا پابند کر دیں تو پھر ہمارے جواب کا وزن ہی کیا رہ جاتا ہے۔ شیعہ صاحبان کے یہاں بھی خلافت کے خاندان میں محصور ہونے کا نظریہ اور آپ کے یہاں بھی یہ نظریہ روبہ عمل آنے کی گنجائش۔ وہ بھی خلافت کو اُمت کا مجموعی حق تسلیم کرنے سے گریزاں اور آپ بھی اُن ہی کے اس معاملہ میں نقش قدم کے مقلد۔

ان ہی تمام خدشات کے مدنظر ہر دور میں امت مسلمہ کی مشاورت اسلامیہ کو تقرر سربراہ خلافت کے معاملہ میں مقدم سمجھا گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔

فمن بایع عن غیر مشورۃ المسلمین فلا بیعۃ لہ (سیرت ابن ہشام)

اگر مسلمانوں کے مشورہ کے بغیر کسی کو سربراہ مملکت بنا دیا گیا تو یہ فیصلہ کالعدم ہوگا۔

خود ہمارے دور کے اسلامی مفکرین نے تقرر سربراہ کے لئے امت کے حق انتخاب کو ہی لازم قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کی رائے ملاحظہ ہو

"خلافت کا اصول موضوعہ یہ ہے کہ حکومت کی تکمیل و امین ملت اسلامیہ ہے کوئی فرد واحد نہیں۔ انتخاب کنندگان اس سیاسی حکومت کو ایک

معتبر و مختصر شخصیت میں ودیعت کر دیتے ہیں جس کو وہ امانت کا اہل تصور کرتے ہیں۔ یوں کہو حکومت کا اجتماعی ضمیر اس ایک فرد یا شخصیت منفردہ کے وجود میں عمل پیرا ہوتا ہے یہی وہ مقام ہے جہاں فرد حقیقتاً صحیح معنوں میں تمام قوم کا نمائندہ کہلا سکتا ہے۔"

(مسلمانوں کے سیاسی افکار۔ پروفیسر رشید)

مولانا تقی امینی لکھا اسکتہ دوسرے موقع پر بھی یہ رائے ہے۔

"ماسلفر تحریکات مذکورہ کے علاوہ خلفاء کا عام مجمع میں انتخاب۔ آزادی و حریت کے ساتھ ان کے احکام واعمال کا انتقاد۔ امور مہمہ میں خلفاء کا اہل الرائے اور ارباب حل و عقد سے استشارہ و بیت المال کی شخصی ملکیت اور اس کے خزینہ کا عمومیہ ہونا اس امر کا محکم ثبوت ہے کہ اسلام میں حکومت جمہوریت کی خلافت کا نام ہے۔ ان تمام تصریحات میں تم دیکھتے ہو کہ انتخاب خلیفہ کے لئے انتخاب عام و مشورہ اہل حل و عقد کے ساتھ خلیفہ سابق کے تعین کو بھی ایک صحیح شکل قرار دیا ہے۔ ساتھ ہی اس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے انتخاب کی مثال پیش نظر ہے لیکن غور کیجئے تو حضرت عمر کے لئے حضرت ابوبکر نے تحریک کی لیکن اس پر تمام اہل حل و عقد اور پھر عامہ مسلمین نے پسندیدگی کا اظہار کیا اس لئے وہ بھی تعین شخصی نہیں بلکہ بمنزلہ انتخاب تھا اس بنا پر نتیجہ نکلتا ہے کہ اسلام نے سوائے انتخاب عام کے اور کوئی صورت تعین خلفاء کی قرار نہیں دی۔"　(مقالات الہلال صلا۹)

علامہ ڈاکٹر سید حلیم پاشا کا نقطہ نظر قابل فکر ہے۔

"یہ بیان کرنے میں کسی تخصیص یا دلیل کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی کہ حکومت کے عام امور کا اگر ہونے کی ایک شرط ہے یہ کہ اس کی عنان شخص واحد کی طرف ہو تو دوسری اتنی ہی ضروری شرط یہ ہے کہ صاحب حکومت کو قوم منتخب کرے یہ قوم کا قطعی طور پر مسلم حق ہے۔"

(اسلامی حکومت کی عملی تشکیل صلا۱۰۵)

مشہور اسلامی مفکر علامہ ڈاکٹر محمد اسد کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

"حقیقت امر کا اصول یہ ہے کہ حکومت قوم کے آزادانہ انتخاب کی بنا پر وجود میں آئے نیز وہ آزاد انتخاب کی پبلک نمائندہ ہو قرآن مجید میں "تم میں سے (منکم) کا یہ ایک اور پہلو ہے۔ اس کا تعلق پوری قوم سے ہے کسی خاص طبقہ یا گروہ سے نہیں۔"　(اسلامی مملکت کے بنیادی اصول صلا۶۵)

محمود عباسی صاحب نے امت کے حق انتخاب کے ابطال کے لئے بعض واقعات سے بھی استدلال کیا ہے۔ نجاشی کے قبول اسلام کے واقعہ کو وہ ابطال انتخاب کی دلیل میں پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر اسلام میں مشاورت امت کی رائے کی اہمیت ہوتی تو نجاشی کو قبول اسلام کے بعد سربراہی سے محروم کر دیا جاتا گویا ایسا نہ ہونا عباسی صاحب کے نزدیک امت کے حق انتخاب کی نفی کی دلیل ہے۔ اس تفصیل طلب بحث سے پہلے یہ فیصلہ ناگزیر ہے۔

(۱) کیا عہد رسالت میں مسلمانوں کی دو جدا جدا خلافتوں کا وجود تھا یعنی سرزمین عرب کی خلافت اور سرزمین حبشہ کی خلافت ؟

(۲) اگر جدا مملکت وہ جدا جدا نہیں بلکہ ایک ہی خلافت تصور ہوں گی تو خلافت واحدہ کے لئے دو سربراہ کیسے ممکن ہوں گے ؟

(۳) کیا نبی کی زندگی میں کسی فرد امت کے لئے خلافت کی سربراہی کا جواز ہے ؟

بہرحال اگر محمود احمد عباسی صاحب مذکورہ بالا سوالات کی وضاحت کر دیں تو خود ان کے استدلال کی حقیقت ظاہر ہو جائے گی کہ وہ کس قدر بے معنی ہے اس لئے کہ قبول اسلام اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کے بعد نجاشی کی پوزیشن ایک آزاد سربراہ مملکت کی حیثیت میں باقی نہیں رہتی ہے بلکہ خلافت اسلامیہ کے ایک علاقہ کے حاکم یا والی (HEAD OF THE REGION) کی ہو جاتی ہے جو مرکز کے تابع عمل ہوتا ہے اس لحاظ سے عہد رسالت میں مختلف علاقوں میں متعدد حاکموں یا والیوں کا وجود ثابت ہے۔ اصل موضوع بحث یہ نہیں ہے کہ خلافت کے کسی علاقائی حاکم کا تقرر انتخاب سے ہو بلکہ موضوع بحث تو یہ ہے کہ "خلافت کے سربراہ" کا انتخاب امت مسلمہ کا حق ہے۔ ان معنوں میں نجاشی کے واقعہ سے استدلال سراسر ایک بے وزن دلیل ہے۔

دوسری قابل غور بات یہ ہے کہ ہم کو تاریخ سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ والیٔ حبش کے بادشاہ نجاشی نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ ملک کی رعایا اور دوسرے افراد نے بھی اسلام قبول کیا تھا۔ کسی تاریخی شہادت سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی اس لئے ایک ایسے ملک میں جہاں صرف بادشاہ مملکت چند گنتی کے افراد مسلمان ہوں انعقاد خلافت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا نہ کہ خلیفہ کا سوال کیونکہ اسلام کا سیاسی نظام اس معاشرہ خطۂ ارض میں روبہ عمل آسکتا ہے جہاں اسلام کے ماننے والے غالب یا موثر تعداد میں ہوں جہاں یہ صورت نہ ہو وہاں مسلمانوں کی رائے کا سوال ہی بے محل بات ہے کیونکہ انتخاب خلیفہ کے لئے مسلمانوں کی رائے اور شاورت شرط ہے الغرض ان تمام باتوں کو نظر انداز کر کے نجاشی کے واقعہ سے استدلال مضحکہ خیز بات ہے۔

باقی رہ گیا یہ سوال کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے صرف اپنی ذاتی ایماء پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو نامزد کر دیا تھا یہ ایک غلط مفروضہ ہے اس لئے کہ اگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اس نقطۂ نظر کے قائل ہوتے تو اس ضمن میں دیگر اصحاب سے مشورہ کی ضرورت ہی کیا تھی مگر آپ نے اس کا اہتمام فرمایا کہ علالت کے باوجود حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت عثمانؓ بن عفان، حضرت اسید بن حضیر، حضرت سعید بن زید اور دیگر حلقوں کی نمائندگی کرنے والے سربرآوردہ اصحاب سے مشورہ کیا جس کی تفصیل ابن اثیر (جلد دوم) میں دیکھی جا سکتی ہے اور جس کا اعتراف خود محمود احمد عباسی صاحب نے بھی کیا ہے کہ

> "البتہ ایک آدھ روز پہلے بعض اکابر سے حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کے متعلق مشورہ لے لی تھی مگر نہ اس طرح کہ انہیں انتخاب میں کوئی دخل ہو ان کو ولی عہد بنانے کا آپ پہلے ہی فیصلہ کر چکے تھے" (تبصرہ محمود کی ص ۳۳)

غرضیکہ مشاورت کا انکار خود محمود احمد عباسی صاحب بھی نہ کر سکے لیکن بات یہ ہے کہ اگر عباسی صاحب کے نزدیک یہ مشاورت ایک رسمی تکلف تھی تو کیا یہی نادیدہ لگاؤ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا بھی ہو سکتا تھا ہرگز نہیں کیونکہ

اول:۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مشاورت کے قرآنی حکم اور اس ضمن میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی توضیحات اور طرز عمل سے لاعلم نہ تھے۔

دوم:۔ اگر مشاورت اصولی نقطۂ نگاہ سے عبث اور محض ایک رسمی تکلف یا برائے بیت ہوتا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ مرض الموت کی شدید علالت میں بھی ان تکلفات کے پابند ہوتے۔

سوم:۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے فرمان یا وصیت کا ان تمام باتوں کے بعد لکھا جانا یعنی تکمیل مشاورت کی اولیت اور موصوف کی تحریر کا موخر ہونا خود اس بات کی محکم دلیل ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خود امت مسلمہ کی مشاورت اور رائے کو سربراہ خلافت کی تعیین کے لئے اساس تصور فرماتے تھے۔

کیا ہم کو محمود احمد عباسی صاحب یہ بتا سکتے ہیں کہ اگر بالفرض امت مسلمہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وصیت کو نظر انداز کر کے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بجائے کسی اور صاحب کے ہاتھ پر بیعت خلافت کر لیتی تو آخر قرآن اور سنت کی وہ کون سی دلیل یا احکام ہیں جن کی بنیاد پر امت کے اس فعل اور خلافت کو کالعدم یا غیر موثر قرار دیا جاتا جبکہ خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی خلیفہ ہونے کے لئے مسلمانوں کی اسی بیعت کو معتبر قرار دیتے جو امت مسلمہ کی باہمی مشاورت کے فیصلہ کے تحت معرض عمل میں آئے۔

من بایع رجلاً من غیر مشورۃ من المسلمین فلا یبایع ھو۔	جس شخص نے مسلمانوں کے مشورہ کے بغیر کسی کی بیعت کر لی تو اس سے وہ شخص خلیفہ نہیں بن گیا۔

(بخاری جلد دوم ص ۱۰۰۹ باب رجم الحبلیٰ)

خلاصہ یہ کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت دراصل نتیجہ تھی امت مسلمہ کی رائے اور رضامندی کا جس چیز کو

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی نامزدگی کہا جاتا ہے وہ فی الحقیقت ایک تحریک تھی جس کو قانونی حیثیت (Legal effect) اسوقت حاصل ہوئی جب امت مسلمہ نے بیعت کے ذریعہ اس کی تصدیق کردی اور اگر امت بذریعہ بیعت اس کو قبول نہ کرلیتی تو قرآن اور سنت سے اس کے قانونی نفاذ کا کوئی جواز فراہم نہیں کیا جاسکتا ہے۔

حکمت دین کے محرم حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنی اس تحریری تحریک سے پہلے اسی لئے مشاورت کی تکمیل کرلی تھی کیونکہ آپ ایک اہم معاملہ میں مشاورت کی اساسی حیثیت کو کس طرح نظر انداز کرسکتے تھے جبکہ موصوف رضی اللہ عنہ قرآن اور سنت کے صریح احکام کے علاوہ خود بر معاملہ میں ہمیشہ مشاورت ہی کے اصول پر سختی سے پیرا رہتے تھے جس کی ایک واضح نظیر وہ واقعہ ہے جس میں موصوف نے بحرین کے مقام براختہ کے مرتدین کی معافی کا مسئلہ مشاورت کے بعد طے کیا تھا۔ (ملاحظہ ہو صحیح بخاری جلد دوم صفحہ ۲۴۳ باب بیعت)

اگر بطور مثال مانعین زکوٰۃ اور جیش اسامہ کا معاملہ زیر بحث لایا جائے تو بھی اس کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ذاتی رائے کے تقدم کی بنا استدلال نہیں بنایا جاسکتا ہے کیونکہ اسلامی نظام کا یہ اٹل بنیادی اصول ہے کہ خدا اور رسول کے حکم کے خلاف انفرادی یا اجتماعی کسی طور پر بھی کوئی قانون سازی یا فیصلہ نہیں کیا جاسکتا ہے۔ زکوٰۃ ایک ایسا معاملہ ہے جس کا کھلا ہوا حکم قرآن میں موجود ہے زکوٰۃ کا انکار صریح نص قرآنی کا انکار ہوتا ہے اس لئے خلافت اسلامیہ کا اولین فرض یہ تھا کہ وہ اس فتنہ کا سدباب کرے بعینہ جیش اسامہ کے معاملہ میں حضرت اسامہ رضی کا تقرر خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کر چکے تھے اور خلافت اسلامیہ کا بہرحال یہ فرض تھا کہ وہ حضور کے اس فیصلہ کو پایہ تکمیل تک پہونچاتے اس طرح ان دونوں مسئلوں میں قرآن اور سنت کے حکم کی واضح موجودگی کے بعد ذاتی رائے کا سوال ہی نہیں آتا۔ ذاتی رائے کے تقدم کا سوال تو اس وقت ہوتا جب قرآن اور سنت میں کوئی حکم صریح موجود نہ ہوتا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عمل کو بھی اگر نامزدگی کے لئے دلیل بنایا جائے تو یہ بات نظر انداز نہیں کی جاسکتی، کہ اگر بالفرض یہ تسلیم کرلیا جائے کہ سربراہ خلافت کو نامزدگی یا جانشینی کے تعین کا اختیار ہے اور یہ انتخاب ہر صورت میں نافذ العمل ہوتا ہے تو سوال یہ ہے کہ ایک خالی عہدہ ..... (SINGLE VACCANCY) کے لئے خلیفہ کو صرف ایک ہی فرد نامزد کرنا چاہئے یہ کیسا تماشا ہے کہ خلافت کا عہدہ تو ایک ہے مگر اس کے واسطے نامزدگی چھ افراد کی! اگر یہ کہا جائے کہ معاملہ چھ افراد کے باہمی فیصلہ پر چھوڑ دیا گیا تھا تو آخر ایسا کیوں کیا گیا جبکہ خود حضرت عمر رضی اپنے جانشین کے تعین کا قطعی اور آخری حق (FINAL RIGHT) رکھتے تھے۔ کیا خاکم بدہن موصوف خود موزوں شخصیت کے انتخاب کی صلاحیت کے حامل نہ تھے؟ حالانکہ تمام اصحاب کے حالات ان کی خدمات اور پوزیشن کا آپ کو صحیح علم بھی تھا پھر کیا بات مانع تھی کہ آپ اپنا ذاتی فیصلہ ایک کے حق میں صادر فرما کر ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو لیتے۔ جا بجا ایک سادہ طریق کار (SIMPLE PROCEDURE) کو چھوڑ کر ایک پیچیدہ راستہ اختیار کیا گیا؟

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اسلام میں خلافت کی نوعیت کا علم تھا آپ جانتے تھے کہ خلافت اصل معنوں میں امت مسلمہ کا مجموعی حق ہے اسی لئے تشکیلی مسائل میں اس کو ہر طرح سے ساری شریک کار رہنا چاہئے۔ اسی باعث اسلامی نقطۂ نگاہ سے کسی کی سربراہی خلافت اس وقت قانونی طور پر معتبر اور جائز ہوتی ہے جبکہ وہ بیعت عامہ کے ذریعہ اپنے تکمیلی مرحلہ کو پہونچ جائے گویا خلافت کا معاملہ اس طرح دو مرحلوں سے گذرتا ہے۔

(۱) سربراہ خلافت کے لئے موزوں و مناسب شخصیت کی تجویز (SUGGESTION) یہ تجویز امت مسلمہ کا ہر فرد پیش کرسکتا ہے چونکہ پیشرو خلیفہ بھی امت ہی کا ایک فرد ہوتا ہے اس لئے اس کو بھی تجویز پیش کرنے کا حق ہوتا ہے۔

(۲) پیش کردہ تجویز پر سواد امت کی رضامندی جس کی شکل بیعت بھی ہے اور جس کے نتیجہ میں کسی کی خلافت پایہ تکمیل کو پہونچتی ہے۔

بیعت عامہ کے بغیر کسی فرد کی خلافت کی سربراہی کی قانونی تکمیل نہ ہونا خود اس بات کا محکم ثبوت ہے کہ اسلام میں انتخاب سربراہ خلافت کا تعلق

حق امت مسلمہ ہی کو ہے کسی فرد واحد کو نہیں۔ اگر نامزدگی یا جانشینی عہدہ خلافت کی تفویض و تکمیل کی اساس ہوتی اور بیعت محض ایک بے ضابطہ یا اضافی کارروائی، تو ہم کو خلافت راشدہ کی تاریخ میں اس بے ضررسی اور اضافی عمل کا وجود نہ ملتا مگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ خلافت راشدہ کے ہر سربراہ کی بیعت عامہ ہوئی ہے اور اس بیعت سے پہلے کسی بھی خلیفہ نے سیاسی امور کی ذمہ داریوں کا آغاز نہیں کیا۔

ساری بحث کے بعد جو خلاصہ سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ

(۱) قرآن نے صاف صاف تمام معاملات میں شاورہم فی الامر کا حکم دیا ہے جس کی پابندی بھی اسی طرح لازم ہے جیسے دیگر قرآنی احکام کی۔ ہر قرآنی حکم کی طرح کے لئے بیعت لازم (۲) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے علاوہ ان امور کے جن میں وحی کے ذریعہ کوئی ہدایت مل جاتی ہو دیگر تمام معاملات میں مشورت کو خرف تقسیم بخشی تھی کہ اختلافی امور میں اس کا نمایاں التزام کیا جس کی ایک مثال آپ کا یہ ارشاد ہے۔

لو کنت مومرا احدا من غیر مشورة لامرت ابن ام | اگر میں کسی شخص کو بغیر مشورہ امیر بناتا تو ابن ام عبد کو بناتا۔

عبد۔ (ترمذی۔ کتاب المناقب)

(۳) خلافت راشدہ میں بیعت کے دستور سے قبل کسی خلیفہ کا برپا کیا عمل نہ جانا نیز نوم ابتہ اس بات کا ثبوت ہے کہ نظام خلافت اشرافی نظام (ARISTOCRACY) چیدہ یہ (OLIGARCHY) یا کلیت پسندی (TOTALATARIANISM) کی طرح کوئی محدود تصور نہیں رکھتا ہے بلکہ وہ صحیح معنوں میں افراد امت کے ساری طرح اور ذمہ داریوں کے مرکزی احساسات و جذبات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

یہ آسان بات ہر شخص سمجھ سکتا ہے بشرطیکہ وہ اسلام کے دستور اساسی اور نظام خلافت کے لئے قرآن و سنت سے ثابت شدہ بنیادی اصولوں کا منکر نہ ہو مگر جہاں صورت حال اس کے برخلاف ہو وہاں تو اصول کا کیا سوال ہر شخص کی ذاتی رائے اور فکر اسلام کا معیار بن جاتی ہے جس کے نتیجہ میں بحث اصولوں سے ہٹ کر عدم توازن اور فکری تضاد کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس کے متعدد نمونے ہم جناب عباسی صاحب کی نگارشات میں دیکھ سکتے ہیں بطور مثال ایک حاضر ہے۔

جناب محمود احمد عباسی صاحب رقمطراز ہیں کہ

من فارق الجماعة شبرا فقد خلع ربقة الاسلام من عنقه الا ان یراجع | جس شخص نے بھی جماعت سے ایک بالشت بھی علیحدگی کی اس نے اسلام کا جوا اپنی گردن سے اتار پھینکا سوا اس کے کہ وہ اپنے موقف سے پلٹ جائے۔

یہ وعید خلافت اسلامیہ کے خلاف خروج کے بارے میں ہے جبکہ کوئی ایسا ہو جس کی پشت پر رائے عامہ نہ ہو۔ (تبصرہ محمودی ص۳۱)

مندرجہ بالا عبارت سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جناب محمود احمد عباسی صاحب کے نزدیک وہ خروج غلط اور قابل اعتراض ہے جس میں صاحب خروج کے ساتھ رائے عامہ نہ ہو اگر صاحب خروج کو رائے عامہ کی تائید حاصل ہو تو خروج صحیح اور مستحسن ہوگا۔

کیا اسلام کا بھی خروج کے متعلق یہ موقف ہو سکتا ہے؟

اسلام ایک اصول پسند دین ہے وہ اصولاً جس چیز کو برائی تصور کرتا ہے وہ اس کے نزدیک ہر حال میں برائی ہوتی ہے خواہ اس کا ارتکاب کوئی فرد از خود کرے یا رائے عامہ کی تائید سے کرے مثلاً چوری اسلام میں ایک ناپسندیدہ اور قابل تعزیر حرکت ہے اگر اس غلط حرکت کا ارتکاب کوئی شخص رائے عامہ کی تائید سے بھی کرے تو اصولاً اسلام جس بات کو غلط کہتا ہے وہ غلط ہی شمار ہوگی محض رائے عامہ کی تائید اصولاً غلط فعل کو پسندیدہ اور لائق تسلیم نہیں بنا سکتی یعنی اگر خروج اسلام میں ایک ناپسندیدہ فعل ہے تو اس کو ہر حال میں برائی تصور کیا جائے گا آخر جس چیز کو اصولاً طور پر برا تسلیم کیا جا چکا ہے وہ رائے عامہ کی تائید سے اچھائی میں کیونکر بدل سکتی ہے ہم اس بحث نقطہ نظر کا اسلام میں کوئی جواز نہیں پاتے ایسے بے معنی اور لغو تصورات کو اسلام جیسے اصول پسند دین سے منسوب کرنے کے بجائے کسی بے اصول ذہنی ساخت اور اسلام کی اصولی پوزیشن کو مسخ کرنے کی نامحمود سعی پر محمول کرنا چاہیے۔

محمد حفیظ اللہ پھلواروی

مُسلم بادشاہ اور امراء
اور
رفاہِ عام

رفاہِ عام کے کاموں سے دل چسپی اسلامی تمدن کی ایک نمایاں خصوصیت ہے اور دنیا کی تقریباً تمام اسلامی حکومتوں کی یہ خصوصیت ہے کہ ان کے حکمرانوں، وزراء، امراء، علماء نے ہر دور اور ہر زمانہ میں رفاہِ عام کے کاموں میں بڑی فراخ حوصلگی کے ساتھ حصہ لیا۔ تمام اسلامی ممالک بے شمار مساجد، مدارس، کتب خانے، خانقاہیں، شفاخانے، کاسمان سرائیں، حمام، تالاب، کنوئیں، حوض، سڑکیں، بند، پل، نہریں، ان وغیرہ بنائے جاتے تھے، بڑے بڑے اوقاف مقرر تھے جن کے ذریعہ رفاہِ عام کے کام انجام پاتے تھے۔

مشہور مسلم سیاح ابن حوقل مسافروں اور سراؤں کے سلسلے میں لکھتا ہے کہ کوئی شہر یا کوئی گزرگاہ جس میں لوگوں کی آمد و رفت ہو، یا کوئی رگاؤں ایسا نہیں جس میں بڑی بڑی سرائیں بنی ہوئی نہ ہوں، اتنی بڑی کہ اترنے والوں کے بعد بھی جگہ اس میں باقی رہ جاتی۔ ما وراء النہر کے علاقے کے علاقہ میں یہ سیاح لکھتا ہے :-

"صرف اس علاقے میں دس ہزار سے زیادہ رباطیں (سرائیں) ہیں۔ بہت سی سرائیں تو ایسی ہیں جن میں اس کا بھی انتظام ہے کہ مسافروں کو اور ان کے جانوروں کو کھانا اور چارہ سرائے کی طرف سے دیا جاتا تھا۔ میں نے ایسا بہت کم دیکھا کہ کہیں مسافر خانہ ہو یا سڑک کا موڑ یا ناکہ ہو، یا کوئی مسجد ہو، یا کسی دیوار کے کنارے (سایہ لینے کے لئے) لوگ جمع ہوتے ہوں، وہ برف کی سبیل سے خالی ہو"

دمشق کا حال بیان کرتے ہوئے مشہور سیاح ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ :-

دمشق کے اوقاف اور مصارف کا شمار ان کی کثرت کی وجہ سے مشکل ہے۔ بعض اوقاف ان لوگوں کے لئے ہیں جو حج کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے، ان اوقاف سے ذریعہ حج کرنے کے لئے مصارف دیئے جاتے ہیں، بعض اوقاف اُن غربا اور مساکین کے لئے ہیں جو مفلسی کی وجہ سے اپنی لڑکیوں کی شادی نہیں کر سکتے، ان اوقاف کے مصارف سے ان کے نکاح کا بندوبست اور سامانِ جہیز وغیرہ کا انتظام کیا جاتا ہے، بعض اوقاف قیدیوں کے رہا کرنے کے لئے ہیں بعض مسافروں کے لئے ہیں جن سے انہیں کھانا، کپڑا، اور زادِ راہ دیا جاتا ہے، بعض اوقاف سڑکوں اور راستوں کی درستی کے لئے ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے نیک کاموں کے لئے اور بھی بہت سے اوقاف ہیں ۔۔۔۔۔

ایک وقف اس لئے تھا کہ کسی غلام سے چینی کے برتن اگر ٹوٹ جائیں تو فوراً غلام کی طرف سے اُس برتن کا معاوضہ برتن

ہی کی شکل میں مانگ کر بھیج دیا جاتا۔

اس وقف میں کافی ذخیرہ چینی کے برتنوں کا اس کام کے لئے رہتا ہے۔"

- -

ابن جبیر اندلسی لکھتے ہیں کہ دمشق میں علاوہ برف کے پانی کے بعض سبیلوں میں عرق عنب کا پانی بھی پلایا جاتا تھا (عنب ایک قسم کے عرق نکالا جاتا تھا)

ساحل تیونس پر ایک خاص قسم کی لذیذ مچھلیاں خاص موسم میں نمایاں ہوتی تھیں، یہ مچھلیاں اتنی قیمتی ہوا کرتی تھیں کہ غریبوں کو نصیب ہوتا نہیں، کسی امیر نے محض اس لئے جائداد وقف کر دی تھی کہ اس کی آمدنی سے یہ مچھلیاں غرباء کو مہیا کی جائیں۔

ایک وقف اس مقصد سے کیا گیا تھا کہ میاں بیوی میں اگر رنجش ہو جائے اور بیوی روٹھ کر میاں کے گھر سے چلی جائے تو جب تک میاں بیوی میں میل نہ ہو، بیوی کے مصارف اس وقف سے ادا کئے جائیں۔ ایسی عورتوں کے لئے ایک مکان بھی مراکش میں بنا ہوا تھا جس کا نام "دار الدقہ" ہے یہ وقف غالباً اپنی نوعیت کا سب سے دلچسپ وقف تھا۔

مراکش میں ایک بڑا وقف پاگل اور دیوانوں کی خبر گیری کے لئے تھا، نیز ہر سال موسم سرما میں غرباء میں کپڑے بھی تقسیم کئے جاتے ایک فرانسیسی سیاح نے مراکش کے متعلق لکھا ہے کہ "وہاں ایک اسلامی وقف ہے جس کے مصارف سے اتنا بڑا مکان بنایا گیا ہے جس میں اندھوں کو پناہ ملی ہوتی تھی، ان کے کھانے پینے، لباس اور تمام ضرورتوں کا کفیل وقف تھا۔ اس کے علاوہ کوڑھیوں، معذوروں اور بیماروں کے لئے اسلامی اوقاف کی فہرست بہت طویل ہے (ماخوذ از ہزار سال پہلے)

ابن بطوطہ قاہرہ کے سلسلے میں لکھتا ہے کہ یہاں "خانقاہیں کثرت سے ہیں اور امراء علی العموم خانقاہیں بنوانے کے بڑے شوقین ہیں خانقاہ فقراء کی ایک جماعت کے لئے مخصوص ہے ان خانقاہوں میں جو جس قسم کا کھانا چاہتا ہے اس کے لئے ویسا ہی تیار ہوتا ہے ..... کھانے جاڑے اور گرمی دونوں موسموں کے کپڑوں کے مصارف ہر درویش کو خانقاہ سے ملتے ہیں اور ہر درویش کو جیب خرچ کے لئے بھی دس درہم سے تیس درہم ماہوار تک ملتے ہیں۔ ہر پنجشنبہ کی شب کو شکر مٹھائی، صابون، دھوبی کی دھلائی، حمام کرنے کی اجرت، روشنی کے تیل، خوشبو کے مصارف بھی اوقاف سے ملتے ہیں۔

خلیفہ مہدی نے مکہ معظمہ کے راستے درست کرائے، قافلے کے لئے جا بجا سرائیں بنوائیں جو سرائیں شکستہ تھیں ان کو درست کرایا، ہر ہر منزل میں کنوئیں کھدوائے، قافلوں کے جانوروں کے لئے حوض بنوائے، بغداد سے مکہ جو راستہ گیا ہے اس کے کنارے خلیفہ ہادی نے حجاج اور دیگر مسافروں کے آرام کے لئے مسافر خانے اور حوض و تالاب بنوائے۔

خلیفہ ہارون رشید کی بیوی زبیدہ خاتون کے خزانے کا بڑا حصہ ہمیشہ رفاہ عام میں صرف ہوتا تھا۔ زبیدہ کا سب سے بڑا تاریخی اور عظیم کارنامہ نہر زبیدہ کی تعمیر ہے جس کے لئے پورا عالم اسلام ان کا مرہون منت ہے، اس بلند ہمت اور نیک نیت خاتون نے حجاج کی راحت کے لئے عرب کی سنگلاخ زمین میں دو نہریں کھدوائی تھیں۔ ایک نہر طائف کی سرزمین سے شروع ہو کر مکہ میں ختم ہوتی تھی جس میں حنین کے چشمہ کا آتا تھا، طائف اور مکہ کے درمیان جگہ جگہ پہاڑوں پر حوض بنوائے گئے تھے، اور ان حوضوں سے اس نہر تک نالیاں بنی تھیں جن کے ذریعہ بارش کا پانی جو حوضوں میں جمع ہوتا وہ نہر میں آتا تھا۔ دوسری نہر وادی نعمان سے عرفات، مزدلفہ اور منیٰ ہوتی ہوئی نہر زبیدہ پر ختم تھی جہاں سے مکہ معظمہ تک پہنچایا جاتا تھا۔ اس نہر کے ذریعہ وادی نعمان کے چشمہ کا شیریں پانی مکہ معظمہ بالائی مقامات میں پہنچایا گیا تھا جو حجاج کو ان مقامات میں میٹھا پانی با آسانی اور کافی مقدار میں دستیاب ہو سکے۔ زبیدہ نے ستر لاکھ دینار صرف کئے تھے، درمیان میں سیلاب

اور دوسرے حادثات کی بنا پر بار بار نہر خراب ہوتی رہی اور اٹ گئی اور مختلف سلاطین نے اس کی مرمت و اصلاح کرائی۔ حتیٰ کہ ۱۲۹۵ ہجری میں ہندوستانی مسلمانوں کی توجہ و کوشش سے اس نہر کی مرمت کرائی گئی۔ سب سے آخر میں سلطان ابن سعود کے لڑکے امیر فیصل کی توجہ و ہمت سے ایک اور نہر کے ذریعہ ایک نئے چشمہ کا پانی بھی نہر زبیدہ میں لایا گیا جس پر تقریباً پانچ لاکھ گنی صرف ہوئے (اعیان الحجاج)

امیر تیمور کے عہد حکومت میں اسپین کا سفیر کلاویجو امیر کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ وہ خراسان کی بڑی سڑک کے متعلق لکھتا ہے:۔

"سڑک کے کنارے بڑے بڑے مکانات بنے ہیں، ان میں اور کوئی نہیں رہتا۔ صرف مسافر یہاں آکر آرام کرتے ہیں۔ ان مکانوں میں پانی بڑے فاصلے سے زمین دوز نالیوں کے ذریعہ پہنچایا گیا ہے۔ سڑک بہت ہموار تھی، کہیں کوئی پتھر اس پر نظر نہ آتا تھا۔ جب مسافر منزل پر پہنچتے تو کھانے پینے کی چیزیں اور تازہ دم گھوڑے موجود ہوتے تھے۔ دن بھر کا سفر ختم ہونے پر امیر تیمور کے گھوڑے حاضر رہتے تھے، کہیں ان کی تعداد سو اور کہیں دو سو ہوتی۔ منزل گاہیں سمرقند تک برابر بنی تھیں۔ اور ہر منزل گاہ پر گھوڑوں کا انتظام تھا ...... گرمیوں کے موسم میں بعض منزل گاہوں میں ایسے حوض نظر آئے جن میں برف کے ٹکڑے پڑے ہوتے ہوتے تھے، اور پیتل کے کوزے وہاں رکھے ہوتے کہ جس کا جی چاہے برف کا پانی ان میں بھر کر پئے" (ہیرالڈ لیمب کی کتاب تیمور)

رفاہِ عام کے سلسلے میں سلاطین ہند اور مسلمان امراء نے بھی بے مثال کارنامے انجام دئے۔

علامہ تقی الدین نے کتاب الخطط میں لکھا ہے کہ سلطان محمد بن تغلق کے عہد میں رفاہِ عامہ کے لئے دہلی میں ستر شفا خانے اور دو ہزار مسافر خانے اور ایک ہزار سرائیں تھیں۔

فیروز شاہ نے اپنے عہد میں کثیر تعداد میں خانقاہیں اور سرائیں درویشوں اور مسافروں کے قیام کے لئے بنوائیں۔ عفیف لکھتا ہے کہ معتبر راویوں نے بیان کیا ہے کہ فیروز شاہ نے بندگانِ خدا کے آرام کے لئے دہلی میں ایک سو بیس خانقاہیں تعمیر کرائیں، بادشاہ نے یہ حکم فرمایا کہ ہر چہار جانب سے مسافر آئیں اور ان سراؤں میں قیام کریں اور ہر خانقاہ میں مسافر تین روز شاہی مہمان رہیں اور اسی طرح ایک سو بیس خانقاہوں میں تین سو ساٹھ دن یعنی تمام سال بطور مہمان قیام کریں۔ غرباء کی امداد کے لئے فیروز شاہ تغلق نے "دیوانِ خیرات" قائم کیا تھا جس کا مقصد یہ تھا جن غرباء اور مساکین کی لڑکیاں جوان ہو گئی ہوں اور عسرت کے باعث ان کی شادی نہ ہو سکتی ہو انہیں مدد دی جائے۔ سراج عفیف کے بیان کے مطابق اس سلسلے میں ہزاروں آدمیوں کی اعانت کی گئی اور خدا جانے کتنی ناکتخدا لڑکیوں کی شادی ہو گئی۔

شیر شاہ نے بڑی بڑی سڑکیں بنوائیں۔ ہر دو کوس کے فاصلے پر مسلمانوں اور ہندوؤں کے لئے کل چیزیں مفت دی جاتیں اس طرح ہندوؤں کو بھی تمام چیزیں مفت ملتیں۔ پروفیسر کالکا رنجن کا بیان ہے کہ ہر سرائے میں ہندوؤں کے لئے برہمن بھی ہوتے تاکہ وہ ہندو مسافروں کے کھانے پینے اور بستر کا انتظام کر سکیں۔ ان ہندو مسافروں کے لئے ہر وقت ٹھنڈا اور گرم پانی موجود رہتا، ان کے سونے کے لئے بستر بھی دیا جاتا اور ان کے گھوڑوں کے لئے دانے بھی رکھے جاتے اور یہ تمام اخراجات حکومت برداشت کرتی۔

اکبر شاہ نے شہروں میں مسلمانوں کے لئے "خیر پورہ" اور ہندوؤں کے لئے "دھرم پورہ" کے نام سے دو مکانات تعمیر کروائے تھے، جو دونوں قوموں کے لئے ہر قسم کا سامان رہائش مہیا رہتا۔ آگرہ میں ایک مکان "جوگی پورہ" کے نام سے بنوایا تھا جس میں جوگی قیام کرتے تھے۔

اورنگ زیب عالمگیر نے غرباء و مساکین کی راحت رسانی کی غرض سے دار الحکومت و دیگر شہروں میں خیرات خانے قائم فرمائے اور ممالک محروسہ میں جہاں کہیں بھی سرائے و رباط نہیں تھی وہاں ضروری مسافر نواز مکانات کی تعمیر کرائی گئی۔ (مآثر عالمگیری)

محمد عادل شاہ والئی بیجاپور کے زمانہ میں مسجد کے لنگر خانوں میں مسلمانوں کو پکا ہوا کھانا ملتا اور ہندوؤں کے لئے خشک خوراک کا انتظام تھا۔ ہر لنگر خانے میں ہندوؤں کو پانی پلانے کے لئے ایک برہمن رہا کرتا۔

کشمیر کے سلطان زین العابدین نے امرناتھ استانہ دیوی کے جاتریوں کے آرام کے لئے مکانات بنوائے تھے۔

نجیب آباد کے پٹھانوں کی ۱۸۵۸ء میں ہردوار پر حکومت تھی۔ نواب نے ہندو جاتریوں کی آسائش کی غرض سے بڑے بڑے مکان بنوائے تھے جو آج تک موجود ہیں اور ہندوؤں کے قبضے میں ہیں (ہندوستان کا مستقبل)

آصف الدولہ (لکھنؤ) نے پانچ لاکھ روپے سے نجف اشرف میں ایک نہر جاری کرائی جس کا نام "نہر آصفی" رکھا یہ نہر تیس میل لانبی ہے۔

شاہان بنگال اور امراء نے تعلیمی ضروریات کے لئے بڑی بڑی جائدادیں وقف کی تھیں لیکن اسلامی سلطنت کے خاتمہ کے بعد انگریزوں نے تمام اوقاف ضبط کرلئے اور بقول سر ولیم ہنٹر اگر اس جائداد کو ٹھیک طور پر استعمال کیا جاتا تو بنگال میں مسلمانوں کے پاس آج بھی نہایت اعلیٰ الشان تعلیمی ادارے موجود رہتے۔

مسلمانوں نے اپنے دور عروج و اقبال میں رفاہ عام کے کاموں میں جو نمایاں حصہ لیا۔ اگر یہ تفصیلات ایک جگہ جمع کئے جائیں تو مستقل ایک کتاب تیار ہوسکتی ہے۔ مسلمان رفاہ عام کے کاموں میں حصہ لینا دینی فرض سمجھتے تھے۔

ماہر القادری

قولِ فیصل ـــــ ایک شاہکار نظم

سید علی اختر اختر اردو زبان کے مشہور اور صاحبِ فکر شاعر ہیں، اُن کی شاعری میں تخئیل کی بلندی کے ساتھ، پاکیزگیٔ فکر بھی پائی جاتی ہے جو اس زمانہ میں کمیاب ہوتی چلی جا رہی ہے، جن شعراء نے کردار کی تعمیر اور اخلاق و حکمت کی تبلیغ کا عظیم کارنامہ انجام دیا ہے، سید علی اختر انہی شعراء کی صف میں آتے ہیں، سنائی، عطار، رومی، سعدی، حالی، اکبر اور اقبال نے جس مسلک سے دماغوں کو منور کا اور جس سوز سے دلوں کو گرمایا ہے۔ سید علی اختر کے کلام میں اسی سوز و فکر کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

علی اختر کی زندگی کا زیادہ حصہ حیدر آباد دکن میں گزرا، اس لئے اُن کے نام کے ساتھ حیدر آبادی لکھا جاتا ہے! مگر اُن کا اصل وطن علی گڑھ تھا، اسی ماحول اور نواح میں اُن کی نشو و نما ہوئی، جب وہ حیدر آباد پہونچے ہیں تو نوجوان تھے، وہاں اُن کی ملازمت کا آغاز محکمہ آبکاری کی انسپکٹری سے ہوا، اس محکمہ میں دستِ غیب (؟) اور مالی فتوحات کے قدم قدم پر مواقع حاصل تھے، وہ چاہتے تو رشوت کی کمائی سے چاندی کے چبوترے چنوا لیتے مگر اُن کی شرافتِ نفس اس عار کو گوارا نہ کرسکی!

علی اختر مرحوم سرکاری ملازمت سے جب سبکدوش ہوتے ہیں تو وہ محکمہ تعمیرات میں معتمد (ڈپٹی سکریٹری) تنخواہ ایک ہزار سے کچھ زیادہ ہی ہوگی، زوالِ حیدر آباد کے بعد اپنے گھر والوں کو لے کر کراچی چلے آتے، اور اسی سرزمین کا پیوند ہوگئے (رحمہ اللہ تعالیٰ)۔

علی اختر کے والد سید کاظم علی باغ اور اُن کے چچا نواب نثار یار جنگ بہادر مزاج (ڈپٹی کمشنر کلکٹر) دونوں بھائی جہاں استاد داغ دہلوی سے شرفِ تلمذ رکھتے تھے۔ علی اختر شعر و ادب کے ماحول میں پروان چڑھے، اُن کے فرزند نظر حیدر آبادی مرحوم اُردو دنیا میں خاصی شہرت کے مالک تھے، یوں کہنا چاہیے کہ شاعری اس خاندان کی جاگیر تھی۔

علی اختر نے غزلیں بھی کہی ہیں، دورِ شباب میں اُن کی غزلوں کا یہ رنگ تھا ـــ

ڈر لیا ہوتی یا تا ہول نجفیِ دلِ دیوانہ
ہلکی سی پھر اک جنبش اے جلوۂ جانانہ

نواب معظم جاہ بہادر کے دربار سے کئی سال تک اُن کا تعلق رہا اور سینکڑوں غزلیں اُن کو کہہ کر دیں!

ـــ مگر ـــ

فطری طور پر اُن کی طبیعت کو صنفِ نظم سے مناسبت تھی!

اُن کی بعض نظمیں "سوفسطائیت" کی آئینہ دار ہیں ـــ یہ کہ دنیا سراب ہے بلکہ خواب ہے، زندگی ایک پہیلی ہے جسے کوئی بوجھ نہیں سکا، انسان واقعات و حوادث کے طوفان میں "حباب" سے بھی زیادہ کمزور ہے، زندگی تارِ عنکبوت کی مانند ہے اور قدم قدم پر ناکامیوں، تلخیوں اور مصیبتوں

کا انسان کو سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان نظموں میں جگ بیتی سے زیادہ آپ بیتی پائی جاتی ہے۔ اکبر الہ آبادی کا یہ شعر ؎

اگرچہ تلخ ہے جام زندگانی کا
مگر مجمل نہیں ساقی سے بدگمانی کا

علی اختر کی زندگی کا ترجمان ہے۔

ان کی نظموں کا دوسرا رنگ اخلاق و حکمت اور معارف شناسی کی تبلیغ ہے۔ علی اختر کی ان نظموں میں فکر و حکمت ملتی ہے، سوزِ دل اور نورِ یقین نے فکر و حکمت کو اور زیادہ تابناک بنا دیا ہے۔

علی اختر کی شاعری دل اور ضمیر کی آواز ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ایمان و اسلام کا تقاضا شعر کے سانچے میں ڈھل گیا ہے اور یہی ان نظموں کے ذریعہ انہوں نے ایک بہت بڑے فرض کو ادا کیا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں شاعری تفریح و نشاط کی بجائے "مقصد" بن جاتی ہے اور شاعری میں "جزویست از پیغمبری" کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔

جوش ملیح آبادی نے ایک طویل نظم "حرفِ آخر" کے نام سے کہی تھی جس میں خدا اور کائنات، مقصدِ آفرینش اور غایتِ تخلیق جیسے دقیق و نازک مسائل کو موضوع بنا کر شاعرانہ افکار کو منظوم کیا گیا، مگر ان مباحث کے لئے جس ظاہری اور باطنی مطالعہ اور حکمت و اشراق کی ضرورت ہے، اُس سے جوش صاحب بڑی حد تک محروم ہیں پھر ان کی طبیعت میں خدا اور دین و اخلاق سے جو بغاوت کا جذبہ پایا جاتا ہے اس نے جوش صاحب کی اس نظم میں سطحیت پیدا کر دی۔ وہ اس خوش فہمی میں بھی مبتلا تھے کہ ان کی اس نظم کے منظرِ عام پر آتے ہی لوگ چونک جائیں گے اور شعر و ادب اور علم و تحقیق کے حلقوں میں دھوم مچ جائے گی، مگر ایسا نہیں ہوا، اُن کی اس نظم نے اہلِ ذوق کی توجہ کو نہ تو اپنی طرف کھینچا، نہ اس نے قلب و نظر کے ساحل پر کوئی موج پیدا کی، نہ یہ پڑھ کر خیالات کے صحرا میں کوئی بگولا اُٹھا! اور اب تو یہ نظم گمنام سی ہو گئی ہے۔

سید علی اختر نے جوش کی اس نظم کے جواب میں ایک طویل نظم کہی "قولِ فیصل" نام رکھا، اس نظم کے کچھ حصے ماہنامہ "نگار" میں شائع ہوتے پھر کتابی شکل میں منظرِ عام پر آئی اس پر نیاز فتحپوری نے "تعارف" لکھا جس کا ایک اقتباس درج ذیل کیا جاتا ہے ؎

"جوش کی وہ طویل نظم جس کا عنوان انہوں نے "حرفِ آخر" رکھا ہے ابھی تک تمام و کمال شائع نہیں ہوئی لیکن اس کے متفرق اجزاء مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں اور ان میں مذہب و عقائدِ مذہب کے خلاف جو کھلی ہوئی بغاوت و تضحیک پائی جاتی ہے اُس نے اختر کو مجبور کر دیا کہ وہ اس کا جواب لکھیں"

نظم کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ ایک شاعر جو آشفتہ حال اور پریشان روزگار ہے کھری چارپائی پر پڑا ہوا ہے۔

دل سے دردِ نامرادی کی خلش جاتی نہ تھی ۔۔۔ کروٹوں پر کروٹیں لیتا تھا نیند آتی نہ تھی
جل رہے تھے اس کے سینے میں غمِ ہستی کے داغ ۔۔۔ تیرہ و تاریک جھونپڑی تھی ٹمٹماتا سا چراغ

اس عالم میں شیطان ایک نوخیز جوان رعنا کی صورت میں اس کے سامنے آتا ہے جس کے ہاتھوں میں شراب سے لبریز صراحی ہے۔

اجنبی آخر بڑھا اُس کی طرف اور اک قدم ۔۔۔ مرتعش یہ نورِ التفات آنکھوں میں اندازِ کرم

اور

اب میں آیا ہوں، تمہیں غم سے چھڑانے کے لئے ۔۔۔ عشرتوں کا دل نشیں مژدہ سنانے کے لئے

شاعر اس جوانِ مے بدست کو دیکھ کر چونکتا ہے۔

آ رہی ہے اس تجسس میں یہ کیسی تلخ بو ۔۔۔ آپ کیوں فرما رہے ہیں، مجھ سے ایسی گفتگو

پہلے میرے ان سوالوں کا مجھے دیجے جواب
سخت حیراں ہوں یہ بیداری کا عالم ہے کہ خواب

نوبلدہ جواب دیتا ہے —

کر چکا آیا ہوں میں پردے اٹھانے کے لئے
شادمانی کی تجلیں راہ میں دکھانے کیلئے

تم ابھی تک ہو اسیرِ ظلمتِ وہم و قیاس
جام توڑ دو کہ اک مرکز پہ آجائیں حواس

شادو شیلین کے ہاتھ سے جام پی لیتا ہے —

شادمانی کی روش کچھ اور تھی عالم اور تھا
جام ہونٹوں سے لگانا تھا کہ عالم اور تھا

اور اس کے بعد —

زندگی کی شست نبضوں میں ہوا نے لگی
مسکرائے پھول ابرِ بہتی چھانے لگا

یہ ہوا محسوس اس کو جیسے ساری کائنات
یہ زمیں یہ چرخ یہ ہنگامۂ مرگ و حیات

سبز شاخوں پہ شگوفے ناز فرماتے ہوئے
بلبل کا رقص مرغانِ ہوا گاتے ہوئے

زندگی ناآشنائے درد عبرت ہو گئی
تھی ابھی دنیا کہانی یا حقیقت ہو گئی

عشق کی خوابیدہ موجوں میں روانی آگئی
پھر پلٹ کر اپنی مرکز پہ جوانی آگئی

شاعر اور دوشیلان سے التجا کرتا ہے —

رہ گئی ہے منزلِ تکمیل شاید چند گام
اپنے میخانے کا صدقہ ہاں! ابھی اور ایک جام

نوبلدہ اس کے جواب میں شاعر سے ہمدردانہ انداز لیکن طنز لب کے لہجہ میں کہتا ہے —

جنس کے وہ پردہ اٹھا دے راز کا چمن کھل جائے گا
پہلے میری بات سن لے جام بھی مل جائے گا

کون ہوں میں جانتے ہو تم مری ہستی کا راز
ہے ابھی ناآشنا ہے عقلِ انسانی کو ناز

میں وہی ہوں جو سکھاتا ہے تمہیں جینے کے ڈھب
صبح ہے جس نے اڑا دی عمرِ ہستی کی شب

میں وہی ہوں جس نے زنداں کو دیا قہر و عتاب
آج تک دنیا نہیں بھولی دیا تھا وہ جواب

میری جنبش پھیر دیتی ہے رخِ لیل و نہار
میری اک گردش میں ویرانوں پہ آتی ہے بہار

میری دنیا رقص و رنگ و شاہد و جام و شراب
میری دنیا کیفِ حسن و عشرت و چنگ و رباب

تو سمجھتا ہے حریفِ جلوۂ ایماں ہوں میں
برقِ خرمن ہوں دہکتی آگ ہوں شعلہ ہوں میں

شیوہ ہائے جرم سے آگاہ کرتا ہوں تجھے
تو سمجھتا ہے کہ میں گمراہ کرتا ہوں تجھے

کس نے ترشے ہیں یہ تیری سطحِ مینا کے حباب
کس کی منت کش ہے رنگ و بو کی ساری آب و تاب

کس نے چھیڑی تھی حدیثِ جلوۂ سرو و سمن
کس نے کھولے تھے تری فطرت پہ اسرارِ چمن

کتنے دھندلے ہیں تری منزل رسی کے خد و خال
خس کے سینے میں کہیں ملتا ہے پھولوں کا جمال

باطنِ ہستی میں بجز وہم و گماں کچھ بھی نہیں
ایک سناٹا ہے غافل اور یہاں کچھ بھی نہیں

ابنِ آدم ہے اسیرِ رشتۂ اُمید و بیم — ناشناسی کی دلیلیں ہیں یہ جنت اور جحیم
خود عمل ہے ہر عمل کے ذوقِ محکم کا صلہ — نیکوکاری پرستش کیوں، حشر کیا، کیسا خدا
فطرتِ آزاد اس بندِ گماں میں ہے اسیر — نسلِ انسانی کی زنجیریں ہیں یہ روح و ضمیر

برتری کے کچھ ادعا ہیں، سیاست کچھ فریب
ان اُچکوں نے کترلی نوعِ انسانی کی جیب

غور کر مذہب نے اس دنیا کو آخر کیا دیا — سیرتِ غارت گری کو اور بھی چمکا دیا
کون سا مذہب ہے اوہامِ باطل کے شکار — عقل اور انسانیت پر ہو بیاں جس کا مدار
تجھ کو مذہب نے دکھائے دوزخ و جنت کے خواب — تجھ کو مذہب نے سکھائی راہِ انعام و صواب
زندگی اوہام کے ان سلسلوں میں کھو گئی — اور دنیا قبر سے بڑھ کر بھیانک ہو گئی
اہلِ مذہب جس تصور پہ بہت کرتے ہیں ناز — وہ یہ دعویٰ ہے کہ دنیا کا خدا ہے کارساز
تازگی پھولوں کو، موجوں کو روانی اُس نے دی — رنگ دے دے کے جام چھلکائے، جوانی اُس نے دی
اک طرف تو یہ صفات اور دوسری جانب یہ حال — ہے دہکتی آگ اُس کی کبریائی کا جلال
دل ہو ورنہ مجسمِ اطاعت اس طرح ہوتا ہے وہ — مدح کے الفاظ سنتا ہے تو خوش ہوتا ہے وہ

واہ رے! مذہب ترے آئینِ حق آگاہ خدا — زندگی کی اس پہیلی کو کوئی پوچھے تو کیا
یہ خدائی ہے ابھی پھولا ابھی دم بھر میں آگ — پھر اُنہی ناچتے ہاتھوں میں ہے اس دنیا کی باگ
جب یکایک ٹوٹتا ہے دم کوئی کڑیل جواں — کیوں نہیں کرتا مدد پر رب کا پاسِ وجاں
جب بھرے گھر کا کسی کے بجھنے لگتا ہے چراغ — بیٹھ جاتا ہے کہاں چھپ کر خدائے باغ و راغ
ٹوٹتی ہے جب کسی بڑھیا کی اکلوتی جہاں کی آس — سوچتا رہتا ہے کیا رحمٰن کا لطفِ بے قیاس
پھیرتا ہے جب زباں ہونٹوں پہ کوئی تشنہ کام — مالکِ کوثر پلاتا کیوں نہیں کوثر کے جام
جب کسی پر آگ برساتا ہے، حاکم کا عتاب — رحمتیں اس وقت ہو جاتی ہیں کیوں معروفِ خواب
خاک پر جب رلتے ہیں گوہرِ اشکِ یتیم — زیرِ لب کیا مسکراتا ہے خداوندِ رحیم
لوٹتی ہے موت جب کل کی بیاہی کا سہاگ — کیوں نہیں اس دم بھڑکتی سینۂ یزداں میں آگ
پیٹتا ہے یاد میں شوہر کی جب بیوہ کا دل — کیوں نہیں آ کر الٹ جاتی بساطِ آب و گل
تیری ہستی خود ہے اس تشریحِ حقائق کی دلیل — کون عہدِ نامرادی میں ہوا تیرا کفیل

شیطان کی ان باتوں نے شاعر کو مبہوت اور لاجواب کر دیا۔ شیطان کا اندازِ خطاب اس قدر پُرجوش اور مرعوب کن تھا کہ بے دلیں شاعر کے ذہن و فکر میں اترتی چلی گئی۔ شیطان نے اندازہ کرنے کے بعد کہ شاعر اس کے دامِ فریب میں آ گیا، اُسے شراب کا ایک اور جام دیا ـــــ شیطان نے پھر اپنی گفتگو کے ٹوٹے ہوئے سلسلہ کو جوڑ دیا، اُس نے کہا ـــــ

؎ تیری کشتی وہم کے دھاروں میں تھی اب تک رواں

—— اور ——

عقل ہے اس خاک کی وسعت میں خلّاقِ بہار
ارتقا کہتے ہیں جس کو ہے خدائے روزگار

———

اب سے لاکھوں سال پہلے یہ جہاں کچھ بھی نہ تھا
یہ بساطِ خاک اور یہ آسماں کچھ بھی نہ تھا

آگ تھی تیز آگ اس عالم میں سرگرمِ حیات
سرخ اور جلتے ہوئے پرزوں میں تھی یہ کائنات

رفتہ رفتہ پھر عناصر میں ہوا کچھ اعتدال
تھم گیا بپھرے ہوئے طوفانِ آتش کا جلال

مختلف دوروں سے گزری ہے یہ خاکِ پرفشاں
زندگی کے ہر قدم لینے پڑے ہیں امتحاں

مادّے کے بطن سے رہ کر بھی ہے کائنات
آپ نکھری ہے کھلی ہے اور بنی ہے کائنات

خاک بادِ آب و آتش کی ہے یہ ساری نمو
ہیں اسی کی ارتقائی صورتیں میں اور تو

وجودِ باری کے انکار اور نفیِ ذاتِ خدا کے سلسلہ میں مادہ پرست اسی قسم کی دلیلیں پیش کرتے ہیں، جوش ملیح آبادی نے بھی اپنی نظم "حرفِ آخر" میں انہی دلیلوں کو دہرایا ہے —— وہ "حیات و توانائی" کو خدا کا درجہ دیتے ہیں۔

اس کے بعد شیطان نے شاعر کو "تعقل و تفکر" کا فریب دیا، اس نے کہا ——

عقل کی ضو میں قدم آگے بڑھانا ہے تجھے
مضحکہ اسرار و عرفاں کا اڑانا ہے تجھے

—— اس کوشش کے بعد ——

قاقم و دیبا کے پردے، نرم قالینوں کا فرش
بام پر بیٹھے گا تو جیسے خدا بالائے عرش

میرے ہمدم! منزلِ امن و سعادت ہے یہیں
تیری دوزخ ہے یہیں اور تیری جنت ہے یہیں

موت کی حد میں پہنچ کر زندگی کیا پائے گی
خاک کی چٹکی کسی دن خاک میں مل جائے گی

دل ہوا روشن کہ اب بھی نعمتیں مستور ہیں
بول کیا یہ زندگی کی راحتیں منظور ہیں

پی چکا تھا بادۂ شیطاں ادیبِ نوجواں
اس میں اب اظہارِ آزادی کی جرأت تھی کہاں

آستانِ کبریا پر خود شناسی جھک گئی
مدح کی آواز آئی۔ اور لبوں پر رک گئی

———

مدتوں یہ کارِ وحشت آزما چلتا رہا
یوں ہی پیہم دہر کا چلتا رہا چلتا رہا

نغمہ و صہبا کی رنگیں بدلیاں کھیل گئیں
عصمتوں کے خوں سے پیہم ہولیاں کھیلی گئیں

عصمتیں بڑھ کر ہوس کے ساز پر گانے لگیں
خلوتیں اس جھمک کو نغموں کو شرمانے لگیں

کج روی کو زندگی کا مدعا سمجھا گیا
عیب کو حسن اور گالی کو دعا سمجھا گیا

اس ادیب و شاعر کو جو شیطان کے فریب میں آکر خدا کا منکر ہو گیا تھا اور جس کی زندگی فسق و معصیت میں بسر ہو رہی تھی!

اس کو اپنے عہد کا روح القدس سمجھا گیا

اخباروں اور رسالوں میں اس کی انقلابی شاعری اور انقلابی پیام کی دھوم مچ گئی، اس کی ہر نظم کا خیر مقدم داد و ستائش سے کیا گیا: وہ لوگ جو مذہب سے عناد رکھتے تھے، انہوں نے اس شاعری کی اک اک بات کو "الہام" کہا!

مگر... شاعرِ فطرت کی چیخ اور ضمیر کی پکار کو آخر کب تک دبائے رہتا ـــــ یہاں تک کہ

عقل تھرائی ہے جس جا وہ مقام آ ہی گیا — رات گزری صبح کا آخر پیام آ ہی گیا
جس جگہ فرعون کے دل سے یہ آتی ہے صدا — کارِ دوراں کچھ نہیں سچا ہے "موسیٰ کا خدا"

عیش و عشرت اور فسق و معصیت کے جس ماحول میں شاعر زندگی گزار رہا تھا، اس نے شاعر کی صحت کو تباہ کر دیا۔

زندگی کیا زندگی کا جیسے دھوکا رہ گیا — کچھ دنوں میں ہڈیوں کا صرف ڈھانچا رہ گیا

زندگی کی توانائی نے جواب دے دیا، جن دوستوں سے غمخواری کی امید تھی وہ رفتہ رفتہ کنارہ کرنے لگے، یہاں تک کہ ـــ

؎ دوست ہی بچھڑے نہ تھے، شیطاں بھی کم آنے لگا

بیمار و ناتواں شاعر نے اپنے اس مشفق ناصح سے شکایت کی ـــ

"جانتا ہے تو کہ سب کچھ تج دیا تیرے لئے
یہ بھی کیا میں نے چھوڑا ہے خدا تیرے لئے"

لیکن اک دن بڑھ گیا جب حد سے اصرارِ ادیب — کہہ دیا شیطان نے آخر بیٹھ کر اس کے قریب
بھوت ہے تو، وصفِ نوعِ انساں بھی تو ہوں — میں سبھی کچھ ہوں مگر نادان شیطاں بھی تو ہوں

پھر شیطان کے جی میں نہ جانے کس طرح نیکی آئی کہ وہ اس طرح گویا ہوا ـــــ

عقل رحمت ہے اگر عرفانِ منزل پا گئی — عقل لعنت ہے جو خود بینی کی زد میں آگئی
جانتا ہوں دام میں کس طرح آئے گا شکار — نوعِ انساں کی یہ کمزوری ہے تجھ پہ آشکار
سن کہ اب اسرار سیارے بتاتا ہوں تجھے — خود سویا تھا مگر اب جگاتا ہوں تجھے
میں نے تجھ کو یہ سکھایا تھا، یہاں کچھ بھی نہیں — بطنِ ہستی میں بجز وہم و گماں کچھ بھی نہیں
میں ہی تجھ سے اب یہ کہتا ہوں کہ تیری کائنات — خاک کی اس سطح پر یہ جنبشِ موجِ حیات
مطربِ فطرت نے چھیڑی ہے نوائے سرمدی — دل کی بیداری ہے جس میں روح کی تابندگی

پھر شیطان کہتا ہے کہ زندگی کا یہ چمن اور گلستانِ کائنات کسی غیبی طاقت کا بنایا اور لگایا ہوا ہے، یہ آپ ہی آپ پیدا نہیں ہو گیا، گلشن دہر کی نشو و نما خالقِ کائنات کے قانونِ قدرت کے تحت ہو رہی ہے ـ

دھوپ سے ہوتی ہے کس حد تک شگوفوں کی نمو — باد و باراں سے کہاں تک ہے فروغِ رنگ و بو
از پئے نشو و نما کتنی لطافت چاہیے — کتنی پودوں کو نمی، کتنی حرارت چاہیے
ایک دستورِ مکمل، ایک آئینِ جمیل — جو ترے گلزار کی شادابیوں کا ہو کفیل

اور

؎ ان حجابوں میں نظر آتا ہے کوئی اور بھی

یہ وہی نقطہ ہے ناداں جس سے کھلتا ہے یہ راز — مادّے اور ارتقا کا بھی ہے کوئی کارساز
اور ہے معمار کوئی نقش بندِ جہانِ پاک
جس کی مٹھی میں ہے یہ سارا طلسمِ آب و خاک

فکرِ انساں حد میں رہتی ہے اگر ہو خود شناس — ورنہ اک موجِ غبارِ عرصۂ وہم و قیاس
کشتیِ امید پھر ساحل کے رخ بہتی نہیں — عقل جب پندار بنتی ہے تو کچھ رہتی نہیں
بھول جاتی ہے وہ رسمِ نظامِ معتبر — یہ سمجھتی ہے کہ میں خود ہوں خداوندِ تبار
پھر اگر آگے بڑھی دھوکے نئے کھانے لگی — مادّے اور ارتقا پہ ناز فرمانے لگی
چند ناقص تجربے ہیں چند ادھورے سے قیاس — کس قدر بودی ہے اب تک علمِ انساں کی اساس
اس نظامِ مستقل کو عقل پا سکتی بھی ہے
مادّے کے بس میں یہ ترتیب آ سکتی بھی ہے

یعنی، اُس شاعر کو بتاتا ہے کہ :—

قوم جب کوئی رہے صدیوں غلامی میں اسیر — بجھ کے رہ جاتے ہیں ایسی قوم کے روح و ضمیر
عیب اس کو اپنی ہر اک شے میں آتا ہے نظر — خاک کے بکھرے ہوئے ذرے ہوں یا سنگ گہر
وہ پجاری بن کے رہ جاتی ہے اُن اصنام کی — جن کے ہاتھوں ڈوبتی ہیں کشتیاں اقوام کی
دوسروں کے نقص کو بھی وہ سمجھتا ہے کمال — ہے اسی کا نام دنیا میں زوال اندر زوال

رب زدہ تمدن نے حیوانی خصائل کو عام رواج دے دیا ہے اور انسان جانور کی طرح بے لگام ہو گیا ہے، جہاں ہریالی دکھائی دیتی ہے منھ مارنے لگتا ہے، زندگی میں کوئی اصول اور قانون و قاعدہ باقی نہیں رہا —— آج کل نام نہاد تمدن دنیا کا یہ نظریہ ہے ——

بن پڑے جب تک شرابِ ناب پینا چاہئے
صرف مرنے کے لئے انساں کو جینا چاہئے

میں نے تجھ کو یہ بتایا تھا کہ قوموں کا زوال — عرصۂ ہستی میں ہے مذہب پرستی کا مآل

اور

ع مذہب اک سازش ہے دنیا میں حقائق کے خلاف

مگر

اب میں کہتا ہوں کہ یہ تشریح دور از حال تھی — یہ تو میرا ایک دھوکا تھا، مری اک چال تھی
راز مذہب کیا ہے؟ تہذیبِ حیاتِ روزگار — ہے اسی آئینِ فطرت پہ زمانے کا مدار
عقل کو اتنی ترقی دی کہ عرفاں کر دیا — تو تو حیواں تھا، تجھے مذہب نے انساں کر دیا
اس گلستاں میں تعصب کا شجر پھلتا نہیں — جبر و استبداد کا سکہ یہاں چلتا نہیں
فکرِ انسانی یہاں اس درجہ ہوتی ہے بلند — پھینکتی ہے ہمتِ مردانہ یزداں پر کمند
وقت کی کن منزلوں میں راہبری کرتا نہیں

مشروبِ وقت
نورس
خوشذائقہ — فرحت بخش

اچھی غذا کے لازمی اجزا
ہر وقت تر و تازہ

ذائقے
اور نفاست
کا معیاری
امتزاج
خوش ذائقہ
مقوّی مٹھائیاں
اسپیشلسٹ
احمد کراچی حلوہ مرچنٹ
کراچی حلوہ ، حبشی حلوہ
سوہن حلوہ
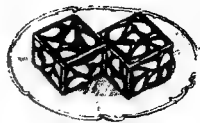
کس نے چھینا قومیت کے بتکدے کا وہ جلال آڑ میں جس کی نہاں تھا نوعِ انساں کا زوال
جس کے سر صدیوں سے خم تھے کس نے اُکسایا انہیں کون سطحِ زندگی پہ کھینچ کر لایا انہیں
بھر تھے جو نشۂ دولت میں ان کو ٹوک کر کس نے کھولیں ان کی آنکھیں کس نے دی ان کو نظر
کس نے الٹی سلطنت کی مسندِ جاہ و جلال کس نے علم و عقل کو بخشا معارف کا جمال
وہ یہی اربابِ مذہب تھے جنہوں نے بے خبر! تیری کم بینی کو سمجھائے مقاماتِ ہنر
دانشِ تعبیر دی اور قوتِ تادیب دی تو تمدن کے بتاتے اور وہ تہذیب تک
آج بھی نازاں ہے جس پر اس گلستاں کی بہار آج بھی ہے جستجو میں جس کی عقلِ رنگار

ان کی عظمت نے جہاں کو زیر و بالا کر دیا
ان کی سیرت نے زمانہ میں اُجالا کر دیا

حق کا پڑتا ہے اگر ہلکا سا پرتو قلب پر آدمی کا اور ہو جاتا ہے اندازِ نظر
جو برائی ہے برائی ہی رہے گی بے خبر! چاہے جتنی کروٹیں بدلے یہاں نوعِ بشر
اصل مذہب ہی رہے گی، چاہے صورت اور ہو ہے یہ فطرت ہو نہیں سکتا کہ فطرت اور ہو
فطرتِ عالی عطا کرتی ہے جینے کے اصول نوعِ انسانی انہیں پہلے تو کرتی ہے قبول
رفتہ رفتہ پھر بدل جاتا ہے اندازِ خیال سیرتِ انساں کے آئینوں میں پڑ جاتے ہیں بال
ہر طرف اُڑتا ہے آئینِ خدا کا مضحکہ زندگی کا مضحکہ، دینِ خدا کا مضحکہ

میں نے تجھ کو یہ بتایا تھا خدا کچھ بھی نہیں وہم ہے اک خالقِ ارض و سما کچھ بھی نہیں
مادے پر منحصر ہے اہتمامِ روزگار کھیلتی ہے ارتقا، پیچ و خمِ زلفِ بہار
گر خدا ہوتا تو چل سکتی نہ تھی بادِ خزاں خاک ہو کر یوں نہ اڑ جاتے مہکتے گلستاں
گر خدا ہوتا تو دنیا تجھ پہ ہو جاتی نہ تنگ زلزلے آتے نہ خوں ریزی کہیں ہوتی نہ جنگ

تو نے ان باتوں کو سچ سمجھا! خوشا حسنِ خیال
دید کے قابل ہے یہ انساں کی سیرت کا زوال

بے خبر! اکرامِ فطرت میں ہے تجھ کو اشتباہ ان حقائق پر نہیں جاتی مگر تیری نگاہ
شاخِ گل سے اک کلی مرجھا کے گرتی ہے اگر سینکڑوں غنچے چٹکتے ہیں بساطِ خاک پر
اک ذرا سی چھیڑ میں پیدا ہوتے ہیں چمن جھومتے ہیں آب و گل کی سطح پر سرو و سمن
یہ ہجومِ رنگ و بو یہ عشرتِ لیل و نہار کس کی آسائش کا عنواں ہے یہ قصدوں کی بہار

ذوق پنہاں چاہیے یا حُسنِ پیدا چاہیے
نعمتیں اتنی تو پھر اے انساں تجھے کیا چاہیے

زندگی کی ہر مصیبت کا ہے اک شیریں مآل ان سے ہوتے ہیں نمایاں حکمتوں کے خد و خال

دل اگر ہو بہرہ یاب جلوۂ علم و یقیں — کون سی ایسی مصیبت ہے جو ٹل سکتی نہیں

اس طرف بھی ہلکا سا اشارا کیا گیا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ ہی خالقِ خیر و شر ہے تو انساں کو اس کی اپنی گمراہی کا ذمہ دار کیوں ٹھیرایا جاتا ہے۔

ہیں یہ باتیں از رہِ کمزوریٔ علم و یقیں — بے خبر! پندار کے دھوکے ہیں دانش کے نہیں

— احد —

عقل طے کرتی ہے جتنی پختگی کی منزلیں — چاہتی ہے ہر قدم اسرار کے غنچے کھلیں

قلبِ انسانی میں چبھکر کانٹے ہیں یہ سوال — زندگی کیا ہے؟ کوئی ظلمت ہے یا نور و جمال

ہم کہاں سے آئے ہیں، کیوں کر بنی ہے کائنات — موت کیا ہے اور کیا ہے رشتۂ مرگ و حیات

چل رہا ہے کس طرح اس کارخانے کا نظام — کون سی قوت ہے اس پردے میں گرمِ اہتمام

یہ چمن کیا ہے، خزاں کیسی ہے؟ کیا ہے نو بہار — آپ ہی کیا بچھ گئی ہے یہ بساطِ روزگار

کیوں چٹکتی ہے کلی، مرجھا کے رہ جاتی ہے کیوں — بادِ عنبر بیز طوفاں میں بدل جاتی ہے کیوں

عقل محوِ جستجو ہے، شوق سرگرمِ طلب — کیوں نہیں کھلتا مگر بابِ طلسمِ روز و شب

یہ تصور رقص کرتے ہیں دلوں میں بار بار — کاوشوں کی ذہن پر ہلکی سی پڑتی ہے پھوار

تو اگر سائنس سے پوچھے کہ کیا ہے کائنات — کون سے رخ بہہ رہی ہے کشتیٔ مرگ و حیات

وہ کہے گی، ہے یہ لامحدود ذروں کا نظام — گردشیں ہیں جن کی بے اندازۂ وقت و مقام

مختلف شکلوں میں یہ تبدیل ہوتے ہیں یہاں — ان کی شکلیں بے نہایت ان کے جلوے بیکراں

فلسفہ ہے اس سے بڑھ کر آشنائے پیچ و تاب — اور بھی بے ربط و مبہم اس سے ملتا ہے جواب

ذہنِ انسانی کے دھوکوں کو بڑھا دیتا ہے یہ — عقل کے ڈانڈے قیاسوں سے ملا دیتا ہے یہ

علم لیکن ان حجابوں کو اٹھا سکتا نہیں
روحِ انسانی کی بے چینی مٹا سکتا نہیں

تو اٹھانا چاہتا ہے رازِ ہستی سے نقاب — مجھ سے سن مشکل نہیں ہے ان سوالوں کا جواب

فلسفہ، سائنس، منطق اور یہ سارے علم و فن — جن سے ہے شاداب آب و گل کی دنیا کا چمن

تو نے کیا پایا تھا ان کو بے تلاش و اکتساب — یوں ہی کیا بر روئے کار آتے ہیں یہ دنیا کے خواب

کیا تصور یہ رہا ہے علم و دانش کا مدار — دب سکا ہے اس طرح ہستی کی راہوں کا غبار

مدتوں ڈھونڈی ہیں راہیں منزلِ تکمیل کی — آج تک لیکن وہی ہے تشنگی تحصیل کی

آج بھی ہیں علم و دانش کے حقائق ناتمام — اس ترقی پر بھی تعبیریں نظر آتی ہیں خام

بے خبر! چھڑتا نہیں یوں سرمدی نغموں کا ساز — عقل بن جاتی ہے جب عرفاں تو کھلتے ہیں یہ راز

زندگی کی مستقل تنظیم پر بھی غور کر
یہ گلستاں یہ گل و ریحاں یہ خورشید و قمر

شب کے سانچوں میں سحر کی تابشیں ڈھلتی ہوئی
خاک کے تودوں میں روحِ زندگی چلتی ہوئی

مادّے اور ارتقا کی ہے یہ ساری گیر و دار
یا کوئی بیدار قوت ہے یہاں سرگرمِ کار

اس نظر سے استفادہ کر جو ہے آگاہِ راز
یہ تو بسیطِ جہاں کس طور سے چھڑتا ہے ساز

کوئی اندھا گر نہ دیکھے زندگی کی آب و تاب
کون کر سکتا ہے انکارِ وجودِ آفتاب

جس سے ملتی تھی دلوں کو گرمیِ فکر و نظر
آگ وہ تو نے بجھا کر آپ رکھ دی بے خبر!

اور جگنو کی چمک پر ہے شرارے کا یقیں
زندگی کی بیل یوں پروان چڑھ سکتی نہیں

زندگی دنیا کی ہے کوئی حقیقت یا نہیں
بہر خلقت ہے کسی خالق کی حاجت یا نہیں

کوئی اندھی رو یہ سب دانے پرو سکتی نہیں
محفلِ ہستی میں یہ ترتیب ہو سکتی نہیں

غور کر اس پر اگر تو کر سکا حل یہ سوال
خود پلٹ جائے گا منزل کی طرف تیرا خیال

روح کی بے چینیاں تسکیں کی راہیں پائیں گی
جتنی ذہنی مشکلیں ہیں آپ حل ہو جائیں گی

اس کے بعد نظم میں اس کی شرح کی گئی ہے کہ دینِ اسلام سرمدی اور تغیر ناآشنا ہے، اور ——

ع اب بھی ان پھولوں کی خوشبو سے معطر ہے نسیم

مگر تو نے غلطی سے اس مغربی تمدن و تہذیب ہی کو سب کچھ سمجھ لیا ہے، یہ تہذیب تو شروع ہی سے سیرت و اخلاق کی حریف رہی ہے، یہاں ملوکیت ہے، سرمایہ داری اور زر پرستی ہے! وہ تمدن جس کی کوششوں کا حاصل "ایٹم بم" ہو، اور جس میں خونریزی اور ہلاکت پر فخر کیا جاتا ہو، جس میں سیرت و اخلاق کا کوئی مقام نہ ہو، جس کو غلاموں، محکوموں اور مظلوموں کی آہ و فریاد سے تسکین اور خوشی ملتی ہو، جس میں روحانی سکون کا فقدان ہو، ایسی تہذیب عقلِ انسانی کو خود بیں اور نفسِ انسانی کو سرکش بنا دیتی ہے۔

اور اے "شاعرِ انقلاب"! تو بغاوت کو بنائے انقلاب سمجھتا ہے! حالانکہ ——

انقلاب آتا ہے عرفانِ حقیقت کے لئے
رہنمائی کے لئے تہذیبِ سیرت کے لئے

صنعتی تعمیر سے کھلتے نہیں ہستی کے باب
ہے وہ ذہنی ارتقا کہتے ہیں جس کو انقلاب

یہ جو اب دنیا میں سرگرمِ عمل ہے انقلاب
اصل میں ہے نوعِ انسانی کا ذہنی اضطراب

جستجو میں ہے سکونِ روح کی اب کائنات
منتشر ہیں انقلابی رو میں اجزائے حیات

نوعِ انسانی کو تباہی سے بچانے کے لئے
مذہب آیا ہے یہی فتنے دبانے کے لئے

ہے یہی آئینِ محکم شرحِ اسرارِ حیات
اس کے بل پر بارہا انساں نے پائی ہے نجات

علم و دانش کچھ نہیں حسنِ حقیقت کے بغیر
زندہ رہتی ہے حقیقت علم و حکمت کے بغیر

تو سمجھتا ہے کبھی وہ وقت بھی آجائے گا　　علم جب ہستی کے اسرار نہاں کو پائے گا
جو نہ تھا معلوم کل تک آج وہ معلوم ہے　　اور کل معلوم ہوگا، آج جو معدوم ہے
موج طوفاں خود لئے جاتی ہے ساحل کی طرف　　رفتہ رفتہ بڑھ رہی ہے عقل منزل کی طرف

اس طرح جب یہ حجابات نظر اٹھ جائیں گے
آنے والے، دانش اجداد پہ شرمائیں گے

—— مگر ——

یہ غلط اندیشیاں ہیں بے یقینوں کے لئے　　عقل کے دھوکے ہیں تجھ سے سطح بینوں کے لئے
ریت کے میداں میں اس امید پہ ہے شادماں　　ایک دن گاتے ہوئے چشمے یہیں ہوں گے رواں
اپنے قبضہ میں عنانِ اختیار آنے تو دے　　کھل کے پی لینا، مگر ابر بہار آنے تو دے

چھیڑتی ہے عقل اگر ایسا فسانے بھی تو کیا
دور کے ہیں ڈھول اگر یہ ہوں سہانے بھی تو کیا

آج کا انساں ہے، انکارِ خدا سے شادماں　　جہل کی ظلمت پہ ہے اس کو تجلی کا گماں
گرچہ اس کی نظر میں ہے ذہانت کی کفیل　　اور اقرارِ خدا ہے عجز ہمت کی دلیل
نوعِ انساں جن دھندلکوں میں ہے اب کھوئی ہوئی　　جہل و نادانی کی گہری نیند میں سوئی ہوئی
کیا عجب عقلیں اگر عقدوں کو سلجھاتی رہیں　　آنے والے عہد میں یہ ظلمتیں جاتی رہیں
کل کی دنیا واقفِ رازِ درون ہو کر رہے　　اضطرابِ روحِ انسانی سکوں ہو کر رہے
دانشِ مغرور اپنے عجز کو پہچان لے　　زندگی کی نا تمامی کی حقیقت جان لے
اس طرح یہ بھی تو ہو سکتا ہے اے محروم راز　　اعترافِ ذاتِ خالق پہ ہو کل انساں کو ناز

شیطان، انقلاب کے داعی اور بغاوت کے مبلغ شاعر سے کہتا ہے کہ تو شروع ہی سے علم و فن کا صحیح قدرداں اور لذت شناس نہیں ہے یہ صرف فطرت کا فیض ہے کہ تیرے کلام میں حسن پیدا ہوگیا۔ وہ حسن گناہ پہ مدہ اور معصیت آلودہ زندگی نے تجھے ذوقِ یقین سے محروم رکھا اور تو شکوک و اوہام میں الجھا رہا،

ابتدا سے تو نہ تھا لذت شناسِ علم و فن　　فیضِ فطرت ہے، اگر کچھ ہے ترا حسنِ سخن
کچھ اثر ماحول کا تھا اور کچھ شہرت کے خواب　　کچھ قبولِ عام کی رو کچھ ہوس کا پیچ و تاب
میں نے دیکھا جھک رہا ہے تو گناہوں کی طرف　　اٹھ رہی ہیں تیرے دل میں شک کی موجیں صف بصف
دل میں تیرے لذتِ اوہام کو چونکا دیا　　آنچ دھیمی تھی ذرا میں نے اُسے بھڑکا دیا
میری چالوں سے ترے دل کی کلی کو کھل گئی　　شہرتِ ارزاں کا طالب تھا، تجھے وہ مل گئی

مند بن کر بھی سرورِ زندگی ملتا نہیں
نشہ مل جاتا ہے لطفِ سرمدی ملتا نہیں

۔ ۔ علی اختر اختر کی یہ نظم اپنے موضوع پر بڑے معرکہ کی نظم ہے، اس نظم سے شکوک و اوہام کے دُھند

مولانا محمد تقی عثمانی
(مدرس دارالعلوم کراچی)

انجیل برناباس

ایک مطالعہ

یہ بات تو اب علمی دنیا میں ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ جو انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی، وہ دنیا سے مفقود ہو چکی ہے، اس وقت جو کتابیں "انجیل" کے نام سے مشہور ہیں، ان سے مراد حضرت عیسیٰؑ کی سوانح حیات ہے، جسے مختلف لوگوں نے قلمبند کیا ہے اور اس میں آپ کی تعلیمات کا ایک بڑا حصہ پایا جاتا ہے۔

تواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مختلف شاگردوں اور حواریوں نے اس قسم کی انجیلیں لکھی تھیں، لوقا اپنی انجیل کے شروع میں لکھتے ہیں:۔

"چونکہ بہتوں نے اس پر کمر باندھی ہے کہ جو باتیں ہمارے درمیان واقع ہوئیں ان کو ترتیب وار بیان کریں،
جیسا کہ انہوں نے جو شروع سے خود دیکھنے والے اور کلام کے خادم تھے ان کو ہم تک پہنچایا" (لوقا ۱: ۱ و ۲)

لیکن عیسائی حضرات نے ان بہت سی انجیلوں میں سے صرف چار انجیلوں کو معتبر مانا ہے جو علی الترتیب متّی، مرقس، لوقا اور یوحنا کی طرف منسوب ہیں، باقی انجیلیں یا تو گم ہو چکی ہیں یا موجود ہیں، مگر انہیں عیسائی حضرات تسلیم نہیں کرتے۔

لیکن آج سے تقریباً ڈھائی سو سال پہلے ایک کتاب دریافت ہوئی جو برناباس حواری کی طرف منسوب ہے، اس کتاب کی دریافت نے دنیا بھر میں ایک ہلچل پیدا کر دی، اس لئے کہ اس میں نہ صرف یہ کہ بے شمار باتیں ایسی موجود تھیں جن سے عیسائیت کا پورا ایوان منہدم ہو جاتا ہے بلکہ اس میں نبیٔ آخر الزمان حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی بھی لکھا ہوا تھا۔

اسی وقت سے کر آج تک بہت سے علمائے عیسائیت اور ماہرین تاریخ نے اس کتاب کو اپنا موضوع بحث بنایا ہے، اور تمام عیسائی علماء نے دعویٰ کیا ہے کہ یہ اصلی انجیل برناباس نہیں ہے بلکہ اس کا مصنف کوئی مسلمان ہے جس نے عیسائیت کو غلط ثابت کرنے کے لئے اُسے برناباس حواری کی طرف منسوب کر دیا ہے۔

جناب سید رشید رضا مصری مرحوم کے ایک مختصر مضمون کے سوا اس سلسلے میں کسی مسلمان کی کوئی تحریر میری نظر سے نہیں گذری، حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانویؒ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "اظہار الحق" میں انجیل برناباس کا بہت مختصر سا ذکر فرمایا ہے، راقم الحروف حال ہی میں اظہار الحق کے اردو ترجمے کی شرح و تحقیق سے فارغ ہوا ہے اسی دوران مجھے انجیل برناباس اور اس کے موضوع پر مختلف مضامین پڑھنے کا اتفاق ہوا، ان مطالعے کا حاصل میں اس مختصر مقالے میں پیش کر رہا ہوں، امید ہے کہ علم دوست حضرات کے لئے دلچسپی کا باعث ہوگا۔

میں سب سے پہلے انجیل برناباس کا مختصر تعارف اور اس کے کچھ اقتباسات پیش کروں گا، اس کے بعد قدرے تفصیل کے ساتھ اس بات کی

تحقیق کی جائے گی کہ یہ انجیل اصلی ہے یا جعلی ۔ انجیل برناباس معروف اناجیل اربعہ سے بہت سی چیزوں میں مختلف ہے، لیکن چار اختلافات ایسے ہیں جنہیں بنیادی اہمیت حاصل ہے :-

(۱) اس انجیل میں حضرت مسیح نے اپنے "خدا" اور "خدا کا بیٹا" ہونے سے صاف انکار کیا ہے۔

(۲) اس میں حضرت مسیح نے بتایا ہے کہ وہ "مسیح" یا "مسیّا" جس کی بشارت عہد قدیم کے صحیفوں میں دی گئی ہے، اس سے مراد میں نہیں ہوں، بلکہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اس کا مصداق ہیں جو آخر زمانے میں مبعوث ہوں گے۔

(۳) برناباس کا بیان ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو سولی نہیں دی گئی، بلکہ ان کی جگہ یہوداہ اسکریوتی کی صورت بدل دی گئی تھی جسے یہودیوں نے حضرت عیسیٰ سمجھا اور پھانسی پر چڑھا دیا، حالانکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ نے آسمان پر اٹھا لیا تھا۔

(۴) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے جس بیٹے کو ذبح کرنے کا ارادہ کیا تھا وہ حضرت اسحٰق نہیں بلکہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام تھے۔

انجیل برناباس میں آنحضرت کا اسم گرامی

ذیل میں ہم انجیل برناباس کی چند وہ عبارتیں پیش کرتے ہیں جنہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبانی سرور کونین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کی بشارتیں ذکر کی گئی ہیں، ہمارے پاس انجیل کے عربی اور اردو ترجمے ہیں، ہم یہاں دونوں کی عبارتیں نقل کریں گے، اردو ترجمے پر اس لئے اکتفا نہیں کیا گیا کہ وہ ایک مسلمان عالم کا کیا ہوا ہے، اس کے برعکس عربی ترجمہ ڈاکٹر خلیل سعادت نے کیا ہے جو ایک عیسائی عالم ہیں۔

(۱) لست أهلاً أن أحل رباطات جرموق أو سيور حذاء رسول الله الذي تسمونه مسيا الذي خلق قبلي وسيأتي بعدي (فصل ۴۲ آیت ۱۶)

میں اس کے لائق بھی نہیں ہوں کہ اس رسول اللہ کے جوتے کے بند یا نعلین کے تسمے کھولوں جس کو تم مسیّا کہتے ہو، وہ جو کہ میرے پہلے پیدا کیا گیا اور اب میرے بعد آئے گا۔

(عربی ترجمہ مطبوعہ قاہرہ ۱۹۵۸ء ص ۶۲ و اردو ترجمہ مطبوعہ لاہور ۱۹۱۶ء ص ۶۴)

(۲) ولما رأيته امتلأت عزاء قائلاً يا محمد ليكن الله معك وليجعلني أهلاً أن أحل سير حذائك (فصل ۴۴ آیت ۳۰)

اور جب کہ میں نے اس کو دیکھا میں تسلی سے بھر کر کہنے لگا، اے محمد! اللہ تیرے ساتھ ہو اور مجھ کو اس قابل بنائے کہ میں تیری جوتی کا تسمہ کھولوں۔

(عربی ترجمہ ص ۶۹، اردو ترجمہ ص ۷۰)

(۳) أجاب التلاميذ يا معلم من عسى أن يكون ذلك الرجل الذي تتكلم عنه الذي سيأتي إلى العالم؟ أجاب يسوع بابتهاج قلب: إنه محمد رسول الله۔ (فصل ۱۶۳ آیات ۷، ۸)

شاگردوں نے جواب میں کہا اے معلم! وہ آدمی کون ہوگا جس کی نسبت تو یہ باتیں کہتا ہے اور جو کہ دنیا میں عنقریب آئے گا! یسوع نے دلی خوشی کے ساتھ جواب دیا بیشک وہ محمد رسول اللہ ہے۔

(عربی ترجمہ ص ۲۴۲، اردو ترجمہ ص ۲۴۴)

(۴) الحق أقول لكم متكلماً من القلب إني أقشعر لأن العالم سيدعوني إلهاً وعلي أن أقدم لأجل هذا حساباً، لعمر الله الذي نفسي واقفة في حضرته إني رجل فان كسائر الناس (۵۲ : ۱۰ تا ۱۳)

میں تم سے سچ کہتا ہوں دل سے باتیں کرتا ہوا کہ برآئینہ میرے بھی رونگٹے کھڑے ہوں گے اس لئے کہ دنیا مجھ کو معبود کہے گی اور مجھ پر لازم ہوگا کہ اس کے حضور میں حساب پیش کروں، اللہ کی زندگانی کی قسم ہے وہ اللہ کہ میری جان اس کے حضور میں کھڑی ہونے والی ہے کہ بیشک میں بھی ایک فنا ہونے والا آدمی ہوں، تمام انسانوں جیسا۔

اس انجیل کی دریافت

قدیم عیسائی لٹریچر میں انجیل برناباس کا ذکر ایک گمشدہ کتاب کی حیثیت سے ملتا ہے، لیکن ۱۷۰۹ء میں شاہ پروشیا کے ایک مشیر کو جس کا نام کریمر تھا، ایمسٹرڈم کے مقام پر کسی کتب خانے سے ایک کتاب ہاتھ لگی جو اطالوی زبان میں تھی اور اس پر لکھا ہوا تھا کہ یہ برناباس حواری کی لکھی ہوئی انجیل ہے، اس وقت تک صرف اتنا معلوم ہو سکا تھا کہ کریمر نے یہ اطالوی نسخہ ایمسٹرڈم کے کسی صاحب حیثیت آدمی سے حاصل کیا تھا جو اسے انتہائی قیمتی کتاب سمجھتا تھا، کریمر نے یہ نسخہ شہزادہ یوجین سافوی کو تحفے کے طور پر دے دیا، اس کے بعد ۱۷۳۸ء میں آسٹریا کے پایۂ تخت وائنا کے شاہی کتب خانے میں منتقل ہو گیا، اور آج تک وہیں ہے۔

اس کے بعد اٹھارویں صدی کی ابتداء ہی میں ہیڈلی کے مقام پر ڈاکٹر ہلمن کو انجیل برناباس کا ایک اور نسخہ دستیاب ہوا، جو ہسپانوی زبان میں تھا، یہی نسخہ مشہور مستشرق جارج سیل کو ملا تھا جس سے اس نے اپنے ترجمۂ قرآن میں مختلف اقتباسات نقل کئے ہیں۔

جارج سیل نے اس ہسپانوی نسخے پر جو نوٹ لکھا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ درحقیقت یہ مذکورہ بالا اطالوی نسخے کا ہسپانوی ترجمہ ہے جو کسی ارغانی مسلمان مصطفیٰ عرندی نے کیا ہے، مصطفیٰ عرندی ہی نے اس کے شروع میں ایک دیباچہ بھی لکھا ہے جس میں اطالوی نسخے کی دریافت کا دلچسپ حال تحریر ہے۔

اس دیباچے کا خلاصہ یہ ہے کہ تقریباً سولہویں صدی کے اختتام پر ایک لاطینی راہب فرامرینو کو آئرینوس بشپ کے کچھ خطوط دستیاب ہوئے جن میں سے ایک میں پولس[1] پر سخت تنقید کی گئی تھی اور ساتھ ہی یہ لکھا تھا کہ انجیل برناباس میں پولس کی حقیقت خوب واضح کی گئی ہے ــــ جب سے فرامرینو نے آئرینوس کا یہ خط پڑھا تھا، اس وقت سے وہ مسلسل انجیل برناباس کی جستجو کر رہا تھا۔

کچھ عرصے کے بعد اسے اس زمانے کے پوپ سکسٹس پنجم کا تقرب حاصل ہو گیا، اور ایک مرتبہ پوپ کے ساتھ اس کے کتب خانے میں چلا گیا، کتب خانے میں پہنچ کر پوپ کو نیند آگئی، اس عرصے میں فرامرینو نے وقت گذاری کے لئے کتابیں دیکھنی شروع کیں، حسنِ اتفاق سے اس نے پہلی بار جس کتاب پر ہاتھ ڈالا وہ انجیل برناباس کا اطالوی نسخہ تھا، فرامرینو اسے حاصل کر کے بہت خوش ہوا اور اسے آستین میں چھپا کر لے آیا۔

یہ پوری روایت مستشرق سیل نے مصطفیٰ عرندی کے حوالہ سے ترجمۂ قرآن کے مقدمے میں لکھی ہے، یہ ہسپانوی نسخہ جو سیل کے پاس تھا اب گم ہو چکا ہے البتہ اتنا معلوم ہے کہ ۱۷۸۴ء میں یہ نسخہ ڈاکٹر وہائٹ کے پاس آگیا تھا، اور اس نے اپنے لیکچروں میں بتلایا ہے کہ دو جگہ معمولی اختلاف کے علاوہ اطالوی اور ہسپانوی نسخوں میں کوئی قابلِ ذکر فرق نہیں ہے۔

خلاصہ یہ کہ اب دنیا میں صرف قدیم اطالوی نسخہ موجود ہے اسی سے ڈاکٹر منگرس نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کر دیا، پھر مصر کے ایک مسیحی عالم ڈاکٹر خلیل سعادت نے اسے انگریزی سے عربی میں منتقل کیا، یہ عربی ترجمہ جناب سید رشید رضا مصری مرحوم نے ۱۹۰۸ء میں اپنے ایک مختصر مقدمے کے ساتھ شائع کر دیا، ڈاکٹر خلیل سعادت ہی نے اس انجیل کی فصلوں پر آیتوں کے نمبر ڈالے ہیں، اصل نسخے میں یہ نمبر موجود نہ تھے اور انہوں نے ہی اس کے شروع میں ایک طویل دیباچہ لکھا ہے جس میں اولاً انجیل برناباس کی دریافت کا مذکورہ بالا واقعہ تحریر ہے اور اس کے بعد ڈاکٹر خلیل سعادت نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ انجیل کسی ایسے یہودی شخص کی تصنیف ہے جو پہلے نصرانی اور پھر مسلمان ہو گیا تھا۔

یہ عربی ترجمہ ہندوستان پہنچا تو مولوی محمد حلیم صاحب انصاری ردولوی نے اس کا اردو ترجمہ کیا جو ۱۹۱۶ء میں لاہور سے شائع ہوا[2]۔

یہ تھا انجیل برناباس کا مختصر تعارف! اب ہم تحقیق کریں گے کہ یہ انجیل واقعۃً برناباس کی تصنیف ہے یا ــــ عیسائی علماء کے بقول ــــ کسی مسلمان کی گھڑی ہوئی ہے؟ جہاں تک ہم نے تحقیق کی ہے ہم پر یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ اس انجیل کا درجۂ استناد بائبل کے کسی بھی صحیفے سے کم نہیں ہے بلکہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔

---

[1] پولس، عیسائیوں کا سب سے بڑا امام ہے جس کے چودہ خطوط بائبل میں شامل ہیں۔ (تقی) [2] جو حضرات یہ ترجمہ دیکھنا چاہیں وہ عربی ترجمہ اسٹیٹ بنک کراچی کی لائبریری میں، اور اردو ترجمہ مجلس علمی میکلوڈ روڈ کراچی کے کتب خانے میں دیکھ سکتے ہیں۔

برناباس کون تھے؟

انجیل برناباس کی حقیقت اور اس کی اصلیت کی تحقیق کرنے کے لئے ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ برناباس کون ہیں؟ حواریوں میں ان کا مقام کیا تھا؟ اور ان کے عقائد اور نظریات کیا تھے؟ —— ان کے تعارف کا پہلا جملہ ہمیں لوقا کی کتاب اعمال میں ملتا ہے، وہ لکھتے ہیں :-

"اور یوسف نامی ایک لاوی تھا جس کا لقب رسولوں[1] نے برنباس یعنی نصیحت کا بیٹا رکھا تھا اور جس کی پیدائش کپرس کی تھی، اس کا ایک کھیت تھا جسے اس نے بیچا اور قیمت لاکر رسولوں کے پاؤں میں رکھ دی" (اعمال ۴: ۳۶ و ۳۷)

اس سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ برنباس حواریوں میں بلند مقام کے حامل تھے اور اسی وجہ سے حواریوں نے ان کا نام "نصیحت کا بیٹا" رکھ دیا تھا، دوسرے یہ بات معلوم ہوئی کہ انہوں نے خدا کی رضا جوئی کی خاطر اپنی ساری دنیوی پونجی تبلیغی مقاصد کے لئے صرف کر دی تھی۔

اس کے علاوہ برناباس کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ انہوں نے ہی تمام حواریوں سے پولس کا تعارف کرایا تھا، پولس جس کا یہودی نام ساؤل ہے، ابتداء میں کٹر یہودی تھا، اور شروع میں آپ نے حواریوں پر سخت ظلم وستم ڈھائے تھے، پھر اچانک دمشق پہونچ کر اس نے یہ دعویٰ کیا کہ دمشق کے راستے میں مجھے یک لخت اور اس میں سے مجھے "خداوند یسوع" کی یہ آواز آئی کہ تو مجھے کیوں ستاتا ہے؟ چنانچہ اب میں "یسوع مسیح" پر ایمان لا چکا ہوں، حواریوں میں سے کوئی یہ یقین کرنے کے لئے تیار نہ تھا کہ جو شخص کل تک ہم لوگوں کو ستاتا اور تکلیف پہونچاتا رہا ہے، آج اخلاص کے ساتھ ہمارا دوست، اور ہم مذہب ہو سکتا ہے لیکن یہ برناباس ہی تھے جنہوں نے تمام حواریوں کے سامنے پولس کی تصدیق کی اور انہیں بتایا کہ یہ واقعی تمہارا ہم مذہب ہو چکا ہے چنانچہ لوقا پولس کے بارے میں لکھتے ہیں :

"اس نے یروشلیم میں پہونچ کر شاگردوں میں مل جانے کی کوشش کی، اور سب اس سے ڈرتے تھے کیونکہ ان کو یقین نہ آتا تھا کہ یہ شاگرد ہے، مگر برنباس نے اسے اپنے ساتھ رسولوں کے پاس لے جا کر ان سے بیان کیا کہ اس نے اس اس طرح راہ میں خداوند کو دیکھا اور اس نے اس سے باتیں کیں، اور اس نے دمشق میں کیسی دلیری کے ساتھ یسوع کے نام سے منادی کی" (اعمال ۹: ۲۶ و ۲۷)

اس کے بعد بھی کتاب اعمال ہی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پولس اور برنباس عرصہ دراز تک ایک دوسرے کے ہم سفر رہے اور انہوں نے ایک ساتھ تبلیغ عیسائیت کا فریضہ انجام دیا، (دیکھئے اعمال ۱۱: ۲۵ والباب ۱۳، ۱۴، ۱۵) یہاں تک کہ دوسرے حواریوں نے ان دونوں کے بارے میں یہ شہادت دی کہ :

"یہ دونوں ایسے آدمی ہیں جنہوں نے اپنی جانیں ہمارے خداوند یسوع مسیح کے نام پر نثار کر رکھی ہیں" (اعمال ۱۵: ۲۶)

پولس اور برنباس کا اختلاف

اعمال کے پندرہویں باب تک برنباس اور پولس ہر معاملے میں شیر وشکر نظر آتے ہیں، لیکن اس کے بعد اچانک ایک ایسا واقعہ پیش آتا ہے جو بطور خاص توجہ کا مستحق ہے، اتنے عرصے تک ساتھ رہنے اور تبلیغ و دعوت میں اشتراک کے بعد اچانک دونوں میں اس قدر سخت اختلاف پیدا ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کا روادار نہیں رہتا، یہاں تک کہ دونوں ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں یہ واقعہ کتاب اعمال میں کچھ اس طرح ناگہانی طور سے بیان کیا گیا ہے کہ پڑھنے والا پہلے سے اس کی توقع نہیں کر سکتا، لوقا لکھتے ہیں :-

"مگر پولس اور برنباس انطاکیہ ہی میں رہے اور بہت سے اور لوگوں کے ساتھ خداوند کا کلام سکھاتے اور اس

---

[1] عہد نامہ جدید میں "رسولوں" سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری ہوا کرتے ہیں۔

کی منادی کرتے رہے، چند روز بعد پولس نے برنباس سے کہا کہ جن جن شہروں میں ہم نے خدا کا کلام سنایا تھا آؤ پھر اُن میں چل کر بھائیوں کو دیکھیں کہ کیسے ہیں؟ اور برنباس کی صلاح تھی کہ یوحنا کو جو مرقس کہلاتا ہے اپنے ساتھ لے چلیں، مگر پولس نے یہ مناسب نہ جانا کہ جو شخص پمفیلیہ میں کنارہ کر کے اُس کام کے لئے ان کے ساتھ نہ گیا تھا اس کو ہمراہ لے چلیں پس اُن میں ایسی سخت تکرار ہوئی کہ ایک دوسرے سے جدا ہو گئے، اور برنباس مرقس کو لے کر جہاز پر کُپرُس کو روانہ ہوا، مگر پولس نے سیلاس کو پسند کیا، اور بھائیوں کی طرف سے خدا کے فضل کے سپرد ہو کر روانہ ہوا، اور کلیسیاؤں کو مضبوط کرتا ہوا سوریہ اور کلکیہ سے گذرا" (اعمال ۱۵: ۳۶ تا ۴۱)

کتاب اعمال میں بظاہر اس شدید اختلاف کی وجہ صرف یہ بیان کی گئی ہے کہ برنباس یوحنا مرقس کو ہم سفر بنانا چاہتا تھا اور پولس اس سے انکار کرتا تھا، لیکن ہماری رائے میں اس شدید اختلاف کا سبب صرف اتنی معمولی سی بات نہیں ہو سکتی، بلکہ دونوں کی یہ دائمی جدائی یقیناً کچھ بنیادی اختلافات کی بنا پر عمل میں آئی تھی، اس بات کے ثبوت میں ذیل شواہد ہیں:-

(۱) لوقا نے کتاب اعمال میں ان کے "اختلاف" اور "جدائی" کو بیان کرنے کے لئے جو یونانی الفاظ استعمال کئے ہیں وہ غیر معمولی طور پر سخت ہیں، مسٹر ای۔ ایم بلیک لاک (E. M. BLAIKLOCK) اپنی کتاب اعمال کی شرح میں لکھتے ہیں:

"اب لوقا ایمانداری کے ساتھ دونوں رفقاء (پولس اور برنباس) کے درمیان واقع ہونے والے اختلاف کی المناک کہانی لکھتا ہے، جو لفظ اس نے استعمال کیا ہے یعنی PAROXUSMUS وہ بڑا سخت لفظ ہے اور انگریزی مترجم R. S. V نے اس لفظ کے ترجمے میں لفظ SHARP (تیز و سخت) کا اضافہ بالکل درست کیا ہے۔ پولس اور برنباس ایک دوسرے سے بالکل جدا ہو جاتے ہیں، یہاں پھر جدائی کے لئے یونانی زبان کا ایک ایسا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو بڑا سخت ہے اور عام طور سے استعمال نہیں کیا جاتا، یہ لفظ عہد نامہ جدید میں اس جگہ کے علاوہ صرف مکاشفہ ۶:۱۴ میں ملتا ہے، جہاں آسمانوں کے تباہ ہو کر پھٹ جانے کا ذکر ہے" (شرح کتاب اعمال[1] مرتبہ ٹاسکر ص ۱۱۸ و ۱۱۹)

کیا اتنا شدید اختلاف جس کے لئے ایسے غیر معمولی الفاظ استعمال کئے گئے ہوں، صرف اس بنا پر پیدا ہو سکتا ہے کہ ایک شخص یوحنا مرقس کو رفیق سفر بنانا چاہتا ہے اور دوسرا سیلاس کو؟ اس قسم کے اختلافات بلاشبہ بعض اوقات پیدا ہو جاتے ہیں، لیکن ان کی بنا پر ہمیشہ کے لئے کسی دیرینہ رفاقت کو خیرباد نہیں کہا جاتا، خصوصاً جبکہ یہ رفاقت اس مقصد کے لئے ہو جس کے تقدس اور پاکیزگی کے دونوں معترف ہیں، وہ برنباس جو تبلیغ دین کے لئے اپنی ساری پونجی لا کر حواریوں کے قدموں میں ڈھیر کر سکتا ہے کیا صرف اپنے ایک رشتہ دار کی وجہ سے تبلیغ و دعوت کے مقصد میں ایسی رخنہ اندازی کو گوارا کرے گا؟

(۲) پھر لطف کی بات یہ ہے کہ بعد میں پولس یوحنا مرقس کی رفاقت کو گوارا کر لیتا ہے، چنانچہ تمیتھیس کے نام اپنے دوسرے خط میں وہ لکھتا ہے:-

"مرقس کو ساتھ لے کر آجا، کیونکہ خدمت کے لئے وہ میرے کام کا ہے" (۲-تمیتھیس ۴:۱۱)

اس سے معلوم ہوا کہ مرقس سے پولس کا اختلاف اتنی اہمیت کا حامل نہ تھا کہ اس پر برنباس جیسے شخص کی دوستی کو قربان کر دیا جائے، اسی لئے اس نے بعد میں مرقس کی رفاقت کو گوارا کر لیا، لیکن پورے عہد نامہ جدید یا تاریخ کی کسی اور کتاب میں کہیں نہیں ملتا کہ بعد میں برنباس کے ساتھ بھی پولس کے تعلقات درست ہو گئے تھے، اگر جھگڑے کی اصل وجہ مرقس ہی تھا تو اس کے ساتھ پولس کی رضامندی کے بعد برنباس کے ساتھ اس کی دوستی کیوں بحال نہ ہوئی؟

(۳) پھر جب ہم خود پولس کے خطوط میں برنباس سے اس کی ناراضی کے اسباب تلاش کرتے ہیں تو ہمیں یہ کہیں نہیں ملتا کہ اس کا سبب یوحنا مرقس تھا، اس کے

---

[1] Cammentary on Acts" EDITED by R.V.G Tasker PP.118, 119

برخلاف ہمیں ایک جملہ ایسا ملتا ہے جس سے دونوں کے اختلاف کے اصل سبب پر کافی روشنی پڑتی ہے، گلتیوں کے نام اپنے خط میں پولس لکھتا ہے :۔

"لیکن جب کیفا (یعنی پطرس) انطاکیہ میں آیا تو میں نے روبرو ہو کر اس کی مخالفت کی، کیونکہ وہ ملامت کے لائق تھا، اس لئے کہ یعقوب کی طرف سے چند شخصوں کے آنے سے پہلے تو وہ غیر قوم والوں کے ساتھ کھایا کرتا تھا، مگر جب وہ آ گئے تو مختونوں سے ڈر کر باز رہا، اور کنارہ کیا، اور باقی یہودیوں نے بھی اس کے ساتھ ہو کر ریا کاری کی، یہاں تک کہ برنباس بھی ان کے ساتھ ریا کاری میں پڑ گیا" (گلتیوں ۲: ۱۱ تا ۱۳)

اس عبارت میں پولس دراصل اس اختلاف کا ذکر کر رہا ہے جو حضرت مسیح کے عروج آسمانی کے کچھ عرصہ کے بعد یروشلم اور انطاکیہ کے عیسائیوں میں رونما ہوا تھا۔ یروشلم کے اکثر لوگ پہلے یہودی تھے، اور انہوں نے بعد میں عیسوی مذہب قبول کیا تھا، اور انطاکیہ کے اکثر لوگ پہلے بت پرست یا آتش پرست تھے اور حواریوں کی تعلیم و تبلیغ سے عیسائی ہوئے تھے، پہلی قسم کو بائبل میں "یہودی مسیحی" (JEWISH CHRISTIANS) اور دوسری قسم کو "غیر قوم کے لوگ" (GENTILE CHRISTIANS) کہا گیا ہے، یہودی مسیحیوں کا کہنا یہ تھا کہ ختنہ کرانا اور موسوی شریعت کی تمام رسوم پر عمل کرنا ضروری ہے، اسی لئے انہیں "مختون" بھی کہا جاتا ہے، اور "غیر قوموں" کا کہنا یہ تھا کہ "ختنہ" فرض نہیں، اس لئے انہیں "نامختون" کہا جاتا ہے، اس کے علاوہ یہودی مسیحیوں میں چھوت چھات کی رسم جاری تھی اور وہ غیر قوموں کے ساتھ کھانا پینا اور اٹھنا بیٹھنا پسند نہ کرتے تھے، پولس اس معاملے میں سو فیصدی غیر قوموں کا حامی تھا اور ختنہ اور موسوی شریعت کی رسوم کی منسوخی اس کے انقلاب انگیز نظریات میں سے ایک نظریہ ہے جسے ثابت کرنے کے لئے اس نے اپنے خطوط میں جا بجا مختلف دلائل پیش کئے ہیں (ملاحظہ ہو رومیوں ۴، [illegible] کرنتھیوں ۷، گلتیوں ۵، [illegible] فلپیوں ۳، کلسیوں ۲ وغیرہ)

اب ہم نے گلتیوں کے نام خط کی جو عبارت پیش کی اس میں پولس نے جناب پطرس اور برنباس پر اسی لئے ملامت کی ہے کہ انہوں نے انطاکیہ میں رہتے ہوئے مختونوں کا ساتھ دیا اور پولس کے ان نئے مریدوں سے علیحدگی اختیار کی جو ختنہ اور موسوی شریعت کے قائل نہ تھے، چنانچہ اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے پادری ڈبلیو پیٹرسن اسمتھ لکھتے ہیں :۔

"پطرس اس جنبی شہر (انطاکیہ) میں زیادہ تر ان لوگوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہے جو یروشلم سے آئے تھے اور جو اس کے پرانے ملاقاتی تھے، اب ایسا جب وہ ان کا ہم خیال ہونے لگتا ہے تو دوسرے مسیحی یہودی پطرس سے متاثر ہوتے ہیں یہاں تک کہ برنباس بھی غیر قوم مریدوں سے علیحدگی اختیار کرنے لگتا ہے اس قسم کے سلوک کو دیکھ کر ان نو مریدوں کی دل شکنی ہوتی ہے۔ جہاں تک ممکن ہے پولس اس بات کو برداشت کرتا ہے، مگر بہت جلد وہ اس کا مقابلہ کرتا ہے گویا ایسا کرنے میں اسے اپنے مقصد کی محافظت کرنی پڑتی ہے"

(حیات و خطوط پولس، ص ۸۸، ۸۹ مطبوعہ [illegible] پنجاب رلیجیس بک سوسائٹی لاہور)

اتفاق یہ ہے کہ یہ واقعہ برنباس اور پولس کی جدائی سے چند ہی دن پہلے کا ہے [illegible] پطرس کی [illegible] یروشلم میں [illegible] کے بعد ہوئی تھی [illegible] بیان کئے گئے ہیں۔

[illegible]

حضرت ابراہیم علیہ السلام سے خطاب ہے :-

"اور میرا عہد جو میرے اور تیرے درمیان اور تیرے بعد تیری نسل کے درمیان ہے اور جسے تم مانو گے سو یہ ہے کہ تم میں سے ہر ایک فرزند نرینہ کا ختنہ کیا جائے، اور تم اپنے بدن کی کھلڑی کا ختنہ کیا کرنا اور یہ اس عہد کا نشان ہوگا جو میرے اور تمہارے درمیان ہے، تمہارے ہاں پشت در پشت ہر لڑکے کا ختنہ جب وہ آٹھ روز کا ہو، کیا جائے، خواہ وہ گھر میں پیدا ہو خواہ اسے کسی پردیسی سے خریدا ہو جو تیری نسل سے نہیں، لازم ہے کہ تیرے خانہ زاد اور تیرے زرخرید کا ختنہ کیا جائے، اور میرا عہد تمہارے جسم میں ابدی عہد ہوگا، اور وہ فرزند نرینہ جس کا ختنہ نہ ہوا ہو اپنے لوگوں میں سے کاٹ ڈالا جائے کیونکہ اس نے میرا عہد توڑا۔" (پیدائش، ۱۷: ۱۰ تا ۱۴)

اور موسیٰ علیہ السلام سے خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ :-

"اور آٹھویں دن لڑکے کا ختنہ کیا جائے" (احبار ۱۲:۳)

اور خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بھی ختنہ کی گئی تھی، چنانچہ انجیل لوقا میں ہے :-

"اور جب آٹھ دن پورے ہوئے اور اس کی ختنہ کا وقت آیا تو اس کا نام یسوع رکھا گیا" (لوقا ۲:۲۱)

اس کے بعد حضرت مسیح علیہ السلام کا کوئی ارشاد ایسا منقول نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ ختنہ کا حکم منسوخ ہو گیا ہے۔

لہٰذا یہ بات عین قرین قیاس ہے کہ وہ برنباس جس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے براہ راست ملاقات کا شرف حاصل کیا تھا، پولس سے اس بنا پر برگشتہ ہوا ہو کہ وہ ایک عرصہ دراز تک اپنے آپ کو سچا عیسائی ظاہر کرنے کے بعد مذہب عیسوی کے بنیادی عقائد و احکام میں تحریف کا مرتکب ہو رہا تھا، شروع میں برنباس نے پولس کا ساتھ اس لئے دیا تھا کہ وہ اسے مخلص عیسائی سمجھتے تھے، لیکن جب اس نے غیر اقوام کو اپنا مرید بنانے کے لئے مذہب کی بنیادوں کو منہدم کرنے اور ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالنے کا سلسلہ شروع کیا تو وہ اس سے جدا ہو گئے اور اسی بنا پر پولس گلتیوں کے نام خط میں برنباس کی ملامت کرتے ہوئے یہ لکھتا ہے کہ :-

"مگر جب وہ آگئے تو مختونوں سے ڈر کر باز رہا اور کنارہ کیا، اور باقی یہودیوں نے بھی اس کی طرح ریا کاری کی، یہاں تک کہ برنباس بھی ان کے ساتھ ریاکاری میں پڑ گیا" (گلتیوں ۲:۱۳)

اس بات کو پادری جے۔ پیٹرسن اسمتھ بھی محسوس کرتے ہیں کہ پولس اور برنباس کی جدائی کا سبب صرف مرقس نہ تھا، بلکہ اس کے پس پشت پر نظریاتی اختلاف بھی کام کر رہا تھا، چنانچہ وہ لکھتے ہیں :-

"برنباس اور پطرس نے جو کہ بڑے عالی حوصلہ شخص تھے، ضرور اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا ہوگا اور لڑائی وہ وقت دور ہو جاتی ہے، لیکن باوجود اس کے یہ احتمال ضرور گذرتا ہے کہ ان کے درمیان کچھ نہ کچھ رنجش رہ جاتی ہے جو بعد میں ظاہر ہوتی ہے"

(حیات و خطوط پولس ص ۸۹ و ۹۰)

مندرجہ بالا بحث کو ذہن میں رکھ کر اب انجیل برنباس پڑھئے، ہمیں اس انجیل کے بالکل شروع میں جو عبارت ملتی ہے وہ یہ ہے :-

ایھا الاعزاء ان اللہ العظیم العجیب قد افتقدنا	اے عزیزو! اللہ نے جو عظیم اور عجیب ہے، اس آخری زمانے میں
فی ھذہ الایام الاخیرۃ بنبیہ یسوع المسیح برحمۃ	ہمیں اپنے نبی یسوع مسیح کے ذریعہ ایک عظیم رحمت سے آزمایا،
عظیمۃ للتعلیم والآیات التی اتخذھا الشیطان	اس تعلیم اور آیتوں کے ذریعہ جنہیں شیطان نے بہت سے
ذریعۃ لتضلیل کثیرین بدعوی التقوی مبشرین	لوگوں کو گمراہ کرنے کا ذریعہ بنایا ہے جو تقویٰ کا دعویٰ کرتے

يتعليم شديد الكفر داعين المسيح ابن الله
ورافضين الختان الذي أمر به الله دائماً
مجوزين كل لحم نجس الذي ضل في عدادهم أيضاً
بولس الذي لا أتكلم عنه إلا مع الأسى وهو
السبب الذي لأجله أسطر ذلك الحق
الذي رأيته وسمعته أثناء معاشرتي ليسوع
لكي تخلصوا ولا يضلكم الشيطان فتهلكوا في دينونة
الله، وعليه فاحذروا كل أحد يبشركم بتعليم
جديد مضاد لما أكتبه لتخلصوا خلاصاً أبدياً۔

(برنباس ۱: ۲ تا ۹)

ہیں، اور سخت کفر کی تبلیغ کرتے ہیں، مسیح کو اللہ کا بیٹا کہتے
ہیں، ختنہ کا انکار کرتے ہیں جس کا اللہ نے ہمیشہ کے لئے حکم دیا
ہے اور ہر نجس گوشت کو جائز کہتے ہیں، انہیں کے زمرے میں
پولس بھی گمراہ ہو گیا جس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا مگر
افسوس کے ساتھ، اور وہی سبب ہے جس کی وجہ سے میں وہ
حق بات لکھ رہا ہوں جو میں نے یسوع کے ساتھ رہنے کے
دوران سنی اور دیکھی ہے تاکہ تم نجات پاؤ اور تمہیں شیطان
گمراہ نہ کر سکے اور تم اللہ کے حق میں گمراہ ہو جاؤ، اور اس بناء پر
ہر اس شخص سے بچو جو تمہیں کسی نئی تعلیم کی تبلیغ کرتا ہے جو میرے
لکھنے کے خلاف ہو تاکہ تم ابدی نجات پاؤ۔

کیا یہ عین قرین قیاس نہیں ہے کہ پولس سے نظریاتی اختلاف کی بنا پر جدا ہونے کے بعد برنباس نے جو عرصہ دراز تک حضرت مسیح علیہ السلام کے ساتھ رہے تھے حضرت مسیح کی ایک سوانح لکھی ہو اور اس میں پولس کے نظریات پر تنقید کر کے صحیح عقائد و نظریات بیان کئے گئے ہوں!

یہاں تک ہماری گذارشات کا خلاصہ یہ ہے کہ خود بائبل میں برنباس کا جو کردار پیش کیا گیا ہے اور اس میں پولس کے ساتھ ان کے جن اختلافات کا ذکر ہے ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ بات چنداں بعید نہیں ہے کہ برنباس نے ایک ایسی انجیل لکھی ہو جس میں پولس کے عقائد و نظریات پر تنقید کی گئی ہو اور وہ مروجہ عیسائی عقائد کے خلاف ہو۔

اگر یہ بات آپ کے ذہن نشین ہو گئی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ انجیل برنباس کو برنباس کی تصنیف سمجھنے کے راستے سے ایک بہت بڑی رکاوٹ دور ہو گئی، اس لئے کہ عام لوگوں اور بالخصوص عیسائی حضرات کے دل میں اس کتاب کی طرف سے ایک بہت بڑا ــــ بلکہ شاید سب سے بڑا ــــ شبہ اسی وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ انہیں اس میں بہت سی باتیں ان نظریات کے خلاف نظر آتی ہیں جو پولس کے واسطے سے ہم تک پہنچے ہیں، وہ جب یہ دیکھتے ہیں کہ اس کتاب کی بہت سی باتیں اناجیل اربعہ اور مروجہ عیسائی نظریات کے خلاف ہیں تو وہ کسی طرح یہ باور کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے کہ یہ واقعی برنباس کی تصنیف ہے۔ انسائیکلوپیڈیا امریکانا کا مقالہ نگار اس انجیل پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"ہمارے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے جس سے ہم یہ معلوم کر سکیں کہ انجیل برنباس کے اصلی مضامین کیا تھے؟ تاہم اس نام سے اطالوی زبان میں ایک طویل صحیفہ آج کل پایا جاتا ہے جو اسلامی نقطۂ نظر سے لکھا گیا ہے اور جس میں ترجمہ عربی کا ایک معروف مختصر موجود ہے، ۱۹۰۷ء میں لانس ڈیل اور لارا نے اسے ایڈٹ کیا تھا اور ان کا خیال یہ تھا کہ یہ کسی ایسے شخص کی تصنیف ہے جس نے عیسائی مذہب چھوڑ دیا تھا، اور غالباً یہ تیرہویں اور سولہویں صدی کے درمیان لکھی گئی۔"

(انسائیکلوپیڈیا امریکانا ص ۲۶۲ ج ۳، مقالہ برنباس م)

آپ نے دیکھا کہ فاضل مقالہ نگار نے اس کتاب کے ناقابل اعتبار ہونے پر کوئی ٹھوس دلیل پیش کرنے کے بجائے صرف اتنی بات پر تبصرہ کیا ہے کہ "یہ اسلامی نقطۂ نظر سے لکھا گیا ہے" اور اسی بات کو کتاب کے جعلی ہونے پر کافی دلیل سمجھ کر آگے یہ بحث شروع کر دی ہے کہ اس کا لکھنے والا کون تھا؟ اور یہ کب لکھی گئی؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ پولس کے نظریات و عقائد اور اس کے بیان کردہ واقعات ذہنوں میں کچھ اس طرح جم چکے ہیں کہ جس کتاب میں ان کے خلاف کوئی بات کہی گئی ہو اسے کسی حواری کی طرف منسوب کرنے پر دل آمادہ نہیں ہوتے، ــــ لیکن اوپر جو گذارشات ہم نے پیش کی ہیں ان کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اگر برنباس کی کسی

توجہ رکھتا ہو وہ کبھی ایسی غلطی نہیں کر سکتا، یہ جعلساز کی فطرت ہے کہ وہ شبہ میں ڈالنے والی کھلی باتوں سے پرہیز کی کوشش کرتا ہے، ایسے مواقع پر اس کے لئے آسان راستہ یہ تھا کہ وہ صرف ایک دو جگہوں پر آپ کا اسم گرامی ذکر کرتا اور بس! بلکہ اس سے بھی بہتر طریقہ یہ تھا کہ انجیل برناباس میں تقلیط کے نام سے جو پیشین گوئی مذکور ہے اسے جوں کی توں نقل کرکے فارقلیط کے بجائے آپ کا اسم گرامی لکھ دیتا، انجیل برناباس کے پڑھنے سے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا لکھنے والا نہ صرف یہ کہ بائبل کا وسیع علم رکھتا ہے، بلکہ انتہائی ذہین انسان بھی ہے، کیا یہ ممکن ہے کہ اپنے مذہب کو حق ثابت کرنے کے جوش میں اس نے اس قدر سامنے کی بات کو نظر انداز کر دیا ہو؟

(دوم) اگر اس انجیل کا مصنف مسلمان ہے تو جگہ جگہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی ذکر کرنے سے اس کا مقصد یقیناً یہ ہے کہ قرآن کریم کی اس آیت کو درست ثابت کرے جس میں کہا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے صراحۃً آپ کا نام لے کر آپ کی تشریف آوری کی بشارت دی ہے، اس صورت میں اسے چاہئے تھا کہ وہ اس کتاب میں ہر جگہ، یا کم از کم ایک جگہ تو آپ کا نام احمد ذکر کرتا، اس لئے کہ قرآن کریم کی جس آیت کی تصدیق کرنا چاہتا ہے اس میں یہی نام ذکر کیا گیا ہے، ارشاد ہے:-

ومبشرا برسول یاتی من بعدی اسمہ احمد　　اور (میں) اس رسول کی خوشخبری دینے والا بنا کر بھیجا گیا ہوں، جو میرے بعد آئے گا اور اس کا نام "احمد" ہوگا۔

اس کے برخلاف ہم دیکھتے ہیں کہ اس کتاب میں ہر جگہ آپ کا اسم گرامی "محمد" ذکر کیا گیا ہے اور کسی ایک جگہ بھی "احمد" کا لفظ موجود نہیں ہے۔

(سوم) اس کتاب میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبانی یہ کہلوایا گیا ہے کہ عہد قدیم کی کتابوں میں جس "مسیح" یا "مسیا" کی بشارت دی گئی ہے اس سے مراد میں نہیں ہوں بلکہ "محمد رسول اللہ" (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں۔ (فصل ۹۶ آیت ۱۴)

اگر اس کتاب کا لکھنے والا کوئی مسلمان ہے تو اسے یہ بات لکھنے کی ضرورت نہیں تھی، کیونکہ یہ مسلمانوں کا عقیدہ نہیں ہے، اور اس کے لکھنے سے بھی خواہ مخواہ شبہات پیدا ہو سکتے ہیں۔

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ لکھنے والے نے کسی کو دھوکہ میں ڈالنے کے لئے یہ سب کچھ نہیں لکھا تھا، بلکہ یہ کتاب دراصل ایک تخیلاتی (IMAGINATORY) کتاب ہے جس میں لکھنے والے نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ مسلمانوں کے نقطۂ نظر کے مطابق حضرت مسیح علیہ السلام کی سوانح حیات یوں ہونی چاہئے!

یہ بات کسی حد تک قرین قیاس ہو سکتی تھی، لیکن انجیل برناباس کو پڑھنے کے بعد اس خیال کی بھی تردید ہو جاتی ہے، اول تو ایسی صورت میں مصنف کو اپنا نام ظاہر کرنا چاہئے تھا، اس کی بجائے اس نے اسے برناباس کی طرف منسوب کیا! پھر اس کتاب میں بہت سی باتیں اسلامی تصورات کے بالکل خلاف ہیں جن کی توجیہ سمجھ میں نہیں آتی، مثلاً:- (۱) فصل ۲۰۹ آیت ۱، فصل ۲۱۴ آیت ۳ اور فصل ۲۲۱ آیت ۱ میں کچھ فرشتوں کے نام ذکر کئے گئے ہیں، جن میں جبریل کے علاوہ میخائیل، رفائیل اور اوریل بھی مذکور ہیں، مؤخر الذکر تینوں ناموں سے اسلامی ادب بالکل نا آشنا ہے۔

(۲) فصل ۲۱۹ اور ۲۲۱ میں ذکر کیا گیا ہے کہ جب حضرت مسیح علیہ السلام کو آسمان پر اٹھا لیا گیا تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ مجھے ایک مرتبہ پھر دنیا میں جانے کی اجازت دی جائے، تاکہ میں اپنی والدہ اور شاگردوں سے مل آؤں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں کے ذریعہ انہیں دوبارہ دنیا میں بھیجا اور وہ اپنی والدہ اور شاگردوں سے کچھ دیر گفتگو کرکے پھر واپس تشریف لے گئے۔

یہ واقعہ بھی اسلامی تصور کے خلاف ہے، آج تک کوئی مسلمان ہماری نگاہ سے ایسا نہیں گزرا جو حضرت مسیح کے آسمان پر تشریف لے جانے کے بعد تھوڑی دیر کے لئے واپسی کا قائل ہو۔

(۳) فصل ۵۳ آیت ۹ میں حضرت مسیح علیہ السلام کا یہ ارشاد منقول ہے کہ:-

اعطوا لقیصر لقیصر و ما للہ للہ -　　تب آقیصر کا حق قیصر کو دے دو اور اللہ کا حق اللہ کو۔

دین وسیاست کی تفریق کا یہ تصور خالصتہً غیر اسلامی ہے اور علمائے اسلام شروع سے اس کی تردید کرتے آئے ہیں۔

(۶) فصل ۱۶ آیت ۳ میں آسمانوں کی تعداد نو بتلائی گئی ہے اگرچہ بعض فلاسفر اس کے قائل رہے ہیں مگر مسلمانوں میں مشہور قول سات ہی کا ہے، قرآن کریم میں بھی آسمانوں کی تعداد ہر جگہ سات ہی مذکور ہے، اس طرح کے بعض اور تصورات اس کتاب میں ایسے ملتے ہیں جو عام اسلامی نظریات کے قطعی خلاف ہیں، یا کم از کم مسلمانوں کے یہاں معروف نہیں ہیں، ان حالات میں یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ یہ کتاب کسی مسلمان کی تخیلی تصنیف ہے۔

یہ تھے وہ قرائن جن کی موجودگی میں اس کتاب کو کسی مسلمان کی تصنیف قرار دینا بہت بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے۔ اب ہم وہ قرائن پیش کرتے ہیں جن سے اس کتاب کا جعلی ہونا معلوم ہوتا ہے اور جن سے اکثر عیسائی حضرات اور اہل مغرب نے استدلال کیا ہے:۔

(۱) جیسا کہ ہم نے عرض کیا، عیسائی حضرات کو اس انجیل کے اصلی ہونے پر سب سے پہلا شبہ یہ ہوتا ہے کہ اس میں بیان کردہ عقائد و نظریات اناجیل اربعہ کے بالکل خلاف ہیں، لیکن بحث کی ابتداء میں ہم تفصیل کے ساتھ یہ ثابت کر چکے ہیں کہ برنباس کی انجیل میں اگر عام عیسائی تصورات کے خلاف کچھ باتیں ہوں تو وہ کسی طرح محلِ تعجب نہیں ہیں اور تنہا یہ بات اس کتاب کے جعلی ہونے کی دلیل نہیں بن سکتی۔

(۲) دوسرا شبہ یہ ہے کہ اس کتاب میں بہت سے مقامات پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی مذکور ہے حالانکہ عام طور سے انبیاء علیہم السلام آئندہ کسی نبی کی پیشین گوئی فرماتے ہیں تو صاف صاف نام ذکر کرنے کے بجائے اس کا حلیہ اور اس کے اوصاف بیان کرتے ہیں اور وہ بھی عموماً تمثیلات اور اشاروں کنایوں میں، بائبل میں کسی جگہ کسی آنے والے شخص کا نام ذکر نہیں کیا گیا۔

لیکن اس میں اول تو یہ کہنا ہی غلط ہے کہ بائبل میں کسی آنے والے کا نام مذکور نہیں ہے، اس لئے کہ کتاب یسعیاہ میں حضرت شعیا علیہ السلام کی زبانی یہ پیشینگوئی بیان کی گئی ہے کہ:۔

"دیکھو۔ ایک کنواری حاملہ ہوگی اور بیٹا پیدا ہوگا اور وہ اس کا نام عمانوایل رکھے گی" (یسعیاہ ۷: ۱۴)

عیسائی حضرات کا کہنا ہے کہ اس عبارت میں حضرت مسیح علیہ السلام کی پیشین گوئی کی گئی ہے، اسی وجہ سے انجیلوں میں اس عبارت کو پیش کرکے حضرت مسیح علیہ السلام کی حقانیت پر استدلال کیا گیا ہے (دیکھئے متی ۱: ۲۳ اور لوقا ۱: ۳۱ و ۱: ۳۲) ——— اگرچہ اس معاملہ میں بائبل کے شارحین سخت حیران ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام کا کوئی نام عمانوایل تھا یا نہیں؟ لیکن اس سے کم از کم اتنی بات بہرصورت ثابت ہو جاتی ہے کہ بعض مرتبہ کسی عظیم الشان شخصیت کی آمد کی پیشینگوئی اس کا نام بتا کر کر دی جاتی تھی، اس کے علاوہ زبور میں ہے:۔

"قومیں کس لئے طیش میں ہیں؟ اور لوگ کیوں باطل خیال باندھتے ہیں؟ خداوند اور اس کے مسیح کے خلاف" (زبور ۲: ۱و۲)

عیسائی حضرات کے نزدیک اس عبارت میں مسیح سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں (دیکھئے آکسفورڈ بائبل کنکارڈنس ص ۲۳۳ مطبوعہ لندن) اس پیشین گوئی میں بھی صریح لقب موجود ہے، بلکہ کتاب دانی ایل میں تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لقب کے ساتھ آپ کی مدت بھی بیان کر دی گئی ہے:۔

"اور باسٹھ ہفتوں کے بعد وہ ممسوح قتل کیا جائے گا اور اس کا کچھ نہ رہے گا" (دانی ایل ۹: ۲۶)

اس کے علاوہ یسعیاہ ۴۵: ۱ اور یرمیاہ ۲۳: ۶ میں بھی آنے والی شخصیتوں کے نام ذکر کئے گئے ہیں، ان تمام حوالوں سے بہر حال یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ جاتی ہے کہ اگر آنے والی شخصیت عظیم الشان ہو تو بعض اوقات پیشین گوئی میں اس کا نام بھی ذکر کر دیا جاتا ہے۔ مذکورہ مثالیں تو بائبل کی تھیں، اسلامی ذخیرۂ احادیث میں آخر زمانے کے حضرت مہدی رضی اللہ عنہ کا نام بھی ہمیں ملتا ہے۔

اب آپ خود فرمائیے کہ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی ذکر کر دیا ہو تو اس میں تعجب کی کونسی بات ہے؟ خاص طور سے اس لئے کہ آپ دوسرے انبیاء علیہم السلام کے مقابلے میں ممتاز ترین مقام کے حامل تھے، آپ پر نبوت و رسالت کے مقدس سلسلے کو ختم ہونا تھا، اور آپ کی نبوت کو کسی خاص خطے یا قوم کے ساتھ مخصوص کرنے کے بجائے دنیا کے ہر گوشے کے لئے عام کیا جانے والا تھا، کیا ایسے نبی کی پیشینگوئی میں حلیہ اور صفات

کے علاوہ نام ذکر کرنا قرین قیاس نہیں ہے۔

(۳) انجیل برنباس کے اصلی ہونے پر تیسرا شبہ عام طور سے یہ ہوتا ہے کہ اس انجیل کا اسلوب بیان باقی انجیلوں سے کافی مختلف ہے ـــــ لیکن ہمارے سامنے اول تو اسلوب بیان کے اختلاف کا فیصلہ اتنی جلدی سے نہیں کیا جا سکتا، اب تک انجیل برنباس کا کوئی عبرانی یا یونانی نسخہ دریافت ہی نہیں ہوا جس سے اناجیل اربعہ کا مقابلہ کیا جائے، اور ترجموں کے ذریعہ اسلوب تحریر کا موازنہ بہت غیر محتاط ہوگا۔ اسلوب تحریر کا جس قدر اختلاف ترجموں سے معلوم ہوتا ہے، وہ بہت نمایاں نہیں ہے جس کی بنا پر کوئی فیصلہ کیا جا سکے۔

دوسرے اگر واقعی انجیل برنباس اور دوسری انجیلوں میں اسلوب میں اسلوب کا فرق ہے تو اس سے اس کے جعلی ہونے پر استدلال نہیں کیا جا سکتا اس لئے کہ ہر لکھنے والے کا اسلوب تحریر جدا ہوتا ہے۔ کیا یہ حقیقت سامنے نہیں ہے کہ انجیل یوحنا اپنے اسلوب بیان کے اعتبار سے پہلی تینوں انجیلوں سے بے حد مختلف ہے اور اس بات کو تمام عیسائی علماء بھی تسلیم کرتے ہیں، پادری جے۔ ٹی منیل بائبل پر اپنی مشہور کتاب میں لکھتے ہیں:-

"تاہم یہ انجیل (یعنی انجیل یوحنا) مورد اعتراض رہی ہے، کیونکہ یہ اناجیل متفقہ سے کئی طرح سے مختلف ہے، بیشک اختلافات تو ہیں، لیکن اگر ہم چوتھی انجیل کو اس کی اپنی خوبیوں کی روشنی میں دیکھیں تو اس امر سے انکار نہیں ہو سکتا کہ یا تو مصنف خود چشم دید گواہ تھا، یا کسی چشم دید گواہ کے بیانات اور شہادات کو اس نے قلمبند کیا تھا" (بائبل کی کتب مقدسہ ص ۳۴۴ مطبوعہ ۱۹۵۸ء)

نیز عہد نامہ جدید کے مفسر ... ناکس نے اپنی تفسیر کے شروع میں کسی قدر تفصیل سے انجیل یوحنا کے اسلوب بیان کا جائزہ لیا ہے (ملاحظہ ہو اے نیو ٹسٹامنٹ کمنٹری ص ۱۳ جلد اول مطبوعہ لندن ۱۹۵۳ء) لہٰذا اگر انجیل یوحنا باقی تین انجیلوں سے اسلوب کے فرق کے باوجود معتبر انجیل کہلائی جا سکتی ہے تو کیا وجہ ہے کہ انجیل برنباس کے اسلوب تحریر کی وجہ سے اسے رد کر دیا جائے؟

(۴) انجیل برنباس کے اصلی ہونے پر چوتھا شبہ بعض حضرات کو یہ ہوا ہے کہ تجلی کے واقعہ میں حضرت مسیح علیہ السلام جس پہاڑ پر چڑھے تھے، اس کتاب کی فصل ۴۲ آیت ۱۹ میں اس کا نام جبل طابور لکھا ہے، حالانکہ یہ تحقیق اناجیل اربعہ کے بہت بعد ہوئی ہے کہ اس پہاڑ کا نام "طابور" تھا۔

لیکن ظاہر ہے کہ یہ بات انجیل برنباس کی اصلیت کو نقصان نہیں پہونچاتی ہے اس لئے کہ یہ عین ممکن ہے کہ اناجیل اربعہ کے مصنفین نے ناواقفیت کی بنا پر، یا غیر ضروری سمجھ کر پہاڑ کا نام ذکر نہ کیا ہو، برنباس نے اسے ذکر کر دیا، اس قسم کے اختلافات خود اناجیل اربعہ میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔

(۵) انجیل برنباس کی اصلیت پر ایک خاص وزنی اعتراض وہ ہے جو ڈاکٹر خلیل سعادت نے اس کے عربی ترجمے کے مقدمہ میں بیان کیا ہے، اور وہ یہ کہ اس کتاب کی فصل ۸۲ آیت ۱۸ میں ایک جملہ یہ موجود ہے کہ:-

حتى أن سنة اليوبيل التي تجيء الآن كل مئة سنة سيجعلها مسيا كل سنة في كل مكان۔	یہاں تک کہ جوبلی کا سال جو اس وقت ہر سو سال میں آتا ہے مسیا اس کو ہر جگہ سالانہ کر دے گا۔

اس میں جس جوبلی کا ذکر ہے اس سے مراد ایک یہودی تہوار ہے، اس کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ "اس وقت ہر سو سال میں آتا ہے" ـــــ حالانکہ یہ تہوار حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بہت بعد تک ہر پچاس سال کی ابتداء میں منایا جاتا رہا ہے، (کتاب احبار ۲۵/۱۱ میں اس کے لئے پچاس سال ہی کی مدت بیان کی گئی ہے) اور اس کے بعد کلیسا کی تاریخ میں صرف ۱۳۰۰ء ایک ایسا سن ہے جس میں پوپ بونیفاس ہشتم نے اس جوبلی کی مدت میں اضافہ کر کے اسے ہر صدی کی ابتداء میں منانے کا حکم دیا تھا، لیکن بعد میں اس حکم پر عمل نہ ہو سکا اس لئے کہ ۱۳۰۰ء میں جو پہلی جوبلی منائی گئی اس میں کلیسا مال و دولت سے نہال ہو گیا، اس لئے پوپ کلیمنٹ ششم نے ۱۳۴۹ء میں یہ فرمان جاری کر دیا کہ یہ تہوار ہر پچاس سال میں ایک

مرتبہ منایا جائے، پھر پوپ آربانوس ششم نے اس مدت میں کمی کی، اور ۱۳۸۹ء میں یہ حکم جاری کیا گیا کہ یہ تہوار ہر تینتیس سال میں ایک بار منایا جائے، پھر پوپ پولس دوم نے اور کمی کر کے اسے ہر پچیسویں سال منانے کا حکم دیا ۔۔۔۔ اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی کہ پوری تاریخ میں صرف ۱۳۰۰ء سے ۱۳۵۰ء تک ایک ایسی مدت گزری ہے جس میں اس جوبلی کو ہر سو سال میں ایک بار منانے کا حکم دیا گیا تھا، اس لئے انجیل برنباس کا لکھنے والا اسی مدت کا ہونا چاہئے۔

لیکن پھر خود ڈاکٹر خلیل سعادت ہی نے اس اعتراض کا جواب دیا ہے اور وہ یہ کہ انجیل برنباس کو پڑھنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس کا لکھنے والا عہد نامہ قدیم کے تمام صحیفوں سے خوب واقف ہے اور اس کا وسیع علم رکھتا ہے، ایسی صورت میں یہ کیسے ممکن ہے کہ اس سے ایسی فاش غلطی ہو گئی ہو جس کا معمولی طالب علموں سے سرزد ہونا بھی مشکل ہے، لہٰذا بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اصل نسخے میں یہاں "سو" کے بجائے "پچاس" کا لفظ ہوگا، لیکن کسی لکھنے والے نے غلطی سے اس لفظ کے کچھ حروف گھٹا کر اسے "سو" بنا دیا، اس لئے کہ اطالوی زبان میں سو اور پچاس کے لفظوں میں کچھ اتنی مشابہت ہے کہ اس قسم کی غلطی کا واقع ہونا عین ممکن ہے۔

اس کے علاوہ ہمارے نزدیک یہ بھی ممکن ہے کہ چودھویں صدی عیسوی کے کسی پڑھنے والے نے یہ جملہ حاشیے کے طور پر بڑھا دیا ہو جو غلطی سے متن میں شامل ہو گیا، بائبل میں اس طرح کے بیشمار الحاقات ہوئے ہیں جن کا اعتراف مسلمان اور عیسائیوں دونوں کو ہے، مثلاً کتاب پیدائش ۳۵ : ۲۷ اور ۳۷ : ۱۴ میں ایک بستی کا نام حبرون ذکر کیا گیا ہے، حالانکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں اس بستی کا نام حبرون کے بجائے قریت اربع تھا اور جب بنی اسرائیل نے حضرت یوشع علیہ السلام کے زمانے میں فلسطین کو فتح کیا، تب اس کا نام حبرون رکھا تھا، چنانچہ کتاب یوشع میں تصریح ہے کہ :-

"اور اگلے وقت میں حبرون کا نام قریت اربع تھا" (یشوع ۱۴ : ۱۵)

یہ تو ایک مثال ہے، حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے بائبل سے ایسی بہت سی مثالیں پیش کی ہیں، (ملاحظہ ہو اظہار الحق باب دوم مقصد دوم جلد اول) ان تمام مثالوں میں عیسائی علماء یہ کہتے ہیں کہ یہ الفاظ بعد میں کسی نے حاشیے کے طور پر بڑھائے تھے، جو غلطی سے متن میں شامل ہو گئے، یہی بات انجیل برنباس میں اس مقام پر بھی کہی جا سکتی ہے۔

(۶) انجیل برنباس کی اصلیت پر چھٹا اعتراض بعض لوگوں نے یہ کیا ہے کہ اس کے بہت سے نظریات چودھویں صدی کے مشہور شاعر ڈانٹے سے ملتے ہیں، لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مصنف ڈانٹے کا ہم عصر ہے، ۔۔۔۔ لیکن اس اعتراض کی کمزوری محتاج بیان نہیں، دو انسانوں کے کلام میں اگر کچھ مطابقت پیدا ہو جاتے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان میں سے ایک لازماً دوسرے سے ماخوذ ہے، ورنہ بقول علامہ رشید رضا یہ ماننا پڑے گا کہ تورات کے تمام قوانین حمورابی کے قانون سے ماخوذ ہیں، پھر اگر توارد مشکل معلوم ہوتا ہے تو یہ کیوں ممکن نہیں ہے کہ ڈانٹے نے اپنے خیالات انجیل برنباس سے مستعار لے ہوں؟

(۷) ڈاکٹر خلیل سعادت نے ایک اعتراض یہ کیا ہے کہ اس میں بعض بحثیں فلسفیانہ انداز کی ہیں، اور اناجیل اربعہ میں یہ انداز نہیں ہے، لیکن اس کا جواب ہم دے چکے ہیں کہ اسلوب کا اختلاف اس کے جعلی ہونے کی دلیل نہیں بن سکتا، انجیل یوحنا کو دیکھئے! اس کا شاعرانہ اور تمثیلات سے بھرپور انداز باقی تینوں انجیلوں سے کتنا مختلف ہے؟ اس کی بہت سی عبارتیں تو ایسی ہیں کہ آج تک یقینی طور سے حل نہیں ہو سکتیں، مگر آج تمام عیسائی معتبر انجیل مانتے ہیں۔

(۸) ہمارے نزدیک انجیل برنباس کے قابل اعتماد ہونے پر سب سے زیادہ مضبوط اعتراض یہ ہے کہ یہ کتاب کسی قابل اعتماد طریقے سے ہم تک نہیں پہونچی، جس شخص نے اسے پھیلایا اور عام کیا ہے، اس کے بارے میں ہمیں کچھ بھی معلومات نہیں ہیں کہ وہ کس قسم کا انسان تھا؟ اس نے فی الواقع یہ نسخہ کہاں سے حاصل کیا تھا؟ اور ایک طویل عرصہ تک یہ نسخہ کہاں کہاں اور کس کس کے پاس رہا ہے؟

ہمارے نزدیک یہ سوالات بہت معقول اور درست ہیں اور جب تک ان کا کوئی تسلی بخش جواب نہ ملے، اس وقت تک اس کتاب کو یقینی طور پر اصلی قرار نہیں دیا جا سکتا لیکن بعینہ یہ سوالات بائبل کے ہر ہر صحیفے کے بارے میں پیدا ہوتے ہیں، جن کا کوئی تسلی بخش جواب ابھی تک نہیں مل سکا، لہٰذا جو حضرات بائبل کو قابل اعتماد سمجھتے ہیں ان کے لئے انجیل برنباس کو ناقابل اعتماد قرار دینے کا کوئی جواز نہیں ہے۔

ہم بحث کی ابتداء میں یہ لکھ چکے ہیں کہ اس طرح گفتگو سے ہم یہ دعویٰ کرنا نہیں چاہتے کہ یہ کتاب یقینی طور پر اصلی اور قابل اعتماد ہے، نہ ہم اسے یقینی طور پر

الہامی اور آسمانی سمجھتے ہیں نہ ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ اس میں جو کچھ لکھا ہے وہ سب صحیح ہے، بلکہ ہماری گزارشات کا حاصل صرف اس قدر ہے کہ اس کا پایۂ اعتبار بائبل کی کسی کتاب سے ہرگز کم نہیں ہے، جیسے ناقابل اعتماد طریقوں سے بائبل ہم تک پہونچی ہے، ایسے ہی طریقوں سے یہ بھی پہونچی ہے، جس طرح انجیل برنباس کا سلسلۂ سند کیمریا راہب فرادینو پر جاکر ختم ہو جاتا ہے اسی طرح تورات کی سند ٹوٹتی ٹوٹتی ہوئی زیادہ سے زیادہ خلقیاہ کاہن تک پہونچتی ہے، شاہ یوسیاہ کے زمانے تک اس کا کوئی پتہ نشان نہ تھا اچانک یوسیاہ کے زمانے میں خلقیاہ کاہن یہ دعویٰ کرتا ہے کہ مجھے ہیکل کو صاف کرتے وقت تورات مل گئی ہے اور اس کے دعوے کو بغیر کسی تحقیق کے تسلیم کر لیا جاتا ہے (دیکھئے ۲۔ سلاطین ۲۲: ۳ تا ۲۰)

یہی حال عہد قدیم کی دوسری کتابوں کا ہے کہ ان میں سے اکثر کے بارے میں تو یہی تحقیق نہیں ہو سکی کہ ان کا مصنف کون تھا؟ اور وہ کس زمانے میں لکھی گئیں؟

عہد نامہ قدیم کا معاملہ تو بہت پرانا ہے، خود اناجیل اربعہ کا یہی حال ہے کہ ان کی کوئی سند موجود نہیں نہ یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ واقعی حواریوں یا ان کے شاگردوں کی لکھی ہوئی ہیں، بڑے بڑے عیسائی علماء نے انہیں اصلی ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا، لیکن ظن و تخمین کے سوا کچھ نہ کر سکے، اور آخر میں اس بات کا کھلا اعتراف کرنے پر مجبور ہوئے کہ دوسری صدی عیسوی سے پہلے ان انجیلوں کا کوئی نشان نہیں ملتا، عیسائی علماء کے بیشمار اقوال میں سے ہم یہاں صرف ایک اقتباس پیش کرنے پر جس سے آپ کو اناجیل اربعہ کی حقیقت معلوم ہو سکے گی، مسٹر برنٹ ہلمین اسٹریٹر اناجیل اربعہ پر اپنی معروف کتاب FOUR GOSPELS میں لکھتے ہیں:-

"عہد نامہ جدید کی تحریروں کو جو الہامی نسخوں کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا ہے، کیا یہ کوئی کلیسائی اعلان تھا، جس پر بڑے بڑے کلیسا ذمہ دار... متفق کیا گیا تھا؟ یہ ہمیں معلوم نہیں ہے ہمیں صرف اتنا معلوم ہے کہ ۱۸۰ء کے لگ بھگ اناجیل اربعہ کو انطاکیہ، افسس اور روم میں یہ حیثیت حاصل ہو گئی تھی" (فور گاسپلس ص ۔ مطبوعہ نیویارک)

گویا ۱۸۰ء سے پہلے تو ان انجیلوں کا کوئی ذکر ہی نہیں ملتا اور اسٹریٹر نے یہ جو کہا ہے کہ ۱۸۰ء میں اناجیل اربعہ کو انطاکیہ وغیرہ میں تسلیم کر لیا گیا تھا اس کی بنیاد بھی اگناشئس اور کلیمنٹس وغیرہ کے خطوط ہیں جن میں ان انجیلوں کے حوالے موجود ہیں، لیکن خود یہ خطوط بھی مشتبہ ہیں، جیسا کہ مولانا کیرانوی نے اظہار الحق میں تفصیل کے ساتھ ثابت کیا ہے۔

یہ تو اناجیل اربعہ کی اسناد کا حال ہے، رہیں اندرونی شہادتیں سو اس معاملے میں بائبل کی حالت موجودہ انجیل برنباس کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ناگفتہ بہ ہے کیونکہ اس میں بے پناہ اختلافات اور غلطیاں موجود ہیں۔

لہٰذا ہماری گزارشات کا حاصل یہ ہے کہ جہاں تک مسلمانوں کے اصول تنقید کا تعلق ہے ان کی رو سے تو بلا شبہ انجیل برنباس ایسی کتاب نہیں ہے جسے یقینی طور سے اعتماد دیکھا جا سکے، لیکن ان اصول کی روشنی میں پوری بائبل بھی ناقابل اعتبار ہے۔

رہے عیسائی حضرات کے وہ اصول تنقید جنہوں نے بائبل کو نہ صرف قابل اعتبار بلکہ الہامی اور آسمانی قرار دیا ہے سو ان کی روشنی میں انجیل برنباس بھی قابل اعتبار ٹھہرتی ہے، لہٰذا جو حضرات بائبل کو قابل اعتماد سمجھتے ہیں ان کے پاس انجیل برنباس کو رد کرنے کی کوئی وجہ جواز نہیں ہے بلکہ جتنے خارجی اور داخلی قرائن اس کتاب کی اصلیت پر دلالت کرتے ہیں، اتنے شاید ہی بائبل کی کسی کتاب کو حاصل ہوں۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

ہر قسم کے سوتی دھاگے کیلئے ہمیشہ
"اٹونیا" برانڈ کو یاد رکھیے
THE
ETONIA
MADE BY
FIROZE SULTAN INDUSTRIES LTD.
KARACHI
W. PAKISTAN
NET W 10 LBS.
فیروز سلطان انڈسٹریز لمیٹڈ سرائے روڈ کراچی

ماہر القادری

یادِ رفتگاں

مولوی مجید حسن مرحوم

۱۹۳۰ء سے سہ روزہ "مدینہ" (بجنور) میں راقم الحروف کی غزلیں اور نظمیں جو شائع ہونی شروع ہوئی ہیں، تو کئی سال تک مسلسل یہ سلسلہ چلتا رہا۔ میں ان دنوں حیدرآباد دکن میں مقیم تھا! اس دور میں "مدینہ" کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ایک صاحب مجھ سے اخبار مانگ کر لے جاتے اور اول و درخالف کی کتاب کی طرح اس اخبار کا ایک ایک لفظ یہاں تک کہ اشتہارات تک کو بڑی توجہ اور شوق و عقیدت کے ساتھ پڑھتے اور دوسرا شمارہ آنے تک "مدینہ" مسلسل ان کے مطالعہ میں رہتا۔

۱۹۳۲ء کے وسط میں سہ روزہ "مدینہ" ہی میں یہ اطلاع میں نے پڑھی کہ بجنور سے روزنامہ "مدینہ" شائع ہونے والا ہے اور اس کے لئے اسسٹنٹ ایڈیٹروں کی ضرورت ہے۔ اس اطلاع کے پڑھتے ہی مولوی مجید حسن صاحب مالک سہ روزہ "مدینہ" کی خدمت میں، راقم الحروف نے درخواست بھیج دی، دو تین مہینے کی خط و کتابت کے بعد بات طے ہوگئی، اور ریاست حیدرآباد دکن میں مجھے لگے ٹکائے روزگار کو چھوڑ کر میں وہاں سے چل پڑا۔

اس واقعہ کا میں نے اپنے کسی دوست اور جاننے والے سے اس لئے ذکر نہیں کیا کہ وہ مجھے میرے اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کریں گے، اُدھر سے اصرار اور میری طرف سے ضد، اس کشمکش کی نوبت ہی کیوں آنے دی جائے، یہ ٹھیک کا رسوائی مانع نہیں رہی! دکن کی سرزمین ہی کوئی تنگ نہیں بڑی کشش تھی اور ہر طرح کی دلدہی کے اسباب موجود تھے۔ خاص طور سے حکومت آصفیہ کے صدر اعظم سر مہاراجہ کشن پرشاد بہادر یمین السلطنت کی نوازشیں ہمیشہ زنجیرِ پا بنی رہیں، مگر دُنیائے صحافت میں آنے کا شوق، وطن کی قربت کا جذبہ اور کچھ یہ بھی کہ آدمی ایک ہی ماحول اور فضا میں رہتے رہتے اُکتا سا جاتا ہے!

اب سے ۳۴ سال پہلے کی بات ہے طے یہ پایا تھا کہ روزنامہ "مدینہ" کے آغازِ اشاعت سے چند دن قبل بجنور پہنچ جانا چاہئے، میں حیدرآباد سے رمضان کی ۲۸ تاریخ کو گرانڈ ایکسپریس سے چل پڑا، ۲۹ رمضان کو شب میں آگرہ آنا ہوا، تو عید کا چاند ہوچکا تھا، ایک سرائے میں سامان رکھا اور صبح سویرے نہا دھو کر شاہی مسجد میں عید الفطر کی نماز ادا کی، زندگی میں پہلا تجربہ تھا کہ دوستوں اور عزیزوں سے دور، اس طرح سافرت میں عید ہوئی، آگرہ میں کچھ دن کے بعد بجنور پہنچا! مولوی مجید حسن مرحوم سے ملاقات ہوئی وہ بڑی محبت اور تپاک سے ملے اور بغل گیر ہوئے، سخت سردی پڑ رہی تھی، اس عالم میں انڈے کا گرم گرم حلوہ اور چائے مزہ دے گئی، مولوی صاحب مرحوم کی محبت اور تواضع کی یہ رسم ہمیشہ جاری رہی! کم و بیش تین ہفتہ دفتر "مدینہ" میں مولوی صاحب کا مہمان رہا، ناشتہ اور دونوں وقت کا کھانا اُنہی کے ساتھ رہتا۔

مولانا نصر اللہ خاں عزیز سہ روزہ "مدینہ" کے مدیرِ اعلیٰ تھے اور کئی سال سے ادارت کے فرائض بڑی نیک نامی اور اچھی شہرت کے ساتھ انجام دے رہے تھے۔ آزادیِ تحریر اور حق گوئی کے جرم میں قیدِ فرنگ کی عزت بھی حاصل کر چکے تھے

مولانا حامد الانصاری غازی[1] اور مولوی مجید حسن کے داماد حمید حسن صاحب "مدینہ" کے رکن ادارہ تھے! اخبار کا اداریہ اور شذرات کا کام مولانا نصر اللہ خاں عزیز سے متعلق تھا، شذرات (Notes) اور عربی ڈاک کے ترجمہ کا کام مولانا انصاری کے ذمہ تھا اور باقی کام حمید حسن انجام دیتے تھے۔

روزنامہ مدینہ میں جس جگہ میرا تقرر ہوا تھا، اس کے لئے شوکت تھانوی مرحوم نے بھی لکھنؤ سے درخواست بھیجی تھی، میں اس دنیا میں نووارد، وہ مشاق و تجربہ کار۔ مگر تنخواہ کی کمی کے سبب اُن سے معاملہ طے نہ ہو سکا، ورنہ یہ قرعہ فال اس دیوانہ کے نام کاہے کو نکلتا۔

میں اس خیال و تصور کے ساتھ بجنور گیا تھا کہ اداریہ، شذرات اور اسی قسم کے دوسرے مضامین کا کام مجھ سے متعلق ہوگا، مگر پہلے ہی دن مولانا نصر اللہ خاں عزیز نے انگریزی روزنامہ کے نیو ہندوستان سٹینڈرڈ کی ایک تقریر ترجمہ کرنے کے لئے میرے سامنے رکھ دی، تقریر پڑھ کر ترجمہ کے لئے جو قلم اٹھایا تو اپنی بے مائیگی کا احساس ہوا، ایک ایک سطر میں کاٹ چھانٹ اور رد و بدل، بعض جملوں کی ترکیب اور مفہوم ہی پوری طرح پلے نہیں پڑا، فیلن کی ڈکشنری بھی آخر کہاں تک مدد کرتی، ایک ایک جملہ پر ٹھوکر کا سامنا، اپنی انشا پردازی اور خواہ مخواہ کی ہمہ دانی کا غرہ اس دن پانی کے بلبلہ کی مانند ٹوٹ کر رہ گیا، یا اللہ! میں کس مصیبت میں پھنس گیا ـــــ کیا کروں کیا نہ کروں، چہرے پر شرم کے مارے ہوائیاں چھوٹ رہی تھیں! کئی گھنٹہ کی محنت کے بعد مشکل سے وہ تین سلپ تیار کرکے مولانا نصر اللہ خاں عزیز کے سامنے رکھیں، وہ ترجمہ کو پڑھ کر تبسم سے مسکرائے، عبارت کو جگہ جگہ سے درست کیا، ہمدردی کے لہجہ میں بتایا کہ انگریزی کے جملوں کو اردو میں اس طرح منتقل کرنا چاہئے، لفظوں کی دروبست کی یہ صورت ہونی چاہئے۔

رات کو پلنگ پر لیٹا تو دل و دماغ عجیب کشمکش اور پریشانی میں مبتلا تھے۔ عقل کہتی کہ یہاں سے بھاگ چلو، یہ روگ تمہارے بس کا نہیں ہے مگر دل مشورہ دیتا کہ اس منزل میں ناکام ہوگئے تو یہ احساس کمتری تمہاری زندگی میں ادب و انشاء کے باب پر ہمیشہ کے لئے سیاہی پھیر دے گا، اور تمہارا ادبی مستقبل ختم ہو جائے گا، اللہ تعالیٰ سے مدد مانگو، ہمت سے کام لو، یہ منزل دشوار رفتہ رفتہ آسان ہو جائے گی!

دوسرے دن مولانا نصر اللہ خاں عزیز نے ایک اور مضمون ترجمہ کے لئے دیا، جس کے ترجمہ میں پہلے دن کے مقابلہ میں کم دشواری پیش آئی، اس طرح رفتہ رفتہ ترجمہ کی مشق بڑھتی چلی گئی، یہاں تک کہ ایک مشاق اور تجربہ کار مترجم کی طرح آدھ اخبار کے چار چار کالموں کے لئے انگریزی سے اردو ترجمہ کرنا روزانہ کا مشغلہ ہوگیا! اس کامیابی بلکہ فتح مندی پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا ـ "السعی منی والاتمام من اللہ" کا یہ مشاہدہ بھی تھا اور تجربہ بھی!

ترجمہ کے علاوہ روزنامہ مدینہ کے ادبی کالموں کی ترتیب بھی مجھ سے متعلق تھی اور کتابوں پر تبصرہ بھی! سیاست کے وقتی مسائل اور ہنگامی موضوعات پر کبھی کبھار [illegible] بھی میرے نام سے چھپتی تھیں، روزنامہ "مدینہ" بڑی شان اور اہتمام سے نکلا، مولانا ظفر علی خاں مرحوم نے اپنے شہرہ آفاق اخبار "زمیندار" میں مدینہ کا خیر مقدم کرتے ہوئے ایک نظم شائع فرمائی جس کا ایک شعر یہ تھا ـــ

رمضاں نے ترے آنے کی سنائی ہے نوید
اس مہینہ کو مدینہ کا مہینہ کہئے!

بجنور کے "مدینہ" اور لاہور کے روزنامہ "انقلاب" سے ان دنوں کسی سیاسی مسئلہ پر نوک جھونک ہوگئی تھی، مولانا ظفر علی خاں نے اپنی نظم کے اس شعر میں ـــ

بدزبانی نہیں ہرگز شرفا کا شیوہ
گالیاں جو تجھے دے اُس کو کمینہ کہئے

---

[1] صاحب موصوف حضرت شیخ الہند کے تربیت یافتہ مولانا محمد میاں منصور انصاری مرحوم مہاجر کابل کے صاحبزادے اور حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے خویش ہیں کم و بیش بیس بائیس سال سے بمبئی میں قیام فرما ہیں اور علماء کی جمعیۃ علماء کے ناظم ہیں! اسلامی حکومت کے آئین و دستور پر ان کی معرکہ آرا تصنیف منظر عام پر آ چکی ہے، افسوس ہے بمبئی میں اُن کے صحافتی مشاغل جاری نہ رہ سکے، تقسیم ہند کے بعد جب بمبئی میرا جانا ہوا، اُن کی محبت کی بدولت قدیم روابط کی تجدید ہوگئی۔

اخبار مدینہ کی حمایت اور روزنامہ انقلاب پر چوٹ کی۔ اس سلسلہ میں یہ تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ سالک و مہر[۱] نے روزنامہ زمیندار سے سبکدوش ہو کر اخبار زمیندار کے توڑ پر اپنا روزنامہ "انقلاب" لاہور سے نکالا تھا۔

روزنامہ "مدینہ" بجنور کی خاصی پذیرائی ہوئی، مگر اس زمانہ میں روزنامہ ایک ایسے مقام سے نکلنا چاہئے تھا جہاں ایسوسی ایٹڈ پریس سے ربط قائم ہو سکتا اور وہاں ریل کی برانچ لائن نہیں، مین لائن ہوتی، بجنور کہنے کو تو ضلع کا صدر مقام تھا مگر اس کی آبادی قصبہ کی حیثیت رکھتی تھی، برانچ لائن کا ریلوے اسٹیشن، گھر پلیٹ فارم نہ وارد یہی حال ریلوے اسٹیشن کے گھنٹہ گھر کا تھا کہ گھر موجود لیکن گھنٹہ غائب! ایسوسی ایٹڈ پریس کی خبروں کا بنڈل ریل کے ذریعہ دلی سے آتا تھا اور دوسرے اخباروں کے مقابلہ میں ایک دن تاخیر سے خبریں چھپتی تھیں، بجنور کی بجائے مرادآباد سے روزنامہ نکلتا، تو زیادہ کامیاب ہوتا، مولوی مجید حسن صاحب اس کے لئے آمادہ نہیں ہوئے، گھر بار چھوڑ کر نئے شہر میں جا کر روزنامہ اخبار نکالنا کوئی ہنسی کھیل نہ تھا۔

روزنامہ مدینہ کی ادارت میں ہم دو آدمی نئے لئے گئے تھے، سید صلاح الدین بہاری اور راقم الحروف! باقی عملہ سہ روزہ اخبار میں بھی کام کرتا رہا، انتظامی شعبہ میں ایک کلرک کا اضافہ ہوا تھا، نذیر حسین نام کے ایک صاحب چند دنوں اس پوسٹ پر کارگزار رہے، آج کل وہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہمدرد دواخانہ میں منیجر ہیں اور دو ہزار کے قریب تنخواہ پاتے ہیں۔

روزنامہ "مدینہ" کی ادارت سے وابستگی ہونے کے علاوہ بچوں کے پندرہ روزہ رسالہ "غنچہ" کا بھی میں ایڈیٹر تھا۔ اصل پوسٹ ہی جب نہ رہی تو یہ ضمنی خدمت کس طرح برقرار رہ سکتی تھی، روزنامہ بند ہو جانے کے بعد میں بدایوں چلا گیا، وہاں سے مولانا عبدالقدیر بدایونی کی ... معیت میں حیدرآباد دکن پہنچا اور پھر براہ بمبئی بحری جہاز سے عراق کا سفر کیا۔

اس زمانے کی دو چار باتوں کا ذکر کرنے کو دل چاہتا ہے! ایک خبر تھی جس کی سرخی میں نے ان لفظوں میں قائم کی تھی۔

"بنگال میں گورنر نے ریڈیو کا افتتاح کردیا"

کاتب صاحب نے اس سرخی کو اس طرح لکھا:—

"بنگال میں گورنر نے رنڈیوں کا افتتاح کیا"

وہ تو خیر ہوئی کہ کتابت کی اس غلطی پر میری نگاہ پڑ گئی ورنہ اسی طرح خبر چھپ جاتی تو ....؟!

ان دنوں حکومت کی طرف سے اخبارات کی بڑی سخت نگرانی ہو رہی تھی، ہم خبروں پر عنوانات بھی خاص احتیاط کے ساتھ قائم کرتے! ایک [illegible] بہادر نے کانپور کا دورہ کیا اور وہاں ان کا استقبال ہوا، میری طبیعت میں چلبلا پن پیدا ہوا، میں سوچنے لگا، تھوڑی دیر میں نظیری کا ایک شعر یاد آگیا، جسے میں نے اس خبر کا عنوان بنایا، شعر یہ تھا:—

---

[۱] عبدالمجید سالک وفات پا چکے ہیں، مولانا غلام رسول مہر اللہ تعالیٰ کے فضل سے بقید حیات ہیں۔ [۲] یہ صاحب صحافت و سیاست کے معاملات میں بڑی معلومات رکھتے تھے، خاصی دلچسپ شخصیت، روزنامہ "مدینہ" بند ہو جانے کے بعد کچھ دنوں کانپور میں قیام کیا، مولانا حسرت موہانی مرحوم سے خاص تعلقات تھے، پھر حیدرآباد دکن چلے گئے، وہاں قاضی عبدالغفار مرحوم کے روزنامہ "پیام" کے شعبۂ اشتہارات سے متعلق رہے، اس کے بعد اورنگ آباد میں انجمن ترقی اردو کی شاخ کے انتظامات کو سنبھالا اور نواب صدیق علی خاں کی رفاقت میں کام کیا، پھر دلی میں مرکزی انجمن ترقی اردو سے ان کا تعلق رہا، بابائے اردو مولوی عبدالحق کا اعتماد ان کو حاصل تھا! کھانوں کے شوقین، خرچ کے معاملہ میں کشادہ دست اور اس کے عواقب سے بے پروا! تقسیم ہند سے کچھ دنوں قبل شادی ہوئی، پاکستان بن جانے کے بعد بیوی بچوں میں ایسے گھرے کہ سیاست و صحافت کی زندگی کو بالکل خیرباد کہہ دیا اور [illegible] کے سپرنٹنڈنٹ بن کر رہ گئے! زندگیوں میں ایسا تغیر بہت کم دیکھنے میں آیا ہے!

ہیبتِ عشق کہ را رخصتِ آہے نہ داد
گرچہ ہر شب داد خواہ ہمہ او تنہا گزشت

اس شعر میں داغ نے بہادر شاہ پر جو لطیف طنز کی تھی اس کا اظہار اتنے چوڑے اعلان پیرائے میں ہونا ممکن نہ تھا، سننے والے بے چارے اس لطافتِ طنز کو کہاں سمجھ سکتے تھے!

بجنور میں عبدالسمیع نام کے ایک مختار تھے، گورنمنٹ سے خان صاحب کا خطاب پا چکے تھے۔ اُن کے بیٹے عبداللطیف اپنے والد کی بالکل ضد تھے، وہ سرکاری آدمی اور صاحبزادے کٹر کانگریسی۔ ایک دو بار جیل بھی کاٹ چکے تھے، دفتر "مدینہ" میں اُن کا آنا جانا رہتا تھا، مولانا نصراللہ خاں عزیز نے ایک بار فرمایا: ان صاحب نے سگریٹ ہونٹوں میں دبا کر گھمانا مولانا آزاد سے سیکھا ہے، چادر اوڑھنا جواہر لال نہرو سے، اپنی علالت کا تذکرہ مولانا محمد علی جوہر کے انداز میں کرتے ہیں اور مسیحا بننے کی کوشش میں حکیم اجمل خاں کی نقل اُتارتے ہیں۔

اردو زبان کے مشہور مورخ مولوی اکبر شاہ خاں نجیب آبادی سے بھی مدینہ منزل ہی میں نیاز حاصل ہوا، لمبا قد، سیاہ رنگت، کھدر کا انگرکھا، اسی کی ٹوپی اور پاجامہ اور ہاتھ میں کان سے اونچا لٹھ! مولوی مجید حسن صاحب سے اُن کے دوستانہ مراسم تھے، اکبر شاہ خاں مرحوم کی زندگی میں ایک ایسا مرحلہ بھی آیا کہ وہ قادیانی ہو گئے اور عقیدت کے جوش میں مرزا غلام احمد قادیانی کے خلیفہ حکیم نور الدین (علیہ ما علیہ) کی بیوگرافی تک مرتب کر ڈالی مگر پھر اللہ تعالیٰ نے توبہ کی توفیق عطا فرمائی اور وہ کفر و ضلالت کے اُس دائرے سے نکل کر مسلمان ہو گئے۔

حضرت جگر مراد آبادی سے پہلی بار ملاقات "مدینہ" کے دفتر ہی میں ہوئی۔ مولوی مجید حسن مرحوم نے اُن کے اعزاز میں شعر و سخن کی ایک نشست کا انتظام کیا۔ مولوی صاحب کو شعر و شاعری سے خاصی دلچسپی تھی!

مولوی مجید حسن مرحوم کی زندگی کا آغاز ایک خوشنویس اور کاتب کی حیثیت سے ہوا، پھر انہوں نے اپنے وطن بجنور سے ہفتہ وار اخبار "مدینہ" نکالنا شروع کیا، اللہ تعالیٰ نے اس کام میں بڑی برکت عطا فرمائی۔ "مدینہ" کی مقبولیت میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا، متحدہ ہندوستان کے علاوہ افریقہ، زنجبار، ماریشس، عدن، اور حجاز وغیرہ ممالک میں بھی "مدینہ" کے خریداروں کی خاصی تعداد تھی، اخبار کے ساتھ کتابوں کی اشاعت کا کام بھی بہت نفع بخش رہا، خاص طور سے حضرت شیخ الہند کا ترجمہ قرآن جس پر حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کے حواشی ہیں، اس کی اشاعت نے انہیں مالا مال کر دیا، بلاک سازی کے لئے متن، ترجمہ، اور حاشیہ کی پیسٹنگ میں مولوی صاحب کو بڑی دیدہ ریزی اور محنت و مشقت کرنی پڑی!

پریس، اخبار اور مکتبہ سے مولوی صاحب مرحوم کو ہزاروں کی آمدنی تھی، اور اب سے ۳۰-۳۵ سال قبل اُن کا شمار ضلع بجنور کے خوش حال بلکہ دولت مند لوگوں میں ہوتا تھا، مگر اس عزت، ناموری اور خوش حالی کے باوجود وہ منکسر المزاج تھے، سیدھی سادی متواضع زندگی جو نام و نمود اور تکلفات سے نا آشنا تھی! خوش چلن اور معاشی معاملات میں محتاط، دو بیویاں تھیں، اور دونوں کے اولاد تھی! ضرورت مند عزیزوں کی خاموشی کے ساتھ امداد کرتے! مولوی صاحب کی شریفانہ روش کی بدولت شہر کے ہر طبقہ میں اُن کی عزت کی جاتی، حافظ محمد ابراہیم جو یوپی کے وزیر رہے ہیں، اس کے بعد ہندوستانی حکومت میں مرکز کے وزیر رہے اور پھر ڈیڑھ دو سال مغربی پنجاب کی گورنری کا لطف بھی اُٹھایا، اُن کو اخبار "مدینہ" بجنور کے دفتر میں راقم الحروف نے بارہا دیکھا، ان دنوں وہ نگینہ میں وکالت کرتے تھے۔ اور مولوی مجید حسن صاحب کو اپنا بڑا سمجھ کر نیاز مندانہ انداز میں ملتے تھے۔

مولوی صاحب مرحوم چونکہ خوشنویسی اور کتابت کے فن سے واقف تھے اس لئے اُن کی نگرانی میں اخبار "مدینہ" کی کتابت معیاری ہوتی، کوئی کاتب عجلت اور بے پرواہی سے کام لیتا تو اس کو ٹوکتے اور بتاتے کہ کتابت میں حرفوں کے دائروں اور شوشوں کے نوک پلک اس طرح درست کئے جاتے ہیں، اخبار "مدینہ" کے اداریئے چھپنے سے پہلے خود پڑھتے اور بعض اوقات ایڈیٹروں کو ٹوک بھی دیتے کہ فلاں خیال کے اظہار میں یہ کوتاہی رہ گئی ہے یا اداریہ اُس قوت کے ساتھ نہیں لکھا گیا جس قوت کا موضوع متقاضی تھا۔

مولوی صاحب مرحوم سر سے پیر تک مذہبی آدمی تھے، صوم وصلوٰۃ کے انتہائی پابند و پاک صاف زندگی، علمائے دیوبند سے بے حد متاثر، ان
عقیدت مند اور قدر شناس! اخبار "مدینہ" کے عملہ نے "مدینہ کلب" قائم کیا تھا جس میں فٹ بال ہوتی تھی، شہر کے باہر کھیتوں کے درمیان کھیل کا میدان تھا۔
دو تین بار مولوی صاحب نے بھی فٹ بال میں حصہ لے کر ہم جوانوں اور اپنے نوجوانوں کی ہمت افزائی کی اور اپنی جولانی طبع کا ثبوت دیا۔

۱۹۴۳ء کے بعد مولوی مجید حسن مرحوم سے گو بالمشافہ ملاقات کا موقع نہ ملا لیکن ان سے خط و کتابت کا معاملہ رہا، سولہ سال کی اس طویل مدت کے بعد
۱۹۴۹ء میں جب میں نے "فاران" نکالا تو اس کا اشتہار "مدینہ" میں اشاعت کی غرض سے بھیجا اور مولوی صاحب نے اُسے کسی معاوضہ کے بغیر اپنے اخبار میں
شائع فرما دیا! اسی طرح "رسالت نمبر" اور "توحید نمبر" کے اشتہارات بھی "مدینہ" میں نمایاں طور پر اشاعت پذیر ہوتے اور اُن کے تبادلہ میں "فاران" میں چھپنے کے لئے
مولوی صاحب مرحوم نے اپنے مکتبہ کی کسی کتاب تک کا اشتہار نہیں بھیجا۔

سُنا ہے کہ اب کچھ دنوں سے مولوی مجید حسن مرحوم کے مالی حالات پہلے جیسے نہیں رہے تھے، مگر انہوں نے استقلال و عزیمت اور صبر و شکر کے ساتھ یہ
زمانہ گزارا۔ ڈیڑھ دو مہینے ہوئے سہ روزہ "مدینہ" میں ایک مضمون نگاہ سے گزرا جس میں جمال ناصر کی حمایت کی گئی تھی اور "اخوان المسلمون" پر چوٹیں تھیں مجھ سے
نہ رہا گیا میں نے مولوی صاحب مرحوم کو شکوہ آمیز خط لکھا کہ "مدینہ" کا اب کیا رنگ ہو گیا ہے، ظالم کی حمایت و مدافعت اور مظلوم پر طنز و ملامت ......
یہ کیا ہو رہا ہے؟ اس خط کے کچھ دن بعد "مدینہ" میں اُن کے انتقال کی خبر پڑھی، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

ماہر القادری

مرحبا ! ماہِ صیام

مرحبا ! اے ماہِ تسبیح وصلوٰت — مرحبا ! اے دورِ غفران ونجات

مرحبا ! شہرِ تراویح و سحور — دل کو حاصل ہے سرور آنکھوں کو نور

اے کہ تو ہے رحمتِ پروردگار — تیری آمد ، آمدِ فصلِ بہار

رات دن سجدوں میں ہیں پیشانیاں — ہر نفس اک محفلِ روحانیاں

کیا بہارِ قرأت و تجوید ہے — اہلِ دل ، اہلِ نظر کی عید ہے

تابعِ فرمانِ حق ہیں روزہ دار — احتسابِ نفس ہے جن کا شعار

زہد اور پاکیزگی کا دور ہے — ان دنوں دنیا کا عالم اور ہے

روزہ کیا ہے ؟ نفسِ امارہ شکن — امتزاجِ صحتِ روح وبدن

مسجدیں آباد ہیں ، معمور ہیں — ہر قدم پر جلوہ ہائے طور ہیں

ہر مسلماں آج خوش اوقات ہے — یادِ حق ، ذکرِ خدا دن رات ہے

یہ مبارک اور مقدس صبح وشام

اُنزِلَ الْقرآنُ فِیْ شَھْرِ الصِّیام

نغمہ و فریاد

بشیر کرکر فاروقی ــــ

دھوپ کی بارش سے ہم آغوش بھی دیکھا گیا ۔ یوں بھی گزری آدمی ہنستا گیا روتا گیا
کتنے عالم حسن کی کتنی مسلماں بے حیا ۔ جگنوؤں کی طرح جھڑتے ہی وہ تھرا گیا
کس کی ستی توڑ کر غنچے مسل دیتے ہیں لوگ ۔ ہم سے ہنس ہنس کر ترا کانٹا بھی ہنسی آ گیا
تنخ معین کرکے بڑھ ساقی کہ ہے ساتا ہجوم ۔ جھوم مستی میں اک بار لڑکھڑا گیا اٹھتا گیا
کیا کبھی تو نے دھنک دیکھی ہے بادل کے بغیر ۔ اور دل نادان گھٹا چھاتے ہی کیوں گھبرا گیا
عمر بھر چل کر جہاں پہونچے وہ منزل ہی نہیں ۔ لٹ گئے ہم رہبران چپنہ درکا کیا گیا
ہم نہ کہتے تھے کہ مہلت کم ہے خیزا خیز چل ۔ زندگی کے دن نہ آئے موت کا دن آ گیا
ہر قدم پر ہمتوں کی دشواریاں آتی رہیں ۔ ہر قدم پر اعتبار زندگی بڑھتا گیا
سعد و شب دیکھا اسی دنیا میں کیا کیا کچھ نہ پوچھ ۔ عشق حیراں ہے کہ ہم سے کس طرح دیکھا گیا
کون جانے آج مجھ کو اجنبی سی کیوں لگی ۔ زندگی میں بارہا جس راہ سے آیا گیا
غم غلط کرنے کو صدہا محفلیں آباد کیں ۔ غم نصیب انساں مگر تنہا سا تنہا گیا

کچھ ڈر ہے کہ کہ یہ دونوں نگر اُجڑے نہیں
دل بھی دلی کی طرح لٹتا رہا بستا گیا۔

شفقت کاظمی

مجھ سے بھی خفا ہے مری قسمت سے بھی شاکی
کیا بات ہے اس دشمنِ ارباب وفا کی
اک شکل فروزاں تھی کبھی خانۂ دل میں
معلوم نہیں اب غم دوراں نے وہ کیا کی
دیتے رہے ارباب وفا دل کو دُہائی
چھوڑی نہ مگر تم نے کوئی طرز جفا کی
کم یوں بھی نہ تھی شدتِ حرماں کی مصیبت
کچھ اور قیامت تیری یادوں نے بپا کی

امید تھی کیا کیا دلِ بیمار کو لیکن
اس رشکِ مسیحا نے دوا کی نہ دعا کی

عروج زیدی ــــ

نشانِ حسن پرستی بھی جرم ٹھہرا ہے
سویرِ حسن کو تعبیرِ حسن جانتے ہیں
ترے شباب پہ اک تبصرہ ہے یہ مصرع
کہ نقش ہائے سر لب جانے کیوں ہیں
بشر میں عظمتِ کردار ڈھونڈنے والو

مری نگاہ پہ سب کی نظر کا پہرا ہے
تمہارا حسن مگر شاہ کار ٹھہرا ہے
چمن میں قافلۂ نو بہار ٹھہرا ہے
مآل کچھ ہو مگر خواب تو سنہرا ہے
نفس نفس پہ یہاں مصلحت کا پہرا ہے

خراب شوق بہ یک جنبش نظر ہوں عروج
اگرچہ وار تو اوچھا تھا زخم گہرا ہے

ہماری نظر میں

سفرِ حج

غلام فرید بھٹی نظامی، ضخامت ۴۰۰ صفحات (مجلد، رنگین گرد پوش) قیمت تین روپے
ملنے کا پتہ :- سلطان حسین اینڈ سنز، بنس روڈ کراچی۔

جناب غلام فرید بھٹی نظامی کو سنہ ۱۹۶۲ء میں زیارتِ حرمین شریفین کی سعادت نصیب ہوئی تھی، اس مبارک سفر کے واقعات انہوں نے اپنے پیر و مرشد خواجہ حسن نظامی صاحب مرحوم کے روزنامچے کی طرز پر قلمبند کئے ہیں جو خاصے دلچسپ اور ولولہ آفریں ہیں کتاب کے سرنامہ پر خود مصنف نے لکھا ہے :-

"سفرِ حج کی مکمل داستان، جو ایک دیوانے کو پیش آئی اور جسے کسی نے کبھی اس انداز میں پیش نہیں کیا"

اس سفرنامہ میں "جذب و دیوانگی" اور "والہانہ شیفتگی" ایک ایک سطر سے نمایاں ہے، لکھنے والے نے اپنے سوزِ دل کو الفاظ میں سمو دیا ہے جسے پڑھ کر دل متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

"ہندوستانی روپیہ کی قدر و قیمت کیوں ہے؟ اور پاکستانی کرنسی کو کیوں ٹھکرا دیا جاتا ہے ...... کوئی ہم راز اس سب کے وجہ مجھے بتا سکے تو ممنون ہو جاؤں گا، ورنہ اپنے پاکستان کے وقار پر اس گہرے دھبے پر آنسو بہانے کے سوا چارہ نہیں ہے" (ص ۱۸۱) اس عبارت کے آخری جملے میں دھبہ پر آنسو بہانے کی بات سمجھ میں نہیں آتی ان لفظوں کے بدولت نے کھٹک کی بجائے کچا پن پیدا کر دیا ہے ...... "لوگ کیڑوں مکوڑوں کی طرح بازاروں میں پھرتے ہیں" (ص ۱۱۰) مدینہ منورہ میں زیارت اور خود مدینہ کے رہنے والوں کی کثرت و اژدہام کو "کیڑوں مکوڑوں" سے تشبیہ دینا، عقیدت کے منافی ہے، "حضرت ابو ایوب انصاری کے گھر کے پاس" دق الباب کی غلطی معلوم ہوتی ہے کہ "الباب" کی بجائے "حیا" چھپ گیا ۔۔۔ اسی طرح ص ۱۱۱ پر "عاتکہ" کی جگہ "عاتقہ" چھپ گیا ہے ۔۔۔ اور ص ۱۹۰ پر بھی "اسطوانۃ ابو البابۃ" کو "اسطوانۃ الوالہانہ" کتابت کیا گیا ہے۔

"ہوش کرو غلام فرید!" (ص ۲۱۵) "ہوش میں آؤ" "یا ہوش سے کام لو" لکھنا تھا ۔۔۔ "ایسے عالم میں نہ دنیا کی ہوش" (ص ۲۲۸) "ہوش" تو مذکر ہے ۔۔۔ "جہاں حرم شریف کا فرش آگ اگل رہا تھا وہاں سر اور دماغ پر دھوپ پوری طرح سوار تھی" (ص ۲۱۶) حرم کعبہ میں وہاں کے مقدس فرش سے "آگ اگلنے" کی نسبت تپش و تمازت کی کیفیت اظہار کے لئے مناسب نہیں، "سر اور دماغ پر دھوپ کا سوار ہونا" زبان و ادب کے اعتبار سے اچھی تشبیہ نہیں ہے۔

جناب ماہر القادری صاحب نے اس کتاب پر "تاثرات" کے عنوان سے پیش لفظ لکھا ہے اس کا ایک اقتباس :-

"بھٹی صاحب مجذوب نہیں ہیں، سالک ہیں اور میں نے انہیں دیکھا ہے اور بولتے سنا ہے بڑی سمجھ کی باتیں کرتے ہیں لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا جب غلبہ ہوتا ہے تو کبھی کبھی خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پڑھایا ہوا سبق بھول جاتے ہیں اور اسے عشق سے سرشار ہو کر حدودِ شریعت سے باہر نکل جاتے ہیں"

یہ سفرنامہ ماہر القادری صاحب کے ان "تاثرات" کی تصدیق کرتا ہے کتنے ہی ایسے مقامات نگاہ سے گذرے جہاں غلام فرید صاحب فرطِ عقیدت کے سبب توحید اور شریعت کے تقاضوں کو ملحوظ نہیں رکھ سکے ۔۔۔ مثلاً ۔۔۔

"حضور رحمت العالمین کی یہ مسجد ہر اعتبار سے اس قابل ہے کہ اس کی پرستش کی جائے" (ص ۱۴۰) حالانکہ مسجد نبوی ہو یا حرم کعبہ ان میں سے کسی عمارت

آدم جی کے پارچہ جات
دیرپا ہوتے ہیں
ACM
آدم جی کاٹن ملز لانڈھی. کراچی

آپ وقت سے پہلے کیوں مرجھائیں!
دس میں سے نو آدمیوں میں قبل از وقت بڑھاپے کے آثار نظر آنے
لگتے ہیں۔ اس کا سب سے بڑا سبب ناقص اور ناکافی غذا ہوتی ہے
اس غیر طبعی حالت سے بچنے کے لئے ہمدرد کا ماءاللحم دوآتشہ
استعمال کیجئے۔ یہ صحت و شباب قائم رکھنے کا بہترین ذریعہ ہے
جدید طبی تحقیق کی مدد سے ماءاللحم کے خواص اور خوبی کو کافی حد تک
بڑھا دیا گیا ہے اور اب یہ ہر لحاظ سے ایک ایسا مکمل اور موثر
ٹانک بن گیا ہے جو تھکے ہوئے اعصاب کو قوت بخشتا ہے اور
پورے نظام جسمانی کو چاق و چوبند کرکے سال بھر کے لئے
ضروری توانائی مہیا کرتا ہے۔ بیشمار لوگ اس کی تاثیر کو آزما چکے ہیں
ماءاللحم
جاڑوں میں نئی قوت اور صحت حاصل کرنے کے لئے ایک مکمل اور موثر ٹانک
ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان
کراچی - لاہور - ڈھاکہ - چاٹگام

جلد ۱۸ — شمارہ ۱۱

ماہنامہ فاران کراچی

ماہ فروری ۱۹۶۷ء

ایڈیٹر — ماہر القادری

ترتیب

نقش اول	ماہر القادری	۳
فاران کی تنقید پر تنقید	حکیم گلچیں کرنالی	۱۸
روشن مستقبل	سید معز الدین شاہ شیرازی ایم۔اے	۲۷
نظام تعلیم	محمد حسام اللہ شریفی	۳۲
تفسیر	مولانا محمد مصطفیٰ (علی گڑھ)	۳۵
یاد رفتگاں	ماہر القادری	۳۸
تبرک چند مرحوم کا غیر مطبوعہ کلام	—	۴۳
درس انتخاب	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی	۴۴
ہماری نظر میں	- - - - - -	۴۸

پبلشر ← مسرور حسین

چندہ سالانہ ساتھ روپے	دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی	قیمت فی پرچہ ۶۲ پیسے

مسرور حسین پبلشر نے ... پرنٹنگ پریس کراچی سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم ۰

نقشِ اوّل

جماعتِ اسلامی اعلاءِ کلمۃ الحق کے جس مقصد کے لئے وجود میں آئی ہے اور اقامتِ دین کی جس دعوت کو لے کر آگے بڑھی ہے، اُس پر پیوستہ قائم اور اُسی راہِ سعادت و عزیمت پر گامزن ہے۔ اُس کے مسلک، مقصد اور عقیدہ میں ذرہ برابر فرق اور اس مقصد کے حصول کی راہ میں کوئی "فترت" واقع نہیں ہوئی۔ اُس کے قول و عمل سے کسی ایسی بات کا صدور اور ظہور نہیں ہوا، جس سے یہ سمجھا جائے کہ جماعتِ اسلامی کی دعوت، مقصد اور پیام میں تبدیلی، انتشار یا اضطراب و تذبذب پیدا ہو گیا ہے۔ ربع صدی کی مدت گزرنے کے بعد بھی، جماعتِ اسلامی کا مقصد مطمحِ نظر اور نصب العین وہی ہے جو اُس کے قیام کے پہلے دن تھا!

جماعتِ اسلامی کے افراد دنیا کے جس خطہ میں بھی پائے جاتے ہیں، ان کی کوششوں کا محور "اقامتِ دین" ہے! ہاں طریقِ کار میں ماحول اور گرد و پیش کے لحاظ سے یکسانی نہیں پائی جاتی اور نہ پائی جانی چاہیئے۔ مثلاً جس خطہ زمین میں مسلمانوں کی غالب کثرت ہے وہاں اسلامی حکومت کے قیام کا مطالبہ اُن کی جد و جہد کا مرکز اور موضوع بنا ہوا ہے، لیکن جن ملکوں میں تعداد کے اعتبار سے غیر مسلموں کا غلبہ ہے، مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں "اقامتِ دین" کی اُن بنیادی شرائط کو پیش اور واضح کیا جاتا ہے کہ جن کے بغیر ایمان اور اسلام کا تصور نہیں کیا جا سکتا، اور خاص طور سے غیر مسلموں میں اسلام کو دینِ حق اور دینِ فطرت ثابت کرنے کے لئے تبلیغ کی جاتی ہے، اور متعصب ناقدین نے اسلام کے بارے میں جو نفرت اور وحشت پھیلا رکھی ہے، اس کو اُنس و دلچسپی سے بدلنے کے لئے یہ داعیانِ حق اپنی تمام توانائیاں اور صلاحیتیں صرف کر رہے ہیں، دعوت کے ساتھ عزیمت اس جماعت کی سب سے بڑی خصوصیت ہے، وہ جان و مال کے نقصانات سے دوچار رہے ہیں اور طرح طرح کی مصیبتوں اور پریشانیوں کا اُنہیں سامنا کرنا پڑا ہے، مگر کوئی لالچ، دباؤ اور مصیبت ان کے عزم اور نصب العین میں لچک اور جھکاؤ پیدا نہیں کر سکی؟

جس جماعت کا اتنا بلند مقصد اور اس قدر مقدس نصب العین ہو، اور جس نے دعوت کے ہر مرحلہ میں اس درجہ عزیمت اور استقامت اور بے لچک کردار کا ثبوت دیا ہو، جس کے کارکنوں کی زندگیاں کھلی کتاب کی طرح دنیا کے سامنے ہوں۔ جس کا پیش کیا ہوا ہزاروں صفحوں کا لٹریچر جماعت کی ذہنی فکر کی شہادت دے رہا ہو —— وہ جماعت دین پسند طبقوں کی طرف سے شایانِ تائید و تعاون ہے یا ملامت و بیزاری کی مستحق ہے۔

ہونا کیا چاہیئے تھا اور ہو کیا رہا ہے؟ دینی طبقوں کی عام طور پر روش جماعتِ اسلامی کے ساتھ غیر ہمدردانہ ہی نہیں بلکہ عنادِ

مخالفت کی روش ہے، جیسے جماعت دنیا کے پردے پر اُن کی سب سے بڑی حریف تنظیم ہے! اہلِ تقلید، اہلِ حدیث حضرات کے بارے میں جو رائے رکھتے ہیں، وہ سب کو معلوم ہے، یہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی جرأت اور حق گوئی تھی کہ انہوں نے فقہی مذاہب کے ساتھ جماعت اہلِ حدیث کے بارے میں اس کا اعلان کیا کہ یہ بھی مسلکِ حق ہے، اور اس اعتراف اور اعلان کو انہوں نے کسی قسم کی "اگر مگر" سے آلودہ نہیں کیا، اور جماعت اسلامی جو تمام مسلمانوں کو دعوتِ اتحاد دیتی ہے خود اس میں اہلِ حدیث کے بعض افراد نے شریک ہو کر کسی قسم کی اجنبیت محسوس نہیں کی، ——— مگر افسوس ہے کہ اہلِ حدیث کے بعض رسالوں اور اخباروں میں ایسی عبارتیں بھی ہماری نظر سے گزریں ہیں جس میں جماعتِ اسلامی کو قادیانی جماعت کے مشابہ قرار دیا گیا ہے۔ یہ تشبیہ اور اس قسم کی مماثلت کتنی صریح ناانصافی کتنا بڑا ظلم اور حقیقت کو مسخ کرنے کی کتنی سفاکانہ کوشش ہے!

سب سے زیادہ دکھ یہ دیکھ کر ہوتا ہے کہ علماء دیوبند جن کو جماعت اسلامی کا سب سے بڑا مونس، ہمدرد اور خیر خواہ ہونا چاہئے تھا انہی کی خاصی اکثریت جماعت کی خفیہ اور علانیہ مخالفت میں لگی ہوئی ہے، یہ حضرات جماعت کی تائید نہ فرماتے بلکہ خاموش اور غیر جانب دار رہتے تو یہ بھی غنیمت تھا مگر اُن کی روش تو یہ ہے جماعت کی مخالفت جیسے کوئی دینی فریضہ ہے، جسے یہ بزرگانِ کرام انجام دے رہے ہیں، ان میں سے کتنے ایسے سادہ مزاج بزرگ ہیں جنہوں نے جماعت اسلامی کی کتابوں کا خود مطالعہ کرنے کی زحمت برداشت نہیں کی، بلکہ اپنے عقیدت مندوں کی سنی سنائی باتوں پر اعتبار کر کے، جماعت اور مولانا مودودی کے بارے میں انتہائی بدظن ہو گئے! ایک بہت بڑے دیوبندی عالم جو وفات پا چکے ہیں اور جو اُن حضرات کے نزدیک "شیخ الشیوخ" کا درجہ رکھتے ہیں، جماعت اسلامی ہند کے ذمہ دار افراد نے ان سے عاجزانہ درخواست اور مخلصانہ التجائیں کیں کہ وہ انہیں ملاقات کا وقت عنایت فرمائیں تاکہ جماعت اسلامی کے لٹریچر میں جن باتوں پر حضرت والا کو اعتراض ہے اُن کی وضاحت کی جا سکے۔ لیکن اُن بزرگ شخصیت نے ملزموں کو اپنی صفائی پیش کرنے کا موقعہ ہی نہیں دیا۔ کسی فرد یا جماعت کی تضلیل و تفسیق کے بارے میں یہ سہل انگاری کیا اہلِ علم و تقویٰ کو کسی طرح زیب دیتی ہے۔

جب ہمیں اس کا پتہ لگا تو ہماری حیرت اور افسوس کی کوئی انتہا نہیں رہی کہ دیوبند کے بعض ایسے صاحبانِ علم و افتاء جن کی عالمانہ سنجیدگی اور احساس ذمہ داری کے بارے میں ہم بہت کچھ خوش گمان تھے، جب اُن تک کے قلم نے جماعتِ اسلامی پر بدعقائد اور بدعمل کا الزام لگا دیا تو اس بے اعتدالی، علم و تقویٰ کی افراط اور غیر ذمہ داری بلکہ زیادتی کا دوسرا قدم یہی ہو سکتا ہے کہ جماعتِ اسلامی کی "تکفیر" کا فتویٰ صادر کر دیا جاتے، چنانچہ دیوبند کے ایک بہت بڑے عالم نے اپنے مدرسہ کے ایک استاذ اور فاضل اہلِ قلم کو یہ خدمت سپرد کی تھی کہ غلام احمد پرویز پر جس طرح کفر کا فتویٰ لگایا گیا ہے، اسی نہج اور انداز پر جماعتِ اسلامی کے لٹریچر سے اقتباسات دے کر مولانا مودودی کو "کافر" قرار دیا جائے، مگر ان صاحب نے اپنی نیک نفسی، خداترسی اور آخرت کی بازپرس کے سبب اس خدمت کے انجام دینے سے صاف انکار کر دیا کہ میں یہ کھیل نہیں کھیل سکتا!

سے ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

اس دورِ انحطاط میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے ایسی سعید روحیں پائی جاتی ہیں، اور ایسے لوگ ملتے ہیں جو حق کے معاملہ میں گروہی عصبیت میں مبتلا نہیں ہیں اور وہ "من قال" کی بجائے "ما قال" کا اصول پیش نظر رکھتے ہیں، اور کسی بڑے آدمی کا دباؤ، مدد، رعایت اور روزگار اور معیشت کے تنگ ہو جانے کا خطرہ جنہیں اپنے ضمیر کے خلاف کام کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا!

بات تو بہت چھوٹی سی ہے مگر اس سے ان حضرات کی ذہنی سطح کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ بزرگانِ کرام اپنے کم سواد عزیزوں اور ارادت مندوں کے نام کے ساتھ "مولوی" اور "مولانا" لکھتے اور بولتے ہیں مگر مولانا مودودی کو ——— "مودودی صاحب" ——— کہتے ہیں اور مودودی

صاحب کو مولانا مودودی کو کہ آن کی علمی اور دینی حیثیت کو RECONGNISE کرنا نہیں چاہتے ۔ انہوں نے علم وفضل اور دینی قابلیت کا جو معیار اپنے ذہنوں میں قائم کر رکھا ہے، اُس پر مولانا مودودی غالباً پورے نہیں اُترتے! یہ گروہی عصبیت نہیں تو اور کیا ہے تفسیر، حدیث، فقہ، علم کلام، تاریخ، عمرانیات، سیاسیات اور دوسرے علوم پر مولانا مودودی کی اتنی بلند پایہ کتب موجود ہیں کہ جب ان کی بعض کتابیں ترجمہ ہو کر عرب ممالک میں پہونچی ہیں تو اکابر علماء عرب نے مولانا مودودی کو انتہائی شاندار الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے! ہند و پاکستان کے علماء میں مولانا مودودی کی تصانیف کو یہ امتیاز اور خصوصیت حاصل ہے کہ وہ دنیا کی متعدد زبانوں میں ترجمہ ہو کر مقبول ہوئی ہیں، خواص نے بھی اُن سے استفادہ کیا ہے اور عوام نے بھی فائدہ اُٹھایا ہے۔ غیر ممالک کے کتنے اکابر علماء اور ارباب فکر ہیں جو مودودی صاحب کی کتابیں پڑھنے کے بعد اُن سے ملنے کی تمنا رکھتے ہیں! افسوس ہے کہ یہی "روشنی طبع" مولانا موصوف کے لئے "بلا" ثابت ہوئی ہے اور گروہی عصبیت کے ساتھ رشک و حسد بھی اُن کی مخالفت کا سبب بن گیا ہے!

علماء اور ارباب فکر کی کتابوں اور تحریروں کو پڑھنے اور ان کی بلندی و پستی کا موازنہ کرنے کے لئے آسمان سے فرشتے نہیں آیا کرتے، ہر دور کے متوسط معلومات کے ارباب قلم، اہل فکر، اور صاحبانِ ادب و انشاء ہی اس کا فیصلہ کرتے ہیں کہ کس عالم اور مفکر نے کیا لکھا ہے؟ اور کیسا لکھا ہے؟ ــــ اس بنا پر کسی مصنوعی انکسار کے بغیر عرض ہے ــــ

ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں
ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے

ــــ تو ــــ

مولانا مودودی کی کتابوں کا جہاں تک تعلق ہے وہ اس دور کے کسی بڑے سے بڑے عالم دین اور مصنف و مفکر سے دبتے ہوئے نظر نہیں آتے! بلکہ جہاں تک علم وفضل سے صحیح طور پر سلیقہ کے ساتھ کام لینے کا تعلق ہے، اس خصوصیت میں وہ سب سے ممتاز ہیں! یہ مودودی صاحب کی شاعرانہ انداز میں قصیدہ خوانی یا مدح سرائی نہیں بلکہ واقعیت کا کسی مبالغہ کے بغیر اظہار ہے! جب مولانا مودودی شام تشریف لے گئے تھے تو ایک علمی اجتماع میں وہاں کے سابق وزیر معارف اور مفکر اہل قلم جناب مصطفیٰ زرقاء نے ان لفظوں میں مولانا مودودی کی خدمت میں خراج تحسین و عقیدت پیش کیا تھا کہ الاستاذ مودودی، غزالی اور ابن تیمیہ کی صف کا آدمی ہے! اور خود دیو بند ہی کے مستند عالم دین اور علمی خانوادے کے چشم و چراغ اور بلند پایہ اہل قلم مولانا عامر عثمانی اپنے متعدد مضامین میں اس کا اعلان اور اعتراف کر چکے ہیں کہ مودودی اپنے وقت کا امام ہے! حالانکہ جہاں تک راقم الحروف کے علم و خبر اور معلومات و مطالعہ کا تعلق ہے، جماعت اسلامی کے کسی فرد کی زبان و قلم سے اس قسم کے مدحیہ الفاظ مولانا مودودی کی شان میں سننے اور پڑھنے میں نہیں آسکے! جمعیۃ العلماء الجزائر کے رئیس علامہ محمد بشیر الابراہیمی مرحوم نے مولانا مودودی کے علم و فکر اور مومنانہ عزیمت کا جن شاندار لفظوں میں اعتراف کیا ہے وہ عربی مدرسوں کی اسناد فضیلت کے مقابلہ میں مولانا موصوف کے علم وفضل کی بہت بڑی بلند شہادت ہے ــــ علامہ مرحوم لکھتے ہیں "ــــ پاکستان اور ہندوستان کے جن فضلاء سے میں متعارف ہوا ان میں سب سے زیادہ تفقہ فی الدین رکھنے والے اور اسلام کے تاریخی حقائق پر بصیرت رکھنے والے ہیں، آپ معلومات کے سمندر ہیں! روشن خیال اور تدبر کے بادشاہ اور روحانیت کے صاف و شفاف آئینے ہیں، مسائل حاضرہ کو اسلامی اصول پر تطبیق دینے میں ماہر ہیں اور اس معاملہ میں ایک جدید طرز استدلال کے موجد ہیں، شریعت کے مزاج شناس اور اس

احساس کمتری کہیں یا جذبہ حسد کہیں جس میں ارباب دیو بند الجھے ہوئے ہیں، ورنہ اب اتنی چھوٹی نہیں
رہی جتنی وہ سمجھتے ہیں اور نہ علم وفضل اور ذہانت و فراست کا دائرہ اتنا تنگ اور محدود ہے، آہ کہ شاید نہیں معلوم کہ مولانا مودودی کے

علم و فضل کا انکار کر کے، اپنے بارے میں وہ لکھی پڑھی دُنیا کو برا تاثر دیتے ہیں! پھر سب سے بڑی ستم ظریفی یہ ہے کہ جو شخص مشرکانہ رسوم و عقائد اور بدعات کا منکر و محتسب اور توحید خالص کا مبلغ ہے اور تجدد و مغرب زدگی کے ہر محاذ پر جس نے غیر اسلامی نظریوں سے نبرد آزمائی کی ہے، اُس اپنی کام صفت کے آدمی کو، ارباب دیوبند نے اپنا مخالف سمجھ رکھا ہے۔

جہاں تک قلم کی لغزش اور سہو کا تعلق ہے، اس سے کوئی اہل قلم محفوظ نہیں ہے، غزالیؒ، ابن جوزیؒ، ابن تیمیہؒ، شاہ ولی اللہ رحمہم اللہ تعالیٰ کتنے بڑے آدمی اور صحیح معنیٰ میں "رجال کار" ہیں مگر اُن کے قلم سے بھی غلطیاں سرزد ہوتی ہیں، مگر ان چند غلطیوں کے سبب ان بڑے آدمیوں کی بلند شخصیتوں کی نفی نہیں کی جاتی! اکابر دیوبند اپنی کتابوں اور تحریروں میں غلطیوں سے کب محفوظ رہے ہیں! بریلویوں نے علماء دیوبند کو مطعون کرنے کے لئے جو کتابیں مرتب کی ہیں، اُن میں اول تو بے سلیقگی پائی جاتی ہے، پھر انہوں نے اُن الفاظ پر گرفت کی ہے، جن کی تاویل ہو سکتی ہے اور جن میں بعض کا تعلق الفاظ کی بے احتیاطی سے ہے ـــــ مگر خدانخواستہ ان حضرات کی سطح پر آکر، دیوبند کے مکتبِ فکر کو بدنام کرنے اور ملت میں انہیں مبغوض اور مطعون بنانے کی مہم ہم جیسے ہیچمداں شروع کر دیں، تو ہم اکابر دیوبند کی کتابوں اور تحریروں سے ایسی غلطیاں چُن کر لوگوں کے سامنے پیش کر سکتے ہیں جن کی مدافعت اور تاویل مشکل ہی سے کی جا سکتی ہے، یہاں تک کہ بعض حلال چیزوں کو حرام ٹھیرانے میں ان حضرات نے خاصہ تساہل اور اوپری تحقیق سے کام لیا ہے! اس قسم کی غلطیوں کے باوجود ہم اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ دیوبند سے اسلام اور ملت کو بہت فائدہ پہونچا ہے اور اس حلقہ میں مجموعی طور پر خیر کا غلبہ ہے! اس لئے دیوبندی حلقہ کے اکابر کی غلطیوں پر نقد و احتساب کی ضرورت آن پڑے، تو ہماری تنقید کا خلاصہ یا ماحصل اور مقصد یہ نہیں ہو سکتا کہ یہ حلقہ دین میں فتنہ پھیلا رہا ہے، یا یہ لوگ فسادِ عقیدہ و عمل میں مبتلا ہیں یا ان کے پیچھے نماز پڑھنی مکروہ تحریمی ہے! اگر ہم اس قسم کی تنقید اور عصبیت، غلط اندیشی اور سوءِ ظن سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں! خدا جانتا ہے کہ ہمیں یہ سُن کر خوشی ہوتی ہے کہ فلاں مسجد، محلہ اور بستی میں علماء دیوبند کا اثر و نفوذ بڑھ رہا ہے! کیونکہ دیوبندی مکتبِ فکر مشرکانہ رسوم و عقائد اور بدعات کی نفی کرتا ہے!

نقد و احتساب ہو یا مدح و ستائش اس کی بھی حدود ہیں، ان حدود کو توڑ دینے ہی سے فساد پیدا ہوتا ہے اور طرح طرح کی خرابیاں اور بے اعتدالیاں ظہور میں آتی ہیں! جماعتِ اسلامی کا لٹریچر وحی و الہام نہیں ہے، اُس کی غلطیوں اور کمزوریوں کی اہل علم کو بے تکلف نشاندہی کرنی چاہئے، لیکن "چند غلطیوں" کی بنیاد پر مولانا مودودی یا جماعت کی تضلیل و تفسیق بہت بڑی زیادتی ہے! ہم نے "فاران" میں حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "التکشف عن مہمات التصوف" پر پوری تفصیل کے ساتھ نقد و محاکمہ کیا، اور جہاں جہاں کمزوریاں بدیہی طور پر نظر آئیں اُن کی نشاندہی کر دی، مگر ہم اس زیادتی کے مرتکب نہیں ہوتے کہ ان چند تسامحات اور کمزوریوں کو بنیاد بنا کر ـــــ حضرت تھانوی یا اُن کے سلسلہ ارشاد و تصوف کو "فتنہ" اور "ضلالت" ٹھیرا دیتے! قلم کی ذرا سی جنبش یہ کام کر سکتی تھی، مگر اس قسم کے ظلم و زیادتی پر اپنے کو ہم آمادہ نہیں کر سکتے! ہم اس غلط فہمی کا شکار نہیں ہیں کہ ہمارے پاس نیک اعمال کی اتنی بہت سی مقدار ہے، جو ہماری زیادتیوں اور الزام تراشیوں کا کفارہ بن سکتی! جن جماعتوں اور افراد سے دین کو فائدہ پہونچ رہا ہو، اُن کو بدنام اور مطعون کر کے اور انہیں فتنہ و ضلالت ٹھیرا کر، ہم دین کے نام پر دین کی بدخواہی کا الزام اور گناہ اپنے سر نہیں لے سکتے:

علماء دیوبند نے اگر یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ تو فولاد کے بنے ہوئے قلعہ میں محفوظ ہیں اور دوسرے آئینہ خانوں میں رہتے ہیں، جن کو آسانی سے چکنا چور کیا جا سکتا ہے ـــــ یہ ان کی خوش فہمی اور غلط اندیشی ہے، حلقۂ دیوبند سے جو حضرات بھی تعلق رکھتے ہیں وہ اگر چاہیں اور پسند فرمائیں تو ہم تبادلۂ خیال کر کے انہیں شاید مطمئن اور قائل کر سکتے ہیں کہ بعض اکابر دیوبند سے دینی مسائل میں جس قسم کی بعض شدید غلطیاں سرزد ہوئی ہیں، مولانا مودودی کے قلم سے اس قسم کی غلطیوں کا صدور نہیں ہوا مگر ان غلطیوں کے باوجود اکابر دیوبند قابل احترام ہیں، اور ان کے تسامحات پر کسی خیر خواہ دین و ملت کو اس انداز میں تنقید نہیں کرنی چاہئے گویا کہ یہ بزرگ

ان غلطیوں کے سبب دین کے لئے معاذ اللہ فتنہ بن گئے ہیں! ان حضرات نے دین کی جو شاندار خدمات انجام دی ہیں اور ان کے علم و فضل سے ملت کو جو فائدہ پہونچا ہے، وہ ان کے چند تسامحات کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے، یہ تمام اکابر مجموعی اور فطری طور پر خیر ہیں اور ان کے یہاں خیر و برکت کا غلبہ ملتا ہے۔

دارالعلوم دیوبند میں فتووں کی بے احتیاطی کا یہ رنگ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریر کے ایک اقتباس پر، مولانا مودودی کی تحریر کے دھوکے میں کفر و ضلالت کا فتویٰ لگا دیا گیا۔

علماء دیوبند سے ہم یہ نہیں کہتے کہ وہ نقد و احتساب کے جائز حق سے دستبردار ہو جائیں، ہر فرد اور جماعت کی تحریر و تقریر اور قول و عمل پر جو دینی نقطۂ نگاہ سے قابل گرفت ہو انہیں احتساب کرنے کا پورا حق حاصل ہے، دینی لغزشوں اور کوتاہیوں پر وہ احتساب نہ کریں گے، تو اور کون کرے گا، جماعت اسلامی کو نقد و احتساب سے ظاہر ہے کہ مستثنیٰ نہیں کیا جا سکتا، مگر نقد و احتساب الیہ نہیں ہونا چاہئے کہ سادہ عبارتوں سے خود بخود کے ذریعہ اعتراض کے پہلو پیدا کئے جائیں — مثلاً جماعت کا یہ عقیدہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے علاوہ اور کوئی شخصیت معیارِ حق نہیں ہے — اس سے یہ رمز اور اشاریت تلاش کی جائے کہ اس جملہ سے صحابہ کرام کی تنقیص ہوتی ہے! یا معمولی غلطیوں پر کفر و ضلالت کا فتویٰ داغ دیا جائے، جہاں گروہی عصبیت اور ذاتی مخالفت کام کرتی ہے، وہاں فتووں کی اصابت اور صحت بہت کچھ مجروح اور مکدر ہو جاتی ہے۔

ہم پوری ذمہ داری کے ساتھ، تمام گوشوں اور پہلوؤں کا جائزہ لینے کے بعد گزارش کر رہے ہیں کہ علماء دیوبند[1] کا جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کی ذات کے ساتھ جو سلوک اور برتاؤ ہے وہ دینی محاذ کو ہر اعتبار سے کمزور کر رہا ہے — — — —

اور اس طرزِ عمل سے مخالفین دین کو قوت مل رہی ہے!

علماء دیوبند کا جو سنجیدہ طبقہ ہے، اس کی خدمت میں ہم نہایت خلوص اور دردمندی کے ساتھ مودبانہ گزارش کریں گے کہ وہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی کتابوں کا خود مطالعہ فرمائیں، اگر انہیں فرصت نہ ہو تو مولانا موصوف کی تفسیر "تفہیم القرآن" کی چار جلدوں کو پوری سنجیدگی کے ساتھ پڑھ لیں، یہ مطالعہ غالباً ان کی بہت سی غلط فہمیوں کو دور کر دے گا۔

یہ ہنگامہ آرائی کیوں؟

جماعت اسلامی پر اس قسم کے چلتے ہوئے اعتراضات بھی کئے جاتے ہیں یہ — ایک مستقل فرقہ بن گیا ہے یا مستقبل میں بن جائے گا! حالانکہ جماعت کی چھبیس سالہ زندگی اس کی شاہد ہے کہ جو لوگ اس سے وابستہ ہیں عقائد و اعمال میں وہ سلفِ صالحین سے مختلف کوئی عقیدہ نہیں رکھتے اور نہ دین کے کسی رکن کے معاذ اللہ منکر اور اس میں کمی بیشی کے مرتکب ہوتے ہیں! وہ تمام مسلمانوں کے پیچھے نماز پڑھتے ہیں اور مسلمانوں میں ان کی بیاہ شادیاں ہوتی ہیں ان کی کوئی ایسی مسجد بھی نہیں ہے، جو کسی فرقہ کے ممتاز و مخصوص عقائد و اعمال کی بنا پر "جماعت اسلامی کی مسجد" کہلاتی! اس جماعت میں تو دوسری جماعتوں، حلقوں اور مکاتیبِ فکر کے مقابلہ میں زیادہ اجتماعیت اور دینی وحدت اور اسلامی مرکزیت پائی جاتی ہے! اس جماعت میں اہل حدیث اور مذاہب اربعہ کے ماننے والوں کے درمیان کوئی امتیاز نہیں برتا جاتا اور تمام فقہی مذاہب سے نسبت رکھنے والے، جماعت سے وابستہ ہونے کے بعد واقعی اس دیوار کی طرح ہو جاتے ہیں، جس کے لئے حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے، کہ اس کی اینٹ دوسری اینٹ کو تھامے رہتی ہے، جماعت اسلامی بین قومیّن

---

[1] علماء دیوبند میں ایسے حضرات بھی ہیں جو جماعت اسلامی سے تعاون کر رہے ہیں۔ اور اس کے موید ہیں، اور بعض علماء جماعت پر زبان طعن دراز کرنے کے مقابلہ میں سکوت کو ترجیح دیتے ہیں۔

کرنے یا نہ کرنے اور بلند آواز سے آمین کہنے یا نہ کہنے پر کسی قسم کی کوئی نزاع نہیں ہے! اور نہ جماعت میں کلامی عقائد پر بحث اور مناظرے ہوتے ہیں! اس جماعت کے تمام کا مقصد ہی اُمت کی وحدت اور اسلامیت کا تحفظ ہے، اس کو فرقہ کہنا زیادتی اور ناانصافی ہے! دینی فرقوں میں بعض فقہی اختلافات کی بنا پر جو عصبیتیں پیدا ہو گئی ہیں، جماعتِ اسلامی میں اُن کا کوئی نام و نشان تک نہیں ملتا!

یہ بھی ایک چلتی ہوئی طنز ہے کہ جماعتِ اسلامی دینی اکابر کا احترام نہیں کرتی یا اُن سے بدگمانی میں مبتلا ہے، جماعتِ اسلامی دینی اکابر کا بیشک احترام کرتی ہے مگر وہ اُن کی پرستش نہیں کرتی! اُس کے سامنے اصل معیار "کتاب و سنت" ہے اور اسی پر ہر کسی کے قول و فعل کو جانچتی اور پرکھتی ہے: مسلمانوں کی پوری تاریخ اس سے لبریز ہے کہ اخلاف نے اسلاف کی اُن باتوں پر جو محلِ غور نظر آئی ہیں، تنقید کی ہے، حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قابلِ فخر شاگردوں کا اپنے استاد امامِ اعظم سے بعض فقہی مسائل میں اختلاف کیا اس کی دلیل بن سکتا ہے کہ امامِ اعظم کے شاگرد اپنے استاد سے بدگمان تھے؛ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ جب یہ فرماتے ہیں کہ —— ما را نص در کار است نہ کہ فص —— تو کیا اُن کی تنقید کو یہ معنی پہنائے جا سکتے ہیں کہ اس قول سے وحدت الوجود پر عقیدہ رکھنے والے تمام صوفیاء کی تنقیص ہوتی ہے ——
حضرت امام غزالیؒ پر یہ تنقید کہ اُن کی کتابوں میں احادیث کا معاملہ بہت کمزور ہے اور اس معاملہ میں وہ معذور تھے اور امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے پیروکاروں اور وجہ کی جو تفسیر کی ہے اُس میں تنزیہ کے ساتھ "تجسیم" کا بھی شبہ ہوتا ہے۔ اس قسم کی تنقیدوں کو جو کوئی اسلاف کی بے حرمتی اور بدگمانی سمجھتا ہے تو وہ عقیدت اور خوش گمانی کے اس غلو میں مبتلا ہے جو اکابر و اسلاف کو "معصوم" بنا دیتا ہے، جماعتِ اسلامی اللہ تعالیٰ کے فضل سے اس غلو میں الجھی ہوئی نہیں ہے اور اسی روش پر —— اسلاف سے بدگمانی —— کی طنز کی جاتی ہے۔

جماعتِ اسلامی با قاعدہ ایک تنظیم ہے، اُس کے یہاں دفاتر میں رجسٹر اور فائلیں ہیں، ٹیلی فون اور ٹائپ کی مشینیں ہیں، تنخواہ یاب کارکن ہیں، کام کی ذمہ داریوں کے اعتبار سے عہدوں کی تقسیم اور تعیّن ہے! پریس کانفرنس اور استقبالے ہیں —— دیندار اور اسلام پسندوں کی ایک جماعت کو ان تمام باتوں میں دنیاداری اور تعلق باللہ کی کمی نظر آتی ہے وہ اس کو انبیائی دعوت سمجھتے ہیں کہ دینی اور تبلیغی جماعتوں کا نہ تو اخبارات میں کوئی اعلان کیا جائے، نہ پوسٹر لگائے جائیں اور اجتماعات کے انتظام کے لئے نہ کوئی کمیٹی بنائی جائے، نہ کوئی شعبہ قائم کیا جائے! جماعتِ اسلامی اس کے برخلاف اُن جائز وسائل سے کام لینے میں دین کا کوئی حرج اور نقصان نہیں سمجھتی جو بیشک غیر مسلموں کے ایجاد کئے ہوئے ہوں مگر اُن سے حصولِ مقصد میں آسانیاں اور سہولتیں پیدا ہوں اور اللہ تعالیٰ کے دین کے پیغام کو اللہ کی زمین پر زیادہ سے زیادہ سے زیادہ مؤثر اشاعت کا موقع میسر آسکیں، غزوۂ خندق میں اہلِ فارس کے طریقۂ جنگ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جو "خندق" کھودی گئی تھی، یہ مقدس سی جماعتِ اسلامی کے لئے تمدن و تہذیب کے ان نوائد اور معاملات میں دلیلِ راہ ہے۔

لعن و طنز اور —— !؟ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی کتاب "خلافت و ملوکیت" پر جو ہنگامہ برپا ہے اسی سے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ بعض دیندار لوگ اُن کو مطعون کرنے اور ہدفِ ملامت کے بہانے ڈھونڈتے رہتے ہیں، بعض پڑھے لکھے لوگ بلکہ اونچے درجہ کے علماء نے اس کتاب پر اس انداز میں تنقید فرمائی ہے کہ مصر سے سید قطب شہید کی تصنیف اور پاکستان سے مولانا مودودی صاحب کی کتاب کا اس موضوع پر منظرِ عام پر آنا یہ سب کچھ ایک "سازش" کے تحت ہوا ہے۔

سہ ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے

مولانا مودودی نے حضرت سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت کے بارے میں جو باتیں کہی ہیں وہی باتیں دوسرے علماء اہلِ سنت و جماعت نے بھی فرمائی ہیں! مگر ان علماء اور ارباب قلم کو چھوڑ کر یا دانستہ چشم پوشی کر کے، مولانا مودودی پر طنز و تشنیع کی بوچھار ہو رہی ہے، مثلاً حضرت مولانا عبدالشکور لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ جو امام اہلِ سنت کہے جاتے ہیں، اور شیعیت کی رد اور ناموسِ صحابہ کے تحفظ میں غیر معمولی شہرت

لکھتے ہیں، وہ اپنی کتاب "سیرت خلفاءؓ راشدین" میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"اس بارہ سال میں چھ سال تو نظامِ حکومت ایسا درست رہا کہ کسی کو شکایت نہ تھی، سب لوگ آپ سے (یعنی حضرت عثمانؓ غنی سے) بے حد محبت کرتے تھے، مگر آخری چھ سال میں آپ نے اپنے اعزا واقارب کو عہدوں پر متمکن کیا اور انہوں نے کام کو خراب کر دیا، صلہ رحم کی صفت کا آپ پر غلبہ تھا اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ صفت بڑی عمدہ صفت ہے، مگر کوئی چیز کیسی ہی عمدہ ہو، جب وہ حدِ اعتدال سے تجاوز کر جاتی ہے تو خرابی پیدا ہوتی ہے، تاہم یہ خرابیاں بہت کم تھیں بمقابلہ ان خوبیوں کے جو آپ کی ذات بالاصفات میں تھیں اور بعد از خلیفہ الثانی صفات اسلامیہ کے جو آپ نے انجام دیں ہرگز قابل اعتراض نہیں ہے۔"

یہ کتابچہ جمعیت اسلامیہ سرگودھا نے شائع کیا تھا اس کتابچہ کی منسجیدہ واضح مت کو کسی صاحب نے امیر جمعیت علماء اسلام سرحد مولانا سید گل بادشاہ فاضل دیوبند کی خدمت میں بھیج دیا۔ وہاں سے اس پر مندرجہ ذیل فتویٰ صادر کیا گیا۔

"اگر اس قسم کے الفاظ کہے کہ خلفاء کرام رضی اللہ عنہم نے سہواً یا عمداً خلافت شرعیت احکام جاری کئے ہیں وہ خبیث الفطرۃ اور گمراہ ہے اس کے دل میں نفاق ہے، یقیناً اس عقیدہ سے خلفاء عظام رضی اللہ عنہم کی توہین ہوتی ہے وہ اہل سنت والجماعت کے گروہ سے خارج ہے، اس قسم کے عقیدہ رکھنے والے سے تعلق کسی قسم کا تعاون نہ کرے۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق یہ تشہیر کہ آخری چھ سال میں آپ نے اپنے اعزہ واقارب کو عہدوں پر متمکن کیا، انہوں نے کام خراب کیا (الی آخرہ) یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر الزام ہے، بالکل غلط ہے، افترار وبہتان ہے۔ جو شخص یہ کہے وہ گمراہ ہے وہ خبیث ہے اللہ تعالیٰ اسے ذلیل کرے، انشاء اللہ ذلیل ہوگا، ایسا شخص اہل سنت والجماعت میں نہیں رہ سکتا، ایسی جماعت میں شمولیت نہ کریں اور اس قسم کی جماعت سے کسی طرح تعاون نہ کریں۔* ایسے شخص پر (یعنی حضرت عثمان پر الزام لگانا) انتہائی ظلم ہے اور یہ شخص ایک منافق ہے جو خدا کے رسول کا دشمن ہو۔ اور جو خدا کے رسول کا دشمن ہو وہ اللہ کا دشمن ہے۔ اللہ کا دشمن جہنمی ہوتا ہے۔"

جمعیت علماء سرحد کے فاضل دیوبند مفتی کو یہ دھوکہ ہوا کہ یہ عبارت مولانا مودودی کی لکھی ہوئی ہے، جو جماعت اسلامی پاکستان کے امیر ہیں، اسی لئے انہوں نے اپنے فتوے میں یہ لکھا ہے — اس قسم کی جماعت سے تعاون نہ کریں . . . . !

جب مفتیان کرام اور علماء عظام جمعیت وحماد کی اس سطح پر آجائیں۔ تو یہ دیگیاں چہ رسد ! عجیب بات ہے کہ جمعیۃ علماء اسلام سرگودھا نے یہ کتابچہ شائع کیا ہے۔ مگر اس میں مولانا عبدالشکور مرحوم ومغفور کی کتاب کا جو اقتباس نقل کیا گیا ہے اس سرگودھا کی جمعیۃ علماء اسلام کے اکابر کو اس میں کوئی خرابی محسوس نہیں ہوتی۔

جماعت اسلامی اور مولانا مودودی پر چاروں طرف سے مخالفتوں کی یلغار اور طنز وطعن کی جو بوچھار کی جا رہی ہے اس پر غور کرنے کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ جب اتنے بہت سے علماء جماعت اسلامی کے مخالف ہیں اور مسلمانوں کی قریب قریب ہر جماعت، مولانا مودودی اور جماعت اسلامی پر معترض ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ جماعت اسلامی میں یقیناً ایسی خرابیاں پائی جاتی ہیں، جو ان کو کھٹکتی ہیں اور مودودی صاحب کا

---

* امام اہل سنت ہی کو اہل سنت والجماعت سے خارج کر دیا گیا۔

تصورِ دین اور اُن کی قیادت ان خرابیوں کی ذمہ دار ہے ـــــ مگر دوسرا پہلو یہ بھی تو ہے کہ قرآن کریم جس جماعت کی نشاندہی کرتا ہے کہ امت میں اس کا وجود ضروری ہے ! تاکہ وہ لوگوں کو بھلائی کی طرف بلاتے اور منکر سے روکے، ہو سکتا ہے کہ وہ جماعت یہی تو جماعت اسلامی ہو؛ اور اسی اپنی ہمہ گیر خوبی اور دینی جامعیت کے سبب وہ عام مخالفت کا نشانہ بنی ہوئی ہو ـــــ کیونکہ جماعت اسلامی بھلائی کے ہر رستہ سے لوگوں کو بلاتی ہے' اور ہر قسم کے منکر اور جاہلیت کے ہر تصور کی تردید کرتی ہے' اور اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے مقابلہ میں کسی کی خوشی اور ناخوشی کی پروا نہیں کرتی ۔

جماعت اسلامی کے یہاں دفاتر ہیں' ٹائپ کی مشینیں ہیں' ناظم ہیں ، پریس کانفرنسیں اور استقبالیے ہیں یہاں تک کہ اسمبلیوں کے لئے الیکشن کی مہم بھی ہے ، بعض دینی جماعتوں کو اس میں "دنیاداری" دکھائی دیتی ہے اور "اکرام مسلم" کے نظریہ کی پابندی کے باوجود جماعت کے حق میں طنزیہ جملے زبانوں سے نکل ہی جاتے ہیں ۔

وابستگانِ جماعت اسلامی نہ تو چلے کھینچتے ہیں اور نہ شجرے پڑھتے ہیں ۔ نہ اُن کے یہاں پیری مریدی کا رواج ہے ، اُن کی اس روش کو دیکھ کر وہ دیندار لوگ جو ان رسوم کو روحانیت کی ترقی کا لازمہ خیال کرتے ہیں ، جماعت اسلامی کو روحانیت سے کورا اور تزکیہ باطن سے عاری سمجھتے ہیں ۔

اہل بدعت جماعت اسلامی والوں کو "وہابی" جانتے ہیں اور "وہابی" انہیں آزاد خیال اور تجدد زدہ سمجھے ہوئے ہیں ، مقلدین اور غیر مقلدین دونوں گروہوں کو یہ دیکھ کر خاصی وحشت ہوتی ہے کہ جماعتِ اسلامی میں ایک شخص نماز پڑھنے میں رفع یدین کرتا ہے اور دوسرا نہیں کرتا ، مگر ان کے درمیان اس قسم کے مسائل پر کسی قسم کی نزاع نہیں ہوتی !

مولانا مودودی "تقلید جامد" پر تنقید کرتے ہیں تو مقلدین بگڑ جاتے ہیں اور "تقلید" کی ضرورت اور اہمیت کا اظہار کرتے ہیں تو غیر مقلدین کی پیشانیوں پر شکنیں آ جاتی ہیں ، سنت رسول کو وہ دین میں حجت کہتے ہیں تو منکرین حدیث ان پر روایت پرستی ، عجمیت اور ملائیت کی طنز کرتے ہیں اور جب درایت کی کسوٹی پر وہ کسی حدیث کو پرکھتے ہیں ، تو مودودی صاحب کو منکرین حدیث کے طبقہ میں شمار کیا جاتا ہے۔

مولانا مودودی ائمہ فقہ کے اختلافی مسائل کے مابین محاکمہ کر کے کسی ایک امام کے مسلک پر ترجیح دیتے ہیں ، تو خصوصاً اہل تقلید اور خاص طور سے احناف بہت برہم ہوتے ہیں کہ مودودی صاحب اول تو ایسا کرنے کے اہل نہیں ہیں ، پھر ائمہ فقہ کے اختلافی مسائل میں سے کسی ایک کے مسئلہ کو قبول کر لینا خود اپنی جگہ "غیر مقلدیت" ہے۔

غرض مسلمانوں کی جن جماعتوں اور گروہوں میں بھی دین کے نام پر کچھ اضافے ہوئے ہیں یا غیر ضروری تکلفات پائے جاتے ہیں یا گروہی عصبیت نے تنگی پیدا کر دی ہے ، وہاں مولانا مودودی کے قلم کی زد پڑتی ہے ! تو اُن حلقوں ، مسلکوں اور جماعتوں کے وابستگان کی برہمی انہیں جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کی مخالفت پر اُکسا دیتی ہے ۔ مثلاً سننے کی بات یہ ہے کہ اہل حدیث اور دیوبندی حضرات جب یہ دیکھتے ہیں کہ مصائب و مشکلات کے موقعوں پر جماعت اسلامی میں "ختم بخاری" نہیں کیا جاتا تو نفس مسئلہ کی نوعیت پر غور کرنے کی بجائے ، جماعت اسلامی کے خلاف اُن کے دلوں میں تکدر پیدا ہو جاتا ہے ! اور ایسی باتوں سے ان حضرات کے ذہنوں میں یہ تصور اُبھرتا ہے کہ جماعت اسلامی اسلاف سے بدگمان ہے اور ان کے طریقِ کار کو کوئی اہمیت نہیں دیتی حالانکہ اس قسم کے مسائل و معاملات میں اصل چیز جو معیار اور کسوٹی ہے وہ کتاب و سنت اور آثار صحابہ ہیں ! اور اُس کے بعد تابعین کے قریب ترین زمانہ کے اسلاف اور ائمہ حدیث و فقہ کا تعامل بھی خاص اہمیت رکھتا ہے ۔

جہاں تک اہل بدعت اور اُن کے مسلک سے ملتے جلتے فرقوں کا تعلق ہے وہ تو جماعت اسلامی اور مولانا مودودی سے خوش ہو ہی

جماعت اور مولانا مودودی پر ڈالنے کی مہم زور شور سے جاری ہے! اگرچہ یہ جرم ہے تو اس جرم میں بہت سے بڑے بڑے شہروں کے تقریباً تمام علماء اور مغربی پاکستان کے عوام کی غالب اکثریت شریک ہے۔

دو سال قبل بھی یہ صورت پیش آچکی ہے کہ ریڈیو پر سرکاری اعلان ہوا کہ کل عید ہے مگر علماء کرام نے (جن میں جماعت کے ارکان شامل نہیں تھے) دوسرے دن عید کا اعلان کیا اور خود کراچی کی پولو گراؤنڈ پر دو دن عید کی نمازیں ہوئیں، جماعت اسلامی نے بھی مسلمانوں کی غالب اکثریت کے ساتھ علماء کرام کے فتووں کی تعمیل میں دوسرے دن نماز عید ادا کی، اور امسال بھی جماعت اسلامی اور مولانا مودودی نے علماء کرام کی اکثریت کی رائے اور فتوے پر عمل کیا ـــــ لیکن اس مسئلہ میں دوسرے علماء کو چھوڑ کر مولانا مودودی کو پھانسنے اور بدنام کرنے اور انہیں انتشار پسند ٹھہرانے کی مہم کس زور شور سے جاری ہے! اُن علماء کا وفد کس قدر خوش قسمت ہے جسے ان دنوں پاکستان کے محترم صدر کی بارگاہ میں آسانی کے ساتھ باریابی کا موقعہ مل گیا۔ اور رویت ہلال کے انتشار کی بنیاد پر اس وفد نے مولانا مودودی کی سرگرمیوں کو کچلنے کا معروضہ پیش کرنے کی عزت اور سعادت حاصل کی!

کنونشن مسلم لیگ کے لیڈروں کے بیانات اس قسم کے آرہے ہیں جو جماعت اسلامی کے خلاف جنگ کو اُبھارنے اور مشتعل کرنے والے ہیں اور فضا ایسی پیدا کی جا رہی ہے کہ حکومت کو کوئی زحمت نہ کرنی پڑے بلکہ پاکستان کے عوام جماعت اسلامی سے دست و گریباں ہو جائیں، اور ـــــ!

جماعت اسلامی کو ایک طرف اس سنگین صورت حال کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے دوسری طرف جماعت اسلامی کو خیرباد نہیں "مردہ باد" کہنے والے وہ چند افراد ہیں جو جماعت اسلامی سے نکلنے کے بعد جماعت اسلامی کی رسوائی بلکہ تباہی و بربادی کے درپے ہیں ـــ کاش! یہ حضرات جماعت سے وابستہ نہ ہوتے، مگر تقدیر کے نوشتہ کو کون مٹا سکتا ہے؟ ایسا ہونا مقدر ہو چکا تھا، اور وہ ہو کر رہا، اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی کچھ مصلحت ہے!

ماہنامہ "میثاق" لاہور کئی سال سے جناب مولانا امین احسن اصلاحی کی ادارت میں نکل رہا ہے اور غالباً دو سال سے بند ہو چکا ہے، اب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اس کی ادارت کو سنبھالا ہے۔ میثاق کے دورِ جدید میں مولانا اصلاحی صاحب کا نام "سرپرست" کی حیثیت سے سرورق پر مرقوم ہے! مولانا اصلاحی صاحب نے "میثاق" میں جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کے خلاف خاصہ زورِ قلم صرف کیا تھا، مگر اول تو کچھ دنوں سے میثاق بند تھا، دوسری وجہ شاید یہ کہ مولانا موصوف اپنے فرزند اکبر ابو صالح مرحوم کی وفات کے غم میں اس طرف توجہ نہ فرما سکے!

ـــــ مگر ـــــ

مجلہ "میثاق" اب دورِ جدید میں پہلے کے مقابلہ میں خاصی آن بان اور ظاہری دلفریبی کے ساتھ منظر عام پر آیا ہے اور اس کا آغاز مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کی مخالفت سے ہوا ہے! ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اور اُن کے رفقاء کو پاکستان میں نہ کوئی "منکر" اپنی طرف متوجہ کر سکا نہ کوئی برائی اُنہیں احتجاج اور استیصال کے قابل نظر آئی، نہ کسی باطل نظریہ اور غلط عقیدہ کی تردید کی انہیں ضرورت محسوس ہوئی، اس ملک میں اُن کے نزدیک سب سے بڑا منکر جماعت اسلامی ہے اور سب سے زیادہ مفسد شخصیت ابوالاعلیٰ مودودی کی ہے! اسی لئے اُن کی دینی فراست اور اسلامی شعور نے جماعت اور مودودی صاحب پر "ہلہ بزن" بول دیا ہے، ڈاکٹر صاحب کی نگاہ میں پاکستان میں تجدید و احیاء دین کا اصلی کام اُسی وقت شروع ہو سکتا ہے، جب تک جماعت اسلامی کے فتنہ کا قلع قمع نہ کر دیا جائے ـ پہلے وہ جماعت اسلامی سے نمٹ لیں اور اس بنے بنائے نشیمن کو آگ لگا دیں، اس کا بعد ملت کی اصلاح کے لئے وہ اپنی اسکیموں کو بروئے کار لائیں گے۔

ڈاکٹر صاحب کی کتاب اور اُن کے بعض مضامین پڑھ کر اُن کی شدید مخالفت کے باوجود دل اس طرف بھی جاتا تھا کہ موصوف

جماعت کی اصلاح کا ہمدردانہ جذبہ رکھتے ہیں، جماعت سے انہیں بلاوجہ کی دشمنی نہیں ہے، وہ جماعت کی تباہی اور شکست وریخت نہیں، اس کی اصلاح کے متمنی اور خواہش مند ہیں ـــــ مگر ڈاکٹر صاحب زیادہ دن تک اپنے دل کی عداوت اور بغض کو نہ چھپا سکے! وہ جہانگیر ہی کی مشہور ضرب المثل ہے کہ بلی تھیلی سے باہر آگئی، تو ماہ جنوری کے میثاق میں انہوں نے اس زہر کو باقاعدہ اگل ہی دیا، جو برسوں سے اپنے اندر چھپائے بیٹھے تھے ـــ فرماتے ہیں ـــــ

"آپ کا یہ سوال بڑا اہم ہے کہ کیا ہماری رائے میں جماعت اسلامی فتنہ ہے، اور اگر ہے تو کیا دوسرے فتنوں کی سرکوبی ہو چکی ہے کہ ہم سب اسی کے پیچھے پڑ گئے ہیں ـــ اس سلسلے میں ہماری اولین گزارش تو یہ ہے کہ ہمارے نزدیک جماعت اسلامی بالقوہ (POTENTIALLY) یقیناً ایک فتنہ کی شکل اختیار کر چکی ہے اگرچہ فی الواقع (PRACTICALLY) کوئی بڑا اور موثر فتنہ برپا کرنے کی صلاحیت اس میں نہیں ہے۔" (ص ۱۰)

ظاہر ہے کہ فتنہ مٹایا جاتا ہے، اس کی اصلاح نہیں ہوا کرتی، ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اس "فتنہ" کو مٹانے کے لئے اٹھے ہیں اور جماعت اسلامی کی تباہی و بربادی اور مولانا مودودی کی بدنامی اور رسوائی ان کا مقصد نصب العین اور مطمح نظر ہے۔

اس پاکستان میں ان لوگوں سے جو جماعت سے کسی قسم کی وابستگی نہیں رکھتے مگر حق پسند اور انصاف دوست ہیں، ہم گزارش کرنا چاہتے ہیں کہ جماعت اسلامی نے کون سا ایسا غلط کام اور گناہ کبیرہ کیا ہے، جس کے سبب وہ "فتنہ" بن گئی ہے۔

کیا جماعت نے اسلام کے کسی بنیادی عقیدہ کو بدل دیا ہے ـــ کیا جماعت کی طرف سے کسی دینی رکن کی تنسیخ کا اعلان ہوا ہے ـــ کیا جماعت کسی منکر میں مبتلا ہو گئی ہے ـــ کیا جماعت امر بالمعروف کی بجائے امر بالمنکر کا فریضہ انجام دینے لگی ہے ـــ کیا جماعت حکومت یا سرمایہ داروں کے کسی ادارے کے ہاتھوں بک گئی ہے ـــ کیا جماعت کے متاثرین اور متفقین میں بے دینی کا رجحان پیدا ہو چلا ہے ـــ کیا جماعت اسلامی کا وجود پاکستان میں بد اخلاقی اور بے دینی کا سبب بنتا جا رہا ہے، جماعت کو "فتنہ" قرار دینے کے لئے کوئی دلیل؟ کوئی ثبوت؟

ڈاکٹر صاحب موصوف کی نگاہ میں جماعت اسلامی کے فتنہ کا سبب کیا ہے؟ وہ بھی سن لیجئے، اور ان کی ریسرچ کی داد دیجئے فرماتے ہیں :ـــ

"دین میں حکمت عملی کا جو نیا مقام اس نے تجویز کیا ہے، وہ اپنی فتنہ انگیزی میں دوسرے کسی فتنے سے کم نہیں۔"

اس دور کے بڑے بڑے فتنے یہ ہیں ـــ قادیانیت، انکار سنت، اباحیت و تجدد اور ... ـــ کمیونزم ـــ

دین کے نام پر شرک و بدعت کی ترویج ـ جماعت اسلامی جسے حکمت عملی کہتی ہے، اس کا ان فتنوں سے آخر کیا تعلق ہے؟ تشبیہ و تمثیل میں آخر کوئی وجہ شبہ اور سبب مماثلت بھی تو ہونا چاہئے، اب جہاں تک زبان و قلم کی جنبش کا تعلق ہے اسے ہر طرح اور ہر طرف موڑا جا سکتا ہے!

"دین میں حکمت عملی" ـــ آخر اس عنوان اور اس کے مضمرات میں کیا ایسی خرابی ہے جسے فتنہ قرار دیا جا رہا ہے، قیاس، استحسان اور مصالح مرسلہ اور اس قسم کی دوسری دینی اصطلاحات جو "حکمت عملی" سے مشابہ ہیں پہلے سے فقہ میں موجود ہیں! "جماعت اسلامی" نے کس معروف کو حکمت عملی کے تحت بدل دیا ہے اور کس "منکر" کو جائز قرار دے دیا ہے؟ دین کا کون سا رکن ہے جس کے بارے میں جماعت نے یہ کہا ہے کہ حکمت عملی کے تحت اس میں تغیر کیا جا سکتا ہے؟ اور دین کی کس قدر کو الٹ دیا ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے جماعت اسلامی کے اس دور کی، جو تقسیم ہند سے قبل تھا، اپنے مقالات میں خاصی تعریف کی ہے، مگر ڈاکٹر صاحب کے بقول جماعت کے اس "دور خیر و صلاح" میں کیا جماعت کے بعض ارکان نے علیحدگی اختیار نہیں فرمائی، ان کی علیحدگی

ہیں جماعت اسلامی کی زندگی میں پریس کانفرنسیں، استقبالیے، جلسے، جلوس، دستوری انتخابات کے لئے پروپیگنڈا، جمہوریت کی بحالی کے لئے دوسری پارٹیوں سے معاہدے، یہ تمام باتیں نظر آتی ہیں، مگر ان کے ساتھ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، معروف کی تبلیغ، منکر کے خلاف صدائے احتجاج، حلال و حرام میں امتیاز، خدمتِ خلق، بیت المال کے ایک ایک پیسے کا صحیح مصرف، لٹریچر کے ذریعہ دل و دماغ اور فکر و نظر کی دینی تربیت، یہ تمام خوبیاں بھی تو پائی جاتی ہیں! انتخابات میں دن کے دو بجے سے لے کر شام تک کا وقت بڑا نازک اور فیصلہ کن ہوتا ہے جماعت اسلامی کے کارکنوں نے ان نازک اوقات میں بھی فریضہ صلوٰۃ سے غفلت نہیں برتی بلکہ بہت سوں نے تو جماعت کے ساتھ ظہر اور عصر کی نمازیں پڑھی ہیں۔

مولانا مودودی نے "حکمتِ عملی" کے تحت جو کچھ کہا تھا، اس کے ثبوت کے لئے متحدہ ہندوستان کے حالات کا جائزہ لیا جا سکتا ہے انگریزی حکومت کو ہٹانے کے لئے مسلمان، ہندوؤں کے ساتھ ایک پلیٹ فارم پر آ گئے تھے اور مہاتما گاندھی کی قیادت کو قبول کر لیا تھا، خاص طور سے ۱۹۲۲ء سے لے کر ۱۹۳۰ء تک ہندوستان کی تمام تر سیاست گاندھی جی کی شخصیت کے اردگرد گھومتی تھی، یہ "حکمتِ عملی" ہی تھی جس کے سبب مسلمانوں نے ایک غیر مسلم کی قیادت کو قبول کر لیا! ایک زمانہ وہ تھا کہ متحدہ ہندوستان کے علماء نے "ترکِ موالات" کا فتویٰ دے کر انگریزی حکومت سے موالات کو ناجائز ٹھہرایا، مگر پھر "حکمتِ عملی" ہی کے تحت انگریز سے تعاون کیا گیا، مسلمان کونسلوں، اسمبلیوں میں گئے، اور انگریزوں سے جس "موالات" (COOPERATION) کو ناجائز قرار دیا گیا تھا حالات کے تحت "جواز" سے بدل دیا گیا۔

"حکمتِ عملی" کوئی گالی یا بے دینی کی بات یا کلمۂ کفر نہیں ہے جس کو ڈاکٹر صاحب جماعت کے لئے "فتنہ" کا سبب قرار دیتے ہیں، "حکمتِ عملی" دین کے کسی رکن یا عقیدہ کو نہیں بدلتی، اس کا تعلق حصولِ مقصد کے ذرائع سے ہے! اس میں حالات کے لحاظ سے تبدیلی کی جا سکتی ہے! ہو سکتا ہے کہ ایک ذریعہ یا تدبیر جس کو "ناجائز" قرار دیا گیا تھا حالات کی تبدیلی کی نوعیت کے اعتبار سے اس کے لئے وجہ جواز پیدا ہو جائے!

حالات ہی کا یہ تقاضا تھا کہ جماعت نے خاصی ناگواری اور شدید کراہت کے ساتھ صدارتی انتخاب میں ایک عورت کی تائید کی، جماعت نے صاف طور پر کہہ دیا کہ ناگزیر حالات میں یہ صورت گوارا کی جا رہی ہے اور آئندہ کے لئے اسے "مثال" ہرگز نہیں بنانا چاہئے، "فوز و فلاح" مرد ہی کے سربراہِ حکومت ہونے میں ہے جس طرح مرض کی شدت میں جان جانے کے خوف کے باعث طبیب کے مشورے سے "شراب" گوارا کی جا سکتی ہے، جماعت کے اس موقف کو بھی ایسا ہی سمجھنا چاہئے!

کسی مباح، جائز اور نیک مقصد کے لئے مسلمان تو پھر مسلمان ہیں، کسی غیر مسلم فرد یا جماعت سے بھی معاہدہ کر لینے کی اجازت ہے! جماعت اسلامی نے بھی جمہوریت کی بحالی کے لئے دوسری پارٹیوں کے ساتھ تعاون کیا ہے، اس معاملہ میں مذہب اور غیر مذہبیت کا سوال اٹھانا ہی سرے سے غلط ہے! اب رہا افراد اور جماعتوں پر اعتماد کا معاملہ تو کافروں پر بھی بعض معاملات میں اعتماد کیا جاتا ہے کافر یا مسلم اہلِ معاہدہ قول و قسم کھا کر اپنے عہد سے پھر جائیں تو اس میں قصور معاہدہ کرنے والوں کا نہیں ہے کہ دلوں کا حال اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا، حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے اہلِ کوفہ کے بھیجے ہوئے خطوط پر اعتبار کر کے ہی تو ان سے عراق کا رخ کیا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ لوگ اپنے عہد سے پھر گئے!

یہ جو ڈاکٹر اسرار احمد صاحب بار بار "جائزہ کمیٹی" کا ذکر کرتے ہیں اس بارے میں ہم برسبیل تذکرہ یہاں تک کہنے کے لئے تیار ہیں کہ جائزہ کمیٹی کے ارکان کے ساتھ فرض کر لیجئے زیادتی ہوئی ہے مگر اس زیادتی کو ضلالت اور فتنہ تو نہیں کہا جا سکتا! یہ تو

انصاف کی بات نہیں ہے کہ جائزہ کمیٹی کے ارکان کے ساتھ جو سلوک ہوا ہے، اُس کو بنیاد قرار دے کر جماعت اسلامی کے مٹانے اور اُس کے وجود کو فنا کرنے کے لئے تدبیریں کی جائیں، پھر "جائزہ کمیٹی" کے بعض ارکان نے جماعت سے علیحدہ ہو کر، جماعت کی جس انداز میں مخالفت کی ہے اس کے بارے میں کیا کہا جائے گا! امیر جماعت نے جس اندیشہ کے پیش نظر یہ انتظامی اقدام کیا تھا وہ اندیشہ کس حد تک صحیح نکلا! اس حقیقت کو بھی دنیا نے دیکھ لیا۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب لکھتے ہیں:-

"ہماری سدی تاریخ میں ایک مولانا مودودی کی شخصیت ہی اتنی مقدس رہ گئی ہے کہ ان کی انتہائی غلط اور مہلک ترین اقدامات پر بھی زبانِ تنقید دا نہ کی جا سکے۔"

تنقید و تنقیص میں فرق ہے، مثلاً مولانا مودودی نے جن مجددین دین کے کارناموں کا جائزہ لیا ہے اس جائزہ سے ہر، انہوں نے ان بزرگانِ دین سے ضلالت وغیرہ کہیں منسوب نہیں کیا، یہ نہیں کہا کہ یہ نفوس قدسیہ (معاذاللہ) گمراہ ہو گئے تھے: مولانا مودودی پر جو تنقید کی جا رہی ہے اس کا یہ انداز ہے کہ جیسے امت میں یہ شخص عمل وعقیدہ کا فساد پیدا کر رہا ہے جس کو ہم "فتنہ" سے تعبیر کرتے ہیں۔ دراصل علم کی مدافعت کی جاتی ہے! اس ظلم وزیادتی، بغض وعداوت اور تعصب ودشمنی کو حلال کر رکھا ہے کہ مولانا مودودی کو "داعیٔ قادیان" سے تشبیہ دی جاتی ہے، ڈاکٹر صاحب کے اس مضمون میں اُن کا قسمِ حق وانصاف کے اس خون سے رنگین ہو گیا ہے: انہوں نے اپنے اس مقالہ میں بعض ایسی باتیں لکھی ہیں، جیسے اس زمانہ میں جب وہ یہ مضمون لکھ رہے تھے، خوفِ خدا اور آخرت کی باز پرس کا اندیشہ اُن کے دل سے رخصت ہو گیا تھا، اُن کا قلم اب کسی اخلاقی حدود کا پابند نہیں رہا ——— "مرکز کے سرد مہری" اس قسم کی رعونت اور ابہام سے اندازہ ہوتا ہے کہ عدل وانصاف اور اخلاق وشرافت کی بساط کو دریا برد کرنے کے بعد انہوں نے ماہنامہ "میثاق" کے دورِ جدید کا آغاز کیا ہے!

واقعات و حقائق جماعتِ اسلامی نے پاکستان میں قادیانیت، انکارِ حدیث، نادہنیت اور تجدد ومغرب زدگی اور قسم کے تمام فتنوں کی روک تھام کے لئے اپنی امکانی حد تک جدوجہد کی ہے، رقص وسرود کی نظریت کے خلاف مہم نے موثر احتجاج کیا ہے، جس کے نتیجہ میں بعض مقامات پر حکومت نے بدتمیزی ترک بھی کیا ہے، سینما مسلمانوں کے معاشرے میں بدتمیزی نہیں سمجھا جاتا مگر جماعت اسلامی نے بعض قصبوں اور شہروں میں سینما ہالوں کی تعمیر کے خلاف بھی قدم اٹھایا ہے، مخلوط تعلیم فتنہ ہے، رقص وسرود کی لعنت، نائٹ کلبوں جیسا یا خاندانی منصوبہ بندی، جماعت نے "ہر منکر" کے خلاف بھرپور ٹکے کی چوٹ مہم کیا ہے۔

جماعت کا لٹریچر جو ہزاروں صفحات پر مشتمل ہے اُس کے مطالعہ نے ہزاروں نوجوانوں کی زندگیوں میں دینی انقلاب پیدا کیا ہے، جماعت کی مرتب کی ہوئی کتابوں نے اسلام کی ہر قدر اور نظریہ کو چاہے وہ تعدد ازدواج اور جہاد ہی کا نظریہ، دستور ہو، معذرت خواہانہ نہیں بلکہ انداز میں سرافتخار بلند کر کے پیش کیا گیا ہے، جماعت دراصل اسلامی افکار کا مستقل دبستان ہے جماعت کی کتابیں دورِ حاضر کے ذہن وفکر کو اپنے طرزِ استدلال اور حسنِ بیان کے سبب خاصی متاثر کی ہیں، نظامِ اسلامی کو برپا کرنے کی آج جہاں جہاں سے بھی آواز بلند ہے وہ جماعتِ اسلامی کے پیغام کی صدائے بازگشت ہے۔

جماعتِ اسلامی نے شعبہ خدمتِ خلق کے ذریعہ ضرورت مندوں اور نادار لوگوں کی مدد کی ہے، جماعت کے کردار کو دیکھ لو یہ ہر دورِ حکومت میں بے لوث رہا ہے، عوام اس پر اعتماد کرتے ہیں اور یہ بات زبانِ زدِ خاص وعام ہے کہ جماعتِ اسلامی

کے کارکنوں کو کوئی لالچ نہ تو رام کر سکتا ہے اور نہ کوئی دباؤ جھکا سکتا ہے ۔ جماعت کے افراد کا کردار ، اسلام کا اچھا تعارف ہوا

جماعتِ اسلامی کو حق گوئی کے جرم میں بڑی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے ۔ اور اس نے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور اس کے دین کو غالب کرنے کے لئے بڑی قربانیاں دی ہیں ، عوام میں یہ بات مشہور ہے کہ جماعتِ اسلامی کے کسی فرد کو بھی کسی قیمت پر خریدا نہیں جا سکتا !

جماعتِ اسلامی کا نام اور ذکر آتے ہی ذہن و فکر میں اسلامی نظام ، اسلامی دستور اور اسلامی طرز حیات کے تصورات ابھرتے ہیں جماعتِ اسلامی کو کمزور کر دینے کے یہی معنی ہیں کہ " اسلامی نظام حکومت " کے محاذ کو کمزور کر دیا جائے ۔

جماعتِ اسلامی سے وابستگی آدمی کو دین سے قریب کرتی ہے ، سیاسی مسائل میں جماعت کو حصہ لیتے دیکھ کر ، بعض لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ یہ بھی سیاسی پارٹیوں کی طرح کوئی پارٹی ہے ، حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہے وہ نہ تو سیاست بے دین کی قائل ہے اور نہ دین بے سیاست کی ! جماعت کے نزدیک " الدین " ایک جامع کلمہ ہے جس میں سیاست بھی شامل ہے ۔ حکومت کو جماعت ، اقامتِ دین کا موثر ذریعہ سمجھتی ہے ! حدود اللہ کی حفاظت اور ان کا اجراء حکومت ہی کے ذریعہ ہوتا ہے ۔

جماعت اسلامی کے کارکنوں کی سیرت و کردار میں دینی اخلاق ، اخلاص اور اسلام کو غالب کرنے کی امنگ پائی جاتی ہے ! اخلاق و اعمال کے حسن و کمال کی کوئی انتہا نہیں ہے ، مگر اس دور انحطاط میں جماعت کے کارکنوں کی زندگیاں دینی اعتبار سے بسا غنیمت ہیں جنہیں دیکھ کر بہت کر اور تجربہ کر کے کوئی شخص اسلام کے بارے میں بدگمان نہیں ہو سکتا !

جماعت اسلامی فرشتوں کی نہیں انسانوں کی جماعت ہے اور انسانوں میں کمزوریاں اور کوتاہیاں بھی ہوتی ہیں مگر مجموعی طور پر جماعت اسلامی میں خیر کا غلبہ ہے اور اس جماعت کے ذریعہ خیر ہی پھیل رہا ہے اور دینی اقدار ہی کو فروغ ہو رہا ہے ! جو کوئی اس جماعت کے درپے آزار ہے اُسے قیامت کے دن اپنے اس فعل کا اللہ تعالیٰ کو جواب دینا ہوگا ۔

جماعتِ اسلامی میں اہل ایمان اپنی شخصیتوں کی حفاظت اور نمود کے لئے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے دین کو غالب کرنے کے لئے شامل ہوتے ہیں ، اس راہ میں مٹ جانا تو ان کی سب سے بڑی کامیابی اور عین تمنا ہے ' اس لئے وہ قصور وار الزامات سے لے کر خانقاہوں تک کی یلغار اور حملوں سے ہراساں نہیں ہوتے ، ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اور ان کے اعوان و انصار بھی ان حق پسند مظلوموں کے سینوں کو چھلنی کر کے اپنا کلیجہ ٹھنڈا کر لیں ! اس اپنے مزعومہ " فتنہ " کو مٹانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا لیں ! کون کہہ سکتا ہے کہ مستقبل میں اسی کشمکش کا انجام کیا ہوگا ــــــ مگر جماعت اسلامی کسی خوف ، لالچ ، دباؤ ، دھمکی اور سختی سے متاثر ہو کر اقامت دین کے مشن سے دستبردار نہیں ہو سکتی ، وہ اس شدید ابتلاء میں اپنے اللہ تعالیٰ ہی کے حضور اپنا دکھ درد پیش کرتی ــــــ اور زبانِ حال سے کہتی ہے ۔

به جرم عشق توام می کشند غوغائیست
تو نیز بر سر بام آکه خوش تماشائیست

کبیر رشید درسی

۲۴ فروری ۱۹۷۰ء

حکیم گلمیں کرنالی

فاران کی تنقید پر تنقید

دسمبر کے فاران میں جناب حکیم گلمیں کرنالی کی کتاب آدابِ اُردو پر جو تبصرہ کیا گیا تھا اُس کے جواب میں حکیم صاحب موصوف نے جو تنقیدی مقالہ ارسال فرمایا ہے اُسے ہم اُن کے شکریہ کے ساتھ درج ذیل کرتے ہیں!

حکیم صاحب کے ہر اعتراض کے بعد ہی ہم نے اپنا جواب بھی درج کر دیا ہے تاکہ ساتھ کے ساتھ بات واضح ہوتی چلی جائے!

کس کی تنقید کا کیا وزن ہے اس کا فیصلہ ہم اربابِ ذوق پر چھوڑتے ہیں۔ (م۔ ن)

"آدابِ اُردو" پر آپ کی تنقید کے بعض پہلو کتمانِ حقیقت اور عدم غور و فکر کے حامل ہیں مثلاً :—

(۱) اس کتاب کے چند ابواب — تلفظ کا معیار۔ اُردو جمع۔ تلفظ کی غلطیاں۔ مخلوط ترکیبیں۔ روزمرہ محاورہ۔ کہاوتیں۔ "ہمیں"۔ مذکر و مونث بعض لفظوں کی نئی تحقیق۔ صلاح سازی۔ حالانکہ یہ ابواب نہیں، ابواب کی ذیلی سُرخیاں ہیں۔ ابواب کے تو نمبر دیتے گئے ہیں، ایک سے نو تک۔

فاران — گلمیں صاحب نے اپنی کتاب میں "ابواب" پر صرف نمبر لگا دیئے ہیں، اُن کے نام نہیں لکھے، اُن نمبروں کے تحت ذیلی ابواب یا اُن کے فرمانے کے مطابق "سُرخیاں" درج کردی ہیں، اگر ان "سرخیوں" کو ہم نے ابواب کہہ دیا، تو خدا کے لئے بتائیے کتاب پر اور مصنف پر اس سے کیا حرف آگیا؟ اعتراض میں وزن ہونا چاہئے —

(۲) "مگر ان کے ذوقِ شعر میں پختگی ہمیں نظر آتی کہ دبیر اور انیس کے ان مصرعوں میں —

سر فرمایا میں حسین علیہ السلام ہوں (دبیر) سر مولا نے سر جھکا کے کہا میں حسین ہوں (انیس) انہیں دبیر کا مصرع بہتر معلوم ہوتا ہے۔ حالانکہ نہ علامہ شبلی بلکہ تمام اربابِ ذوق کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ انیس کے مصرع یا پورے شعر کے مقابلے میں دبیر کا مصرع یا شعر انتہائی پست ہے۔ انیس کا یہ شعر —

یہ تو نہیں کہا کہ سُتہ مشرقین ہوں　　مولا نے سر جھکا کے کہا میں حسین ہوں

شاعری کی معراج ہے۔" یہاں آپ نے ہمارے اعتراض کی تمام عبارت حذف کردی، شاید اپنے اعتراض کو صحیح ثابت کرنے کے لئے، جو ایک قسم کا کتمانِ حق ہے جس کی توقع آپ جیسے فاضل متدین متشرع جسے اللہ نے حج کی سعادت سے بھی نوازا ہے ہرگز نہیں ہو سکتی! ہم نے لکھا ہے —

"ان میں دبیر کا مصرع بہتر ہے۔ کیا یہ بات قابلِ غور ہے کہ علیہ السلام اپنے لئے حسین نے خود استعمال نہیں کیا جیسا کہ مولانا نے سمجھا ہے، بلکہ انہوں نے تو یہ کہا "میں حسین ہوں" مگر شاعر نے احتراماً یا وزن پورا کرنے کے لئے علیہ السلام لکھ دیا۔ یعنی یہاں علیہ السلام ایک قسم کا نقل قول ہے مصرع یوں لکھا جائے گا کہ فرمایا "حسین (علیہ السلام) ہوں۔ انیس کے مصرع میں سر جھکا کے بھی درست نہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ "میں حسین ہوں" فرمانے کی کیا بات تھی؟ اگر خود کو علیہ السلام کہتے تو شرط

کی بات تھی، کیونکہ انسان اپنی تعریف کرتے ہوئے شرم محسوس کرتا ہے۔"

اب غور فرمائیے! انیس کے ہاں " مولانا نے جو کاٹ کے مشتبہات ہیں ۔ دبیر کا مصرع " فرمایا میں حسین علیہ السلام ہوں " بہت بلیغ ہے۔ انیس کا پورا شعر بلاغت کے بالکل خلاف ہے کوئی معقول آدمی اپنے لئے ایسے تعریفی الفاظ کہنا پسند نہیں کر سکتا۔ پھر حسین جو خود ہی شرمندہ ہیں دیکھو کیسے کہہ سکتے تھے ؟ حقیقت یہ ہے کہ اس شعر میں معنویت تو بہت ناقص ہے مگر چونکہ روانی، صفائی اور نغمگی ہے اس لئے آپ قلم زد کرنے سے الجھ گئے۔

"فاران" ۔۔۔ راقم الحروف نے کتمانِ حقیقت کو کبھی پسند نہیں کیا۔ کسی مصنف کے قول پر اعتراض کیا جاتا ہے تو اس کی توجیہ و تشریح کے ذیل میں لکھی ہوئی پوری کی پوری عبارتیں اگر نقل کی جائیں تو ایک کتاب کی تنقید کے لئے دسیوں صفحے بھی ناکافی ثابت ہوں گے۔ ہاں ایسی عبارت کو حذف نہیں کرنا چاہئے جس کے نقل نہ کرنے سے مصنف کا موقف کمزور ہوتا ہو یا اس کا اصل منشا دھندلا ہو کر رہ جائے۔ مثلاً قادیانیت کی تردید کرتے ہوئے ہم نے لکھا تھا کہ " مرزا غلام احمد قادیانی نے تو یہ نہیں کہا کہ میں ختم نبوت کے عقیدہ کا منکر ہوں، مگر اس کی دوسری تفسیریں اور اقوال و اعمال سے ختم نبوت کی پوری طرح نفی ہوتی ہے ۔۔۔ قادیانیوں کے آرگن ماہنامہ " الفرقان " (ربوہ) نے ہمارے مقالہ کا پہلا جز نقل کر کے ہماری شکست کا اعلان کر دیا لیکن دوسرا جملہ کہ جس سے عبارت کا مدعا واضح ہوتا ہے اور جو اس بحث کا مرکزی نقطہ ہے دانستہ نقل نہیں کیا۔

یہ ہے " کتمانِ حقیقت " کی صحیح مثال یعنی جس عبارت کے حذف کر دینے سے لکھنے والے کا مفہوم و منشا ہی بالکل الٹ ہو جاتا ہے۔ گلچیں صاحب کی توجیہ کے حذف کر دینے سے ان کا مفہوم و منشا مجروح نہیں ہوتا !

گلچیں صاحب کی توجیہ و تشریح نقل نہ کر کے ہم نے ان کی سخن فہمی کا پردہ رکھ لیا تھا ۔ اب جو توجیہ ارباب ذوق کے سامنے آ رہی ہے اُسے پڑھ کر صاحب موصوف کی سخن فہمی کے بارے میں لوگ شاید اچھی رائے قائم نہیں کریں گے۔

جناب گلچیں صاحب نے دبیر کے شعر کی عجیب و غریب توجیہ کی ہے :۔

" ان میں دبیر کا مصرع بہتر ہے۔ کیونکہ یہ بات قابلِ غور ہے کہ علیہ السلام اپنے لئے حسین نے خود استعمال نہیں کیا، جیسا کہ مولانا نے شبلی نے سمجھا ہے۔ بلکہ انہوں نے صرف یہ کہا کہ " میں حسین ہوں " مگر شاعر نے احتراماً یا وزن پورا کرنے کے لئے " علیہ السلام " کہہ دیا۔ یعنی یہاں " علیہ السلام " ایک قسم کا نقل قول ہے، مصرع یوں لکھا جائے گا۔

فرمایا میں حسین (علیہ السلام) ہوں

مرزا دبیر کے اس مصرع (فرمایا میں حسین علیہ السلام ہوں) کو پڑھ کر کسی شخص کا ذہن اس طرف کیا منتقل ہو سکتا ہے کہ بات تو صرف اتنی تھی کہ " میں حسین ہوں " علیہ السلام تو شاعر نے احتراماً اور وزن پورا کرنے کے لئے بڑھا دیا ہے ! کیا اس طرح مصرع لکھنے کا اُردو یا فارسی میں رواج ہے ۔۔۔

" فرمایا میں حسین (علیہ السلام) ہوں "

اور اس طرز املا سے یہ مفہوم لینا چاہتے کہ جو الفاظ قوسین میں ہیں وہ شاعر نے احتراماً یا وزن پورا کرنے کے لئے بڑھا دئیے ہیں کہنے والے کے اصل الفاظ وہی ہیں جو قوسین سے باہر ہیں۔ سخن فہمی کا آخر کیا ٹھکانہ ہے ! حالانکہ مصرع اوقاف و اعراب " PUNCTUATIONS " کی پابندی کے ساتھ یوں لکھا جائے گا ۔۔۔

فرمایا ۔ " میں حسین علیہ السلام ہوں "

فرمایا کے بعد جو الفاظ ہیں کہے گئے ہیں وہ شاعر کے نہیں، کہنے والے کے ہیں !

میر انیس کے شعر میں معنویت ناقص نہیں ہر اعتبار سے مکمل ہے اور یہ شعر بلاغت کے اصول پر پورا اترتا ہے اس شعر کی روانی، صفائی اور نغمگی تو خود نقص نا قدر کو تسلیم ہے جس پر انہوں نے قلم زد کر کے اپنی بات کی پچ کے لئے چوٹ کی ہے !۔۔۔۔ یہ تو نہیں کہا کہ " خورشید مشرقین ہوں " یہ الفاظ تو شاعر کے ہیں امام حسین کے نہیں ہیں پھر اس پر یہ اعتراض کیوں کہ " کوئی معقول آدمی اپنے لئے ایسے تعریفی الفاظ کہنا پسند نہیں کرتا " ! اس شعر میں بھی تو کمال بلکہ ث اعجاز ہے

کہ شاعر نے پہلے مصرع میں حضرت حسین کے مرتبہ کی رفعت و عظمت کا اس خوبی سے اظہار کیا ہے کہ وجدان وجد کرنے لگتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ حسین جو عرش مشرقین ہیں وہ اپنا تعارف ان واضح لفظوں میں کرانے کی بجائے عزت و انکسار کے انداز میں "بس" میں حسین ہوں" کہہ کر رہ گئے۔

"سر جھکانے" پر حکیم صاحب نے جو اعتراض وارد کیا ہے وہ بھی درست نہیں ہے۔ "نور اللغات جلد سوم" میرے سامنے ہے اس کے صفحہ ۲۲۰ پر سر جھکانا کے یہ معنی لکھے ہیں:——

"سر نیچا کرنا —— سجدہ کرنا —— انکسار کرنا۔ شرم یا غیرت سے گردن نیچی کرنا"

تو اس مصرع میں "شرم" کی بجائے غیرت و انکسار کے معنی لئے جائیں گے۔

"مہمان نے سر جھکا کے کہا میں حسین ہوں"

اس مصرع میں تاثرات کا ایک طوفان شاعر نے بند کر دیا۔ "سر جھکا کے" اگر حذف کر دیا جائے تو شعر کا بہت کچھ لطف غارت ہو جائے گا۔ اس شعر میں حضرت حسین علیہ السلام کے مرتبہ کی رفعت کے ساتھ ان کی مظلومیت اور بیکسی کا جس خوبی سے اظہار کیا گیا ہے وہ درحقیقت شاعری کی معراج ہے۔ اس واقعہ کو ایک مثال کے ذریعہ سمجھئے۔ ایک بادشاہ جس کا "فیروز" نام ہے سوئے اتفاق سے غلاموں کے جنگل میں پھنس جاتا ہے۔ ایک غلام بادشاہ سے پوچھتا ہے کہ تم کون ہو؟ اس واقعہ کو ایک افسانہ نگار ان لفظوں میں لکھتا ہے——

"غلام کے دریافت کرنے پر شہنشاہ کو وہ احساس کیا تڑپانے لگا تھا کہ تم تو میرے گھر کے ٹکڑوں پر پلے ہوئے ہو، بادشاہ کا غلام اور بیچنے غلام ہو، میں تو تاج و تخت کا مالک شہنشاہ وقت اور تمہارا آقا ہوں —— مگر اس عالم بے کسی میں شہنشاہ کی زبان سے یہ نکلا:۔

"میں فیروز ہوں"

اور یہ کہتے ہوئے اُس کا سر جھک گیا——"

میر انیس کے اس شعر کے بارے میں دو رائیں ہو ہی نہیں سکتیں، ہر اہل ذوق اس شعر کو عظیم ہی کہے گا، مگر گھمبیر صاحب کی خوش ذوقی (؟) کا یہ عالم ہے کہ اتنا اچھا شعر انہیں ناپسند ہے۔

"ناظلما" پڑھنے والے انصاف کریں کہ بتائیں کہ گھمبیر صاحب کی جس عبارت کو ہم نے حذف کر دیا تھا جس پر انہوں نے "کتمان حقیقت" کی طنز فرمائی ہے اس کو گھمبیر صاحب نے نقل کر کے اپنے موقف کی وضاحت کی یا اُسے اور کمزور کر دیا۔

(۳) ہم نے لکھا ہے کہ دبیر کا مصرع واضح بھی ہے اور چست بھی۔ انیس کا مصرع بیانیہ کے ذہن میں ہے اس لئے روانی کم ہے اور واضح بھی نہیں، پتہ نہیں چلتا کہ شاعر کہنا کیا اور کسے سنانا چاہتا ہے؟ —— اس تمام عبارت کو حذف کر کے آپ نے لکھا ہے "دیکھا میں رہتا" تو زبان ہی نہیں" اس طرح اُردو میں کون بولتا ہے کہ "میں نے دیکھا دیکھی رہتا" یا "میں کل رات دریا میں رہتا تھا" حالانکہ بول چال اور شعر کی زبان میں بڑا فرق ہوتا ہے اگر کوئی شعر بول چال کی زبان میں ہو جاتا ہے تو اسے "سہل ممتنع" کہتے ہیں اور ضروری نہیں کہ ہر شعر سہل ممتنع ہو۔

"ناداں" —— گھمبیر صاحب کی جو توجیہ راقم الحروف نے حذف کر دی تھی اس کو صاحب موصوف نے درج کر کے کیا فائدہ حاصل کیا؟ بیشک بول چال کی زبان اور شعر کی زبان بالکل ایک سی نہیں ہوتی، مگر شعر میں جب بھی ثقیل اور نامانوس الفاظ آتے ہیں ان پر بھی اعتراض وارد کیا جاتا ہے کہ یہ روزمرہ اور عام بول چال کی "زبان" نہیں ہے کوئی شاعر یوں کہے:۔

"نکلا نہ کوئی لفظ بھی میری لسان سے"

تو "لسان" پر اعتراض کیا جائے گا کہ "لسان" اردو اور روزمرہ نہیں ہے، شاعر کو لسان کی بجائے "زبان" لانا تھا۔ ٹھیک اسی طرح کا اعتراض مرزا دبیر کے

واساتذہ نے واحد بھی نظم کیا ہے، سراج الدین شاہ ظفر کا شعر ہے۔

ہجوم اشک سے مژگاں اگر اونچی نہیں ہوتی
تعجب کیا کہ شاخ پر ثمر اونچی نہیں ہوتی

یعنی یہ کب کہا تھا کہ شعر کے تیور زنانہ یا مردانہ ہونے چاہئیں، یہ تو گلیپی صاحب نے شعر کی خوبی بتائی ہے کہ دبیر کے مصرع کے تیور بھی مردانہ ہیں!

(۵) علامہ شبلی پر گلیپی صاحب کا یہ اعتراض کہ انیس و دبیر کے کلام کا مقابلہ کرنے میں دقت نظر سے کام نہیں لیا، یا لیا نہیں جا سکا، اہل ذوق اور ارباب نظر کے نزدیک کوئی وزن نہیں رکھتا! شبلی کو شعر کی جیسی پرکھ تھی ایسی پرکھ تو دنیا کے شاید چند ناقدین کو نصیب ہوئی ہوگی۔

جواب:- یہ اہل ذوق اور اہل نظر کی غلط وکالت ہے اور (ب) یہ تو انتہائی خوش عقیدگی ہے کہ شبلی جیسی شعر کی پرکھ دنیا کے اور دو بھی مشاہد ہے — اور وہ بھی چند ہی کو نصیب ہوئی ہوگی۔ علامہ تاجور نجیب آبادی کہتے ہیں کہ :-

"علامہ شبلی کو وہ اظہار محاسن اشمار معائب میں تنقید کی حدود کا خیال نہیں رکھ سکتے تھے۔ کسی کے محاسن بیان کرتے ہوئے اپنے تاثر۔ شمار معائب میں اپنی بیزاری کو چھپا نہیں سکتے ؛ اور یہ شبلی اور آزاد استدلال کی بجائے اکثر جذبات کی آمیزش سے کام لیتے ہیں عقل اپنے ناقد کو اپنی قوت استدلال کے ساتھ ہمنوا بناتا چلا جاتا ہے اور آزاد و شبلی اس کے جذبات سے اپیل کر کے اسے ہمنوا بنانے کی سعی کرتے ہیں"

فاران :- علامہ تاجور نجیب آبادی کو اپنے ذوق اور فہم کے مطابق ہر ناقد اور مضمون نگار کے بارے میں نقد و جرح کا حق حاصل ہے، مگر علامہ شبلی نعمانی کا ذوق شعری ارباب ذوق اور اہل نظر کی غالب اکثریت کے نزدیک مسلم ہے اشعر فہمی کے معاملہ میں وہ تنہا اپنی ذات سے پوری ایک امت کے برابر ہیں!

(۶) "مولانا آزاد نے چار جگہ سنکھیا کا املا صحیح لکھا ہے۔ یہ چیز قواعد سے کہیں بڑھ کر ذوق و وجدان سے تعلق رکھتی ہے، وہ شخص بے ذوق ہے جو سنکھیا کو جملہ کی کسی حالت میں بھی سنکھیے لکھتا اور بولتا ہے۔ مثلاً یوں تو بولتے اور لکھتے ہیں کہ "پنکھا خراب ہوگیا" اور پنکھے کی قیمت سو روپے ہے، لیکن یوں نہیں بولیں گے کہ انگھے کی قیمت دو روپے ہے، انگیا جملے کی ہر حالت میں انگیا ہی لکھا اور بولا جائے گا۔ باڈی پیچ کی رنگت سرخ ہے۔ اس کا قیاس سنکھیا پر نہیں کیا جا سکتا ہے"

جواب :- آپ نے سنکھیا، پنکھا، ڈبیا، انگیا سب کو یکساں اوزان کے استعمال کو ذوق و وجدان کی چیز سمجھ لیا ہے، حالانکہ یہ استعمال کی چیز ہے جس کے خلاف استعمال کرنا غلط ہوتا ہے۔ ڈبیا، انگیا کا الف ہر حال میں قائم رہتا ہے جیسے ڈبیا کو، انگیا کو وغیرہ میں، اگر سنکھیا کو پنکھ کو غلط، سنکھیے کو پنکھے کو صحیح ہوگا۔ مگر یہ بھی خیال رہے کہ سنکھیا ایک طبی نام ہے جسے طبیب ہی صحیح استعمال کر سکتے ہیں اور اطبا کا یہی استعمال ہے جو میں نے لکھا ہے۔ کسی دلی یا لکھنؤ کے طبیب سے دریافت کریں یا کسی طبی کتاب میں دیکھ لیں، سنکھیے کا تیل، سنکھیے کی گولی ملے گا۔ یہی حال "سانڈے کے تیل" کا ہے، ایک طبی اصطلاح پر آپ کا ایک طبیب سے الجھنا ہرگز معتبر نہیں کہا جا سکتا، آپ سے بہت پہلے حکیم حبیب اشعر دہلوی تبصرہ کر چکے ہیں جو خالص اہل زبان ہیں چونکہ وہ سنکھیے کے استعمال سے واقف ہیں اس لئے انہوں نے بھی ایسا اعتراض نہیں کیا جیسا آپ نے دھر گھسیٹا، اور یہ بھی نہیں سوچا کہ معترض بھی ایک اہل زبان اور طبیب ہے۔

"فاران" — یہ عجیب و غریب انکشاف ہوا کہ اردو زبان میں "فن طب" کی گرامر، عام قواعد سے مختلف ہے — کیا دور کی کوڑی لائے ہیں، حکیم صاحب! اس میں طبیب سے الجھنے اور جھگڑنے کی کیا بات ہے، راقم الحروف نے تو آپ کی تحریر سے یہی سمجھا تھا کہ آپ اردو زبان و ادب پر ایک ادیب و ناقد کی حیثیت سے گفتگو فرما رہے ہیں، آپ کو مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریر پر گرفت کرتے وقت اس کا اظہار کر دینا چاہیے تھا کہ اطبا ایسے موقعوں پر "سنکھیے" بولتے ہیں! اگر اطبا واقعی "سنکھیے" بولتے ہیں تو ہم اس غلطی میں ان کی تقلید نہیں کر سکتے، زبان و ادب کے مسائل میں طبیبوں کی مخصوص زبان اور اصطلاحات کے ہم پابند نہیں ہیں! اطبا کی جو باتیں ماننے کے قابل ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اردو میں "غلیظ" میلے اور نجس کو کہتے ہیں مگر اطبا "غلیظ" گاڑھے کے معنی میں بولتے ہیں اور عربی کے اصل معنی کو برقرار رکھتے ہیں! "سانڈے" کی مثال گلیپی صاحب بالکل غلط دی ہے جس طرح "کونڈا" سے "کونڈے" اور دو میں بولتے ہیں اس طرح "سانڈا" سے سانڈے بنا لیا گیا ہے۔ اور یہ مروج ہے! مگر "سنکھیا" سے "سنکھیے" اردو زبان نہیں ہے!

حکیم حبیب اشعر دہلوی نے اس کتاب پر تبصرہ فرمایا ہے اور اس لفظ (سنکھیہ) کی گرفت نہیں کی ہو سکتا ہے انہوں نے گلچیں صاحب کی پوری کتاب ملاحظہ لفظاً نہ پڑھی ہو، اور وہ بھی اگر طبیب کی حیثیت سے "سنکھیہ" ہی پڑھتے ہیں تو گلچیں اور اشعر کو ہم اس لفظ کی حد تک ایک ہی درجہ کا آدمی سمجھتے ہیں۔

یہ مضمون لکھا جا رہا تھا کہ خیال آیا کہ کسی فاضل طبیب سے اس کی تصدیق بھی کر لی جائے، چنانچہ راقم الحروف دواخانہ ناظمی میں پہونچا جہاں حکیم نصیرالدین ندوی مطب بھی فرماتے ہیں اور اس دواخانہ کے مالک بھی ہیں، موصوف اجمیر شریف کے رہنے والے ہیں، کئی سال ندوۃ العلماء لکھنؤ میں عربی ادب کی تعلیم پائی ہے اور وہاں سے فراغت پانے کے بعد طبیہ کالج دہلی میں طب کی اعلیٰ سند حاصل کی — راجستھان میں اجمیر، جے پور، ادے پور، ٹونک وغیرہ ریاست کی زبان دہلی کی زبان سے ملتی جلتی ہے، پھر حکیم صاحب موصوف نے لکھنؤ اور دہلی کے لکھے پڑھے طبقوں میں بہت وقت گزارا ہے، اُن سے دریافت کیا تو موصوف نے چھوٹتے ہی کہا کہ اطبا "سنکھیا" بولتے اور لکھتے ہیں "سنکھیہ" ہم نے نہیں سنا۔ میں نے عرض کیا کہ اردو کی کوئی کتاب فن طب میں ہو، تو اسے مزید تصدیق کے لئے دیکھ لیا جائے! حسن اتفاق کہ حکیم محمد کبیرالدین صاحب کی تصنیف "کلیات ادویہ" مل گئی، حکیم صاحب موصوف نے شیخ الرئیس بو علی سینا کی طب کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ فرما کر طب اور علم و ادب کی دنیا میں غیر معمولی شہرت حاصل کی ہے وہ برسوں جامعہ طبیہ دہلی کے پرنسپل (شیخ الجامعہ) رہے ہیں!

کتاب مذکورہ بالا کے صفحہ ۵۷۷ کی یہ عبارت:—

"سنکھیا کو مدبر کرنے ..... یہ ہے کہ چونے کی راکھ کے مقطر پانی میں سنکھیا جوش کر ڈال دیں ...."

● اور اسی صفحہ کے ذیل میں درج ہے:—

"اگر سنکھیا کا سیال بنانا منظور ہو، تو اس سفوف کو چینی کی رکابی میں رکھ کر رکابی کو شبنم میں رکھ دیں ...."

گلچیں صاحب نے اطبا کی زبان و اصطلاح کی جو دلیل دی تھی وہ بھی بے اصل ثابت ہوئی۔

(۴) "اردو میں عام طور پر کترن وہ چھوٹا کاغذ یا کپڑے کا ٹکڑا جو کترنے سے بیکار نکلے کو کہتے ہیں، کٹنگ کے معنی میں تراشے کے مقابلہ میں کترن کہنا بلکہ اسے بہتر سمجھنا بڑی بے ذوقی ہے:"

جواب:— اور تراشہ اس کو کہتے ہیں جو کسی چیز کو تراشنے کے بعد بیکار نکلے جیسے "قلم کا تراشہ"! آخر کترن اور تراشے میں کیا فرق رہا —— ؟ دونوں بیکار چیزوں کے نام ہیں۔ "کترن" لطیف اور بدل نہیں سکتا تھا "شین" بھاری اور بدل کر "تراس" بھی بن سکتا ہے!

"ف طن" —— اگر گلچیں صاحب کی طرح ہم بھی اُن پر اعتراض جڑ دیں کہ انہوں نے ہماری تنقید کی پوری عبارت نہ لکھ کر "کتمانِ حقیقت" کیا ہے، تو وہ اس کا کیا جواب دیں گے؟ لیکن ہم ان پر اس طرح کے لغو اعتراض وارد کرنے اور الزام لگانے کی غلطی نہیں کر سکتے —— ہمارا اعتراض:—

"گلچیں صاحب نے "تقابلی" مطالعہ کے عنوان سے انگریزی اور اردو کی بعض مترادف اصطلاحیں درج فرما کر بتایا ہے کہ ان میں کون اصطلاح بہتر ہے مثلاً ان کی رائے میں:—

"کترن، کٹنگ اور تراشے سے بہتر ہے" (حالانکہ) اردو میں عام طور پر کترن، وہ چھوٹا کاغذ یا کپڑے کا ٹکڑا، جو کترنے سے بیکار نکلے (نور اللغات جلد سوم) کو کہتے ہیں، اس لئے کٹنگ کے معنی میں "تراشے" کے مقابلہ میں "کترن" کہنا بلکہ اسے بہتر سمجھنا بڑی بے ذوقی ہے کوئی یوں بولے ——

"میں فلاں مضمون کی کترن آپ کو بھیج رہا ہوں اس سے استفادہ کیجئے اور پھر مجھے واپس بھیج دیجئے"

تو اہل ذوق "کترن" سن کر ہنسی کو مشکل ہی سے ضبط کر سکیں گے۔"

اس کے بعد ارباب ذوق سے ہم گذارش کرتے ہیں کہ گلچیں صاحب نے ہمارے اعتراض کا جو جواب دیا ہے، اس میں کیا کوئی جان اور معقولیت پائی جاتی ہے؟
سوال یہ ہے کہ اردو میں کٹنگ کے معنی میں "تراشہ" عام طور پر رائج ہے تو اس میں گلچیں صاحب کو کیا قباحت نظر آئی، جو "تراشہ" کے مقابلہ میں "کترن" کو

۵
آزمودہ دواؤں کا مرکب
انالجین
سر درد۔ کمر کا درد۔ دانت کا درد
ایام۔ انفلوئنزا اور ہر قسم کے دوسرے درد کے لئے
یقینی زود اثر اور بے ضرر علاج ہے
Opal

یہ دین، اپنی اس حیثیت کے ساتھ ایک ایسا دین نہیں ہے جو محض ایک تجریدی اور وجدانی عقیدہ بھی ہو اور جسے حیات انسانی کے متنوع اور مختلف کاموں سے کوئی سروکار نہ ہو ——— اگر یہ بات مان بھی لیں کہ کوئی دین ایسا بھی ہو سکتا ہے جو محض ایک عقیدہ اور وجدان ہو اور جسے انسان کی عملی زندگی سے کوئی سروکار نہ ہو اور نہ وہ پوجا پاٹ کے چند رسوم پر مشتمل ہو جنہیں مسلمان انفرادی طور پر یا اجتماعی طور پر ادا کرتے ہوں اور وہ صفت اسلام سے موصوف ہو جاتے ہوں اور ... یہ دین ایسا کوئی طریقہ ہے کہ جو وصول الی الآخرت کا راستہ ہے اور عالم آخرت میں جنت الفردوس تک پہنچاتا ہے جبکہ اس کے بالمقابل یہاں کوئی اور ایسے نظام حیات یا نظام ہائے حیات ایسے بھی موجود ہیں جو کرۂ ارض پر جنت کو بسائے کا مالا تے ہیں یا زندگی کے ایسے طریقے بھی موجود ہیں جو اس دین اور اس کے اجتماعی نظم کے علاوہ ہیں ؟

یہ دین اپنی اس خصوصیت اور اس مفہوم میں اس قدر واضح ہے اور اس کی یہ حیثیت اس قدر مستحکم و قوی ہے کہ کوئی ایسی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی جو اسے محض ایک وجدانی عقیدے کی شکل میں پیش کرے اور انسانی زندگی کے حقیقی موقف سے اس کا کوئی تعلق نہ ہے، زندگی کے موجودہ نظم و ربط سے اس کا کوئی ربط نہ ہو اور نہ زندگی کی مربوط اور فعال مشینری سے اس کا کوئی رابطہ ہو۔ ایسی کوئی کوشش کامیاب ہو سکتی ہے جو اسے محض ایک ایسے عقیدے کی شکل میں پیش کرے جس کے صلے میں آخرت میں جنت نصیب ہو اور وہ صرف اس عقیدے کے مطابق چند عبادتیں اور مذہبی رسومات ادا کر دیں اور اپنی حقیقی اور عملی زندگی میں اس کے قوانین اور اس کے وضع کردہ طور طریقے اور زندگی کی اجتماعی تشکیل کا کوئی خیال نہ رکھیں حالانکہ یہ دین ایک منفرد وزن اور ایک مخصوص نظام رکھتا ہے۔ دنیا میں بہت سے مذاہب ہیں جن کا خیال ہے کہ وہ "دین" ہیں، حالانکہ "الدین" جو پوری زندگی کو محیط ہے وہ صرف اسلام ہے

ہمیں اس بات کا علم ہے کہ صدیوں سے اسلام کو محض ایک وجدانی عقیدہ اور مذہبی رسوم و عبادات کے دائرے کے اندر بند کرنے کے لئے زبردست کوششیں ہو رہی ہیں تاکہ اسے اجتماعی زندگی کے حقیقی نظام ہائے حیات میں دخل دینے سے روک دیا جائے اور انسانی زندگی کی عملی تنظیم اور سرگرمیوں پر اسے جو وسیع کنٹرول حاصل ہے اسے ختم کر دیا جائے۔ جبکہ اس دین کا مزاج ہے اور یہی اس کی حقیقت ہے اور یہی اس کا وظیفہ مطلوب ہے۔

معاندین اسلام نے اس کی کوشش کی کہ اسلام کو محض ظاہری رسوم تک محدود کر دیا جائے تاکہ اجتماعی معاملات میں وہ دخل انداز نہ کر سکے۔ اور زندگی کی اجتماعی حرکت پر اسلام کا تسلط باقی نہ رہے۔ یہ کوشش جب کامیاب ہو گئیں اور لادینیت کے عظیم لیڈر اتاترک کے ہاتھوں اس منصوبہ کی تکمیل ہوئی۔ نظام خلافت کو ختم کر دیا گیا! دین کو حکومت سے علیحدہ کر دیا گیا اور ترکی کو ایک خالص لادینی مملکت قرار دے دیا گیا اس کے بعد اسلامی دنیا کے ان ممالک میں جو استعمار اور صیہونیت کے قبضے میں آ چکے تھے، مسلسل یہ کوشش کی گئی کہ اسلامی شریعت واحد ماخذ قانون نہ رہے اور اس کے ساتھ ساتھ دوسرے قوانین سے بدل دی جائے! ان اقدامات کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی شریعت موجودہ محدود دائرے کے اندر بند ہو کر رہ گئی؟

ترکی کے اس عظیم ... ؟ اور نمائی زبردست کامیابی کے بعد لادینیت نے دوسرا اور آخری قدم یہ اٹھایا کہ عالم اسلام سے ——— یا صحیح الفاظ میں اس سرزمین سے جو کبھی عالم اسلام تھا ——— اس دین کی جڑیں ہی اکھاڑ کر پھینک دی جائیں اور عقائد و نظریات کے میدان سے بھی اسے نکال دیا جائے اور اس کی جگہ ایسے تصورات اور ایسے عقائد پھیلائے جائیں جو لوگوں کو زندگی کا ایک نیا تصور، ایک نیا مفہوم دیں اور نئے اقدار وجود میں آئیں اور اسلامی عقائد و نظریات کے خلاف ... اور عقیدہ کہنا کہ جیسا کہ ... ایک عقیدہ کہلاتا ہے۔

ان اقدامات کے ساتھ ساتھ پورے کرۂ ارض پر چن چن کر اسلام پسند عناصر کو ختم کیا گیا۔ انہیں سخت مصائب میں مبتلا کیا گیا، مشرق و مغرب کے تمام متحارب بلاک، جو مشرق سے لے کر مغرب تک کسی ایک بات پر بھی متفق نہ ہو سکتے تھے، اس کام میں شریک ہوئے یہ تمام بلاک مرزح اسلامی انقلاب سے برابر خوف زدہ رہے! جو زندگی اور کائنات کے حقائق اور حالات کے مزاج کا لازمی نتیجہ معلوم ہوتا تھا کیونکہ انسانیت کی جو صورت حال تھی اس کا لازمی تقاضا یہ تھا کہ مختلف مقامات سے اسلامی رد عمل رونما ہو۔

لیکن ہم یہ بھی جانتے ہیں دین اسلام ایک بڑی حقیقت ہے: وہ ایک بڑی طاقت ہے! اس کی گہری جڑیں ہیں! یہ تمام کوششیں بھی اسے جڑ سے

یہ دین دنیا میں آیا ہی اس لئے ہے کہ انسان کے گلے سے انسان کی غلامی کا جوا اتار دے اور جس جس شکل میں انسان کی غلامی موجود ہے اُسے ختم کر دے اور اللہ وحدہٗ کی غلامی اور بندگی کو قائم کر دے جس طرح اس وسیع و عریض کائنات میں اللہ وحدہٗ کی غلامی جاری ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ "افغیر دین اللہ یبغون ولہ اسلم من فی السمٰوٰت والارض طوعاً وکرہاً والیہ ترجعون" "کیا یہ لوگ اللہ کی اطاعت کا دین چھوڑ کر کوئی اور طریقہ چاہتے ہیں حالانکہ آسمان و زمین کی ساری چیزیں چار و ناچار اسی کی تابع فرمان ہیں اور اسی کی طرف سب کو پلٹنا ہے" (۳ : ۸۳)

بایں ہمہ کہ اسلامی نظام حیات، جس کے سرچشمے اس دین سے پھوٹتے ہیں، کوئی ایسا تاریخی نظام نہیں ہے جو تاریخ کے ادوار میں سے کسی دور سے مخصوص ہو اور نہ وہ کوئی ایسا مثالی طریق زندگی ہے جو انسانی آبادی کے ایک مخصوص حصے کے مصالح و منافع کا تحفظ کرتا ہے، اور نہ وہ خاص معاشرے تک محدود ہے بلکہ وہ ایک ایسا ٹھوس نظام زندگی ہے جو انسان کی متجدد اور متنوع زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے تاکہ یہ انسانی زندگی اس محور کے گرد ہی گھومتی رہے جسے اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے منتخب کیا ہے اسی دائرے، وسعت کے اندر — جس کے اندر اللہ تعالیٰ اسے محدود کرنا چاہتا ہے، اس نظام کے تحت، وجود پذیر زندگی اس طرح بلند ترین صورت میں نمودار ہو کہ انسان کا یہ شرف محفوظ رہے کہ وہ اللہ کے سوا کسی کی غلامی کی لعنت میں مبتلا نہیں ہے۔

یہ طریق زندگی متجدد انسانیت کے بالمقابل درحقیقت ایک کائناتی سچائی ہے جو دوسرے ناقابل تغیر کائناتی اصولوں کی طرح اپنی جگہ قائم ہے۔ یہ اصول جو ابتدائے آفرینش سے اس کائنات پر متصرف رہے ہیں جو آج بھی ہیں اور کل بھی رہیں گے۔ ان اٹل اصولوں کی خلاف ورزی کی جرات جب بھی انسان نے کی ہے اور وہ ان سے ٹکرایا ہے تو انہوں نے زبردست شکست دی ہے اور بے پناہ رنج و الم سے دوچار ہونا پڑا ہے۔

انسان اگر اپنی پوری زندگی اللہ کے اس نظام حیات کے مطابق بسر کرتے ہیں تو انہیں مسلمان کہا جائے گا اگر وہ اس نظام حیات کے سوا کسی دوسرے نظام حیات کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں تو وہ جاہلیت میں مبتلا ہیں، جس کی کوئی گنجائش اس دین میں نہیں ہے بلکہ دین آیا ہی اس لئے ہے کہ اس جاہلیت کا استیصال کرے اور اسے سرے سے بدل کر رکھ دے اور لوگوں کو غیر اللہ کی بندگی سے نکال کر اللہ کی غلامی میں داخل کرنے کا مقصد عظیم لیا ہے!

پھر یہ کہ انسان اگر اپنی مکمل زندگی اس نظام حیات کے مطابق بسر کرتے ہیں تو ان کی زندگی اس کائنات کے ابدی اصولوں سے ہم آہنگ ہے، ان کی زندگی اور اس کائنات کی فطرت میں توافق پایا جاتا ہے۔ بلکہ خود ان کی اپنی فطرت سے بھی توافق ہوگا۔ اور اگر وہ کسی دوسرے کے تجویز کردہ نظام زندگی کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں تو درحقیقت وہ کائنات کے اٹل حقائق سے برسرپیکار ہیں، وہ اس عالم وجود کی فطرت سے لڑ رہے ہیں بلکہ وہ خود اپنی فطرت سے ٹکرا رہے ہیں؛ کیونکہ ان کا وجود بھی اس کائنات کا ایک حصہ ہے، اور یہ ایک تصادم ..... کے ... تباہ کن نتائج جلد یا بدیر لامحالہ آ جائیں گے۔ جیسا کہ ہم اس سے قبل کہہ چکے ہیں کہ اب لوگوں کا رجوع اللہ کی طرف ہوتا ہے اور وہ اللہ کے ....

لہ تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو میری کتاب "معالم فی الطریق" کا باب "ایک کائناتی شریعت" (معالم فی الطریق کا یہ باب بھی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب امیر جماعت اسلامی پاکستان کی کتاب مبادی الاسلام پر مبنی ہے جیسا کہ خود مصنف نے اس کا حوالہ دیا ہے کہ تفصیلات کے لئے مبادی الاسلام کی طرف رجوع کیا جائے۔

(مترجم)

تجویز کردہ نظام حیات کی طرف پلٹ رہے ہیں اسے یہ کہ روشن مستقبل اب یقیناً اس دین کا ہے ۔

اسے ہمیں یقین ہے کہ اس دین کو اپنے حقیقی مقام سے ہٹانے کی جو کوششیں کی گئی ہیں یا کی جانے والی ہیں وہ تمام کی تمام بری طرح ناکام ہوں گی ! اس ناکامی اور نامرادی کے آثار ظاہر ہو رہے ہیں، اس کا حقیقی مقام کیا ہے ؟ یہ کہ وہ انسان کی واقعی زندگی آئے۔ اس تمام عملی اور شعوری شعبوں میں، ایک نظام حیات ہے ۔

کیونکہ ایک طرف ہو کر گوشہ نشینی اختیار کر لینا اس دین کے مزاج کے خلاف ہے جیسا کہ کوئی نظام حیات بھی واقعی زندگی سے کبھی بے تعلق نہیں رہا کرتا ۔ !

محمد حسام اللہ شریفی

نظامِ تعلیم ـــ تاثرات

علم و عقل ہی انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کا سبب اصلی ہے۔ نوعِ انسانی کے جدِ بزرگوار جناب آدم علیہ السلام کی جن وانس اور ملائکہ پر فضیلت اور برتری کا سبب قرآنِ حکیم نے " علّم آدم الاسماء " کے الفاظ مقدس میں بیان کیا ہے اور اسی کی بنا پر ہمہ مسجود ملائک قرار پائے ـــ نبی امی جناب خاتم النبیین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر اولین وحی الٰہی بھی " اقرأ باسم ربک .... الذی علّم بالقلم ـــ علّم الانسان ما لم یعلم " کے بابرکت الفاظ ہی نازل ہوئی اور پھر آپ نے اپنی ساری زندگی تعلیم و تعلّم ہی میں بسر کی اور زندگی کا کوئی گوشہ بھی ایسا نہ تھا جس کے متعلق آپ کی تعلیمات میں واضح ہدایات موجود نہ ہوں۔

مذاہبِ عالم میں محض آپ کی تعلیمات ہی اس درجہ مکمل طور پر رہبری سے چہرۂ انسانی زندگی کا احاطہ کرتی ہے اور حیاتِ انسانی کا کوئی پہلو بھی تشنۂ نظر نہیں آتا۔ اس میں دوسرے مذاہب کی تعلیمات کی طرح محض چند عبادات اور رسوم کے بیان ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ حقوق کے لئے تو اس میں ایک ضابطہ موجود ہے اگر ان کی حقوق نظر انداز کردیئے گئے ہوں ـــ اس میں اگر حقوق اللہ کی عدم ادائیگی پر مواخذہ کیا گیا ہے تو انسانی حقوق کی پامالی پر اس سے کہیں زیادہ گرفت موجود ہے۔ غرض تعلیماتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہر پہلو کامل اور مکمل ہیں اور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم سے تعلق رکھنے والے، فرد کو علم و دانش کی تحصیل پر برانگیختہ کرتی ہیں۔

گفت حکمت را خدا خیرِ کثیر
ہر کجا ایں خیر را بینی بگیر

پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ اسلام میں دیگر الفاظ دیگر تعلیمات نبوت میں تعلیم جیسے بنیادی مسئلے کو نظر انداز کردیا جاتا اور اس معاملے میں کسی قسم کی رہنمائی نہ کی جاتی۔ اسلام چونکہ انسانی زندگی کے تمام گوشوں کو محیط ہے اس لئے وہ تعلیم اور مذہب میں علیحدگی کے تصور کی ہرگز ہرگز حمایت نہیں کرتا بلکہ اس کی نظر میں وہ تعلیم ہی معاشرہ کے لئے سود مند ہو سکتی ہے جس پر مذہب کا سایہ ہو اور اگر یہ سایہ اٹھ جائے تو پھر وہی تعلیم معاشرے کو ایک نہ ختم ہونے والے اور طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا کردیتی ہے۔ آج ہمارے معاشرے میں ہر طرف جو فکری انتشار برپا ہے اس کی وجہ محض یہی ہے کہ ہم نے اسلام کے نظریۂ تعلیم سے بے رخی اختیار کرکے " سیکولرزم " کے نظریۂ تعلیم کو اپنانے کی کوشش کی ہے جس کے مطابق مذہب اور تعلیم کا یکجا ہونا امرِ محال ہے حالانکہ امریکہ کا ممتاز ماہرِ تعلیم (ALFRED NORTH WHITEHEAD) اپنی ممتاز تصنیف (AIMS OF EDUCATION) میں اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ " تعلیم کی روح مذہبی ہونی چاہئے .... مذہبی تعلیم ہی وہ تعلیم ہے جو انسان میں احساسِ فرض اور تقدس پیدا کرتی ہے (ص ۳۸) اور اگر تعلیم پر سے مذہب کی نگرانی ختم کردی جائے تو ممتاز فرانسیسی مستشرق ڈاکٹر گستاؤلی بان کی رائے کے مطابق جو نتیجہ نکلتا ہے وہ ان کی بے مہر تصنیف " تمدنِ ہند " میں بے اعتقادی کی پراگندگی کے ساتھ (ہندوستانی) بالعموم ایک افسوسناک نتیجہ یورپی تعلیم کا برا اثر یہ ہے کہ اس میں اخلاقی

پاکیزگی کے متعلق لاپرواہی آگئی۔ مذہب کی جس بنیاد پر اس کے چال چلن کا دارومدار تھا وہ اس درجہ منہدم ہو گیا ہے کہ اب اس کے پھر سے درست ہونے کی امید نہیں ہے، وہ اپنے آباؤ اجداد کے اعتقادات کھو بیٹھا ہے۔ (تمدن ہند صفحہ ۴۴۹)

تعلیم سے مذہب کی بیگانگی، خدا جانے کتنی صدیوں میں انسانیت کی قدریں بدل جاتی ہیں، اخلاقیات کے پیمانے تبدیل ہو جاتے ہیں اور اسی بنا پر ڈاکٹر گستاؤلی بان ایسے تعلیم یافتہ اصحاب کو مصنوعی قوم کا فرد شمار کرتا ہے اور کہتا ہے "وہ تعلیم جس کو ہم زمانہ حال میں تمام بیماریوں کا علاج سمجھے ہوئے ہیں جب بلا رعایت مشرقیوں کے دماغ کو دی جاتی ہے تو کیسے برے نتائج اس سے ظہور میں آتے ہیں (کتاب مذکور صفحہ ۴۶۶) اور اسی سلسلے میں مزید گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر لی بان یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ "یورپی تعلیم سے جو اخلاقی ضعف باہم منتج ہوا ہے وہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ اس کی میزان عقل بالکلیہ ڈانواں ڈول ہو گئی ہے۔ (تمدن ہند۔ صفحہ ۴۴۸)

اسلام نے روز اول ہی اُدخلوا فی السلم کافۃ کے ذریعے اپنے متبعین کو حکم دیا کہ وہ اپنی زندگی کے شعبہ ہائے مختلفہ کو اسلام کے رنگ میں رنگ لیں۔ ان کا قول و عمل اسلام کی ترجمانی کرتا ہو، فکر و نظر پر بھی اسلام کی چھاپ نمایاں ہو۔ ان کی تعلیم بھی اسی حقیقت کا اظہار کرتی ہو کہ وہ ملت مسلمہ کے قلب و ذہن کو مسلم بنانے میں اپنا کردار کس حد تک ادا کر رہا ہے اور ان کے نظام تعلیم میں بھی یہی روح کارفرما ہو۔

انگریزی نظام تعلیم سے پہلے برصغیر میں مسلمانوں کا جو نظام تعلیم رائج تھا سید سلیمان ندوی اسی کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں "سب سے پچھلا نظام تعلیم کتنا ہی برا سہی لیکن یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس کے سامنے ایک مقصد تھا اور وہ مذہب کی خدمت اور اس کے ذریعہ سے علوم و فنون کی تحصیل تھا۔" (مسلمانوں کی آئندہ تعلیم۔ صفحہ ۹۰) حتیٰ کہ ڈبلیو۔ ڈبلیو۔ ہنٹر جیسا متعصب انگریز بھی اپنی مشہور زمانہ تصنیف (OUR INDIAN MUSALMANS) میں اس امر کا اعتراف کرتا ہے کہ "وہ نظام تعلیم اعلیٰ سے اعلیٰ دماغی تعلیم و تربیت کا اہل تھا .... مسلمان اس طریقہ تعلیم سے اعلیٰ قابلیت اور دنیاوی برتری حاصل کرتے۔ (صفحہ ۲۵۹) اور اپنے نظام تعلیم کا ذکر وہ ان الفاظ میں کرتا ہے "ہمارا طریق تعلیم مسلمانوں کی روایت کے بالکل خلاف اور ان کی ضروریات کے بالکل غیر مطابق ہے بلکہ ان کے مذہب کی تحقیر کرتا ہے (صفحہ ۲۵۰) اور اسی سلسلے میں معروف برطانوی مفکر تعلیم لارڈ میکالے اپنی رسوائے زمانہ رپورٹ میں یوں کہتا ہے کہ "ہم انہیں اس تعلیم سے محروم کر رہے ہیں جسے حاصل کرنے کے وہ شدید طور پر آرزومند ہیں، وہ ان بے مغز چیز نظام تعلیم سے مستفید کرتے ہیں جس سے انہیں گھن آتی ہے (میکالے کا نظریہ تعلیم۔ صفحہ ۰۰) اور اس کا مقصد وہ ان الفاظ میں بیان کرتا ہے "اس نظام تعلیم کے ذریعے ہمیں ایک ایسا طبقہ وجود میں لانا ہے جو خون اور رنگ کے اعتبار سے ہندوستانی ہو مگر ذوق، طرز فکر، اخلاق اور فہم و فراست کے نقطہ نظر سے انگریز۔ (میکالے کا نظریہ تعلیم۔ صفحہ ۹۰) مغربی نظام تعلیم کو رائج کرتے وقت انگریزوں کے سامنے جو مقصد تھا اس میں ان کی کامیابی سے انکار کی جرأت کیسے کی جا سکتی ہے؟ انہیں خود تو یہاں سے رخصت ہونا پڑا مگر اپنے بعد وہ ایک ایسی قوم کو اپنا جانشین بنا گئے جو اس سرزمین پر رہتے ہوئے بھی ہر حالت میں فکری طور پر انہیں سے وابستہ رہنا پسند کرتی ہے اور اسی لئے اکبر مرحوم کو کہنا پڑا تھا۔

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

اس سے بڑا ظلم اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس نظام تعلیم نے پوری قوم کی زندگی کو بے مقصد بنا دیا اور دنیا میں ایک ایسی قوم کی تخلیق کی جس کے سامنے زندگی کا کوئی مقصد نہیں۔ ایسا اس قوم کے ساتھ ہوا جو دنیا کی تاریخ میں سب سے اعلیٰ مقصد حیات رکھتی تھی اور سب سے زیادہ فعال زندگی بسر کرتی تھی اور اس کا نظام تعلیم بھی اسی مقصد کے گرد گھومتا تھا اور اب یہ حالت ہے کہ

سرود و ساز زندگی رفت از گلش
آن کہن آتش فسرد اندر دلش

مولانا محمد مصطفےٰ علی گڑھ

اللہ نور السمٰوٰت والارض مثل نورہ

کمشکوٰۃ فیہا مصباح المصباح فی زجاجۃ الزجاجۃ کانہا کوکب دری یوقد من شجرۃ مبارکۃ زیتونۃ لا شرقیۃ ولا غربیۃ یکاد زیتہا یضیٓء ولو لم تمسسہ نار نور علیٰ نور یہدی اللہ لنورہ من یشآء ویضرب اللہ الامثال للناس واللہ بکل شیء علیم

(ترجمہ) اللہ آسمانوں اور زمین کے لئے باعث نور ہے اس کے نور کی مثال اس طرح ہے کہ ایک طاق ہے جس میں چراغ ہے، وہ چراغ ایک فانوس (زجاجی) میں ہے جو گویا ایک بہت روشن ستارہ ہے، چراغ ایک کثیر المنافع درخت زیتون سے جو نہ مشرقی شئی ہے اور نہ مغرب میں روشن کیا جاتا ہے اس کا روغن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آگ بھی نہ چھوئے تو بھڑک اٹھے گا، نور علیٰ نور ہے، اللہ راہ دیتا ہے اپنے نور کی جانب جس کو چاہتا ہے اور مثالیں لوگوں کے لئے بیان کرتا ہے اور اللہ ہر چیز سے خوب واقف ہے۔

اس نورانی آیت میں بتایا گیا ہے کہ دلائل ایمان و معرفت اور آیات بینات نہایت ظاہر و باہر ہیں۔ تاہم ہدایت مشیت الٰہی پر مبنی ہے۔

نور اپنی ذات پر ظاہر اور اپنے غیر کا مظہر ہوتا ہے اور وجود و عدم سے وہی نسبت رکھتا ہے جو ظہور خفاء سے چونکہ تمام عالم امکان پر حضرت واجب الوجود فیضان نور وجود ہے اس لئے فرمایا اللہ نور السمٰوٰت والارض اور ضمناً یہ بھی معلوم ہوا کہ یہی سماوات کو کواکب و سیارات سے زمین کو انبیاء و رسل و علماء اور اولیاء و صالحین سے اور قلوب مومنین کو انوار ایمان و طاعات و اخلاق و معارف سے منور کرنے والا ہے اور اللہ چونکہ سبب ہدایت ہوتا ہے اس لئے ہادی مطلق بھی وہی ہے۔

سرورِ عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جناب باری میں جو دعا کی ہے کہ اے میرے اللہ میرے سامنے میں، بالوں میں، پوست گوشت پوست میں نور پیدا کیجئے اور آخر میں یہ بھی ہے کہ واجعلنی نوراً یعنی مجھے مجسم نور مجسم ہدایت بنا دیجئے۔

مولانا فرماتے ہیں سے

نور جاناں گر نبود سے راہبر | میں چگونہ پیش و پس دارم خبر
نور او درمین و لیثر تحت و فوق | بر سر و بر گردنم مانند طوق

رفع اشتباہ - بعض کا جو یہ زعم ہے کہ اللہ کی حقیقت نور ہے وہ قطعاً باطل ہے کیونکہ مثل نورہ میں نور کو اس کی ذات پاک کی طرف مضاف کیا ہے ۔
اور اضافت دلیل ہے تغایر کی اور نور السموات والارض میں نور کا اس پر اطلاق اس طرح ہوا ہے جس طرح کہتے ہیں زیدٌ عدلٌ و خالدٌ جودٌ ۔
بال اس آیت کو وحدۃ الوجود سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ نور الٰہی مادہ سموات وارض نہیں بلکہ موجد بالذات ہے ورنہ مادہ متعدد ہے، پھر ماننا تسلیم کرنے میں کئی محذور لازم
آتے ہیں ۔ ۱- اس کا تجزیہ ہوتا ہے اور بوجہ ترکیب کے وہ قدیم، اور واجب الوجود نہیں رہتا ۔ ۲- علت بالذات ہونے کی وجہ سے فاعل بالاختیار بھی نہیں
رہتا ۔ ۳- تمام کائنات کی قدامت لازم آتی ہے، حالانکہ اس کے حدوث کے دلائل بے شمار ہیں ۔
بجز آیت میں خود وحدت الوجود کی نفی ہے، فرمایا یہدی اللّٰہ لنورہٖ من یشاء یعنی جس کو چاہتا ہے ہدایت بخشتا ہے جس کا مفہوم مخالف
یہ ہوا کہ وہ ترک دکاہے اور اس کا غیر کوئی ہدایت یافتہ ہے اور کوئی گمراہ، اور وحدت الوجود میں یہ بات کہاں !
اب اس تمہید کو جو آیات بینات پر بھی صادق آتا ہے (قد جاءکم من اللّٰہ نور) اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی (یا ایہا
النبی ارسلنٰک ... سراجاً منیرا) اور قلب مومنین کے لئے ایمان و ایقان و عرفان پر بھی (افمن شرح اللّٰہ صدرہ للاسلام فہو علی نور من ربہ) تمثیل
کے پیرایہ میں بیان فرمایا ہے تاکہ غور و فکر کرنے والوں کو مثال سے ممثل لہ کے خواص و اوصاف زیادہ سے زیادہ واضح اور زیادہ ذہن نشین ہو جائیں اور فکر کی
صحیح تربیت اور علمی صلاحیتوں سے بھرپور تلذذ بھی حاصل ہو ۔
خلاصہ تمثیل یہ ہے :- کہ ہدایت ربانی کی اس ظہور میں بمنزلہ اس مشکوٰۃ کے ہے جو موصوف بایں صفات ہونے کی وجہ سے نہایت درجہ روشن ہے ،
آفتاب سے تعبیر یوں نہیں کی گئی کہ وہ روشنی تو وسط ظلمت میں جلوہ نما ہوتی ہے ، اور تفصیل اس کی یہ ہے کہ یہ طاق جو ایک طرف سے بند ہے جب اس میں چراغ
روشن ہوگا تو شعاعوں کے اجتماع کی وجہ سے بہت زیادہ پرنور ہو جائے گا خصوصاً جب کہ وہ چراغ بھی ایسی قندیل زجاجی میں رکھا گیا ہو جو کسی چمکدار روشن ستارہ کی طرح
تاباں و درخشاں ہے تو ظاہر ہے کہ شعاعوں کا انعکاس اس کی روشنی میں اور چار چاند لگا دے گا اس پر طرفہ تر یہ کہ وہ روغن بھی جو اس میں صرف کیا جاتا ہے ۔
زیتون کا ہے جو اشراق و صفائی میں ایک خاص شان رکھتا ہے اور وہ زیتون بھی ایسا ویسا نہیں بلکہ آفتاب کے مقابل رہنے کی وجہ سے زیادہ پختہ اور اس لئے
زیادہ مصفی ہے، حتیٰ کہ دیکھنے والے کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بغیر آگ کے ہی وہ آپ روشن ہوا جاتا ہے اسی کثرت و شدت و نورانیت کو "نور علیٰ نور" فرمایا ہے ۔
بعض مشائخ کا قول ہے کہ وہ مشکوٰۃ تو سینہ ہے اور قندیل قلب ہے اور وہ چراغ معرفت الٰہی ہے، اور شجرہ مبارکہ، عبادات و اعمال شرعیہ
و لاشرقیہ اس اعتبار سے کہ وہ روحانی ہے، اور یکاد زیتہا یضیٔ ولو لم تمسسہ نار اشارہ ہے کہ اسرار شرائع و احکام پر شدت اطلاع کی استعداد
پر اور اسی قسم الحروف عرض پرداز ہے کہ شجرہ مبارکہ کو کلمہ طیبہ سے اگر تاویل کریں تو یہ بھی ایک وجہ وجیہ ہے ۔
(کلمۃ طیبۃ کشجرۃ طیبۃ اصلہا ثابت وفرعہا فی السماء)
اور بعض حکمائے اسلام نے کہا کہ یہ تمثیل ہے قوائے مدرکہ کی کیونکہ وہ اللہ میں ظہور موجودات کے لئے، اور توضیح اس کی یہ ہے کہ وہ مشکوٰۃ قوت
حسیہ ہے، اور وہ مصباح قوت عقلیہ ہے جو حقائق کلیہ کی مدرک اور روشن گر ہے، اور وہ قندیل زجاجی قوت خیالیہ ہے کیونکہ زجاج جو فی الاصل جوہر
کثیف ہے جب صاف و شفاف ہو جاتا ہے تو چراغ کی روشنی کے لئے حجاب نہیں بنتا بلکہ اس کے اشراق میں اور ممد و معاون ہو جاتا ہے اسی طرح خیال اگرچہ
عالم سفلی کی خوبو رکھتا ہے اس لئے کہ ہر شی متخیل شکل و حیز رکھتی ہے لیکن بایں ہمہ جب خیال صاف و لطیف و مہذب ہو جاتا ہے تو اس نکھار کے بعد قوائی
عقلیہ کا ہم سنگ ہو جاتا ہے اور بجائے حائل انوار ہونے کے حامل انوار ہو جاتا ہے اور وہ شجرۃ کثیرۃ المنافع وکثیرۃ الثمرات قوت فکریہ ہے جو مقدمات کو
نہایت ترتیب سے کر امور مجہولہ کا استخراج و استعلام کرتی ہے کیونکہ جس طرح شجرہ نافعہ، شاخ در شاخ ہوتا ہے اور ہر شاخ کے نتائج یعنی ثمرات
ہوتے ہیں، اسی طرح یہ قوت بھی ماہیات کے گوناگوں شعبے رکھتی ہوئی آن کے نتائج تک پہونچتی ہے اور یہی اس کے ثمرات ہیں، اور یکاد زیتہا یضیٔ ولو لم
تمسسہ نار بیان ہے شدت استعداد کا جو کمال قوت ایمانیہ کو حاصل ہے علوم الٰہیہ کے اکتساب کے لئے کہ جس طرح وہ روغن زیتون مصفی بغیر آگ کے

ہی گویا روشن ہوا چاہتا ہے اور آگ نے مس بھی نہ کیا ہو تو نور علیٰ نور بن جاتا ہے، اسی طرح ایمان کامل جو بذات خود ایک نور ہے جب اس سے جذبۂ تعمیل احکام الٰہی کی آگ منضم ہو جاتی ہے تو عزم عمل کے شعلہ کے ساتھ نار مس نہ کرا سے لطیف سے الطف بنا دیتی ہے یعنی نور علیٰ نور اور اسے ایک مقام پر فراز تر پہنچا دیتی ہے جس کو ناسوتی بھی لطیف نفس پایا ہے ؟

یہاں یہ نکتہ بھی پیش نظر ہے کہ جس طرح مصباح کا ظرف قندیل اور قندیل کا ظرف مشکوٰۃ ہے اسی طرح عقل کا مقدمہ خیال اور خیال کا مقدمہ قوت حساسہ ہے۔

یہدی اللہ لنورہ من یشاء اب اشارہ ہوتا ہے کہ دلائل تو واضح ہیں، آفاقی بھی انفسی بھی، لیکن ان سے ہدایت ہماری مشیت ہی سے وابستہ ہے جسے چاہتے ہیں اپنے نور کی جانب راہ دیتے ہیں، علم و عقل کافی نہیں، ورنہ تمام دنیا کے علما اور عقلا کا مسلک واحد ہوتا — کیونکہ حق واحد ہے حالانکہ ان میں اختلافات کثیر ہیں۔

ویضرب اللہ الامثال للناس چونکہ مضمون مذکورہ بالا تمثیل کے پیرایہ میں بیان کیا تھا اس لئے اعلان ہے کہ یہ اور نیز دیگر مثالیں ہم لوگوں کے فائدہ کے لئے بیان کرتے ہیں کہ وہ غور و فکر کریں اور مغز حق تک پہونچ کر حکمت علمی و عملی سے بہرہ مند ہوں۔ "للناس" سے معلوم ہوا کہ تمام انسانوں کو حق کی جانب دعوت دی گئی ہے خواہ وہ مومن ہوں یا کافر، صدیق ہوں یا زندیق اور کسی کو یہ وہم و گمان بھی نہ ہونا چاہئے کہ ان قرآنی ضرب الامثال میں کچھ خامی یا نقص ہے، کیونکہ ان کا بیان کرنے والا تو تمام خارجی و ذہنی، ظاہری و باطنی، امور کے حقائق، خواص، صفات مشترکہ وغیرہ سے بخوبی واقف ہے۔ اسی لئے جو کچھ ارشاد ہوتا ہے اس میں ادات تشبیہ و تمثیل کے ارکان میں پوری تطبیق کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔

سنہ اور مقام ہو تو آنکھ اسے ... کا رنگ اور آنکھ کا زبان اور ... کا جلد جانتا ہے۔ (مصطفیٰ)

ماہرالقادری

یادِ رفتگاں

واحد بخش قادری مرحوم

بدایوں میں ایک خاندان ہے، جس کے افراد "بخش" کہلاتے ہیں، "بخش" کوئی ذات قبیلہ یا قوم نہیں ہے، بلکہ تین پشتوں سے اس خاندان میں "بخش" ہر فرد کے نام کا جزو ہوتا ہے، مثلاً رحمان بخش، ستار بخش، عزیز بخش ـــــ! اس گھرانے کے لوگ تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ خوش حال بھی رہے ہیں!

بدایوں کے اس خاندان کے ایک رکن عزیز بخش بلند شہر میں مختار تھے، یہ اب سے ساٹھ ستر سال پہلے کی بات ہے! اس پیشہ میں انہوں نے بڑا نام پیدا کیا اور نام کے ساتھ دولت بھی! انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی مشتاق بخش کو ولایت بیرسٹری کی تعلیم کے لئے بھیجا، اس زمانہ میں بیرسٹری کے لئے غالباً میٹرک کی بھی قید نہ تھی انگریزی کے مڈل پاس انگلستان جاتے اور وہاں ابتدائی امتحان (LITTLE GO) میں کامیاب ہو کر بیرسٹری کی تعلیم حاصل کرتے اور دو تین سال میں بیرسٹری کی سند لے کر ہندوستان چلے آتے۔

مشتاق بخش مرحوم نے بھی اسی طرح بیرسٹری کی سند حاصل کی اور انگلستان سے واپس آکر علی گڑھ میں وکالت کا آغاز کیا، وہ بہت ذہین، خوش نصیب اور اقبال مند تھے، دو تین سال ہی میں ان کی پریکٹس خوب چمک گئی، اور ان کا شمار ضلع کے نامور وکلاء میں ہونے لگا، مسٹر اقبال احمد مرحوم، جو الٰہ آباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس رہے ہیں، مشتاق بخش مرحوم کے جونیئر وکیل اور ان کے تربیت یافتہ تھے! اس خاندان کے اکثر افراد بدایوں کے مشہور قادریہ خانوادے[1] سے سلسلۂ بیعت رکھتے تھے، اس لئے "قادری" کہلاتے تھے، مشتاق بخش آر، بی قادری (R. B. QADRI) کے نام سے مشہور تھے!

مشتاق بخش قادری کا شمار علی گڑھ ہی نہیں، یو، پی کے چوٹی کے وکیلوں میں شمار ہونے لگا انہوں نے ہزاروں روپیہ کی جائداد خریدی، علی گڑھ اور بدایوں میں شاندار کوٹھیاں بنوائیں۔ متحدہ ہندوستان میں ترک موالات کا جن دنوں زور شور تھا اُسی زمانہ کی بات ہے کہ قوم پرستوں نے انگریز دشمنی کے جوش میں "چورا چوری" پولیس اسٹیشن کو آگ لگا کر کتنے ہی سپاہیوں کو زندہ جلا دیا۔ چورا چوری کے اس مشہور مقدمہ کی پیروی سرکار کی طرف سے انہی قادری بیرسٹر نے کی جس میں انہیں ایک لاکھ روپیہ کے لگ بھگ محنتانہ ملا۔ اسی دوران میں ان کا انتقال ہو گیا، یہ ۱۹۲۳ء کی بات ہے میں ان دنوں

---

[1] مولانا فضل رسول بدایونی۔ وہابیت کی رد میں خاصی شہرت رکھتے تھے، انہوں نے توحید و سنت کے داعیوں کو بدنام کرنے میں پہل کی ان کے خلف مولانا عبدالقادر بدایونی تھے اور [illegible] کے صاحبزادے مولانا عبدالمقتدر اور مولانا عبدالقدیر بدایونی سے اس گھرانے کو خاص شہرت ہوئی۔ اب [illegible] سجادہ نشین ہیں، ہندوستان کے مشہور عالم و خطیب مولانا عبدالماجد بدایونی مرحوم کا بھی اسی خانوادے سے تعلق تھا۔ [illegible] اسی خاندان کے ایک فرد تھے، عالم دین، مسلم یونیورسٹی میں شعبہ دینیات کے لیکچرر رہے، عربی ادب میں استاذ کی حیثیت رکھتے تھے۔

نویں کلاس میں پڑھتا تھا مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہمارے کلاس میں قادری بیرسٹر کے انتقال کا خاصہ چرچا تھا ـــــ انہوں نے تین بیٹے چھوڑے، جواد بخش
ماجد بخش، واحد بخش ! ان سب کے ناموں کے ساتھ شروع ہی سے "قادری" لکھا جاتا تھا۔

۱۹۲۵ء میں راقم الحروف جب سب سے پہلے بدایوں گیا، تو مدرسہ قادریہ کے سامنے قادری منزل میں ان بھائیوں کو قریب سے دیکھا۔ پھر بدایوں میرا آنا جانا ہوتا رہا اور وہاں کئی کئی ہفتہ قیام کیا ! جواد بخش قادری میرے ہم عمر تھے، اُن سے خاصی بے تکلفی ہو گئی تھی، واحد بخش کی عمر بہت سے بہت گیارہ سال کی ہوگی، چھریرا بدن، متوسط قامت، کھلتا ہوا رنگ، اسدیدہ زیب ناک نقشہ ! مدرسہ قادریہ کے صحن میں ہم کرکٹ کھیلا کرتے تھے۔ اور وکٹوں کی بجائے کھٹولے یا چیئر کے بنے ہوئے بکس سے کام لیتے، واحد بخش اس کم سنی میں خاصی تیز بولنگ کرتے اور کسی بیٹسمین کو مشکل ہی سے جمنے دیتے۔

حیدرآباد دکن جانے کے بعد میرا وطن ہر سال آنا جانا رہتا، مسلم گنج بدایوں راستے ہی میں پڑتا تھا، کئی بار ـ ابنائے قادری بیرسٹر کے یہاں ٹھیرنے کا اتفاق ہوا، خوش حال گھرانا، رہنے سہنے کا انداز امیرانہ، کئی کئی نوکر اور ماما ئیں ! آئے دن بڑے بڑے شہروں، بڑی کلاسوں کے ممتاز طلباء اور سیاسی رہنما آتے ہوتے، بھاری لوں کی دعوتیں ہوتی رہتیں، جواد بخش مرحوم نے دو تین بار میرے لئے ٹی پارٹیوں کا اہتمام کیا، وہ شعر کا بڑا اچھا ذوق رکھتے تھے، یہ شعر میں نے ان کی زبان سے سب سے پہلی بار سنا ہے ــــ

مجھے زہر ہے جب ساقی میں پینا
یہ رکھا ہے ساغر، یہ رکھا ہے مینا

جواد بخش بچپن سے دمہ کے مریض تھے، ایک بار ڈاکٹر سر ضیاء الدین کے ساتھ اور دوسری بار مسٹر اے کے بیدی کی ہمراہی میں، مسٹر مذاق بخش قادری مرحوم نے انہیں علاج کے لئے انگلستان بھیجا، مگر مرض کو بس وقتی افاقہ ہو کر رہ گیا۔ شاید اسی بیماری کی وجہ سے انہوں نے شادی نہیں کی، یہ مرض بالآخر جان لیوا ثابت ہوا اور ۲۶ ءمیں سہ برس کی عمر میں اُن کا انتقال ہو گیا۔

جواد بخش مرحوم کے دونوں بھائی ماجد بخش اور واحد بخش بڑے ذہین نکلے اسلامی ذہانت اور تقریر و خطابت کی بدولت مسلم یونیورسٹی کی یونین کے صدر منتخب ہوئے، پاکستان بننے سے غالباً چار سال پہلے ایم۔ اے کرنے کے بعد واحد بخش قادری انڈین سول سروس میں لے لئے گئے، اسی کی تعیناتی صوبہ بنگال میں ہوئی ! اور یہیں ڈھاکہ میں خواجہ ناظم الدین کے خاندان میں اُن کی شادی ہو گئی۔

جس عہدہ پر بھی مرحوم رہے نیک نامی، فرض شناسی، دیانت داری اور ساتھ ہی بڑی قابلیت اور سوجھ بوجھ کے ساتھ انہوں نے اپنے فرائض انجام دیئے، ڈیڑھ دو سال مسٹر محمد علی بوگرہ وزیر اعظم پاکستان کے سکریٹری کی حیثیت سے اُن کا کراچی میں بھی رہنا ہوا، اس مدت میں کئی بار اُن کے بنگلہ پر شعر و ادب کی محفلیں اور مشاعرے کے جلسے ہوئے ! ایک بار حضرت جگر مراد آبادی کے اعزاز میں دعوت دی۔

۱۹۵۵ء میں جس سال راقم الحروف کو حرمین شریفین کی زیارت کی سعادت حاصل ہوئی ہے، اسی سال واحد بخش قادری مرحوم کو پاکستان کے وزیر اعظم کی حیثیت میں اس سعادت سے بہرہ ور ہونے کا موقع ملا۔ حج کے دنوں میں منیٰ میں مسجد خیف کے پاس اُن سے اتفاقیہ طور پر ملاقات ہو گئی۔ وہ شاہی مہمان تھے اور پولس کا سپاہی رائفل لئے ہوئے باڈی گارڈ کی حیثیت سے اُن کے ساتھ تھا، میں نے کہا یہ وہ مقام ہے جہاں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا خیمہ نصب ہوا تھا، یہ سن کر اُن کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی ! حرم نے اُن کی ظاہری شخصیت اور جسمانی حسب صورتی کو اور نمایاں کر دیا تھا۔

اب سنئے۔ ماہ پچھلے کئی مہینوں کے زمانہ میں آدھ دریان کے مشہور استاد شاعر منشی احمد میناؔئی رحمۃ اللہ علیہ کے داتی پوتے اسمٰعیل احمد

سلہ کیرانی اسکول قصبہ ڈبائی، ضلع بلند شہر۔ اب یہ ڈگری کالج ہو گیا ہے۔

تسنیم مینائی نے راولپنڈی کے سفر سے واپس آ کر کہا کہ مسٹر واحد بخش قادری نے تم سے ملنے کا بے حد اشتیاق ظاہر کیا، انہوں نے تاکید کر دی ہے کہ فلاں تاریخ کو میں یورپ کے سرکاری دورے سے واپس کراچی پہونچ رہا ہوں، ایئرپورٹ پر ماہر سے کہنا کہ وہ مجھ سے ضرور مل لیں۔ میں مقررہ تاریخ پر ہوائی اڈے پہونچا تو پتہ لگا کہ جہاز کو آتے ہوئے آدھ گھنٹہ سے بھی زیادہ ہو گیا، ایک صاحب نے مینائی کی کرسٹل ردی کے ، این ، ایم کے ریلوے ہاؤس تشریف لے گئے ہیں۔ وہاں پہونچا تو دیکھتے ہی بغل گیر ہو گئے اور خوشی کے مارے چہرہ کھل گیا، یہ دیکھ کر دل نے خلش محسوس کی کہ شگفتگی اور تازگی ... کی صحت کے اضمحلال کو چھپا نہیں سکی! تھوڑی دیر میں کافی آ گئی، کافی پینے میں بے تکلفی کی گفتگو ہوتی رہی انہوں نے کئی غزلیں مجھ سے سنیں، بڑی محبت کے انداز میں بولے "ماہر بھائی! دل نہیں بھرا، آپ پنڈی آئیے، میرے یہاں قیام کیجئے، بس پھر تین چار دن جی بھر کے آپ کا کلام سنیں گے" ——— اتنے میں کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ان سے ملنے کے لئے آ گئے اور میں ڈاکٹر محمود حسین صدیقی کے ساتھ ان کی کار میں شہر چلا آیا۔

یہ اتفاق نہیں حسن اتفاق تھا کہ جن دنوں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی ملازمت کی توسیع کا مسئلہ زیر غور تھا، واحد بخش قادری جیسا شریف النفس، قدر شناس اور جوہر شناس محکمہ تعلیمات کا سکریٹری تھا۔

واحد بخش قادری نے پاکستان میں کتنی بہت سی حکومتیں دیکھی تھیں، سرکاری عہدے دار کی حیثیت سے وہ ہر حکومت کے وفادار رہے مگر ان کی کمزوریوں سے بھی واقف تھے اور ان کو تاہیوں پر ان کا دل کڑھتا تھا۔ پاکستان میں "صحیح معنی میں" اسلامی حکومت کا قیام "ان کی سب سے بڑی تمنا اور عشق رسول ان کی سب سے زیادہ گرانقدر متاع تھی، صوم و صلوٰۃ کے پابند، کلب گھروں کی زندگی سے نفور اور اس قسم کی تمام ملاہیوں سے گریزاں! نیکی اور بھلائی کی طرف طبیعت کا رجحان تھا، فطرتاً خیر پسند اور شریف النفس۔ صاحب کردار اور اہل دل! اپنی ملازمت اور عہدے سے کسی قسم کا کوئی ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا، پاکستان کے دن اس وقت پھریں گے جب کرسیوں پر بہت سے "واحد بخش" نظر آئیں گے، اللہ تعالیٰ ان کی قبر پر اپنی رحمت کے پھول برسائے! (آمین)

میاں محمد شفیع مرحوم

مجھے پاکستان آئے ہوئے تین ساڑھے تین مہینے ہوتے تھے کہ ۱۹۵۵ء کے دوسرے مہینہ ملتان سے ایک مشاعرے کا دعوت نامہ آیا، ملتان جانے کا یہ پہلا موقع تھا، مشاعرے کی صدارت مسٹر ارشاد حسن (سی ایس پی) نے فرمائی، جو ان دنوں وہاں کے کمشنر تھے، مرحوم عبد العزیز عظیم آبادی کے صاحب زادے میاں ظہور الحق صاحب فوڈ ڈیپارٹمنٹ کے وہاں افسر تھے، انہی کی کوٹھی میں ٹھیرا ہوا تھا اور یہیں میاں محمد شفیع مرحوم سے پہلی بار نیاز حاصل ہوا، ان کی پہلی مسکراہٹ ہی نے دل موہ لیا، میاں صاحب ان دنوں ملتان میں ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تھے! انہی عہدے داروں کی توجہ اور محبت و قدر شناسی کی بدولت راقم الحروف کو مہینہ ایک مقدمہ کے سلسلہ میں ملتان مقیم رہا، صابر دہلوی مرحوم کی رفاقت نے اس قیام اور عجیب مشغلہ کو گوارا بنا دیا!

دفتری کام کے سلسلہ میں پہلی بار عدالت میں پہونچا، تو لوگوں کا خاصہ ہجوم تھا، میاں محمد شفیع صاحب نے مجھے دیکھتے ہی عدالت کے ڈائس پر اپنے قریب کرسی پر بٹھا لیا، میاں صاحب کی نوازش اور محبت اپنی جگہ مسلم مگر تمام دوسرے لوگوں کو عدالت کے کمرے میں کھڑا دیکھ کر میں دل ہی دل میں عجیب سی گھٹن محسوس کر رہا تھا، اسی ہجوم میں قابل گلاؤٹھوی بھی درخواست لئے کھڑے ہوئے تھے، میں قصداً ان سے نگاہیں بچا رہا!

میاں صاحب مرحوم سے ملتان میں ملاقاتیں ہوتی رہتیں، ایک دن وہ ملنے کے لئے خود تشریف لے آئے اور سرراہ ملنے کے پھاٹک کے سامنے بچھی ہوئی کھری چارپائی پر بیٹھ گئے! اور محبت کے لہجہ میں مجھے "ماہر صاحب" کہہ کر گفتگو کا آغاز فرمایا۔ میں چند ماہ کے بعد مستقل طور پر کراچی چلا آیا

ہر قسم کے سوتی دھاگے کیلئے ہمیشہ
اٹونیا برانڈ کو یاد رکھیے
THE
ETONIA
MADE BY
FIROZE SULTAN INDUSTRIES LTD.
KARACHI
W. PAKISTAN
فیروز سلطان انڈسٹریز لمیٹڈ سرائے روڈ کراچی

تلوک چند محروم کا غیر مطبوعہ کلام

نئی دہلی ۱۱

۷ر جنوری ۱۹۸۰ء

برادرِ محترم تسلیم

"فاران" باقاعدہ موصول ہو رہا ہے، سراپا سپاس ہوں۔ نیا شمارہ ابھی اگلے دن ملا۔ مولوی محمد حسین مرحوم کے بارے میں آپ کا مقالہ پڑھا۔ آپ نے بہت اچھا کیا کہ اُس کے کچھ اقتباسات قلمبند کر دیے اور مولوی صاحب مرحوم کی شخصیت پر روشنی ڈالی۔ مقالہ بہت پیارا ہے۔ آپ اپنی اس قسم کی تحریروں کو یکجا کر کے ایک کتاب مرتب کیجیے۔ بڑی اہم کتاب ہوگی، میرا اعتبار ہے!

مولوی محمد حسین کو دنیا دو دن ہی میں بھول گئی ہے۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے، آپ نے حقِ رفاقت ادا کیا ہے۔

نام نیک رفتگاں ضائع مکن   تا بماند نام نیکت یادگار

نظیری کا شعر تو خیر لاجواب ہے ہی، آپ کا اس موقع پر یہ شعر نقل کرنا بھی ایک کارنامہ سے کم نہیں!

باب "ہماری نظر میں" ہمیشہ سب سے پہلے پڑھتا ہوں۔ والد محترم بھی یہ باب بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔ ہمارے نئے ادیب اور شاعر ان پابندیوں سے بالا آزاد ہیں! نہ جانے یہ جدت پسندی ہماری نئی نظم اور نثر کو کہاں لے جائے۔

اس خط کے ساتھ والدِ محترم کا غیر مطبوعہ کلام "فاران" کے لئے بھیج رہا ہوں۔ امید کہ آپ بخیریت ہوں گے۔

نیازمند جگن ناتھ آزاد

رحم و کرم سے غافل نہ رہے
آہ دلِ پُر الم سے غافل نہ رہے
احساسِ غم اس لئے ملا ہے اس کو
انسان انساں کے غم سے غافل نہ رہے

گستاخ سے کس لئے بگڑتا ہے تو
کیا تیرا بگاڑ لے گا کوئی بدخو
بہتر ہے خوشامدی، اُسے منہ نہ لگا
ہے اپنے ضمیر کا بھی تیرا ہی عدو

دیوانہ ہر لذت مذموم رہا
پروانہ ہر طلعت موہوم رہا
باتیں تو بنائیں خوب تو نے محروم
لیکن حسنِ عمل سے محروم رہا

منظور نہ کر اپنے کئے کا الزام
ہے رحمت پر اپنے کئے کا الزام
انسان کو ابلیس سکھاتا ہے یہی
اللہ پہ دھر اپنے کئے کا الزام

ہے خوب وہ طبع جس میں رنگینی ہے
سامانِ ستائش خود آئینی ہے
سب سے ہشیار ہے مگر وہ انساں
جس کو سودائے عاقبت بینی ہے

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

الطور

(۲)

کیا یہ کہتے ہیں کہ اس شخص نے یہ قرآن خود گھڑ لیا ہے ؟ اصل بات یہ ہے کہ یہ ایمان نہیں لانا چاہتے اگر یہ اپنے اس قول میں سچے ہیں تو اسی شان کا ایک کلام بنا لائیں[۱]

بعض لوگ اس چیلنج کی حقیقی نوعیت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے یہ کہتے ہیں کہ ایک قرآن ہی کیا، کسی شخص کے اسٹائل میں بھی دوسرا کوئی شخص نثر یا نظم تصنیف نہیں کر سکتا۔ ہومر، رومی، شیکسپیئر، گوئٹے، غالب، ٹیگور، اقبال سب ہی اس لحاظ سے بے مثل ہیں کہ ان کی نقل اتار کر انہی جیسا کلام بنا لانا کسی کے بس میں نہیں ہے۔ قرآن کے چیلنج کا یہ جواب دینے والے دراصل اس غلط فہمی میں ہیں کہ فلیأتوا بحدیث مثلہٖ کا مطلب قرآن کے اسٹائل میں کوئی کتاب لکھ دینا ہے، حالانکہ اس سے مراد اسٹائل میں مماثلت نہیں ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ اس پائے اور اس شان اور اس مرتبے کی کوئی کتاب لے آؤ جو صرف عربی ہی میں نہیں، دنیا کی کسی زبان میں ان خصوصیات کے لحاظ سے قرآن کی مقابل قرار پا سکے، جن کی بنا پر قرآن ایک معجزہ ہے، مختصر چند بڑی بڑی خصوصیات حسب ذیل ہیں جن کی بنا پر قرآن پہلے بھی معجزہ تھا اور آج بھی معجزہ ہے۔

۱۔ جس زبان میں قرآن مجید نازل ہوا ہے اس کے ادب کا وہ بلند ترین اور مکمل ترین نمونہ ہے، پوری کتاب میں ایک لفظ اور ایک جملہ بھی ایسا گرا ہوا نہیں ہے، جس مضمون کو بھی ادا کیا گیا ہے موزوں ترین الفاظ اور مناسب ترین انداز بیان میں ادا کیا گیا ہے۔ ایک ہی مضمون بار بار بیان ہوا ہے اور ہر مرتبہ پیرایہ بیان نیا ہے جس سے تکرار کی بدنمائی کہیں پیدا نہیں ہوتی اول سے لے کر آخر تک ساری کتاب میں الفاظ کی نشست ایسی ہے جیسے نگینے تراش کر جڑے گئے ہوں، کلام اتنا موثر ہے کہ کوئی زبان داں آدمی اسے سن کر سر دھنے بغیر نہیں رہ سکتا حتیٰ کہ منکر اور مخالف کی روح بھی وجد کرنے لگتی ہے ۱۴ سو برس گزرنے کے بعد بھی آج تک یہ کتاب اپنی زبان کے ادب کا سب سے اعلیٰ نمونہ ہے جس کے برابر تو درکنار ——————

---

[۱] یعنی بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام نہیں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ سرے سے انسانی کلام ہی نہیں ہے اور یہ بات انسان کی قدرت سے باہر ہے کہ ایسا کلام تصنیف کر سکے اگر تم اسے انسانی کلام کہتے ہو تو اس پائے کا کوئی کلام لا کر دکھاؤ جسے کسی انسان نے تصنیف کیا ہو یہ چیلنج نہ صرف قریش کو بلکہ تمام دنیا کے منکرین کو سب سے پہلے اس آیت میں دیا گیا تھا اس کے بعد یہ تین مرتبہ مکہ معظمہ میں اور پھر آخری بار مدینہ منورہ میں دہرایا گیا (ملاحظہ ہو یونس آیت ۳۸، ہود ۱۳، بنی اسرائیل ۸۸، البقرۃ ۲۳) مگر کوئی اس کا جواب دینے کی نہ اس وقت ہمت کر سکا نہ اس کے بعد آج تک کسی کی یہ جرأت ہوئی کہ قرآن کے مقابلہ میں کسی انسانی تصنیف کو لے آئے

———— جس کے قریب بھی اس زبان کی کوئی کتاب اپنی ادبی قدر و قیمت میں نہیں پہنچتی، یہی نہیں بلکہ یہ کتاب عربی زبان کو اس طرح پکڑ کر بیٹھ گئی ہے کہ ڈیڑھ ہزار برس گزر جانے پر بھی اس زبان کا معیار فصاحت وہی ہے جو اس کتاب نے قائم کر دیا تھا۔ حالانکہ اتنی مدت میں زبانیں بدل کر کچھ سے کچھ ہو جاتی ہیں۔ دنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں ہے جو اتنی طویل مدت تک املا، انشا، محاورے، قواعد زبان، اور استعمال الفاظ میں ایک ہی شان پر باقی رہ گئی ہو۔ لیکن یہ صرف قرآن کی طاقت ہے جس نے عربی زبان کو اپنے مقام سے ہلنے نہ دیا۔ اس کا ایک لفظ بھی آج تک متروک نہیں ہوا ہے۔ اس کا ہر محاورہ آج تک عربی ادب میں مستعمل ہے۔ اس کا ادب آج بھی عربی کا معیاری ادب ہے اور تقریر و تحریر میں آج بھی فصیح زبان وہی مانی جاتی ہے جو ۱۴ سو برس پہلے قرآن میں استعمال ہوئی تھی۔ کیا دنیا کی کسی زبان میں کوئی انسانی تصنیف اس شان کی ہے ؟

۲۔ یہ دنیا کی واحد کتاب ہے جس نے نوع انسانی کے افکار، اخلاق، تہذیب اور طرز زندگی پر اتنی وسعت، اتنی گہرائی اور اتنی ہمہ گیری کے ساتھ اثر ڈالا ہے جس کی کوئی نظیر دنیا میں نہیں پائی جاتی۔ پہلے اس کی تاثیر نے ایک قوم کو بدلا اور پھر اس قوم نے اٹھ کر دنیا کے ایک بہت بڑے حصے کو بدل ڈالا۔ کوئی دوسری کتاب ایسی نہیں ہے جو اس قدر انقلاب انگیز ثابت ہوئی ہو۔ یہ کتاب صرف کاغذ کے صفحات پر لکھی نہیں رہ گئی ہے بلکہ عمل کی دنیا میں اس کے ایک ایک لفظ نے خیالات کی تشکیل اور ایک مستقل تہذیب کی تعمیر کی ہے۔ ۱۴ سو برس سے اس کے ان اثرات کا سلسلہ جاری ہے اور روز بروز اس کے اثرات پھیلتے چلے جا رہے ہیں۔

۳۔ جس موضوع سے یہ کتاب بحث کرتی ہے وہ ایک وسیع ترین موضوع ہے جس کا دائرہ ازل سے ابد تک پوری کائنات پر حاوی ہے۔ وہ کائنات کی حقیقت اور اس کے آغاز و انجام ———— اور اس کے نظم و آئین پر کلام کرتی ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ اس کائنات کا خالق اور ناظم و مدبر کون ہے، کیا اس کی صفات ہیں، کیا اس کے اختیارات ہیں، اور وہ حقیقت نفس الامری کیا ہے جس پر اس نے یہ پورا نظام عالم قائم کیا ہے۔ وہ اس جہان میں انسان کی حیثیت اور اس کا مقام ٹھیک ٹھیک مشخص کر کے بتاتی ہے کہ یہ اس کا فطری مقام اور یہ اس کی پیدائشی حیثیت ہے جسے بدل دینے پر وہ قادر نہیں ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ اس مقام اور اس حیثیت کے لحاظ سے انسان کے لئے فکر و عمل کا صحیح راستہ کیا ہے جو حقیقت سے ٹھیک مطابقت رکھتا ہے اور غلط راستے کیا ہیں جو حقیقت سے متصادم ہوتے ہیں۔ صحیح راستے کے صحیح ہونے اور غلط راستوں کے غلط ہونے پر وہ زمین و آسمان کی ایک ایک چیز سے، نظام کائنات کے ایک ایک گوشے سے، انسان کے اپنے نفس اور اس کے وجود سے، اور انسان کی اپنی تاریخ سے بے شمار دلائل پیش کرتی ہے۔ اس کے ساتھ وہ یہ بھی بتاتی ہے کہ انسان غلط راستوں پر کیسے اور کن اسباب سے پڑتا رہا ہے اور صحیح راستہ، جو ہمیشہ سے ایک ہی تھا اور ایک ہی رہے گا، کس ذریعہ سے اس کو معلوم ہو سکتا ہے اور کس طرح ہر زمانے میں اس کو بتایا جاتا رہا ہے۔ وہ صحیح راستے کی صرف نشان دہی کر کے نہیں رہ جاتی بلکہ اس راستے پر چلنے کے لئے ایک پورے نظام زندگی کا نقشہ پیش کرتی ہے جس میں عقائد، اخلاق، تزکیہ نفس، عبادات، معاشرت، تہذیب، تمدن، معیشت، سیاست، عدالت، قانون، غرض حیات انسانی کے ہر پہلو سے متعلق ایک نہایت مربوط ضابطہ بیان کر دیا گیا ہے۔ مزید برآں وہ پوری تفصیل کے ساتھ بتاتی ہے کہ اس صحیح راستے کی پیروی کرنے اور ان غلط راستوں پر چلنے کے کیا نتائج اس دنیا میں ہیں اور کیا نتائج دنیا کا موجودہ نظام ختم ہونے کے بعد ایک دوسرے عالم میں رونما ہونے والے ہیں۔ وہ اس دنیا کے ختم ہونے اور دوسرا عالم برپا ہونے کی نہایت مفصل کیفیت بیان کرتی ہے۔ اس تغیر کے تمام مراحل ایک ایک کر کے بتاتی ہے۔ دوسرے عالم کا پورا نقشہ نگاہوں کے سامنے کھینچ دیتی ہے اور پھر بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کرتی ہے کہ وہاں انسان کیسے ایک دوسری زندگی پائے گا، کس طرح اس کی دنیوی زندگی کے اعمال کا محاسبہ ہوگا، کس امر کی اس سے بازپرس ہوگی، کیسی ناقابل انکار صورت میں اس کا پورا نامۂ اعمال اس کے سامنے رکھ دیا جائے گا، کیسی زبردست شہادتیں اس کے ثبوت میں پیش کی جائیں گی، جزا اور سزا پانے والے کیوں جزا اور سزا پائیں گے، جزا پانے والوں کو کیسے انعامات ملیں گے اور سزا پانے والے کس کس شکل میں اپنے اعمال کے نتائج بھگتیں گے۔ اس وسیع مضمون پر جو کلام اس کتاب میں کیا گیا ہے وہ اس حیثیت سے نہیں ہے کہ اس کا مصنف کچھ منطقی گہری جوڑ کر چند قیاسات کی ایک عمارت تعمیر کر رہا ہے — بلکہ اس حیثیت سے ہے کہ اس کا مصنف حقیقت کا براہ راست علم رکھتا ہے، اس کی نگاہ ازل سے ابد تک سب کچھ دیکھ رہی ہے، تمام حقائق اس پر عیاں ہیں —

کائنات پوری کی پوری اس کے سامنے ایک کھلی کتاب کی طرح ہے۔ نوعِ انسانی کے آغاز سے اس کے خاتمہ تک ہی نہیں بلکہ خاتمہ کے بعد اس کی دوسری زندگی تک بھی اس کو بیک نظر دیکھ رہا ہے اور وہ قیاس و گمان کی بنا پر نہیں بلکہ علم کی بنیاد پر انسان کی رہنمائی کر رہا ہے جن حقائق کو علم کی حیثیت سے وہ پیش کرتا ہے ان میں سے کوئی ایک بھی آج تک غلط ثابت نہیں کیا جا سکا ہے۔ جو تصورِ کائنات و انسان وہ پیش کرتا ہے وہ تمام مظاہر اور واقعات کی مکمل توجیہ کرتا ہے اور ہر شعبۂ علم میں تحقیق کی بنیاد بن سکتا ہے فلسفہ و سائنس اور علومِ عمران کے تمام آخری مسائل کے جوابات اس کے کلام میں موجود ہیں اور ان سب کے درمیان ایسا منطقی ربط ہے کہ ان پر ایک مکمل، مربوط اور جامع نظامِ فکر قائم ہوتا ہے۔ پھر عملی حیثیت سے جو رہنمائی اس نے زندگی کے ہر پہلو کے متعلق انسان کو دی ہے وہ صرف انتہائی معقول اور انتہائی پاکیزہ ہی نہیں ہے بلکہ ۱۴ سو سال سے روئے زمین کے مختلف گوشوں میں بے شمار انسان بالفعل اس کی پیروی کر رہے ہیں اور تجربے نے اس کو بہترین ثابت کیا ہے۔ کیا اس شان کی کوئی انسانی تصنیف دنیا میں موجود ہے یا کبھی موجود رہی ہے جسے اس کتاب کے مقابلے میں لایا جا سکتا ہو۔

۴۔ یہ کتاب پوری کی پوری بیک وقت لکھ کر دنیا کے سامنے پیش نہیں کر دی گئی تھی۔ بلکہ چند ابتدائی ہدایات کے ساتھ ایک تحریکِ اصلاح کا آغاز کیا گیا تھا اور اس کے بعد ــــــــــــ ۲۳ سال تک وہ تحریک جن جن مرحلوں سے گزرتی رہی ان کے حالات اور ان کی ضروریات کے مطابق اُس کے اجزاء اُس تحریک کے رہنما کی زبان سے کبھی طویل خطبوں اور کبھی مختصر جملوں کی شکل میں ادا ہوتے رہے۔ پھر اس مشن کی تکمیل پر مختلف اوقات میں صادر ہونے والے یہ اجزاء اُس مکمل کتاب کی صورت میں مرتب ہو کر دنیا کے سامنے رکھ دیئے گئے جسے "قرآن" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ تحریک کے رہنما کا بیان ہے کہ یہ خطبے اور جملے اس کے طبعزاد نہیں ہیں بلکہ خداوند عالم کی طرف سے اس پر نازل ہوتے ہیں۔ اگر کوئی شخص انہیں خود اُس رہنما کے طبعزاد قرار دیتا ہے تو وہ دنیا کی پوری تاریخ سے کوئی نظیر ایسی پیش کرے کہ کسی انسان نے سالہا سال تک مسلسل ایک زبردست اجتماعی تحریک کی بطور خود رہنمائی کرتے ہوئے کبھی ایک واعظ اور معلمِ اخلاق کی حیثیت سے، کبھی ایک برسرِ جنگ فوج کے قائد کی حیثیت سے، کبھی ایک فاتح کی حیثیت سے، کبھی ایک شارع اور مقنن کی حیثیت سے، غرض بکثرت مختلف حالات اور اوقات میں بہت سی مختلف حیثیتوں سے جو مختلف تقریریں کی ہوں یا باتیں کہی ہوں، وہ جمع ہو کر ایک مکمل، مربوط اور جامع نظامِ فکر و عمل بن جائیں، ان میں کہیں کوئی تناقض اور تضاد نہ پایا جائے، ان میں ابتدا سے انتہا تک ایک ہی مرکزی تخیل اور سلسلۂ فکر کام کرتا نظر آئے۔ اس نے اول روز سے اپنی دعوت کی جو بنیاد بیان کی ہو آخر دن تک اسی بنیاد پر عقائد و اعمال کا ایک ایسا ہمہ گیر نظام بناتا چلا جائے جس کا ہر جزء دوسرے اجزاء سے کامل مطابقت رکھتا ہو، اور اس مجموعہ کو پڑھنے والا کوئی صاحبِ بصیرت آدمی یہ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکے کہ تحریک کا آغاز کرتے وقت اُس کے محرک کے سامنے آخری مرحلے تک کا پورا نقشہ موجود تھا اور ایسا کبھی نہیں ہوا کہ بیچ کے کسی مقام پر اُس کے ذہن میں کوئی ایسا خیال آیا ہو جو پہلے اس پر منکشف نہ تھا یا جسے بعد میں اس کو بدلنا پڑا ہو۔ اس شان کا کوئی انسان اگر کبھی گزرا ہو جس نے اپنے ذہن کی خلاقی کا یہ کمال دکھایا ہو تو اس کی نشاندہی کی جائے۔

۵۔ جس رہنما کی زبان پر یہ خطبے اور جملے جاری ہوتے تھے وہ یکایک کسی گوشے سے نکل کر صرف ان کو سنانے کے لئے نہیں آجاتا تھا اور انہیں سنانے کے بعد کہیں چھپ نہیں جاتا تھا۔ وہ اس تحریک کے آغاز سے پہلے بھی انسانی معاشرے میں زندگی بسر کر چکا تھا اور اس کے بعد بھی وہ زندگی کی آخری ساعت تک ہر وقت اسی معاشرے میں رہتا تھا۔ اس کی گفتگو اور تقریروں کی زبان اور طرزِ بیان سے لوگ خوب آشنا تھے۔ احادیث میں ان کا ایک بڑا حصہ اب بھی محفوظ ہے جسے بعد کے عربی داں لوگ پڑھ کر خود بآسانی دیکھ سکتے ہیں کہ اس رہنما کا اپنا طرزِ کلام کیا تھا۔ اس کے ہم زبان لوگ اس وقت بھی صاف محسوس کرتے تھے اور آج بھی عربی زبان کے جاننے والے یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس کتاب کی زبان اور اس کا اسٹائل اس رہنما کی زبان اور اس کے اسٹائل سے بہت مختلف ہے، حتیٰ کہ جہاں اس کے کسی خطبے کے بیچ میں اس کتاب کی کوئی عبارت آجاتی ہے وہاں دونوں کی زبان کا فرق بالکل نمایاں نظر آتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا دنیا میں کوئی انسان کبھی اس بات پر قادر ہوا ہے یا ہو سکتا ہے کہ سالہا سال تک دو قطعی مختلف اسٹائلوں میں کلام کرنے کا تکلف نباہتا چلا جائے اور کبھی یہ راز فاش نہ ہو سکے کہ یہ دو الگ اسٹائل دراصل ایک ہی شخص کے ہیں؟ عارضی اور وقتی طور پر اس قسم کے تصنع میں کامیاب ہو جانا تو ممکن ہے لیکن مسلسل ۲۳ سال تک ایسا ہونا کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ کہ ایک شخص جب خدا کی طرف سے آنے والی وحی کے طور پر کلام کرے تو اس کی زبان اور اسٹائل کچھ ہو اور جب خود اپنی طرف سے گفتگو یا تقریر کرے تو اس کی

زبان اور اس کا اسٹائل بالکل ہی کچھ اور ہو۔

۶ — وہ رہنما اس تحریک کی قیادت کے دوران میں مختلف حالات سے دوچار ہوتا رہا۔ کبھی برسوں وہ اپنے ہم وطنوں اور اپنے قبیلے والوں کی تضحیک توہین، اور سخت ظلم وستم کا نشانہ بنا رہا۔ کبھی اس کے ساتھیوں پر اس قدر تشدد کیا گیا کہ وہ ملک چھوڑ کر نکل جانے پر مجبور ہو گئے۔ کبھی دشمنوں نے اس کے قتل کی سازشیں کیں۔ کبھی خود اسے اپنے وطن سے ہجرت کرنی پڑی۔ کبھی اس کو انتہائی عسرت اور فاقہ کشی کی زندگی گزارنی پڑی۔ کبھی اسے پیہم لڑائیوں سے سابقہ پیش آیا جن میں شکست اور فتح دونوں ہی ہوتی رہیں۔ کبھی وہ دشمنوں پر غالب آیا اور وہی دشمن جنہوں نے اس پر ظلم توڑے تھے اس کے سامنے سرنگوں نظر آئے۔ کبھی اسے وہ اقتدار نصیب ہوا جو کم ہی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ ان تمام حالات میں ایک انسان کے جذبات کا اثر نمایاں نظر آتا ہے جو ایسے مواقع پر انسان کے دل میں پیدا ہوتے ہیں لیکن خدا کی طرف سے آئی ہوئی وحی کے طور پر ان مختلف حالات میں جو کلام اس کی زبان سے سنا گیا وہ انسانی جذبات سے بالکل خالی ہے۔ کسی ایک مقام پر بھی کوئی بڑے سے بڑا نقاد انگلی رکھ کر یہ نہیں بتا سکتا کہ یہاں انسانی جذبات کار فرما نظر آتے ہیں۔

۷ — جو وسیع اور جامع علم اس کتاب میں پایا جاتا ہے وہ اس زمانے کے اہل عرب اور اہل روم و یونان و ایران تو درکنار، اس بیسویں صدی کے اکابر اہل علم میں سے بھی کسی کے پاس نہیں ہے۔ آج حالت یہ ہے کہ فلسفہ، سائنس اور علوم عمران کی کسی ایک شاخ کے مطالعہ میں اپنی عمر کھپا دینے کے بعد آدمی کو پتہ چلتا ہے کہ اس خاص شعبہ علم کے آخری مسائل کیا ہیں اور پھر جب وہ غائر نگاہ سے قرآن کو دیکھتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب میں ان مسائل کا ایک واضح جواب موجود ہے۔ یہ معاملہ کسی ایک علم تک محدود نہیں ہے بلکہ ان تمام علوم کے باب میں صحیح ہے جو کائنات اور انسان سے کوئی تعلق رکھتے ہیں۔ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ آج سے چودہ سو برس پہلے ریگستان عرب میں ایک اُمّی کو علم کے ہر گوشے پر اتنی وسیع نظر حاصل تھی اور اس نے ہر بنیادی مسئلے پر غور و خوض کر کے اس کا ایک صاف اور قطعی جواب سوچ لیا تھا؟

اعجاز قرآن کے اگرچہ اور بھی متعدد وجوہ ہیں لیکن صرف ان چند وجوہ ہی پر آدمی غور کرے تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ قرآن کا معجزہ ہونا جتنا نزول قرآن کے زمانے میں نمایاں تھا اس سے بدرجہا زیادہ آج واضح ہے اور ان شاء اللہ قیامت تک یہ واضح تر ہوتا چلا جائے گا۔

ہماری نظر میں

خلافت و ملوکیت از :- سید ابوالاعلیٰ مودودی، ضخامت :- ۳۱۵ صفحات، قیمت اعلیٰ ایڈیشن پلاسٹک کور، آٹھ روپے ۲۵ پیسہ سستا ایڈیشن، چار روپے ۵۰ پیسے، ملنے کا پتہ :- اسلامک پبلیکیشنز، شاہ عالم مارکیٹ لاہور ـــــ ۱۲/۱ بیت الکرم (پہلی منزل) ڈھاکہ ـ

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی یہ وہ معرکہ آرا کتاب ہے، جو ان دنوں بحث و مناظرہ کا موضوع بنی ہوئی ہے، اور جو لوگ مولانا موصوف کی ذات اور جماعتِ اسلامی سے عناد اور کدورت رکھتے ہیں، انہوں نے الزام تراشی اور طعن و تشنیع کی باقاعدہ مہم شروع کر رکھی ہے۔ ان کی تنقید عدل و انصاف کے حدود سے بہت کچھ تجاوز کر گئی ہے۔

یہ کتاب نو ابواب پر مشتمل ہے :- باب اول، قرآن کی سیاسی تعلیمات ـــــ باب دوم :- اسلام کے اصول حکمرانی ـــــ باب سوم، خلافت راشدہ اور اس کی خصوصیات ـــــ باب چہارم، خلافت راشدہ سے ملوکیت تک ـــــ باب پنجم، خلافت اور ملوکیت کا فرق ـــــ باب ششم، مسلمانوں میں مذہبی اختلافات کی ابتدا اور اس کے اسباب ـــــ باب ہفتم، امام ابوحنیفہؒ کا کارنامہ ـــــ باب ہشتم، خلافت اور اس کے متعلقہ مسائل میں امام ابوحنیفہؒ کا مسلک ـــــ باب نہم، امام ابویوسفؒ اور ان کا کام ـ !

ہر باب کے تحت متعدد ذیلی سرخیاں ہیں، ہر واقعہ اور مسئلہ کو اس قدر تفصیل اور عقلی و نقلی دلائل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ پڑھنے والا تشنگی، الجھن اور کمی محسوس نہیں کرتا، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی دینی مسائل اور سیاسی معاملات میں جو سلجھی ہوئی فکر رکھتے ہیں، اور استدلال کا دلنشیں انداز اور خاص پیرایہ بیان، اللہ تعالیٰ نے انہیں ودیعت فرمایا ہے، یہ کتاب ان خوبیوں کی مظہر ہے، زبان، بیان، طرز نگارش اور اسلوب تحریر ہر چیز اپنی جگہ خوب سے خوب تر، بلکہ معیاری :

مغرب کے تصور کی جمہوریت اور اسلام کی جمہوری خلافت کا فرق چند لفظوں میں کس خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے :-

"مغربی تصور کی جمہوریت عوامی حاکمیت کے اصول پر قائم ہوتی ہے اور اس کے برعکس اسلام کی جمہوری خلافت میں خود عوام خدا کی حاکمیت تسلیم کر کے اپنے اختیارات برضا و رغبت قانونِ خداوندی کے حدود میں محدود کر لیتے ہیں۔

(ص ۳۶)

سلسلہ صفحہ ۔ "تہمت" نگاہ سے گزرا اور ہمارے ذہن میں کھٹک پیدا ہوئی، تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ دلی میں "تہمت" بھی بولا جاتا تھا۔ اس لئے یہ املا غلط تو نہیں ہے، مگر اردو میں اب بہت دنوں سے "تہمت" کا چلن ہے، دلی والے بھی اب "تہمت" ہی بولتے اور لکھتے ہیں۔ علامہ شبلی نعمانی اور دوسرے ارباب فکر اور اہل قلم کی تحریروں میں "تہمت" ہی ملتا ہے !

—— اور ——

" وہ (یعنی اسلام) جمہوریت کے اس اصول میں ڈیموکریسی سے متفق ہے کہ حکومت کا بننا اور بدلنا اور چلایا جانا، بالکل عوام کی رائے سے ہونا چاہئے، لیکن اس میں عوام مطلق العنان نہیں ہوتے کہ ریاست کا قانون، اس کے اصول حیات، اس کی داخلی و خارجی سیاست اور اس کے وسائل و ذرائع، سب ان کی خواہشات کے تابع ہوں اور جدھر جدھر وہ مائل ہوں، یہ ساری چیزیں بھی انہی کی طرف مڑ جائیں، بلکہ اس میں خدا اور رسول کا بالاتر قانون اپنے اصول، حدود اور اخلاقی احکام و ہدایات سے عوام کی خواہشات پر ضبط قائم رکھتا ہے اور ریاست ایک ایسے متعین راستے پر چلتی ہے جس کے بدل دینے کے اختیارات نہ اس کی منتظمہ کو حاصل ہوتے ہیں، نہ عدلیہ کو، نہ مقننہ کو، نہ مجموعی طور پر پوری قوم کو، الا یہ کہ قوم خود اپنے عہد کو توڑ دینے کا فیصلہ کر کے دائرہ ایمان سے نکل جائے" (ص ۵۳) (ص ۵۳)

—— اور ——

"یہ ریاست محض پولیس کے فرائض انجام دینے کے لئے نہیں ہے کہ اس کا کام صرف نظم و ضبط قائم کرنا اور سرحدوں کی حفاظت کرنا ہو، بلکہ یہ ایک مقصدی ریاست ہے جسے ایجابی طور پر اجتماعی عدل اور بھلائیوں کے فروغ اور برائیوں کے استیصال کے لئے کام کرنا ہے" (ص ۵۶)

—— اور ——

" فرد اور ریاست کے درمیان اس نظام میں ایسا توازن قائم کیا گیا ہے کہ نہ ریاست مختار مطلق اور ہمہ گیر اقتدار کی مالک بن کر فرد کو بے بس غلام بنا سکتی ہے، اور نہ فرد بے قید آزادی پا کر خود سر اجتماعی مفاد کا دشمن بن سکتا ہے" (ص ۵۷)

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی جنگی تدبیر اور مسئلہ تحکیم :-

حافظ ابن کثیر حضرت عمرو بن العاص کے اس فعل کی یہ توجیہہ کرتے ہیں کہ "انہوں نے اس حالت میں لوگوں کو بلا امام چھوڑنا مناسب نہ سمجھا، کیونکہ جس قسم کا اختلاف برپا تھا اس کو دیکھتے ہوئے انہیں خطرہ تھا کہ ایسا کرنا طویل و عریض فساد کا موجب ہوگا، اس لئے انہوں نے مصلحت کی بنا پر حضرت معاویہ کو برقرار رکھا، اور اجتہاد صحیح بھی ہوتا ہے اور غلط بھی" ——— لیکن جو انصاف پسند آدمی بھی نیزوں پر قرآن، تحکیم کی تجویز سے لے کر اس وقت تک کی روداد پڑھے گا وہ مشکل ہی سے یہ مان سکتا ہے کہ یہ سب کچھ "اجتہاد" تھا۔ بلاشبہ ہمارے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام صحابہ واجب الاحترام ہیں اور بڑا ظلم کرتا ہے وہ شخص جو ان کی کسی غلطی کی وجہ سے ان کی ساری خدمات پر پانی پھیر دیتا ہے اور ان کے مرتبے کو بھول کر گالیاں دینے پر اتر آتا ہے۔ مگر یہ بھی کچھ کم زیادتی نہیں ہے کہ اگر ان میں سے کسی نے کوئی غلط کام کیا ہو، تو ہم محض صحابیت کی رعایت سے اس کو "اجتہاد" قرار دینے کی کوشش کریں۔ بڑے لوگوں کے غلط کام اگر ان کی بڑائی کے سبب اجتہاد بن جائیں تو بعد کے لوگوں کو ہم کیا کہہ کر ایسے "اجتہادات" سے روک سکتے ہیں؟

"اجتہاد کے تو معنی ہی یہ ہیں کہ امر حق معلوم کرنے کے لئے آدمی اپنی انتہائی حد تک کوشش کرے، اس کوشش میں نادانستہ غلطی بھی ہو جائے تو حق معلوم کرنے کی کوشش بجائے خود اجر کی مستحق ہے، لیکن جان بوجھ کر ایک سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق غلط کام کرنے کا نام اجتہاد نہیں ہو سکتا، درحقیقت اس طرح کے معاملات میں افراط و تفریط

دوسروں ہی یکساں احترام کے لائق ہیں، کوئی غلط کام محض شرف صحابیت کی وجہ سے مشرف نہیں ہو جاتا، بلکہ صحابی کے مرتبہ بلند کی وجہ سے وہ غلطی اور زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے، لیکن اس پہ تنقید کرنے والے کو لازماً یہ احتیاط ملحوظ رکھنی چاہیے کہ غلط کو صرف غلط سمجھے اور کہنے پر اکتفا کرے اس سے آگے بڑھ کر صحابی کی ذات کو بہ حیثیت مجموعی مطعون نہ کرنے لگے، حضرت عمرو بن العاص یقیناً بڑے مرتبہ کے بزرگ ہیں اور انہوں نے اسلام کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں البتہ ان سے یہ دو کام ایسے سرزد ہو گئے ہیں، جنہیں غلط کہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں" (ص ۱۴۳-۱۴۴)

حضرت معاویہؓ کی امارت اور یزید کی ولی عہدی کے واقعہ کے اثرات :-

" خلفائے راشدین میں سے ہر ایک اسی قاعدے کے مطابق برسر اقتدار آیا تھا ان میں سے کسی نے بھی خود خلافت ——— لینے کی برائے نام بھی کوشش نہیں کی بلکہ جب خلافت ان کو دی گئی تھی، تب انہوں نے اس کو لیا...... ان کی خلافت دی ہوئی خلافت تھی نہ کہ لی ہوئی خلافت!

" ملوکیت کا آغاز اسی قاعدے کی تبدیلی سے ہوا، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت اس نوعیت کی خلافت نہ تھی کہ مسلمانوں کے خلیفہ بنانے سے وہ خلیفہ بنے ہوں، اور اگر مسلمان ایسا کرنے پر راضی نہ ہوتے تو وہ نہ بنتے، وہ بہر حال خلیفہ ہونا چاہتے تھے انہوں نے لڑ کر خلافت حاصل کی، مسلمانوں کے راضی ہونے پر ان کی خلافت کا انحصار نہ تھا، لوگوں نے ان کو خلیفہ نہیں بنایا وہ خود اپنے زور سے خلیفہ بنے اور جب وہ خلیفہ بن گئے تو لوگوں کے لئے بیعت کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا اس وقت اگر ان سے بیعت نہ کی جاتی تو اس کا نتیجہ یہ نہ ہوتا کہ وہ اپنے حاصل کردہ منصب سے ہٹ جاتے بلکہ اس کے معنی خونریزی و بدنظمی کے تھے، جیسے امن اور نظم پر ترجیح نہیں دی جا سکتی تھی، اس لئے امام حسن رضی اللہ عنہ کی دست برداری کے بعد تمام صحابہ و تابعین اور صلحائے امت نے ان کی بیعت پر اتفاق کیا اور اس کو "عام الجماعت" اس بنا پر قرار دیا کہ کم از کم باہمی خانہ جنگی تو ختم ہوئی" (ص ۱۵۸)

——— اور ———

" اس طرح جس تغیر کی ابتداء ہوئی تھی، یزید کی ولی عہدی کے بعد وہ ایسا مستحکم ہوا کہ موجودہ صدی میں مصطفیٰ کمال کے الغائے خلافت تک ایک دن کے لئے بھی اس میں تزلزل واقع نہ ہوا اس سے جبری بیعت اور خاندانوں کی موروثی بادشاہت کا ایک مستقل سلسلہ چل پڑا اس کے بعد سے آج تک مسلمانوں کو انتخابی خلافت کی طرف پلٹنے کا کوئی موقعہ نصیب نہ ہو سکا لوگ مسلمانوں کے آزادانہ اور کھلے مشورے سے نہیں، بلکہ طاقت سے برسر اقتدار آتے رہے بیعت سے اقتدار حاصل ہونے کے بجائے اقتدار سے بیعت حاصل ہونے لگی" (ص ۱۵۹)

امارت بے مشاورت و انتخاب :-

" یہاں یہ بحث غیر متعلق ہے کہ مسلمانوں کی آزادانہ مشاورت کے بغیر جو خلافت یا امارت زبردستی قائم ہو گی وہ آئینی طور پر منعقد ہو جاتی ہے یا نہیں! اصل سوال منعقد ہونے یا نہ ہونے کا نہیں، بلکہ یہ ہے کہ اسلام میں نصب خلافت کا صحیح طریقہ آیا وہ ہے، جس سے خلفائے راشدین خلیفہ بنتے، یا وہ جس سے حضرت امیر معاویہ اور ان کے بعد کے لوگ خلیفہ بنے! ایک طریقہ کام کرنے کا وہ ہے جس کے متعلق اگر وہ کام کر ڈالا جائے تو اسلام اسے برداشت کر لینے کی طرف

ہمیں اس لئے تلقین کرتا ہے کہ ہم گمشدہ شان اور عظمت کو واپس لانے کی کوشش کریں اس سے بھی زیادہ غلط فہمیاں پھیلا دے گا، بڑا ظلم کرے گا وہ شخص جو ان دونوں کو ایک درجہ میں رکھ دے اور دعویٰ کرے کہ اسلام میں یہ دونوں طریقے یکساں جائز ہیں، درحالانکہ ایک محض جائز نہیں بلکہ عین مطلوب ہے، دوسرا اگر جائز ہے تو قابلِ برداشت ہونے کی حیثیت سے ہے نہ کہ مطلوب اور پسندیدہ ہونے کی حیثیت سے۔" (ص ۱۴۰)

نسلی اور قومی عصبیتوں کا ظہور :-

"بنی اُمیہ کی حکومت ابتدا ہی سے ایک عرب حکومت کا رنگ لئے ہوئے تھی، جس میں عرب مسلمانوں کے ساتھ غیر عرب نو مسلموں کے مساوی حقوق کا تصور قریب قریب مفقود تھا، اس میں اسلامی احکام کی صریح خلاف ورزی کرتے ہوئے نو مسلموں پر جزیہ لگایا گیا، جیسا کہ ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں، اس سے نہ صرف اشاعتِ اسلام میں شدید رکاوٹ پیدا ہوئی بلکہ عجمیوں میں یہ احساس پیدا ہو گیا کہ اسلامی فتوحات نے دراصل ان کو عربوں کا غلام بنا دیا ہے اور اب وہ اسلام قبول کر کے بھی ان کے برابر نہیں ہو سکتے۔" (ص ۱۶۰)

——— ۰۰۰ ———

"دورِ عباسیہ میں بادشاہی کا طرز وہی رہا جو بنی امیہ نے اختیار کیا تھا فرق صرف یہ ہوا کہ بنی امیہ کے لئے قسطنطنیہ کے قیصر نمونہ تھے، تو بنی عباس کے خلیفہ کے لئے ایران کے کسریٰ" (ص ۱۹۵)

معتزلہ کے قول اور رائے پر تنقید :-

"بعض معتزلہ اس سے آگے بڑھ کر یہ کہتے تھے کہ کسی کو امام بنانا زیادہ بہتر ہے، بلکہ اگر مرئی آزاد کردہ غلام کو بنایا جائے، تو یہ اور بھی اچھا ہے، کیونکہ امام کے حامی زیادہ نہ ہوں تو ظلم و جور کی صورت میں اسے ہٹانا زیادہ آسان ہوگا۔ گویا حکومت کے استحکام کی بہ نسبت انہیں زیادہ فکر اس بات کی تھی کہ حکمران کو معزول کرنے میں سہولت ہو" (ص ۲۱۸)

امام ابو یوسفؒ کا شاندار کارنامہ :-

"سب سے پہلی چیز جو پوری کتاب (الخراج) کو بغور پڑھنے سے نمایاں طور پر آدمی کے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ امام ابو یوسفؒ خلیفہ کو بنی امیہ اور بنی العباس کی قیصر و کسریٰ کی روایات سے ہٹا کر ہر پہلو سے خلافتِ راشدہ کی روایات کے اتباع کی طرف لے جانا چاہتے ہیں، انہوں نے اگرچہ کہیں یہ نہیں کہا ہے کہ وہ اپنے پیش روؤں کی روایات چھوڑ دے، لیکن کسی جگہ انہوں نے شروع سے آخر تک بنی امیہ تو درکنار، خود ہارون الرشید کے باپ دادا کے طرزِ عمل اور فیصلوں کو بھی نظیر کی حیثیت سے پیش نہیں کیا ہے، ہر معاملہ میں وہ یا تو قرآن و سنت سے استدلال کرتے ہیں یا پھر نظیر لاتے ہیں تو ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ کے دورِ حکومت سے، اور بعد کے خلفاء میں سے اگر کسی کے اعمال کو انہوں نے نظیر بنایا ہے تو وہ المنصور، یا المہدی نہیں بلکہ بنی امیہ کے خلیفہ عمرؓ ابن عبد العزیز ہیں اس کے صاف معنی یہ تھے کہ سلطنتِ عباسیہ کا یہ آئینِ سلطنت مرتب کرتے وقت انہوں نے (عمرؓ بن عبد العزیز کے ڈھائی سال مستثنیٰ کر کے) حضرت علیؓ کی وفات سے لے کر ہارون الرشید کے زمانہ تک تقریباً ۱۳۲ سال کی حکومت کے پورے رواج اور تعامل کو نظر انداز کر دیا۔ یہ کام اگر کسی حق گو فقیہ نے محض وعظ و نصیحت کے طور پر بالکل غیر سرکاری حیثیت میں کیا ہوتا تو اس کی کوئی خاص اہمیت نہ تھی، لیکن یہ دیکھتے ہوئے اس کی بڑی اہمیت ہو جاتی ہے کہ ایک چیف جسٹس اور وقت کا قانون نے اپنی پوری سرکاری

حیثیت میں خلیفۂ وقت کی سپرد کردہ ایک خدمت انجام دیتے ہوئے کیا ہے" (ص ۲۸۰)

—— الخ ——

"یہ خلاصہ ہے اُن آئینی تجاویز کا جو امام ابو یوسفؒ نے اب سے بارہ سو برس پہلے ایک مطلق العنان فرمانروا کے سامنے اس کے وزیر قانون اور قاضی القضاۃ کی حیثیت سے پیش کی تھیں۔ اگر ان کو اسلامی ریاست کے بنیادی اصولوں اور خلافت راشدہ کے دستور العمل اور خود ان کے استاد امام ابو حنیفہؒ کی تعلیمات کے مقابلہ میں دیکھا جائے تو یہ اُن سے بہت کم نظر آتی ہیں، ان میں انتخابی خلافت کے تصور کا شائبہ تک نہیں ہے، ان میں شوریٰ کے ذریعہ سے حکومت کرنے کا بھی کوئی ذکر نہیں ہے، یہ اس تصور سے بھی خالی ہیں کہ امام ظالم کو حکومت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے اور خلق اس کی جائز ہے کہ اس کی حکومت کی جگہ بہتر حکومت لانے کی کوشش کرے، اسی طرح دوسری متعدد حیثیات سے بھی یہ تجاویز اصل اسلامی تصور کے مقابلہ میں بہت ناقص ہیں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ امام ابو یوسفؒ کے تصور ریاست کی وسعت بس اتنی ہی ہے، جتنی کتاب الخراج کی ان تجاویز میں پائی جاتی ہے اور در حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہ چاہتے تھے، جو انہوں نے اس کتاب میں بیان کر دیا ہے، بلکہ در اصل یہ وہ زیادہ سے زیادہ چیز تھی، جس کی ایک عملی مفکر کی حیثیت سے وہ سلطنت عباسیہ کے اُس دور میں توقع کر سکتے تھے، ان کے پیش نظر محض ایک ایسا خیالی نقشہ پیش کرنا نہ تھا جو تصور کی حد تک مکمل ہو، مگر واقعی حالات میں اس کو جامۂ عمل پہنانے کے امکانات نہ ہوں، اس کے بجائے وہ ایک ایسی آئینی اسکیم مرتب کرنا چاہتے تھے جو اسلامی ریاست کے کم سے کم جوہر مطلوب کی حامل ہو اور اس کے ساتھ اسے ان حالات میں عمل میں بھی لیا جا سکتا ہے" (ص ۲۹۷)

"کتاب الخراج" پر گفتگو کے ضمن میں مصنف نے فقہائے اسلام کے ساتھ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے موقف کی حسین مدافعت اور ان کی فقہی خدمات کا اعتراف واقعی بھی، حضرت امام ابو حنیفہ علیہ الرحمۃ نے فقہ کی تدوین کا جو عظیم کارنامہ انجام دیا ہے اس پر مولانا مودودی کا تبصرہ اور اس کا تجزیہ خود اپنی جگہ علمی شاہکار ہے!

مولانا مودودی کی اس کتاب کے بعض ابواب اُن کے رسالہ "ترجمان القرآن" میں بالاقساط شائع ہوتے تھے، اس سلسلہ میں جو اعتراضات اور سوالات ان تک پہنچے تھے ان میں سے متعدد سوالات اور اعتراضات کے جوابات "ضمیمہ" کی صورت میں درج کر دیئے گئے ہیں ـــــ مثلاً

"بعض حضرات اس معاملہ میں یہ نرالا قاعدہ کلیہ پیش کرتے ہیں کہ ہم صحابہ کرامؓ کے بارے میں صرف وہی روایات قبول کریں گے جو اُن کی شان کے مطابق ہوں اور ہر اُس بات کو رد کر دیں گے جس سے ان پر حرف آتا ہو، خواہ وہ کسی صحیح حدیث ہی میں وارد ہوئی ہو، لیکن میں نہیں جانتا کہ محدثین، مفسرین اور فقہاء میں سے کس نے یہ قاعدہ کلیہ بیان کیا ہے اور کون سا محدث یا مفسر یا فقیہ ہے جس نے کبھی اس کی پیروی کی ہے، کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایلاء اور تخییر کا واقعہ حدیث، فقہ اور تفسیر کی کتابوں میں بیان نہیں کیا گیا ہے؟ حالانکہ اس سے امہات المومنین پر یہ الزام آتا ہے کہ انہوں نے نفقہ کے لیے حضورؐ کو تنگ کیا تھا، کیا واقعہ افک میں بعض صحابہؓ کے ملوث ہونے اور ان پر حد قذف جاری ہونے کا قصہ ان میں بیان نہیں کیا گیا ہے، حالانکہ اس قصہ کی شناعت جیسی کچھ ہے وہ ظاہر ہے ـــــ

"پھر اگر واقعی یہ کوئی مسلم قاعدہ تھا تو حضرت عمرؓ نے حضرت مغیرہ بن شعبہ پر زنا کا الزام لگانے والوں سے شہادت طلب کر کے اس کی خلاف ورزی کی، کیونکہ اس قاعدے کی رو سے تو ایک صحابی کی طرف اس فعل کی نسبت ہی ممکن

قابلِ تسلیم نہ تھی، کجا کہ اس پر فہمائش طلب کی جاتی، بلکہ خود وہ حضرات جو آج اسی قاعدہ کلیہ کو پیش فرما رہے ہیں، اس کی پابندی نہیں کرتے، اگر واقعی وہ اس کے قائل ہوتے تو انہیں کہنا چاہیے تھا کہ جنگِ جمل اور جنگِ صفین سرے سے کبھی پیش ہی نہیں آئی ہیں، کیونکہ صحابہ کرام کی شان اس سے بالاتر ہونی چاہیے کہ وہ ایک دوسرے کے مقابلہ میں تلواریں لے کر کھڑے ہو جائیں اور ان کے ہاتھوں اہلِ ایمان کی خونریزی ہو۔" (ص ۳۰۵-۳۰۶)

قاتلینِ عثمانؓ کا معاملہ:-

"میں نے شرعی احکام پر جتنا بھی غور کیا ہے، اس کی بنا پر میرے نزدیک خونِ عثمانؓ کا بدلہ لینے کی شرعاً ایک ہی صورت تھی اور وہ یہ کہ خلیفۂ وقت کی خلافت کو مان کر انہی سے یہ مطالبہ کیا جاتا کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلین کو گرفتار کر کے اُن پر مقدمہ چلائیں اور جس جس کا جو حصہ بھی اس جرمِ عظیم میں تھا اس کو شہادتوں کے ذریعہ سے متعین کر کے قانون کے مطابق اس کو سزا دیں، دوسری طرف اس وقت کے حالات کا میں نے جس قدر بھی مطالعہ کیا ہے اس کی بنا پر میں یہ سمجھتا ہوں کہ عملاً یہ اسی طریق کار اس کے بغیر اختیار نہیں کیا جا سکتا تھا کہ حضرت علی رض کے ساتھ سب لوگ تعاون کرتے، اور ان کو پُر امن حالات میں کام کرنے کا موقع دیا جاتا، جیسا کہ تاریخی واقعات سے ثابت ہے، جو لوگ سازش کر کے مدینہ پر چڑھ آئے تھے ان کی تعداد دو ہزار کے قریب تھی، خود مدینہ میں بھی ایک تعداد اُن کے حامیوں کی موجود تھی، اور مصر، بصرہ اور کوفہ میں بھی اُن کی پشت پر ایک ایک جتھا پایا جاتا تھا، اگر تمام اہلِ حق حضرت علی رض کے گرد جمع ہو جاتے اور ان سے تعاون کرتے تو وہ ان جتھوں کو منتشر کرنے کے بعد ان پر ہاتھ ڈال سکتے تھے، لیکن جب کہ ایک طرف با اثر صحابہؓ کے ایک گروہ نے غیر جانبداری کی روش اختیار کی اور دوسری طرف بصرہ اور شام میں طاقت ور فوجیں حضرت علی رض سے لڑنے کے لیے جمع ہو گئیں تو ان کے لئے یہ منصوبہ کہ اس گروہ پر ہاتھ ڈالنا ممکن نہ رہا بلکہ وہ عملاً مجبور ہو گئے کہ ان طاقت ور فوجوں کے مقابلے میں جن لوگوں سے بھی مدد لے سکتے تھے، ان سے مدد لیں اور ایک تیسری لڑائی قاتلینِ عثمان رض کے جتھے سے نہ چھیڑ دیں۔"

"میری اس رائے سے کسی کو اگر اختلاف ہے تو وہ مجھے بتائے کہ حضرت علی رض قاتلینِ عثمان رض کے اس مضبوط جتھے کو کس وقت پکڑتے؟ کیا خلافت سنبھالتے ہی فوراً؟ یا جنگِ جمل کے زمانے میں؟ یا جنگِ صفین کے بعد اس زمانے میں جب کہ ایک طرف حضرت معاویہؓ ان کے مقابلہ میں مملکت کے ایک ایک صوبے کو توڑ لینے کی کوشش کر رہے تھے اور دوسری طرف خوارج اُن کے خلاف صف آرا تھے؟" (ص ۴۴۲-۴۴۳)

حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کے موقف کی مدافعت اور آن کے برسرِ حق ہونے کا اعتراف کرتے ہوئے مولانا مودودی نے یہ بھی لکھا ہے:-

"مگر صرف ایک مالک الاشتر اور محمد بن ابی بکر کو گورنری کا عہدہ دینے کا فعل ایسا تھا جس کو کسی تاویل سے بھی حق بجانب قرار دینے کی گنجائش مجھے نہ مل سکی، اسی بنا پر میں نے اس کی مدافعت سے معذوری ظاہر کر دی ہے۔" (ص ۴۴۸)

مولانا مودودی نے چند جملوں میں محمود عباسی صاحب کی دلیلوں کے سر بفلک قلعہ کو ڈھا دیا ہے، فرماتے ہیں:-

"اس بحث سے پوری شرعی پوزیشن کھل کر سامنے آ جاتی ہے اور یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ حضرت علیؓ کی خلافت اور ان کے مخالفین کے معاملہ میں اہل السنت کا مسلک کیا ہے؟ اب یہ دعویٰ کرنے کے لئے مکابرہ کی بہت بڑی مقدار درکار ہے کہ حضرت علی کی خلافت مشکوک و مشتبہ تھی، اور ان کے مقابلے میں تلوار اٹھانے کے لئے شرعی جواز کی کوئی گنجائش موجود تھی، خصوصاً اُن لوگوں پر تو مجھے سخت حیرت ہے جنہیں ایک طرف یزید کی

خلافت کو صحیح اور حضرت حسین رضؓ کو برسرِ غلط ٹھیرانے پر تو بڑا اصرار ہے! مگر دوسری طرف وہ حضرت معاویہؓ کے حق میں معذرتیں پیش کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں، حالانکہ جن دلائل سے یزید کی خلافت صحیح ثابت کی جاتی ہے ان کی بہ نسبت ہزار گنے زیادہ قوی دلائل سے حضرت علی رضؓ کی خلافت قطعی صحت کے ساتھ قائم ہوتی تھی، اور جن حضرات نے بھی خونِ عثمان رضؓ کا بدلہ لینے کے لئے اُن کے خلاف تلوار اُٹھائی، ان کے اس فعل کے حق میں کوئی شرعی دلیل نہیں پیش کی جا سکتی، خدا کی شریعت بے لاگ ہے، اس میں یہ گنجائش نہیں ہے کہ کسی کے مرتبے کا لحاظ کر کے ہم غلط کو صحیح بنانے کی کوشش کریں" (ص ۲۴۲-۲۴۳-۲۴۴)

عربی سے اُسلوبِ ترجمہ اور خود مصنف کی تحریر کا ایک نمونہ:—

● "ویسے بھی عراق کے باشندے سالہا سال سے بنی اُمیہ کے ظلم و ستم سہتے سہتے تنگ آ چکے تھے اور اُٹھنے کے لئے سہارا چاہتے تھے، علوی خاندان کی ایک صالح، عالم، فقیہ شخصیت کا میسر آ جانا انہیں غنیمت محسوس ہوا، ان لوگوں نے زید کو یقین دلایا کہ کوفہ میں ایک لاکھ آدمی آپ کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہیں، اور ۱۵ ہزار آدمیوں نے بیعت کر کے باقاعدہ اپنے نام بھی اُن کے رجسٹر میں درج کرا دیئے! اس اثناء میں کہ خروج کی یہ تیاریاں اندر ہی اندر ہو رہی تھیں، اموی گورنر کو ان کی اطلاع ہو گئی، زید نے یہ دیکھ کر کہ حکومت خبردار ہو گئی ہے، صفر ۱۲۲ ہجری میں قبل از وقت خروج کر دیا، جب تصادم کا موقع آیا تو کوفہ کے شیعانِ علیؓ اُن کا ساتھ چھوڑ گئے، جنگ کے وقت صرف ۲۱۸ آدمی اُن کے ساتھ تھے، دورانِ جنگ میں اچانک ایک تیر سے وہ گھائل ہو گئے اسی سے ان کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا" (الطبری)

● "فرماں روا میں اتنا تحمل ہونا چاہئے کہ وہ حق بات سنے، اس کے تند و تلخ بے برداشت ہونے سے بڑھ کر فرمانروا کے لئے کوئی چیز نہیں" (ص ۲۸۹)

یہ کتاب الخراج" کی ایک عبارت کا ترجمہ ہے اس میں "بے برداشت" مولانا مودودی کی بنائی ہوئی کتنی حسین اور قابلِ قبول ترکیب ہے۔

"خلافت و ملوکیت" اس صدی کی عظیم کتاب ہے۔ اس کی مقبولیت کی انتہا یہ ہے کہ دو سوا دو مہینہ میں چار ہزار کی چار ہزار جلدیں فروخت ہو گئیں، اور اب دوسرے ایڈیشن کی تمنا ہے کہ تیار ہو رہی ہیں۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ مولانا مودودی کے قلم سے جو کچھ بھی نکل جاتا ہے وہ سراسر حق ہی ہوتا ہے، اُن کے قلم سے بھول چوک بھی ہو سکتی ہے اور ہوئی ہے: مولانا موصوف کی اس کتاب پر بھی تنقید کا ہر شخص کو حق حاصل ہے کوئی چاہے تو حضرت سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت کے اضطرابات کی مدافعت بھی کر سکتا ہے! مگر اس قسم کی الزام تراشی عدل و انصاف کے معروف اصولوں کے خلاف ہے کہ مودودی صاحب نے حضرت عثمانؓ کی شان میں نعوذ باللہ گستاخی کی ہے، اور صحابہ کی تنقیص نعوذ باللہ جیسے ان کا شعار ہے اور وہ رفض بلکہ کفر و الحاد کے نمائندے ہیں! وہ شخص آخرت کے محاسبہ سے بالکل بے پروا ہے، جو مولانا مودودی کو اس انداز میں مطعون کرتا ہے! مولانا نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی نیت کے بارے میں کسی اشتباہ تک کا اظہار نہیں کیا! انہوں نے اس کتاب میں جو باتیں کہی ہیں، قریب قریب وہی باتیں بعض دوسرے مسلم مفکرین، اربابِ قلم اور اہلِ علم نے بھی کہی ہیں!

(۱) (الف) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں اضطرابات رونما ہوئے تھے۔

(ب) آپ کے عہد میں بنو اُمیہ کو غلبہ حاصل ہو گیا تھا۔

(ج) آپ سے پوری نیک نیتی کے ساتھ ایک دو اجتہاد میں غلطی ہو گئی تھی۔

(۱) حضرات شیخین کے دورِ خلافت کے مقابلہ میں خلافتِ عہد عثمان کے کل پہلوؤں میں ڈھیل پیدا ہو گئی تھی۔

(۲) جمل و صفین میں حق حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ساتھ تھا۔

(۳) حضرت معاویہؓ خلافتِ راشدہ کے باغی امیر تھے۔

(۴) حضرت معاویہ نے یزید کو ولی عہد بنا کر خلافت کو ملوکیت کی راہ پر ڈال دیا۔

(۵) خود اپنی اسی یزید کی ولی عہدی کی بیعت کے بارے میں امیر معاویہ کا معاملہ خاصہ گندہ نظر آتا ہے۔

(۶) حضرت مغیرہ بن شعبہ نے امیر معاویہ کو یزید کی ولی عہدی کا جو مشورہ دیا تھا وہ صائب نہ تھا۔

(۷) جنگ میں قرآن کا نیزوں پر اٹھانا اور واقعہ تحکیم ـــــ ان میں حضرت عمرو بن العاص کی غلطیوں کی مدافعت نہیں کی جا سکتی۔

(۸) مروان ناپسندیدہ کردار کا حامل جس کے سبب اُمت میں فتنے پیدا ہوئے!

(۹) حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت حق کی شہادت تھی، اُن کے قاتل بلاشبہ ظالم تھے، حضرت حسین رضہ کو دل سے محبوب سمجھنا محبت نبوی کا تقاضا ہے!

(۱۰) یزید تاریخ اسلام کی مکروہ اور مبغوض شخصیت ہے، حضرت حسینؓ سے محبت اور یزید کی ذات سے لگاؤ اور خوش گمانی رحمت ناک تضاد اور ناقابلِ فہم اعجوبہ ہے! جس شخص کے بارے میں اکابر ملت کے درمیان نزاع رہی ہو کہ اس پر لعنت کی جائے یا نہ کی جائے، اور ایک دو اکابر نے جس سے کفر تک منسوب کیا ہو اُس کی مدافعت فسادِ قلب اور ناصبیت نہیں تو اور کیا ہے۔

جن حقائق کا اوپر اظہار کیا گیا ہے اُن سے "رفض و خارجیت" یا "تنقیصِ صحابہ" کی نسبت درست نہیں ہے! اہل سنت والجماعت کے اکابر علماء کی تحریروں ہی کا یہ خلاصہ ہے، جو ہم نے سطور بالا میں پیش کیا ہے ـــ رفض و خارجیت صحابہ کرام کی رنگ برنگ گستاخی، تکفیر، تفسیق اور تفضیل ہے! جن صحابہ سے غلطیاں ہوئی ہیں چاہے ان میں سے ایک دو صحابی کی ہوائے نفس بھی شامل ہو تو ان غلطیوں کے باوجود وہ صحابیت کے شرف سے ممتاز ہیں، اور اہل ایمان ہیں ان کے دوسرے اعمال صالحہ کو اللہ تعالیٰ ان کی غلطیوں کا کفارہ بنا دے گا (رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ) ان غلطیوں کا اظہار ایمان پر نقد و جرح نہ رفض ہے اور نہ خارجیت اور نہ زندقہ و معصیت ہے۔

اس حقیقت کو کون جھٹلا سکتا ہے نہ اس کی پردہ پوشی کی جا سکتی ہے کہ اسلامی تاریخ میں نظامِ خلافت، نظامِ ملوکیت سے بدلا ہے! کس طرح بدلا ہے؟ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اس تبدیلی کے محرکات اور اسبابؒ بحث کی ہے، اس موضوع پر اُن کی یہ کتاب بڑے معرکہ کی کتاب ہے اس قسم کے واقعات سے اللہ تعالیٰ کی توحید کا عقیدہ نکھر کر سامنے آتا ہے ـــــ یعنی یہ عقیدہ جو گھڑ لیا گیا ہے کہ اولیاء اللہ کو علم غیب ہے وہ دلوں کے حالات جانتے ہیں اور تمام کائنات اُن کے سامنے ہتھیلی کی طرح روشن ہے اور کائنات میں ہر قسم کے تصرف کا انہیں حق حاصل ہے، وہ مشکل کشا، داتا اور فریاد رس ہیں اور گناہ سے بالکل محفوظ ہیں۔ صحابہ کرام کے ساتھ جو یہ معاملات پیش آئے ہیں وہ اس قسم کے غلط عقائد کی نفی اور تردید کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی مشیت کے آگے ہر کوئی مجبور ہے، اور ہوتا وہی ہے جو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی سمیع الدعا، حلّالِ مشکلات، اور عالم الغیب ہے، مصیبت کے وقت اُسی سے فریاد کرنی چاہئے کہ سب کچھ اُسی کے قبضۂ قدرت میں ہے، انبیاء کرام تک کو کیسی کیسی مشکلیں پیش آئی ہیں اور انہوں نے اس عالم میں اللہ تعالیٰ کو پکارا ہے! اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْر، نعم المولیٰ ونعم النصیر۔

لہ: اسلام تو خیر بہت بلند چیز ہے، یزید میں اگر انسانی شرافت کی بھی کوئی رمق ہوتی، تو وہ سوچتا کہ فتح مکہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کے پورے خاندان پر کیا احسان کیا تھا اور اُس کی حکومت نے اُن کے نواسے کے ساتھ کیا سلوک کیا۔" (ابوالاعلیٰ مودودی)

القرأة الراشدہ (حصہ دوم)

از :- مولانا ابوالحسن علی الندوی، ضخامت ۱۱۲ صفحات، قیمت ایک روپیہ ، ۷ پیسے ،
ملنے کا پتہ :- مکتبہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ (بھارت)

یہ کتاب اُستاد اور عربی کے مشہور عالم وادیب حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی تالیف ہے، جو مدارس اسلامیہ کے طلباء کے لئے مرتب کی گئی ہے، مقصد تالیف اور غرض ترتیب عربی زبان کی تعلیم کے ساتھ دل و دماغ کی دینی تربیت اور اخلاقی تہذیب و تزئین بھی ہے، چند اسباق کے نام درج ذیل ہیں :-

الحنین الی الشہادۃ ——— عید الاضحیٰ ——— رسالتہ الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ——— فتح الاسلام ———
الخلیفۃ عمر بن عبد العزیزؒ ——— عیادۃ المریض !

جو مضامین خالص معلوماتی اسلوب میں ہیں مثلاً ——— جسم النبات، البائعہ، المانشات، العین، الکیمیاء ——— اُن میں بھی وجود باری کا اثبات ملتا ہے، مسلمان بادشاہوں کے قصوں میں بھی عدل و ضابطی اور انسانیت دوستی کی جھلکیاں نظر آتی ہیں، عربی نظموں کا انتخاب بھی خوب ہے خود فاضل مولف کے لکھے ہوئے " اسباق " ادب و انشاء کا اعلیٰ نمونہ ہیں !

پیارے رسولؐ کیسے تھے ؟

از :- مائل خیرآبادی، ضخامت ۸۰ صفحات (سرورق رنگین اور دیدہ زیب) قیمت اعلیٰ ایڈیشن ایک روپیہ پچیس پیسے، سستا ایڈیشن ستر پیسے ملنے کا پتہ :- ادارہ " بتول " اچھرہ، لاہور

اس کتابچے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس زندگی کے حالات آسان زبان میں طلبا اور طالبات کے لئے لکھے گئے ہیں، انداز تحریر بچوں کی نفسیات کے مطابق ہے، اس کے مطالعہ سے ذہن، فکر اور دل و دماغ کا تزکیہ ہوتا ہے، اور بچوں میں یہ احساس اور شعور اُبھرتا ہے کہ مسلمان کی معاشرت کیسی ہونی چاہئے، اور رہنے سہنے، بات کرنے اور اٹھنے بیٹھنے میں کیا طریقہ اختیار کرنا چاہئے! یہ کتاب اتباع رسول کی تعلیم دیتی ہے اور

بہ مصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

کی مبلغ اور معلم ہے۔

مخلوط تعلیم

از :- احمد انس، ضخامت ۴۸ صفحات (سرورق دیدہ زیب)
ملنے کا پتہ :- ادارہ مطبوعات جمعیت ۲۳ - اسٹریچن روڈ، کراچی

اسلامی جمعیت طلباء قابل تبریک، مستحق تحسین اور اسلام پسند طبقوں کی تائید و معاونت کی مستحق ہے کہ وہ مسلمان طلباء میں اخلاقی احساس اور دینی شعور پیدا کرنے کی جدوجہد کر رہی ہے، اس معصیت پرور دور میں نوجوانوں کا اخلاق و تقویٰ اور نیکی کی تحریک لے کر اٹھنا کتنی بڑی سعادت کی تومتی ہے۔ تخریب دلفریب اور خدا ناپسند زندگی سے نوجوانوں کی یہ پاکیزہ جماعت پاکستان میں تبلیغ حق کا فرض انجام دے رہی ہے۔

اس کتاب میں علمی دلیلوں کے ساتھ اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ مخلوط تعلیم اخلاق و پاکیزگی کے نقطہ نگاہ ہی سے نہیں بلکہ خود تعلیمی مقاصد کے اعتبار سے بھی ناقص و مضرت رساں اور برے نتائج کی حامل ہے ——— چند اقتباسات ———

● ——— " لیکن یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ جس طرح زندگی کے سرمائے میں، اسی رُخ پر حرکت جاری رہی

لہ " ستو بھی ڈکھاتے " (راہ ستو ردی، تو بزادہ کجھ روی کی طرح نہیں کھائے جاتے، ستو پئے جاتے ہیں، " ستو بھی استعمال فرماتے لکھنا تھا ——— " کہ دوا در جیسی " اصل لفظ " جیس " ہے کتابت میں ایک نقطہ زیادہ لگ گیا۔

جس طرح یہاں انگریز بنیادیں ڈال گئے تھے، اسی طرح تعلیم کے دائرے میں بھی ٹھیک اس طرز اساس نہج پر ترقی ہوتی رہی، جس پر انگریز خود یہاں ہوتے تو کرتے۔"

● "اس مطالعہ سے جو بات سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے کہ مخلوط تعلیم کا نظریہ معاشرہ کے سنجیدہ طبقہ کے لئے کبھی قابلِ قبول نہ تھا۔"

● "یہ بات بالکل واضح اور سمجھ میں آنے والی ہے کہ مخلوط تعلیم کے ساتھ خاندانی نظام کا برقرار رکھنا ناممکنات میں سے ہے، مخلوط تعلیم کے ساتھ خاندانی نظام کی تباہی لازم و ملزوم ہے۔"

● "ہمارے طبقۂ بالا میں، جہاں مخلوط تعلیم کے اثرات مکمل کر سامنے آگئے ہیں، اخلاقی حیاسوز گراوٹ جس انتہا کو پہونچ گئی ہے، وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔"

● "ڈاکٹر رابرٹ ہرسکومز کا اندازہ یہ ہے کہ بڑے مخلوط کالجوں میں یا لڑکوں کے کالج سے قریب واقع لڑکیوں کے علیحدہ کالج میں اسّی فی صد لڑکیاں کالج کی تعلیم ختم ہونے سے پہلے جنسی تجربات کر چکی ہوتی ہیں۔ ـــــ قبل شادی جنسی تعلقات قائم کرنے والی طالبات میں سے ۲۰ سال کی عمر تک کے گروہ میں ۱۳ فیصدی حاملہ ہوتی ہیں، اس میں سے ۳۰ فیصدی شادی کر لیتی ہیں، ۲۰ فیصدی اسقاط کراتی ہیں اور ۵۰ فیصدی کے ناجائز بچے ہوتے ہیں۔"

● "مخلوط تعلیم نہ صرف یہ کہ عائلی زندگی کو خوش گوار نہیں بناتی ہے بلکہ مثبت طور پر اسے ناخوش گوار بنانے کا کام انجام دیتی ہے۔"

● "جن ممالک نے مخلوط تعلیم کو اختیار کیا ہے، مثلاً روس، امریکہ، انگلستان، اسکاٹ لینڈ، اور مغربی یورپ کے مختلف ممالک، وہاں طلاقوں اور جھگڑوں کی بھرمار ہے، اگر مخلوط تعلیم عائلی زندگی میں خوش گواری پیدا کرنے کا باعث ہے تو کیا وجہ ہے کہ ان ممالک میں عائلی نظام کی بنیادیں ختم ہوتی جا رہی ہیں اور خود وہاں کے اہلِ فکر بھی اس صورتِ حال سے پریشان ہیں۔"

افسوس ہے پاکستان میں جو اسلام کی بنیاد پر اور اسلام کے لئے وجود میں آیا ہے، یورپ کی اس اخلاقی تباہی سے کوئی عبرت حاصل نہیں کی گئی: اور یہاں بھی مغرب کی طرح مخلوط تعلیم کی برائیاں، رائج پاتی جا رہی ہیں! نہ جانے پاکستان کے افق پر دین و اخلاق کا سورج کب طلوع ہوگا!

ذوقِ جمال

از:- عنوان چشتی، ضخامت ۱۲۸ صفحات، مجلد، سرورق انتہائی دیدہ زیب اور خوش خطی کا اعلیٰ نمونہ، قیمت ـــ روپے

ملنے کا پتہ:- مکتبہ جامعہ نگر، نئی دہلی۔

جناب عنوان چشتی جغرافیہ اور اردو کے ایم اے ہیں، جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اردو کے لیکچرر ہیں، تئیس سال کی عمر میں علم و ادب اور عروض و فن میں بہت کچھ ریاض کر چکے ہیں، شعر و ادب سے فطری مناسبت ہے اور اس جوانی میں ان کے کلام میں جو ثقاہت اور پختگی پائی جاتی ہے وہ ان کے شاندار مستقبل کی آئینہ دار ہے۔

عنوان چشتی کی غزلوں میں شاعری کی گوناگوں خوبیاں ملتی ہیں، کیف و نشاط کے ساتھ سوز و درد بھی اور ساتھ ہی لطیف بیان بھی: فن کا اکتساب انہوں نے جناب آبر احسنی گنوری سے کیا ہے مگر شاگرد کے کلام میں شاعری کا جو چٹخارا پایا جاتا ہے، وہ استاد کے کلام میں بس واجبی سا نظر آتا ہے! یہ وہ سعادت ہے جو زورِ بازو سے حاصل نہیں ہوتی۔

ع تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اپنے اس مجموعہ کلام پر "میری غزل" کے عنوان سے شاعر نے خود مختصر سا دیباچہ لکھا ہے اور پروفیسر محمد مجیب صاحب نے اس کتاب کو مرتب کیا ہے —— منتخب اشعار :—

عشق پھر عشق ہے آشفتہ سری مانگے ہے — ہوش کے دور میں بھی جامہ دری مانگے ہے
ہائے آغازِ محبت میں وہ خوابوں کا طلسم — زندگی پھر وہی آئینہ گری مانگے ہے
میں وہ آسودۂ جلوہ ہوں کہ تیری خاطر — ہر کوئی مجھ سے مری خوش نظری مانگے ہے

دیوانوں کا بھیس بنالیں یا صورت شہزادوں کی
دور سے پہچانی جاتی ہے، شکل ترے بیماروں کی

یوں مجھے ناز سے دیکھا اس نے — پیار اک دادِ طلب ہو جیسے
ماہ رو کے ہوئے اک مدت سے — کوئی دوشیزہ کھڑی ہو جیسے
اس طرح مل کے جھکی ان کی نظر — سجدۂ سہو کیا ہو جیسے
اُف یہ تنہائیِ دل کا عالم — زندگی ایک خلا ہو جیسے
اپنی زلفیں مرے شانوں پہ بکھر جانے دو — دو گھڑی گردشِ دوراں کو ٹھہر جانے دو
لاکھوں سلام شوخیِ رفتارِ یار کو — جینا سکھا دیا ہے نسیمِ بہار کو
تیری نسبت سے ملا ہے مجھے یہ ذوقِ جمال — مسکراتی ہوئی ہر چیز غزل ہو جیسے
بجھا چکا ہوں ترے انتظار کی شمعیں — کھلا ہوا ہے مگر شام ہی سے دروازہ
تکلفات بھی قربان، سادگی بھی نثار — یہ تیرا پھول سا چہرہ یہ فسوں سا غازہ
ابھی کم کم ہے ترے قرب کی خوشبوئے دست — زندگی اور مہک جائے تو کچھ شعر کہوں
اپنی نگاہ میں بھی سبک ہو رہا تھا میں — اچھا ہوا کہ تم نے نظر سے گرا دیا
آدمی توجہ سے کام لے تو دنیا میں — دل کی ایک دھڑکن سے سو جہاں بدلتے ہیں
کچھ اس ادا سے میں نے کیا اُس کا تذکرہ — کتنے ہی خوش جمالوں کے چہرے اتر گئے
ابھی سے بخش دیے غم یہ کیا کیا تم نے — ابھی تو دل مرا شائستۂ غم بھی نہیں
ابھی ابھی تری محفل سے اٹھ گیا ہوں — بہت قریب سے دیکھی ہے زندگی میں نے
ہر بار یہ رہ رہ کے ہوتا ہے گماں مجھ کو — شاید ترے جلووں کو دیکھا تھا کہیں پہلے
یہ بات الگ چھیڑی اب ہم کو نہ پہچانیں — محفل میں مگر ان کی آتے تھے ہمیں پہلے
یہ رازِ محبت ہے سمجھے گا زمانہ کیا — تم حاصلِ دیں آخر غارت گرِ دیں پہلے
دیوانوں کے داماں سے پھولوں کے گریباں تک — وحشت کا تصرف ہے صحرا سے گلستاں تک
ان کے جلوے عام ہیں لیکن — اپنا اپنا ذوقِ نظر ہے

مجھے یہ فرقِ رنگ و نکہت نہیں گوارا نہ بھول ساقی
خزاں کے پہلو میں غنچہ و گل بہار پر ہیں جمیل ساقی

اے شامِ خندہ! تیرا کیا خیال ہے ۔۔۔ بادلوں کی چاندنی کو کفن کہہ سکا ہوں میں ۔۔۔ (ص ۱۱۳)

بادلوں کی چاندنی ——— پھر اس کو "کفن" کہنا ؟ آخر یہ بات کیا ہوئی ؟ یہ جو نام نہاد "ترقی پسند شاعری" کی عام وبا پھیلی ہوئی ہے اس شعر پر اس کی چھینٹ شاعر کو لگ گئی !

"سفر دتی جمال" اس قابل ہے کہ ہر حلقہ میں اس کی پذیرائی کی جائے، جناب عنوان چشتی کے آہنگ میں انفرادیت پیدا ہو چلی ہے، اس کتاب کی اشاعت سے ان کی شاعری کا شاندار مستقبل جھلک دکھلا رہا ہے ۔

خطبہ صدارت

از :- مالک رام ایم اے، ضخامت ۲۹ صفحات ،
(کتابچہ پر نہ تو قیمت درج ہے، اور نہ ملنے کا پتہ ؟)

آل انڈیا اورینٹل کانفرنس ماہ اکتوبر ۱۹۶۶ء میں اس مرتبہ علی گڑھ میں منعقد ہوئی تھی، جس کے شعبہ اردو کی صدارت کے فرائض جناب مالک رام نے انجام دئے، ان کا خطبہ نہایت ہی دیدہ زیب شکل میں شائع ہوا ہے ،

اس خطبہ کا موضوع ——— اردو میں تحقیق ——— ہے اور کوئی شک نہیں اپنے موضوع پر یہ ایک محققانہ مقالہ ہے، فاضل مضمون نگار نے اردو کے بڑے دیدہ وری کے ساتھ جائزہ لیا ہے، یہ مقالہ لکھنے والے کی وسعت مطالعہ کی شہادت دیتا ہے یہ ایک عالمانہ خطبہ ہے جس کے مطالعہ سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے اور تحقیق و کتابت کے نئے گوشے نگاہ کے سامنے آتے ہیں :

بعض کا بہا اہلِ قلم پر مقالہ نگار کی تنقید کھٹکی ، یہ اس خطبہ کا کمزور پہلو ہے ، مجموعی طور پر یہ خطبہ پڑھنے اور غور کرنے کی چیز ہے ۔

صلیب درد

از :- سہیل اختر ، ضخامت ۱۳۳ صفحات ، مجلد ، رنگین گرد پوش ، قیمت چار روپے
ملنے کا پتہ :- پیراماؤنٹ بُک کارنر ، ڈیرہ نانک خاں

جناب سہیل اختر جوان سال شاعر ہیں فارسی اور اردو کے ایم - اے ہیں ان کی کئی کتابیں چھپ کر منظر عام پر آ چکی ہیں نظم کے علاوہ وہ نثر بھی لکھتے ہیں، ان کا مجموعہ کلام ——— صلیب درد ——— ہمارے سامنے ہے جس پر ... قریشی صاحب نے مقدمہ تحریر فرمایا ہے !

سہیل صاحب نے اپنے مجموعہ کا "انتساب" ———

"سمندر پر رقص کرتی ہوئی آگ زرد لہروں کے نام" کیا ہے ؟

جن میں

"سوائے کھاری پانی کے اور کچھ نہیں ہوتا"

اس "انتساب" میں جدت تو ہے مگر اس کی "اشاریت" سمجھ میں نہیں آئی ! انتساب تو کسی ایسی شخصیت یا شے سے ہونا چاہئے جس میں عظمت و محبوبیت ادبیت کی کوئی جھلک پائی جاتی ہو ! اگر یہی روش پڑی تو بہت سارے ادیب اپنی تخلیقات کو اینٹ پتھروں گھاس پھونس اور خار و خس سے منسوب کیا کریں گے

سہیل اختر کے کلام میں شدت احساس کے ساتھ "سچائی" پایا جاتا ہے اُن کی محبت دھیمی آنچ نہیں ، شعلہ جوالہ کی مانند ہے ، غم دوراں کے ساتھ غم جاناں کے امتزاج نے اُن کی شاعری کو دو آتشہ بنا دیا ہے، ہمیں اس کتاب کے مقدمہ نگار کی اس رائے سے اتفاق ہے :-

"سہیل اختر کی غزلوں میں ہمیں مستقبل کے اہم شاعروں کے ابتدائی آثار نظر آتے ہیں "

"صلیب درد" کے منتخب اشعار :-

ہو گئے گل تیرے آنچل کی ہوا سے وہ دیئے	نہ دیئے جو بادِ مخالف کی چلے ہوں برسوں
جانتے تھے مآلِ الفت کا	پھر بھی اے دوست، تجھ کو پیار کیا

مے پرستی نہ چھٹ سکی ہم سے — عزم توبہ ہزار بار کیا
تیرے کوچے کی سمت آ نکلے — جب کبھی دل نے بیقرار کیا
کس قدر تھا مختصر عہد نشاط — مسکراتے ہی کلی مرجھا گئی
کبھی اپنی جفائیں یاد کرکے — وہ دل ہی دل میں شرماتے تو ہوں گے
ہم فقیروں نے کچھ نہ پا کر بھی — تیرے حق میں ہمیشہ دعا کی ہے
ہم نے اپنی یہ داستاں اختر — در و دیوار سے سُنا کی ہے
تیرے بغیر دیدہ و دل کے حسیں چراغ — جلنے کو جل رہے ہیں مگر روشنی کہاں
آسماں پہ یہ مہ درخشندہ — تیرے قدموں کا نشاں ہو جیسے
ہم اہل دل کا رہ غم میں ساتھ چھوڑ گئی — تری وفا کہ تھی عمر گریز پا کی طرح
پھر اضطراب بڑھا گئی ہے اک شعلہ رو کا قرب — آتی ہے نیند دل کو شراروں کی چھاؤں میں
یوں سینہ نگار میں روشن ہیں داغ دل — جلتے ہوں جیسے دیپ چناروں کی چھاؤں میں

دوسرا رخ :—

ہم رہ شوق میں تنہا ہی چلے ہیں ورنہ — پھر بھی ہم سے در و دیوار جلے ہیں برسوں

"تنہا" سے شاعر نے شعر میں آخر کیا فائدہ اٹھایا ہے، اگر ہم رہ شوق میں دوسروں کے ساتھ چلتے، تو کیا در و دیوار کو پھر جلن نہ ہوتی؛ اور جو کوئی در و دیوار کے سایہ میں نہیں چلتا، اس سے در و دیوار آخر کیوں جلتے ہیں! شاید اس میں یہ "اشاریت" ہو کہ دنیا میں جن لوگوں کا ہم احسان تک نہیں لیتے وہ بھی بلا وجہ ہم سے کد رکھتے ہیں!

دل کو پھر گھیر رہے ہیں وہ اندھیرے دوست — تیرے عارض کی ضیا سے جو ٹلے تھے اے دوست

"جو ٹلے تھے اے دوست" اس مصرعہ میں قافیہ (ٹلے) نے شعر کو وجدان کے لئے تکلیف دہ بنا دیا۔

سایہ دل شکستہ پہ گا کر خوشی کے گیت — میں حسرتوں کے دل کو بھاتا چلا گیا (ص ۱۸)

اگر مصرعہ ثانی میں کتابت کی غلطی نہیں رہ گئی —— تو یہ مہمل مصرعہ ہے۔

جب کبھی زلف حسیں لہرا گئی — آئینہ دل پہ جوانی آ گئی (ص ۲۰)

نو مشقوں کا سا انداز :

توڑ کر جذب و محبت کا حسیں پیمانہ — میرے شیرازۂ ہستی کو پریشاں کر دو (ص ۲۲)

جذبۂ محبت کا پیمانہ کیا ہوتا ہے؟

دو الفت میں اپنی شکست گامی — وہ اب محسوس فرماتے تو ہوں گے (ص ۲۵)

"اب" سے کیا مراد ہے؟ شاید وہ زمانہ جب طرفین کے درمیان تعلقات نہیں رہے۔ مصرعہ اولیٰ خیال کے اعتبار سے بھی پست ہے۔

زیست ساون کی جھڑی ہو جیسے — اور کئی دن سے کھڑی ہو جیسے (ص ۳۰)

"کھڑا ہونا" بادل اور گھٹا کے لئے آتا ہے، جیسے "صبح سے گھٹائیں کھڑی ہوئی ہیں"۔ "جھڑی" کے لئے "لگنا" آتا ہے۔ — "دوپہر سے جھڑی لگی ہوئی ہے"۔

ہم ترے لب کی حلاوت کے لئے تلخیٔ غم کی ڈگر سے گزرے (ص ۳۳)

جس شعر میں "لب" حلاوت، "تلخیٔ غم" اور "گزرے" جیسے فارسی اور عربی کے شیریں، سبک اور نرم الفاظ ہوں، اُن کے درمیان "ڈگر" کتنا ثقیل لفظ آ گیا ہے۔

ہم تصور کے سنہرے آنچلوں میں جا اٹکے ہجر کی ناگن سی گھڑیاں ہاتھ ملتی رہ گئیں (ص ۴۰)

یہ ہے وہ "ترقی پسندانہ انداز" کا اسلوب بیان" جس نے شعر و ادب کے مزاج کو بگاڑ دیا ہے۔

مری مژہ پہ مری زیست کا لہو تو نہیں یہ شب چراغ کہیں داغِ جستجو تو نہیں (ص ۴۴)

مصرعِ ثانی خوب نہیں، بہت خوب ہے مگر مصرعِ اولیٰ میں "زیست کا لہو" مہمل ہے۔ "مرا خونِ آرزو" آ سکتا تھا۔

وہ پھول جو شبنم کے تلطف کے کھلے تھے آفات کی اس دھوپ میں کس درجہ سڑے ہیں (ص ۴۳)

توبہ! —— وجدان کو ابکائی آنے لگی!

تند لمحات کے فسوں کے لئے صورتِ سم رہی ہے تیری یاد (ص ۵۴)

"تند لمحات" اور پھر اُن کا "فسوں" اُس پر ستم یہ کہ "یاد کا صورتِ سم رہنا" کوئی کل بھی اس شعر کی سیدھی نہیں ہے۔

یہ تمنا بھی سہی کوششِ ناکام کے بعد کاش لیں نام مرا لوگ ترے نام کے بعد (ص ۶۷)

آخر بات کیا ہوئی؟ عشق میں کون اس کی کوشش کرتا ہے کہ محبوب کے نام کے بعد عاشق کا نام لوگ لینے لگیں! پھر شاعر کو اس کا تجربہ کیسے ہوا کب یہ شعر جس ٹکڑے (یہ تمنا بھی سہی) سے شروع ہوتا ہے، اور تو وہی کمزور ہے۔

ناگن سی ایک رات ہے اور ہم ہیں دوستو دل ہے حادثات ہے اور ہم ہیں دوستو (ص ۹۰)

بچکانہ اندازِ بیان!

دیدہ و دل میں کشتی ہو تو غزل ہوتی ہے حسن نیزے کی انی ہو تو غزل ہوتی ہے (ص ۹۴)

"حسن" کو "نیزے کی انی" کہنا، حسن اور شاعری دونوں کے ساتھ مذاق ہے۔

پھر دل ہے بیقرار سبب ہر دن کی چھاؤں میں اک پل کو آ بھی جاؤ ستاروں کی چھاؤں میں (ص ۱۰۰)

"بہانہ" کی جمع یہاں کھٹکتی ہے، شاعر شاید کہنا یہ چاہتا ہے کہ دل موسمِ بہار میں بھی بے قرار ہے، تم ذرا سی دیر کے لئے رات میں کسی وقت آ جاؤ۔

رکھ دیا ہو جس نے الطاف سے جیسے عارض اس قدر نرم و خنک جیسے ہوا کا جھونکا (ص ۱۱۱)

"الطاف" —— "لطف و کرم" کی بجائے استعمال ہوا ہے! محبوب کے رخسار کی ہوا کے نرم و خنک جھونکے سے تشبیہ عجیب تشبیہ ہے۔

ہمارے خوابِ ویراں کی غزالہ اک توقف کر

کسی دن تیرے خوابوں میں بھٹک کر ہم بھی دیکھیں گے (ص ۱۱۴)

"اک" شعر میں کتنا اکھڑا اکھڑا لگتا ہے! دوسرا مصرعہ مبہم نہیں مہمل ہے۔

میری گمنام محبت کا لرزتا دامن تیرے آنچل سے جو چھو جائے کہانی بن جائے (ص ۱۲۴)

"گمنام محبت" کا "لرزتا دامن" کیا ہوتا ہے۔ پھر وہ لرزتا دامن محبوب کے آنچل سے چھو جانے سے حقیقت کی بجائے آخر "کہانی" کیوں بن جائے گا!

جدید شعرا جن ترقی پسند شاعروں کو اپنے نزدیک عظیم شاعر سمجھتے ہیں خود ان کے یہاں فکر و بیان اور زبان و محاورہ کی فاحش غلطیاں ملتی ہیں اسی لئے ان کے مقلدین شروع "غلط نگاری" اور غلط اندیش ہو جاتے ہیں! —— ہمیں اکبر صاحب اگر کسی طرح "ترقی پسندی" کے خارزار سے دامن بچا کر شعر و سخن کی وادیٔ ایمن کا رخ کریں تو وہ مستقبل میں بہت کچھ ترقی کریں گے! کاش! وہ نام نہاد "ترقی پسندی" کے گرد و غبار سے اپنے ذہن و فکر کو پاک و صاف کر سکیں۔

مارچ ۱۹۶۷

جلد ۱۸

شمارہ ۱۲

ماہنامہ فاران کراچی

ایڈیٹر ۔۔۔۔۔ ماہر القادری

ترتیب

نقش اول	ماہر القادری	۳
وحی الٰہی	سید معروف شاہ ایم ۔ اے	۸
قرآن اور انسانی نفسیات	مولانا شمس تبریز خاں	۱۳
وحشت کی شاعری میں اسلامی رجحانات	وقار راشدی ایم ۔ اے	۲۱
تکفیر اور اس کی حدود	پروفیسر ضیاء احمد بدایونی	۲۴
مولانا مفتی محمد یوسف صاحب کے دو مکتوب	۔۔۔۔۔	۲۸
معیاری حکومت ۔ مثالی حکمراں	محمد نعیم صدیقی	۳۷
ایک حکیمانہ حدیث کا پس منظر	محمد زکریا مائل	۴۳
یاد رفتگاں	ماہر القادری	۴۶
ہماری نظر میں	۔۔۔۔۔۔۔۔۔	۵۶

چندہ سالانہ :- سات روپے | پبلشر :- سرور حسین | قیمت فی پرچہ :- ۶۲ پیسے

مقام اشاعت :- دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱

(سرور حسین پبلشر نے انٹرنیشنل پریس کراچی میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱ سے شائع کیا۔)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

کمیونزم کی بنیاد اللہ تعالیٰ کے وجود کی نفی اور انکار پر ہے، اللہ تعالیٰ کے انکار کے بعد "آخرت" کے تصور کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایک کمیونسٹ کے نزدیک تو یہی مادّی دنیا سب کچھ ہے، کھاؤ، پیو، مزے کرو، عیش اڑاؤ اور مر جاؤ، موت زندگی کا ڈراپ سین ہے، پھر نہ کوئی دوسری زندگی ہے نہ کوئی برزخ اور یوم الحساب ہے اور نہ انسانی اعمال پر جزا اور سزا کا کوئی امکان ہے۔

؎ بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

جس طرح ایک کمیونسٹ کسی ملک میں انقلاب لانے کے لئے ہر قسم کا ظالمانہ حربہ اور سفاکانہ تدبیر اختیار کر سکتا ہے مثلاً یہ کہ صرف انتشار پیدا کرنے اور عوام کو بدحواس بنانے کے لئے کسی ٹرین کو بم سے اڑا دے یا عوام کے اجتماع میں گولی چلا دے، اسی انداز پر کمیونسٹ حکومتیں بھی کسی اخلاقی ضابطہ کی پابند نہیں ہیں، وہ اپنے بڑے سے بڑے لیڈر کو حکومت کی کسی پالیسی سے اختلاف کی پاداش میں گولی سے اڑا سکتی ہیں، روسی حکومت میں بیریا کا جو حشر ہوا وہ ہمارے سامنے ہے! وہاں ملزموں کو اپنی صفائی میں بولنے تک کی بھی آزادی نہیں ہے، حکومت جس کو ملزم سمجھتی ہے اس کو پولیس کے ذریعہ ایسے سخت عذاب میں مبتلا کیا جاتا ہے کہ وہ ناکردہ گناہ اقرارِ جرم پر مجبور ہو جاتا ہے، کمیونسٹ ملکوں کی عدالتیں بھی انصاف کے تقاضوں کو برائے نام ہی پورا کرتی ہیں۔

کمیونسٹ حکومتوں میں، حکومت کے کسی فعل پر کوئی تنقید نہیں ہو سکتی: کوئی مظلوم اور مصیبت زدہ کسی قسم کا کوئی احتجاج نہیں کر سکتا، اشتراکی ریاستوں میں اخباروں پر حکومت کا پوری طرح قبضہ ہوتا ہے، وہ عوام کے کسی فرد کا ایک حرف احتجاج بھی شائع نہیں کر سکتے، حکومت سے کسی قسم کا نرم سے نرم مطالبہ یا احتجاج کرنے کے لئے کوئی جلسہ منعقد نہیں ہو سکتا، حکومت کی خارجہ حکمت عملی ہو یا داخلی پالیسی، اس پر رائے زنی اور نقد و جرح کا کسی کو حق نہیں ہے۔ ریڈیو، پریس، ٹیلی ویژن اور نشر و اشاعت کے دوسرے ذرائع بالکلیہ حکومت کے ہاتھ میں ہوتے ہیں، عوام ان سے استفادہ ہی نہیں کر سکتے حکومت کی کسی بھی پالیسی پر عوام کا کوئی ردِّ عمل پریس میں نہیں آ سکتا، پورا ملک قید خانہ بنا ہوا، عوام بالکل بے اختیار ہو کے رہ گیا!

وہ جو قدیم زمانہ میں کہا جاتا تھا کہ ـــــ

"بادشاہ غلطی نہیں کر سکتا"

یہی شاہانہ، اور جاگیردارانہ عقیدہ کمیونسٹ ملکوں میں زندہ اور پائندہ ہے کہ حکومت غلطی نہیں کر سکتی۔ "بادشاہ" کی جگہ اب "حکومت" نے لے لی ہے ـــ شہنشاہیت، مطلق العنانی اور آمریت جوں کی توں کمیونسٹ ملکوں میں موجود ہے بلکہ پہلے سے زیادہ طاقت اور وسعت کے ساتھ موجود ہے۔

کمیونسٹ حکومتیں درحقیقت اس جمہوری دور میں امپیریلزم اور ڈکٹیٹرشپ کی روایات گراں کی تمام خصوصیات کے ساتھ قائم کئے ہوئے ہیں، کہنے کو

"میرزم" سرمایہ داری اور جاگیردارانہ نظام کے خلاف مزدوروں کی تنظیم ہے مگر دراصل کمیونسٹ حکومت خود اپنی جگہ سرمایہ دار بھی ہے اور جاگیردار بھی ہے ؛ وہ عوام اور خاص طور سے مزدوروں کی معاشی ضرورتوں کا اہتمام کرتی ہے اور انہیں بھوکا مرنے نہیں دیتی ، مگر اس اہتمام کی حیثیت قید خانوں کی زندگی جیسی ہے جہاں قیدیوں کو حکومت کی جانب سے کھانا بھی ملتا ہے طبی سہولتیں بھی مہیا کی جاتی ہیں اور ان کو دست کاری بھی سکھائی جاتی ہے ۔

کمیونسٹ حکومتوں کے یہاں اخلاق و پاکیزگی کا کوئی ضابطہ سرے سے موجود ہی نہیں ہے ، شراب ، زناکاری ، مرد و زن کا بے باکانہ اختلاط رقص و سرود یہ تمام فواحش کمیونزم کے نزدیک "آرٹ" اور انسان کی فطری ضرورت سمجھے جاتے ہیں ۔

فلمی میلے اور رقص و سرود کے ماہرین اور فنکاروں کے وفود کا غیر ملکوں میں جانا یہ بھی کمیونسٹ حکومتوں ہی کی ایجاد کی ہوئی رسم ہے کہ تمام فواحش کو رواج دینے اور انہیں مقبول بنانے کا مقصد یہ ہے کہ کسی طرح اس اخلاقی حس کو نقصان پہنچایا جائے جو خدا اور آخرت سے کسی نہ کسی طرح میں وابستگی اور ربط و تعلق رکھتی ہے ۔

جو جاہ پسند لوگ ایک بار حکومت کی کرسی پر بیٹھ کر پھر اس سے اترنا ہی نہیں چاہتے اور آخری سانس تک تخت اقتدار پر جمے رہنے کی خواہش رکھتے ہیں ان کو فرماں روائی کے گر کمیونسٹ حکومتوں سے سیکھنا چاہئیں جو کتنی اچھی حیثیت کے افراد کے لئے مثالیں اور نمونے ہیں کہ اگر تم اپنے اقتدار کا دوام چاہتے ہو ، تو ہماری تقلید کرو ، عوام کو اس طرح شکنجے میں کسو کہ وہ سب چاہتے ہوئے بھی چوں بھی نہ کر سکیں ، یہاں تک کہ انقلاب قیادت کا تصور بھی ان کے ذہن سے نکل جائے ؛ عوام کو بے اختیار کر دو اور بے بس بنانے کے جو ہتھکنڈے کمیونسٹ حاکموں کی تقلید میں وہ ان ہمنام پر بادشاہوں کو کہاں آ سکتے ؟ جن کا نام تن کہہ کر کوئی تعریف سمجھتا ہے ؛

جمال ناصر کی زندہ مثال ہمارے سامنے ہے مصر کے اس مطلق العنان فرماں روا نے کمیونسٹ حکومتوں کو نمونہ بنا کر ان ہی کی مثالیں سامنے رکھ کر مصر میں جو غضب ڈھائے ہیں وہ سب پر ظاہر ہیں ؛ دین کی جمہوریت کی آزادی اور اخلاق و شرافت کی وہ کون سی قدر ہے جسے اس شخص نے صحیح سلامت رہنے دیا ہے ؛ یہ شخص اچھی طرح جانتا ہے کہ جب تک مسلمانوں کا اسلام اور اسلام کی روایات سے تعلق اور وابستگی رہے گی ، جمال ناصر کی شخصیت "الٰہ" نہیں بن سکتی ؛ اسلام کی وحدت کو ختم کرنے کے لئے "عرب قومیت" کی تحریک شروع کی گئی ، جو دراصل برامکہ کی "شعوبیت" کی طرح اسلامی وحدت اور دینی مرکزیت کے خلاف خطرناک سازش ہے ، اس تحریک کو دل و دماغ پر غالب کرنے کے لئے قاہرہ کی سب سے زیادہ معروف شاہراہ پر "فرعون اکبر رعمسیس دوم" کا مجسمہ نصب کیا گیا ہے ، اور "نحن ابناء الفرعون" (ہم فرعون کی اولاد ہیں) کے نعرے کو عام کرنے کی بھرپور جد و جہد جاری ہے ۔

اس اسلام دشمنی پر ٹوکنے والی واحد جماعت "اخوان المسلمون" تھی اس کی سیاست و اقتدار کو جمال ناصر نے اپنے اقتدار کا حریف سمجھ کر سب سے پہلے اسی کو شکار بنایا ۔ "اخوان" کو تعذیب و اذیت کی جن صبر آزما مراحل سے گزرنا پڑا ہے ، اس پر خون کے آنسو بہا کر بھی تعزیت اور اظہار غم کا حق ادا نہیں ہو سکتا ، عبدالقادر عودہ ، سید قطب اور ہضیبی یہ وہ شخصیتیں تھیں کہ اس مادیت زدہ دور میں دینی علم و فضل کا بھرم ان سے قائم تھا مگر سے

شمعیں گل کر دی گئیں ، باقی دھواں رہنے دیا

"اخوان" پر بجلیاں ٹوٹ رہی تھیں اور دیندار حلقے مطمئن تھے کہ ظلم و ستم کی یہ بجلیاں "اخوان" کے آشیانوں کو خاکستر بنا کر ، ادھر نہ ہی گرنے جائیں گی ، ہم پر کوئی آنچ نہ آسکے گی ، مگر ان کی خود غرضی ، خوش فہمی اور غلط اندیشی تھی ۔ "اخوان" کی تباہی کے بعد مصر کے دینی حلقوں کا اثر و نفوذ بھی ختم کر دیا گیا ، مصر کے مفتیوں کے قسم جمال ناصر کی مرضی کے خلاف مشکل ہی سے حرکت میں آسکتے ہیں ، جو علماء اس جابرانہ ماحول میں بھی دینی مسائل میں اظہار حق کی جرأت کر جاتے ہیں ان کی آواز پریس اور ریڈیو کے ذریعہ دوسروں تک پہونچنے نہیں دی جاتی ۔

جمال ناصر نے اپنے اقتدار کو دوام اور استحکام دینے کے لئے جیسا دستور بھی ضروری جانا وہ بنا دیا گیا اور اسے نافذ بھی کر دیا گیا جس کی رو سے

مرحبا ! صبر ابن علی مرحبا
غم کے ماروں کو اک آسرا ہو گیا

حق و صداقت کی راہ پھولوں کی سیج نہیں بلکہ ایسا پُرخطر راستہ ہے جہاں کانٹوں پر چلنا پڑتا ہے، بعض اوقات تلوار کی دھار پر چلنا پڑتا ہے، ہر قدم امتحان، ہر موڑ پر نازک مرحلہ اور ہر نازک مرحلہ کے بعد اور زیادہ پُرخطر راستہ، حق و صداقت کا راستہ جان و مال کی قربانی کی منزل سے گزرتا ہے !

اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

دنیوی محبوب کے لئے اہل ہوا و ہوس اپنا سب کچھ لٹا دیتے ہیں خدا سے محبت کرنے والے اگر تن آسان، نفس کے پرستار اور مفاد پرست ہو جائیں تو اخلاق و انسانیت کی سب سے بڑی ٹریجڈی ہے !

سازگار ماحول میں تو ہر کوئی کچھ نہ کچھ کر سکتا ہے، اہل حق کی آزمائش تو ناسازگار فضاؤں میں ہوتی ہے جہاں ہر طرف مخالفتوں کی یلغار نظر آتی ہے قدم قدم پر دل شکن حالات سے سابقہ پڑتا ہے ایسے نازک حالات میں ظالموں کو غالب دیکھ کر بعض لوگوں کے عقائد متزلزل ہو جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ظلم کو پسند نہیں کرتا اس کی دنیا میں ظالموں کو ظلم و ستم ڈھانے کی چھٹی ملی ہوئی ہے اور مظلوموں کی کوئی فریاد اور آہ و شیون کارگر نہیں ہوتی دعائیں مستجاب نہیں ہوتیں انتہائی ناسازگار حالات میں اس قسم کے اندیشے جو ذہن میں آتے ہیں اور طرح طرح کے اوہام پیدا ہوتے ہیں یہ دراصل نتیجہ ہیں اس کمزوری کا کہ بعض لوگوں کے ذہن سے "آخرت" کا تصور اوجھل ہو جاتا ہے اور اس کا خیال بھی نہیں رہتا کہ یہ دنیا دارالجزاء نہیں دارالعمل، مقام آزمائش و ابتلا اور امتحان گاہ ہے !

اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے تو ظلم کا سلسلہ اور جبر و زیادتی کرنے والوں کو اس دنیا میں بھی ان کی بد عملیوں کی تھوڑی بہت سزا دے دیتا ہے مگر نیکی و بدی کی اصل جزا و سزا تو بعد آخرت میں ملے گی اور عالم آخرت وہ عالم ہے جس کی جتنی زیادہ رسائیاں ہوں گی اتنی ہی سخت باز پرس اس سے ہوگی، اور نہ جانے کتنے صاحب تخت و تاج جو دنیا میں مالک رقاب اور امیر بنے ہوئے تھے اور جن کے ناموں کے خطبے پڑھے جاتے تھے، اور جن کے رو برو کسی کو مجال دم زدن اور یارائے گفتگو نہ تھا قیامت کے دن قیدیوں، جواریوں اور مجرموں کی طرح کھنچے کھنچے پھریں گے اور اس دن وہ پچھتائیں گے کہ کاش! ہم نے وہ کام نہ کئے ہوتے جو اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہیں مگر اس دن پچھتانے سے کسی کو کوئی فائدہ نہ ہوگا، قیامت قائم ہوتے ہی توبہ کا دروازہ بند کر دیا جائے گا اور پھر توبہ و ندامت اور استغفار ان میں سے کوئی چیز کچھ بھی نفع نہ دے سکے گی ! حق و صداقت کی خاطر جن کو دنیا میں پامال کیا گیا ہے جو ستائے گئے اور ذلیل کئے گئے ہیں وہ قیامت کے دن سرخرو ہوں گے اور بشارت کے مستحق ہوں گے! یوم حساب دراصل ظالموں کے لئے ذلت و عذاب اور مظلوموں کے لئے عزت اور بشارت کا دن ہے۔

اللہ تعالیٰ کی حکمت و مشیت کے اسرار، انسانوں کی فہم و دانش اور عقل و بصیرت سے ماوراء ہیں، یہاں ظالموں کی گرفت بھی ہوتی ہے انہیں ڈھیل بھی دی جاتی ہے، حق پسندوں کو مظلومیت کے دور سے بھی گزارا جاتا ہے، بعض اوقات خدا شناس دانا و فرزانہ کو ستائے جاتے ہیں اور منکرین خدا بلکہ دشمنان خدا کے یہاں شہد اور دودھ کی نہریں بہتی ہیں ! فاسقوں فاجروں اور اللہ تعالیٰ کے دین سے بغاوت کرنے والوں کو اس دنیا میں سرداریاں دی جاتی ہیں اور ان کی خدمت میں سپاسنامے پیش کئے جاتے ہیں مگر نیکوکار اور اللہ تعالیٰ کے اطاعت گزار بندوں کو گالیاں اور پتھر کھانے پڑتے ہیں !

حضرت امام ابو حنیفہ، حضرت امام مالک، حضرت امام احمد بن حنبل اسلامی تاریخ کی عظیم شخصیتیں ہیں، ان کا اس کے سوا کیا قصور تھا کہ خدا کے یہ نیک بندے معروف کی تبلیغ کرتے تھے اور خیر و فلاح کی طرف امت کو بلاتے تھے۔ اور معصیت اللہ میں حکمرانوں کی اطاعت نہیں کرتے تھے مگر کافروں نے نہیں مسلمان فرمانرواؤں نے ان کے ساتھ جو ظلم روا رکھا ہے انسانی نفوس قدسیہ

نے جس عظیم الشان عزیمت و استقامت کا ثبوت دیا ہے اُس میں مظلوموں اور حق پسندوں کے لئے بڑی تسلی اور عبرت ہے ۔

اللہ تعالیٰ کی رضا پیشِ نظر ہو تو پھر دنیا کی ہر سختی اور مصیبت کا خیر مقدم کیا جا سکتا ہے ! ہاں ! یہ ضرور ہے کہ خواہ مخواہ بلیات میں پڑنے اور مصیبت میں مبتلا ہونے کی کوشش نہیں کرنی چاہیئے ؛ مگر جب کوئی مصیبت آن پڑے تو صبر و استقامت کے سا[illegible] اُسے برداشت اور گوارا کرنا چاہیئے ؛

ہر حال میں حق پر جمے رہنا ، اُسی کے لئے کام کئے جانا ، یہ ہے مردِ مومن کا کردار ، یہاں تک کہ اسی جدوجہد کے عالم میں موت آجائے ؛ اور خاتمہ اس طرح ہو کہ عالمِ غیب سے " اولٰئک هم المفلحون " کی صدائیں آرہی ہوں ؛

ماہر القادری

۲۲ فروری ۱۹۷۶ء

سید معروف شاہ ایم۔اے
(رفیق ادارۂ معارف اسلامی کراچی)

یہ کرۂ ارض ایک مدت سے انسان کا مسکن ہے۔ یہاں انسان نے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ قوتوں اور صلاحیتوں سے شبِ تاریک کو چراغ اور بجلی کے قمقموں سے روشن کیا، سنگلاخ سے باغ ڈھالے اور دشتِ خارزار کو گلزار بنا دیا —— یہ کرۂ ارض جو ہمارا مسکن ہے، ہماری جستجو اور ذوقِ تلاش کا مرکز ہے۔ انسانی فکر اور فلسفہ ہائے حیات کے عظیم مسائل اسی زمین اور سکونت سے تعلق رکھتے ہیں، انسان نے ہر دور میں اس سوال پر غور کیا ہے کہ یہ جہان کیا ہے؟ یہ عالم کیسے وجود میں آیا؟ اس کا موجد و خالق کون ہے؟ اس جہان کی وجہِ تخلیق کیا ہے؟ خالق اور مخلوقات کا باہمی رشتہ کیا ہے؟ کیا یہ یونہی رہے گا؟ یا اس کا کوئی انجام ہونے والا ہے؟ یہ لوگ کہاں سے آرہے ہیں اور کدھر جا رہے ہیں؟
یہ اور اس قسم کے بے شمار سوالات ہیں جن پر انسان نے ہر دور میں غور کیا ہے اور کوشش کی ہے کہ وہ ان کے بارے میں کوئی تسلی بخش جواب پالے چنانچہ اپنی اپنی فہم کے مطابق ہمیشہ ہر انسان اس معمے کو حل کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے، دیکھئے موسیٰ علیہ السلام کی ملاقات اچانک ایک بالکل ان پڑھ چرواہے سے ہو جاتی ہے اور اس کے ذہن میں بھی اس معمے کا ایک حل تھا، خواہ اس کی تعبیر و توجیہ سے حضرت موسیٰ کو اتفاق ہو یا نہ ہو افلاطون اور ارسطو کے ذہنوں میں ایک حل تھا خواہ موسیٰ کا چرواہا اس سے اتفاق کرے یا نہ کرے۔

۱۔ انسان کے حسی اور ذہنی وسائل۔

انسانی غور و فکر کی تاریخ اور اس کے نتیجے میں سامنے آنے والا تمام ذہنی اور فکری لٹریچر شاہد عادل ہے کہ کسی دور میں بھی انسان محض اپنے ذہنی اور حسی وسائل سے معمۂ کائنات کو حل کرنے میں کامیاب نہیں ہوا، نہ اس بات کا ابھی کوئی امکان نظر آتا ہے کہ مستقبل میں انسان ایسا کر سکے گا۔ انسان کے علم کا دار و مدار انسان کی حواس پر ہے۔ اس کے مجمع مدرکات ہیں وہ حواسِ خمسہ کے مرہونِ منت ہیں یعنی سامعہ (سننے کی قوت) باصرہ (دیکھنے کی قوت) ذائقہ (چکھنے کی قوت) شامہ (سونگھنے کی قوت) اور لامسہ (چھونے کی قوت) یہ ہیں انسان کے ظاہری حواس۔ —————— ان کے علاوہ انسان کے پانچ باطنی حواس بھی ہیں مثلاً۔ حسِ مشترک" یہ حواسِ ظاہری کا تالاب خانہ ہے، ہمارے پانچ ظاہری حواس جن جن چیزوں کا ادراک کرتے ہیں وہ سب چیزیں حسِ مشترک کے اندر نقش ہو جاتی ہیں "خیال" یہ تمام معلومات کا اسٹور یا گودام ہے، جو معلومات حواسِ ظاہری سے ہو کر حسِ مشترک میں نقش ہوتی ہیں، یہاں آکر جمع ہو جاتی ہیں اور خیال میں جمع شدہ معلومات حافظہ کی طرف منتقل ہو جاتی ہیں اور بوقتِ ضرورت یاد آجاتی ہیں" واہمہ" یہ وہ قوت ہے

جو مدرکات کا جائزہ لیتی رہتی ہے اور ان کے متعلق احکامات صادر کرتی ہے ، مثلاً ہم نے دور سے ایک لمبی چیز دیکھی جو حرکت کر رہی ہے ، اس کا تو
بذریعہ حس مشترک خیال میں پہنچ گیا اور وہاں سے حافظہ میں پہنچا اب قوت واہمہ اس " مدرک " کے بارے میں احکامات صادر کرتی ہے مثلاً یا تو
لمبی چیز انسان ہے جو چلا آ رہا ہے یا یہ کہ کسی جھاڑی پر کپڑے پڑے ہیں جو اپنی جگہ پر حرکت کر رہے ہیں ۔ " متخیلہ " یہ بڑی اہم قوت ہے یہ ایک طرف
یہ تمام مدرکات میں تصرف کرتی ہے اور دوسری جانب اس کا تعلق روحانی دنیا اور عالم بالا سے بھی ہوتا ہے اور وہاں سے کشف و الہام کے ذریعہ نئے نئے
معلومات حاصل کرتی ہے لیکن عالم روحانی سے اس کا تعلق اس وقت قائم ہوتا ہے جب ظاہری حواس اپنا کام بند کر دیں یعنی نیند کی حالت میں ۔

بس یہ ہے انسان کی کل ذہنی کائنات جس کے بل بوتے پر طبیعات اور مابعد الطبیعات کے تمام راز فاش کرنا چاہتا ہے ۔ انسان کے ان
ذہنی قوتوں پر ، خواہ ظاہری ہوں یا باطنی ، ایک سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ہمارے تمام ظاہری مدرکات اور تمام علوم و تصورات کا واحد
ذریعہ حواس خمسہ ہیں ، یہ حواس جو مواد فراہم کر دیں انسان کا ذہن اور اس کی باطنی قوتیں اس کی بنیاد پر آگے بڑھتی ہیں ۔

سوال یہ ہے کہ کیا خود فلسفیوں اور دانشوروں کے نقطۂ نظر سے یہ بات ممکن ہے کہ انسان محض اپنی قوائے ذہنی کے سہارے کائنات کے
متعلق تمام سوالات کا جواب دے سکے اور طبیعت اور ماورائے طبیعت تمام حقائق کو جان سکے ۔ اگر اس سوال کا جواب نفی میں ہو تو پھر ہمارے سامنے
وحی الٰہی اور تعلیمات خداوندی کے اور کوئی ذریعہ علم ہی نہیں ، اس کے بغیر ہم ہمیشہ جہالت و بے خبری میں مبتلا رہیں گے اور کبھی " حقیقت " معلوم
اور روشنی تک نہ پہونچ سکیں گے ۔ اقبال نے نہایت لطیف انداز میں وحی اور تعلیمات الٰہی کو " دانش نورانی " کہا ہے اور انسان کے حواس کی بنا پر
حاصل شدہ علم کو دانش برہانی سے

اک دانش نورانی ، اک دانش برہانی
ہے دانش برہانی حیرت کی فراوانی

۲ :- علم کے ذرائع اور ان کے حدود ۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ سب سے پائیدار ذریعہ علم " مشاہدہ " ہے ۔ یعنی کسی چیز کو اپنی حواس کے ذریعہ سے پا لینا ۔ لیکن حواس کی جو حیثیت ہے ،
اس کے متعلق نکولا میرانس نے اپنی کتاب " جستجوئے صداقت " میں لکھا ہے :-

" غلطی کا ایک اور بڑا ماخذ یہ غلط یقین ہے کہ حواس جو حقیقت میں ہمیں محض عملی اغراض کے لئے عطا ہوئے ، ماہیت
اشیاء کو بھی ہم پر منکشف کر سکتے ہیں " ۔

یہی مصنف ایک دوسرے مصنف MONTAIGN کا حوالہ نقل کرتے ہیں :-

" انسان کا علم بہت ہی ناقص ہے ۔ اس کے حواس غیر یقینی اور مغالطہ پذیر ہیں ۔ ہم کبھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ انہوں نے حقیقت
ہی کو ہمارے سامنے پیش کیا ۔ حواس کی دنیا ایسی ہی معلوم ہوتی ہے جیسی ان کی حالت اور فطرت ہے اور ان سے خارجی اشیاء
نہیں بلکہ آلات حس کی کیفیت ظاہر ہوتی ہے ۔ حواس پر یقین کرنے کے لئے ہمارے پاس ایک آلہ ہونا چاہیے جو ان کی تصدیق
و تکذیب کر سکے ۔ اور اس آلہ کی جانچ کے لئے ایک اور آلہ ہونا چاہیے اس طرح یہ سلسلہ غیر متناہی ہو گا " ۔

جب یہ حواس ہی محدود ہو گئے تو ان کے ذریعہ حاصل شدہ علم کی کیا حقیقت ہوتی ۔ لیکن یہ مسئلہ یہاں آ کر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ ہماری بڑی
مصیبت تو یہ ہے کہ ان ناقابل اعتبار حواس کے ذریعہ بھی ہمارا ذخیرہ معلومات نہایت ہی قلیل ہے اور ہماری عقل کی حدود نہایت محدود ہیں ، ہمارے علم کی جو
حدود ہیں خود صف اول کے عقلاء کے خیال کے مطابق یہ ہیں :-

---

* اہل مشرق کے پاس تو یہ آلہ موجود ہے یعنی وحی الٰہی لیکن اہل مغرب شاید اسے پانے کے لئے صدیوں تک ... [illegible]

نہیں سمجھتا۔ اس سے بچنے کی بہترین تدبیر یہ ہے کہ ہم اپنے ادعا اور بلند آہنگی کو کم کریں۔ اعتراض کرنے سے پہلے ہم خود اس دشواری کو معلوم کر کے اس کا اعتراف کریں۔ لاعلمی کا یہ اعتراف خود ایک فضیلت ہوگی۔

۴۔ عقل کی نارسائی۔

ہر زمانے کے فلاسفروں نے اگر وہ ضد اور عناد میں مبتلا نہیں رہے ہیں تو ایک حد تک جا کر اپنی عقل کی نارسائی اور علم انسانی کی حدود کا اعتراف کیا لیکن جہالت کے اس اعتراف کے ساتھ ساتھ ہیوم نے اعتراف جہالت کی تبلیغ بھی کی ہے۔ وہ فلاسفہ کو مشورہ دیتا ہے کہ ان کے لئے بہترین راستہ یہی ہے کہ ایک حد تک جا کر اعتراف کریں کہ اس سے آگے ہم نہیں جا سکتے۔ عجیب یہ ہے کہ ما بعد الطبیعات میں جانا تو بڑی بات ہے ہم خود اپنے ذہن ہی کو نہیں سمجھ سکتے وفی انفسکم افلا تبصرون۔

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

یہ بیچارگی عقل پر تکیہ کرنے والے انسانوں کا المیہ ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ ہماری فکر کا المیہ ہے جو ہمیں ماضی سے میراث کے طور پر ملا ہے۔ یہی مصنف لکھتا ہے:—

"افعال ذہن کا یہ ایک عجیب خاصہ ہے کہ ایک طرف تو وہ ہمارے لئے نہایت مانوس اور حسی واقعات کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن دوسری طرف جب ہم ان پر غور کرنا چاہیں تو ایک تاریکی سی چھا جاتی ہے اور اس حد تک بھی نظر نہیں پہنچتی کہ ان کے باہمی فرق و امتیاز کے حدود ہی آسانی سے گرفت میں آ جائیں۔ بات یہ ہے کہ یہ افعال اس قدر لطیف اور نازک ہوتے ہیں کہ ایک حالت پر دیر تک قائم نہیں رہتے۔"

انسانی دماغ میں کس قدر قوتیں ہیں؟ وہ کس طرح کام کرتی ہیں۔ ان سے فعل کیونکر سرزد نہیں ہوتے۔ کون ہے جو اس نازک مشینری کو چلا رہا ہے۔—

"ذہن کا یہ خاص فعل جس کی بنا پر ہم معلولات سے علل اور علل سے معلولات کا استنباط کرتے ہیں چونکہ تمام نوع انسان کی بقا کے لئے اشد ضروری ہے اس لئے اس کو مغالطہ آمیز عقلی قیاسات کے سپرد نہیں کیا جا سکتا کیونکہ عقل و استدلال کا یہ حال ہے کہ بچپن کے ابتدائی ایام میں اس کا سرے سے پتہ نہیں ہوتا اور ایک کوئی زمانہ بھی انسانی زندگی میں نہیں آتا کہ جب کہ سے نہ درست عقل کی طرف سے بھی انتہائی لغزش اور خطا کا خطرہ نہ لگا رہتا ہو۔ لہٰذا قدرت کی اس عالمگیر حکمت کا اقتضا جو ہر جگہ نظر آتی ہے یہی تھا کہ وہ ذہن کے ایسے اہم اور ضروری فعل کو کسی ایسی جبلت یا میکانیکی میلان کی نگرانی میں دیدے جس کے افعال میں خطا کی گنجائش نہ ہو، جس کا سرشتہ زندگی اور فکر کے "اولین سرشتہ" کے پاس ہو اور جو عقل و فہم کے پر تکلف پیدا کئے ہوئے قیاسات سے آزاد ہو، جس طرح فطرت نے ہم کو اپنے ہاتھ پاؤں کا استعمال سکھا دیا ہے بغیر اس کے کہ ان کے اعصاب و عضلات کی مشین کا پہلے سے علم حاصل کریں، اسی طرح اسی "فطرت" نے ہمارے اندر ایک ایسا جبلی میلان بھی ودیعت کر دیا جو فکر و خیال کو اس راہ پر لگا دیتا ہے جس پر کہ کائنات خارجی چل رہی ہے گو کہ ہم خود ان طاقتوں اور جبلتوں کے بارے میں جاہل رہیں جن پر کہ خارجی اشیاء کی یہ منضبط اور مسلسل روش موقوف ہے۔"[1]

ہیوم اور دوسرے فلسفیوں کی سمجھ سے یہ بات باہر ہے کہ یہ کارخانہ قدرت کیسے چل رہا ہے اس کی کیا حقیقت ہے؟ تمام علوم اور تمام فلسفوں کی بنیاد، علت و معلول کے باہمی ملاپ پر ہے اور اس رابطہ و علاقہ کی جو حقیقت ہے اس کی دھجیاں خود ہیوم کے ہاتھوں بکھر چکی ہیں۔ علاقہ تو وہم کا وہ سکہ ہے اور اس کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتا یہاں آ کر وہ ایک "فوق الفطرت ہستی"، "اولین سرشتہ" اور "علت العلل" کا سہارا لیتا ہے جس کو ہم اس ہستی کو "خدائے پاک" کہتے ہیں۔

---

[1] فہم انسانی صفحہ ۹۱

اس صدی کے بیشتر مفکرین اور سائنس دان اپنی تلاش اور جستجو کے بعد اس مرحلہ پر آ گئے ہیں کہ کسی نہ کسی صورت میں اللہ کی ذات کا اعتراف کرتے ہیں۔ صدی میں سائنس کا مزاج "لا ادریت" یا انکار الحاد تھا۔ بیسویں صدی کے سائنس دان، ثبات اللہ کی شہادت دے رہے ہیں۔ سر جیمز جینس جیسے سائنس دان نے لکھا ہے کہ اس کائنات کے پیچھے ایک ایسا ریاضی دان ہے کہ اگر اس کے حساب میں ایک لمحہ کے کروڑویں حصہ کی بھی غلطی ہو جائے تو یہ نظام شمسی درہم برہم ہو جائے۔ "یہ فوق الفطرت ہستی" یہ "اولین سرچشمہ" یہ "عظیم ریاضی دان" ——— ان کے لئے ایک ہی جامع اور واضح لفظ ہے ——— "اللہ"۔

جب انسانی ذرائع علم کی حقیقت یہ ہے تو اب ہمارے لئے اس کے سوا چارہ کار ہی کیا ہے کہ ہم زندگی کی حقیقت کو جاننے کے لئے اس دور سے پیچھے ہو کے پچھلے زمانہ سے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی طرف رجوع کریں۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی بنا پر دین کی طلب ضرورت بن جاتی ہے انسان ہمیشہ بے چین اور غیر مطمئن رہے گا اور وہ ان فطری سوالات کا کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکے گا جو اس کے ذہن میں ہر وقت پیدا ہوں گے اور بے چینی اور بے یقینی کے وہ اثرات، جو اس کی زندگی کے، اس کے تمدن اور اس کے معاشرے پر مرتب ہوں گے، وہ اس قدر مہلک ہوں گے جن کا اندازہ آج تمدن کے اندرونی تضاد اور کشمکش سے ہو سکتا ہے۔ کسی نظریے کی بات نہیں ہے کہ بیسویں صدی کی گذشتہ دہائیوں کی تمام، ہم کتابوں کا موضوع کا تمدنی انتشار ہے۔

مغرب کی عائلی زندگی پر ایک نظر ڈالئے۔ وہاں کی ہیئت اجتماعی کا جائزہ لیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ معاشرہ ایک تنہا ہجوم اور نوشش نما بے رونق ——— ہے۔ بچوں میں جرائم پسندی کے رجحانات بڑھ رہے ہیں، اولاد جوان ہو کر ماں باپ کی طرف نہیں دیکھتی، اور محتاج خانوں اور اپنے مرکزوں میں خالی آنکھوں اور ویران دلوں کے ساتھ موت کا انتظار کرتے ہیں۔ کثرت طلاق، ازدواجی دائرہ سے باہر کے جنسی اور ایسے ہی دوسرے مرض وبائے عام کی صورت اختیار کر چکے ہیں۔ زندگی میں سکون، اعتدال، حقیقی توازن اور فطری مسرت، اس وقت قائم ہو سکتی جب زمین و آسمان کے پیدا کرنے والے کی دی ہوئی ہدایت کے مطابق انفرادی اور اجتماعی زندگی کے معاملات طے ہوں ورنہ عالم یہی رہتا ہے کہ۔

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

کام کی بات یہ ہے کہ ہمارے پیدا کرنے والے نے ہماری تمام ضروریات کی تکمیل کا سامان بھی کیا ہے، ہماری جسمانی اور مادی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے اس نے سینہ گیتی اور فضائے کائنات میں بیش بہا خزانے ودیعت کر دئے ہیں جو انسان کی ہر ضرورت کو پورا کرنے کے لئے کافی ہیں، اور ہماری روحانی، اخلاقی اور تمدنی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے اس نے اپنے انبیاء کے ذریعہ ہدایت نازل فرمائی تاکہ انسان کی زندگی کائنات کے حقائق کے مطابق ترتیب پائے اور جس خدا کا قانون زمین و آسمان میں جاری و ساری ہے اسی کے قانون کے مطابق انسان بھی اپنی زندگی کو بسر کرے ——— اور ہر طرف بندگی کا ایک ہی نظام کارفرما ہو جائے۔ یہ ہدایت وحی کے ذریعہ انسانوں کو دی گئی ہے اور یہ اس کی اخلاقی اور تمدنی زندگی کے لئے اتنی ہی بلکہ اس سے بھی زیادہ ضروری ہے جتنی اس کی جسمانی زندگی کے لئے ہوا اور پانی ضروری ہیں یہ نہ ہو تو جسمانی موت ہے۔ اور وہ نہ ہو تو روحانی موت!

مولانا شمس تبریز خاں

قرآن اور انسانی نفسیات

قرآن اصلاً صحیفۂ اخلاق و ہدایت اور کتابِ رشد و روحانیت ہے، وہ اور کتابوں کی طرح انسان اور انسانی علوم کے متعلق خبر نہیں کرتا، بلکہ اس کا اسلوب کلی اور اصولی ہوتا ہے اس کے ضمن میں دوسرے مفید علوم و فنون اور صالح افکار و فلسفہ کی طرف لطیف رمز و ایما سے کام لیتا ہے۔ جس کے بارے میں کہا گیا ہے ع حدیثِ خلوتیاں جز بہ رمز و ایما نیست!

قرآن کی اس ہمہ گیر جامعیت کو پیش نظر کہا گیا۔

وہ گنجینۂ معارف جس کے اک اک حرف میں پنہاں
نکاتِ فلسفی، اسرارِ نفسی، رازِ عمرانی!

علم نفسیات بھی دوسرے علوم کی طرح ایک وسیع علم و فن بن گیا ہے جس کے ذریعہ پوری زندگی کی تعبیر و توضیح بھی کی گئی ہے۔ قرآنی نقطۂ نظر سے کوئی مسلم ماہر نفسیات ہی قلم اٹھا سکتا ہے تاہم قرآن سے مستنبط چند نفسیاتی نکتے بھی فکر انگیز ہوں گے۔ خوش اعتقادی نہیں واقعہ ہے اسلامی علوم کی تاریخ گواہ ہے کہ کتاب و سنت ان علوم کا ایک بڑا ماخذ رہے ہیں اور مسلمانوں نے دوسرے سے پرانے علوم و فنون اور مکاتب فکر و نظر کی روشنی میں ہمیشہ ہی اسلامی فکر کی تشکیل نو کی ہے، اور اس طرح چراغ سے چراغ جلتا رہا ہے ؎

یک چراغ ست دریں خانہ کہ از پرتوِ آں — ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند!

قرآن ایک بصیر و خبیر ہستی کی کتاب ہے جو انسان اور جگت سنسار کا پالن ہار بھی ہے اور خالق CREATOR بھی! وہ اس کے دل کی رگ رگ سے واقف اور اس کے تمام نفسیاتی پیچ و خم سے آگاہ ہے اس لئے وہ دوسرے نفسیین کی طرح انسان کو پر اسرار MYSTERIOUS نہیں بناتا بلکہ اپنی کتاب میں اس کی کتابِ زندگی کا ہر صفحہ کھول کے رکھ دیتا ہے کہ اِقْرَأْ کِتَابَكَ

وہ رحیم و کریم ہستی نفسیات کی سرحدی نہیں کرتی بلکہ اپنی حکمت و ہدایت سے اس کی توجیہ کرتی اور اسے صحیح رخ بھی عطا کرتی ہے ۔

قرآن دوسری کتابوں کی طرح اپنے بنیادی طرز فکر اور موضوع (TOPIC AND ALTITUDE) (توحید، رسالت، آخرت) سے کبھی غیر متعلق نہیں ہوتا وہ علوم و فلسفہ، مسائل و مباحث کی جزئیات کا ذکر بھی اس انداز میں کرتا ہے کہ وہ گویا ایک کلی اصل الاصول کی فروعات ہیں، کتاب و سنت فلسفہ زندگی ہیں اس لئے ناگزیر طور پر انسانی زندگی ہی سے وہ خام مواد فراہم کرتے ہیں اور کبھی نادر حیات کے دقیق دقیق کو معرفتِ کردگار کا دفتر بنا کر دعوت نگاہ دیتے ہیں۔ معشوقِ حقیقی کی کتنی مہربانی ہے کہ جادۂ طلب کے نقش و نگار اور رہگزر کے گرد و غبار کو بھی نشانِ منزل بنا دیا۔ میرا ایک شعر ہے ؎

پہلے تو اپنے آپ کو پنہاں بنا دیا — پھر بزمِ دو جہاں کو ہی عنواں بنا دیا

آفاق و انفس میں جتنی نعمتیں ہیں وہ سب شعور ازلی ہی کی عنایت ہیں، انسان کے تمام جذبات و خواہشات اور کائنات میں پھیلی ہوئی علامات سب اللہ کی

نعمت ہیں۔ "وما بکم من نعمۃ فمن اللہ" ـــ "وان تعدوا نعمۃ اللہ لا تحصوھا" قرآن ایسے تمام حقائق کو "آیات اللہ" اللہ کی نشانیاں اور خدا شناسی کی کنجیاں کہتا ہے، یعنی یہ ایسے اہم حقائق ہیں جو فکر انگیز ہیں اور گھٹا طرح اللہ کی یاد دلاتے ہیں اور "ذکر" کا قابل عمد وعنی خیز لفظ بھی قرآن میں یہی بتانے کے لئے آیا ہے کہ اللہ دراصل انسان کی ایک بھلائی ہوئی حقیقت ہے جس کا استحضار تذکیر بھی انسان کو یاد دلایا سکتا ہے۔ یہ وہ چنگاری ہے جو خاکستر میں دبی ہے مگر بجھی نہیں، زرکے کے مضراب سے اگر ساز دل کو چھیڑ دیا جائے تو نغمۂ الہام کے سوا اس سے کوئی دوسری آواز نکل ہی نہیں سکتی ؎

در ہیچ پردہ نیست نباشد نوائے تو — عالم پر است از تو وخالی ست جائے تو (بیدل؟)

معرفت الٰہ کا دوسرا رخ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت وجبلت میں بہت ہی ایسے کرانی رکھی اور اسے نامحدود بنا دیا ہے جسے "لامحدودیت" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یعنی انسان نفسیات کے ہر پہلو سے اتنا بلند نظر واقع ہوا ہے کہ خوب سے خوب تر کی تلاش اسے گرم جستجو رکھتی ہے اور ہر منزل پر آگے کی دنیا اس سے سامنے آ جاتی ہے اس لئے ضروری ہوا کہ اس کے فطری اور نہ ختم ہونے والے مطالبات کی تسکین کے لئے حیات ہی نہیں بعد الممات بھی زندگی کی دلچسپیوں کا دوسرا سفر ہو جہاں "تا کہ وہ گناہوں کی حسرت کی بھی داد ملے" ذوق جمال، جذبۂ الفت، خواہش حیات اور تمام جذبات کے لئے لامحدود فضا میسر ہو۔ قرآن کہتا ہے کہ انسان کی جبلتوں کا ماخذ آفاقیت میں ہے اس لئے وہ انہیں وسعت، لطافت، اور SUBLIMATION دیتا ہے اور جو حقائق انسان کے سامنے رکھتا ہے ان پر خود انسان کی گواہی لیتا ہے کہ یہ نرے دعائی نظریات نہیں بلکہ نفسیاتی حقائق ہیں۔ "وفی انفسکم افلا تبصرون"، "بل الانسان علی نفسہ بصیرۃ ولو القیٰ معاذیرہ" ـــ "وانہ لحب الخیر لشدید" ـــ "وانہ علی ذالک لشہید"

خداشناسی کا دوسرا مرحلہ آیا کہ معرفت کا ذریعہ خود زندگی کی کیفیات کو بنا دیا گیا کہ اگر تمہیں اعتبار نہیں تو اپنی زندگی کے روز و شب ہی سے پوچھ لو کہ اللہ اس کائنات کا ایک فعال عنصر ہے کہ نہیں؟ ارشاد ہے "الا بذکر اللہ تطمئن القلوب" اللہ کی یاد سے دل تسکین و اطمینان پاتے ہیں ـــ اور دوسری طرف یہ بھی کہہ دیا گیا۔ جو میری یاد سے غافل ہوگا تو اس کی زندگی اجیرن ہو جائے گی جس میں تنگی، گھٹن، ذہنی الجھن اور جذباتی انتشار کے سوا کچھ نہ ہوگا ـــ اکبر نے کہا ہے ؎

منکر کو بھی خدا کی طرف التفات ہے — آخر خدا کے نام میں کوئی تو بات ہے؟

انسان کے اندر سب سے بڑا نفسیاتی داعیہ اور فطری جذبہ خدا پرستی، مذہب پسندی اور عبدیت و بندگی کا ہے تمام جذبات دھندلے پڑ سکتے ہیں۔ مگر یہ نقش پتھر کی لکیر ہے کہ آسے تیز نیز لہریں بھی کسی بھولی ہوئی عظیم حقیقت کی یاد دلاتا رہتا ہے، دہریہ اور بے خدا ATHEIST بھی بار بار دل کے اس انہماک سرگوشی کو سنتا رہتا ہے کہ تیج جیسے ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتا ہوں میں!

بے خدا ہونے کے بعد نہ فرد کو تسکین مل سکتی ہے نہ جماعت کو ایک مرکز یقین سے ہٹنے کے بعد پھر گھر گھر کی بیزاری DISCONTENT اور لامرکزیت کا احساس انسان کو جلا کر راکھ کر دیتا ہے، خدا کے بغیر نہ کائنات کی توجیہ ممکن ہے نہ انسان کی حیثیت اس کائنات میں متعین ہو سکتی ہے نہ اس کے عظیم ولافانی AGELESS جذبات کی تسلی ہو سکتی ہے یہ سب سے بڑی تاریخی حقیقت ہے کہ انسان نے ہوش سنبھالتے ہی جس قدیم ولامکان کا خلا محسوس کیا جسے اللہ تعالیٰ کے خیال نے پر کیا۔ اور جس میں خدا کا محبوب ومقدس تصور ہی بالکل مطابق FIT نظر آیا اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی شعور پر سب سے پہلی پرچھائیں image خدا پرستی ہی کی پڑی اور انسان کا پہلا شعوری کارنامہ کسی عظیم ترما ورا ہستی کا اقرار اور جستجو رہا ہے۔ حیدی، نحاسی اور حجری دور تاریخ سے بھی قبل انسان کی خدا پرستی Divine worship کی تاریخ موجود ہے ابوالفضل نے صحیح کہا تھا۔ "اپنی بہر خانہ کہ می بینم جو یائے تو اند بہر زبانہ کہ می شنوم گویائے تو" الکسس کیرل کہتا ہے کہ مذہب جمالیاتی احساس کی طرح فطری شعور ہے۔

"RELIGIOUS INTUITION IS AS REAL AS AESTHETIC INSPIRATION

- -

خودی و خودداری

حضور سرور کائنات کا ارشاد ہے کہ اللہ کی نظر میں دنیا کی عزت پرکاہ کے برابر بھی ہوتی تو کسی کافر کو نہ ملتی، اس کے علاوہ کتاب و سنت میں دنیا کو فریب نظر اور محض دھوکہ سراب بھی کہا گیا ہے، تاہم مسلمان بھی آخر انسان ہی ہوتا ہے، ظاہری چمک دمک سے کب تک آنکھیں بند کر سکتا ہے۔ حضرت موسیٰ بھی کفار کی ملوکیت و حکمت کو دیکھ کر بددعا کر ہی بیٹھے کہ "ربنا انک آتیت فرعون و ملاہ زینۃ و اموالا فی الحیوۃ الدنیا ربنا لیضلوا عن سبیلک"۔ اس لئے حضور سے بھی کہا گیا اور خویشتن داری کا جذبہ ابھارا گیا کہ

برخود نظر کشا ز تہی دامنی مرنج　　در سینۂ تو ماہ تمامے نہادہ اند !

ارشاد ہوا تو آپ ان کے مال و اولاد سے تعجب نہ کریں اللہ دنیا میں انہی کے ذریعہ انہیں عذاب دیگا اور وہ کفر ہی پر جان دیں گے۔

محبت کا نمونہ ۔ حضرت نوحؑ نبی تھے مگر کنعان کے باپ بھی تھے، بیٹے کی فطری محبت ان کے دل میں موجزن تھی طوفان کی لہریں بھی اخیر وقت میں بھی باپ کی محبت کے جوش سے مجبور ہو کر بیٹے کو سمجھانے ہیں اور محبت سے بھرے لہجہ میں (ابنی نہیں یا بنی) کہہ کر سفینہ نجات میں بلاتے ہیں اور غرق ہی کے بعد بھی جب بیٹے کی یاد آتی ہے تو اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ آپ کا وعدہ تھا کہ میرے لوگوں کو نجات دیں گے میرا بیٹا بھی تو میرا اہل ہی تھا، اور آپ کا وعدہ تو حق ہی ہوتا ہے اور آپ حکم الحاکمین ہیں ہر طرح آپ سے بجا لیتے ہیں (۱۱، ۴۵) ان چند جملوں میں پدری محبت کی نفسیات کا کتنا صحیح نقشہ موجود ہے؟ پھر اس عظیم جذبہ کا صحیح ترجمہ بھی کی گئی کہ محبت کو مجبور عشق سے ہونا چاہئے، حضرت ابراہیمؑ نے جب آذر کی سفارش کی تب بھی یہی ارشاد ہوا کہ اصل محبت کا مستحق تو اللہ ہے دنیا کی کسی محبت کا صادق ہونا تو اس راہ کا پتھر ہے!

ارشاد ہے جب ابراہیمؑ نے عذاب کے فرشتوں کو دیکھا کہ ان کے ہاتھ کھانوں کی طرف نہیں اٹھ رہے ہیں (جب کہ دشمنی کا طریقہ ہے) تو سب سے نا محرم ہوا اور ان سے خوف محسوس کیا فرشتوں نے اطمینان دلایا کہ ڈرئیے نہیں ہم قوم لوط پر بھیجے گئے ہیں۔۔۔ ان کی بیوی جو کھڑی یہ منظر دیکھ رہی تھیں، ہنس پڑیں (۱۱، ۷۱) عورتوں کی سادہ طبعی کی کتنی بے ساختہ تصویر اس بے ساختہ ہنسی کے ذکر میں آتی۔

نفسیات کفر و نفاق ! ضد، ہٹ دھرمی انسان کی اندرونی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ حق کا دیدہ و دانستہ انکار کرتا رہتا ہے جاننے کے باوجود بھی آفتاب کی تابانی اور ستاروں کی ضوفشانی بھی اس کے نزدیک محتاج ثبوت ہو سکتی ہے، کفار کا مزاج بھی قریباً ایسا ہی ہوتا ہے قرآن کہتا ہے "جنہوں نے کفر کیا انہیں آپ کا ڈرانا نہ ڈرانا برابر ہے وہ ایمان نہ لائیں گے (کیونکہ) اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگادی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے" (۲، ۶) "منافق" اور وہ شخص جس کو اس کی مفسدانہ کوششوں پر اگر ٹوک دیا جائے تو اس کی تاویلیں کرنے لگتا ہے اور فساد کو اصلاح (REFORM) کے خوشنما الفاظ سے تعبیر کرتا ہے قرآن ان کی قلعی کھولتا ہے: "جب ان سے کہا جاتا ہے زمین پر خرابی نہ پھیلاؤ تو کہتے ہیں ہم تو مصلح ہیں۔ اور جب ان سے ایمان لانے کو کہا جاتا ہے تو کہتے ہیں کیا ہم بھی بے وقوفوں (سیدھے سادے مسلمانوں) کی طرح ایمان لائیں۔ بیوقوف وہی ہیں مگر انہیں خبر نہیں۔ جب ایمان والوں سے ملتے ہیں تو ایمان ظاہر کرتے ہیں اور اپنے شیطانوں کی خلوتوں میں کہتے ہیں ہم تو تمہارے ساتھ ہیں ہم تو مومنوں سے مذاق کر رہے تھے، اللہ ان سے مذاق کرتا اور ان کی سرکشی پہ ڈھیل دیتا ہے" (۲، ۱۵)

کفار و منافقین کی اس طبعی کیفیت کی وجہ سے ہدایت ان کے حق میں ضلالت اور تریاق شفا ان کے لئے زہر ہلاہل بن جاتا ہے ابر بہار کا ابر خوش ہنگام سانپ کے منہ میں زہر اور آغوش صدف میں در رخشاں پیدا کر دیتا ہے۔ او درخشاں کی کرنیں سب کے لئے نور و سرور ہیں مگر چمگادڑ کے لئے پیام موت۔ لیکن بہر تو مہر عالم ایک عالم فیضیاب ہے بوم رشپرہ پر سخت گراں اور شبنم کے لئے تو تعلیم فنا ہی ہے۔ گل شبنم خواب جمہور کتاں سینہ چاک ماہ؛ تاہم چشمۂ آفتاب کا اس میں کیا گناہ ہے؟ ہوائے بہار باران رحمت کردگار کی فیض بخشیاں عام ہیں مگر حصہ بقدر جثہ نعمت بقدر ہمت اور توفیق باندازۂ لیاقت و صلاحیت ہے۔

باران کہ در لطافتِ طبعش خلاف نیست در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس

استعداد اخذ و پذیری برتر ہو تو پھول کی پتی سے ہیرے کا جگر کٹ جاتا ہے، بے لیاقتی اور بے حسی ہو تو نرم و نازک کلام بھی بے اثر ہو کر رہ جاتا ہے۔ قرآن نے اس نکتہ کو بار بار دہرایا ہے "ایمان والے سمجھ جاتے ہیں کہ یہ باتیں مبنی حقائق ہیں اور کافر کج بحثی کرنے لگتے ہیں کہ اللہ میاں جا کیا ہے (دراصل قرآن ہی کے ذریعہ) بہتوں کو ہدایت یاب کرتا ہے اور کتنوں کو گمراہ، اور گمراہ تو فاسقین ہی ہوتے ہیں جنہوں نے عہد الست بھلا دیا جو نافرمان ہیں مفسد ہیں"۔ (۲: ۲۷)

"یضل بہ کثیرا و یہدی بہ کثیرا" کی دو گونہ شان قرآن کی صفات میں سے ہے۔ صاف دلی، نیک نیتی کی راہ سے آنے والوں پر عقدہ واشگاف ہو جاتا ہے، بدگمانی، استکبار و انکار کے راہرو اُن پر عقدہ بند کا بند ہی رہ جاتا ہے۔ چو شاہد نے درمیان کو دلاں است، معشوق گنشتہ ز مدبقال: آفتاب ہدایت تو نصف النہار پر ہے مگر آنکھیں بند کر لی جائیں تو اس کا کیا علاج ہے ہے

دوست نزدیک تر از من بمن ست وین عجب تر کہ من از وے دورم

چہ کنم با کہ توان گفت کہ او در کنار من و من مہجورم

سعدی نے کیا خوب کہا ہے "دولتی با خبر و حضور و نشد یکان بے بصر ودد"!

بقائے دوام کی تمنا! (۲)

بقائے دوام کی تمنا فانی انسان کی ایک خوشگوار تمنا رہی ہے جس کی تسکین کے لئے انسان نے تنزل لطیفہ کا سہارا لیا ہے

ڈھونڈھتا ہے بشر راز بقائے دوام دائے تمنائے خام وائے تمنائے خام

جملہ فلسفیانہ اشارات اور سنتی تحقیقات کی تہ میں یہی جذبہ کارفرما ہے قرآن نے بھی اس طرف اشارہ کیا "اے نبی آپ انہیں زندگی کا بہت خواہشمند دیکھیں گے اور بعض مشرک تو ہزار سالہ زندگی چاہتے ہیں" ۲: ۹۶

تجاہل عارفانہ! ضد اور ہٹ انسان کی کج طبعی کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ جانی پہچانی باتوں کا بھی انکار کر دیتا ہے اور حق کو حق جان کر بھی اس سے روگرداں ہو جاتا ہے قرآن نے اس صورت حال کی تصویر کشی کی ہے:۔

"اہل کتاب ذرا نصف دین حق کو اپنے بیٹوں کی طرح قطعی طور پر پہچانتے ہیں مگر ان کا ایک فریق جان بوجھ کر حق پوشی کرتا ہے" (۲: ۱۴۶)۔ دوسری جگہ کہا گیا ہے "وجحدوا بہا واستیقنتہا انفسہم ظلما و ....." (۲۷: ۱۴) انہوں نے اس حال میں انکار کیا کہ ان کے دل یقین پر مجبور تھے اس کی وجہ ان کا ظالمانہ اور باغیانہ رویہ تھا۔

اضطراب مایوسی: امید و بیم اور خوف و رجا کی کشمکش کی ایک صورت وہ بھی ہوتی ہے کہ انسان کو امید و یقین کے بار جب طمانیت اور اطمینان کی منزل ملتی ہے اور یہاں آ کر اس کی دھوپ چھاؤں میں اس کا دل ڈوبتا ابھرتا رہتا ہے۔ کبھی امید کی جھلک کبھی ناامیدی کی اندھیاری یہ اضطراب یا اضطراری سیماب وشی انسان کی جبلت ہے۔ قرآن کہتا ہے "کیا تم سمجھتے ہو کہ پہلی امتوں کی مثالیں آئے بغیر تم جنت میں چلے جاؤ گے جب کہ انہیں مصائب نے گھیر لیا۔ اور حوادث نے انہیں جھنجھوڑ کر رکھ دیا حتی کہ رسول اور اہل ایمان بھی بے اختیار ہی ہیں کہ اٹھے آخر خدا کی مدد کب آئے گی" ۲: ۲۱۴

تہذیب رسم عاشقی ۔ جب عورتوں سے نکاح کا حکم ہوا مگر ہدایت دی گئی کہ ایام عدت میں پیام نکاح دے کر ان کا عمر تہ رہ نہ کیا جائے اس لئے کہ علی ما الحب الا للحبیب الاول کے مصداق مرحوم شوہر کی محبت کبھی نہیں بھولتی اس لئے پیام دیتے وقت مرحوم کی محبت کا خیال ضروری ہے۔ قرآن نے اس نازک موقع کی تصویر کھینچی ہے "عدت میں کوئی حرج نہیں اگر تم نکاح کا پیام کسی کو دیدیا اسے دل ہی میں رکھو اللہ جانتا

نفسیات ترغیب و ترتیب - سورہ انفال و برأت کے غالب حصہ میں جہاد پر جس جس طرح ابھارا گیا ہے وہ اس کا ثبوت ہے کہ صاحب کلام فطرت انسانی کی نفسیات سے پوری طرح باخبر ہے۔ سورہ توبہ کے شروع میں بسم اللہ نہ ہونے کی وجہ (بعض مفسرین کے نزدیک) یہی ہے۔ سورہ تمام تر مشرکوں کے خلاف اعلان جنگ ہے۔ ظاہر ہے کہ موقع غضب پر رحمت کا ذکر کرنا مناسب نہیں، سورہ کا آغاز بھی اظہار نفرت و بیزاری اور بائیکاٹ کے اعلان سے ہوا کہ "اللہ و رسول کی طرف سے معاہدہ شکن مشرکین کے حق میں صاف برأت اور علیحدگی کا اعلان ہے" یہ مختصر جملہ کتنی عظیم و شدید بیزاری لئے ہوئے ہے!۔
نفسیاتی دلیل کا انداز اختیار کرتے ہوئے جذبات کو اس طرح اکسایا اور ابھارا گیا جس سے مسلمانوں کے دل جذبہ جہاد اور شوق شہادت سے سینوں میں تھا ہو گئے اور ہر فرد بیکر جوش شہادت کی رضا کا ایک لازوال تمثال ایثار و قربانی بن گیا۔ ارشاد ہوا "کیا تم ان سے جنگ نہ کرو گے جنہوں نے عہد توڑ دیا اور خود رسول کو پہلے نکالا اور انہوں نے جنگ میں پہل کی کیا تم ان سے ڈرتے ہو؟ تو اگر مسلمان ہو تو خدا ہی ڈرنے کی چیز ہے۔ ان سے جنگ کرو اللہ انہیں تمہارے ہاتھوں سے عذاب دیگا اور انہیں رسوا کرے گا اور تمہیں ان پر فتحیاب کریگا۔ اور مومنین کا کلیجہ ٹھنڈا اور ان کے دل کی بھڑاس نکال دے گا" (۹ : ۱۵) پوری سورۃ اس نفسیاتی اسلوب کی بہترین مثال ہے۔

جبر و اختیار ! اسلام میں انسان کو فکر و خیال اور ارادے کی آزادی دی گئی ہے اور انسان کو جبر محض اور مضطر معطل نہیں، مختار و صاحب کردار مانا گیا ہے، اور اس کی فطرت کی خیر پسندی کو سراہا گیا ہے! "فالہمہا فجورہا و تقواہا" - "وھدینٰہ النجدین" خیر و شر دونوں راہوں پر چلنے کی یکساں قوت دی گئی ہے اور دونوں انجام سے بھی باخبر کر دیا گیا ہے۔ یہ انسان کی نفسیاتی خیر پسندی ہی ہے کہ وہ بلا کسی کے بتائے ہوئے برائی کو برائی سمجھتا ہے اور اس سے نفرت کرتا ہے گناہ کرتا ہے مگر خوف، ندامت، جھجک اور تذبذب جذبات کے ساتھ اس میں کسی قوم کی تخصیص نہیں بلکہ "عالمی صداقتیں" —— UNIVERSAL TRUTHS اقوام عالم میں مشترک اقدار کی حیثیت رکھتی ہیں جنہیں ہر عامی و عالم اپنے COMMON SENSE ہی سے سمجھ لیتا ہے یہ بات دلیل ہے کہ انسان تنہا صاحب اختیار ہے اور قدرت نے اپنے جبر کے صدود ہمارے دائرہ اختیار کے مطابق ہی رکھے ہیں کا مستحق گردانتے ہیں عملی بیانات میں، ہاں انسان کے سوا تمام کائنات مجبور ہی نظر آتی ہے اور یہی "ولقد کرمنا بنی آدم" کا امتیاز خاص ہے جس نے اسے اشرف مخلوقات کا مسند نشین کر دیا ہے سے

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات　　　مومن فقط احکام الٰہی کا ہے پابند!

بخل و حرص ! فرمایا گیا میرے رب کے خزانہ رحمت کے مالک بھی ہو گئے تو تم خرچ ہو جانے کے ڈر سے بخالت کرو گے اور انسان ہے ہی سخت بخیل اور تنگ دل (بنی اسرائیل ۱۰۰) ایک جگہ تو کہا گیا کہ "بخالت نفسوں کی گھٹی میں پڑی ہے" (۴ : ۱۲۸)، اسلام اس جذبہ کو تسلیم کرتے ہوئے اس کی اصلاح، سخاوت و فیاضی، بذل، زنول اور جود و عطا کے ذریعہ ان جذبات سے کرنا چاہتا ہے۔ انسان اس فطری جذبہ بخل کو اس کے دوسرے جذبات کی طرح حد اعتدال میں لاتا ہے قرآن میں ارشاد ہوا کہ "نہ یہ ہو کہ مٹھی بند کر لو اور نہ تو سکیڑ لو اور نہ ایسا ہو کر سب کچھ شاہ خرچی کی نذر کر دو، بلکہ راہ اعتدال اختیار کرو" اس کے برخلاف زندگی کے دوسرے فلسفوں میں "پہلے اپنا بھرپیٹ اتنا" اور "خیرات اپنے گھر سے شروع" کرنے کا اصول کار فرما ہے جس نے ایثار کا گلا گھونٹ اور "تنازع للبقاء" کے غلط نظریہ کی بنا ڈالی ——

معقول پسندی ! سورۃ کہف میں حضرت خضرؑ کے غیر معمولی اور خارق عادت کاموں پر حضرت موسیٰؑ کا عہد خموشی کے باوجود اعتراض کر دینا اور علم و علت پوچھنا اور پھر بار بار یہ کہنا "اچھا اب کچھ پوچھوں تو پھر مجھے ساتھ نہ رکھئے گا" انسانی نفسیات کی کئی گرہیں کھول دیتا ہے اور اس کی معقول پسندی، حیرت و استعجاب، اور جذبات پر سے پردے بھی اٹھا دیتا ہے۔ اس کے مقابلہ پر حضرت خضرؑ کا حضرت موسیٰؑ سے کہنا کہ —— "انک لن تستطیع معی صبرا!" (آپ میرے ساتھ صبر و خاموشی کے ساتھ نہیں رہ سکتے) انسان کی فطری خدا پرستی، الہام پسندی اور ایمان بالغیب کا ترجمان ہے۔ اصل میں حضرت خضرؑ یہی کہنا چاہتے تھے کہ یہاں عقل ہی سب کچھ نہیں بلکہ اشارۂ الہام اور دست غیب کی کارفرمائیاں کائنات کے پس منظر میں

رضا راشدی ایم۔ اے

وحشت کی شاعری میں اسلامی رجحانات

مولانا رضا علی وحشت کلکتوی ایک غزل گو کی حیثیت سے مشہور ہیں لیکن ان کے کلام پر اسلامی تعلیمات کا اثر اور ان کے افکار جن میں دینی عقائد کی جھلک بھی جا بجا نظر آتی ہیں۔ وحشت نہ صرف متشرع تھے نہ صوفی شاعر لیکن قدرت نے انہیں مزاج قلندرانہ، طبیعت صوفیانہ اور دل عاشقانہ عطا کیا تھا ان کے سینے میں ایک ایسا دردمند دل تھا جس نے محبت کی چوٹ بھی کھائی تھی اور عشق کی لذت بھی پائی تھی۔ اگرچہ عشق کہیں مجازی تھا تو کہیں حقیقی۔ ان کے افکار و خیالات کے جس گوشے کا تعلق ذات باری، وحدت الوجود سے ہے وہ عارفانہ ہے۔ ان کا عارفانہ کلام فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں موجود ہے پہلے ایک فارسی حمد کا ایک شعر سنئے :-

یارب کنیمِ راحتِ دل آرامِ جانِ ما
ذکرِ تو ضامنِ طربِ جاودانِ ما

یہ شعر ذکر و فکر کی عجیب کیفیت کا حامل ہے۔ اب اس رنگ کے اردو اشعار ملاحظہ فرمائیے :-

بندگی اور صاحبی اصل میں دونوں ایک ہیں
جس کا غلام ایاز ہے وہ ہے غلام ایاز کا

شوق ترا ہے موجزن ذوق ترا ہے ساز جو
کھل نہ دیں محرم کہیں پردگیانِ ناز کا

خاک میں مل گئے ولے آنکھ اٹھی نہ شرم سے
جب سے ہوا نہ حق ادا اس کی نگاہِ ناز کا

ان اشعار سے ظاہر ہے کہ ان کی فکر جمیل میں تصوف کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں ـــــ چند اور نمونے :-

دیکھا ہے چشمِ شوق نے تجھ کو غلط غلط
تو جلوہ گر جہاں تھا وہاں کس کو ہوش تھا

ذرے ذرے پہ جمالِ یار ضو افگن ہوا
گوشے گوشے میں چراغِ آرزو روشن ہوا
کارفرمائے تجلی جب رخِ روشن ہوا
برق سے دستِ گریباں شوق کا خرمن ہوا

سجدہ گاہ دستِ نیاں ہے ترا نقشِ قدم
بے نوا دل کا وہی ملجا وہی ماویٰ ہوا

ہمیں تو ایک معما ہے اُس کا جلوۂ ناز
کہ آشکارا ہوا اور پھر بھی مانند

اب تک نظر آ جاتی ہے مشتاق دلوں کو
وہ برقِ تجلّی جو سرِ طور نہیں ہے

نعت اپنے موضوع کی ہمہ گیری اور بلندی کے لحاظ سے ایک اعلیٰ صنف ہے۔ وحشت نے اس صنف میں بھی خاص جدت، تنوع اور توانائی کے ساتھ طبع آزمائی کی ہے۔ ترانۂ وحشت، دیوانِ وحشت اور نقوش و آثار میں ان کی نعتیں کافی تعداد میں موجود ہیں۔ انہیں سرکارِ دو عالم سرورِ کائنات رسولِ کریم محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی سے بے پناہ عقیدت و محبت اور عاشقانہ عشق و ارادت تھی۔ حضور پُر نور کا نام سن کر آبدیدہ ہو جاتے اور ان کی یہ کیفیت لوگوں نے خاص طور پر سیرۃ النبی کی محفلوں میں دیکھی ہے بقول میر ؎

جب نام ترا لیجئے تب چشم بھر آوے
اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

خود وحشت کہتے ہیں ؎

مرا سفینہ نبی کے عشق میں طوفاں اُٹھائے گا
محیطِ شوق ہے ایک ایک قطرہ دیدۂ تر کا

قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ۔ یعنی اے رسول مسلمانوں سے کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے محبت کرنا چاہتے ہو تو میری اتباع کرو۔ پھر اللہ بھی تم سے محبت کرنے لگے گا۔ اس آیتِ کریمہ کی روشنی میں مولانا کے نعتیہ کلام کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کی محبت و سنت رسولِ کریمؐ سے عشق مولانا کی زندگی کا نصب العین تھا۔ اپنی اس سعادت مندی کا اظہار بار بار انہوں نے اپنی نعتوں میں بصد افتخار کیا ہے وہ عشق لٰہی کس درجہ سرشار تھے۔ اس کا اندازہ ان اشعار سے لگایا جا سکتا ہے ؎

پیامِ حق نما سنتا ہے گوشِ دل ہمیشہ کا
مرا ہر ہر نفس اک نعرہ ہے اللہ اکبر کا

خوش قسمت شب و روز اپنا دل محوِ تصور ہے
کبھی زلفِ معنبر کا کبھی روئے منور کا

مرے دم میں ہے دم جب تک یہی میری تمنا ہے
کہ دم بھرتا رہوں میں اپنے آقا اپنے سرور کا

یہ کس کے ذکر سے کام و دہن لذت چشیدہ ہیں
گماں ہوتا ہے اپنے ہر نفس پر موجِ کوثر کا

یہ کیا کم ہے کہ وحشت باہمہ جرم و سیہ کاری
سبب ناز روز حشر ہے شفیع روز محشر کا

مولانا کے نعتیہ کلام کا ایک ہمہ گیر پہلو یہ بھی ہے کہ انہوں نے نعتوں میں حضور اکرمؐ کے احسانات، کمالات، تعلیمات اور فیضان بیکراں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ سرکار دو عالم سے مخاطب کس ادب و عقیدت کیساتھ کیا ہے۔

ترا خلق عظیم اے رہنمائے حق مسلّم ہے
تری تعلیم کا مرہون احسان سارا عالم ہے
اخوت کا سبق تو نے دیا سارے زمانے کو
بنایا مرکز اخلاص اپنے آستانے کو
ترے قربان اے ختم رسل کیا شان ہے تیری
قبائے رحمۃ للعلمین پہچان ہے تیری
تمیز حق و باطل دی تری تعلیم قرآں نے
زمانے کو کیا ممنون تیرے فیض و احساں نے
سلام اے بانئ دین مبیں ختم و رسل تو ہے
گلستان جہاں کا حسن جس سے ہے وہ گل تو ہے
دیا درس مساوات اہل عالم کو تری تو نے
طریقہ سارے عالم کا بدل کر رکھ دیا تو نے

تو جو اے ماہ عرب، عالم کی زینت ہوگئی
نہ تیرا کس کے جلوے کی شہادت ہوگئی
نہ تیرا دافع آثار ظلمت ہوگیا
ایک عالم کے لئے شمع ہدایت ہوگئی
کیوں نہ منظور نظر ہو تیرے کوچہ کا غبار
مرحبا یہ سرمۂ چشم بصیرت ہوگیا

پروفیسر ضیاء احمد بدایونی

تکفیر اور اس کی حدود

دو مسلمان دوست ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور یوں بات چیت ہوتی ہے۔

ایک ۔ کیوں جناب آپ کی مسجد میں جمعہ کی اذان ثانی کس جگہ ہوتی ہے۔

دوسرا ۔ جہاں تمام ملک اور دوسرے ممالک اسلام میں ہوتی ہے یعنی خطیب کے روبرو۔

پہلا ۔ مگر یہ تو بدعت ہے۔ یہ اذان تو دروازۂ مسجد پر ہونی چاہئے۔ کیا آپ نے علی باب المسجد نہیں پڑھا۔

دوسرا ۔ مگر بین یدی الامام (امام کے سامنے) کو کیا کیجئے گا۔

پہلا ۔ بین یدی میں تو بڑی گنجائش ہے۔ وہ تو حد نظر کو بھی شامل ہے۔

غرض دیر تک بحث و تکرار رہتی ہے آخر پہلے بزرگ کی بارگاہ جلال سے دوسرے حق میں فتوائے کفر صادر ہوتا ہے۔ جس کے ساتھ تجدید ایمان، تجدید حج، تجدید بیعت اور تجدید نکاح کی بھی تاکید ہے۔

یہ کوئی فرضی کہانی نہیں ہے بلکہ حقیقت کی دنیا میں ایسے واقعات ہو چکے ہیں کہ دو عامیوں نے نہیں، دو بڑے عالموں نے ایک جزئی مسئلے کو وجہ نزاع بنالیا۔ اذان سنت رسول اور شعار اسلام ہے۔ لیکن اگر اذان کے بغیر نماز پڑھ لی جائے تو نماز ہو جاتی ہے گو ترک سنت کا گناہ ہوگا۔ مگر یہاں اذان جمعہ کو جو ایک جزئی چیز ہے کفر و ایمان کا سوال بنا لیا گیا۔

ان واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہم لوگ تکفیر و اکفار کے معاملے میں کس قدر دلیر ہیں حالانکہ شریعت مطہرہ نے مسلمان کو کافر ٹھہرانے کے سلسلہ [illegible] ب کافی حدود و قیود لگائی ہیں۔ قرآن حکیم میں ہے ۔ ولا تقولوا لمن القی الیکم السلم لست مومنا یعنی جو شخص (اظہار اسلام کے لئے) تمہیں سلام علیک کرے اس سے یہ نہ کہو کہ تو مومن (مسلمان) نہیں۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ مرداس بن نہیک اسلام لائے مگر ان کی قوم مشرف بہ اسلام نہیں ہوئی۔ جب [illegible] ن کے خلاف میں حضرت اسامہ بن زید کی سرکردگی میں اسلامی لشکر پہنچا تو اور لوگ تو بھاگ گئے لیکن مرداس رہ گئے۔ لشکر کو دیکھ کر انہوں نے سلام کیا اور کلمہ پڑھا۔ اس کے باوجود حضرت اسامہ نے ان کو دشمن سمجھ کر قتل کر دیا۔ جب حضور کو اس واقعہ کی خبر ہوئی تو آپ اسامہ پر ناراض ہوئے (تفسیر [illegible] ک التنزیل) بیان القرآن میں ہے کہ حضور نے مقتول کے بھائی کو ان کی دیت ادا فرمائی۔ بخاری، ترمذی اور مسند کی میں قتل کرنے والے کا نام [illegible] ب، بزار نے حضرت مقداد کو قاتل بتایا ہے۔ ایسا ہی ایک واقعہ حضرت خالد بن ولید کو بھی پیش آیا کہ انہوں نے ایک شخص کو غلطی سے قتل کر دیا [illegible] ول نے ان پر عتاب فرمایا کہ ہل شققت قلبہ۔ کیا تم نے اس کا دل چیر کر دیکھ لیا تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ سے عرض کی کہ اے پروردگار میں تیرے حضور میں خالد [illegible] عمل سے بیزاری کا اظہار کرتا ہوں۔

غرض تکفیر مسلم پر شریعت میں سخت وعید آئی ہے۔ بخاری میں حضرت ابوذر سے روایت ہے کہ آنحضرت نے فرمایا کہ جب کوئی شخص دوسرے کو [illegible] ، یا کفر سے منسوب کرتا ہے، مگر وہ درحاصل ایسا نہیں ہوتا تو وہ فسق یا کفر پہلے شخص ہی پر لوٹ آتا ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے من قذف مومنا

بکفیہ فہو کقتلہ یعنی مومن کو کفر کی تہمت لگانا اس کو قتل کرنے کے برابر ہے ۔ امام بخاری نے اسی سلسلے میں باب باندھا ہے ۔ باب من اکفر اخاہ بغیر تاویل فہو کما قال یعنی جو بغیر تاویل (صریح طور پر) اپنے بھائی کی تکفیر کرے تو وہ ویسا ہی ہے جیسا کہ اس نے کہا ۔ علیٰ ہذا باب من لم یر اکفار من قال ذٰلک متأولا او جاھلا یعنی جو شخص تاویل کے ساتھ یا نادانی سے کوئی بات کہہ دے اس کی تکفیر کو جائز نہ جاننا ۔ اس ضمن میں یہ حدیث نقل کی ہے کہ جب کوئی شخص اپنے بھائی کو کافر کہہ کر پکارے تو ان میں سے ایک ضرور کافر ہوگا ۔ (جس کو کافر کہا گیا یا جس نے غلطی سے کافر کہا) ۔ نیز حضرت حاطبؓ کا واقعہ لکھا ہے جنہوں نے کفار قریش کو حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جنگی ارادوں سے مطلع کر دیا تھا ۔ اور ان کو اس فعل پر حضرت عمرؓ نے منافق کہا ۔ لیکن حضورؐ نے حضرت عمرؓ کو تنبیہ کرتے ہوئے ارشاد کیا کہ ایسا نہ کہو ۔ حاطب بدری ہیں ، تمہیں کیا خبر کہ حق تعالیٰ اہل بدر کی تمام خطائیں معاف فرما چکا ہو ۔ یا ایک بار حضرت معاذ بن جبل نے ایک مسلمان کو منافق کے لقب سے یاد کیا جس پر آنحضرت نے فرمایا یا معاذ افتان انت معاذ کیا تم لوگوں کو فتنہ میں ڈال دو گے ۔

ان نصوص صحیحہ و صریحہ کی روشنی میں علماء اسلام اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اہل قبلہ کی تکفیر جائز نہیں ، شرح عقائد نسفی میں جو مدرسوں کے ہماری نصابیات میں شامل ہے تصریح کی ہے کہ ومن قواعد اہل السنۃ والجماعۃ ان لا یکفر احد من اہل القبلۃ یعنی اہل سنت وجماعت کے اصولوں میں یہ ہے کہ اہل قبلہ میں کسی کی تکفیر نہ کی جائے ۔ اور اس کو اشاعرہ کا مسلک بتایا ہے ۔ حضرت امام اعظمؒ سے بھی یہ قول منقول ہے کہ لا نکفر احداً من اہل القبلۃ ۔ اب سوال یہ ہے کہ اہل قبلہ کون ہیں ۔ ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جو ہماری سی نماز پڑھے اور ہمارے قبلہ کی طرف رخ کرے اور ہمارا ذبیحہ کھائے وہ اسلام کی پناہ میں آگیا ۔ بنا برآں اس حدیث نے اس عقدہ کو قطعی طور پر حل کر دیا ۔ مگر علماء کی ایک بڑی جماعت دوسری نصوص کے پیش نظر اس طرف گئی ہے کہ اہل قبلہ سے وہ لوگ مراد ہیں جو ضروریات دین کے قائل ہیں اور جو ضروریات کے منکر ہیں مثلاً حدث عالم ، حشر اجساد ، حق تعالیٰ کے عالم کلیات و جزئیات ہونے پر اعتقاد نہیں رکھتے وہ اہل قبلہ میں شامل نہیں ہیں ۔ خود اشاعرہ بھی اسی تعبیر کے حق میں ہیں ، حاشیہ خیالی میں ہے کہ اشاعرہ مسائل اجتہادیہ میں کسی کی تکفیر نہیں کرتے ۔ البتہ ضروریات دین کے منکر کو وہ بھی کافر کہتے ہیں ۔ تاہم فقہاء و متکلمین کی اکثر نے تکفیر کی کچھ حدود مقرر کی ہیں جن پر آگے بحث آتی ہے ۔

پہلے ضروریات دین کی توضیح کر دی جاتی ہے جس سے زیر نظر مسئلہ کسی قدر صاف ہو جائے ۔ وہ عقائد جن پر ایمان کی بنیاد ہے ضروریات دین کہلاتی ہیں ، جیسے خدا ، رسول و قیامت وغیرہ پر یقین رکھنا ، اگر کوئی شخص خدا کو نہیں مانتا ، یا مانتا ہے مگر اس کی ذات و صفات میں دوسروں کو شریک گردانتا ہے ۔ یا اس کی شان اقدس میں گستاخی کرتا ہے یا قرآن مجید کو جھٹلاتا ہے یا رسالت کا منکر ہے یا رسول مقبولؐ کا یا آپ کی خاتمیت کا قائل نہیں یا قیامت پر اعتقاد نہیں رکھتا تو وہ بے شبہ دائرہ اسلام سے خارج ہے ۔

لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا ۔ حضرات علماء نے تکفیر میں کافی احتیاط برتی ہے اور اس پر متعدد پابندیاں عائد کی ہیں مثلاً شرح فقہ اکبر میں ہے کہ اگر کوئی کہے کہ میں نے دنیا میں اپنی آنکھوں سے حق تعالیٰ کو دیکھا تو کافر ہو جائے گا ۔ مگر محض دعویٰ رویت پر تکفیر کا اقدام نہایت خطرناک ہے ۔ خان نظام فی افناء الف کافر اھون من الخطاء فی افناء مسلم ۔ یعنی ایک ہزار کافروں کے متعلق فتویٰ میں غلطی کرنا ایک مسلمان کے بارے میں غلطی کرنے سے زیادہ آسان ہے ۔ حضرت مولانا عبدالحی فرنگی محلی سے مختلف فرقہ اسلام کی نسبت دریافت کیا گیا جس پر آپ نے جواب دیا کہ "عقائد اور فقہ کی کتابوں سے ثابت ہے کہ بہتر فرقے جو اہل اہواء میں ہیں ان میں ایک بھی کافر نہیں ہے ۔ بلکہ اتفاق ان کے کفر کا بھی کفر ہے ۔ تمہید ابو شکور میں ہے کہ حدیث مبارکہ فترقہ میں اختلاف ہے نیز یہ کہ امام ابو حنیفہؒ سے پوچھا گیا کہ اہل سنت وجماعت کی کیا تعریف ہے امام نے فرمایا لا نصب ولا رفض ولا جبر ولا قدر ولا تشبیہ ولا تعطیل ۔ اسی کے ساتھ امام موصوف نے کہا کہ اہل اہواء کی گواہی مقبول ہے ۔ اور جب ایسا ہے تو ثابت ہو گیا کہ وہ مسلمان ہیں امام محمد نے فرمایا کہ بدعتی کے پیچھے نماز جائز ہے اگرچہ بکراہت ، کیونکہ وہ بدعت کو حق سمجھ کر ایسا کر رہا ہے ۔ دوسرے وہ تاویل سے کام لیتا ہے لہٰذا اس کو

لے جامعہ اسلامیہ اکوڑہ خٹک کی خدمت میں بھیج دیا، مولانا موصوف نے اس کے جواب میں جو مکتوب لکھا ہے وہ درج ذیل کیا جاتا ہے
مدیر مکتوب مولانا کے جواب میں مولانا محمد یوسف صاحب کا ۔ اصل غرض یہ ہے کہ مولانا محمد یوسف صاحب حق پسند عالم ہیں اور الحمد للہ ان
کے نفس سے کسی گروہی عصبیت میں آلودہ نہیں ہیں، انہوں نے بڑی جرأت کے ساتھ حق باتیں کہی ہیں اور اس کی پروا نہیں کی کہ خود ان
کے مسلک کے علماء اُن کے مخالف ہو جائیں گے، مولانا موصوف کی تحریر میں جو آزادی اور سچی حق فکر پائی جاتی ہے، ملت کی خیر خواہی
اور اسلام کی درد مندی سے اُن کا دل لبریز ہے جس کی جھلکیاں اُن کے ہر ہر لفظ میں نظر آتی ہیں، یہی وہ حق گوئی ہے جس نے تاریخ کے
ہر دور میں حق کی خاطر مظلوم اور شکستہ دلوں کو سہارا دیا ہے اور حق پسندی کے پرچم بلند کئے ہیں۔ (م۔ ق)

سوادِ مکتوب

محترم المقام! السید مجدکم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ آپ کا والا نامہ معہ پوسٹر موصول ہوا، پوسٹر کے مندرجات کو دیکھ کر دکھ بھی ہوا، اور تعجب بھی، دکھ تو اس لئے ہوا کہ اسلام کی غربت، بلکہ انتہائی مظلومیت کے دور میں جو منکرین اسلام اور پاسبانِ شریعت پر کیا تشدد اختیار کئے ہوئے ہیں اور ان کی دینی درسگاہوں میں فضلاء کی یہ کیسی تربیت ہو رہی ہے، کیا اب ان کے کرنے کے لئے دوسرا کوئی کام نہیں رہا ہے۔ بجز اس کے کہ مولانا مودودی ہی کو اپنی تکفیر و تضلیل کے لئے منتخب کریں؟ افسوس اور صد افسوس۔

اور تعجب اس لئے ہوا کہ جس مضمون کی بنیاد پر یہ حضرات مولانا مودودی کی ذات کو ہدف ملامت بنائے ہوئے ہیں اس میں صحابہؓ کرام کے متعلق مولانا نے جو واقعات نقل کئے ہیں وہ سب کا سب تاریخ کے معتبر ذخیرہ سے باحوالہ نقل کئے ہیں اور خود مولانا کے یہ ناقدین اور معترضین حضرات بھی معترف ہوں گے۔ کہ یہ تمام کے تمام واقعات سینکڑوں برس سے مسلم مؤرخین نے مرتب کرکے اپنی اپنی تصانیف میں درج کئے ہیں نہ کہ مولانا موصوف نے انہیں از خود گھڑ لیا ہے۔ تو اگر بالفرض یہ حضرات عشق صحابہؓ کے جذبہ سے سرشار ہیں اور یہ واقعات بھی ان کے نزدیک توہین آمیز ہیں اور یہ حقیقت بھی ان کے نزدیک مسلّم ہے کہ ان کا نقل اور اپنے کسی مضمون یا تصنیف میں ان کا محض ذکر ہی وہ ناقابل معافی جرم ہے جس کا مرتکب، والعیاذ باللہ توہین صحابہؓ کا مجرم متصور ہوگا اور اس بات کا مستحق ہوگا کہ اس پر تکفیر یا تضلیل کے فتویٰ داغ دئے جائیں تو پھر یہ بات ہماری سمجھ سے بالا ہے کہ سب سے پہلے لائق تکفیر یا مستحق تضلیل تو وہ مسلم مؤرخین ہیں جنہوں نے دنیائے اسلام کے سامنے واقعات کی حیثیت سے ایسی حالت صحابہؓ کے یہ واقعات پیش کئے ہیں لیکن اُن سے یہ ناقدین حضرات مکمل طور پر خاموش ہیں۔ نہ ان کی زبانیں اُن کے خلاف ہل سکتی ہیں اور نہ قلم کو معمولی سی بھی جنبش دیتے ہیں۔ حالانکہ انصاف کا تقاضا کے مطابق تو ان کی رو سے ان معترضین حضرات کے نزدیک مسلم مؤرخین ہی سب سے زیادہ اور سب سے مقدم مجرم ہونے چاہئیں کیونکہ انہوں نے ہی سب سے اول اس جرم کا ارتکاب کیا ہے اور آنے والی نسلوں کے لئے ان توہین آمیز واقعات کے نقل کرنے کا دروازہ کھولا ہے اب ان سے ان کی یہ مکمل خاموشی اور مولانا مودودی کی ذات ہی کو اپنی تضلیل شمین گنوں کی گولیوں کے لئے ٹارگٹ بنانا ہر شخص جانتا ہے کہ یہ سب کچھ عشق صحابہؓ کے جذبہ سے نہیں بلکہ ذاتی بغض اور عناد کے جذبہ سے کیا جا رہا ہے اور ناموس صحابہؓ کی حفاظت کا جو لیبل اس پر چسپاں کیا جاتا ہے اس کی حیثیت بر حقیقت دیدہ اور منصف مزاج آدمی کے نزدیک کلمۃ حق ارید بہا الباطل۔ سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق مولانا نے جو کچھ اپنے مضمون میں لکھا ہے وہ کوئی نئی بات نہیں، نہ مولانا نے اپنی طرف سے اُن پر کوئی بے بنیاد الزام لگایا ہے بلکہ مولانا سے صدیوں پہلے یہ واقعات بہت بڑے بڑے محدثین اور ثقہ مؤرخین نے ذکر کئے ہیں اور اسی طرح ذکر کئے ہیں۔ جس طرح کہ مولانا موصوف نے نقل کئے ہیں۔ مشہور فاضل دیوبند جناب صاحب نے اس سے جو استنباط اور استنتاج کیا ہے اُسے دیکھ کر بے ساختہ یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ بے چارے ابھی تک اعتدال کی کتب میں سے ہیں اور بہ حق سے اُن پر بغض زیادہ غالب آ چکا ہے، نیز انہوں نے اس بات پر بھی غور نہیں فرمایا کہ جن واقعات کی بنیاد پر وہ مولانا مودودی کو محض زندیق اور گمراہ کہتے ہیں وہ واقعات تو صاحبِ امت کے بہت سے بڑے علماءؒ اور محدثینؒ و فقہاءؒ نے ذکر کئے ہیں تو کیا ان کے اس فتوے اور الزامات کی زد میں وہ تمام علماء اور محدثینؒ و فقہاء

نہیں آئیں گے۔ جنہوں نے سب سے پہلے اس قسم کے واقعات ذکر کئے ہیں! یہی واقعات حضرت معاویہ کے متعلق بھی مسلم محدثین اور فقہاءؒ و مؤرخینؒ کی کتابوں میں پائے جاتے ہیں۔ تو ان کے متعلق ان فضلاء دیوبند حضرات کا فتویٰ کیا ہوگا؟ والسلام

محمد یوسف

۲۰ دسمبر ۱۹۶۶ء

دوسرا مکتوب

جناب کا والا نامہ موصول ہو کر باعث سرفرازی ہوا۔ یاد آوری کے لئے بے حد ممنون ہوں۔ امید ہے اسی طرح آئندہ بھی یاد آوری فرماتے رہا کریں گے۔ میں ہمیشہ کے لئے ممنون رہوں گا۔ جزاکم اللہ۔

محترما! آپ نے اپنے عنایت نامہ میں جو باتیں ارشاد فرمائی ہیں۔ جی نہیں چاہتا کہ اپنی طرف سے ان کے جواب میں کچھ معروضات پیش خدمت کروں، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ آپ بھی مولانا غلام غوث صاحب کی طرح غصہ ہو کر اپنے غیظ و غضب کے لئے مجھے نشانہ بنائیں، اس طرح ایک دوسری ناگوار بحث کا آغاز ہوگا۔ جو جانبین کے لئے باعث پریشانی ہوگی۔ لیکن خط کے بعض مندرجات کو سامنے رکھ کر مجبوراً چند گذارشات پیش کرتا ہوں۔ خدا کرے آپ کے لئے موجب غلط فہمی یا باعث رنجیدگی ثابت نہ ہوں۔

(۱) میرے محترم بزرگ! میں اپنے متعلق آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں کسی مسلمان کی عزت و آبرو پر حملہ آور ہونے کو جائز نہیں بلکہ حرام قطعی سمجھتا ہوں، اسی طرح میں علماء دین کے متعلق بھی وہ رائے نہیں رکھتا جو آپ رکھتے ہیں، آپ کی رائے تو ان کے بارے میں یہ ہے کہ یہ لوگ عافیت کوش بھی ہیں اور حاسد بھی۔ اور خبث باطن کی بیماری میں بھی مبتلا ہیں اور دینی حالت میں وہ کرکس و تدلیس کو اپنے لئے ذریعہ نجات سمجھ بیٹھے ہیں۔ اس سے زیادہ وہ دین کی کوئی خدمت نہیں کرتے اور یہ آپ کی نظر میں چنداں قابل قدر کام نہیں ہے۔ اس کے برخلاف میں ان حضرات کے علمی کارناموں اور عملی خدمات دین کو بہت قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ اس وقت جو کچھ اور جتنی کچھ پاک و ہند کی سرزمین پر اسلام کی روشنی نظر آتی ہے یہ انہی حضرات علماء دین کی تعلیمی مساعی اور تبلیغی سرگرمیوں ہی کا نتیجہ ہے اس لئے تمام مسلمانوں کو انہی کا ممنون احسان ہونا چاہیے۔

(۲) عرصہ دراز سے میری یہ تمنا اور دلی خواہش رہی ہے کہ اس وقت جتنی بھی اسلام پسند تنظیمیں اور دینی جماعتیں سرزمین پاکستان میں اسلام کی حقیقی سربلندی کے لئے مخلص دل سے کام کر رہی ہیں وہ سب کے سب باہم متفق اور متحد ہو کر اعلاء کلمۃ الحق کی مشترکہ جدوجہد کا آغاز کریں اور اپنے اپنے فروعی اور فقہی مسالک پر قائم رہ کر تمام فتنہ انگیز تنظیموں کے مقابلہ میں بنیان مرصوص بن کر رہیں اور اپنے اتحاد عمل سے یہ ثابت کر کے دکھائیں کہ گو ہم اپنے فروعی مسلک کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں مگر اپنے مشترک اور قیمتی متاع دین کی حفاظت کے لئے آج سے چودہ سو سال قبل ہمیں واعتصموا بحبل اللّٰہ جمیعا ولا تفرقوا۔ کا جو سبق پڑھایا گیا تھا اس کے گہرے نقوش آج بھی ہمارے دل و دماغ پر پوری طرح ثبت ہیں نہ کہ وہ مٹ چکے ہیں اور ہمارے اس متاع دین پر جو بھی حملہ آور ہوں ہم اچھی طرح ان کے حملوں کا منہ توڑ جواب دے سکتے ہیں اور دفاع کا فریضہ بھی ادا کرنا جانتے ہیں۔

(۳) اس وقت سرزمین پاکستان میں اسلام کی حقیقی سربلندی کے لئے جو لوگ پورے خلوص کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ خواہ آپ برا کیوں نہ مانیں مگر میں بلا خوف تردید یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ بہت سی تنظیموں سے وابستہ حضرات ہیں۔ ان میں سے ایک تو اہل حدیث حضرات ہیں، جو اگرچہ اپنے مخصوص مسلک کے لحاظ سے مقلدین حضرات سے الگ اور قدرے جدا ہیں مگر یہ حقیقت ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ وہ دوسرے تمام اسلام پسند حضرات کی طرح بلکہ ان سے بھی زیادہ اس ملک میں قرآن و سنت پر مبنی نظام اسلام دیکھنے کے نہ صرف خواہشمند ہیں بلکہ اس کے لئے مقدور بھر سعی اور جدوجہد بھی کرتے ہیں۔

اور دوسرے وہ علماء کرام ہیں جو دیوبندی مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔ خواہ وہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مشرب سے متعلق ہیں یا حضرت مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے خاص مسلک "اشاعت توحید و سنت" سے وابستہ ہیں۔

تیسرے وہ لوگ ہیں جو جماعت اسلامی سے منسلک ہیں ــــ پاکستانی عوام اور تعلیم یافتہ دونوں طبقوں پر موخر الذکر دونوں حضرات کا جو اثر ہے وہ دوسری

نے اسلام کی صحیح تعلیمات اپنی تبلیغ و تدریس کے ذریعہ ہم تک پہونچائی ہیں اور انہی کی روشنی میں ہم نہایت آسانی سے اصلی اور نقلی اسلام کی تمیز کر سکتے ہیں ورنہ اگر ماضی میں وہ اپنی تعلیم اور درس و تدریس کے ذریعہ آنے والی نسلوں تک اسلام کی اصلی تعلیمات پہونچانے کا انتظام نہ کر چکے ہوتے یا آج مدارس دینیہ میں مقتدر و محدثین حضرات درس و تدریس کے ذریعہ اسلام کے اصل احکام کی تشریح نہ کرتے تو بہت سے نادان ڈاکٹر اسلام کے احکام پر عمل جاری کر کے اس کا اصل حلیہ ہی بگاڑ کے رکھ دیتے، پھر میڈیکل اور ایڈیٹروں سے کچھ نہ بن پڑتا۔ اسی لئے حضور نے فرمایا ہے کہ : انما بعثت معلما ——— ۔

۸) آپ مجھ پر یہ الزام لگا رہے ہیں کہ آپ نے مولانا غلام غوث صاحب کے خلاف محاذ بنایا ہے لیکن یہ خیال تک نہیں فرماتے کہ پہلے کون حملہ آور ہوا ہے اور بے بنیاد الزامات کون لگا چکا ہے اور گالیوں سے بحث کا آغاز کس نے کیا ہے۔ آپ کا انصاف یہ بھی فیصلہ نہیں کر سکتا کہ پہلے انہوں نے مسلسل حملے کئے ہیں اور میں صرف اپنا دفاع کر رہا ہوں۔ ایک بھی میرا مضمون ایسا نہیں جو دفاع کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ سارے کے سارے مضامین جوابی ہیں۔ جن میں مولانا غلام غوث صاحب کے حملوں کا دفاع کیا جا رہا ہے ——— تین چار سال سے مولانا غلام غوث صاحب میرے خلاف ہر قسم کی ایذا رسانی میں برابر مصروف ہیں اور قسم قسم کے ناجائز حربے کر رہے ہیں اور جرم صرف یہ ہے کہ میں مولانا مودودی کے بارے میں وہ رائے نہیں رکھتا جو وہ رکھتے ہیں حالانکہ میں ان کے جواب میں ہمیشہ خاموشی اختیار کر چکا ہوں لیکن ان کی یہ تمام حرکتیں آپ کے نزدیک قابل تحسین ہیں اور جب میں اپنا دفاع کر رہا ہوں تو آپ اسے محاذ کا نام دیتے ہیں۔ کم سے کم یکم جولائی سے لیکر ۹ اگست تک کے ترجمان اسلام کے پرچے دیکھیں۔ بالخصوص ۹ اگست کے پرچے میں "شیخ و شیر میں" کے عنوان کے تحت جو کچھ میرے متعلق تحریر کیا گیا ہے اس کو ملاحظہ فرما کر خود فیصلہ کریں کہ مجرم کون ہے اور میں اپنا دفاع کرنے میں حق بجانب ہوں یا نہیں ؟

۹) میں حیران ہوں کہ جب مولانا غلام غوث صاحب مجھے مغلظ گالیاں دیتے ہیں تو آپ ان کے لئے یہ توجیہہ کرتے ہیں کہ وہ معذور ہیں کیونکہ ان کی طبیعت جلالی واقع ہوئی ہے۔ اور جب ان کی گالیوں کو گالیاں کہا جاتا ہے تو آپ اس کو زبان کی لغزش کی بات سے تشبیہ دیتے ہیں کیا اسلام جلالی طبیعت رکھنے والے حضرات کو گالیاں دینے کی اجازت دیتا ہے نیز ایسی جلالی گالیوں کو گالیاں کہنا کب حرام کیا جا چکا ہے؟ یقین جانیئے کہ دنیا کی کوئی بھی عدالت انصاف آپ کی اس رائے سے کبھی متفق نہیں ہو سکتی۔ آپ کو چاہئے کہ "کونوا قوامین للہ شہداء بالقسط" پر قائم رہیں نہ کہ "لا یجرمنکم شنآن قوم علی ان لا تعدلوا" کی خلاف ورزی کا ہر وقت مظاہرہ کرتے رہیں۔

۱۰) مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے بارے میں آپ حضرات کی جو رائے ہے یا آن سے آپ کو جو اختلافات ہیں کم سے کم مجھے تو ان کے متعلق یہ اطمینان حاصل نہیں کہ آپ کی یہ رائے صائب اور اختلافات ہر قسم کے تعصبات سے پاک اور نفسانیات سے بالاتر ہیں اس کو خواہ آپ مولانا مودودی کی چوکھٹ پر سب کچھ نثار کرنے سے تعبیر کیوں نہ کریں۔ مگر ہے یہ حقیقت کہ میں عرصہ دراز سے آپ کے حلقہ سے تعلق رکھنے والے اہل علم حضرات کی تحریریں اور اختلافی مسائل سے متعلقہ مضامین اور تصانیف و کتب کا مطالعہ کر رہا ہوں اور کئی حضرات سے زبانی گفتگو بھی کر چکا ہوں اور بہت سے حضرات کو قریب سے دیکھنے کا بھی موقع مل چکا ہے لیکن عدل و انصاف اور شریعت حقہ کی تعلیمات اور علماء حق کے فیصلوں کی روشنی میں جب ان اختلافات پر نظر ڈالتا ہوں، تو مجھے ہرگز یقین نہیں آتا کہ یہ تمام اختلافات نیک نیتی پر مبنی اور ہر قسم کے تعصبات سے پاک اور نفسانیات سے بالاتر ہیں اور حق کی خالص حمایت کے لئے ہیں ——— اگرچہ اختلافات کو میں برا نہیں سمجھتا۔ لیکن ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے اور اسی بناء پر کہنا چاہتا ہوں کہ یہ اختلافات نہ ذاتیات اور تعصبات سے پاک ہیں اور نہ اپنی حدود میں رہے ہیں۔ البتہ میں اکابرین دیوبند رحمہم اللہ کی نیک نیتی پر شبہ نہیں کر سکتا لیکن ان کے ہر فیصلہ سے کلی طور پر اتفاق ظاہر کرنا بھی اپنے لئے فرض اور واجب نہیں جانتا ہوں۔ اگرچہ مسلک کے اعتبار سے انہی سے وابستہ ہوں۔ اور علمی استفادہ کے لحاظ سے انہی سے شرف تلمذ حاصل کر چکا ہوں ——— اختلافات حالیہ کے بارے میں میں نے آپ کے سامنے جو کچھ اپنی رائے پیش کی ہے۔ واللہ یہ کسی کی ناجائز مخالفت یا حمایت پر مبنی نہیں۔ بلکہ اپنے علم کی حد تک میں اس کو حق اور مبنی بر انصاف سمجھتا ہوں۔

۱۱) لیکن اگر آپ کو میری اس رائے پر کہ اختلافات تعصبات سے پاک نہیں ہیں شک ہے تو میں آپ کو حالیہ اختلافات کا حوالہ دیتا ہوں۔ جو مولانا مودودی کے

"خلافتِ راشدہ" والے مضمون کی اشاعت سے پیدا ہوئی ہیں۔ اس مضمون کی اشاعت پر علمی حلقوں نے جو غیر معمولی ہنگامہ برپا کر رکھا ہے اس میں یہ آوازیں سُننے میں آتی رہی ہیں کہ "مودودی صاحب نے صحابہ کرامؓ کو گالیاں دی ہیں" "اور مودودی صاحب نے ان کو بہتان تراش، جھوٹے، سازشی اور لالچی کہا ہے اور اس پر وہ ڈھٹائی سے قائم ہوا ہے" وغیرہ وغیرہ ——— اب غور کیجئے کہ حقیقت حال کیا ہے اور اختلافات کا یہ ہنگامہ کہاں تک نیک نیتی پر مبنی اور تعصب سے پاک ہے۔

——— اگر آپ نے خلافت راشدہ والا مضمون خود دیکھا ہو اور انصاف سے آپ کا دل بالکل خالی نہیں ہو چکا ہو تو آپ اس سے زیادہ اس مضمون سے متعلق کچھ نہیں کہیں گے کہ مولانا مودودی نے صرف مشاجرات صحابہؓ سے متعلق تاریخ کی معتبر کتابوں سے واقعات کو باحوالہ نقل کیا ہے اور اپنی طرف سے ایک بھی واقعہ گھڑ کر نہیں ذکر کیا ہے۔ صحابہ کرامؓ کے متعلق جو کچھ ——— تصورات ذہن میں قائم ہوتے ہیں تو وہ اصل واقعات ہی سے قائم ہوتے ہیں اور نفس الامری حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام واقعات سب سے پہلے مسلم مورخین نے ذکر کئے ہیں ——— اب اگر آپ مجرد واقعات نقل کرنے ہی کو صحابہ کرام کی توہین یا گالی دینے کے مترادف سمجھتے ہیں اور صحابہ کرام سے انتہائی محبت ہی کی بنا پر مولانا مودودی کو سب کچھ کہنے کے لئے تیار بیٹھے ہو کر یہ الفاظ عجب عجب نکل آتے ہیں توبہ توبہ کرم! یہ بتائیں کہ صحابہ کرام کی توہین کرنے والے مسلم مورخین سے آپ کیوں اس قسم کے طور پر خاموش ہیں؟ سب سے پہلے اس جرم کے مرتکب تو وہ ہوئے ہیں تو ان کو یک جنبش قلم اسلام، یا اہل السنۃ والجماعت کے دائرہ سے نکال کر آپ کیوں نہیں پھینکتے ہیں اور ان پر توہینِ صحابہ کا الزام کیوں نہیں لگایا جاتا؟ پہلے آپ ان پر گمراہی کا فتویٰ لگائیں۔ اس کے بعد اگر مولانا مودودی کے متعلق آپ کچھ کہیں گے تو ہم یہ سمجھیں گے کہ یہ عشقِ صحابہؓ ہی کا جذبہ ہے جو آپ کو پریشان کر سکتا ہے اور جو بھی ان کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھتے ہیں آپ ان کی خوب خبر لیتے ہیں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ مسلم مورخین سے آپ پوری طرح خاموش ہیں۔ اور بار بار توجہ دلانے پر بھی آپ ان کے بارے میں لب کشائی نہیں فرماتے اور صرف مولانا مودودی کی ذات پر ہر قسم کے حملے کئے جا رہے ہیں تو آپ ہی بتائیں کہ اس طرزِ عمل کے متعلق کوئی ذی عقل یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ سب کچھ اخلاص اور نیک نیتی پر مبنی ہے، یہ حب علیؓ ہے نہ کہ بغض معاویہؓ؟ صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ احترام صحابہؓ کے نام سے ذاتیات اور گروہی تعصبات کی بنیاد پر کیا جا رہا ہے نہ کہ حق کی حمایت کی غرض سے۔

اور اگر آپ کا دعویٰ یہ ہو کہ واقعات کے علاوہ بھی مولانا مودودی نے خود صحابہ کرامؓ کو گالیاں دی ہیں تو آپ ان کی نشاندہی فرمائیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس طرح گالیوں کی نشاندہی کرنے پر سب سے پہلے میں ہی وہ شخص ہوں گا جو مولانا مودودی کے خلاف آپ کی حمایت کا اعلان کروں گا لیکن قیامت تک بھی آپ اس طرح کی گالیوں کی نشاندہی نہیں کر سکیں گے۔

مـ۱۲ م:- آپ نے میرے متعلق جو یہ فرمایا ہے کہ آپ اپنے موقف سے مودودی صاحب کا تیسرا صفحہ دیکھ کر ہٹ گئے۔ تو اس کے متعلق میں عرض کروں گا کہ اگر دل میں خدا کا کچھ بھی خوف ہو تو اس کے لئے خدا سے استغفار کیجئے۔ آپ عالم الغیب نہیں ہیں اور فی الواقع یہ مجھ پر بہت بڑا بہتان ہے۔ اصل حقیقت حال وہ ہے جس کی وضاحت بار بار انہیں کے صفحات میں کی جا چکی ہیں۔ آپ کے ذہن پر جو الزامات شخصوں سے پیدا ہو چکا ہے جو ہر بات دن کے بعد مولانا غلام غوث صاحب یا ان کا ترجمان اسلام یا پھر اس کے ادارہ سے منسلک حضرات آپ کو لگاتے ہیں لیکن یاد رکھئے سوءظن اور بہتان بہت بری بیماری ہے۔

آپ یہ بات ذہن نشین کر لیجئے کہ مولانا مودودی کے مضمون پر میری تنقید کی نوعیت ابتدا سے یہ تھی کہ یہ واقعات اگرچہ تاریخ کی معتبر کتابوں سے لئے گئے ہیں مگر چونکہ ان کے مطالعہ سے ایک قاری کے ذہن میں صحابہ کرامؓ کے متعلق برے تصورات قائم ہوتے ہیں اس لئے آج کے پرفتن دور میں ان کی اشاعت مفید نہیں بلکہ نقصان دہ ہے۔ اور اس پر میں اب بھی قائم ہوں۔ لیکن میں نے ہرگز اپنے مضمون میں یہ نہیں لکھا ہے کہ مولانا مودودی نے صحابہ کرامؓ کو گالیاں دی ہیں۔ یہ مجھ پر ترجمان اسلام کی بہتان تراشی تھی۔ اور اسی بہتان تراشی کا انتساب یہ بھی ہوا ہے جبھی تو آپ کہتے ہیں کہ مودودی صاحب نے صحابہ کرامؓ کو گالی دی ہے۔

مـ۱۳ م:- مجھے آپ کے اس ارشاد سے سخت اختلاف ہے کہ مودودی صاحب جب یہ کہتے ہیں کہ تقلید گناہ ہے تو ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ابوحنیفہؒ، شاہ ولی اللہ، شیخ الہندؒ مولانا محمود الحسنؒ اور محمد قاسم نانوتویؒ کی تقلید نہ کرو۔ میری کرو صرف میری۔ میرے خیال میں یہ بھی ان بہتانات میں سے ایک ہے جو آپ کے خدا رسیدہ بزرگ مولانا غلام غوث صاحب اپنے سوءظن کے چشمۂ صافی سے خدا کے بے گناہ بندوں پر رات دن لگاتے ہیں ورنہ مولانا مودودی کی کسی کتاب

۵
آزمودہ دواؤں کا مرکب
انالجین
سر درد - کمر کا درد - دانت کا درد
ایام - انفلوئنزا اور ہر قسم کے دوسرے درد کے لئے
یقینی زود اثر اور بے ضرر علاج ہے
Opol
Spotlit

خلافت راشدہ کا پورا عہد مساوات اور جذبۂ خدمت گذاری کے واقعات سے معمور ہے اس مختصر سے مجلاتی مضمون میں ان کا احاطہ و استقصا مقصود نہیں، صرف اس کی چند جھلکیاں پیش کی جاتی ہیں، شاید ان اوراق پارینہ کی بازخوانی واخبارات سینہ کی تازگی کا باعث بنے اور آج کی "اسلامی" حکومتوں کے لئے لمحۂ فکریہ ثابت ہو۔

———(٠)———

رسول عربی (فداہ ابی و امی) کامل تیئیس ۲۳ سال تک پوری جانکاہی کے ساتھ اپنے فرض منصبی کو پایۂ تکمیل تک پہنچا کر اس عالم فانی سے تشریف لے جا چکے تھے، بہا مدینہ سوگوار تھا۔ عرب کے متعدد قبائل اللہ کے دین کے طوق اپنی گردن سے نکال پھینکنے کے لئے تیار نظر آ رہے تھے، ایسے نازک ترین وقت میں خلافت عظمیٰ کا تاج صدیق اکبرؓ کے سر پر رکھ دیا گیا، وقت کے اس فتنہ گری کا استیصال انتہائی اہم اور غیر معمولی کام تھا، لیکن صدیق اکبرؓ نے آہنی عزائم کے ساتھ اسکو فرد کر کے اپنی جہانبانی صلاحیتوں کا ثبوت بہم پہونچایا۔

کرسی خلافت کو زینت دینے کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے جو پہلا خطبہ و مثالی بیان جاری کیا ——— وہ آج بھی پند و موعظت حکمت اور عزیمت کی ایک معیاری مثال ہے۔

"لوگو! میں تم پر حاکم مقرر کیا گیا ہوں حالانکہ میں تم سے بہتر نہیں ہوں، اگر میں اچھا کام کروں تو میری مدد کرو اگر برائی کروں تو مجھے درست کر دو، خدا نے چاہا تو تم میں سے کمزور شخص میرے نزدیک طاقتور ہوگا یہاں تک کہ میں اسے اس کا حق دلوا دوں جب تک میں خدا اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرتا رہوں تم میری اطاعت کرو لیکن جب خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کروں تو تم پر میری اطاعت لازم نہیں۔" (طبقات ابن سعد بحوالہ خلفاء راشدین ص۳۵)

کتنا سادہ اور جامع ہے یہ بیان گویا اسی عزم و ارادہ کا اظہار ہے جو ان کے رگ و پے میں سمایا تھا کہ خلافت کبھی بھی راحت پسندی اور عیش کوشی کا وسیلہ نہ بننے پائے گی، بلکہ اس کا اصل و بنیادی مقصد خدمت خلق ہی ہوگا۔

یوں تو حضرت ابوبکرؓ خلافت ملنے سے پہلے بھی عوام کی بے لوث خدمت کرنے میں اپنے بیش قیمت لمحات صرف فرمایا کرتے تھے، لیکن جب خلافت کی ذمہ داریوں کے بار کو سنبھالا تو عام طور سے سمجھا جانے لگا کہ وہ خدمت خلق سے غافل ہو [illegible]۔ چنانچہ ایک عورت جس کی بکری کا دودھ آپ روزانہ دوہ کرتے تھے، جب اس کی معصوم بچی نے آپ کو خلیفہ ہونے کے بعد دیکھا تو [illegible] ہو گئی۔

"اب یہ تو خلیفہ ہو گئے ——— ہماری بکری نہ دوہیں گے۔"

"نہیں نہیں ——— میں اب بھی تمہاری بکریاں دوہوں گا ....." خلیفۂ اول نے بچی سے مسکرا کر فرمایا۔

ان الفاظ کو صرف قول کی حد تک محدود نہ رکھا بلکہ اسکو عملی جامہ پہنا کر دکھایا اور آخری عمر تک بلا ناغہ روزانہ جا کر اس کی بکریوں کو دوہتے رہے۔ (رشاہی حکمران ص۱۲)

مدینہ کے اطراف میں ایک اندھی بڑھیا رہتی تھی، حضرت عمر فاروقؓ روزانہ علی الصباح جا کر اندھی ضعیفہ کا سارا کام انجام دے دیا کرتے تھے، کچھ عرصہ بعد انہیں محسوس ہوا کہ کوئی [illegible] ان سے بھی پہلے آکر سارا کام کر جاتا ہے۔ ایک دن مکان کے گوشہ میں چھپ کر بیٹھ گئے کہ دیکھیں یہ کون شخص ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد کسی کی آمد کی آہٹ محسوس ہوئی انہوں نے صاف صاف دھندلکے میں بغور دیکھا تو وہ ابوبکر صدیقؓ تھے۔ جب وہ کام سے فارغ ہو کر چلے تو حضرت عمرؓ نے فرط عقیدت سے کہا۔

"خلیفۂ رسول آپ خدمت خلق میں سب سے بازی لے جاتے ہیں ———" (کنز العمال ج۶ ص۳۱۲)

خدمت گزاری کے اس شدید جذبہ میں انتہائی بے نفسی اور بے غرضی ہوتی تھی۔ یہی ابوبکرؓ خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالنے سے پہلے

اپنے اہل و عیال کی معاش کے لئے کپڑوں کے گٹھے لے جا کر فروخت کرتے تھے۔ خلافت کی گوناگوں ذمہ داریوں کے باوجود ذریعہ معاش بھی قائم رکھا اور بیت المال سے ایک حبہ بھی لینا گوارا نہ کیا، آخر میں جب کام بہت زیادہ بڑھ گیا تو بقدر کفاف معاوضہ منظور کر لیا لیکن بوقت وفات اس پر بھی نہایت بے چینی اور اضطراب کی کیفیت طاری رہی، اور وصیت کر گئے کہ ان کے ذاتی مال کو فروخت کر کے بیت المال کو یہ رقم واپس کر دی جائے قوت و شوکت کی یہ حالت تھی کہ پورا عرب زیر نگیں تھا۔ ان کی فوجیں ایک طرف شام کے میدانوں میں رومیوں کے مقابلے میں اپنے جوہر دکھا رہی تھیں اور دوسری طرف فارس کی سیاست سے سرگرم پیکار تھیں۔ بجائے عروج و اقبال کے انہیں نخوت و غرور میں مبتلا کرنے کی بجائے اور بھی منکسر المزاج اور خدا ترس بنا دیا تھا، خوف خدا میں کچھ کمی نہیں، اس میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔

———— ۰ ————

فاروق اعظمؓ ————

دنیا کا وہ عظیم رعایت و حکمران جس کی شوکت و دبدبہ سے قیصر و کسریٰ کے ایوان لرز جاتے تھے۔ جس کے عہد حکومت میں شام و مصر کی شہنشاہیت کا چراغ گل ہو گیا۔ اور فارس کی با جبروت حکومت کے دھوئیں اڑ گئے۔

لیکن ———— بایں ہمہ عروج و اقبال خدا کے اس بندہ خدا کا عالم یہ تھا کہ پہلے زندگی فقر و سادگی میں بسر کی۔ حکومت سے کوئی منفعت اور لطف حاصل نہیں کیا جو کہ فقر کی جو حالت پہلے تھی، خلافت ملنے کے بعد بھی وہی حالت رہی!

ایک مرتبہ ایک صحابی ربیع بن زیاد نے اس جانب توجہ دلائی کہ آپ کو اللہ نے بلند مرتبہ عطا کیا ہے آپ راحت و آرام کی زندگی بسر کرنے کا سب سے زیادہ حق رکھتے ہیں ———— حضرت عمرؓ نے ان کی یہ گفتگو سن کر فرمایا کہ امانت میں خیانت جائز نہیں۔ مجھے قوم کا امین بنایا ہے، مجھے ان کی امانت میں خیانت کا حق نہیں، کسی نے کہا: "اگر آپ مسلمانوں کے مال سے اچھا کھا اور پہن سکیں تو اس میں کوئی خاص کمی واقع نہ ہو گی" فرمایا: "افسوس! تم مجھے عیش و عشرت کی ترغیب دیتے ہو۔" (کنز العمال ج ۶ ص ۳۴۵)

بعض اللہ نت آپ سے ملاقات کے لئے بیرونی سفراء آ جاتے اور اپنے بادشاہوں کی شان و شوکت اور طمطراق کی بجائے اسلام نہیں بچھے پرانے کپڑوں میں ملبوس کسی جگہ خاک پر بیٹھا دیکھتے تو انہیں اپنی نگاہوں پر یقین نہ آتا۔

سفر شام کے موقع پر تمام مسلمانوں کی خواہش تھی کہ آپ اچھی پوشاک زیب تن فرما کر اور ترکی گھوڑے پر سوار ہو کر بیت المقدس میں داخل ہوں تاکہ خلیفہ اسلام کا رعب قائم ہو سکے، مگر آپ نے کسی طرح یہ منظور نہ فرمایا اور اپنے وہی پرانے کپڑے پہنے رہے اور اسی طرح معاہدہ پر دستخط ثبت فرمائے آپ کی سادگی کا عیسائی سرداروں کے دلوں پر بہت ہی اچھا اثر پڑا۔

کھانے کی کیفیت کا یہ حال تھا کہ دوسروں کو حضرت عمرؓ کے یہاں کا معمولی کھانا دیکھ کر آپ پر ترس آتا تھا۔ ایک مرتبہ عمرو بن عاص کھانے کے وقت تشریف رکھتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے بہت ہی اصرار سے انہیں کھانے میں شریک کرنا چاہا مگر وہ نہ بیٹھے خلیفہ نے اصرار کے سبب ان کی اس کا سبب پوچھا، تو عمرو بن عاص یوں گویا ہوئے۔

"ہمارے گھروں میں جو کھانا پکتا ہے وہ اس سے بہت اچھا ہوتا ہے۔ ————"

حضرت عمرؓ نے جواب دیا۔

"میں اگر چاہوں تو خود ایک سے ایک عمدہ کھانا کھا سکتا ہوں، مگر قیامت کا خوف ایسا دامنگیر رہتا ہے کہ عیش و تنعم کی ہمت نہیں ہوتی۔" (کنز العمال ج ۶ ص ۳۴۶)

۱؎ کنز العمال ج ۶ ص ۳۴۶

عدل کے معاملات میں کسی قسم کا امتیاز گوارا نہیں تھا۔ حتیٰ کہ غیر مسلموں کے درمیان بھی مساویانہ سلوک روا رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ کی زرہ کہیں گم ہو گئی اتفاق سے وہ ایک یہودی کو ملی آپ نے قاضی کے یہاں مقدمہ دائر کیا اور شہادت کے طور پر اپنے بیٹے حضرت حسنؓ اور غلام قنبر کو پیش کیا، قاضی نے گواہی کو رد کرتے ہوئے مقدمہ آپ کے خلاف فیصل کر دیا کہ بیٹے کی شہادت معتبر نہیں۔ آپ نے بے چون و چرا فیصلہ کو تسلیم کر لیا، یہودی آپ کے اس طرز عمل سے بہت متاثر ہوا اور کہنے لگا کہ یہ طریقہ انبیاء علیہم السلام کا ہے، قاضی خلیفہ کے خلاف فیصلہ دیتا ہے اور وہ اسے تسلیم بھی کر لیتا ہے اور یہ کہہ کر وہ مسلمان ہو گیا۔ (مثالی حکمران ۹۵)

———— (۰) ————

یہ اور اسی قسم کے سینکڑوں واقعات اس عہد زریں کے اوراق تاریخ میں محفوظ ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی حکومت کے اہل حل و عقد کا کیا کردار اور معیار زندگی ہونا چاہئے۔ صدیوں سے انہی مناظر کے دیکھنے کے لئے آنکھیں ترس رہی ہیں ———— کاش۔ ———— اے کاش !!

محمد زکریا مائل

ایک حکیمانہ حدیث کا پس منظر

بخاری اور مسلم نے اپنی صحیحین میں ایک مشہور و معروف حکیمانہ حدیث درج کی ہے جو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور وہ یہ ہے: حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ لَا یُلْدَغُ الْمُؤْمِنُ مِنْ جُحْرٍ وَاحِدٍ مَرَّتَیْنِ (مومن ایک سوراخ سے دوبارہ نہیں ڈسا جاتا)۔

یہ حدیث شریف بہت تھوڑے کلمات پر مشتمل ہے، یہ ایک ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جوامع الکلم میں شامل ہے جو الفاظ کے اختصار اور معانی کے پھیلاؤ اور جامعیت میں اپنی مثال نہیں رکھتے، یہ وہ کلام ہے جس کی طرف اور کسی قوتِ ناطقہ کی رسائی نہ ہو سکی۔ یہ حضور ہی کی معجزانہ سحر بیانی کا کرشمہ ہے کہ اتنے تھوڑے لفظوں کے کوزے میں حسنِ معنی، بلندیِ فکر اور نکتۂ تمثیل کا دریا سمو دیا ہے۔ اس ارشادِ مبارک کا مقصود مومن کی عقلی تربیت اور دقتِ نظر، اصابتِ رائے اور استواریِ تدبیر کی تعلیم و تلقین ہے۔ بالفاظِ دیگر منشائے مبارک یہ تھا کہ صاحبِ ایمان شخص ان اوصاف کی جانب متوجہ ہو جائے جن سے ایک کامل مسلمان کو اپنی دنیا اور دین میں متصف ہونا چاہئے۔

ادنیٰ سی فکر سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ جس زبانِ گرامی پر خدا کی طرف سے وحی آتی ہو اور فیوضِ الٰہیہ کے فیضان سے بہترین عقلی، بلند ترین اور کامل ترین حکیمانہ سیاسات کی نعمتیں عطا ہوتی رہی ہوں اس کی زبانِ حقیقت ترجمان سے اسی قسم کے نادر و جامع کلام کا صدور ہونا چاہئے۔ اس ارشاد کے ذریعے مومن کو ہدایت فرمائی گئی ہے کہ وہ صاحبِ دل، دانشمند، چوکس اور ہوشیار رہے، کسی پہلو سے غفلت کا شکار نہ ہو، بار بار پے در پے دھوکا کھائے، خواہ یہ دھوکا دنیوی معاملات میں ہو یا دینی امور میں، ہر موقع پر محتاط رہے۔ آپ نے مسلمانوں کو بڑی حکمت سے متنبہ فرمایا ہے کہ ایسے بھولے بھالے اور غافل و نادان نہ بن جائیں کہ ہر موڑ کا راہ چلتا ٹھگ لوگ انہیں اپنی چالبازیوں کا ہدف بنا لیں اور انہیں جس طرح چاہیں بہکاتے رہیں۔ اسی تعلیم و تنبیہ کا اعلیٰ درجہ کی حکیمانہ رہنمائی کا نتیجہ سمجھئے کہ اونٹوں اور بکریوں کے گلے چرانے والی قوم میں ایسے ایسے بالغ نظر اور ذکی عقل، حکیم اور عالم پیدا ہوئے کہ دنیا ان کی حکمت و دانائی کے نور سے جگمگا اٹھی۔ وہی قوم جو اپنی جہالت اور وحشت پرستی میں انتہا کو پہنچ گئی تھی ایسے علم و عمل، حکمت، فراست، شائستگی اور تہذیب و تمدن کے اوصاف میں جو ایمان، حق، عدل، اور خیر و فلاح کی بنیاد پر قائم تھے، سارے عالم کے لئے ضرب المثل بن گئی اور اس کی بدولت ایسے ایسے کامل الفن اشخاص وجود میں آئے کہ دنیا علم، سیاست، تجارت اور عدل و شفقت کی صفات میں ان کی نظیر پیدا کرنے سے قاصر رہی۔

مومن کامل کی یہ شان نہیں اور نہ ہونی چاہئے کہ وہ ایک بھولا بھالا اور ناتجربہ کار شخص بن کر رہ جائے کہ اس کے دشمن اُسے اپنے استہزاء و تمسخر کا ذریعہ بنا لیں اور اس کے دینی و دنیاوی معاملات میں نقصان رسانی کا باعث ہوں۔ صاحبِ مسند الفردوس نے حضرت انس سے مرفوعاً روایت کی ہے: اَلْمُؤْمِنُ كَيِّسٌ فَطِنٌ حَذِرٌ وَقَّافٌ مُتَثَبِّتٌ (مومن، عاقل، دانشمند، عواقب پر نظر رکھنے والا اور حقیقت کا جویا ہوتا ہے) مومن عاقل وہی ہے جو حوادثِ زندگی سے نصیحت اور تجربات سے استفادہ کرے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی سے

مروی ہے ۔ لا حلیمَ اِلّا ذو عثرۃ ولا حکیمَ اِلّا ذو تجربۃ (صرف لغزش والا شخص ہی بردبار اور صرف تجربہ کار شخص ہی حکیم ہوتا ہے) نیز بحث حدیث (لا یُلدَغ) کا انداز تمثیلی ہے تاکہ دل پر زیادہ اثر انداز ہو اور تاثیر و موعظت میں قوی تر ہو جائے ۔ عالم محسوس میں یہ صورت عادۃً پیش آیا کرتی ہے کہ جس شخص کو کسی بل سے ایک بار کوئی سانپ کاٹ کھاتا ہے تو وہ اس بل کی طرف نہیں جاتا اور اس خیال سے اس کے قریب نہیں ہوتا کہ کہیں دوبارہ سانپ نہ کاٹ کھائے ۔ اس وجہ سے ہمارا عبرت حاصل کرنا اور اس قسم کے تجربات سے فائدہ اٹھانا کتنا مناسب اور منفعت خیز ہے ۔

اس حدیث سے ایک صحیح واقعہ وابستہ ہے جس سے حدیث کی غایت اور مقصد کی توضیح ہوتی ہے ۔ وہ یہ ہے کہ ابوعزہ عمرو بن عبداللہ الجمحی ایک شاعر تھا ۔ معرکہ بدر میں اسیر ہوا ۔ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی تہی دستی اور عیال داری کی شکایت کی اور کہا :۔

آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ میرے پاس مال نہیں ہے ۔ میں حاجت مند اور عیال دار ہوں مجھ پر احسان فرمائیے ۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی امداد فرمائی اور اس کا پابند فرما دیا کہ وہ حضور کے مقابلہ میں کسی اور کی اعانت نہ کرے گا ۔ اس تصفیہ کے بعد ابوعزہ نے حضور کی شان میں ایک مدحیہ قصیدہ لکھا ۔

اس کے بعد مشرکین کو موقع ملا تو وہ ابوعزہ کو ہموار کرنے میں کامیاب ہو گئے اس نے حضور اکرم سے جو عہد کیا تھا توڑ ڈالا ۔

جمایہ کو غزوہ احد سے پہلے صفوان بن امیہ نے ابوعزہ سے کہا :۔

——— اے ابوعزہ تم ایک شاعر ہو ہمارا ساتھ دو اور اپنی زبان سے ہمارے کام آؤ ۔

ابوعزہ نے جواب دیا :۔

——— محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے میرے ساتھ بھلائی کی ہے ۔ میں ان کی مخالفت نہیں کرنا چاہتا ۔

اب صفوان نے کہا :۔

——— اچھا تو پھر اپنی ذات سے مدد دو اگر بچ کر آ گئے تو ہم تمہیں مالا مال کر دیں گے ، مارے گئے تو ہم تمہاری بیٹیوں کو اپنی بیٹیوں کے ساتھ رکھ لیں گے اور خوش حالی یا تنگی جس حال میں وہ رہیں گی تمہاری بیٹیاں بھی اس حال میں رہیں گی ۔

ابوعزہ نے یہ بات مان لی اور بلا تامل کہ حضور سے لڑنے پر آمادہ ہونے لگا ۔ جب احد کا معرکہ پیش آیا تو ابوعزہ پھر گرفتار ہو کر بارگاہ رسالت میں پیش ہوا ۔

اس موقع پر ابوعزہ نے دوبارہ حضور سے درخواست کی کہ اس مرتبہ پھر احسان فرمائیے اور میری جاں بخشی کر دیجئے ۔

حضور نے اس درخواست پر یہ حکیمانہ جواب عطا فرمایا :۔

——— اب میں اس کا موقع نہ دوں گا کہ تیرے رخسار مکے کی خاک سے مس ہوں اور تو یہ کہتا پھرے کہ میں نے محمد کو دوبارہ فریب دیا ۔

اس کے بعد حضور نے حکم دیا کہ ابوعزہ کی گردن مار دی جائے ۔ پھر اسی موقع پر ارشاد فرمایا :۔

——— لا یلدغ المؤمن من جحر واحد مرتین (مومن ایک بل سے دوبارہ نہیں ڈسا جاتا)

لب مبارک سے نکلے ہوئے یہ الفاظ مدارج عام پا گئے اور ایک ایسی حکیمانہ ضرب المثل بن گئے جو رہتی دنیا تک لوگوں کو فراموش نہ ہوگی ۔ مسلمانو ! کیا یہ امر واقع نہیں کہ اس حکیمانہ ادب کو دنیا کے ہر گوشے کے دور اول کے فرزندان اسلام نے حرز جان بنا لیا اور اپنے دینی و دنیوی معاملات میں اکثر و بیشتر ٹھوکر کھانے سے بچے رہے ۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے :۔ " نہ میں فریبی ہوں نہ کوئی فریبی مجھے دھوکا دے سکتا ہے ۔"

ان نبوی ارشادات نے اگلے مسلمانوں کی زندگی پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ افسوس ہے کہ ہم نے دورِ حاضر میں ان سے فائدہ نہ اٹھایا اور ایک ہی بل سے بار بار اپنے آپ کو ڈسواتے رہے۔ ہم بیانات اور اعلانات بار بار نازل ہوا کئے، اور ہم اسی طرح خوابِ خرگوش میں پڑے سوتے رہے اور ایک ہی طرح کے دھوکے بار بار کھاتے رہے۔ اللہ ہم پر رحم فرمائے اور ہمیں دشمنانِ خدا اور اعدائے اسلام کے ہاتھوں میں کھلونا بننے سے محفوظ رکھے۔

(اقتباس و تلخیص از رسالہ الازہر (عربی))

ماہرالقادری

یادِ رفتگاں

عطیہ فیضی

یہ لٹ طبیہ (کیڈمی) تو یہ ہی گر کبھی حتنک الیہ (ٹریجڈی) بھی ہے کہ علامہ شبلی نعمانی کے تذکرے کے ساتھ عطیہ فیضی کا نام آتا ہے، علامہ شبلی سے راقم الحروف کو بے انتہا محبت بھی ہے اور عقیدت بھی، اس نسبت اور تعلق کے سبب عطیہ فیضی کے نام سے میں بہت دنوں سے واقف تھا، فنونِ لطیفہ عطیہ کو جو خاص شغف تھا، اُس کے تذکرے بھی لوگوں کی زبانی سنے تھے۔

دغالباً ۱۹۴۰ء کا ذکر ہے جب بمبئی میں "یومِ اکبر[1]" منایا گیا اور اس سلسلہ میں ایک مشاعرہ بھی منعقد ہوا، مشہور اہلِ قلم جناب ضیاء الدین احمد برنی اس مشاعرے کے داعی تھے، انہی کی دعوت پر میں حیدرآباد دکن سے بمبئی پہنچا، کرانٹ مارکیٹ سے متصل شاہجہان ہوٹل تھا وہاں مجھے ٹھیرایا گیا، صابو صدیق ہال میں بڑے دھوم کا مشاعرہ ہوا، اُن دنوں مجھ پر کبھی کبھار دل کا دورہ پڑ جایا کرتا تھا، مشاعرے میں پہلی غزل کے بعد سامعین نے دوسری غزل کی فرمائش کی، دوسری کے بعد تیسری کی، چوتھی غزل پر میں دل میں گھبراہٹ سی محسوس کرنے لگا، تکلیف بڑھنے لگی، میں نے جیسے تیسے غزل ختم کی، اسی عالم میں ہال سے باہر آکر بستر پر لیٹ گیا، شدید تشنج کی تھی ہوئی بدن پسینہ میں شرابور، میں بستر پر بے قابو ہو کر لوٹ رہا تھا، اور ایک مجمع میرے اردگرد تھا، وہ جو کسی نے کہا ہے کہ "ہزار منہ ہزار باتیں!" لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں، کسی نے کچھ کہا کسی نے کچھ مگر زیادہ لوگوں کا گمان یہ تھا کہ ماہر نے زیادہ شراب پی لی تھی، اُس کے سبب یہ حادثہ پیش آیا ــــ

مشاعرے کے بعد دعوتیں اور ادبی نشستیں رہیں، بمبئی کے مشہور خاندان طیب جی کی خواتین نے ایک ادبی انجمن قائم کی تھی، اُس کا نام "عندلیبیا" تھا، اس بزم میں مجھے بلایا گیا، چائے نوشی کے بعد شعر خوانی ہوئی، آصف فیضی جو مصر میں حکومت ہند کے سفیر رہے ہیں اُن دنوں لا کالج بمبئی کے پرنسپل کے عہدے پر فائز تھے ان سے بھی اسی انجمن میں تعارف ہوا، نواب ہاشم یار جنگ بہادر حکومت حیدرآباد دکن میں ہائی کورٹ کے جج تھے پھر وہ مشیر قانونی ہو گئے یہ وہ زمانہ تھا جب سر اکبر حیدری کا حیدرآباد میں طوطی بولتا تھا، انہی ہاشم یار جنگ کی صاحبزادی مسز زینت فتح علی، اس علم دوست خانوادے کی ادبی سرگرمیوں کی روحِ رواں تھیں، عطیہ فیضی سے تعارف کا ذریعہ

---

[1] اکبر الہ آبادی نہیں ــــ مغلیہ شہنشاہ جلال الدین اکبر!

میرے ٹھیرنے کے لئے انہوں نے ساحل پر ایک جھونپڑی نصب کرائی، جس کا دروازہ سمندر کی جانب تھا، اندر سفری پلنگ رکھا گیا، چھوٹی سی تپائی، جس پر کاغذ، پنسل اور ٹارچ رکھی ہوئی، شب میں پر تکلف کھانے کے بعد شعر و سخن کی محفل کا آغاز ہوا اسی خاندان کے ایک فرد جن کا پورا نام یاد نہیں رہا جو آئی سی ایس تھے[1]۔ انہوں نے بڑے شاندار الفاظ میں میرا تعارف کرایا۔ جیسے وہ پہلے سے کہ میرے لباس وضع قطع اور شاعری کا مزہ لے لے کر اپنے تصور میں نقشہ کھینچا پھر میں نے جو کلام سنانا شروع کیا ہے تو بقول شخصے سویرا کیا سب لوگ آخر وقت تک بیٹھے رہے اور لطف لیتے رہے! جیسے بدمزگی، اکتاہٹ اور بے کیفی کو ان کی شبستان سے دیس نکالا مل چکا ہے۔

دوسرے دن میں وہاں سے اسی راستے سے بمبئی واپس ہوا یعنی خشکی کے ساتھ بحری سفر بھی! چلتے وقت بڑے احترام کے ساتھ "نذرانہ" بھی دیا گیا!

تقسیم ہند سے قبل بزم اقبال مسلمانانِ پنجاب کی جانب سے آخری مشاعرہ اپریل ۱۹۴۶ء میں ہوا، پھر چند ماہ کے بعد ملک کے طول و عرض میں جو قیامت برپا ہوئی اُس کا ذکر کرنے کے لئے لوہے کا کلیجہ اور پتھر کا دل چاہیے' دوست احباب اور عزیز و شناسا اس طرح منتشر اور تتر بتر ہوئے کہ کسی کو کسی کی خبر نہیں کہ کون مرا، کون جیا اور جی رہا ہے تو کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔

عطیہ فیضی، اُن کے شوہر مسٹر رحمین اور عطیہ کی بڑی بہن بیگم جنجیرہ سے ۱۹۴۹ء میں ملاقات ہوئی یہ لوگ اُن دنوں کراچی کینٹ اسٹیشن کے قریب کارلٹن ہوٹل میں ٹھیرے ہوئے تھے۔ اس کے بعد مسٹر غلام محمد مرحوم سابق گورنر جنرل پاکستان جو اُن دنوں وزیر خزانہ تھے، ان کی کوٹھی کے قریب عطیہ فیضی نے ایک فلیٹ کرایہ پر لیا تھا، یہاں بھی بمبئی کی روایت کو باقی رکھا گیا ہر ہفتہ بدھ کے بدھ اہل ذوق کا اجتماع ہوتا، ایک بار بھارت کے ہائی کمشنر مسٹر سری پرکاش اپنی صاحبزادی کے ساتھ تشریف لائے، چائے نوشی کے بعد میں نے اشعار سنائے جب وہ چلے گئے تو عطیہ فیضی نے مجھ سے کہا کہ جب تم اپنا کلام سنا رہے تھے، تو سری پرکاش صاحب نے مجھ سے کہا کہ یہ صاحب (میری طرف اشارہ تھا ــــ م۔ق) اب جب آئیں تو مجھے اطلاع کرنا میں اس نشست میں ضرور آؤں گا۔

ہارنس گارڈن میں جہاں اب آرٹ کونسل کی شاندار عمارت ہے اُس کے عقب میں عطیہ فیضی نے اپنے رہنے کے لئے خالص مشرقی طرز کا آرام دہ کشادہ مکان اور اُس کے قریب چند قدم کے فاصلے پر آرٹ گیلری تعمیر کرائی تھی، جس میں اُن کے شوہر فیضی رحمین کی مصوری کے اعلیٰ نمونے آویزاں تھے، خاص طور سے مولانا شوکت علی کی قد آدم تصویر قابل دید تھی، دیکھنے والے کو پہلی نظر میں دھوکا ہوتا تھا جیسے عین مین مولانا شوکت علی (مرحوم) چغہ پہنے کھڑے ہیں۔ ان دونوں عمارتوں کی دیواروں کے بیرونی حصہ کا رنگ دلی کے لال قلعہ کی دیواروں کی طرح سرخ تھا!

یہ لوگ زیادہ سے زیادہ ڈھائی تین سال اُس مکان میں رہے ہوں گے، پھر ان پر ایسی بپتا پڑی کہ اس مکان سے انہیں اُٹھ جانا پڑا، اس باغ میں عطیہ فیضی اُن کے شوہر اور ہمشیرہ نے حکومت سے اجازت لے کر ہی عمارت بنائی ہوگی، پھر وہ اس سے بے دخل کس طرح کر دیئے گئے؟ وہ دونوں عمارتیں غالباً اب تک خالی پڑی ہوئی ہیں۔ دفتری کارروائیوں کے بھی عجیب چکر اور پیچیدگیاں ہوتی ہیں اور حکومتوں کی تبدیلیاں بھی بعض معاملات و مسائل اور حالات پر خاصی اثر انداز ہوا کرتی ہیں۔ بہرحال یہ بہت بڑا سانحہ تھا جو اُن کے ساتھ پیش آیا۔

اس طرح گھر سے بے گھر ہو جانے کے بعد یہ مختصر سا خاندان جس کا ہر فرد ضعیفی کی عمر کو پہونچ چکا تھا اور کسی عزیز رشتہ دار اور اولاد کا سہارا بھی انہیں میسر نہ تھا، ہوٹلوں میں رہنے لگا، جمع کیا ہوا اندوختہ آخر کہاں تک ساتھ دیتا، کسی قسم کا کوئی سہارا نہیں، وہ جو مثل مشہور ہے، کہ مفلسی میں آٹا گیلا، آئے دن کی بیماریوں نے مالی حالات کو اور زیادہ سقیم کر دیا!

---

[1] غالباً یہ صاحب وہ تھے جو چند سال قبل مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر رہ چکے ہیں۔

شکل میں چھپا گیا۔ عطیہ فیضی اور ان کے شوہر کے انتقال کے بعد میں نے لندن میں اس کا ترجمہ تمام بمبئی کے نامہ نگاروں کیا نہ معلوم اس ترجمہ کا پھر کیا حشر ہوا!

عطیہ فیضی کے پاس مشاہیر کے خطوط کا خاصہ ذخیرہ تھا انہوں نے مجھے ایک خوبصورت سی بیاض دکھائی، جس کا سنہری حاشیہ تھا۔ اس پر نواب حامد علی خاں والی رامپور کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک شعر تھا، یہ بیاض نواب صاحب رامپور نے انہیں تحفہ کے طور پر دی تھی۔

راقم الحروف نے سینکڑوں نہیں ہزاروں کاپیوں پر آٹو گراف دیے ہیں لیکن عطیہ فیضی نے جس آٹو گراف بک پر مجھ سے لکھوایا وہ اپنی نوعیت کی نادر اور بیش قیمت "بیاض" تھا (Autograph Book) اس میں ہندوستان، انگلستان، ترکی اور بعض دوسرے ممالک کے مشاہیر کی تحریریں اور دستخط تھے، یہاں تک کہ جب پہلی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے بعد بحری جہاز سے ہندوستان واپس آ رہے تھے، تو عطیہ بیگم اسی جہاز میں تھیں، انہوں نے اسی موقع پر گاندھی جی کی انگلی میں آلپین چبھوئی اور گاندھی جی نے اپنی انگلی کے خون کا نشان عطیہ فیضی کی آٹو گراف بک پر ثبت کر کے اپنے دستخط کئے، آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی مجلس عاملہ کے جو ارکان اس جہاز سے گاندھی جی کے ہمسفر تھے ان سے بھی اس صفحہ پر دستخط لئے گئے اس قسم کی نادر و عجیب اور فن کاری کی باتیں عطیہ فیضی کو خوب سوجھتی تھیں۔

عطیہ فیضی کی زندگی صفحۂ رنگین بھی ہے اور درسِ عبرت بھی!

خان بہادر عالم علی خاں مرحوم

تقسیم ہند سے قبل جب میں دلّی میں مقیم تھا، تو خان بہادر عالم علی خاں کا نام سنا تھا کہ وہ یو۔پی کی اسٹیٹ میں وزیر اعظم ہیں ایک دو بار غالباً کنور مہندر سنگھ بیدی کے یہاں جو آن دنوں دلی میں مجسٹریٹ تھے، خان بہادر صاحب کو دیکھا بھی تھا مگر ان سے ملاقات بہاولپور میں ہوئی!

پاکستان بننے کے چار پانچ سال بعد بہاولپور میں اردو کانفرنس اور مشاعرہ منعقد ہوا کرنل مقبول حسین قریشی ان دنوں ریاست بہاولپور کے وزیر تعلیم تھے انہی کی شاندار کوٹھی میں سب مہمان ٹھہرائے گئے، بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب اس قافلہ کے رہنما تھے۔

مشاعرے کے دوسرے دن بہاولپور کے سنٹرل جیل دیکھنے کا پروگرام تھا، تمام مہمان شعراء اور اہل قلم مولوی عبدالحق صاحب کی قیادت میں جیل پہنچے، خان بہادر عالم علی خاں محکمہ جیل کے انسپکٹر جنرل تھے انہوں نے ایک ایک وارڈ سب کو لے جا کر دکھایا، وہاں کے طریقِ کار، قیدیوں کی خوراک، رہن سہن، اسیری انسانی کی تفصیلات بتائیں، پھر ایک شاعر قیدی سے ملوایا جو اپنے رقیب کے قتل کرنے کے الزام میں ماخوذ تھا، خان بہادر صاحب بہادر نے بڑی عقیدت اور احترام کے انداز میں فرمایا۔

"جب مجھے پتہ چلا کہ یہ صاحب شاعر ہیں تو میں نے ان کے لئے جیل میں ہر قسم کی ممکنہ سہولتیں مہیا کر دیں، شاعر بہت بڑا آدمی ہوتا ہے کم سے کم میرے دماغ سے تو اس کا دماغ بڑا ہے"

پھر اس شاعر نے اپنے شعر سنائے اور تھوڑی دیر کے لئے جیل خانہ شاعروں کی گاہ بن گیا۔

اس کے بعد خان بہادر صاحب سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ مراسلت میں پہل انہی نے کی۔ "فاران" کے خریدار بنے، اپنا مجموعہ کلام ——— مرقعِ عالم ——— تبصرہ کے لئے بھیجا، تین چار اپنی غزلیں اور نظمیں بھی "فاران" میں اشاعت کے لئے ارسال کیں ان میں سے ان کی بس ایک نظم "فاران" میں چھپ سکی، جو شائع نہیں ہوئیں آن کا نہ شکوہ کیا اور نہ اشاعت کے لئے اصرار!

بہرحال اس پیرانہ سالی اور بیماری کے باوجود آخر زمانے تک بھی تشریف لانے کا اشتیاق ہر منزل پر قائم رہتا تھا! ان کے خط
ایک دو مہینے کے وقفہ سے برابر آتے رہتے تھے! آخری خط میری اہلیہ کے انتقال پر تعزیت کا خط تھا۔ میں نے جواب میں شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا کہ عید
کے بعد میں خود حاضر ہوں گا۔ مگر میں ان سے ملنے کے لئے جانے کا پروگرام بنا رہا تھا کہ روزنامہ "جنگ" میں ان کے انتقال کی خبر پڑھی۔
— غفرلہ اللہ تعالیٰ۔

اب سے تقریباً تیس سال قبل عالم علی خاں مرحوم کی ملازمت کا آغاز [illegible] میں ایک چھوٹے سے عہدے سے ہوا مگر وہ اپنی فرض شناسی
اور قابلیت کی بدولت ترقی کرتے چلے گئے۔ ریاست بہاولپور میں وزارت عظمیٰ کے فرائض اس وقار و وقعت اور قابلیت کے ساتھ انجام دئے کہ ریاست
کو خود کفیل اور ہر طرح سے خوشحال بنا دیا۔ انگریزی حکومت کی طرف سے خان بہادر کا خطاب ملا! ریاست بہاولپور میں جب وہ محکمہ جیل کے
انسپکٹر جنرل تھے تو بہاولپور سنٹرل جیل کی نگرانی میں اس معجزانہ خوش انتظامی کا ثبوت دیا کہ مختلف صنعتوں کی بدولت جیل خانہ کو ہر سال
ڈیڑھ دو لاکھ کی بچت ہونے لگی۔ غالباً انہوں نے بتایا کہ ساری دنیا میں یہ ایک ایسا جیل خانہ ہے جہاں کا بجٹ فاضل ہوتا ہے۔ ہز ہائی نس نواب
صاحب بہاولپور نے کارگزاری کے اس صلہ میں انہیں بہت کچھ نوازا! خان بہادر صاحب مرحوم کے ہٹتے ہی جیل خانہ کی آمدنی میں کمی ہونے
لگی یہاں تک کہ ——

ع جہاں سے چلے تھے وہیں آگئے!

بہاولپور کی زمین اور مکان فروخت کر کے کراچی کی ڈیفنس سوسائٹی میں اپنے صاحبزادے معظم علی خاں کی کوٹھی سے متصل [illegible]
عمارت بنانے کے لئے جگہ لی! دو سال ہوتے اس زیر تعمیر کوٹھی میں سیرت کا جلسہ کیا جس میں بلایا۔ موجودہ نواب بہاولپور جو ان دنوں اپنے
والد محترم کی وفات سے پہلے ولی عہد اور مرکزی اسمبلی کے رکن تھے اس جلسہ میں تشریف فرما تھے نواب صاحب موصوف خان بہادر صاحب کے فرزند
معظم علی خاں کے ہم زلف ہوتے ہیں۔

اس جلسہ میں مختصر مجمع تھا مگر سب لوگ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے میں نے بیس منٹ میں سیرت مقدسہ پر تقریر کی اس کے بعد نعتیہ کلام
سنایا، خان بہادر صاحب کی خوشی کا عالم دیدنی تھا، جلسہ کے بعد چائے نوشی ہوئی جس کے ساتھ پرتکلف لوازم بھی تھے۔

خان بہادر عالم علی خاں کی زندگی اس اعتبار سے ایک تجربہ بلکہ معجزہ معلوم ہوتی تھی کہ وہ پچیس تیس سال سے ایک منٹ کے لئے
بھی نہیں سوئے۔ چوبیس گھنٹے اور آٹھ پہر جاگتے گزرتی، ان کی اس مسلسل بیداری کا حال سنکر بعض انگریز ڈاکٹر اور امریکن ڈاکٹر ان کو دیکھنے کے لئے آتے
تھے۔ ان کی اس بے خوابی کے باوجود ان کی صحت اچھی تھی، بڑھاپے میں بھی سرخ و سپید رنگ تھا، جوانی میں بہت خوبصورت ہوں گے،
مگر جب وقت آیا تو ہمیشہ کے لئے قیامت کی نیند سو گئے۔

آرم لکھنوی مرحوم

نام تھا شہنشاہ حسین، آرم تخلص، خاص لکھنؤ کے باشندے، شاعری میں علامہ آرزو لکھنوی سے شرف تلمذ حاصل تھا [illegible] لکھنؤ
میں اور جوانی کا خاص حصہ کلکتہ میں بسر ہوا، وہاں بھی اہل علم اور ارباب فن کی صحبت اور ہم نشینی انہیں میسر آئی۔ انگریزی کے ایم۔اے تھے مگر
وضع قطع، لباس، نشست و برخاست اور چہرے بشرے سے [illegible] فاضل نظر آتے تھے، سلام کرتے ہیں وہ ان کے ہاتھ کی جنبش اور
زبان کا خم، ان کے لکھنوی ہونے کی شہادت دیتا تھا۔

پاکستان میں آنے کے بعد ان کی ملازمت کا آغاز محکمہ ریڈیو سے ہوا اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ آرم و نظم دونوں ریڈیو پر [illegible]

تو زنجیر...... اور بھاری ہو گئی

اس کی توجیہہ تو ہماری سمجھ میں ابھی نہیں آتی، اس شعر کو یہ معنی پہنائے جا رہے ہیں کہ پچھلے وعدوں کے مقابلہ میں موجودہ وعدہ سخت تر ہے! ارم بے چارے کے چہرے پر فکر و تشویش کی پرچھائیاں سی چھانے لگیں، کئی دن مذاق کا یہ سلسلہ چلتا رہا اور جب اس مذاق کا راز اُن پر کھل گیا، تو برا نہیں مانا ——

ارم سے آخری ملاقات اُن کی وفات سے دو دن پہلے جناب اسمٰعیل احمد تسنیم مینائی (نبیرہ حضرت امیر مینائی) کی صاحبزادی کی شادی میں ہوئی، چند منٹ ہنسی مذاق کی باتیں بھی رہیں، بس پھر وہ ایسی گم ہوئے کہ دوسری صبح کو اخبار میں اُن کے انتقال کی خبر پڑھی —— ! اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

ارم لکھنوی خوش گو شاعر تھے، غزل کے مزاج کو پہچانتے تھے، اُن کے ترنم میں انفرادیت کے ساتھ سوز و کشش بھی تھی جن مشاعروں میں وہ اس زمانہ کامیاب رہے کہ جگر کے بعد کوئی شاعر ترنم میں نہیں سکا! اُن کے چند شعر ——

وہ یہ کہتے ہیں کہ جا اب رستگاری ہو گئی / اے جنوں! زنجیر یہ تو اور بھاری ہو گئی
آئینہ میں اپنی صورت دیکھتا جاتا تھا میں / دفعتہً پیش نظر صورت تمہاری ہو گئی
ہم باغ تمنا میں دن اپنے گزار آئے / آئی نہ بہار آخر، شاید نہ بہار آئے
ٹکرایا ترے در سے اک نعرۂ مستانہ / بے نام لیے تیرا ہم تجھ کو پکار آئے
کبھی سر بھی رکھ دیں گے قدموں پہ اُن کے / ابھی صرف نقش قدم دیکھتے ہیں
کوئی دیکھ کر اُن کو سنبھلے تو جانیں / مگر جن نگاہوں سے ہم دیکھتے ہیں

مقطع کا مصرعہ ثانی غالب کا مصرعہ —— خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں —— اُن کے تخلص (ارم) کی مناسبت سے لطف دے گیا۔

"مذاہب عالم اور جنگ" ـــــ اس کتاب کا ایک باب ہے اُس کا ایک اقتباس جو ادبِ نادر ادب کا اچھا نمونہ ہے :-

"تمدن و زمین و زمان ان تینوں چیزوں کی ہم آہنگی اس کرۂ خاک میں وہ تباہیاں لائی ہے جس کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں اگر دیارِ مصر کے اہرام کو جو فراعنہ کے جاہ و جلال کی یادگار ہیں کشتوں کا پشتہ کہا جاتا ہے تو فرات و دجلہ کو خون کی ندیاں کہنا چاہیے جو بابل اور اسیریا کے خوفناک تصادم سے رنگین ہوئیں، اگر سرزمین ہند ہندیوں کے ہاتھوں ایک قربان گاہ سمجھی جاتی ہے تو ملک عجم کو آتش سوزاں کہنا چاہیے . . . "

فاضل مصنف کی دلکش تحریر کے اور بھی چند نمونے :-

● ـــ "واقعاتِ زندگی میں بھی دریا کی طرح مد و جزر ہوتا ہے قریش کا مد جنگِ احزاب میں ناکامی کے بعد گھٹنا شروع ہوا . . . . "

● ـــ "حکما جس کو علت و معلول کا سلسلہ سمجھتے ہیں وہ اصل میں مقدم و مؤخر کا ظہور ہے جو ایک مقررہ ترتیب کے ساتھ نظر آتا ہے فاعل اور مختار حقیقی اصل میں ذاتِ پاک ہے "

● ـــ "دینِ عیسوی ابتدائی تین صدیوں تک نامعلوم سا رہا، لیکن جب قیصر قسطنطین نے صلیب کو پرچم بنایا تو یورپ، ایشیا، افریقہ تثلیث کا حلقہ بگوش ہو گیا۔

"زردشت نے جب نورانیت چمکانا چاہا تو گشتاسپ کی قوت اور اسفندیار کی تلوار نے آتش کدے روشن کر دیئے "

فاضل سیرت نگار نے مسلمان مورخین ابن اسحٰق اور واقدی وغیرہ کی کمزور اور غلط و مشتبہ معلومات پر بھی بڑی مدلل تنقید کی ہے، مثلاً ریحانہ کے بارے میں لکھتے ہیں :-

"اگر ریحانہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح ہوا اور حجۃ الوداع میں انتقال ہوا تو ضرور کوئی صحابی ایسی ام المومنین کا ذکر کرتا، جیسے حضرت زینب بنت خزیمہ کا احوال، جن کا انتقال آنحضرت کے سامنے ہوا لیکن اگر وہ زندہ رہیں اور وفاتِ رسول اللہ کے بعد انتقال کیا تو جس خلیفہ کے عہد میں وفات پائی وہ تاریخ ضرور ضبط کی جاتی، جس طرح دیگر ازواجِ مطہرات بشمول حضرت ماریہ قبطیہ کے سن وفات قلمبند کئے گئے، اصل یہ ہے کہ بنی قریظہ کے متعلق چونکہ توریت کے مطابق فیصلہ ہوا جس میں یہ لکھا ہے . . . . . (توریت باب بستم) اس لئے

"ارباب سیرت نے ریحانہ کو ڈھونڈ نکالا . . . . "

اور تزویج کے سلسلہ میں ابن اسحٰق نے جو روایت بیان کی ہے اُس روایت کی تفصیل کر کے فاضل مصنف نے بے سند ٹھیرایا ہے اسی روایت سے دشمن اسلام مستشرق مارگولیتھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر طنز کرنے کا مسالہ مل گیا (ص ۳۶۲)

"جیشِ اسامہؓ" کے بارے میں حضرت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر تخلف کا جو الزام لگایا گیا ہے اُس کی پروفیسر صاحب مرحوم نے کس قطعیت کے ساتھ نفی کی ہے فرماتے ہیں :-

"اس موقع پر چند حاشیہ نشین متعصب اور غلط نویس جو حاشیے چڑھاتے ہیں وہ کس قدر افسوسناک ہیں، کہا جاتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے جیش اسامہؓ سے تخلف کیا، مگر یہ خیال نہیں ہوتا کہ رفیق غار رسول اللہ کو اس حالت میں دیکھتا ہے [illegible]

*

زندگی ملتوی کرتا ہے، اس صورت میں تخلف کا الزام کیسے قائم ہو سکتا ہے یہی وہ شیادتِ رسول ہے جو جیشِ اسامہؓ کو وفاتِ رسالت مآبؐ کے بعد باوجود لوگوں کی مخالفت اور فتنۂ ارتداد کے باعث مدینہ اور اہلِ اسلام کی نازک حالت ہو جانے کے لشکریوں کو رخصت کرتا ہے۔

اس کتاب میں بعض باتیں ایسی بھی آگئی ہیں جن سے صرفِ نظر ممکن اور مناسب نہیں مثلاً ”واقعہ اسریٰ“ کو فاضل مصنف ”رویا“ کا درجہ دیتے ہیں (ص ۱۳۳-۱۳۴) حالانکہ جمہور علماء کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ حضور کو معراج جسمانی طور پر عالمِ بیداری میں ہوئی تھی۔

قرآن شریف میں ”جن“ کا ذکر ایک مستقل نوعِ مخلوق کی حیثیت سے آیا ہے لیکن سید نواب علی مرحوم نے اس مسئلہ میں سر سید احمد خاں سے متاثر ہو کر ”جن“ سے بدوی یا وحشی یعنی اُجڈ اور گنوار لوگ مراد لئے ہیں! ان کا یہ خیال اور تحقیق صحیح نہیں ہے۔ قرآن کریم میں اس انداز میں اللہ تعالیٰ کی تخلیق کا کہیں ذکر نہیں کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے زمینی اور وحشی لوگ پیدا کئے یا مہذب و غیر مہذب طبقوں کو وجود بخشا!

”الیاس ہوں یا عیسیٰ یا خواجہ خضر، بشر تھے، اس لئے زندہ نہیں“ (ص ۱۰۷)

حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں جمہور امت کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ مصلوب نہیں ہوئے اللہ تعالیٰ نے ان کو اٹھا لیا، وہ آسمان میں زندہ ہیں اور دوبارہ دنیا میں تشریف لائیں گے۔ محض قیاس کی بنا پر متواتر احادیث کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

”غلامی“ کے بارے میں بھی فاضل سیرت نگار کی رائے میں ”تجدد“ کی آمیزش نظر آتی ہے (ص ۳۰۵) اگر اسلام نے ہر قسم کی غلامی کو (جس میں جنگ کے ہنگامی حالات اور ضروریات و مصالح بھی شامل ہیں) ختم کر دیا تھا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس آخری وصیت کی جو صفحہ ۴۳۴ پر خود اس کتاب میں درج کیا گیا ہے:—

الصلوٰۃ وما ملکت ایمانکم — نماز کی پابندی کرو اور لونڈی غلاموں کا خیال رکھو

کیا توجیہ کی جائے گی؟ جس میں ”لونڈیوں اور غلاموں“ کا واضح طور پر ذکر موجود ہے!

پروفیسر سید نواب علی مرحوم نے حضرت ابو طالب کے مومن ہونے اور ایمان لانے کی تصدیق کی ہے، —— مشہور حدیث من کنت مولاہ فعلی مولاہ —— کی شرح میں وہ لکھتے ہیں:—

”جناب علی مرتضیٰ کے انہیں اوصاف حمیدہ اور قرابتِ قریبہ کی بنا پر رسول اللہ نے روانگی تبوک کے وقت آپ کو حضرت ہارونؑ سے تشبیہ دی تھی کہ جس طرح حضرت ہارون اور ان کی اولاد میں نسلاً بعد نسلٍ ہمیشہ بنی اسرائیل میں روحانی پیشوا اور امام مانے جاتے ہیں (دیکھو توریت کتاب خروج) اسی طرح حضرت علیؓ اور حضرات حسنینؓ نسلاً بعد نسلٍ اسی درجہ پر فائز رہیں گے، حجۃ الوداع میں جب رسول اللہ کو اپنی رحلت کا زمانہ قریب معلوم ہو رہا تھا۔ امت مرحومہ کو رخصت کرتے وقت آپ نے علی الاعلان جناب مرتضوی کو اس خاص درجہ پر فائز فرمایا، یہ درجہ ولایت اس عہدۂ خلافت سے ممتاز تھا۔۔۔“ (صفحہ ۳۰۳-۳۰۴)

امامت اور ولایت کو ایک خاندان کے ساتھ مخصوص کر دینا اور ساتھ ہی ائمہ کے بارے میں عصمت کا عقیدہ رکھنا یہ عقیدت کا وہ غلو ہے جس سے اسلام میں رد کیا گیا ہے۔

”سقیفہ کے فوری اور اصولِ انتخاب کے لحاظ سے بے قاعدہ کارروائی کو تسلیم کر کے (حضرت علی) کمال ایثار اور کسر نفسی کا اظہار فرماتے ہیں اور اسلام میں فتنہ پیدا نہیں ہونے دیتے“ (ص ۳۱۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سقیفہ میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے انتخاب کو ”بے قاعدہ کارروائی“ کہنا اساس

انتخاب کے تسلیم کرنے کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے کمال تقیہ اور کسر نفسی سے تعبیر کرنا ——— شیعی فکر و نظر کی عکاسی ہے اس قسم کی چند باتیں مصنف کے قلم سے جو نکل گئی ہیں، ان کے پس منظر کو سمجھنے کے لئے پروفیسر سید نواب علی صاحب کے حالاتِ زندگی کے اس اقتباس کو ضرور پڑھ لیا جائے۔

"اب وجد کے شیعہ عقائد کے برعکس آپ نے اپنے چچا کی پیروی کی اور سنی ہونے کے بعد بیعت کر لی، لیکن اس کے باوجود اپنے مشہور خاندان سادات کی روایات کے تا دمِ تک امین رہے" (از صہبا لکھنوی صفحہ ۴۱۹)

سلمان کو سلیمان، دحیہ کو دجیہ، حکم کو حلم اور کعب العنفی کو کعب الحسی ——— پڑھنا شاید یہ کاتب کی غلطیاں ہیں، مگر سقیفہ کو جگہ جگہ ثقیفہ لکھا گیا ہے اُسے کیا سمجھا جائے؟

کتاب کے آخر میں جناب صہبا لکھنوی (مدیر ماہنامہ افکار) نے فاضل مصنف کے حالاتِ زندگی دئیے ہیں اور علمی دنیا کو یہ خوش خبری سنائی ہے کہ پروفیسر سید نواب علی صاحب کی غیر مطبوعہ تخلیقات جلد اشاعت پذیر ہونے والی ہیں۔

چند مقام سے قطع نظر، کوئی شک نہیں کہ اپنے موضوع پر یہ کتاب بلند پایہ تاریخی، علمی اور دینی پیشکش ہے، مکتبہ افکار اس کتاب کی اشاعت پر مبارکباد کا مستحق ہے۔

ماہنامہ الحق زیر سرپرستی:- شیخ الحدیث حضرت مولانا عبد الحق ——— طابع و ناشر:- مولانا سمیع الحق، زر سالانہ چھ روپے، فی پرچہ ۵۰ پیسے، ملنے کا پتہ:- دفتر الحق دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک!

ماہنامہ "الحق" کی دوسری جلد کا پانچواں شمارہ ہمارے سامنے ہے جس میں دینی اور علمی مضامین کا اچھا نمونہ پایا جاتا ہے! "نقشِ آغاز" سے لے کر "مکتوب بغداد" تک تمام مضامین دین و شریعت اور اخلاق و پاکیزگی کی ترجمانی اور عکاسی کرتے ہیں! ہاں! مولوی غلام محمد (بی۔ اے) کا مقالہ "حضرت مجدد اور تصوف" محلِ غور ہے! خاص طور سے یہ عنوان کہ ——— "حضرت مجدد مجذوب سالک" ہیں دل میں کھٹک پیدا کرتا ہے۔

اگر تصوف صرف تزکیہ نفس، احتسابِ نفس، خشیتِ الٰہی، اظہارِ نعمت اور شکرانہ، فضیلت کا نام ہے تو پھر اس کو "انبیاء کرام" سے نسبت دینی چاہئے اور قرآن کریم کو "صحیفہ تصوف" کہنا چاہئے! ——— حالانکہ تصوف ان خوبیوں کے علاوہ کچھ اور "تکلفات" بھی اپنے اندر رکھتا ہے! مثلاً حدیث میں صرف "ابدال" کی اصطلاح آئی ہے اور یہ حدیث بھی جس میں ملک شام کے ابدالوں کا ذکر ہے اپنے اندر ضعف رکھتی ہے، قطب، غوث، قیوم ...... یہ عہدے اور مناصب بعد کے لوگوں کے تراشے ہوئے ہیں، دین میں ان کی کوئی اصل نہیں ملتی، ان مناصب کے جو خصوصیات وابستہ کی گئی ہیں انہوں نے توحید خالص کو غبار آلود بنایا ہے۔

کیا تصوف نے مسلمانوں میں اس غلط تصور کو پیدا نہیں کیا کہ کچھ لوگ جو بالکل غیر مکلف، سلب العقل ہوتے ہیں، ان کو "مجذوب" اور قابلِ احترام سمجھا جائے اور ان کے ہذیانات کو "رموزِ معرفت" کا درجہ دیا جائے۔

شیخ محی الدین ابن عربی جو فنِ تصوف کے سب سے بڑے نمائندے ہیں کیا ان کے افکار و اقوال میں خلجان و اضطراب نہیں پایا جاتا؟ صوفیائے کرام کے ملفوظات میں کیا بعض ایسی باتیں نہیں ملتیں، جن کو شریعت کے مطابق ثابت کرنے میں شارحین کو خاصی مشقت کرنی پڑی ہے مگر پھر بھی۔

؎ کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

تبرک، چلہ اعتکاف، سلاسلِ تصوف کے شجروں کی تلاوت، پاسِ انفاس، صلوٰۃ معکوس اور اس قسم کے بعض دوسرے طریقے، کیا ان کے لئے کتاب و سنت اور آثارِ صحابہ میں کوئی سند اور مثال ملتی ہے، کیا صوفیاء کے تذکروں میں ایسے واقعات نہیں پائے جاتے کہ فلاں بزرگ نے کسی دوسرے صوفی بزرگ کی ولایت کو ایک نگاہ میں سلب کر لیا اور وہ بے چارہ بالکل کورا رہ گیا اور پھر کسی بات پر خوش ہو کر، سلب کی ہوئی ولایت اُسے واپس کر دی!

ماہنامہ "الحق" کوئی شک نہیں دین و شریعت کی قابلِ قدر خدمت انجام دے رہا ہے اور متجددین اور مغرب زدہ لوگوں کے افکار باطل کی تنقید اس کی خصوصیت رہی ہے خاص طور سے حضرت مولانا عبدالحق بانی و مہتمم دارالعلوم حقانیہ کے مضامین پڑھنے کے لائق ہوتے ہیں! اس مادیت زدہ دور میں جہاں سے بھی حق کی آواز بلند ہو رہی ہے وہ تائید و تعاون کی مستحق ہے، اللہ تعالیٰ دینی جرائد و رسائل کی عمر دراز فرمائے، اور اس کی بھی توفیق کہ اسلام پسند اہلِ قلم اور ارباب فکر اپنے فروعی اختلافات کے باوجود ایک محاذ پر جمع ہو جائیں۔

مجلہ "چراغ راہ" مجلس ادارت :- خورشید احمد، مصباح الاسلام، اسعد گیلانی، ممتاز احمد۔ قیمت فی پرچہ :- ۵۰ پیسے۔ سالانہ چندہ نو روپے، ملنے کا پتہ :- چراغ راہ، یوسف منزل، ہرمزجی روڈ، کراچی ملا۔

ماہنامہ "چراغ راہ" مشہور رسالہ ہے جو برسوں سے دین و اخلاق اور علم و ادب کی خدمت انجام دے رہا ہے، اس پر قیصر و ایوان کے عتاب و برہمی کے سخت وقت بھی آئے ہیں مگر وہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے اب تک زندہ ہے!

تین مہینہ سے یہ رسالہ ادارۂ معارف اسلامی کی نگرانی اور سیادت میں نکل رہا ہے اس تبدیلی اور نئے انتظامات نے "چراغ راہ" کو صورت و معنی کے لحاظ سے بہت کچھ دیدہ زیب اور بلند تر بنا دیا ہے اب یہ ادب و شعر اور دین و اخلاق کے ملے جلے مضامین کی بجائے خالص دینی اور علمی مجلہ بن گیا ہے۔ یہ تبدیلی بڑی مبارک تبدیلی ہے اللہ تعالیٰ اس تبدیلی کو راس لائے اور دین و اخلاق کی خدمت کی زیادہ سے زیادہ توفیق عطا فرمائے۔

نظری سیاسیات از پروفیسر شاہ فرید الحق۔ ایم۔ اے، ایل، ایل بی (علیگ) صدر شعبہ اسلامیات اسلامیہ کالج، کراچی۔ ضخامت:- ۳۰۹ صفحات (مجلد رنگین گرد پوش) قیمت آٹھ روپیہ۔ ملنے کا پتہ :- سید بک کمپنی ۱۸/۲ بی، اردو بازار، کراچی

———

جناب شاہ فرید الحق "دستور سیاسیات" کے موضوع پر ایک مصنف اور علم سیاسیات کی حیثیت سے خاصی شہرت رکھتے ہیں موصوف کی کئی کتابیں منظر عام پر آ کر مقبول ہو چکی ہیں یہ کتاب ——— نظری سیاسیات ——— (POLITICAL THEORY) جو ہمارے سامنے ہے اس کا پہلا ایڈیشن چھپنے کے بعد ہی چند مہینوں میں ختم ہو گیا اب اس کا دوسرا ایڈیشن ضروری ترمیم اور مفید اضافوں کے ساتھ شائع ہوا ہے۔

یہ کتاب گیارہ ابواب پر مشتمل ہے :-

(۱) علم سیاسیات کی تعریف اور نوعیت (۲) ریاست (۳) ریاست کی ابتدا سے متعلق نظریے (۴) سیاسی اور سماجی اطاعت کے اسباب (۵) قوم اور قومیت (۶) اقتدارِ اعلیٰ (۷) قانون اور سزا (۸) کلیسا اور ریاست (۹) جدید سیاسی نظریے (۱۰) مختلف مکاتیب اشتراکیت (۱۱) کلیاتی نظام۔

کتاب کے ابواب جلی حروف میں لکھے گئے ہیں اور اردو کے ساتھ انگریزی کی معروف اصطلاحیں بھی درج کر دی گئی ہیں، مثلاً :-

نظریہ پدری یا ابوی (PATRIARCHAL THEORY) قرابت یا خونی رشتہ (KINSHIP OR BLOODRELATION) مساوات و اخوت (EQUALITY AND FRATERNITY) نظریہ افادیت (UTILITARIANISM) کلیاتی نظام (TOTALITARIANISM)

یہ کتاب در اصل بی۔ اے اور بی۔ اے آنرز کے طلبا کے لئے لکھی گئی ہے مگر جامعیت اور معلومات کے اعتبار سے یہ کتاب اہلِ علم کے مطالعہ بلکہ استفادہ کے لائق ہے، سیاست کے کتنے گوشے اور پہلو ہیں، جن کی دلنشین تشریح اس میں ملتی ہے پھر جہاں سیاسیات میں فلسفہ کا رنگ پیدا ہو گیا ہے، وہاں بھی فاضل مصنف کے بیان میں بڑا سلجھاؤ پایا جاتا ہے، انہوں نے ماہرین سیاسیات کی آراء اور اقوال نقل کرنے

کے ساتھ ساتھ اُن پر کہیں کہیں تنقید بھی کی ہے اور یہ دلیل ہے مصنف کی ذہانت اور بصیرت و مہارت کی۔ مثلاً :۔ " مل کی آزادیٔ عمل کا نظریہ بھی لغو ہے، اس لئے کہ فرد معاشرہ کا ایک جز ہے یہ کیسے تسلیم کر لیا جائے کہ فرد کے بعض ذاتی کام معاشرے پر نظر انداز نہیں ہوتے . . . مل معاشرہ کی عضوی اکائی اور وحدت کو نظر انداز کر گیا ہے اس نے حق کا صحیح مفہوم نہیں سمجھا آزادی ایک حق ہے اور حق کے لئے یہ ضروری ہے کہ معاشرہ اسے تسلیم کرے ـــــ " اسپنسر کا بقائے اصلح کا اصول بھی لغو ہے یہ کیسے ممکن ہے کہ کمزور اور غریب کو معاشرے سے نکال دیا جائے۔"

معاشرہ اور سیاست کیا ہے ؟ فاضل مصنف نے چند لفظوں میں اس کی تشریح کی ہے :۔

● " معاشرہ انسانوں کا ایک ایسا گروہ ہے جس میں ہر فرد ایک دوسرے سے انفرادی اور اجتماعی طور پر اس طرح مربوط ہوتا ہے کہ اس کی معاشی، اقتصادی، مذہبی، خاندانی اور سیاسی نشوونما معاشرے سے وابستہ ہوتی ہے، معاشرہ بغیر تنظیم کے قائم نہیں رہ سکتا، اسی تنظیم کو ہم ریاست کا نام دیتے ہیں اور اس سے متعلق علم کو علم سیاست کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔"

● " ارسطو کے نزدیک تو انسان ہونے کے لئے ریاست میں رہنا ضروری ہے ورنہ وہ یا تو جانور ہے یا پھر خدا"

● " حکومت کے بغیر ریاست کا تصور عبث ہے اور ریاست کے بغیر حکومت بے کار ہے۔ ریاست ایک مجرد تصور ہے تو حکومت اس تصور کے عملی اظہار کا ذریعہ ہے بلکہ مدرو کے الفاظ میں حکومت ایک نشہ اقتدار ہے، ریاست کے مقاصد کو حکومت ہی بروئے کار لاتی ہے۔"

● " حکومت ریاست کے عناصر میں ایک اہم عنصر ہے نہ یہ کہ خود ریاست ہے، ریاست مستقل اور پائیدار ہے جبکہ حکومت ناپائیدار اور غیر مستقل ہے۔"

ملت اسلامیہ کے حاکموں کی شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی ہے :۔

- " وہ جاہ و حشمت اور عہدہ حاصل کرنے کے لئے حریص نہ ہو اور خود ہی اس کا طلبگار نہ ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں "ہمارے نزدیک تم میں سب سے بڑا خائن وہ ہے جو خود اس کا طالب ہو" (ابو داؤد)

- " بخدا ہم کسی ایسے شخص کو اپنی حکومت کے کسی منصب پر مقرر نہیں کرتے جس نے اس کی درخواست کی ہو یا جو اس کا حریص ہو" (بخاری و مسلم)

اسی "حب جاہ" نے آج ساری دنیا کو حکومت کے حریص حاکموں کی حرص اور جلب منفعت کے ہاتھوں طرح طرح کی پریشانیوں میں مبتلا کر رکھا ہے، لوگ حاکم بننے کے لئے ہر طرح کی کوشش بلکہ سازشیں کرتے ہیں اور کرسی مل جاتی ہے تو اس سے کسی قیمت پر چمٹنا ہی چاہتے ہیں۔

کلیسا اور سیاست کے بارے میں کلمہ حکمت :۔

- " پاپائے کلیسا نے سیاست کو اپنا تابع کر کے کلیسا ہی کو ریاست بنا دیا اور بادشاہوں نے کلیسا کو تابع کر کے ریاست کو کلیسا بنا دیا۔"

اسلام اور ذہنی ارتقاء :۔

" اسلام میں ذہنی ارتقاء پر کوئی ضرب نہیں پڑتی۔ مسلم فقہ کی بنیاد ہی اجتہاد و قیاس اور اجماع امت پر ہے اور ان کا تعلق ذہنی آزادی سے ہے، لیکن ذہنی آزادی کا یہ مطلب نہیں کہ انسانی ذہن خدائی ذہن پر فوقیت رکھے، بہر حال

خلافت و سنت کی خلاف ورزی کا کسی صورت میں ممکن نہیں ۔"

اسلامی سیاست کے خط و خال کیا ہوتے ہیں ؟ ان کو اس کتاب میں خاصی تشریح کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور مصنف نے دیانتداری کے ساتھ متعلقہ باب کے آخر میں لکھ بھی دیا ہے کہ پروفیسر الیاس احمد صاحب کے مضمون سے یہ باب ماخوذ ہے !

حکومت اور قانون :۔

"آزادی کو بالکلیہ قوانین کے رحم و کرم پر چھوڑنا درست نہیں ، اس لئے کہ بعض حکومتیں ایسی جابرانہ اور غیر جمہوری ہوتی ہیں کہ وہ عوام کی آزادی سلب کرنے کے درپے ہوتی ہیں اور اقتدار کے بل بوتے پر ظالمانہ قوانین نافذ کرتی ہیں ۔۔۔۔۔۔"

اسٹیوارٹ مل نے بڑی اچھی بات کہی :۔

"انسان ہو کر غیر مطمئن رہنا جانور ہو کر مطمئن رہنے سے بہتر ہے ۔"

اشتراکیت کیا ہے ؟

"لفظ اشتراکیت ، اجتماعیت کے علاوہ اتنے مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے کہ اس لفظ کی صحیح تعریف مشکل ہو گئی ہے ، ایریس کے مضمون نگار سال نے اشتراکیت کی چھ سو تعریفیں چھپوائیں ، جتنے اشتراکی ہیں اتنی ہی اشتراکیتیں ہیں یا اشتراکی خود نہیں جانتے کہ اشتراکیت کیا ہے ۔"

کسی اشتراکیت پر مصنف نے تنقید کی ہے کہ اس کی بنیاد صرف توہم پرستی اور خام خیالی پر ہے عملی طور پر اس سے عام کامیابی حاصل نہیں ہوتی ۔

دوسرا رخ :۔

"استفادہ حاصل کریں" (صفحہ ۱۱) "حاصل" زاید ہے ۔۔۔ "اللہ ہی اسے بہتر جانے" (صفحہ ۱۸) افسوس ہے کہ "نہ ہی" نے وبائے عام کی صورت اختیار کر لی ہے ۔۔۔ "ارسطو کے متعلق بھی یہ مشہور ہے اس نے سینکڑوں دساتیر کا مطالعہ کرنے کے بعد بعض نتائج اخذ کئے" (صفحہ ۲۴۳) "سینکڑوں دساتیر" میں مبالغہ پایا جاتا ہے، متعدد دساتیر لکھنا تھا ۔۔۔ "مصالحت اور میل ملاپ" (صفحہ ۱۹۶) "و" زاید ہے ۔ میل ملاپ بولتے اور لکھتے ہیں :۔

"خدا کے بعد سب سے برتر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت ہے" جو خود خدا نہیں تھے ، بلکہ انسان تھے ، عباسی بادشاہوں کی طرح بے لگام مطلق العنانیت حاصل نہ تھی" (صفحہ ۳۰۴) اس پوری عبارت کو بدل دینے کی ضرورت ہے "بے لگام" خاص طور سے نکال دینا چاہیے ۔۔۔ "حکومت نے نظریہ انفرادیت میں جان ڈالا ہے" (ص ۱۴۷) یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے کہ "جان ڈالی" کی بجائے "جان ڈالا" چھپ گیا ۔ صفحہ ۲۰۷ پر "غیظ" کو "غیض" لکھا گیا ہے ، اسی طرح "تابع" کو کئی مقامات پر "طابع" (صفحہ ۲۹۶) کتابت کیا گیا ہے اور "مطالعہ" کو "مطابع" !!

مارکس کے "نظریہ قدر زاید" پر فاضل مصنف نے تنقید کی ہے ۔۔۔

"قدر زاید کے تعین میں مارکس نے غلط تجزیہ کیا ہے اس لئے کہ سرمایہ دار مزدوری اور خام مال کے علاوہ دیگر اخراجات بھی کرتا ہے مثال کے طور پر ٹیکس ادا کرتا ہے اور بہت سے ایسے اخراجات جو مال کی حفاظت وغیرہ سے متعلق ہوتے ہیں کرنا پڑتے ہیں ، نیز سماجی بھلائی کے کاموں میں بہت سی چیزیں دی جاتی ہیں ۔"

اس کے علاوہ یہ بھی لکھنا تھا کہ سرمایہ لگانے والا سرمایہ کے علاوہ اپنا وقت ، توانائی اور دماغ جو اس کام میں صرف کرتا ہے اس کا معاوضہ بھی تو

ملنا چاہئے!

- یا ایہا الذین آمنوا لا یسخر قوم من قوم ...
(اے ایمان والو! نہ مرد، مردوں سے ہنسے!) (ص ۳۸۶)

- ہنسے کی جگہ "ٹھٹھا نہ کریں" یا "مذاق نہ اُڑائیں" ترجمہ کرنا تھا۔

"نظری سیاست" ——— کوئی شک نہیں اپنے موضوع پر کامیاب علمی اور سیاسی پیشکش ہے، فاضل مصنف کے دینی رجحانات اور اسلامی افکار صحت مندانہ ہیں، جن کی جھلکیاں اس کتاب میں بھی نظر آتی ہیں!

ہے کہ تم تذکرہ شروع کرو گے۔ اب ان سے بچتے رہو یا صراحت کرو ہاں شائستہ انداز بہرحال رہے اللہ تمہاری نفسیات سے واقف ہے لہذا اس سے ڈرتے رہو" اللہ غفور و حلیم بھی ہے ـــ ۲ : ۲۳۵

فقر غیور ! شریف الطبع حاجت مندوں کی نفسیات اوران کی شناخت بتائی گئی کہ :

" جاہل انہیں ان کی خودداری اور عزت کے سبب غنی سمجھتے ہیں مگر آپ ان کے چہرہ سے پہچان لیں گے۔ وہ لوگوں سے الحاح واصرار کے ساتھ لپٹ کر نہیں مانگتے " ــــ ۲ : ۲۷۳ غیرت مند اپنی احتیاج چھپاتے ہیں مگر تکلف چہرے سے کھل جاتا ہے ست نگتے زحال خویش لسیما نوشتہ ایم ، ان کا فقر غیور اس انداز کا ہوتا ہے جس کی ترجمانی اقبال نے کی ہے ؂

گدائی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے کہ منعم کو گدا کے ڈر سے دینے کا نہ تھا یارا

ایسے شریف لوگوں کے ساتھ شریف ہی سلوک بھی کرتا ہے۔ حضرت عمر بن عثمان کا ملاقاتی شاعر عمرو بن کیس ایک بار اپنے پھٹے ہوئے لباس کو عبا میں چھپائے ہوئے آیا، حضرت عمرؓ نے آستین سے اندازہ کرلیا اور اس کی حاجت روائی کی اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ واقعہ محمد بن سعد کاتب اور حضرت عمرو بن العاصؓ کے درمیان تھا جبکہ حضرت عمرؓ نے دس ہزار درہم اور سو کپڑوں کی خلعت عطا کی اور احسان شناس شاعر نے شکریہ ادا کیا، سیف الدولہ جیسے سخن سنج بادشاہ نے متنبی سے ان اشعار پر تضمین کرائی تھی، اشعار اتنے عمدہ ہیں کہ بے کہے دل نہیں مانتا :

سأشکر عمرًا ما تراخت منیتی — ایادی لم تمنن وان ھی جلت

میں عمر بھر عمرو کا شکر گزار رہوں گا — ان گرانقدر عطیات پر جن پر احسان نہیں جتایا گیا

فتی غیر محجوب الغنی من صدیقہ — ولا مظہر الشکوی اذا النعل زلت

ایک جوان کہ اپنے دوست سے کچھ دریغ نہیں کرتا — اور احتیاج کے وقت کسی سے شکایت نہیں کرتا

رأی خلتی من حیث یخفی مکانھا — فکانت قذی عینیہ حتی تجلت

میرے فقر کو اس نے مخفی جگہ سے جب محسوس کرلیا — تو میرا فقر جب تک دور نہ ہوا اس کی آنکھوں کی کھٹک بن گیا

غالبؔ مرحوم کا واقعہ مولانا حالیؔ نے لکھا ہے کہ غدر کے بعد مارے مارے ہوئے ایک رئیس کے بدن پر چھینٹ کا فرغل دیکھ کر بے تاب ہوگئے اور حسن طلب کا انداز اختیار کرکے کہنے لگے آپ کا فرغل مجھے بہت پسند ہے چنانچہ اس کے بدلے اپنا قیمتی فرغل اُن رئیس کی نذر کر دیا ۔

جذبات غیظ و غضب ! ارشاد ہوا ۔ مسلمانو ! غیروں سے دوستی نہ کرنا جو تمہارے نقصان کے درپے رہتے ہیں ۔ اور تمہاری مصیبت پر خوش ہوتے ہیں بغض وعناد تو ان کے منہ سے نکلا پڑتا ہے اور دلوں کا مخفی غبار تو بہت بڑا ہے " ۳ : ۱۱۷

چہرہ باطن کا آئینہ ہوتا ہے ۔ دل میں جو ہوتا ہے وہ اس آئینہ میں جھلک پڑتا ہے ۔ قہر و مہر ، غم و مسرت تمام جذبات اس میں عکس ڈالتے رہتے ہیں مگر غصہ اور بغض کے ضبط سے نادان دشمنوں کے ہونٹ بھی کانپنے لگتے ہیں اور غیظ و غضب کا جھاگ منہ سے اُبل پڑتا ہے ۔

محبت فاتح عالم ! قرآن نے اپنا پیغام بھی محبت ہی کے ذریعہ دیا ہے اور وہ اس بات کا قائل ہے کہ " میٹھے بول میں جادو ہے " وہ کہتا ہے کہ حسن اخلاق سے دشمن بھی دوست ہو جاتے ہیں ۔ فاذا الذی بینک وبینہ عداوۃ کانہ ولی حمیم " آنحضرتؐ سے خطاب کیا گیا ؛ ـــ

" اللہ کی مہربانی تھی جس کی وجہ سے آپ نرم طبع ہیں اگر آپ تند خو اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ کبھی کے آپ کے پاس سے جا چکے ہوتے ۔ انہیں ان کی غلطیوں پر معاف اور ان کے لئے استغفار کیا کیجئے ، مشورہ میں شریک رکھئے اور عزیمت کے وقت اللہ پر توکل کیجئے " ۳ : ۱۵۸

فرد اور جماعت کا تعلق ! اچھے افراد ہی سے اچھا معاشرہ وجود میں آتا ہے ، جیسے رنگ رنگ کے پھولوں سے چمن مہکتا ہے ۔ وحدت و کثرت ، قطرہ و دریا ، ذرہ و صحرا ، فرد اور اجتماع اپنے تعلقات کی وجہ سے ہر وقت ایک دوسرے پر اثر ڈالتے بھی ہیں ، ان سے متاثر بھی ہوتے ہیں فرد اپنے اثرات کی ہمہ گیری کے لحاظ سے جماعت بھی ہے اور جماعت بہ حیثیت ایک اکائی فرد بھی ۔